آب گینے
تمام نقادان سخن اس امر پر متفق ہیں کہ اختر انصاری کی یہ دل افروز جذباتی شاعری، اپنی جدت طرازی، انوکھے پن، البیلے انداز اور مغربی اسلوب کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے
نزاکت تخیل، شدت احساس، صداقت جذبات، حسن بیان، اثر انگیزی اور وجد آفرینی ان قطعات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ نیا زک آب گینے حسن و جوانی اور عشق و رومان سے لبریز پیمانے ہیں۔
قیمت مجلد مع رنگین گردپوش صرف ۱۲ر
غبار خاطر
مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ معرکۃ الآرا نئی کتاب جو آپ نے اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کی نظر بندی کے ایام میں احمد نگر کے قلعہ میں لکھی اور جس کا موصوف کے رہا ہونے کے بعد سے ملک بے تابی سے انتظار کیا جا رہا تھا شائع ہو گئی ہے۔
"غبار خاطر" میں ہندوستان کی ناگفتہ بہ حالت اور پیچیدہ گتھیوں کا حل ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن کے لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ قیمت مجلد للعہ

سالنامہ ۱۹۴۶ء

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے | سال ۵ - نمبر ۱ | یکم جون ۱۹۴۶ء | قیمت سالنامہ [illegible]

فہرست

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶ دہلی

منظومات

تصاویر

نوٹ:- "نسیم" کی نہایت دیدہ زیب رنگین تصویر علیحدہ چھپی ہوئی اسی شمارے میں رکھی ہے۔

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی، بی اے (علیگ) ایل ایل بی

ناشر: راجیندر ناتھ شیدا، ایم اے

مدیران: فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد، ایم اے

غزل

امجد حیدرآبادی

گرچہ امجد سخت نافرجام ہے ۔۔۔ کام لینا اس سے تیرا کام ہے

کامیابی کے نہیں ہم ذمہ دار ۔۔۔ کام کی حد تک ہمارا کام ہے

جبر اس مختار پر کیونکر کریں ۔۔۔ عرض کر دینا ہمارا کام ہے

حسن صورت کو نہیں کہتے ہیں حسن ۔۔۔ حسن تو حسن عمل کا نام ہے

رہتے ہیں ٹوٹے ہوئے دل میں خوش ۔۔۔ ٹوٹ کر بھرتا ہے، یہ وہ جام ہے

اہل دل کو اپنا دل دیجئے ۔۔۔ ہاں اسی منزل میں کچھ آرام ہے

رہ سکے کس طرح امجد مطمئن

زندگی خوف خدا کا نام ہے

افتتاحیہ

پچھلے سال ہماری کوششوں کو جس طرح سراہا گیا وہ بے حد اطمینان بخش ہے۔ خریداروں اور پڑھنے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا اور ہمارے معاصرین نے ہمارے جتنے مضامین نقل کئے ان کی تعداد بھی ہماری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ خاص کر یہ دیکھ کر ہمیں بے حد مسرت ہوئی کہ افغانی رسالوں اور اخباروں نے بھی ہمارے کچھ مضامین نقل کئے اور اس طرح گویا ہماری ان خدمات کو سراہا جو ہم ہندوستان اور افغانستان کے کلچرل تعلقات کے بڑھانے کے سلسلے میں انجام دے رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جو سالنامہ ہم اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ ہر طرح کے قارئین کو مطمئن کر سکے گا۔ مضامین کی فراہمی میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مختلف طرح کے مذاقوں کی تسکین ہو سکے۔ پچھلے سال سالنامہ کی لکھائی چھپائی اور ظاہری شکل و صورت میں جو کچھ کمیاں رہ گئی تھیں انہیں دور کرنے کی طرف بھی پوری توجہ دی گئی ہے اور یقین ہے کہ رسالہ اپنی موجودہ شکل میں نفیس مزاج اور نفاست پسند قارئین کو بھی پسند آئے گا۔ ہم قارئین کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے کام میں جو ہمارے نزدیک ترقی پسند بھی ہے اور پورے ہندوستان کے لئے ایک خاص اہمیت بھی رکھتا ہے ہمارا برابر ہاتھ بٹایا اور ہمیں سہارا دیا۔

بیرونی سیاست اور دوسرے ملکوں کی زندگی کے اور خاص کر ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں کی زندگی کے مختلف پہلو ہمیشہ سے آج کل کا سب سے اہم اور نمایاں موضوع رہے ہیں۔ پچھلے سال ان مضامین کو پڑھ کر قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے سب سے بڑے پڑوسی روس کے تعلقات دنیا کے دوسرے ملکوں سے عموماً اور برطانیہ اور امریکہ سے خصوصاً کسی حد تک کشیدہ ہوتے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان اختلافات سے جو ایران کے معاملہ میں پیدا ہو رہے ہیں، یا بعض دوسرے مسائل جو دنیا کی صحافت پر چھائے ہوئے نظر آ رہے ہیں، سر دست ہندوستان کو کوئی قریبی تعلق نہیں۔ لیکن روس سے اس کا قرب، برطانیہ سے اس کا وہ تعلق جو اب آزاد اشتراک کی شکل اختیار کر کے پہلے سے بھی زیادہ اہم بننے والا ہے اور ایران کے لئے اس کے دوستانہ جذبات، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ ہندوستان ایک ایسے معاملہ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہے جس سے اسے بظاہر کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے تھا۔

ہمارے قارئین کو پوری طرح اس بات کا اندازہ ہوگا کہ دوسرے ملکوں کی برائی کر کے یا ان کی پالیسی پر نکتہ چینی کر کے اپنے صفحات کو بھرنا ہمارا مسلک نہیں۔ ہمارے نزدیک تو جہالت اور تعصب انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور اس لئے دوسرے ملکوں کا ذکر کرتے وقت ہم ان کی زندگی کے ان پہلوؤں اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں جو ہماری نظر میں اچھے اور قابل ستائش ہیں، سلامت ہم پہلوؤں اور کارناموں کے تخریبی اور مضر امکانات کو سامنے لانا ہمارا شیوہ نہیں۔ اگر کسی معاملہ میں غلط فہمی کی جھلک نظر آتی ہے تو بجائے اس کے کہ ہم اس معاملہ کو سرے سے مذموم قرار دیدیں ہم اس غلط فہمی کی وجہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

روسیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً اور مزاجاً شکی ہوتے ہیں، اور اس لئے روس کے موجودہ رویّہ اور پالیسی کی ذمہ داری ان بے بنیاد شکوں اور شبہوں پر ہے جو اس نے امریکہ اور برطانیہ کے ارادوں کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ تیرھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی تک تقریباً ڈھائی سو برس کی تاتاری محکومی نے روسی مزاج اور فطرت میں خود حفاظتی کا احساس پیدا کر دیا ہو لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ روسی انقلاب کی طرف سے مغربی قوتوں اور جاپان کا جو رویہ رہا ہے وہ روسی ذہن میں اب تک کھٹک رہا ہے۔ روسیوں کو اس رویّہ میں اس چیز کو مٹا دینے کی خواہش کی جھلک نظر آتی ہے، جسے ہر روسی اپنی نجات کا سبب جانتا ہے۔

روسیوں کے دلوں میں یہ کھٹک اور شکایت کا یہ جذبہ کتنا شدید ہے، اس کا اندازہ شاید اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لڑائی کے دنوں میں اور اس کے بعد جب ساری دنیا کا رویہ روس کے ساتھ دوستانہ تھا اور دنیا سرخ فوج کے شاندار کارناموں کو احسان مندی کے شدید احساس کے ساتھ دیکھ رہی تھی سوویٹ حکومت بڑی احتیاط سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ روسیوں کو دنیا کے احساس کا پتہ نہ چلنے پائے۔ روسی حکومت اب بھی روسیوں اور غیر ملکی باشندوں کے درمیان کسی قسم کے تعلقات بڑھانے کے خلاف ہے۔ اور اس کی تہ میں بھی یہ اندیشہ کام کر رہا ہے کہ کہیں روسیوں کو ان خیالات کا پتہ نہ چل جائے جو مغرب میں عام طور پر پھیل رہے ہیں۔

روس نے باقی دنیا سے علیحدگی اور تنہائی کا جو راستہ اختیار کر رکھا ہے اس کی توجیہہ تو روسی مزاج کے شک و شبہ سے کی جا سکتی ہے لیکن پچھلے چند مہینوں میں روس کی بیرونی پالیسی کا جو رجحان رہا ہے اس کی بظاہر کوئی تاویل اور توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ کچھ دنوں تک روس کی ترکیب بظاہر یہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ ادارہ اقوام متحدہ کے وسیلے سے برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ کے تعلقات میں رخنہ ڈال دے تاکہ سوویٹ یونین کے خلاف کوئی متحدہ محاذ نہ بن سکے۔ چونکہ ان دونوں قوتوں میں برطانیہ، روس کو نسبتاً کمزور دکھائی دیا اس لئے اس نے سب سے پہلے اپنے حملوں کی آماجگاہ برطانیہ کو بنایا۔ لیکن اور آگے چل کر روس کی پالیسی نے ایک دوسرا رخ اختیار کیا۔ لندن میں ادارہ اقوام متحدہ کا جو اجلاس ہوا اس میں مسٹر وشنسکی کی تقریروں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ روس نے برطانیہ اور امریکہ کے اتحاد کو ناگزیر تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ

ایک طرف تو روسی سرحدوں سے ملی ہوئی چھوٹی چھوٹی قوموں کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے اور دوسری طرف ان دور افتادہ قوموں کی خوشامد اور دلجوئی کر رہا ہے جن میں قومی احساسات جاگ رہے ہیں۔ روس کی پالیسی کے ان دو مختلف رخوں کا اندازہ منچوریا اور ایران کے معاملہ میں اس کے رویہ سے اور بھی واضح طور پر ہو جاتا ہے۔ اگر روس اب بھی اپنی پہلی پالیسی پر قائم ہوتا تو بالکل سیدھا سادا راستہ یہ تھا کہ روس منچوریا میں امریکہ کو دباتا اور پھر وسط مشرق میں برطانیہ کے خلاف قدم بڑھاتا لیکن روس نے بالکل اس کے خلاف کیا۔ اور برطانیہ اور امریکہ کا جو اتحاد چند مہینے پہلے تک ناممکن سا معلوم ہوتا تھا اسے خود روسی پالیسی نے ممکن بنا دیا۔

کسی دوسرے ملک میں بیرونی پالیسی کی اس دورنگی کا مطلب یہ سمجھا جاتا کہ ملک میں خیال کے دو مختلف گروہ ہیں۔ ممکن ہے یہی بات روس میں بھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ روس میں صرف ایک ہی سیاسی جماعت ہے لیکن اس کے باوجود کمیونسٹ پارٹی اور سرخ فوج کے درمیان مقصد کے اختلاف کی ایک ہلکی سی لہر ضرور موجود ہے۔ پورے ملک کو اس وقت امن کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جنگ سے روس میں جو تباہی اور بربادی ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا ہمارے لئے دشوار ہے۔ لینن گراڈ سے مغرب کی طرف شمالی کوہ قاف تک کا سارا وسیع علاقہ بالکل ویران ہو گیا ہے۔ اس پورے علاقہ میں ایک شہر بھی ایسا نہیں جسے جنگ نے تھوڑا بہت تباہ و برباد نہ کیا ہو۔ روس سے پیچھے ہٹتے وقت جرمنوں نے روس کی اسی فیصدی عمارتوں کو برباد کر دیا تھا۔ اور اس لئے کمیونسٹ پارٹی یہ چاہتی ہے کہ ملک میں نئے سرے سے تعمیر کے کام کو سنبھالے اور عوام کی نظروں میں دوبارہ وہی اقتدار حاصل کرے جو لڑائی کے دنوں میں کسی نہ کسی حد تک فوجوں کو مل گیا ہے۔ فوجوں نے اور خاص کر فوجی سپہ سالاروں نے ملک کی نظر میں جو عزت اور اہمیت حاصل کر لی ہے اس کے بعد بھی ان کی سیاسی حیثیت بالکل مبہم سی ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سوویٹ حکومت درحقیقت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہی کی خواہش اور ارادہ نہیں کہ اپنے ملک کو پھر کسی لڑائی میں الجھائے لیکن عین ممکن ہے کہ بعض حالات میں سرخ فوج اپنے جارحانہ رجحانات سے کام لے کر پھر اپنی قوت کے آزمانے کا فیصلہ کر بیٹھے۔ روسیوں میں سے اکثر کے ذہنوں پر اس وقت تعمیر کا خیال چھایا ہوا تھا اور اس تعمیر کو ممکن بنانے کے لئے امن کے حالات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ساتھ ملک میں ایک دوسرا رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے۔ یہ رجحان کچھ تو سرمایہ کی دنیا اور اس کے ایٹم بم کے شبہ اور خوف کا پیدا کیا ہوا ہے اور کچھ فوجی قوت کے احساس اور اس کے استعمال کی خواہش کا۔

لڑائی کے بعد سے روسی عمل ایک طرح کا معمہ بنا ہوا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا نظریہ ہی اس کا سب سے صحیح اور یقینی حل ہے۔ لیکن یہ حل ممکن ضرور ہے اسلئے کہ ہمارا یقین ہے کہ ایک لحاظ سے روسی بھی دنیا کے باقی لوگوں کی طرح ہیں۔ یعنی باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنے سے جو غلط فہمیوں کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پہلے روس نے دنیا کا بائیکاٹ نہیں کیا، بلکہ دنیا نے پہلے روس کا بائیکاٹ کیا۔ انقلاب کے بعد بیس برس سے بھی زیادہ مدت تک ساری دنیا کی صحافت نے جس میں ہندوستان بھی شامل تھا انجمنت اور سوویٹ طریقوں کی ملامت اور نکتہ چینی کو اپنا محبوب مشغلہ بنائے رکھا۔ جس دنیا کو ہم سرمایہ دارانہ دنیا کہتے ہیں اس کی اس مخالفت سے روسی حکومت نے روسیوں کو ہوشیار اور خبردار رکھنے کا کام لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرف سے مشتبہ اور مشکوک رہنا روسیوں کی ذہنی عادت بن گئی اور یہ عادت اب اتنی راسخ ہو چکی ہے کہ ان کے لئے اس کا چھوڑنا مشکل ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جنگ کے زمانہ میں روسیوں کے دلوں میں باقی دنیا کی طرف سے دوستی کے جذبہ کی ایک عام لہر دوڑ رہی تھی۔ شاید اس بات سے زیادہ غلط کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ روس کے اکثر رہنے والوں کو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ لڑائی کے زمانہ میں دوسرے ملک اس کی مدد کر رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب سرخ فوج سب سے پہلے امریکی فوجوں سے ملی تو روسی سپاہیوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ امریکنوں کے پاس بھی "جیپ" گاڑیاں تھیں۔ حالانکہ اب تک ان کا خیال تھا کہ "جیپ" گاڑیاں روس کی بنی ہوئی ہیں۔

یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں رہ کر ہم بھلا روسیوں کے ذہن میں فراخی کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ سچ ہو کہ دنیا جو کچھ سوچ رہی ہے اس کی طرف سے روس کی بے خبری کی مثال تقریب قریب ویسی ہی ہے جیسی ایک لحاظ سے ہندوستانیوں کی۔ وہ اپنے شمالی سرحد پر رہنے والے ہمسایوں کی زندگی اور ان کے طرز فکر سے قطعی بے خبر اور ناآشنا ہیں۔ حالانکہ ان دو ملکوں کی سرحد ایک دوسرے سے اتنی ملی ہوئی ہے کہ آج کل ہمارے سورق پر بنے ہوئے نقشہ میں اسے ظاہر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی یونیورسٹی نے "روسی تعلیمات" کا ایک اسکول قائم کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ روس ہمیشہ اسی طرح الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اگر ہندوستانیوں نے روسیوں کی زبان اور ادب سیکھ کر اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا تو ہمیں یقین ہے کہ ان دو بڑی قوموں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ بہت جلد دور ہو جائے گی اور اس قرب سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔

حرفِ آخر کا ایک ورق

آگ

جوشؔ ملیح آبادی

آگ، جولانی، حرارت، مُسکراہٹ، روشنی
آگ ہنستی سرخوشی، مستی، جوانی، زندگی

آگ، آبِ چہرۂ شب، آگ تابِ حسنِ روز
موجِ رقص و موجِ رنگ و موجِ ساز و موجِ سوز

شعلۂ جلوت فروز و مشعلِ خلوت نواز
رنگِ مُل کی کارفرما، بوئے گُل کی کارساز

گرم گل گوں، گُل چکاں، گُل بار، گُل رُخ، گُل صفات
ہمہمہ، حِدّت، حرارت، حوصلہ، ہلچل، حیات

آگ حرفِ اوّلینِ خطبۂ خلّاقِ نور
سُرخیٔ افسانۂ ایجاد و پیغامِ ظہور

ظُلمتوں کو سُرخ زرّیں چادروں میں ڈھانپتی
ناچتی، پہلو بدلتی، سنسناتی، کانپتی

بادو باراں کی جوانی، لالہ و گُل کا سُہاگ
سُرخ انگاروں کی لے پر گُنگُنی شعلوں کا راگ

چمپئی رخسار کی دیوی، بھڑکتی چاندنی
قلبِ عاشق کی طرح پیہم دھڑکتی چاندنی

مخزنِ نور و حرارت، مرکزِ دُود و بخار
عشرتِ ہستی کا محوَر، رزقِ عالم کا مدار

پُختہ مغز و پختہ عزم و پختہ کیش و پختہ کار
جس کے دستِ گرم سے ملبوسِ خامی تار تار

چشمۂ رفتار و جنبش، معدنِ جوش و خروش
نور گُستر، رنگ پرور، گل چکاں، گوہر فروش

پیکرِ نور و تبسّم، روشنیٔ غرب و شرق
قاصدِ رخشندگی، حُسنِ شبستاں، بنتِ برق

نور افزائے قصور و کارفرمائے بخور
پردہ بردارِ شہود و بزم آرائے ظہور

نو عروسِ شعلہ پاش و لیلیٔ زرّیں جبیں
شاہدِ شامِ برشتہ، دُخترِ صبحِ مُبیں

شامِ غربت کے افق پر جلوۂ صبحِ وطن
جہل کی تاریکیوں میں علم و عرفاں کی کرن

جسکی فطرت میں ہے پنہاں شہرِ لاعلمی کی تاخت
جس کے فیضِ عام سے اشکال و اشیا کی شناخت

زندہ و رقصندہ و جوّالہ ضو، غلطیدہ لو
خندۂ تازہ بتازہ، آب و رنگِ نو بنو

پرچمِ تنویر، وجہِ اضطرابِ تیرگی
ناخنِ ظلمت کُشا، تعبیرِ خوابِ تیرگی

مشعلِ زر، پرفشاں سرخی درخشاں اضطراب
رات کی اُمید، ظلمت کی دُعائے مُستجاب

جوش شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے

انقلاب اور انقلابی شاعری مبہم الفاظ ہیں۔ ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب بھی گمراہ کن عقیدہ ہے، اس لئے کہ انقلاب کا نتیجہ خیر بھی ہو سکتا ہے اور شر بھی۔ یہ انقلاب کی نوعیت اور مقاصد پر منحصر ہے۔

روس میں زاریت کا خاتمہ انقلاب کی ایک صورت ہے اور جرمنی میں جمہوریت کی تباہی دوسری۔ اس خیر و شر میں تمیز کرنے اور صحیح انقلابی تعلیم کی ترویج کے لئے جذبہ و جنون کافی نہیں۔ فہم و تدبر اور صحتِ نظر بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ہر ادبی تحریر کے فنی اور افادی پہلو تو ہوتے ہی ہیں لیکن انقلابی ادب کا ایک تیسرا پہلو بھی ہوتا ہے یعنی نظریاتی پہلو۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ انقلابی ادب کامیاب اور ناکامیاب، مفید اور مضر ہونے کے علاوہ صحیح یا غلط بھی ہو سکتا ہے۔ جوش چونکہ شاعرِ انقلاب تسلیم کئے جاتے ہیں اس لئے ان کے دوسرے محاسن یا معائب پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ انکا انقلابی نقطۂ نظر کس حد تک صحیح ہے؟

یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح انقلابی نقطۂ نظر ہے کون سا؟ یہ اپنے اپنے سیاسی عقائد کی بات ہے۔ اگر شاعر ایک نظرئیے کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے کلام کی صحت یا نادرستی اسی نظرئیے سے متعین کی جا سکتی ہے۔ نقاد کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ شاعر سے یہ گلہ کرے کہ اسکا نظریہ نقاد کا نظریہ کیوں نہیں ہے؟ آجکل عام طور سے اصطلاحی معنوں میں انقلابی نظرئیے سے اشتراکی نظریہ مراد لیا جاتا ہے۔ غالباً جوش بھی اسی نظرئیے کے قائل ہیں اور اس سے مطابقت کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کا انقلابی کلام اشتراکی نظرئیے سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے؟ اگر یہ صحیح نہیں ہے تو جب تک وہ اپنے نظرئیے کی وضاحت نہ کر دیں تنقید بے سود ہے۔ اس مضمون میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ پہلی بات صحیح ہے اور صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشتراکی عقائد کے مطابق ہے۔

جوش کے کلام سے جو سب سے پہلا تاثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جوش ایک شخصیت نہیں بلکہ دو شخصیتیں ہیں۔ ان دو شخصیتوں کے لئے جوش صاحب نے خود سیف و سبو کے نشانات وضع کئے ہیں اور وہ اس تضاد کا اعتراف کرتے ہیں۔ ع

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے ‏ ‏ ‏ یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

انقلابی شاعر پر حسن و عشق بادہ و جام حرام نہیں اور اس پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ انقلابی مضامین کے علاوہ اپنے دوسرے تجربات اور دوسری وارداتوں کا ذکر ہی نہ کرے لیکن چونکہ یہ سارے تجربات اور وارداتیں ایک ہی شخصیت پر گزرتی ہیں۔ اس لئے ہم یہ تقاضہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اس کے کلام کے ان متنوع اوراق میں کوئی داخلی یا خارجی ربط اور کوئی ذہنی یا جذباتی وحدت قائم رہے۔

اشتراکی نظریۂ حیات ہمہ گیر ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تمام انسانی تعلقات اور تجربات، ہماری تمام محبتیں اور لغزشیں، راحتیں اور کدورتیں غیر مربوط اور الگ تھلگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی بنیادی سماجی حقیقت کی پیداوار اور آئینہ دار ہوتی ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صحیح انقلابی شاعر اپنا انقلابی نظریہ محض انقلابی مضامین تک محدود نہیں رکھتا۔ اسکے لئے حسن و عشق، مناظرِ فطرت، شراب و ساغر، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ خالص عاشقانہ کیفیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں بھی انقلابی شعور کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ بزمِ شراب کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس بزم کی ہاؤ ہو میں انقلاب کا شور و شغب بھی شامل ہوتا ہے اور جب وہ خالص انقلابی مضامین باندھتا ہے تو وہ بھی بزمِ مے کے سرور اور فراق و وصال کے سوز و ساز سے یکسر خالی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شاعر اپنی ذات کو انقلابی نظریۂ حیات سے منطبق کر چکا ہے تو اس کے لئے یہ آسانی سے ممکن نہیں کہ ایک لمحے میں وہ خالص سو فیصدی انقلابی ہو اور دوسرے لمحے میں مکمل رندِ لاابالی۔

یہ جوش صاحب کا کمال کہہ لیجئے یا کمزوری سمجھ لیجئے کہ ان کی انقلابی اور رندانہ شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اتنا محسوس نہیں کہ اگر انکا کلام دو حصوں میں بانٹ دیا جائے تو سوائے اسلوبِ بیان کے ان دو حصوں میں کوئی ذہنی یا جذباتی کیفیت مشترک نہیں۔ اگر یہ تضاد موجود ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں شخصیتوں میں سے یا یوں کہہ لیجئے کہ انکی شاعری کے ان دو حصوں میں سے زیادہ کامیاب کون سا ہے؟ چونکہ شاعرانہ خلوص کا واحد امتحان شعر کی کامیابی ہے اسلئے ہمارے پہلے نتیجے سے یہ بھی نتیجہ ہوگا کہ ان دونوں شخصیتوں میں سے زیادہ پُرخلوص کونسی ہے؟ ایک حد تک ان دونوں سوالات کے جواب ذاتی تعصبات اور ذاتی مذاق پر منحصر ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ کامیاب نظموں کی گنتی کس حصے میں زیادہ ہے تو ممکن ہے فیصلہ کچھ آسان ہو جائے لیکن شعر اور ریاضی میں بڑا فرق ہے۔ پھر کامیاب اور ناکام نظمیں متعین کرنا بھی کچھ ایسی سیدھی بات نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کونسی نظم شاعر کی ذہنی کیفیت کی مکمل ترجمان ہے اور کس نظم میں یہ ترجمانی ناقص یا غیر مکمل ہے، کس نظم میں الفاظ و معانی

فیض احمد فیض

پوری طرح مدغم ہیں۔ اور کس نظم میں الفاظ و معانی کا رشتہ ڈھیلا اور بے جوڑ ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی طے کرنا پڑے گا کہ ان دو مختلف الانواع کی کیفیتوں میں بنیادی انسانی اقدار کا امتزاج صحیح اور غلط کہاں کہاں ہے؟

میری ذاتی رائے میں اگر محض تعداد سے اندازہ لگایا جائے تو جوش کی زیادہ تر عاشقانہ نظمیں اس اعتبار سے ان کی انقلابی نظموں سے زیادہ ہیں۔ بہر حال اس وقت ان کے انقلابی اور غیر انقلابی کلام کا موازنہ مقصود نہیں محض ان کے انقلابی کلام کی انقلابیت کو اشتراکی نقطۂ نظر سے پرکھنا مقصود ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ انقلاب کسی فرد یا کسی ایک شخص کی ذاتی کوششوں یا تدبر کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کی باہمی پیکار اور کشمکش سے نمودار ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں فرد کی اہمیت طبقوں یا جماعتوں کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جوش کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج اس نظریے کے خلاف ہے۔ وہ طبعاً انانیت پسند اور انفرادیت کے مداح واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ انقلابی جنگ و جدل کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور سے اس جنگ کا ہیرو کوئی طبقہ نہیں بلکہ کوئی فرد ہوتا ہے اور ان کے ابتدائی انقلابی کلام میں یہ ہیرو جوش صاحب خود ہی ہیں ؎

ہٹ کے ابھی وقت کی راہوں میں آتا ہوں   خلق واقف ہے جب آہوں میں چھا جاتا ہوں

فراس جوش کی جو ذرا بھی نہ سہا جائے گا   کتنے ہندوستاں جیسے ہی تو تجھ کو پکارے گا

مری تیغِ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی   ترے ہونٹوں کی جنبش ختم ہونے بھی نہ پائے گی

اور بالخصوص جب حکومت کا سامنا   رعب و شکوہ، جاہ و جلالت کا سامنا

شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا   قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے

اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

یہ تصور کہ کوئی ایک فرد یا کوئی ایک شخص انقلاب کو اپنی ذات میں سمیٹ سکتا ہے اور یہ سماجی علل و اسباب اس کشمکش میں غیر اہم ہیں قطعاً غیر اشتراکی اور اشتراکیوں کے بقول رجعت پسندانہ ہے۔ وہ ذاتی انکسار اور جماعتی تفاخر جو صحیح انقلابی شاعر میں ہونا چاہئے جوش صاحب کی شخصیت کی عین ضد ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک دوسری بات یہ ہے کہ اشتراکی نظریے کے مطابق سماجی نظام میں سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ تنومند، محنت کشوں کا طبقہ ہے، کامیاب انقلابی درس دینے کے لئے اس طبقے سے ذہنی جذباتی اور نظریاتی مطابقت پیدا کرنا ضروری ہے۔ جوش کے ہاں یہ بات نہیں۔ وہ کسان اور مزدور کا ذکر اکثر کرتے ہیں لیکن بہت اوپر سے اور مشفقانہ انداز میں۔ انھوں نے اس طبقے کی نظر سے مسائل کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، نہ اس طبقے کے مسائل میں انھیں زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کے متعلق انکی مشہور نظم کے چند اشعار ہیں ؎

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار   ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں تاجدارِ خاک امیرِ بوستاں   ماہرِ آئینِ قدرت ناظمِ بزمِ جہاں

ناظرِ گل پاسبانِ رنگ و بو گلشن پناہ   ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

ان سارے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسان کے متعلق چند رومانی تصورات کے علاوہ اور کوئی تصویر شاعر کے ذہن میں نہیں ہے۔ اسی طرح آگے چل کر اس کسان کے بیل کے متعلق وہ یوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں ؎

کون بیل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل ٭ قصرِ گلشن کا دریچہ شیشۂ گیتی کا دل

خوشنما شہروں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ ٭ خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام ٭ شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام

یہ الفاظ بھی نوابی درباروں کے قصیدہ گو شعرا کی ذہنیت کا عکس ہوں تو ہوں، اشتراکی شعور کے ترجمان نہیں۔ کسان اور بیل کی رنگین تصاویر کے بعد یہ تصویر آتی ہے ؎

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا ٭ بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں ٭ گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے ٭ یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

مزدور اور کسان کے متعلق یہ ترحم اور رقت کا جذبہ قطعاً غیر اشتراکی ہے کیونکہ اشتراکی نظریہ مزدور اور کسان کی بے بسی و لاچاری اور نقاہت کے بجائے اس طبقے کی تنومندی اور اس کی قوت و عظمت کا قائل ہے۔

انقلاب کا تصور ان طبقاتی تصورات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ جوش نے اپنے طبقاتی نظریے کی تنظیم نہیں کی اسلئے ان کا نظریۂ انقلاب بھی ایک حد تک نادرست ہے۔ وہ انقلاب کا تصور ہمیشہ کسان یا مزدور کی نظر سے نہیں بلکہ ایک خوشحال شہری کی نظر سے کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے شعر میں انقلاب ایک پُرہول، مہیب اور دہشتناک سانچے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہی صورت جو راتوں کو ہر حاکمِ شہر اور ہر صاحبِ زر کی نیند، خواب کرتی ہے۔ ؎

اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گلباریاں ٭ ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں

الاماں والحذر میری کڑک میرا جلال ٭ خوں سفاکی گرج، طوفان بربادی قتال

برچھیاں بھالے، کمانیں تیر، تلواریں کٹار ٭ برمیں، پرچم، علم، گھوڑے، نیامیں، ہشوار

آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام ٭ رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام

موت ہے خوراک میری موت پر جیتی ہوں میں ٭ سیر ہو کر گوشت کھاتی خون پیتی ہوں میں

انقلاب کا یہ نظریہ اک مزدور یا کسان کا نظریہ نہیں جس کے لئے انقلاب خوش آئند دنوں اور بے غم راتوں کا پیش خیمہ ہے، موت و دہشت خون کا منظر نہیں۔

یہی نہیں کہ جوش نے مزدور اور کسان کے تجربات اور مسائل کی ترجمانی نہیں کی بشکوہ یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے طبقے کی الجھنوں اور مسائل کو بھی بیشتر موضوع شعر نہیں بنایا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ وہ انفرادیت پسند ہیں اس لئے وہ جماعتی طور سے سوچتے ہی نہیں، انفرادی طور سے سوچتے ہیں اور جب کبھی وہ سیاسی یا جماعتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو اپنی جماعت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر سے۔ اس سے ان کے کلام میں ایک اور نظریاتی قباحت پیدا ہوگئی ہے اور وہ ہے ابنائے وطن کے لئے ان کی نفرت اور حقارت۔ ؎

اے سیہ رو بے حیا وحشی کمینے بدنما
اے جبینِ ارض کے داغ اے دنی ہندستان

اپنی اہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں
آتنا دلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے جوش

تیری شرابِ تند کو برداشت کر سکے
اس ملک میں یہ ظرف وہ قوت کہاں ہے جوش

ہم ناکسوں کی وضع جنوں کے اٹھائیں ناز
اہلِ وطن میں اتنی شرافت کہاں ہے جوش

اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے
اتنی ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوش

اپنے ملک اور اپنی قوم کو ذلیل اور اپنی ذات کو افضل اور برتر قرار دینا کسی اختراکی شریعت میں حلال نہیں۔ اس لئے کہ ایک اشتراکی اپنی ذلت یا برتری، اپنی یاس و امید کو اپنے ملک، اپنی جماعت یا اپنے طبقے سے الگ بھی نہیں کرتا۔

اس ساری بحث سے یہ مراد نہیں کہ جوش کا انقلابی یا ترقی پسند کلام نظریاتی اعتبار سے بالکل ناقابلِ اعتنا ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ انکی نظریات میں جو کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں وہ مستقل اور ناقابلِ اصلاح ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے دس پندرہ برس میں، ان کی شاعری میں تعلّی اور تبرّا دونوں بہت کم ہوگئے ہیں۔ ایک حد تک وہ محض اپنی ذات کی ترجمانی کرنے کے بجائے کبھی کبھی جملہ نوعِ انسان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں مثلاً اب اگر وہ یہ کہیں ؎

مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

تو ان سے ان کی مراد شبیر حسن جوش نہیں ہے بلکہ ہر آدم زاد انسان ہے۔ اسی طرح بغاوت اور انقلاب کے متعلق بھی ان کے تصورات زیادہ خوشگوار اور کم ہولناک ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی جماعتی زندگی کی کوئی نہ کوئی صحیح اور واضح تصویر بھی دکھائی دے جاتی ہے ؎

حوصلے سرنگوں امیدیں شل
آرزو داغِ یاس سے بوجھل

نشہ بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف گرتی ہوئی سی ایک دیوار

ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

اس کے علاوہ ان کی کامیاب ترقی پسند (بدقسمتی سے ہمارے ہاں انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب میں فرق نہیں کیا جاتا۔ تمام کامیاب انقلابی ادب ترقی پسند ضرور ہوگا۔ لیکن ہر ترقی پسند تحریر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں) نظموں کا ذکر ابھی میں نے نہیں کیا، اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ایسی نظمیں ان کے کلام میں مفقود ہیں یہ نظمیں عام طور سے دو تین مضامین کے متعلق ہیں۔ ایک وہ نظمیں جن میں کبھی جوش اپنی زبان سے اور کبھی انسان کی زبان سے ان راحتوں اور لذتوں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں ان گنت صدیوں کا جبر و ظلم و ستم برباد نہیں کر سکتے ؎

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے وہی ہر دو نشاں کیا کہنا

کب سے ہے ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا

لرزش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

زہد کے کوئے ہلاکت میں بھی ہیں گرم خرام
زلف بردوش ہیں سیما لفاں کیا کہنا

دوسرے اسی سے ملتی جلتی وہ نظمیں جس میں رسمی عقائد و اخلاق کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ تیسرے وہ وطنی یا قومی نظمیں ہیں جن میں غم و غصہ یا نفرت و حقارت کی بجائے وطن یا اہلِ وطن سے شاعر نے اپنی محبت یا ہمدردی کا اظہار کیا ہے ؎

مگر راتوں کو جب گردِ وطن میں سر جھکاتا ہوں ÷ فضائے تیرہ میں دھیمی سی ایک آواز پاتا ہوں
یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے ÷ صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے
فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال جنبانی ÷ برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی
یہ مشرق محو ہے صبح تجلی زار ہونے میں ÷ یہ سطحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

ابھی تک ہم نے صرف جوش کے کلام کے نظریاتی پہلو کا ذکر کیا ہے ان کے کلام سے افادی اثرات کا جائزہ نہیں لیا۔ افادی اعتبار سے جوش کے کلام کی قدر و قیمت میں کلام نہیں۔ کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرأت اور دلیری چاہتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں، اس احتجاج کی وقعت مختلف وجوہات کے سبب اور بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں کہ جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اور انھیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اگر ان میں سے بہت سے ناکام اور بے رنگ نقالی کی حد سے آگے نہیں گذر سکے تو اس کی ذمہ داری ان کے اپنے کندھوں پر ہے۔ جو گنتی کے چند ایک لکھنے والے ہمارے نئے ادب میں تھوڑا بہت اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھیں جوش کی رفاقت اور گرمیٔ گفتار سے یقیناً اعانت اور امداد ملی ہے۔

***

علوئے ہمت

ثاقب لکھنوی

تلاطم خیز طوفانِ بلا ہے ۔۔۔ مرے دل کا سفینہ ڈوبتا ہے
تموجِ بحر کا اللہ اکبر ۔۔۔ عجب پُر ہول منظر رونما ہے
نگل لینے کو منہ کھولے ہیں موجیں ۔۔۔ جسے دیکھو۔ وہی اک اژدہا ہے
معاذ اللہ بھنور پڑتا ہے جس جا ۔۔۔ سمجھتا ہوں یہی گھر موت کا ہے
اچھلتے ہیں وہ ہیبتناک مینڈھے ۔۔۔ کہ ملاحوں کا جی چھوٹا ہوا ہے
ہراس و بیم میں ہے خود معلم ۔۔۔ مری کشتی۔ ترا حافظ خدا ہے
کھڑی ہو ہو کے صف بستہ ہیں موجیں ۔۔۔ بڑے غارت گروں کا سامنا ہے
وہ بادِ تند کا اندازِ رفتار ۔۔۔ قیامت خیز جس کی ہر ادا ہے
یہ ہے کشتی کا سطحِ آب پر حال ۔۔۔ کہ جیسے کوئی جھولا جھولتا ہے
وہ چیرہ دست موجوں کے تھپیڑے ۔۔۔ پیاپے جن کا جاری سلسلا ہے
پہاڑ اٹھتے ہیں پانی کے فلک سر ۔۔۔ ہوا کا زور بھی حد سے سوا ہے
گرا وہ بادباں۔ ٹوٹا وہ مستول ۔۔۔ وہ بیڑا بائیں جانب جھک چلا ہے
اٹھا سکتا نہیں لنگر کے جھٹکے ۔۔۔ سفینہ مائلِ تحت الثرےٰ ہے
چڑھائی کا ہے پھر سامان تیار ۔۔۔ وہ پھر موجوں کا ایک ریلا ہوا ہے
وہ پھر پانی نے کشتی کو ابھارا ۔۔۔ وہ پھر طوفان نے دھاوا کیا ہے
صدائے الفراق آتی ہے پیہم ۔۔۔ جدا تختے سے تختہ ہو رہا ہے
کہاں ہیں آج میرے عافیت خواہ ۔۔۔ خدا حافظ کہیں وقتِ دعا ہے
نفس کی آمد و شد میں بھی ہے فرق ۔۔۔ دلِ مایوس جینے سے خفا ہے
طبیعت غرقِ دریائے تفکر ۔۔۔ سرِ شوریدہ زانو پر دھرا ہے
نہ کھانے سے نہ پینے سے مجھے کام ۔۔۔ مرا خونِ جگر میری غذا ہے

مطلع

نہ ہمدم ہے۔ نہ کوئی ہمنوا ہے ۔۔۔ بس اک میں اور اک ذاتِ خدا ہے
عیادت کو وہ آئی نامرادی ۔۔۔ وہ جھک کر یاس نے مجرا کیا ہے
اسی عالم میں دیکھی اک تجلی ۔۔۔ کہ جیسے شب کو تارا ٹوٹتا ہے
یکایک آئی اک دھیمی سی آواز ۔۔۔ ارے سوتا ہے تو یا جاگتا ہے
نظر چہرے پہ جب ڈالی تو دیکھا ۔۔۔ کہ شانِ ایزدی جلوہ نما ہے
وہی کافر، وہی ظالم، وہی شوخ ۔۔۔ وہی بت جس پہ میرا دل فدا ہے
بدلجوئی ہے مجھ سے یوں مخاطب ۔۔۔ بتا کس درد کا لب پر گلا ہے
ذرا دل میں نہیں تابِ تحمل ۔۔۔ یہ تیرا ظرف ہے یہ حوصلا ہے
کہا میں نے مریضِ جاں بلب ہوں ۔۔۔ کہا اس وقت تو خاصہ بھلا ہے
کہا تیرا کرم ہے شاملِ حال ۔۔۔ کہا یوں کیوں نہ کہہ "فضلِ خدا ہے"
کہا بیتاب ہوں دردِ جگر سے ۔۔۔ کہا یہ وہم بیشک لا دوا ہے
کہا ہر دم لہو روتی ہیں آنکھیں ۔۔۔ کہا ہنس کر یہی ان کی سزا ہے
کہا میں نے پڑے ہیں دل میں ناسور ۔۔۔ کہا چھتا یہ شہدِ عشق کا ہے
کہا کچھ بھی مری پروا ہے تجھ کو ۔۔۔ کہا اس کو ترا دل جانتا ہے
کہا راہِ محبت میں ہوں بدنام ۔۔۔ کہا چپ کذب ہے یہ افترا ہے
کہا وصلِ تمنا سے ہوں محروم ۔۔۔ کہا ہر مدعا، صبر آزما ہے
کہا میں نے کہ میں ہوں دل سے مجبور ۔۔۔ کہا اس میں کسی کی کیا خطا ہے
کہا کچھ تو دکھا شانِ ترحم ۔۔۔ کہا دل رحم سے ناآشنا ہے
کہا میں نے کہ آخر جان دیدوں ۔۔۔ کہا پھر کیا علاج اس کے سوا ہے
حقیقت کو سمجھ اے دشمنِ عقل ۔۔۔ کہ راحت رنج و محنت کا صلا ہے
نہیں یارائے ضبطِ غم جو دل میں ۔۔۔ تو دعوئے محبت ناروا ہے
دلیلِ پستیٔ ہمت جہاں میں ۔۔۔ کسی مشکل کو مشکل جاننا ہے
یہی ہے باعثِ ادبار و نکبت ۔۔۔ یہی ناکامیابی کی بنا ہے
کھپا دی ہے جنہوں نے عشق میں جان ۔۔۔ انہیں کو گوہرِ مقصد ملا ہے
اسی کی مشکلیں ہوتی ہیں آساں ۔۔۔ جو دامنگیر استقلال کا ہے
رہِ الفت میں وصلِ شاہدِ حسن ۔۔۔ شہیدانِ وفا کا خوں بہا ہے
بشر کو چاہیئے ہمت نہ ہارے ۔۔۔ یہی اربابِ دانش نے کہا ہے
یہی بامِ ترقی کا ہے زینہ ۔۔۔ یہی فتح و ظفر کا راستا ہے

یہی ہے مایۂ نازِ ارجمندی
یہی مشکل، یہی مشکل کشا ہے

اشارات — حباؔ لکھنوی

پھولوں کی طرف ان کی قطاروں کی طرف دیکھ
جھکے ہوئے سرشار نظاروں کی طرف دیکھ

ہے کشمکشِ عشق کی ہر گام پہ دعوت
بہکی ہوئی بدمست بہاروں کی طرف دیکھ

کندن کی طرح نکھری ہوئی چاندنی راتیں
بکھرے ہوئے مدہوش ستاروں کی طرف دیکھ

یہ صحنِ چمن کرمکِ شب تاب کی پرواز
اڑتے ہوئے بیچین شراروں کی طرف دیکھ

گذری ہوئی الفت کی جو کچھ یاد دلائیں
بہتے ہوئے دریا کے کناروں کی طرف دیکھ

بستی ہے یہاں ایک خیالات کی دنیا
چشموں کے لپکتے ہوئے دھاروں کی طرف دیکھ

یہ گردشِ گردوں کا دھڑکتا ہوا سینہ
کچھ مادرِ گیتی کے فشاروں کی طرف دیکھ

کچھ خاک کے روندے ہوئے ذروں پہ نظر کر
عالم کے جو رنگین مناروں کی طرف دیکھ

دنیا یہ اگرچہ طرب انگیز ہے لیکن
بھولے سے کبھی درد کے ماروں کی طرف دیکھ

کہتا تھا حباؔ صبح کا ٹوٹا ہوا تارا
کچھ تو بھی مشیّت کے اشاروں کی طرف دیکھ

تفکّرات — صفیہ بیگم شمیم

کب تک رہوں سرگشتہ و آلام رسیدہ
آ صورتِ تعبیر میں اے خوابِ ندیدہ

آجا کہ ہے اب دامنِ امید دریدہ
بے مہریٔ احباب سے ہے قسمت کشیدہ

پھر سائے میں کاکل کے چمک اے رخِ رنگیں
پھر ابر کی چھاؤں میں تڑپ برقِ رمیدہ

یہ موجِ تبسم یہ جبینِ عرق آلود
گویا سرِ شبنم اثرِ صبح دمیدہ

بے چین ہیں دل، منتظرِ دید ہیں نظریں
ظلمات کے پردے سے نکل حسنِ رسیدہ

روشن ہے تری یاد سے فانوسِ تخیّل
اے جلوۂ صد رنگ، چراغِ دل و دیدہ

بس اک نگہِ مہر جمالِ چمن افروز
ہر پھول ہے گلشن میں گریبان دریدہ

اے شدتِ اندوہ ٹھہر، دیکھ کہ دل سی
ہونے ہی پہ ہے رشتۂ احساس بریدہ

اب کشمکشِ یاس ہے بس یاد ہے اتنا
دیکھا تھا کبھی ہم نے بھی اک خوابِ دمیدہ

ممکن ہو تو اب پردۂ اسرار اٹھا دے
اے غنچۂ مستور، شمیمِ نشنیدہ

پیٹ کا راز

[illegible]

مسعود حسن

آج بھی پڑھئے کل بھی پڑھئے

شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی جانشین حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کی لکھی ہوئی دو سو کتابوں میں سے چند کتابوں کا حال ناظرین سالنامہ آجکل دہلی کی معلومات کے لئے بطور اشتہار کے شائع کیا جاتا ہے۔ راقم علی بن حسن نظامی ایڈیٹر اخبار منادی دہلی

تاریخ انقلاب دہلی ۱۸۵۷ء

اس کتاب کے بارہ حصے چھپ چکے ہیں۔ اور یہ تاریخ خواجہ صاحب کی سب کتابوں سے بہت زیادہ مقبول ہے۔ اس کے پہلے حصے بیگمات کے آنسو کے تیرہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں بارہ حصوں کی مجموعی قیمت تیرہ روپے آٹھ آنے (۱۳؍۸)

تاریخ سلاطین عباسیہ

اس کتاب کے دو حصے ہیں جن میں عباسیہ خاندان کے سب بادشاہوں کا تاریخی تذکرہ لکھا گیا ہے۔ ہر قسم کی تاریخی معلومات اس کتاب میں ہے۔
قیمت ہر دو حصہ دو روپے آٹھ آنے

شہنشاہ جہانگیر کا روزنامچہ

تزک جہانگیری کے پہلے حصے کا ترجمہ خواجہ صاحب نے اس کتاب میں شائع کیا ہے
قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

کربلا کا تاریخی حال

اس کتاب میں واقعات کربلا کی تاریخی کیفیت درج کی گئی ہے۔ جذبات اور اعتقادات کا دخل اس کتاب کے مندرجات میں نہیں ہے۔ اور نئی چیز یہ ہے کہ یزید کی تصویر اور شمر کی تصویر اور حضرت امام حسینؓ کے قاتل کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ قیمت آٹھ آنے

سی پارہ دل

خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو بی اے کے کورس میں داخل ہے۔ اور جس میں مذہبی سیاسی ادبی مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ اور جو بہت زیادہ مقبول کتاب ہے۔ سات ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ کامیابی کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں خواجہ صاحب کی تاریخی اور علمی ریڈیو تقریریں جمع کی گئی ہیں۔ پہلے حصے کی قیمت دو روپے دوسرے حصے کامیابی کی قیمت عہ

سفرنامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز

سنہ ۱۹۱۱ء میں حضرت خواجہ صاحب نے مصر اور فلسطین اور شام اور حجاز کا سفر کیا تھا۔ اور ہر مقام کی جزئیات کو قلم بند کیا تھا۔ مشاہیر کے مزارات پر خود دعائیں انہوں نے مانگی تھیں وہ اس سفرنامے کی جان ہیں۔ ہر مقام کی عکسی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت ڈھائی روپے بہت کم رکھا گیا ہے اس واسطے شائقین تین روپے کو خریدتے ہیں۔ (سے؍)

ہندو مسلمانوں کی آخری لڑائی

یہ کتاب آجکل کے زمانے میں ہر ہندو مسلمان کے پڑھنے کے قابل ہے۔ کیونکہ اس میں دو سو برس پہلے کی اس لڑائی کا حال لکھا گیا ہے جو ہندو مسلمانوں میں پانی پت کے میدان میں ہوئی تھی اور اس وقت بھی ہندوستان کی وہی حالت تھی جو آجکل ہے۔ قیمت مجلد بارہ آنے

سفرنامہ افغانستان

غازی نادر شاہ شہید بادشاہ افغانستان کے زمانے میں خواجہ صاحب نے افغانستان کا سفر کیا تھا اور افغانستان کے ایسے مکمل حالات اس سفرنامے میں درج کئے تھے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو معلوم نہ تھے افغانستان کے شہروں، قصبوں اور دیہات تک کی مردم شماری، ہتھیار شماری، گھوڑا شماری بکری شماری اس سفرنامے میں موجود ہے اور اہم مقامات کے نقشے بھی دئے ہیں اور عکسی تصویریں بھی۔ قیمت مجلد

تاریخ فرعون

اس میں مصر کے تمام فرعونی خاندانوں کی بادشاہی کا مفصل بیان ہے اور عکسی تصویریں بھی ہیں اور قصویریں اور کتبوں اور دوسرے آثار قدیمہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ ہندو قوم کی برہمن ذات فرعون ہیرتی سر کی اولاد ہے۔ قیمت مجلد تین روپے (سے؍)

طمانچہ برخسار یزید

یہ کتاب اگرچہ تاریخی نہیں ہے بلکہ محض ڈرامہ ہے۔ لیکن اکثر واقعات تاریخ سے لئے گئے ہیں۔ یزید اور اس کے خاندان کے اندرونی اور خانگی نامعلوم حالات اس کتاب میں خواجہ صاحب نے لکھے ہیں۔ یہ ڈرامہ دہلی کے شیعہ حضرات نے اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ کئی بار چھپ چکی ہے قیمت عہ

نظامی بنسری

یہ پانچسو صفحے کی مجلد کتاب خواجہ صاحب نے اس وقت لکھی تھی جبکہ ان کی آنکھوں کا اپریشن ہوا تھا اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کتاب میں ترک اور افغان بادشاہوں کے تاریخی حالات ہیں۔ اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا۔ اور ... مفصل تاریخی ...

میلاد نامہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے وفات تک کے تاریخی حالات اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں اور اس کے دوسرے حصے محرم نامے میں آنحضرتؐ کی وفات کے وقت سے کربلا کے واقعے تک کے تاریخی حالات درج کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے کی قیمت عہ دوسرے حصے کی قیمت عہ

بہادر شاہ کا حُقّہ

تیموری سلطنت کے آخری بادشاہ سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کی نسبت تاریخ انقلاب دہلی کے بارہ حصوں میں میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور جب بہادر شاہ رنگون میں قید ہوئے اور ان کا آخر وقت آیا اسوقت کی ایک تصویر بھی میں نے شائع کی تھی۔ اور یہ تصویر مجھے دلی کے لال قلعے کے میوزیم سے ملی تھی۔ جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس تصویر میں بہادر شاہ چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں سکرات میں مبتلا ہیں۔ ناک کا بانسہ ڈہل گیا ہے اور ان کے منہ کے پاس حقے کی نے نظر آتی ہے۔ اور پلنگ کے نیچے حقہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

مگر جب میں نے یہ تصویر قلعے سے حاصل کی تو چونکہ بہت مدہم تھی اس واسطے دہلی کے ایک نامور مصوّر سے اس کو اُجلوایا۔ مصوّر دہلی کے ایک پُر جوش مسلمان تھے انھوں نے اس حقّے کو بادشاہ کے پلنگ کے پاس سے ہٹا دیا۔ اور جب میں نے اس پر اعتراض کیا کہ انھوں نے تصویر کی اصلیت خراب کر دی۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ میری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ بہادر شاہ جیسے ولی صفت بادشاہ کی موت کے وقت حقّہ جیسی مکروہ چیز ان کے چہرے کے پاس ہو۔

بہر حال میں نے وہ تصویر تاریخ انقلاب میں بھی اور اخباروں میں بھی شائع کرائی۔ مگر بہادر شاہ کا دمساز حقّہ اس میں نہ رہا۔

میں نے "شاہی حلال خور" نام کے ڈرامے میں بہادر شاہ بادشاہ کے محل کے خاکروب اماّمی کے بیٹے جینداؔ کا قصہ لکھا ہے جو بہت خوبصورت بھی تھا اور بہت خوش آواز بھی تھا اور استاد ذوقؔ کا شاگرد بھی تھا اور جینداؔ تخلص کرتا تھا۔ ایک دفعہ استاد ذوقؔ نے بادشاہ سے کہا "جینداؔ اگرچہ حلال خور کا لڑکا ہے لیکن تعلیم و تربیت اچھی پائی ہے۔ خوب شعر کہتا ہے اور بڑے درد انگیز انداز سے غزل پڑھتا ہے"۔ بادشاہ خاموش ہو گئے۔ لیکن دوسرے دن حکیم احسن اللہ خان صاحب نے کہا: "میں نے اماّمی کے جینداؔ کی غزل خوانی کا حال سنا ہے۔ کل اس کو حاضر کیا جائے"۔ چنانچہ حکیم صاحب جینداؔ کو لے گئے۔ اسکا باپ اماّمی بھی لال مندیل باندھے ہوئے اس میں مور کا پر لگا ہوا، اپنے بیٹے کے ساتھ بادشاہ سلامت کے سامنے گیا اور ہاتھ جوڑ کر حضرت حافظؔ کے چند اشعار پڑھ کر دعائیں دیں۔ جینداؔ بھی لال مندیل باندھے ہوئے تھا۔ کانوں میں سونے کی مندریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا۔ بادشاہ مسند پر بیٹھے تھے۔ پیچوان سامنے تھا۔ انھوں نے جینداؔ کا اور اماّمی کا سلام کرنا اور آداب بجالانا دیکھا اور حکیم احسن اللہ خان صاحب کی طرف دیکھکر ہوں کہا۔ حکیم صاحب نے جینداؔ سے کہا: "ظلِّ سبحانی حکم دیتے ہیں کہ تو اپنی غزل پڑھ"۔ جینداؔ نے کھڑے کھڑے اپنی غزل پڑھی۔ بادشاہ خوش ہوئے ایک دو شالا اور سونے کے کڑے مرحمت فرمائے۔

مجھے صرف بہادر شاہ کے حقّے کا حال لکھنا تھا۔ ایک حقّہ وہ تھا۔ ایک حقّہ یہ تھا۔

بہادر شاہ کے حقّے کا شبہہ: ۵ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

کے شروع میں سید علی جوّاد صاحب افسر پلبشی پرنس چیمبر کی اہلیہ نے وفات پائی۔ میں نے خبر سنی کہ میّت علی گنج شاہ مرداں میں دفن ہوگی اسلئے میں دن کے تین بجے وہاں گیا جہاں دہلی کے شیعہ امراء دفن ہوتے تھے۔ اور بڑے بڑے شیعہ ادیب بھی جہاں مدفون ہیں۔ اس کے دروازے پر میری موٹر ٹھہری۔ دروازے کے برابر ایک ٹوٹی پھوٹی چھپّی میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اور اسکے سامنے حقّہ رکھا تھا۔ مٹی کا حقہ تھا۔ بہت میلا نیچہ تھا۔ ٹوٹی ہوئی چلم تھی۔ جسمیں آگ کا کڑیل رکھا تھا۔ اور وہ بوڑھا آنکھیں بند کئے ہوئے سنبردانوں کی ایک تسبیح پڑھ رہا تھا۔ میں نے موٹر میں بیٹھے بیٹھے غور سے اس بوڑھے کی شکل دیکھی۔ لمبی سفید ڈاڑھی۔ مونچھیں کتری ہوئی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں۔ سانولی رنگت۔ بالکل ایسا معلوم ہوا کہ بہادر شاہ بادشاہ رنگون کے قبرستان سے یہاں آگئے ہیں۔ بہادر شاہ کی اس تصویر میں جسکا ذکر ابھی میں نے لکھا اور اس بوڑھے کی صورت میں کچھ بھی فرق نہ تھا۔ مجھ پر غشی کی سی حالت طاری ہوئی اور میرے کلیجے میں ایک ہوک سی اُٹھی اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا "شہاب الدین! یہ تو بہادر شاہ ہیں"۔ شہاب الدین میرے موٹر ڈرائیور کا نام ہے۔ ان پر کچھ اثر نہیں ہوا اور انھوں نے مجھ سے کہا: "یہاں تو کوئی آدمی نظر نہیں آتا جس سے معلوم کیا جائے کہ میّت کہاں دفن ہوگی"۔ میں نے کہا: "اس بڈھے آدمی سے پوچھو شاید اسکو کچھ معلوم ہو"۔ شہاب الدین اس بڈھے کے قریب گئے اور کہا: "شاہ جی! یہاں کوئی میت آئی ہے؟" بوڑھے نے آنکھ کھولی اور غور سے شہاب الدین کو دیکھا۔ میرے کلیجے میں پھر ایک ہوک اٹھی۔ کیونکہ آنکھیں بھی بہادر شاہ کی سی تھیں۔ بڈھے نے جواب دیا:۔ "یہاں کوئی میّت نہیں آئی" اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

یہ بے نیازی، یہ بے پروائی۔ اور یہ کھنڈر اور یہ ٹوٹا ہوا حقّہ۔ اور یہ اُس بڈھے کا حال۔ اور یہ اسکا لباس۔ اور یہ اس کی بیکسی اور بے بسی۔ یقیناً نئی دنیا کے سائنس کا کوئی کرشمہ ہے۔ بہادر شاہ جی اُٹھے ہیں اور یہاں آگئے ہیں۔ میں نے شہاب الدین سے پھر کہا: "ان صاحب کا نام پوچھو۔ میں تو یہاں اکثر آتا ہوں۔ انکو پہلے کبھی نہیں دیکھا"۔ شہاب الدین نے پوچھا۔ کہا: "میرا نام فدا حسین ہے۔ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں اور کچھ دن سے یہاں آگیا ہوں"۔ یہ جواب دیکر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور میں آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر میں واپس چلا آیا۔

یقیناً صورت بادشاہ کی تھی اور یقیناً یہ حالت بھی بہادر شاہ کی آخری حالت سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اور مجھے تو شک ہی نہیں کہ یہ حقّہ تو بالکل ویسا ہی حقّہ تھا جیسا حقّہ بہادر شاہ کے پلنگ کے پاس تھا جبکہ انہوں نے اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

خواجہ حسن نظامی

غزل

نوح ناروی

مُسکرانے کی ادائیں آپ کو آنے لگیں
جس قدر منہ بند کلیاں تھیں وہ شرمانے لگیں

کیا نکل کر دل سے آہیں عرش تک جانے لگیں
عالمِ ارواح میں روحیں جو تھرّانے لگیں

ابر کے اٹھتے ہی ذوقِ بادہ نوشی بڑھ گیا
جو گریں بوندیں وہ گویا جام چھلکانے لگیں

جاؤ جاؤ میری بالیں سے کہیں تم ڈر نہ جاؤ
دیر اب مرنے میں کیا ہے ہچکیاں آنے لگیں

مِل سکے گا چین اگر دنیا میں تو مرنے کے بعد
وقت سے پہلے فضائیں کیوں بدل جانے لگیں

کیا خبر اب عشق میں ہوگا دوبارہ کیا مآل
پھر نئے سر سے امنگیں پرورش پانے لگیں

پرسشِ حالِ زبوں تو خیر تھی دشوار بات
دیکھ کر مجھ کو نگاہیں اُن کی کترانے لگیں

عمر بھر کے واسطے گھر حسرتوں کو مِل گیا
آگئیں دل میں تو اب دل سے کہاں جانے لگیں

آرزو یہ تھی کہ پیہم تیر ناز آتے مگر
وہ نگاہیں کس لئے تکلیف فرمانے لگیں

ہر طرف رنگِ بہارِ عیش و عشرت دیکھ کر
کوئے جاناں میں ہوائیں خود ہوا کھانے لگیں

تیرے رستہ بنا دو تم نکلنے کے لئے
آرزوئیں دل میں رہتے رہتے گھبرانے لگیں

کیوں قفس میں ہم کئے جائیں نہ آہِ بازگشت
پتیاں گلشن سے اُڑ اُڑ کر ادھر آنے لگیں

بن تو جانے دیں چمن میں آشیانِ عندلیب
کیوں ابھی سے بجلیاں گرنے کو لہرانے لگیں

رفتہ رفتہ حسرتوں کو ہم نے اپنا کر لیا
دل میں وہ رہنے لگیں آنے لگیں جانے لگیں

گلشنِ عالم میں شاید آگئی پھر فصلِ گُل
مے کشی کی حسرتیں توبہ سے ٹکرانے لگیں

کوچہ گردی کرتے کرتے ہوگیا جینا محال
خضر کو بھی گردشیں اب راہ پر لانے لگیں

اللہ اللہ موسمِ گل کی نشاط آرائیاں
ڈالیوں کو رقص سوجھا پتیاں گانے لگیں

وہ مکرر پوچھ بیٹھے تو بڑی حسرت کے ساتھ
داستانِ غم وفائیں میری دہرانے لگیں

آپ کی رفتار پر کیوں کر زمانہ مٹ نہ جائے
• حشر کو بھی شوخیاں قدموں سے ٹھکرانے لگیں

اپنی نظروں کے کرشمے آپ ہم سے پوچھئے
دل کسی کا بھی جہاں دیکھا یہ للچانے لگیں

ہم نے اتنا گریۂ غم کا اثر پھیلا دیا
نوحؔ کے طوفان کی موجیں بھی تھرّانے لگیں

ترکی میں صحافت

جمیل احمد

ترکی میں سب سے پہلا چھاپہ خانہ ۱۷۲۷ء میں ایک عثمانی فرمانؔ کے بعد قائم ہوا۔ لیکن اس چھاپہ خانہ کے قیام کے بہت عرصہ بعد ۱۷۹۵ء میں ترکی میں سب سے پہلا رسالہ شائع ہوا۔ یہ رسالہ فرانسیسی زبان میں تھا اور اسے ایم۔ ورمن بیک نے، جو سلطان سلیم سوم کے دربار میں وزیر تھا، جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کا نام گزٹ دی فرانس، (یعنی فرانس کا گزٹ) تھا اور یہ تھوڑے عرصے جاری رہ کر بند ہوگیا۔ آخر ۱۸۱۱ء میں فرانسیسی سفارت خانہ کی سرپرستی میں ایم۔ الکساندر بلیک نے اسپکیتور دی لا اوریان کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور بعد میں اس کا نام بدل کر کیور بردی سمرن (یعنی سمرنا کا سفیر) کر دیا گیا۔ یہ رسالہ سمرنا سے شائع ہوا تھا اور ترکی میں پہلا سیاسی رسالہ تھا۔ اس کے بعد ایک تیسرا رسالہ مانی تیورآ لوٹن (یعنی عثمانی محتسب) فرانسیسی زبان میں ایم بلیک کی ادارت میں نکلا۔ یہ رسالہ باب ہمایوں کی سرپرستی میں نکلا تھا اور آگے چل کر اس نے سرکاری حیثیت اختیار کر لی تھی۔

۴ مئی ۱۸۳۱ء میں ترکی زبان کا سب سے پہلا رسالہ 'تقویم وقائع' شائع ہوا۔ یہ رسالہ حکومت عثمانی نے جاری کیا تھا اور سلطان محمود ثانی نے ہی اس کا نام تجویز کیا تھا۔ اصل میں 'تقویم وقائع' 'مانی تیور' کا ترکی ایڈیشن تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ 'مانی تیور' میں غیر سرکاری خبریں بھی شائع ہوتی تھیں اور 'تقویم' محض سرکاری اعلانوں اور فرمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ ترکی زبان کا دوسرا اخبار ۱۸۴۰ء میں نکلا۔ اس اخبار کا نام جریدۂ حوادث' تھا اور اسے مسٹر چرچل نامی ایک شخص نے نکالا تھا۔

۱۸۶۰ء سے پہلے تک ترکی کی صحافت حکومت کے قبضہ اور اثر میں رہی۔ اس سال (یعنی ۱۸۶۰ء میں) ایک ترک فاضل شناسی نے ترجمانِ احوال، کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار نہ صرف ترکی کا پہلا غیر سرکاری رسالہ تھا بلکہ ترکی کے جدید خیال کے طبقہ کا پہلا ترجمان بھی تھا۔ اس لئے اس کا انداز پرانے پرتکلف انداز سے بالکل مختلف اور صاف اور سادہ تھا اور اس نے ترکی صحافت کو پہلے پہل سادگی اور سلاست سے آشنا کیا۔ لیکن اس اخبار سے شناسی کا تعلق صرف چھ مہینے قائم رہا۔

اس کے بعد شناسی نے 'تصویر افکار' کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۲ء میں ترکی کا نامور مصنف نامق کمال بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا اور شناسی کی وفات کے بعد ترکی کے جدید ادب کا رہنما بنا۔ زمانہ کے کثیر اور متعدد نشیب و فراز کے باوجود یہ اخبار اب تک جاری ہے اور ایک لحاظ سے اسے ترکی کا سب سے پرانا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار نے حتی الامکان اپنے کو سیاست سے الگ تھلگ رکھا اور ترکی کی معاشی ترقی اور علمی اور سائنٹفک نشوونما کا حامی رہا۔ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں کچھ عرصہ کے لئے بند ہوگیا تھا اور اس کے بعد پھر ۱۹۲۵ء تک برابر نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہوا اور دوبارہ جاری ہوا۔ یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں حکومت نے محوری قوتوں کا حامی ہونے کے الزام میں اس کی اشاعت بند کر دی۔ لیکن مارچ ۱۹۴۵ء میں نام بدل کر یہ اخبار پھر جاری ہوا اور آجکل 'تصویر' کے نام سے اچھی طرح چل رہا ہے۔

شناسی اور نامق کمال نے صحافت میں جس چیز کی ابتدا کی تھی اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور ۱۸۷۶ء میں صرف استنبول سے ۴۷ اخبار اور رسالے نکل رہے تھے۔ ان میں سے ۱۳ ترکی زبان میں تھے، ۹ یونانی میں، ۹ آرمینی میں، ۷ فرانسیسی میں، ۳ بلغاری میں، ۲ انگریزی میں، ۲ عبرانی میں اور ایک ایک جرمنی اور عربی میں۔ ۱۳ ترکی اخباروں میں سے سات روزنامے تھے، اور دو ہفتے میں دو بار نکلنے والے۔ ایک سیاسی ہفتہ وار، ایک طنزیاتی ہفتہ وار، ایک طبی ماہنامہ اور ایک مصور رسالہ۔ ان کے علاوہ عثمانیہ حکومت اپنے صوبوں کے مختلف دارالحکومتوں سے سرکاری ہفتہ وار اخبار شائع کرتی تھی۔ ترکی صحافت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی قوم کو جس میں تباہی اور بربادی کے آثار پیدا ہو رہے تھے ترقی کی راہ دکھائی اور اسی صحافت کی پیدا کی ہوئی قومی بیداری اور احساس تھا جس نے آگے چل کر ترکی میں اصلاحی اور سیاسی تحریکوں اور انقلابوں کی بنیاد ڈالی۔

اس موقع پر ایک اور اخبار کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ اس کا نام مخبر تھا اور اسے ۱۸۶۶ء میں ایک روشن خیال ترک علی سعدی نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار بہت جلد نوجوان ترک تحریک کا آرگن بن گیا اور اس لئے عثمانیہ حکومت کے دل میں شدید قسم کے اندیشہ پیدا ہونے لگے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے صحافت پر مختلف طرح کی سخت پابندیاں لگائیں اور ۱۸۶۷ء میں مخبر بند ہوگیا۔ ترقی پسند مصنف ترکی چھوڑ چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے اور وہاں سے رسالے اور اخبار نکال کر کسی نہ کسی طرح ترکی پہنچاتے رہے۔ اسی زمانہ میں نامق کمال کو بھی ترکی چھوڑ کر لندن جانا پڑا اور وہاں پہنچ کر اس نے ضیا پاشا

سالہ تبدیل کر حریت نام کا باغیانہ رسالہ نکالا۔ جب حکومت نے ان باہر جانے والوں کو معافی دینے کا اعلان کر دیا تو نامق کمال ترکی واپس آ گیا اور یہاں عبرت نکالا۔ اور اس اخبار نے ترکی کی قومی تحریک کو بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ گو عثمانیہ حکومت کی پالیسی عموماً تشدد کی پالیسی رہی ہے لیکن اس نے تراجم لکھنے والوں کو سرکاری خطابوں اور عہدوں سے سرفراز کیا ہے۔ نامق کمال کو بھی ایک مرتبہ گلی پولی کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا لیکن اس نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۸۷۳ء میں جب اس کا لکھا ہوا ڈرامہ وطن استنبول میں اسٹیج کیا گیا تو حکومت نے اسے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا جہاں وہ سلطان مراد پنجم کے مختصر عہد میں ترکی واپس آیا۔ سلطان عبدالحمید دوئم کے اقتدار کے بعد تشدد کا ایک نیا دور شروع ہوا اور صحافت کو اس زمانہ میں بڑا نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ نوجوان ترکوں کی تحریک کامیاب ہوئی اور جولائی ۱۹۰۸ء میں قوت اور اقتدار ترقی پسند جماعت کے ہاتھ میں آ گیا۔ ملک میں آئینی حکومت قائم ہوئی اور صحافت میں پھر ایک نیا جوش و خروش پیدا ہوا۔ اس حد تک کہ جن اخبار کی قیمت ایک آنہ تھی وہ دو دو روپے میں بکے، اس لئے کہ اخباروں کی تعداد کم تھی اور لوگ خبروں کے بھوکے تھے۔ ملک میں اخباروں اور رسالوں کا ایک سیلاب آ گیا اور وکیلوں، ڈاکٹروں، طالب علموں، دوا فروشوں، سرکاری ملازموں، غرض کہ ہر پیشہ کے لوگوں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ جذباتی جوش نے بعض اوقات بغاوت کی شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ آئینی حکومت کو بھی صحافت پر کچھ پابندیاں لگانے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن ان میں سے اکثر اخبار یا تو اس لئے بند ہو گئے کہ چلانے والوں کو اس کام کا تجربہ نہ تھا اور یا اس لئے کہ انہیں خریدار نہیں ملے۔

۱۹۰۹ء میں آئینی حکومت کے خلاف ایک زبردست بغاوت شروع ہوئی۔ سلطان عبدالحمید دوم کو تخت سے اترنا پڑا اور ملک میں تشدد کی پالیسی پر عمل شروع ہو گیا اور جو اخبار آئینی حکومت کے خلاف تھے ان پر سختیاں کی گئیں۔

اس انتشار اور کشمکش کے زمانہ میں کچھ ایڈیٹروں کو قتل بھی کر دیا گیا۔ ٹریپولی اور بلقان کی جنگوں نے اس انتشار کو اور بھی بڑھا دیا۔ صحافت کے لئے بھی یہ زمانہ بہت برا تھا۔ اور ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحافت نے سیاست کا میدان چھوڑ کر آرٹ اور سائنس کو اپنا لیا۔

۱۹۱۱ء میں صحافت کی طرف سے لوگوں میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ لوگوں نے اب خبر رسانی کو ایک باعزت پیشہ سمجھنا شروع کر دیا اور اخباروں میں اب تنقید اور نکتہ چینی کے بجائے خبروں پر زیادہ زور دیا جانے لگا پھر بھی اس پیشہ کی مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی کسی اخبار کے چیف ایڈیٹر کو بھی ساٹھ ڈالر یا ڈیڑھ سو روپے مہینہ سے زیادہ نہیں ملتے تھے۔ تجربہ کار ایڈیٹر کی تنخواہ ۴۵ ڈالر، مترجم کی تنخواہ ۲۵ ڈالر، اور رپورٹروں اور نامہ نگاروں کی تنخواہیں دس ڈالر سے لیکر ۳۰ ڈالر مہینہ تک ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس دور نے ترکی میں بہت سے نامور صحافت نگار پیدا ہوئے، مثلاً توفیق فکرت، گوک الپ ضیا اور نامق کمال۔

۱۹۱۳ء میں ترکی میں ۶ روزنامے، ۳ مزاحیہ چار روزہ اخبار، چار مصور ماہنامے، چار مذہبی ہفتہ وار، پانچ زراعتی رسالے، پانچ فوجی اور بحری رسالے، سات سائنٹفک رسالے، ۱۳ طالب علموں اور بچوں کے رسالے اور دو عورتوں کے ہفتہ وار رسالے تھے۔ ان کے علاوہ حکومت کے مختلف محکموں کی طرف سے ایک روزنامہ اور آٹھ ہفتہ وار اخبار بھی شائع ہوتے تھے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہوئی کہ غیر ملکی زبانوں میں جو رسالے اور اخبار چھپتے تھے ان کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ فارسی میں البتہ ایک نیا رسالہ جاری ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے ساتھ ساتھ نہ صرف کچھ نئے صحافتی قانون آئے بلکہ فوجی احتساب بھی شروع ہو گیا اور اس سے صحافت کی ترقی میں ایک عارضی سی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ کاغذ کی کمی کی وجہ سے ۱۹۱۸ء میں پریس ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی اور اسے ترکی جمہوریہ نے ۱۹۲۱ء کی بغاوت کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور ترقی دی۔ قسطنطنیہ کی حکومت نے ایسی مجبوری دور میں صحافت پر بے حد سختیاں کیں لیکن

غزل

حاصل زیست گناہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یعنی گستاخ نگاہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

دل مرحوم کی نا قابل بخشش تقصیر
چند بے ساختہ آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

خالق حسن ہے وارفتگی دیدۂ شوق
جلوہ خود میری نگاہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

کون اب طالب منزل کو بتائے کہ یہاں
کھوئی کھوئی ہوئی راہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

پائیگا کیا غم دنیا کہ متاع دل زار
مسکراتی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

منزلیں ذوق عمل کے لئے گمراہی ہیں
جستجو اصل میں راہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

بربط قلب شکستہ کو نہ چھیڑو ہادی
اس میں خاموش کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

عبدالہادی قادری

لیکن اناطولیہ کی حکومت کے زیر سایہ اناطولیہ میں قومی صحافت نے بعد ترقی کی۔

ترکی جمہوریہ کے قیام کے بعد دوسری قومی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ترکی صحافت میں بھی بے حد خوشگوار انقلابات ہوئے اور اس کے بعد سے اب تک وہ برابر ترقی کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ پرانی حکومت صحافت کو ایک ایسا شر سمجھتی تھی جس سے چھٹکارہ ممکن نہ تھا لیکن جمہوریہ نے اسے نئی ترکی کی تعمیر اور لوگوں میں نئی حکومت کی طرف سے خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرنے کا اہم ذریعہ بنایا۔ صحافت کی طرف بے حد توجہ کی گئی اور حکومت نے اس کی مدد کو اپنا فرض سمجھا، سوائے ان اخباروں کے جن کا انداز رجعت پسندانہ تھا۔ خود صحافت نے بھی بڑی خوبی سے وہ فرائض انجام دئے جن کی اس سے توقع تھی اور ایک نئے اور مستحکم ترکی کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا۔

آج کل صحافت آزاد ہے اور جمہوری انداز پر چل رہی ہے اور ترکی کی قومی پالیسی کی زبردست حامی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں صحافت کے قوانین نے کچھ پابندیاں ضرور لگا دی تھیں لیکن اب وہ پابندیاں اٹھالی گئی ہیں۔ اور صحافت کو چلانے اور اس کی رہنمائی کرنے کا کام دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ حکومت کی طرف سے پریس اور پبلسٹی کا ڈائرکٹر جنرل ہے، جس کا الحاق وزیر اعظم کے دفتر سے ہے۔ ڈائرکٹر جنرل کا شعبہ صحافت کی سرگرمیوں کی نگرانی اور احتساب کرتا ہے۔ اس شعبہ کے موجودہ افسر اعلیٰ ندیم وصل الکن ہیں۔

خود صحافت کے مفاد کی نگرانی ترکی صحافت کی ایسوسی ایشن کرتی ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے پانچ حلقے ہیں اور ان حلقوں میں متعدد دفتر ہیں جو صحافت کے کام میں آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ ایسوسی ایشن سالانہ اجلاس کرتی رہتی ہے۔ اس کے موجودہ صدر فالح رفقی آتے ہیں، جو الوس کے مشہور و معروف ایڈیٹر ہیں اور جو ۱۹۴۲ء کے آخر میں ترکی صحافتی وفد کے صدر ہو کر ہندوستان آئے تھے۔

آجکل ترکی میں ایک سو سینتیس اخبار اور ۲۰۶ رسالے نکل رہے ہیں۔ صحافت اور علمی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز استنبول ہے اور اکثر رسالے اور اخبار یہیں سے شائع ہوتے ہیں۔ ان رسالوں اور اخباروں میں سے بہت سے الگ الگ لوگوں کی ملکیت ہیں۔ لیکن زیادہ تر تعلیمی رسالے خلق ایولری (یعنی ایوانات عوام یا تمدنی مرکز) سے شائع ہوتے ہیں اور بہت سے مختلف موضوعوں کے رسالے حکومت کے مختلف محکموں کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔

ترکی کا سب سے بڑا اخبار اُلوس (یعنی قبیلہ) ہے جو انقرہ سے نکلتا ہے اور جس کی اشاعت چالیس ہزار روزانہ ہے۔ یہ اخبار جمہوری پارٹی کا آرگن ہے اور اس کی حیثیت نیم سرکاری سی ہے۔ اس کی ابتدا ترکی انقلاب کے خاتمہ پر، ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو حکومت ملیہ کے نام سے ہوئی تھی یہ حکومت انقرہ کا خاص ترجمان تھا۔

استنبول سے جو ۳۰ روزنامے شائع ہوتے ہیں ان میں سے دو نیم سرکاری اخبار، آقشام (شام) اور جمہوریت زیادہ بڑے اور مقتدر ہیں۔ آقشام کے مدیر نجم الدین صادق ہیں اور اس کی روزانہ اشاعت بیس ہزار ہے۔ جمہوریت کو انقلاب کے کچھ عرصہ بعد یونس نادی نے شروع کیا تھا جن کا انتقال پچھلے سال ہوا ہے۔ اس اخبار کا نقطۂ نظر سخت قسم کا قومی نقطۂ نظر ہے اور اس کی اشاعت ۲۵ ہزار سے ۴۰ ہزار روزانہ تک ہے۔

صبح کے روزناموں میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

ینی صباح (صبح نو) م ۔ ا ۔ ع سراج اوغلو کی ادارت میں نکلتا ہے اور اس کی اشاعت ۱۳ ہزار سے ۱۵ ہزار روزانہ تک ہے۔ وقت جس کی ادارت مشہور اہل قلم حسین شہید یالچین کرتے ہیں ۴۰۰۰۰ نکلتا ہے۔ تان، ایک یساری اخبار ہے، جس کے مالک اور مدیر سرتل خاندان کے لوگ ہیں، جنہوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تصویر (پرانا تصویر افکار) زیادا ابو ضیا کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے اور کسی زمانہ میں اس کی اشاعت ۷۰۰۰۰ تھی۔ وطن (جس کی اشاعت سات سے لے کر آٹھ ہزار تک ہے) کی ادارت تجربہ کار صحافت نگار احمد امین یالمان کے ہاتھ میں ہے۔ ۱۹۴۲ء میں تان اور تصویر افکار کے ساتھ ساتھ اسے بھی بند کر دیا گیا تھا لیکن سان فرانسسکو کانفرنس سے ذرا پہلے پھر نکلنا شروع ہو گیا۔ خبر اور اقدام کی اشاعت ۶۰۰۰ ہے۔ اقدام کے مدیر عابدین داور ہیں۔ ایک نیا اخبار، جس کا نام حریت (صدائے آزاد) ہے پچھلے سال سالم نوری نے نکالنا شروع کیا ہے۔ ان کے علاوہ ضیار برسس، بر ملیق نام کا ایک تجارتی روزنامہ نکالتے ہیں۔

شام کے اخباروں میں سے سون پوستہ کی اشاعت ۱۶۰۰۰ ہے ان سون دقیقہ کی ۱۸۰۰۰، گیجہ پوستاسی کی ۱۴۰۰۰ اور سون تلگراف کی تقریباً ۷۰۰۰ ہے اور شام کے اخباروں میں یہی اخبار زیادہ مشہور ہیں۔

ان اخباروں کے علاوہ تین اخبار یونانی ہیں، دو ارمنی اور تین فرانسیسی میں شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سائنٹفک، کلچرل، ٹکنکل، قانونی، تجارتی، اقتصادی اور کھیل کود کے موضوعوں اور معاملات

باقی صفحہ ۹۹ پر

"آج تو ہم بھی قائل ہو گئے" رفی بھائی نے پیار سے
کر کہا۔

"رفی بھائی؟" پروین نے تھکی ہوئی مسکراہٹ سے پوچھا۔
"جسیم تعریف کر رہا تھا....."

"جی؟" اور نہ جانے کیسے برش غلط چل گیا " اوئے"
یہ تو عورت کی فطری خامی ہے.... بس کوئی تعریف
تو ارے اترا ہٹ کے.... "

پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا پروین جھینپ سی گئی۔
ناس کر دیا نا اچھی خاصی تصویر کا۔ اب اگر جسیم دیکھے
کہ....."

"کہاں دیکھ لی جسیم صاحب نے.....؟" بظاہر
ہی سے پوچھا۔

"آج صبح وہ آیا تھا نا....."

"اوہ" پروین نے سوچا کہ کاش میں آج کالج نہ گئی ہوتی۔
"تو میں نے سوچا کہ لاؤ تمہارے نگار خانے کی سیر کرا دوں"
"تو پھر کیا کہا انھوں نے؟"

"کہنے لگا کہ ان کا مستقبل شاندار ہوگا....... اور
ان کے انتخاب کی داد دے رہا تھا"

"جیسے ان کی رائے تو بڑی اہمیت رکھتی ہے" بات
ٹالنے کے خیال سے کہا۔

"یہ مت کہنا پروین.... اسکا معیار نظر بلند ہے"

اور جب رفی بھائی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے
کہیں غائب ہو گئے تو پروین نے برش رکھ کر تصویر
ناقدانہ نگاہ سے دیکھا "جسیم صاحب نے میرے شاندار
مستقبل کی پیشینگوئی کی ہے"

اور پھر وہ آرام کرسی پر لیٹ کے سوچنے لگی کہ جسیم ہے
کیا.....

اس نے کبھی رفی بھائی سے جسیم کے متعلق کرید کرنا
چاہا تھا۔ ایسے کسی اور کی بات ہوتی تو وہ ہزار سوال
کر ڈالتی، کون ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، عادت کیسی
ہے، صورت کیسی ہے، سیرت کیسی ہے۔ پر جانے کیا
بات تھی کہ جسیم کا نام آیا اور وہ الجھ کر رہ گئی.... رفی
بھائی کے بیانات نے جسیم کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا...

دُور دیس کا رہنے والا

افسانہ

تسنیم سلیم چھتاری

دنیا کی ہر خوبی اس میں موجود ہے اور ہر موضوع سے وہ مکمل
واقفیت رکھتا ہے۔

"کوئی بیمار ہو جائے تو جسیم اسے صحت مند کر سکتا ہے"
پروین نے سوچا کہ ڈاکٹر ہوگا۔

"کوئی الجھن میں ہو تو جسیم اسے صحیح رائے دے سکتا ہے"
شاید وکیل ہوگا۔

"جسیم صورت دیکھ کر انسان کا کیرکٹر بتا سکتا ہے"
ممکن ہے نجومی ہو۔

"جسیم کا اعتراض ہمیشہ ٹھوس اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے"
تو پھر نقاد کہا جائے گا۔

"جسیم کا کردار نوزائیدہ بچے کی طرح معصوم ہے" تو یقینی
فرشتہ ہے۔

اسی طرح مختلف اوقات میں رفی بھائی کے متفرق بیانات
سے جسیم ایک معمہ بن گیا تھا۔ اور ایک دن جب رفی بھائی
کہنے لگے کہ جسیم کو گانے میں کمال حاصل ہے تو پروین نے
اکتا کر کہہ دیا کہ "آپ کا دوست بھی اِسی ہوگا" اور رفی بھائی
ناخوش ہو گئے۔

یہ عجیب و غریب قیاس آرائیاں تو وہ کسی نئی بات کو
سن کر ہی کرتی تھی مگر اور بھی بہت سی باتیں تھیں جو دن
رات دماغ میں آنکھ مچولی کھیلا کرتیں.... یہ انسان
جس میں کائنات کی ہر اچھائی نے جنم لیا آخر کون سے
دیس کا باسی ہے.......

رفی بھائی کہتے ہیں کہ جسیم
کی رنگت بالکل سرخ
سفید ہے" تو کیا وہ کشمیری ہے؟

"اسکی آنکھوں میں انتہائی کشش ہے" تو شاید
بنگالی ہوگا۔

"اسکا جسم انتہائی خوبصورت ہے" ہو سکتا ہے پنجابی ہو
"اسکی طبیعت میں انتہائی نفاست ہے" تو پھر یورپین ہوگا۔
"وہ انتہائی نڈر اور بہادر ہے" تب تو کوئی
پشاوری خان ہے.....

بسا اوقات وہ سوچتے سوچتے ہنسنے لگتی ہے..
... اسکا انسان ہونا ہی مشکوک ہے.... رفی بھائی کا
دوست ہے یا معجون مرکب جس میں ہر مرض کی دوا گھوٹ
دی جائے۔ ہر صفت انتہائی!

اگر انسان ہے تو پھر وہ انسان جسے اللہ پاک نے
اپنے ہاتھوں سے بطور ماڈل بنایا ہوگا۔ اور پھر فرشتوں نے
ہماری سب کی غلط سلط نقلیں کر کے رکھ دی ہونگی.....
ورنہ جسے سچ مچ انسان کہنا چاہئے تو وہ جسیم ہے.....
مصیبت یہ کہ اسے دیکھنے کی کوئی شکل نہیں
نکلتی .... پہلے سال سے کہ اکثر یہاں آتا تھا۔
پھر جب سے میں کی ہوں تب کل سے تین چار دفعہ آیا ہوگا اور
ہمیشہ ایسے موقع پر کہ میں گھر سے غائب ہوتی ہوں۔ کچھ مجھ سے
ضد تو نہیں.... آج تو میرے نگار خانے کا بھی جائزہ لے ڈالا۔

اس سے پہلے ایک دن.... رفی بھائی کہہ رہے تھے۔
جسیم نے تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا لفافہ دیکھ کر کہا "بھئی
رفی پروین صاحبہ کی تحریر تم سے تو کہیں بہتر ہے"

اور رفی بھائی نے اس بات کو بلا عذر مان لیا.....
جسیم نے کہا ہے نا! ورنہ اس سے پہلے یہی بات لاکھ دفعہ
پروین نے کہی تھی مگر رفی بھائی اعتراف نہ کرتے تھے۔

رفی بھائی کے ان گنت دوست بکھرے پڑے ہیں۔
کچھ شاعر و ادیب ہیں، کچھ مسخرے اور ظریف، سب دن رات
یہیں پر جمے رہتے ہیں اور پان سگریٹ پھونک پھونک کر
ناطقہ بند کر دیا ہے۔ ایک جسیم صاحب ہیں کہ ادھر کا رخ
ہی نہیں کرتے.... اور رفی بھائی روز سائیکل گھسیٹتے
ان کے یہاں چل دیتے ہیں۔

ایک دن پروین نے رکتے رکتے کہہ دیا.. "بہت
مغرور ہیں آپ کے جسیم صاحب"۔

"نہیں تو یہ کس نے کہا؟" رفی بھائی سائیکل میں ہوا
بھرتے بھرتے رک گئے۔

"ظاہر ہے! وہ آپ سے ملنے کبھی نہیں آتے اور آپ روز حاضری بجا لاتے ہیں۔"

"مصروف آدمی ہے... میری طرح بیکار تو نہیں...."

"لاکھ کوئی مصروف ہو... مجھے تو اپنی منہ لگے اگر میری کوئی سہیلی... ؟"

"خیر خیر... ہم تمہاری طرح نازک مزاج نہیں ہیں۔" رفی بھائی اطمینان سے چلے گئے۔

دوسرے ہی دن شام کو رفی بھائی نے ڈرائنگ روم میں سے شور مچایا "ارے کوئی جلدی سے چائے بنا کر بھیجو.... بھئی پروین کہاں اونگھ رہی ہو۔ جسیم کے لئے چائے بنواؤ۔"

"اور پروین اسی طرح چونکی جیسے پہلے اونگھ ہی رہی تھی.... کیا جسیم آئے ہیں...."

نوکر سے پوچھا "کیا رفی بھائی کے پاس کوئی مہمان بیٹھا ہے ؟"

"ہاں جسیم میاں آئے ہیں۔"

ارے سچ مچ.... تو پھر دیکھا جائے.... اب سوال یہ ہے کہ سیدھی طرح کمرے میں جا کر دیکھا جائے یا کہیں سے جھانک کر... میرا خیال ہے کہ اول جھانکنا مناسب ہوگا

پروین کو ڈرائنگ روم میں جھانکنے کے لئے بڑی اچھی اور محفوظ جگہ کا علم تھا۔ گذشتہ دنوں جب رفی بھائی کے لئے دلہن کی تلاش شروع ہوئی تو ایک رشتہ دار لڑکی کو بلا کر رفی بھائی کو بڑے اہتمام سے چوری چوری دکھایا گیا تھا اور انہوں نے بڑی دیر تک جھانکنے کے بعد ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ کہتے تھے کہ لڑکی پلک بہت جھپکاتی ہے۔ خیر وہ بات تو آئی گئی ہو گئی۔ مگر یہ روزن دریچہ پروین کے دماغ میں موجود تھا اور آج اسکا مصرف بھی نکل آیا۔

جب ننگے پاؤں سانس روک کر پروین بند کواڑوں کے پاس پہنچی تو اسکا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور سوراخ سے آنکھ چپکاتے ہوئے پروین نے سوچا کہ کہیں یہ دھک دھک کی آواز اندر پہنچ کے بات نہ کھو لدے....

جسیم بالکل ہی سامنے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی پروین نے دیکھا وہ مارے حیرت کے اچھل پڑی... پھر آنکھیں مل کر جھانکا...... خدا سمجھے رفی بھائی کو۔ اول تو ان کو ہمیشہ جھوٹ بولنے میں مہارت ہے اور کسی کو بیوقوف بنا کے بہت خوش ہوتے ہیں مگر اس دفعہ کو حد کر دی۔ یہی وہ جسیم ہے جس کے حسن کا چرچا ہو رہا تھا اور جس کو وہ یوسف ثانی بتاتے تھے.... یہ کالی رنگت یہ نیش عقرب جیسی مونچھیں اور یہ پچکے ہوئے گال.... اور اس پہ منحنی آواز طرفہ قیامت تھی جسیم صاحب کہہ رہے تھے "آپ کا شکوہ بجا ہے رفی صاحب.... مگر آپ جانتے ہیں کہ مجھے فرصت نہیں ملتی..... اوّل تو آجکل جوتوں کی بکری بہت کم ہے، پھر میرا کوئی ساتھی نہیں۔ اگر دکان بند کر کے آجاؤں تو ایک پیسے کی آمدنی نہ ہو.... کل آپ نے جو طعنہ دیا تو میں نے سوچا کہ جس طرح بھی ہو...."

پروین کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسکے سر پہ بھاری سا بوٹ یا نوکدار اونچی ہیل جما دی ہو۔ اب بلا خوف و جھجک وہاں سے پیر پٹختی لوٹی۔ بلا سے اگر پتہ بھی چل جائے اسے کہ میں نے جھانکا ہے.... منحوس صورت کہیں کا..... اور یہ پڑھا وڑھا خاک نہیں، جوتیاں بیچتا ہے! اللہ رفی بھائی سمجھے.... ناحق میرے کئی مہینے ضائع کرائے.... بس ہر دم سوتے جاگتے یہی خیال جو دل میں رہتا تھا کہ یہ جسیم... چائے اب تک نہ پہنچی تھی.... آخر کار رفی بھائی کو اٹھ کر آنا پڑا۔

"کیا مصیبت ہے پروین.... اتنی دیر سے جسیم بیٹھا ہے اور تم نے....."

"چو لہے میں جائیں آپ کے جسیم صاحب...."

"کیوں کیوں خیر تو ہے....؟" رفی بھائی گھبرا گئے۔

"آپ نے بھی کیا پروپیگنڈا کیا تھا.... کمبخت کی بندر جیسی صورت ہے۔"

"ششش شش... آہستہ بولو..... اندھی تو نہیں... تم سے لاکھ درجہ بہتر ہے....."

"واہ میرے تو جوتی کے برابر.... اور ماں جوتوں کی دکان کرتے ہیں ماشاء اللہ...."

"ہائیں...." پھر رفی بھائی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا "تم نے شوکت کو تو نہیں دیکھ لیا....؟"

"شوکت ؟ کون شوکت ؟" پروین سٹ پٹائی۔

"ارے بھائی ایک صاحب ہیں۔ بس یوں ہی خواہ مخواہ سے.... کل مجھے راستہ میں ملے تو میں نے کہا کہ آپ یار دا کیوں نہیں آتے.... تو آج وہ اتفاق سے جسیم کے ساتھ .. خیر تم چائے بنا کر جلدی بھیجو.... شوکت چلا جائے تو پھر کو سناؤں گا کہ ہماری ہمشیرہ عزیزہ تمہیں دیکھنے سے ماشاءاللہ قاصر رفی بھائی رکتے رکتے غائب ہو گئے.... یہ نئی مصیبت کیا سوچیں گے جسیم صاحب! خیر ابھی تو یہی مسئلہ قابل غور کہ جن صاحب کو دیکھا گیا وہ جسیم تھے یا شوکت! ممکن ہے رفی بھائی نے یہ اور نئی چال چلی ہو.....

چائے بھیج کر پروین نے پھر دروازے پر آنکھ چپکائی شاید تیسرے آدمی کی آواز ہی سنائی دے کر کچھ واقعات پر روشنی ڈالے..... اتفاق سے جونہی نوکر نے میز پر ٹرے رکھی جسیم چائے بنانے کے خیال سے سامنے آ گئے.....

یہ احساس بہت پرسکون تھا کہ پانچ چھ مہینے تک جسیم کے متعلق سوچ سوچ کر وقت ضائع نہیں کیا..... اور.... رفی بھائی بھی اکثر سچی بات کہہ دیتے ہیں.... کم از کم جو کچھ انہوں نے جسیم کی صورت کے متعلق کہا وہ حرف بحرف صحیح نکلا... .... کہاں جسیم اور کہاں وہ بیچارے جوتیوں والے شوکت صاحب.... جسیم کے پاس بیٹھے کارٹون سے لگ رہے ہیں .... تب ہی تو رفی بھائی کہنے لگے کہ اندھی ہو.... تم سے تو ہزار درجہ بہتر ہے......

اور یہ ہزار درجہ بہتر والی بات نے پروین کو چونکا دیا۔ ...." میرا جسیم سے کیا مقابلہ..... میری رنگت بھی سانولی ہے اور نقش بھی خاصے بھدے ہیں کم از کم جسیم کے مقابلے میں ... بقول رفی بھائی کے تپ دق کی مریض لگتی ہوں..... جسیم میری تحریر اور مصوری کو پسند کرتے ہیں ممکن ہے اور بھی میرے متعلق بہت سی باتیں سوچی ہوں.... اور جب مجھے دیکھیں تو اسی طرح حیران رہ جائیں جیسے میں شوکت صاحب کو دیکھ کر.... پروین نے طے کر لیا کہ وہ کبھی جسیم کے سامنے نہیں آئیگی۔ ...." اچھے خاصے بد صورت مرد بھی حسین عورتوں کی تلاش میں رہتے ہیں.... پھر بھلا جسیم.... اور کہاں میں....؟"

پروین کو جسیم پہ رشک آنے لگا.... کاش وہ سچ مچ ہی

ہوکت جیسا ہوتا تو آج یہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی ۔ اب تو ساتھ
تے گھڑوں پانی پڑتا ہے۔
رنی بھائی نے شاید جسیم سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پروین تمکو معروف
سمجھتی ہے اسی لئے وہ جلد جلد آنے لگے ..... رنی بھائی
نے کہا : " پروین میں اس کاسنی پردے سے نفرت کرتا ہوں
جسیم کے آنے پر تم ادھر ادھر کیوں چھپ جاتی ہو ؟"
" تو کچھ ضروری ہے سامنے آنا۔ پھر کوئی بات ہو تب بھی!"
" میں یہ نہیں کہتا کہ ضروری ہے .... پر دیکھو نا اسے
لگ سکتا ہے کہ جب تم سب کے سامنے آتی ہو تو مخصوص طور
اسی سے .... حالانکہ وہ قابل قدر انسان ہے "
اور وہ رنی بھائی کی بات کو گول کرتی رہی .... بکھرے
مسکراتی آنکھیں بہت فقرے اور بے تحاشہ قہقہوں کی
ئی میں اس نے کو اڑ کا سہارا لیکر مہینوں گزار دیئے اور
چاپ سگرٹ کے پیچ دار دھوئیں کو تکتی رہی ... اکثر خود
کا ذکر آ جاتا۔
" تو اب کوئی نئی تصویر بن رہی ہے کیا ؟"
" اچھا تو بی۔ اسے میں فلسفہ لینے کا ارادہ ہے! بھئی رنی
تمہاری ایک نہ چلے گی !"
" میں دہلی جاؤنگا .... پروین سے پوچھ لینا! کچھ منگانا
نہیں ہے "
اور جب کوئی ایسی بات ہوتی تو دل بلّیوں اچھلنے لگتا۔ حلق
میں کانٹے پڑ جاتے اور ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ سی پھیل جاتی۔
پھر ایک دن رنی بھائی نے یہ طلسم ہی توڑ ڈالا .....
نہ پروین کو جسیم کے آنے کی خبر تھی اور نہ اپنا ہوش تھا ...
ای محویت سے رنگ گھول کر وہ پنسل سے پس منظر کا خاکہ بنا
رہی تھی اور ساتھ ہی کوئی انجان سا گیت اس کے ہونٹوں پر
مچل رہا تھا جو دفعتہً چونک پڑی .....
" معاف کیجئے گا " جسیم نے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو
ادا ہی سے جھٹکا اور بڑھ کر تصویر دیکھنے لگا " تو یہ ابھی شروع
ہے آپ نے ؟"
" جی .... جی ہاں " آواز میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی جھنجھناہٹ تھی
" یہ محض خیالی ہے یا ؟ ....."
" جی ! " اس نے خود بھی محسوس کیا کہ طرز گفتگو مضحکہ خیز ہے

" میں یہ پوچھنا چاہتا تھا " جسیم نے متانت سے کہا۔
" یہ تصویر جو آپ نے شروع کی ہے محض خیالی ہے یا آپ نے
کوئی ماڈل بھی ..... "
ماڈل کا لفظ آتے ہی پروین کو خیال آیا کہ جسیم بھی تو
انسانی شکل کے لئے ... نہیں مردانی شکل کے لئے ماڈل ہے ...
" جی .... جی بس یونہی ..... " وہ ایک ہاتھ کے
ناخن سے دوسرے ہاتھ پر لگا ہوا رنگ چھڑانے لگی .....
جسیم اس بیچارگی کو محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔
" اچھا تو یونہی .... میں آپ کے کام میں دخل انداز تو
نہیں ہو رہا ؟ .... دراصل رنی نے مجھ سے کہا کہ آپکے سامنے
والے باغ کی بڑی اچھی تصویر بنائی ہے .... پھر اس نے مجھ
سے کہا کہ میں ابھی جا کر دیکھوں ... معلوم ہوتا ہے آپ اسے
ختم کر چکیں .... "
" جی ہاں وہ تو پرسوں شام ہی .... "
" اوہ .... اچھا .... تو پھر تضیع اوقات کے لئے معافی "
پروین نے چاہا کہ جسیم کو روک کر باغ والی تصویر دکھا دے
مگر الفاظ سوچتی رہ گئی۔ اور جسیم خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ
سر کے جھٹکے سے سلام کر کے ! سر جھٹکنے کے سلسلے میں ماتھے پر بکھرے
ہوئے بالوں کو سنبھالتا ہوا چلا گیا .....
جب بھاری جوتوں کی چاپ مدھم پڑ گئی تو پروین نے رونی
صورت بنا کر کھڑکی کا سہارا لیا " یہ کیا مصیبت ہوئی اللہ " اسے
سچ مچ رونا آنے لگا " آج میرا ڈھنگ بھی تو عجیب تھا .....
بکھرے ہوئے بال اور رنگوں کے لاتعداد دھبے کپڑوں پر اپنا
اپنا منہ چڑا رہے تھے ... ایک تو یونہی .... پھر جسیم نے سوچا ہوگا
کہ پاگل ہے !"
اور برش کو غصے سے پھینک کر وہ شیشے کے سامنے جا کھڑی
ہوئی محض یہ دیکھنے کو کہ جسیم نے کیا دیکھا ۔ شیشہ میں منہ دیکھ کر
اسے دفعتہً جھٹکا سا لگا اور پھر ہنسی آ گئی ... بڑا سا لال رنگ
کا دھبہ اسکے دائیں گال سے لپٹا ہوا تھا اور ناک کی نوک پر اس نے
بے خبری میں پنسل سے کھجا کر کالا سا گول نشان بنا لیا تھا ....
" بھئی لاحول ولاقوۃ .... مصیبت آتی ہے تو پوری طرح ...
اور شاباش ہے جسیم کی ہمت کو کہ وہ ذرا نہیں ہنسا .. میں
کسی کی ایسی صورت دیکھتی تو .... ؟

اور جب اسے احساس ہوا کہ وہ خود اپنی شکل کا مذاق
اڑا رہی ہے تو اس نے جھنجھلا کر دوپٹے سے اپنا منہ رگڑ لیا اور
رنی بھائی کو گالیاں دینے لگی۔
جسیم کے چہرے پر جو لاابالی پن جوانیت تھی اسکی آنکھوں میں جو
سکون تھا اسکی باتوں میں جو ٹھیراؤ تھا وہ صاف بتا رہا
تھا کہ میں تمہیں دیکھ کر حیران نہیں ہوا۔ تم میرے تخیل سے
جدا نہیں ہو اور میں تو جانتا تھا کہ تمہارا رنگ سانولا ہے
اور تمہارے نقشے میں کوئی جاذبیت نہیں نہ تمہاری آواز میں
کوئی شیرینی ہے اور نہ تمہارے جسم میں کوئی دلکشی اگر اب
بھی میں تمہیں پسند کرتا ہوں، تمہاری قدر کرتا ہوں اور
تمہارے ان بکھرے ہوئے رنگوں میں میرے مستقبل کے
خاکے جھلک رہے ہیں ..... میں آئندہ بھی تنہائی میں صرف
تمہاری ہی بابت سوچا کرونگا .... تم جانتی ہو کہ میں ہرجائی
نہیں ہوں .....
" دیکھیں " پروین نے دل کی تسکین کا طنزیہ منہ چڑایا۔
اور دوسرے دن دیکھا تو جسیم کے وہی بے ساختہ
قہقہے ہوش و حواس کی دنیا پر مسلط تھے ....
" تو پھر کل پردہ ختم ہو گیا ؟" رنی بھائی نے پوچھا۔
پروین کا دل چاہا کہ اس ننھی سی درز میں آنکھ اور کان
بیک وقت پیوستہ ہو جائیں۔
" ہاں بھئی کل تو مجھے دیکھ کر وہ گھبرا گئیں ... بہت
ہی مصروف تھیں " جسیم نے سگرٹ سلگایا اور پروین نے
دیکھا کہ جسیم کل کی ملاقات کے خیال سے مسکرا رہا تھا۔
" ہاں پروین کو گمان نہ تھا کہ یوں دفعتہً ..... "
رنی بھائی ہنسنے لگے۔
" میری اس جرأت پر وہ ناخوش تو نہ ہونگی ؟" وہ اداس
سا ہو گیا۔
" ارے نہیں بھئی ... میں نے تو کل اسی لئے تم سے کہا
تھا کہ وہ خود تو سامنے آنے سے رہی اور مجھے بہت ہی برا
لگتا ہے ... عجیب ذہنیت ہوتی ہے ان عورتوں کی ... "
یہ رنی بھائی کا پسندیدہ فقرہ تھا جسے وہ دن میں دو چار
دفعہ ضرور استعمال کرتے۔
" کیوں ؟" جسیم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہی پردے کے معاملہ میں" رفی بھائی کو اللہ برائی کرنیکا موقعہ دے پھر دیکھئے "اب یہ مضحکہ خیز بات ہے، کہ آدھے مردوں سے پردہ جائز سمجھتی ہیں، آدھوں سے ناجائز... جہاں تک مذہبی احکام کا تعلق ہے وہاں یہ تو نہیں ہے کہ آپ گنواروں کے سامنے آئے اور مہذب لوگوں کے سامنے سے بھاگ گئے... تم نے عام طور پر تم پردہ پسند لڑکیوں کو دیکھا ہوگا کہ جتنے گندے سندے لوگ ہیں، انکے سامنے ٹھاٹ سے بیٹھی رہیں گی بلکہ وہ سب تو بقول شخصے باپ بھائی کے برابر ہوئے اور بزعم خود جانوروں سے بدتر... اور جہاں کوئی صاحب ذوق مرد دیکھا وہاں جھٹ سے پردہ ہو گئیں۔"

"بات یہ ہے رفی کہ ہماری تہذیب ہی تو ہم کو مدنظر بنا دیتی ہے! صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو گنوار لوگ ہم مہذب لوگوں کی طرح کسی عورت کو تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" رفی بھائی کو تو آج خدا مانے کا بیر تھا۔ "ہماری نگاہیں بھاری ہو چکی ہیں، ہمکو اب یہ نظارے بیگانہ حواس نہیں کر سکتے اور نہ ان میں کوئی خصوصیت ہی نظر آتی ہے۔ مگر یہ جاہل طبقہ جنکی عورتوں کو منہ دھونے تک کا ہوش نہیں ہوتا یہ رنگے ہوئے ہونٹوں کو اور بل کھائے ہوئے بالوں کو زیادہ دلچسپی سے دیکھتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ انسان ہر اجنبی چیز کو دلچسپی سے دیکھتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نگاہ میں تعریف سے زیادہ تضحیک کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ عورت کا یہ مصرف نہیں سمجھتے اور حیران ہوتے ہیں کہ گھر اور بچوں کے علاوہ عورت سوسائٹی اور سینما میں کس طرح وقت گزار سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں مطمئن نگاہوں کے بجائے متعجب نگاہیں کیوں پسند کرتی ہیں۔" رفی بھائی نے میز پر گھونسہ جمایا۔

"بھئی رفی، میں موڈرن لڑکیوں کو تو نہیں کہتا، مگر جو لڑکیاں آزادی کی واجبی خواہش کے باوجود اپنی نسوانیت کا احترام کرتی ہیں، وہ قطعی جانتی ہیں کہ جتنی جلدی ہم مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے جنسی جذبات بیدار ہو جاتے ہیں اسی قدر یہ گنوار لوگ مستقل مزاج ہوتے ہیں۔"

"یہ محض تمہارا خیال ہے۔"

"اور میں تمہیں بھی منوا کے رہوں گا۔" جسیم نے دھیمی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"اگر تم چاہوگے تو میں بھی ماننے پر مجبور ہو جاؤنگا... مگر یہ عجیب بات ہے کہ پردیں کو اس مالی سے شرم نہیں آتی جو چوری کے الزام میں دو سال کی جیل بھگت چکا ہے، مگر وہ شریف انسان کو دیکھ کر گھبرا گئی... اب یہ ہے نا...؟"

"لاحول ولا قوۃ... جسیم نے رفی بھائی کی بات کاٹی۔

"یہ تم ہمارا ذکر کیوں نکال لائے۔ یہ علیحدہ بات ہے۔"

جسیم کے ایک فقرہ نے پردیں کا پارہ اتار دیا اور تین دن تک اس کے کانوں میں یہی الفاظ گونجتے رہے "یہ تم ہمارا ذکر کیوں نکال لائے... ہمارا ذکر!"

اور چوتھے دن جب برآمدے میں جسیم نے اسے بڑے مؤدبانہ طریقہ پر سلام کیا تو وہ "جیتے رہو" کہتے کہتے رہ گئی اور سٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"آپ نے وہ تصویر ختم کر لی؟" جسیم نے سائیکل کھڑی کرکے کپڑوں کی گرد جھاڑتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

"جی نہیں وہ تو... دراصل میری طبیعت..." اور سچ مچ وہ تصویر جوں کی توں پڑی تھی۔

"کیوں خیر تو ہے؟ آپکی طبیعت..." مسکراہٹ کی جگہ تشویش نے لے لی۔

"اب تو ٹھیک ہوں" وہ پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے"... کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد... "رفی کیا کر رہا ہے؟"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں"

"کہاں گیا؟" چونک کر پوچھا

"آپ ہی کے پاس گئے تھے... ابھی آدھا گھنٹہ ہوا" پردیں کو کہتے کہتے ہنسی آگئی۔

"ارے توبہ... یہ خوب رہی" پھر ایک باتمیز بچے کی طرح سلام کرکے سائیکل اٹھائی اور جب پھاٹک کے موڑ پر ہلکے نیلے رنگ کا کوٹ بھی نظر سے اوجھل ہوگیا تو پردیں سوچنے لگی کہ سائیکل اٹھاتے وقت اسکی ٹانگیں کیوں کانپ رہی تھیں اور میری طبیعت کی خرابی کے ذکر نے اسے اتنا پریشان کیوں کر دیا تھا اور مجھ سے بات کرتے ہوئے اسکی نگاہوں میں بے اختیار مسکراہٹ کیوں تھی... اور... اور کیا اسے اپنے حسن کا احساس نہیں... پھر وہ حسن کے موضوع پر گھنٹوں سوچتی رہی۔ کیا یہ بہت ضروری شے ہے! ضروری نہ ہو مہلک تو ضرور ہے...

امتحان قریب آئے۔ حسن و عشق کا موضوع بھی پس پشت ڈال دیا اور تصویر کشی بھی پھیکی پڑ گئی اور ایک دن جب وہ تاریخ کی موٹی سی کتاب اٹھا کر گوشہ نشین ہو گئی تو رفی بھائی نے آ کر پوچھا "پردیں تمہا کوئی مضمون کمزور تو نہیں ہے؟"

"کیا مدد کیجئے گا؟"

"نہیں مجھ سے جسیم نے کہا... اسلئے پوچھتا ہوں"

"وہ کیا کریں گے؟" چونک کر پوچھا۔

"بھئی یہاں اکثر لوگوں سے اس کی جان پہچان ہے، پا پرچہ معلوم کریگا یا سفارش کر دیگا... بہرحال تم تو بتاؤ"

جسیم کے علاوہ دنیا کا کوئی انسان ہوتا پردیں یہ مدد قبول کر لیتی مگر ایسے لگا جیسے اسکی توہین ہو رہی ہے... جسیم سوچے گا کہ میں تعلیم میں کمزور ہوں ...

"رفی بھائی آپ میری طرف سے شکریہ کہہ دیجئے! فی الحال تو ہر طرف سے مطمئن ہوں"

"بیکار تکلف مت کرو... تم حساب کے بارے میں گھبرا رہی تھیں"

"نہیں اب تو سب ٹھیک ہے" حالانکہ اس پرچے کے خیال سے اسکی جان پہ بن رہی تھی۔

رفی بھائی چلے گئے تو پردیں کتاب رکھ کر سوچنے لگی کہ جسیم کو میرا کتنا خیال ہے اور پھر سارے دن پڑھنے میں جی نہ لگا۔

جسیم کا خیال اسکا اچھا راہبر تھا۔ وہ دن رات اسی فکر میں رہتی کہ ایک دفعہ جسیم پر قابلیت کا سکہ بٹھا دیا جائے اور اسی کو میں تھکن کا دم ٹوٹ جاتا... جب پردیں کے امتحانات ختم ہو تو وحشت کا یہ دیو اس کے کندھوں سے اتر کر رفی بھائی کے کندھوں پر سوار ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے امتحانات شروع ہو گئے۔

"جسیم تو" بقول رفی بھائی کے "ہر وقت مستعد رہتا ہے۔ ا مجھی کو سال بھر کی محنت ایک ساتھ کرنی پڑی"... بیکاری اور خاموشی نے پردیں کو بوکھلا دیا۔ نہ جسیم کے قہقہے تھے نہ رفی بھائی کی بکواس! البتہ دن رات چائے کے برتن کھنکتے سگرٹوں کے ٹین پر ٹین ختم ہوتے... پھر یہ مصیبت۔

"کھانا وقت پر نہیں ملا۔ ہائے ہمیں امتحان دینا ہے... چائے ابھی نہیں بنی۔ ا... ہم اس قدر محنت کر رہے ہیں ......

...ہاں شور مچاتے ہیں۔ انہیں ہمارا کام ہرج ہوتا ہے۔" الغرض امتحان
ہوا قیامت ہو گئی اور خدا خدا کرکے اس سے پیچھا چھوٹا تو ایک
اور مزیدار بات نکل آئی۔

رفی بھائی کو دفعتہً ایک عمدہ سی نوکری مل رہی تھی۔ اب اگر
اطمینان سے نوکری پر جاتے ہیں تو شادی کا قصہ سال ڈیڑھ
سال کے لئے رہ جائے گا اور جو سلیقہ سے شادی کرتے ہیں تو
نوکری نکلی جاتی ہے۔ گھر والوں کی رائے ہوئی کہ دونوں کام
ہو جانے چاہئیں اور جٹ منگنی پٹ بیاہ والی شکل بن گئی۔

اس دفعہ بیچارے رفی بھائی کو لڑکی دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔
پروین نے اکثر دیکھا تھا اسکے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسمیں کھلوائیں تب
پوچھا کہ کانی تو نہیں ہے۔ گنجی تو نہیں ہے۔ رنگ کیسا ہے
ناک کیسا ہے۔ بات کرتے میں بار بار پلک تو نہیں جھپکاتی وغیرہ
وغیرہ ایسے ہزاروں سوالات کئے تب کہیں قبولا ......

اماں جان تو کچھ ضعیف سی ہیں اور بھابی جان کو آدھی دنیا
باتوں سے گھڑی بھر کو فرصت نہیں ملتی۔ گھر کی کل ذمہ داری
اور شادی کا سارا کام پروین کے سر پڑا۔

ادھر جیسے ہی بھائی جان نے ابا مرحوم کی جگہ سنبھالی۔ فوراً
جسیم بھائی جان کے جانشین بن گئے اور بڑے زور و شور سے تیاری
شروع ہوئی۔

آدائنگی کی کپکپاہٹ اور قدموں کی ہچکچاہٹ جلد ہی افسانہ
بن گئی اور پروین کو گھنٹوں جسیم سے سر مغزی کرنی پڑتی.... مہمان
کہاں ٹھہریں گے۔ بارات میں کتنے آدمی جائیں گے اور کھانے کا کیا
انتظام رہے گا۔

یوں تو رفی بھائی زمانے بھر کے بے شرم ہیں مگر جہاں محنت کرنی
پڑے اور ساتھ ہی کہیں سے شرم کا بھی سہارا مل آئے تو وہ بڑے
ہی حیادار بن جاتے ہیں۔ اب ان کا کام اتنا تھا کہ پڑے پڑے
سب پر حکم چلائیں اور کوئی تنکا بھی توڑنے کو کہے تو شرما جائیں۔

شادی کے جھمیلے اور مہمانوں کی آؤبھگت میں جسیم اور پروین
بارہا ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو
پروین نے ان ٹکروں کی کسک محسوس کی۔

جسیم اپنے گھر جا رہا تھا.... وہ امتحانوں کے بعد ہی چلا جاتا
مگر رفی کی شادی نکل آئی.... اور اب تو کوئی مجبوری بھی نہ تھی
.... خیر.....

پروین نے پوچھا: "تو کل آپ ضرور چلے جائیں گے؟"

جسیم نے افسردہ سی مسکراہٹ سے کہا: "ہاں کل چلا جاؤں گا"

"پھر کب آئیے گا؟"

"جب آپ حکم دیں"

رفی بھائی نے کہا: "جسیم! میں نوکری پر جاتے ہی تمکو بلاؤنگا
اور تمہیں فوراً آنا پڑیگا.... میں کوئی عذر نہیں سن سکتا۔"

"میں کوئی عذر نہیں کر سکتا رفی.... میں ضرور آؤنگا۔"

اور جسیم چلا گیا.... نئی دلہن بھابی کی جھینپی جھینپی باتیں
اور لجاتی ہوئی مسکراہٹ بھی پروین کا دل نہ بہلا سکی.... وہ صبح
سے شام تک نامکمل تصاویر بناتی اور پھاڑ دیتی۔ یہاں تک کہ
جب رفی بھائی نوکری پر جانے لگے تو وہ پروین کو بھی ساتھ لے آئے
.... یہاں نئی جگہ تھی اور نیا گھر نئے نئے ملنے والے تھے اور نت نئی
باتیں مگر یہ ساری نئی اور دلفریب دلچسپیاں ایک طرف ڈال کے
وہ محض اسلئے یہاں خوش تھی کہ جسیم نے آنے کا وعدہ کیا ہے اور
وہ ضرور آئے گا......

اور جب رفی بھائی کے شدید طرح مجبور کرنے پر جسیم نے اپنی آمد کا
خط لکھا تو پروین کے دل و دماغ کا ایک ایک تار تن گیا اور بے
جانے بوجھے گیتوں کا لاوا ابل پڑا.... ہونٹوں پر چلبلی سی
مسکراہٹ اور آنکھوں میں ان دیکھے خواب بسے ہوئے ماتھے
پر بکھرے ہوئے بالوں کو جھٹک کر معصومیت سے پوچھا "ہاں
تو ابھی کیا کہا تھا آپ نے؟"

اور بڑی جلدی میں کسی کام سے آکر باتیں کرتے کرتے جھینپ
کر گریبان کے بٹن لگاتے ہوئے واپس مڑ جانا "میں ابھی آئی
.... ایک ضروری بات یاد آگئی ہے۔"

پھر ایک دفعہ رفی بھائی کی بارات والے دن......

"یہ جسیم صاحب کہاں ہیں.... توبہ.... بھئی اب میں
کسی سے پوچھوں!" وہ جھنجھلاتی ہوئی رفی بھائی کے ڈریسنگ
روم میں گھس گئی جسیم گہرے نیلے ریشم کی قمیص پہن کر آئینہ کے
سامنے اپنے سینے کی چوڑائی کا جائزہ لے رہا تھا.... پروین
رک کر دیکھنے لگی.... "کیا وہ خود کو اسی قدر اچھا لگ رہا ہے
جتنا کہ وہ درحقیقت اچھا ہے۔"

جسیم نے شانے اچکا کر آئینہ کے سامنے پہلو بدلا تو اپنے
پیچھے اسے پروین کا عکس نظر آیا.... گھبراہٹ، شرم اور
ندامت نے جو چہرہ کی رنگت بنائی وہ قابل اظہار تو کیا قابل دید
بھی نہ تھی.... اور پھر کچھ پروین نہ دیکھ سکی۔ اس نے کانوں
میں ہلکا سا ارتعاش محسوس کیا اور واپس مڑتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھابی جان پوچھ رہی تھیں کہ......"

"جی؟" جسیم نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بھابی جان پوچھتی ہیں کہ...." پروین نے رک کر
جسیم کی طرف دیکھا تو وہ سر جھکا کر جھینپی ہوئی مسکراہٹ
سے ناخون کرید رہا تھا...... پروین بات کو
ادھورا چھوڑ کر اسکا چہرہ تکنے لگی۔

"کیا پوچھتی ہیں بھابی جان؟" جسیم نے آنکھیں اٹھائیں
تو پروین کو اپنی صورت دیکھتے پایا۔ نظریں ملتے ہی پروین
وہاں سے بغیر کچھ کہے سنے بھاگ آئی اور جسیم اسی طرح
بدحواس سا کھڑا رہ گیا......

آج اتنے دن بعد پروین اس روز کا خیال کرکے مسکرا دی
اور سوچنے لگی کہ بسا اوقات معمولی سی بات کا کتنا گہرا نقش
رہ جاتا ہے آج بھی وہ شکل اسی طرح سامنے ہے.... سرخ
چہرہ اور کانپتے ہوئے لب! جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اور
نہیں کہہ پاتا......

جس رات کی سحر جسیم کو اپنے ساتھ لا رہی تھی وہ رات دلہن
بھابی سے زیادہ آہستہ خرام نکلی۔ جب صبح کے تارے نے دم توڑا
تو پروین کے اضطراب نے آنکھ کھولی اور وہ انتظار کے تاریک
گھنٹوں سے نجات پا کر صبح کے دھندلکے میں نکل آئی۔ حد نظر
تک کہر کی سفید چادر تنی ہوئی تھی اور راہیں تناور درختوں
کی طرح جو کہرے میں لپٹے ہوئے تھے پروین کی مسرت نے بھی
بے چینی کے دامن میں منہ چھپا رکھا تھا۔ جوں جوں وقت
قریب آتا جا رہا تھا اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

جب دھوئیں جیسا کہر اٹھنے لگا اور ادھر ادھر سے
زندگی کے میلے میلے آثار پھوٹ نکلے تو اس نے بالکنی میں آکر گرم
چادر علیحدہ ڈال دی اور سرد ہوا کی رنگتی ہوئی سوئیوں میں پرکیف
مسرت کو محسوس کیا.... میٹھی میٹھی خنکی تھکی مسرت! جو کہرے
کی دودھیا چادر کے مانند مبہم گہری تھی اور نازک بھی!

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں
تانا بانا سا بن گئے اور ٹھنڈ سے اسکا رواں رواں کانپنے لگا۔

اس نے اپنی کھلی ہوئی باہنوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر جھک کر پنڈلیوں کو چھوا..... سارے جسم کا رونگٹا کھڑا تھا اور برف جیسی سرد جلد کے نیچے نیلی رگیں قمقمے کے تار کی طرح لرز رہی تھیں..... پھر اس نے اپنی سرد سرد گالوں کو ہتھیلیوں کی گرمی پہنچا کر ایک انگلی سے ناک کو چھوا تو غیر موجود سا پایا.....

حیران ہو کر جب تین چار انگلیوں سے مضبوطی کے ساتھ ناک کی تلاش کی تو پتہ چلا کہ موجود ہے۔ مگر ٹھنڈ سے بے حس ہو گئی ہے۔ تب ہی دور کسی مندر کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور خواب آلود فضا نے انگڑائی لے کر آنکھیں کھول دیں.... زندگی کے نئے آثار اب ایک نئی روح لے کر بیدار ہو رہے تھے.... شاید اس لئے کہ دنیا کا یہی دستور ہے یا پھر اس لئے کہ آج جسیم آ رہا ہے.... وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی اور گنگنا کر کہا....

"آج جسیم آ رہا ہے"

مندر کی گھنٹیاں ایک ایک دوسرے سے ٹکر کھا کے پجاریوں کو پوجا کے لئے پکار رہی تھیں اور اس کا انگ انگ کوئی بے آواز ساز بجا کر اسے جی بھر کر جھومنے کے لئے بلا رہا تھا۔ اس نے دھیمے سروں میں گانا شروع کیا ؎

"ہماری عبادت تو ہے یاد ان کی
وہ معبود ہو کر ہمیں بھول جائیں"

اور اس انسانی معبود کا چہرہ حریری پردوں کے پیچھے سے جھانکنے لگا۔ اس نے تکریم کے لحاظ سے آنکھیں بند کر کے گنگنایا۔

"اسی آرزو میں بسر ہو رہی ہے
پھر اک بار تم کو کہیں دیکھ پائیں"

اور جب آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے سڑک پر مختلف سمتوں سے دو بیل گاڑیاں آ رہی تھیں اور کتوں کے غول ادھر سے ادھر مارے مارے پھر رہے تھے......

"دن نکل آیا ہے" شب بیداری کی تھکن چند انگڑائیوں میں اتارنی چاہی اور ایک بڑی سی جمائی لے کر مضمحل انداز سے کمرے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "یہ آپ سے آپ پھول کیوں اٹھ رہی ہے۔ جیسے پہلے کبھی اسے دیکھا ہی نہیں ہے" اسے اپنی دہشت پر خود خجل آ گئی اور یکسو ہو کر دل کو سمجھانے لگی۔

.... پلکوں پر کوئی بوجھ سا آ پڑا اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

پھر جب اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تو کانوں سے ایک مانوس اور مخصوص قہقہہ ٹکرا گیا۔ ساتھ ہی رنی بھائی کی آواز "پروین کہاں ہے.... کیا اس نے دوبارہ جسیم سے پردہ شروع کر دیا ہے"

دلہن بھابی پروین کو ڈھونڈتی ہوئی آ نکلیں اور جب پروین بھابی سے منہ دھونے کی اجازت مانگ رہی تھی تو رنی بھائی جسیم کو لیکر وہیں آ دھمکے "ارے پروین جسیم سے ملو"

پروین کے حواس از سر نو مختل ہو گئے اور جسیم کے چہرے پر وہی متانت تھی جو پروین نے نگار خانے والی پہلی ملاقات میں محسوس کی۔

"کہئے کیا حال ہے.... کتنی نئی تصاویر بنائیں؟"

"جی.... وہ کوئی اچھی تو نہیں.... یونہی دو ایک...."

"اچھا تو آئیے پھر چائے کے بعد دیکھیں گے" اور پروین کو بغیر منہ دھوئے ہی جسیم کے ساتھ چائے پر جانا پڑا۔

دلہن بھابی نے شادی کے بعد جسیم کو پہلی مرتبہ یہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ خاموش اور علیحدہ سی بیٹھی تھیں۔ جب رنی بھائی اپنے کام پر جانے لگے تو پروین کو ہدایت کی کہ جسیم کا مکمل خیال رکھے۔

جسیم نے فرمائش کی کہ نئی تصاویر دکھائی جائیں۔ پروین اسے اپنے کمرے میں لے آئی "دیکھئے یہ اس سامنے والے درخت کی تصویر ہے جو یہاں کھڑکی میں بیٹھ کر بنائی تھی... اور یہ بادلوں کی تصویر ہے.... اور یہ کوئی چار پانچ میل کے فاصلے پر ندی ہے۔ وہاں جا کر بنائی تھی.... اور یہ دھنک کی تصویر ہے...."

جسیم پرشوق نگاہوں سے ہر ایک تصویر کا جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ تعریف کے متعدد جملے.... "آپ نے اس دفعہ کمال ہی کر دیا ہے" پھر وہ رنگوں کے امتزاج کو سراہنے لگا "یہاں اس رنگ سے جان پڑ گئی ہے.... اور یہ کتنا نیچرل ہے"

پروین کے چہرے پر کامرانی کا رنگ جھلک رہا تھا....

آخر میں جسیم اپنے سامان کی الٹ پلٹ کر کے ایک بڑا سا ڈبہ اٹھا لایا اور پروین کے سامنے رکھ دیا....

"یہ کیا ہے جسیم صاحب؟"

"یہ ہے تو کچھ نہیں" جسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر آپ اس سے کچھ بنا سکتی ہیں"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہو کر سوچنے لگی۔

"دیکھئے، کچھ سادے کاغذ ہیں، کچھ رنگ ہیں، برش ہیں، پنسلیں ہیں اور شاید جاذب ہیں۔ آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ سب چیزیں بہت دقت سے ملتی ہیں تو میں نے سوچا کہ آپ کے لئے اٹھاتا لے چلوں"

پروین سٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

جسیم نے سگرٹ سلگاتے ہوئے اطمینان سے کہا "میرا خیال ہے کہ آپکو ان چیزوں کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے.... یہ ایسی اہم بات نہیں۔ میں دلہن بھابی کے لئے بھی ایسا ہی کچھ الم غلم لے آیا ہوں"

پروین نے سنبھل کر کہا "یہ بات نہیں ہے جسیم صاحب"

"تو پھر؟" جسیم نے چونک کر پوچھا۔

"در اصل میں سوچ رہی تھی کہ آپ نے ناحق اتنی تکلیف کی"

"اگر مجھے حق نہیں تھا اور میں نے ناحق کیا تو معذرت کا خواستگار ہوں"

پروین بالکل ہی گھبرا کر رہ گئی "ارے صاحب میں یہ تو نہیں کہتی......"

جسیم ہنسنے لگا "تو پھر یہ تکلفات اٹھائیے.... معہ اس ڈبے کے.... دیکھئے اس طویل سفر نے میرا بھیجا چاٹ دیا... مشکل سے تین دن میں یہ تھکن اترے گی"

اور جب تین دن میں جسیم کی تھکن اتر گئی تو وہ دونوں بہت سا وقت ایک ساتھ گذارنے لگے۔ جسیم رنگ پسند کرتا اور پروین تصویر بناتی۔ پروین گیت منتخب کرتی اور جسیم گاتا.... پھر اور بہت سی باتیں جو دوسرا نہ تو ایک لفظ سمجھ پائے۔ دنیا کے ہر موضوع پر بحث ہوتی.... مذہب اور سیاست پر، مصوری اور موسیقی پر، شاعری اور افسانہ نگاری پر، محبت اور شادی پر..... آخر میں دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے مل جاتے اور پھر اس کرنے کو نیا مسئلہ نکال لیتے۔

ایک دن کسی طویل گفتگو کے بعد جسیم نے کہا "دنیا میں آپ پہلی عورت ہیں جن کے خیالات سے میں اتنا متاثر ہوا ہوں"

پروین نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "اور جسیم، آپ ہی پہلے مرد ہیں جو...." وہ کہتے کہتے رک گئی.... جسیم نے

ر شرارت سے بڑا لمبا سلام کیا۔۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

پروین کا لگاؤ محبت کی حد سے گزر کر دارفتگی کے سرے چھو رہا تھا۔ جسیم کی بے مثال شخصیت نے اسے پابستہ بنا ڈالا تھا۔

"یہ وہی جسیم ہے جسے میں کبھی بھوری مرکب سمجھنے لگی تھی۔" پرانی باتیں ایک ایک کرکے یاد آئیں۔

"تو آپ کا گھر بہت دور ہے نا؟"

"بہت دور" جسیم نے بہت پر زور دے کر کہا۔

"کیسی جگہ ہے؟" پروین نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تعریف نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ ہمارے یہاں کی عورتیں بہت محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں۔ آپ ان کو ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصّہ لیتے ہوئے دیکھیں گی۔۔۔ ہمارے یہاں ہر چیز اپنے فطری رنگ میں ہوتی ہے مصنوعات کا استعمال نہیں ہوتا۔۔۔ وہاں کوئی نہیں جانتا کہ یہ پاؤڈر اور لپ اسٹک کس بلا کا نام ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔ اور وہاں کا طرزِ معاشرت کیا ہے؟"

"بالکل سادہ۔۔۔ دیہاتی۔۔۔۔ ہمارے آس پاس اور دور دور تک کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے۔۔۔ وہاں لوگ نہیں جانتے کہ بجلی کی روشنی کیسی ہوتی ہے اور سینما تھیٹر کس چیز کو کہتے ہیں۔۔۔ وہاں عمدہ مناظر کی کمی نہیں۔ پہاڑی جھرنے اور بل کھاتی ہوئی ندیاں خود رو پھولوں کے جنگل سے بھرے رہتے ہیں۔۔۔۔"

"تو کیا وہاں پر تعلیم وغیرہ نہیں ہے؟"

"وہاں صرف انسانیت کی تعلیم ہے جو ہر بچہ اپنی ماں سے حاصل کرتا ہے۔۔۔ وہاں کالج اسکول نہیں ہوتے۔۔۔ وہاں تو ریل اور موٹریں بھی نہیں ہوتیں۔۔۔ اونٹوں پر قافلے سفر کرتے ہیں۔"

"ہائے خدا!" پروین نے حسرت سے کہا۔ جسیم نے اسے بتایا کہ جب چاندنی راتوں میں پہاڑوں کے درمیان اونٹوں کے قافلے گزرتے ہیں اور ساربان اپنا مخصوص گیت گاتے ہیں تو دل کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ اور جب ریت کے جھکڑ اور تودے ہوا کے زور سے کروٹ بدلتے ہیں تو کیسا لگتا ہے اور جب اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھتی ہیں تو فضا کس قدر مسحور ہو جاتی ہے۔"

پروین نے کہا "آپ لیلےٰ مجنوں والے نجد میں تو نہیں رہتے؟"

جسیم نے جواب دیا "نہیں لیلےٰ مجنوں والے نجد میں تو نہیں رہتا مگر ایسی پائدار محبت کی ہمارے یہاں بھی بہت مثالیں ملیں گی۔"

"میں ایسی جگہ جانا چاہتی ہوں" پروین نے مضطرب ہو کر کہا۔

"میری بھی زبردست خواہش ہے کہ آپ وہاں آئیں۔"

پروین نے سوچا کہ اگر تم بھی یہی چاہتے ہو تو میں کیوں نہ آؤں گی۔۔۔ تم چاہو گے تو میں بخوشی اپنی ساری زندگی انہی تپتے صحراؤں میں گزار دوں گی۔

جسیم نے کہا "نہ وہاں آپ کسی کو روپیہ کی ہیضہ میں مبتلا دیکھیں گی اور نہ ذہنی افلاس میں گرفتار پائیں گی۔ وہاں مشقت سے کماتے ہیں اور محبت سے کھاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کسی کی حق تلفی گناہِ عظیم ہے۔ اور محبت کے معاملے میں لوگ جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔"

"میں وہاں ضرور جاؤں گی" پروین نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"میں آپکو وہاں ضرور بلاؤں گا" جسیم نے ہنس کر جواب دیا۔

"بہت لمبا سفر ہے" پروین نے خیالات کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔ اوّل تو ریل وغیرہ ہی سے بمشکل جانا ہوتی ہے اور پھر دو دن پیدل چلنا پڑتا ہے۔۔۔ مگر لطف بہت آتا ہے۔"

پروین کو اب جسیم سے زیادہ اس کے دیس سے عشق ہو گیا۔ دن بھر جسیم سے ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھتی اور رات بھر چاندنی راتوں میں اونٹوں کے قافلے اسکے خوابوں کی دنیا پر چھائے رہتے۔ یہاں تک کہ جسیم نے واپس جانے کا مسئلہ اٹھایا "اب ہم دیس نہیں جا سکتے" یہ پروین کا خیال تھا اور رفی بھائی کے الفاظ۔۔۔۔ مگر قوتِ ارادی اور قوتِ الفاظی دونوں کو ہفتہ بھر میں پسپا ہونا پڑا۔ جسیم نے پروین سے کہا "اگر مجھے مجبوری نہ ہوتی تو زندگی بھر آپ لوگوں کے ساتھ باتیں کرکے گزار دیتا۔"

"ایسی کیا مجبوری ہے آپکو۔۔۔۔ اتنی دور چلے جائیں گے پھر جانے کب ملاقات ہو۔"

"یہ نہ کہیئے ہم انشاءاللہ بہت جلد ملیں گے۔۔۔۔ میں نے رفی سے باتیں کر لی ہیں۔"

"کیا؟" پروین نے چونک کر پوچھا۔

"ہیں کچھ باتیں۔۔۔۔" جسیم نے ہنستے ہوئے کہا "یہ مت بھولیے گا کہ آپ کو وہاں آنا ہے۔"

پروین ان الفاظ کے پھندے میں پڑ کر رہ گئی۔۔۔ جسیم نے جاتے جاتے بھی ایک لفظ منہ سے نہیں کہا۔ مگر اشاروں اشاروں میں جو کچھ بتا دیا تھا وہ پروین کے لئے بہت تھا۔

رخصت ہونے سے پہلے جسیم نے پروین کو تصویر کشی کے متعلق مشورے دئے۔ اتنے دن تک ساتھ رہنے پر اظہارِ مسرت کیا، رخصت کا افسوس ظاہر کیا۔ اپنے گھر آنے کا پختہ وعدہ لیا اور پھر چلا گیا۔

جسیم کے جانے سے پروین کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ اب اسکو پہلی سی الجھن نہیں تھی بلکہ زندگی میں ایک بیتاب سا سکون پیدا ہو گیا تھا۔ جسیم کی جدائی سے مضطرب بھی رہتی اور اس کی محبت کے خیال سے مطمئن بھی۔

اب اسکے خیالات کی پرواز جسیم کے دیس میں مقید ہو گئی تھی جسیم کے لائے ہوئے تصویر کشی کے سامان سے وہ جسیم کی باتوں کو شکل جامہ پہنایا کرتی۔۔ صحراؤں میں رینگتے ہوئے اونٹوں کی قطاریں ان کے گلے میں بندھی ہوئی نقرئی گھنٹیاں، کجاووں میں سر سراتے ہوئے رنگین لباس اور جاسوس کی تنہا پرچھائیاں۔۔۔۔

پروین نے لاکھوں مکمل اور نامکمل تصاویر کے ڈھیر لگا دئے۔۔

اسی طرح بہت سے دن گزرنے کے بعد ایک دن رفی بھائی یہ شور مچاتے آئے "پروین پروین۔۔۔ جسیم کے گھر چلو گی۔۔۔۔؟"

"ایں" پروین نے متعجب ہو کر برش رکھ دیا۔۔۔ رفی بھائی ایک طویل سا خط ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"چلتی ہو جسیم کے گھر؟"

"یہ کیا سوجھی آپ کو۔۔۔؟" پروین اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ اسکا خط آیا ہے۔۔ تمہیں تو خاص طور پر بلایا ہے لکھا ہے کہ پروین کو میرا دیس دیکھنے کا بہت ارمان ہے۔۔۔۔"

"کوئی بات بھی ہو یا بس یونہی۔۔۔" پروین بوکھلا سی گئی۔

"ارے اسکی شادی ہے۔۔۔ غریب پانچ سال سے جس لڑکی کے لئے پریشان تھا اب خدا خدا کر کے۔۔۔ بہت اصرار سے بلایا ہے۔۔۔ سنو لکھا ہے کہ۔۔۔۔"

رفی بھائی سارا خط سنانے پر مصر تھے اور پروین کا احساس و خیال، دل و دماغ سب کسی دور دیس کے باسی سے پوچھنے لگے تھے کہ "تم نے جان بوجھ کر دھوکا دیا یا میں ہی غلط سمجھتی رہی۔۔۔۔"

کانوں میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں اور ہوا کے جھونکے سے صحرا کا سارا ریت اسکی آنکھوں میں پڑ گیا۔۔۔۔ ٭

دل کی تربیت

بھگوان گوتم بدھ کے "دھم پد" کا منظوم ترجمہ

بے حد چنچل ہوتا ہے دل — اس کا ٹھہرانا ہے مشکل
ہے مشہور شرارت اس کی — ہے دشوار حفاظت اس کی
بس میں لانا سہل نہیں کچھ — قابو پانا سہل نہیں کچھ
ہوتا ہے جو شخص خرد ور — آجاتا ہے غالب اس پر
کر لیتا ہے تیر کو سیدھا — جیسے تیر بنانے والا

پانی کا ہے جو بھی مخزن — ہوتا ہے مچھلی کا مسکن
آتی ہے جب اس سے باہر — دے دیتی ہے جان تڑپ کر
ویسے ہی پھنس کر دام ہوس میں — ہو کر ظالم کام کے بس میں
اس سے پھر باہر آنے کو — فوراً چھٹکارا پانے کو
ہر تکلیف سہا کرتا ہے — دل بیتاب رہا کرتا ہے

ہاتھ آتا ہے اس کا مشکل — ہے رفتار میں تیز بہت دل
حرکت ہوتی ہی رہتی ہے — دنیا ہرجائی کہتی ہے
دل بس میں آجائے تو اچھا — اس پہ بشر چھا جائے تو اچھا
اس پر قابو پا جانے سے — اس کو راہ پہ لے آنے سے
غم سے فراغت مل جاتی ہے — ان کی دولت مل جاتی ہے

اس پہ نظر رکھنا مشکل ہے — اس کی خبر رکھنا مشکل ہے
اس کی چالاکی ہے ظاہر — دل کی بے باکی ہے ظاہر
رہتا ہے ہر دم آوارہ — کرتا ہے حیراں ناکارہ
دانا اس پر قابو پا لے — بربادی سے اس کو بچا لے
بس میں جب آجاتا ہے دل — بے حد سکھ پہنچاتا ہے دل

بھٹکا بھٹکا رہنے والا — اپنی رو میں بہنے والا
حد سے باہر جانے والا — کوڑی دور کی لانے والا
شکل نہیں ہے اس کی کوئی — دل کا راز ہے سب سے مخفی
اس کو جو بس میں لائیں گے — اس پر جو قابو پائیں گے
کام کے پھندوں سے چھوٹیں گے — مکتی کی دولت لوٹیں گے

صاف نہیں ہے باطن جن کا — قلب نہیں ہے ساکن جن کا
جو ست دھرم سے ناواقف ہے — اچھے کرم سے ناواقف ہے
آگاہی کا نام نہیں ہے — نیکی سے کچھ کام نہیں ہے
رہتا ہے جو افسردہ سا — جس کا دل ہے پژمردہ سا
اس کا جہل نہیں جا سکتا — اس کو ہوش نہیں آ سکتا

جس کے دل میں میل نہیں ہے — آب و گل میں میل نہیں ہے
جس کا دل یک جا رہتا ہے — مرکز پر ٹھہرا رہتا ہے
عیب و ہنر سے بالا ہے جو — خیر و شر سے بالا ہے جو
جو بیدار ضمیر انساں ہے — دانا اور خبیر انساں ہے
اس کا دل ناپاک نہیں ہے — اس کو کوئی باک نہیں ہے

جسم نہیں یہ - ایک گھڑا ہے — ہر صورت سے اس کو فنا ہے
مرکز ساری سرگرمی کا — دل کیا ہے اک شہر ہے گویا
عرفاں کا ہتھیار چلائیں — نفس دنی کو مار گرائیں
ایسا کچھ بے بس ہو جائے — ہرگز سر نہ اٹھانے پائے
پھر بھی رکھئے دل کی حفاظت — رغبت ہو نہ کسی سے نفرت

بے وقعت ہے جسم خاکی — ہے یہ اک تصویر فنا کی
اس کا جادو کھل کے رہے گا — حیف یہ چولا گھل کے رہے گا
ہو جائے گا یہ ناکارہ — کر لے گی جب روح کنارہ
مٹی پانی کی یہ مورت — بے مصرف لکڑی کی صورت
کام نہ پھر کچھ بھی آئے گی — فرش زمیں پر گر جائے گی

دشمن خواہ کوئی ہو کتنا — تنگ نہیں کرتا وہ اتنا
ہو کیسا ہی تیرہ باطن — اتنی ایذا دے ناممکن
جتنا ظلم وہ دل ڈھاتا ہے — جو بد مسلک ہو جاتا ہے
چال چلن جس کا گندہ ہے — گمراہی جس کا دھندہ ہے
جان کا دشمن بن جاتا ہے — بے حد نقصاں پہنچاتا ہے

دل جو ہے راہ نیک کا سالک — دنیا کے اوصاف کا مالک
جتنی بھلائی وہ کرتا ہے — عقدہ کشائی وہ کرتا ہے
چاہے باپ ہو چاہے ماں ہو — کیسا ہی کوئی عزیز جاں ہو
کوئی نہیں ہے دل پر فائق — دل سے ہے بہبود خلائق
دل ہی سے ہے شکل افادہ — کون ہے محسن دل سے زیادہ

منور لکھنوی

منزلِ عشق

ڈرامہ

افراد ڈراما

۱ ——— فیض
۲ ——— ثریا
۳ ——— حمید
۴۔ ریلوے گارڈ۔ پھیری والے۔ قلی۔ مسافرین وغیرہ

گاڑی اسٹیشن سے چھوٹنے کو ہے۔ مسافر سوار ہو رہے ہیں۔ دوڑ دھوپ گڑ بڑ۔ شور پکار۔۔۔

ثریا:۔ (پلیٹ فارم پر ایک ڈبہ کے آگے) یہیں یہیں۔ اسی ڈبہ میں

فیض:۔ ارے یہ سیکنڈ کلاس ہے ــ سنا نہیں۔ او قلی کے بچے! ابے سیکنڈ کلاس ہے (قلی ڈبہ کا دروازہ کھول کر سامان رکھنے لگتا ہے) ــ اور ہاں ذرا سن تو سہی، مردانہ ڈبہ ہے یہ۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ہوتا ــ جانور کی طرح منہ اٹھایا اور گھس گیا (قلی نے سارا سامان ڈبہ میں رکھدیا)

ثریا:۔ (ڈاک گنتی ہے) ایک دو ــ تین ــ چار۔ ہاں سب ٹھیک ہے۔ یہ لو چار آنہ۔ اب جاؤ ــ

فیض:۔ (کھنکارتے ہوئے) شاید آپ کو قلی نے ـــــ

ثریا:۔ جی نہیں قلی نے غلط ڈبہ میں نہیں بٹھایا بلکہ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ اس ڈبہ میں سامان رکھے۔ کیونکہ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے اور اس کے سوا میں مردانہ ڈبہ ہی میں سفر کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ زنانہ ڈبہ میں بالکل جگہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ میں کھڑے کھڑے سفر کرنا مناسب نہیں سمجھتی ــ مگر معاف کیجئے کیا آپ کو میری وجہ سے کوئی تکلیف ہوئی؟

فیض:۔ تکلیف؟ جی نہیں۔ تکلیف کاہے کی، بلکہ تنہائی سے میں خود بھی اکتا سا گیا تھا۔ دیکھئے نا پچھلے چار گھنٹوں سے اکیلا سفر کر رہا تھا۔ اخبارات پڑھتے پڑھتے تھک گیا۔ اشتہارات تک کو دو، دو چار چار مرتبہ پڑھ گیا۔ بات کرنے کو ترستی تھی زبان میری۔ ایسے میں آپ ــ

ثریا:۔ (بات کاٹ کر) میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ بن کر آئی ــ کیوں یہی کہہ رہے تھے نا آپ؟

فیض:۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک۔

ثریا:۔ لیکن یہ آپ بار بار کیا زنجیر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا زنجیر کھینچنے کا ارادہ ہے۔ یقیناً میری موجودگی آپ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے۔

فیض:۔ نہیں نہیں یہ بات نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی موجودگی تو میرے لئے دلچسپی کا باعث ہو رہی ہے۔

ثریا:۔ جی ہاں یہ تو آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن مجھے تو یہ ایک رسمی تکلف اور زبانی جمع خرچ معلوم ہو رہا ہے۔

فیض:۔ کیوں یہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟

ثریا:۔ آپ کی پریشان پریشان نظریں صاف بتا رہی ہیں بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ آپ میری موجودگی سے اتنے خائف ہیں، یا تنگ آ چکے ہیں کہ زنجیر کھینچ کر گاڑی رکوانا چاہتے ہیں ــ مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مردانے ڈبہ میں کسی عورت کا سفر کرنا قانونی جرم ہے ایسا ہو آپ زنجیر کھینچ کر گاڑی رکوائیں اور مجھے گارڈ کے حوالہ کر دیں۔

فیض:۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ــ

ثریا:۔ (بات کاٹ کر) غلط فہمی کی گنجائش کہاں صاحب؟ ممکن ہے آپ سمجھتے ہوں کہ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ نہیں ہے اور اس کے باوجود بھی میں یہاں گھس آئی ہوں ــ دیکھئے نا، پھر آپ زنجیر کی طرف دیکھ رہے ہیں ــ آخر آپ کا مطلب کیا ہے ایک شریف عورت کو اس طرح تنگ کرنے سے؟

فیض:۔ (پریشان ہو کر لکنت آمیز لہجہ میں) ارے توبہ ــ آپ ــ آپ تو بگڑ گئیں ــ میں، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے آپ سے نہ نفرت ہے اور نہ میں آپ کی شکایت ریلوے والوں سے کرنا چاہتا ہوں ــ

ثریا:۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ مگر پھر یہ زنجیر کھینچنے کی فکر کیوں؟

فیض:۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا ہاتھ زنجیر تک نہ جائے گا۔

ثریا:۔ تو کیا بغیر ہاتھ لگائے زنجیر خود بخود کھنچے گی؟ اوہو آپ تو بڑے شعبدہ باز معلوم ہوتے ہیں۔ ہے تو سہی دلچسپ چیز لیکن جناب من، اس کا حرجانہ پچاس روپے کون ادا کرے گا۔ میں اس تماشہ کو اتنی قیمت پر دیکھنا پسند نہیں کرتی لیکن یہ اور بات ہے کہ آپ اپنی روحانی قوت آزمانے کے لئے یہ معاوضہ زیادہ نہ سمجھیں۔

فیض:۔ آپ فکرمند نہ ہوں میری روحانی قوت اتنی گراں نہیں پڑتی۔

ثریا:۔ یعنی؟

فیض:۔ یعنی یہ کہ گاڑی نہیں رکے گی۔

ثریا:۔ خوب! تو پھر آپ زنجیر کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں؟

فیض:۔ میں اپنی خوشی سے زنجیر کی طرف دیکھ نہیں رہا بلکہ آپ نے مجبور کیا۔

ثریا:۔ آپ کی حرکتوں سے زیادہ آپ کی گفتگو دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔

فیض:۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کی موجودگی میرے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی اور میں زنجیر کی طرف کم سے کم دیکھوں گا لیکن

بادشاہ حسین رضوی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

ثریا: — آپ کی گفتگو چیستاں معلوم ہوتی ہے۔

فیض: — (ایک آہ سرد کھینچ کر) ہونہہ — چیستاں! کاش ایسا ہو سکتا کہ آپ میرا مذاق اڑانے کی بجائے میری مدد فرما سکیں۔

ثریا: — اوہو تو کیا آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟ فرمائیے فرمائیے میں حاضر ہوں — یا لعجب اللہ اکبر —

فیض: — (بات کاٹ کر) دیکھئے دیکھئے پھر آپ طنز فرما رہی ہیں۔

ثریا: — کیا خوب؟ کیا اپنے نصیب پر فخر کرنا بھی دوسرے کے لئے طنز ہو سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو میرے طنز سے زیادہ اپنے حسد سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔

فیض: — خیر جانے دیجئے، اگر آپ میری مدد نہیں کرنا چاہتیں تو طعنہ تو نہ سنائیے۔

ثریا: — معاف کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی — میں آپ کی مدد کرنا سعادت سمجھتی ہوں مگر آپ کچھ بتلائیے بھی تو سہی کہ میرے لائق کیا خدمت ہے؟

فیض: — (خوشی سے) واقعی؟ واقعی؟ کیا آپ سچے دل سے فرما رہی ہیں کہ آپ میری مدد کرنا چاہتی ہیں؟

ثریا: — ہاں صاحب ہاں آپ بلا وجہ شک و شبہ کر رہے ہیں۔

فیض: — تو پھر میں آپ کو اپنی حقیقی الجھن بتاؤں — سنئے — آں آں — کیا آپ اپنا اسم گرامی بتا سکتی ہیں؟ —

ثریا: — کیوں نہیں مجھے ثریا کہتے ہیں — اور آپ کو؟

فیض: — میرا نام فیض محمد ہے — ہاں تو مس ثریا — حقیقت یہ ہے کہ مجھے نہ جانے کب سے یہ خواہش بے چین کر رہی ہے کہ کبھی نہ کبھی کم از کم ایک آدھ مرتبہ ضرور زنجیر کھینچ کر ریل روکنی چاہئے۔ سالہا سال سے میری یہ آرزو شرمندۂ تکمیل نہیں ہوئی۔ خصوصاً جب میں ریل میں ہوتا ہوں تو یہ خواہش انتہائی درجہ تک بڑھ جاتی ہے جب کبھی زنجیر پر نظر پڑتی ہے تو دیوانہ سا ہو جاتا ہوں اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ فوراً زنجیر کھینچ کر اپنی تشفی کر لوں مگر پھر پچاس روپے جرمانہ ادا کرنے کا جب خیال آتا ہے تو انتہائی ضبط سے کام لیتا ہوں۔

ثریا: — عجیب و غریب خواہش ہے آپ کی — زنجیر کھینچ کر ریل روکنے کی خواہش — میں نے تو اب تک ایسی عجیب و غریب لیکن انتہائی دلچسپ خواہش کسی سے نہیں سنی —

فیض: — (بات کاٹ کر) دیکھئے آپ پھر مذاق پر اتر آئیں۔ حالانکہ آپ نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔

ثریا: — بے شک میں حاضر ہوں لیکن اس خواہش کی تکمیل میں میں کس طرح مدد کر سکتی ہوں۔

فیض: — آپ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ثریا: — یعنی؟

فیض: — یعنی یہ کہ میں زنجیر کھینچ کر ریل بھی روکوں اور جرمانہ بھی نہ ادا کروں۔

ثریا: — اچھا یہ بات ہے — فی الحال آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتی ہوں شاید کسی قابل ہو۔ ایک دوست ہیں ہمارے مرزا صاحب نرالی وضع کے بزرگ ہیں۔ ایک دن انکے ہاں دعوت تھی۔ نوکر نہ معلوم نیند میں تھا یا کسی سوچ میں پانی کا گلاس لئے کھڑا اونگھ رہا تھا کہ گلاس ہاتھ سے چھوٹا اور فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا — میری طرف دیکھئے فیض صاحب! — کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مرزا صاحب نے نوکر کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟

فیض: — یا تو خوب پیٹا ہوگا یا نوکری سے علیحدہ کر دیا ہوگا۔

ثریا: — نہیں — آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ انکے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ جتنے گلاس اسوقت وہاں موجود تھے ان سب کو فرش پر گرا کر توڑ دینا چاہئے۔

فیض: — کیا کہا آپ نے؟ ان سب گلاسوں کو توڑ دینا؟

ثریا: — جی ہاں — یقیناً حیرت انگیز خواہش تھی انکی مگر انھوں نے آپکی طرح پس و پیش نہیں کیا۔ فکر میں مبتلا نہیں ہوئے۔ لوگوں سے مشورہ طلب نہیں کیا بلکہ فوراً نوکر کو حکم دیا کہ وہ یکے بعد دیگرے سارے گلاس توڑ دے۔ چنانچہ دعوت میں باجے کی جو کمی رہ گئی تھی وہ سب اس طور سے پوری ہو گئی — فیض صاحب! آپ پھر زنجیر کی طرف دیکھ رہے ہیں! — میں پوچھتی ہوں کہ آپ نے اس واقعہ سے کیا نتیجہ نکالا؟

فیض: — کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں بھی مرزا صاحب کی طرح بغیر سوچے سمجھے اسی قسم کی حرکت کر بیٹھوں۔ زنجیر کھینچنے کو تو کھینچ دونگا مگر پچاس روپے کے جرمانے کا خیال مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

ثریا: — آپ یہ نہیں سوچتے کہ اتنی بڑی خواہش کی تکمیل کے لئے پچاس روپے کا معاوضہ بہت کم ہے میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو ہمت کرنی چاہئے۔

فیض: — نہیں مس ثریا نہیں، میں پچاس روپے خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوں روپے خرچ کرنا ہوتا تو میں سالہا سال تک کیوں فکر میں مبتلا رہتا اور وہ بھی ایسی فکر میں کہ جسکی شدت کا آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔ زنجیر کو دیکھتے ہی میرے سارے جسم میں ایکقسم کا تشنج سا پیدا ہوتا ہے اور سارے اعضاء یہ چاہتے ہیں کہ ہاتھ بڑھا کر زنجیر کھینچ لوں — دیکھئے، دیکھئے —

ثریا: — (بات کاٹ کر) ارے رے رے! واقعی آپکا رنگ زرد پڑ

رہا ہے — اور مزہ لیجئے میری بات تو سنئے۔ آپ اپنا دھیان بٹانے — ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے — میرے ایک عزیز ہیں ان کو بڑی مونچھوں سے نفرت ہے جب کبھی وہ کسی کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھتے ہیں تو ان کا بیان ہے کہ انہیں ایک عجیب غریب قسم کی بے چینی ہوتی ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ فوراً انہیں کتر دیں لیکن ہر دفعہ وہ صبر و ضبط سے کام لیتے تھے اور دوست احباب بھی انہیں ایسا کرنے سے روکا کرتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی مونچھ کتا کر چپ رہنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جبکہ وہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک شخص ان کے سامنے ایسا بیٹھا تھا جسکی مونچھیں خاص طور پر بڑی بڑی تھیں اور وہ بار بار ان پر تاؤ بھی دیتا جاتا تھا —

فیض:۔ توبہ! یہ عجیب آفت ہے کہ جس شخص کو جس چیز سے نفرت ہوتی ہے اس کے سامنے وہی چیز آتی ہے۔

ثریا:۔ جی ہاں — تھوڑی دیر تک وہ انتہائی ضبط سے کام لیتے رہے لیکن بہت جلد بے اختیار ہو گئے اور چونکہ کوئی روکنے والا بھی اس وقت ان کے ساتھ نہ تھا اس لئے انھوں نے چپکے سے اپنا جیب سے قینچی نکالی اور دفعتاً جھپٹ کر آن کی آن میں اس شخص کی مونچھیں کتر ڈالیں —

فیض:۔ اوہ! کتر ڈالیں؟ پھر تو بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا؟

ثریا:۔ نہیں، اتفاق دیکھئے کہ وہ شخص مجرم تھا اور چوری کر کے بھیس بدل کر فرار ہو رہا تھا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی جب اس کی مونچھیں کٹ گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ نقلی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے بھیس کا پول کھل گیا اور اگلے اسٹیشن پر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور ہمارے عزیز کو کافی انعام ملا۔

فیض:۔ بڑے خوش قسمت تھے وہ صاحب۔ مگر ہمیں کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی۔ فائدہ نہ سہی جرمانہ ہی سے بچ سکیں۔

ثریا:۔ سنو ترکیبیں ہو سکتی ہیں فیض صاحب۔ مگر آپ سوچیں تو بھی ٹھنڈے دل سے — دیکھئے پھر آپ زنجیر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

فیض:۔ مجھے تو خاک سوجھائی نہیں دیتا اور اسی لئے تو میں نے آپ سے مدد طلب کی تھی — بتائیے نا کوئی ترکیب آپ ہی۔

ثریا:۔ ایسا کیوں نہیں کرتے آپ کہ اپنا کچھ سامان گرا دیں اور پھر زنجیر کھینچ دیں۔

فیض:۔ ایک اور واقعہ سناتی ہوں شاید آپ کے کام کا ہو۔ غور سے سنئے —

پچھلے دنوں جب میں دلی سے آ رہی تھی ایک نوجوان نے جو دریچے کے پاس بیٹھا تھا زنجیر کھینچ کر ایک سنسنی پیدا کر دی۔ گاڑی رکی۔ گارڈ آیا تو اس نے سبب یہ بتایا کہ ابھی ابھی اس کی ایک خاص انگوٹھی جس پر اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا گر پڑی۔ منگیتر نے یہ عجیب غریب شرط لگائی ہوئی تھی کہ اگر یہ انگوٹھی وہ سال بھر تک ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے سے جدا نہ کرے تو وہ اس سے شادی کرے گی۔ سال ختم ہو چکا تھا اور وہ انگوٹھی دکھا کر شادی کا فوری مطالبہ کرنے جا رہا تھا۔

فیض:۔ اچھا تو پھر معاملہ واقعی نازک تھا — گارڈ نے روپیوں کا مطالبہ نہ کیا ہوگا۔

ثریا:۔ گارڈ ذرا پس و پیش کر رہا تھا لیکن ہمراہیوں نے اسکی ہیبت پر بڑا زور دیا اور جرمانہ عائد کرنے سے ریلوے والوں کو روکا۔

فیض:۔ انگوٹھی کا کیا ہوا — کیا وہ اسے ملی؟

ثریا:۔ ہاں حسن اتفاق سے مل گئی۔

فیض:۔ بڑا خوش قسمت تھا وہ شخص۔

ثریا:۔ بے شک مگر آپ بھی خوش قسمت بن سکتے ہیں اگر اپنی انگوٹھی دریچہ گاڑی سے باہر پھینک دیں۔

فیض:۔ مگر میں تو شادی شدہ ہوں اور میری بیوی نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی۔

ثریا:۔ مضائقہ نہیں فرضی قصہ بیان کر دیا جا سکتا ہے۔

فیض:۔ مگر انگوٹھی بھی تو نہیں ہے۔

ثریا:۔ پھر تو واقعی مشکل ہے۔

فیض:۔ کیا کہوں مس ثریا! میں واقعی اس معاملے میں بد قسمت ہوں جب کوئی تدبیر سوجھتی ہے تو کسی نہ کسی وجہ سے ناقابل عمل ہوتی ہے اور جب کوئی موقع ملتا ہے تو میری بجائے دوسرا شخص فائدہ اٹھا جاتا ہے۔

ثریا:۔ کیا کبھی آپ کو ایسا موقع بھی ملا ہے جبکہ زنجیر کھینچنے کی واقعی ضرورت رہی ہو؟

فیض:۔ ہاں ایک دفعہ صرف ایک دفعہ۔ ہوا یہ کہ کسی بات پر باتوں باتوں میں دو مسافروں میں جھگڑا ہو گیا اور بات اتنی بڑھی کہ مار پیٹ کی نوبت آ گئی جو صاحب کمزور تھے وہ بیچارے بری طرح پٹ رہے تھے مگر آخر کب تک پٹتے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً جیب سے چاقو نکال لیا اور جھپٹ کر حملہ آور ہوئے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ اس سے بہتر موقع زنجیر کھینچنے کا نہیں ہو سکتا۔ فوراً میں تیزی سے زنجیر کی طرف لپکا لیکن قبل اس کے کہ میں وہاں تک پہنچ سکوں زنجیر کھینچ

جو صاحب بیٹھے تھے وہ فوراً میرا رجحان سمجھ گئے اور بجلی کی سی سرعت سے زنجیر کھینچ بیٹھے۔

ثریا :- ارے رے رے! آپ کو بہت صدمہ ہوا ہوگا۔

فیض :- صدمہ! کیا کہتی ہو مس ثریا! سالہا سال کی آرزو پوری ہونے میں یقین مانئے ایک سیکنڈ کا وقت اور بلا مبالغہ دوگز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ زندگی میں ایک ہی موقع ملا تھا وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ ایک طرف تو مجھے اپنی حالت پر انتہائی درجہ رحم آیا اور دوسری طرف اس شخص پر اتنا غصہ کہ بس چلتا تو چلتی گاڑی سے دھکیل دیتا۔

ثریا :- واقعی بہترین موقع ملا تھا —— مگر میں سمجھتی ہوں کہ ایسے مواقع سفر میں کبھی کبھار مل ہی جاتے ہیں۔

فیض :- کہاں ملتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد سے جب کبھی میں سفر کرتا ہوں تو یقین مانو دو مسافروں میں گفتگو ہوتی ہے تو میں کان لگا دیتا ہوں اور زنجیر کی طرف نظریں رکھتا ہوں بلکہ اس سے قریب ترین جگہ پر پہنچ جاتا ہوں کہ ادھر جھگڑا چھڑے اور ادھر میں زنجیر کھینچوں مگر توبہ کیجئے جو سوائے مایوسی کے کوئی اور صورت نظر آئی ہو۔

(اسٹیشن آتا ہے اور گاڑی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ رکتی ہے ثریا فوراً اترتی ہے)

فیض :- کون سا اسٹیشن ہے؟ کیا آپ یہاں اتر رہی ہیں؟

ثریا :- نہیں نہیں میں تو آگے چلوں گی ذرا رفرش منٹ کا رنگ ہو آؤں۔

[ثریا جاتی ہے]

(کچھ دیر تک اسٹیشن کے ہنگامے سے ثریا کی غیر موجودگی میں فیض دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مسافروں کا شور، بچوں کا رونا، سامان کی گھڑگھڑاہٹ، بوڑھی ماں قلیوں سے اجرت چکانا —— پھیری والوں کی بھانت بھانت کی آوازیں :- ہندو چاء، مسلمان چاء، پان، بیڑی، سگریٹ —— ماچیس برفی، لڈو، پیڑا، پلوری، کچوری گرم، مسلمان پانی، ہندو پانی، ہندوستان ٹائمز، پانیر……

فیض :- ساد اخبار والے! ادھر، ابے ادھر۔

اخبار والا :- کیا دوں صاحب؟ ہندوستان ٹائمز، پانیر، لیڈر، اسٹار، اسٹیٹسمین

فیض :- (بات کاٹ کر) ارے کوئی فلمی رسالہ ہے تو بتا۔

اخبار والا :- یہ لیجئے فلمستان، فلماس، مصور، نگارستان۔

فیض :- ارے یہ کیا۔ ان پر تو کاغذ چپکا ہوا ہے۔

اخبار والا :- جی ہاں صاحب :- لوگ تصویریں دیکھکر پرچہ واپس کر دیتے ہیں اس لئے اخبار والوں نے کاغذ چپکا رکھا ہے۔ تصویریں دیکھنا ہو تو اخبار خرید لیں۔

فیض :- لاحول ولا۔ عجب بدتمیز لوگ ہیں آخر نہیں دیکھتے خریدیں کس طرح۔

اخبار والا :- آگے جانے دیجئے صاحب، لائیے پرچہ وقت کم ہے۔

فیض :- اچھا خیر یہ پرچہ دیدو —— لو پیسے۔

(پیسے دیتا ہوتا ہے کہ ثریا واپس آجاتی ہے)

ثریا :- کون سا اخبار لے رہے ہیں آپ؟

فیض :- ایک فلمی رسالہ لے رہا تھا کہ ——

ثریا :- (بات کاٹ کر) معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فلموں سے بڑی دلچسپی ہے۔

فیض :- جی ہاں ہے تو سہی مگر اتنی زیادہ بھی نہیں۔ بہر حال دو گھڑی دل بہلائی ہو جاتی ہے۔

[سیٹی ہوتی ہے اور ریل چھوٹنے کو ہوتی ہے کہ ایک موٹا تازہ شخص قلیوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے ڈبہ میں گھس پڑتا ہے۔ اس کا نام حمید ہے]

حمید :- (قلیوں سے کرخت لہجہ میں) ابے ادھر رکھ سوٹ کیس اور وہ ہولڈال کہاں ہے۔ ادھر لا۔ توشہ دان کہاں ہے؟ کہاں ہے کہاں ہے۔ ابھی ابھی نیچے ہی رکھا ہے گاڑی چھوٹنے کے بعد لائیگا —— بدمعاش کہیں کا —— لے پیسے۔ چل بھاگ۔

[گاڑی چلتی ہے۔ ایک لمحہ خاموش رہکر حمید فیض سے مخاطب ہوتا ہے] کیوں جناب کیا آپ نہیں سمجھتے کہ قلی بدنیت تھا اور وہ میرا توشہ دان چرانا چاہتا تھا؟ گاڑی جلدی چھوٹ گئی ورنہ دیکھتے آپ کہ اتنا مارتا اتنا مارتا بدمعاش کو کہ جسکی کوئی انتہا نہیں۔

فیض :- مگر وہ دروازے کے آگے ہی رکھا تھا اور غالباً وہ لیکر ہی جا رہا تھا۔

حمید :- آپ بھی بس ایسے ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کتنا سفر کیا ہے آپنے؟ میں نے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا ہے۔ خوب جانتا ہوں ان بدمعاشوں کو ——

فیض :- ہوگا صاحب۔ خیر جانے دیجئے۔ ممکن ہے آپ صحیح ہوں۔

حمید :- ممکن کیا واقعہ یہی ہے۔ خیر، جناب کا اسم شریف۔

فیض :- فیض محمد۔

حمید :- مجھے شیخ حمید کہتے ہیں میں دہلی جا رہا ہوں۔ جناب کا ارادہ کہاں کا ہے؟

فیض :- میں بھی دہلی جاؤں گا۔

حمید :- اور یہ آپ کی غالباً اہلیہ محترمہ ہونگی۔

فیض :- نہیں نہیں۔

حمید :- تو پھر ہمشیرہ معظمہ۔

فیض :- نہیں نہیں۔

حمید :- پھر تو یقیناً دوست ہوگی۔ ہاہاہا دوست!

فیض :- واقعہ یہ ہے جناب کہ ہمسفر ہیں۔ راستہ ہی کی ملاقات ہے۔ اس سے پہلے ہم ایک دوسرے کو نہ جانتے تھے۔

حمید :- خوب۔ بڑے خوش قسمت ہیں آپ

فیض :- خوش قسمتی کی کون بات ہے اس میں

حمید :- اگر یوں ہے تو پھر انہیں میری طرف منتقل کر دیجئے اور میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

فیض :- کیا کہتے ہیں آپ؟

حمید :- کچھ نہیں میں آپ کی نظر انتخاب کی داد دے رہا تھا۔

فیض :- معاف کیجئے میں اس قسم کی گفتگو سننے کا عادی نہیں ہوں۔

حمید :- اچھا تو جانے دیجئے — میں خود ان کی جانب رجوع ہوتا ہوں — کیا آپ مجھے اپنا اسم گرامی بتا سکتی ہیں؟

ثریا :- ثریا۔

حمید :- کہاں جا رہی ہیں آپ ؟

ثریا :- دہلی۔

حمید :- کہاں سے آ رہی ہیں آپ۔

ثریا :- آگرہ سے۔

حمید :- آہ آہ — آپ تنہا سفر کر رہی ہیں یا کوئی نوکر ساتھ ہے۔

ثریا :- عورتوں کی شخصی باتوں کے متعلق کھوج لگانے کی کوشش کرنا نامناسب ہے۔

حمید :- میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا کہ آپکی کوئی خدمت کرنے کے قابل ہو سکوں تو دریغ نہ کروں۔ مثلاً یہ کہ دہلی کے اسٹیشن پر اگر آپ کو لینے کوئی نہ آئے تو میں آپ کو کوٹھی تک پہنچا آؤں یا —

ثریا :- (بات کاٹ کر) شکریہ۔ مگر مجھے آپ کی خدمت کی ضرورت نہ ہوگی آپ بے فکر رہیں۔

حمید :- زندگی بھر میں ایک ہی موقع ملا ہے اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اسکو بھی گنوا بیٹھوں — سفر کی رومان بھری داستانیں دوست احباب سے سنتے سنتے میرے منہ میں بھی بار بار پانی بھر آتا تھا مگر کسی وقت موقع ہی ہوتا تھا — آج حسن اتفاق سے تکمیل آرزو کا موقع ہے۔

ثریا :- جناب! آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ براہ کرم تہذیب کے ساتھ پیش آئیے۔

حمید :- بات یہ ہے مس ثریا — اہا!

لبوں پہ ہائے خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلئے

میں ذرا سیدھا سادھا آدمی ہوں جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بے کم و کاست آ جاتا ہے رہا تہذیب و شائستگی کا سوال، سو میرا خیال ہے کہ میں نے اب تک کوئی بدتمیزی نہیں کی —

ثریا :- براہ کرم آپ مجھ سے مخاطب نہ ہوں۔

حمید :- ؎ یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ثریا :- میں آپ سے مکرر التجا کرتی ہوں کہ آپ براہ کرم خاموش رہیں۔

حمید :- ایک شعر اور سنئے۔ شاید کسی قابل ہو ؎
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرف زیر لب شرمندۂ گوش سماعت ہوں

ثریا :- للہ چپ رہئے صاحب، ورنہ بات خواہ مخواہ بڑھ جائے گی۔

حمید :- ؎ منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

لو ہو آپ تو روٹھ کر دریچہ سے باہر دیکھنے لگیں۔ اگر اجازت ہو تو میں ذرا قریب ہو جاؤں —

ثریا :- دیکھئے اگر مجھ سے قریب ہونگے تو میں مدد طلب کروں گی۔

حمید :- ہاہاہا۔ مدد؟ کس کی؟ ان صاحب کی مدد؟ ہاہاہا

فیض :- جناب! آپ کی بدتمیزی ناقابل برداشت ہو رہی ہے۔ اگر ابکی دفعہ آپ نے اس لڑکی کو چھیڑا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خیر نہیں۔

حمید :- ہاہاہا۔ تو یہ گویا چیلنج ہے۔ اچھی بات ہے ہم دونوں آپس میں تصفیہ کر لیں۔ فی الحال تو گھونسہ بازی ہی سہی۔ جو جیتے گا وہ اس لڑکی کو حاصل کرے گا۔ آئیے ایک دو تین۔

فیض :- ارے ارے ارے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہاتھا پائی شریفوں کا کام نہیں۔

حمید :- ہاہاہا۔ تو ہار مان گئے نا — اب تو ثریا یقیناً میری ہے تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ آؤ ثریا — دیکھا اپنے جانباز کو —

ثریا :- دور رہئے دور رہو کم بخت، بدتمیز۔

حمید :- اور کچھ ارشاد ہو۔

ثریا :- فیض صاحب، فیض صاحب! للہ زنجیر کھینچئے، جلدی کیجئے۔ مجھے اس بدمعاش کے پنجے سے بچائیے۔ جلدی کھینچئے زنجیر۔

فیض :- ابھی، ابھی، ثریا! ابھی کھینچی۔ مزہ چکھاؤں گا بدمعاش کو۔ ابھی کھینچی زنجیر [زنجیر کھینچتا ہے۔ گاڑی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ ایکدم رکتی ہے۔

(گارڈ ڈبہ کی طرف دوڑتا ہوا آتا ہے اور پوچھتا ہے)

گارڈ :- کیا ہوا؟ کیا ہوا جناب؟

فیض :- دیکھئے یہ بدتمیز شخص اس خاتون کو بلا وجہ ستا رہا تھا۔

گارڈ :- ستا رہا تھا؟

فیض :- جی ہاں نہایت بدتہذیبی کے ساتھ پیش آرہا تھا اور اسکی نیت یقیناً بہت بُری تھی۔ عورت پر حملہ کرنا یقیناً سخت ترین جرم ہے۔ اس نالائق کو سزا ہونی چاہئے۔ بلوائیے پولیس کو، پولیس، پولیس۔

گارڈ :- شرم نہیں آتی عورت کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر ہو۔ صورت سے تو جاہل بھی نہیں معلوم ہوتے۔ لُچّے، شہدے بھی نہیں معلوم ہوتے۔ پھر یہ کیا حرکت ——— کہئے خاتون آپ کیا فرماتی ہیں ان کے متعلق؟ کیا ابھی پولیس کے حوالے کیا جائے۔

حمید :- سنئے مس ثریا پولیس کو حوالے کرنے سے پہلے سنئے کہ میں اپنی خطا پر نادم ہوں بے شک مجھ سے زبردست غلطی ہوئی میں نہ معلوم کس دُھن میں تھا خواب میں تھا یا ہوشیار بہرحال مجھ سے جو بدتمیزی ہوئی جسکے لئے میں ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں اور عجز کے ساتھ شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں ——— اب آپکو اختیار ہے خواہ میری خطا سے درگذر کریں یا پولیس کے حوالے کریں۔

ثریا :- گارڈ صاحب، چونکہ ان کو خطا پر ندامت ہے اور معافی چاہ رہے ہیں اسلئے شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ انہیں اس دفعہ معاف کر دیا جائے ——— معاف کیجئے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی، گاڑی روکنا پڑی اب ان سے اتنا ضرور کہئے کہ وہ کسی اور ڈبہ میں چلے جائیں اور میرا پیچھا نہ کریں۔

گارڈ :- میری رائے تو معاف کرنے کی نہ تھی کیونکہ بدمعاشوں کو معقول سزا ملنی چاہئے ورنہ وہ اور بھی دلیر ہو جاتے ہیں مگر چونکہ آپ چاہتی ہیں کہ انہیں چھوڑ دیا جائے اسلئے ہم مجبوراً انہیں معاف کرتے ہیں ——— آپ دوسرے ڈبہ میں چلے جائیں، اور یاد رکھئے کہ آئندہ کسی عورت کو اگر چھیڑا تو پھر رہائی کی کوئی صورت نہیں۔ ہر عورت اتنی نیک نہیں ہوتی۔ جائیے جائیے، جلدی کیجئے ——— نکالئے سامان اپنا۔

(حمید سامان نکالتا ہے سیٹی ہوتی ہے اور گاڑی چلتی ہے)

فیض :- بدمعاش! غنڈا تھا غنڈا! آپ نے ناحق چھوڑ دیا بدمعاش کو۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ کچا ہی چبا ڈالوں۔ بدتمیز کہیں کا۔

ثریا :- (ہنسی ضبط نہ کر کے بے اختیار قہقہے لگاتی ہے) ہاہاہا ——— ہاہاہا ——— ہاہاہا

فیض :- کیوں کیوں؟ بھلا یہ ہنسنے کا کون سا موقع ہے؟

ثریا :- (مسلسل قہقہے لگاتی ہے) ہنسوں نہ تو کیا کروں آپ کی عقل پر ہنسی آتی ہے۔

فیض :- میری عقل پر؟

ثریا :- ہاں آپ کی عقل پر۔ کیونکہ جو شخص آپ پر احسان کرتا ہے اس کو آپ بُرا بھلا کہتے ہیں۔ کیا اسی کا نام تمیز اور تہذیب ہے؟

فیض :- کیا مطلب؟

ثریا :- مطلب یہ کہ حمید نے تمہیں زنجیر کھینچکر ریل رکوانے کا موقع فراہم کیا۔ تم کو چاہئے تھا کہ اس کے ممنون ہوتے لیکن تم اس کو صلواتیں سنا رہے ہو۔ الٹی گنگا بہاتے ہو۔

فیض :- موقع فراہم کرنے کا کیا سوال ہے۔ وہ بدمعاش ———

ثریا :- (بات کاٹ کر) نہ نہ نہ اس قسم کا لفظ بیچارے کے لئے استعمال نہ کرو۔

فیض :- بیچارہ؟ اچھا۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟

ثریا :- مطلب یہ ہے کہ حمید ایسا ہی شریف آدمی ہے جیسے کہ آپ بلکہ اس حیثیت سے وہ آپ سے شرافت میں زیادہ ہے کہ اس نے آپ کو زنجیر کھینچنے کا موقع دینے کے لئے اپنی شخصیت کو خطرہ میں ڈالا۔

فیض :- آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔

ثریا :- واقعہ یہ ہے کہ تمہارے زنجیر کھینچنے کے شوق کا حال سنکر مجھے ترس آگیا اور میں سوچنے لگی کہ کس طرح تمہارے لئے یہ موقع فراہم کیا جائے۔ حسنِ اتفاق سے یاد آیا کہ ہماری فلم کمپنی کا ایک سٹار اگلے اسٹیشن پر سوار ہونے والا ہے۔ میں ریفرشمنٹ کار کو جانے کے بہانے سے اتری اور حمید کو پلیٹ فارم پر تلاش کرنے لگی۔ وہ ملا تو میں نے سارا حال سنایا۔ وہ بڑا زندہ دل اور نیک آدمی ہے۔ اس نے کہا چلو ہم اپنا ریہرسل یہیں کر لیں ——— آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے اور حمید کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ ہمارے زیرِ تیاری فلم "منزلِ عشق" کے ایک سین کا مکالمہ ہے ——— اب کہو تمہیں حمید کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے یا نہیں؟

فیض :- اوہ! آپ فلم ایکٹرس اور حمید فلم ایکٹر ———

(گاڑی رکتی ہے، اسٹیشن آتا ہے)

ثریا :- (اُترنے لگتی ہے) اچھا خدا حافظ۔

فیض :- اوہ! تو آپ چلیں؟

ثریا :- جی ہاں۔

فیض :- (اپنے آپ سے) منزلِ عشق!

غزل

عظمت اقبال شمع

دل میں جب بے چینیوں کی لذتیں پاتی ہوں میں
ہوش کی منزل سے کوسوں دور ہو جاتی ہوں میں

یہ گھٹائیں، یہ بہاریں، یہ ہوائیں، یہ فضا
ہر گل نظارہ میں فطرت کی بو پاتی ہوں میں

اک کشاکش ہر قدم ہر لحظہ پیش اک امتحاں
ہر نفس برہم نظام زندگی پاتی ہوں میں

کارفرما کون سی قوت دل محزوں میں ہے
جی میں کیا کچھ ہے مگر کہنے نہیں پاتی ہوں میں

ہر تبسم بھی مرا اک داستان درد ہے
مسکراتی ہوں تو اشک آنکھوں میں بھر لاتی ہوں میں

ضبط غم کی چارہ فرمائی کو گزریں مدتیں
زندگی کی کشمکش سے اب تو گھبراتی ہوں میں

سازِ خاموشی میں بھی ہیں غم کے نغمے صد ہزار
آشکارا ہے وہ جس کو راز بتلاتی ہوں میں

کتنی لامحدود ہیں اس بے خودی کی وسعتیں
منزلِ ادراک سے آگے بڑھی جاتی ہوں میں

نبضِ غم ساکت ہے اور نبضِ فطرت ہی خموش
جیسے اک کھوئی ہوئی شے آج پھر پاتی ہوں میں

گرچہ شمع جل بجھی شمع شبستانِ امید
دل کے خاکستر میں کچھ اب بھی شرر پاتی ہوں میں

غزل

رہ گئی شرم ناشکیبائی
بھولنے والے تیری یاد آئی

اللہ اللہ ناز فرمائی
آنکھ جھپکی تھی زلف لہرائی

وہ بھی آزردۂ نگاہ ہے
دل ہی تنہا نہ تھا تماشائی

زندگی تھی کہ کاکلِ برہم
آپ سلجھائی، آپ الجھائی

التجا اتنی بے اثر تو نہ تھی
ہائے پندار نا پذیرائی

بارہا ہم نے پی لئے آنسو
بارہا آپ کو ہنسی آئی

دل کا انداز شرمسار ادا
نگہ ناز بھی تو پچھتائی

ادا بدایونی

سیلاب

افسانہ

رام پرتاب بہادر

وہ گاؤں دریا کے کنارے، دریا سے لگا ہوا، پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے لیکن اگر سوچئے تو پہلے اور آج میں بہت فرق ہے۔ یعنی پہلے اس گاؤں میں ہنگو ساہو تھے اور اب وہ نہیں رہے۔ ہنگو ساہو آدمی تھے، گاؤں نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی اس دریا کے کنارے، دریا سے لگے ہوئے گاؤں کو، جسکو آج بھی تھنتیں کہتے ہیں، ہنگو ساہو کو سوچے بغیر نہ پہلے کوئی سوچ سکتا تھا اور نہ اب سوچ سکتا ہے۔

جب ہنگو ساہو زندہ تھے تب ایسا تھا اور آج جب وہ نہیں رہے تب بھی ایسا ہے۔ یعنی ایک زمانہ تھا جب ہم تھنتیں کو ہنگو ساہو کے دھن اور آس پاس میں پھیلے ہوئے ان کے اثر اور دبدبہ کو سوچکر سوچتے تھے، اور آج ان کے نہ ہونے پر ہم تھنتیں کو ہنگو ساہو کی یاد کو سوچکر سوچتے ہیں۔

دیہاتی بول چال میں تھنتیں کے مطلب ہوتے ہیں تھونھیں یعنی شہتیر یعنی وہ لمبی، موٹی اور مضبوط لکڑی جسکو بنتے ہوئے مکانوں کی دیواروں پر رکھکر اس کی کمر کے سہارے کھپریل یا پھوس کی چھت بچھاتے ہیں اسی کو جب کنویں پر ڈال دیا جاتا ہے تو اس کے سینے پر پیر رکھکر دیہاتی عورتیں پانی بھرتی ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ کہ تھنتیں سچ مچ تھونھیں تھا، کیونکہ آس پاس کی پچاسوں میل کی دنیا کے لئے تھنتیں حقیقت میں تھونھیں کا کام کرتا تھا۔

تھنتیں راپتی ندی کے کنارے بسا ہوا ہے، اور راپتی سال کے کسی موسم میں سوکھتی نہیں، اس لئے کہ راپتی پہاڑوں سے نکلتی ہے اور سو دو سو میل زمین کی نیچائی اونچائی پر بہہ کر سرجو سے مل جاتی ہے، اور پھر سرجو گنگا میں مل جاتی ہے، اور اگر راپتی سوکھ جاتی تو تھنتیں سوکھ جاتا کیونکہ راپتی تھنتیں کے لئے وہی تھی جو شہتیر مکانوں کی چھتوں کے لئے یا کنویں پر پانی بھرنے والی عورتوں کے لئے ہوتی ہے جس طرح راپتی پر بستی ہوئی تجارت تھنتیں کی جان تھی اسی طرح تھنتیں اور ہنگو ساہو کی دولت اور تجارت آس پاس کے پچاسوں میل تک پھیلے ہوئے دیہات کے لئے شہتیر کی طرح سہارے کا کام کرتی تھیں۔

تھنتیں کے لئے ہنگو ساہو وہی تھے جو تھنتیں تھا ہنگو ساہو کے لئے۔ بلکہ کچھ کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہنگو ساہو ہی تھنتیں تھے۔ لیکن خود ہنگو نے ایسا کبھی بھول کے بھی نہ سوچا کیونکہ وہ اپنے کو تھنتیں کی بدولت سمجھتے تھے۔ انکا ایسا خیال تھا جب ان کے پاس دولت تھی، بیل اور بیل گاڑیاں تھیں گھوڑے اور ٹٹو تھے، اور جب ان کے دھن کی شہرت نیپال کی ترائی میں سے ہوکر گزرنے والے سوداگر ہمالیہ پہاڑ کی وادیوں تک لے جاتے تھے اور ان کے اسی نام کو بدریوں میں بھر کر راپتی سرجو میں لے جاتی تھی اور سرجو انہیں گنگا کے دور دراز کناروں پر اتارتی تھی۔

ہنگو مہاجن تھے، سوداگر تھے، ساہو تھے، زمیندار تھے، بھلے آدمی تھے، کیا نہیں تھے۔ ہنگو کے وہاں لین دین ہوتی تھی، تجارت ہوتی تھی، ہلدی بکتی تھی، کھیتی ہوتی تھی، لوگوں کی بات اور عزت رہتی تھی۔ ان کے درجنوں بڑے مکان تھے، سیکڑوں مویشی تھے، سواریاں تھیں، اور ان کے وہاں انگنت بھیڑ، بکریاں کتے، طوطے، تیتر اور بیٹر پلے تھے۔ غرضکہ ان کے پاس سب کچھ تھا جو کسی بڑے آدمی کے پاس ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ نہیں تھا تو وہ ہاتھی تھا، اور وہ اس وجہ کر نہیں تھا کہ جس برادری کے ہنگو ساہو تھے اس برادری میں ہاتھی رکھنے کی جیسے خاندانی ممانعت سی تھی۔ اس لئے ہنگو ساہو جہاں سب کچھ رکھتے تھے وہاں صرف ہاتھی نہیں رکھتے تھے، ویسے ہاتھی کے خیال سے انھیں ایک طرح کا لگاؤ بھی تھا جسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتے تھے۔

بچے سبھی ہاتھی کے تصور سے خوشی کے مارے پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہنگو کا ہاتھی سے جو ذہنی لگاؤ تھا وہ ان کا بچپنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ لگاؤ خاص طور سے اس دن سے شروع ہوا جس دن انھوں نے دریا کے کنارے سے مرچوں کی بوریاں خرید کر لوٹتے وقت ایک ننھے سے کھڑریچ[1] کو ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اڑتے دیکھا۔ لیکن اگر باوجود اس شگون اور مرچوں کے بھاؤ بڑھ جانے کے ہنگو ساہو راجہ نہیں ہوئے تو اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ ان کے راجہ ہونے میں اس کے بعد کچھ باقی رہ گیا تھا بلکہ ہنگو ساہو جوانی کی اس عمر سے، جب انھوں نے کھڑریچ کو ہاتھی کے مستک اتنی اونچائی سے اڑتے دیکھا تھا، دن بدن بڑھ کر پختہ ہوئے تو صرف راجہ ہوئے لیکن ہنگو نے راجہ ہوکر بھی اپنے کو راجہ نہیں سمجھا۔

اس کے پیچھے صرف برادری کی بات نہیں تھی بلکہ ہنگو راجہ ہونے سے بھی اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا وہ ہاتھی رکھنے سے ڈرتے تھے۔

لیکن ایک ہاتھی کے نہ ہونے نے ہنگو ساہو کو بے ہاتھی کے ہونے سے نہیں روکا۔ بلکہ ہاتھی نہ رکھنے کے باوجود بھی، جب سمے بدلا، تو جہاں دوسرے ہاتھی رکھکر مٹے وہاں ہنگو بنا ہاتھی کے مٹ گئے۔ جب وقت بدلتا ہے تو کسی کیلیے بہت بدلتا ہے کسی کے لئے کم بدلتا ہے اور کسی کے لئے زیادہ بدلتا ہے، لیکن جب ہنگو ساہو کے لئے زمانہ بدلا تو وہ پورے تھنتیں کے لئے بدلا، اور

---

[1] کھڑریچ نام کی ایک چڑیا ہوتی ہے جسکے بارے میں دیہاتوں میں کہیں کہیں ایسا یقین کیا جاتا ہے کہ اگر اسے کوئی ہاتھی کے ماتھے کی اونچائی سے اڑتے دیکھے تو وہ راجہ ہو جاتا ہے۔

تھنمیں کے ساتھ ساتھ اُن ہزاروں لاکھوں کے لئے بدلا جو تھنمیں کے آس پاس صرف تھنمیں کی بدولت جیتے اور مرتے تھے۔ اصل میں صرف زمانہ تھوڑے ہی بدلا تھا، بلکہ اس کے ساتھ دریا کا دھارا بھی بدلا تھا اور جب دریا کا دھارا بدلتا ہے تو وہ یک بیک آناً فاناً بدل جاتا ہے۔ چنانچہ وہی راپتی جو تھنمیں کے کنارے کنارے چپ چاپ سال بہ سال بہا کرتی تھی اس نے اپنا بہاؤ ایک برساتی رات میں یک بیک بدل دیا۔

اس برساتی رات میں کیا کیا ہوا اور برساتی راپتی نے تھنمیں والوں کے ساتھ کیا کیا کیا۔ آج تھنمیں میں کم ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ اول تو اس رات سے بچنے والوں میں آج کم رہے، اور جو ہیں بھی ان میں سے کوئی بہرا، گونگا یا اندھا ہو چکا ہے تو کوئی ایک زمانے سے لقوہ کا مریض بنا چارپائی پکڑے ہے۔ چنانچہ اگر آج ساٹھ اور نو اونہتر سال کی عمر میں کوئی ایسا بھی ہے جس کی زبان اب بھی چلتی ہے تو وہ ہیں جھنگو ساہو۔ جھنگو ساہو آج بھی دریا کے کنارے، دن ڈوب جانے کے بعد، ملاحوں کے ساتھ گانجے کی چلم پی کر بتاتے ہیں کہ جب سیلاب آیا تو گاؤں والے سو رہے تھے۔ دریا یوں تو صبح ہی سے بڑھ رہا تھا اور تیز بڑھ رہا تھا۔ لیکن دریا ہر برسات میں بڑھتا تھا اور بڑھ کر گاؤں کے شوالے کا چبوترہ چھو کر گھٹنے لگتا تھا۔ شوالے کے برگد کی لمبی جٹائیں جب برساتی پانی پی لیتی تھیں اور برگد کے نیچے بیٹھے ہوئے شیو جی کے چرن برساتی لہریں چھو لیتی تھیں، تو پانی آپ سے آپ گھٹنے لگتا تھا۔ چنانچہ جب سیلاب آیا تو گاؤں والے سوئے ہوئے تھے۔ جھنگو ساہو بتلاتے ہیں کہ رات میں ایک دم شور مچا۔ لوگ بے تحاشا مکانوں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ لیکن باہر نکل کر گاؤں والوں نے دیکھا۔ گاؤں پانی سے گھر چکا تھا۔ پانی زور سے گاؤں میں گر رہا تھا اس کے شور سے کچھ اور سنائی نہیں پڑتا تھا۔ صرف عورتوں بچوں کا رونا چلانا اور دیواروں کا دھم دھم گرنا سنائی دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جیسے پورا گاؤں بہہ چلا۔ جھنگو ساہو جھپٹ کر اندر گئے۔ اور تیتر کا پنجرا باہر نکال لائے۔ پھر اپنی لڑکی اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر انھوں نے چاہا کہ سامنے کی لیک کو، جس پر پہلے بیل گاڑیاں چلتی تھیں، پار کر کے دوسری طرف نکل جائیں۔ لیکن لیک نہر بن چکی تھی اور پانی اس میں زور مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بیوی کا ہاتھ ساہو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دھارے کے ساتھ بہتی نکل گئیں۔ جھنگو ساہو تیتر کا پنجرا چھوڑ کر تیرنے لگے۔ لڑکی نے جھنگو کی صدری پکڑ لی۔ جب جھنگو سامنے کے ٹیلے پر پہونچے تو لڑکی کی ساڑی میں اُلجھا ہوا تیتر کا پنجرا بھی کنارے لگا۔ رات کے اندھیرے میں جھنگو ساہو نے دیکھا پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ گائے بیل، بکریاں اور آدمی بہتے چلے جا رہے تھے۔ جھنگو نے سامنے کے درخت پر لڑکی کو بڑی محنت سے سہارا دے کر چڑھا دیا، اور خود بھی تیتر کا پنجرا لے کر ایک ڈال پر جا بیٹھے۔ صبح تک گاؤں کا تین چوتھائی حصہ صاف ہو گیا تھا جو حصہ بچا تھا وہ ملاحوں اور چماروں کی بستی تھی جس کے صرف چھپر پانی کے اوپر دکھائی دیتے تھے۔ آس پاس کی دنیا پانی کی دنیا بن گئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں کے اوپر کی صرف شاخیں دکھائی پڑتی تھیں۔ جھنگو نے تیتر کے پنجرے کو ایک شاخ پر لٹکا دیا تھا، اور اس طرح وہ دو راتیں اور ایک دن درخت پر بیٹھے رہے۔ لیکن لڑکی دوسری رات کو اونگھ کر پانی میں گر پڑی۔ درخت کے نیچے پانی سوں سوں کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ لڑکی کے پانی میں گرنے سے جو چھپاکا ہوا اس سے جھنگو ساہو جو خود جھپکی لے رہے تھے جاگ اٹھے۔ لیکن دھارے کی تیزی دیکھ کر ہمت نیچے اترنے کی نہ ہوئی۔ لڑکی تیسرے دن بہتے ہوئے کیلے کے ایک تنے سے لپٹی ہوئی کئی میل کی دوری پر زندہ پائی گئی۔ سیلاب جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گھٹنے لگا۔ ڈیڑھ دن میں دریا اپنے پیٹ میں پورا گاؤں میں دس بیس آدمیوں کو چھوڑ کر، جو درختوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ نہ بچا تھا۔ شوالہ گر کر دریا کے پیٹ میں چلا گیا تھا۔ مہادیو جی بکھرے ہوئے اپنی جگہ پر پڑے تھے۔ گاؤں کے بابو صاحب کا ہاتھی جو شوالے کے پاس برگد تلے بندھتا تھا، برگد کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تیرہ میل کی دوری پر مردہ سرجو کے کنارے بہتا پایا گیا۔

اتنا قصہ سنا کر جھنگو ساہو نے صدری سے گھڑی نکالی اور اسے کنڈے کی آگ کے پاس لیجا کر دیکھا۔ آٹھ بج چکے تھے، اس لئے تیتر کا پنجرا اٹھا کر دریا کے کنارے سے چل پڑے۔

ٹھیک تو کوئی نہیں بتا سکتا، لیکن ایک زمانے سے جھنگو ساہو اسی طرح شام کے وقت دریا کے کنارے جاتے تھے۔ ایک ہاتھ میں تیتر کا پنجرا اور دوسرے ہاتھ میں سونٹا لئے ہوئے دریا کے کنارے ضروریات سے فارغ ہوتے اور پھر ملاحوں کے ساتھ گانجا پی کر سیلاب سے پہلے اور سیلاب کے بعد کی تھنمیں کی کہانی سناتے تھے۔ پوری کہانی ملاحوں کو کبھی معلوم نہ ہو سکی کیونکہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسطرح اپنی یا تھنمیں کی داستان سنا کر جھنگو اپنی آنکھوں کی گھٹتی ہوئی روشنی سے کنڈے کی آگ کے پاس اپنی گھڑی لیجا کر، وقت دیکھتے اور گھڑی میں آٹھ بجا دیکھ کر دریا کے کنارے سے چل دیتے۔ پوری کہانی شاید کبھی ختم ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ جھنگو ساہو اور ان کی ہر چیز دریا پر ناؤ چلانے والے ملاحوں کے لئے نہ ختم ہونے والی داستان تھے۔

وہ اپنی گھڑی کے بارے میں بتاتے تھے، جسے صبح جین کے صدری کے سامنے کی جیب میں ہمیشہ لئے رہتے تھے کہ اسے انھوں نے ایک نیپالی سوداگر سے خریدا تھا۔ گھڑی کے علاوہ ان کے پاس ایک کمبل بھی تھا جس کے روئیں اڑ گئے تھے، لیکن اندر کی اونی خول اب بھی باقی تھی جس پر بال جا کر وہ کمبل بنا تھا۔ جھنگو ساہو بتاتے، گھڑی جرمنی میں اور کمبل ولایت میں بنے تھے اور یہ دونوں چیزیں انھوں نے اسی نیپالی سوداگر سے خریدی تھیں، جو، بقول جھنگو ساہو ہر پانچ سال پر تھنمیں سے ہو کر بدیشی مال لے کر گذرتا تھا راستہ میں کبھی وہ سوداگر اپنا مال بیچتا نہیں تھا۔ ساری بدیشی چیزیں نیپال لیجا کر

صرف مہاراجہ، بڑے اور چھوٹے سرکاروں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ ہنگو ساہو کے واسطے یہ صرف اسکا پریم تھا جو اس نے ایک بار کمبل اور گھڑی ان کے ہاتھ بیچ دی۔ گھڑی اور کمبل کی تعریف کرتے ہوئے ہنگو کمبل کی عمر لگ بھگ ۴۸ سال بتاتے تھے اور کہتے کہ وہ ولایتی کمبل اتنا گرم تھا کہ اسے بدن پر ڈال کر اگر کوئی جاڑے کی رات میں باہر میدان میں بھی پڑا رہ جائے تو سردی نہیں لگتی تھی اسی طرح گھڑی کی بھی کہانی سناتے، جس کو دیکھکر ہنگو ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ سورج ٹھیک وقت پر نکلا ہے یا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تیس سال سے گھڑی نہ کبھی بگڑی اور نہ کبھی مرمت کو گئی۔ باتوں میں وہ یہ بھی کہتے کہ اگر گھڑی میں کنجی نہ دی جائے تب بھی وہ چلتی رہتی تھی حالانکہ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی، اپنی یا گھڑی کی تعریف میں کہہ دیتے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اپنی گھڑی میں کنجی دینا بھول گئے ہوں۔ وہ بتاتے تھے کہ سیلاب سے گھرے ہوئے جب وہ درخت پر بیٹھے تھے تب بھی گھڑی میں کنجی لگانا نہیں بھولے۔ سیلاب آنے پر جب وہ گھر سے نکل بھاگے تو گھڑی صدری میں تھی اس لئے وہ تیتر کی طرح ان کے ساتھ چلی آئی۔ کمبل انہیں سیلاب کے بعد گری ہوئی دیوار کے نیچے ملا۔ جہاں سیلاب میں اور ساری چیزیں سڑ گل یا بہہ گئیں وہاں یہ اکیلا کمبل تھا جو پانی میں بھیگ کر اپنا وزن لئے وہیں رہ گیا۔ ہنگو ساہو کی نظر میں اس کمبل کی یہ بھی ایک بڑی خوبی تھی جو اسے اتنا بڑا سیلاب بھی نہ بہا سکا۔ اور جو اس کے بال جھڑ گئے تھے اس کے بارے میں ان کا یہ وچار تھا کہ اگر وہ دیوار کے نیچے دب نہ جاتا تو اس کے بال ہرگز نہ گرتے کیونکہ جرمن گھڑی کی طرح ولایتی کمبل بھی امر تھا۔ نیپال کے سوداگر نے ایسا ہی بتایا بھی تھا۔ ملاحوں نے گھڑی تو دیکھی تھی لیکن کمبل انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہنگو ساہو جب یہ داستان سناتے تو ہمیشہ کہتے "کمبل بھی کسی دن لاکر دکھاؤں گا" لیکن ملاحوں کے لئے وہ دن کبھی نہیں آیا۔

اتنی داستان سنا کر ہنگو نے نیپال کے سوداگر کی دی ہوئی گھڑی نکال کر دیکھی اور کہنے لگے ۔ سیلاب بھی نیپال ہی سے آیا تھا۔ نیپال میں چاروں طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک بہت بڑا تال تھا جس میں برسات کا پانی اکٹھا ہوتا تھا۔ اس سال نیپال میں اتنے زور کی بارش ہوئی کہ تال میں زیادہ پانی اکٹھا ہو جانے کی وجہ سے آس پاس کی دھان کی کھیتی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تالاب کا ایک بند کاٹ دیا گیا۔ راپتی یونہی بڑھی ہوئی تھی۔ بند کے ٹوٹنے سے پانی دندناتا ہوا آیا اور تحصیل کا تین چوتھائی دیکھتے دیکھتے راپتی کے پیٹ میں ہضم ہو گیا۔ سیکڑوں گاؤں اور ہزاروں آدمی راتوں رات بہہ گئے۔ جنھوں نے بھاگنے یا تیرنے کی کوشش کی وہ دو چار میل آگے جاکر ڈوبے۔ بچا کوئی نہیں سوائے ان کے جو ان درختوں یا مکانوں پر چڑھ گئے تھے جنھیں سیلاب گرا نہ سکا۔ لیکن جو اس طرح بچ گئے انھوں نے بچکر بھی یہی محسوس کیا کہ جو نہیں رہے تھے وہی اچھے رہے، کیونکہ جو رہ گئے تھے ان کے لئے زندگی خود ایک مستقل سیلاب بن گئی جس میں جینے والے دن رات ڈوبتے اتراتے رہے۔

انہیں بچنے والوں میں ہنگو بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس مرنے کے ہاتھوں جی کر یہی محسوس کیا کہ اگر وہ نہ بچے ہوتے تو برا نہ ہوتا لیکن ایسے جینے کو بھی جینا ہی کہتے ہیں، کیونکہ اسطرح جینے والا بھی اپنی زندگی موت سے نہیں بدلتا۔ سیلاب کے بعد گاؤں میں بخار کی بیماری چلی تھی جو سیلاب سے بچے تھے وہ بخار سے مرے۔ اور جو بخار سے بچے وہ بھوک کے مارے کتوں بلیوں کی موت مرے۔ اپنے گھر میں رہ گئے تھے اپنی لڑکی کے علاوہ ہنگو ساہو۔ لیکن ہنگو نے چونکہ اس درمیان میں یہ طے کر لیا تھا کہ آخر میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا اور آدمی کو اپنی زندگی کا بوجھ آپ ہی ڈھونا پڑتا ہے۔ اس لئے جب ہیضے کی بیماری سے اکیلی لڑکی بھی چل بسی تو ہنگو زیادہ ہمت نہیں ہارے

غزل

اُٹھ رہی ہے پھر وہ چشمِ امتحاں میری طرف
پیار سے دیکھ لے غمِ راحت رساں میری طرف

یہ تماشا دیکھئے رہتا ہے اتنا ہی خلاف
جسقدر جھکتا ہے ظالم آسماں میری طرف

ہمتیں پائے شکستہ کی رلاتی ہیں مجھے
جائے اب آئے نہ گردِ کارواں میری طرف

خیر ہو یارب گریباں کی کہ بوئے موجِ گل
آ رہی ہے باغ سے دامن کشاں میری طرف

دیکھ تو میرے دلِ مجبور کی بیباکیاں
دیکھ تو اے بے نیازِ این و آں میری طرف

لے چلا ہے جب نشیمن سے مجھے صیاد ربط
جھک رہی تھی جیسے شاخِ آشیاں میری طرف

ربط تلہری

سر کے چند بال جو کالے رہ گئے تھے وہ بھی اب سفید ہو گئے۔ چہرہ پر جو جھریاں تھیں وہ بل کر لکیریں بن گئیں۔ بڑھاپے میں آدمی کا رنگ یوں بھی معنی نہیں رکھتا لیکن ہنگو ساہو کے بارے میں اب یہ بھی آسانی سے نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ وہ کس رنگ کے۔ کپڑے لتے پہلے بھی زیادہ نہیں پہنتے تھے اور اب ۶۹ سال کی عمر میں پہنتے بھی تو کیا پہنتے۔ لے دے کے، دھوتی کے علاوہ، صدری رہ گئی تھی، جسے اب پہنتے کم کندھے پر ڈالے زیادہ رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ میں وہ سوٹا رہتا جس پر جھک کر اب ان کا بڑھاپا چلتا تھا۔ اور جب دریا کے کنارے صبح شام جاتے تو داہنے ہاتھ میں پنجرا بھی ہوتا جس میں وہ تیتر تھا، جسے ہنگو ساہو اپنی جان کے ساتھ اس سیلاب میں سے بچا لائے تھے۔ پنجرا وہی رہا لیکن تیتر بدلتے رہے تیتر اتنے دن جیتے بھی کیسے۔

ہنگو ساہو کے پاس جب سب کچھ تھا تب بھی وہ صبح شام دریا کے کنارے جایا کرتے تھے اور جب ان کے پاس کچھ بھی نہ رہا اور ان کا کوئی نہ رہا تب بھی ان کے لئے وہی دریا کا کنارہ تھا۔ یعنی دریا کے کنارے جانا جیسے ان کے جینے کا بہانہ تھا۔ دریا میں نہاتے، سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے کھڑے ایک لوٹا پانی گرا کر کچھ گنگناتے، پھر گاؤں کے دوسرے نہانے آنے والوں سے باتیں کرتے۔ دریا کے اس پار سے اُس پار اور اُس پار سے اِس پار اُترنے والوں سے دیس سماج کا حال پوچھتے۔ تیتر کو پانی پلا کر اسے ریتیلی اودی زمین پر دیکھ کھلنے کو چھوڑ دیتے۔ دُور دُور بازاروں میں بکنے جانے والی چیزیں جو کشتیوں سے اُترتی رہتیں ان کا بھاؤ پوچھتے۔ اس طرح وہ روز صبح شام ہاتھی سے لے کر بٹیر تک، ہر چیز کے دام پوچھتے جو اُدھر سے گذرتی۔ پھر واپس آکر گھر میں پڑ رہتے۔

دن رات کا بقیہ حصہ وہ کہاں اور کس طرح گذارتے۔ یہ گاؤں والوں میں کم ہی کو یا شاید کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ہنگو ساہو اب کیا کھاتے اور کیا کماتے تھے یہ بھی کسی کو کیا معلوم ہوتا۔ اور اگر ہنگو کے اُس بھید سے کوئی واقف ہو سکتا تھا تو وہ ان کا تیتر تھا، جو گھر میں ہنگو کا اکیلا ساتھی تھا۔ جب دیوار کی نیو کھک جاتی ہے تو کسی اور سہارے نہیں ٹھہرتی، اور جب کسی کا زمانہ بدلتا ہے تو عموماً اچھی طرح بدلتا ہے۔ چنانچہ سیلاب نے جہاں سارا دھن دولت لے لیا وہاں سمے نے اپنے جان میں ہنگو کو جینے کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ تین گاؤں کی زمینداری دریا نے کاٹ کر اُس پار کے زمینداروں کے حصوں میں ڈال دی تھی۔ شیوالے کے پیچھے ہنگو کا جو پکا مکان تھا وہ شیوالے کے ساتھ راپتی کے دھارے میں آگیا تھا اور جب شیوالہ ہی گر گیا تو ہنگو کا مکان گرنا کیا بڑی بات تھی۔ یعنی جب بھگوان ہی پر آفت آئی تھی تو آدمی رونا کیا روتا۔ جگ جگ سے تھنکیں والے یہ مانتے آئے تھے کہ چاہے دنیا ڈوب جائے لیکن شیوالے کو آنچ نہیں آسکتی تھی۔ اسی لئے آج جب شیوالہ نہیں رہا تو تھنکیں کیسے رہتا۔

ہنگو کے گھر میں جو دولت تھی۔ اُسے سے اب دریا بہہ رہا تھا۔ کمبل کے علاوہ اگر کوئی اور چیز ملی تو وہ انکی بہی تھی جس میں اُن کے لین دین کا حساب رہتا تھا لیکن جو بہی مہینوں کیچڑ اور پانی کی ہو کر رہ گئی تھی اس میں آدمی کا حساب بھی کیا ملتا۔ ہنگو کا کس نے نہیں کھایا تھا۔ لیکن کس کے پاس کیا رہ گیا تھا جو ہنگو کسی سے پیسہ مانگتے۔ رگھو کل شکل نے انھیں اکثر یہ سکھایا کہ قرضداروں کو نوٹس دے کر ثبوت کے لئے عدالت میں بہی جمع کر دو۔ لیکن پہلے عدالت میں جانا جو ہنگو اپنی عزت اور شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ انھوں نے اب دھن اور عزت نہ رہنے پر رگھو کل شکل کی بات پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے کہ حقیقت یہ ہے وہ سرکاری عدالت سے ڈرتے تھے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ جو دعویٰ کئے بیٹھے تھے انھیں ہی کیا کچھ ملا جاتا تھا۔ انھوں نے صبر کر لیا رگھو کل کو انھوں نے یہ سمجھایا کہ عدالت کے سامنے بہی کی کیچڑ میں سنی ہوئی ڈھیری کی کالکھ کی لکھائی ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

لیکن جہاں ہنگو کی بہی دوسروں کے خلاف نہ چل سکی وہاں دوسروں کی بہیاں ہنگو کے خلاف خوب ہی چلیں اور ایسی چلیں کہ رہا سہا زمینداری کا حصہ اس طرح بک گیا راپتی سے لے کر سرجو کے کنارے تک جس جس کے رد کڑے میں تین ہزار کی ہلدی، ساڑھے چار ہزار کی مرچ، سات ہزار کا نمک اور نو سو ننانوے کا گڑ لکھا تھا وہ سب سود در سود جوڑ کر ہنگو نے سوت سوت بیچ کر ادا کرنا اپنا دھرم سمجھا۔ چونکہ آدمی روزگاری تھے اس لئے سوچا، زبان اور بات پر اڑے رہو، سمے بدلے گا تو یہی ایک کا تین دیکر جائیگا۔

چنانچہ ہنگو جب صبح شام بہی سامنے رکھکر اپنے دھن پونجی کا میزان لگاتے تو گھڑی، کمبل اور جھونپڑی کے علاوہ، جس میں اب وہ رہتے تھے۔ دو ہی چیزیں اور یاد آتیں۔ بیس آنے کا تیتہ اور دانت کھودنے والی ان کے گلے میں کھوردنی جس کی قیمت چاندی کا بھاؤ گھٹ جانے سے اب بیس پیسوں سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی لیکن اب بھی ہر سال دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت گوبر سے اندر کا برآمدہ لیپ کر بہی لے کر بیٹھتے تھے اور کسی سادہ پنے پر مذکورہ کے کھاتے میں انھیں پانچ چیزوں کا اندراج کر دیتے تھے۔

دیوالی سے پہلے دسہرہ آتا ہے اور دسہرے کے دن صبح کو گاؤں کا چڑی مار اب بھی ہنگو کو نیل کنٹھ دکھانے لاتا تھا۔ اس لئے آج دوپہر تک وہ چڑیمار کی راہ دیکھتے رہے اور جب دن گذر گیا اور چڑیمار نیل کنٹھ دکھانے نہیں آیا تو شام تک ہنگو بہت اداس ہو گئے۔ جب دن ڈوبنے سے پہلے چھپر کے بانس میں سے تیتر کا پنجرا اُتار رہے تھے تو انھوں نے ایسا محسوس کیا، جیسے کمر میں سکت نہیں رہی۔ پنجرا اُتارتے وقت جانگھیں کانپنے لگیں۔ ایک ہاتھ میں پنجرہ اور دوسرے میں سوٹا لے کر جو وقت وہ مکان کر

باہر نکلے سامنے کے درخت پر سے ایک نیل کنٹھ قیں قیں کرتا سیدھے زمین پر آیا۔ جھنگو ساہو کے پیر رک گئے۔ لیکن چونکہ دریا جانا تھا اس لئے اس شگون کے باوجود گئے۔ راستہ بھر یہی سوچتے رہے کہ دسہرے کے دن شام کے وقت نیل کنٹھ اوپر سے اتر کر نیچے کیوں آیا۔ اسی وقت کھیڑ رحم کا ہاتھی کے مستک کی اونچائی سے اترنا یاد آیا۔

دریا کے کنارے ملاحوں کے ساتھ دو جلیم کا سنجالی کر جب وہ بابو صاحب کے ہاتھی کا سیلاب میں بہہ کر مرنا بتا رہے تھے، تیسری جلیم کا دم کھینچتے کھینچتے جیسے ان کا دم چھوٹ گیا۔ ہوش کھوتے کھوتے انھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے دریا کے اس پار دراڑے میں سے جو الو اڑا تھا اس کی آواز ان کے کانوں میں کھڑ پیچ کہہ رہی تھی۔

ملاحوں کی پریشانی دیکھ کر کوٹ قمیض پہنے ہوئے بابو، جو اسی وقت کشتی سے اترے تھے، آ گئے۔ جس وقت وہ جھنگو ساہو کی نبض دیکھ رہے تھے، ان کی نظر جھنگو کی گھڑی کی چین پر پڑی۔ نبض ہلکی چل رہی تھی اس لئے جھنگو کی گھڑی ہاتھ میں لے کر نبض گننے لگے۔ لیکن جب سکنڈ کی سوئی چلتی نہیں دکھائی دی تو انھوں نے گھڑی کان پر لگائی۔ ملاحوں نے بتایا کہ گھڑی بولتی نہیں لیکن وقت ٹھیک بتاتی تھی۔ جو گھڑی سیلاب ہی کے وقت سے بند تھی۔ اس کی گھنٹے والی سوئی کو آٹھ پر دیکھتے ہوئے بابو نے کہا: "ہاں۔ اس وقت تو وقت ٹھیک بتا رہی ہے"۔ جب نبض کی طرف انھوں نے دھیان دیا تو نبض بند ہو چکی تھی *

غزل

عبد المجید سالک

خرد میں مبتلا ہے سالکِ دیوانہ برسوں سے
نہیں آیا وہ میخانے میں بیباکانہ برسوں سے

میسر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

نئی شمعیں جلاؤ عاشقی کی انجمن والو!
کہ سونا ہے شبستانِ دلِ پروانہ برسوں سے

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

بیادِ چشمِ یار اک نعرۂ مستانہ اے ساقی
کہ ہاؤ ہو سے خالی ہے ترا میخانہ برسوں سے

کسی کو تو مشرف کر دے اے ذوقِ جبیں سائی
تقاضا کر رہے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

کوئی جوہر شناس آئے تو جانے قدر سالک کی
پڑا ہے خاک پر یہ گوہرِ یکدانہ برسوں سے

غزل

مہندر سنگھ بیدی سحر

نہ بے نیازِ مسرت نہ غم سے بیگانہ
حدودِ فہم و خرد میں ابھی ہے دیوانہ

نہ خم نہ شیشہ نہ ساغر نہ مے نہ پیمانہ
ہے تیری مست نگاہی تمام میخانہ

یقیں میں صدق اگر ہے عمل میں جوش تو پھر
گذر جا دیر و حرم سے تو بے نیازانہ

قیام جب کہ نہیں ہے کسی کو دنیا میں
چہ صحنِ قصرِ بلوریں چہ کنجِ کاشانہ

نہ مبتلائے تمنا نہ صیدِ ناکامی
بکارِ خویش ہے ہشیار یوں تو دیوانہ

اگر ہے چشمِ حقیقت شناس دل میں دیکھ
اسی میں کعبہ بھی ہے اسی میں بت خانہ

اسی کا نور ہے اپنا رخِ حسن دونوں میں
نہ کوئی شمع جہاں میں نہ کوئی پروانہ

مجھے ہے ناز سحر دل کی بے نیازی پہ
اگرچہ فطرتِ انسان ہے گدایانہ

غلط مبحث

موجودہ طریقۂ تنقید اور اصول تنقید پر ایک ناقدانہ نگاہ

سیماب اکبرآبادی

ادب اردو اور تنقید یہ کہنا تو غلط ہے کہ ادب اردو میں تنقید کا وجود ہی نہیں، لیکن یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ تنقید کا جو معیار معہود ذہنی ہے وہ ابھی تک اردو کو میسّر نہیں ہوا۔ اردو ادب کی داغ بیل پڑتے ہی اس کے پرکھنے والوں کی تخلیق ہو گئی تھی۔ مگر یہ پرکھنے والے بھی ادیب ہی تھے اور ادب کو صرف من حیث الادب پرکھتے تھے۔ ان کی تنقید میں محاکمہ کا خارجی اثر برائے نام بھی نہ تھا۔ کیونکہ ان کا ماحول، ان کی معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کی جماعتی زندگی فی نفسہٖ خارجی اثرات سے محفوظ تھی۔ سب ایک ہی ماحول کے پروردہ، ایک ہی مدرسۃ الخیال کے طالب علم اور ایک ہی بساطِ ادب کے حاشیہ نشین تھے۔ ان کی علمی سمجھ بوجھ اور ان کے ادبی تجارب ہی ان کی تنقید کے اجزائے ناطق تھے۔ اس لئے ان کی تنقید انہیں کی زبانوں اور انہیں کی مجلسوں تک محدود رہی۔ مگر اس محدودیت میں بھی بڑی وسعتیں تھیں۔ انہیں وراثتِ فن اہل فارس سے ملی تھی جن کے مکمل اور فارغ التحصیل دماغ یہیں ہندوستان میں موجود تھے۔ ہندوستانی ادبا اور شعراء نے فن کو من حیث الفن حاصل کیا اور پھر اسے اپنی ملکی زبان میں منتقل کر کے اس کے تمام پہلوؤں پر مقامی نقطۂ نگاہ سے غور کیا۔ جو چیز بار سماعت پائی اسے متروک اور جو چیز قابلِ عمل دیکھی اسے معمول کر لیا۔ یہی ان کی فنی تنقید کا حاصل تھا۔ جس میں عہد بہ عہد ترمیم ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ زبان سلجھ کر صاف اور شستہ ہو گئی اور فنی قواعد جو پیچ در پیچ تھے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آنے لگے۔ شعر و ادب میں جو الجھنیں تھیں رفتہ رفتہ دور ہو گئیں، اور آخر وہ دور آگیا کہ اردو شاعر دعوےٰ کے ساتھ اپنی زبان اور زبان وطنی کا اعلان کرنے لگا کہ

کہتے ہیں جس کو اردو ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ دہلی اسکول کی طرف سے اعلانِ زباں دانی تھا۔ "لکھنؤ اسکول" سے بھی خاموش نہ رہا گیا اور اس نے بھی ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے!
اظہارِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے!

بظاہر یہ دو اسکولوں کا ایک دوسرے کو "چیلنج" تھا۔ لیکن اس میں حقیقت روح کی طرح پنہاں تھی کہ دورِ آخر میں اردو، اپنی لسانی، فنی، علمی اور ادبی حیثیات کے ساتھ مکمل ہو چکی ہے۔ اور وہ صلاحیتیں جو اس نے عربی، فارسی اور ہندی زبانوں سے عاریتاً لی تھیں اب اس کا ذاتی سرمایہ بن چکی تھیں۔ یہ سب کچھ تحقیق، تنقیح، اور تنقید ہی کی برکتیں تھیں۔ خاموش تنقید کی۔

اس وقت بھی جب کہ اشاعت کے ذرائع مفقود یا محدود تھے۔ مختلف موضوعات پر مختصر و طویل کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور لوگوں کو دیکھنے کے لئے ہاتھوں ہاتھ دی جاتی تھیں۔ میں نے بھی اس زمانے کی لکھی ہوئی ایک قلمی کتاب دیکھی ہے اس کا نام "تشریح العروض" تھا۔ مولوی میر علی اکبرآبادی اس کے مؤلف تھے۔ تاج گنج (آگرہ) میں ہاتھ سے بنے ہوئے دبیز کاغذ پر لکھی گئی تھی۔ متن اردو میں تھا۔ اور حاشیہ پر مختلف مطالعہ کرنے والوں کی مختلف رائیں، مختلف سیاہیوں اور مختلف قلموں سے ثبت تھیں۔ یہ رائیں عربی اور فارسی زبان میں زیادہ تھیں۔ رائے دینے والوں کے نام بھی درج تھے۔ بعض صفحات پر حاشیے تھے اور بعض پر نہ تھے، موضوع فنِ عروض تھا۔ عربی قواعد کا ترجمہ اردو میں کیا گیا تھا۔ جو زیادہ صاف اور عام فہم نہ تھا۔ تمام بحور و اوزان، فصاحت، بلاغت، علم کلام، عیوب و محاسن شعر، تشبیہ و استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل اور تمام اوصافِ سخن کی تشریح اردو زبان میں تھی۔ اور جا بجا مؤلف کے تنقیدی اشارے بھی موجود تھے۔

مقصد یہ ہے کہ ادب اردو کا وہ دور جس کے متعلق تاریخ ادب اردو خاموش ہے، جذبۂ تنقید سے خالی نہ تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ تنقید کا آغاز حالی اور شبلی کے زمانے سے ہوا ہے غلط ہے۔

تنقید دور مابعد میں اس دور کے بعد مولانا حالی، علامہ شبلی، سر سید احمد خاں اور مولانا آزاد دہلوی کا زمانہ آیا۔ اور ان لوگوں نے تنقید کو ایک الگ موضوع کی حیثیت دے دی۔ اب اشاعت کی آسانیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اس لئے اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں چھپیں اور شائع ہوئیں۔ مگر ان تمام تنقیدوں میں مشرقیت اپنی خالصیت کے ساتھ موجود تھی۔ اور خالصیت ضروری بھی تھی، اس لئے کہ اردو کی ساخت میں صرف مشرقی زبانوں کا عنصر غالب تھا۔ ہندی، فارسی، اور عربی الفاظ کے اختلاط سے اردو بنی تھی۔ اردو شعر و ادب میں عربی اور فارسی شعر و ادب کی عکاسی تھی۔ افعال ہندی، فن عربی الاصل اور موضوعات فارسی نژاد تھے۔ اس لئے تنقید بھی انہیں تین زبانوں کے ادب اور اصول کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی تھی۔ اگر یہی اصول کم و بیش اساسِ تنقید بنائے جاتے اور انہیں موضوعی حیثیت سے منضبط کر دیا جاتا تو آج تنقید کا صحیح معیار ہمارے سامنے ہوتا۔ مگر اردو زبان کی یا ہماری بدنصیبی سے اس میں آگے چل کر خلط مبحث ہو گیا۔ جو آج تک روایتی طور پر فیصلے ادب پر طاری و ساری ہے۔

غلط مبحث کیوں ہوا؟

ہندوستان پر انگریزی قبضہ ہونے کے بعد حکومت کی دفتری ضرورتوں کے لئے ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہوئی جو انگریزی لکھ پڑھ اور بول سکیں۔ اس ضرورت کے ماتحت مغربی اصول پر نئی درسگاہیں قائم ہوئیں اور ان میں بتدریج علوم وفنونِ مغربی کی ترویج لازمی کر دی گئی۔ مغربی ادب کے نفوذ نے انگلستانی، جرمنی، فرانسیسی اور یونانی نقادوں کے لئے ہندوستان آنے کی راہیں کھولدیں۔ آج کے طالب علم کل کے پروفیسر بنے۔ جو پڑھا تھا وہی دوسروں کو پڑھایا۔ جو خود سیکھا تھا وہی دوسروں کو سکھایا۔ یہ سلسلہ کم وبیش سو برس سے جاری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اردو ادب وشعر پر تنقید کرنے والے زیادہ تر کالج کے کچھ پروفیسر ہی ہیں۔ شعرا اس میدان میں شاذ شاذ ہی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ پروفیسر ایف اے۔ بی اے۔ اور ایم اے کلاس کو انگریزی ادب پڑھاتے ہیں، اور انگریزی ادب پر لیکچر دیتے ہیں، اس لئے ان کا ہر جہتی نقطۂ نگاہ بھی مغربی ہے، مشرقی بالکل نہیں کیونکہ یہ لوگ (ماشاءاللہ چند) السنۂ مشرقیہ اور علوم مشرقی سے برائے نام واقف ہوتے ہیں۔ اور انگریزی لٹریچر ہی ان کے مطالعۂ مستقل کا جزوِ مستقل ہوتا ہے۔

بنائً علیٰ ہذا ان پروفیسروں کا تنقیدی نقطۂ نگاہ بھی مغربی ہے اور جب یہ نفسِ تنقید پر قلم فرسائی کرتے ہیں تو ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جس میں مارکس، گوسئٹے، میتھیو آرنالڈ، ورڈس ورتھ، کولرج، شیلے، کارلائل، میکالے وغیرہ وغیرہ مغربی ناقدین کے اقوال ونظریات بیان کرتے کرتے یہ لوگ سقراط، ارسطو اور افلاطون تک نہ پہنچ جاتے ہوں۔ اور یہیں سے خلطِ مبحث شروع ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی ادب پر مغربی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا، مشرق کو مغرب کی عینک سے دیکھنا، اردو ادب کی لسانی نزاکتوں کو انگریزی نظر سے پرکھنا، پھر اس میں عیب نکالنا اور اس عیب جوئی پر نازش کرنا۔ ایک عجیب مخلوط ومخبوط ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ ان کی افلاطونی تنقیدیں ان کی نگاہوں میں کتنی ہی جاندار کیوں نہ ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ دو ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کی حنوط شدہ ہیں۔ فنِ تنقید کو لے کر انھیں وہیں سے آگے بڑھنا چاہئے تھا جہاں اس فن کو حالی، آزاد، شبلی اور سرسید نے چھوڑا تھا۔ اگر تکمیلِ فن میں کچھ کمی رہ گئی تھی تو وہ رفتہ رفتہ پوری کی جاسکتی تھی مغربی علوم وفنون سے استفادے کے بعد مشرقی فنِ تنقید میں بعض نئے اصول کا اضافہ ہوسکتا تھا۔ اور بعض پرانے اصول ترک کرنا ممکن تھا۔ اور اگر یہ خالص ہندوستانی نقادان کے معیارِ نظر پر صحیح اور پورے نہیں اترتے تھے تو ان کے لئے عربی ادب سے استفادہ کرنے کی راہیں بند نہ تھیں۔

امرؤ القیس، عبد القادر جرجانی، ابو یعقوب سکاکی، ابو قتیبہ، ابن رشیق، محمد بن سلام، قدامہ بن جعفر، ابن شرق وغیرہ نقادانِ فن کے نظریات کو پیش نظر رکھ کر فن تنقید کے قواعد وضوابط منضبط کئے جا سکتے تھے لیکن یہ موجودہ تعلیم کا اثر تھا کہ اس نے مشرقی علوم کی طرف ہندوستانی طلبائے علم کو متوجہ نہ ہونے دیا۔ اگر مغرب کے نظریات اور اصولِ تنقید طلبائے مشرق تک نہ پہنچ سکتے اور مشرقی علوم سے بھی بے نیازی رہتی تو تنقیدی جذبات کا خاتمہ ہی تھا۔

مستقبل قریب میں اگر سنسکرت (ہندی) نے ہندوستان کی علمی فضاؤں پر غلبہ کر لیا، تو ہمارے یہ ماضی پسند نقاد غالباً "ساہتیہ پریچے"، "ساہتیہ لوچن"۔ اور ساہتیہ سدرش وغیرہ کتابوں کے پرانے اصولِ تنقید کی پیروی اور تبلیغ کرنے لگیں گے۔ "چیست یارانِ طریقت بعد ازاں تدبیر ما؟"

آخر ہمارے نقادوں کو ہندوستانی طرزِ تنقید سے چڑ کیوں ہے؟ شعر کا وزن کرنے کے لئے عربی باٹوں کی گرانباری کا رونا عام طور پر رویا جاتا ہے۔ مگر مغربی طرزِ تنقید کے معیار پر جنس اردو کو پرکھنا کسی پر بار نہیں گزرتا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ ادبیات کا تقلیدی دور ہے (جسے غلطی سے عبوری دور کہا جاتا ہے) ابھی تک شعر وادب میں بھی وہی پرانا تقلیدی رنگ ہے اور نقد ونظر میں بھی وہی قدامت ہے۔ اور اس کا سبب ہے قوتِ اجتہاد کی کمی، جب تک کوئی مجتہدِ فن پیدا نہ ہو اس قدامت زدگی کا کوئی صحیح علاج نہیں ہوسکتا۔ اور نہ موجودہ خلطِ مبحث دور ہوسکتا ہے۔

دورِ مابعد کے بعد

گویا دئ النظر میں شبلی، آزاد، سرسید اور حالی کے بعد مشرقی فنِ تنقید کا ٹھراؤ محسوس ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی طرزِ تنقید کی رو چلتے چلتے یکایک رک گئی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان ہندوستانی نقادوں کے بعد بھی نقاد پیدا ہوئے۔

مولانا عبد الحلیم شرر، ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری، مہدی حسن افادی الاقتصادی، میر ناصر علی خاں دہلوی، کے تنقیدی کارنامے بھول جانے کی چیزیں نہیں ہیں۔ ہندوستان رجال العلم سے کبھی خالی نہیں رہا۔ آج بھی مولانا ابو الکلام آزاد، سید ابو العلا مودودی، علامہ مشرقی قابلِ رشک اور ناقابلِ مقابلہ ادبی اہلیتوں کے حامل ہیں۔ مگر ان میں سے بعض نے مذہب اور بعض نے سیاست میں حصہ گیر ہو کر خدمتِ ادب سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اور ادب کی اصلاح وتعمیر کا کام زیادہ تر چند ناتجربہ کار اور غیر ذمہ دار ہاتھوں میں آپڑا ہے جن کی مغرب زدگی انھیں خالص ہندوستانیت کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتی۔

مولانا نیاز فتحپوری نے البتہ اردو ادب و شعر پر تنقید میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مگر وہ بھی تنقید کے صرف ایک پہلو تنقیص کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور تحسین کلام ان کی عادت میں داخل نہیں۔ مولانا عبدالحق کی کوششیں بیشتر تحفظ و بقائے اردو تک محدود ہیں اور چند تنقیدیں انھوں نے لکھی ہیں ان کو "ریویو" یا "تقریظ" کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ "فن تنقید" پر یکسو ہو کر کوئی کتاب انھوں نے اب تک نہیں لکھی۔ بعض دیوانوں کے مقدمات میں کہیں کہیں تنقید کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔

تنقیص بجائے تنقید

میں نے اپنے اس مضمون میں کہیں لکھا ہے کہ شعرا اس میدان میں شاذ و نادر ہی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو کوس "انا" بجاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کے معاصرین میں سے کسی کا کلام قابلِ داد سمجھا جائے۔ یہی جاہلانہ انانیت ہے جو ہمارے شعرا کو ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ اور ایک دوسرے کو اس کے مقام سے گرانے کی فکر میں خود بھی کسی خاص مقام اور درجے تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔

جب ہمارے شعرا کسی ہم عصر شاعر کے کلام پر زحمت تنقید فرماتے ہیں تو انھیں سب سے زیادہ عیوبِ کلام کی تلاش رہتی ہے اور اگر کوئی عیب نہیں ملتا تو اشعار کی صورت مسخ کر کے، یا شاعر کے مقصدِ معیّن کے خلاف کوئی نیا مقصدِ شعر پیش کر کے حق تنقید ادا کیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تنقید سراپا تنقیص بن جاتی ہے۔ اور ناظر کی نگاہ میں وہ ایک متعصب اور مخالف کی حیثیت تو حاصل کر لیتے ہیں مگر ایک نقاد کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ امر قطعی اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی شاعر کے کلام پر کوئی شاعر ہی صحیح تنقید کر سکتا ہے۔ جو لوگ شعر نہیں کہہ سکتے وہ شاعر کی فکری و فنی مشکلات کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور شاعر جن بلندیوں پر پہنچ کر الہامات کی بارش کرتا ہے وہاں تک ان کی نظر تو نظر، خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی خودی اور انانیت کو نہیں چھوڑتا۔ اس لئے اس کا فرض غیر شاعر ادا کرتے ہیں۔

صحیح علاج

اس تمام افراط و تفریط اور خلط مبحث کا صحیح علاج یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ادیب جو تنقید کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے فن تنقید کے کچھ اصول معیّن کر لیں۔ انھیں اصول پر ادب اردو کو پرکھیں اور غیر ملکی نظریات کو دستورِ ماضی سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیں۔ اپنا نظریہ اپنے ماحول، سماج، اور تہذیب و معاشرت کے مطابق بنائیں۔ اور ان پر عامل ہوں۔ تنقید کو صرف قافیہ و تقطیع نہ سمجھیں۔

تنقید کے جدید پیرائے اختیار کریں۔ عربی اور فارسی اسلوب تنقید میں جو اسالیب مفید اور آفاقی و جدلیاتی ہوں انھیں قبول کر لیا جائے اور جن قواعد کا اردو ادب پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں ہوتا اور جو فنی حیثیت سے صرف عربی اور فارسی ادب کے لئے مخصوص ہیں انھیں ترک کر دیا جائے۔

اردو شاعری میں موضوعات کی تبدیلی

یہ بات بہ اتفاق رائے مان لی گئی ہے کہ ادب کو ملک کی اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور نئے نئے موضوعات اردو شاعری میں خود بخود پیدا ہو رہے ہیں تاہم غزل بھی تغزلِ محض کے ساتھ باقی ہے۔ پیہم اور مسلسل کوشش کرنے کے بعد بھی بعض شعرا "غزل" کا جنسیاتی و جمالیاتی عنصر ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ "غزل" کا جمالیاتی عنصر تو باقی رہنا چاہئے لیکن جنسیاتی جذبات کی ترجمانی بھی ایک وقت خاص تک رکتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے غزل کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے۔ وہ مشاعروں کی شاعری کے لئے مخصوص رہے۔ جہاں غزل سرائی کا مقصد صرف "تفریح" اور مسرت اندوزی ہے۔ زمانہ سب سے بڑا نقاد ہے۔ سوسائٹی کی پست مذاقی کے ساتھ یہ جنسیاتی تغزل بھی ایک دن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ نیا دور آ رہا ہے۔ زندگی کی نئی قدریں معیّن ہو رہی ہیں۔ اردو شاعری کو انھیں قدروں کا ساتھ دینا ہے۔ اس لئے اگر "غزل" اپنے لغوی معنیٰ کے ساتھ کچھ دن اور باقی رہنا چاہتی ہے تو ثقہ شعرا مجبور نہیں ہیں کہ وہ جوانانِ وطن کی مجلسوں میں بیٹھ کر عورتوں کی باتیں کئے جائیں۔ انھیں اپنی "غزل" کے لئے کوئی دوسرا عنوان ڈھونڈ لینا چاہئے۔ مثلاً وہ غزل نہیں "رجز"[1] کہیں۔ اور اسے غزل کا لغوی نہیں بلکہ اصطلاحی بدل سمجھیں۔ رفتہ رفتہ "رجز" کا رواج عام ہو جائے گا اور شعرا کے رجحانات بھی عنوانِ نو کیساتھ بدل جائیں گے۔ وقت آگیا ہے کہ "غزل" کے قدیم مستعار موضوعات کو یک قلم ترک کر کے "رجز" کے لئے نئے موضوعاتِ فکر موجودہ ماحول سے تلاش کئے جائیں جن کی لَے مردانہ ہو، جن کا تعلق مردانِ وطن سے ہو، اور جو سننے والوں میں آگہی، خود شناسی، مردانگی اور زمانے کے ساتھ چلنے کی استعداد پیدا کر سکیں۔ یہ کام نظموں سے بھی لیا جا سکتا ہے اور لیا جا رہا ہے۔ مگر میں "رجز" کو "غزل" کا قائم مقام بنا کر "غزل" کی روایتی قدر و قیمت، اس کی پسندیدہ ترتیب، اس کے اجمال کی جامعیت، اس کا مشرقی پن اور خیالات کا یکجائی تضاد باقی رکھنا چاہتا ہوں۔ غزل کا سانچہ مجھے بہت پسند ہے۔ مواد نیا ہو تو ہو لیکن سانچہ یہی رہنا چاہئے۔ اگر اسالیبِ غزل باقی نہ رہے تو ہمارے نقادوں کی تنقیدیں پھیکی رہ جائیں گی۔

[1] یا کوئی اور عنوان مقرر کر لیا جائے۔ مثلاً شعریہ۔ افکارہ۔ شہ پارہ۔ قدیمہ۔ سخن پارہ وغیرہ۔ رواج پا جانے کے بعد ان میں سے ہر عنوان مانوسِ سماعت ہو سکتا ہے۔

شاعرِ رومان حضرت اختر شیرانی کا مجموعۂ کلام

شرابِ شعر و سخن کے متوالوں کو مژدہ ہو کہ
شعرائے ہند کی صفِ اول کے جادو بیان، شاعرِ رومان خیام الہند

حضرت اختر شیرانی

کا مجموعۂ کلام چار جلدوں میں شائع ہو گیا ہے۔ کلام کیا ہے ہر شعر کیف و سرور کا چھلکتا ہوا پیمانہ ہے جس میں جذبات کے سیکڑے لہریں لے رہے ہیں۔

صبح بہار ——— تین روپے
اخترستان ——— تین روپے
لالۂ طور ——— تین روپے
طیورِ آوارہ ——— تین روپے

جملہ کتب کا سائز ۲۷×۱۷ کاغذ عمدہ جلد بندی مضبوط گرد پوش جاذبِ نظر ہے۔ آج ہی طلب فرمائیے ——— (فہرست کتب مفت طلب فرمائیے)

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

بچوں کا بُک کلب

(۱۶ سال سے کم عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے)

تھیکرز نے بچوں کے لئے ایک بک کلب قائم کیا ہے۔ ہندوستان میں بچوں کی کتابیں چھاپنے والی کمپنیوں میں تھیکرز سب سے پہلی اور سب سے بڑی ہے۔ بچوں کے لئے ان کی چھاپی ہوئی خوبصورت اور باتصویر کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بک چکی ہیں۔ یہ بک کلب اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ ان کی کتابیں زیادہ سے زیادہ بچوں کے پاس پہنچ سکیں اور اتنی سستی ہوں کہ بچے اپنے جیب خرچ سے انہیں خرید سکیں۔ ابھی یہ کتابیں انگریزی میں ہیں لیکن اس سلسلے کو اردو اور دوسری زبانوں میں شروع کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ جدید تفصیلات کے لئے آج ہی خط لکھکر "چلڈرنز کیٹلاگ" منگالیں۔ اس میں ممبری اور داخلہ وغیرہ کے قاعدے درج ہیں۔ ہمارے ہاں انگریزی میں سب قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں۔

فہرست مفت طلب کریں

میسرز تھیکر اینڈ کمپنی بمبئی

حیاتِ محمد علی جناح

ہندوستان کے مشہور ادیب و سوانح نگار
رئیس احمد جعفری

جنہوں نے آج سے بارہ سال قبل رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے سوانح حیات لکھے تھے، ہندوستان کی ایک دوسری

محمد علی یعنی قائد اعظم

کے سوانح حیات اپنے مخصوص انداز میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب صرف قائد اعظم کے سوانح حیات کا مرقع ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل سیاسی تاریخ ہے۔ قیمت پانچ روپے۔ اسی مصنف کا حیرت آفریں ناول باغی ضرور مطالعہ فرمائیں۔ چار روپے بارہ آنے۔ "پھریری" افسانے عظیم بیگ چغتائی اڑھائی روپے۔ حسن و شباب افسانے ماہر القادری دو روپے۔ جوش کے مجموعے "شعلہ و شبنم" پانچ روپے۔ نقش و نگار۔ ساڑھے تین روپے۔ عرش و فرش چار روپے۔ انتخاب۔ اڑھائی روپے۔ جذبات ماہر دو روپے

کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

اردو زبان کے ہر دلعزیز ناول نویس

رشید اختر ندوی کے تین نئے ناول

آپ کے دلوں میں میٹھی میٹھی چٹکیاں لینے، کبھی ہنسانے اور اکثر رلانے والے رشید اختر ندوی کے تین نئے اور حیرت انگیز ناول نشان راہ، کانٹوں کی سیج اور نسیم چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ نے رشید اختر ندوی کے پہلے ناول بھی پڑھے ہوں گے۔ مگر یہ نئے ناول بالکل انوکھے اور انتہائی دلچسپ ہیں۔
رشید اختر ندوی نے انہیں لکھکر ہر بیرونی زبان کے ناولوں کو چیلنج کیا ہے۔ نشان راہ تین روپے آٹھ آنے۔ کانٹوں کی سیج تین روپے آٹھ آنے۔ نسیم تین روپے آٹھ آنے۔
رشید اختر ندوی کے پہلے ناول تشنگی چار روپے۔
تلخیاں تین روپے

ملنے کا پتہ

کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

سلطان سلیم کی فارسی شاعری

سلطان سلیم اول، محمد فاتح کا پوتا، بایزید ثانی کا بیٹا، کوئی آٹھ سال قسطنطنیہ میں تخت نشین رہا اور ان آٹھ سالوں میں اس نے وہ وہ جنگی کارنامے کئے کہ آج تک اسے سلیم مہیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ اپنے صوفی منش اور شاعر مزاج باپ کو سلطنت سے علیحدہ کیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے دونوں بھائیوں کرکود اور احمد کا خاتمہ کیا۔ جب اپنے خاندان سے نپٹ چکا تو پھر آس پاس کے ممالک کی طرف متوجہ ہوا۔ محمد فاتح اور بایزید ثانی نے اپنی فتوحات کا دائرہ یورپ میں پھیلایا تھا۔ محمد فاتح نے البانیہ فتح کیا، بایزید ہنگری تک جا پہنچا لیکن سلیم نے سلطنت عثمانیہ کو ایشیا میں وسعت دی۔ پہلے سے دوگنا علاقہ فتح کیا۔ دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا بڑا حصہ جس میں مکہ مدینہ بھی شامل تھے۔ آٹھ سال کے اندر اندر اپنی حکومت میں داخل کر لیا۔ عرب کی فتح سے ترک اسلامی خلیفہ بن گئے۔ مصر کی وجہ سے ان کی بحری طاقت میں تقویت آگئی۔ شام کو مٹا کر اور ایران کو پیچھے ہٹا کر انہوں نے یورپ میں آگے بڑھنے کے لئے اپنی پشت مضبوط کر لی۔ سلیم نے یہ سب کچھ ایک باقاعدہ سکیم کے مطابق ایک معین پروگرام بنا کر کیا۔ محض خود مختار حکمرانوں کی طرح نہیں کہ من کی موج جدھر لے گئی ادھر بہہ نکلے۔

سلیم کی زندگی مہمات و فتوحات سے بھرپور تھی، وہ صلح و جنگ کے انتظامات میں اس قدر مصروف تھا کہ حرم سرا سے بہت کم دلچسپی رکھتا تھا یعنی عام آدمیوں کی طرح تھا، عام راجاؤں بادشاہوں کی طرح نہ تھا مگر سلطنت کے روز افزوں کاروبار کے باوجود وہ علمی صحبتوں کے لئے وقت ضرور نکال لیتا۔ اس طرح کہ دن بھر حکومت کے کام کرتا اور رات کو سوتا کم اور زیادہ حصہ کتابوں کے مطالعہ، اہل علم سے مذاکروں اور شعر و شاعری میں صرف کرتا۔ شاعری کا شوق محمد فاتح کو بھی تھا اس کا ترکی دیوان موجود ہے۔ بایزید ثانی بھی شعر کہتا تھا اور سلیم کا چچا شہزادہ جم تو اپنے عاشقانہ کلام کی وجہ سے آج تک ترکی شاعری میں ایک ممتاز ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد فاتح کی طرح سلیم سکندر اعظم کے کارناموں کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور سکندر ناموں کی طرح اس نے ترکی میں مثنویات بھی لکھی ہیں۔ اور یوں تو شاید ہی عثمانی بادشاہ گزرا ہو جس نے شعر نہ کہے ہوں۔ مگر سلیم کا نام خاص طور پر اس لئے مشہور ہے کہ اس کا فارسی کلام آج تک پڑھا جاتا ہے۔

سلیم کا شاعرانہ رتبہ بس اتنا ہی ہے جتنا عام شعر گو سلاطین کا ہوتا ہے۔ اس طرح کا کلام عموماً کلام الملوک ملوک الکلام کی سرخی سے زینت پاتا ہے۔ اور تاریخ ادب میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے اسی بحث کا موضوع بنتا ہے کہ کیا یہ کلام استادوں کا ہے یا شاہ کا اپنا۔ سلیم کے کلام کو ایک اور وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اگلی سے پہلی جنگ عظیم کی تیاریوں کے سلسلے میں قیصر ولیم نے ترکی کو حلیف بنانے کے لئے جو جتن کئے ان میں سے ایک وسیلہ سلیم کا فارسی کلام بھی تھا۔ برلن سے ایک آراستہ پیراستہ، مطلا و مزین، ایڈیشن کلام سلیم کا شائع ہوا۔ اور اسے ترکی میں تقسیم کیا گیا۔ ایسا ایڈیشن شاید آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ نسخہ ماسکو، استنبول، برلن اور پیرس کے کتب خانوں کے مختلف قلمی نسخوں کے مقابلے سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے عموماً جو مطبوعہ نسخے استنبول سے شائع ہوتے تھے وہ نامکمل اور نامعتبر تھے۔ لیکن یہ درست ہے کہ سلیم کا کلام جرمن نسخے کی اشاعت سے پہلے ترکی میں مقبول تھا۔ میرے سامنے "دیوان یاوز سلطان سلیم" کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۳۰۵ھ میں استنبول سے شائع ہوا اور اس کے سرورق پر جو سلیم کی قلمی تصویر ہے وہ اس مضمون کے ساتھ چھپ رہی ہے۔

دیوان سلیم کے کچھ قلمی نسخے انگلستان کے کتب خانوں میں بھی ہیں لیکن کچھ ایسے مستند نہیں اور کتب خانے والوں کی بے توجہی کا یہ حال ہے کہ فہرستوں میں ہر سلیم کو سلطان سلیم سمجھ لیا گیا ہے۔ چنانچہ کنگز کالج کیمبرج کی لائبریری میں ایک ایسے ایرانی شاعر سلیم کا دیوان ہے جس نے شاہجہاں کے قصیدے لکھے ہیں اور ہندوستان میں رہنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن فہرست کتب میں اس سلیم کو سلیم اول سلطان ترکی ظاہر کیا گیا ہے۔ برٹش میوزیم کی فہرست کتب بھی ایسی غلطیوں سے پاک نہیں۔ برلن کی ایڈیشن ایک طرح سے قاطع ایڈیشن ہے۔ سیاسی اغراض کی خاطر ہی سہی اس طرح ایک معمولی علمی کام غیر معمولی اہتمام سے سر انجام ہو گیا۔ جھی توپیں بنانے سے تو بڑی کتابیں اچھی طرح چھاپنا بھی بہتر ہے اور سلیم کا فارسی کلام یقیناً دلچسپ ہے۔

کچھ غزلیں، کچھ نظمیں، کچھ قطعات، کچھ رباعیاں جس طرح عام دیوان ہوتے ہیں ردیف وار لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ یہ کلام ایک فاتح سلطان کا ہے۔ عاشقی میں بھی دم خم ترکی تلوار کا ہے۔ حمد میں بھی جھکتے ہیں تو تیغ رومی کی طرح۔ حمد کے اشعار ہیں ؎

ہیچ بے امرِ تو از بندہ نیاید امرے — من بامرِ تو کنم ہر چہ تو می فرمائی
بادشاہی است ہیچے کہ گدائے درِ تست — دانشے بخش کہ افزوں بود از دانائی

اور اس میں ایک شعر ہے جو اقبال کی بول چال میں ہے ؎

چوں زہد قہرِ تو پروازِ شاہین قضا — پشہ در کلۂ نمرود کند عقابی!

بعض میں گدا بتایا ہے لیکن گدائی کے ذریعہ سے شاہنشہی کے حصول کا شوق تو کم ہے ؎

شاہنشہ آں گدا کہ بود خاکِ راہِ او — آزاد بندہ کہ گرفتارِ مصطفےٰ ست

ڈاکٹر تاثیر

مشتمل کلام غزلیات پر مشتمل ہے اور ان کے بیشتر اشعار رسمی ہیں لیکن ان غزلیات میں سلطان سلیم کبھی بار عاشقانہ رسمی اور غزلیاتی مفروضات نظر انداز کر دیتا ہے اور اپنے سلطانی رنگ میں آجاتا ہے۔ ایک غزل ہے مسلسل غزل یا یک قافیہ نظم کہہ لیجئے بہرصورت مطبوعہ دیوان میں شامل ہے۔ اس میں جنگ ایران و روم کا ذکر ہے سلطان سلیم کا عہد حکومت ۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۰ء ہے (بمطابق ۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ سال پیدائش ۱۴۶۷ء م) بایزید ثانی کے آخری سالوں میں شاہ اسمٰعیل صفوی نے ایران سے نکل کر عراق، عرب، خراسان اور دیار بکر پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۵۱۰ء میں فارستان اور آذربائیجان کو ملحق کر لیا۔ اس طرح اس کی سلطنت خلیج فارس سے بحیرۂ کیسپین اور آمو دریا سے فرات تک پھیل گئی اور ایران کی سرحد سلطنت عثمانیہ سے مل گئی۔ یورپ کے حکمران ایران کے حکمرانوں سے جوڑ توڑ کر کے ترکوں کی یورپ میں فتوحات روکنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ اسمٰعیل کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر سلیم نے مغرب کی طرف سے یورپ اور مشرق کی طرف سے ایران کے بیک وقت حملہ آور ہونے کے خطرہ کو محسوس کیا اور مغرب والوں سے معاہدے کر کے شاہ اسمٰعیل کی طرف پلٹا۔ اسمٰعیل نے سلیم کے بھائی احمد کے بیٹے مراد کو پناہ دے رکھی تھی اور مراد سلیم کے تخت کا امیدوار تھا۔ اس پر شیعہ سنی کا یہ اسی حیلہ بھی موجود تھا۔ غرض سلیم اور اسمٰعیل دونوں لڑنے پر تلے بیٹھے تھے۔ سلیم نے ینی شہر کے میدان میں ایک لاکھ چالیس ہزار فوج اور تین سو توپیں جمع کیں اور ۲۰ اپریل ۱۵۱۴ء کو ایران کے دارالسلطنت تبریز کی طرف جو یہاں سے ایک ہزار دو سو میل تھا کوچ کا حکم دیدیا۔ پہاڑی راستہ نہ سڑکیں نہ رسد کا انتظام اسمٰعیل نے مقابلے کی بجائے تمام سرحدی علاقے برباد کر دئے جس طرح پچھلی جنگ میں روسیوں نے جرمنوں سے کیا تھا اور خود تبریز لوٹ گیا۔ ۲۰ اپریل کو چلی ہوئی فوج مارا مار کرتی ایک سو چھبیس دنوں میں ۲۴ اگست کو تبریز کے سامنے وادی چالدیران میں صف آرا ہو گئی۔ بارہ سو میل کا سنگلاخ سفر، دشمن کا ملک رسد کی کمی، راستہ میں بیس ہزار آدمی بھوک پیاس سفر کی کلفتوں سے مارا گیا۔ لیکن یہ بقیۃ السفر خستہ حال عثمانی تازہ دم ایرانی سواروں کے سامنے ڈٹ گئے۔ شاہ اسمٰعیل کا دستہ بڑھا اور مقابل کے عثمانیوں کو پسپا کر دیا۔ سلیم نے بھاگتوں کو للکارا اور ترکوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ ایرانی خوب جان توڑ کر لڑے مگر ترکوں کے پاس توپیں تھیں، نئے اسلحہ جنگ تھے اور ایرانی پرانے ہتھیاروں اور محض بہادری سے توپوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ شاہ اسمٰعیل خود زخمی ہوا اور پچیس ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سلیم نے مفتوح ممالک پر مشہور مورخ ادریسی کو گورنر مقرر کیا اور مصر کی طرف متوجہ ہوا۔

اس تاریخی واقعہ کا تذکرہ سلیم کی غزلیات میں ہے مطلع ہے ؎

لشکر از تختِ ستانبول سوئے ایران تاختم
سرخ سر را غرقۂ خونِ ملامت ساختم

"سرخ سر" ایرانی فوج کی سرخ لنگیوں کی وجہ سے کہا ہے۔ وہی چیز جو عام شاعروں کے ہاں مبالغہ اور بے بنیاد تعلّی سمجھی جاتی ہے سلیم کے کلام میں واقعاتی بیان معلوم ہوتی ہے ؎

کشورِ دہر گرفتیم بہ ہمت آساں — گرچہ دشوار نماید تو آسانئ ما

اور یہ جتا ہوا مبالغہ ہے۔ شاید دماغ میں ایران کا کٹھن پہاڑی سفر تھا ؎

کوہ فریاد برآرد چو آہو راندن — در گذار از شکوہ و نوبتِ سلطانئ ما

مطلع بھی اسی سفر کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

در سفر گشتن و ایں بے سروسامانئ ما — ہر جمعیتِ دلہاست پریشانئ ما

اور گھمسان کے معرکوں میں سے بچ نکلنے کی یاد میں ؎

چشم ما گشت بہ پیکانِ بلا جوشن پوش
کہ بود حفظِ الٰہی بہ نگہبانئ ما

لیکن یہ تو ہوئیں غیر متعلق گو دلچسپ باتیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ غزلوں میں تغزل کیا رنگ ہے اور کیا عاشقانہ اشعار میں بھی انفرادیت قائم ہے۔ عام اشعار جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے بس سلطانی قسم کے ہیں جیسے شوقین رئیس کہا کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں دیوانِ سلیم میں ایک ہلکی سی جھلک اس کی اپنی شخصیت کی دکھائی دیتی ہے ایک ہی غزل کے چند اشعار ہیں ؎

آہ است نالہ از سپہر غم لفیر ما — اے ترک شوخ چشم حذر کن ز تیر ما
بر ما اگرچہ ملکِ جہاں عرضہ داشتند — جز دردِ عشقِ یار نشد دل پذیر ما
در حسن اگرچہ یار ندارد نظیرِ خویش — در ملکِ عشق نیز نباشد نظیر ما

متفرق اشعار کا انداز یہ ہے ؎

مجنونِ دشت پو شحنۂ ویرانہ می رسد
طفلانِ شہر مژدہ کہ دیوانہ می رسد

شادند خیل مغبچگاں بادہ ہا بکف
کاشوب دیر فتنۂ میخانہ می رسد

؎ اجازت شد حریفاں چشم ساقی گشت خواب آلود
بمجلس یک اشارت بس بود رندانِ دانا را

؎ ما را نباید شد بر ہیچ چیزے لیک بردم رشک
کہ رسم عشق پیش از من دریں عالم چرا بودست

آپکی رائے

"آجکل" کا سالنامہ آپ کے پیش نظر ہے آپ سے استدعا کی جاتی ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد جملہ مضامین نثر و نظم اور تصاویر کی بابت اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمائیں۔

ادارہ

غزل

اطہر ہاپوڑی

دل کو غارت ترے پیکان کئے جاتے ہیں
گھر مرا لوٹ کے مہمان لئے جاتے ہیں

دل سے چُن چُن کے جو پیکان لئے جاتے ہیں
اس بھرے گھر کو وہ سنسان کئے جاتے ہیں

عدم آباد کو خالی کوئی جاتا ہی نہیں
جانے والے ترے ارمان لئے جاتے ہیں

طعنِ اغیار کا ہوتا ہے تحمل مشکل
زہر کے گھونٹ کچھ آسان پئے جاتے ہیں

شغل یہ ہاتھ لگا جوشِ جنوں میں اچھا
چاک کر کر کے گریبان سئے جاتے ہیں

اس نزاکت پہ شہید آپ بھلا کیا کرتے
یاد رکھئے یہ ہم احسان کئے جاتے ہیں

خواہشِ مرگ نہیں کس کو محبت میں مگر
موت آتی نہیں آسان جئے جاتے ہیں

شیخ کو رند لگا لائے ہیں میخانہ میں
آج حضرت بھی مسلمان کئے جاتے ہیں

وصل کی صبح وہ اٹھ کر نہیں جاتے تنہا
ساتھ اپنے مرے اوسان لئے جاتے ہیں

شیخ کی سادہ دلی دیکھی بھی تو نے ساقی
اک سبو کے لئے ایمان دئے جاتے ہیں

کیا کوئی شبہ ہوا تم کو وفا میں میری
آج کیوں مجھ سے یہ پیمان لئے جاتے ہیں

دل سے فریاد نکلتی ہے زباں سے شکوہ
ہونٹ کیوں میرے مری جان سئے جاتے ہیں

قیس ہی خوب رہا مر کے مصیبت سے چھٹا
ہم زبوں حال پریشان جئے جاتے ہیں

شیخ دانا ہیں نظر ظرف پہ اپنے ہے انھیں
ہم بلا نوش ہیں نادان پئے جاتے ہیں

بیوفا میں نے کبھی ان کو لکھا تھا اطہر
وہ مرا چھین کے دیوان لئے جاتے ہیں

چین میں سائنس کی ترقی

دو سال کے قریب ہوئے چینی گورنمنٹ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے درخواست کی تھی کہ چین میں کارخانے کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے اس صنعت کے کسی بڑے ماہر کی خدمات چینی گورنمنٹ کو دے دی جائیں۔ اس کام کے لئے مناسب آدمی کی تلاش میں کئی مہینے گذر گئے۔ جب اقوام متحدہ کی مجلس "رفاہ عام" کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے ڈاکٹر ٹی۔ ایف سیانگ امریکہ پہنچے تو متعلقہ امریکی حکام نے آپ سے کہا کہ چینی گورنمنٹ کی مقصد برآری کے لئے جو شخص موزوں ہے وہ خود ایک چینی ہی ہے۔ ڈاکٹر سیانگ نے یہ دیکھنے کے لئے کہ فی الحقیقت وہ شخص ان کے ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں اس سائنسدان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ چینی سائنسدان مسٹر یو آن تھا جو بوسٹن میں کاغذ کے ایک کارخانہ کی مجلس شوریٰ کا نائب صدر اور چیف انجنیر تھا۔ یہ شخص اس کارخانہ میں دس سال سے کام کر رہا تھا۔ اور یونیورسٹی میں گریجویٹ ہوتے ہی یہاں ایک مبتدی کی حیثیت سے داخل ہو گیا تھا۔ اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر اس نے درجہ بدرجہ یہ ترقی کی تھی۔

چان چینگ ہوائی

انڈیانا یونیورسٹی میں ایک اور چینی ہے جو اس یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ بھی "ای للی ڈرگ کمپنی" کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کا صدر ہے۔ یہ کمپنی امریکہ کی سب سے بڑی دواساز کمپنیوں میں سے ہے۔ انڈیاناپلس کے آدمی اس پروفیسر کو اپنے لئے بے حد ضروری اور قابل فخر سمجھتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر سیانگ سے قطعی طور پر کہہ دیا کہ وہ اس سائنسدان کو خود اس کے وطن بھی نہ جانے دیں گے۔

اور بھی بہت سے چینیوں نے اتنی ہی شہرت اور کامیابی حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر یاؤ پتانگ اور ڈاکٹر چیا ڈیوان کا تو کہنا ہی کیا ہے یہ لوگ تو پہلے ہی شہرۂ آفاق ہیں۔ ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چین میں سائنس اور صنعت و حرفت کی دوڑ میں بھی دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

غلط جوابات

اگر کوئی پوچھے کہ سائنسی سرگرمیوں میں چین اب تک پیچھے کیوں ہے تو اس کے جو جوابات ملیں گے وہ شاید مختلف ہوں گے۔ بعض کا خیال ہے کہ چینیوں کا طریقہ تفکر جس پر قدیم زراعتی زندگی کا اثر پڑا ہے۔ مغربی اقوام کے طریقہ تفکر سے مختلف ہے۔ سائنس کی ترقی کے واسطے یہ ماحول سازگار نہیں ہے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ چین میں سائنسی سرگرمیوں کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا۔ کیونکہ خاندان چنگ کے اختتام پر ہی چینیوں نے خارجی معاملات میں ناکامی دیکھ کر سائنس کی اہمیت کا اندازہ لگایا۔ اور صرف اسی وقت محسوس کیا کہ صنعت و حرفت پر سائنس کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد سائنسی ترقی شروع ہوئی۔ لیکن یہ دونوں جواب صحیح نہیں۔

اس مقالہ میں ہم کو اس سے بحث نہیں ہے کہ چین کے سائنسی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے اسباب کیا ہیں۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت کی سائنسی سرگرمیوں کا مجملاً تذکرہ کر دیں اور یہ بتائیں کہ مزید ترقی کی کیا تدابیر سوچی گئی ہیں۔

خاندان چینگ کے عہد میں کئی وجہوں سے چین صنعتی ترقی نہ کر سکا البتہ جمہوریت کے قائم ہوتے ہی سائنسدانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اور سائنسی معلومات بڑی تیزی کے ساتھ ملک میں بڑھنے لگیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ سائنسی تعلیم کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ لیکن سائنسی دریافت و انکشاف کے کام کی ابتدا معقول طور پر نہیں ہوئی۔ شمالی قومی مہم کے ختم ہوتے ہی چینی حکومت نے سائنس کی ترقی کے کام کو بڑی تیزی کے ساتھ جاری کر دیا۔ سائنس کو اسکولوں کے نصاب میں داخل کر دیا گیا۔ ریسرچ کے ادارے بڑی پھرتی کے ساتھ قائم ہونے لگے۔ اتنے میں جاپان سے جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے دوران میں سائنسی تعلیم اور دریافت و انکشاف کے ادارے دشمن کے ہاتھوں بری طرح تباہ ہو گئے۔ اور ضروری سامان کا مہیا ہونا دشوار تر ہوتا گیا۔ کیونکہ چین ہر طرف سے دشمن کے نرغہ میں تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود چین میں صنعت و حرفت کی ترقی جاری رہی۔ اور چینی سائنسدانوں کو ملک کی ضروریات پورا کرنے کے لئے گورنمنٹ کی امداد بھی برابر ملتی رہی۔ ماہرین کی ایک جماعت کے زیر نگرانی قومی صنعت و حرفت نے پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔

سائنسی دریافتوں کی بنیاد

حال ہی میں سرکاری اعانت کے زیر سایہ چینی سائنسدانوں نے سائنسی تحقیقات و انکشافات کی ایک مستحکم بنیاد ڈالی ہے۔ ابھی اس بنیادی کام سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور زمانہ بعد از جنگ کی منصوبہ بندی کا ایک خاص پروگرام بنانا ہے تاکہ پورا ملک مکمل طور پر صنعتی اور حرفتی ملک بن جائے۔ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ انتظامات اور اداروں کو اور زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ اور ان میں ضروری رد و بدل بھی کیا جائے۔ چونکہ نجی صنعتی کارخانوں میں اپنے ذاتی ریسرچ کے محکمے کھولنے کی سکت نہیں ہے اور صرف

سرکاری اعانت ہی کے ذریعہ اپنی مقصد برآری کا امکان نظر آتا ہے۔

مشہور انگریز سائنسدان ڈاکٹر جوزف نیدھم جو چین میں دو سال رہ کر لندن واپس گئے ہیں یہ دیکھنے کے واسطے آئے تھے کہ چین کی صنعتی و حرفتی ترقی کیلئے برطانیہ کیا کچھ کر سکتا ہے آپ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ چین میں سائنس کا مستقبل روشن اور امید افزا نظر آتا ہے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۴ء کو لندن میں "چینی یونیورسٹیوں کی کمیٹی" کے سامنے اپنے ایڈریس میں ڈاکٹر موصوف نے ان سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جن میں دوران جنگ میں چینی سائنسدان اور مختلف فنون کے ماہرین منہمک رہے۔ چینی صناعوں نے ضروری سامان کے نہ ہوتے ہوئے بھی صرف ذاتی معلومات ہی کی مدد سے جو جو نمایاں کام کئے ہیں ان کو ڈاکٹر مذکور نے "مجاہدانہ کارنامے" کہا ہے۔ گذشتہ پچاس سال کے اندر اندر چینیوں نے اپنی سائنسی تحریک کو بالکل جدید روش پر لا ڈالا ہے۔ ان کا کام بہت ٹھوس ہے اور اب تک ملک میں اعلیٰ درجہ کے بہت سے سائنسدان پیدا ہو چکے ہیں۔

چین کے سائنسی ادارے

چین کے موجودہ سائنسی اداروں میں دو ادارے خاص طور پر اہم ہیں۔ ایک تو "کولفانگ کو سوئیہ چیسو چین ہوئی" (قومی تحفظ کے لئے سائنسی ترقی کی مجلس) ہے۔ اور دوسرا "اکیڈیمیا سینیکا" ہے۔ پہلے ادارے کے اس وقت پانچ شعبے ہیں۔ (۱) صنعت و حرفت (۲) طب اور رسل و رسائل کے طریقے (۳) سائنسی علمہ جات (۴) ثقافتی تعلقات، اور نشر و اشاعت (۵) متفرقات۔ غرض اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جو نام کی رعایت سے اس میں داخل کی جا سکتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد وہی ہیں جو انگلستان میں "سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی" "منسٹری آف پروڈکشن" اور "رائل سوسائٹی اینڈ منسٹری آف لیبر" کے مقرر کردہ "نیشنل رجسٹر آف سائنٹسٹس" کے ہیں۔ "اکیڈیمیا سینیکا" بھی جو براہ راست سرکار کے زیر سرپرستی چل رہا ہے۔ ریسرچ کا ایک قومی ادارہ ہے جہاں سائنس کے بنیادی اصولوں اور نظریوں کے متعلق ریسرچ کی جاتی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اعلیٰ تعلیمی ریسرچ کرنا اور ریسرچ کے مختلف کاموں میں ربط پیدا کرنا، مشورہ دینا اور ریسرچ کرنے والوں کا دل بڑھانا داخل ہے۔ اس کی اہمیت تقریباً وہی ہے جو سوویت روس میں "نیشنل ریسرچ اکیڈمی" کو حاصل ہے۔

خاص اپنے ریسرچ کے کاروبار کے علاوہ "اکیڈیمیا سینیکا" نے ایک اور قومی ادارہ بھی قائم کیا ہے جس کا مقصد ہے ریسرچ کے کام کی مشکلات کو حل کرنا اور ان مختلف اداروں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنا جو ریسرچ کا کام اندرون ملک کر رہے ہیں۔

اور میرونجات میں بھی۔

"اکیڈیمیا سینیکا" کے ماتحت بائیس ادارے ہیں جن میں مندرجہ ذیل مضامین میں ریسرچ کا کام ہوتا ہے:- ریاضی، ہیئت، طبیعیات، کیمیا، ارضیات، حیوانیات، نباتیات، معدنیات، فلسفہ، تعلیمات، چینی ادب، سانیات، قانون، اقتصادیات، طب، دواسازی، انجینیرنگ، جغرافیہ، اثریات، بشریات، نفسیات اور علم الانسان وغیرہ۔

ان اداروں نے چین میں ریسرچ کے کام کو بہتر بنانے اور ترقی دینے میں بڑی مدد دی ہے۔ دوسرے ادارے جو عملی سائنس کی ترقی میں مصروف ہیں محکمہ جات اقتصادیات، تعلیمات، زراعت اور جنگ کے ماتحت ہیں۔

غیر ملکی ادارے

چین میں جو ادارے غیر ملکی ہیں ان میں سے "سائنو برٹش سائنس کوآپریشن بیورو" جس کے صدر مشہور عالم سائنسدان ڈاکٹر جوزف نیدھم ہیں، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس بیورو کا مقصد یہ ہے کہ چینی اور مغربی سائنسدانوں، اور سائنسی اداروں کے درمیان سلسلہ ارتباط قائم رکھے۔ اس سلسلہ کو بالفاظ دیگر "دو طرفہ" داخلی ادھار پٹہ" کہہ سکتے ہیں۔ صدر جمہوریہ چیانگ اور اس کے بعض وزیروں کی رائے سے یہ بیورو سرکاری طور پر اس سائنسی مجلس سے ملحق ہو گیا ہے جو قومی تحفظ کا کام کرتی ہے۔ اس باضابطہ الحاق کے علاوہ یہ بیورو ان بے شمار سائنسدانوں اور سائنسی اداروں سے ربط ضبط رکھتا ہے جو انفرادی طور پر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بیورو چینی وزیروں کے ساتھ تعلقات رکھتا ہے۔ اس کو قائم ہوئے کوئی تین سال ہوتے ہوں گے۔ اس تھوڑے سے عرصہ کے کارنامے بھی قابل داد ہیں۔

چین کی دشواریاں

برطانوی حکومت کو اپنے ملک میں سائنس کو ترقی دینے کے لئے کوئی چونکا دینے والی اصلاحات یا تبدیلیاں نہیں کرنی پڑتیں بلکہ موجودہ اداروں کو صرف گرانقدر امداد دینی پڑتی ہے کیونکہ وہاں کی جنتا میں سائنسی معلومات پہلے ہی سے موجود ہے اور ان کو سائنس کی نئی نئی مانوں سے کسی قسم کا کوئی گریز اور اچنبا نہیں ہوتا۔ چین کے موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اس سلسلہ میں انگلستان کی نقل کرے۔ بلکہ چین کم و بیش سوویت روس کے نقش قدم پر چل سکتا ہے انقلاب کے بعد روس نے محسوس کیا کہ وہ سائنسی دوڑ میں دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں کی حکومت نے سائنسی ریسرچ کے کام کو فوراً اپنی ذمہ داری اور فرض تسلیم کر لیا اور اس کی ترقی کے واسطے نئے نئے منصوبے بننے لگے۔ چین کی حکومت نے بھی جنتا کی مالی حالت کی درستی کے لئے اور ان کے واسطے معاش کے

[ذر]ائع پیدا کرنے کے واسطے ملک کو صنعتی و حرفتی بنانے کا فیصلہ کرلیا لیکن [ظ]اہر ہے کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے نقش قدم پر چلنا چین کے واسطے [ز]یادہ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ طریقے تو صرف انہی ملکوں کے واسطے [م]ناسب و موزوں ہیں جو پہلے سے ہی ترقی یافتہ ہیں۔

خالص سائنس ہم سب جانتے ہیں کہ خالص سائنس کی ابتدا سائنسدانوں کے جذبۂ تلاشِ حق سے ہوتی ہے۔ عام طور پر اس میں [ع]ملی اور مادی عنصر بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کو کسی قومی منصوبہ بندی [م]یں شامل کرلیں تو اندیشہ ہے کہ خود اس کو بھی نقصان پہونچ جائے گا [ک]یونکہ لازمی بات ہے کہ ہر قومی منصوبہ کا مقصد آخر یہی ہوتا ہے کہ [ا]س سے مادی فائدہ اٹھایا جائے۔ سائنسی ریسرچ کے لئے ایک جامع و مانع [م]نصوبہ بنانے کے سلسلہ میں رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں بعض [ک]ا خیال ہے کہ سائنسی ریسرچ کی حدبندی (کسی مخصوص پروگرام اور [م]خصوص مقاصد کے ذریعہ سے) مضر ہے۔ اس سے سائنس کی عام ترقی کو نقصان پہونچنے کا امکان ہے کیونکہ اس صورت میں غیر محدود طریقہ [پ]ر کسی بڑے پیمانہ پر ترقی ممکن نہ ہو سکے گی۔ جو لوگ منصوبہ بندی کے [م]وافق ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ چین میں سائنسی تجربات کرنے کے [آ]لات، سامان اور آدمی کم ہیں، اس لئے مخصوص اور محدود پروگرام [کے] مطابق کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے اور یہ کہ خالص سائنس اور عملی [س]ائنس میں بھی فرق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دونوں رائیں مناسب ہیں لیکن انتہاپسندی کا رنگ دونوں میں جھلکتا ہے [اس] میں شک نہیں کہ ہر ملک میں سائنسی ریسرچ ایک منظم طریقہ پر ہوتی ہے۔ [او]ر اس کا ایک مقررہ پروگرام ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح طریقۂ کار اور حدود پیمانہ [می]ں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح پروگرام اور نظم میں بھی فرق ہونا لازمی سی بات [ہے]۔ اب چونکہ چین میں سائنسی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر سرکاری امداد [و] اعانت پر ہے اس لئے باقاعدہ ایک پروگرام اور منصوبہ کا ہونا ناگزیر [ہے]۔ ہاں اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ اس منصوبہ بندی کے معنی [یہ] ہوں کہ آزاد ریسرچ کے کام میں یہ سرکاری منصوبہ بندی مخل اور حائل نہ ہو

[سا]ئنسی ریسرچ کے اصول چین کی مخصوص ضروریات کو پورا کرنے کے واسطے شاید یہ بات مفید ہو کہ [سائن]سی پروگرام میں مندرجۂ ذیل اصولوں کا لحاظ رکھا جائے:۔

[(۱)] ــ کم از کم مستقبل قریب میں سائنسی ریسرچ کے کام کو ترقی دینا سرکار [اپنے ذ]مہ لے وہ اس طرح کہ یونیورسٹیوں اور ریسرچ کے اداروں کے زیادہ [س]امان و آلات میں اضافہ کر کے قومی سائنسی ترقی کا پروگرام سائنسدانوں کے ہاتھوں میں سونپ دے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ملک کے لئے سائنسی اداروں کو توسیع دے لیکن اس بات کا خیال ضرور رہے کہ سرکار کی توجہ تمام اداروں پر یکساں رہے ایسا نہ ہو کہ کوئی ادارہ تو سب سے زیادہ مستفید ہو جائے اور کوئی بالکل محروم ہی رہ جائے۔

(۲) ــ ریسرچ کرنے والوں میں آپس میں اس بات پر ایکا ہونا چاہیئے کہ وہ نجی کام میں مخل انداز نہ ہونگے اور جو لوگ محض تعلیمی غرض سے ریسرچ کریں ان کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنے تجربات کو عملی سائنس کے ڈھانچہ میں بھی ڈھالیں۔ ریسرچ کرنے والوں میں آپس میں اس معاملہ پر اتحاد ہونا چاہیئے کہ عملی سائنس کے تجربات میں وہ ایکدوسرے کی مدد کرینگے۔ اس طرح پر محدود اور مقررہ منصوبہ کے مطابق بھی کام ہوتا رہیگا اور نجی طور پر بھی سائنسدانوں کی کوششیں برابر جاری رہینگی

(۳) ــ سائنس کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور سائنسی کارگزاریوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کے لئے لازمی ہونا چاہیئے کہ تمام سائنسدان آپس میں اتحاد عمل رکھیں اور بھائی چارہ سے کام لیں۔

(۴) ــ چین میں چونکہ روپیہ کی بھی قلت ہے اور سائنسی معلومات کی بھی کمی ہے اس لئے دوست اقوام سے مدد لینے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے کیوں کہ غیر ممالک سے امداد لینا ناگزیر ہے۔ امداد مالی بھی ہونی چاہیئے اور ٹیکنیکل بھی۔ آج امریکہ کی مالی حالت جو اس قدر درست اور مستحکم ہے اس کی وجہ وہی امداد ہوئی ہے جو انیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ نے اس کو دی۔ برطانیہ نے امریکہ کی مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ امریکہ ایک اعلیٰ درجہ کا صنعتی و حرفتی ملک ہوگیا اور خود برطانیہ کو بھی مالی فائدہ خوب ہوا۔ چین کی آبادی تمام دنیا کی $\frac{1}{5}$ ہے اور چونکہ اس ملک کے مادی ذرائع کثیر ہیں اس لئے اس ملک کی اقتصادی حالت کے بہت اچھے ہو جانے کے امکانات بہت ہیں دوسرے ترقی یافتہ ممالک کو چین سے بہت سی ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جن کی ان کو ضرورت ہے۔ اس کے بدلہ میں چین کو خود اپنی ضرورت کا سامان مل سکتا ہے۔ ہم چینی لوگ اس روز کا انتظار کر رہے ہیں جب ہمارا ملک ہماری گورنمنٹ اور ہمارے سائنسدانوں کی مدد سے ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک ہوگا۔ اس ترقی میں ہمارے اتحادیوں کا بھی ہاتھ ہوگا۔ ان کی امداد بھی ہمارے لئے بڑی قیمتی ہوگی ؎

نوٹ: ــ آجکل کے قلمی معاونین، مضامین نثر و نظم بھیجتے وقت اس امر کا لحاظ رکھیں کہ وہ مختصر ہوں نیز انکو صاف خوشخط اور صفحے کے صرف ایک طرف لکھا جائے۔ (مینیجر)

ساگر کی سرزمین

ایک بھولے ہوئے خواب کی یاد میں -

مخمور اکبرآبادی

ارضِ ساگر میں نمایاں کیا خدا کی شان ہے
دعوتِ ذوق و نظر کا ہر طرف سامان ہے
روح بالیدہ ہے دل میں تازگی سرآں ہے
حسن جس کا نام ہے اس گل زمیں کی جان ہے

کھل گئی تقدیرِ وحشت اک ذراسی بات میں
کھینچ ہی لایا مقدر یاں بھری برسات میں

شہر کے ہر چار جانب شاہراہیں دلکشا
بخشتی ہے قلبِ مضطر کو سکوں جن کی ہوا
سجدہ فرماتے ہیں یاں عاشق کو ایک ایک نقشِ پا
کہکشاں صرف ایک ہو کا ہے نگاہِ شوق کا

خود قدم اٹھتے ہیں ان راہوں پہ چلنے کے لئے
یہ جگہ ہے ان کے قدموں پر مچلنے کے لئے

دونوں جانب وہ درختانِ فلک سر کی قطار
جن کی رفعت سے پہاڑوں کی بلندی شرمسار
ایک کے بعد ایک بس اتنے کہ بیروں شمار
سائے کی رنگت سے بڑھتا ہے سکونِ رہگذار

شام کو ہر راستہ نیرنگیوں کی کان ہے
جھٹپٹے میں تو یہاں رومان ہی رومان ہے

ہر طرف اس سرزمیں کا ایک نیا عنوان ہے
سامنے دیکھو تو میلوں سبز کوہستان ہے
بائیں کو اک وادیٔ گل ریز کا دامان ہے
داہنے کو دور تک میدان ہی میدان ہے

پشت کا منظر غضب کس کا تجلی زار ہے
مڑ کے ہر دم دیکھئے دل کا یہی اصرار ہے

صنعتِ تکوین کا ہے کیا خوب یاں یہ اہتمام
جا بجا قائم ہے پستی اور بلندی کا نظام
پست ہے کوئی تو بالا ہے بہت کوئی مقام
کیسی زیبائی و رنگی ہے نگاہوں میں مدام

چوٹیوں کا اخضریں عالم جلال بے پناہ
وادیوں کے سبز قالین رحمتوں کی خوابگاہ

جنتِ شدادیاں کے کوہساروں پر نثار
سبزۂ صحنِ ارم تکتا ہے ان کے مرغزار
جس طرف دیکھو عیاں ہے صنعتِ پروردگار
گوشہ گوشہ ارض کا ممنونِ احسانِ بہار

صبح کا زریں اجالا اور گلوں کے قہقہے
شام کا رنگیں دھندلکا طائروں کے چہچہے

ہر شجر اک دیو پیکر سنتری بے الامان
دشت و در کی یہ سکونِ خیزگی کا پاسبان
عصمتِ صحرا کو قالب میں چھپائے مثلِ جان
لے رہا ہے آپ اپنے زعم میں انگڑائیاں

دھیمی دھیمی سنسناہٹ سے لبھاتا ہے کوئی
جھوم کر اپنی زباں میں گنگناتا ہے کوئی

گرد کے سنسان جنگل رو کشِ شانِ جلال
دن دہاڑے راہ گم کرنے کا جن میں احتمال
حسنِ صورت میں فریبِ دہر کی زندہ مثال
ان میں کھو جانا ہے گویا زندگانی کا مآل

یاں بسو گر جورِ انسانی سے دل غمناک ہے
یہ حرم زہرِ تمدن کے اثر سے پاک ہے

نافِ صحرا جس کو کہئے ایک طوفانِ سکوں
بج رہا ہے چار جانب خامشی کا ارغنون
اس فضا کی رمز فرمائی کا عالم کیا کہوں
ایک طلسمِ کیف ہے گویا فسون اندر فسون

محشرِ احساس میں پیدا ہے اک عنوان نیا
بڑھ رہا ہے جاں فدا کرنے کو دل کا حوصلہ

تازگی چھائی ہوئی سیلِ نمو کا جوش ہے
پتہ پتہ ڈالی ڈالی کیف در آغوش ہے
ہر شجر بالیدگی کے فیض سے مدہوش ہے
یہ قبائے زرد پہنے وہ زمرد پوش ہے

دختِ فطرت نے کیا جب یاں کی خلوت میں سنگھار
اس گھڑی سے پاسبانِ ہر کنج کی ہے خود بہار

ڈالیاں بار طراوت سے دلہن سی شرمگین
یوں جھکی ہیں جس طرح گھونگھٹ میں روئے نازنیں
جنبشوں سے منبعِ قربت کا اشارہ ہے کہیں
ایسے پاکیزہ نہیں فردوس کے خلوت نشیں

ان کے دھانی پیرہن کا کیا سہانا رنگ ہے
روح پر چھایا ہوا ہے دل سے ہم آہنگ ہے

زمردیں ارض و سما آرامِ قلبِ ناصبور
ہر طرف گنجان کنجوں میں طراوت کا وفور
واہ کیا ٹھنڈی ہوائیں ہیں برستا ہے سرور
مست ہیں نی روح فرحت کا کل ہے دور

بوئے گل کی لوریاں کیسی نشاط انگیز ہیں
سیلِ نکہت سے زمین و آسماں لبریز ہیں

جس طرف نظریں اٹھاؤ اک جہانِ رنگ و بو کیسے کیسے ہیں شگوفے کھل رہے ہیں چار سو
ہر گلِ مینائے عشرت ہر گلِ رعنا سبو دیکھنا ان پر نہ پڑ جائیں نگاہیں بے وضو

حسنِ احسان دیکھئے پھولوں پہ نظریں ڈال دیں
نکہتوں نے ذہن کی سربستہ راہیں کھول دیں

پھول ایسی قطع کے ترشے ہوئے جیسے نگین ان میں کچھ پکھراج کے ہم رنگ اور کچھ نیلمیں
یاسمن کے روپ کے گچھے بھی ہیں کتنے حسیں دیدنی ہے کچھ شگوفوں کا جمالِ آتشیں

کیسے نرالے نقش سحر آمیز بناتی ہے بہار
کیسے کیسے رنگ کے جادو جگاتی ہے بہار

پیالیوں میں شرابِ ناب ہے پھولوں کے جام مست رکھنے کیلئے فطرت کا رنگیں اہتمام
پڑتی چلتی ہے پہلو میں نسیمِ خوش خرام یہ وہ عالم ہے جہاں آباد ہیں ہر صبح و شام

گدگدا کر قلب کو بیدار کرتی ہے فضا
ہم سخن ہے روح سے فطرت کی دیوی سن ذرا

ابجا خود رو گلوں پر تتلیوں کا اژدہام وہ اچھوتی کنواریاں عاشق ہے جن کا حسن خام
لمیں قوسِ قزح کی دیویاں خیرہ فام موجِ نکہت سے سبک تر کج ادا اصد فن بدام

کیسے کیسے شوق سے پھولوں سے ہم آغوش ہیں
نوش رنگین جو پی ہیں مست ہیں مدہوش ہیں

کوئی غنچے کے مقابل کوئی گل سے ہمکنار نارسائی پر کوئی محزوں تو کوئی کامگار
بدن گلرنگ گلرو نازپروردِ بہار ہوک سی اٹھتی ہو دل میں تو بکھراں کا سنگھار

اس پرستاں میں عمل ہے صنعتِ ارژنگ چیں
میں تو کہتا ہوں کہ اندر کا اکھاڑا ہے یہیں

ہیں ایک ایک نازنیں جھجکی ہوئی الھڑ پری نشہ ہستی ہے ہر جنگی سانسیں بھری
کا دھوکا نہیں سمجھوں کہ سحر سامری کاش نہیں کوئی بھی سب کو چھوتی اک ذری

میں تو اس جھرمٹ میں صرف لغزشِ مستانہ ہوں
آپ کو بھولا ہوا ان کے رقص کا دیوانہ ہوں

سوزِ دل ہے لطفِ منظر کی نوا جھومتی ہے سازِ خاموشی کے نغموں پر فضا
دیا بے خودی نے کون سا افسوں نیا سن رہا ہوں قلبِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا

دھڑکنِ فطرت میرے قلبِ پاک کا ہم ساز ہے
اک نوائے شوق جو سازِ دل میں ہم آواز ہے

اس فضا نے میری آنکھوں سے اٹھا ڈالا حجاب میں نے فطرت کو عیاں دیکھا برافگندہ نقاب
اب یہ الجھن ہے کہ بیداری اسے سمجھوں کہ خواب عالمِ رویا میں بھی لیکن نہیں اس کا جواب

حسنِ منظر عام سحر جذبِ عالمگیر ہے
یہ مرقع زندگی کے فیض کی تفسیر ہے

اور بھی پُرفن مناظر ہیں مگر ایسے نہیں شست سا دل میں ہو جاتا ہو جنت کا یقیں
اہلِ دل اپنا صنم خانہ سمجھتے ہیں یہیں جوشِ عرفاں میں جھکی جاتی ہے سجدے میں جبیں

گوش اہلِ پر نہ دنیا میں کہیں فردوس ہے
دل جہاں بیدار ہو جائے وہیں فردوس ہے

آؤ اب اک دم گزاریں تالاب کی دیکھیں بہار صاف پانی گرد کے منظر کا ہے آئینہ دار
چن رہی ہے سطح کی چادر نسیمِ خوشگوار وہ چلیں موجوں کی جھیلیں چھین کر دل کا قرار

نغمۂ امواج یوں جاری ہے قلبِ آب میں
جیسے دھیما ساز بجتا ہو کسی کے خواب میں

سطح پر بطوں کی وہ نازک خرامی بار بار وہ حبابوں کا کبھی اٹھنا قطار اندر قطار
نقرئی چادر کا وہ پھیلاؤ پانی کا نکھار اے جمالِ سادگی قربان تجھ پر سو سنگھار

مست کر سکتی نہیں اس طرح صہبا کی پری
ذہبِ فطرت کا نرالا ہے فسونِ دلبری

جھیل کا عالم سرورِ تازگی کی کائنات اک طرب آباد ہے کیف آفریں جس کی کدرت
یہ وہ جلوہ ہے جسے قدرت نے بخشا ہے ثبات سحر ہے پانی کی خنکی بن گئی آبِ حیات

کیوں کہوں اس کو خزینہ نقرۂ سیال کا
اک جہانِ نو بہ نو ہے حسنِ بے تمثال کا

وہ افق پر سبز ساحل جنتِ صہبا گسار وہ کنارِ آب سبزے کا لہکنا بار بار
روحِ الماس اپنے شوقِ وصل کی آئینہ دار ہمکناری کیلئے روحِ زمرد بے قرار

کیا کنول کے پھول کھلتے ہیں یہاں شام و سحر
چوم کر ان کو خوشی میں رقص کرتی ہے نظر

ہر طرف حدِ نظر تک آسماں فیروزہ رنگ چتلی چتلی چھتی ہیں بیاں کیا شوخ و شنگ
بادلوں کے سبزے پہ بگلے پھر رہے ہیں بے درنگ انکی خوش وقتی کو دیکھے جی میں اٹھتی ہے، امنگ

دل اڑا نہیں پھر رہا ہے آسماں کی سیر کو
دل کے سب نیرنگ ہیں دنیا میں دل کی خیر ہو

وہ سہانی صبح، وہ خنکی وہ پانی کا بہاؤ　　وہ نہانے والیوں کا گھاٹ پر سرسو جماؤ
وہ عیاں نستان کے حیلے سر اٹھا کا گھاؤ　　ان سے دل کیسے بچے لے ناصحو آؤ بتاؤ

تیرتی ہے کوئی اور غوطے لگاتی ہے کوئی
جس قدر ڈھکتی ہے اتنا ہی دکھاتی ہے کوئی

کامنی کوئی چھبیلی کوئی کوئی طرح دار　　کوئی اٹھلاتی ہوئی جوبن پہ کوئی پر وقار
وہ بلورین فرش پر گویا ببھوکوں کی قطار　　جا بجا اترے ہوئے جسموں پہ نظریں کا مگار

چھین کر صبر و سکوں نظریں چرائے ہے کوئی
ناگنیں زلفوں کی ہاتھوں پر اٹھائے ہے کوئی

وہ غضب کا چلبلا پن وہ ستم کی پھرتیاں　　تیرتے ہیں کوندتی ہیں پنڈلیوں کی بجلیاں
سرمئی من موہنی بھولی نشیلی انکھڑیاں　　ٹھمریاں گاتی ہیں لچکیلی کمر کی ٹھمکیاں

پنکھڑی سے مسکراتے ہونٹ رنگت چمپئی
جان لیوا اچھوتی تیکھی نگاہیں رس بھری

جھٹپٹے سے ہیں شفق جب پھوٹتی ہیں نالیاں　　بکراتی ہیں یہ جب افق پر ندیاں
آگ سی پانی میں لگ اٹھتی ہے جب دم بھگیان　　جھیل میں رقصاں نظر آتی ہیں گلگوں دیویاں

آنکھ سے اوجھل نہیں لیکن نہاں جلباب میں
حسب کیا نگارستاں بنایا آب میں

چھوڑ رہا ہے جس جگہ پانی کو جھک کر آسماں　　وہ نظر آتا ہے جو اک دھندلا دھندلا سا نشاں
اک سیہ کشتی ہے جس میں خستگی سے نیم جاں　　اک مچھیرا جھونپڑی کی آرزو میں ہے رواں

کھے رہا حکم سے تقدیر کے مجبور ہے
بہ رہی ہے زندگی سے نا و ساحل دور ہے

جھٹپٹا ہوتے ہی لو مندر میں وہ گھنٹہ بجا　　اب صنم خانے کے اندر اک نیا عالم رچا
جوق جوق آنے لگیں درشن کو کیا کیا مہ لقا　　شانتی رفتار میں نیچی نگاہوں میں دفا

پاک چہروں پر متانت دل میں ہے آنندی
ہر ادائے ناز تفسیر مذاق دلبری

وہ اندھیرے میں لب ساحل چراغاں کا سماں　　پھول لالے کے کھلے ہیں یا تہِ آب رواں
یا کھنچ آیا آبگینے میں شہابِ آسماں　　کوندتی ہیں آئینے میں یا سنہری بجلیاں

عکس لو کا اس طرح جنبش میں ہے مستانہ وار
رقص میں ہو سینۂ الماس میں جیسے شرار

یہ شعاعستان زریں یہ ریاض شعلہ فام　　آگ اور پانی کا سنگم معجزہ ہے لاکلام
ہاں مگر پانی کے ہچکولوں سے یہ ڈر ہے مدام　　بجھ نہ جائیں جل کنول برہم نہ ہو جائے نظام

حیف یہ نا آگہی یہ زعم ایسے فہم پر
ہنس رہی ہے فکر نقاشِ ازل اس وہم پر

وہ اندھیری رات اور وہ قلعے کے برج اور فصیل　　جو بیانک پن قدر قامت میں ہیبت دل کے مدیل
وہ سیہ پانی پہ ان کا دور تک عکس طویل　　سر پہ سقف آسماں تاریک گنبد کی مثیل

دل کی گہرائی میں پیدا شورش گرداب ہو
شب کے سناٹے میں یاں آؤ تو زہرہ آب ہو

ہے یہیں سے زندگی کے باب نو کی ابتدا　　مونس غم نے یہیں باندھا تھا پیمان وفا
درد کا درماں بنی تھی دل نوازی کی فضا　　آرزوؤں کا پھر اک طوفان تھا دل میں بپا

ہو رہے بیدار کرتی تھی نوا خلخال کی
ذرے ذرے میں رچی تھیں لذتیں سسرال کی

سر و قد پر جامہ زیبی کا وہ حسن انتظام　　صبح کا جوڑا نیا شب کا انوکھا اہتمام
وہ مسی آلود ہونٹوں پر تبسم کا پیام　　وہ نگاہوں کی لگاوٹ وہ کنایوں میں کلام

ہر ادا میں دلربائی کے نئے انداز تھے
چشم و ابرو کے اشارے شوق کی آواز تھے

وہ مزے کی صحبتیں وہ رنگ رلیوں کا خمار　　وہ شباب ننند کی کیف آفریں رنگیں کنار
وہ حیا وہ شوق وہ مستی کا جوش بیقرار　　وہ اچھوتے جسم کی پاکیزگی جان بہار

شانہ و گردن کی وہ رشکِ قمر عریانیاں
وہ "جوانی باوری" کی نت نئی نادانیاں

اس نئی دنیا میں وہ فرصت کی سانسیں ہائے ہائے　　وہ سکون قلب وہ راحت کی سانسیں ہائے ہائے
لطف بے حد ہائے وہ لذت کی سانسیں ہائے ہائے　　رات کے پچھلے پہر وہ عشرت کی سانسیں ہائے ہائے

دن کی سرشاری مسرت کا چھلکتا جام تھی
رات کی خلوت دلہن کے وصل کا پیغام تھی

وہ ہنسی وہ قہقہے وہ سب کی گھاتیں یاد ہیں　　ساتھ دیورانی کا وہ دلچسپی کی باتیں یاد ہیں
وہ ملاقاتیں وہ دلداری وہ باتیں یاد ہیں　　یاد ہیں ساگر کے دن ساگر کی راتیں

جیتے جی کے واقعے کم بخت افسانے بنے
حیف ہے کیسے یگانے آج بیگانے بنے

اندھے کی لاٹھی

سلطان حیدر جوش

ساون کا مہینہ، گھٹا ٹوپ اندھیری
اور پھٹیاں پھٹیاں بارش۔
رات بھیگ رہی تھی، ہوا سرسرا رہی
تھی اور وُہ کھڑے قد نہا رہے تھے۔
مینڈک گا رہے تھے، جھینگر ناچ رہے
تھے، جگنو چمکار رہے تھے، اور وہ جھُوم جھُوم کر نہا رہے تھے۔

آبادی سے کوس بھر دُور، رات کے گیارہ بجے، میاں حسین کے باغ میں، چاروں طرف ہُو کا عالم تھا — البتہ — مختصر عمارت کے ایک دروازے سے، روشنی گھبرا کر باہر آ رہی تھی اور مینہہ سے کپکپا رہی تھی — مگر وہ چپ چاپ نہائے جا رہے تھے۔

بجلی دم لے لے کر کوند رہی تھی، ہوا کے جھونکے رہ رہ کر زلیج رہے تھے، اور چمک ٹھہر ٹھہر کر انھیں نمایاں کر جاتی تھی — پھر بھی وہ بلا تکلف، ننگے نہا رہے تھے۔

وُہ کون؟

مخلوق یک پایہ کے نونہال۔ آم اور جامن کے سربلند درخت، اور گلاب و موتیا کے ننھے شجر!

عمارت کے روشن کمرے میں، کارنس پر گلوب دار لیمپ جل رہا تھا۔ زمین پر بوسیدہ بوریا سیل رہا تھا اور بغلی دیوار کا سہارا لئے اندھے کی لاٹھی کھڑی تھی — جو اندھا نواڑی پلنگ پر پاؤں لٹکائے، گوش برآواز تھا اور بے نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف کسی کو دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھ نہ سکتا تھا۔

"حسینہ بیوی! حسینہ بیوی!" اندھے نے پکارا۔

حسینہ کچھ فاصلے پر دروازے سے لگی، اندھے کی اضطراری حرکات پر مسکرا رہی تھی۔

حسینہ حافظ نتھے سے رات بھر اسی طرح کھیلنا چاہتی تھی جس طرح عموماً گربہ مسکین اپنے چنگل میں گرفتار چوہے سے کھیلتی ہے۔ یا۔ خصوصاً موت کی ساعت، ایک سنبھالا لینے والے شکار و بیمار سے کھیلتی ہے — مگر حافظ نتھے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑنے سے سرشار تھے یا فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ آنکھوں سے لا چار تھے۔

بصارت و بصیرت کے بھلا کا نہ لحاظ سے، اندھوں کی قسمیں قلمی آم کی اقسام سے، یا — راگ راگنیوں کی تعداد سے کم نہ ہوں، مگر اس گروہ میں بصیرت کا اندھا اسی قدر ممتاز ہے جس قدر آموں میں لنگڑا اور آموں میں کا لنگڑا — اور — لنگڑے کو کا لنگڑے سے وہی نسبت ہے جو خیام کی رباعی کو ساگون کی تپائی سے۔

"حسینہ بیوی! بولتی کیوں نہیں؟" اندھے نے دیوار سے خطاب کیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔

"کیا گونگی ہو؟" اندھے نے جواب نہ پا کر دوسرا قلادیوار پر مارا۔

"خدا نہ کرے..." بے ساختہ حسینہ کی زبان سے ٹپک پڑا اور وہ ہونٹھ دانتوں میں دبا گئی۔

"تو پھر؟" اندھے نے آواز کی طرف منہ کرتے ہوئے چٹکی لی "کیا شرماتی ہو؟ ڈرتی ہو؟"

اندھے سے شرم کیسی اور معذور سے خوف کہاں؟ — کیونکہ — شرم کا چونچلا زیادہ تر دیکھنے دکھانے پر منحصر، اور ڈر کا دارومدار لاعلمی پر — حسینہ چالاک و شوخ چشم، میاں حسین کی مطلقہ بیوی اور حافظ کی رات بھر کی ہم جلیس — وہ اس بے تکے سوال پر ہنس پڑی۔

اور حافظ جی کے جھالردار چہرے پر، اس شرملی ہنسی سے ایسا بے آواز جوار بھاٹا رونما ہوا کہ نقاب شب نہ ہوتی تو ان کے پھوڑے ہوئے سوڑھوں کی ہلکی ہلکی جڑیں حسینہ کو بھی نظر آ جاتیں۔

"اچھا تو۔ اب آجاؤ میرے پاس" اندھے نے التجا کی۔

"کیوں آجاؤں؟" شوخ دیدہ بولی۔

"کیا تم میری بیوی نہیں ہو؟" حافظ کو اپنی مرحومہ بیوی کی خلوت کا مشابہ لگا۔

"خدا نہ کرے!" حسینہ نے فوراً لقمہ دیا۔

"خدا ہی نے تو تمھیں میری بیوی بنا دیا" اندھے نے جواب دیا۔

"رات بھر کے تماشے پر ذرا اترائیے نہیں"

"رات بھر کے لئے سہی۔ میں ہوں تو آپ کا شوہر"

اس دعوے سے انکار نہ قانوناً ممکن تھا نہ شرعاً — حسین و حسینہ کے ازسرِ نو اتصال کے لئے طلاق مغلظہ کی عجلت آمیز خلیج پر پل حلالہ ہی ڈالا جا سکتا تھا اور اس محبتِ شرعی کے لئے اندھے حافظ سے زیادہ موزوں اور کم خطرناک، کون ہو سکتا تھا؟

"بس تو اب آجاؤ!" اندھے نے تکرار التجا کی اور گڑگڑانے میں، اس کے کھلنے والے دہانے سے، رال کے چند قطرے ٹھوڑی کی جھاڑی پر ٹپک پڑے۔

"میری تو جوتی بھی نہیں آتی" حسینہ نے کورا جواب دیا۔

میاں حسین سے حافظ جی کا جو قول و قرار ہوا تھا اس کی بنا پر حسینہ کو یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی حافظ صاحب کو طلاق دینی ہے اور نکاح کے غیر مشروط ایجاب و قبول پر، حافظ جی حسینہ کو اپنی کھیتی سمجھتے تھے، جس پر اندھیرے اُجالے تصرفِ کلی کا حق ان کو حاصل تھا۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ایسا ہی گھمنڈ تھا جیسا بعض اوقات پہاڑ کی بلندی پر شلوار اور دھوتی کو ہو جاتا ہے اور پتلون ہنسا کرتی ہے۔

"دیکھو۔ مان جاؤ! نہیں تو پچھتاؤ گی" اندھے نے نئی کروٹ لی۔

"پچھتائیں میرے دشمن۔ میں کیوں پچھتانے لگی"

"اچھا تو دن نکلنے دو"

"دن نکلنے پر کیا کرو گے میرا؟"

"طلاق نہیں دونگا" اندھے نے لاٹھی چلائی۔

"اور پچاس روپے کس بات کے لئے ہیں؟" حسینہ نے طعنہ دیا۔

"وہ تو تمہارے مہر کی رقم ہے"

"اخّاہ! پچاس روپلّی میرا مہر ہے؟" حسینہ نے حقارت لب ریز لہجے میں کہا۔

"ایک اندھے سے حلالہ کرنے کے لئے یہ بھی بہت ہے"

"اندھے کے لئے ہوگا" حسینہ جھلاّئی "میری جوتی کی نوک پر ہے ایسی رقم"

"یہ ہے تو معاف کر دو۔ مہر ایک نابینا کو بخش دو"

"میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا" حسینہ فوراً بولی "مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں چاہئے"

"جزاک اللہ فی الدارین خیرا" حافظ جی نے نہایت قراَت و ترنم کے ساتھ حافظ شیراز کو یاد کیا۔

"اب تو آپ کو تسلی ہو گئی؟" حسینہ نے پوچھا۔

"میرے پاس آ جائیے تو جواب دوں"

"وہی مرغ کی ایک ٹانگ" حسینہ بولی "میں تو نہیں آتی"

"تو میں بھی جواب نہیں دیتا"

ضد اور خود رائی نے حسینہ کو حسین سے طلاق دلائی تھی۔ کیا اب پلِ حلالہ بھی اسی ضد کے ایٹم بم سے مسمار کر دیا جائے؟ ـــ حسینہ کی ترکش میں تریاہٹ کے علاوہ تریا چرتر کے تیر بھی ہوں، مگر غریب اندھے کا سہارا اس کی لاٹھی ہی تھی۔ اس کو لاٹھی ٹیک کر ہر جگہ راستہ تلاش کر لینے کی مہارت تھی، اس نے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر ہی اپنی دنیا بنائی تھی ـــ پھر؟ ـــ کیا اندھے سے ضد کر کے طلاق کو الجھن میں ڈال دیا جائے؟

"لو آ گئی۔ اب تو جواب دو!" حسینہ آخر کار پلنگ کی پٹی پر ٹکتے ہوئے بولی۔

"آپ نے ایک نابینا حافظ کو مہر معاف کر دیا" حافظ جی ٹٹول کر ایک ہاتھ حسینہ کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولے "خدا اس کا اجر آپ کو دس گنا دنیا میں اور ستر گنا عاقبت میں دے گا"

"اجر و جر چولہے میں جائے!" حسینہ نے کہا "کل طلاق دینے کا جواب دیجئے"

"اچھا! کیا آپ نے طلاق کے لئے مہر معاف کیا ہے؟"

"اور نہیں تو کیا جنت میں نوّیں جوڑا جوڑنے کے لئے معاف کیا ہے؟"

"مگر اس نوازش کو میری ذاتی خواہش سے تعلق نہیں" حافظ جی نے کہا۔

"آپ کی خواہش کیا ہے؟" حسینہ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

"کیا آپ نہیں جانتیں؟" کہتے ہوئے حافظ جی حسینہ کی طرف سرکے۔ حسینہ نے پرے ہٹنا چاہا مگر اندھے کے ہاتھ کرخت تھے اور گرفت سخت تھی ـــ حافظ جی سرک رہے تھے کہ زور کا دھڑاکا ہوا اور حافظ جی اچھل کر الگ ہو گئے۔

"کَ ـ کَ ـ کون؟" حافظ جی گھبرا کر ہکلا رہے۔

کوئی ہوتا تو جواب دیتا ـــ ہوا کا وہ شریر جھونکا کبھی بھاگ چکا تھا جس نے عین طلوعِ خلوت میں، دھڑ سے کواڑ کھول کر، دراندازی کی تھی۔

"کیوں چلاتا ہے؟ چل دور ہو!" حسینہ نے مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف ڈانٹا۔

"کون ہے؟" حافظ جی نے حسینہ سے پوچھا۔

"مالی کا لونڈا تھا ـــ چلا گیا" حسینہ نے چکمہ دیا۔

"اچھا!" حافظ جی اطمینان کا سانس لے کر بولے "کواڑ بند کر دو ـــ کنڈی لگا دو!"

"کواڑوں میں نہ کنڈی ہے نہ چٹخنی"

اگر چٹخنی کے زبان ہوتی تو شاید حسینہ کے ایک چٹخنا لگاتی مگر اندھے کو نظر نہیں آتا اور دنیا کی چہل پہل دروغ بافی اور اندھا دھند پر ہی مبنی ہے ـــ سکوت طاری ہو گیا اور حافظ جی غوطہ لگا گئے ـــ حسینہ نے موقعہ غنیمت سمجھ کر نئی بات چھیڑی۔

"میں نے سنا ہے آپ گاتے خوب ہیں" حسینہ بولی۔

"گانا اور رونا کون نہیں جانتا"

"جی نہیں۔ آپ کی آواز میں درد بھی ہے"

"ایسا ہوتا تو آپ کے دل میں درد نہ پیدا کر لیتا"

"آپ گانے کب جو درد پیدا ہونے کا امتحان ہوتا"

"کیا آپ کو گانے کا شوق ہے؟"

"گانے کا نہیں، گانا سننے کا شوق ہے"

"اچھا!" حافظ جی بولے: "مجھے اِس کا علم نہ تھا"

آخر حافظ جی کھانسے کھنکارے اور "آآ آم آ" گنگناتے ہوئے گانے لگے:-

"مہاراجہ کوڑیاں کھولو رے، رس کی بوندیں پڑیں —
آآآآ — کھولو رے، رس کی بوندیں پڑیں —
مہاراجہ کوڑیاں کھولو رے، رس کی بوندیں پڑیں۔ ..."

حافظ جی استائی اور انترہ گاتے، تان پلٹے دکھلاتے اور آواز کو لہراتے
و عمارت کے باہر ہوا کا جھکڑ اور بارش کا تار شاید نغمے سے متاثر ہو کر رک گیا،
سینہ بھی تھوڑی دیر کے لئے در و دیوار کی طرح بت بن کر رہ گئی۔ اسی میں نور کا
ہوا تو عمارت کی چھت پر ایک سناٹا چھا گیا:-

"نہ کوڑیاں کھلیں، نہ رس کی بوندیں پڑیں!!"

دوسرا دن یَومُ الحِسَاب تھا۔

قاضی صاحب اس گھریلو قضیے میں عدل گستری کے لئے مدعو تھے اور
حسین حافظ جی کی طلاق کے بعد حسینہ کو پھر اپنی زوجیت میں لے لینے کے لئے
بین تھے۔

"کیا مہر ادا ہو گیا؟" قاضی صاحب نے دریافت کیا۔

"نہیں — میں نے بخش دیا" حسینہ نے جواب دیا۔

"تو مہر کی رقم حافظ صاحب کے پاس رہی؟" قاضی صاحب کچھ اس
سے پوچھنے لگے گویا پوری رقم حافظ جی کے ڈکار لینے پر انہیں طیش آ گیا۔
سکوت سے قاضی صاحب کا شبہ یقین پر پہنچ گیا اور میاں حسین کو
ہوئی کہ حسینہ نے سال بھر کی ناز برداری پر بھی ان کے مہر کا ایک حبہ نہ چھوڑا
ظ جی کا مہر رات بھر میں ہی معاف کر دیا۔ حسین کو شبہات پیدا ہوئے ہوں مگر
ں نے کہا یہ ہی کہ "اب طلاق میں کیا حجت ہے؟"

"کیا خوب!" حسین نے بلند و ترش آواز میں کہا "ساری گلستان
ھنے کے بعد اب آپ پوچھتے ہیں کہ 'یہ حکایت' کیا ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" حافظ جی نے کہا۔

"آپ کا نام ننھے ہو مگر آپ ایسے ننھے نہیں کہ اپنا قول و اقرار
ہ جائیں!" حسین نے طعنہ دیا۔

"مجھے اپنے قول و اقرار سے انحراف کب ہے؟" حافظ جی نے کہا۔

"تو پھر طلاق دیجئے!" حسین نے کہا۔

"آخر آپ کو عجلت کیوں ہے؟" حافظ جی بولے۔

"مجھے طلاق دینے سے گریز مقصود نہیں" حافظ جی نے آہستہ سے
ڈکار لیتے ہوئے جواب دیا "مگر شاہد رہے میں یہ کب میں نے تسلیم کیا تھا
کہ آج ہی طلاق دیدونگا"

"یہ بھی ایک ہی ہوئی!" حسین کو تاؤ آنے لگا "تو کیا یہ ٹھہرا تھا
کہ آپ مرتے وقت طلاق دیں گے؟"

"ناراض نہ ہو جیئے!" حافظ جی نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی لاٹھی
پر ریشش دار ٹھوڑی ٹیکتے ہوئے بولے "اگر میں نکاح کے وقت ایسا معاہدہ
تو کیا ارادہ بھی کرتا تو نکاح ناجائز ہو جاتا"

"بے شک پھر تو وہ متعارع ہو جاتا" قاضی صاحب نے غالباً اس
خیال سے ہاں میں ہاں ملائی کہ نکاح پڑھانے کی معمولی رقم ان کو ملی ہو
مگر جیب تو گرم نہیں ہوئی۔

"دوسرے۔ طلاق کا تقاضہ اگر ہو سکتا ہے تو حسینہ کی جانب سے"
حافظ جی قاضی صاحب کی تائید سے بہت کچھ سانو نے ہو چلے۔

"میں تو حسینہ کی منشاء کا ترجمان ہوں" حسین نے اعتراض کیا۔

"کیوں بیوی؟" حافظ جی نے حسینہ سے خطاب کیا "تم چاہتی ہو
کہ آج ہی طلاق دیدوں؟ تم تو کبھیر دیں سننا چاہتی تھیں۔ کیا اب
نہیں سنو گی؟"

حسینہ خاموش تھی اور حسین حیرت زدہ۔ آخر قاضی صاحب
بولے "حسینہ بیوی بولئے!"

"کیا بولوں؟" حسینہ نے گردن جھکائے جواب دیا "آج نہیں
تو کل سہی"

غضب۔ آفت۔ قیامت! ایک بجلی گری۔ زلزلہ آیا سارا عالم
حسین کی نظروں میں تہ و بالا ہو گیا —— وہ لال پیلا ہو رہا تھا اور دم
بخود تھا! —— مگر۔ اندھے کی لاٹھی اکڑ رہی تھی کہ عصائے موسیٰ دعصائے
سعدی سے پناہ ممکن ہو لیکن اندھے کی لاٹھی بے پناہ ہے!

معاملہ آج سے کل پر گیا تو آجکل کے حلقۂ ادب کو اس سے کیوں
محروم رکھا جائے۔

اعلان

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم بڑی تعداد میں جمع ہو گئے
ہیں۔ اس لئے تمام معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے
کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں —— ادارہ

غزل

بیخود دہلوی

محبت میں اک انقلاب آگیا — انھیں آج مجھ سے حجاب آگیا

وہ چھوڑیگا اب زندہ کسکو یہاں — قیامت سے پہلے شباب آگیا

ترے ہجر میں ہم کو جینا پڑا — اجل کی طرف سے جواب آگیا

ہجوم تمنّا خدا کی پناہ — پیامی مرا کامیاب آگیا

زباں ہم نے کی آب زمزم سی پاک — اگر لب پہ ذکر شراب آگیا

کہوں کس سے ناکامیاں عشق کی — وہ آئے لحد پر تو خواب آگیا

زمانے کے سب غم غلط ہو گئے — مرے ہاتھ جام شراب آگیا

سزاوار زاھد کو ہے ذکر حور — کہ چہرے پہ رنگ شباب آگیا

زمیں پر اُتر آئی خلد بریں — کہ زاہد بھی پی کر شراب آگیا

محبّت زمانے سے رخصت ہوئی — زمانہ کچھ ایسا خراب آگیا

ہنسانے کو چھیڑا تھا میں نے اسے — تبسم کے بدلے عتاب آگیا

تمھیں تو ہے فتنے اُٹھانے سے کام — قیامت نہ آئی شباب آگیا

جو جاگے بھی بیخود تو جاگے ہیں کب
لب بام جب آفتاب آگیا

آکسفورڈ کی شاہراہ کا ایک حصہ۔ یہاں طلبا کی
بڑی چہل پہل رہتی ہے۔
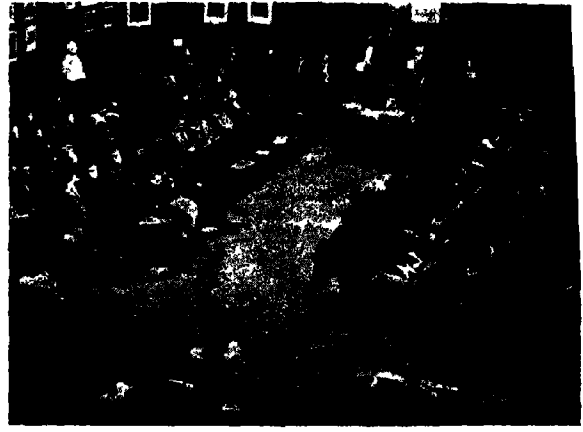
آکسفورڈ یونین ہال میں مباحثہ ہو رہا ہے۔ یہاں
اس طرح کے مباحثے ہر ہفتہ ہوتے ہیں اور بڑے
بڑے آدمی تقریریں کرتے ہیں۔

میگڈالن کالج (آکسفورڈ) کا مینارہ۔ تصویر کے بیچ میں کشتی کم

کوئنز کالج (آکسفورڈ) کی لائبریری کا کمرہ۔ اسکی چ
پلاستر کا کام بہت ہی دیدہ زیب ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی

آکسفورڈ یونیورسٹی انگلستان کی سب سے پرانی اور مشہور ترین دو یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ یہ یونیورسٹی ۱۱۴۲ء میں قائم ہوئی اول اول یہاں کے استاد اور طالب علم پیرس سے آئے تھے۔ اس یونیورسٹی میں ہمیشہ سے ٹھوس مضامین مثلاً دینیات، فلسفہ اور قدیم ادب پر زیادہ توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کا سب سے بڑا کارنامہ شاید "ٹیوٹوریل سسٹم" ہے جسکا سلسلہ ابتک قائم ہے۔ اس یونیورسٹی کی یہ امتیازی شان بھی قابل ذکر ہے کہ برطانوی وزیر اعظموں میں نصف سے زیادہ اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہوئے ہیں۔ علاوہ کے، یونین بھی بڑی اہمیت کی مالک ہے۔

ایرانی فنون لطیفه کی نمائش

پیرس کے قومی کتب خانہ کی قدیم قلمی کتابوں
ابکے ساتھ ساتھ قدیم ایرانی فنون لطیفہ کے
سے نادر نمونوں کی حال ہی میں بڑے اہتمام کے
ایک نمائش ہوئی۔ ان دو صفحوں پر جو
ریں دی گئی ہیں وہ ساسانی عہد کی کاریگری
مسلمانوں کے زمانہ کی مختصر کاری کے بعض
نمونے ہیں۔ ساسانیوں کا زمانۂ حکومت
ری سے ساتویں صدی تک) ایرانی فنی تاریخ
ہد زرّیں ہے۔ ایرانی فنوں کے عروج کا سلسلہ
شکانیوں ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا تھا اور
ی فتح بھی پارچہ بافی، مجسمہ سازی اور
گری کی ترقی کو مانع نہیں آئی وہ نادرات جنکا
اف وسط ایشیا، جاپان اور دوسرے مشرقی
لک میں ہوا ہے اور جن میں ساسانی روح کارفرما
ساسانیوں کے زوال کے بعد کی یادگار ہیں۔
سے قدیم یونانی اور روایاتی ایران کے اثرات
، ظاہر ہیں۔ سکندر نے ہخا منشیوں کی سلطنت

کونہ و بالا کرکے ایران میں یونانی اثرات کو ایسا جاگزیں
کیا کہ وہ نشانات پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک
نہ مٹ سکے۔ پھر تیسری صدی کے اوائل میں ہخا منشی

ساسانی عہد کی صناعی کا ایک نمونہ۔ شاپور اول شہنشاہ روما
«ولریں» کو قید کر رہا ہے (عقیق پر کھدائی کا کام)
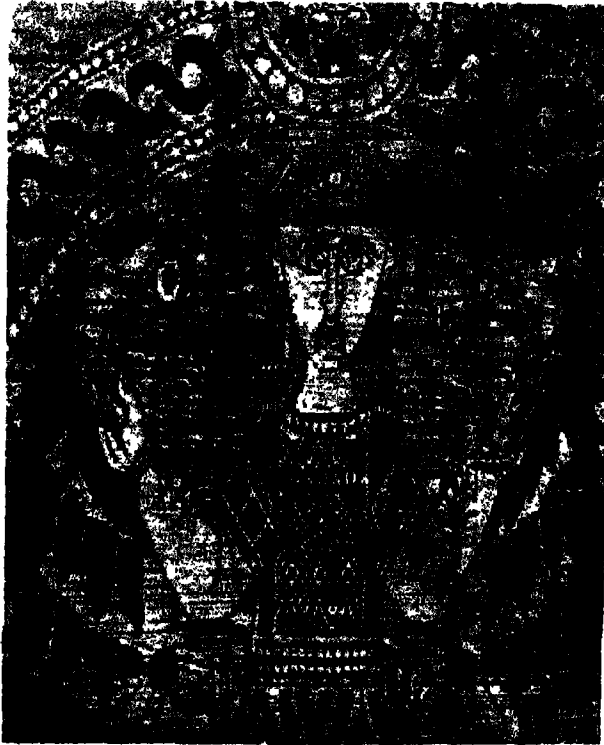
آٹھویں صدی میں ریشم بننے کی صنعت نے بڑی ترقی
کرلی تھی۔ یہ کپڑا ایک گرجا میں محفوظ ہے۔ یہ

ن کے کنگر کا ایک حصہ جو پانچویں یا چھٹی
ی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ انگور کی بیل پر دو
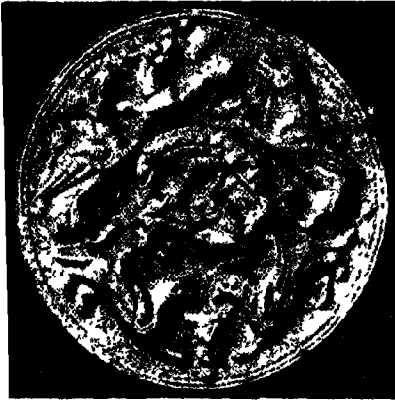
اس ملمع شدہ چاندی
کی گول تختی پر
جانوروںکی تصویریں
ابھرواں بنائی گئی
ہیں۔ اس سے ایرانی
کاریگروں کا اعلیٰ فنی
مذاق آشکارا ہے۔
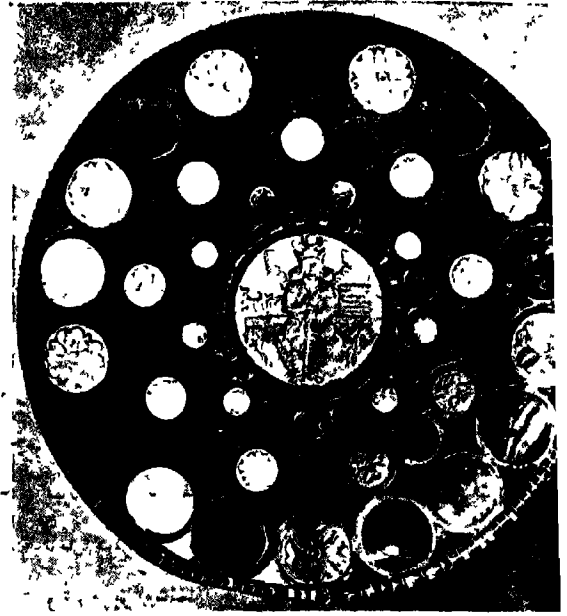
سرو اول کا جام سرخ، سبز اور سفید نگینہ خالص
و نے میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس سے قدیم ایرانی
کندہ کاروں کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔

چاندی کی رکابی
پر نقاشی۔ بہادر
بادشاہ شیروں کو
مار رہا ہے۔

ب کے دعویداروں نے از سرنو قدیم ایرانی روایات کو
ہ کرنے کی کوشش کی۔ خاندان ساسانی کے بانی
دشیر نے ایران کو دوبارہ فتح کیا اور اسکی ازسرنو تنظیم
۔ اسنے اصل ایرانی تمدن، قومی زبان اور قدیم مذہب کو
ر انکی جگہ لاکھڑا کیا۔ اسکے بعد چار سال تک ایرانی فنون
بھی خوب ترقی کی۔ عہد ساسان میں قومی روح نے نیا جنم
اور اٹتالیس بادشاہوں کے زیر سرپرستی ایران میں ایسے
سے فنی شاہ کار عالم ظہور میں آئے جن کا مقابلہ اسکے
عصر ممالک (روما اور بزنطین) بھی نہ کرسکے۔

اس ملک کی فنی کارگزاریوں کو ایک مکمل اور مسلسل
ریخ میں منسلک نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہاں کی فنی
ریخ کا کوئی زیادہ عمیق مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ
رانی اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے تھے بلکہ کھلی ہوا
یں چھوڑ دیتے تھے اور لاشیں وہیں بڑی بڑی گوشت خوار
جانوروں کی نذر ہوجاتی تھیں۔ اگر مصریوں کی
طرح ایرانی بھی قبریں بنایا کرتے تو آج قدیم ایرانی
تہذیب و تمدن کا مطالعہ اتنا مشکل نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے
کہ بہت سے ایرانی نوادر عیسائی ممالک کی قبروں سے
برآمد ہوئے ہیں۔ چاندی کی اشیا روس سے نکلی ہیں۔
یہ استثنائے چند ساسانی عہد کی اکثر چیزیں ایران سے

چاندی کا خوبصورت قرابہ۔ ساسانی

پنجاب کے کوہ نورد

ہمالیہ کا کوہستانی سلسلہ ہندوستان کی تمام شمالی سرحد پر پھیلا
تقریباً گیارہ سو چوٹیاں ہیں جن میں سے "ایوریسٹ" دنیا کی سب سے
ہے۔ بہت سے مغربی کوہ نوردوں نے اس چوٹی تک پہونچنے کی
لیکن ہردفعہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہندومت میں کوہ ہمالیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انکا عقیدہ
چوٹیوں پر دیوی دیوتاؤں کے استھان ہیں۔ اسلئے بعض پہاڑ
ہرسال ہزاروں تیرتھی پوجاپاٹ کے لئے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ بعض
کر اسکی بعض کھوؤں میں تپسیا کیلئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جغرا
بہم پہونچانے کیواسطے ابتک کسی ہندوستانی جماعت نے اسطرف
تھی۔ البتہ حال ہی میں پنجاب کے کوہ نوردوں کے ایک کلب کے
کولاھائی تک پہونچے وہ لائق مبارکباد ہیں۔ انمیں ایس افراد ۱۷
چوٹی تک پہونچ سکے اور صرف تین اصل چوٹی تک۔ وہاں ایک
چاندی کے تین روپیہ اور ایک گولی ملی۔ یہ ہندوستانی کوہ

کولاھائی کی چوٹی جس پر یہ کوہ نورد پہونچنا
چاہتے ہیں مگر اس تک رسائی ہونا بڑا کٹھن کام ہے
اور اسکے واسطے بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

اس چوٹی تک
سکے پہاڑ
انکا ارتفاع
اونچائی
کا ہے

یہ کوہ نورد اس راستہ سے اپنی جائے مقصود پر پہونچنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ آگے چلکر اس پر چڑھ
ناممکن ہوگئی اور یہ راہ ترک کرنا پڑی۔

چڑھنے والے اس برف پوش ڈھلوان پہاڑی پر کس مستعدی کے
ساتھ بڑھتے چلے جارہے ہیں! ←

کوہ نوردوں کے خیمے ان کے قریب ہی برف کے
تودے بہہ رہے ہیں۔

کی نوکیلی چوٹیاں۔ پہاڑ کے بالائی حصہ پر
دھوپ میں کسقدر چمک رہا ہے!

۱۹۳۷ء سے پہلے شنگھائی ایک بہت ہی پر رونق شہر تھا جسکی تمام عمارتیں جدید ترین وضع کی تھیں۔ اس کی آبادی تیس لاکھ تھی اور دنیا کے ہر حصہ کے آدمی یہاں موجود رہتے تھے۔ دریائے "یانگ سی کیانگ" کی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے چین کا تمام مال تجارت غیر ملکوں کو یہیں سے جاتا تھا۔ چین کی یہ سب سے بڑی اور خاص بندرگاہ تھی کلب، دفاتر، ناچ گھر اور بازار سب نئی مغربی وضع کے تھے۔ جنگ سے اسے سخت نقصان پہونچا ہے۔ بہت سی عمدہ عمارتیں مسمار ہوگئیں۔ اور بھی بہت سی تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور ہونے والی ہیں لیکن اسکا محل وقوع ایسا ہے کہ اسکی اہمیت میں کبھی بھی کوئی کمی نہیں آسکتی
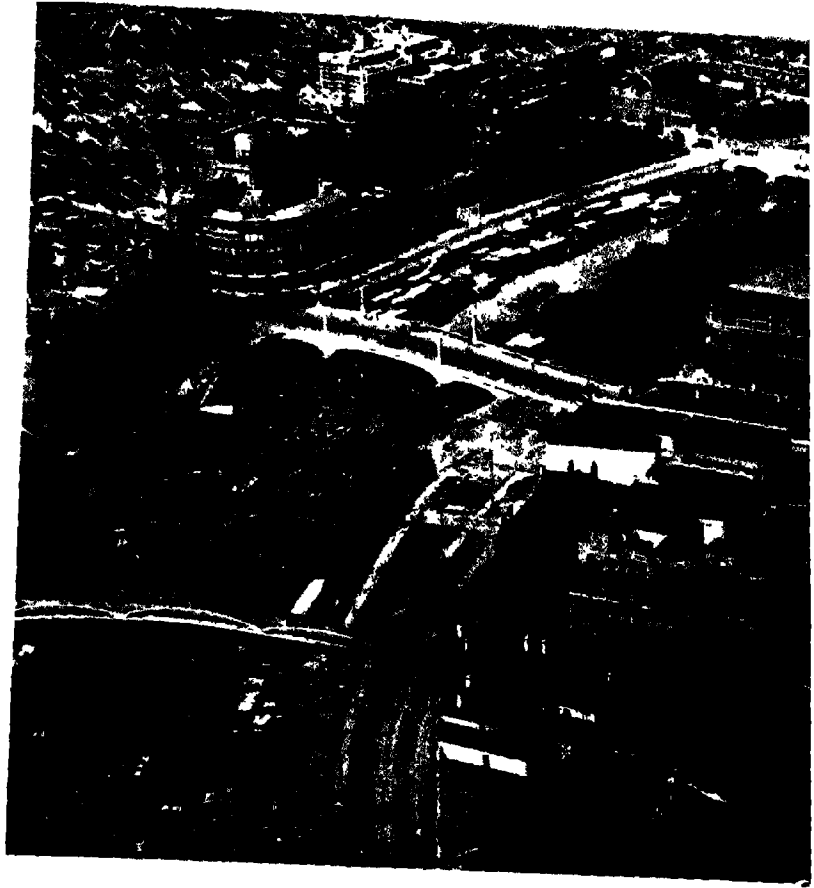
ایک طائرانہ نظر۔ اونچی عمارتیں، دریائے سوچو اور اسکے متعدد پل نظر آرہے ہیں۔

ٹل کی سربفلک عمارت کے سامنے گرانڈ تھیٹر کی اتنی اونچی عمارت بھی بہت ہی پست نظر آرہی ہے۔

گھڑ دوڑ کا کلب، دفاتر اور میدان

روس کی چند جمہوریتوں کے صدر مقام

یوکرین کے صدر مقام "کیف" کے ایک بررونق بازار کا ایک حصہ
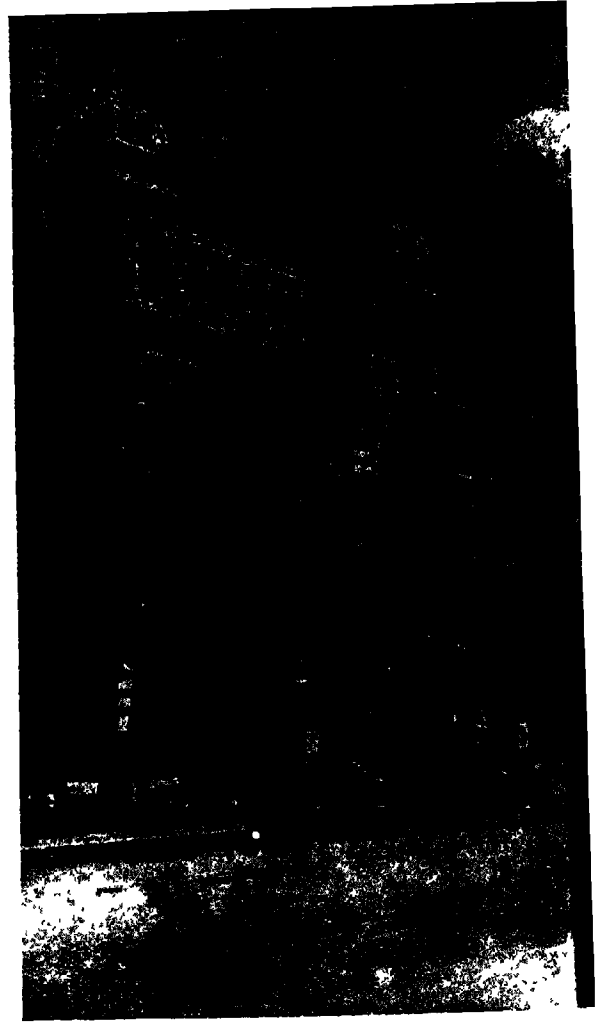
، کے صدر مقام "تفلس" کا ایک
سنگیت گھر
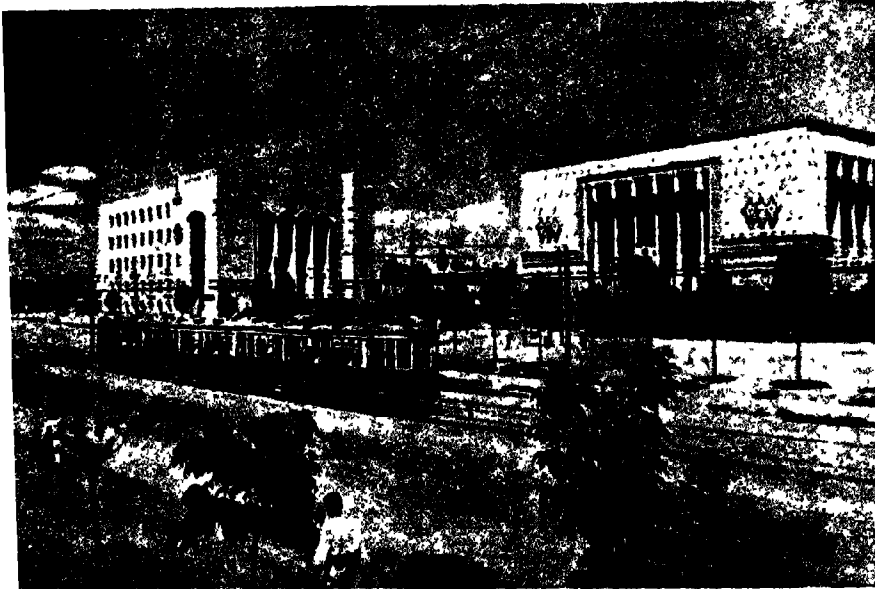
روس کی سولہ جمہوریتوں میں
کرین، گرجستان اور ازبکستان
ہیں۔ انکے صدر مقامات "تفلس"
اور تاشقند بڑے پررونق شہر
ہاں کی عمارتیں بالکل جدید طرز
ں اور سڑکیں بہت کشادہ اور
ہیں۔ "تفلس کا سنگیت گھر خاص
اں "بیلے" بھی ہوتے ہیں۔

پتلیاں ممالک کی

پتلیوں کے تماشہ کا رواج بہت پرانے زمانہ سے چلا آتا ہے کہتے ہیں کہ اسکی ایجاد سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی تھی۔ اور پھر یہیں سے یورپ کے دوسرے ملکوں میں پھیلیں۔ ایسویں صدی میں پتلیوں کے تماشہ بند ہوگئے

جادوگر سفوف بیچنے آیا ہے۔

بادشاہ کا چہرہ

لیکن اب پھر ان کی پوچھ ہونے لگی ہے۔ تماشہ بڑے بڑے سین اور لمبے لمبے قصے دکھائے جاتے لیجئے ایک دلچسپ قصہ آپ بھی سن لیجئے :-

ایک بادشاہ اپنی ایک کنیز کی موت سے بہت رنجیدہ اسکے وزیر نے اس کا غم غلط کرنے کی ہر چند کوشش لیکن ناکام رہا۔ ایک روز ایک جادوگر محل میں آنکلا

بادشاہ سارس کی جون میں

اور اس نے بادشاہ کو ایک ایسا سفوف دیا جسکی تاثیر یہ تھی کہ اسکی ایک چٹکی سونگھنے اور ایک پر اسرار لفظ "معتبر" کہنے سے آدمی کی قلب ماہیت ہوسکتی تھی اور یہی لفظ دوہرانے سے وہ اپنی اصلی حالت پر آسکتا تھا۔ لیکن یہ شرط تھی کہ بدلی ہوئی جون میں آدمی ہنسے نہیں۔ بادشاہ، وزیر اور

، مـیں

را نے اس سعوف کو آزمانا
ں سرا سے باہر آ کر بادشاہ نے
ں دیکھا اور سارس ہی بننا چاہا
. تینوں سارس بن گئے۔ اتفاق
یہ سرا سارس بنے ہوئے بھی
ور جوتے پہنے رہا اس پر

جھوٹا بادشاہ رقاصہ کو قتل کرا رہا ہے۔

بادشاہ اور وزیر کو ہنسی آ گئی۔ جب یہ سارس بن چکے تو جادوگر نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کی جگہ تخت پر بٹھا دیا۔ تینوں سارس ایک ویرانہ میں پہونچے اور وہاں ایک الو سے ملے۔ الو نے بیان کیا کہ وہ ایک شہزادی ہے اور چونکہ اسنے جادوگر کے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اسوجہ سے جادوگر نے اسکو الو بنا دیا ہے۔ اسنے یہ بھی کہا کہ اگر

گر بھیری والے کے بھیس میں
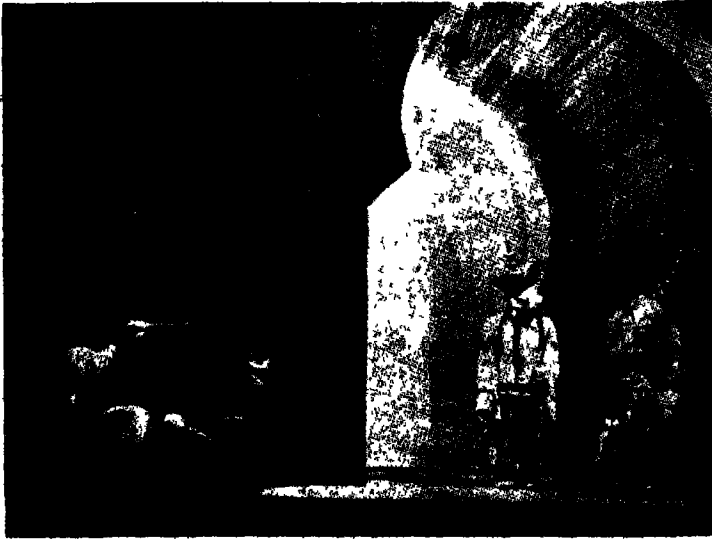
بادشاہ اور اسکے ساتھی (سارس اور الو کی جون میں) جادوگر اور اسکے ساتھی کی باتیں سن رہے ہیں

ں سے شادی کرلے تو وہ پھر آدمی
ں میں آسکتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ
دی کیلئے تیار ہوگیا۔ جب جادوگر
انہ میں آیا تو انہیں وہ لفظ
گیا جسے یہ بھول گئے
لفظ کے یاد آتے ہی یہ سب
ں گئے اور انہوں نے مل کر
کو مار ڈالا۔

علــی گدہ
یونیورسٹ

علی گڈھ یونیورسٹی ہندوستان میں
کا واحد علمی ادارہ ہے جہاں موجود
کےمطابق اعلی تعلیم ہوتی ہے۔یہاں انج
اور سائنس وغیرہ اعلی مضامین کے
اسلامی دینیات اور تاریخ کا بھی درس
ہے۔ اسکولوں کے علاوہ ایک زنانہ ک
اس یونیورسٹی سے ملحق ہے۔ اعلی
ایک طبیہ کالج بھی کھولنے کی
ہورہی ہے جسکے لئے ہندوستان کے
علم دوست اور قومی ضروریات کو
کرنے والے اصحاب دل کھول کر چندہ
ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا کے واسطے اقا
میں رہنے کا بھی باقاعدہ انتظام ہے

سر سید ہاسٹل ←
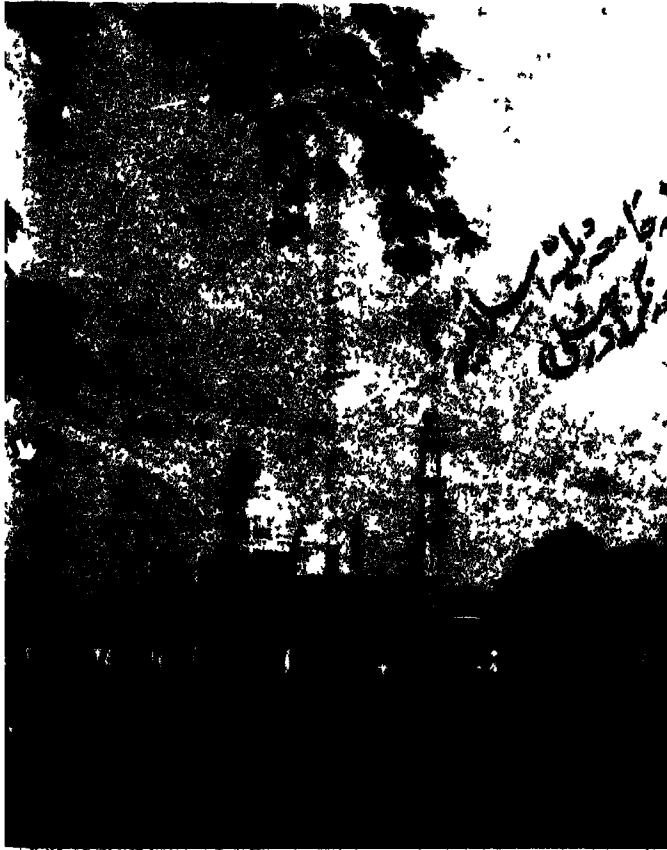
سائنس کالج کا ایک رخ

یونیورسٹی یونین کی عمارت کا ایک حصہ

یونیورسٹی کی مسجد

غزل — جگر مرادآبادی

رگ رگ میں ایک برقِ خراماں لئے ہوئے
دل ہے ہوائے منزلِ جاناں لئے ہوئے

وہ کیا گئے، بہارِ گلستاں لئے ہوئے
ہر پھول ہے جراحتِ پنہاں لئے ہوئے

دل ہے تجلیات کا طوفاں لئے ہوئے
لیکن حجاب دیدۂ حیراں لئے ہوئے

ناصح! گدازِ عشق کی معراج دیکھنا
ہر قطرہ خوں ہے شمعِ فروزاں لئے ہوئے

دل کو ہے کیوں گلہ کہ بہ ظاہر تو وہ نگاہ
نشتر لئے ہوئے ہے کہ پیکاں لئے ہوئے

وہ سامنے تو آئے مگر اس ادا کے ساتھ
اک طرزِ التفات گریزاں لئے ہوئے

اہلِ سلامتی کی طرف سے اسے سلام
کشتی جو غرق ہو گئی طوفاں لئے ہوئے

کانٹوں میں جیسے پھول - جہنم میں جیسے خلد
آنکھیں ہیں یوں، ندامتِ عصیاں لئے ہوئے

ہر مرحلے سے عشق گذرتا چلا گیا
دل میں ادائے حسن گریزاں لئے ہوئے

دل بھی وہی ہے، غم بھی وہی - پھر یہ کیا؟ کہ آج
ہر اشک ہے تبسمِ پنہاں لئے ہوئے

ہونا تھا چاک چاک گریباں کو اے جنوں
لیکن کسی کا گوشۂ داماں لئے ہوئے

پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے، ہوا کرے
کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے

عالمگیر مسئلۂ خوراک

انسانی تاریخ میں آج سے پہلے کبھی بھی مسئلۂ خوراک نے اتنی وردناک اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ دنیا بھر کی گیہوں چاول کھانے والی بھوکی قومیں فالتو ذخیرہ رکھنے والے ملکوں سے خوراک لینے کے لئے آواز بلند کر رہی ہیں۔ ۱۹۴۳ء کے آغاز میں متحدہ اقوام کے ایک اجلاس میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ اناج اتنی کافی مقدار میں پیدا نہیں ہو سکا ہے جو اس دنیا کے ہر متنفس کا پوری طرح پیٹ بھر سکے۔ اجلاس میں یہ بھی کہا گیا کہ اس کمی کا سبب نہ تو نا واقفیت کو قرار دیا جا سکتا ہے نہ قدرت کے ظلم و ستم کو۔ کسی نہ کسی طرح اشیا سے خوراک کی پیداوار کو بڑے پیمانہ پر وسیع کرنا ہے۔ اب ہمیں وہ علم حاصل ہے جس کے ذریعہ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ جہانتک حکومت کا تعلق ہے تحقیق اور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے اور عوام کو اس علم سے استفادہ کرنا ہے۔" اس عالمگیر کمی کی صورت پیدا کرنے کے لئے بہت سے اسباب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ بیماری اور قحط کی وباؤں نے ہمیشہ لڑائیوں کے بعد اپنے رنگ جمائے ہیں۔ آج یورپ، ایشیا اور افریقہ، عالمگیر جنگ کے بعد رونما ہونے والی مصیبتوں کو برداشت کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہی تین براعظموں کے بڑے بڑے علاقے بری طرح لڑائی کے میدان بن چکے ہیں۔ مشرقِ بعید میں سیام کو اور یورپ میں روس کو چھوڑکر ان براعظموں کے بیشتر ملک دنیا کے ان ملکوں سے جن کے پاس فالتو اناج موجود ہے، امداد و تعاون کے خواہاں ہیں۔

طویل مدت کے امکانات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آگاہی کے طور پر یہ بتا دیا جائے کہ خوراک کی اس کمی کی صورت محض ہنگامی اور جلد گذر جانے والی ہے اور بہت جلد جب حالات سازگار ہو جائینگے تو دنیا میں غلہ اس قدر زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگیگا کہ اتنی مانگ بھی باقی نہیں رہیگی۔ مثال کے طور پر پہلی عالمگیر جنگ کو لیجئے۔ اس وقت تقریباً دس سال کے بعد اشیائے خوراک کی پیداوار اس سطح پر آئی جو لڑائی سے پہلے قائم تھی۔ لیکن حال کی لڑائی کے سلسلے میں تباہکاریاں بڑے پیمانے پر اور زیادہ وسیع علاقوں میں ہوئی ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے سائنسدانوں نے جنگ کے دوران میں ایسے نت نئے طریقے اور ذریعے معلوم کئے ہیں جنکو دائرۂ عمل میں لاکر اشیائے خوراک کی پیداوار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

ڈی راگھون

زراعتی طریقوں میں سائنسی انقلابات کے آثار امریکہ میں پہلے ہی رونما ہو چکے ہیں۔ وہاں کے محکمۂ زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر ضرورت لاحق ہو تو ریاست ہائے متحدہ میں دس سال کے اندر اندر خوراک کی اس مقدار کو جو ۱۹۴۳ء میں تھی سوا دوگنی حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ بات دنیا کے ان بہت سے دوسرے حصوں میں بھی حقیقت کا رنگ اختیار کر سکتی ہے جہاں ابھی تک سائنسی طریقوں کو عمل میں نہیں لایا گیا ہے۔ وہ زبردست زراعتی انقلاب جو آج سے سو سال پہلے شروع ہوا تھا، اپنے اثرات زائل کر چکا ہے اور درحقیقت اب وہ صنعتی انقلاب کا ایک جزو بن گیا ہے۔ اس طرح دنیا میں فراوانی پیدا کرنے والے طویل مدت کے امکانات ابھی تک ضیا ہیں تاہم موجودہ تشویشناکی کے عالم میں ان سے بہت کم تشفی کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

جنگ کے ابتدائی تین سال کے دوران میں اشیائے خوراک کی پیداوار میں زبردست کمی سرزمین یورپ پر رونما ہوئی۔ اس کے برعکس روس میں پیداوار خوب بڑھتی رہی یہانتک کہ جرمنوں کے حملے نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ جرمن حملہ آوروں نے لاکھوں ایکڑ مزروعہ زمین کو بیکار کر ڈالا۔ تاہم روسی قوم کی صلاحیتیں جن کے طفیل ان کا ملک لڑائی کے دوران میں کسی بھی چیز کا محتاج نہ ہو سکا، ایسی ہی شاندار اور نتیجہ خیز رہیں جیسی کامیابی کے ساتھ ان کو میدانِ جنگ میں عروج حاصل رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ جرمنوں کے حملے نے اس بات کا موقع دیا کہ روسیوں نے فوراً دورافتادہ علاقوں کی بنجر زمین کو جو پچاس ساٹھ لاکھ ایکڑ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے قابلِ زراعت بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وسطی سائبیریا کی فصلوں پر اس طرح توجہ دی گئی کہ نتیجے نہایت شاندار رہے۔ چنانچہ لڑائی کے ختم ہوتے ہی روس کو راشننگ کا طریقہ ختم کرنا پڑا۔ یہ صورت حد زیادہ قابلِ رشک ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اعداد و شمار کے لحاظ سے روس کو اس لڑائی میں سب سے زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں نے لڑائی کے دوران میں سر توڑ کوششیں کیں کہ غلے کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ترکاریوں اور پھلوں جیسی غذاؤں کی کاشت کو بھی ترقی دی جائے۔ چنانچہ ترکی، ایران، عراق، شام، فلسطین، شرق اردن اور مصر

یہ ترقی ایک حد تک خام اشیا کی قربانی کے بعد عمل میں آسکی۔ مثلاً مصر میں حکومت نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ روئی کے کھیتوں میں اناج کی فصلیں پیدا کرائیں۔

یورپ میں صورتِ حالات

یورپ میں لڑائی سے پہلے گیہوں کی کل پیداوار چار کروڑ بیس لاکھ ٹن ہوتی تھی لیکن ۱۹۴۵ء میں یہ مقدار گھٹ کر دو کروڑ تیس لاکھ ٹن رہ گئی۔ لڑائی کے دوران میں مزروعہ زمین کی بربادی اس طرح ہوئی کہ اسکی مثال تاریخ میں پہلے کبھی نہیں مل سکتی۔ اس کے علاوہ ہزاروں گاؤں اجڑ گئے کھیت تباہ ہوئے مویشی مرے اور مشینیں بیکار ہو گئیں۔ ساری آبادی کو لڑائی کے کاموں میں شریک کر لیا اور لوگ اپنے عام زراعتی کاروبار کو چھوڑ بیٹھے۔ زرخیزی پیدا کرنے والی کھاد کی صنعت پر اثر پڑا اور حمل و نقل کے طریقے مفلوج ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ فالتو ذخیرہ رکھنے والے ملکوں کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ اپنا غلہ ضرورت مند علاقوں تک پہنچا سکیں۔ ان تمام غیر معمولی حالاتِ جنگ کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ آج سارے یورپ کو ایسی کمیٔ خوراک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو بڑھتے بڑھتے قحط کی صورت اختیار کر لیگی۔ آسٹریا، ہنگری، یوگوسلافیہ، بلغاریہ اور فنلینڈ کے لوگ بالکل قحط کی حالت میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اٹلی اور فرانس میں راشن کے سخت ترین طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر غذا نے پہلے سے کہدیا ہے کہ ڈبل روٹیوں کی فراہمی میں مزید کمی کی جائیگی۔ کچھ عرصے پہلے یہ امید قائم کر لی گئی تھی کہ امداد مشرقِ بعید کے ان ملکوں سے مل جائیگی جو چاول پیدا کرتے ہیں۔ لیکن خود مشرقِ بعید میں چاول کی کمی نے تمام توقعات کو پامال کر کے رکھدیا۔ چاول کی پیداوار اسقدر قلیل ہوئی ہے کہ چاول کھانے والے ملکوں کو مجبوراً زیادہ گیہوں لینا پڑ گیا۔

مشرقِ بعید

چاول کے تین بڑے برآمدی علاقے برما، سیام اور فرانسیسی ہندچینی ہیں اور بڑے درآمدی علاقے ہندوستان، لنکا، ملایا، چین، جاوا اور فلپائن ہیں۔ جنوبی اور مشرقی ایشیا کے چاول بھیجنے والے ملکوں کی بابت عام اندازہ یہ لگایا گیا تھا کہ وہ دنیا بھر کے چاول کی برآمد کا تقریباً نوے فیصدی حصہ دے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے سال یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ وہ لڑائی سے پہلے کی مقدار کا نصف سے کچھ کم حصہ دوسرے ملکوں کو دے سکینگے۔ لیکن جاپانی تسلط سے وہاں کے کسانوں کی ہمت اس درجہ جواب دے گئی کہ وہ صرف ملکی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے چاول بو سکے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حمل و نقل کے ذرائع ختم ہو جانے کے باعث ان کا مال بیرونی منڈیوں میں نہیں جا سکیگا۔ چنانچہ پچھلا سال ختم ہونے سے پہلے ہی ملایا، جاوا اور چین میں صورتِ حالات نازک ہو گئی۔ جزائر فلپائن میں لڑائی کی تباہ کاریوں نے چاول کے علاقوں کو سب سے زیادہ کم کر دیا۔ اب جاپان نے بھی چاول کی فراہمی کے سلسلے میں کمبائنڈ فوڈ بورڈ کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

کمبائنڈ فوڈ بورڈ مسٹر چرچل اور سابق صدر روزویلٹ کے مشترکہ اعلانات شائع ہونے پر جون ۱۹۴۲ء میں قائم ہوا تھا۔ اس بورڈ کا فرض ہے کہ وہ دوسری متحدہ اقوام کے باہمی تعاون سے ایسی صورتیں پیدا کرے کہ ان کی فالتو غذائی پیداوار دوسری ضرورت مند قوموں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن جائے۔ نیز یہ کہ وہ ان کی غذائی پیداوار کو ترقی دینے، پھیلانے، خریدنے پالیسی اور مناسب طریقے سے ٹھکانے لگانے کے لئے خاکے بنانے اور سفارشیں پیش کرنے میں مدد دے۔ اس بورڈ کی خاص کوششیں حسب ذیل ہوں گی۔ (۱) صحیح ضرورتوں کے مطابق قلیل مقداروں میں اشیائے خوراک کی مناسب اور ٹھیک تقسیم۔ بورڈ نے متحدہ اقوام کی مقامی حالتوں کا بڑی دوراندیشی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان صورتِ حالات کا بھی لحاظ رکھا جائے جو مستقبل میں رونما ہو سکتے ہیں۔ (۲) بحری جہازوں کی آمد و رفت میں کمی تاکہ وہ بین الاقوامی طور پر اشیائے خوراک کے حمل و نقل کے لئے زیادہ کام آسکیں۔ اس سلسلے میں راستے کے انتخاب کا مرحلہ بھی بورڈ کے پیشِ نظر رہتا ہے تاکہ اشیائے خوراک کو کسی ایسی راہ سے بھیجا جائے کہ وہ منزلِ مقصود تک کم سے کم وقت میں پہنچ جائے۔

اس سال دنیا بھر کے قحط زدہ علاقوں کو گیہوں فراہم کرنے کے سلسلے میں آسٹریلیا ایک اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے پاس چھ کروڑ چالیس لاکھ بشل گیہوں فالتو ہے جسے وہ باہر بھیج سکتا ہے۔ آسٹریلیا کے کسانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اگلی فصل میں ڈیڑھ کروڑ ایکڑ مزید اراضی پر کاشت کریں۔ اس طرح پچھلی فصل کی کل پیداوار پر ۳۵ فیصدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ لڑائی سے پہلے کے پانچ سال کی اوسط پیداوار پر بقدر بیس فیصدی اضافہ ہوگا۔ آسٹریلوی گیہوں کے بعد سیام کے چاول کا ذخیرہ ہے جس سے مشرق میں کمیٔ خوراک کا مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے۔ حمل و نقل کی دشواریاں اور زراعتی اوزاروں کی نایابی دو اہم رکاوٹیں ہیں جو ان حکومتوں کی توجہ کا مرکز بن رہی ہیں جنہوں نے سیام کے چاول کی برآمد میں دلچسپی ظاہر کی ہے

ہندوستان میں صورتِ حالات

مسلسل دونوں موسموں میں بارش کے فقدان نے

ہندوستان کے مسئلہ خوراک کی حالت بہت نازک کردی ہے - جنوب مغربی مون سون ہواؤں سے ملک کے بہت سے حصوں میں آخری وقت تک پوری تیزی کے ساتھ بارشیں نہیں ہوئیں - اور جب ہوئیں تو بہت بے قاعدہ اور کہیں کہیں - جنوبی ہند میں بالکل فقدان رہا، صوبجات متحدہ، بمبئی اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں معمول سے کم رنگ جما - اس کے برعکس بعض صوبوں میں ضرورت سے زیادہ بارش نے فصلیں تباہ کر ڈالیں - اڑیسہ کے کچھ حصوں میں اور مدراس کے مشرقی ساحل پر آندھیوں کا بہت برا اثر رہا - پھر شمال مشرقی مون سون ہوائیں بھی جواب دے گئیں - صوبجات متحدہ اور شمال مغربی ہندوستان میں بہت ہی کم بارش ہوئی - غرض یہ کہ بارش کے دیوتا نے ہر طرح امیدوں پر پانی پھیر دیا - لیکن اس کا یہ عتاب ہماری بہت سی مصیبتوں میں سے صرف ایک سبب ہے - اصل بات یہ ہے کہ لڑائی کے دوران میں کاشتکاروں کی کمیابی اور مویشیوں کی نایابی کے باعث ملک بھر کی زراعتی کارکردگی میں بڑا فرق پیدا ہوگیا لیکن تیسرا تباہ کن سبب ملک کی خطرناک حد تک بڑھتی ہوئی آبادی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں اوسطاً پچاس لاکھ نفوس سالانہ کے حساب اضافہ ہوتا رہا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ خوراک کی محدود مقدار سے زیادہ لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوئیں - بہرحال آج ساری دنیا کے ساتھ ہندوستان کو بھی کمئی خوراک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ اپنی ہولناکی کے اعتبار سے اتنا ہی شدید ہے جتنا کہ ۱۹۴۳ء میں رونما ہوا تھا۔

قحط بنگال کے نتائج بین اور صاف ہیں - یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لئے قدرتی تدابیر خود بخود بے اثر ہو گئی ہیں - ۱۸۸۰ء سے اب تک یعنی تقریباً پینسٹھ سال کے عرصے میں آبادی بقدر پندرہ کروڑ نفوس بڑھ گئی - موجودہ آبادی چالیس کروڑ ہے - اس کے تیس فیصدی

افراد کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا - باقی میں سے زیادہ لوگوں کو اتنی اچھی غذا نہیں ملتی کہ وہ خاطر خواہ اپنی صحت جسمانی کو قائم رکھ سکیں - اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ بیس سال میں کل آبادی پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہو جائیگی - پھر ایسی صورت میں جبکہ اسوقت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پچیس فیصدی فالتو خوراک درکار ہوگی، کیا یہ لازمی نہیں ہے کہ ہم زراعتی پیداوار کے طریقوں کو نئے اسلوب کے مطابق ڈھال لیں؟ یقیناً یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وسیع پیمانہ پر نظامِ آبپاشی کو ترقی دی جائے، کاشتکاری کے سائنسی اور بڑے پیمانے کے طریقے اختیار کئے جائیں - کافی مقدار میں کھاد تیار ہو، اچھی قسم کے بیج بوئے جائیں نیز جفاکشی اور محنت کے ساتھ کام کرنے والے مویشی کھیتوں میں استعمال ہوں - اس سلسلے میں زمینی پٹے کے موجودہ طریقے کو بہتر بنانا، زراعتی اشیاء کی قیمتوں پر مہر احتساب لگانا، دیہاتیوں کی قرضداری اور بے روزگاری کا قلع قمع کرنا اور گھریلو صنعتوں کو نئے سرے سے دائرۂ عمل میں لانا بھی ضروری ہوگا - غلے کی بڑی بڑی فصلوں کو ترقی دینے سے قطع نظر ایسی فصلیں تیار کرنی بھی مناسب ہوں گی جو موجودہ اناجوں کا نعم البدل بننے کے ساتھ ساتھ غذائیت کے اعتبار سے اعلیٰ اور زیادہ مناسب بھی ہوں اور ان کی اوسط پیداوار با اعتبار رقبہ بہت زیادہ ہو - مثال کے طور پر سویابین کو لیجئے - چین کی اشیائے خوراک میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے - اگر کوشش کی جاتے تو اسکی کاشت سے ہندوستان کی اشیائے خوراک میں اضافہ ہو سکتا ہے - غذائیت کے اعتبار سے آلو کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی اس ملک میں فائدہ اٹھانا ضروری ہے جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی - خوراکی قدر و قیمت کے اعتبار سے آلو در اصل چاول اور گیہوں کی غذائیتوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے - دنیا بھر میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے - مشرقی یورپ کے گنجان آباد ملکوں میں خصوصیت کے ساتھ آلو کی

غزل

شارب ہاشمی

بہارِ گلشن کا حسن رنگیں بھی حسنِ فطرت سے کم نہیں ہے
مجاز گو خود نہیں حقیقت مگر حقیقت سے کم نہیں ہے

سحر سے تا شام جام صہبا ہیں آپ کے حسن کی زیارت
اسے عبادت نہ کہہ سکیں گے مگر عبادت سے کم نہیں ہے

ادھر وہ عفو و کرم پہ مائل ادھر یہ جرم و گنہ پہ قائم
گناہگاروں کا ذوقِ عصیاں مزاجِ رحمت سے کم نہیں ہے

دلِ شکستہ کے پاس کیا تھا کہ نذرِ جانِ بہار کرتا
مگر یہ آنسو کا ایک قطرہ گلِ عقیدت سے کم نہیں ہے

نگاہِ عالم سے بچ کے مجھ پر ستم تو کرتے ہیں آپ اکثر
مگر ستم کی یہ پردہ پوشی بھی کچھ عنایت سے کم نہیں ہے

متاعِ دل مشتمل ہے شارب تمام تر جنسِ عیش و غم پر
غمِ محبت کی تلخ کامی مجھے مسرت سے کم نہیں ہے

کاشت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ انیسویں صدی سے پہلے وہاں اسی ترکاری کے طفیل قحط کی وباؤں کو روکا گیا ہے۔ آلو کیلے اور کساوا کی کاشت میں اضافہ کرنے سے ہندوستان کی اشیائے خوراک قابل قدر حد تک بڑھ سکتی ہیں اور اس طرح ہر کاشتکار کے رحم وکرم پر آس لگا کر بیٹھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوگی۔

۵ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانیہ کے وزیر اغذیہ سر بین اسمتھ نے پارلیمان کے روبرو قرطاس ابیض پیش کیا، جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ چھڑنے سے پہلے اور ختم ہونے پر اناج کی حیثیت کیا تھی۔ صحیح اعداد و شمار معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل ہندسوں کو ہزار سے ضرب دے لیا جائے۔ جن خانوں میں (ــ) نشان ہے، اس سے مراد "کچھ نہیں" ہے اور (××) سے مراد یہ ہے کہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکے۔

نقشہ نمبر ۱۔ مزروعہ زمین کا رقبہ ایکڑوں میں دکھایا گیا ہے:۔

ملک	گیہوں		جو		چاول	
	۱۹۳۸	۱۹۴۵	۱۹۳۸	۱۹۴۵	۱۹۳۸	۱۹۴۵
کنیڈا	۲۵،۹۳۰	۲۳،۳۱۴	۴،۴۵۴	۷،۳۵۰	ــ	ــ
ریاست ہائے متحدہ	۷۸،۹۸۱	۶۸،۷۸۱	۱۲،۱۷۱	۱۱،۴۲۹	۱،۰۷۹	۱،۵۱۱
آسٹریلیا	۱۴،۳۵۰	۱۰،۹۵۰	۷۴۵	۷۴۲	۲۴	۲۷
ارجنٹائن	۲۱،۳۰۲	۱۴،۱۸۳	۲،۰۶۳	۲،۵۵۴	۸۰	ــ
برطانیہ	۱،۹۲۸	۲،۲۷۹	۹۸۸	۲،۲۱۶	ــ	ــ
برما	ــ	ــ	ــ	ــ	۱۲،۵۳۰	۶،۴۰۰
ہندوستان	۳۵،۶۳۹	۳۵،۷۰۹	۷،۱۷۳	××	۷۳،۴۰۰	ــ
سیام	ــ	ــ	ــ	ــ	۷،۷۰۰	ــ

نقشہ نمبر ۲۔ کل مقدار کا اندازہ جو فصلوں سے حاصل ہو سکی، ٹن کی صورت میں:۔

ملک	گیہوں		جو		چاول	
	۱۹۳۸	۱۹۴۵	۱۹۳۸	۱۹۴۵	۱۹۳۸	۱۹۴۵
کنیڈا	۹،۶۴۳	۸،۱۹۶	۲،۱۸۶	۳،۳۸۶	ــ	ــ
ریاست ہائے متحدہ	۲۴،۶۴۳	۳۰،۰۸۰	۵،۵۰۷	۵،۶۵۷	۷۰۳	۸۳۶
آسٹریلیا	۴،۱۵۲	۳،۳۴۸	۲۴۱	××	۳۸	۲۷
ارجنٹائن	۱۰،۱۵۲	۴،۰۱۸	۴۳۹	۹۸۵	۱۰۰	××
برطانیہ	۱،۹۶۵	۲،۱۸۱	۹۰۴	۲،۰۷۱	ــ	ــ
برما	ــ	ــ	ــ	ــ	۵،۵۰۰	۲،۳۰۰
ہندوستان	۱۱،۷۶۲	۱۰،۴۵۸	۲،۲۴۵	××	۲۴،۰۰۰	××
سیام	ــ	ــ	ــ	ــ	۳،۰۰۰	۲،۶۰۰

نقشہ نمبر ۳:۔ گیہوں کا کل ذخیرہ ٹن کی صورت میں جو آخر ماہ میں بڑے بڑے برآمدی ملکوں کے پاس موجود تھا۔

ملک	۱۹۳۸ جون	۱۹۴۵ جون	۱۹۴۵ دسمبر	۱۹۴۶ جون (قیاس)
کنیڈا	۱،۰۱۸	۸،۹۲۰	۹،۵۳۶	۳،۰۸۰
ریاست ہائے متحدہ	۴،۰۹۸	۷،۵۲۰۷	۱۸،۴۵۵	۴،۶۸۰
آسٹریلیا	۱،۶۸۷	۱،۰۹۸	۱۳۴	۱،۲۳۰
ارجنٹائن	۲،۶۵۲	۴،۸۲۱	۱،۹۰۲	۲،۸۱۰

نقشہ نمبر ۴ بڑے بڑے برآمدی ملکوں سے جتنے ٹن گیہوں اور آٹا باہر بھیجا گیا:-

زمانہ	کنیڈا سے	ریاست ہائے متحدہ سے	ارجنٹائن سے	آسٹریلیا سے
۱۹۳۸-۳۹ کے دوران میں	۳۴۴	۲۴۵	۲۱۹	۲۵۷
۱۹۴۵ جنوری تا جون	۹۴۳	۵۳۱	۲۴۷	۴۸
۱۹۴۵ جولائی تا دسمبر	۱،۰۰۵	۷۸۱	۱۸۷	۲۳

نقشہ نمبر ۵ - جن ملکوں میں گیہوں اور آٹا (ٹن کی صورت میں) درآمد ہوتا رہا:-

زمانہ	برطانیہ	ہندوستان	لنکا	مشرقِ وسطیٰ	جرمنی (برطانوی علاقہ)
۱۹۴۵ء جنوری تا جون (ماہانہ اوسط)	۳۳۹	۴۹	۲۶	۴۵	—
جولائی ۱۹۴۵ء	۵۳۳	۸۳	۱۰	۵۴	—
اگست ۱۹۴۵ء	۴۵۵	۵۵	۳۰	۸۷	—
ستمبر ۱۹۴۵ء	۳۳۶	۱۱۱	۴۷	—	—
اکتوبر ۱۹۴۵ء	۳۰۸	۷۴	۶۰	۱۸	—
نومبر ۱۹۴۵ء	۲۴۶	۶۹	۱۹	۷	—
دسمبر ۱۹۴۵ء	۵۲۰	۷۱	۳۷	۷	۱۱۲
جنوری ۱۹۴۶ء	۳۵۳	x	x	x	۹۷
فروری ۱۹۴۶ء	۳۰۷				
مارچ ۱۹۴۶ء	۴۱۷	-----	-----	----	

نقشہ نمبر ۶ - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ میں شہری مفاد کے لئے کتنا گیہوں یا آٹا برطانیہ نے بذاتِ خود دیا اپنی ذمہ داری پر بھیجا یا بھجوایا:-

مسور کی دال

افسانہ

ناکارہ حیدرآبادی

"ابا- ایک لڑکی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے - آپ کی اجازت درکار ہے۔"

"کیوں بیٹے- اب تم مجھ سے بھی مذاق کرنے لگے۔ شاعر ہو- ادیب بھی ہو مگر باادب نہیں۔ بادی ہازی بارش یا باہم بازی۔"

"جی نہیں- بھلا بے ادبی مجھ سے ممکن ہے۔"

"پھر یہ تم نے کیسی عجیب الٹی بات کہی۔ مجھے چھوڑو میں بستر سے لگ گیا ہوں۔ تم اس لڑکی کے باپ کے پاس جاؤ۔ اس سے کہو۔ میں آپ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا باپ زندہ نہیں ہے۔"

"وارث تو ہوگی- کوئی تو ہوگا۔"

"ایک بھائی ہے مگر وہ میرا مخالف ہے۔"

"ہوں! لڑکی پڑھی لکھی ہے؟"

"گریجویٹ ہے۔"

"پکوان جانتی ہے؟"

"جی ہاں- زمانۂ طالب علمی میں اس نے پکوان کے کئی انعامات حاصل کئے ہیں- وہ بہترین جام، جیلی، پڈنگ بنانا جانتی ہے۔"

"دال روٹی پکانا جانتی ہے؟"

"جہاں تک مجھے علم ہے- نہیں۔"

"کیا خوب! — خوبصورت ہے؟"

"جی اوسط ہے۔"

"اچھا اور کوالیفیکیشنز کیا کیا ہیں؟"

"جی- وہ مجھ سے دو سال بڑی ہے۔"

"ماشاء اللہ! یہ بھی کوئی نیا فیشن ہے کیا؟"

"کیا چیز؟"

"یہی اپنے سے کم عمر لڑکوں کے ساتھ شادی کرنا۔"

"قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا۔"

"ہو جائے تو مناسب- زمانے کی الٹی باتوں میں یہ بھی ایک الٹی بات سہی۔ مزید خواص بیان کرو۔"

"وہ بہت دولتمند گھرانے کی لڑکی ہے۔"

"اچھا؟"

"وہ معلمہ بھی ہے۔"

"دولتمند لڑکی کو معلمہ بننے کی کیا ضرورت؟"

"جی وہ کہتی ہے، ہم کو تعلیم جو کس لئے دلائی گئی ہے؟ معلمی کا ایک پیشہ عورت کے لئے کھلا ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مگر گھر میں جی نہیں لگتا۔ محض وقت کاٹنے اور دل بہلانے کو معلمہ بن گئی ہوں۔"

"تو گویا قوم کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس کی لڑکیوں کی قسمت کی باگیں ایسے اچھے ہاتھوں میں آرہی ہیں!"

"بیچاری قوم مجبور محض ہے۔"

"کم خوش حال اور غریب تعلیم یافتہ عورتیں اس جگہ کی کہیں زیادہ مستحق ہونگی۔ ان کا حق اس نے چھین رکھا ہے۔ کیا اسے احساس نہیں؟"

"مجھے احساس ہے۔"

"چہ خوش!"

"تو آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

"قطب تم جانتے ہو۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں ہماری لڑکیوں کا مسئلہ اب بہت نازک ہو جاتا ہے ہمارے نوجوان حرص میں پڑ گئے ہیں۔ وہ لڑکی خوبصورت چاہتے ہیں پڑھی لکھی چاہتے ہیں۔ وہ زیور چاہتے ہیں مال و دولت چاہتے ہیں ہمارے گھرانوں میں یہ سب چیزیں یکجا نہیں ملتی ہیں تو وہ بڑے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ بولو کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟"

"جی ہاں حقیقت ہے۔"

"پھر؟ بڑے گھروں کی لڑکیاں ہمارے گھروں میں آتی ہیں تو نباہ مشکل ہو جاتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی حالات کا فرق رنگ لاتا ہے۔ تم وکیل ہو۔ عدالتوں میں آئے دن ایسے مقدمے دائر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہو پھر بھی درخواست کرتے ہو کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

"جی میں نے یہ عرض کیا تھا، وہ لڑکی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟"

"میرے نام گمنام خطوط آرہے ہیں۔ لکھنے والے وہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں جو اس لڑکی کے گھر آتے جاتے ہیں۔ وہ مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ لڑکی تم سے۔"

"اس کی ایک ساتھی معلمہ کا خط بھی آیا ہے جس میں کھلے اشارے پائے جاتے ہیں۔"

"عجیب۔ کیا اب لڑکیاں بھی شادی کے واسطے سفارشی چٹھیاں بھجوانے لگی ہیں؟"

"بظاہر تو معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ہوں! — اچھا تم کیا چاہتے ہو؟"

"جی میں — میں ابھی غیر جانبدار رہنا چاہتا ہوں۔"

"غیر جانبدار! مسخرے ہو — اچھا سن لو۔ میں تم کو ایسی لڑکی سے — یعنی یہ کہ میں ایسی لڑکی کو تم سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

۴ جنوری

میں بلقیس کی ساتھی کا وہ خط پھر پڑھنے لگا۔ ابتدا میں میری شاعری کے متعلق ایک قصیدہ ہے میرا کلام پر تاثیر ہے۔ کیف انگیز ہے۔ یہ ہے۔ وہ ہے۔ اے لڑکیو! میرے کلام پر تم جتنا سر دھنتی ہو کم ہے! مگر یہ تعریف و توصیف میری شاعری کی ہے یا میری جادو بھری آواز کی؟ واہ ری میری آواز! کیا ہے؟ روح میں ارتعاش و اہتزاز وغیرہ وغیرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس ناچیز آواز پر بیچاریاں مرتی ہیں تو مرا کریں۔ مگر بلقیس، اقتباس ضروری ہو گیا....

"ہم کو اس پر رشک ہے آپ اس کے مکان جاتے آتے ہیں ہم اس کو چھیڑتی ہیں۔ اب شاعری نہ بھی سیکھ جاؤ۔ بچیاں کیا پڑھاتی ہو قانون پڑھ لو۔

اس دفعہ بلقیس کبھی ہنس کر کبھی بگڑ کر قانون کو ہاتھ میں لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ واقعی وہ بہت خوش نصیب ہے۔ اکثر آپ کا تذکرہ رہتا ہے۔ کیا بتاؤں وہ آپ کی کس کس پیرائے میں تعریفیں کیا کرتی ہے۔ کاش اس کے بھائی اس کے ہم خیال ہوتے۔ کہتی تھی۔ بھائی صاحب ان آدمیوں میں ہیں جو ہر معقول بات پر بگڑ سکتے ہیں کہ اس میں بھی کچھ فی ہے اور ہر نامعقول بات کو قبول کر لیتے ہیں کہ وہ ان کے ضمیر کو تشفی بخشتی ہے......" آخر میں محض برائے بیت رقمطراز ہیں "اب کی دفعہ آپ بلقیس کے گھر جائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیجئے۔ میں بھی آ جاؤں گی۔ آپ سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔"

بہت دیر تک اس خط کے مضمون پر سوچتا رہا۔ مگر کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا دشوار تھا۔ وہ لوگ اچھے تھے جو خط کا مضمون بھانپ جاتے تھے لفافہ دیکھ کر۔ سوچتے سوچتے یاد آیا۔ کل مقدمہ کی پیشی ہے خط رکھ کر مقدمہ کی مثل کی ورق گردانی میں لگ گیا۔

۱۵ فروری

ٹیلیفون آیا۔ عدالت میں ایک وکیل صاحب سے گفتگو کرنے بیٹھا تھا۔ اطلاع ملنے پر اٹھ کر گیا۔ بلقیس تھی اور گھر سے بات کر رہی تھی۔

"آپ خفا ہیں؟"

"میں کسی سے خفا نہیں۔"

"کسی نہ کسی سے ضرور خفا ہیں۔ جب ہی تو کئی دن سے نہیں آئے۔ دو تین بار اس سے پہلے ٹیلیفون کیا مگر آپ سے بات نہ ہو سکی۔ کہئے آج آپ آئیں گے:"

"بات یہ ہے مقدموں سے فرصت نہیں ہے۔"

"میں نے اسکول سے رخصت لے لی ہے۔"

"کیوں؟"

"اسکول میں جی نہیں لگتا۔ آج آ جائیے۔"

"نہیں آج نہیں۔"

"تو کل سہی۔"

"کل بھی فرصت نہیں ہے۔"

"پرسوں۔"

"اچھی بات ہے۔"

"دوپہر کا کھانا یہیں کھائیے۔"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

"دیکھئے آپ سے کتنی بار کہا۔ ہر بار ٹال گئے۔ مگر پرسوں آپ کو ——"

"بڑی مشکل ہے۔"

"اچھا تو وعدہ ہے۔"

"مگر دیکھئے میں —— میں مسور کی دال کھاؤں گا۔"

"مسور کی دال؟ اچھی بات ہے۔ پک جائے گی۔"

"پک جائے گی نہیں۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے پکانا پڑے گی۔"

"مجھے؟ —— اچھی بات ہے۔"

"ترکیب معلوم نہ ہو تو باورچی سے پوچھ لیجئے۔"

"اچھی بات ہے۔"

۱۷ فروری

میرے پہنچتے ہی کہنے لگی: "یہ منہ اور مسور کی دال!" میں نے کہا: "اور نہیں تو کیا؟" دونوں ہنستے رہے۔ مسور کی دال کے انتظار میں کچھ اشعار سناتا رہا۔ تازہ بتازہ تھے۔ از قسم یہ سینہ سوز دل سے خالی نہیں ہے اور محبت ری انفعالی نہیں ہے۔ ایک نظم کے یہ مصرعے اجزائے ترکیبی تھے حسبِ عادت وہ خاموش سنتی رہی۔ دوسرے تو واہ واہ سبحان اللہ کا شور مچاتے ہیں اور مجھے آداب تسلیمات کے سلسلے میں ہاتھ اپنا آپ ہلانا پڑتا ہے مگر میں نے آج تک داد کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں سنا۔

نظم ختم ہوئی تو بولی: "آپ اپنی آواز کا بیمہ کرا لیجئے" میں نے کہا: "سنتے ہیں بیمہ جان کا ہوتا ہے۔ پہلے اسی کا بیمہ کراؤں۔ پھر آواز کی باری آئے گی۔ کیا کوئی مجھے سیندور پلا دینے والا ہے؟" کہنے لگی: "آپ کے دشمن کئی ہیں۔" میں نے کہا: "اچھا ہے وہ کامیاب ہو جائیں نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔" بول اٹھی: "واہ! یہ آپ کیا کہتے ہیں؟" بیمہ کا ذکر چلتا رہا۔ میں نے کہا: "بات یہ ہے ہندوستان میں بیمہ کمپنیاں بہت دیر میں قائم ہوئیں۔ شاعر کہتے آئے ہیں

در پے جاناں جاں ہم رفت ❊ ہیں ہم رفت و آں ہم رفت

اب اگر اسی زمانے میں جان کے بیمہ کا رواج ہوتا تو جان جانے کا رنج نہ ہوتا۔ پالیسی کی معقول رقم شاعر کو مل جاتی اور اس کا افلاس دور ہو جاتا۔ عہد حاضر کے شاعر کے لئے یہ سانحہ سکندر کا ایک لمحہ فکر ہے۔" ہنس پڑی اور کہنے لگی: "تو بسم اللہ۔ آپ ہی تجھئے۔ بیمہ اپنی جان اور آواز دونوں کا کرا لیجئے۔" میں نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا: "آپ کو میری آواز کی بڑی فکر ہے حالانکہ سنتا ہوں کہ آپ کے بھائی بیرسٹر صاحب مجھے نئی قسم کا قوال کے نام سے یاد کرتے ہیں!" کسی قدر ناراضی کے لہجے میں بولی۔ "اونہہ! ان کا ذکر چھوڑیئے۔ وہ قانون داں ہیں۔ قانون فہم نہیں ہیں۔" میں نے اضافہ کیا "شاید وہ شعر فہم بھی نہیں ہیں۔" اس کے بعد قوال اور قوالی کا ذکر چل پڑا اس نے کہا: "اب تو عورتوں کی قوالی بھی ہوا کرتی ہے۔" میں نے کہا: "ہاں ایک ریکارڈ ریڈیو پر سنا ہے۔ صاحب اب تو وہ زمانہ آنے والا ہے کہ عورتوں کی قوالی ہو گی اور شوہروں کو وجد آنے لگا۔" ہنس کر بولی: "غضب کرتے ہیں آپ بھی!"

مسور کی دال میز پر آئی۔ کہنے لگی: "دیکھئے شاید کسی قابل ہو۔" میں نے کہا: "اچھی ہی ہے۔" بولی: "پہلی کوشش ہے۔" میں نے جواب دیا: "رفتہ رفتہ مشق ہو جائے گی۔" اس کے بعد میں "دال کی فریاد" سے پڑھنے لگا۔

ایک لڑکی بگھارتی تھی دال   دال کرتی تھی عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں   سارے آفات سے بری تھی میں
ایکدن ہے کہ مجھ پہ آفت آئی   جس نے درگت بری طرح بنائی

بلقیس کو اصولاً ہنسنا چاہیئے تھا مگر وہ نیچی نظریں کئے کھانے سے کھیل رہی تھی۔ میں نے کہا: "آج سے آپکا نام 'مسور کی دال' ہے۔" کہنے لگی: "میں چڑوں گی نہیں خوش ہوں گی۔"

۲۵ فروری

شہر کے باغ کی سیر کو گئے تھے پُر فضا مقام۔ باتیں کرتے کرتے دونوں چپ ہو گئے۔ خدا معلوم وہ کیا سوچ رہی تھی مگر مجھے وہ دن یاد آ رہا تھا جب کوئی دس ماہ قبل

اس عجیب لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی، مسز شعیب کے ہاں پارٹی تھی۔ میں نے اپنی نظم سنائی تھی ؎

درد کیسے وہ اگر دل کا سہارا نہ ہوا
مے ہے کیا چیز اگر جام ہمارا نہ ہوا

اسکی آواز آئی "آج آپ چپ چپ سے ہیں"۔ میں نے چونک کر بات بنائی "۔ ایک مزاحیہ نظم ہو گئی ہے"۔ بولی "سنائیے" میں نے کہا "مسور کی دال"۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

سنجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ دمجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

اس مقدمہ کی روداد "نظم ہو گئی ہے"۔ پھر میں نے وہ نظم سنائی جس میں استغاثہ کا بیان، وکیل صفائی کی بحث جرح، جرح مکرر گواہوں کے حلفیہ بیانات وغیرہ شرح و بسط کے ساتھ درج تھے۔ آخری شعر تھا ؎

منصف اعلیٰ نے آخر فیصلہ بھی کر دیا
جلس کو لیلیٰ کی قائم چار دداری ہو گئی

وہ بہت ہنسی اور بولی "خدا آپ سے پناہ میں رکھے"۔ یہ آج پہلی داد ملی تھی۔ میں نے بنچ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف کو جھک کر اور ہاتھ اٹھا کر کہا "تسلیمات"۔ آج وہ بہت اچھے موڈ میں تھی۔ کہنے لگی "آپ کس قسم کے شاعر ہیں"۔ میں جھٹ بات کاٹ کر بول اٹھا "شاعر بے ذم ہوں احباب نے مجھے یہ خطاب دیا ہے اس لئے کہ میں تخلص نہیں کرتا"۔ بولی "وہ نہیں میں اس کو نہیں کہہ رہی تھی نہ آپ کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ نہ چہرے پہ ہوائیاں ہیں"۔ میں نے گرہ لگا کر کہا "نہ میرے اوپر کوئی لیبل لگا ہے نہ میں نے کبھی شراب پی ہے نہ دلاتی نہ دیسی۔ نہ روز ابر میں نہ شب ماہتاب میں۔ دشمنوں کو حسرت ہے کہ کبھی تو موری میں بیہوش پڑا پایا جاؤں کبھی تو گیسو دراز بن جاؤں"۔ اور جب "بال زیادہ اگاؤ" کی شاعرانہ مہم کا ذکر خیر نکلا تو میں نے کہا "میراٹل کے اشتہار بازمجھ سے رجوع کریں تو بغیر فیس کے مفت مشورہ دینے کو حاضر ہوں"۔ پوچھا "ہم بھی تو سنیں وہ مشورہ کیا ہے؟" میں نے تشریح کی "یہ لوگ اپنے اشتہاروں میں عورتوں کی تصویریں دے کر لکھتے ہیں کہ ہمارے میراٹل رمبرڈ سے دیکھو بال لتنے فٹ لمبے ہو گئے۔ یہ پیا زمانہ ہے۔ مشہور ترین اب شاعروں کی تصویر اخبارات میں شائع کر کے لکھیں کہ یہ شاعر تیل مالش سے اپنے بال بڑھاتے ہیں۔ مسور کی دال کیا خوب کہا ہے ؎

"منیرہ اس کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
اپنی زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہو گئیں"

بات چیت کے دوران میں میں نے دیکھا دو نوجوان بار بار ہمارے سامنے سے گذر رہے تھے اور ملقبیں کو گھور رہے تھے۔ اب کی دفعہ وہ گزرنے لگے تو میں نے اشارے سے بلایا پہلے تو وہ جھجکے۔ میں نے پھر اشارہ کیا وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ قریب آئے تو اٹھا اور ان سے ہاتھ ملا کر میں نے عرض کیا "آپ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ ہیں آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ دیکھئے کل بھی ہم یہاں آئیں گے آپ حضرات بھی ضرور تشریف لائیں اور اسی طرح گھورا کریں۔ ہم بہت ممنون ہوں گے۔ آداب عرض"۔ مالی اور مالن درختوں کو پانی دے رہے تھے مگر ان نوجوانوں پر بھی گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میرے پاکیزہ اور اعلیٰ خیالات سن کر اس تیزی سے رخصت ہو گئے کہ ان کے چلنے اور ان کے دوڑنے میں فرق بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ اس شتاب رفتہ کو آواز دیتا تو بھی وہ پلٹ کر نہ دیکھتا۔ میں نے مسکرا کر ملقبیں کی طرف دیکھا وہ دم بخود بیٹھی تھی۔ نظریں چار ہوتے ہی مسکرانے لگی۔ اٹھ کر کہا "اچھا اب گھر چلیں" میں نے کہا چلئے "مسور کی دال"۔

۶۔ مارچ

خط آیا۔ خط کیا تھا۔ اردو میں ایک تار تھا "آپ پھر غائب ہو گئے۔ کل ضرور آئیے"۔ میں نے جواب دیا "مسور کی دال" آپ کے بھائی کا عنایت نامہ آیا تھا دولت خانے میں داخلہ کی ممانعت کر دی ہے"۔

۷۔ مارچ

جواب الجواب آیا "آپ ضرور آئیے وہ میرے دوستوں کو منع کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ میں ان کی طرف سے معافی چاہتی ہوں آپ آج ضرور آئیے"۔ میں نے لکھا "کل آؤں گا"۔

۸۔ مارچ

شام کو سائیکل پہ پہنچا۔ دو صاحبین تشریف فرما تھے۔ ایک تو مسٹر سعادت اور دوسرے مسٹر حفیظ اللہ اندر تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ سعادت فرمانے لگے "کچھ گانا سنائیے"۔ دوسرے صاحب ہنس کر گویا ہوئے "مطلب یہ کہ اشعار سنائیے"۔ میں نے عرض کیا "اردو اشعار انگریزی لَے سے سناؤں؟ اس لئے کہ آپ حضرات کو انگریزی موسیقی بہت پسند ہے"۔ وہ کچھ جواب سوچ ہی رہے تھے کہ وہ آ گئی۔ دونوں جھٹ کھڑے ہو گئے اور مسٹر سعادت نے کہا "اچھا اب چلیئے۔ بائی بائی"۔ یہ کہہ کر مجھے گھورتے ہوئے روانہ ہوئے۔

چائے پر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ دودھ کی قلت کا ذکر آیا۔ ایک شعر ہوا تھا میں نے سنا دیا ؎

دودھ کی قلت ہوئی شیریں کو تب مشورہ
لانے جوئے شیر اب پیدا ہوا فرہاد کر

پوچھا "بنا فرہاد کیوں؟" میں نے وضاحت کی "ایران کے چیف انجینئر مسٹر فرہاد کوہکن مجنوں نے عظیم الشان بے ستون پراجکٹ کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اکثر ٹھیکہ داروں کی طرح سان کے بچے نکلے۔ اس جنگ میں افواہ کو شعلۂ موت کا نام دیا گیا لیکن ان ایرانی چیف انجینئر صاحب کے حق میں ایک بڑھیا کی پھیلائی ہوئی افواہ واقعی شعلۂ موت ثابت ہو گئی اور بیچارے نے براکری کرلی۔ غالب نے کہا ہے ؎

"تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا"

"دہلی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کہنے لگی "آپکا کوئی افسانہ ایک عرصے سے پڑھنے میں نہیں آیا"۔ میں نے کہا "ایک افسانہ لکھ رہا ہوں۔ کسی دن سناؤں گا "مسور کی دال"۔ اتنے میں آدمی گھر سے دوڑا ہوا آیا۔ ہمارے والد صاحب کا مزاج یکایک بگڑ گیا تھا۔ میں بھاگا۔

۱۷۔ اپریل

رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ میں پہنچا۔ اس نے پوچھا "اب والد صاحب کا مزاج کیسا ہے؟" میں نے کہا

"خدا کا فضل ہے۔ اب کچھ چلنے پھرنے بھی لگے ہیں"
بولی "شکریہ"

کھانے کی میز پر کہنے لگی "اب میں اسکول سے استعفٰی دیدینا چاہتی ہوں" میں نے اختلاف کیا "نہیں نہیں ایسا نہ کیجئے۔ اب آپ کا گھر بیٹھنا ظلم ہوگا۔ سمجھ گئیں مسور کی دال" سر جھکا کر کہنے لگی "جیسی آپ کی مرضی"

ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے بائیں جیب سے کاغذ نکال کر کہا "اچھا اب افسانہ سنو" پڑھنے لگا۔

"ہیروئن حسب دستور ہیرو سے اس طرح کھیل رہی تھی جس طرح بلی چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ہیرو اس کے ہاتھ میں آکر ایک موم کا پتلا، ایک کھلونا بن گیا تھا۔ ہیرو شاندار طریقہ سے اظہار محبت کر رہا تھا۔

"میں تمہاری خاطر سے دنیا کا کوئی کام نہیں جو نہ کر سکوں" ہیروئن نے پوچھا "سچ سچ؟" ہیرو نے سینہ تان کر کہا "بالکل سچ سچ۔ ایکدم سچ سچ" ہیروئن نے کہا "اچھا ایک کام کیجئے"

ہیرو نے خوش ہو کر کہا "فرماؤ" ہیروئن نے ایک ادا سے مسکرا کر کہا "اٹھ بیٹھ کرو۔ میری خاطر سے ایک سو تک اٹھک بیٹھک کرو" ہیرو نے تعجب سے پوچھا "اٹھ بیٹھ یعنی کہ اٹھک بیٹھک؟"

ہیرو نے سوچا۔ عورت مرد کو بچوں کی سی حرکتیں دیکھکر بھی خوش ہوتی ہے۔ طفلانہ شوخی بھی اس کا موہ لینے میں اکسیر کا کام کرجاتی ہے۔ چنانچہ اس نے بہت خوب" اور حسب الحکم اٹھ بیٹھ کرنے لگا۔ ہیروئن ی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گننے لگی "ایک تین۔ چار۔ پانچ۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چار پانچ" پھر ہنسی سے بے حال ہو کر اس نے "اچھا اب بس کرو۔ میری خاطر سے تھک گئے گے۔ بہرحال شکریہ" ہیرو کو سنہری بنانے پر ہی آؤٹ ہو جانا پڑا۔ وہ محبت کی اس ریاضت ارے ہانپ رہا تھا۔ مسکرا کر سینہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بول اٹھا۔ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم" یہاں تک پڑھنے پایا تھا کہ دوسرے کمرے میں کچھ شور ہوا۔ بلقیس ہنسی بند کر کے ادھر متوجہ ہوئی۔ اتنے میں مسٹر سعادت نشہ کی حالت میں جھومتے ہوئے داخل ہوئے۔ بلقیس نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ اس کی دو ایک سہیلیوں نے اس سے کہا تھا کہ ان سہیلیوں کی بعض سہیلیوں نے ان سہیلیوں سے کہا تھا کہ ان سہیلیوں کی سہیلیوں کی سہیلیوں نے بعض سہیلیوں سے سنا تھا کہ جناب سعادت خوب پیتے ہیں۔ طویل مسافت سے آئی ہوئی ایسی روایت کی آج تصدیق ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی آپ نے گالیوں کی مشین گن چلادی اور جو کچھ اس ناچیز کی شان میں ارشاد فرمایا اس کا نچوڑ یہ ہے کہ آپ مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں اس طرح کہ میں شاعری او فاؤن سب بھول جاؤں۔

بلقیس اور میں ایک ساتھ کھڑے ہوگئے وہ گھبرائی ہوئی تھی اس کے منہ سے نکلا "کیا کرتے ہیں آپ؟" سعادت صاحب آگے بڑھتے آئے۔ وہ شاید خیال کرتے تھے کہ کوئی پونے دو سو پونڈ والے اس پہلوان تہذیب کو آمادۂ جنگ دیکھکر سوا سو پونڈ وزن والا یہ شخص بھاگ جائیگا۔ مگر میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ کچھ قریب آئے تو مجھ سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوگئی کہ آج بھی یاد آتی ہے تو مسور کی دال ہنس دیتی ہے۔

میز پر پانی کا جگ، دو مگ رکھے تھے۔ میں نے جھٹ ایک جگ اٹھایا اور ان کو سیراب کردیا۔ یہ آبپاشی چشم زدن میں ہوگئی وہ چیخ چیخ کر ناچنے لگے اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دوسرا جگ بھی خالی کردیا۔ بلقیس بے ساختہ ہنس پڑی۔ خود مجھے بھی ہنسی آگئی اور بار بار رکوع میں جاکر قہقہے لگاتا رہا۔ مسٹر سعادت دوسری باتوں کی تو توقع کرآئے ہونگے لیکن وہ کمرۂ عوام میں اس غسل کے لئے مطلق تیار نہ تھے وہ سوسائٹی کو منہ دکھلانے کے لائق نہ رہے تھے۔ آرائش و زیبائش پر پانی پھر گیا تھا۔

قاعدہ ہے کہ پانی ڈالا جائے تو آگ بجھ جاتی ہے مگر یہاں پانی پڑنے سے آگ اور بھڑک اٹھی وہ غیر مہذب کلمات زبان سے نکالتے ہوئے رومال سے منہ اور سر پونچھنے لگے۔ پھر اچانک نعرہ مار کر جھپٹ پڑے۔ بلقیس چیخی۔ میں نے پینترا بدلا۔ ان کے دائیں پنجے کو اپنے پنجے میں لے لیا اور پھر اس طرح موڑا ہے کہ مسٹر سعادت "ابابابا" پکارتے ہوئے گھوم گئے۔ وہ چیخ رہے تھے "چھوڑ چھوڑ میرا ہاتھ چھوڑ" میں نے اور زور لگایا اور منہ ان کے کان کے قریب لیجا کر کہا "ایں سعادت بزور بازو نیست" اس کے بعد میں نے پنجہ چھوڑ کر انہیں دور دھکیل دیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے پنجے کو باری باری ملنے اور جھٹکنے لگے۔

اب بلقیس نے ان کو مخاطب کر کے کہا "جائیے۔ آپ کی تہذیب و شائستگی کو زکام ہوجائیگا پھر اپنی صورت نہ دکھلائیے مجھے بڑی شرم آئے گی" اس کی آواز غصہ سے ٹوٹتی سنائی دی۔ مسٹر سعادت معذرت کا ایک لفظ کہے بغیر روانہ ہوگئے۔ میں نے پھولی سانس کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مسور کی دال۔ پہلے ان سے اٹھ بیٹھ کرالیتیں پھر جانے دیتیں" مگر وہ ہنسی نہیں۔ اسکا چہرہ تمتما رہا تھا میں نے سوچا یہ بلب کتنے ہزار کینڈل پاور کا ہے۔

۲۰- اپریل-

آگ برس رہی تھی۔ سخت حبس کا عالم تھا دم ناک میں تھا۔ میں گیا۔ بھائی بہن باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بہن جھٹ کھڑی ہوگئی۔ بھائی نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی۔ میں جاکر بیٹھ گیا۔ بھائی غیظ و غضب کی حالت میں تھا اور رہ رہ کر مجھے گھور رہا تھا۔ اضطراب سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ تینوں چپ سادھے ہوئے تھے۔ اس خلفشار کا کوئی گوشہ بھی گفتگو میں پہل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سکوت ناقابل برداشت ہوگیا۔ بالآخر میں اٹھا "اب چلئے"۔ بولی "اتنی جلدی"۔ میں نے کہا "ایک اہم مقدمہ کی تیاری کرنی ہے" کہنے لگی "چائے پیتے جائیے" میں نے کہا "اس گرمی میں چائے!" اس نے کہا "شربت" میں نے کہا "نہیں۔ طوفان کے آثار دیکھ۔ کالے کالے بادل آرہے ہیں" گھر پہنچا ہوں تو طوفان نے

غضب ڈھانا شروع کر دیا۔

۲۵۔اپریل۔

"ابا۔ میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں آپ کی اجازت درکار ہے"۔

"بیٹا۔ آج تم سنجیدگی سے باتیں کر رہے ہو۔ اسکے سرپرست سے اجازت لے لی ہے؟"

"اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے"۔

"پڑھی لکھی ہے؟"

"گریجویٹ ہے"۔

"پکوان جانتی ہے؟"

"جی ہاں ہر قسم کا پکوان بشمول "مسور کی دال"۔

"خوب! خوبصورت ہے؟"

"جی ہاں بہت خوبصورت"۔

"بہت خوبصورت! خوب! خوب ——— اور کوالیفکیشنز کیا کیا ہیں"؟

"وہ مجھ سے دو سال ———"

"بڑی ہے؟"

"چھوٹی معلوم ہوتی ہے"۔

"خوب! خوب! ——— دولتمند ہے؟"

"مفلس ہے، البتہ ایک زمانہ میں دولتمند تھی"۔

"اچھا! تو اس کے بھائی نے ——— جائداد کے لئے مقدمہ ہو سکتا ہے نا؟"

"مجھے پروا نہیں"۔

"وہ معلمہ ہے کیا؟"

"جی ——— جی ہاں"۔

"مفلس لڑکی معلمہ ہو سکتی ہے؟"

"جی کیوں نہیں؟ وہ کہتی ہے، قوم کے نونہالوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہے"۔

"اچھا تم ۔ تم غیر جانبدار ہو؟"

"جی نہیں"۔

"تو تم ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ یہ منہ اور مسور کی دال! چہ خوش!"

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

"اب تک نہیں سمجھے؟"

"مگر ابا! آپ یہ دیکھتے ہیں ———"

"سنو۔ برخوردار۔ اس لڑکی کو بھلا تم اپنی بیوی کیا بناؤ گے ———"

"مگر ابا ———"

"اس لڑکی کو میں اپنی بہو بناؤں گا!"

سرِ راہے

راہ پر
چل رہا ہوں میں شب کو
ان خیالات کے دھندلکوں میں
سر سے پا تک خموش ۔ لپٹا ہوا
بجلیوں کے یہ قمقموں کی ہنسی
پا بجولاں ہے تیرگی میں ——— مگر
کتنی پیاری ہے ——— کس قدر دلکش!
راہرو کو پتہ بتاتی ہے
ایک منزل نئی دکھاتی ہے
رات بھر جاگتی ہے بس یونہی
آنکھ اسکی مگر جھپکتی نہیں؟
اور ہم تیرگی کے دامن میں
ہیں ازل سے
اداس، اداس،
خموش!

———

ان خیالات کے دھندلکوں میں
سر سے پا تک خموش۔
لپٹا ہوا
راہ پر چل رہا ہوں میں شب کو

متصل راستے کے ہنگامے!
کاریں پاس سے گزرتی ہے
جیسے بجلی سی آسماں پہ چمک،
اپنے دامن میں قہقہوں کو لئے،
ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ جس سے
ان خیالات کا جو گہرے تھے!

———

راہ پر چل رہا ہوں میں اب بھی!
پر خیالات وہ نہیں آتے
پھر بھی میں سوچ میں ہوں۔ سوچ میں غرق
روز کا راستہ ہے یہ میرا
وہ بھکارن ———
جو شب کے وقت یہاں
ہاتھ پھیلا کے بھیک مانگتی تھی

آج پھر کیوں نظر نہیں آتی
نوجوان تھی ———
مگر تھی کتنی غریب!
خامشی تیرگی سے لپٹی ہے
جس کے سائے میں یہ عمارت پھر
اک دلہن سی بنی ہوئی ہے آج؟
۔ یہ مگر اس کے ایک کمرے میں
دفعتاً روشنی ہوئی کیوں گل؟
اور کچھ قہقہوں کے جھرمٹ میں
تھرتھراتی ہوئی سی اک آواز
بن کے ہلکی سی چیخ
ڈوب گئی!

———

راہ پر چل رہا ہوں میں اب بھی
کھویا کھویا سا کچھ خیالوں میں
قمقمے اب بھی مسکراتے ہیں
راستے کے سائے بڑھتے جاتے ہیں
جن کے دامن میں
رقص کرتی ہیں
پھیکی پھیکی سی چند تصویریں!

عبادت بریلوی

پرندوں کے احسانات اردو ادب پر

حامد اللہ افسر

انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات میں جذبات کا وجود حقیقت میں ہو یا نہ ہو، ادبیات کی دنیا میں حیوانات کا جذبات سے متصف ہونا ایسا ہی مسلّم ہے جیسا کہ خود انسان کا جذبات سے متصف ہونا مسلّم ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کے ادب پر حیوانی دنیا کی زندگی کا پرتو نہ پڑا ہو، خاص طور پر وہ حیوانات جو انساں کی بستیوں میں یا بستیوں کے قرب و جوار میں زندگی بسر کرتے ہیں ہمیشہ اس کے ماحول کا ایک اہم جزو رہے ہیں۔

اس بے زبان مخلوق نے رنج و غم میں، بے کسی میں تنہائی میں، آرام و راحت میں، سفر میں، حضر میں ہمیشہ انسان کا ساتھ دیا ہے۔ کسی زبان کے ادب کی شاید ہی کوئی شاخ ایسی ہو جس کی نشو و نما میں حیوانات نے مدد نہ دی ہو۔

انسان نے اپنے ان خاموش ہمسایوں کو زبان کی دولت عطا کر کے ان کی معرفت خود اپنے جذبات کا خاکہ کھینچنے میں بڑی بڑی رنگ آمیزیاں کی ہیں، بڑے بڑے نفسیاتی نکات حل کئے ہیں اور خوب خوب دل کی بھڑاس نکالی ہے۔

آئیے ذرا دیکھیں کہ پرندوں نے ہماری شاعری پر کیا کیا احسانات کئے ہیں یوں تو اردو شاعری کا گلزار طرح طرح کے پرندوں سے بھرا پڑا ہے لیکن بعض پرند ہماری شاعری کا ایسا ضروری جزو بن گئے ہیں کہ اگر آج ہم ان کو اپنی شاعری سے خارج کر دیں تو اس کی قدر و قیمت آدھی رہ جائے۔

جب ہم چمنستان اردو کی روشوں پر گلگشت کرتے ہوئے نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اسے قسم قسم کے خوش آواز اور خوش رنگ پرندوں سے آباد پاتے ہیں، سب سے پہلے **بلبل** پر نظر پڑتی ہے، اگرچہ یہ پرند ہمارے ملک کا پرند نہیں ہے اور شاید اس سرزمین کی آب و ہوا اس کو راس بھی نہیں آتی لیکن اس کے باوجود ہماری شاعری پر اس درجہ اس کا قبضہ ہے کہ مشکل سے کوئی غزل ایسی ملے گی جس کے کسی نہ کسی شعر کو بلبل نے رونق نہ بخشی ہو۔ یہ اصل میں ایران کا ایک خوش الحان اور شیریں زبان پرند ہے۔ اس کی دو قسمیں بہت مشہور ہیں، حسینی بلبل جس کا کل جسم سفید اور چونچ سیاہ ہوتی ہے اور سلطانی بلبل جس کا کل جسم سرخی مائل اور چونچ سیاہ ہوتی ہے، دونوں کی دمیں بڑی ہوتی ہیں۔

اردو شاعری میں بلبل کو عاشق کا نمائندہ سمجھنا چاہیئے اور ایک عاشق پر عشق میں جو کچھ نہیں گذر سکتا، اردو شعر کی دنیا میں وہ سب اس پر گذرتا ہے اس چھوٹی سی چڑیا پر وہ وہ مصائب توڑے جاتے ہیں جن کو شاید قوی سے قوی اور بہادر سے بہادر انسان بھی نہیں سہ سکتا۔ کبھی اس کا دل خون ہو کر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسوؤں کر ٹپک پڑتا ہے، کبھی اس کو گرفتار کرنے کے لئے گل کی رگوں کا جال بچھایا جاتا ہے، کبھی اس کو قفس میں بند کر کے باغ میں بہار کو بلا لیا جاتا ہے، کبھی اس کو ذبح کر کے سارے گلشن میں اس کا خون بکھیر دیا جاتا ہے جس سے پھولوں کا رنگ نکھر جاتا ہے، غرض طرح طرح سے اس کی گت بنائی جاتی ہے۔

پرندوں کی دنیا جو ہمارے شاعروں نے بسائی ہے وہ ایک بڑی حد تک محض خیالی ہے، فطرت کے حسن میں پرندوں نے جو چار چاند لگائے ہیں اس کے ذکر سے ہماری شاعری محروم ہے، موجودہ دور کی بعض نظموں کو چھوڑ کر شاذ و نادر ہی ایسا کوئی شعر مل جاتا ہے جس میں کسی پرند کو فطرت کا ایک خوشنما اور کیف انگیز جزو ہونے کی حیثیت سے جگہ دی گئی ہو۔

اب چمن زار اردو میں بلبل کی بہار دیکھئے۔ میر تقی میر گلچیں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

سن اے بے درد گلچیں غارت گلشن مبارک ہو
پہ ٹک گوش مروت جانب فریاد بلبل کر

اسی مضمون کو دوسرے لفظوں میں سنئے

بلبل کی اور چشم مروت سے دیکھو ٹک — بیدردیوں چمن میں کسو پھول کو نہ توڑ

دونوں شعروں میں بلبل کو عاشق فرض کر کے گلچیں کو پھول توڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، میر نے ایک اور شعر میں گل کو جفاجو قرار دیا ہے اور بلبل کو اتنا وفادار ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنی جان ہی قربان کر دی۔

گل کی جفا بھی جانی، دیکھی وفائے بلبل — یکمشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

میر کبھی کبھی بلبل سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں:

بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا — سونے دیا نہ ہم کو، ظالم نہ آپ سوئی

ایک اور شعر میں ان کی ناراضگی زیادہ خلاف فطرت نہیں ہے۔

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے — یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو

خواجہ میر درد صوفی مشرب شاعر ہیں، ان کے نزدیک اگر انسان گوش ہوش وا رکھے تو بلبل جیسے خوش الحان پرند اور زاغ جیسے کریہہ الآواز پرند میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کہتے ہیں:

غفلت دل ہوئی مگر پنبۂ گوش خلق درد — بلبل بوستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

مصحفی اپنی فریاد کو بلبل کی فریاد سے زیادہ پر تاثیر بتاتے ہیں۔

نالے نے ترے بلبل نم چشم نہ کی گل کی — فریاد مری سن کر صیاد بہت رویا

ایک اور شعر میں بلبل کے نالوں کی تاثیر کے متعلق سودا طنز کرتے ہیں

کیوں ہے خاموش مری طرح چمن میں بلبل
تیرے نالوں کی تو تاثیر بہت اچھی ہے

آتش بلبل کے نالہ کو خدا کے حسن کا افسانہ قرار دیتے ہیں جس کو سننے کے لئے گل عدم سے ہستی میں آتے ہیں۔

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

مومن بلبل کو متنبہ کرتے ہیں کہ پھول سے وفا کی امید نہ رکھ، اس نے تیری محبت کا سودائی بن کر اپنا لباس چاک نہیں کیا ہے۔

چاک پیراہن گل پر تو نہ جا اے بلبل
جامہ یاراں لباسی کا قبا ہوتا ہے

غالب نے بلبل کو غزل خوانی سکھا دی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اقبال فلسفی ہیں اور اپنے نغمہ نغمہ سے قوم کے دل میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، وہ بلبل اور شہباز کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ چمن کا کیف و سرور نہیں، بلکہ بیابان کی ویرانی زندگی کو زندگی بنا تی ہے۔

یہ حسن و لطافت کیوں، وہ قوت و حرکت کیوں
بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی

ایک اور شعر میں نسیم سحر کی زبان سے کہتے ہیں۔

مجبور ہوتی جاتی ہوں میں ترک وطن پر
بے ذوق ہیں بلبل کی نوا ہائے طربناک

بندۂ آزاد کی ایک نظر سے بلبل میں اقبال شاہین کے اوصاف بھر دیتے ہیں

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

ذیل کے شعر میں بلبل و طاؤس کی تقلید سے مغربی تہذیب کی طرف اشارہ ہے

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اکبر الہ آبادی بھی غالب کی طرح بلبل کو چہکنا سکھاتے ہیں مگر جو کیفیت غالب کے یہاں ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

جو محفل میں اکبر نے کھولی زباں
گلستاں میں بلبل چہکنے لگے

ایک اور شعر میں اکبر نے بلبل کے ترانوں میں بھی نئے زمانے کا اثر دکھایا ہے:

رنگ رخ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا

اردو شاعری میں عندلیب کی صورت میں بھی بلبل جلوہ گر نظر آتی ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں:

صدا ہو خار خار باغباں گل کا جہاں مانع
سمجھ لے عندلیب اس باغ سے کنج قفس بہتر

میر نے ایک شعر میں عندلیب کی آواز دلخراش کا اثر ظاہر کیا ہے۔

اللہ رے عندلیب کی آواز دلخراش
جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل

میر ہی کا ایک اور شعر ہے۔

سیر کر عندلیب کا احوال — ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

ناسخ اپنے موزوں نالوں سے عندلیب کی فریاد کا مقابلہ کرتے ہیں:

نالۂ موزوں یہ کہتے ہیں بہ آواز بلند
آج ہم باطل کریں گے دعوہ ہائے عندلیب

جوش ملیح آبادی گلبانگ عندلیب سے توجہ ہٹا کر ترانہ زاغ کی طرف رخ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

اگر اچاٹ ہے گلبانگ عندلیب سے دل
تو بن خدا کے لئے محرم ترانۂ زاغ

جگر مراد آبادی بلبل کو گل کے پردہ میں خدا کے جلوے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

اور کیا چاہتی ہے، بلبل شوریدہ مزاج
پردۂ گل میں ہے خود چاک گریباں کوئی

ایک اور شعر میں جگر نے غنچوں کے کھلنے اور ان میں رنگ و بو پیدا ہونے کا سبب بلبل کے نالہ ہائے خونیں کو قرار دیا ہے۔

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں!
نہ غنچے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے!

جگر بلبل کی فریاد کو بے اثر نہیں مانتے۔

دم بخود رہ گئی بلبل ہی چمن میں ورنہ
کون سا پھول تھا جو گوش بر آواز نہ تھا

بلبل کا ذکر بہت ہو چکا، اب چمن زار اردو کے اور پرندوں کا ذکر سنئے۔

قمری بھی مجازی عاشق ہے۔ یہ فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ ہے جس کے گلے میں طوق ہوتا ہے۔ قمری اکثر سرو کے درخت پر بیٹھنا پسند کرتی ہے اس لئے اردو شاعری میں اُسے سرو کا عاشق قرار دیتے ہیں۔ میر تقی میر فرماتے ہیں۔

پروانہ ہوں ازل سے سراج منیر کا
قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا

میرؔ ہی کا شعر ہے۔

عشق قمری کو ہو بے سرو گلستاں کیونکر
اور پیدا ہمیں طاؤس ہو رقصاں کیونکر

میرؔ ایک اور شعر میں چمن کی نہر کا منبع قمری کی "چشم گریاں" کو قرار دیتے ہیں۔

شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشم گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جو کا

ذوقؔ نے قمری کی فریاد سے صور کا کام لیا ہے۔

تیرے قامت سے جو برپا قیامت سرو پر
کام ہے منقار سے فریاد قمری صور کا

کویل میں بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو شاعری کی دنیا کو چار چاند لگا سکتی ہیں اور شعر کو کیفیات سے لبریز کر سکتی ہیں لیکن اردو شعراء نے اس پرند کی ان صفات سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ منیرؔ شکوہ آبادی جیسے شاعر پر کوئل کوئی خاص اثر قائم نہ کر سکی، کہتے ہیں۔

آم کے مور کی کثرت سے نہ نکلے باہر
بیٹھ جائے وہیں آواز جو بولے کویل

اور کسی کا شعر ہے۔

دشت جنوں میں آیا تھا میں کون سی گھڑی
بیچین کر دیا مجھے کویل نے کوک کے

آرزوؔ لکھنوی اپنے شعر میں حقائق زندگی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں

سونے گھر میں ایک تو یوں ہی کہیں آتی ہے نیند
کوک اٹھتی ہے جو کویل اور اڑ جاتی ہے نیند

راقم مضمون کا ایک شعر ہے۔

رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کویل نے
وہ جب کوئی دل والا تو سمجھے درد کیا ہے

راقم مضمون ہی کا ایک اور شعر ہے۔

ہیں آموں کے باغوں میں نغمے رسیلے
یہ ساون کی راتیں ہیں کویل کی راتیں

طوطی ۔ یا توتی اردو شاعری میں اکثر چہکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پرند توتے سے مختلف ہے۔ جو لوگ اسے توتے کا مونث سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں۔ یہ لفظ اردو میں مذکر ہے۔ توتی اصل میں ایک خوش آواز پرند ہے جو شہتوت کے موسم میں اکثر دکھائی دیتا ہے اور شہتوت بہت رغبت سے کھاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام توتی پڑ گیا ہے۔ عربوں نے اس کا املا طوطی کر دیا ہے۔ امیرؔ مینائی کا شعر ہے!

صدائے قلقل مینا سے مینا نے میں آتی ہے
کہ بخت سبز اک طوطی ہے مستوں کے گلستاں کا

امیرؔ لکھنوی نے ایک محاورے سے کام لیا ہے۔

آئی خزاں فسردہ ہوئے گل گئی بہار
طوطی چمن میں بول چکا عندلیب کا

امیرؔ ہی کا ایک اور شعر ہے۔ اس میں بھی محاورے کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
بولتا ہے آجکل طوطی مرے صیاد کا

مور کے خوبصورت پروں نے بھی اردو شاعری کی زیب و زینت بڑھانے میں مدد دی ہے۔ گو اس کا برسات میں کوکنا اور مست ہو کر ناچنا جن کیفیتوں کا حامل ہے ان سے اردو شاعری نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ آدم کے ساتھ بہشت سے یہ بھی نکالا گیا تھا، شاید اسی لئے اردو شعر کی دنیا میں اسے مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ امیرؔ مینائی کا شعر ہے۔

مور ناچیں کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھیں
جل تھل کے دن آگئے فصل آئی کیا برسات کی

مور طاؤس کی صورت میں بھی اردو شاعری میں نظر آجاتا ہے۔

مرغ خوش خواں اس چمن کا ہوں کہ جس کے صحن میں
آسماں طاؤس سا کرتا ہے صبح و شام رقص

مندرجہ بالا شعر میں پپیہے کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک پہاڑی پرند ہے اور بہت ہی خوش آواز ہوتا ہے۔ اس کی آواز میں سوز اور درد ہے۔ ہندی شاعری میں اس کا درجہ وہی ہے جو اردو شاعری میں بلبل کا ہے، لیکن اردو میں اس کی پوچھ زیادہ نہیں ہے۔ محسنؔ کاکوروی کا شعر ہے۔

پپیہے نے لیں دل میں سو چٹکیاں
کہاں بولتا ہے سکھی پی کہاں

ہدہد ۔ یا مرغ سلیمان ایک خوبصورت پرند ہے جس کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ مسلمان والے اس کو حضرت سلیمان کا بیٹا خیال کرتے ہیں۔ مفسروں ہی کی ایک روایت ہے کہ پہلے اس کا تاج سونے کا تھا۔ لالچ سے لوگ اسے مارا کرتے تھے۔ جب اس نے حضرت سلیمان سے فریاد کی تو انہوں نے اس سونے کے تاج کو اس کی جان کا وبال خیال کر کے دعا دی کہ اس کا پروں کا تاج ہو جائے چنانچہ اسی وقت سے اس کا تاج پروں کا ہو گیا۔ کسی کا شعر ہے

ہوئی تکرار لے جانے میں کیا کیا جب لکھا نامہ
صبا سے نامہ بر بگڑا لڑا ہدہد کبوتر سے

لال ایک چھوٹے سے خوش آواز پرند کا نام ہے جس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور پروں پر سفید چتیاں ہوتی ہیں، مسلمان اس کی آواز سے "صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ فہم لا یرجعون" کا تلفظ ادا ہونا خیال کرتے ہیں، برسات میں اس کی سرخی نہایت تیزی پر ہوتی ہے۔ وزیر لکھنوی کا شعر ہے۔

رنگیں لب لعل کی صدا ہے   کیا خوب یہ لال بولتا ہے

کبوتر بھی اردو شاعری میں کہیں کہیں اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں مصحفی کا شعر ہے۔

الحذر اے طائرِ دل دیکھئے ہوتا ہے کیا
جان پر کھیلے ہیں ہم اس کا کبوتر مار کے

شاما ایک سیاہ رنگ خوش الحان پرند ہے، محسن کاکوروی نے کاجل کو شاما کی طرح اڑایا ہے۔

صاف آمادۂ پرواز ہے شاما کی طرح
پھڑکائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل

عقاب۔ گدھ کی قسم کا ایک شکاری پرندہ ہے۔

نہ ملے گا کبھی شکار یقیں   گو عقابِ گمان بلند ہوا

شہباز۔ بڑے باز کو کہتے ہیں جس کی مدد سے پہلے زمانے میں بادشاہ شکار کھیلا کرتے تھے۔ آتش لکھنوی کہتے ہیں۔

تو نے زلفوں کو اُلجھ پڑنے سے منڈوا ڈالا چھوڑ
شاہبازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

اقبال نے اردو شاعری میں شہباز کو بہت سربلندی عطا فرمائی ہے۔ تین شعر کے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں؛

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر   شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت   ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بےخبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام   روح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر

اقبال کا ایک اور شعر ہے:۔

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثلِ ہوس
پرِ شہباز سے ممکن نہیں پروازِ مگس

شاہین بھی ایک شکاری پرند ہے۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں اس کو ڈاکٹر اقبال کے زمانہ تک کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے فلسفہ کی ترویج میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ایک شعر میں مسلمانوں کے لئے موجودہ تعلیم کی غیر موزونیت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

یہ تو نام بہ نام چند ایسے پرندوں کا ذکر تھا جنہوں نے اردو شاعری کو اپنے وجود سے مالا مال کیا ہے، اس کے علاوہ ہماری شاعری میں بغیر کسی طائر کا نام لئے قریب قریب ہر شاعر نے پرندوں کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے استعارہ کیا ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں:

کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر
آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار

میر ہی کا ایک شعر ہے:

بے بال و پر اسیر ہوں کنجِ قفس میں میر
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

میر نے کیا خوب شعر کہا ہے:

چمن میں دل خراش آواز آتی ہے چلی شاید
پسِ دیوارِ گلشن نالہ کش ہے کوئی پربستہ

جگر مرادآبادی فرماتے ہیں:

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر

اثر لکھنوی کا شعر ہے:

اسیری ایسی آزادی سے بہتر   چمن اپنا نہ اپنا آشیاں ہے

اثر ہی کا ایک اور شعر ہے:

کیوں غارتِ چمن پہ اتر آئیں بجلیاں
کیا ان کی رہگذر میں مرا آشیاں نہ تھا

حفیظ جالندھری کا شعر ہے:

رونقِ بزم ہے شیون سو تو شیون ہی سہی
ہمصفیرانِ چمن پھر نہ خفا ہو جاتا

حفیظ کا ایک اور شعر سنئے۔

نہ کر ذکرِ نشیمن فکرِ آزادی میں اے ہمدم
مبادا اپنے ہاتھوں سے قفس تیار ہو جائے

اقبال اپنے مخصوص رنگ میں فرماتے ہیں؛

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

۔ اور شعر میں کیا خوب بات کہی ہے۔

شاخ گل پر چہک ولیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ

۔ اور شعر میں مغربی ممالک کی عیاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

گرچہ ہے دل کشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر

اس کے علاوہ اردو شعرا نے بغیر کسی پرندے کی تخصیص کے لفظ "مرغ" طائر کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے پردے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں۔

میر تقی میر کا شعر ہے۔

مرغان قفس سارے تسبیح میں تھے گل کی
ہر چند کہ ہر اک کا ڈھلکا ہوا منکا تھا

ایک اور شعر میر کا ہے۔

حیرت روئے گل سے مرغ چمن
چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا

میر ہی کا یہ شعر بھی ہے۔

ہوش اڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اس کے
مرغ چمن اگرچہ یکمشت بال و پر تھا

اقبال فرماتے ہیں۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں | جو ہوا نالۂ مرغان سحر سے مدہوش
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں | بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

راقم مضمون کا ایک شعر ہے۔

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہائے جانفزا | مرغ خوش پر از آزادی اسی کا نام ہے

جو پرند نظر کے سامنے تھے یا جن کا نام سنا تھا اردو شعرا نے صرف ان ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسے پرندوں سے بھی اردو شعر کے باغ کو آباد کیا ہے جن کا وجود دنیا میں نہیں مثلاً "ہما" یہ ایک فرضی پرند ہے ان کے متعلق شعراء کا خیال ہے کہ جس کے سر پر اس کے پروں کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جائے۔ ایک اور خیالی پرند کا نام "عنقا" رکھا ہے، اس کا بھی دنیا میں وجود نہیں ہے۔ اور خود شاعر اس لفظ کو ایسی چیزوں کے لئے استعمال کرتے ہیں جو دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

آجاؤ

میں جاگتا ہوں کہ شاید کہیں سے آجاؤ
یہیں سے کھوئی گئیں تھیں یہیں سے آجاؤ

نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گوشہ گوشہ میں
نہیں زمیں پہ تو عرش بریں سے آجاؤ

سپرد خاک اگر ہو گئیں تو کیا پروا
بشکل لالہ و گل تم زمیں سے آجاؤ

چھپو گی پردۂ رنج و الم میں یوں کب تک
نکل کے تم دل اندوہگیں سے آجاؤ

ستم ہے مجھ کو پتہ تک نہیں گئی ہو کہاں
غرض جہاں بھی ہو للہ وہیں سے آجاؤ

میں کوششوں میں ہوں دنیا بہشت کر ڈالوں
بکار خیر ہی خلد بریں سے آجاؤ

نہ کیمیا میں یہ قدرت نہ شعر میں طاقت
جو ہو سکے تو دم واپسیں سے آجاؤ

شراب نیست کے گرداب سے نکلنے کو
دہن پہ میرے لب ساتگیں سے آجاؤ

قدم جو اٹھ نہ سکیں آؤ تم زبانِ نگاہ
تخیلات میں میرے جبیں سے آجاؤ

پسند ہو نہ اگر شاہ راہِ عام تمہیں
تصورات میں راہِ یقیں سے آجاؤ

ترس رہے ہیں زمانے سے دیدۂ مشتاق
اٹھا کے پردہ رخ شرمگیں سے آجاؤ

شانتی سروپ بھٹناگر

سید الانبیاء خاتم النبیین محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم
کی
سیرت پر مشہور عالم کتاب
رحمۃ اللعالمین کامل تین جلد
(سیرت النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ بارک وسلم)
مصنفہ:- علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری
رحمۃ اللعالمین نے شائع ہوتے ہی سیرت رسول کے شیدائیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اور اس کو جملہ حقوق میں مستند قرار دے کر پسند کیا گیا اب اس کی جگہ تینوں جلدیں تیار ہو گئی ہیں۔
یقیناً اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر تڑپ جائیں گے۔ اتنی دلچسپ اتنی مکمل اور اتنی اچھی کتاب سیرت النبی صلعم پر آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ طرز بیان محبت اور عقیدت کے رنگ میں سلجھا ہوا۔ طریقہ استدلال سنجیدہ ہے سیرت کیساتھ ساتھ مختلف مذہبی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اس کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے
کتابت روشن اور خوشخط
کاغذ چکنا عمدہ دبیز
طباعت دیدہ زیب
جلد پائدار ولائتی کپڑے کی
گردپوش سہ رنگا خوبصورت
کامل تین حصہ مجلد ——— سترہ روپے
ہم اسلامی و ادبی کتابیں۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں
فہرست مفت طلب فرمائیے۔
ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب۔ کشمیری بازار۔ لاہور

پتلیاں ممالک مغرب میں

فضل حق قریشی دہلوی

اس حقیقت کا علم ہوتے ہوئے کہ پتلیاں لکڑی، مٹی، دھات یا کسی اور چیز کی بنی ہوئی بے جان مورتیں ہوتی ہیں اور ان کی ہر نقل و حرکت پس پردہ کھڑے ہوئے کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی فنی صلاحیتوں کی رہین منت ہوتی ہے، سب چھوٹے بڑے عورت مرد، مشرقی و مغربی، جاہل اور تعلیم یافتہ یکساں طور پر محظوظ ہوتے، روپے خرچ کرتے اور اپنا قیمتی وقت اس لہو و لعب کی نذر کرتے ہیں۔ اس بناوٹ پر جان دینا شاید اس وجہ سے روا رکھا جاتا ہے کہ خود انسان کی زندگی تصنع اور بناوٹ سے بہت قریب ہوتی ہے اور غیر شعوری طور پر اسے اس حقیقت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

اس زمانے ہی کے نہیں، عہد عتیق کے لوگ بھی پتلیوں کے کھیل سے لطف اٹھاتے رہے ہیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب مذہب نے اپنا رنگ جمایا، دیوتاؤں اور دیویوں نے جنم لیا تو پتلیاں اور گڑیاں بھی دائرۂ وجود میں آگئیں اور یہ اس لئے کہ فطرتاً کبھی اطمینان و سکون سے نچلا نہ بیٹھنے والا انسان ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سال کے بارہ مہینے اور تین سو پینسٹھ دن برابر سنگھاسن پر چپ چاپ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بے حس بیٹھے رہیں۔ لہذا اس نے سوچا کہ اگر ان میں اپنے آپ حرکت کرنے یا اپنی جگہ سے ہلنے کی سکت موجود نہیں ہے تو وہ خود کسی تار یا نظر نہ آنے والی ڈوری کے ذریعے ان میں عارضی صلاحیت جنبش پیدا کر دے۔ چنانچہ ہندوستان، مصر اور یونان و روما کی قدیم ترین عبادت گاہوں کی کھدائی کے بعد مٹی کی ایسی بہت سی مورتیں برآمد ہوئی ہیں جن کے نہ صرف دست و پا بلکہ سر بھی باقی جسم سے علیحدہ لیکن کسی مضبوط رشتے سے اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ ذرا سی جنبش انہیں ہاتھ پاؤں ہلانے اور منڈیا مٹکانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

زمانۂ قدیم کے مصنفوں مثلاً ابیوتیوس، ارسطو، ہوریس، افلاطون، اور زینوفون کی ان تحریروں میں جو ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں، اس قسم کے حوالے جابجا موجود ہیں۔ یہاں یہ کہ انسان نے ان قصوں اور کہانیوں کو جنہیں دیوتاؤں اور دیویوں سے منسوب کیا جاتا تھا، اچھی طرح عوام کے ذہن نشین اس طرح کرانا چاہا کہ خود وہ دیوتا اور دیویاں اپنے اپنے کردار کو عملی طور پر پیش کریں۔ دنیا میں ناٹک کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ چنانچہ قدیم کھیل مذہبی عقائد یا زیادہ سے زیادہ روایتی تاثرات کے حامل ہوتے تھے۔ مندروں کی دیواروں پر اس زمانے کے نقوش میں بھی دیوتاؤں اور دیویوں کو آپس میں بات چیت کرتے، کھیلتے کودتے، لڑتے جھگڑتے یا جانوروں کی سواری کرتے اس لئے دکھایا جاتا تھا کہ ان کی عملی سرگرمیوں کا احساس ہو اور انسان ان کی ہیبت و جبروت سے کس طرح خالی الذہن نہ ہو سکے۔

رفتہ رفتہ وہ پتلیاں مذہب کے دائرۂ تنگ سے نکل کر روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں بھی اپنا جلوہ دکھانے لگیں، اور اس طرح فریضۂ مذہب ادا کرنے کے علاوہ ان کا ناچ حصول تفریح و نشاط کی خاطر بھی اختیار کیا جانے لگا۔

جہاں تک نئے زمانہ کا تعلق ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی دنیا میں پتلیوں کو اٹلی کی سرزمین پر نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی، غالباً اس لئے کہ مصوری اور بت سازی کے ضمن میں جس کے بغیر لعبت گری کسی طرح بھی ممکن نہیں، دنیا کا کوئی دوسرا ملک اٹلی کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اپنے اس نئے دور میں بھی پتلیوں کو ابتدائی طور پر اہل گرجا کی سرپرستی حاصل ہوئی اور کھیل کے موضوع یسوع ناصری کی پیدائش اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کلیسا کی چار دیواری میں عوام کے سامنے پیش کرنے تک محدود رہا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں، بہت جلد وسعت نظر نے ان قیود کو توڑا اور پتلیاں آزاد ہو کر محبوب عوام بننے کے لئے بازار میں نکل آئیں۔ چنانچہ اٹلی کے بازی گر عرصہ دراز تک اپنی پتلیوں کو پورے تام جھام کے ساتھ ہمراہ لئے کوچہ و بازار میں یا وطن کے علاوہ آس پاس کے ملکوں میں کھیل دکھاتے، شہرت حاصل کرتے اور روپے کماتے رہے۔

شروع میں کوئی خاص پروا نہیں کی گئی لیکن رفتہ رفتہ جب انسان میں زیادہ شعور پیدا ہوا تو وہ غیر ملکوں کے عام مذاق، ادا و ادب، رسم و رواج اور عقائد و خیالات کا لحاظ رکھنے لگے۔ اس طرح ان کی ناموری اور قدر و قیمت میں اضافہ بھی ہونے لگا۔ قصوں کے پلاٹ جو بے ربط، مہمل اور ایک حد تک مضحکہ خیز ہوتے تھے، زیادہ سلیقے کے ساتھ تیار ہونے لگے۔ پھر اس احساس کے ساتھ کہ بار بار ایک ہی قسم کی چیز کا اعادہ فرسودگی

اور بے رنگی پیدا کر دیتا ہے۔ کھیلوں میں نت نئے مذاق شامل کئے جانے لگے تاکہ لوگوں کی دلچسپی کسی طرح ختم ہونے نہ پائے۔

اس طرح یہ فن، جو بظاہر بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، تکنیک کے مدارج طے کرتا ہوا پورے کمال کو پہنچ گیا اور ہر طرف ان بازی گروں کو دعوت دی جانے لگی۔ مقامی رنگ پیدا کرنے کیلئے ان کھلاڑیوں نے نقلی چہرے بھی بنائے تاکہ حسب ضرورت ان کو گنتی کی چند تپلیوں کے منہ پر چڑھا کر نت نئے کردار پیش کئے جا سکیں۔ ورنہ موقعہ اور وقت کے لحاظ سے اگر گڑیاں تیار کی جاتیں تو ان کا شمار سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچ جاتا۔

ان کی دیکھا دیکھی دوسرے ملک والوں میں بھی شوق پیدا ہوا اور انہوں نے مناسب سمجھا کہ ان غیر ملکی بازی گروں کو دعوت دینے کی بجائے خود اپنے وطن میں اس فن کو اختیار کیا جائے۔ یہ ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوتی کہ اٹلی کے بازی گر کبھی کبھی دوسرے ملکوں کے بعض افراد کا خاکہ اڑاتے، بری طرح چوٹیں کرتے اور ان کی زندگی کو مضحکہ خیز پیرائے میں پیش کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ بہت جلد دوسرے ملکوں کے خاص خاص شہروں میں تپلی ناٹک کے مرکز قائم ہو گئے۔

اس زمانے کی تپلیاں بہت موٹی تازی اور پھولی ہوئی جیسی کہ آجکل ہندوستان میں بھی رائج ہیں، گودڑ یا پھوس وغیرہ بھر کر بنائی جاتی تھیں۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں ان خانہ بدوش مغنیوں نے جو میلوں اور نمائشوں میں پھر گھوم کر گاتے ہوئے اپنی روزی کماتے اور بعد ازاں تپلیوں کے ناچ کو بھی تماشے کا ایک جزو بنا چکے تھے، نئی قسم کی تپلیاں بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کو فرانس میں ماریونیٹ اے لا پلاشے Marionnette a la Planchette کے نام سے موسوم کیا گیا۔ انہیں تیار کرنے کی ترکیب بہت آسان تھی۔ چپٹے تختے یا گتے کے ٹکڑے پر مختلف رنگوں سے کوئی تصویر بنائی اور اسے بیرونی خطوط کے پاس سے کاٹ لیا۔ ہاتھ پاؤں اور سر اس کے بھی الگ الگ کر کے مضبوط تاگے سے جوڑ لئے۔ ان تصویروں کا دوسرا رخ سادہ اور بے رنگ رکھا جاتا کیونکہ وہ تماش بینوں کی نگاہ کے سامنے کبھی نہ آتا تھا۔ پھر ایک ڈنڈے میں جسے زمین میں گاڑ کر یا کسی بھاری چیز میں پھنسا کر عمودی حالت میں کھڑا کر لیتے تھے، ڈوری کا ایک سرا باندھ دیا جاتا۔ وہ سرا دو یا تین تپلیوں کے بیچ میں سے گذرتا ہوا بازی گر کی ٹانگ تک پہنچتا جہاں اسے گھٹنے کے قریب باندھ لیتے تھے۔ بازی گر بانسری بجا کر اور ڈھول پیٹ پیٹ کر گاتا اور اپنی ٹانگ کو خاص طریقوں سے حرکت دیتا تو تپلیاں ناچنے لگتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھ بڑھ کر معمولی طور پر بات چیت کرنے یا لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہیں۔ وہ ڈوری دور بیٹھنے والے تماش بینوں کو بمشکل نظر آ سکتی تھی۔ نیز وہ مصنوعی آواز جو تپلیوں کی گفتگو کے طور پر خود بازی گر اپنے منہ سے نکالتا تھا، قطعی طور پر پہچانی نہیں جاتی تھی۔ لیکن ان کھیلوں میں سخا پن زیادہ اور کہانیوں کا پلاٹ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ البتہ بازی گر کے چٹپٹے جملے اور دلچسپ گانے مزا دیتے تھے۔ اس قسم کے تماشوں کے خاکے قدیم مخطوطات کے ساتھ اب بھی بعض لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

ان کا رواج انیسویں صدی کے وسط تک رہا لیکن ماریونیٹ کا اصطلاحی لفظ سترھویں صدی کے شروع ہی سے ان قد آدم ٹوٹواں گڑیوں کے لئے استعمال ہونے لگا تھا جن کے سروں اور بالاؤ قدوں وغیرہ میں دور سے نظر نہ آنے والے تار بندھے ہوتے اور جن کو تماشہ گاہ کی عام سطح سے بلند یا کسی طرح روپوش ہو کر بازی گر حرکت دیتے تھے۔

انگلستان میں تپلیوں کا کھیل ملکہ الزبتھ کے زمانے میں یقیناً رائج تھا کیونکہ ۱۵۵۳ء میں ایک اطالوی بازی گر نے وہاں مستقل طور پر رہائش اختیار کر کے عوام میں اس کی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ شیکسپیر اور جانسن کی اکثر تحریروں میں تپلیوں کے حوالے ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آدم و حوا سے متعلق ایک کہانی نے جسے تپلیوں کے ذریعے تماشائیوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا، ملٹن کو اس درجہ متاثر کیا کہ گم شدہ جنت Paradise Lost لکھنے کا خیال اس کے دل و دماغ میں قائم ہو گیا۔

سترھویں صدی میں تپلی ناٹک نے یورپ میں زیادہ ترقی کی اور اسے مالدار سرپرست بھی مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے تھیٹروں میں الو بولنے لگا۔ ایکٹروں کے لئے فاقے کی نوبت آ گئی اور وہ حیران رہ گئے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر جہد البقا کے اصول پر انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی، تپلی والوں کو طرح طرح سے نقصان پہنچایا، ان کے خلاف سازشیں کیں اور ان میں سے بعض کو مار بھی ڈالا۔ حتیٰ کہ ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور شہروں سے تپلیوں کے مستقل مرکز اٹھ گئے۔ بازی گر خود لوگوں کی حویلیوں اور محلوں پر جا جا کر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے یا دیہاتی میلوں یا عارضی نمائشوں تک ان کے تماشے محدود رہتے۔

اس زمانے میں تپلی ناٹک کی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جرمنی کے صرف ایک بازی گر نے دو درجن کے قریب متفرق کھیل تیار کر رکھے تھے ۔ نیز مختلف قد و قامت اور وضع قطع کی ہزار تپلیاں اس کے پاس موجود تھیں ۔

انگلستان میں تپلی ناٹک کی سرپرستی شاہ چارلس دوم اور اس کے امراء نے خوب کی ۔ چنانچہ سیموئل پیپائس نے اپنے روزنامچے میں ۳۰ اگست ۱۶۶۷ء کو لکھا ۔

"میں بارتھولومیو کے میلے میں گیا اور ادھر ادھر ٹہل کر بہت سی چیزوں سے لطف اٹھانے کے بعد میں نے دیکھا کہ میری محبوبہ ——— کیسل مین ——— تپلیوں کے ایک کھیل Patient Grizill سے محظوظ ہو رہی ہے "

ٹیٹلر Tatler اور اسپکٹیٹر Spectator کے صفحات جو اس زمانے میں بھی مشہور اخبار تھے تپلی ناٹکوں کی تعریف سے بھرے پڑے ہیں ۔ پاول نامی بازی گر کے کھیلوں کا خاص طور پر ذکر خیر ملتا ہے ۔ اس کا ایک منظری ڈرامہ "عالمگیر طوفان" بہت ہی مشہور ہوا ۔ اس میں طوفان نوحؑ کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا تھا ۔ وہ حضرت نوحؑ اور ان کے خاندان والوں کو کشتی میں جاتا اور ان کے پیچھے پیچھے تمام جانوروں کے جوڑوں کو دو دو کی قطار میں داخل ہوتا دکھاتا تھا ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا ساز و سامان کس درجہ شاندار اور بہ اعداد و شمار کے لحاظ سے بے قیاس ہوگا ۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں تپلی ناٹکوں نے زیادہ نزاکت و صفائی کا خیال رکھنا شروع کیا ۔ بعض رئیسوں نے ذاتی تفریح و نشاط کے لئے اپنے ہی ناٹک گھر قائم کر لئے ، جن سے ان کے رشتہ دار اور مہمان ہی لطف اٹھا سکتے تھے ۔ مثلاً ہنگری کے شہزادہ ایسٹرہازی نے اپنے محل واقعہ ایزن سٹیڈ میں ایک تپلی ناٹک گھر کھولا جس نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۰ء کے درمیان پانچ ایسے کھیل دکھائے جن کے گانے آسٹریا کے اس زمانے کے مشہور ماہر موسیقی ہیڈن نے لکھے ۔ وہ اس قدر شاندار اور پُر لطف تھے کہ ملکہ میریا تھریسیہ نے انہیں دیکھ کر خواہش ظاہر کی کہ ان کی نمائش ہمارے محل میں کی جائے ۔ ۱۷۵۳ء میں جرمنی کے مشہور ڈرامہ نویس گیٹے نے ایک تپلی ناٹک گھر کے لئے کئی منظوم کھیل لکھے ، اور اسی وقت اسے شہرۂ آفاق ڈرامہ فاؤسٹ لکھنے کا خیال پیدا ہوا ۔ فاؤسٹ کی اولین نمائش تپلی گھر ہی سے عمل میں آئی ۔

اٹھارویں صدی کے وسط تک فرانس میں بھی تپلی ناٹک بہت مقبول رہا لیکن یک بیک وہاں چھایا ناٹک Shadow Play سے دلچسپی بڑھی اور وہ ہر قسم کی تفریحات پر چھا گیا ۔

انیسویں صدی میں تپلیوں کی بناوٹ اور انہیں نچانے کے طریقوں میں کل پرزوں کو شامل کر کے ایسی ترقی دی کہ وہ صداقت سے زیادہ قریب معلوم ہونے لگے ۔ اس سے پہلے ان کی نقل و حرکت میں جو تصنع اور بناوٹ پائی جاتی تھی ، وہ یکسر مفقود ہو گئی اور اس طرح ان کی مقبولیت کا سکہ نئے سرے سے قائم ہونے لگا ۔ وائنا کے ایک مشہور بازی گر گینرل پریٹ کی تپلیاں اتنی "جاندار" تھیں کہ کھیل کے دوران میں حسب ضرورت کھانسنے ، کھنکھارنے اور تھوکنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھیں ۔

جرمنی میں قومی تحریک شروع ہونے کے ساتھ تپلیوں کے کھیل نے بھی ترقی کی کیونکہ انہی کے ذریعے مقامی کرداروں اور روایتوں کو پیش کر کے اپنا اثر قائم کیا جاتا تھا ۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں سب سے زیادہ اہم تھیٹر جوزف شمد نے میونخ میں کھولا ۔

اٹلی میں ڈوری والی تپلیاں زیادہ رائج رہیں ۔ وہاں کے کھیل اور سنگیت ناٹک بھی زیادہ دلچسپ ، مکمل اور مربوط ہوتے تھے ۔ ان میں کوئی بات بے تکی نہیں ہوتی تھی ۔ اسی لئے زمانے کی ترقی اور مذاق عامہ کے تغیر و تبدل کے باوجود دو تھیٹر جو ۱۸۱۵ء اور ۱۸۱۶ء میں کھلے آج تک قائم ہیں ۔ ان میں سے پہلا تیاترو جیرولامو شہر میلان میں اور دوسرا تیاترو گیاندوجا شہر تیورن میں ہے ۔

فرانس میں تپلی ناٹک کو ادیبوں اور فن لطیف کے ماہروں کا زبردست تعاون حاصل رہا ۔ خصوصاً انیسویں صدی کے وسط میں جب جارج سینڈ فرانس کی مشہور ناول نگار اور ڈرامہ نویس خاتون گزری ہے ، اس کا اصل نام لیوسلی اورور ڈیوپن تھا ۔ اس کے دل میں تھیٹر کا خیال محض حسن اتفاق سے پیدا ہوا کیونکہ ایک بار اس نے اپنے لڑکے موریس اور اس کے مصور دوست یوجین لیمبرٹ کو تپلیوں کے کھیل میں عملی دلچسپی لیتے دیکھ لیا تھا ۔ جارج سینڈ نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ لباسوں کی تیاری میں بھی حصہ لیا ۔ موریس اور یوجین نے مل کر تپلیاں بنائیں اور ان کے چہروں کو مختلف روغنوں سے دلکش بنا دیا ۔ ان کے ناٹک گھر کا نام "تیاترو دا آمس" تھا ۔ اس میں قہقہہ انگیز مزاحیہ ڈراموں کے ساتھ ساتھ نہایت دلدوز المیہ کھیل بھی دکھائے گئے ۔ شہرت کے انتہائی عروج کے وقت اس تھیٹر کے بے جان اداکاروں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی ۔

۱۸۶۳ء میں لامر سیر تیووِل نامی ایک شخص نے اپنے بیمار بچے کو

خوش کرنے کے لئے یہ طریقہ نکالا کہ اخبارات کی تصاویر سگار کے ڈبے کی لکڑی پر چپکا کے اور پہلوؤں سے کاٹ کے نچانی شروع کیں تاکہ مریض کا دل بہل جائے۔ یہ تصویریں چینی یک رخی پتلیوں کی طرح جنکا ذکر اوپر آ چکا ہے، ہاتھ، پاؤں ہلاتی اور سر مٹکاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس شخص کی یہ ذاتی دلچسپی گھر کی چار دیواری سے نکل کر پبلک میں آگئی۔ اسے کئی حسن کار مل گئے جو ساز بجانے اور مورتیں بنانے کے ماہر تھے۔ اس نے اپنے ہمعصر ادیبوں کی ہم شکل گڑیاں تیار کرکے ان کی زندگی کے خاکے عوام کے روبرو پیش کئے اور بڑا نام پیدا کیا۔ ان ادیبوں میں ٹرولی تاحمی کوکلیتن، سارہ برنہارٹ، ایملی زولا اور الفانسو ڈوڈے کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے تک تاپلیوں کے کھیل امریکہ، زیکوسلوکیہ، فرانس، جرمنی، برطانیہ، اٹلی اور روس میں نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ لڑائی کی تباہکاریوں نے بعض ملکوں میں اس فنِ لطیف کو نقصان پہنچایا ہو لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہو گیا ہے جس طرح قدرت کے عناصر مٹی میں ملے ہوئے بیج کو زمین سے پھوٹ آنے میں مدد دیتے ہیں، اسی طرح امن و عافیت کا پورا تسلط ہو جانے کے بعد تہذیب و تمدن کے تقاضے ان ملکوں میں پتلیوں کے کھیل کو دوبارہ زندہ کردینگے جہاں پچھلے چھ سال میں وہ جنگی دیوتاؤں کے ہولناک شانے پر دم توڑ چکا ہے۔

گیت

"چرنجیت"

رات رو پہری۔ میری باہوں میں کندن سی کایا
سونے کے پیالے میں پیاسے نین امرت رس پایا
چاند، بھور کی لالی جیسے کھلیں آنکھ مچولی
مسکائے شرمائے رہ رہ سندر مکھ من بھایا
رات رو پہری، میری باہوں میں کندن سی کایا

جھکی جھکی ان لمبی پلکوں کے پیچھے اورانی
کون خزانہ چوروں سے ڈر تو نے آج چھپایا
رات رو پہری، میری باہوں میں کندن سی کایا

نٹ کھٹ کنگن چھن چھن چھنکے چھم چھم پائل باجے
ناچ رہی مدہوش جوانی، ناچ رہی جگ مایا
رات رو پہری، میری باہوں میں کندن سی کایا

ہونٹ نہیں پیارے ہنستے کیسے کوئی بولے
آنکھوں نے دل کی دھڑکن نے من کا حال سنایا
رات رو پہری، میری باہوں میں کندن سی کایا

غزل

آزارِ نفس و جان کا سودا نہیں مجھے
ترکِ تعلقات کی پروا نہیں مجھے

بندہ ہوں محض اور بس اک التفات کا
حاسِ غیر و دعابی تو اتنی نہیں مجھے

دہلی کی بود و باش محبت کی بات ہے
فضلِ خدا سے ورنہ کہاں کیا نہیں مجھے

شکرِ خدا کہ خلق کا منت گزار ہوں
حاشا، ستم تو یاد بھی رہتا نہیں مجھے

ہر وقت دل میں قہرِ الٰہی کا خوف ہے
واللہ بغض و دیر و کلیسا نہیں مجھے

مانا کہ ہر سخن میں مری فکر کامیاب
واضح رہے کہ شعر کا دعویٰ نہیں مجھے

وہ چاہے جسقدر مجھے توفیق نیک دے
یوں ہی کا خیال بھی زیبا نہیں مجھے

آیا کوئی مقام تو جنبش زباں کو دی
ہاں عرضِ شوق شوق کا دعویٰ نہیں مجھے

احساس پر تجاہلِ احباب کے نثار
کچھ اس طرح خموش ہیں گویا نہیں مجھے

بازو چلائے عزم کے کس طرح بام دوں؟
انسان ہیں حیں کہ تمنا نہیں مجھے

دنیا تمام مرحمتِ لا الٰہ ہے
ہرگز کسی سے رشک گوارا نہیں مجھے

ناحق ہی ہیں خمار مرے حق کا کیوں نہ ہو
تاہم یہاں بھی ضبط کا یارا نہیں مجھے

خلقِ خدا نے پاک ہے کیوں ملے جو ملیں
یا اہلِ عقل و ہوش سے جھگڑا نہیں مجھے

میرا مزاج ازل سے قناعت پسند ہے
کچھ عشرت و نشاط کا سودا نہیں مجھے

سب کچھ ہے اُسکے فضل سے حیراں یہ کیوں کہوں
"ایسا مجھے نہیں ہے، کہ دیا نہیں مجھے"

حیراں خیر آبادی

کوئل سے

پگلی کوئل گیت سنائے
اپنے من کا بھید بتائے

تم تو مجھ کو چھوڑ گئے ہو
پریم کے ناطے توڑ گئے ہو

پگلی کوئل گیت سنائے

ہک پل سو چین نہ پائے
روگ لگایا روگی بنایا

پریت لگا کے خوب ستایا
پگلی کوئل گیت سنائے

برہا اگنی من کو جلائے
آؤ ساجن، ساجن آؤ
مجھ دکھیا کو مکھ دکھلاؤ

رو رو اپنے پی کو بلائے
پگلی کوئل گیت سنائے

کشور جہانگیر

مہاجرین

افسانہ

راجندر سنگھ بیدی

وہ ایک دم پاکھا کے اسٹیشن پر اُتر پڑے ——— وہ مہاجرین جو ایک مرد، ایک عورت اور ایک ہی بچے پر مشتمل تھے، کوئی بڑے عزم والے لوگ نظر آتے تھے۔ سوائے اس بات کے کہ اسٹیشن پر اترنے سے پہلے عورت کچھ دیر کے لئے رُکی اور کوئی بات ان کے عزم اور استقلال کو نہیں جھٹلاتی تھی۔

مسافر اُترے اور ان میں سے کچھ ترتیب اور کچھ دھکم پیل کے ساتھ باہر نکل گئے۔ لیکن مہاجرین ابھی وہیں کھڑے تھے اور اپنے عزم کے باوجود کچھ سوچ رہے تھے۔ ایک دو قلیوں نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن مرد نے بڑھ کر کہا "نہیں میاں، میں آپ ہی قلی آپ ہوں ———" اور مہاجرین کے ساز و سامان میں کچھ پھٹی پرانی کتابیں، کچھ تپائیاں، کچھ ٹرنک اور ایک دو تہ کئے ہوئے نمدے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے سر پر محبت کا تمام بوجھ تھا جو کوئی قلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"شاید ٹینکیوں کے لئے آئے ہیں" دارلیش اے ایس ایم نے سوچا۔

ان دنوں ٹینکیوں کی مرمت کے لئے بہت سے لوگ آ رہے تھے۔ سرکار ان لوگوں کی درآمد کے لئے ذمہ دار تھی لیکن پاکھا کے پتی داروں میں سے کوئی بھی انہیں راستہ دکھانے کے لئے نہ آیا تھا۔ اور اس لئے وہ بیچارے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ دارلیش نے رحم بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور بالکل مشینی انداز میں گاڑی کو چلے جانے کا سگنل دیتا رہا۔ "شاید رہائش کی بابت کوئی فیصلہ نہ ہوا ہو" دارلیش نے سوچا ..... تاہم یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ لوگ پاکھا کے اسٹیشن پر اُگے ہوئے بہی اور اناس کو دیکھ کر اُتر پڑے ہوں۔ ہر مسافر کے دل میں منزل طے کی ہوئی بات ہوتی ہے ورنہ وہ یونہی سا لکھا، پاتھا یا جاکو لاٹری کے اسٹیشنوں پر نہیں اُتر پڑتا۔ البتہ جب سردیاں چپکے چپکے، ہولے ہولے، گرمیوں کے ساتھ بغلگیر ہوتی ہیں تو قدرت میں چاروں طرف ان گنت خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت ہو سکتا ہے کوئی مسافر کسی بھی اسٹیشن پر اُتر جائے ——— گو دن وہی تھے لیکن وہ مہاجرین یوں "اُتر جانے" والے نہیں تھے!

دارلیش بدستور سگنل کرتا ہوا، خانہ بدوشوں کے انداز میں سامنے کے شاملات کو دیکھنے لگا۔ بہی، اناس، اور شاملات میں اُگے ہوئے پھلوں کی سرسبزی آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی۔ دارلیش خالی خولی نگاہوں سے دیکھتا رہا، اس وقت کیبن میں وزیرے نے کانٹا گرا دیا اور سب کیبن کی طرف دیکھنے لگے جس کے نیچے لکھا تھا "پاکھا جنکشن!" ..... اس کے قریب ہی مرمت طلب ٹینکی، جن میں پچیس ہزار گیلن پانی آ سکتا تھا، برس رہی تھی۔ دارلیش نے پھر اس مرد اور ٹینکی کی طرف دیکھا ———

"آپ کہاں جائیں گے؟" دارلیش نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں قریب کوئی آرام گاہ ہے نا؟" اس مرد نے دارلیش کی پیشکش قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ مرد گورکھپور اور اسی کے نواح کی ہندوستانی بول رہا تھا۔

دارلیش نے جواب دیا: "اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے ایک حجام کی دکان ہے، رنگون ہیر کٹنگ ——— اور اس کے پاس ایک گندہ سا ہوٹل ہے جس کے بالکل سامنے پاکھا کے کوئلے کی اَن لوڈنگ ہوتی ہے اور ......"

"کوئی بات نہیں، کوئی ......" اسی مرد نے ٹوکا۔

دارلیش اس وقت تک گاڑی نکال چکا تھا، اس کے پاس فرصت کے چند لمحے تھے جن کا وہ استعمال ایک عام متعجب آدمی کی طرح جاسوسی میں کرنا چاہتا تھا۔ یہ کون ہیں؟ کیوں ہیں؟ ——— کہاں جا رہے ہیں؟ اور اس قسم کے واجب اور ناواجب سوال اس کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے۔ دراصل دارلیش اس بات کو ماننا نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ ایسے شخص کے پاس آئے ہوں جنہیں وہ نہ جانتا ہو ——— وہ پاکھا کے ہر کتے بلے سے واقف تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ اس نے رنگون ہیر کٹنگ اور اَن لوڈنگ کے پاس تنور کا ذکر کرتے ہوئے شروع کیا ——— "آپ کے ساتھ بچہ ہے ——— نا؟"

اس مرد نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور کہا ——— "ہاں، اور بیوی بھی ......"

اور پھر وہ بہت تھوڑا سا مسکرایا جس کی وضاحت اس کے ہونٹوں کے کونوں نے کر دی۔ دارلیش نے دیکھا اور اس کے خاندان کی روایتی مہمان نوازی اُمڈ آئی ——— "مجھے بچے سے غرض ہے، بیوی سے نہیں ———" اس نے پھر سوچا اور شاید ہنسا بھی۔ گویا اس نے اس مرد سے بدلہ لیا ہو اور بولا: "اسی تنور کے نانبائی نے دو بلے پال رکھے ہیں، جو اکثر دودھ کو منہ لگا جاتے ہیں ......"

بیگم نے دارلیش کا ساتھ دیتے ہوئے کہا: "گڈو کو تنور کا دودھ نہیں پلائیں گے ——— بیگم کچھ آزادی محسوس کرنے لگی تھیں۔ ابھی تک وہ اپنی ان جانی جمع تفریق کے ساتھ دارلیش کو اپنا بھائی بنا چکی تھیں۔

دارلیش نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "بیگم سمجھتی ہیں، بیگم جانتی ہیں ..... بلی کی مونچھ کا بال دودھ میں پڑ جائے تو ......"

"نعوذ باللہ!" بیگم نے کہا "کہتے ہیں مرگی کا ڈر ہوتا ہے!"

——— دارلیش مسکرا رہا تھا!

بیگم ایک ٹوکری تھام کر بیٹھ گئی۔ اس ٹوکری میں کپڑوں کے بجائے بہت سے چیتھڑے نظر آتے تھے جیسے بچہ پیدا ہونے سے پہلے گاؤں کی عورتیں جمع کر لیتی ہیں۔ ذرا مرد نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دارلیش کو غور کرنے کا موقع ملا۔ مرد اتنا لمبا تھا کہ اونٹ کی دُم چومے لیکن اس کے باوجود اتنا بُرا نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس کے کندھے چوڑے تھے۔ اگر وہ دُبلا بھی تھا تو کفنی کی قسم کے لباس نے اس کا جسم چھپا رکھا تھا۔ مولویانہ داڑھی میں اس کی مضبوط ٹھوڑی "محسوس" ہوتی تھی اور جس طرح تھوڑی سے زیادہ شراب پی لینے سے دوسرے آدمی کے خد و خال ٹیڑھے میڑھے اور نقوش کبھی واضح اور کبھی غیر واضح نظر آنے لگتے ہیں اسی طرح اس کے

چہرے کی باقی "چیزیں" اپنی اپنی جگہوں سے ادھر ادھر ہٹی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ غور کرنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ "چیزیں" وہیں تھیں جہاں انھیں ہونا چاہئے تھا!
چونکہ عورتیں دنیا کے اس گوشے میں کم تھیں اس لئے دارلیش کو وہ عورت خوبصورت نظر آئی۔ ورنہ وہ گول مٹول سا چہرہ اور لباس میں تنگ سا اریب پائجامہ اور اس کے نیچے ٹھیٹھ جوتی ان دونوں کے اچھی لگتی ہے۔ وہ عورت تھی اور یہ کافی تھا پھر ایک بچے کی ماں تھی، یہ بہت تھا!
"آپ کا نام؟" دارلیش نے پوچھ لیا۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بولا:۔ "آپ کسے ملنا چاہتے ہیں؟"
گویا دارلیش سمجھتا تھا کہ اتنی جلدی نام پوچھ لینا بہت زیادہ "دخل" ہے دوسرے سوال کا مطلب تھا اگر آپ نام بتانا گوارا نہیں فرماتے تو دوسرے سوال کا جواب دینے میں گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ یونہی ہوا۔ نام بتاتے ہوئے اس شخص نے ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن دوسرے سوال کا جواب فوراً ہی دیتے ہوئے بولا:۔
"کوئی خاص جگہ نہیں — آپ یہاں ریلوے میں ہیں؟"
دارلیش نے اب اپنے آپ کو محفوظ سمجھا اور بولا:۔ "میرا نام دارلیش ہے اور میں یہاں اسسٹنٹ ہوں۔"
"میرا نام آثم ہے۔ مولوی آثم۔" اس مرد نے آناً فاناً کہا۔ شاید اس لئے کہ کتنا عرصہ وہ نام کو چھپانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا!
"مولوی آثم، خوب!" اور دارلیش نے آثم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:۔ "بہت خوشی ہوئی —"
— "تو آپ کبیرا کے ہاں جائیں گے — مسجد میں؟"
"نہیں بھیا" بیگم بول اٹھی "ہم۔۔۔۔"
"آپ نہیں بتائے گا۔" دارلیش نے انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا "تو گویا آپ دو آدمیوں کے مہمان ہیں؟"
"کون دو آدمی؟"
"نہیں نہیں ٹھہرئیے — آپ سلطان کے یہاں جا رہے ہیں جو گھوڑوں کی کاٹھیاں بناتا ہے، نہیں، تو جبار کے ہاں اور یا تیجی داروں کے ہاں۔"
مولوی آثم کھلکھلا کر ہنس رہے تھے اور دارلیش شرمندگی کو چھپانے کے لئے اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔ مہاجرین میں سے عورت کے لئے ہجرت آسان ہو گئی تھی اور وہ تھوڑی سی فرصت پا کر اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے سامان کی طرف دیکھنے لگی اور اپنے سامان کے سب سے پیارے اور بدصورت حصے کو جھلانے لگی — "بھوک لگی ہے میری گڈو کو"۔۔۔۔ مولوی آثم دراصل کسی سے بے تکلف ہونا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن جانے انہوں نے دارلیش میں کیا دیکھا کہ چھوٹتے ہی اپنا نام بتا دیا۔ شاید اس لئے کہ ایک آدھ آدمی کو تو اللہ میاں

رازداں بنا لیتا ہے۔ لیکن یہی نام مولوی آثم کے لئے سب سے بڑا راز تھا خصوصاً پاکھا کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد یہ راز اور بھی اہمیت رکھتا تھا۔ مولوی آثم بولے۔ "بھائی، میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔۔۔ میں یہاں کوئی کام کروں گا! کوئی کام۔۔۔۔۔ ابھی مجھے ایک ٹھکانہ چاہئے اور بس!"
"پاکھا میں کیا کام مل سکتا ہے؟" دارلیش نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "اَن لوڈنگ کے سوا اور تو یہاں کوئی کام نہیں اور یا ٹھیکیاں مرمت ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ دراصل آپ کیا کام کریں گے؟"
"جو مل جائے گا؟"
"میں نہیں مانتا کہ آپ کوئی کام نہیں کر سکتے۔"
"یہ میں نے کب کہا؟ میں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔"
"آپ نے جو کہا جو کام ہو گا کریں گے۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب تھا اتنی عمر میں آپ نے کوئی نہ کوئی ایسی بات تو سیکھی ہو گی جو آپ ہی کر سکتے ہیں اور۔۔۔۔ اور مثلاً میں نہیں کر سکتا۔"
"ہاں سیکھی ہے — لیکن وہ بیکار ہے"
"ہنف ہنف!" دارلیش نے اپنی ہنسی کو دبایا۔ "ایسی بھی کوئی چیز ہے جو بیکار ہو۔۔۔۔۔ کیوں، گڈو بی بی کیوں رو رہی ہے؟"
— گڈو رو رہی تھی لیکن دارلیش کی دخل اندازی سے سہم گئی۔ بیگم بولیں: "اسے بھوک لگ رہی ہے نا۔"
لیکن مولوی آثم بولے: "بھئی اب تمہیں کیا بتاؤں، جو میں نے اب تک حاصل کیا ہے وہ بیکار ہے!"
"اگر کوئی بہت راز کی بات ہے تو۔۔۔۔"
"نہیں تو، سُن لو — میں دلّی کے کوچہ چیلان میں رہتا تھا اور شعر کہا کرتا تھا —"
"شعر!"
"ہاں شعر —"
"ارشاد فرمائیے بھلا کوئی"
"میں کوئی اتنے پائے کا شاعر نہیں تھا بھائی، یونہی تک بندی کرتا تھا۔"
"نہیں آپ تو کسرِ نفسی کرتے ہیں، ماشاء اللہ یوں تو۔۔۔۔"
"مولوی آثم نے جھلّاتے ہوئے کہا: "بس میاں دارلیش، اسی بات سے گھبرا کر بھاگ آیا ہوں۔ ابھی میں نے شعر سنایا ہی نہیں اور آپ داد دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ نے فرض کر لیا کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں اور میرے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنی چاہئے۔ مجھے بہت کوفت ہوئی، کیونکہ نہ میں نے شعر کہا، نہ آپ نے سُنا، آپ نے داد دی اور میں جھک کر آداب بجا لانے کی فکر میں تھا — یہ

سب کچھ کس لئے، کیوں ——/ آخر کیوں ؟"

گاڑی سننے اور دیکھنے کے اُفق پر پہنچ چکی تھی۔ اب وہاں بڑے بجر بھی اور بڑمل کے درمیان مہاجرین کھڑے تھے اور یا دارِش تھا جسکی سبز جھنڈی بڑمل کا ایک پتہ دکھائی دے رہی تھی۔ انناس کے سوکھے ہوئے پھل ہوا کے کسی جھونکے سے گر کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگے تھے۔ دور اَن لوڈنگ میں کوئلے کا دھواں سارے یارڈ پر چھایا ہوا تھا —— ایک پل کے لئے دارِش نے سوچا "کہیں یہ لوگ کمیونسٹ نہ ہوں —— کیا پتہ، کان کے مزدوروں کو منظم کرنے آئے ہوں ——" پھر اس نے گڈّو اور اس کی ماں کی طرف دیکھا اور کہا "جانے یہ سب کچھ کیوں فلاح، ہو شعر و غیرہ کا ڈھونگ بھی اپنے اصل مقصد . . . ." اور اس نے شک اور تاسف کی ملی جلی نگاہوں سے مولوی آثم کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ مولوی آثم کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دارِش اور آثم دونوں فوری ضرورت کے متعلق بھول گئے تھے حالانکہ انہیں چاہئے تھا کہ سب سے پہلے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرتے —— صلح ہو جائے جو لڑائی ہو کر —— کچھ ایسی محبت پرورش پا رہی تھی!

آخر دونوں نے ایک ساتھ سوچا کہ اسوقت کہاں جائیں۔ دارِش بھلا اپنی روایات سے باہر کیسے جا سکتا تھا۔ جیسے داد وصول کرتے ہی مولوی آثم نے آداب بجالانے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح مولوی آثم کے مدّعا زبان پر لاتے ہی دارِش کے باپ دادا دارِش کے ذریعے سے بولنے لگے تھے ——

"آپ میرے ہاں چلئے ——"

مولوی آثم اور بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کیا۔ آخر مولوی آثم بولے: "اگر میں اسوقت تکلف کروں تو یہ جھوٹی شرم ہو گی لہٰذا اگر آپ اسوقت تک ہمیں پناہ دیں جب تک میں سامنے بازار میں اپنا ٹھکانا نہیں کر لیتا تو میں آپ کا ممنون ہوں گا"

دارِش نے اسٹیشن کے ایک دو قلیوں کو آواز دی۔ وزیر اکا نشا چھوڑ کر دھر آ رہا تھا وہ بھی اے۔ ایس۔ ایم کی بیگار میں شامل ہو گیا۔ کچھ سامان تو مولوی آثم نے ہاتھ لگایا لیکن دارِش نے منع کر دیا۔ جیسے دارِش نے سامان اٹھایا ویسے ہی اس کے مہمان تھے۔ اس لئے آثم نے صرف دارِش کی عزت کے لئے، اٹھائے ہوئے ندرے نیچے رکھ دئے اور چپ راست، چپ راست کرتا ہوا دارِش کے ساتھ چل دیا۔ دارِش سوچ رہا تھا۔ مولوی آثم نے کسی حد تک اپنی روایت کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ مثلاً جب میں نے انھیں اپنے ہاں چلنے کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے روایتی انداز میں یہ نہیں کہا: "نہیں جناب، آپ کو ناحق تکلیف ہو گی" اب وہ چیزوں کو حقائق کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ شاید مولوی آثم اور ان کی بیگم یہ بھی جانتے ہوں کہ کسی کو احسان کرنے کا موقع دینا چاہئے جس پر احسان کیا جائے یہ اسکے لئے اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ احسان کرنے والے کے لئے —— شاید —— شاید —— اور یہ وہ وقت تھا جبکہ دارِش نے ان لوگوں کو مہاجرین کا خطاب دیا تھا!

ابھی اسٹیشن کا پلیٹ فارم گذرا نہیں تھا کہ بہی کے پودے کم ہونے شروع ہو گئے اور جنگلے کے پیچھے سے لائن کے متوازی پلکا کا ریلوے بازار نظر آنے لگا۔ دارِش کا بنایا ہوا ہوٹل —— تنور، پھاٹک سے ایک طرف ہٹ کر تھا البتہ رنگون ہیر کٹنگ بالکل سامنے تھا۔ ارد گرد پرانے کپڑوں اور پرانے جوتوں کی دکانیں تھیں جن پر بیت سے کاریگر بیٹھے پرانی ٹوپیوں پر نیا کپڑا لگا رہے تھے۔ ان دکانوں کے پیچھے کوارٹر دور تک چلے گئے تھے۔ یہی ٹی چی داروں کے مکان تھے۔ انہی میں دو تبے، سلطان اور جبار رہتے تھے۔ یہیں چاروں طرف سے مکانوں میں گھری ہوئی کبیرا کی مسجد تھی جسکا گنبد یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بہت سے پتوں میں کوئی رس بھرا خوشہ ہوتا ہے۔

ٹھیلے، گاڑیاں، اَن لوڈنگ کا سامان، بازار، ٹریفک —— گڈّو کثرت نظارہ سے بوکھلا گئی تھی اور کسی حد تک دودھ کا خیال بھول چکی تھی۔ بہلاریلا شاید جھوٹی بھوک کا تھا حس کی "تلافی" پانی کا ایک گھونٹ بھی کر سکتا ہے۔ البتہ سچی بھوک میں کثرت نظارہ سے توجہ منتشر نہیں ہو سکی۔ گڈّو کے ہاتھ میں کاغذ کی بنی ہوئی ایک کشتی تھی جسے وہ ہلکے پانیوں میں تیرنے کے لئے چھوڑ دیتی اور کبھی بیگم، کبھی آثم، کبھی کوئی قلی یا دارِش اٹھا کر اسے دے دیتے —— اس دفعہ اس نے کشتی دارِش کی طرف بڑھائی —— بیگم بولی: "ماموں جان نہیں لیتے تمہاری کشتی؟"

"ماموں جان!" دارِش نے سوچا ——!

تو ابھی تک بیگم کا دل دلّی ہی میں دھڑک رہا تھا اور پاکھا کی کوئی علامت اس میں نظر نہیں آتی تھی۔ نئی جگہ میں آنے سے اسکا دل مسرور بھی تھا اور مغموم بھی۔ اس نے آثم کے آسرے یہ ہجرت کی تھی۔ مہاجرین میں وہ بچہ تھا —— گڈّو، یا آثم —— اور بیگم ان کا سا تھ دے رہی تھیں۔ وہ دائرے سے نکلنے کی خواہشمند تھیں لیکن آہستہ آہستہ، ہولے ہولے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ بالکل جیسے رسوم و روایات میں بندھی ہوئی کنواری، چاہتی ہے کہ سوتے میں کوئی اس سے لپٹ جائے تاکہ اسکا کوئی قصور نہ ہو اور . . . . .

مولوی آثم نے ابھی پاکھا کو محسوس نہیں کیا تھا۔ یا شاید کیا تھا اسی لئے وہ بے پروائی اور عزم "کے ساتھ گنگنا رہے تھے کہ

گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!

اس بظاہر بے بسی میں جو چیلنج تھا وہ مولوی آثم کو بھی معلوم تھا اور اس کے صیاد کو بھی۔ وہ گا رہے تھے —— بس یونہی، محض گنگنانے کی غرض سے۔ شاید اس لئے کہ وہ آخری بار "وہی" کرنا چاہتے تھے جو کہ وہ زندگی بھر کرتے رہے تھے۔ زندگی بھر کا جور

آخری فعل میں کب اپنے خدا کو دھوکا دیتا ہے. برخلاف اس کے . . . .

یہ سفر کوچ چیلان سے شروع ہوتا ہے اور پاٹھا بیٹھ کر ختم ہو جاتا تھا پلکے کی موت تو صرف ایک خول تھی . ایک ٹرانسلس" جس میں مولوی آثم کا کیڑا بے حس وحرکت پڑا گار رہا تھا تاکہ وہ تیتری بن جائے ۔

گھنٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!

اتنی دیر میں اسباب رکھا جا چکا تھا لیکن گرد دودھ پی رہی تھی ۔ اس دودھ میں نہ بتے کا ڈر تھا نہ سٹے کا ، نہ مرگی اور تشنج کا خطرہ اور نہ ہائیڈرو فوبیا کا ۔ دارش کے "باپ دادا" ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے تاکہ مہمانوں کو تکلیف نہ ہو اور مولوی آثم ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے اپنے عزم کے ساتھ "ہوں ہوں" کر رہے تھے گویا آنے والی مصیبتوں کا ابھی سے مقابلہ کر رہے ہوں ۔

بیگم اُٹھیں اور زنانے میں چلی گئیں ۔ یونہی ، ورنہ وہ مردانے میں بھی بیٹھ سکتی تھیں ۔ دارش نے اس وقت سنبھلتے ہوئے کہا : "معاف کیجئے گا ، مجھ سے اس وقت گستاخی ہوئی تھی ۔"

"نہیں ، آپ کا کیا قصور" مولوی آثم نے دارش کی وکالت کرتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں قاعدہ یہی ہے کہ اگر کوئی یہ تمادے کہ میں شاعر ہوں تو اس سے فرمائش کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے بشرطیکہ . . . . . ."

"بس اسی لئے ، اسی لئے ۔" دارش نے کرسی کھینچتے ہوئے کہا اور قلیوں سے بولا : "بس ، جاؤ ۔ دیکھتے کیا ہو ؟ اپنے ہی آدمی ہیں"

مولوی آثم نے جیب سے پیسے نکالنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ۔ یہ بُری بات تھی کیونکہ اس سے غلط فہمی کا احتمال ہو سکتا تھا ۔ دارش اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ لوگ کس حد تک "آزاد" ہو چکے ہیں ۔ لیکن اگر پیسے نہ ہوں تو یونہی جیب کی طرف ہاتھ لے جانا اور میزبان کا یہ کہنا "نہیں جناب رہنے دیجئے" ۔ ایک ایسی چیز تھی جو پلکے کی موت کے بعد ممکن نہیں تھی ۔

جب مہمان نوازی ہو چکی تو دارش نے پوچھا : "تو آپ کیا کام کریں گے" ؟

"میں سب کام کر سکتا ہوں ۔" آثم نے جواب دیا ۔

"مثلاً" ؟

"مثلاً ۔ میں آپ کے جوتے اٹھا سکتا ہوں ۔ آپ کی چلم بھر سکتا ہوں"

دارش نے گھبرا کر مولوی آثم کی داڑھی کی طرف دیکھا ۔ وہ چہرے سے اتنے باوقار آدمی نظر آتے تھے ۔ دارش کہہ سکتا تھا ، نہیں جناب ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔ لیکن اس نے اپنے مقابل بیٹھے ہوئے آدمی کی بے تکلفی کے پیش نظر کچھ نہ کہا اور پھر مولوی آثم جو کچھ کہہ رہے تھے ۔ اس میں شک ہی نہیں تھا ۔ وہ سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار تھے ۔ کر گزرنے نہیں بلکہ کرنے کے لئے مستعد تھے ۔

دور سے کہیں گھنگھے کے پودوں کی تیز سی خوشبو آئی جیسی کہ اکثر سردیوں اور انگوروں سے ملاپ کے وقت آتی ہے ۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے کلی پیدا ہوئی ۔ خوشگوار سردی میں تلخی کی ایک رمق ۔ اور پھر یہ خوشبو ! تھوڑی دیر کے بعد درختوں کا جھاڑ گرا اور کچھ پھننگے سے اڑے ۔ کائنات میں سب کچھ پھل لا رہا تھا اور جنسیاتی کیڑے ، مکوڑے ، ہزاروں شہد کی مکھیاں اور تتلیاں ، ایک درخت ، ایک پودے ، ایک پھول کی محبت کا پیغام دوسرے درخت ، پودے اور پھول تک پہنچا رہی تھیں ۔ ہوا کبھی ہلکی ، کبھی تیز ، ذخیرے سے ان گنت درختوں کی زرد زرد محبت لائی تھی اور ریلوے اسٹیشن کے جنگلے پر جھکے ہوئے بید اور انناس پر قربان کر رہی تھی !

کچھ دیر کے لئے مولوی آثم اور دارش دونوں چپ رہے ۔ پھر دارش بولا :

"ان دنوں ہماری ریلوے لائن میں کنکر ڈالنے کا کام ہے !"

آثم نے اچھلتے ہوئے کہا : "میں کروں گا" !

دارش نے پوچھا : "ٹھیکہ لیں گے آپ" ؟

آثم نے کہا : "نہیں بھائی ۔ ٹھیکیدار کے نیچے کام کروں گا ۔ اور جب کام سیکھ لوں گا تو . . . . پھر تھوڑا بہت پیسہ لگا کر لائنوں میں کنکر ڈالنے کا ٹھیکہ لے لوں گا اور پھر . . . . ."

اس وقت تک دارش قریب قریب اپنی تمام حیرت کھو چکا تھا ۔ اس کا سوچنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے ۔ وہ قدرت کی اس بے رحمی پر دل سے رو رہا تھا کہ وہ انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے اور کیا سے کیا بن جانے کے بعد بھی انسان خوش رہتا ہے ۔ شعر اور کنکر کا فلسفہ سمجھنا کتنا مشکل تھا لیکن دارش اب اس کی ایک جھلک پا سکتا تھا ۔ آخر دارش بولا "آپ کی عنایت سے میں اتنا قابل ہو گیا ہوں کہ ایک ہی سانس میں شعر اور کنکر کا ذکر کر سکوں ۔ اب کوئی شعر سنا دیجئے !"

مولوی آثم نے دارش کے ساتھ پرجوش مصافحہ کیا اور سوچ میں غرق ہو گئے !

یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس غوطے کے بعد کوئی موتی ہی لائیں گے ۔ لیکن جناب موتی کہاں آتا ہے ۔ کروڑوں غوطے خالی جاتے ہیں اور ہر غوطے کے ساتھ فضول کر گھونگھے ہو گئے "زیادہ جالے میں پھنسے چلے آتے ہیں ۔ مولوی آثم نے کہا ۔ "مجھے افسوس ہے کہ پاکستان آ جانے کے بعد بھی میں شاعر ہی رہا ۔ اس کر موبل مسلک نے میری ہجرت کو جھٹلا دیا ہے ۔"

"میں شعر کو نہیں چھوڑ سکتا" مولوی آثم نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن کنکر اور شعر دونوں کو علیحدہ رکھوں گا"

دارش نے کہا ۔ "میرا شعر"

مولوی آثم بولے ۔ "میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا ، سب کچھ" ۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ کوئی تو اس قصے کا شاہد رہے ۔ لیکن پھر ان میں ایک عزم پیدا ہوا اور مولوی آثم بولے ۔

میں نے چاہا تھا کہ مر جاؤں اجازت نہ ملی
موت کو بھی وہ مرے دل کی تمنا سمجھا!

اور واقعی ہجر معکوس حد تک ممکن تھی؟ جو کچھ مولوی آخم کے دل پر بیت رہی تھی۔ وہی جانتے تھے۔ وارثی نے خجالت سی محسوس کی اور مولوی آخم جان بوجھ کر آسمان کو زمین پر الٹتے ہوئے بولے:— اور بس اس کے بعد قافیہ بندی۔ اگر عیاں قافیہ ہوا تو آسماں، زماں، توبس، استخواں، نہاں، رواں، امتحاں، (رنگ) جناں، خزاں، زباں، عیاں وغیرہ چلے آتے اور اگر اضطراب ہوا تو انقلاب، جواب، عذاب، (ابوا) خراب اور پھر آب آب ہو گئے! ......

اور پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ شعر ابھی سنایا نہیں اور داد ملنے لگی گھر میں شعر و ادب کی محفلیں جمنے لگیں — اجی وا — ہ — وا کیا کہنے، حاصل مشاعرہ ہے! کہ گئے، استاد کہہ گئے، واہ وا — واہ، اجی جناب آپ ہی کا حصہ ہے اور ایسے کلمے ابا جان سے ہی ترکے میں ملے۔ میں تو سے حد ذلیل شعر کہتا تھا۔ البتہ ابا جان کبھی کبھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ آخر میرزا سے تلمذ کرتے تھے بلکہ میرزا نے خطوط میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابا جان ہی تھے جنہوں نے بچپن میں میرزا کو "بیسن کی روغنی روٹی" پہنچائی تھی! ......

گویا جو لوگ آتے تھے ان کی خاطر مدارات ہوتی تھی۔ پان گلوری سے لے کر شروع کے نقاؤں اور گھوڑوں بچھیروں تک دیا جاتا تھا۔ لیکن ابا جان — آہ وہ شمع بھی خاموش ہو گئی، بقول میرزا ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی!

وہ لد گئے لیکن ہم نے گفتنے دفنانے میں وضعداری کو قائم رکھا۔

مگر لوگ ہمیں اور ہمارے خاندان کی روایات کو جانتے تھے۔ وہ اُن ایات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتے تھے اور اس میں مرحومہ مغفورہ والدہ صاحبہ ہمارے دوسرے عزیزوں کی تائید شامل ہوتی تھی۔ لوگ فوراً کہنے کو تیار تے، اجی کہاں — فلاں، اور کہاں ان کا بیٹا آخم، اس کے باوجود مرصع ان اور چنار اور کٹوریاں، اور جانے کیا کیا چلتا رہا —

اسی طرح میں بھی انہیں میں کے فرق کے ساتھ ایک خاص انداز کا مالک یا۔ وہ انداز کیا تھا۔ یہ میں بھی نہیں جانتا۔ لیکن مجھے اتنا پتہ ہے کہ اگر میں تا تو پھر بولتا ہی چلا جاتا۔ اور جو چپ رہتا تو پہروں خاموش! اگر زیادہ بولتا تو سکتے!

"دیکھا مولوی آخم کو! وا رے یار بڑا پھکڑ ہے!"
"اس کے اباجان بڑی متانت تھی!
"کبھی بات نہ کرتا تھا — لیکن جب بات کرتا تو ... موچکر، کیا بات تھا! واہ — وا!"

مجھے یاد ہے اسی طرح خواجہ رفیع کے ہاں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سب ان کے مکان کے صحن میں کچھ چاندنی پر کچھ نیچے پھسکڑا مارے بیٹھے تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ ابھی صدر نہیں چنا گیا تھا۔ اس دن گنجی پھر کی رہی تھی اور اس سے پہلے میں کسی کی معرفت سٹہ ہار چکا تھا۔ اس لئے چپ رہا۔ سو وہاں ایک ذوقی صاحب تشریف رکھتے تھے۔ وہ ذوق نہیں جو بہت بڑے شاعر تھے۔ یہ کوئی نقال تھے۔ میری طرف دیکھا اور پیکدان میں تھوکتے ہوئے بولے:۔

"ارے میاں ہاشم! تم چپ سادھے بیٹھے ہو!"

میں بھانپ گیا مجھ پر نوازش ہو رہی ہے۔ یوں صاحب اباجان کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اتنا بھی تو نہ ہوا کہ صحیح نام جان لینے کی زحمت گوارا فرماتے۔ میں نے انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا: "قبلہ کوئی بات کرنی نہیں آتی۔"

فرمانے لگے — "اپنی طرف سے کسر نفسی کر رہے ہو —" اور اس کے بعد ہو ہو ہو...... اور قہقہے بلند ہوئے جس میں دلآزاری کے لئے والد صاحب کے تمام دوست شامل ہو گئے۔ اول تو میری عادت ایسی جانی اور ان جانی حزو چیزوں کو اکٹھا کر لیتا۔ مثلاً جب شعر لکھتا اور اتفاق سے کہیں سیاہی کا قطرہ گر جاتی تو سمجھتا کہ لا کھ سر پٹکوں، غزل ذلیل ہو گی۔ یہ قدرت نے تنبیہہ کی ہے کہ یار چھوڑ دو اس شعر شاعری کو۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے کہہ گئے، کہنے والے۔ اسی طرح اگر میں (کسی کی معرفت) سٹہ کھیلنے جاتا اور اوپر گلی کا کبوتر بیٹ کر دیتا تو مجھے پیسہ گم کر دینے میں یقین ہو جاتا۔ کوئی اندرونی آواز کہتی۔ تم ذلت کے لئے پیدا ہوئے ہو۔ ورنہ تم پر پھول برستے اور کبھی بھی تو یوں نہ ہوا کہ رخصت ہوتے ہوئے سامنے کھڑکی میں سے میری طرف دیکھ کر کوئی مسکرا دے ...... اسی طرح جب پیکدان میں تھوکنے کے ساتھ یہ فقرے کسے گئے تو میں سب لوگوں کی ہنسی کے باوجود اٹھ کر چلا آیا۔

گھر بھر میں میں پہلا آدمی تھا جس نے سارے خاندان کی مخالفت کے باوجود مسجد میں لڑکے پڑھانے شروع کئے۔ گھر میں جھنجی کوڑی نہ تھی لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا کہ کوئی کام کرنے سے ہچکچاتے تھے — کوئی کیا کہے گا! حالانکہ دلی میں ہزاروں ایسے کام مل سکتے تھے جن سے آدمی عزت کی روٹی کھائے، لیکن نہیں۔ ہمارے گھر کے لوگ جاگیروں کے مالک تھے۔ جاگیریں بک چکی تھیں لیکن پھر بھی جاگیردار کہلانے کی خواہش دل میں لئے ہوئے تھے —

لڑکے پڑھانے میں بھی ایک وضع قائم ہو گئی۔ دس سال یہ کام کیا، جب کہ انگریزی سکول قائم ہو گئے۔ پہلی مخالفت نے ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اب لڑکے پڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ باپ کیا کرتا۔ سب دنیا کہتی تھی۔ فلاں باپ کا بیٹا ہے جو میرزا سے تلمذ کرتے تھے......

اور جب وارثی کے کوارٹر میں گھنٹی بجی۔ مولوی آخم نے سمجھا شاید

دارِیش کو زمانے میں سے کسی نے بلوایا ہے۔ لیکن اس گھٹی کا اسٹیشن کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔ مولوی آثم نے کہا: "آپ ہو آئیے" دارِیش جو نہایت انہماک سے مولوی آثم کی باتیں سن رہا تھا، بولا: "کوئی خاص بات نہیں۔ چھوٹا بابو ریٹرنو کے سٹے چلا رہا ہوگا۔ میں دو پیسے کو بھیجدوں گا اور کاغذ نہیں منگوا اوں گا"..... اس وقت ایک انجن جو ابھی تک دور یارڈ میں کہیں گاڑیاں سارٹ کر رہا تھا بہار کی مختلف خوشبوؤں کے ساتھ کوئلے اور تیل اور بھاپ کی بدبو ملاتا ہوا گذر گیا۔ کچھ دیر تک اس کا جسم اور آخر میں اس کی نقل دکھائی دیتی رہی اور پھر وہ کمل طور پر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

مولوی آثم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس کے بعد میں نے "اپنی زندگی" شروع کر دی جسکے پہلے حصہ سے میں واقف ہوں لیکن بعد کے حصے سے نہیں۔ البتہ مجھے ہاجرہ، اپنی بیگم کی زبان اس بات کا پتہ چلتا ہے..... مجھ میں ایک عزم بیدار ہو رہا تھا: "اپنی زندگی" گزارنے کا عزم جس میں کسی کو کوئی دخل نہ ہو۔ میں نے اپنے انگرکھے اور دوپلی کو اتارا۔ ہمیں بہت سے دیے ہوتی لیکن چونکہ انگریزی تعلیم نے کچھ "آسانیاں" پیدا کر دی تھیں۔ اس لئے گھر کے لوگ بک جھک کر چپ ہو رہے۔

آخر مجھے وہ دن یاد ہے جب میرے چچا جنہوں نے والد کی وفات کے بعد جائداد کا بہت سا حصہ غصب کر لیا تھا میرے تبلیغ کے خلاف کچھ بولے سکتے۔ غصہ کا ایک طوفان تھا جو امڈ آیا....... میں تہبند اتار کر ننگا گلی میں اتر گیا۔

میں نے کہا: "میں فلاں فلاں کا پوتا ہوں"۔ فلاں فلاں کا بیٹا! فلاں، فلاں کا دوہتا —— میرے نانا اورنگ آباد میں ناظم تھے! اور یہ ہیں میرے چچا تمیز الدین صاحب، جو بہ تمیز تخلص کرتے ہیں......" اور میں نے چچا کو گلے سے پکڑا ہوا تھا لیکن اس کے بعد جانے کیا ہوا۔ میں نے چچا کو چھوڑ دیا، حالانکہ اگر چاہتا تو اسے گھر کے باڑے سے ٹکرا کر مار سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں جیسے پھانسی لگے ہوئے آدمی کی باہر آجاتی ہیں محلے کے سب مرد جمع ہو گئے۔ عورتیں منہ چھپانے لگیں۔ میں نے ان لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھی جن کی مسکراہٹ کے لئے میں ترس گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے بے ربط فقرے کہنے شروع کئے —— پیغمبرانہ فقرے —— "تو مٹی سے کھیل کہ تیرا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا ہے"

"تو خدا اور اس کی دنیا میں ننگا رہ —— جو تجھے روکے گا، خدا اس سے بدلہ لے گا"

اور ایسی واہی تباہی کی، لوگوں نے کہا پاگل ہے۔ بہتوں نے کہا اسے کشف ہو رہا ہے۔ میں ان کے سامنے کھڑا تھا —— ننگا —— مجسم کشف! انہیں نظروں میں بہت سادگی نظر آتی تھی، جیسی دنیا کی بعض عظیم ترین کتابوں میں۔ پھر چند ایک نے پکڑ کر مجھے پاگل خانے میں داخل کر دیا ——

ایک..... یا شاید ڈیڑھ برس میں وہاں رہا۔ پاگل خانے میں جاتے ہی میں نے تہبند باندھ لیا۔ وہاں مجھے سب لوگ سلجھے ہوئے نظر آتے تھے۔ شاید یہی میرے پاگل ہونے کی علامت تھی۔ لیکن وہاں کتنی آزادی تھی۔ جیسے کوئی چاہے رہے —— اپنی زندگی —— بالکل اپنی!

اس کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن میں اپنا علاج سمجھ چکا تھا۔ چند حالات کی بنا پر مجھے دو تین برس دلی میں کام کرنا پڑا۔ اس عرصہ کے دوران میں میں نے حاجو سے چکی پسوائی، خود سن بانٹی۔ دو کتابیں لکھیں جو کہ بہت نہیں تو کسی حد تک مقبول ہوئیں۔ مسجدوں میں وعظ کئے۔

میں جہاں چاہتا تھا جاتا تھا اور جو جی چاہے کرتا تھا۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ آج میری ایک پوشش ہوتی تو کل دوسری۔ لیکن میں نے دیکھا اہلِ خانہ نے مجھے سزا دینے کا ایک اور طریقہ سوچ لیا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ خود کو رستے تھے۔ اول تو اس لئے کہ وہ مجھے پاگل سمجھتے اور دوم جو مجھے پاگل نہ سمجھتے وہ اپنے خاندان کے لئے مجھے باعثِ ننگ گردانتے ——

یہ اپنی زندگی نہ تھی۔ جس میں مجھے ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ میں اگر اپنے آپ کو تکلیف نہیں دے رہا تو کسی کے لئے باعثِ تکلیف ہو رہا ہوں۔ اسی صدمے کے باعث میرے چچا تمیز الدین پاگل ہو گئے۔ چچی اور خالاؤں کا خیال تھا کہ چچا تمیز الدین اس دن سے اچھے نہیں ہوئے جس دن "میں انہیں گلے سے پکڑ کر گلی میں لے آیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے دیوانے ہو گئے اور میں جو در اصل دیوانہ تھا، صحیح سلامت ہو گیا!

اس منزل پر پہنچکر مجھے یقین ہو گیا کہ آج جس صورت میں میں نظر آ رہا ہوں اسی صورت میں مجھے کل رہنا چاہئے ورنہ میرے ہمسائے حیران ہونگے اور میرا کیا حق ہے کہ انہیں حیران کروں۔ میرا جو طرزِ عمل آج ہے وہی کل ہونا چاہئے میرا کیا حق ہے کہ میں لوگوں میں رہ کر اپنی مرضی سے اپنا طرزِ عمل بدل کے انہیں پریشان کروں"

اور اس بات کو قبول کرتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہجرت کر جاؤں ایسی جگہ جہاں مولوی آثم کو کوئی مولوی آثم کے طور پر نہ جانتا ہو۔ میں ایک نئی زندگی شروع کروں۔ دوسری جگہ جا کر میں نوکری ڈھونڈوں گلے اٹھاؤں، کچھ بھی کروں، میری وجہ سے کوئی پریشان نہ ہوگا اور میں خود پریشان نہیں ہو سکتا کیونکہ میں اور حاجرہ اس بات کو جان گئے ہیں کہ کوئی کام ذلیل نہیں ——!

اسوقت گڈو اپھبتی کو دتی زنانے سے باہر چلی آئی۔ اس نے آتے ہی کہا: "ابا چلو"

باقی صفحہ ۹۹ پر

چنہو دارو

یوکے اج شاہ

ایسوشی ایٹڈ پریس اوف امریکہ کی ایک اطلاع
ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد ملنے والا پانچ سو ڈالر کا انعام
وس اینگلیز اور رہو فولو لو کی وڈمل فاؤنڈیشنز
جانب سے مسٹر ارنسٹ جے آر میکے کو ان کی کتاب
نہو دارو ایکس کے ویشنز ۱۹۳۵-۳۶ء" پر دیا
ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں امریکہ کی انجمن شرقیہ نے ہندوستانی
و ایرانی علوم کی تحصیل کے امریکی مدرسے اور بوسٹن کے عجائب خانہ
نون لطیفہ کے واسطے شائع کرائی تھی۔ اس کتاب کی بابت رائے قائم کی گئی
ہے کہ وہ ریاست ہائے متحدہ میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک
نچ سال کے دوران میں چھپنے والی ان سب کتابوں میں جو تاریخ ہند
ے متعلق ہیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

چنہو دارو کا محل وقوع

چنہو دارو کی کھدائی کا کام سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء کے دوران میں
ثار قدیمہ کی اس پہلی امریکی مہم نے انجام دیا جو اس غرض سے ہندوستان
ی تھی۔ اس مہم کا انتظام ہندوستانی اور ایرانی علوم کی تحصیل کے
مریکی مدرسے اور بوسٹن کے عجائب خانہ فنون لطیفہ نے اپنی سرپرستی
ں کیا تھا۔ اس کے سب سے بڑے ہدایت کار ڈاکٹر ارنسٹ میکے
ے جنکی شہرۂ آفاق کتاب "تمدن وادیٔ سندھ" نے شائع ہو کر یہ ثابت
ر دیا تھا کہ مصنف کو ہندوستان کے آثار قدیمہ سے زبردست دلچسپی
ہے۔ چنہو دارو کی کھدائی پوری طرح عمل میں نہیں آئی ہے۔ کیونکہ اس
میں کافی روپیہ نہ ہونے کے باعث کام کو آگے بڑھنے سے روک
یا گیا ہے۔

ان سے قبل سر جان مارشل نے صوبہ سندھ کے موہنجو دارو
صوبہ پنجاب کے ہڑپا نامی دو مقامات پر کھدائیاں کرا کے تاریخ ہند
انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے شہری
ن کے چہرے سے نقاب اٹھایا تھا جو پانچ ہزار سال قبل دریائے
ھ کے ساحلی علاقے پر اپنا رنگ جمائے ہوا تھا۔

چنہو دارو دریائے سندھ کے مشرقی ساحل پر موہنجو دارو سے
میل دور جانب جنوب مشرق واقع ہے۔ گویا وہ صوبۂ سندھ میں
نواب شاہ کے نو آباد شہر سکرنڈ کے قریب ہے۔ اگرچہ اس وقت
یائے سندھ جائے مذکور سے بارہ میل دور بہتا ہے تاہم اسکی
قدیم گذرگاہ صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ "دارو" کے لفظی معنی
ٹیلے کے ہیں اور یہ دو بہنوں — چنہیوں اور بوتیوں — کے
ناموں سے مشتق ہے۔ ان بہنوں کے حالات کسی کو بھی
معلوم نہیں ہیں۔

چنہو دارو کے مقام پر تین ٹیلے ہیں جن کا مجموعی
رقبہ ۱۹ ایکڑ کے قریب ہے۔ یہ جگہ چار ہزار سال قبل ہی
ویران ہو گئی تھی۔ حسن اتفاق ہے کہ ۱۹۳۲ء میں
ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کے افسر مسٹر مجمدار کی توجہ اس طرف
مبذول ہو گئی جبکہ وہ سندھ کے پرانے مقامات کی جانچ پڑتال
کر رہے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس شہر کی شان و شوکت تین
ہزار سال قبل مسیح میں اپنے عروج پر تھی۔

سب سے بڑے اور سب سے اونچے ٹیلے کو سترہ فٹ کی گہرائی
تک کھودا جا چکا ہے۔ کل چار طبقات برآمد ہوئے ہیں۔ سب سے
اوپر کے طبقے میں ہاتھ کے بنے ہوئے مٹی کے برتن نکلے ہیں جنکی
بابت رائے قائم کی گئی ہے کہ عہد جاہلیت کے خانہ بدوش لوگوں
کے گروہ انہیں استعمال کرتے ہونگے۔ اس عہد کی کوئی تاریخ
معین نہیں کی جا سکی۔ دوسرے طبقے سے "جھکاری تمدن" کا پتہ
چلتا ہے۔ یہ نام اس گاؤں کی مناسبت سے دیا گیا ہے جو صوبۂ
سندھ کے ضلع لڑکانہ میں واقع ہے۔ اتنی ہی سطح پر جھکار میں
بھی ایسے ہی مٹی کے برتن دستیاب ہوئے تھے جیسے پہلے پہل
چنہو میں دریافت ہوئے۔ لیکن نیچے کے دو طبقوں کا آثار ہڑپائی
تمدن" سے بہت مشابہہ ہیں بالفاظ دیگر وہ موہنجو دارو اور ہڑپا
کا ہمعصر تھا۔ اس خیال سے کہ شاید زیادہ نیچے کی سطح پر کچھ اور آثار
دریافت ہو جائیں، اسی ٹیلے کے پہلو میں ایک گہرا گڑھا کھودا گیا
یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ کم سے کم تین اور تہیں ان طبقات کے نیچے
جنکا جائزہ پہلے ہی لیا جا چکا تھا زیادہ وسیع علاقے میں نمودار ہو سکتی
تھیں۔ چنانچہ ارنسٹ میکے کا بیان ہے کہ عین ممکن ہے کہ
سب سے نیچے کی سطح کا معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہو کہ وہ
آثار موہنجو دارو کے زمانے سے بھی کہیں زیادہ پرانے ہیں۔
ان زیریں طبقات سے ان طغیانیوں کی تاریخ پر بھی روشنی پڑ سکتی
ہے جنہوں نے شہر کو زیر آب کر کے تباہ کر دیا تھا۔

ان تحقیقات سے جو چنہو دارو کی کھدائی کے بعد ہوئیں پتہ
چلتا ہے کہ دو بالائی طبقات کے باشندے اس زمانے کی تاریخ
پر جو ہڑپائی تمدن اور آریہ قوم کی آمد کے درمیان ہے۔ زبردست
روشنی پڑتی ہے۔

جھکاری تمدن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو مندرجہ بالا اسلوب کے مطابق جھکاری تمدن کے حامل تھے اس مقام پر اس وقت پہنچے جبکہ ہڑپا والوں نے اس ٹیلے کو تباہ و برباد کردیا تھا اور وہ بھی تھوڑے عرصے بود و باش اختیار کرنے کے بعد چلے گئے کیونکہ انہیں دریائے سندھ کی طغیانیوں کا ہر گھڑی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ خود دریا یا اس کی کسی معاون ندی نے شہر کو آر پار کاٹ کر تین حصوں میں تقسیم کردیا اور اس کی جگہ تین ٹیلے باقی رہ گئے۔

بالکل اسی قسم کے ظروف کا جو وہاں سے نکلے بلوچستان سے بھی برآمد ہوتا ثابت کرتا ہے کہ وہ لوگ شمال مغرب سے چل کر وادیٔ سندھ تک پہنچے ہونگے۔ انہوں نے جس نئے تمدن کی داغ بیل ڈالی، اس کے آثار مٹی کے برتنوں، مہروں، تعویذوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں ملتے ہیں۔ جو ان چیزوں سے مختلف ہیں جو ہڑپا کے رہنے والے چھوڑ گئے تھے۔ وہ لوگ امیر نہیں تھے لیکن نفیس قسم کی چیزیں تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہڑپائی تمدن

ہڑپا کے پورے دور میں چنہو مالا کے دانے بنانے کا زبردست مرکز رہا ہے۔ بہت بڑی تعداد میں ایسے منکے ملے ہیں جو سنگِ یشب اور عقیق سے تیار کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض دانے اسقدر چھوٹے ہیں کہ انہیں دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ یعنی اگر چالیس دانے برابر برابر ایک قطار میں رکھے جائیں تو صرف ایک انچ جگہ گھیریں۔ ان کے سوراخ بھی اتنے مختصر ہیں کہ بمشکل بال جیسے باریک تار میں پروئے جاسکتے ہیں۔ یہ امر باعث استعجاب ہے کہ اتنے چھوٹے منکے کس طرح بنائے گئے اور کس چیز سے ان میں سوراخ کیا گیا۔

تانبے اور کانسی کی چیزیں مثلاً برتن بھانڈے، کلہاڑیاں، چاقو، چھینیاں، بالوں کی سوئیاں، اور استرے وغیرہ بکثرت ملے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنہو وادیٔ سندھ میں کھلونوں کا بھی مرکز رہا ہے۔ خوبصورت نقش و نگار کے مٹی کے بنے ہوئے جھنجھنے، پرندوں کی وضع کی سیٹیاں، مٹی کی گاڑیاں، اور انہیں کھینچنے کے لئے کوہان نکلے ہوئے مٹی کے بیل بھی بڑی تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ کچھ ایسی کھلونا گاڑیاں بھی ملی ہیں جو آجکل ہندوستان میں بنائی جاتی ہیں۔ گویا ان کا نقش اول ساڑھے چار ہزار سال پہلے بنایا گیا تھا۔

جہاں تک مالا کے دانوں کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چنہو کے تجارتی تعلقات کش، آر اور دوسرے سمیریائی شہروں (موجودہ عراق) سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہاں بھی ویسے ہی دانے قلیل مقدار میں پائے گئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چنہو کا محل وقوع بحری اور بری دونوں قسم کی تجارت کیلئے نہایت موزوں تھا۔ کیونکہ وہ بلوچستان جانے والے اس تجارتی راستے سے جو آج بھی استعمال ہوتا ہے صرف ۳۷ میل دور تھا۔

موہنجو دارو میں بہت سی کھیل کود کی اور رجھانے کی چیزیں بھی دریافت ہوئی ہیں جن کا پتہ چنہو دارو میں برائے نام ملتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موخر الذکر کے لوگ جو زیادہ کھاتے پیتے نہیں تھے، لہو و لعب میں بہت حصہ نہیں لیتے تھے۔

مقامی طور پر بنے ہوئے تولنے کے بہت سے بٹے بھی ملے ہیں۔ ان کی باہمی نسبت وہی ہے جو موہنجو دارو اور ہڑپا کے بٹوں میں پائی

میرے سامنے

یہ جہاں اک درد کی محفل ہے میرے سامنے
ذرہ ذرہ اک دھڑکتا دل ہے میرے سامنے

کسقدر رنگین ہے رنگین نظروں کا شباب
زندگی کا عقدۂ مشکل ہے میرے سامنے

کسقدر رنگین ہے دامِ محبت کا فریب
ہر مسافر کو یقیں منزل ہے میرے سامنے

آ دلِ بیتاب بھر دے رنگ دنیا میں مری
کسقدر اجڑی ہوئی محفل ہے میرے سامنے

آ گئی ہوں کس مقامِ بے نشاں پر اے سحاب
اب نہ کشتی ہے نہ اب ساحل ہے میرے سامنے

سحاب قزلباش

جاتی ہے ۔ ان میں سے بعض اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اتنے مکمل ہیں کہ انہیں دیکھکر قیاس ہوتا ہے کہ شاید وہ نئے بتوں کو جا بجا کے لئے استعمال ہوتے ہونگے۔

چنہو دارو سے ایسی زنانہ مورتیاں نکلی ہیں جنکے سروں کے پہناوے اتنے خوبصورت اور شاندار ہیں جیسے موہنجو دارو اور ہڑپا والی مورتیوں کے ہیں۔ لیکن وہ سر سے پاؤں تک زیورات سے لدی ہوئی ہیں۔

عمارتیں پکی پختہ اور مضبوط تھیں لیکن چونکہ آس پاس کے لوگ ان کی اینٹیں متواتر چراتے رہے، اسلئے ان سب کو نقصان پہنچ گیا۔ موہنجو داڑو کی طرح اس قدیم زمانے کے ہر مکان میں مناسب خاکوں کے مطابق بنے ہوئے غسلخانے، پاخانے اور بدرو کی نکاسی کے راستے بنے ہوئے تھے۔ مٹی کی بنی ہوئی بہت سی پختہ نالیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر میں حفظان صحت کا معقول انتظام تھا۔

موہنجو داڑو کی طرح یہاں کے لوگ بھی صلح جو اور امن پسند تھے۔ اعلیٰ مادی تمدن کے عین ماحول میں رہتے ہوئے لڑائی کے کسی ہتھیار کا پتہ نہیں چلتا جو یقیناً تعجب خیز ہے۔ لیکن سرکش دریا سے سندھ جو ان کو زندگی بخشتا تھا ان کی موت اور تباہی کا باعث بنا۔ آجکل کی طرح اس وقت بھی اس نے بارہا لوگوں کو خانماں برباد کر ڈالا یہاں تک کہ وہ انجام کار ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا۔

ان لوگوں کے رسم و رواج کیا تھے؟ بہت سی سرمہ دانیاں ملی ہیں جو آنکھ میں لگانے والے سرموں اور کاجلوں سے بھری ہوئی ہیں۔ غالباً انہیں مرد اور عورت دونوں ہی استعمال کرتے تھے کیونکہ ان کے طبی مفاد سے وہ واقف تھے اور کچھ اسلئے بھی کہ انکے استعمال سے آنکھیں جادو اثر ہو جاتی تھیں۔ تزئین جمال کے سلسلے کی کئی ایسی چیزیں بھی نکلی ہیں جنہیں صرف عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ سرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی تلیں جنکے سرے کثرت استعمال سے چپٹے ہو گئے تھے۔ اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ حسینان شہر کے لب و رخسار کو رنگنے کا کام دیتی ہونگی۔

ضروری دفتر آجکل میں مضامین نثر و نظم کافی مقدار میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین اپنے رشحات قلم نہ بھیجیں تاوقتیکہ خاص طور پر طلب نہ کئے جائیں۔ — ادارہ

مہاجرین

بقیہ صفحہ ۹۶

"کہاں چلیں؟" مولوی آثم نے صحن میں آگے ہوئے بڑھل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر۔"

"ساری دنیا ہمارا گھر ہے بیٹا!" مولوی آثم نے کہا۔

دارلش نے دل میں سوچا اسکا مطلب ہے کہ رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

لیکن دارلش نے مولوی آثم کے چہرے پر ایک غصہ اور ایک عزم دیکھا اور وہ مان گیا۔ مجھے کچھ شکوک تھے جو آثم کی شکل دیکھ کر رفع ہو گئے۔ آثم نے کہا،

"دارلش صاحب! آپ وعدہ کیجئے کہ آثم اور اس کے ماضی کے متعلق کسی کے ساتھ بات نہیں کریں گے۔"

دارلش نے کہا: "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اجازت لے کر مولوی آثم باہر چلا گیا۔ اسی اثناء میں دارلش نے دزیرے کو آوازدی "تاکہ اسٹیشن سے "ریشرنو" کے کاغذ لے آئے"، اور جب کاغذوں کی خانہ پُری کے بعد دارلش نے باہر قدم رکھا تو دروازے پر ایک نووارد کھڑا تھا۔ دارلش نے کہا: "فرمائیے" لیکن اگلے ہی لمحے اسے پتہ چلا کہ نووارد مولوی آثم ہے جو سامنے رنگون ہیر کٹنگ سے داڑھی منڈوا آیا ہے، اور آج سے اسکا نام "حقی" ہے!

ترکی صحافت

بقیہ صفحہ ۱۸

پر بھی متعدد اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔

ترکی کا سرکاری گزٹ رسمی گزیت ہے جو وزیر اعظم کے دفتر سے شائع ہوتا ہے۔ صحافت اور اشاعت کے ڈائرکٹر جنرل کی طرف سے آئین طرحی کے نام سے ایک اور ماہوار رسالہ نکلتا ہے جس میں ترکی اور غیر ملکی اخباروں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہوا حبلیق وتمبور بھی ایک بے حد دلچسپ ماہنامہ ہے، جس میں ہوا بازی کی خبریں ہوتی ہیں۔ یہ رسالہ انقرہ سے ترکی حکومت کے ہوائی ہیڈ کوارٹر سے شائع ہوتا ہے اور اسکے ایڈیٹر م۔س۔ج۔ عرج ہیں۔

ترکی کی خبروں کا اہتمام و اشاعت اناطولیہ کی خبروں کی ایجنسی (آژانس اناطولیہ) کے ہاتھ میں ہے اور ترکی میں خبروں کی یہی ایک تنہا ایجنسی ہے۔ اس کا انداز نیم سرکاری سا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر انقرہ میں ہے اور یہیں ساری دنیا کی خبریں آکر ملک میں پھیلتی ہیں۔

نوٹ: — آجکل کے خریدار خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ جواب دینے میں آسانی ہو۔

سائنسوں میں قدیم عرب و ہند کا اشتراک

اے اے عابدی

ہندوستان اور عرب میں صدیوں تک بہت گہرے اور قریبی تعلقات رہے ہیں۔ اسلام سے بہت پہلے سے ان دونوں ملکوں میں تعلقات اور خاص کر تجارتی تعلقات قائم تھے۔ اسلام کی اشاعت اور ایران کی فتح نے عرب اور ہند کے تجارتی تعلقات میں اور بھی زیادہ استحکام پیدا کر دیا۔ ساتویں صدی کے آخری زمانہ میں عرب کے تاجر بہت بڑی تعداد میں ہندوستان کے جنوبی مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں آباد ہو گئے اور یہاں کی عورتوں سے شادیاں کر لیں۔ اس کے بعد سے ان کا اثر تیزی سے بڑھنا شروع ہوا۔ اور اگلے سو برس کے اندر وہ ہندوستان کے پورے مغربی ساحل پر پھیل گئے۔ اور دسویں صدی کے آخر تک ان کی نو آبادیاں سارے مشرقی ساحل پر بھی قائم ہو گئیں۔ عربوں نے ساتویں ہی صدی سے رفتہ رفتہ شمال کی طرف جانا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ اور سندھ کی پوری وادی کو فتح کر لیا تو اس اثر نے ایک مستحکم شکل اختیار کر لی۔

عہد عباسیہ میں ہندوستان اور عرب کے تعلقات اور بھی زیادہ گہرے ہو گئے۔ یہ عہد نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ فکر اور کلچر کی پوری تاریخ میں فکری اور علمی ترقی کا ایک بہت اہم دور ہے۔ خلفائے عباسیہ اور ان کے برمکی وزیروں نے فارسی، سنسکرت، سریانی اور یونانی زبانوں کی آرٹ، ادب اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے عربی میں کروا کر دنیا کی علمی اور فکری بیداری میں ایک قابل قدر حصہ لیا۔ خلیفہ المامون (۸۱۳ سے ۸۳۳) نے ترجمہ کے کام کے لئے بغداد میں ایک باقاعدہ دار الترجمہ قائم کیا۔ اس دار الترجمہ کے ساتھ ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ اس کے علاوہ خلیفہ نے نئی کتابوں کی تلاش میں فاضلوں کو دور دور کے ملکوں میں بھیجا۔ مسلمان سیاح نادر کتابوں کی تلاش میں دور دور کے سفر کرتے تھے۔ امرا مترجموں سے نئی کتابوں کے ترجمے کرواتے اور انہیں معاوضہ میں بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے۔

ہندوستانیوں اور عربوں میں پہلے سے بھی تعلقات تھے لیکن عربوں میں علم کی جستجو اور تلاش کے اس ولولہ نے دونوں ملکوں کے درمیان گہرا ربط پیدا کر دیا اور سائنس کی دنیا میں خصوصاً ان دونوں میں زبردست اشتراک قائم ہو گیا۔ سندھ پر محمد بن قاسم کے قبضہ کے بعد ہندوستان کا ایک بہت بڑا برہمن ریاضی دان اور فلسفی ہندوستانی فاضلوں کے ایک وفد کے ساتھ بغداد گیا۔ یہ فلسفی اپنے ساتھ "سدھانت" لے گیا تھا اور اس نے (۷۵۶ء - اور ۸۰۶ کے درمیان) محمد ابن ابراہیم الفجری کی مدد سے ان کا ترجمہ عربی میں کیا۔ یہ پنڈت اپنے ساتھ ریاضی کی ایک کتاب بھی لے گیا تھا۔ اسی سے عربوں نے گنتی کا نیا طریقہ سیکھا۔ اور پھر اسے یورپ تک پہنچایا۔ نویں صدی میں عربوں نے ہندوستانیوں سے اعشاریہ کا طریقہ سیکھا۔ الجبرا میں بھی ہندوستان ہی نے ساری دنیا کو راہ دکھائی۔ عربوں نے ریاضی کی یہ قابل قدر سائنس ہندوستانیوں سے سیکھی اور پھر عربوں سے یورپ نے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ عرب کے سائنس دانوں نے ہندوستان کی ریاضی کی سائنسوں کے متعلق خود بھی عربی میں کتابیں لکھیں اور سنسکرت کی اسی طرح کی کتابوں کے ترجمے عربی میں کیئے۔ الکندی کی تصانیف نے ہندوستانی ریاضی کے علوم کو دور دور کے ملکوں میں پھیلا دیا۔ مشہور عالم الخوارزمی نے ۸۲۵ اور ۸۴۴ کے درمیان حساب کے ہندوستانی طریقہ پر ایک کتاب لکھی اور دوسری کتاب الجبرا پر لکھی۔

ابو ریحان البیرونی نے دسویں صدی میں پتانجلی (پتانجل) کا ترجمہ عربی میں کیا۔ یہ کتاب ریاضی کی ایک مستند کتاب ہے۔ اسی کتاب کے بعض حصوں کی بنیاد پر اس نے اپنی مشہور کتاب قانون مسعودی لکھی۔ یہ کتاب ریاضی اور جامیٹری سے متعلق ہے۔ ۱۰۳۰ء میں جب البیرونی ہندوستان میں تھا تو اس نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الہند، عربی میں لکھی۔ اور اس کتاب میں اور بہت سی چیزوں کے علاوہ اس سے سائنس میں ہندوستانیوں کے جو کارنامے اور خدمات ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا۔ البیرونی نے ہندوستان کو اقلیدس کے نظریوں سے روشناس کیا اور ہندوستانی گنتی پر ایک رسالہ بھی لکھا۔ حساب سکھانے کے لئے ہندوستان میں جو نشان رائج تھے، البیرونی نے ان کے متعلق بھی لکھا ہے۔ البیرونی نے ہندوستان کے قاعدہ اربعہ متناسبہ کا ترجمہ کیا، ریاضیاتی جغرافیہ کے بہت سے مسئلوں پر لکھا، اور لاہور، ادھستھان (کشمیر کا دار السلطنت) نیپال، دہمند (سندھ میں)، سیالکوٹ، ملتان، تیز (بلوچستان کا ایک بندرگاہ) سومناتھ، نہروالا، کھمبایات، مالوہ، اجین، بڑودہ (بڑودچ) کالنجر، متھرا، قنوج، ماری (قنوج کا دار السلطنت) گوالیار، بشرانی، دابل (سندھ کا ایک بندرگاہ) اجودھیا، بنارس، تنجور اور لنکا کے عرض البلد اور طول البلد معلوم کئے۔ البیرونی نے

نے ٹرگنامیٹری کی ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا۔

خلفائے عباسیہ کی کوششوں کی وجہ سے دوسری سائنسوں کے ساتھ ساتھ طب کی سائنس نے بھی بے حد ترقی کی۔ الرازی سب سے پہلا اور اس زمانہ کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ اس نے حنین ابن اسحاق کے ایک شاگرد سے بغداد میں تعلیم حاصل کی تھی جو یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طبیوں سے واقف تھا۔ "الحاوی" اس کی سب سے بڑی طب کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں الرازی نے ہر بیماری کے سلسلہ میں ہندوستانی مصنفوں کا حوالہ دیا ہے اور آخر میں اپنے تجربات اور رائیں قلم بند کر دی ہیں۔ ابو منصور موافق نے ۹۷۵ء میں "حقیقت العلاج" لکھی۔ اس کتاب میں اس نے ۵۸۵ بوٹیوں کا ذکر کیا ہے اور جا بجا ہندوستانی "مخزن الادویہ" کے حوالے دئے ہیں۔ البیرونی نے ہندوستانی اور چینی معدنیات اور نباتات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس زمانہ میں طب پر مسلمانوں نے جتنی کتابیں لکھیں انہیں اب بھی ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

طب کے میدان میں بغداد کے برمکی وزیروں نے اسلامی دنیا کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے ہندوستان سے طب کے فاضلوں کو بلایا اور انہیں اپنے شفا خانوں میں طبیب اعلیٰ مقرر کیا۔ ان فاضلوں نے طب، اصولِ دوا سازی اور سمیات پر سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے عربی میں کئے۔ ان وزیروں نے عرب فاضلوں کو طب اور اصولِ دوا سازی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بھیجا اور اس طرح برمکی وزیروں کی سرپرستی کی بدولت طب اور اس سے متعلقہ علوم کی بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے ہندی اور عربی فاضلوں نے عربی میں کئے۔ مانک نے، جسے ہارون الرشید اور عبداللہ ابن علی کے علاج کیلئے بغداد بلایا گیا تھا، طب پر ہندوستان کی مستند کتابوں کے ترجمے کئے۔ نوشنکل کی لکھی ہوئی دو کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ ان میں سے ایک میں سو بیماریوں اور اُن کے علاجوں کا ذکر ہے اور دوسری میں تشخیص امراض کا۔ رُوسا نامی ایک برہمن کی ایک کتاب (جس میں نسوانی امراض کا ذکر ہے) کا ترجمہ بھی ہوا اور اس کے علاوہ مختلف قسم کے سانپوں اور ان کے زہروں کے متعلق ہندوستانی کتابیں تھیں ان کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

ان اہم کتابوں نے عرب طبیبوں کو علاج اور جراحی کے نئے طریقوں سے واقف کیا اور معدنیات اور نباتات کے متعلق ان کی معلومات میں بے حد اضافہ کیا اور اسی علم کی بدولت انہوں نے علم کیمیا میں اتنی ترقی کی کہ یورپ نے ان کی بنیادوں پر عالیشان عمارتیں کھڑی کر لیں۔

غزل

ساغر نظامی

سکوتِ اسرار سے اداسی حریمِ ناز و نیاز میں ہے
مری تمنا بھی تیرِ مخفی، تری محبت بھی راز میں ہے

پیامِ معراجِ بے خودی ہے نظامِ تکمیلِ زندگی ہے
چھپا ہوا اک لطیف ایما جو نرگسِ نیم باز میں ہے

مری فسردہ نوائیوں پر گمان بے چارگی نہ فرما
قیامتِ زندگی ہے مطرب وہ روحِ نغمہ جو ساز میں ہے

اسی تقاضے سے آئینہ میں ہزار جوہر تڑپ رہے ہیں
شکستگی کا جو اک تقاضہ نگاہِ آئینہ ساز میں ہے

حیات چولا بدل رہی ہے عروسِ جدت مچل رہی ہے
حقیقتوں میں مجاز تازہ نئی حقیقت مجاز میں ہے

طلسم ٹوٹا نہیں محبت سے بھی روایاتِ خواجگی کا
ہزار پنہاں شکستِ محمود بندگیٔ ایاز میں ہے

چلا چل ابدل، چلا چل ابدل، زمانے بھر سے نظر بچا کر
سپردگی میں کہاں وہ لذت جو تشنگی احتراز میں ہے

نہ آستاں ہو نہ رسمِ سجدہ جھکے جہاں میں نہ سر کسی کا
نیا جنونِ سرکشی کا پیدا مری جبینِ نیاز میں ہے

شبوں کی بیرا بیاں بھی ثابت شگفتگی سحر بھی ظاہر
حیات ساغر متاعِ ساغر نہ راز میں تھی نہ راز میں ہے

زہرہ جبیں

افسانہ

خواجہ محمد شفیع

زہرہ جبیں کے سیتلا نکلی۔ کلو کی ماں خیریت دریافت کرنے گئی۔ کلو نے ضد کی کہ میں بھی چلوں گا۔ ماں نے ٹال دیا۔ جانتی تھی کہ یہ اڑ کر لگنے والا مرض ہے۔ سانولی جا کر ایک طرف کو بیٹھی ہی تھی کہ کلو بھی آگیا۔ ماں وہاں کچھ کہہ تو نہ سکی پر دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ کلو غریب بھی کیا کرتا اس کا دل نہ مانا۔ دن رات زہرہ جبیں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اسے اس لڑکی سے کچھ ایسی محبت تھی کہ اس کے بغیر چین ہی نہ آتا۔ بچپن اندھا ہوتا ہے اس دور میں امتیاز مراتب کا احساس نہیں ہوا کرتا۔ زہرہ کو بھی اس کی باتیں پسند آتیں۔ جو اسے جانے میں دیر ہوتی تو وہ آدمی پر آدمی بھیجتی۔ غرضیکہ سارا دن ان دونوں کا ساتھ ہی گزرتا۔ بی زہرہ۔ بیگم بنی بیٹھی رہتیں۔ یہ نوکروں کی طرح کام کرتا۔ گڑیاں اٹھا کر لاتا۔ وہ اس کے گلے میں رسی ڈال دیتیں۔ یہ گھوڑے کی طرح پھدکتا۔ دُلتیاں چلاتا، ہنہناتا۔

جب ماں جانے لگی تو کلو سے بھی چلنے کو کہا۔ زہرہ نے جانے نہ دیا۔ یہ بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ وہ غریب مجبور گھڑیاں گھوٹتی اٹھ آئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر دل میں وسواس آئے۔ بیٹے کے ہاتھ کہلوایا کہ آکر روٹی کھا جا۔ جواب ملا نہیں کھائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے روز اسے بخار چڑھا تھا اور سارے بدن پر دانے نکل آئے۔ ماں نے کوسا پیٹا۔ کہا: "میں کہہ رہی تھی وہاں نہ جا۔ اب تارتی نہیں کا مجھ سے مصیبت پٹوائے گا"۔

کچھ روز بعد اچھے تو دونوں ہوگئے لیکن زہرہ کا چہرہ بے داغ تھا اور کلو کا تمام منہ چھپا ہوا ——— وہاں احتیاطیں ہوئیں۔ بہترین علاج کئے گئے۔ یہ بیوہ کی اولاد گندے سندے میں پڑا رہا۔ ماں کو پیٹ پالنے کے لئے گوٹہ بھی بنتا۔ اس کی بھی خبر گیری کرنا۔ زہرہ بیوی کے دانوں میں جب سلسلاہٹ ہوئی تو ان کو روئی کے پھویوں اور ریشمیں رومالوں سے سہلایا گیا۔ انہوں نے ناخنوں سے کھرچ ڈالا۔

غرضیکہ کلو کا چہرہ ہمیشہ کے لئے بدنما ہوگیا۔ پہلے ہی کون سے مہ جبین تھے، اب اور بھی گئے گزرے ہوئے۔

بہر نوع زہرہ جبیں کے ہاں آرجا جاری رہی۔ وہ گاہ گاہ اس کی بدصورتی پر طعنہ زن ہوتیں لیکن اپنا غلام بنانے میں عار نہ فرماتیں۔

ایک روز کھیل کھیل میں وہ بولیں: "دیکھیں ہمارے ہاتھ سے کون اپنی ناک کٹوائے۔" اس مجنوں صفت قیس نژاد نے فوراً اپنے کو پیش کر دیا۔ چھری کمبخت خاصی تیز تھی۔ بچی نے ہنسی ہنسی میں پھیر دی۔ اس کی ناک پر بیٹھ گئی ——— ماں کو خبر ہوئی وہ روتی ہوئی آئی۔ زہرہ بی بی نے اتنی دیر میں پٹی بڑھا دی تھی کہ میرا نام لیجیو۔ یہ جاں نثار ان کے حکم سے کب ٹلنے والا تھا۔ کہہ دیا میں چھری سے کھیل رہا تھا، لگ گئی۔ ماں مصیبت زدہ نے جل کر ایک دوہتڑ مارا۔ کچھ روز ناک کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔ زخم تو بھر گیا۔ لیکن بدصورتی میں ایک اور اضافہ ہوا۔

مہ و سال گزرتے رہے۔ یہ دونوں پروان چڑھتے رہے۔ کلو ایک ہوٹل میں بہرہ ہوگیا۔ کچھ ماں گوٹہ پیک بن کر کماتی، کچھ اس کی تنخواہ۔ گزر بسر ہوجاتی۔ زہرہ جبیں سے بھی تیسرے چوتھے ملنا ہوتا۔ یہ کبھی کبھی ہوٹل سے کیک، پیسٹری لاکر اپنی بہن بسم اللہ کے ہاتھ بھجوا دیتا۔ گاہ گاہ وہ اسے کسی کام کو یاد فرمالیتیں۔

بچپن کی چنگاری اس کے دل میں شعلہ بن رہی تھی اور دوسری جانب قطعی بے خبر۔ کوئی آس، امید، توقع، ہوا دینے کو نہ تھی۔ تاہم یہ کمبخت تو خود ہی بھڑکتی رہتی ہے۔ یاس کے چھینٹے اسے تیز تر کرتے ہیں۔ مایوسیاں دہکاتی ہیں۔ ناامیدیاں بھڑکاتی ہیں۔

کلو گو غریب تھا تاہم دل امیر غریب سب کے ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ زہرہ اس کی نہیں ہو سکتی، پھر بھی اسے دیکھنے کا متمنی تھا۔ چکور چاند تک پہنچ نہیں سکتی تاہم قریب تر ہونے کی کوشش میں ہلکان ہوتی رہتی ہے۔ گرگٹ سورج سے ہم آغوش نہیں ہو سکتا پھر بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے تکتا رہتا ہے ——— بس اتنی ہی تمنا کلو کو بھی تھی۔ اس سے زائد آرزو آتی، ایک جگنو کی سی چمک دکھاتی لیکن عقل اس پر فوراً ناممکنات کی سیاہ چادر ڈال دیتی ؎

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال ——— کارے کہ خدا کند فلک راچہ مجال

دولت رنڈی کی طرح اپنا مرکز التفات و اعتنا بدلتی رہتی ہے۔ یہ عروس ہزار داماد نئے نئے انداز سے پہلو بچاتی اور نگاہیں چرا جاتی ہے۔

اشرف علی خاں خراج انسان تھا اور نواب خو ——— لالہ دنی چند سے سودی قرض لے کر ایک عرصے سے عادتیں نباہی جا رہی تھیں۔ بہت کچھ جائداد مول اور بیاج کے چکر میں آچکی تھی کہ ایک روز لالہ نے مزید قرض دینے سے انکار کیا۔ اس بات پر قدرے تکرار ہوئی اور تلخ کلامی تک نوبت پہنچی۔ لالہ نے اپنی رقم کا دعویٰ کر دیا۔ نواب کو جائداد کوڑیوں کے مول جاتی نظر آئی۔ سخت متردد اور پریشان تھے

سارے گھر پر ایک افسردگی طاری۔ زہرہ جبیں بھی تیرہ خاطر۔ کلو نے وجہ دریافت کی۔ انھوں نے سارا معاملہ سنایا۔ کہا: "ابا حضور سے گستاخیاں کر کے گیا ہے۔ اس کا پانسہ بھاری ہے، ہمارا ہاتھ دبا ہوا۔ کلو تجھ سے کیا چھپاؤں۔ تو میرے ساتھ کا کھیلا ہے۔ میں عورت ذات ہوں اور بے دست و پا کاش آج اپنے گھر کی ہوتی تو ان سے انتقام لیتی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ بدنصیب کل مرا کہہ کر گیا ہے کوڑی کوڑی کو محتاج کر دوں گا، بڑے نواب صاحب بنے پھرتے ہیں۔ جب یہ فقرہ یاد آتا ہے چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اسوقت میرے باپ کو اس موذی کے چنگل سے نکال دے اور اس سے بدلہ لے تو ساری عمر لونڈی رہوں۔ کاش میں آج کو مرد ہوتی۔"

اس سے زیادہ زہرہ جبیں نہ کہہ سکی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ منہ پھیر کر پونچھے۔ کلو کے دل پر بری گذری۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بھچے ہوئے دانت عزم کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ بغیر کچھ کہے اٹھا۔ باہر جا زہرہ کے والد کے قدم پکڑ لئے اور کہا: "زہرہ بی بی اسوقت سخت پریشان ہیں۔ خدا اسی وجہ مجھ کو بھی بتائی۔ میں ان کے ساتھ کھیلا ہوں۔ حضور میرے باپ کی جگہ ہیں۔ اگر غلام کوئی خدمت کر سکے تو جان تک حاضر ہے۔"

اشرف علی خاں نے کلو کو سر سے پا تک دیکھا اور کہا: "سوائے اس کے اور کوئی شکل نہیں کہ اس مردود کے گھر سے تمسک نکال لیجائیں۔ اس میں دو فائدے ہیں ایک طرف تو اس کے پاس قرضہ کا ثبوت نہیں رہے گا۔ دوسری طرف روپیہ کی مار پڑے گی۔" کلو نے کہا: "اللہ نے چاہا تو یہ کام غلام انجام دے گا آج کے آٹھویں دن تمسک آپ کے ہاتھ میں ہوں گے۔"

اشرف علی خاں نے کہا: "میں ساری عمر احسانمند رہوں گا۔"

انسان جو چیز دل پر رکھتا ہے وہ کر ہی گذرتا ہے ؎

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود مرد باید کہ ہراساں نہ شود

کلو نے ٹھان لی تھی کہ یہ کام تو کرنا ہی ہے۔ سرچہ با دا باد ہمت اور ارادے کی پختگی سے کام لیا۔ میعاد کے تقرر نے اور بھی تالی لگادی۔ شب و روز ایک کر دئے سیٹھ کے ملازمین کو ملایا۔ سب کچھ پتہ چلا یا۔ ان کو رقم کا لالسہ دیا۔ کہا روپیہ سب تمہارا مجھے تو صرف دو چار کاغذات درکار ہیں۔ لالچ بری بلا ہوتا ہے وہ بھی راضی ہو گئے۔

ایک رات لالہ کے گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ کنجیاں سیٹھ کے سرہانے سے سرکالی گئیں۔ کلو نے اپنا کام بنالیا۔ مال لیجانے کر چل رہا تھا کہ جاگ ہو گئی۔ یہ بھاگا۔ اندھیرے کا معاملہ سر کو چوٹ لگی۔ پھاٹک سی کھل گئی۔ نشان کے طور پر چند قطرات لہو رہ گئے اور یہ فرار۔ ملازم پہلے ہی نکل چکا تھا۔ ملنے کی جگہ مقرر ہو چکی تھی۔ کلو نے تمام رقم اسے تھموا دی۔ کاغذات دوسرے روز نواب کی نذر کئے۔ انھوں نے کہا سر میں چوٹ آئی ہے۔ یہ بولا اگر کٹ جاتا تو بھی پروا نہ تھی۔

اشرف علی خاں کو اطمینان خاطر نصیب ہوا۔ لالہ سر پکڑ کر بیٹھا۔ کلو کی بہت آؤ تواضع ہوئی۔ سر کی خیریت دریافت فرمانے نواب صاحب خود کئی بار تشریف لائے۔ بی زہرہ جبیں بھی آئیں۔ کلو نے دبے الفاظ مبہم جملوں میں وعدہ یاد دلایا۔ وہ بات ٹال گئیں۔ سر جھکا کر ناسمجھ بن گئیں۔

نواب نے بے شک کچھ جائداد اس کے نام منتقل کرنی چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ تو کسی اور ہی انعام کا خواستگار تھا۔ زہرہ جبیں کے الفاظ نے ایک خاص تمنا پیدا کر دی تھی، امید بندھا دی تھی۔

ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ لکھنؤ سے بی زہرہ کی خالہ اور انکے جواں سال صاحبزادے تشریف لائے۔ روبیہ کی اب کمی نہ تھی۔ شاندار میزبانیاں ہوئیں۔ بڑی آؤ تواضع۔

کلو کے ماتھے کا زخم بھر گیا لیکن ایک بدنما خراش چھوڑ گیا۔ دل کا خلا، قدرے زیادہ محسوس ہونے لگا اور خراشیں بھی امید کی پھوار پڑنے سے میٹھی میٹھی کسک دینے لگیں۔

زہرہ کے بھائی مسٹر ظہار بی۔ اے پاس تھے اور ایل ایل بی کے طالب علم۔ نہایت حسین اور خوب رو جوان۔ ان کی والدہ دبی بات ڈالنے کی نیت سے آئی تھیں۔ اپنا خاندان ایک گھرانہ، جاگیر جائداد معقول اور کیا چاہئے تھا۔

زہرہ بھی اس حسین مہمان کی بہت خاطریں کرتیں ——— کلو کی تمنائیں جب طغیانیاں پیدا کرنے اور دل کا کنارہ توڑنے ہی لگیں تو ایک روز اس نے نواب کو ٹوٹی پھوٹی زبان میں رقعہ لکھا۔ املا غلط۔ انشا غلط۔ ہجہ غلط۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ آرزو ہی غلط تھی۔

کلو کی تمناؤں نے اسے غلط امیدیں دلا دی تھیں۔ زہرہ نے جب کہا تھا کہ عمر بھر لونڈی بنی رہوں گی تو اس کا یہ مدعا نہ تھا کہ اس سے شادی کرنے پر راضی ہو جاؤں گی۔ ایک لفظ تھا جو جذبات کی رو میں کہہ دیا ——— نیز نواب نے جب تمام عمر احسان ماننے کو کہا تھا تو انکے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ کلو کے خط نے نواب کے دل و دماغ میں ایک تلاطم سا بپا کر دیا۔

ایک جانب کلّو کا احسان تھا تو دوسری طرف اس کی اس جرأت بے جا و بے محل پر غصہ۔ خط نذرِ آتش کر دیا اس کے ساتھ ساتھ جذبات احسانمندی بھی قدرے جھلس گئے۔

کلّو کو جب اپنی درخواست کا کوئی جواب نہ ملا تو آخر کار ایک روز خود زہرہ کے پاس گیا۔ وہاں خالہ زاد بھائی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے کلّو کو بہ نظرِ حقارت دیکھ کر پوچھا "یہ کون ہے؟" زہرہ جبیں نے کہا: "میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے۔ اس کی بیوہ ماں پڑوس میں رہتی ہے۔ واحد حاضر کا صیغہ اور بیوہ کا لفظ صرف اس لئے استعمال کیا گیا تھا کہ عزت و حقارت ظاہر ہو جائے۔ زہرہ بیگم کلّو سے ہمیشہ تو کر کے بات کرتی تھیں لیکن کاغذات کے واقعہ کے بعد سے یہ تم ہو گئے تھے۔ اس سگِ دوران کے منہ سے تو بھی بُرا نہ لگتا۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

لیکن اس وقت غیر کے سامنے انی کی طرح چبھا۔

سامنے آئینہ تھا۔ اس میں اظہار کا بھی عکس نظر آرہا تھا اور اس کا اپنا بھی۔ کلّو کی نگاہیں عکس پہ بار بار جاتیں اور منکی کھا کر آتیں۔ حقیقتیں بھی کچھ سرزنش سی کر رہی تھیں۔ زہرہ کی نگاہیں نظر بے پھیری سی دکھائی دیتیں۔ یہ افسردہ خاطر لوٹا۔

نواب کو کلّو کے آنے کی اطلاع ہوگئی۔ دربان کو حکم ہو گیا کہ اندرون خانہ نہ آنے دیا جائے۔ اب جو یہ ایک روز دل سے مجبور ہو کر پھر قسمت آزمانے پہنچا تو اپنے پہ دروازہ بند پایا۔ ماتھے پر چوٹ سی لگی۔ دل میں طوفان اٹھا۔ ان حالات میں نواب کو ایک خط اور لکھا۔ دماغ پریشان تھا تلخیٔ حیات کاری۔ زبان بھی قدرے ترش ہو گئی۔ نواب کی طبع نازک اس تقاضہ کو برداشت نہ کر سکی۔ انھوں نے سخت توہین آمیز جواب دیا۔ دل میں بھالا سا گھس گیا۔ اتنا تو یہ برداشت کر چکا تھا اس زخم نے بے تاب کر ڈالا۔

اسی اثنا میں ماں اور بہن بسم اللہ کو پریشان خاطر دیکھا ان کے تکدّر کا بھید زیادہ دن چھپ نہ سکا۔ معلوم ہوا کہ اظہار میاں کے حسن سے خیرہ ہو کر یہ غریب کی بچی لڑکھڑا گئی — عورت کی لغزش رنگ لاتی ہے دوکے گنا، فطرت نظر انداز کر جاتی ہے۔ کلّو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مصیبت زدہ ماں نے کسی دائی کو بلایا۔ لڑکی ختم ہو گئی۔ ماں کھٹیا پر پڑ گئی دل نے جواب دے دیا۔ اختلاج کے دورے پڑنے لگے۔

نواب کا سیاست داں دماغ ایسے خطرناک راز داں کا درپۓ آزار ہو گیا۔ نہ صرف محلّے سے اٹھانے کا طلبگار بلکہ دلّی چھڑانے پر کمربستہ۔

روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ انھوں نے چند گنڈے لگا دئے۔ ایک دن رات کو جب کلّو آیا تو ماں نے کہا بیٹا تو نے کسی سے کچھ قرض لیا ہے۔ وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔ بولا کیوں کیا بات ہے۔ اس دکھیاری نے بیان کیا کہ تقاضہ گھر پر چڑھ آئے تھے۔ دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ برا بھلا کہہ رہے تھے سارے محلّہ میں تھڑدی تھڑدی ہو رہی ہے۔ بیٹے نے کلام پاک سر پر رکھ کر قسم کھائی۔ ماں نے اپنے لال کو سینہ سے لگا لیا اور کہا بیٹا میں سمجھی تھی کہ میرے علاج معالجہ کے لئے شاید تو نے ایسا کیا ہو۔ میں بچوں کی نہیں۔ تیرے باپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تو بہت پریشان ہے اب یہاں آجا۔ کلّو کا بدلہ خدا خود لے گا ابھی کچھ دن چکّر ہیں اللہ نکال دے گا۔

کلّو دوسرے روز پریشاں خاطر ملازمت پر گیا پیٹ کا معاملہ تھا۔ جب گھر لوٹا تو دیکھا ماں کی حالت خراب ہے۔ معلوم ہوا فرضی قرض خواہ پھر آئے تھے بڑھیا کے سر پر دُوں مچا کر گئے ہیں غریب اہل محلّہ نے اگر شکل ٹالا۔ نواب کے ملازمین گنڈوں کی حمایت کر رہے تھے۔

صبح تک ماں بیٹے کی گود میں ختم ہو گئی۔ رانڈ ماں کی آخری ہچکی کے ساتھ کلّو کی انسانیت بھی نزع میں تھی۔ اس نے رات کی تاریکی میں مردہ ماں کے سینہ پر سر رکھ کر انتقام کا وعدہ کیا۔

اندیشہ تھا کہ نواب کہیں کسی چال سے سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچا دے اور یہ اپنے کو ابھی بدلہ لینے کے قابل نہ پا رہا تھا نیز او چھا ہاتھ مارنا چاہتا نہ تھا خواہش تھی کہ ایک ہی وار کرے مگر بھرپور۔ کچھ عرصہ آنکھوں سے اوجھل ہو جانا انسب نظر آیا۔ ہوٹل میں ایک انگریز کو بہرہ کی تلاش تھی اس نے اس کی ملازمت کر لی وہ اپنے ساتھ بمبئی لے گیا۔ کلّو نے جاتے وقت ماں اور بہن کی قبر پر وعدۂ انتقام کی تجدید کی۔

وہ انگریز ڈاکٹر تھا اور ہیوٹی اور فیشن کا اکسپرٹ۔ کلّو نے وفاداری سے کام کیا صاحب کی ہر آسائش کا خیال رکھا۔ وہ اپنے ہمراہ پیرس لے گیا۔

یہاں اس نے نئی دنیا دیکھی اک پرستان نظروں کے سامنے تھا۔ معشوقانِ شوخ و شنگ کا سیل رواں دل و دماغ کے قدم اکھاڑے دے رہا تھا۔ لعبتانِ فرنگ کی عریاں عشوہ کاریاں چراغ عقل و شعور پر پردہ ڈالے دیتی تھیں۔ ہر عورت پری زاد تھی، ہر ساق ساقِ بلوریں ہر غبغب غبغبِ سیمیں، ان سیم تنوں کے شہر میں تمام سیاہی اکٹھی ہو کر دلوں میں جا چھپی تھی — نازنینوں کی آنکھوں میں ہمندر کی رنگت دل کی نیّا کا لنگر توڑے دیتی۔ یاقوتی لب آنکھوں پسند رنگ شفق کی طرح چھائے جاتے سنہری بال ابن آدم پہ سونا حرام کرتے۔ رخسارِ صفا پہ قدم نگاہ پھسلتا۔

کھلی ہوئی باہیں دل سے آہیں نکلواتیں۔اس پر دعوتِ نظارہ۔بے باکی و چالاکی زاہدِ سست قدم کے خون میں بھی تلاطم بپا کر دیتی۔

غرض کہ چند روز کے لئے کلّو اپنے کو بھی بھول گیا۔اسکی حالت کچھ ایسی تھی جیسے شش محل میں کتّا۔

ڈاکٹر کے پاس عورتیں آتیں حسن میں اضافہ کرا کرا کے جاتیں۔ ایک روز اس نے بہت جرأت کر کے آقا سے کہا کہ دریا میں رہ کر پیاسا ہوں۔آپ دولتِ حسن لٹا رہے ہیں اور یہ سگِ در ابھی تک اپنی بدصورتی شانوں پہ لئے پھر رہا ہے——— ڈاکٹر نے اسے سر سے پا تک دیکھا اور کہا:"کلّو میں ابھی تک اپنے تجربات میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہوں۔آج کہتا ہوں کہ تم کو تجربہ کرنے ہی کے لئے لایا تھا لیکن کچھ عرصہ باقی ہے۔فطرت سے لڑنا آسان نہیں۔کوشش کر رہا ہوں۔ تم بھی صبر سے کام لو۔"

روز و شب، ہفتہ و ماہ گذرتے رہے۔کلّو کو امید بندھ گئی تھی۔ حسن رہگذر کو دیکھتا۔اپنے لئے کسی کی ناک چھانٹتا کسی کی آنکھ تو کسی کی پیشانی ذہن نشین کرتا۔کسی کا دہن غنچہ رو۔

شعاعِ امید نے گو مکمل مایوسی سے نجات دلا دی لیکن تلاطم اور اضطراب بڑھتا رہا۔اسے اپنا چہرہ شانوں پر پہلے بھی بارِ گراں تھا اب گراں تر ہو گیا——— کلّو ان ذہنی حالات میں تھا کہ اک روز ڈاکٹر نے اس سے کہا:"کلّو تجربہ مکمل ہو گیا ہے لیکن اوپریشن اس درجہ اذیت رساں ہے کہ شاید ہی کوئی انسان اس جسمانی تکلیف کو گوارا کرنے پر آمادہ ہو سکے——— بدصورتی کو حسن مکمل میں تبدیل کر سکتا ہوں لیکن شکم مرغ چیر کر زہرہ کو برآمد کرنا ہو گا۔ وہ درد و کرب جسم انسان برداشت نہیں کر سکتا۔"

کلّو مسکرایا۔اس نے اپنی بدصورتی کی وجہ سے وہ وہ روحانی تکلیفیں اٹھائی تھیں کہ ان کے مقابلہ میں سخت سے سخت جسمانی تعب کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔روحانی او جسمانی تکلیفوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسا دل کی پھانس اور ایڑی کی پھانس میں۔علاوہ بریں حسن کی طاقتوں سے آگاہ تھا۔انتقام کے لئے اس طاقت کو اپنانا چاہتا تھا۔یہ تبسم کناں بولا:"میں تیار ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا:"ہارٹ فیل ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔" کلّو نے پھر وہی پہلا جواب دیا۔

یہ بدصورتی کا شکار جب اوپریشن ٹیبل پر لیٹا تو آخری مرتبہ اپنا چہرہ الماری کے شیشے کے فریم میں دیکھا اور پھر اس پر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

اب جو کلّو اٹھا تو کلّو نہ تھا اڈونس تھا۔کامل فن کار کی نگاہیں اپنے کمال کی بلائیں لے رہی تھیں——— کلّو کو آئینہ یوسفِ ثانی دکھا رہا تھا۔ آنکھیں نرگس کے ایسے پھول تھیں جن میں موتی اور نیلم کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہو۔ ماتھا مہتابِ روز، اس پر بھویں جیسے برف پر شاخ صنوبر کا اچٹتا ہوا سایہ۔ رخساروں کا رنگ کچھ نہ پوچھئے۔یاسمن کی سفیدی میں گلاب کی رنگت جھلک مار رہی تھی۔سیب زنخداں وینس لاموئے کی ٹھوڑی پر حسین ترمیم تھی۔اب کلّو یوسفِ ثانی اور حسن و شباب کا سر بسر مجسمہ تھا——— حوروں کی جوانی کام دیوتا کی تندیاں لئے نظر آتی۔صنّاع چابک دست اپنی صنعت گری دیکھتا اور کچھ اس طرح عش عش کرتا جیسے شاعر اپنے حسین شعر میں گم ہو جائے۔ اپنی ہستی کو بھول جائے اور اس کے مزے اٹھائے۔

ڈاکٹر نے کلّو کا نام جوزف تجویز کیا۔اسے بہترین ٹیلر کے ہاں لے گیا لیڈی شوپ اسسٹنٹس کی حالت زنانِ مصر کی سی تھی۔درزی نے بھی ایسے سوٹ بنائے جیسے انگوٹھی پر نگینہ۔

صنعت گر جوزف میں اپنے کمالِ فن کی پرستش کر رہا تھا اور اس موتی کی تزئین میں بخوشی خاطر روپیہ خرچ کرتا جس روز پہلی مرتبہ ڈاکٹر جوزف کو ڈریس سوٹ پہنا کر اوپیرا لے کر گیا وہاں عجیب منظر تھا۔نظروں کا طوفان اس جانب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔دنیا اوپیرا کے بدلے اسے دیکھ رہی تھی۔مرد و زن تعارف کے ذرائع تلاش کر رہے تھے چشمِ مشتاق قدم چوم رہی تھی۔

جوزف نے کچھ عرصہ پیرس، لندن اور نیو یارک میں اپنے حسن گلوسوز کی سحرکاریاں دیکھیں۔گل رخوں سے کھیلا۔پھولوں کی سیجوں پر سویا۔ لیکن اس گل رخسار کے سینہ میں ایک کانٹا چبھا تھا۔اس یاسمن جسم کی روح میں افعئی انتقام کا زہر جوش مار رہا تھا۔

یورپ میں ہر چیز بکتی ہے حسن کے گاہکوں نے اسے قیمتِ حسن ادا کی۔کچھ عرصہ بعد یہ دولتِ حسن سے مالامال نیز سرمایہ معقول لے کر سرزمین ہند پر پہنچا۔ساحلِ بمبئی نے اس کے قدم چومے۔دنیا کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں——— فلمی دنیا کے خریدارانِ حسن نے اس سیم تن کو پردۂ سیمیں پر لانا چاہا۔اسے بھی ہندوستان میں متعارف ہونے کے لئے یہ ذریعہ پسند آیا۔

دو تین پکچرز میں کام کیا۔ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ مچ گیا۔دنیا عکس دیکھ کر دیوانی ہو گئی۔اس کے دروازے پر گدایانِ کوئے حسن کا اژدحام رہتا۔پوشیدہ خطوط آتے۔ملنے کی دعوت دی گئی۔خفیہ ٹھکانے بتائے گئے۔جوزف فلمی دنیا میں یوسفِ ثانی کے

نام نامی سے متعارف ہوا حسب دلخواہ متعارف ہو جانے کے بعد اب اس نے دلی کا قصد کیا۔

سب سے پہلے ماں اور بہن کی قبر پر گیا۔ ان دونوں کی محبت منت کش جمال نہ تھی۔ یہ تو کلو کو بھی چاہتی تھیں۔ یوسف ثانی سے بھی محبت یکساں۔

اس کے بعد نواب اشرف علی خاں کی ٹوہ لگائی۔ معلوم ہوا کہ زہرہ جبیں کی شادی اقبال میاں سے ہو چکی ہے نواب نے گھر داماد رکھا ہے۔ سال میں ایک دو ماہ کے لئے لڑکی سسرال جاتی ہے باقی سارا سال میکے میں گذارتی ہے۔

دلی کے سنیما فینز اور حسن پرستوں نے اشرف کو گھیر لیا۔ چند احباب کے ہمراہ اظہار صاحب بھی کھنچے آئے یہ فوراً پہچان گیا۔ ان کی جانب التفات خاص فرمایا۔ وہ نوکر دیدہ ہو گئے۔ اپنے گھر دعوت کی۔ بیوی کا پردہ بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی شوہر نے اٹھوا دیا تھا۔ زہرہ بھی کھانے میں شریک تھی۔ یوسف ثانی کے حسن عصمت شکار کے تیر بے پناہ سے نہ بچ سکی۔ اس صیاد فگن نے بھی سارے حربے آزمائے۔ لطف نیم ظاہر سے گھائل کیا تو کبھی چشم بے محابہ سے مارا۔ اور بھی چند سوسائٹی گرلز فلشن ایبل سونے چاندی کی چڑیاں مدعو تھیں۔ یوسف نے نگاہ کماں کسی جانب کج کی۔ تیر کسی اور کے سینہ کے پار۔ لالہ رخ پر عنایت خاص فرمائی۔ زہرہ تلملا اٹھی۔

یوسف نے اظہار سے بھی خوب پینگ بڑھائے۔ دوسرے روز سب کو ساتھ سنیما چلنے کی دعوت دی۔ دو بوکس رزرو کرائے۔ ایک میں زہرہ تھی تو دوسرے میں لالہ رخ۔ یوسف بہ شکل میزبان گاہ ادھر آتا گاہ ادھر جاتا۔ حسن جہاں سوز آتش رقابت کو ہوا دے رہا تھا۔ متاع صبر و سکون پھونک رہا تھا۔ لعبت عصمت دھواں دینے لگی۔ پکچر کے عاشقانہ مناظر نے تیل کا کام کیا۔ پاکدامنی کے مندر کے شہتیر چٹخنے لگے۔ عفت کی کڑیاں چیخ گئیں۔ معبد حیا و وفا گرنے کو تھا کہ یوسف نے تدبیر کی اڑواڑ پر روکا۔ ابھی صرف دیواریں گر رہی تھیں اور یہ بنیادیں اکھیڑ پھینکنے کے درپے۔

ایک روز زہرہ کے پائیں باغ میں یوسف اور وہ بیٹھے چاء پی رہے تھے کہ مسئلہ حسن و عشق زیر بحث آیا۔

یوسف:۔ دنیا میں حسن کی حکومت ہے۔

زہرہ: بعض تخیلات حسن سے زیادہ قدر رکھتے ہیں۔

یوسف:۔ معاف کیجئے گا۔ یہ محض کوتاہی فہم و ادراک ہے حقیقت میں وہاں بھی حسن تخیلات کار فرما ہے۔

ایک مرجھایا ہوا پتہ زمین پر گرا۔

یوسف:۔ دیکھا۔ رنگ روپ ختم ہو گیا تھا آغوش شاخ نے خود اپنے پروردہ کو سپرد خاک کر دیا۔

زہرہ:۔ یہ کھاد بن جائے گا۔

یوسف:۔ جی ہاں بدصورت چیزیں صرف کھاد بننے کے لئے ہوتی ہیں ——— بیگم انسان کی انگلی میں زخم ہو جاتا ہے۔ اس کے حسن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ وہ ایک کریہ منظر پیش کرتی ہے۔ ابن آدم خود اسے کٹوا دیتا ہے۔ حالانکہ وہ انگلی اس کے جسم کا ایک حصہ تھی۔

زہرہ:۔ اس مثال میں تو کرب، درد اور زخم کو دخل ہے حسن کو نہیں۔

یوسف:۔ زاویۂ نگاہ کا فرق ہے، ورنہ بات وہی ہے جو خادم نے عرض کی ——— بندہ نواز۔ انسان خود اپنی اس چیز سے بیگانگی و بے اعتنائی کا اظہار کرتا ہے جو بدنما ہو۔ یہ پاؤڈر، لپ اسٹک، روژ اور فاونڈیشن کریم اسی بنیاد پر قائم ہیں۔

زہرہ:۔ میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔

یوسف:۔ محترمہ، رنگ انسان کا اپنا ہے اور پاؤڈر غیر۔ وہ اپنے پر غیر کا پردہ چڑھاتا ہے صرف اس لئے کہ غیر اپنے سے حسین ہے۔ ایک لڑکی کے ہونٹ اس کے اپنے ہیں۔ اس کا حکم مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، اس کے ساتھ مرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لپ اسٹک اس کی اپنی نہیں۔ اس کے جسم کا جزو نہیں۔ چوری جا سکتی ہے جس کے ہاتھ لگ جائے اس کے کام آ سکتی ہے۔ پھر بھی اپنے ہونٹوں کی رنگت اس کی تحریروں سے چھپائی جاتی ہے۔ محترمہ جس طرح آپ کے پائیں باغ میں حسین پھولوں کے لئے جگہ ہے بعینہ کائنات عالم میں سریر قلب پر حسن بلا شرکت غیرے متمکن۔ کونین اس کے آگے سرنگوں۔

زہرہ: حسن کی تمام قدر و قیمت عشق سے ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو حسن کو کون پوچھے۔

یوسف:۔ عشق حسن کا غازہ ہے لیکن بے مایہ و محروم قدر ——— مکھیاں پھولوں میں تلون پیدا کرتی ہیں۔ دنیا پھول کی دیوانی ہے اور مکھی کو نظر حقارت سے دیکھتی ہے۔ گل و لالہ خاک کا لہو چوس کر رنگ حاصل کرتے ہیں۔ زمین کو دنیا ٹھکراتی ہے۔ لالہ کو سر چڑھاتی ہے ——— ہاں لالہ پر مجھے یاد آیا کہ کل سنیما میں اظہار کے ساتھ لالہ رخ تھیں تم نہیں آئیں۔

یہ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ زہرہ بے چین سی ہو گئی۔ تعجب یہ ہے کہ وہ ہی بیوی جو ایک غیر کو دل دے چکی تھی شوہر کے غیر عورت کے ساتھ سنیما جانے کی تاب نہ لا سکی ——— انسان کی خصوصیت ہے کہ اپنی غلطیوں پر تغافل کے پردہ ڈال دیتا ہے اور دوسروں کے عیب برداشت نہیں کرتا۔ بنت حوا خاص طور پر یہ شتبہ رکھتی ہے۔ جہاں ابن آدم کچھ نہ پائے صنف نازک کا دماغ خیالی افسانہ بنائے۔ بہر نوع سم سوفار اپنا کام کر گیا۔

بیج زمین پکڑ گیا۔ زہرہ شوہر کے شائبۂ بے وفائی سے آمادہ بہ خیانت ہوگئی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ سوءِ اتفاق سے تھوڑی دیر بعد اظہار اور لالہ رخ ساتھ ساتھ آئے۔ یوسف کا تبسم معنی خیز زہرہ کی چشم اشتباہ زدہ میں اتفاقی شہادت پیش کر رہا تھا۔ اب زہرہ کے دل و دماغ پہ۔ تو کرے گا رام جی تو میں کروں گی رام جنا۔ کا بھوت سوار تھا اور یہ کوتاہ نظر ناقص عقل شعور و خرد کی آنکھوں پہ پٹی باندھ اس راہ پہ گامزن ہوگئی۔

ابھی یوسف ثانی دہلی ہی میں تھا کہ زہرہ جبیں پہ علامات حمل ظاہر ہونے لگیں۔ ایک روز یوسف سوختۂ آتش انتقام نے پیرس کے قصے شروع کئے۔ زہرہ کو بتایا کہ حسن بار برداری کے لئے تخلیق نہیں کیا گیا ہے۔ نسرین و نسترن پھل نہیں دیتے۔ گلاب کا حسن اسی میں مضمر ہے کہ بار آور نہیں۔ سرو آزاد اسی وجہ سے کہلاتا ہے کہ پھل کے بوجھ سے سبکدوش ہے۔ سوسن کی شاخ نازک تربوز اور خربوزہ کے لئے نہیں۔ جانور تک حاملہ مادین سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ انسان تو پھر انسان ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ زہرہ نے اسقاط کی دوا کھائی۔ دنیا منتقم ہے جس نے حیات نو دینے سے پہلو تہی کی فطرت نے اس سے بھی امانت زیست لے لی۔ بسم اللہ کا بدلہ ایک حد تک لے لیا گیا۔ اشرف علی خاں کو اکلوتی بیٹی کا داغ اٹھانا پڑا۔ کمر ٹوٹ گئی دنیا نظروں میں اندھیر ہوگئی۔ اب تیغ انتقام خون اظہار کی پیاسی تھی۔

ہم کو تعجب ہوگا کہ کلو یوسف ثانی بنتے ہی پڑھا لکھا بھی ہوگیا۔ دماغ فلسفیانہ باتیں تراشنے لگا۔ بندہ نواز خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔ اوّل تو یوسف نے تھوڑی سی تعلیم پائی ہی تھی۔ نیز پیرس نے اس پہ جلا کی۔ لندن اور نیویورک کی سوسائٹی نے پولش کر دیا اب یہ مکمل ڈرائنگ روم کا چھیلا تھا۔ ادب آداب میں ماہر گفتگو میں طاق۔

بیٹی کے مرنے کے بعد اشرف علی خاں کی نگاہیں اظہار سے پھر گئیں۔ اب وہ ہی نہ رہی جس کے منہ سے ان کی ناز برداریاں تھیں۔

ادھر اظہار میاں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں۔ جور و زوشب نظریں دیکھتے رہتے تھے ان کی نگاہیں بدلی ہوئی تھیں۔ اظہار نے باپ کے پاس چلا گیا وہاں یہ آرام و آسائش کہاں۔ گو اللہ کا دیا سب کچھ تھا تاہم اشرف علی خاں کا سا دل نہیں۔ یہ میاں اب ہو چکے تھے نشاہ خرچ باپ نے ہاتھ کھینچ کر دیا۔ آخر کار ان حضرت نے پریکٹس شروع کی یوسف سے خط و کتابت جاری رہی۔ چند روز بعد یہ شعلۂ خانہ سوز لکھنؤ پہنچا۔ اظہار سے جاتے ہی ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ گھوڑ دوڑ میں ساتھ جانے لگے۔ رقعوں کے پر دونوٹ لکھوائے گئے۔ چوک کی سیریں رہیں۔ عالم گنج بو میں گلگشت حتیٰ کہ اظہار سر سے پا تک یوسف کا مقروض ہوگیا۔ باپ سے یہ رقم ملنے کی امید نہ تھی۔ اشرف علی خاں کی تجوریاں اس پر بند ہو چکی تھیں۔ وکالت واجبی واجبی چل رہی تھی۔ منشی اور کمرہ کا خرچ بھی بمشکل نکلتا تھا۔

یوسف نے جب اظہار کے گرد خوب جالا پور دیا تو ایک طرف روپیہ کا ملائم تقاضہ کیا اور دوسری جانب فلم کمپنی کھولنے کی تجویز۔

اظہار کو خوب سبز باغ دکھائے۔ کہا: "ہم تم برابر کے حصہ دار رہیں گے پانچ چھ مہینہ میں چار پانچ لاکھ کما لینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن رقم درکار ہے۔ میں خود آخر ملینوں کے حصے خرید چکا ہوں اس سے زیادہ رقم نہیں لگا سکتا۔ تم اگر ایک لاکھ سے مدد کر دو تو باقی میں خود لوں گا مینیجنگ ڈائرکٹر تم کو کر دیں گے۔

اظہار کو سوکھے میں ذرا سی ہریاول نظر آئی۔ لیکن سوال رقم کا تھا۔ وہ کہاں سے لائے۔ اتفاق کی بات اسی زمانہ میں اس کے والد نے ایک جائیداد ایک لاکھ میں فروخت کی اچھا گاہک مل گیا تھا۔ وہ سارا روپیہ ابھی گھر پر ہی رکھا تھا۔ اظہار نے اسے تائید غیبی سمجھا۔

انسان کا قاعدہ ہے کہ جو تصورات اور خیالات ایک عرصہ تک دماغ میں چکر لگائیں وہ ایک نہ ایک دن عملی جامہ پہن ہی لیتے ہیں۔

باپ بیٹے سے کیا احتیاط برتتا۔ کیا پردہ رکھتا۔ سارے گھر کا رکھاؤ ان کو معلوم تھا۔ رات کو اپنا کام بنا لیا اور فوراً یوسف کے ساتھ فرار۔

نواب شبیر علی خاں نے رپورٹ تو درج کرا دی لیکن بیٹے پہ شبہ کا اظہار نہ کیا۔ اصل چور کو جانتے تھے رپورٹ مصلحتاً لکھوا دی تھی۔ لیکن تحقیق اور تفتیش میں زیادہ پیر دوڑی نہیں کی۔

اظہار کو پہلے ہی سے خرچ کرنے کی عادت تھی۔ بمبئی میں نئی نئی مورتیاں دیکھ کر لگے اندھا دھند پھسلنے۔ انہیں روز روپیہ درکار۔ اصل رقم فلم کی تیاری کے لئے تھی نہ کہ ان کی آوارگیوں کے واسطے۔ ان کے گھر کے قریب ایک ادھیڑ عمر امیر عورت رہتی تھی۔ اس سے ان کی یاد اللہ ہوگئی۔ خلتے مراسم بڑھ گئے۔ وہ شوقین مزاج، یہ گبرو جوان۔ کچھ روز خوب یوسف زلیخا کی اوراق گردانی رہی، بڑھیا رقمیں بھی دیتی خاطر مدارات بھی کرتی، تاہم اظہار اس کی عمر سے بیزار تھا ——— بازاریں ایک ہم عمر طوائف سے لانگر پھنس گیا۔ کچھ روز اس کی فرمائشیں بڑھیا کے روپیہ سے پوری ہوتی رہیں۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت ——— وہ بھی جہاندیدہ ایک کائیاں عورت تھی۔ بات زیادہ دن چھپ نہ سکی اسے پتہ چل ہی گیا۔

نام تلوک چند تخلص محروم۔ وطن مالوف عیسیٰ خیل ضلع میانوالی صوبہ پنجاب ہے۔ جولائی ۱۸۸۷ء میں آپ نے عالم ارواح سے عالم اجسام کا رخ کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ ڈیرہ اسمٰعیل خاں، عیسیٰ خیل اور کلورکوٹ میں بطور اسسٹنٹ انگلش ٹیچر و ہیڈ ماسٹر کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں آپ نے گورنمنٹ بورڈ مڈل سکول لال کرتی بازار راولپنڈی کی ہیڈ ماسٹری کا چارج لیا۔ ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ بورڈ کی ملازمت سے آپ ریٹائر ہو گئے۔ اور اس سے تھوڑے ہی عرصہ بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں بطور لیکچرار (پروفیسر) زبان اردو و فارسی لے لئے گئے۔ اور ہنوز آپ یہیں کام کر رہے ہیں۔ ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایس۔ اے۔ وی کے امتحانات آپ نے سکولوں کی ملازمت کے دوران میں پاس کئے تھے۔

محروم صاحب قدرت سے ایک شاعرانہ طبیعت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کے سینے میں حساس اور دردمند دل ہے۔ تیسری جماعت سے ہی آپ نے شاعری شروع کر دی تھی۔ ذرا غور فرمائیے جس بچے نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا ہو جو ابھی کوئی باتیں بھی نہ کر سکتا ہو، اگر اچھے اچھے شعر کہنے لگ جائے تو اس کا مستقبل شاعری کتنا شاندار اور ہنگامہ خیز ہوگا۔ محروم صاحب کے متعلق یہ معلوم کر کے اور بھی حیرت ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے شعر و سخن میں بے طرح مستغرق ہونے کے باوجود اپنے تعلیمی مشاغل میں کوئی خلل پیدا نہیں ہونے دیا۔ بلکہ پرائمری، مڈل کے امتحانات میں وظائف حاصل کئے اور میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور ایف۔ اے اور بی۔ اے درجہ دوم میں۔

زمانہ طالب علمی میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر آپ نے ایک دردناک مرثیہ لکھا جسے افسران تعلیم اور سکول کے مدرسین نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ڈائرکٹر صاحب بہادر محکمۂ تعلیم نے اپنی خوشنودی کا اظہار بذریعہ تحریر کیا۔ اس نوحے کا ایک شعر یہ تھا جو آج تک زبان زد خاص و عام ہے ؎

فرط غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

آپ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ بلکہ ہمیشہ اپنی طبیعت ہی کو رہبر سمجھا۔ نویں جماعت سے آپ کے نتائج افکار ملک کے مشہور و معروف اخبارات و رسائل میں چھپنے شروع ہو گئے۔ جن میں سے زمانہ کانپور اور مخزن لاہور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہیں دنوں آپ نے ایک نظم "بلبل" لکھی۔ جسے تمام ہندوستان میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج کل یہ نظم نصاب تعلیم پنجاب کے ایف۔ اے کورسوں میں شامل ہے۔ نومشقی کے عالم ہی میں آپ کو وقتاً فوقتاً سرور جہان آبادی، بشیر الدین احمد خاں، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے داد سخن ملا کرتی تھی۔ شاعری میں آپ استادی شاگردی کے قائل نہیں۔ آپ کا قول ہے کہ فطری رجحان اور اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ ہی سب سے بڑا استاد ہے۔

آپ کی اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظموں کا پہلا مجموعہ "کلام محروم" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ کتابیں اپنے وقت میں حد سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ اور آجکل تینوں نایاب ہیں۔ دوسرے مجموعے (کلیات) کا نام "گنج معانی" ہے جسے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور نے ۱۹۳۰ء میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اسے بھی ملک کے طول و عرض میں غیر معمولی قدر و منزلت نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ "مہرشی درشن" کے نام سے محروم صاحب کی مذہبی نظموں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ محروم صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے جو ہر موضوع کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے اور جس کی طباعت کا انتظام آپ کے صاحبزادے مسٹر جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے کر رہے ہیں۔

جناب محروم نہایت با اخلاق، سنجیدہ مزاج ہستی ہیں۔ ہر ملنے والے کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بے فکری پر رشک کرتے ہیں۔ اساتذۂ سلف سے آپ کو حد درجہ محبت و عقیدت ہے۔ آپ کو مناظر قدرت سے والہانہ وابستگی ہے۔ بیابان، آبجو اور رود وغیرہ آپ کی پسندیدہ چیزیں ہیں۔ آپ نے بیشتر مشاعروں میں اپنا کلام سنایا۔ سینکڑوں ادبی مجالس کی صدارت کی۔ اب بھی آل انڈیا پشاور وغیرہ سے آپ کی ادبی تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ اور ریڈیائی مشاعروں میں بھی آپ اکثر حصہ لیتے ہیں۔

اوائل سے ہی محروم صاحب نے غزلوں کی طرف بہت کم توجہ دی ہے مگر اس کے باوجود ان کی غزلوں کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ [illegible] چھوڑ کر صرف اسی صنف میں طبع آزمائی کرتے رہتے تو آج غزل گوئی کے میدان میں شاید ہی کوئی شخص ان کا ہم سر ہوتا۔ میرے اس دعوٰی کی تصدیق کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے گا ؎

سرورِ عاشقی بعد فنا بھی مونس جاں ہے
کہ صحرا کے بگولوں میں غبار قیس رقصاں ہے

خیال رنج و راحت میں عبث اے دل پریشاں ہے
نہ یہ قائم نہ وہ دائم یہ پران وہ شتاباں ہے
چراغ زندگی روشن سر راہِ بیاباں ہے
ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے

تینوں مطلعے شاعری کی جان ہیں۔ ع "سرورِ عاشقی بعد فنا بھی مونسِ جاں ہے"۔ ماشاء اللہ کتنا پیارا مصرع ہے۔ ایک عاشقِ صادق کی دلی کیفیت کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر اس کیفیت کو اور بھی نمایاں طور پر ظاہر کرنے کے لئے کتنی نادر تشبیہ تلاش کی گئی ہے۔ دوسرے مصرع کے شروع میں کاف بیانیہ کی نشست قابلِ داد ہے۔ اس حرف نے دونوں مصرعوں کو دست و گریباں کر دیا ہے۔

دوسرا مطلع ان لوگوں کے لئے مایۂ تسکین ہے جو ہر وقت رنج و راحت کے فضول خیالوں میں الجھے رہتے ہیں۔ راحت کو تمام دنیا فانی مانتی ہے مگر رنج کی ناپائداری پر بہت کم لوگوں کی نگاہ پڑی ہے۔

تیسرے مطلع میں انسان کی زندگی کو ایک چراغ قرار دیا ہے۔ وہ چراغ بیابان کے راستے پر جل رہا ہے اور وہاں کا ہر جھونکا اس کے لئے موت کا پیغام ہے۔ زندگی اور چراغ کی تشبیہ قریباً تمام استادوں کے کلام میں موجود ہے۔ مگر محروم صاحب نے اسے جس ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر ان کے نام کو تا قیامت زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

یہ آج سے بائیس سال پہلے کا کلام ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ اگر محروم صاحب اس وقت سے غزل کہتے رہتے تو غزل گوئی میں ان کا مرتبۂ سخن کس بلندی پر پہونچ چکا ہوتا۔ لیکن یہ افسوسناک بات ہے کہ غزل کو قریباً قریباً خیرباد کہہ کر صرف نظم کو ہی انہوں نے اپنا موضوعِ سخن بنا لیا ہے۔ لیکن ہماری شکایت اس وقت دور ہو جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام نظمیں تغزل ہی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جا بجا وہی عاشقانہ تشبیہات اور مضامین نظر آتے ہیں۔ پھیکی سے پھیکی بات کو بھی نہایت رنگینی سے ادا کیا ہے۔ مثلاً شباب کی مذمت میں کہتے ہیں ؎

فریبِ دہر نے تدبیر جاں ستانی کی ؛ کہ شکلِ آگ نے کی اختیار پانی کی

محروم صاحب کے کلام میں سوز و گداز کی فراوانی ہے اور یہ خصوصیت آپ کو ہندوستان بھر کے شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ غم و الم کے جذبات کی ترجمانی میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے۔

چنانچہ آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ اور کمسن بچی کی وفات پر جو نوحے لکھے ہیں انہیں پڑھ کر کوئی بھی آنسوؤں کو نہیں روک سکتا۔ علاوہ ازیں ہمعصر شعرائے ہمعصر اور مشاہیر وطن کے ماتم میں انہوں نے نوکِ قلم سے خونِ جگر ٹپکا دیا ہے۔

حضرات سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، نادر کاکوروی، مولانا گرامی، آغا حشر، برق دہلوی، علامہ اقبال، طالب بنارسی، سحر ہنگامی، منشی دیا نرائن نگم، رابندر ناتھ ٹیگور، کے مرثیے جن میں سے اکثر ان کے مجموعۂ کلام "گنج معانی" میں آ چکے ہیں، ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں۔ لالہ لاجپت رائے اور سی۔آر۔ داس کی وفات پر نہایت پُر درد مرثیے لکھے ہیں جن میں جذبات حبِ وطن کا طوفان متلاطم نظر آتا ہے۔ ان نوحوں کا اقتباس ہمارے مضمون کو بہت طولانی کر دے گا اس لئے ہم صرف چند شعر اس درد ناک نوحے سے نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی دو برس کی بچی کی موت پر لکھا تھا، اور ان کے کسی مجموعہ کلام میں شائع نہیں ہوا۔

(مزار پر دوسری صبح)

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آ گئے ؎ اے کاش! زیرِ خاک سے ہو آشکار تو
ہم دودھ لے کے آئے ہیں گھر سے تمہی لئے ؎ دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیرخوار تو
گھر میں تو رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ ؎ آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو
افسوس! عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات ؎ جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تو
جانے سو تیرے رونق کا شانہ لٹ گئی ؎ تھی اے شگفتہ! مرے گھر کی بہار تو
کیا خوشگوار چلتی ہے بادِ نسیم صبح ؎ اور زیرِ سنگ و خاک ہے وقفِ فشار تو
بہتا ہے جس میں اشک کا مینہ تیری خاک پر ؎ ظاہر ہوتا بہ شکلِ گلِ نوبہار تو
روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالین تیری آج ؎ وہ بھائی جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو

جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

شاعری میں آپ پنڈت برج نارائن چکبست لکھنوی اور منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کے مقلد نظر آتے ہیں اور ان کا رنگِ سخن قبول کرنے میں آپ نے کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ کے دم سے چکبست اور سرور کی یاد تازہ ہے۔ اگر آج یہ بزرگ دنیا میں موجود ہوتے تو دیکھتے کہ ان کے لگائے ہوئے باغ کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے پنجاب کے ایک مالی نے کتنی جانکاہی اور تندہی سے کام لیا ہے۔

"زمزمۂ توحید" کے عنوان سے محروم صاحب کی ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

عالم ہے نگار خانہ تجھ سے ؎ اے مایۂ خوبیِ حسیناں
تیرے ہی ولولے ہیں دل میں ؎ اے ذوقِ دلِ جمال بیناں
ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم ؎ اے مرہمِ زخمِ غم قریناں

اور وجہ تسلی دلِ زار   اور موجبِ راحت حزیناں

پروانے کو تیری ہی لگن ہے
اور شمع میں تیری ہی جلن ہے

پہلے شعر میں نگار خانہ کے لفظ پر غور کیجئے۔ دنیا میں حسنِ قدرت کی فراوانی کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے اچھی تشبیہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسرا شعر جذبات نگاری کا مرقع ہے۔ "ہی" کے لفظ میں گویا جادو بھرا ہوا ہے عشق و محبت کے جذبات کو دلوں کا نام دینا محروم صاحب کا ہی حصہ ہے۔ تیسرے شعر میں خدا کو غم قریبوں کے زخم کا مرہم بیان کیا گیا ہے۔ واقعی خدا کی ذات ایک ایسی ذات ہے جو مصیبت میں کام آتی ہے۔ چوتھے شعر میں کوئی نئی بات موجود نہیں مگر اس کے باوجود یہ شعر اتنا دردناک اور رقت انگیز ہے کہ پڑھتے ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں "او" حرف ندا کا استعمال فن بلاغت کا اعلےٰ مثال موجود ہے۔ واضح ہو کہ یہاں "او" کی جگہ "اے" بھی کہا جا سکتا تھا مگر "اے" میں وہ بات کہاں جو "او" میں ہے۔ اس "او" نے تمام شعر کو آنسوؤں میں ڈبو دیا ہے۔ پانچویں شعر میں ارشاد ہوتا ہے کہ پروانے کو تیری ہی لگن ہے یعنی اسے معلوم ہے کہ شمع میں تیری ہی روشنی ہے اور اسی لئے وہ اس پر قربان ہو جاتا ہے۔ اور شمع کی روشنی بھی تیری محبت کی آگ کے سوا کوئی دوسری شے نہیں سبحان اللہ کتنی نازک خیالی ہے۔ ایک ہی چیز کو نورِ الٰہی اور آتشِ عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر صفائی اور بے تکلفی بیان کی مثال دیکھنی ہو تو مذکورہ بالا نظم کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھیئے گا۔ ؎

یہ کشمکشِ حیات کیا ہے   تیرا ہو کرم تو بات کیا ہے
اے رہبرِ کاروانِ ہستی   راہِ غم مشکلات کیا ہے
تو جس کو دکھا دے اک تجلی   کیا جانے وہ غم کی رات کیا ہے

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ محروم صاحب نے یہ نظم دسویں جماعت میں لکھی تھی۔

مہاتما بدھ سکونِ ابدی کی تلاش میں ایوانِ شاہی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آدھی رات کا وقت ہے۔ آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں وہ اُن کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

اے ستارو تم سراپا ہو کے چشمِ انتظار   دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار
لو اب آیا میں اب آیا تم رہو پیرے کو تیار   کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار
آہ میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں   ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

ایسے وقت میں مہاتما بدھ کا ستاروں سے خطاب کرنا محض شاعرانہ تخیل نہیں، بلکہ واقعی ایسا ہوا ہوگا۔ ہر وہ شخص جو عشقِ الٰہی کا لذت چشیدہ ہو یا اس کا متمنی ہو، اسے مناظرِ قدرت سے صدق جذبہ محبت ہوگی۔ یہ ایک اصلی بات ہے "کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بے قرار"

عام طور پر آوارگی کا لفظ مذمت کے معنوں میں آتا ہے یعنی بیکار ہو کر مارے مارے پھرنا۔ مگر یہاں اس لفظ میں کتنی روحانیت اور پاکیزگی بھری ہوئی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں اس آوارگی کی آرزو بے قرار رکھتی ہے۔ دنیاوی تعلقات کو سونے کی زنجیروں سے تشبیہ دینا ندرت کی انتہا ہے۔

آخر میں جناب محروم کے کلام کا مختصر انتخاب یہاں درج کیا جاتا ہے پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔ ؎

ہر ستارے کی چمک ہے حق نما میرے لئے   ہو گیا رہبر فریبِ ماسوا میرے لئے
لا نہیں سکتا ہوں میں حدِ تنا کامی کی تاب   چاہئے دل بے نیازِ مدعا میرے لئے
یاد جب بھی آگئی تیری نگاہِ اولیں   کھل گیا اک دفترِ مہر و وفا میرے لئے
اب تو اے محروم اک اجڑی ہوئی محفل ہے دہر   وہ بھی دن تھے جب یہ بزم ناز تھا میرے لئے

جوانی اور بچے گل میں یارب کیا تعلق تھا   کہ بوئے گل سے میری جاں جوانی یاد آتی ہے

نور جہاں کا مزار

رہنے کیلئے دیدہ و دل جن کے مکان تھے   جو پیکرِ ہستی کیلئے روحِ رواں تھے
محبوبِ دل خلق تھے جانِ جہاں تھے   تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے کہ اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجرے پڑے زیرِ زمیں ہیں

نوائے بہار

ہر ایک گل شررِ طورِ جلوہ گری   کہاں ہے آہ! مجھے تابِ جلوہ ہائے بہار
ہجومِ گل سے زمیں پر جگہ نہیں باقی   شفق کے پھول فلک پر کہیں کھلا بہار

محبت کے کرشمے

جانبِ مشرق گئی جب صبح دم خالی نظر   واژگوں اک کاسۂ حسرت نما تھا آفتاب
دفعتاً مستانہ میں نے اس پہ اک ڈالی نظر   جامِ زریں میں چھلکتی تھی محبت کی شراب

آندھی

روپوش اس کے خوف سے کوہِ گراں ہوا   ہیبت وہ ہے کہ زرد رخِ آسماں ہوا
کرتی ہے مثلِ اژدہ صحرا پھنکار رہی   للکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم ابھارتی   اڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اتارتی

رباعیات

ہے رحم و کرم سے تہی بے زار انساں   انساں سے ہے خود بر سرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے   کس منہ سے ہے جنت کا طلبگار انساں

انجام خمار ہے ہر اک مستی کا   عازم ہر اوج ہے یہاں پستی کا
دنیا میں نہ مطمئن نہ مغرور ہیں وہ   معلوم جنہیں مآل ہے ہستی کا

آکسفورڈ یونیورسٹی

تقریباً ایک ہزار سال ہوئے جنوبی انگلستان کے وسط میں لندن سے کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر ایک دارالعلوم ظہور میں آیا۔ جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر سوسائٹی میں تمام دارالعلوم مذہبی جذبہ کے ماتحت قائم ہوتے رہے ہیں، یہ علمی ادارہ بھی مذہبی تحریک ہی کے زیر اثر قائم ہوا۔ دینیات کے طلباء نے آپس میں مل جل کر پڑھنا شروع کیا اور کالجوں کی بنیاد پڑی، کیونکہ کالج کے معنی ہی "آپس میں مل جل کر پڑھنے کی جگہ" کے۔ بہت سے کالجوں کے مجموعہ کو یونیورسٹی کہتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر قسم کے آدمی اکٹھے ہوتے اور علم کی تہ کو پہونچتے تھے۔ نصب العین ہر ایک کا ایک ہی ہوتا تھا یعنی انسان کے ماحول (روحانی اور مادّی) کو سمجھنا اور اسی سلسلہ میں خدا کا عرفان حاصل کرنا۔ معرفت کائنات ہی کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ذرّہ ذرّہ میں اسی کی قدرتِ کاملہ جلوہ گر ہے اور اسی کی قوت ہر شے میں جاری وساری اور رواں دواں ہے۔

کالجوں کی بنیاد مذہبی اور دولتمند آدمیوں نے ڈالی۔ ان کے واسطے اراضیات وقف کی گئیں۔ بعض صورتوں میں تو پورے پورے گاؤں دیدیئے گئے جن کی آمدنی ان کی برقراری کے لئے ہمیشہ کے واسطے کافی ہو سکتی تھی۔ بعض کالجوں کے اوقاف میں عام کارخانے، شراب کے کارخانے، پرانے کاروبار میں حصے اور سرکاری ہنڈیاں تک شامل ہیں۔ گویا ہر کالج کے پاس اپنا ذاتی ذریعہ آمدنی موجود ہے جو اس کی کفالت کے لئے کافی ہے۔ کالجوں کے رفقا Fellows چلاتے ہیں جن کو عرفِ عام میں "ڈون" Don بھی کہتے ہیں۔ "ڈون" لاطینی خطاب ڈومینس Dominus سے نکلا ہے۔ یہی اساتذہ اوقاف کا انتظام کرتے ہیں، خالی جگہوں کو آپس کے انتخابات کے ذریعہ پُر کرتے ہیں، انڈر گریجویٹوں کو بھرتی کرتے ہیں اور وظائف تقسیم کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں کالج کی حیثیت بالکل آزاد، ممتاز اور خود مختار ہوتی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی کوئی ایک عمارت نہیں ہے بلکہ یہ ان تمام کالجوں پر مشتمل ہے جو اپنی اپنی گنتی کے مطابق کونسل کے لئے ممبرں کو بھیجتے ہیں۔ یہ اراکین مجلس تمام کالجوں کی پڑھائی میں ایک سلسلۂ ربط پیدا کرتے ہیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے نافذ کردہ قوانین کی پابندی کی جا رہی ہے یا نہیں۔ افسران کا تقرر کرتے ہیں۔ مضامین کے مختلف شعبہ جات کے لکچروں میں تنظیم و نسق قائم رکھنے کے واسطے ہر کالج سے لکچرار (اساتذہ) منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے لکچروں کا اعادہ نہیں ہوتا اور اساتذہ کو بھی اپنے مطالعہ کے لئے کافی وقت اور فرصت مل جاتی ہے۔ ایک ہندوستانی یونیورسٹی میں (جو لندن یونیورسٹی کی طرز کی ہوتی ہے) اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ موخرالذکر یونیورسٹیاں دراصل گنجینۂ علوم اور گہوارۂ فنون ہیں۔ ان میں امتحانات کو محض ضمنی اور ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ آکسفورڈ میں انڈر گریجویٹ اچھا خاصا ماہر تفریح ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت وہاں ایک فرماں بردار اور بے زبان کی سی ہوتی ہے۔ یہی وہ تازہ واردانِ کالج ہوتے ہیں جن میں سے اساتذہ Tutors بعض کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کر لیتے ہیں تاکہ ان کے بعد وہ تحصیلِ علم، تلاشِ حسن اور طلب پاکبازی میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ آکسفورڈ کا "ڈون" یا استاد ہی وہ ہستی ہے جس کی تربیت کے لئے آکسفورڈ نے اپنا دامنِ عطوفت کشادہ کر رکھا ہے۔ درحقیقت "ڈون" آکسفورڈ کا لختِ جگر یا چہیتا بچہ ہوتا ہے۔

آکسفورڈ میں آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی صحیح معنوں میں طالب علم ہے تو وہ یقیناً علم حاصل کرے گا۔ اگر کوئی بدشوق ہے تو وہاں بھی وہ وقت ہی ضائع کرے گا، مقرر کو اپنے سننے والے پیدا کرنے میں دقت نہ ہوگی، شاعر پوری آزادی کے ساتھ مشقِ سخن کر سکتا ہے اور موسیقی کا دلدادہ بغیر کسی کی خلل اندازی کے خوب گا اور بجا سکتا ہے۔ بعض خلل اندازوں کی بعض صورتوں میں کچھ عرصہ کے لئے تخفیف کر دی جاتی ہے اور کبھی کبھی ان کو بالکل ہی یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے لیکن بالعموم خوش مزاج لوگ خوش رہ سکتے ہیں، محنتی خوب پڑھ سکتے ہیں اور بے فکروں پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے مل جل کر اور کالج میں آزادانہ زندگی گزار کر (کیونکہ وہاں کے ضابطہ کی حدبندیاں محض برائے نام ہوتی ہیں) ہر گریجویٹ صحیح اور اصلی معنوں میں تعلیم یافتہ ہو جاتا ہے۔ اس کا دیہاتی پن اور بدسلیقگی جاتی رہتی ہے اور دوسروں کے جذبات اور معتقدات کی پاسداری کرنی آ جاتی ہے۔ نہ وہ دوسروں کو پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ اُن سے گریزاں رہتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ ایک مہذب اور شریف آدمی بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ وقت آ پڑنے پر بھی سختی اور سنگدلی نہیں دکھا سکتا۔ وقت پر وہ ایسا بھی کرتا ہے لیکن ایسی صورت میں بھی فطری شائستگی کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے اخلاق و آداب محض ظاہری ڈھکوسلا نہیں ہوتے بلکہ دراصل اس میں ضبط اور تحمل کا وہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو تہذیب کی جان ہے۔ اس کی شائستگی اور خوش خلقی فطری اور اصلی ہوتی ہے۔ تصنع اس میں نام کو نہیں ہوتی۔ یہ خوبی پیدا ہوتی ہے ہر مزاج اور ہر طبیعت کے آدمی کے ساتھ اس کالج کی چار دیواری میں رہ کر جو زمانۂ وسطیٰ کی خانقاہوں کی وضع کا بنا ہوتا ہے، جس کے دامن صحن پر سبزہ لوٹتا ہے، جہاں کمرے ایسے ہیں جیسے اندھیرے حجرے اور جن میں

ایس وی-ایس چاری

کھانے کا کمرہ ایسا ہوتا ہے جیسا کوئی خیرات خانہ۔ اس میں انتظام کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لوگوں پر بغیر غصے کے قابو پا سکتا ہے اور بغیر اختلاف رائے کے ان کو اپنا ہمنوا بنا سکتا ہے۔

آکسفورڈ میں شہر اور یونیورسٹی ایک دوسرے میں بالکل مدغم ہیں۔ پرانے کالج شہر کے وسط میں ایک دوسرے سے بالکل پیوستہ ہیں۔ کالجوں کے بیچ میں جو جگہیں خالی تھیں ان میں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھل گئی ہیں۔ پرانی عمارتوں کی دیواریں شہر کے شور و شغب کو یونیورسٹی سے دور رکھتی ہیں۔ کالج کے دروازے میں داخل ہوتے ہی انسان ایک عہد قدیم میں پہنچ جاتا ہے۔ صحن کیا ہیں سبز مخمل کے فرش ہیں جن کو دیکھ کر ہی وہ نشاط اور راحت حاصل ہو جاتی ہے جو سمرقند اور بخارا کے سحر خانوں میں بھی شاید میسر آسکے۔ دیواروں پر عشق پیچاں لپٹا ہوا ہے اور ان پر وہ سکون رقص کناں رہتا ہے جس کا اثر اس کالج کے باسیوں کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات اجتماع ضدین معلوم ہوتی ہے لیکن ہے یہ حقیقت کہ شاہ بلوط سے مزین و آراستہ کمروں میں انڈر گریجوٹ جو رنگ رلیاں اور شور و غل مچاتے ہیں وہ اس متانت اور سنجیدگی پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہیں ہوتا جو مدت العمر طلب علم میں کھوئے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

پہلے زمانہ میں کالجوں میں ایسے طلباء کا داخلہ ہوا کرتا تھا جو ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہوتے تھے لیکن اب داخلہ کی عمر تقریباً سترہ سال ہے۔ ذرا زیادہ عمر کے رنگروٹ نئے نئے مذاق اور مشاغل اپنے ساتھ لائے۔ ان نوجوانوں نے نئی نئی سوسائٹیاں (سیاسی، ادبی، سائنسی، فنی، ڈرامائی، موسیقی اور فلسفہ کی) قائم کیں اور نئی نئی سرگرمیاں دکھائیں۔ ان پر یونیورسٹی کے قوانین کی رو سے نہ کوئی پابندی عائد کی گئی اور نہ ان کی کوئی نگرانی ہوئی۔ طرح طرح کے کھیل منظم طریقہ پر کھیلے جانے لگے جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر کشتی کی دوڑ ہے جو آکسفورڈ اور کیمبرج کے درمیان ہوتی ہے۔ یہاں ہوا بازی وغیرہ کے کلب بھی ہیں۔ ہر وہ کھیل جو دنیا میں کھیلا جاتا ہے یہاں بھی کھیلا جاتا ہے۔ آکسفورڈ کا انڈر گریجوٹ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ہر کام میں دلچسپی لیتا ہے۔ لائبریری کے پر خاموش اور سکوت پرور ماحول سے لے کر خوش باش زندگی کے تمام لہو و لعب سے گزر کر وہ ایک صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ انسان بن کر نکلتا ہے۔ اس کو اپنی خوابیدہ قوتوں اور پوشیدہ صلاحیتوں کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ ان کو بیدار اور اجاگر کر دیتا ہے۔ تعلیم کا مقصد اور نے بھی شاید یہی ہے۔

یہاں طلباء کا اجتماع صرف اہل انگلستان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہاں ہر نسل اور قوم کا نمائندہ موجود رہتا ہے۔ غیر ملکیوں میں ہندوستانیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جنگ سے پہلے آکسفورڈ میں ہندوستانی طلباء ایک سو چالیس سے زیادہ تھے۔ بتیس کالجوں میں سے شاید ہر ایک میں کم از کم ایک ہندوستانی طالب علم ضرور تھا اور بعض میں تو (مثلاً بلیول کالج میں) نصف درجن سے تھے۔

آکسفورڈ کے ہندوستانی طلبا کی ایک اپنی سوسائٹی ہے جس کا نام "آکسفورڈ مجلس" ہے۔ اس کے ممبر ہندوستان کے مختلف حصوں کے باشندے ہوتے ہیں لیکن ان میں کسی قسم کا امتیاز اور افتراق نہیں ہوتا۔ مجلس کے عہدہ داروں کا انتخاب رایوں سے ہوتا ہے جیسا کہ جمہوریت کا قاعدہ ہے مگر ہندوستانی طلبا صرف اپنی ہی سوسائٹی میں گم نہیں رہتے بلکہ ہر قسم کے کھیلوں میں حصہ لینے کے علاوہ وہ ہر سیاسی اور ثقافتی سوسائٹی میں شریک رہتے ہیں۔ "آکسفورڈ یونین" برطانیہ کے بڑے بڑے مصنفوں کی تربیت گاہ کہلاتی ہے۔ دو ہندوستانی طالب علم اس یونین کے صدر رہ چکے ہیں۔ مجلس نے آکسفورڈ میں ہندوستان کو ایک بڑی حد تک روشناس کرا دیا ہے۔ اس نے ظاہر کر دیا ہے کہ ہندوستانی کس چیز کی زیادہ قدر کرتے اور کس بات کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مجلس نے ہندوستانی کھیلوں کی نمائش کی اور ہندوستانی فنون، نقاشی، فلسفہ اور سیاست پر تقریریں کرائیں۔ سربرآوردہ ہندوستانیوں کو مدعو کیا گیا کہ وہ بشمار انگریز طلبا کے جلسوں میں تقریریں کریں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سیاحت کا سب سے اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ انسان جس ملک میں جائے اس ملک کے دامن کو معلومات کی دولت اور ہمدردی کی نعمت سے بھر دے۔ میرا خیال ہے کہ پرانے وقتوں کے لوگوں میں یہ بات بڑی عقلمندی کی تھی کہ وہ اس شخص کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے جو سیر و سیاحت کرتا اور دولت علم خود بھی حاصل کرتا اور دوسروں کو بھی بخشتا۔ تجارت اصولی اور بنیادی طور پر ہی خود غرضانہ چیز ہے جو ہندوستانی طلباء آکسفورڈ جاتے ہیں (خواہ مرد ہوں یا عورت) ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کا علم ان میں سے اکثر کو ہوتا ہے لیکن ہونا چاہیئے سب کو۔

کسی ایک کالج کو دوسرے کالجوں پر ترجیح دینا ناانصافی کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر کالج کا (رنگ کی طرح) ایک زمانہ ہوتا ہے لیکن جو شخص آکسفورڈ میں رہ آیا ہے اس کے لئے اس کا کالج ہی (اس کی ماں کی طرح) سب سے زیادہ پیارا اور اچھا کالج ہے۔ استاد اپنے شاگرد پر نگرانی ضرور رکھتا ہے۔ لیکن کسی کام میں دخل نہیں دیتا۔ وہ شاگرد کی تمام حرکات و سکنات کو بھیتا ہے اور کوشش یہ کرتا ہے کہ اس کے لوح دماغ پر اپنے بہترین نقوش ثبت کر دے۔ لیکچروں میں حاضری ضروری نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ حاضرین کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑا کمرہ بھی ناکافی معلوم ہوتا ہے اور بعض دفعہ مشہور ترین استاد کا لیکچر بھی صرف ایک طالب علم ہی سنتا ہے۔ شاگرد کو اپنے لئے استاد خود انتخاب کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اگر وہ چاہے تو شفیق استاد اس کی ہر طرح کی مدد کے لئے بخوشی حاضر رہتا ہے۔

ایک انڈر گریجویٹ کو گریجویٹ ہونے میں عام طور پر تین سال لگ جاتے ہیں ان تین سالوں کے نو حصے ہوتے ہیں۔ پہلے دو برس تو طالب علم کالج میں رہتا ہے لیکن تیسرے سال علیحدہ مکان میں۔ دن کا پہلا حصہ نو یا دس بجے سے ایک بجے تک طالب علم لائبریری میں گزارتا ہے یا لکچر سننے جاتا ہے۔ سہ پہر کسی کھیل میں گزرتا ہے۔ اس کے بعد شام کو طالب علم اپنے اپنے کمروں میں کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں۔ کھانا تمام طلباء ایک ساتھ ایک ہی ہال میں کھاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لوگ یا تو مختلف سوسائٹیوں میں چلے جاتے ہیں، یا مطالعہ میں مشغول ہو جاتے ہیں، یا ساتھی طلبا یا استادوں سے گپ شپ کرنے لگتے ہیں، یا تفریحی جلسوں میں چلے جاتے ہیں، یا کالج کے خوبصورت میدانوں میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ عام طور پر ایک انڈر گریجویٹ اپنے زمانہ میں ان میں سے ایک شغل کر لیتا ہے۔

معاف کیجئے گا میں یہ مضمون، کچھ اپنے بارے میں کہہ کر ختم کر رہا ہوں کیونکہ دل نہیں مانتا کہ آکسفورڈ کا ذکر کروں اور اپنی خوشہ چینی کا تذکرہ نہ کروں۔ میں اس درسگاہ کے خوانِ یغما کا زلہ ربا ضرور رہا ہوں لیکن میں نے نہ تو تاخت و تاراج سے کام لیا ہے نہ کسی اور کو محروم کیا۔ میگڈالن کے مرغزار جن میں ہرن کلیلیں کرتے پھرتے ہیں، وہ باغات جن کے دامن میں دریا بہتے ہیں - وہ سایہ دار کنج اور روشیں جو ہر موسم میں ایک نئی آن پیدا کرتی ہیں، اور وہ مینارے جو ابر آلود بادلوں میں ناچتا ہوا نظر آتا ہے اور جس کے تصور ہی سے خود میری روح رقص کرنے لگتی ہے —— ان سب چیزوں کا حسن میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنے گورو کے جذبۂ ہمدردی اور بے لوث خدمتِ خلق کے مادہ سے بھی میں، اپنے دامن کو پُر کر کے لایا ہوں۔ خیر خواہی اور ایثار کے وہ خیالات اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے وہ اضطراب جو اس زمانہ میں میری روح میں جاری و ساری رہتا تھا آج بھی میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ اس زمانہ میں مستقبل کا فکر ایک لمحہ کیلئے بھی مجھکو نہ ستاتا تھا۔ امیدو بیم اور تلاشِ معاش کے جھگڑے اور جنجال سے کالج کی چار دیواری مجھکو محفوظ کئے ہوتے تھی۔ تین سال تک میں اپنے تئیں زندگی کے دوسرے مستقل حقائق کے سپرد کئے رہا۔

آج مجھکو صرف یہی ایک ڈر ستاتا ہے کہ مبادا آکسفورڈ میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہو۔ کیا اس کے کنج چمن اب بھی پہلے ہی جیسے شیدائیوں سے معمور و آباد ہیں یا اب وہاں ان لوگوں کا گزر ہو گیا ہے جو آکسفورڈ کو دنیوی اعزازات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے اور ایسی مشین خیال کرتے ہیں جسمیں سائنسی اور میکانکی معلومات ڈھالی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جنگ سے پہلے کے زمانہ کی طرح اب بھی آکسفورڈ کی فضا دنیوی طمع سے مبرا اور آزاد ہو۔ میری خواہش ہے کہ آج بھی وہاں کے کالجوں، کمروں، لائبریریوں، مخملیں سبزہ زاروں اور حسین کنجوں میں اسی سکون کا دور دورہ ہو جو باقی دنیا میں تعمیر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ آکسفورڈ کی تعریف ہی آن مجھو پسند ہے

غزل

بجا کہ ہے پاس حشر ہم کو، کریں گے پاس شباب پہلے
حساب ہوتا رہے گا یارب ہمیں منگا دے شراب پہلے!

فضائے نخب ہنس کے جگمگا گئی وہ نازنیں صبح بن کے آئی
ہوا ہے روشن مرے شبستاں میں چاند سے آفتاب پہلے!

زباں پہ آیا نہ حرفِ مطلب کہ کہہ گئیں کچھ شریر نظریں
سوال کرنے نہ پائے ہیں ہم کہ مل گیا ہے جواب پہلے!

جناں میں پہلے پہل پیئے گا تو لڑکھڑاتا پھرے گا زاہد
سرورِ کوثر کی ہے اگر دھن جہاں میں پی لے شراب پہلے!

ہے خسروِ عشق کا یہ فرماں کہ دل لگانا نہیں ہے آساں
جسے ہو کوئے بتاں کا ارماں، وہ کو بکو ہو خراب پہلے!

یہ کس کے رنگِ رُخِ بہاریں نے بخشدی ہے لطافتِ نو
شگفتہ ہوتا نہ تھا گلستاں میں اس ادا سے گلاب پہلے!

غم و الم ہوں کہ رنج و حسرت اٹھاؤں گا سب کے رُخ سے پردے
مگر قسم ہے دلِ حزیں کی، اٹھاؤ تو تم نقاب پہلے!

الٰہی وہ بوئے پیرہن سے بھی پہلے ہو ہمکنار آکر
چمن میں ہوتا ہے جلوہ افروز پھول سے ماہتاب پہلے

نگاہِ ساقی کی مسکرائی کہا جب اختر نے ضد سی کر کے
پئیں گے پیتے رہیں گے میکش مگر یہ خانہ خراب پہلے

اختر شیرانی

ضروری

آجکل کا سالنامہ ۱۹۴۶ء آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اگر آپ یا آپکے احباب سالنامے کی مزید کاپیاں خریدنی چاہیں تو ۱۲ آنے فی کاپی کے علاوہ تین آنے کی رقم برائے رجسٹری بھی روانہ فرمائیں تاکہ راستے میں ان کے گم ہو جانے کا اندیشہ نہ رہے۔

قارئین کرام سے یہ بھی استدعا ہے کہ وہ اسکا مطالعہ کرنے کے بعد جملہ مضامین نثر و نظم اور تصاویر کی بابت اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمائیں:—— ادارہ

احمد شاہ ابدالی کی پشتو شاعری

احمد شاہ ابدالی کے نام نامی اور تاریخی اہمیت سے کون ناواقف ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس بات کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ یہ اولوالعزم فاتح ایک فاضل ادیب اور جید اور خوش فکر شاعر بھی تھا۔ اس کا پشتو کا دیوان تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ پشتو کے علاوہ اس کا عربی کا منثور اور منظوم کلام بھی ہے جس کی شرح اس کے ایک ہمعصر ادیب محمد غوث ابن ترکمان ابن تاج خاں نے فارسی میں لکھی۔ یہ شرح "شرح الشرح" کے نام سے موسوم اور دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ افغانستان میں موجود ہے۔

پشتو کے دیوان میں غزلیں ہی نہیں بلکہ رباعیات، قطعات اور دیگر اصناف شعر بھی ہیں۔ یہ دیوان بہ اعتبار فکر و بیان پشتو ادب کا بہترین سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں خوشحال خان خٹک کا قومی جوش اور رحمان بابا کا تصوف دونوں موجود ہیں۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کا تصوف ایرانی نہیں رومی ہے۔ مایوسانہ اور راہبانہ نہیں، عزم انگیز اور مجاہدانہ ہے۔ اس کی شاعری کشمکش، خودداری، آزادی اور مساوات کے جواہر پاروں کی حامل ہے۔

نیک عمل:

تولہ یو دی کہ غلجی دی کہ ابدال — بنہ ھغہ چہ ئے نیبہ دزړہ صفا دہ
چہ عمل ئے د نیکئ وی میړہ ھغہ — کہ اغوستے ئے کالہ دخامتا وہ

ترجمہ۔ غلجی ہوں یا ابدالی سب برابر ہیں۔ اچھا وہ ہے جس کا دل صاف ہو جس کا عمل اچھا ہے وہی کامیاب ہے خواہ وہ کھردرے موٹے کپڑے ہی پہنتا ہو۔

جدوجہد:

بے زحمتہ راحت چیرے مونہ لشی — د احمد شکہ پہ ھر لوری غزا دہ

ترجمہ۔ احمد، زحمت کے بغیر راحت نہیں مل سکتی۔ اسی لئے زحمت کا جہاد ہر جگہ کامیاب رہتا ہے۔

قربانی:

احمد شاہ ھغہ لتہ جوړ پہ سر زیئ دہ — د لوړ تیا خرہیلی کوہ لہ دیہ بازارہ

ترجمہ۔ اے احمد شاہ دنیا کے بازار میں سب سے قیمتی چیز سرفروشی ہے۔

حریت:

راتہ یو دی بحر و بر — کہ خہ سمہ دہ کہ غر
پہ ھمت بہ ئے تسخیر کړم — شاھانہ پہ شان و فر

ترجمہ۔ میرے لئے سمندر، خشکی، میدان اور پہاڑ سب برابر ہیں۔ میں سب کو اپنی ہمت کے زور سے اور شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ فتح کروں گا۔

چہ برکړے م خدای لاس پہ رقیبانو — تر بہ زہ د ھند پہ لوری پہ تماشہ زم
چہ د ھند د ملکو نتح م ردزی شوہ — نو ایران لرہ بہ توغ بہ نغارہ زم

ترجمہ۔ اب جب کہ خدا کے فضل سے دشمن کو نیچا دکھا چکا ہوں، میں ہندوستان کی طرف توجہ کروں گا۔ جب ہندوستان فتح کر لوں گا تو طبل و نقارہ کے ساتھ ایران کا رخ کروں گا۔

سپہ گری:

پہ بریښنا د تورے تیر کوہ احمدہ — د بری جولان پہ لوی دھر دیار کړہ

ترجمہ۔ اے احمد، تلوار چمکاتے ہوئے زندگی گذار اور ہر ملک میں کامیاب چل۔

غیرت:

پہ ننگ مرخو خہ مرنہ دے — دبے ننگہ ژوند جفا دہ
لاس بہ وانخلم لہ ننگہ — کہ بے ننگ پاتے دنیا دہ

ترجمہ۔ غیور کی موت موت نہیں۔ بے غیرتی کی زندگی بہت سخت ہے۔ جان جائے، مگر غیرت کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔

وفا:

مرگے بند دے پہ دنیا کښ — نہ چہ خوک نشی باوفا
سر پہ تیغ پریکړے بنہ دے — تر بے پتہ پہ دنیا

ترجمہ۔ بے وفائی سے موت بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ بے وفا کو زندہ رہنے دیا جائے اس کا سر تلوار سے اڑا دینا چاہیے۔

حب وطن:

ستا دعشق لہ دیوہ ک شو ځگرونہ — ستا پہ لارکښ بائیلی ځلمی سرونہ

ترجمہ۔ تمہاری (وطن کی) خاطر جگر ریزہ ریزہ خون ہیں اور تمہارے لئے نوجوان اپنا سر قربان کرتے ہیں۔

کہ ھر ځوم د دنیا ملکونہ د ډیر شی
خو ما نہ ھیر لشی دا ستا ښکولی باغونہ

ترجمہ۔ خواہ دنیا کے بے شمار ملک میرے قبضے میں آ جائیں۔ لیکن میں تیرے (وطن کے) دلکش گلستانوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

عبدالرؤف خان

دَ دہلی تخت ہیرومہ چہ را یاد کرم
ځما دښکلی پښتو نخوا دغرو سرونہ

ترجمہ۔ جس وقت مجھے وطن کے پہاڑوں کی چوٹیاں یاد آتی ہیں۔ میں دہلی کا تخت بھلا دیتا ہوں۔

قومی تفاخر:

دَ رقیب دژوند مناح بہ تار پہ تار کڑی
چہ پہ تورو پښتانہ کڑہ گذارونہ

ترجمہ۔ دشمن کی زندگی کا سرمایہ تحس نحس ہو جاتا ہے۔ جب پشتونوں کی تلواریں چلنے لگتی ہیں۔

دَ فرید او دَ حمید، دور بہ بیا شی
چہ زہ وکا ندم پہ ہر لوری تاختونہ

ترجمہ۔ جب میں ہر طرف اپنے حملے شروع کروں گا تو "فرید" (شیر شاہ) اور "حمید" (سلطان سمید بودھی) کا دور پھر سے زندہ ہو جائیگا۔

—— احمد شاہ ابدالی کا یہ خداداد ملکہ اس کی اولاد کو بھی ورثہ میں ملا۔ اس کا بیٹا اور جانشین تیمور شاہ بھی نغز گو فارسی شاعر اور صاحب دیوان تھا اور اس کی شاعری سے متعلق میرے دوست مدیر "آجکل" کا مضمون "افغانستان کا ایک سخنور بادشاہ" کے عنوان سے آجکل میں شائع ہو چکا ہے۔ تیمور شاہ کا بیٹا شاہ شجاع الملک بھی بہت اچھا فارسی کا شاعر تھا۔ امید ہے دواستی صاحب اس بادشاہ کے کلام کو بھی قارئین آجکل سے روشناس کرائینگے ؛

غزل مسلسل

برق موسوی

آکر اک عمر سے ویران ہے میرا پہلو — مجھ کو سنسان نظر آتی ہے دنیا ہر سو
کل جو آنکھوں میں جھلکتی تھی مسرت کی شراب — آج ان آنکھوں سے رستا ہے تمنا کا لہو
کل حمائل تری بانہیں تھیں مری گردن میں — آج طوقِ غم و اندوہ ہے اور میرا گلو
چاک ہے دامنِ دل دست تغافل سے ترے — رشتۂ مہر سے فرما مرے دامن کا رفو
مجھ سے مانوس ہوئے میرے پریدہ طوطے — رام ہو جا کبھی اے میرے رمیدہ آہو
آنکھوں آنکھوں میں پلادے مجھے الفت کی شراب — مست کردے مجھے بے واسطۂ جام و سبو
آ ادھر اسطرح اٹھادے مری نظروں کے حجاب — تیرا جلوہ نظر آنے لگے مجھ کو ہر سو
آکہ میں سورۂ یوسف کی تلاوت کروں — مصحفِ رخ ہو ترا، رحل ہو میرا زانو
جذب کرلے مجھے اسطرح سے اے حسن تمام — یعنی مَیں مَیں نہ رہوں بلکہ میں ہو جاؤں تو

تیرے پانے کے لئے سہل ہے سب کچھ کھونا
مجھ کو اپنی بھی ضرورت نہیں مل جائے جو تو

قفس

موہن سنگھ دیوانہ

اللہ لڑ رہے ہیں قفس میں دو مرغ زار
قسامِ آب و دانہ کیسا چپکے سے کہہ گئے

گھر کر گئی ہے آہ غلامی کچھ اس قدر
آزادیوں کے خواب بھی آنے سے رہ گئے

کیا اپنے چار تنکوں کا افسوس کیجئے
طوفاں وہ تھا کہ جس میں بہت قصر ڈھہ گئے

ہم کیا کہیں کہ ہجر میں کٹتی ہے کس طرح
جی ہلکا ہو گیا جو نہی دو آنسو بہہ گئے

تسلیم دوستی تھی یہ کچھ بزدلی نہ تھی
قہرِ خدا سمجھ کے ترا ظلم سہہ گئے

شوق دیدار

مجھ کو تو ہے یہی ہوس، مجھ کو تو ہے یہی جنوں
تو مرے سامنے رہے میں تجھے دیکھتا رہوں

دیکھ کے تجھ کو شوقِ دل اور بھی ہو گیا فزوں
ہو گئی اس سے مشتعل اور بھی آتشِ دروں

یہ تو بتا کہ ہے تری جلوہ گری میں کیا فسوں
دل ہے اسی سے بے قرار دل کو اسی سے ہے سکوں

یہ جو ہے لذتِ نظر لحظہ بہ لحظہ بیشتر
ہے ترے حسن کا اثر یا مرے شوق کا فسوں

جلوہ بے دریغ سے تو جو نواز دے مجھے
میں بھی نگاہِ شوق سے حسن کا حق ادا کروں

دیدہ و دل نہ ہوں اگر دید سے تیری بہرہ ور
دل کو لئے پھروں کدھر ذوقِ نظر کو کیا کروں

سب کی ملامتیں سہے پھر بھی اسد یہی کہے
تو مرے سامنے رہے میں تجھے دیکھتا رہوں

اسد ملتانی

جزائر بحرالکاہل کا تیل

تیل زیادہ تر سخت چٹانوں کی تہوں کے درمیان بیٹھی ریت میں پایا جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے تین خاص خطے ہیں۔ پہلا خطہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے وسط میں واقع ہے، اور بحیرۂ روم کے ممالک یا مشرق وسطیٰ کا خطہ کہلاتا ہے۔ دوسرا خطہ خلیج میکسکو اور بحیرۂ کیریبین کے اردگرد کا ہے۔ یہ قریب قریب جنوبی امریکہ کے شمالی ساحل سے شروع ہو کر ممالک متحدہ امریکہ کے وسط تک جاتا ہے۔ تیسرا خطہ جنوب مشرقی ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان واقع ہے۔ اس میں بورنیو، سراوک، جاوا اور نیو گائنا کے جزیرے شامل ہیں جہاں تیل نکلتا ہے۔

رقبے کے لحاظ سے تو تیسرا خطہ ان تینوں میں سب سے وسیع ہے لیکن اس میں تیل کی پیداوار سب سے کم ہے جبکہ پہلے دو خطوں کی پیداوار بالترتیب چھتیس کروڑ اور ڈیڑھ ارب پیپے ہے۔ تیسرے خطے میں صرف پانچ کروڑ پیپے تیل نکلتا ہے۔

بحرالکاہل کے جزیروں میں تیل کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہالینڈ کے مقبوضہ جزیرے سماترا، جاوا اور بورنیو ہیں اور ایک حد تک سیرام۔ ان سب سے ہر سال ستر لاکھ ٹن تیل نکلتا ہے۔

برطانوی بورنیو میں تیل کے کنوئیں برونی، سراوک اور لبوآن میں واقع ہیں۔ اور کچھ تیل برطانوی بورنیو کے شمالی حصہ میں بھی نکلتا ہے۔ برونی کے کنوئیں ساحل کے ساتھ ساتھ اور کسی حد تک منتشر ہیں۔ ان میں خاص تو تونگ اور بلیت کے مقام پر ہیں۔ اس علاقے میں ۵۰۰ سے زیادہ چالو کنوئیں ہیں۔ ان پر "اینگلو سیکسن پٹرولیم کمپنی" کا قبضہ ہے۔ باقی پیداوار دوسری انگریز کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔

سراوک کے کنوئیں خاص طور پر شہر میری کے قریب ہیں جو خلیج برونی سے تقریباً ڈیڑھ سو میل جنوب میں واقع ہے۔ اس علاقہ میں تقریباً بارہ سو پچاس کنوئیں ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی چالو ہیں۔ اور ہر ایک میں ہر روز ڈیڑھ ہزار پیپے تیل نکلتا ہے۔ سراوک میں ایک کمپنی "سراوک آئل فیلڈ لمیٹیڈ" کام کرتی ہے جس کا تعلق رائل ڈچ شیل کمپنیوں سے ہے۔ اس علاقے اور برونی کی کل پیداوار تقریباً ساڑھے بہتر لاکھ پیپے سالانہ ہے۔

لبوان اور برطانوی شمالی بورنیو میں تیل کی پیداوار کسی قدر کم ہے۔ لیو ٹونگ میں تیل صاف کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے جو ہر سال دس لاکھ ٹن تیل صاف کرتا ہے۔ یہ ایک نل کے ذریعہ لبوان کے کنوؤں سے ملا ہوا ہے۔

شمال میں اور جنہیں ڈوبے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیاں سمجھنا چاہئے۔ ڈچ حکومت کے ماتحت ہیں۔ اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ ان جزیروں میں تیل کی بہتات ہے یعنی ان میں سوا ارب پیپے تیل ہے جو دنیا کے محفوظ تیل کا دس فیصدی ہوتا ہے۔ پھر بھی اس علاقہ کی کل پیداوار سوا اٹھارہ ارب پیپے تیل ہے جو دنیا کی پیداوار کی ۲ء۷ فی صدی ہے۔ کل پونے تین ہزار کنوئیں ہیں جو پچھتر یا پچھتر سے زیادہ علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جن جگہوں پر سب سے زیادہ تیل نکلتا ہے وہ سماترا میں ہیں (پالمبانگ اور جامبی جنوب میں اور ضلع آچن شمال میں)۔ ان کے علاوہ مشرقی بورنیو میں بالک پاپن اور تراکان میں اور جاوا میں سماربنگ کے قریب بھی بہت تیل نکلتا ہے۔ کچھ تیل سیرام (جزائر ملکا) میں بھی نکالا جاتا ہے۔ سماترا اور جاوا میں تیل کے کنوئیں ساحل اور پہاڑ کے سلسلے کے ساتھ ساتھ ہیں اور یہ تیل صاف کرنے کے ان کارخانوں میں نلوں کے ذریعہ لے جایا جاتا ہے۔ جو ساحل کے آس پاس واقع ہیں۔

اس علاقہ میں تیل صاف کرنے کے سات کارخانے ہیں، چار سماترا میں اور تین جاوا میں۔ ان میں ہر سال ستر لاکھ ٹن کچا تیل رکھا جا سکتا ہے اور ۱۴۰۰۰۰ ٹن تیل صاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسے خاص کارخانے سماترا میں پالمبانگ اور بورنیو میں بالک پاپن کے مقامات پر واقع ہیں۔

یہ بات سترہویں صدی میں بھی معلوم تھی کہ ہالینڈ کے مقبوضہ جزائر شرق الہند میں کچا تیل موجود ہے۔ لیکن ۱۸۶۵ء تک کوئی باقاعدہ تحقیق یا ترقی نہ ہو سکی۔ اس سال ہالینڈ کے ایک انجینیر نے ثابت کر دیا کہ اس علاقہ میں تیل کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۸۸۵ء میں شمالی سماترا میں پہلا کنواں کھودا گیا۔ اس کے فوراً بعد سارے علاقہ میں بہت ترقی ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں اس کا الحاق "شیل ٹرانسپورٹ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی" سے ہو گیا۔ اس طرح تیل کی کمپنیوں کا رائل ڈچ گروہ وجود میں آیا اور اسی نے مشرق بعید میں زیادہ تیل نکالا ہے۔

ڈچ جزائر شرق الہند میں ۱۹۳۹ء میں چھ کروڑ دس لاکھ پیپے تیل نکالا گیا۔ جنگ کے زمانہ میں ان تمام جزیروں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اس لئے وہاں کے تیل کے ذخیروں کو بڑا نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں تیل کی پیداوار محض ایک کروڑ بیاسی لاکھ پیپے رہ گئی۔ جاوا میں حال میں شورش ہونے کی وجہ سے بھی تعمیری کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اب ہاں پہلے جتنا تیل نکلنے میں کچھ وقت لگے گا۔

راج نرائن گپتا

برطانوی بورنیو کو چھوڑ کر دوسرے پانچ ہزار سے زیادہ مشرقی جزائر الہند، جن میں چھوٹے سے چھوٹے جزیرے سے لے کر بورنیو تک

ڈچ جزائر شرق الہند کے بعد، جو یقیناً مشرق بعید میں سب سے زیادہ تیل فراہم کرتے ہیں، نیو گائنا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، چین، سخالین

اور جاپان کا نمبر ہے جن میں نسبتاً کم تیل نکلتا ہے۔

نیوگائنا یا پاپوا دنیا کا دوسرا بڑا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں بہت معدنی تفتیش کی گئی لیکن زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پاپوا کے علاقہ اوریما میں البتہ کچھ پتہ چلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں جب ایک کنواں کھودا گیا تو ۱۳۹۴ فٹ کی گہرائی پر ایک ریتلی شیل (پتھر) سے عارضی طور پر پٹرول بہ نکلا۔ اس کے علاوہ دلوچ نیوگائنا کے ضلع ایشیپ میں بھی کچھ ذخیرہ کا پتہ چلا ہے جہاں کئی کمپنیوں کو بہت سے حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس وقت کی معلومات سے یہ بات ظاہر ہے کہ اگرچہ مستقبل میں یہاں کافی تیل نکلنے کا امکان ہے لیکن ابھی تک اتنا تیل نہیں نکل سکا جو دوسرے ملکوں کو بھیجا جا سکے۔

آسٹریلیا میں بھی کئی سالوں سے تفتیش جاری ہے لیکن یہاں بھی نیوگائنا کی طرح کوئی خاص نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ کوئنز لینڈ کے علاقہ روما، جو برسبین کے قریب ہے اور نیولمیتھ کے قریب ترزکا میں جو نیوزیلینڈ کے نارتھ آئی لینڈ کے مغربی ساحل پر واقع ہے، کچھ تھوڑے سے پٹرول کا پتہ ضرور چلا ہے۔ لیکن دوسرے علاقوں میں ترقی کے امکانات ہونے کے باوجود، خاصکر تسمانیہ اور نیوساؤتھ ویلز میں ابتک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر بھی آسٹریلیا میں شیل کے تیل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ چار کروڑ تیس لاکھ ٹن ہوگا۔ ایک ٹن شیل میں ۳۰ سے ۵۰ گیلن کچا پٹرول ہو سکتا ہے۔ ان ذخیروں سے "نیشنل آئل کمپنی" اور "پٹرولیم شیل کارپوریشن" تھوڑا بہت استفادہ کر رہی ہیں۔

نیوزیلینڈ میں اوماٹا کے مقام پر تیل کی تفتیش عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ نیو پلیمیتھ اور کوہ پاری توتو کے مشرقی ڈھلانوں میں بھی تیل تلاش کیا گیا لیکن حاصل نہ ہوسکا۔ مترنگی نیلسن اور دادی دیماتا میں تیل نکلنے اور اس صنعت کی ترقی حاصل ہونے کے امکانات ضرور ہیں۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۲ء تک آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی کل پیداوار ۲۲۰۰۰ پیپے تھی اور اندازہ لگایا گیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں چار ہزار پیپے تیل نکالا گیا۔

چین کے شمالی علاقہ شینسی، مغرب میں زچوان، شمال مغرب میں کانسو جنوب مغرب میں کویچو اور تبت اور منگولیا کے درمیان سنکیانگ میں سینکڑوں برس پہلے پٹرول کے بہت سے سلیٹی پتھروں کا پتہ چل گیا تھا لیکن ابھی ان علاقوں میں سے کسی میں بڑے پیمانے پر تیل نہیں نکالا جا رہا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ چین میں مختلف جگہوں پر تیل کا بہت کافی ذخیرہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیچانگ ہی کے علاقہ میں ایک ہزار سے زیادہ مربع میل میں تیل موجود ہے جو کئی سالوں کے لئے دنیا کی پٹرول کی مانگ پورا کر سکتا ہے۔ زچوان اور کویچو کے صوبوں کا بھی یہی حال ہے۔ ابتک ملک میں جو کام ہو سکا ہے وہ محض ابتدائی سا ہے لیکن عنقریب ہمارے علاقہ میں بہت بڑے پیمانہ پر تیل نکالے جانے کی امید ہے۔

غزل —— شعری بھوپالی

نگاہِ منتظر میں زندگی معلوم ہوتی ہے
ابھی تاروں میں کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

جہانتک بزمِ دل میں برہمی معلوم ہوتی ہے
وہانتک زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے

حوادث میں متاعِ زندگی معلوم ہوتی ہے
مجھے یہ شمع تو بجھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

جُدائی کا اثر تنہا محبت پر نہیں ہوتا
انہیں میری مجھے انکی کمی معلوم ہوتی ہے

بھلائیں اور دیوانہ، بھلائیں اور ویرانہ
مجھے تو یہ عنایت آپکی معلوم ہوتی ہے

عجب آتشکدہ ہے ہمنشیں دنیا مرے دل کی
نہیں جلتی مگر جلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

خدا معلوم کیا سنکر اٹھا ہوں تیری محفل سے
مجھے تو ساری دنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

یہ کس نے مسکرا کے مجھ سے میرا حالِ دل پوچھا،
فضائے دو جہاں ہنستی ہوئی معلوم ہوتی ہے

کُجائی کثرتِ جلوہ کہ نظریں اب بھی پیاسی ہیں
مجھے دریا میں رہ کر تشنگی معلوم ہوتی ہے

تری نظروں کا نشتر رہ گیا ہے ٹوٹ کر شاید
کوئی شئے روح میں چبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

انہی کی یاد رہ رہ کر رُلاتی ہے مجھے شعری
ہمیشہ جن کے چہرہ پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

بحرالکاہل میں جزائر سخالین میں سب سے زیادہ تیل نکلتا ہے۔ اسکا جنوبی حصہ ابتک جاپان کے قبضہ میں تھا۔ اس علاقہ میں تیل کے کنوئیں اوکھا اور نبوداہین میں ہیں۔ اوکھا کے کنوئیں ایک نل کے ذریعہ موسکا میٹ سے ملے ہوئے ہیں۔ اس جزیرے میں سنہ ۱۹۴۰ء میں چالیس لاکھ پیپے تیل نکالا گیا۔ ایک دن کی اوسط پیداوار ۱۰،۹۶۰ پیپے تھی۔

سکھالین ہی سے ملے ہوئے وہ کنوئیں ہیں جو شمال مشرقی سکھالین سے مغربی ساحل تک پائے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہوکائیڈو سے ہوکر نیگاٹو تک چلا گیا ہے۔ ہوکائیڈو میں مسو ہورو۔ اشیکاری اور ایبوری کے کنوئیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور آخری تو بہت ہی اہم ہے۔ ہونشو کے کنوئیں ہیکی، ہی کاوا، یوری، ہیناکاوا اور تناکا وغیرہ کہلاتے ہیں۔

جزیرہ فارموسا میں بھی کچھ تیل نکلتا ہے۔ جاپان میں تیل صاف کرنے کے سترہ کارخانے ہیں جن میں سے ہر سال ۲۷،۰۰،۰۰۰ ٹن تیل تیار رکھا جا سکتا ہے اور ۸۵۰،۰۰۰ ٹن تیل صاف کیا جا سکتا ہے۔ صاف کرنے کے خاص مقامات ٹوکیو، یوکوہاما، اسیٹے، نیگاٹا اور یاماگوچی ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جاپان کے تیل کی کل پیداوار ۲۴،۴۰،۰۰۰ پیپے تھی۔ روزانہ پیداوار کا اوسط ۵،۷۸۴ پیپے تھا۔ یہ پیداوار ملک کی مانگ کا صرف ۱۰ فیصدی تھی۔ باقی تیل دوسرے ملکوں سے درآمد کیا جاتا تھا خصوصاً امریکہ سے۔ جنگ کے زمانہ میں جاپان کی تیل کی صنعت کو اتحادی بمباری کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا ہے اسلئے اب جاپان کی تیل کی صنعت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

نقد و نظر

اختر شیرانی اور کتاب منزل

حضرت اختر شیرانی فطری شاعر ہیں۔ ان کی شاعری محض گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی فرضی حیاتِ عشقیہ کی ترجمان نہیں بلکہ وہ حد درجہ حقیقت و واقعیت کی حامل ہے۔ اس میں زندگی بھرپور حرکت و عمل کے ساتھ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ حسن کی پرستش صرف حیائی نظری ۔ سے نہیں لبوں کی جنبش اور بازوؤں کی گرفت سے کرنے کے قائل ہیں کیونکہ ان کا عشق کسی بے غرض انہماک یا خود فراموش محویت کا نام نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اسے جوانی کا نشہ سمجھتے اور ہمیشہ اس کیفیت سکر سے مدہوش ہو جانے کے آرزومند رہتے ہیں۔ ان کا کلام چار جلدوں میں زیور اشاعت سے آراستہ ہو کر آسمان ادب پر جلوہ گر ہوا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب منزل نے جس کے روح رواں شیخ غلام علی اینڈ سنز ہیں، طباعت کی نفاست و پاکیزگی کا ایک اچھا معیار قائم کیا ہے۔ چاروں جلدیں ہر لحاظ سے عمدہ اور دیدہ زیب ہیں۔ خصوصاً دو رنگ کا سیدھا سادا جلد پوش اپنے خاص ڈیزائن کے اعتبار سے بہت ہی جاذب نظر ہے۔

صبح بہار یہ نظموں کا پہلا مجموعہ ہے اور دوسری بار چھپا ہے۔ اس میں عشق و محبت کے گیت گانے کے علاوہ دوسرے موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں بھی موجود ہیں۔ ہر چند وہ نظمیں بھی فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں لیکن اختر کی اصل رومانی شاعری ان میں اپنی پوری جھلک نہیں دکھاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تک شاعر کے تصورات کی دنیا کسی ایک معبود خیال سے آباد نہیں ہوئی تھی۔ ان معدودے چند نظموں کے علاوہ باقی کلام لطیف رنگینیوں کا حامل ہے۔ خصوصاً "اے عشق کہیں لے چل"۔ "ایک شاعرہ کی شادی پر" اور "بعکطوریہ میمورئل میں" ایسی نظمیں ہیں جو ہمارے ادب میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔

اخترستان یہ نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ن۔م۔ راشد صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا ہے جس کی حیثیت خود ناشر صاحبان کے قول کے مطابق مقدمے کی نہیں ہے بلکہ محض دلچسپی کے خیال سے شائع کیا گیا ہے۔ اس منزل میں پہنچے تک اختر کا عشق زیادہ پختہ ہو کر سلمیٰ کے گیت گانے لگا ہے۔ انہیں اس دیس سے جو دریائے چناب کے پار سرزمین گجرات کا ایک حصہ اور سلمیٰ کا وطن ہے، خاص دلبستگی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی تنہائی کے سوگوار لمحات میں سلمیٰ کو طرح طرح سے یاد کرتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس حصہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کے دل پر بھی سلمیٰ کا تصور اتنا گہرا نقش جاتا ہے کہ پھر اختر سے متعلق جب بھی کوئی بات سوچی جائے سلمیٰ کا خیالی پیکر اپنی جھلک ضرور دکھانے لگتا ہے۔ کیونکہ سلمیٰ نے اپنے اختر کی شاعری میں رس لیس کر شیریں۔ لیلیٰ۔ عذرا اور سوہنی وغیرہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اختر کے ساتھ سلمیٰ کا نام بھی زندہ رہے گا لیکن ممکن ہے کہ کبھی رومان پرور دماغ کچھ ایسے عشقیہ افسانے بھی گھڑ لیں جن کا اختر کی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

لالہ طور یہ نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں پروفیسر اختر اورینوی کا ایک مقالہ "اردو کی رومانی شاعری اور اختر شیرانی" بطور مقدمہ شامل ہے۔ اس مجموعہ میں خلاف توقع سلمیٰ کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ جام فنا پی کر ان کے دل و دماغ سے نکل گئی بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے خیال میں اس کی ہستی وسیع ہو کر ساری کائنات پہ چھا گئی اور جب ان کو اس کا جلوہ ہر شے میں نظر آنے لگا تو براہ راست اسے مخاطب کرنے یا اس کی یاد میں آنسو بہانے کی ضرورت نہیں رہی۔ پہلے مجموعے کی طرح اس میں بھی چند نظمیں انھوں نے اپنے مخصوص رنگ سے ذرا ہٹ کر قومی جذبات کے تحت کہی ہیں جو بجائے خود لائق تحسین ہیں۔

طیور آوارہ یہ غزلوں، رباعیوں اور گیتوں کا مجموعہ ہے جس میں خیالات کے اعتبار سے زیادہ تر قدیم اسلوب شاعری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، تاہم اچھوتے انداز بیان، نت نئی تشبیہوں اور دلنشین بندشوں کے لحاظ سے اس حصہ کلام کو بھی درجہ امتیاز حاصل ہے۔ غالباً اس میں شروع سے اب تک کی تمام غزلیں شامل ہیں، اور ان کو کسی خاص ترتیب سے جمع نہیں کیا گیا۔ لہذا ان کے مطالعے سے اختر کے بدلتے ہوئے رنگوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اختر کے گیت عام گیتوں کی طرح بے سروپا نہیں ہوتے۔ ان میں بھی شاعری کا اعجاز اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ان کتابوں میں سے صرف "طیور آوارہ" ساڑھے تین روپے میں باقی سب تین تین روپے میں کتاب منزل لاہور سے طلب کیجیے۔

ماڈرن اردو ڈکشنری یوں تو اردو میں لغت کی بہت سی اچھی اچھی کتابیں موجود ہیں لیکن ایک جلد میں شائع ہونے والی یہ پہلی لغت ہے جسے اختصار کے ساتھ جامعیت کی سند دی جا سکتی ہے۔ تلاش میں آسانی کے خیال سے لفظوں کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے کہ شروع کے نہ صرف پہلے بلکہ دوسرے حرفوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر لفظ کی بابت یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کس دوسری زبان سے اردو میں آیا یا اپنایا گیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحات کی یہ مفید کتاب صرف ساڑھے تین روپے میں بہت ہی سستی ہے۔ اس کے مرتب صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم نشتر جالندھری اور ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور ہیں۔

ادبی خطوط مصنف: سید اصغر علی اکبر آبادی (مرحوم)، ناشر: مرتضائی بکڈپو۔ بازار سیب۔ آگرہ۔ قیمت آٹھ آنے مجلد۔ یہ خطوط زبان اردو میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ شاید ان جیسی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان میں بھی

ف ۔ ح.

نہ مل سکے ہر خط حروف ابجد میں سے کسی ایک حرف کو ترک کرتے ہوئے لکھا گیا ہے یعنی انتہائی کوشش سے صرف ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں وہ مخصوص حرف شامل نہ ہو۔ آخری خط کے تمام الفاظ غیر منقوط ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس عجیب پابندی کے ہوتے ہوئے عبارت میں کسی قسم کا جھول پیدا ہونے نہیں پایا بلکہ اس کے برعکس وہ نہایت مرصع، شگفتہ اور دلپذیر ہے۔ ہر خط میں ایک اچھوتے القاب کے علاوہ ایسے برجستہ اشعار استعمال کئے ہیں جن میں وہی ترک حرف کی پابندی موجود ہے۔ نیز تمام خطوط باعتبار موضوع ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ کامیاب کوشش مصنف کی جدت طبع کے علاوہ انکی نہایت بلند ادبی استعداد پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔

...ل مصنف:۔ جناب سلام مچھلی شہری۔ ناشر:۔ ساقی بکڈپو کھاری باؤلی دہلی قیمت قسم اوّل پونے دو روپے قسم دوم سوا روپیہ۔ مجلد۔ یہ گیت فلمی گیتوں سے بھی زیادہ گھٹیا ہیں کیونکہ معدودے چند کے سوا باقی سب میں ترنم کا فقدان ہے ترکیب و بندش کے لحاظ سے اتنے معمولی ہیں کہ شاعری سے نابلد اور معمولی استعداد کا انسان ان جیسے سینکڑوں گیت کسی کاوش کے بغیر گھڑ سکتا ہے۔ بعض جگہ لفظوں کے محض الٹ پھیر اور لمبے لمبے خطوط سے سارا صفحہ بھر دیا ہے۔ چند ایسے گیت بھی شامل ہیں جو انکے ریڈیائی ڈراموں اور فیچروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ ڈرامے یا فیچر کتابی صورت میں شائع ہوں گے تو ان گیتوں کی اشاعت دوبارہ اور علیحدہ ممکن ہو جائے گی جسے غیر مناسب سمجھا جاتا۔ ابتدائی صفحات میں دیباچے کے طور پر ریڈیو کی دنیا کے ڈائرکٹر جنرل سے لے کر معمولی پروگرام اسسٹنٹ تک سب کی چاپلوسی اتنے گرے ہوئے انداز میں کی ہے کہ اس کی توقع پست ذہنیت کے کسی شاعر سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ امید ہے کہ ریڈیو کی ان معقول ہستیوں نے بھی اس بے جا خوشامد کو کسی عنوان پسند نہیں کیا ہوگا۔

...کہانیاں مصنف:۔ جناب "پریم پجاری"۔ ناشر:۔ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد۔ دہلی۔ مجلد قیمت تین روپے۔ اصل واقعات کو پوری صداقت کے ساتھ پندرہ کہانیوں میں پیش کرکے "پریم پجاری" (جناب ...یب شادانی) نے اردو کے ایوان ادب میں ایک نئے ستون کا اضافہ کیا ہے اور انہیں پڑھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعی "صداقت افسانے سے زیادہ دلکش اور تعجب خیز ہے"۔ مغربی زبانوں میں اس صنفِ ادب کی کمی نہیں بلکہ ہر زبان میں سچی کہانیوں کے رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کامیاب کوشش ہے اور ...لینار سے بھی لائق تحسین ہے۔ زبان نہایت پاکیزہ، بامحاورہ اور دلنشین ہے۔ پیش نظر کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے پچھلی تاریخ اشاعت کا لحاظ رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلا اڈیشن بہت جلد فروخت ہو گیا۔

چاند بی بی سلطان

مصنف:۔ سید وزیر حسین دہلوی۔ ناشر:۔ دکن اردو اکاڈمی۔ ادارہ تربیہ حیدرآباد۔ دکن مجلد قیمت قسم اول للعہ دوم للعہ۔ دکن کے نظام شاہی خاندان کی چشم و چراغ، وہ شہرۂ آفاق ہستی چاند بی بی سلطان کی یہ داستان حیات اردو کے نامور ادیب وزیر حسن دہلوی نے اسقدر پاکیزہ نکھری ستھری، آبِ کوثر میں دھلی، دلی کی ٹکسالی زبان میں قلمبند کی ہے کہ قصے کی لطافت و دلکشی سے قطع نظر صرف طرزِ تحریر کی شیرینی ہر پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے اور لذتِ بیان کا وہ چٹخارہ جو عرصۂ دراز سے روح کے کام و دہن کو نصیب نہ ہوا تھا اس کتاب کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ قصہ بیان کرنے میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ افسانوی اور رومانی فضا پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کی صداقت ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ نتیجہ یہ کہ دکن کی تاریخ اور اس عہد کی سیاست بھی ذہن نشین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نیز اس زمانے کے شاہی اور متعلقہ خاندانوں کی سماجی زندگی آئینہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر پہلو اور ہر اعتبار سے اس کتاب کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ اس تخلیق پر اردو کا ادب عالیہ ہمیشہ ناز کرے گا۔ یہ اصل کتاب کا پہلا لیکن اپنی جگہ بالکل مکمل حصہ ہے جس میں چاند بی بی سلطان کی شادی تک کے واقعات درج ہیں۔ باقی دو حصے زیر ترتیب ہیں۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ آخری غزل ——— حضرت فصاحت جنگ جلیل مرحوم
۲۔ کاروان امیر کا آخری مسافر ——— پروفیسر ادیب احمد ادیب
۳۔ فلمی چہرے ——— جناب سلام مچھلی شہری
۴۔ تبتی فنون ——— جناب ڈاکٹر رمنیکر
۵۔ حلیمہ نصیروف ایک تاجک ——— جناب ل۔ احمد
۶۔ قدیم ہندوستان کی بحری قوت ——— جناب شنکر دیال
۷۔ منتانی کا تبلہ (افسانہ) ——— جناب ایم۔ اسلم
۸۔ جادوی عورتیں ——— محترمہ جانی چوہان
۹۔ اقبال کی وحدت فکر (۲) ——— مولانا غلام محمد بٹ
۱۰۔ افسانہ نگار خواتین ——— جناب مظہر ممتاز
۱۱۔ یہ زندگی (افسانہ) ——— محترمہ نسیمہ سوز
۱۲۔ عالمگیر اتحاد کی طرف ——— ماخوذ

لندن سے ہوائی حملے

جب لندن کی فضا میں ہوائی حملے کے سائرن گونجتے تھے تو لوگ پناہ گاہوں میں گھس جاتے۔ لندن کے پر رونق بازار سنسان ہو جاتے اور ہوائی مار توپیں دہاڑنے لگتی تھیں۔ بموں کے دھماکوں سے فلک بوس عمارتیں خاک کا ڈھیر ہو جاتی تھیں اور ہر طرف خاک و خون کا نظارہ ہوتا تھا۔ اس شور و شغب میں غریبوں کی آہیں، بچوں کی سسکیاں اور عورتوں کا شیون کون سنتا۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم طاری ہوتا تھا۔ لیکن آغا محمد اشرف نے بموں کی بارش میں بیٹھ کر یہ عجیب و غریب کتاب لکھی جس میں ان روح فرسا مناظر کا ہو بہو نقشہ کھینچا گیا۔ اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے۔ قیمت ۱۲ر بارہ آنے

غبار خاطر

مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ معرکۃ الآراء کتاب جو آپ نے اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کی نظر بندی کے ایام میں احمد نگر کے قلعہ میں لکھی اور جس کا موصوف کے رہا ہونے کے بعد سے اب تک بے تابی سے انتظار کیا جا رہا تھا شائع ہو گئی ہے۔ "غبار خاطر" میں ہندوستان کی ناگفتہ بہ حالت اور پیچیدہ سیاسی گتھیوں کا حل ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن کے لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

دیگر مطبوعات

- واردات۔ از منشی پریم چند (افسانے) عہ
- خونی۔ از اختر انصاری (" ") ۱۲ر
- مجنوں کے افسانے۔ از مجنوں گورکھپوری (افسانے) ۲ر
- موج نیل۔ از زین العابدین (افسانے) عہ
- ماہ درخشاں بیگم احمد علی (ناول) سے
- بیوہ۔ منشی پریم چند (ناول) ۲ر
- شمع۔ اے۔ آر خاتون (ناول) صہ
- آبگینے۔ اختر انصاری (قطعات) ۲ر
- تجلیات۔ مہر عثمانی (نظم) عہ
- مسدس حالی۔ صدی ایڈیشن آرٹ پیپر ۲ر
- اردو شاعروں کا البم سے
- جمالیاتی شاعری۔ سعید انصاری (ادب) ۴ر
- خمارستان۔ آغا شاعر (ادب) ۲ر
- شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ عبد اللطیف اعظمی (ادب) عہ
- آب حیات کے لطیفے۔ محمد حسین آزاد (ادب) ۲ر
- مقالات اسلم۔ مولانا اسلم جیراجپوری (ادب) ۲ر

- نئی تہذیب نئی تعلیم۔ برکت علی فراق ۲ر
- خطبات اقبال۔ علامہ اقبال مرحوم ۸ر
- اٹھارہ مہینے ہندوستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاسی) ۸ر
- مضامین ابوالکلام آزاد (اول) (مذہب) للعہ
- مضامین ابوالکلام آزاد (دوم) (سیاسی) للعہ
- مضامین البلاغ سے
- پاکستان۔ از راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس ۸ر
- سرخ چین کا رہنما۔ از اسرار احمد (سوانح) ست
- ستالن۔ از آصف علی بیرسٹر (سوانح) لا
- کیا خوب آدمی تھا (سوانح) عہ
- لندن سے آداب عرض۔ آغا محمد اشرف (معلومات) ۸ر
- بچوں کا لندن " (" ") ۸ر
- ہوائی حملے " (" ") ۱۰ر
- خیال آفریں دماغ عرش تیموری (تمثیل) ۶ر
- حسن حسینؑ (مذہب) ۷ر
- اسلام کیسے شروع ہوا عبید اللہ سندھی (مذہب) ے

- اسلام کیسے پھیلا اول عبید اللہ سندھی (مذہب) ے
- اسلام کیسے پھیلا دوم عبید اللہ سندھی (مذہب) ۱۲ر
- سامان آخرت۔ خواجہ غلام الثقلین (مذہب) عہ

بچوں کی دلچسپ سبق آموز کتابیں

نظم

- اسلامی نظمیں۔ از شفیع الدین نیر ۱۰ر
- وطنی نظمیں " ۱۴ر
- حب وطن ۱ر، حب بی دادا ۱ر، شکوۂ ہند ۱ر
- تحفۃ الاخوان ۱ر، مناجات بیوہ ۲ر، حقوق اولاد ۳ر

کہانیاں

- چنن ملن۔ از شفیع الدین نیر ۳ر
- میاں مٹھو " " ۵ر
- ٹلو میاں " " ۵ر
- منی کا پرستان " " ۵ر
- فسانہ عجائب ۳ر، ڈاکٹر مصطفیٰ ۴ر، نئی بیاض ۴ر، ریل ۴ر
- پیا حلی موہ بچے کی جاد ۵ر، کتاب ۵ر، تاج کر ۲ر، مسولینی ۵ر

آج

اردو کا پندرہ روزہ باتصویر رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۲ | فہرست | ۱۵ جون ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر سنگھ شیدا
ایم اے
فضل حق قریشی
دہلوی
مشیر احمد
ایم اے

مصر اور نئے منصوبے

حکومتِ مصر نے بعد جنگ کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں ایک بہت بڑا خاکہ مرتب کیا ہے جس میں سماجی زندگی کے سدھار اور صحتِ عامہ کی ترقیوں کو خاص طور پر مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ توجہ غریب طبقہ کی فلاح و بہبود کے لئے مبذول کی گئی ہے۔ سلطنت کے وزیرِ اعظم صدقی پاشا اس کارِ خیر میں بذاتِ خود مصروفِ عمل ہیں اور اس مجلس کو جو مصر کے تین بڑے دشمنوں یعنی افلاس، امراض اور جہالت کے قلع قمع کرنے میں کوشاں ہے، مفید مشورے دے رہے ہیں۔ آبادی کا مشکل سے دس فیصدی حصہ تعلیم یافتہ ہے اور دیہاتی جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اکثر چند عام بیماریوں کا شکار رہتے ہیں۔ اس خاکے کے مطابق بارہ سو ایسے سماجی مرکز قائم کئے جائیں گے جہاں مائیں اور بچے نہانے اور کپڑے دھونے کی آسانیاں حاصل کرسکیں۔ صنعتی اداروں میں کام کرنے والوں کے چھ مرکز بنائے جائیں گے جن میں سے ایک قاہرہ میں اور ایک اسکندریہ میں بھی ہوگا۔ یہ مرکز کھیل کے میدانوں، تفریح گاہوں، کتبخانوں، طبی مشورہ گاہوں اور قہوہ خانوں پر مشتمل ہونگے۔ مضرِ صحت اغذیہ کی دشواریاں اس طرح دور کی جائینگی کہ ہر علاقے میں سرکاری طور پر ریستوراں کھولے جائینگے جن میں صحت و تندرستی کو ترقی دینے والی غذائیں کم قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ آوارہ گرد بچوں کا اہم مسئلہ بھی مدِنظر ہے۔ انکی فلاح و بہبود کے لئے تمام ملک میں مناسب تربیت گاہیں کھولی جائینگی۔ مزدور طبقہ کے افراد کو بلا اجرت طبی امداد اور بڑھاپے میں پنشن دینے کی تجویز بھی منظور کی جا چکی ہے۔ سفری سینما تمام ملک کا دورہ لگایا کریں گے تاکہ لوگوں کو تعلیمی اور معلومات افزا فلم دکھا کر انکی اقتصادی اور سماجی حالت کو سدھارا جاسکے۔

جاپان کے جنگی مجرم

کچھ عرصے سے جاپان کے اٹھائیس مجرمینِ جنگ کیخلاف اتحادیوں کی جنگی عدالتِ عالیہ میں سنگین مقدمات کی کارروائی زیرِ غور ہے۔ کچھ دن ہوئے ان میں سے دو مجرموں کے نام عدالت مذکور نے محض اسلئے قلمزن کر دئے کہ وہ طبی تشخیص کی بنا پر اسقدر کمزور سمجھے گئے کہ وہ مقدمہ کی پوری کارروائی اور اس دوران میں اثر انداز ہونے والے صدمات کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر متسوکا ہیں جو ۱۹۴۱ء میں جاپان کے وزیرِ خارجہ تھے اور دوسرے مسٹر اوکاوا ہیں جو پروپگنڈا کرنے والے اور نامہ نگار تھے۔ موخر الذکر کی بابت یہ امر قابلِ غور ہے کہ ایک روز جبکہ عدالت میں جنرل توجو کے خلاف لگائے ہوئے الزامات کی فہرست پڑھکر سنائی جارہی تھی تو انھوں نے اظہارِ ناراضگی کے طور پر اپنے جنرل کے گنجے سر پر ایک چانٹا رسید کردیا تھا۔ عدالت نے دو اور ایسے مجرموں کو معاف کردیا ہے جن کی عمریں اسی سال کے لگ بھگ ہیں۔

جارج کراس ایک ہندوستانی افسر کیلئے

کپتان محمود خاں درانی ریاست بہاولپور کے ایک پیدل دستے کے ساتھ ملایا میں شریکِ جنگ تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جب اتحادیوں نے ملایا کو خیرباد کہا تو کپتان صاحب سوئے اتفاق سے وہیں رہ گئے۔ جاپانیوں نے انھیں قید کرلیا اور چند راز کی باتیں معلوم کرنے کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانی شروع کیں لیکن انھوں نے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ تمام مصائب و آلام برداشت کئے اور ان باتوں کو منکشف نہیں کیا جن سے اتحادیوں کے آئندہ عزم و ارادے کا پتہ چل سکتا تھا۔ اسکے بعد آزاد ہند فوج کے سربرآوردہ لوگوں نے بھی انھیں اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کی لیکن وہ سب طرف سے دامن بچائے الگ تھلگ رہے۔ اس دوران میں انھوں نے ایسی ایسی صعوبتیں برداشت کیں کہ ان کی صحت ہمیشہ کے لئے جواب دے چکی ہے۔ انکی ہمت و مردانگی، ایثار و وفاداری اور صبر و استقلال کو مدِنظر رکھتے ہوئے جارج کراس کا مشہور تمغہ عطا کیا گیا ہے جو اس جنگ کے سورماؤں کے لئے طرۂ امتیاز ہے۔

مردہ دلوں میں زندگی کی لہر

لڑائی کے دوران میں فنی اختراعات کے ساتھ ساتھ طبی معلومات کے ضمن میں بھی نت نئے تجربات عمل میں آتے رہے۔ تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ روس کے سائنسدانوں نے چند ایسے حیات بخش عرق تیار کئے ہیں جنکے مرکب میں مردہ انسانوں کا دل اپنی ضربات کو تھوڑے عرصے تک بدستور قائم

رکھ سکتے ہیں انکی یہ مصنوعی حرکت عموماً دس اور تیرہ گھنٹے کے درمیان جاری رہتی ہے۔ یہ تجربہ ایک سو اسی دلوں پر کیا گیا۔ تقریباً پچاس صورتوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ان تجربات کے سلسلے میں بجلی کا ایک خاص مقیاس الحرکت آلہ استعمال کیا گیا جو قلب انسانی کی ہلکی سے ہلکی جنبش کو بھی محسوس کر لیتا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسطرح پیدا کی ہوئی حرکت کی مدت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہے۔ امید ہے کہ اس طرح دل کی بہت سی بیماریوں کو سمجھنے اور ان کا علاج کرنے میں کامیابی حاصل ہوگی بلکہ ایک حد تک ان اموات پر قابو پایا جا سکے گا جو یکلخت حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے واقع ہوتی ہیں۔

پارچہ بافی کی جاپانی کلیں

اس میں شک نہیں کہ جاپان سے وصول کئے جانے والے تاوانِ جنگ کی صحیح رقم کا تعین ابھی تک نہیں ہوا تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں ہندوستان کا بہت بڑا حصہ ہوگا کیونکہ اس جنگ میں ہمارے ملک نے ناقابلِ تلافی نقصانات برداشت کئے ہیں۔ حکومتِ ہند اس کوشش میں ہے کہ پارچہ بافی کی ان جاپانی کلوں کو جو اب وہاں بیکار پڑی ہیں، کسی طرح قبل از وقت حاصل کرے تاکہ ان کو استعمال میں لاکر کپڑے کی قلت کی دشواریاں دور کی جا سکیں۔ وہ کلیں فوراً ہی قابلِ استعمال نہیں ہو سکیں گی تاہم کل پرزوں کو نئے سرے سے جوڑ کر اچھی مشینیں تیار کر لی جائینگی۔ اس کے بعد جب تاوانِ جنگ کا حصہ مقرر ہو جائے گا تو ان کلوں کی قیمت محسوب کر لی جائے گی۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ نئی مشینیں جو خود جاپان میں ابتک استعمال نہیں ہو سکی تھیں، ہندوستان کے لئے حاصل کر لی جائینگی۔

افغانستان میں نئی وزارت

افغانستان کے صدرِ اعظم والاحضرت سردار محمد ہاشم خاں نے علالت کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفےٰ دیدیا۔ موصوف نے اس جنگ کے دوران میں حکومتِ افغانستان کو غیر جانبدار رکھنے میں اپنی زبردست حکمتِ عملی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کی جگہ والاحضرت سردار شاہ محمود خاں غازی صدارتِ عظمےٰ پر متعین ہوئے ہیں۔ آپ کی نئی کابینہ سردار محمد داؤد خاں (وزیر حربیہ) علی محمد خاں (وزیر خارجہ) غلام فاروق خاں (وزیر داخلہ) میر عطا محمد خاں (وزیر عدلیہ) نجیب اللہ خاں (وزیر معارف) عبد المجید خاں (وزیر اقتصادیات) سلطان احمد خاں (وزیر صحیہ) محمد کبیر خاں (وزیر فوائد عامّہ) غلام یحیٰی خاں (وزیر پوسٹ و ٹیلیگراف) غلام محمد خاں (وزیر معادن) فضل احمد خاں مجددی (رئیس مجلس اعیان) میرزا محمد خاں (وزیر دولت) اور صلاح الدین خاں (رئیس مستقل مطبوعات) پر مشتمل ہے۔ موصوف نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے وقت ایک پر جوش تقریر کی اور یقین دلایا کہ نئی کابینہ کے اراکین افغانستان کی فلاح و بہبود کیلئے کوئی امکانی کسر اٹھا نہ رکھینگے۔

شرقِ اردن میں جشن تاجپوشی

شرقِ اردن کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں ۲۵ مئی ۱۹۴۶ء کی صبح سب سے زیادہ مسعود و مبارک تھی جبکہ چونسٹھ سال بوڑھے عبداللہ ابن الحسین کے سر پر شاہی تاج رکھا گیا۔ اسوقت تک شرقِ اردن کو خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل نہیں تھی اور نہ وہاں کا فرمانروا "بادشاہ" کہلاتا تھا۔ حال ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچنے والے ایک عہد نامہ کی رو سے حکومتِ برطانیہ کے زیر سایہ اس کی مندوبیت کا دور ختم ہوگیا۔ جشن تاجپوشی کے موقعہ پر آس پاس کی عرب ریاستوں کے وزرا اور نمائندے اور حکومتِ برطانیہ کے اعلیٰ افسران موجود تھے۔ شاہ موصوف نے تاجپوشی کے بعد ایک جوشیلی تقریر میں اپنی تین لاکھ رعایا کو مخاطب کرتے ہوئے شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ شرقِ اردن کو عرب ریاستوں کے وفاق میں شامل ہوکر آگے بڑھنا پڑے گا۔ بادشاہ کی سلامی ایک سو ایک توپوں سے ہوئی اور تمام جشن نہایت شاندار اور کامیاب رہا۔

برطانوی وزارتی وفد کی سفارشات

ہندوستان کو آزادی دینے کے سلسلے میں برطانوی وزارتی وفد جس کے صدر لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند ہیں اور جس میں سر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزنڈر بھی شامل ہیں، کئی ہفتے سے ہندوستان میں مقیم ہے۔ اس دوران میں اراکین وفد نے ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں سے انفرادی اور اجتماعی طور پر مل کر کوشش کی کہ مکمل آزادی حاصل کرنے کے سلسلے میں وہ کسی ایک مرکز پر آ جائیں مگر ان میں کوئی مفاہمت ممکن نہ ہو سکی۔ اس لئے وفد مذکور نے آزادی کی راہ پر ایک درمیانی قدم اٹھایا اور عارضی حکومت کے قیام کے لئے اپنی سفارشات پیش کیں جن کی بنیادی صورت حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندوستان کی ایک یونین بنائی جائے جس میں برطانوی ہندوستان اور ریاستیں دونوں شامل ہوں اور اس کا تعلق تین امور سے ہو یعنی امور خارجہ، دفاع، اور رسل و رسائل اور ان پر کاربند ہونے کے لئے اسے مناسب اختیارات حاصل ہوں۔ (۲) اس یونین کی ایک مجلسِ انتظامیہ اور ایک مجلس مقننہ ہو جس کے نمائندے برطانوی ہندوستان اور ریاستوں سے لئے جائیں۔ جب کبھی کوئی اہم فرقہ وارانہ مسئلہ

مجلس مقننہ میں زیر بحث ہو جائے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ حاضر الاکین کی اکثریت اس کی تائید کرے۔ نیز یہ کہ اس مسئلہ پر دونوں فرقے الگ الگ اور تمام حاضر اراکین کی اکثریت اظہار خیال کرے اور ووٹ دے۔ (۳) ان امور کے علاوہ جو یونین کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں دوسرے تمام امور اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کے پاس رہینگے (۴) یونین کو تفویض کئے ہوئے امور کے علاوہ باقی تمام امور اور اختیارات پر ریاستوں کو بھی پورا پورا اقتدار حاصل ہوگا۔ (۵) مجالس انتظامیہ و مقننہ کے ساتھ مل کر گروپ بنانے کی آزادی سب صوبوں کو ملی رہیگی۔ نیز ہر گروپ ان صوبجاتی امور کا تعین کر سکیگا جن کو مشترکہ طور پر دائرۂ عمل میں لایا جا سکے۔ (۶) یونین اور گروپوں کے دستور اساسی میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اگر کوئی صوبہ چاہے تو اپنی مجلس مقننہ کے اراکین کی کثرت رائے سے یہ مطالبہ کر سکے کہ اس دستور اساسی کی دفعات پر ابتدائی دس سال کی مدت کے بعد اور اس کے بعد کے ہر دس سالہ وقفوں میں نظر ثانی کی جائے۔

ان سفارشات کا اصل مسودہ کافی طویل ہے اور اس میں ان مطالبات پر جو مسلم لیگ اور کانگریس کمیٹی نے پیش کئے تھے، سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مسودے کی ایک ایک نقل ہندوستان کی ان دو اہم سیاسی جماعتوں کے سپرد کی جا چکی ہیں تاکہ وہ غور و خوض کے بعد اظہار رائے کر سکیں۔ بظاہر ان دونوں کو ان سفارشات کے قبول کرنے میں تامل و اعتراض ہے تاہم آج یعنی ۲۷ مئی کی شام تک کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکا ہے۔

اناج کی کمی کے آئندہ چار سال

سر جان بائڈ اور نے جو ادارۂ اقوام متحدہ کے شعبۂ زراعت و اغذیہ کے ڈائرکٹر جنرل اور برطانوی پارلیمان کے رکن ہیں، ایک ملاقات کے دوران میں فرمایا "اگر ۱۹۴۷ء کی فصل تاریخ عالم میں پہلی بار حد سے زیادہ شاندار نہ ہو تو اس لڑائی میں جو وبائے قحط کو دبانے کے لئے لڑی جا رہی ہے، ہماری شکست ہو جائے گی۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اگلی فصل کی کل پیداوار بھی ساری دنیا کے باشندوں کے لئے پوری نہیں ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے قحط کے باعث بہت زیادہ اموات نہ ہوں لیکن عوام کی صحت و تندرستی کا بگڑ جانا اور محنت و جانفشانی کے کاموں کے لائق نہ رہنا یقینی ہے۔ صرف اناج کی کمی ہی سے ان مشکلات کا سامنا نہیں ہوگا بلکہ خوراک بننے والے جانوروں اور پرندوں کی پیداوار میں بھی کمی رہیگی۔ اس طرح دودھ، پنیر و انڈوں کی قلت کے باعث بھی جسمانی کمزوریوں کا مداوا نہیں ہو سکیگا۔ اگر ۱۹۴۷ء کی فصل ۱۹۴۶ء کی فصل سے بہتر رہے تب بھی کشمکش کا سلسلہ آئندہ تین چار سال تک جاری رہیگا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ کسانوں کی تباہی کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مالی اور اقتصادی نظام کا شیرازہ بکھرنے والا ہے اور اب جبکہ جنگ کی تباہکاریاں ہی اطمینان کا سانس لینے نہیں دتیں، زراعتی پریشانیوں کا بار ناقابل برداشت رہیگا۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔"

نیا دمدار تارا

روم کی مشہور پاپائی ریاست ویٹیکن کے ایک ستارہ شناس پادری یکم فروری سے برابر ایک نئے دمدار تارے کو طلوع ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ اس تارے کا نام "ٹمزر کومٹ" رکھا گیا ہے کیونکہ سب سے پہلے ٹمزر نامی ایک ولندیزی پادری نے اس کی زیارت کی تھی۔ شروع میں اس کی حرکت ایک درجہ یومیہ کے حساب عمل میں آ رہی تھی۔ ان کا قیاس ہے کہ وہ قطبی ستارے سے پندرہ درجہ کے اندر اندر پہنچ جائے گا اس وقت اسے شمالی منطقہ میں دیکھ لینا بہت آسان ہوگا۔ یہ ستارہ شناسی کیسل گنڈولفو کے قریب نئی پوپی رصدگاہ سے ہو رہی ہے جو جھیل البانو کے کنارے روم سے ۲۵ میل دور ہے۔ رصدگاہ میں ایک بہت بڑی دوربین ہے جس کا شیشہ ہر چیز کو بقدر ۸۵۷ گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ دوربین کے علاوہ ایک بہت بڑا کیمرہ اجرام فلکی کی تصویر لینے کے لئے بھی نصب ہے۔ پاپائے روم بذات خود اس نئے دمدار ستارے کی تحقیق میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ اس کا پورا ظہور کب اور کن اثرات کے ساتھ ہوتا ہے۔

ترکی میں نئی مخالف جماعت

اتاترک کے زمانے سے آجتک ترکی میں صرف ایک ہی جماعت برسر اقتدار ہے جسکا نام "ری پبلکن پیپلز پارٹی" ہے۔ اس کے صدر اعظم عصمت انونو ہیں۔ لیکن حال ہی میں ایک نئی مخالف جماعت نے "ڈیموکریٹک پارٹی" کے نام سے سر اٹھانا شروع کیا ہے۔ اس کے روح رواں ترکی کے سابق وزیر اعظم ایم جلال بیار ہیں۔ اس نئی جماعت میں صنعتی اور تجارتی اداروں کی نامور ہستیاں شامل ہیں۔ وہ حکومت ترکی کی اس اقتصادی حکمت عملی کو کہ صنعتی اور تجارتی معاملات پر حکومت کا قبضہ رہے، کسی عنوان پسند نہیں کرتیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل آزادی چاہتی ہیں۔ حکومت نے اس جماعت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے نئے انتخابات کا انتظام شروع کر دیا ہے حالانکہ اصولی طور پر ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ اکثریت ان کا ساتھ دیگی۔

آخری غزل

فصاحت جنگ جلیلؔ

کدھر چلے مرے اشکِ رواں نہیں معلوم
بھٹک رہا ہے کہاں کارواں نہیں معلوم

اٹھا کب آہوں کا دل سے دھواں نہیں معلوم
زمین ہو گئی کب آسماں نہیں معلوم

اٹھا دیا تو ہے لنگر ہوا کے جھونکوں میں
کدھر سفینہ ہے ساحل کہاں نہیں معلوم

چمن میں عمر گذاری ہے آجتک لیکن
کسی کو نام کسی کو نشاں نہیں معلوم

ہماری بیخودیٔ شوق کا یہ عالم ہے
کہ آشیاں میں ہیں اور آشیاں نہیں معلوم

فلک بھی پوچھ رہا ہے یہ لیکے انگڑائی
شبیہ کسکی ہے یہ کہکشاں نہیں معلوم

اک آہ کی تھی تہہ آشیاں بس اسکے سوا
لگی کب آگ، کب اُٹھا دھواں نہیں معلوم

عجیب رنگ سے نکھرا ہوا ان آنکھوں کا
پلا دی کس نے مئے ارغواں نہیں معلوم

پھنسا کے دام میں پیری کے بیکس و تنہا
کدھر گئی مری عمرِ رواں نہیں معلوم

جلیلؔ کر چکے پینے سے کب کے ہم توبہ
اب آئیں جھوم کے کیوں بدلیاں نہیں معلوم

تاریخ رحلت فصاحت جنگ جلیل

اعلیحضرت سلطان الشعراء سلطان دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

نشاط آور چہ جام زنجبیلے | عجب مستی بہ جام سلسبیلے
بگفت عثمان کہ او شد واصل حق | دکن گفت آہ استاد جلیلے

۱۳۶۵

ہو الباقی

سیماب اکبرآبادی

آہ حافظ جلیل احسن بھی
شاعر نکتہ سنج معانی
تھے تو مانکپوری لیکن انکو
کرلیا بادشاہ دکن نے
عمر بھر خوب داد سخن دی
رنگ اپنا نہ تا سحر بدلا
وہ قصیدوں میں رنگ تغزل
وہ سزاوار تاج سخن کے
اے زمین دکن! انجھ میں کتنے
داغ و فانی، امیر اور آزاد
اور جلیل اب ہوئے مائل خواب
ان کے آثار محفوظ رکھنا

ہوگئے عازم خلد و کوثر
جانشین امیر مطہر
کھینچ لایا دکن میں مقدر
اپنا استاد انکو مقرر
شعر کہتے رہے زندگی بھر
وضعدار ایسے ہوتے ہیں کمتر
وہ تغزل میں کیفیت اسر
لکھنؤ کے دبستاں کے افسر
ہوگئے دفن نایاب گوہر
علم و فن و ادب کے پیمبر
یہ ترا ظرف، اللہ اکبر!
ان کا حق امانت ہے تجھ پر

سال ترحیل سیماب لکھئے
تا ہر فن جلیل سخنور

۱۳۶۵

قطعۂ تاریخ

مات شیخی الجلیل فھو | کان شمسا فقد کسفا
یا کبا عام رحلتہ | قلت استاذنا اسفا

۱۳۶۵

عتیق حیدرآبادی

قطعہ فارسی

شاعر نامور جلیل حسن | کرد زیں عالم فنا رحلت
در فراقش سخنوراں غمگیں | بر فلک رفت نالۂ حسرت
سخنش بود کوثر معنی | غزلش بود زمزم لذت
بادۂ ناب شعر می نوشید | کردہ با ساغر و سبو بیعت

قیصری گفت سال پرورش
خوابگاہ جلیل در جنت

۱۳۶۵ ہجری

قیصری فیروزپوری

کاروانِ امیر کا آخری مسافر — جلیل

نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل حسن جلیل (مرحوم) امیر مینائی کے تلامذہ کی جمعیت اربعہ[1] کے ایسے فلک وقار غزل گو تھے جنھوں نے امیر کی روح شاعری کو اس اضطرابی دور میں نہ صرف قائم رکھا بلکہ داغ، جلال اور تسلیم کی شاعرانہ لطافتوں اور نزاکتوں کو بھی اجاگر کر دیا اور انھیں اضطرابی دور کے جدید رجحانات میں مدغم ہو کر فنا ہونے سے بچا لیا۔ حالانکہ اردو شاعری کا یہ دور ایسے جدید احساسات، جدید خیالات اور جدید نصب العین کا حامل ہے جن کی مقبولیت نے قدیم نظریاتِ زندگی کو ذہنی عیاشی کے مترادف قرار دیدیا ہے زندگی کی نئی قدریں آج وضاحت کے ساتھ وطنیت، قومیت اور ملت کے روپ میں پیش کی جا رہی ہیں مگر جلیل نے ابتدائے شاعری ہی سے جو نظریے قائم کرنے تھے اور جو روش اختیار کر لی تھی آخیر وقت تک قائم رہی۔ اس سے ہٹنا اور اس کو ترک کرنا انھوں نے وضعداری کے خلاف سمجھا۔ اس کو یوں کہیے کہ انھوں نے ان کی طرف رجوع ہونا امیر کی امانت میں خیانت کرنے کے برابر جانا۔ ان کو تازندگی یہ مانا رہا کہ انھوں نے امیر مینائی کی جانشینی کا صحیح حق ادا کیا چنانچہ ایک شعر میں اس کا یوں اعتراف کیا ہے ؎

شعر خوانی پہ تری سب کو گماں ہے یہ جلیل
بزم میں روحِ امیر الشعراء آئی ہے

جلیل مرحوم مینائی ضرور تھے مگر دراصل مانک پور کے رہنے والے تھے۔ جب رام پور گہوارۂ ادب تھا اور امیر و داغ کے معرکے ہو رہے تھے اسوقت جلیل نے امیر مینائی کے روبرو زانوئے ادب تہ کیا۔ شعر و شاعری کے ماحول نے بہت جلد پختہ کار شاعر بنا دیا۔ استاد کی توجہ نے ذکاوت شعری پر جلا کی۔ مشق سخن نے استادی کے درجہ پر لا کھڑا کیا۔ نواب کلب علی خاں (مرحوم) کے زمانہ تک رامپور میں بازار شاعری خوب گرم رہا۔ مگر نواب موصوف کے انتقال سے محفل شعراء درہم برہم ہوئی اور وہ بھی ایسی کہ داغ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ؎

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ
وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں کے

۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں نے رحلت کی ۱۸۸۸ء میں داغ حیدرآباد پہنچے مگر امیر ۱۹۰۰ء میں عازم حیدرآباد ہوئے ہونہار شاگرد جلیل ہمراہ گئے۔ وہاں استاد کی خدمت کی اور اپنے کلام پر اصلاح لی۔ امیر بہتر برس کی عمر میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ داغ بھی امیر کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہے ۱۹۰۵ء میں انھوں نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ حیدرآباد کی علم دوستی اور علم پروری اظہر من الشمس ہے۔ جلیل کو وہ اعزاز بخشا گیا جو داغ دہلوی کا تھا۔ میر محبوب علی خاں مرحوم سابق تاجدار دکن نے اپنے کلام پر اصلاح لے کر ان کو اپنا استاد تسلیم کیا۔ پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور جلیل القدر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ پہلا دیوان "تاج سخن" کے نام سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ دوسرا دیوان اس کے بعد قدرداں سخن کے ہاتھوں میں پہنچا۔ ہندوستان کے مقتدر رسائل و اخبارات میں کلام وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ آپ کی حالیہ بہترین غزل یہ ہے۔

نہ ستم ترا نہ کرم ترا نہ جفا تری نہ ادا تری
ہوئے جس کے ہاتھوں خراب ہم وہی چشم ہوش ربا تری
گلے شکوے کہنے کی بات ہی نہیں وجہ کوئی ملال کی
یہ کرشمے سارے ہیں عشق کے نہ وفا مری نہ جفا تری
مرے دل کو آئے قرار کیا جو نہ بھولتی ہو کسی گھڑی
وہ نظر وہ عشوہ گری تری وہ حیا تری وہ ادا تری
تجھے حسن بھی حسن پرست بھی تری بزم میں دمِ امتحاں
رہی آن سب سے الگ مری رہی شان سب سے جدا تری

یادِ جلیل

چھا گئی پژمردگی ہر سمت غم کا جوش ہے
جو بھی دل ہے وہ مسرت سے تہی آغوش ہے
ہوگیا ہے اک گلِ خنداں جو پامالِ خزاں
بلبلوں میں گریہ و زاری کا ہر سو جوش ہے
ختم ہنگامہ ہوا سونا پڑا ہے میکدہ
ہجرِ ساقی میں فسردہ ایک اک مے نوش ہے
کل ہی جس کے زمزموں سے گونجتی تھیں محفلیں
آج دیکھو تو اسی کا سازِ دل خاموش ہے
زندگی بھر اب ہمیں تڑپائے گی یادِ جلیل
وہ تو پی کر جامِ عمر جاوداں مدہوش ہے
عیسوی سن میں فصاحت جنگ کا سالِ وفات
کہہ شمیم تو جگر "اک خوش نوا خاموش ہے"

۱۹۴۶ء
شمیم رائے بریلوی

---

[1] جمعیت اربعہ میں حفیظ جونپوری، وفا رام پوری، ریاض خیرآبادی، اور خود جلیل شامل تھے۔

قطعہ

عمر جلیل بادشاہِ سخن ہیں
سیاہ پوش دنیائے شعر و ادب ہے
عیسوی جشن [illegible] سال [illegible]
[illegible] تاریخ و [illegible]
عمیر [illegible]

قطعہ

بزمِ جہاں سے اٹھ گئے حافظ جلیل آہ
کام اپنا آکے وقت پہ کر جاتی ہے اجل
[illegible] کی ہاتف رضا یہ ندائے غیب
دربارِ جلیل خلد بریں میں ہے آج کل
۱۳۵۴ فصلی
رضا دارُوی

گل دغنچہ ہمہ بگوش ہیں سنے کون بلبل نوحہ خواں
یہ فغاں تری یہ بکا تری یہ صدا تری یہ نوا تری
مرے شوق نے تو بنا دیا تجھے آئینہ ترے حسن کا
ترے زلف و رخ پہ نظر مری مرے چشم و دل میں ہی جا تری
جسے چاہتا ہے جلیل تو وہ تجھے بھی چاہے خدا کرے
کہیں کام آئے طلب تری کہیں رنگ لائے دعا تری
(آجکل ۱۵ رجولائی ۱۹۴۵ء)

زندگی کے آخری دور تک حیدرآباد ہی میں قیام رہا۔ ضعف و پیری نے مشاغل زندگی سے علیحدہ کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ استفسارات کے جوابات خود نہ لکھتے تھے "عالمگیر" (جون) میں حضرت امیر مینائی کے مندرجہ ذیل شعر پر اپنے صاحبزادے بلند اقبال مولوی عزیز احمد سے جواب لکھوایا ؎
بخیے کا دیا حکم تو بولے دہنِ زخم [illegible] سلواتے ہو کیوں؟ قابل شیون تو نہیں ہم
لفظ "شیون" پر جھگڑا اٹھا تھا۔ کوئی سوزن پڑھتا تھا اور کوئی سیون۔ آپ نے اپنی جامع و مانع رائے دی کہ لفظ "سیون" ہے۔ نہ سوزن ہے اور نہ سیون۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ امیر کے شعر پر آپ ہی کی رائے مستند ہو سکتی تھی۔ آپ کو بھی سرزمین حیدرآباد سے انس ہو گیا تھا اور اس قدر کہ امیر و داغ کی طرح آپ بھی ۲ر جنوری ۱۹۴۶ء کو وہیں رحلت فرما کر سپرد خاک ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وفا شعاری جلیل کا مسلک زندگی تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چل کر ان کے رنگ کو آخری لمحات تک نبھایا۔ مگر اس وفا شعاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کو دہلی اور لکھنؤ اسکول کا سنگم بھی بنایا یعنی یہ کہ دونوں دبستان شاعری کی خصوصیات اپنے کلام میں پیدا کیں۔ امیر کا رنگ تو فیضان استاد سے ملا ہی تھا، داغ کی چند مخصوص خوبیاں بھی اپنے کلام میں پیدا کر لیں۔ انھوں نے دراصل زمانے کے رجحانات کا اندازہ لگا کر اپنے کلام کو مقبول عام بنانے کے خیال سے اپنے طرز شعری کو صرف لکھنؤ اسکول کی شاعرانہ نزاکتوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے وہ دور بھی دیکھا تھا جبکہ امیر پر داغ محض اپنی شگفتگی اور رنگینی بیان کی بدولت رامپور میں سبقت لے گئے تھے۔ کیونکہ امیر رعایت لفظی اور خارجی لوازمات پر توجہ مبذول کرتے تھے مگر داغ جذباتی دنیا کے واحد علمبردار تھے۔ وہ ہلکے پھلکے الفاظ کے ساتھ جذبات سے کھیلتے تھے، داخلی عناصر کو اپنے کلام میں جگہ دیتے تھے، یہی وہ عناصر تھے جن سے مجبور ہو کر امیر نے داغ کا رنگ "صنم خانۂ عشق" میں اختیار کیا تھا۔ جلیل کے کلام میں امیر و داغ کے علاوہ میر تقی میر خواجہ حیدر علی آتش اور خواجہ میر درد کا رنگ بھی جگہ جگہ نمایاں ہو گیا ہے۔ خود امیر نے ان شعرا کے انداز بیان کی تقلید کرنا چاہی تھی۔ تسلیم اور جلال کا دور خود انھوں نے دیکھا تھا خود داغ کو دیکھئے، ذوق کے شاگرد تھے مگر انھوں نے استاد کے کلام سے علیحدہ ہو کر جذبات کی رنگینی اور شگفتگی پیدا کی اسطرح جلیل کا کلام ان دونوں دبستان شاعری کا مرکز بن گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی خوبی زیادہ اجاگر ہو گئی اور کوئی کم۔

جلیل نے رامپور اور حیدرآباد کے شاہی قصرات دیکھے، شاہانہ ذوق شعری کا بخوبی اندازہ لگایا، ذوق عامہ کی شعری تشنگی کو بجھانے کی اکثر کوششیں کیں۔ اس وجہ سے بلند و پست دونوں طرح کے مضامین کو اپنے اشعار میں جگہ دی۔ پامال سے پامال مضمون کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ امیر کی خاص خصوصیات یعنی معاملہ بندی، معشوق کے خارجی لوازم ہجر و وصل کی کیفیتیں جام و سبو وغیرہ سب جلیل کے کلام میں موجود ہیں۔ اعتقادات کا اظہار بھی نعتیہ غزلوں میں کیا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی دوسری عام خصوصیت رعایت لفظی سے کسیقدر علیحدگی ضرور اختیار کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ زمانہ بدل چکا ہے لفظی گھروندے نہیں بنائے جاسکتے کیونکہ عوام ان کو پسند نہ کریں گے۔ اس طرح انھوں نے لکھنؤ اسکول کی اس ایک امتیازی صنعت سے ہٹ کر دہلی اسکول کی عام صنعت واردات قلبیہ کو اپنے کلام میں جگہ دی اور وہ اس وجہ سے کہ انھیں وقت کی ضرورت کا احساس تھا۔ خود اس طرف لطیف اشارہ کیا ہے ؎

بہ جان لو کہ زمانہ ہے نکتہ چینی کا   جلیل سقم کا پہلو ذرا بچائے ہوئے

پھر بھی لکھنؤ اسکول کی نمایاں صنعت معاملہ بندی کو اپنے کلام میں پیش کیا۔ یہاں پر جلیل کا رنگ بہت زیادہ نکھر گیا ہے ؎

دعا اگر نہ دو، کوسنا دیتے جاؤ   مرے پیار کا کچھ صلہ دیتے جاؤ

مگر معشوق کی عادتوں سے وہ واقف ہیں اور اس طرح اس کو مخاطب کرتے ہیں ؎

یہی انصاف ہے او غیر کے یار   اسے بوسے ہمیں دھوکے دئے جائیں

معشوق دوسرے عاشق کی طرف رجوع ہونے لگتا ہے ؎

اڑاؤ خاک جو تم اس طرح عدو کیلئے   تمہیں بتاؤ نہ دلمیں غبار کیونکر ہو

معشوق ان کی ایک نہیں سنتا، وہ چپکے پرچے کے دئے جاتا ہے تو مجبور ہو کر اسے یوں بیوفا ٹھیرلتے ہیں ؎

ملو تم بے تکلف غیر سے ملنا مبارک ہو
مجھے تسکین ہے اس سے کہ پورے بیوفا تم ہو

اس جان عاشق کی بے توجہی اور بے التفاتی دراصل حزن و ملال پیدا کر دیتی ہے جلیل بھی اپنی یاس اور ناکامی کی بنا پر اپنے کلام میں از ابتدا تا انتہا حزنیہ جذبات اور احساسات پیش کرتے ہیں۔ ان کا کلام طربیہ اثرات سے خالی نظر آتا ہے۔ رجائی مستقبل کا کہیں شائبہ بھی نہیں ملتا۔ ایک جلیل ہی پر کیا موقوف ہے، عام طور پر غزل گو شعرا یاس و قنوطیت کو اپنے کلام میں جگہ دیتے رہے۔ حسرت کے کلام کو پڑھ کر بقول کنہیا لال کپور مالیخولیے کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ جلیل نے بھی اس کا تتبع کیا مگر میرے نزدیک اس کی اصل وجہ وہ واقعات ہوتے ہیں جو شعرا کو زندگی کی دوڑ میں پیش آتے ہیں، مگر رازداری کے خیال سے ان کو ظاہر نہیں کرتے۔ بلکہ ایک ایسا لفظی گھروندا اور گورکھ دھندا تیار کرتے ہیں جس میں واقعات زندگی کی مٹتی ہوئی سی جھلک نمودار ہو جاتی ہے۔ جلیل کی ایک تازہ غزل کا یہ شعر ؎

ہر کلی گلشن کی مرجھائی ہوئی   سوگوار بلبل ناشاد ہے

ضرور کوئی نہ کوئی پس منظر رکھتا ہے۔ مگر بلبل ناشاد کو ہر کلی گلشن کی مرجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیوں؟ بلبل، ناشاد اور سوگوار کیوں ہے؟ اس لیے کہ . . . . بلبل ناشاد کی زندگی کے تمام لمحات تو حزن و ملال کے عالم میں نہ گذرے ہوں گے۔ خوشی کی حالتیں تو ضرور نصیب ہوئی ہوں گی مگر حقیقت سے دور جاکر اور واقعات حقیقی پر پردہ ڈال کر جلیل نے مذکورہ بالا شعر پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شعر میں رنج و غم، اور یاس و قنوطیت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

کائنات زندگی کہئے اسے   دل ہے جبتک دلمیں اسکی یاد ہے

میرے خیال میں جلیل کی شاعری متاخرین کی طرح رسمی نہیں ہے۔

ان کا ایک ایک شعر عہد ماضی کی حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

وہ نظر جس سے لیا تھا تم نے دل   مدتیں گذریں ابھی تک یاد ہے
آ گئی تم پر طبیعت کیا کریں   اپنا لکھا اپنی قسمت کیا کریں

یہی وہ قنوطیت ہے جس نے شعرائے دہلی کی امتیازی صنعت واردات قلبیہ یا داخلی جذبات جلیل کی شاعری میں پیدا کر دئے۔ معشوق کی جدائی اس کے دل کو تڑپاتی ہے، مگر تڑپنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، جذبات رفتہ رفتہ اسے وارفتہ بنا دیتے ہیں۔ اور وہ یہ کہہ گزرتا ہے ؎

اشکباری میں خدارا مجھے سمجھو معذور   دل پہ صدمہ ہے کچھ ایسا کہ جگر پانی ہے

اسی طرح نہ صرف جلیل کے کلام میں بلکہ ہر شاعر کے کلام میں محرکات ہوتی ہیں۔ جلیل کے اشعار کے ساتھ کوئی داستان تو وابستہ نہیں کیجا سکتی مگر ان کے اشعار پڑھ کر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔ ان کے یہ اشعار ؎

باتیں بخیال یار سے کرتا ہوں اسطرح   سمجھے کوئی کہ آٹھ پہر ہوں نماز میں
مصروف کر لیا مجھے اس کے خیال نے   جانے اجل کہ مرنے کی فرصت نہیں رہی

انکی زندگی کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر ان کی تہ میں واقعات نہ ہوتے تو "ذہنی عیاشی" کے مترادف اشعار کبھی اس قدر درد و اثر کے حامل نہ ہوتے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو ؎

میں شمع بزم ہوں نہ چراغ مزار ہوں   راتیں مگر گذرتی ہیں سوز و گداز میں

ایسے اشعار تخیل کی بلند پروازیوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتے، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے شمع و پروانے کی کیفیتیں شفق اور رنگین شام کی حالت ۔

چاند اور اس کا رنگین ہالہ، جوانی کا ابھار اور نکھار، گل و بلبل کی واردات، نسیم اور کلی کے راز، پھولوں کی نرمی اور نزاکت سب کچھ اپنے کلام میں پیش کی ہیں۔ مگر یہ کیفیتیں ورڈسورتھ کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوسکتیں۔ گل و بلبل کے پردے میں جلیل کا تخیل وہ حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے جن کو شاعر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ ان کا پس منظر واردات قلبیہ اور عشقیہ داستانیں پوشیدہ نہیں رکھتا ہے

ہلا اپیار ہے ان کے لئے نسیم بہار ؛ کہ منہ جو چوم لیا کھل گئے کلی کی طرح

یا

حسیں ہیں کیسے کیسے نرم و نازک ؛ یہ پھول آنکھوں میں جن کر رکھ لئے جائیں

یہ واردات قلبیہ، خارجی لوازمات کی بدولت بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتے ہیں، جلیل کے یہاں معشوق کے خارجی لوازمات بھی ان کے دل کو بہاتے نظر آتے ہیں، معشوق کا لباس کب عاشق پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے

ہے گلے میں جوان کے جوڑا سرخ ؛ آج آنکھوں میں ہے زمانہ سرخ

ایک طرف تو جوڑے کا یہ خونی رنگ اور دوسری طرف تو بہ شکن نقاب ہے

نقاب کہتی ہے میں پردہ قیامت کا ؛ اگر یقین نہ ہو دیکھو لو اٹھا کے مجھے

جلیل کے اکثر موضوع بھی پامال ہیں مگر بعض اوقات وہ پامال موضوع کو ایسا دلکش بنا دیتے ہیں کہ اس کی پامالی محسوس نہیں ہوتی یہ انکے ندرت بیان اور ندرت ادا کا نتیجہ ہوتا ہے "بادہ و مینا" امیر مینائی کا خاص موضوع رہا۔ ان سے قبل اس موضوع پر سینکڑوں نظروں کے ساتھ طبع آزمائی کی گئی امیر کے بعد ریاض نے اس کو اپنا اصل موضوع قرار دیا۔ "خمریات ریاض" میں خوب خوب نکھرا، جلیل نے بھی اس موضوع کو بطور چاشنی اپنے کلام میں جگہ دی۔ ان کے علاوہ تخیل اور حسن بیان نے بادہ نوشی کو ثانوی عادت بنا دیا ہے

گنہ گنہ نہ رہا اتنی بادہ نوشی کی ؛ اب ایک شغل ہے یہ لذت شراب نہیں

جب شراب سے لذت حاصل کرنے کا احساس جاتا رہا تو اس کی تلخی حلاوت میں تبدیل ہو گئی۔ اور اس نے اس قابل بنا دیا کہ مے طہور پی سکے ہے

مے طہور ہے رندوں ہی کے لئے اے شیخ

وہ کیا پئے گا جسے لذت شراب نہیں

جلیل کے اشعار انسانی فطرت سے مطابقت کرتے ہیں۔ انسان ہر اس چیز کو پسند کرتا ہے جو نیچرل ہو یا فطری ہو۔ داغ کے اکثر اشعار انسانی فطرت سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے وہ اشعار جن کی بدولت داغ پر الزام لگائے جاتے ہیں دراصل بہترین نیچرل اشعار ہیں۔ ان کا یہ مشہور لوکا شعر ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

اُف تری کافر جوانی جوش پہ آئی ہوئی

بہترین محاکاتی شعر ہے۔ اصل تصویر سے بڑھ کر انھوں نے مصوری کی ہے۔ اور یہی ایک نیچرل شاعر کا کمال ہوتا ہے کہ وہ زندگی یا انسان کے جس پہلو کو بھی لے اسے اس طرح نمایاں کرے کہ اس میں اصل کی جھلک پیدا ہو جائے بعض اوقات حسن الفاظ، انداز کی دل نشینی میں معتد بہا اضافہ کر دیتا ہے۔ تمثیل کے نمونے جلیل کی شاعری کا جزو ہیں۔ انداز بہت کچھ ڈرامائی ہو جاتا ہے

کھینچکر پہلو میں بوسے لیا ؛ ان کا وعدہ میں نے خود پورا کیا

موسیقی اور ترنم ان کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ ان کی غزلیں ایسی بحروں میں لکھی گئی ہیں جن سے ترنم اور نغمہ خود پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غالباً بے جا نہ ہوگا کہ جلیل کی غزلوں کو عہد حاضر میں وہی مرتبہ حاصل ہو چکا ہے جو داغ اور امیر کو اپنے زمانے میں ہو چکا تھا، ہر محفل رقص و سرود اور ہر بزم طرب میں لحن داؤدی کے ساتھ ان کی غزلیں فضا میں ترنم پیدا کرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ نشر گاہوں سے بھی ان کی غزلوں کو نشر کیا جاتا ہے۔ یہ ترنم اور نغمہ سامعین کے لئے ان کے کلام کو اور موثر بنا دیتا ہے۔ فارسی سے گریز، سیدھی سادی زبان کلام کو آسان بنا دیتی ہے۔ اس پر جدت ادا اور جرأت و داغ کی سی شگفتگی شعر کے معیار کو بلند کر دیتی ہے۔ زبان کا یہ شعر ہے

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی ؛ کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

ملاحظہ ہو اس میں کس قدر ترنم موجود ہے، فارسی الفاظ محاورات اور فقرے کہیں نظر نہیں آتے، پوری غزل اسی کیفیت کے ساتھ کہی ہے۔ استعارات و تشبیہات سے زیادہ کام نہیں لیا اور نہ زیادہ تلمیحات کو پیش کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان کے دیوانوں کی چھان بین سے اس قسم کے چند اشعار ضرور نکل آئیں گے جن میں لیلیٰ مجنوں، موسیٰ و طور، یوسف و زلیخا کی طرف لطیف اشارات کئے گئے ہیں۔ جلیل نے سیر حاصل غزلیں نہیں کہیں بلکہ ہر غزل کے چیدہ چیدہ اشعار کو اپنے مجموعوں میں جگہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں ابتذال کم ہو گیا ہے۔ دوسری طرف وہ شعراء دہلی کی طرح مختصر غزلیں کہتے ہیں زیادہ تر مختصر بحریں بھی استعمال کی ہیں اور معیاری اشعار نکالے ہیں۔ ان غزلوں میں حقائق روزگار بھی پیش کئے ہیں۔ انسان جب کسی چیز پر بے جا طور سے ناز کرتا ہے تو اس کی وقعت دوسروں کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے۔

آپ کی پیاری حیا پامال ہو کر رہ گئی ؛ او چلنے ناز سے جوبن پہ اتراتے ہوئے

انسان کے ہوش و حواس دوبارہ واپس نہیں آتے ہے

کھوئے ہوئے حواس کو ڈھونڈوں میں اب کہاں

شاید وہ رہ گئے کسی مے کی دکان پر

جوانی میں عشق کا پیدا ہونا واقعی ظلم ہے ؎

ستم ہے مبتلائے عشق ہو جانا جواں ہو کر
ہمارے باغ ہستی میں بہار آئی خزاں ہو کر

جہاں جلیل کے کلام میں مجازی عشق موجود ہے وہاں انھیں بانیٔ اسلام سے انتہائی محبت ہے۔ نعتیہ غزلیں ان کے یہاں موجود ہیں جن میں انھوں نے سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

غزلوں کی آمد پر کیفی اور ندرت بیان کے بعد ان کی قصیدہ گوئی پر بھی ایک نظر ضروری ہے۔ عہد حاضر میں قصیدہ گوئی تنزل پذیر ہو چکی ہے۔ قصیدہ کے لئے جس متانت، جزالت سنجیدگی اور شوکت الفاظ کی ضرورت ہے وہ جلیل کے یہاں نہیں ملتی۔ عزیز لکھنوی عہد حاضر کے بہترین قصیدہ گو تصوّر کئے گئے ہیں مگر ان کے یہاں مدح کے بجائے "مرثیت" موضوع کی نوعیت کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ جلیل نے "شکریہ سرفرازی" کہا مگر اس میں تغزل کا رنگ جگہ جگہ نمایاں ہو گیا، اس کی ابتدا اتفاق روزگار سے یوں ہوتی ہے ؎

جو دن پھرتے ہیں تو سامان پیدا ہو ہی جاتا ہے
شب غم لاکھ طوفانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے

تشبیب کے اشعار ان کے تغزل کا پورا پورا رنگ لئے ہوئے ہیں، مدح میں اپنے رنگ سے علیٰحدہ ہونے کی کوشش کی ہے مگر واجبی مدح، نے انہیں حقیقت سے متعلق رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ موجودہ تاجدار دکن نے بھی جلیل کی انتہائی عزت افزائی کی، اور فصاحت جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس کی وجہ صرف جلیل کی قادر الکلامی تھی۔ جلیل مادی حیثیت سے روپوش ضرور ہو گئے مگر ؎

بعد فنا ہے نام بلند اپنا اے جلیل
زیر زمیں بھی جا کے رہے آسمان پر

قدیم ہندوستان کی بحری قوت ۔ ۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۲۸

تھا ان قوانین کو مذہبی رنگ دیا گیا تاکہ لوگ انھیں آسانی سے قبول کر لیں۔ یہ لفاظ ضرورت کی پیداوار تھا لیکن اس نے آئندہ ملک میں جڑ پکڑ لی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ محض تعصب بن کر رہ گیا۔

اب امید کی جاتی ہے کہ ہندوستان مستقبل میں دوبارہ زبردست بحری قوت بن جائے گا۔ بحری سفر کے خلاف وہم مٹتا جا رہا ہے اور قدیم بحری روایات کا اعادہ ہو رہا ہے۔ ہندوستانی ملاحوں نے جو شاہی بحری بیڑے سے مل کر جنگ میں لڑے تھے، ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے قدیم زمانہ کے بزرگوں کی روایات کو زندہ کرنے کے ہر طرح قابل ہیں۔

غزل

نمود شام وصال بھی ہے طلوع صبح جمال بھی ہے
الٰہی کتنی حسین دلکش یہ گردش ماہ و سال بھی ہے

وہ اک ہمیں ہیں کہ تیرے جلوے کو دیکھ کر خود نظر ہٹا لی
نظر ہٹائے جو تیرے رخ سے کسی کی اتنی مجال بھی ہے

وہ منفعل سی نگاہ رنگیں وہ کچھ خجل سا کسی کا ابرو
جھکی جھکی سی ہے شاخ گل بھی جھکا جھکا سا ہلال بھی ہے

یہ اک کسک سی یہ اک چبھن سی یہ اک خلش سی یہ اک تڑپ سی
یہی محبت کی ابتدا ہے یہی وفا کا مآل بھی ہے

رہیں تو کب تک رہیں امیدیں بجھے تو کیونکر بجھے محبت
مری وفائیں ہزار لیکن تری وفا کا سوال بھی ہے

میں تجھ کو پانے کی کوئی خواہش اگر کروں تو قصور میرا
مجھے تو شئے کی مجھ پہ حسرت ہے جو محبت جمال بھی ہے

نہ پوچھ وہ آگہی کی منزل نہ پوچھ وہ بے خودی کا عالم
جو مرگ بھی ہے حیات بھی ہے جو ہجر بھی ہے وصال بھی ہے

نہ مجھ کو اُن کے بغیر تسکیں نہ ان کو میرے بغیر راحت
جواں کے دل کا ہے حال اختر وہی مرے دل کا حال بھی ہے

جاں نثار اختر

بہار

سجنی لوٹ آئی ہے بہار
آیا ہے عالم پہ نکھار
روپہلی سرسوں لہرائی
جھوم اُٹھے ہیں لالہ زار
کلیاں گھونگٹ کھول رہی ہیں
ہر ڈالی ہے نغمہ بار
ناچ رہی ہے کونپل کونپل
غنچہ غنچہ ہے سرشار
جھولا جھول رہی ہے بلبل
کوئل گاتی ہے ملہار
کتنا دلکش کتنا سُندر
کتنا موہن ہے سنسار

آپ مگر جو پاس نہیں ہیں
پھول بھی ہے آنکھوں میں خار

حسرت صہبائی

اقبال کی وحدتِ فکر

(۲)

غلام محمد بٹ

حصلہ اقبال کی عظمت اس چیز میں مضمر ہے کہ اس نے شاعری کی پرانی اصطلاحات کی اقدار کو اس خوبی سے تبدیل کیا ہے کہ تبدیلی کا گمان تک نہیں ہوتا بلکہ سوچنے والے کیلئے ارتقائی منازل کا عرفان ہوتا ہے۔ وہی عشق جو ہوس کا مترادف تھا، وہی محبت، وہی جنون وہی قلندر، وہی تصوف ۔مگر معانی ہیں کس قدر معراج ۔ اور یہی چیز اقبال کے کلام میں تضاد کی غیر حقیقی رونمائی کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے ادیب بھی اقبال کے کلام میں تضاد مانتے ہیں۔ کرشن چندر نے بھی ملکہ راج آنند کی زبان سے اسنے حالیہ مضمون "پودے" (جسے میں افسانہ نہیں کہہ سکتا) میں یہی کہلوایا ہے کہ اقبال کی عظمت مسلّم مگر وہ متضاد نظریات کے حامل ہیں۔ خدا جانے ہمارے ادیبوں میں تفکر کی صلاحیت ہی مفقود ہو چکی ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

مادہ اور روح | حضرت میکش خود تسلیم فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال مادہ اور روح کو ایک ہی چیز خیال فرماتے ہیں اور ان کے نزدیک یہی اسلامی نظریہ ہے مگر جو مثالیں انہوں نے پیش کی ہیں ان سے غلط استنباط کیا ہے ۔ ان مثالوں سے مادہ کے تیاگ کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ مادہ کی ارتقائی منازل بیان کی گئی ہیں پہلی منزل کا نام مادہ اور دوسری کا نام روح ہے۔ جسم کو تکلیف مالایطاق (کیونکہ فاضل مقالہ نگار کے ذہن میں تکلیف سے مراد مالایطاق ہی ہے ورنہ تکلیف تو ہر جد و جہد میں اٹھانا پڑتی ہے اور انسان سعی و جہاد پر مکلف ہے) دینا اور مادہ کی نفی ہرگز مقصود نہیں ۔ یہی تصوف کا قصہ بھی غیر متعلق ہے کیونکہ اقبال کا ایمان "لا رہبانیۃ فی الاسلام" مسلّم ہے ہاں اگر رہبانیت سے کوئی مراد کوئی بہتر اخلاقی کیفیت ہے تو بمصداق حدیث نبوی الجہاد رہبانیۃ الاسلام نہ مجھے کوئی اعتراض ہو سکتا ہے نہ حضرت علامہ کو۔ جاوید نامہ سے شاہ ہمدان کے عنوان میں سے پہلے دو شعر میں

"با تو گویم رمزِ باریک اے پسر تن ہمہ خاک است جاں والاگہر
جسم را از بہرِ جاں باید گداخت پاک را از خاک می باید شناخت"

میں جاں گداختن کی تشریح حضرت علامہ اسی نظم میں آگے چل کر یوں فرماتے ہیں

چیست جاں دادن بحق پرداختن کوہ را با سوزِ جاں بگداختن

دوسرے مبیّن کردہ دونوں شعر بالکل غیر متعلق ہیں۔ وہاں حکمت سے مراد حکمت دنیوی اور عرفان سے مراد حکمت دینی ہے جس میں مادہ کے ارتقا کیلئے اصول و قوانین ملتے ہیں اور حکمت دنیوی کا تعلق صرف مادی قوانین سے ہوتا ہے۔ "مادیات سے گذر کر روحانیات میں قدم رکھئے مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے"۔ یہ حضرت علامہ کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ سے مقتبس ہے۔ یہاں علامہ صاحب ایک اجتماعی انا پیدا کرنے پر زور دیتے ہیں لیکن حضرتِ میکش اس سے بھی مادہ اور روح کا قضیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

ترکِ عالم | حضرتِ میکش کا یہ کمال استدلال ہے کہ انہوں نے محض مغالطہ کے زور پر ترکِ عالم کا پہلو نکالا ہے۔ حالانکہ وہ خود بالِ جبریل کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

خلوت دشت کا مفہوم حضرت میکش کے خیال میں رہبانیت ہے۔ کم آمیزی اور تجرد خلوت جس میں ترک کا شائبہ تک نہ ہو بے شک علامہ کے خیال میں مستحسن ہے مگر وہ خلوت جو ترک دنیا پر منتج ہو علامہ کے نزدیک مردود ہے۔ حضرت میکش کے پیش کردہ اشعار ہی اس چیز پر دال ہیں۔

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
ایں خدا را جستن از ترکِ بدن ایں خودی را بر فسانِ حق زدن

قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہاں خلوتِ دشت سے مراد ترکِ بدن اور ترکِ دنیا ہے جسکو علامہ اچھا خیال نہیں کرتے۔ مگر

خلوتے جو یہ بہ دشت و کہسار یا لبِ دریائے ناپیدا کنار

میں خلوتے کی یائے تنکیری مستقل خلوت کے خلاف گواہی دے رہی ہے اور اسی طرح

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید

میں بھی خلوت کے معنی کم آمیزی ہے کیونکہ مدتے کے لفظ نے اس کی حیثیت غیر مستقل کر دی ہے اور "از کم آمیزی تخیل زندہ تر" بھی اسی خیال کی غمازی کر رہا ہے۔ دیگر اشعار میں بھی شکست عالم سے مراد تسخیر عالم ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حضرت میکش نے درست تجزیے قائم نہیں کئے اور نتائج تو یقیناً مغالطہ کی طرف راہنمائی کرنے والے ہیں۔

حقیقتِ عالم | اس عنوان کے مندرجات کو بھی اگر حضرت علامہ کے مبینہ بالا خیالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی تضاد نظر نہیں آئے گا۔ یہ عالم مادی اور عالم روحانی خودی یا انا کی منازلِ ارتقا ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ اسی کو حقیقت سمجھنا یا جلوۂ حقیقت خیال کرنا علامہ مرحوم کے نزدیک غلط ہے

لہ فرض کیا گیا ہے کہ قارئین نے اس مضمون کا پہلا حصہ "اور اقبال کے متضاد نظریے" ضرور پڑھے ہونگے۔ بصورت دیگر اخذ معانی کے سلئے اشکال قائم رہے گا۔

جیسا کہ فلاسفہ مادی عالم کو ہی حقیقت تصور کرتے ہیں یا ہمہ اوستی اسکو جلوۂ حقیقت خیال کرتے ہیں۔ خودی کا اصلی مقام ان منازل کو طے کرنا ہے اور اس سے آگے قربِ ذاتِ واجب حاصل کرنا ہے۔ ان منازل کو چھوڑ دینا نہیں ورنہ مقصود تک رسائی ناممکن۔ دیکھئے اقبال اپنے مقام کے متعلق کس انداز میں استفسار فرماتے ہیں۔

اے من از فیضِ تو پایندہ نشانِ تو کجا است
ایں دو گیتی اثرِ ماست جہانِ تو کجا است (زبورِ عجم)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

گمان مبر کہ ہمیں خاکدان نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہانِ است یا جہانِ بود است (زبورِ عجم)

جو شخص ایسی خاکداں کو اپنا نشیمن سمجھتا ہے "وہ فریب خوردۂ نقشِ باطل" ہے وہ اس قدر بلا رتقائی قافلہ کی سالاری کے لئے ان صفات کی تلقین فرماتے ہیں۔

امیرِ قافلہ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری ز کرّار است

صرف رنگ و بو کی طغیانی ہمارا مطمحِ نظر نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس سے ہمارا ارتقا صرف مادیات میں الجھ کر رہ جائے گا اور خودی کا استحکام غیر ممکن

فکرِ فرنگ پیشِ مجاز آورد سجود
بینائے کور و مستِ تماشائے رنگ و بو ست (زبورِ عجم)

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

یہ شعر بالِ جبریل کی تیرھویں نظم کا دوسرا شعر ہے اور میرے خیال میں پہلے شعر سے قطعہ بند۔ نظم کا مقصد اہلِ یورپ کی مادہ پرستی اور اخلاق سوزی ہے چنانچہ وضاحت کے لئے دونوں شعر نقل کر دئے ہیں۔ واضح رہے کہ حضرت علامہ نے اپنے سفرِ یورپ کے دوران میں یہ نظم قرطبہ میں لکھی ہے اور ظاہر ہے کہ یورپ سے متاثر ہو کر لکھی۔

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

مذاقِ صحیح اس بات کی گواہی دے گا کہ چونکہ بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب ہے اسلئے اس رعایت سے اسے مہ و ستارہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور شاعر نے آسمان کو بحر مان کر مہ و ستارہ کو گرداب تسلیم کر لیا۔ کہاں شاعرانہ محاذات اور کہاں ترکِ عالم اور حقیقتِ عالم کا موضوع۔ بات کیا سے کیا ہو گئی۔ کیا اسی کا نام تاویل ہے؟ حضرت علامہ کا نقطۂ نظر فاضل مقالہ نگار کے استخراج کے خلاف ہے سنئے

بچشمِ مردہ دلاں کائنات زندانے است
دو جامِ بادہ کشیدند و از جہاں رستند

غلامِ ہمتِ بیدارِ آں سوارانم
ستارہ را بسنانِ سفتہ در گرہ بستند

فرشتہ را دگراں فرصتِ سجود کجا است
کہ نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستند

اگلا شعر جو حضرت میکش پیش فرماتے ہیں یہ ہے

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلی ہے عینِ مستوری

اس شعر میں علامہ نے اس خیال کی کہ مدارِ تحقیق و علم صرف مشاہدہ و تجربہ ہے مخالفت کی ہے اور وجدانیات کی برتری کی تلقین۔ ظہور سے بیزاری کا مفہوم ہرگز نہیں نکلتا بلکہ مستِ ظہور ہونے کی قدغن ہے۔

دل بکسے نباختہ با دو جہاں نساختہ
من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں

اس شعر میں دل باختن بمعنی فریفتہ شدن۔ با کسے ساختن بمعنی رضائے کسے جستن کے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوائے خودی یا انا مطلق کے کسی پر فریفتہ ہونا پسند نہیں فرماتے۔ اور اس فریفتہ ہونے کی رسم دو جہاں کے خلاف انقلاب جہاد کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ بہ ہزار کوشش یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس شعر کے اندراج سے صاحب مضمون کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد کا شعر میرے خیال کی تائید کرتا ہے بلکہ اس غزل کے چند اور اشعار بھی میرے مؤید ہیں۔

غلامِ زندہ دلانم کہ عاشقِ سرہ اند
نہ خانقاہ نشیناں کہ دل بکس ندہند

بآں دلے کہ برنگ آشنا و بیرنگ است
عیارِ مسجد و میخانہ و صنم کدہ اند

نگاہ از مہ و پرویں بلند تر دارند
کہ آشیاں بگریبانِ کہکشاں نہ نہند

برون ز انجمنے در میانِ انجمنے
بخلوت اند و لے آنچناں کہ باہمہ اند

مقالہ نویس کو "دل دادن" سے مغالطہ ہوا ہے۔ دل دادن بمعنے عاشق شدن بھی ہے مگر دلیر ساختن کے معنوں میں بھی آیا ہے (از بہارِ عجم و غیاث اللغات) اور یہاں قرینہ دلیر ساختن کا ہے کیونکہ خانقاہ نشینوں کو زندہ دلوں کی ضد بتایا گیا ہے اور یہ چیز بدیہی ہے کہ زندہ دل دوسروں کو بھی زندہ دل اور دلیر بنائیں گے۔ ملا ظہوری کی سند ملاحظہ ہو۔

عشق اگر دل دہد کبوتر را۔ جگر از سینۂ عقاب کشد

نظرِ باطن:- یہ موضوع بھی دراصل وحدت الوجود کی فروعات میں سے ہے۔ اور میرے خیال میں حضرت علامہ کا یہ فرمان جو خود میکش نے پیش کیا ہے۔ اس کے جواب میں کافی ہے "گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود و انحطاط ہے"۔ (ملفوظاتِ اقبال)

حضرت علامہ نہ تو صرف چشمِ باطن کو کافی سمجھتے ہیں اور نہ ہی صرف چشمِ ظاہر کو۔ بلکہ دونوں کے اختلاط و امتزاج سے جو نورِ نظر پیدا ہوتا ہے مشاہدہ اور تجربہ کے لئے اسے ضروری خیال فرماتے ہیں۔

افلاطون:- "یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ" (زبورِ عجم)
علوم و فلسفہ کے متعلق علامہ کا نظریہ شروع میں واضح کر چکا ہوں۔

اور فاضل معترض بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ ہر علم اور ہر فلسفہ کو حرکی اور عملی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ افلاطون کے فلسفہ کے بارے میں حضرت علامہ کا پختہ فیصلہ ہے کہ افلاطون کا فلسفہ فراری اور تنزل پسندی کا فلسفہ تھا۔ اس لحاظ سے علامہ اس کی مخالفت میں حق بجانب ہیں۔ رہا علامہ کی کتاب "ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا ارتقا" (فلسفۂ عجم مترجمہ میر حسن الدین) کی اشاعت کا معاملہ اس کے متعلق پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اب حضرت علامہ کا اپنا قول پیش کرتا ہوں جو انہوں نے مترجم کو ترجمہ کی اجازت دیتے ہوئے رقم فرمایا "یہ کتاب اس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے" حضرت علامہ کو خود اس کتاب کی کمزوری کا پورا احساس تھا اور پھر وہ معترف ہیں کہ ان کے خیالات میں انقلاب آچکا ہے۔ ملفوظاتِ اقبال کے صفحہ ۳۴-۳۵ کے حوالہ کے متعلق عرض ہے کہ یہ غلط ہے۔ حضرت اقبال علامہ محمد حسین عرشی کو ایک خط کے جواب میں اپنی صحت کی کمزوری کے باعث یہ تحریر کرتے ہیں کہ میں نے مطالعہ چھوڑ رکھا ہے اور آجکل صرف قرآن اور مثنوی کو پڑھتا ہوں وہ بھی کبھی کبھی۔ قرآن و حدیث پڑھنے کا مشورہ بھی اس مفہوم کا حامل نہیں جو حضرت میکش نے پیدا کرنا چاہا ہے۔

مولانا روم کے متعلق حضرت علامہ کے خیالات جو انہوں نے اس کتاب میں ظاہر فرمائے کافی حد تک روشن ہیں۔ اس لئے مزعومہ تناقض کو دور کرنے کے لئے مزید کوشش فضول ہوگی۔ غیر محسوس اور غیر مشہود کی بحث بھی عبث کیونکہ ظاہر و باطن اور غیب و شہادۃ کے قرآنی الفاظ کے ہوتے ساتھ کیوں اس جھگڑے میں پڑیں۔ حضرت علامہ دونوں صفات کے قائل ہیں۔ اور دونوں پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ افلاطون کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے صرف نامحسوس پر زور دیا اور محسوس سے روگردانی کی۔ خود فرماتے ہیں۔

آنچناں افسونِ نامحسوس خورد
اعتبار از دست چشم و گوش برد (اسرارِ خودی)

اسی عنوان کی ایک ذیلی بحث "موت و حیات" ہے۔ مختصراً اس کی وضاحت بھی کئے دیتا ہوں۔ اقبال کے نزدیک جسمانی موت صرف انتقال کی حیثیت رکھتی ہے حقیقی موت خودی کا فنا ہو جانا ہے۔ نباتات و حیوانات میں "تنازع البقا" کا جذبہ بقائے نوع پر منتج ہوتا ہے۔ مگر انسان کی زندگی بقول علامہ حیاتِ مطلق سے مشابہت اور قرب ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کل من علیہا فان الا وجہہ یعنی سوائے خدا کی ہستی کے سب کو فنا ہے۔ اور انسان کی تخلیق "نفخت فیہ من روحی" اور "فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا" کے اصول پر ہوئی ہے جو شخص انسانی خودی کی بقا کے لئے کوشاں ہوگا اور اپنے آپ میں "تخلقوا باخلاق اللہ" اخلاق الٰہی پیدا کرے گا اسے فنا نہیں۔ اگر کل غیر فانی ہے تو لازماً جزو بھی غیر فانی ہونا چاہئے۔ اور یہ ظاہری موت صرف ایک ارتقائی حالت کا نام ہے۔

موت کے آئینے میں دکھا کر تجھے رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے (ضربِ کلیم)

اسی مفہوم میں آیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں یہ مسئلہ کافی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست موت — یک مقام از صد مقام اوست موت
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ — زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را جانے دگر — مرگ او را میدہد جانے دگر
او خود اندیش است و مرگ اندیش نیست — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست
چہ غم داری حیاتِ دل ز دم نیست — کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست
نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لب او
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات — کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم — خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

دو شعر اور پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ اگرچہ بیسیوں اشعار اور بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔

بانگِ اسرافیل انکو زندہ کر سکتی نہیں — روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جنکا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام — گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

اقبال کے خیال میں خودی حیات مشروط ہے۔ مرنے کے بعد وہی دائماً زندہ رہ سکتی ہے جس نے اپنا استحکام کر لیا ہوگا۔ ورنہ بغیر استحکامِ خودی عارضی موت کے بعد فی الواقع موت واقع ہو جاتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں "ہمیں شخصی ابدیت اپنے حق کے طور پر نہیں مل سکتی بلکہ ہم ذاتی جد و جہد سے اسے حاصل کر سکتے ہیں"۔ (اقتباس از تقریر چہارم انسانی خودی اس کی آزادی اور ابدیت)

تقلید:۔ لفظ تقلید سے حضرت علامہ کی مراد تقلید جامد ہے۔ وہ تقلید صالح کے خلاف نہیں۔ تقلید یا اسے تقلید بنی مراد ہے۔ اور قرآن و حدیث

غور و فکر اور اجتہاد کے لئے بے شمار احکام موجود ہیں۔ تصوف میں تقلید ہے مگر مجدد الف ثانی کے تصوف میں تقلید نہیں۔ اسی طرح علامہ عام شاعری کو بھی تقلیدی مانتے ہیں مگر ناصر علی سرہندی اور بیدل کی شاعری کو تقلیدی نہیں مانتے۔ اس مضمون کے لئے ملاحظہ ہو آپکا حوالہ ملفوظات صـــ ۱۲۲ یہ بھی درست ہے کہ علامہ اجتہاد عوام کے مخالف ہیں۔ یہ چیز واضح ہے کہ عوام میں اجتہاد کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ نام نہاد اجتہاد ہوتا ہے۔ اسلئے اصولی طور پر اسکی حمایت بے معنی۔

مشائخ نقشبندیہ اور میرزا بیدل :- ان اعتراضات کا جواب مندرجہ بالا عنوان کے جواب میں گذر چکا ہے اور در اصل یہ بحث دور از کار بھی ہے۔ اصولی طور پر ہمیں فلسفۂ عجم سے سوچے سمجھے بغیر استناد نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ علامہ کے خیال میں "اس کتاب کے اکثر حصے تنقید کی زد سے نہیں بچ سکتے۔"

قادیانیت :- "پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں" (مضامین اقبال بحوالۂ اقبال کے متضاد نظریئے) یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت علامہ قرآن مجید کی تعلیمات کو مدارِ نجات خیال کرتے تھے اور لاتفرقو کے قائل تھے۔ یہاں فرقۂ قادیانی کے لفظ ہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قادیانی فرقہ کو غیر اسلامی سمجھتے تھے۔ کیونکہ مسلمان فرقہ بند ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی وضاحت ضروری ہے۔ "سیرت" کے لغوی معنی عادت طریقہ ہیئت ہے (غیاث۔ بہارِ عجم۔ منتخب) سیرت سے مراد روح نہیں ہے۔ میرے اس خیال کی تائید خود علامہ فرماتے ہیں۔ "یہ (یعنی قادیانیت) اسلام کے ضبط کو قائم رکھتی ہے مگر اس روح کو جس کی حفاظت کرنا اس ضبط کا مقصد تھا فنا کرتی ہے" ترجمہ اقتباس انگریزی مقالہ احمدیت اور اسلام بجواب استفسارات پنڈت جواہر لال نہرو مندرجہ انگریزی رسالہ اسلام جنوری ۱۹۳۶ء) اس سے قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن صورتوں میں جنم لیا ہے میرے نزدیک ان میں بہائیت قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے۔ لیکن موخر الذکر اسلام کی چند ایک نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لئے مہلک ہے" (حرف اقبال مرتبہ شاملو صـــ ۱۲۱) ان چیزوں کے مطالعہ کے بعد کوئی تضاد باقی نہیں رہتا۔

علامہ ابن تیمیہ :- اس ضمن میں حضرت مقالہ نگار علامہ کی کوئی تحریر پیش نہیں کر سکے محض سنی سنائی باتوں پر استدلال قائم کر لیا۔ بایں ہمہ کوئی مفید نتیجہ اخذ نہ ہوا۔ بات صرف یہ ہے کہ حضرت علامہ نے ابن جوزی کی "تلبیس ابلیس" پر اظہار ناپسندیدگی کیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے "بعض لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور نظر بر ظاہر عیب چینی شروع کر دیتے" (ملفوظات) محض عیب چینی اور مخالفت میں صداقت کا معیار نہیں۔ اور علامہ نے بھی مجرد و مطلق تصوف کی مخالفت نہیں کی بلکہ ایک مخصوص اندازِ فکر کی مخالفت فرمائی ہے اور یہ چیز صراحت کے ساتھ وحدت الوجود کی بحث میں بیان ہو چکی ہے۔

علم و حکمت :- اس عنوان میں بھی فاضل مقالہ نگار بہک گئے علم کے متعلق علامہ فرماتے ہیں۔

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

اب بھلا شیخ مکتب کے طریقوں میں یہ علم، یہ تحقیق، کہاں جو کشادِ دل کا باعث ہو۔ دوسرا شعر

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم ضمیر خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق"

اگر کلام و فلسفہ کو ہی علم مانا جائے تو کیا تحقیق بغیر علم کے حاصل ہو جاتی ہے بلکہ تحقیق کا درجہ علم سے بلند۔ اور پھر کلام و فلسفہ خود محلِ اعتراض ہے۔ تیسرا شعر

چہ کنم چہ چارہ گیرم کہ ز شاخِ علم و دانش نہ دمید ہیچ خارے کہ بہ دل نشانم او را

یہاں بھی وہ علم و دانش مراد ہے جو کشادِ ضمیر کے لئے نشترِ تحقیق ثابت نہ ہو سکے۔ ان اشعار میں تضاد تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

خودی :- وحدت الوجود کے زیر عنوان اس پر سیر حاصل بحث کر چکا ہوں۔ چند ایک غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ خودی کی واردات مجاہدۂ باطن کے ذریعہ حاصل کردہ اور آزمودہ ہے۔ مگر کیا واردات میں فلسفہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ فلسفہ جس کی بنیاد بقول علامہ مشاہدہ و فکر ہو۔ میرا دعوے ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے" (بحوالہ اقبال کے متضاد نظریئے) میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ علامہ تمام متصوفین کے خلاف نہ تھے۔ بلکہ ان صوفیا کے خلاف تھے جنکا اندازِ فکر خالصاً ایرانی یا بالفاظِ دیگر آریائی تھا محض ایران میں پیدا ہونے سے انسان ایرانی نہیں ہو جاتا بلکہ ایران کے مخصوص عادات و خصائل سے نسبت پیدا کرنا ایرانی بنا دیتا ہے۔ اور پھر حضرت علامہ اس قسم کی قومیت کے جسکی بنیاد محض وطن ہو خلاف بھی تھے۔ ملا جامی، حکیم سنائی، شیخ عطار اور مولانا رومی وغیرہ ہم بظاہر ایرانی تو تھے مگر اسلامی تفکر کے حامل اور مندرجہ بالا حوالے میں علامہ صرف مسلمان صوفیا کا ذکر فرما رہے ہیں۔

اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہا اور سنا جا سکتا ہے مگر قرطاس کی تنگ دامانی خاموشی پر آمادہ کر رہی ہے۔ مگر انشاء العزیز پھر کسی فرصت میں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو عرض کیا جائے گا۔ السعی منی والا تمام من اللہ

ماتمِ جلیل

نوح ناروی

اے جلیلِ قدر یعنی اے جلیلِ خوش بیاں
تو نہیں موجود تجھکو ڈھونڈنے جائیں کہاں

رونقِ بزمِ سخن دنیا سے رخصت ہو گئی
الوداع والفراق والحفیظ والاماں

نیک فطرت نیک طینت نیک نیت نیک ذات
بامروّت، با محبت با فضائل باصفات

پاک مظہر پاک پیکر پاک باطن پاک دل
قابلِ تقلید عالم عالمانہ بات بات

ہائے وہ تخئیل تیری ہائے وہ تیری غزل
ہائے وہ کردار تیرا ہائے وہ تیرا عمل

خوبیاں تھیں سیکڑوں پھر کیسی کیسی خوبیاں
سب جنھیں تسلیم کرلیں بے نظیر و بے بدل

ایک اک مضمون دلکش لفظ اک اک دلستاں
ایک اک مقطع بلند ایک ایک مطلع آسماں

ایک اک ترکیب نادر ایک اک بندش جدید
ایک اک نکتے میں سو سو دفترِ معنی نہاں

ابتدائی دور میں آزار و غم اکثر سہے
انتہائی وقت میں آرام پائے بے کہے

کر گیا کیا کیا بساطِ فکر پر گلکاریاں
خونِ دل اشکوں کے بدلے کیوں نہ آنکھوں سے بہے

یاد ہیں اب تک ہمارے دل کو یارانِ دکن
تھے امیر و داغ زندہ ماہرانِ علم و فن

رفتہ رفتہ دہر سے سب اٹھنے والے اٹھ گئے
ہو گئی نظروں سے غائب انجمن کی انجمن

سانحہ یہ کیا نیا ہے موت یہ ہے کیا نئی
اور کامل کر گئے خالی جگہ اپنی کئی

پیشتر تھا خوب نظم و نثر کا نظم و نسق
لیکن اب اردو زباں برباد و غارت ہو گئی

کوئی مضطر ہے ادھر کوئی پریشاں ہے ادھر
ایک ماتم کر رہا ہے دوسرا ہے نوحہ گر

ہے عزیز و اقربا کا حال اس غم سے خراب
سوگواری ہر طرف چھائی ہے مانکپور پر

پھر ذرا آ پھر ذرا آ جا نظر کے روبرو
پھر نکل آ پھر نکال آ کر دلوں کی آرزو

کوششوں پر بھی نہ اب سننے میں ہرگز آئیگی
سیدھی سادی پیاری پیاری اچھی اچھی گفتگو

دے جگہ باغِ جناں میں بخش کر جرم و خطا
رات دن اللہ کی درگاہ میں ہے یہ دعا

گریہ و زاری نے برپا کر دئے طوفان و حشر
نوح کو تکلیف پہنچی نوح کا ہم عصر تھا

رحلتِ جلیل

ان کی غزل زبان زدِ خاص و عام تھی
چاروں طرف تھی ہند میں شہرت جلیل کی

عطرِ سخن سے تازہ ہوئی تھی مشامِ جاں
باغِ سخن میں پھیلی تھی نکہت جلیل کی

شہ بادشاہِ فنِ سخن اس میں شک نہیں
تھی ملکِ شاعری پہ حکومت جلیل کی

پوچھو نہ ان کے ذہنِ رسا کی بلندیاں
اللہ رے اوجِ فکر یہ عظمت جلیل کی

ان کا سخن تھا [illegible] غالب
تھی نقشِ لفظ [illegible] ندرت جلیل کی

[illegible] بیاں پہ تھا قدرت تمام سی
تھی معنی و بیاں پہ قدرت جلیل کی

اہلِ حسد نے زور [illegible]
لیکن ہوئی نصیب [illegible] جلیل کی

[illegible] سوختہ ہے اور [illegible]
[illegible] ضرورت جلیل کی

اردو ابھی [illegible] نظامِ سخن کے
[illegible] عزت جلیل کی

[illegible]
[illegible] جلیل کی

[illegible] حلت
کسری منہاس

تبتی فنونِ لطیفہ کی نمائش

ڈکر ٹرینکر

تبتی فنونِ لطیفہ کی جو نمائش "برکلے گیلریز" (ڈیویز اسٹریٹ) میں منعقد ہوئی ان تمام نمائشوں سے زیادہ جامع تھی جو اب تک لندن میں ہو چکی ہیں۔ اس میں تبت اور اس کے ہمسایہ ملکوں کے ان فن پاروں کی نمائش کی گئی جو اکثر نجی شوقینوں نے مہربانی کر کے عاریتاً اس نمائش کے واسطے دیئے تھے۔ لارڈ ٹریڈیگر نے کانسی اور گلٹ کے چار چھوٹے چھوٹے مجسمے، ایک ہاتھی دانت کا ہنستا ہوا چینی بونا اور ایک تنتری چھرا دیا۔ مسز ایف ولمین نے متعدد دلکش کے وہ چھرے دیئے جو عبادت اور ریاضت میں کام آتے ہیں، چاندی کی پتریاں لگی ہوئی ایک کھوپڑی دی جو مذہبی رسوم ادا کرنے میں کام آتی ہے۔ اور کئی اور دلچسپ چیزیں بھی۔ مسٹر کرسمن ہمفریز نے ایک گہرا سرخ کشمیری لبادہ دیا جو دلائی لاما نے سنہ ۱۹۲۴ء میں بودھ وفد کو پیش کیا تھا۔ مسٹر بی شٹلورتھ نے تین سروں والا ایک "اوُلوکیت" دیا جو بہت سی فنی خوبیوں کا حامل ہے۔ "رائل ایشین سوسائٹی" نے بھی ایک دلچسپ "اوُلوکیت" دیا۔

نمائشی اشیا کی باتصویر فہرست میں تین سو سے زیادہ چیزیں داخل ہیں۔ اس فہرست کا دیباچہ مسٹر ایچ جی شٹل ورتھ نے لکھا ہے اور شوقین طالب معلومات کے واسطے وہ ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

تبتی فن کو "روحانی" یا "عارفانہ" کہا جاتا ہے لیکن اس کو "پراسرار" کہنا زیادہ صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک عامی کو اس کے متعلق بہت ہی کم معلومات حاصل ہیں۔ اس نمائش سے خالص تبتی فن پاروں کی اصل نوعیت پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

بدھ مت بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر مفکر اور مصلح کی تعلیمات بالآخر اس کے شاگردوں اور مقتدیوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر مبہم، باطل اور مسخ ہو جاتی ہیں۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے غلط ترجمانی کا۔ پال وکری نے کہا ہے کہ ہر نیا فن آخر میں ایک بالکل نئی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بالکل اسی طرح ہر نیا مذہب بڑھتے بڑھتے ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ اس کی ابتدائی شکل و صورت سے اس کو دور کا بھی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا۔ کیا جہاتما بدھ، پیغمبر اسلام یا حضرت عیسےٰؑ کو اس کا سان گمان بھی ہو سکتا تھا جو آج اُن کے پیروان کے نام پر کہہ اور کر رہے ہیں۔ ولیم جونز نے لکھا ہے: تاریخ کا ایک غائر مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ہر بانی مذہب اپنے پیروکاروں اور ہواخواہوں کا جتھا پیدا کرتا ہے۔ جب یہ لوگ یکجا اور مجتمع ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کا جتھا ایک ایسے مذہبی ادارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں خود غرضی اور ذاتی مفاد کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر سیاسی ہوس اور ادعائی طور طریق اصلی، سادہ اور معصوم روح کو گدلا اور غلیظ کر ڈالتے ہیں۔" بدھ مت کی تاریخ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تبت میں مہاتما بدھ کی تعلیم تلقین کے عام اور سادہ اصولوں نے بھی تحکم و ادعا کی صورت اختیار کر لی۔

گلٹ کے دو چھوٹے مجسمے بدھ کی تعلیم کی روح کو سب سے زیادہ مکمل طور پر واضح کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اُس باطنی سکون اور قوتِ ادراک کا اندازہ ہوتا ہے جو ایک اصلی معلم اور عارفِ کامل کا حصہ ہوتی ہے۔ پہلا مجسمہ ساکیا فرقہ کے ایک لاما کا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے پتہ لگتا ہے کہ بے خوفی بھی کیسی برکت ہے۔ دوسرے مجسمہ پر تبتی زبان میں یہ الفاظ کندہ ہیں "یان۔ لاگ ڈگیسور کی خدمت میں" یہ مجسمہ انتہائی کاملیت کا بہترین مرقع ہے۔ ان دونوں مورتیوں کی سادگی ان کو گیارہ سروالے "اوُلوکت" سے ممیز کرتی ہے۔ یہ گیارہ سروالی مورتی عام طور پر کھڑے ہوئے انداز میں بنائی جاتی ہے اور اس کے دوسرے ہاتھوں میں عام طور پر وہ ہتھیار ہوتے ہیں جن سے یہ گویا پرستاروں کی حفاظت اور حمایت کرتی ہے۔ جب غم کے مارے اس کا سر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے تو گویا اس کو گناہگار مخلوق کے حال پر انتہائی ترس اور رحم آتا ہے۔ یہ گیارہ سر عام طور پر گاؤدم صورت میں اس طرح ترتیب دیئے جاتے ہیں کہ پہلی تین قطاروں میں تین تین سر ہوتے ہیں اور آخری دو میں ایک ایک۔ سب سے اوپر کا سر "امیتابھ" (اوُلوکت کے روحانی باپ) کا ہوتا ہے۔ جو سر آگے کی طرف دیکھتے ہوئے ہوتے ہیں ان کی نظروں میں رحم بھرا ہوتا ہے، بائیں طرف کے سروں کی آنکھیں غیظ ہوتی ہیں (انسان کے گناہوں پر) دائیں جانب کے سر یا تو اپنے نیک اعمال پر متبسم ہوتے ہیں یا بداعمالوں پر حقارت آمیز نظریں ڈالتے ہیں۔ اس مورتی کے اکثر ایک ہزار آنکھیں بنائی جاتی ہیں گویا "اوُلوکت" اور "سمنت مکھ" کے مفہوم کا مادی طور پر اظہار کیا جاتا ہے۔ "اوُلوکت" کے معنی ہیں نظروں سے مرعوب کر لینے والا اور "سمنت مکھ" کے معنی ہیں وہ جس کا چہرہ ہر طرف دیکھ سکتا ہو۔ ایک ہزار آنکھوں سے مراد صرف

"تعدد و کثرت" سے تخصیص نہیں۔ برہمنی دیومالا کے ایک ہزار سر والے دیوتا اندر کے برخلاف "اولوکت" کی زائد آنکھیں اس کے زائد ہاتھوں پر بنی ہوئی ہیں جس سے اس کی طاقت کا اظہار منظور ہے۔ اکثر ہاتھ آگے کو پھیلے اور کھلے ہوئے ہیں گویا مورتی مظلوم آدمیوں کی مدد کے لئے تیار ہے، جس کی آنکھ دنیا والوں کے دکھ درد کو دیکھتی رہتی ہے اس کے ہاتھ بھی ان کی مدد کو تیار رہتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی شاعرانہ تمثیل ہے۔

مذہب کا اظہار دو مختلف طریقوں سے ہوتا ہے جن میں سے ایک تو بہت اعلیٰ و منزہ ہے اور دوسرا مادی اور رسمیاتی۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ ایک طرف تو ایک گروہ نے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار پتھر اور دھات وغیرہ کی مورتیوں کے ذریعہ کیا اور دوسری طرف دوسرے گروہ نے اپنے مذہبی اصولوں کی پاکیزگی اور سادگی کو برقرار رکھا اور پیچیدگی اور ہیرپھیر سے کنارہ کشی رکھی۔ تبت میں بدھ مت نے (چند چھوٹے فرقوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) اپنے عقائد کا اظہار زر و جواہر کے ذریعہ اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ اس سے بہتر ذرا مشکل ہی ہے۔ بعضوں کے نزدیک جواہرات کے سہارے کی یہ کثرت ذرا پست مذاقی کی دلیل ہوگی اور ان کا خیال ہو سکتا ہے کہ اس سے مذہبی روح کے اظہار کے بجائے اخفا ہوتا ہے۔ روحانی اہمیت کچھ بھی ہو اظہارِ خیال کا طریقہ پُرمعنی ہونے سے زیادہ مؤثر و دلنشین ہونا چاہئے۔

بدھ مت اپنی اصلی صورت میں آرٹ کو "تفکر" یا "دھیان" کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ تبت میں مذہبی نقاشی اور صورت گری نے (خاص طور پر مہاتما بدھ اور ان کے چیلوں کی مورتیوں کے سلسلہ میں) ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا تھا۔ رنگ، بیٹھنے اور کھڑے ہونے کا انداز اور حدیہ کہ پیمانے تک مقرر تھے اور ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہو سکتی تھی۔ بدھ کی وہ تصویر جس میں قبلائی خاں اور اس کی ملکہ کو ہدیش دیتا ہوا دکھایا گیا ہے ہمیشہ ایک ہی انداز سے بنائی جاتی رہی ہے جس کی تفصیل یہ ہے:۔ تصویر کے بیچ میں مہاتما بدھ کو بٹھایا جاتا ہے، اس کے بعد قبلائی خاں کو۔ ملکہ کو

سب سے کم اہمیت دیجاتی ہے۔ قبلائی خاں کا بدھ مت اختیار کرنا ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا اور "لامائیت" کو اس چینی شہنشاہ سے بڑی تقویت ملی۔ قبلائی خاں کا جدِ امجد چنگیز خاں سنہ ۱۲۰۶ء میں تبت کو فتح کر چکا تھا۔ مارکوپولو کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ قبلائی خاں ایک روشن خیال حکمران تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اپنی وسیع سلطنت کے تمام تہذیب یافتہ اطراف و اکناف کو ایک سلسلہ میں مربوط کر دے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے واسطے اس نے سب سے بڑے لاما کو اپنے دربار میں طلب کیا اور لامائیت کو چین اور منگولیہ کے تمام مذاہب سے قریب تر پایا۔

بدھ مت کے بنیادی اصول جو اب تک لامائیت کی اکثر "شاخوں" میں پائے جاتے ہیں آگے چل کر مبتی آرٹ کے ہاتھوں "کثرت پرستی" (بہو دیوادھ) سے گراں بار ہو گئے۔ مثلاً "تنترایت" کی بدعت خبیثہ کو دسویں صدی سے آج تک لاما لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں اور یہ لامائیت کا ایک جزو بنی ہوئی ہے۔ لاماؤں کی خوفناک مورتیاں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں اور لاماؤں کی "تجرید تجسیم" کی من گھڑت بھی ایک حد تک کلیسائی حکومت کی ایک سیاسی چال تھی۔ مہاتما بدھ کے بنیادی اصول ساتویں صدی میں تنترائیت کی وجہ سے بھی مسخ ہو گئے اور اسی کے اثر سے بدھ مت رو بہ زوال ہو گیا۔ نسوانی قوتوں (استری شکتی) کی پرستش کے مسلک نے بدھ مت کی رہی سہی جان کو بھی سلب کر لیا۔ "تنترائیت" "پراکریتی" کے اس اصول پر مبنی ہے جس کا انکشاف و اظہار کالی یا درگا سے ہوا۔ کالی یا درگا، پرشش یا شیو کی نسوانی قوت ہیں اور شیو خلاقِ اعظم کی ایک ہیولیٰ ...

اگر یوگ کے طریقوں پر کاربند ہونے سے یوگ کے عامل میں کوئی روحانی نور پیدا ہونا ممکن ہے تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنے کم یوگیوں نے اپنے روحانی انکشافات کا اظہار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دینی پیشوا عام طور پر لوگوں کو ایک قسم کی روحانی ظلمت میں ڈھانپے رہے اور انھوں نے ایک حقیقی عارف کامل کی طرح اپنے عرفان اور علم حقیقی سے اوروں کو باخبر نہیں کیا۔ جن یوگیوں کو فی الواقع معرفت اور صفائے قلب حاصل ہو گئی وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر کٹیوں میں گوشہ نشین ہو گئے۔ عقائد رسمی کی خرابیوں کے خلاف ہم کسی ایسی انقلابی روح کو کارفرما نہیں دیکھتے جو یورپ میں "نشاۃ الثانیہ" کے دوش بدوش سرگرم عمل تھی۔

غزل — پروین راغب پروین

اعدا سے ہے شکوہ نہ مجھے تم سے گلا ہے
وہ دیکھ رہی ہوں جو مقدر میں لکھا ہے

مجھ کو یہ سبق دانۂ گندم سے ملا ہے
دراصل بقا، تکملۂ نقشِ فنا ہے

کیونکر نہ میں اس درد کو سینے میں جگہ دوں
سرکارِ محبت سے یہ انعام ملا ہے

اب تک ہے تری یاد انیسِ دلِ مضطر
دنیائے تصور میں تو ہی جلوہ نما ہے

دیکھو اس بتِ رعنا کو صنم خانۂ دل میں
مشتاقِ تجلی! حرم و دیر میں کیا ہے

عنوان ہیں دو ایک ہی افسانے کے وہ
جو دیر میں بت ہے وہی کعبہ میں خدا ہے

معلوم ہے پروین! ترے نغموں کی حقیقت
یہ ربِ دو عالم کی فقط لطف و عطا ہے

یہ زندگی

افسانہ

نسیمہ سوز

رات کی تاریکیوں میں۔ یا دوپہر کے سناٹے میں جب میں اس کو یاد کرتی ہوں تو کانپ اٹھتی ہوں۔ گرمیوں کی تعطیل میں جب میں وہاں پہنچی تو پہلے پہل اسے دیکھ کر چیخ اٹھی تھی۔ میرے اللہ۔ وہ انسان تھی یا زندہ لاش؟

اس کی آنکھیں بالکل اندھی ہو چکی تھیں۔ چہرے پر صرف اس کی آنکھوں کے نمایاں گڑھے موجود تھے۔ اور اس کے سر بال کی قید سے بالکل آزاد تھے۔ میل کی تہہ سر پر جمی ہوئی تھی۔ جھریوں پڑے ہوئے چہرے پر ناک کے دو سوراخ بہتی ہوئی نالیوں کی طرح ہر وقت بھیگے بھیگے رہتے۔ اور اس کے ہاتھ کندھوں پر سے اس طرح جھولتے رہتے جیسے کسی درخت کی بے جان سوکھی ہوئی ٹہنیاں لٹک رہی ہوں۔ وہ زیادہ تر بیٹھی ہوئی نظر آتی تھی۔ محض ایک تہبند اس کی کمر کے گرد لپٹا رہتا تھا۔ باقی عریاں جسم پر سکڑے سکڑے چمڑے ایسے معلوم ہوتے جیسے وہ مٹیالی رنگ کے شکن دار کپڑے پہنے ہوئی ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ یہاں کی پرانی دایہ تھی۔ اس نے رانو۔ منو۔ اور محمود کو گود میں کھلایا تھا! جب شروع شروع وہ اپنے پرانے مالک "دارو غہ جی" کے یہاں سے بھاگ کر یہاں آئی تھی تو بڑی تیز طرار سی تھی۔ ہر قسم کے کام میں اسے مہارت حاصل تھی۔ چھٹپن میں منو تو اس سے الگ ہی نہ ہوتی تھی۔ اور رانو تو ابھی تک اسے "مما" ہی کہتی ہے —— !

پھر ایک دن محمود کے "بی اے" پاس ہونے کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ نہایت پر تکلف دعوتِ عام تھی۔ طرح طرح کے مہمانوں سے صحن، چھوٹے بڑے سب ہی کمرے بھرے ہوئے تھے۔ یہ بچاری بھی مہمانوں کی خاطر مدارات میں منہمک تھی۔ بڑے بڑے شیشے کے جگ اور گلاس لئے ہر ایک کو کھانے کے بعد پانی بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً اس کا پاؤں پھسلا اور گر پڑی۔ شیشہ کا ایک دبیز ٹکڑا پیشانی کے عین وسط میں بری طرح چبھ گیا۔ بے انتہا خون نکلا۔ سبز کنارے کی پیلی ساری سرخ سرخ خون سے شرابور ہو گئی۔ ڈاکٹر آیا۔ مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ پیشانی کے زخم کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بھی شدید درد اور جلن تھی۔ رات کے دو بجے تک جلن اور تکلیف سے تڑپتی رہی پھر سو گئی۔ اس رات کے بعد پھر اس کے لئے کوئی دن نہ ہوا۔ اس کی دنیا سورج کی روشنی اور چاند کی کرنوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی —! اور اس کی روح رات کی سی تاریکیوں میں بھٹکتی رہی —— !

سب کا خیال تھا کہ شاید کوئی کانچ کا ٹکڑا اس کے دیدہ میں بھی چبھ گیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ تھی۔ سر سے اس قدر خون نکلنے کی وجہ سے اس کی بصارت جاتی رہی۔ روز بروز اس کی نقاہت بڑھتی گئی۔ بڑھاپا اپنا رنگ چڑھاتا رہا۔ اندھی آنکھوں کی تپش خون اور پیپ بن کر آنکھوں سے بہتی رہی۔ اور وہ اپنی زندگی کے دن یونہی گذارتی رہی۔

شروع شروع میں تو سب لوگ اس پر ترس کھاتے تھے۔ اور وہ بھی لاٹھی کا سہارا لے کر چلتی پھرتی رہتی تھی۔ لیکن آنکھوں کی تکلیف دن بدن زیادہ ہونے لگی اور وہ ہفتوں کوٹھری میں پڑی کراہتی رہتی۔

مالکن نے اسے گھر کی سب سے پرانی کوٹھری میں پھینکدیا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے خون اور پیپ کی بو ایسی تھی کہ دماغ گندے ہو جاتے۔ لڑکے لڑکیاں اس سے نفرت کرنے لگیں۔ گھر کے سب لوگ اس سے گھن کھاتے تھے —— !

اُفوہ یہ بڑھیا ہکتی کیسی ہے۔ آخ تھو۔ دن بدن ہوتی کیسی موتی جا رہی ہے جیسے قبر کی مردہ ہو۔ اور تو۔ اور اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں ہے۔ کیسی بے پرواہی سے بیٹھی رہتی ہے؟ گندی ہے، گندی!

میلے میلے پسینے سے تر کپڑے خون اور پیپ سے بھیگ کر عجیب بو پھیلاتے ہیں۔ توبہ۔ اس صحن کی طرف جانے کو جی نہیں چاہتا ہے —!

اس کی دنیا بس اسی چھوٹی سی کوٹھری تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اب تو وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ اسی کوٹھری میں کھانا پینا۔ رہنا، سہنا سب ہی کچھ تھا!

مالکن کی اتنی مہربانی تھی کہ مہترانی دونوں وقت اس کی غلاظت کو صاف کر جاتی تھی۔ اور کھانا وقت پر مل جاتا تھا۔ لیکن ہمیشہ ایک ہی طرح کی چیزیں کھاتے کھاتے گھبرا جاتی اور زور زور سے چیخا کرتی۔ ہم کو میٹھے چاول دیجئے۔ میٹھے چاول۔ اور دو گھی کی تلی ہوئی پوری —! پوری کھائے بڑا دن ہو گیا۔ کہتے وقت وہ بار بار زبان چٹخاتی —— !

اس کی باتیں سُن کر گھر کے سب ملازم ہنسنے لگتے۔ واہ کیا خواہش ہے بوڑھیا کی۔ جیسے نواب ٹھہری میٹھے چاول اور گھی کی پوریاں مانگتی ہے۔ کمینی کو موت بھی نہیں آتی ہے۔ ہم سب اس کے بھی نوکر ٹھہرے جو کھانا اور پانی پہنچایا کریں؟ اس کے پاس جانے سے دماغ سڑ جاتا ہے —! نہ جانے کتنی بڑی زندگی ہے اس بوڑھیا کی —!

مالکن کو جب خبر ہوئی تو اس قدر ناراض ہوئیں کہ خدا کی پناہ۔

نگوڑی۔ جیسے میں اس کی رشتہ دار ہوں جو اس مہنگائی میں کھانے اور کپڑے دوں اور یہ بیٹھی بیٹھی مزے سے کھائے؟ اور اس پر یہ نخرے کہ ہم سے روکھا پھیکا نہیں کھایا جاتا۔ ایسی ہی نوابی ہے تو چلی جا

اپنے پرانے مالک کے یہاں۔ نمک حرام جب اپنے پرانے مالک کی نہیں ہوئی تو میری کیا خاک ہوگی؟ بوڑھی ہوگئی قبر میں پاؤں لٹکائے ہے پر منہ کا لالچ نہ گیا۔ اللہ ایسی کو دنیا میں رکھتا ہی کیوں ہے—؟

بیرا اپنا وقت اچھی غذا اور اچھے کپڑوں میں گذار چکی تھی۔ اس نے گہنے بھی بنوائے تھے اور روپیہ بھی جمع کیا تھا۔ پچاس روپیہ اس نے جمع کر کے سب کی نظریں بچا کر زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اپنے برے بھلے دن کے لئے—! لیکن قسمت بھی کیا چیز ہے انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ جب مرغیاں اس زمین پر جا کر اپنے پنجوں سے مٹی کریدنے لگتیں تو وہ کانپ اٹھتی۔ جیسے اس کے سارے چھپے ہوئے روپے مرغیوں کے پنجوں کے نیچے چمک رہے ہیں—! اللہ تو ہی میرے مال کا محافظ ہے—!

مرغے جب اس خزانہ کے پاس جا کر اذان دیتے تب وہ لرزنے لگتی۔ یہ مرغا گویا پکار پکار کر کچھ کہہ رہا ہے۔ اور اس کا راز افشا ہوا جا رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں مرغے کو کوسنے لگتی۔ اور جب بچے اُدھم مچاتے ہوئے اس کونے پر سے گذرتے تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سارے بچے اس کے کلیجہ کو کچل رہے ہیں۔ اس سے ضبط نہ ہوتا وہ اپنی لاٹھی کا سہارا لیتی ہوئی اسی مقدس زمین پر آ بیٹھتی تھی—!

ایک دوپہر کو جب یہ سوئی ہوئی تھی۔ ننھو کی چھوٹی بہن جمو نے اپنی گڑیا کا گھروندا بنانے کے لئے مٹی کھودنی شروع کی۔ تھوڑی سی زمین کھودنے کے بعد چاندی کے روپے نکلنے شروع ہوئے— پچاس روپیہ! بڑھیا کا مخفی خزانہ! سارے گھر میں یہی چرچا تھا کہ یہ روپیہ کہاں سے لائی جب کہ اس نے زیور بھی بنایا ہے۔ روز روز بازار سے کچوریاں اور مٹھائیاں بھی منگوا کر کھاتی تھی— پھر یہ روپیہ؟ جب مالکن نے اس کو بلا بھیجا تو لرزتی ہوئی، لاٹھی کا سہارا لئے گرتی پڑتی مالکن کے حضور میں پہنچی— اور جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ روپیہ تو کہاں سے لائی تھی، تو وہ رو پڑی۔ اس کے بدن کی کپکپاہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا۔ "اللہ قسموں— اللہ قسموں— یہ ہمرے نا— ہیں— نا— ہیں—؟"

"سچ بتا کیا یہ روپے تیرے نہیں ہیں؟" مالکن نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"بی بی جی— اللہ قسموں یہ ہمرے نا ہیں۔" وہ ہچکی لیتی ہوئی بولی۔ اس کو اپنا سرمایہ لٹتا ہوا نظر آیا— ! یہ محنت کی کمائی— برے بھلے وقتوں کا سہارا— اگر وہ سچ سچ کہہ دیتی تو۔

"ٹھیک ٹھیک بتا کتنے روپے ہیں تیرے؟ نہیں تو میں یہ روپے نوکروں میں تقسیم کر دوں گی۔ کمینی— چوری بھی کرتی تھی تو—؟ جب ہی نا زمین میں چھپا کر رکھا تھا! اسی چوری کی بدولت تو یہ حال بنا— اچھا صاف صاف بتا کہاں سے لائی تھی؟"

وہ گھبرا رہی تھی— یہ چوری کا الزام اس پر ناحق لگایا جا رہا تھا۔ لیکن وہ اس بھرے مجمع میں کیسے کہہ دیتی— آج سے دس بارہ سال پہلے کی بات! جب وہ بھرے بھرے جسم والی شریفن تھی، لال اور پیلی ساریوں میں لپٹی ہوئی، ہاتھ میں چاندی کا کنگن اور پاؤں میں پائل پہنے، جب وہ باہر کے کنوئیں سے پانی بھر بھر کر اپنی کمر پر رکھ کر لاتی تھی تو— منشی جی اس سے کتنی چھیڑ کیا کرتے تھے— اور پھر— رفتہ رفتہ منشی جی اس پر بہت مہربان ہوگئے تھے لیکن— اب یہ بوڑھے منشی جی اسے دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ نفرت اور گھن سے ان کی حالت عجیب ہو جاتی تھی۔

اگر اس نے اس وقت اس دوسرے راز کو بھی فاش کر دیا تو اسے گھر سے نکال دینے کے علاوہ اس بڑھاپے میں منشی جی کی الگ ذلت ہوگی—!

"ارے بتاتی ہے کہ نہیں؟ کمبخت دو گھنٹے سے دماغ خراب کر رہی ہے۔ چوری نہ کی تو روپیہ آیا کہاں سے؟" مالکن نے گرج کر کہا۔

"بی بی جی۔ اللہ قسموں خدا قسموں۔ یہ ہمرے نا ہیں۔"

اس کے بعد وہ اپنی کوٹھری میں جا کر دیر تک روتی رہی۔ اس کا مال ضبط ہو چکا تھا۔

جب کبھی میں اس کی کوٹھری کے پاس جاتی تو وہ ہمیشہ بکواس ہی کرتی رہتی تھی۔ اگلی ساری باتیں اسے اب تک یاد تھیں۔ ابھی تک ننھو۔ راجو اور محمود کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ لیکن یہ تینوں کبھی بھول کر بھی اس طرف سے نہیں گذرتے تھے—! وہ اپنی کوٹھری میں ایک بوسیدہ سی چٹائی پر بیٹھی رہتی تھی۔ کونے میں پانی کی ٹھلیا دھری رہتی اور ٹھلیا کے پاس ہی ایک ٹوٹا ہوا پیالہ رکھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی میلی سی گٹھری کو کھول کر پرانے چیتھڑے، پرانی ساریوں کے کنارے کو لپیٹتی رہتی۔ یا الجھے الجھے دھاگوں کو نہایت انہماک سے سلجھاتی رہتی تھی۔ ہاں اس کی گٹھری میں اس کے دو تہبند۔ اور ایک کرتہ بھی تھا جسے وہ بار بار کھول کر ٹھیک سے تہہ لگاتی رہتی تھی—! بس اب یہی تھا اس کا سرمایۂ حیات!

بعض اوقات مہترانی کے آنے سے قبل اس کوٹھری کے کسی کونے میں گیلی مٹی اور دھول میں چھپی ہوئی غلاظت کی بو ادھر سے گذرنے والوں کے لئے عذابِ جان اور سوہانِ روح ثابت ہوتی تھی— وہ اپنی رفع حاجت پوری کرتے وقت "ایک بلی" بن جاتی تھی—!

سوکھے سوکھے ہاتھوں اور لانبے لانبے ناخنوں سے مٹی کرید کر

وہ اپنی گندگی" کو چھپا دیتی تھی ——! اور بعض دفعہ پانی دینے والا پانی دینا بھول جاتا تب وہ اپنی کھٹری میں سے پرانے چیتھڑے نکال کر پانی کی ضرورت کو پورا کر لیتی تھی ——!

اب وہ اس گھر میں ایک بیکار اور نجس چیز سمجھی جانے لگی تھی۔ کوئی بھی یہ تصور نہ کرتا تھا کہ یہ کسی زمانہ میں اس گھر کی ایک خیر خواہ ملازمہ تھی۔ اور تین بچوں کو کھلایا بھی!

برسات کی سیاہ راتوں میں، سردیوں کی لا بنی راتوں میں بھی اس کی کوٹھری قبر کی سی تاریک رہتی تھی —— ایک بار میں نے منجھو سے کہا بھی کہ اس کی کوٹھری میں بھی روشنی کر دیا کرو۔ میری بات سُن کر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اندھوں کو روشنی سے کیا واسطہ؟ ان کی دنیا میں تو دن رات سب ہی برابر ہیں۔ ان کے لئے تو بس اندھیرا ہی اندھیرا ہے!

جب کھانے کا وقت ہوتا تو وہ چیخ چیخ کر کھانا مانگنے لگتی۔ پھر مٹی کی تھالی میں پروسا ہوا چاول، سالن، وہ جلد جلد حلق سے اتارنے لگتی جیسے وہ بہت دنوں سے بھوکی ہو۔ مکھیاں اس کے سارے جسم اور میل سے بھرے ہوئے سر پر ہر وقت اپنا اڈا جمائے رہتی تھیں۔ اور جب اس کے سامنے چاول، سالن، دال سے بھری ہوئی تھالی آتی تو سب کی سب ٹوٹ پڑتی تھیں۔ بعض دفعہ تو وہ مکھیاں تک کھا جاتی تھی ——!

جب کسی کی موت کی خبر سنی جاتی۔ مالکن کہہ اٹھتیں "اللہ تمام دنیا میں موت کا فرشتہ جاتا ہے لیکن اس گوڑی دائی کے پاس نہیں آتا۔؟" لڑکیاں ہنس ہنس کر کہا کرتیں —"فرشتہ بھی گھن کھاتا ہے اس سے!"

ایک صبح۔ پورے گھر میں ہنگامہ برپا تھا۔ بڑھیا مر گئی ——! سانپ نے ڈس لیا بچاری کو۔ اور سانپ اب تک مرنے والی کی چٹائی میں چھپا بیٹھا ہے ——! سب لوگ اس کی کوٹھری کی طرف جا رہے تھے۔!

موٹا سا سانپ ٹوٹی ہوئی چٹائی کے کونہ پر اینٹھا پڑا تھا۔ اور بوڑھیا موت کی گہری نیند سو رہی تھی ——!

جیسے ہی سانپ پر وار کیا گیا وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ارے! وہ تو اب تک زندہ تھی؟ سانپ ختم ہو چکا تھا۔ اور بوڑھیا چٹائی کے دوسرے کونہ پر بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"اللہ —— سانپ تھا؟ ہمرے ناہیں کاٹیس؟" پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ بغیر دانت کے پوپلے ہونٹ جبڑے تک سب کھل گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خود اپنی اس زندگی کا مذاق اڑا رہی تھی۔

قدیم ہندوستان کی بحری قوت

شنکر دیال

ہندوستان جغرافیائی نقطۂ نظر سے باقی دنیا سے الگ ہے۔ شمال میں اونچے اونچے اور ناقابل عبور پہاڑ ہیں اور اس کا جنوبی حصہ بحرالہند سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ ان جغرافیائی حالات کا ہندوستان کی تاریخ پر بہت کم اثر پڑا۔ ہندوستان کی قدرتی رکاوٹوں کو پار کر کے مشرق اور مغرب کے پڑوسی ملکوں کے تعلقات تجارتی، ثقافتی اور سیاسی تھے۔ یہاں سے مصر، عربستان اور روما کی قدرتی بیداوار مثلاً ہاتھی دانت، موتی اور مسالے بھیجے گئے۔ ہندوستان کی ریاضیات، جوتش، ویدک اور روحانیت نے یونان، ایران اور عربستان پر اثر ڈالا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں ہندوستانی مذہب، فن اور تعمیر کا ظہور ہوا۔ ساتھ ہی ان ملکوں کے خیالات اور تجارت کا بھی ہندوستان پر اثر پڑا۔ ہندوستان سے ان کے تعلقات کا انحصار جس چیز پر ہے وہ ملک کی بحری قوت ہے۔ ہندوستانیوں نے سمندر پر قبضہ کر لیا تھا۔ جہاں تک بحری سیاحت کا تعلق ہے قدیم زمانہ میں ہندوستان کو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج برطانیہ کو حاصل ہے۔ اس کی سمندری فوج بھی بہت طاقتور اور مشہور تھی۔

ہندوستان نے بہت قدیم زمانہ ہی میں اچھے ملاح پیدا کئے تھے۔ ہربلاس سردا نے اپنی کتاب "ہندوؤں کا تفوق" میں کچھ مستند مورخوں کے اقتباسات نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھ ہزار برس گزرے مصر پر ہندوستانیوں کا قبضہ تھا۔ اگر اس خیال کو صحیح مان لیا جائے تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ حضرت عیسٰی کی پیدائش سے ہزارہا برس پہلے ہندوستان میں طاقتور بحری فوج موجود تھی۔ سندھ کی وادی انڈس میں جو پانچ ہزار سال پہلے کی تہذیب کے متعلق انکشافات ہوتے ہیں ان سے بھی قدیم زمانہ میں ہندوستان کی بحری سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر جنوبی ہندوستان اور سرخ سمندر کے ساحل سے یہاں آئے اور ظاہر ہے کہ نقل و حمل کا ذریعہ سمندر ہی ہو سکتا ہے۔ وادی سندھ کے لوگ آریوں کے ہندوستان آنے سے پہلے بھی بحری مہموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

جب آریے ہندوستان میں آئے تو انھوں نے قدیم روایات کو قائم رکھا بلکہ یہاں آباد ہو کر انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی ترقی کی۔ عالموں نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے ادب، فن اور آثار قدیمہ سے ایسی شہادتیں اکٹھا کی ہیں جن سے آریوں کے ابتدائی عہد کی بحری سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستان کے قدیم ترین ادب یعنی ویدوں (۱۵۰۰ قبل مسیح) میں بحری سفروں کا ذکر ملتا ہے۔ رامائن میں بھی بحری جنگوں کی تفصیلات درج ہیں اور بتایا گیا ہے کہ "تاجر سمندر پار جا کر راجہ کو تحفے پیش کرتے تھے"۔ مہابھارت میں پانڈوں کی بحری مہموں اور کوروؤں کے سپاہیوں کے جہاز ٹوٹنے کا ذکر ہے۔ ہندوؤں کے قانونی کتابچوں میں جو سوتر کہلاتے ہیں، بحری سفروں اور جہازوں کے مالکوں پر محصولوں کا ذکر آیا ہے۔ ہندوؤں کے مشہور قانون ساز منوجی نے بحری بیمہ کے متعلق قوانین بنائے۔ ایک قانون کی رو سے ملاح بحیثیت مجموعی مسافروں کے اس مالی نقصان کے ذمہ دار قرار دئے گئے ہیں جو ان کی غلطی سے واقع ہو۔ ایک دوسرے قانون کے مطابق انھیں اس نقصان سے بری قرار دیا گیا ہے جو انسانی قوت سے باہر ہو۔ جاتک کی شہادتوں سے ایک مشہور عالم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ پٹنہ اور بنارس کے بازاروں سے مغربی ساحل کی بندرگاہوں پر مال لایا جاتا تھا اور وہاں سے اسے ہندوستانی جہاز ساحلوں کے ساتھ ساتھ بابل، لیوانت (بحیرۂ روم کے مشرقی ممالک) شام اور مصر لے جاتے تھے۔ اس بات کی شہادت کہ ہندوستانی جہاز بحیرۂ عرب کو پار کر لیتے تھے یہ ہے کہ انھوں نے جزیرہ سوکوترا (سوکھادھارا) معلوم کر لیا تھا۔ مشرقی ساحل سے جہاز چمپا (سیام) ملایا اور انڈونیشیا تک جاتے تھے۔ یہ پانچویں صدی قبل مسیح کے قریب کا زمانہ ہے۔

چندرگپت موریہ (۳۲۱ — ۲۹۷ ق-م) کے عہد سے ہندوستان کا تاریخی دور شروع ہوتا ہے اور بحری سفروں کا علم حاصل ہونے کے ذرائع بڑھ جاتے ہیں۔ چندرگپت کے دربار میں یونانی سفیر میگستھنیز جہازی صنعت کا ذکر کرتا ہے جو حکومت کی ملکیت تھی۔ چندرگپت کے عہد پر کوٹلیہ کی کتابیں مستند خیال کی جاتی ہیں۔ اس نے سیاسیات اور انتظام سے متعلق کوٹلیہ نام ہی کی ایک کتاب لکھی ہے یہ راجہ کا گورو اور منتری (وزیر) تھا۔ اس کتاب سے اس عہد کی بحری سرگرمیوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بحری فوج کا محکمہ موریہ راجاؤں کے چھ بڑے محکموں میں تھا۔ یہ ایک وزیر کے ماتحت تھا۔ اس کے ماتحت بندرگاہوں کے افسر ہوتے تھے جن کے فرائض میں جہازوں کی دیکھ بھال

تھی۔ کوٹلیہ بڑھتی ہوئی تجارت اور جہازرانی سے متعلق محصولات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جہازرانی اشوک کے زمانہ میں بھی جاری رہی۔ موریہ خاندان کی حکومت ختم ہونے سے جہازرانی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہندوستان کے تاجروں کے حوصلے، ملاحوں کی عقلمندی اور نوآبادیاں تلاش کرنے والوں کی مہموں کی وجہ سے جہازسازی کی صنعت تیرھویں صدی تک بدستور جاری رہی۔

آیئے اب اس سولہ سو برس کے زمانہ (۳۲۱ ق۔م ——— ۱۳۰۰ء) میں ہندوستانی ملاحوں کی سرگرمیوں پر غور کریں۔ ان کے کارنامے بحرالہند کے مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مغربی سفروں کا مقصد تجارت تھا۔ یہ لوگ ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی بندرگاہوں سے روانہ ہوتے تھے ان میں سے کچھ بندرگاہوں کے نام "پیرپلس" میرس ایری تھیری" کتاب میں ملتے ہیں۔ ملک کے اندرونی حصوں سے تجارت کی خاص منڈی بَڑوچ بتائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سوپرا، جو بمبئی کے قریب ہے۔ کالینا، جو آجکل کلیان کہلاتا ہے، منداگورا جو اب منداد کے نام سے مشہور ہے، بندرگاہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستانی ملاح اس زمانہ میں بھی ایک مقناطیسی آلہ "متسیا مینتر" استعمال کرتے تھے جس سے سمت کا پتہ چل جاتا تھا۔

ہندوستان کے ملاح اور سوداگر خاص طور پر روم جاتے تھے جہاں وہ عیش وعشرت کا سامان مثلاً مالے، موتی، خوشبودار اشیاء، جواہرات اور سوتی اور ریشمی کپڑے فروخت کر کے رومی سونا حاصل کرتے تھے۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ "رومی عورتیں ریشم کی اس قدر دلدادہ ہیں کہ وہ سونے سے تل کر بکتا ہے،" اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال روما سے چالیس لاکھ پونڈ کا سونا ہندوستان آتا تھا۔ پلائنی (رومی مورخ) کو اس کا بڑا افسوس ہے۔ لکھتا ہے "ہم اپنی عیش پسندی اور عورتوں کے لئے اس قدر نقصان برداشت کرتے ہیں"۔ دکن کے مختلف حصوں میں رومی سکّے ملنے سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان اور روما میں بہت قریبی تعلق تھا۔ مصر سے مغربی ساحل والوں کے تعلقات بہت گہرے تھے میمفس میں فلنڈرس پیٹری کی ہندوستانی عورتوں اور مردوں کی تصویریں ملی ہیں۔ ہندوستان سے مصر تک جہاز کے ذریعہ چالیس دن میں پہنچ جاتے تھے۔ جیساکہ اسٹرابو کے بیان "کہ ایک ہندوستانی ۱۲۰ سنہ ق۔م میں کشتی کھیتی ہوا پایا گیا اور مصر بھیجا گیا" سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی ملاح سرخ سمندر میں جہازرانی کرتے تھے۔ بحیرۂ احمر میں ہندوستانی ملاحوں کی بحری سرگرمیوں کا ایک یونانی زبان کے مزاحیہ ڈرامہ سے بھی ثبوت ملتا ہے جس میں دو کردار کناری زبان میں باتیں کرتے ہیں۔

اگرچہ اسکندریہ اور دوسرے مصری شہروں میں ہندوستانی آباد تھے اور ہندوستانیوں نے خلیج فارس کے ساحلوں پر اور شاید مدغاسکر میں بودوباش اختیار کرلی تھی مگر ہندوستانیوں نے بحیرۂ عرب کی جہازرانی سے نوآبادیات قائم نہیں کیں بلکہ تجارتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ البتہ مشرقی سمندروں میں بحری سرگرمیوں کا مقصد تجارت کے ساتھ سیاست بھی تھا۔

اشوک کے عہد میں جہاز تمارالپتی سے لنکا جاتے تھے۔ ایک ایسی ہی کشتی میں خود راجہ کی بہن سنگھامترا تبلیغ کی غرض سے لنکا گئی۔ ملایا میں کیرہ ایک اہم بندرگاہ بن گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ اس سے بہت عرصہ پہلے ہندوستانی ملاح خلیج بنگال کو عبور کرنے لگے تھے۔ اس کا فخر اہل اڑلیسہ (کالنگا) کو حاصل ہے جو عہد قدیم سے جہازرانی کے ماہر تھے۔

دوسری صدی عیسوی تک بحرالہند اور بحیرۂ چین جنوبی میں خوب جہازرانی ہونے لگی تھی۔ اس کی تصدیق چینیوں کے کاغذات اور یونانی جغرافیہ دان بطلیموس کے بیان سے ہوتی ہے جو لکھتا ہے کہ ہندچینی میں ہندوستانی نوآبادی تھی۔ جزائر جاوا، سماترا اور بالی میں ہندوستانی نوآبادیات قائم ہوتی جارہی تھیں۔ ان نوآبادیات میں حکومتیں ضرور قائم ہوگئیں لیکن ان کے اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ سے آمدورفت جاری رہی۔

اس سفر کے دو راستے تھے۔ ایک تو خلیج بنگال کے ساتھ ساتھ اور دوسرا بحرالہند کو پار کر کے۔ چینی سیاح فاہین نے، جو ۴۱۳ء میں ہندوستان سے چین واپس گیا، آخرالذکر راستہ کا مفصل ذکر کیا ہے۔ وہ اڑلیسہ میں تمارالپتی کے مقام پر ایک جہاز میں سوار ہوا اور پندرہ روز سفر کر کے لنکا پہنچا، لنکا سے نکوبار گیا، نکوبار سے اس کا جہاز آبنائے ملاکا سے گزر کر بحرالکاہل پہنچا۔ فاہین کے بیان سے جہاز اور مسافروں کے مذہب کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ جہاز میں دو سو تاجر تھے جن میں سے ہر ایک برہمن دھرم مانتا تھا۔

جہازوں میں ترقی ہونے اور جہازرانی کا تجربہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ملاحوں کی مشرق بعید کے سمندروں میں سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ حضرت عیسٰی کے عہد سے ہندوستان اور چین کے درمیان تعلقات قائم ہیں۔ ایک پالی زبان اور چینی زبان کی ایک کتاب میں بدھ بھکشوؤں، شاہی ایلچیوں اور سوداگروں کے سمندر کے راستے چین آنے کا ذکر ملتا ہے۔

یہ کتابیں سنہ ۷۳۰ء میں لکھی گئیں۔ چینی سیاحوں اتسنگ اور فاہین کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد ہندوستانی سیاح بھی چین گئے مثلاً سنہ ۷۲۰ء میں وجرآبودھی چین پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے بدھوں کی کئی مقدس کتابوں کا ترجمہ کیا اور بدھ مت کے متصوفانہ فرقے کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستانی جہاز جاپان بھی پہنچے۔ ایک جاپانی روایت ہے کہ جنوبی ہندوستان کا ایک شخص بودھیترا ما شہزادے شوتو دس (سنہ ۵۷۲-۶۲۱ء) سے ملا۔ اس طرح کے اور بھی سفر عمل میں آئے۔ جاپان کی ایک سرکاری دستاویز کے مطابق ایک ہندوستانی کو باد مخالف جاپان لے آئی۔ یہ شخص اپنے ساتھ بنولے لایا تھا جو ملک کے کئی صوبوں میں بوئے گئے۔

چھٹی صدی عیسوی تک جہازرانی میں جنوب بعید کے ہندوستانیوں کو برتری حاصل رہی لیکن چھٹی صدی میں شری وجے سلطنت والے ان سے آگے بڑھ گئے۔ اس ہندو سلطنت میں ملایا، سماترا اور جاوا کا مغربی نصف حصہ شامل تھا۔ ان راجاؤں کے پاس طاقتور بحری فوج تھی جس نے بحری ڈاکوؤں کا صفایا کردیا، سیام اور ہند چینی پر حملہ کیا، آبنائے ملاکا پر مضبوطی کے ساتھ قبضہ رکھا اور ہندوستان سے تعلق قائم رکھنے میں مدد پہنچائی۔ اس تفوق کی چار صدیوں کے بعد سنہ ۱۰۰۰ء میں چولا راجاؤں نے شری وجے سلطنت کی بحری فوج پر حملہ کردیا۔ سو سال سے زیادہ بحری جنگ جاری رہی۔ اس سے دونوں سلطنتیں کمزور پڑ گئیں اور چودھویں صدی میں مسلمانوں کی طاقت بڑھ گئی۔

ہم نے قدیم ہندوستانیوں کی تیرھویں صدی تک کی بحری سرگرمیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ ہندوستان کے ملاح دوسرے ملک والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے تھے۔

موجودہ ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ وہ بحرالہند پر محض اپنا قبضہ رکھنے کے خواہاں نہیں تھے بلکہ ہر شخص کو تجارت اور جہازرانی کی مکمل آزادی تھی۔ عبدالرزاق نے سنہ ۱۴۴۲ء میں لکھا کہ کالی کٹ آنے والے سب جہازوں کو برابر سہولتیں دی جاتی تھیں۔ چینی اور عرب جہازراں ہر جگہ آزادی کے ساتھ آجا سکتے اور تجارت کر سکتے تھے۔

ایک سوال جہازسازی کی صنعت کے متعلق ہو سکتا ہے۔ کچھ مصنفین نے قدیم زمانہ میں ملک کے مختلف حصوں میں کشتیوں اور جہازوں کی صنعت کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مختلف قبیلے یہ کام کرتے تھے۔ مگستھنیز لکھتا ہے کہ منظم صنعت صرف حکومت کے ہاتھوں میں تھی۔ حکومت مستریوں کو ملازم رکھتی تھی جو دوسرے لوگوں کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان دو متضاد بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک انتظام کا تعلق ہے کوئی ایک طریقہ رائج نہیں تھا۔ کچھ زمانوں اور جگہوں پر یہ صنعت نجی تھی تو کہیں اس پر حکومت کا قبضہ تھا۔ علم نباتات پر سنسکرت کی ایک قدیم کتاب "ورکش آیوروید" میں لکھا ہے کہ چار قسم کی لکڑی جہازسازی کے زیادہ کام آتی ہے۔ ایک اور مستند کتاب میں لکھا ہے کہ تختے جوڑنے میں لوہے کی کیلیں استعمال نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ ایسی صورت میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کیلیں سمندر کی تہ میں محفوظ مقناطیس کے اثرات قبول نہ کرلیں۔ سنسکرت کی ایک اہم کتاب "یکتی کلپتارو" جہازوں اور کشتیوں کو دس حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس میں مختلف قسموں کی بڑی ہوئی کشتیوں اور جنگی جہازوں کا ذکر ہے۔ جہازوں میں سامان رکھنے اور سجانے اور ان پر نقش ونگار بنانے اور روغن کرنے کے لئے رنگوں کے انتخابات کی بابت ہدایات ہیں۔ نکولو کونتی کے پندرھویں صدی کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان ہدایات پر عمل کیا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "یہاں کے لوگ ہمارے جہازوں سے بڑے جہاز بناتے ہیں۔ ان جہازوں کی پیندی میں تہرے تختے لگے ہوتے ہیں تاکہ طوفانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ کچھ جہاز ایسے بنے ہوتے ہیں کہ اگر ان کا ایک حصہ ٹوٹ جائے تو دوسرے سے سفر طے کیا جا سکتا ہے۔"

آخری قابل غور چیز قومیت ہے۔ قدیم ہندوستان میں آج کی طرح یہ لوگ انجمنوں میں منقسم تھے اور ساحل کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ سنسکرت کی کتابوں میں انھیں بہت قدیم بتایا گیا ہے۔ ان میں جو زیادہ مہم جو ہوتے تھے انھیں حکومت کچھ تجارتی اشیاء کے اجارے دے دیتی تھی۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ قدیم ہندوستان کے لوگ بڑے ملاح تھے۔ آجکل یہاں اکثر لوگ اپنے شاندار ماضی سے بے خبر ہیں۔ اگر آپ کسی معمولی آدمی سے ان چیزوں کا ذکر کریں تو وہ حیرت میں رہ جائے گا اور آپ کو خبطی خیال کرے گا۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ اپنے ملک ہی میں رہے ہیں۔ یہ وہم کہ اگر ہندو بحری سفر کرے تو اس کی ذات کھو جاتی ہے۔ اس عقیدہ کا ذمہ دار ہے لیکن بحری مہم پسند کرنے والی قوم میں اس قسم کا وہم پیدا ہونا حیرت انگیز ضرور ہے۔ اس کی ایک وجہ معلوم ہوتی ہے یعنی اسے تاریخی ضرورت نے پیدا کیا۔ جب ہندوستان پر شمال اور شمال مغرب سے حملے ہونے لگے تو ہندوستان کو اپنی حفاظت کے لئے کل تندرست و توانا آدمیوں کی ضرورت پڑی اور نوآبادیات کا بحری سفر ناممکن ہو گیا۔ سفر اور جہازرانی کو روکنے کے لئے قوانین بنانے پڑے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں رائج

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ندوستان کی کرکٹ ٹیم ۔ یہ ٹیم آجکل انگلستان گئی ہوئی ہے۔ وہاں کی متعدد ٹیموں کو کھیل ہرا کر اس ٹیم نے ہندوستانی کھلاڑیوں کا انگلستان میں سکہ بٹھا دیا ہے ۔
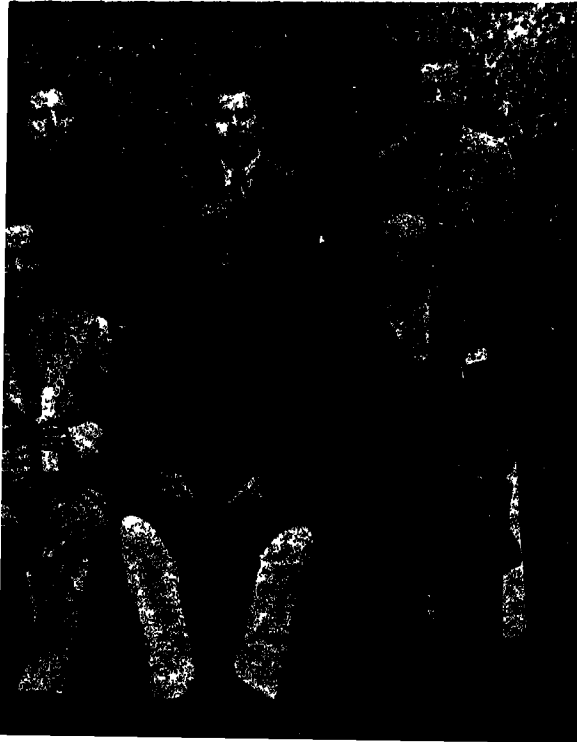
حضرت جوش اور ادارہ "آجکل"

کچھ عرصہ ہوا حضرت جوش ملیح آبادی "آجکل" کے دفتر میں تشریف لائے تھے۔ یہ تصویر اُسی موقع کی یادگار ہے ۔

بیٹھے ہوئے:۔

بائیں سے دائیں کو: کپتان سید محمد دہی (جنرل ایڈیٹر انڈیا) حضرت جوش ملیح آبادی آغا محمد یعقوب دواشی (مدیر اعلیٰ)

کھڑے ہوئے:۔

فضل حق قریشی دہلوی۔ بشیر احمد ایم اے ۔ راجیندر ناتھ شیدا ایم اے
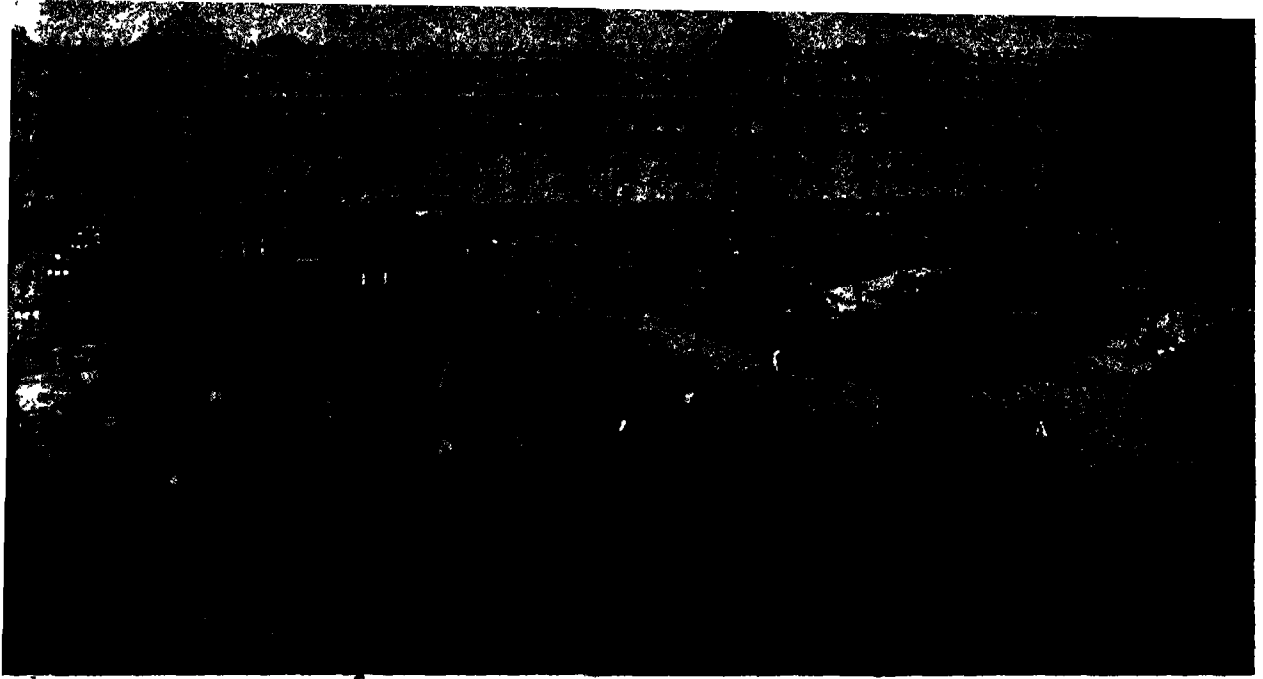
«نیشنل پیلیس» میکسیکو شہر۔ یہ عمارت بڑی شاندار ہے اور شہر کا یہ حصہ ہروقت پر رونق رہتا ہے۔

، لوگ سیر و تفریح کرنے کیلئے باغوں کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ باغات
مصنوعی طور پر بنائے گئے ہیں۔

میکسیکو

میکسیکو ایک قدیم ملک ہے اسپر بہادر دازتا
کی حکومت رہ چکی ہے۔ پندرھویں صدی میں
نے اسپر تسلط حاصل کرلیا تھا۔ موجودہ
پیلیس» اسی جگہ بنایا گیا ہے جہاں کسی ز
بادشاہ «منتزما» کا محل تھا۔ شہر کا ہر حصہ
جدید آثار سے پر ہے۔ قدیم فنون اور صنعت ر
اثرات بھی ابتک باقی ہیں۔ یہاں کا عجائب
نادرات کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ نئے قومی
اور قومی تھیٹر کے ساتھ ساتھ سولھویں صدی
ہوئے شاندار گرجا گھر اور قلعہ بھی موج
موجودہ شہر کی سڑکیں بہت صاف اور چ
یہاں کے باشندوں کا فنی مذاق بہت پرانا ہے
موسیقی، رقاصی اور پھولوں کے خاص طور
ہوئے ہیں۔ یہاں ہرقسم کی معدنیات دستیاب ہ
سونا، چاندی، لیڈ اور تانبے کے علاوہ تیل ا

...ران میں ...لین بافی ... صنعت
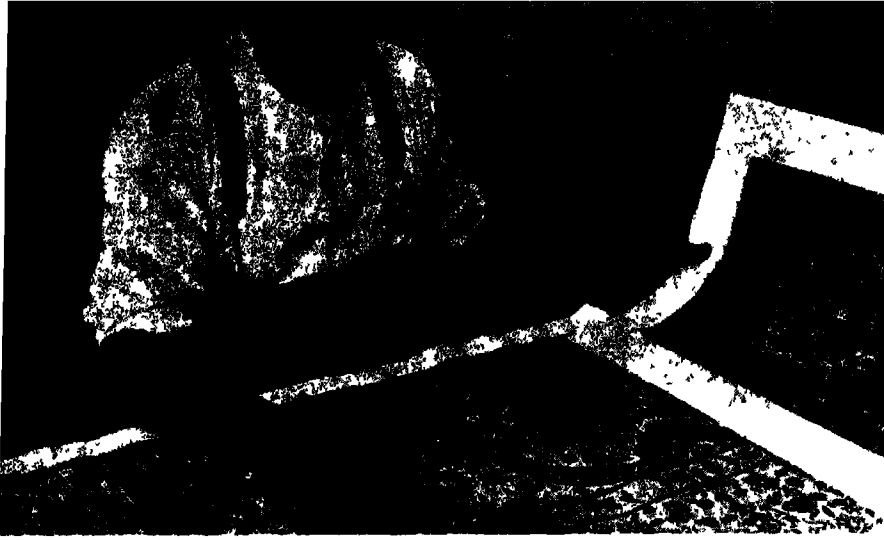
یہ شخص قالینوں کے واسطے گل کاریوں کے نقشے تیار کر رہا ہے۔

ایک تیار قالین کی سر عام نما...
ایرانی قالینوں کی ایک خو...
یہ بھی ہے کہ ان پر جتنا
چلا پھرا جاتا ہے انکا ر...
روپ اسی قدر نکھرتا ہے

یہ لڑکا کرگے پر قالین بن رہا ہے۔ ایران میں چھو...
چھوٹے بچے بھی قالین بافی کا کام بڑے انہماک او...
ہوشیاری کے ساتھ کرتے ہیں۔

کے شاهی
نباتاتی باغات

کلکته کے شاهی نباتاتی باغات اپنی نوعیت کے تمام ممالک مشرقی میں پهلے باغ هیں. انکی بنیاد ۱۷۸۷ء میں کرنل کڈ نے رکھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک بڑے انجینئر تھے۔ یه باغ دریائے هگلی کے کنارے دوسو تهتر ایکڑ زمین پر پهیلے هوئے هیں۔ یهاں کے درختوں میں سب سے زیاده اهم اور قابل ذکر بڑھ کا درخت هے۔ ان باغات کا خاص مقصد یه هے که طبی اور اقتصاری نقطهٔ نظر سے هندوستان کے درختوں اور پودوں کا مطالعه کیا جائے۔ لیکن کلکته والوں کے واسطے ان باغات کے میدان، خیابان، تالاب اور کنج بڑی عمده تفریح گاهیں هیں۔

یه ۔ لی ایک پودگر ۔ ں چھوٹے چھوٹے پودوں
کر رها هے۔

یه ماهر نباتات پتوں کی ایلبم کو نئے سرے سے ترتیب دے رها هے۔

اس باغ کے بانی کرنل کڈ کی یادگار-ستون سنگ مرمر کا هے اور اس پر ایک مرمر بن مرتبان رکھا هوا هے۔

بڑھ کا اصل تنا فنا ہو چکا ہے اسکی
اور دوسری سینکڑوں ہوائی جڑور
لے لی ہے۔ ان جڑوں میں سے بعض
تصویر میں نظر آرہی ہیں۔

باغ کا بڑھ کا درخت جو ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور جسکا قطر ڈیڑھ
ہزار فٹ ہے۔

ہر نباتات ایک نمونہ کا بغور معائنہ کررہا ہے اور اسکا مددگار
کچھ سوکھی ہوئی شاخیں اور پتیاں اسکو دکھا رہا ہے۔

ط کے درختوں کا ایک کنجھا۔ دیکھئے درختوں نے کیسی خوبصورت
شکل اختیار کرلی ہے!
←

... کا استعمال

ہندوستان میں جتنا بھی سیمنٹ استعمال ہوتا ہے وہ سب ہندوستان ہی کی پیداوار ہے۔ ہندوستان کی تمام منصوبہ بندیوں میں سیمنٹ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ سیمنٹ کی بنی ہوئی عمارتیں نہ صرف مضبوط ہوتی ہیں بلکہ صاف شفاف بھی رہتی ہیں۔ اسی لئے گرام سدھار کے سلسلہ میں سیمنٹ سے بہت کچھ کام لیا جانے والا ہے۔ حال ہی میں بمبئی سے کوئی اڑتیس میل کے فاصلہ پر ورار نامی ایک گاؤں میں اس بات کی نمائش کی گئی کہ سیمنٹ اور کنکری سے کیا کیا کام لئے جاسکتے ہیں۔ گاؤوں کے کنویں اور سڑکیں خاص طور پر کنکری اور ... جائینگی۔

ہندوستان میں بھاری بھرکم گاڑیاں ابتک بیلوں سے کھنچوا... ہیں۔ کنکری کی پختہ سڑکوں سے اب ان جانوروں کا ... ہو جائے گا۔

اس نئی وضع کی کوٹھی میں غلہ بھرا ہوا ہے۔ ... کیلئے اسکے نیچے ایک ... سا سوراخ ... ہے۔

جدید طرز کے اس پختہ کنویں سے تالابوں میں بھی پانی بھرا جاسکتا اور پیاسے آدمی اسکی ٹینکو سے پانی پی بھی سکتے ہیں۔

یمن

یمن کے ولی عہد امیر سیف الاسلام عبداللہ کا محل
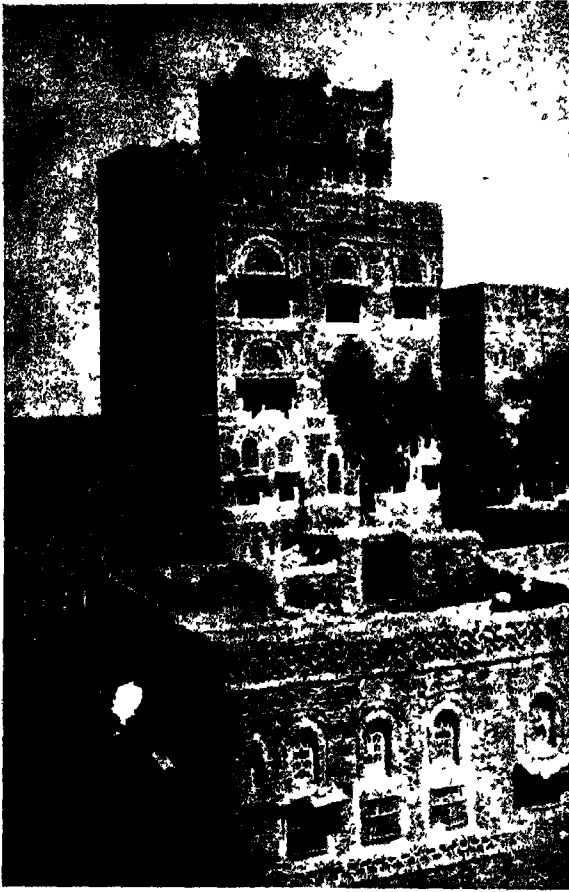
یمن کے دارالخلافہ کے ہفت منزلہ
محلات میں سے ایک محل

اسلامی ریاستوں میں یمن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسکا دارالخلافہ صنعا ایک بہت ہی پر رونق شہر ہے بازاروں میں بڑی چہل پہل رہتی ہے اور دور دور سے سوداگر اپنا مال بیچنے اور خریدار مال خریدنے آتے ہیں۔ یہاں کئی محل سات سات منزلوں کے ہیں جو بہت ہی شاندار ہیں۔ یمن کے ولی عہد امیر سیف الاسلام عبداللہ کا محل بھی قابل دید ہے۔

شہر صنعا کا ایک عام نظارہ

لارڈ لسٹر کا مجسمہ ' نیشنل گیلری ' لندن میں

جدید عمل جراحی کا ایک پیش رو

لارڈ لسٹر کو جدید حفظان صحت اور عمل جراحی کا بانی مانا جاتا ہے۔ آپکی اہم دریافتوں سے پہلے اگر کسی مریض کو زخم کی وجہ سے حرارت ہو جاتی تھی تو اسکا انجام یقیناً مو[ت] ہوتا تھا۔ لیکن لارڈ لسٹر نے اس سخت مہم پر [بہ] آسانی قابو پالیا۔

لارڈ لسٹر گلاسگو میں ' اینڈرسنز کالج میں جراحی کے پروفیسر تھا۔ کالج تو یہ چھوٹا سا [تھا] لیکن اس سے ایک شفاخانہ بھی ملحق تھا جو اس زمانہ میں بڑا بدنام تھا۔ کیونکہ یہاں کے مریضوں کے زخم سڑ جاتے تھے اور بڑے بڑے ڈاکٹر عمل جراحی کرنے سے گھبراتے تھے۔ لارڈ لسٹر نے کئی سال تک بڑی محنت کی لیکن وہ کسی کامیاب نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا۔ آخرکار ایک فرانسیسی ڈاکٹر ' پاسچر کا ایک مقالہ اسکے ہاتھ لگ گیا۔ لسٹر نے اسے بڑے غور سے پڑھا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ اب کسی زخم کے سڑنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بخار کی وجہ جراثیم ہیں جو زخم میں پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے ان کیڑوں کو مارنے کے واسطے کاربولک ایسڈ کا استعمال شروع کیا اور پہلے [ہی] عمل میں کامیاب ہوا۔

اس نے اپنے ماتحت ڈاکٹروں اور نرسوں [کو] ہدایت کی کہ آپریشن کرنے سے پہلے ہاتھوں [کو] صرف دھو ہی لینا کافی نہیں ہے بلکہ وہ کاربولک ایسڈ میں خوب اچھی طرح بھگو لیا کریں۔ جدید جراحی کا یہ پہلا جنم تھا۔ صرف جراحی ہی کا نہیں بلکہ اسکے بعد سے اسی طریقہ پر کاربند ہو گئے اور سڑنے والی کھانے کی اشیا بھی عرصہ تک محفوظ رکھی جاسکتی اور دنیا کے ایک سرے [سے] دوسرے سرے تک لے جائی جاسکتی ہیں۔

جوش ملیح آبادی

"کتابستان" میں باوصفِ وضع و شکل جب مجھکو
اودھ کا ایک سرمایہ پرست انساں نظر آیا
مرے ہاتھوں سے "باغی" کا رسالہ گرنے والا تھا
کہ میرے "دوست" نے ہنستے ہوئے چپکے سے تبلایا
یہی ہیں "شاعرِ اعظم" ـــــ انہیں کو "جوش" کہتے ہیں
میں یہ سنتے ہی اک نازک غلط فہمی پہ شرمایا
ـــ "جنون و حکمت" "نقش و نگار" و "حرف آخر" میں
مجھے شاعر نے کیا بخشا ہے، اور کیا دینے والا ہے
ابھی تک جو بھی ہے، خیام و حافظ ہی کی محفل کا
کوئی ساقیِ رنگیں ہے۔ کوئی نازک پیالہ ہے
مگر اتنا تو ہے ان اجنبی، رنگین نغموں کو
انیس و میرزا کی بزم کے سانچے میں ڈھالا ہے
مرا ایمان ہے، اس شاعرِ اعظم کی محفل میں
محبت کی افق کا نرم اور نازک اجالا ہے
نہ جانے کتنے اشکوں، کتنے خوابوں، کتنے گیتوں کو
اسی نے دامنِ گنگ و جمن میں لیکے پالا ہے
برا ہو اسکا جس نے شاعرِ رومان و فطرت کو
سلام! اک "انقلابی رنگ" میں اسوقت ڈھالا ہے
ـــ "ادب" کو زندگی کا اک حسیں نغمہ ہی کافی ہے
"محبت" جانتی ہے جوش کو اتنا ہی کافی ہے!!

فراق گورکھپوری

ـــ ایک بار، تین بار ـــــ اور اب تو بار بار
زندگی کے فلسفے ـــ زندگی کے شاہکار!
زندگی کی دلکشی ـــ زندگی کی تلخیاں
تلخیوں میں نرم نرم آنسوؤں کی جھلکیاں
آنسوؤں کی جھلکیوں میں گرم گرم جسم سے
موت دانت پیس لے اور حیات جھوم اٹھے
حسنِ نغمۂ فراق، اک اداس چاندنی
چاندنی کے ساز پر اک لطیف نغمگی
نغمے سرد پڑتے جائیں اور سحر ہوتی جائے
چاندنی درختوں سے دور ـــ ایک گیت گائے
میں تو تیرے دھیان کا اک حسین عکس تھی
دیکھ صبح ہو گئی ـــــ ڈھونڈ اپنی زندگی ـــ!!"

فیض احمد فیض

"نقشِ فریادی" کا مجموعۂ دلکش، اور میں
شجرِ ماہ کی شاخوں کے تلے محوِ خیال!
زندگی گیت ہے۔ ان گیتوں میں کچھ درد بھی ہے
درد کو گیت سمجھ لوں تو میں گاؤں کیسے؟
چاندنی رات میں رقصندہ ہیں نازک اجسام
سوچتا ہوں انہیں سینے سے لگاؤں کیسے؟
گیت ٹوٹے ہوئے بربط پہ سناؤں کیسے؟
دیکھوں، تاریکیِ غم میں کوئی لے ہو شاید
اے شبِ ماہ کے جلوو! میں ابھی آتا ہوں!!

ن۔ م۔ راشد

"ماورا" ـــ یعنی، پلازا کی حسیں شام کے بعد
اپنے کمرے کی ٹیبک میز پہ ـــ نغماتِ جمیل!

(سلام مچھلی شہری)

سوئیزرلینڈ کی جھیلوں میں یہ بنگال کے گیت
آئینہ خانۂ پیرس میں اجنتا کے حسیں
دور — مغرب کے افق پر یہ ستاروں کا ہجوم
مادرِ گنگ وجمن! کیا ترے آنسو ہیں وہیں!
ان ستاروں میں ترے درد کی تابش تو نہیں
ـــ ماورا "مجھکو مئے ناب دیئے دیتی ہے
زندگی ہاتھوں میں زہراب دیئے دیتی ہے"!!

اسرار الحق مجاز

"یہ ہے پیمانہ۔ یہ بربط۔ یہ مئے وساقیٔ ناز"
مرحبا، زندگیٔ محفل "آہنگِ مجاز" ـــ!
تیری آشفتہ مزاجی کی قسم اب بھی مجھے
تیری اس محفلِ رنگیں میں سکوں ملتا ہے
تونے "تلوار اٹھائی تھی" ہے لیکن ہر بار
دور — پازیب کی نرم اور سہانی جھنکار
تیرے جذبات کو مخمور کیئے دیتی ہے
دیکھتا ہوں کہ تجھے دور کیئے دیتی ہے
جنگ کی شعلہ فشاں۔ گریہ کناں وادی کی
شور و ہنگامہ سے۔ پیکار سے۔ جلا دی سے
دیکھ، اس بار ترا "شہرِ نگار" آ ہی گیا
جس کے باعث نہ تھا کچھ تجھکو قرار آ ہی گیا
اب ذرا ساز اٹھا۔ گیت سنا۔ جھوم بھی جا
تیری آواز سویرا، تری لئے نرم ہوا
جوش کے نغموں کے سائے میں ندی بہتی ہے
ترے اشعار میں ندیوں کی پری رہتی ہے
اسکو نغمات کے پیمانے میں رقصاں کردے
انقلاب آئیگا، پہلے مجھے شاداں کردے!!

میرا جی

کرشن جی کی بنسری میں زندگی کی تان تھی
جمنا اپنے نرم نرم آنسوؤں میں پی گئی
آج تو نے اپنے گیت کی حسین لہر میں
پھر اسے جگا دیا ہے انقلاب دہر میں
آ کہ تیرے گیت کا ذرا مشاہدہ کروں
مندروں میں دیو داسیوں کا ناچ دیکھ لوں
ناچ — اک حسین ناچ، اپنی زندگی کا ناچ
قہقہوں کے دوش پر اپنی بے کسی کا ناچ
دیویوں کے جسم پر یہ سرخ۔ زرد۔ ساریاں
"کرشن بانکے" کی شوخ اور حسین تتلیاں
اڑ رہی ہیں تیری بانسری کی نرم لہر میں
دیکھ مرنہ جائیں تیرے گیت ہی کے زہر میں

کرشن چندر

میرے افسانے پروردہ ہیں جنت کے نظاروں کے
میں ہر موضوع بس کشمیر کی وادی سے لاتا ہوں
میں ہر کردار اس رنگین آبادی سے لاتا ہوں
یہ آئینے ہیں، جھیلوں۔ سبزہ زاروں۔ آبشاروں کے!
مناظر کی حسیں وادی سے جو آنسو ٹپکتے ہیں
میں ان کو اپنے افسانوں میں چن دیتا ہوں لا لاکر
انہیں چھوٹے، بڑے تاروں کی پرچھائیں میں آ آ کر
مرے جذبات دنیا کی نگاہوں میں چمکتے ہیں
کوئی تارا۔ کوئی آنسو۔ کوئی غنچہ سمجھتا ہے
میں اپنا جال ان دھاگوں سے اکثر بنتا رہتا ہوں
ستاروں کی تڑپ۔ کلیوں کی آہیں چنتا رہتا ہوں
مجھے کیا، میرے افسانوں کو کوئی کیا سمجھتا ہے؟
میں بس یہ جانتا ہوں، زندگی کی مسکراہٹ سی
لیا کرتا ہوں لاکھوں دکھ بھرے افسانوی خاکے

افسانہ

مستانی کا ٹیلہ

ایم ۔ اسلم

جانگیوں کے خانہ بدوش قبائل جہاں مال مویشی کے لئے چراگاہ ہو وہیں ڈیرے لگا دیتے ہیں۔ اور اگر وقت پر بارش بھی ہو جائے تو کچھ بری بھلی کھیتی باڑی بھی کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی آبادیوں کو ان لوگوں کی اصطلاح میں "جھگیاں" کہا جاتا ہے۔ اور یہ جھگیاں مختلف ناموں سے مشہور ہوتی ہیں۔ جیسے "پیل والی جھگیاں" یعنی وہ آبادی جو کسی پیل کے پاس آباد ہو۔ یا "باؤلی والی جھگیاں" جہاں پانی کی کوئی باؤلی ہو۔ یا کسی مشہور آدمی کے نام پر جیسے "صلابت خاں کی جھگیاں" یعنی صلابت خاں کی آبادی وغیرہ وغیرہ

انہی ریت کے میدانوں میں جانگیوں کی ایک بستی تھی اور یہ بستی صلابت خاں کی جھگیاں کہلاتی تھی۔ یہاں پرانے وقتوں کا ایک کنواں بھی تھا۔ اور اسی کنوئیں کے آسرے پر صلابت خاں کی جھگیاں آباد تھیں اور اس آبادی کے چاروں طرف ریت کے میدان اور ریت کے ٹیلے تھے اور ریگستانوں میں راستوں کی پہچان کے لئے ریت کے ان ٹیلوں کے بھی نام مقرر تھے۔ جیسے "گیدڑ والا ٹیلا"، "بھگیاڑ (بھیڑیا) والا ٹیلا"، "کیکر والا ٹیلا"۔ اور ان ٹیلوں میں ایک کا نام "مستانی کا ٹیلا" بھی تھا۔ یہ ٹیلا صلابت کی جھگیوں سے پانچ سات فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔

ریگستانوں کی رومان پرور فضا۔ اور وسعت نگاہ تک ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے۔ کون جانے ان ٹیلوں کے خاموش سینوں میں کتنے رومان مدفون تھے۔ شام کا وقت تھا اور ریت کے میدان جو تمازت آفتاب سے دن بھر لوہے کی طرح تپ رہے تھے اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ جھگیوں سے کوئی پانچ سات فرلانگ کے فاصلہ پر ایک جوان لڑکی ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھی کسی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام مریم تھا۔ مریم کا شوہر مہابت بہت دنوں سے کہیں پردیس گیا ہوا تھا۔ اس کے آنے کا راستہ انہی ٹیلوں میں سے گذرتا تھا۔ اور مریم کئی روز سے ان ٹیلوں پر آکر شوہر کا انتظار کیا کرتی۔ شام ہو چکی تھی لیکن مسافر کا ابھی تک کچھ پتا نہ تھا۔ اور جس طرح تسلم کی خاموشی ریگستانوں کو اپنے دامن میں لئے رہی تھی اسی طرح مریم کا دل بھی نا امیدیوں کی آغوش میں تڑپ رہا تھا۔ کیونکہ مہابت کے وعدے کے مطابق آج سے کچھ روز پہلے اسے آجانا چاہئے تھا۔

صلابت کی جھگیوں میں دو قبیلے آباد تھے۔ قومیت کے لحاظ سے تو دونوں ایک ہی تھے۔ لیکن کچھ ان بن ہو جانے کے باعث بٹ گئے تھے اور آئے دن دونوں میں فساد ہوتے رہتے۔ مریم ابھی بچہ ہی تھی کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور غریب بے یار و مددگار رہ گئی۔ قبیلے میں سے کسی نے بھی یتیم کی پرورش کی حامی نہ بھری دوسرے قبیلے کی ایک عورت کے دل میں خدا نے رحم ڈالا اور وہ مریم کو گھر لے آئی اور اپنے بیٹے مہابت کے ساتھ مریم کی بھی پرورش کرنے لگی۔ دونو ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئے۔ اونٹ چرانے کے سوا دونوں کو اور کوئی کام نہ تھا۔ دن بھر جنگلوں اور ریگستانوں میں اونٹ چراتے اور آزادی کے میٹھے میٹھے گیت گاتے۔ مہابت کے باپ نے اپنے لوگوں کے صلاح مشورہ سے مہابت کی مریم کے ساتھ سگائی کر دی۔ اس پر مریم کے قبیلے والوں میں سے ایک نوجوان نے جس کا نام شریف تھا لیکن چھوٹے بڑے اسے شریفو کہتے تھے اس پر اعتراض کیا شریفو مریم کا دور کا رشتہ دار بھی تھا۔ جب گھر میں فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو شریفو نے پنچوں کے پاس اپنا دعویٰ پیش کیا۔ اور درخواست کی کہ یہ سگائی فسخ قرار دی جائے۔

مہابت کے باپ نے کہا کہ اس نے چودہ سال مریم کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ اس لئے اس کا حق فائق ہے۔ شریفو کے قبیلے والے چودہ سال کا حق خدمت ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مریم چونکہ بالغ تھی اور ملک کے دستور کے مطابق اپنے فعل کی مختار تھی۔ اس لئے جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے نہ صرف شریفو سے شادی کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنے قبیلے میں واپس جانا بھی منظور نہ کیا۔ پنچوں نے شریفو کا دعویٰ خارج کر دیا۔ شریفو اس وقت تو خاموش رہا۔ لیکن اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ مریم کی مہابت سے کبھی شادی نہیں ہونے دے گا۔

شریفو ایک آوارہ مزاج آدمی تھا۔ چونکہ اس کے پاس دس بارہ اونٹ تھے اس لئے اپنے قبیلے میں معزز متصور ہوتا تھا۔ اسے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ کہ مریم اس طرح صاف انکار کر دے گی۔ کیونکہ وہ ایک مالدار آدمی تھا اور مہابت غریب۔ وہ تو شاید جبر کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ لیکن پنچوں سے سرتابی کرنے کی کسے مجال تھی۔ اور یہ پنچ کون تھے؟ تین مختلف قبائل کے تین معزز اور بارسوخ آدمی۔ پنچوں کا فیصلہ یا حکم ملک کا قانون تھا۔ لیکن شریفو نا امید نہیں تھا اسے امید تھی کہ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مریم کو کبھی رام کر ہی لے گا۔

اتفاق سے ایک اونٹ مستی٭ پر آیا ہوا تھا۔

٭ مستی پر آنا ۔ جانگیوں کی اصطلاح میں ہیٹ میں آنا کہتے ہیں

جب اسے موقع ملتا کاٹنے کو لپکتا۔ مہابت نے اس کی اگلی ٹانگوں میں زنجیر ڈال رکھی تھی تاکہ وہ کسی کے پیچھے بھاگ نہ سکے۔ ایک روز مہابت کو کچھ کام تھا۔ مریم اونٹوں کو چرانے کے لئے باہر لے گئی۔ اتفاق سے اونٹ کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ اور وہ کم بخت مریم پر ہی لپکا۔ مریم کے ہاتھ میں سونٹا تھا۔ اس نے جو پے در پے دو چار سونٹے رسید کئے تو اونٹ کا مزاج درست ہونے کی بجائے اور بھی برہم ہوگیا۔ اونٹ کا کینہ تو ایک ضرب المثل ہے۔ وہ جب کاٹنے کو بڑھتا مریم اس کے منہ پر زور سے سونٹا مارتی۔ یوں بھی اونٹ سے بھاگ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ اونٹ کا غصہ دم بدم تیز ہو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک پیڑ تھا۔ مریم بے تحاشہ اس پیڑ کی طرف بھاگی۔ اونٹ نے بھی تعاقب کیا۔ اتفاق سے شریفو اونٹ پر بیٹھا گھر جا رہا تھا۔ مریم کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اسے مدد کے لئے پکارے۔ لیکن شریفو مریم کو خطرے میں دیکھ کر خود ہی اونٹ تیزی سے بھگاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور مریم سے سونٹا لے کر پانچ سات سونٹے اس زور سے اونٹ کے مارے کہ اس کا مزاج درست ہوگیا۔ شریفو نے اس کی "نکیل" پکڑ لی اور مریم سے کہا:۔

"زنجیر کہاں ہے۔ یہ حرامی پھر شرارت کریگا۔"

"زنجیر ٹوٹ گئی ہے"۔ مریم نے جواب دیا۔

"اس کا یوں کھلا رہنا تو ٹھیک نہیں" شریفو نے کہا۔ "ٹھیرو! میرے پاس زنجیر ہے"۔ شریفو نے کھرجی[1] میں سے اونٹ کے پاؤں میں ڈالنے والی زنجیر نکالی۔ مریم بولی:۔ "اسی کو کاٹ کر باندھ دو گھر جا کر زنجیر ڈال دوں گی۔"

شریفو نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنے اونٹ کی زنجیر مریم کے اونٹ کے اگلے دونوں پاؤں میں ڈال دی۔ اور کچھ کہے سنے بغیر اپنے اونٹ کی طرف جو ایک دن کے پیڑ کے پتے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا چلا گیا اور اونٹ کی مہار پکڑ کر اور نیچے کی طرف جھٹکا دے کر دو تین بار ہش ہش[2] کہہ کر اسے بٹھایا۔ شریفو جب سوار ہونے لگا تو مریم کی طرف دیکھ کر بولا:۔

"مریم! اس کم ذات کی طرف سے غافل مت رہنا۔ بگڑا اونٹ بھروسہ کے قابل نہیں ہوتا۔"

"جو اللہ کی مرضی!" مریم نے جواب دیا۔

"ہاں!" شریفو بولا۔ "اللہ نے بہت فضل کیا جو میں آ پہنچا۔"

"میں خود سوچتی ہوں"۔ مریم نے کہا۔ "اگر تم نہ آتے تو جانے آج میرا کیا حشر ہوتا۔ تم نے مجھ پر بہت احسان کیا۔"

"احسان کی بات تو رہنے دو"۔ شریفو نے کہا "لیکن ایک بات تو بتاؤ تم"

"کیا؟" مریم نے پوچھا۔

"سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے نفرت کیوں ہے"؟ شریفو نے پوچھا۔

"کس نے کہا تم سے؟" مریم نے ذرا تیوری چڑھا کر پوچھا۔ "کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔"

"کسی کو کہنے کی کیا ضرورت تھی جب تم نے خود ہی کہہ دیا۔" شریفو نے جواب دیا۔

"کب کہا میں نے؟"۔ مریم نے پوچھا۔ "کس سے کہا میں نے؟"

"پنچوں سے!" شریفو نے جواب دیا۔ "تمہارے ہی انکار کرنے سے تو میرا دعویٰ خارج ہوا تھا۔"

"لیکن!" مریم بولی۔ "میں پوچھتی ہوں۔ کیا حق ہے تمہارا مجھ پر۔ کیا واسطہ ہے تمہیں مجھ سے؟"

"یہ اچھی رہی!" شریفو نے مسکرا کر کہا:۔ "سب سے بڑا حق تو یہ ہے کہ ہم دونوں ایک قبیلے سے ہیں۔ پھر میرا تمہارا کچھ رشتہ بھی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حق ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک!" مریم سر ہلا کر بولی۔ "لیکن یہ حق اس روز کہاں ہوا جب مجھے کسی نے پناہ نہ دی تمہارے والدین بھی تو اس وقت زندہ تھے۔ ان سے تو اتنا بھی نہ ہوا۔ کہ مجھے سر چھپانے کا ہی آسرا ملتا۔"

"مریم!" شریفو ہنس کر بولا۔ "یہ تو سب جھگڑے کی باتیں ہیں۔ آج مجھ پر اللہ کا کرم ہے۔ قبیلے میں میری عزت بھی ہے۔ کیا رکھا ہے مہابت کے پاس۔ وہ ایک اونٹ یا کچھ اور بھی؟"

"مہابت اور اس کے ماں باپ کے احسان سے تو میں مر کر بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی"۔ مریم نے جواب دیا۔ "انہوں نے مجھے اس وقت پناہ دی جب ایک دنیا نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ جو شخص بندے کا احسان مند نہ ہو وہ خدا کا شکرگذار بھی نہیں ہوتا۔"

"مان لیا!" شریفو نے جواب دیا۔ "جو کچھ تم کہہ رہی ہو درست ہے لیکن تمہارا اور مہابت کا ساتھ ہی کیا؟"

"ساتھ کیسے نہیں!" مریم نے پوچھا۔ "وہ کوئی اپاہج تو نہیں۔"

"اپاہج نہ سہی"۔ شریفو بولا۔ "لیکن گذر تو......"

"رہنے دو یہ باتیں"۔ مریم نے بات کاٹ کر کہا۔ "اور نکال دو یہ خیال دل سے کہ میں کبھی تمہاری ہوسکوں گی۔"

شریفو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور لپک کر اونٹ پر سوار ہوگیا۔ پھر اونٹ پر بیٹھے بیٹھے بولا:۔

مریم! محبت کی آگ بری ہوتی ہے۔
دنیا! اونٹ کی طرح کینہ پرور ہے۔
کینہ کی آگ اس طرح بھڑکتی ہے
جیسے
آتش پرستوں کے آتشکدے میں۔
جب زمانے کی ہوا بدلی
محبوب نے آنکھیں پھیر لیں۔
سائل نے محبت کا بھیک مانگا
بخیل کا ہاتھ پتھر ہوگیا۔

---

[1] کھرجی:۔ تھیلا۔ ۞ [2] جب اونٹ کو بٹھانا ہو تو اس کی مہار کو نیچے کی طرف جھٹکا دے کر منہ سے ہُش ہُش کہتے ہیں۔ اونٹ بیٹھ جاتا ہے۔ ۞

سخیؔ سرور مرد تھا
ڈوم نے سر مانگا
سر دے دیا! حاتم کا نام زندہ ہو گیا۔
مرد قول سے نہیں پھرتے۔
زبان جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔
سونے کی جھلک جیتا جادو ہے۔
مالی سمجھ دار ہو
سوکھی ٹہنی بھی ہری ہو جاتی ہے۔"

مریم نے بھی اسی وقت جواب دیا!
"عورت کا دل محبت کا چشمہ ہے۔
عنی دوک ہو اتنا اچھلتا ہے۔
سخی سرور مرد تھا
ڈوم نے سر مانگا سر دیا
فریبی عاشق سے ڈوم اچھا
آن پر جان دے دی۔
ڈومنیوں نے سینے خون سے رنگ لئے۔
ملک کے ٹیکے سے موت اچھی
دنیا نے گیت گائے
فرشتوں نے آفرین کہی
کینہ آدم کی اولاد کا ورثہ ہے۔

حوا کی بیٹی ہمیشہ مظلوم رہی
ظلم کی کھیتی کبھی ہری نہیں ہوتی
اللہ کے بعد پنچ آسرا ہیں
نوشیرواں زندہ نہیں
اس کا نام زندہ ہے۔"

شریفو کا اونٹ قدم قدم چل رہا تھا۔ اس نے اونٹ روک لیا اور مریم کی طرف موڑ کر جواب دیا:-
"مریم!
دنیا پرانی کہانی ہے۔
جہانگیر مغل ہند کا بادشاہ
اس کی سونے کی زنجیر
عدل کا اعلان بنی
جب عشق کی آگ بھڑکی
نور جہاں کا سہاگ لٹ گیا
عدل کی زنجیر خاموش ہو گئی
انصاف نے آنکھیں بند کر لیں
جب گھر کو آگ لگے
پڑوسیوں کی کون خبر لیتا ہے۔
راون لنکا کا راجہ
سیتا کے عشق میں جان لٹی گئی

ملک بھی گیا
کبھی دنیا کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا
ہڈیاں راکھ ہو گئیں
نام زندہ رہا
عاشق سو بار مر کر سو بار زندہ ہوتا ہے
تریا ہٹ بری!
دنیا دوزخ بن گئی

مریم نے بھی برجستہ جواب دیا:
"شریفو!
دنیا پرانی کہانی ہے
جہانگیر کا نام بڑا
جب عدل کی زنجیر ملی
جلاد کی تلوار
نور جہاں کے سر پر چمکی۔
محبت تڑپتی رہی
انصاف منتا رہا
سیتا رانی! صدق اور وفا کی پتلی
راون اندھا تھا
راون ہر سال زندہ ہوتا ہے۔
ہر سال مرتا ہے دنیا اس کی رسوائی کا تماشہ دیکھتی ہے۔

ع۱؎ سخی سرور:- یہ ملتان کے صوبے میں ایک ڈاکو تھا۔ اس کا نام سرور سلطان تھا لیکن اتنا سخی اور فیاض تھا کہ سخی سرور کے نام سے مشہور ہو گیا۔ امیروں کو لوٹتا اور غریبوں کو دیتا۔ حاکم وقت نے ہزار جتنے کئے لیکن وہ کبھی قابو نہ آتا اور نہ خراج وغیرہ دیتا۔ غالباً اکبر اعظم کے عہد کا واقعہ ہے ع۲؎ سخی سرور کی سرکشی سے حاکم وقت نالاں تھا کیونکہ سلطنت کے وقار کو ضعف پہنچتا تھا۔ شہر میں ایک بہت عقلمند ڈوم یعنی میراثی رہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کی عنایات کے بھروسہ پر سخی سرور کو زندہ پکڑ لانے کا وعدہ کیا۔ اور حاکم وقت سے یہ وعدہ لے لیا کہ سخی سرور کو قتل نہیں کیا جائیگا چنانچہ وہ ڈوم سخی سرور کے پاس گیا۔ اور اسکی فیاضیوں کی تعریف کی۔ سخی سرور نے پوچھا "مانگ! کیا مانگتا ہے"۔ ڈوم نے جواب دیا" سر"۔ سخی سرور نے سر جھکا دیا اور کہا کاٹ لے۔ لیکن ڈوم نے جواب دیا۔ کہ اب یہ سر میرا ہو چکا اب میں اسے کاٹوں یا نہ کاٹوں یہ میری مرضی پر ہے۔ اب میں جہاں کہوں مجھے چلنا ہو گا۔ سخی سرور ساتھ ہو لیا۔ ڈوم اسے ملتان لے آیا۔ اور شہر سے باہر ایک بارہ دری میں بٹھا کر خود شہر چلا گیا۔ اس عرصہ میں ... نے سخی سرور کو پہچان لیا اور اس نے کوتوال کو خبر دی۔ سپاہیوں نے آکر اسے گھیر کر قتل کر ڈالا۔ جب ڈوم واپس آیا تو سخی سرور کو مردہ دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے قتل کرنے والوں کو بہت برا بھلا کہا۔ پھر کریند سے خنجر نکال کر سینے میں گھونپ لیا اور وہیں تڑپ کر جان دے دی۔ جب ڈوم کی بیوی کو خبر ہوئی تو وہ بھی آئی اور خاوند کے سینے سے خنجر نکال کر اپنے سینے میں مار لیا۔ اور بعد اس کی بیٹی اور ... رشتہ داروں نے محض اس لئے جان دیدی کہ دنیا انہیں دغا باز نہ کہے۔
ع۳؎ عدل کا اعلان:- جہانگیر کی زنجیر عدل کی طرف اشارہ ہے۔ ع۴؎ زنجیر خاموش ہی: شیر افگن خان کے قتل کی طرف اشارہ ہے جو مشتبہ تاریخی واقعہ ہے۔
ع۵؎ روایت ہے یا کچھ: اشارہ اس واقعے کی طرف ہے جب نور جہاں نے طمنچہ مار کر ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا اور جہانگیر نے قتل کے جرم میں اسے جلاد کے حوالے کر دیا تھا۔

تریامٹ نہ ہوتی
دنیا میں صدق رہتا نہ وفا۔"

شریفو نے جواب دیا۔
"[1]تکلے کا بل
جوتی سے نکلتا ہے
چرخے کی گھوں گھوں[2] مال کے زور پر ہے۔
مال ٹوٹ جائے
نہ چرخہ چلتا ہے نہ گکڑی بنتی ہے
تریامٹ کا علاج مرد کا ہاتھ ہے
بیلو کا گچھا ہاتھ سے نہ ٹوٹے
لاٹھی سے ٹوٹتا ہے۔
پھوڑا پک جائے تو اس کا علاج
جراح کی تیز نشتر ہے۔
آندھی چلتی ہے
جھاڑیاں ناچتی ہیں
جو پیڑ جھکتے نہیں
جوان ہوں یا بوڑھے ٹوٹ جاتے ہیں
جوانوں کے عزم پہاڑ ہیں
لیکن زمانہ!
کسی کی کمر سیدھی نہیں رہنے دیتا۔"
یہ کہہ کر اس نے اونٹ کی مہار اٹھائی اور اپنی راہ پکڑی۔
مریم نے کچھ جواب نہ دیا۔

مریم جب گھر آئی تو آج کا سب واقعہ مہابت سے کہہ دیا۔ لیکن وہ ایک صلح کل آدمی تھا اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ جب بہار کا موسم آیا تو مہابت کی مریم سے شادی ہو گئی۔ اور دونوں اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ مریم ساس کی بھی خدمت کرتی اور اپنے چھوٹے دیور گاموں کو بھی کھلاتی۔ مہابت کا گھر اس کے لئے جنت تھا۔ لیکن شیطان بھی جنت میں گھسنے کا موقع دیکھ رہا تھا۔

مریم آج بھی مہابت کی راہ دیکھ رہی تھی۔ آخر جب اندھیرا ہونے لگا تو خوش خرام چکارے اپنے رمنوں سے نکل کر میدانوں میں چلنے پھرنے لگے اور نازک اندام تلور ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر رقص کرنے لگے۔ آج مریم کا دل خود بخود دھڑک رہا تھا۔ خوف اور وہم کا آماجگاہ بن رہا تھا۔ کیونکہ شریفو بھی کئی روز سے کہیں سفر پر گیا ہوا تھا۔ جدھر سے راستہ آتا تھا وہ ادھر کو ہاتھ اٹھا کر بولی:
"انتظار کی گھڑیاں!
موت سے زیادہ سخت ہیں۔
فراق کا نشتر
بچھو کا ڈنگ ہے۔
خون نہیں نکلتا
درد شراب کی تلخی سے تیز،
پاک رب! گھڑی بھر کو
سلیمان نبی کا کھٹولا بخش دے۔
کالے پٹوں والے
خوبصورت شکل والے
قول کے جھوٹے سے پوچھوں
پھول اچھا یا ارنڈ
جو دھوپ میں بھی ہری رہتی ہے۔
شوہر کا جمال عورت کا مکہ ہے۔
مسافر کے قدموں کے نشان
آسمان پر پڑے۔
کہکشاں بن کر چمکے
زمین پر پڑے
دل کے داغ بن گئے۔
قیس نے لیلے کے فراق میں
سر پر خاک ڈالی
گرد ہرن کی آنکھ کا سرمہ بنی
جس طرح
مہابت کے قدموں کی گرد
مریم کے سہاگ کا سیندور۔

مریم کی دلکش لیکن اداس آواز ریگستانوں میں گونج رہی تھی اور چاند کسی عروس نو کی طرح بدلیوں کے گھونگٹ میں سے جھانک رہا تھا۔ مریم واپس جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آئی۔ مریم یہ آواز پہچانتی تھی۔ یہ مہابت کے اونٹ کی گھنٹیوں کی آواز تھی۔ وہ ٹیلے سے اتر کر راستہ پر جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد اونٹ نظر آیا۔ لیکن اونٹ کے ساتھ کوئی آدمی نہیں تھا۔ مریم نے آگے بڑھ کر اونٹ کو پکڑ لیا۔ یہ وہی اونٹ تھا جس پر اس کا شوہر گھر سے سوار ہو کر گیا تھا۔ پاکھڑے[3] کے ساتھ مہابت کا کٹا ہوا سر بندھا ہوا تھا۔ مریم نے شوہر کا سر اونٹ پر سے اتار لیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بت کی طرح خاموش تھی۔ نہ آنکھ سے کوئی آنسو گرتا نہ زبان سے لفظ۔ پھر اس نے سر جھولی میں ڈال لیا اور اونٹ کی مہار پکڑ کر گھر آ گئی۔ جوان بیٹے کا کٹا ہوا سر دیکھ کر ماں نے سر پیٹ لیا۔ اس کی چیخ پکار سے بہت سے لوگ آ گئے اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی باتیں کر رہا تھا۔ ایک مریم تھی جو اب بھی بت کی طرح خاموش تھی۔

جب صبح ہوئی تو پنچ آئے اور چھان بین ہونے لگی۔ یقین تو سب کو یہی تھا کہ یہ کام شریفو کا ہے۔ لیکن شریفو کے خلاف کچھ ثبوت نہ تھا وہ بھی آج شام ہی کو سفر سے واپس آیا تھا۔ پنچوں نے وارثوں کو قصاص کا حقدار قرار دیا اور

---

[1] تکلے کا بل:۔ دیہات والیاں عام طور پر جوتے سے تکلے کا بل نکالتی ہیں [2] چرخے کی گھوں گھوں: یعنی مہابت کی شیخی پر تو اکڑتی ہے [3] پاکھڑہ:۔ کاٹھی۔

مہابت کا سر دفن کر دیا گیا۔ جب شوہر کا سر بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تو مریم کی زبان بھی کھلی۔ وہ بڑی درد بھری آواز سے بولی:۔

"قضا کے ساربان نے مہار پکڑ لی۔
سفر کو جانے والے ساتھ ہو لئے۔
عدم کی منزل کتنی دلکش ہے۔
مسافر روز جاتے ہیں
کسی کو کچھ علم نہیں
کل کس کی باری ہے
آج دشمن کے گھر گھی کے چراغ جلے
مہابت کے گھر اندھیرا ہو گیا
قضا ہنس رہی ہے۔
شکار موت کے پھندے کی طرف خود چلا آرہا ہے
خوش ہونے والے سے کہو
موت کا سامان کر
عمر کی بتی جھلملا رہی ہے
اونٹ نے لمبی راہ پکڑ لی
نشان ملے یا نہ ملے۔
کوچ کا دن مقرر ہے۔
مسافر چلا گیا
سرائے سونی ہو گئی۔
پردیسی کو رنج درد سے چلا رہی ہے۔
قضا کا عقاب ساتھی کو لے گیا

اتنا کہہ کر وہ شوہر کی قبر پر گری اور گرتے ہی بیہوش ہو گئی۔ لوگ اٹھا کر گھر لے گئے۔

اس واقعہ کو تین چار مہینے ہو چکے تھے صلابت کی جھگیوں میں بنجارے آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سال میں دو بار بستی میں آتے تھے۔ بنجارے گاؤں کے چوک میں اپنا اسباب کھولے بیٹھے تھے اور لوگ ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ ان میں شریفو بھی تھا۔ جب شریفو چلا گیا تو ایک بنجارے نے گاؤں کے ایک آدمی سے پوچھا۔

"یہ جو ابھی ابھی گیا ہے اس کا کیا نام ہے؟"

"شریفو!" اس نے جواب دیا۔ "کچھ لینا ہے اس سے؟"

بنجارے نے کہا کہ لینا دینا تو کچھ نہیں۔ تین چار مہینے ہوئے ہم کسی بستی کو جا رہے تھے۔ سائے ڈھل چکے تھے۔ جب ہم ٹیلوں سے نکلے تو ہم نے اس شخص کو ایک اونٹ کی مہار پکڑے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اونٹ کے پالکھڑے کے ساتھ کسی آدمی کا کٹا ہوا سر بندھا تھا۔ یہ خبر آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی اور بہت سے لوگ گھروں سے نکل کر بنجاروں کے پاس آئے۔ ان میں شریفو بھی تھا۔ شریفو بنجاروں کو گالیاں دینے لگا۔ بنجارے گو بہت بزدل ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہیں بھی ایک قبیلے کی حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے شریفو کو برملا قاتل قرار دیا۔ مریم ابھی ابھی جنگل سے اونٹ لے کر واپس آئی تھی۔ اونٹ گھر چھوڑ کر وہ بھی اس جگہ جہاں بنجارے بیٹھے تھے پہنچی۔ اس نے بنجاروں سے کہا کہ کیا وہ قسم کھاتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں سچ ہے۔ بنجاروں نے قسم کھائی اور کہا کہ ہمیں نہ کسی سے دشمنی ہے اور نہ عداوت۔ اب شریفو وہاں سے کھسکنے لگا۔ لوگوں میں سے ایک کے پاس کلہاڑی تھی۔ مریم نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کلہاڑی لے لی۔ شریفو وہاں سے بھاگا۔ مریم نے تعاقب کیا۔ شریفو آگے آگے تھا۔ مریم پیچھے پیچھے۔ اور گاؤں کے مرد و زن ان دونوں کے پیچھے بھاگے چلے آرہے تھے۔ اچانک شریفو ٹھوکر کھا کر گرا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اٹھے مریم نے کلہاڑی کا وار کیا اور دوسرے وار میں شریفو کا سر تن سے جدا کر دیا۔ لوگ جہاں تھے وہیں کھڑے خونی منظر دیکھ رہے تھے۔ مریم نے شریفو کے خون سے دونوں ہاتھ رنگے۔ پھر مانگ میں خون بھرا اور شریفو کا سر جس میں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا بالوں سے پکڑ کر گاؤں کی طرف آئی اور بولی:۔

"لوگو!
مریم آج سہاگن ہے
مہابت کے قاتل کا خون
ہاتھوں کی مہندی بنا اور
سہاگ کا سیندور
فاطمہؓ کے لاڈلے پر
درود اور سلام
کربلا کے میدان میں سر کٹوایا
حور و غلمان نے درود اور سلام بھیجا۔
شریفو! ذلیل کتے قاتل کو آگ نے آغوش میں لے لیا۔
مالک[1] نے دوزخ کے دروازے کھول دیئے۔
حسینؓ کے قاتلوں پر
سات آسمانوں سات زمینوں کی پھٹکار
ریت کربلا کا میدان
شہیدوں کے خون سے لالہ زار بنا۔
لوگو! جنت کے شہزادوں کا ماتم مت کرو
شہیدوں پر ہزار درود اور سلام
یزید کی عقل کا ماتم کرو
جنت کے بدلے دوزخ خریدی
ملعونوں اور لعینوں کا مقام
جو آنکھ شہدا کے غم سے پرنم نہیں
آنکھ نہیں پتھر ہے
جو دوزخ میں پگھلتا ہے۔
قضا شریفو کا گھر ڈھونڈ رہی تھی
مہابت کی روح ویرانوں میں پریشان تھی
قضا کو گھر مل گیا
اور روح کو چین
مریم کا سہاگ لوٹنے والے
لاش پر گدھ منڈلا رہے ہیں

[1] مالک: دوزخ کے محافظوں کے افسر کا نام۔

(باقی صفحہ [illegible])

نیوزیلینڈ اور اس کے لوگ

اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر نیوزیلینڈ کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ یہ ملک دوسرے ملکوں کے بڑے شہروں سے بہت دور ہے اور اس کے اور ان کے درمیان وسیع سمندر حائل ہیں۔ اس میں آکر آباد ہونے والے صرف سو برس سے قدرت کی قوتوں سے جنگ آزما ہیں، شہر اور سڑکیں بنا رہے ہیں۔ اور محنت سے خوراک اور دوسری ضروریات زندگی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان سو سال میں بہت کام ہو چکا ہے۔ آج کا نیوزیلینڈ ایسا ملک ہے جو دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی طرح نئی روشنی کا ہونے کے باوجود بہت سی قدیم روایات کا متحمل ہے۔ یہاں مناظر کے تماشائیوں، سیاحوں اور صحت بخش آب و ہوا تلاش کرنے والوں کے لئے دلچسپی کا بیحد سامان موجود ہے۔ اس کے علاوہ سلطنت برطانیہ کا ایک ایسا ملک ہے جہاں مقامی آبادی کا مسئلہ دونوں فریقین کے لئے اطمینان بخش طریقہ پر حل کیا جا چکا ہے۔

آج کوئی دعویٰ کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ نیوزیلینڈ کے سب سے قدیم باشندے کون تھے۔ اتنا البتہ کہا جا سکتا ہے کہ چودھویں صدی تک پولی نیشیا کے ملاح کئی مرتبہ اس کے شمالی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پھر تین سو برس میں وہ جنوب تک پھیل گئے جہاں وہ ۱۶۴۲ء میں ابیل جانسن تسمان کو ملے تھے۔ یہ شخص جاوا سے سمندر میں گھوم پھر کر اس مجمع الجزائر میں پہنچا اور اس کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ گیا اور اس کا موجودہ نام رکھا۔ تسمان سے ۱۲۷ برس بعد مشہور کپتان کک نے اپنی اینڈیور کشتی میں اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرکے اور بار بار وہاں جا کر اس کے متعلق کافی معلومات حاصل کیں اور بہت کچھ صحیح نقشے بنائے۔

کک کے بعد بہت سے لوگوں نے دریافتیں کیں۔ ان میں فرانسیسی، روسی، ہسپانوی اور امریکی سبھی شامل تھے۔ ان کے بعد سیل اور وہیل کے شکاری اور سن اور عمارتی لکڑی تلاش کرنے والے تاجر آئے۔ ساتھ ہی پادریوں نے بھی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اگرچہ شروع شروع میں ان کا مقامی لوگوں سے جھگڑا ہوا اور کبھی کبھی جانیں تک ضائع ہوئیں، لیکن آخر کار ۱۸۳۹ء تک امن قائم ہو گیا اور عیسائیت پھیل گئی۔ جب فرانسیسیوں نے نیوزیلینڈ میں اپنی سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش کی تو لندن کا دستور نو آبادیا غنودگی سے بیدار ہوا۔ آخر کپتان ہابسن کو بھیجا گیا تاکہ نیوزیلینڈ کو فتح کرکے سلطنت برطانیہ میں شامل کرے۔ وہ ۲۲ر جنوری ۱۸۴۰ء کو ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب نو آبادیاتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ نو واردوں اور مقامی باشندوں میں، جو ماوری کہلاتے تھے، جھگڑا ہوا۔ نیوزیلینڈ کو ۱۸۵۲ء میں حکومت خود اختیاری تو مل گئی لیکن نو وارد ابھی انگلستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ دراصل پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کی ذہنیت بدلی اور اب وہ خود کو نیوزیلینڈ کا باشندہ اور شہری سمجھنے لگے۔

نیوزیلینڈ چھوٹا سا ملک ہے۔ اس کی آب و ہوا بھی یکساں ہے لیکن اس کے قدرتی مناظر میں حیرت انگیز فرق ہے۔ یہاں پہاڑ بھی ہیں اور میدان بھی، جنگلات بھی اور ریگستان بھی، بارش بھی ہوتی ہے اور دھوپ بھی۔ یہ سب کچھ ہے صرف ۱۰۳،۲۸۵ مربع میل کے علاقہ میں۔ آلیور ڈف کوپر اپنی کتاب "موجودہ نیوزیلینڈ" میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور فرانسیسی مصنف والٹیر نے انگلستان کی سیاحت کے بعد کہا تھا کہ "قدرت میں بھی اثر اندازی پائی جاتی ہے۔ انگلستان جیسے چھوٹے سے ملک میں جنگلات، کھیت، بندرگاہیں، دریا، بڑے بڑے شہر، اور بے پایاں کانیں سب موجود ہیں اور اس کے محل وقوع کے باعث اس پر حملہ کرنا ناممکن ہے۔" ڈف کوپر آگے چل کر لکھتا ہے: "اگر انگلستان میں قدرت کے ایسے مناظر موجود ہیں تو نیوزیلینڈ میں تو گویا قدرتی عجائبات کی نمائش ہے۔ اس رقبے کے کسی اور ملک میں حسین اور گوناگوں مناظر کی اس قدر افراط نہیں ہے۔ اگر ہم شمالی آکلینڈ کے نیم گرم اور سکون بخش جزیرہ نما سے چلیں اور اس کی خوشنما جھاڑیوں اور بڑی بڑی جھیلوں سے گزر کر جنوب کے ویران اور جنگلاتی علاقے میں پہنچیں تو گویا ہم ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں گے۔"

توہنگا و کیکی

شمال سے جنوب تک ملک میں ہر طرف دلکش اور نظر نواز مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ بحرالکاہل کا کوئی جزیرہ اس سلسلہ میں نیوزیلینڈ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شمالی جزیرہ کے بیچ میں روتسروا کا گرم ضلع دراصل ایک جوالا مکھی پہاڑ کے سلسلہ کا حصہ ہے۔ اس کی لمبائی ڈیڑھ سو میل اور چوڑائی بیس میل ہے۔ یہ سطح سمندر سے ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار فٹ تک اونچی ہے۔ اس کی تین آتش فشاں چوٹیوں کی بلندی نو ہزار فٹ تک ہے۔ بہت سی جھیلیں ہیں اور ہزاروں دراڑیں اور جگہیں ایسی ہیں جہاں سے بخارات اور کبھی کبھی آگ نکلتی ہے، اور بہت سے گرم پانی کے بڑے بڑے

چشمے ہیں۔ اسی علاقہ اور مین ٹرنک ریلوے کے قریب ہی مشہور روکیم نامی غار ہیں۔

جنوبی جزیرہ میں یورپ کے کوہستان الپ کی حیرت انگیز دلکشی موجود ہے۔ اس کے پہاڑ کی کم سے کم سترہ چوٹیاں دس ہزار فٹ سے اونچی ہیں۔ اورنگی کی نگ نامی چوٹی سب سے اونچی ہے۔ نیوزیلینڈ کے قدیم باشندوں کی زبان میں اورنگی کے معنی ہیں "ابر دوز"۔ جزیرہ کے مغربی ساحل پر جہاں پہنچنے کے لئے پانچ میل لمبی سرنگ سے ریل کے ذریعہ گزرنا ہوتا ہے۔ یہ سرنگ کوہستان کے نیچے ہے اس سے آگے شہرۂ آفاق برفستانی چٹان "فرینز جوزف گلیسیر" واقع ہے۔ اس کا سلسلہ ساحل کی ناقابل فراموش گھنی ہریالی تک پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگلات اور جھیلوں کے مناظر بھی قابل دید ہیں اور پھر نیوزیلینڈ کے بالکل جنوب مغربی علاقہ میں شاندار دریاؤں کے دہانے ہیں۔

نیوزیلینڈ کے شمال سے جنوب تک اونچے اونچے پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے مختلف علاقوں کی بارش میں بڑا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ مغربی ساحل پر زیادہ بارش ہوتی ہے، مشرقی ساحل پر بہت کم۔ اسی وجہ سے فصلوں میں بھی فرق ہے۔ اس کے باوجود کہ زیادہ علاقہ میں پہاڑ، دریا اور جھیلیں واقع ہیں، چار کروڑ تیس لاکھ ایکڑ زمین پر آبادی ہے جس میں عوامی کاموں کے لئے مقررہ زمین بھی شامل ہے اس علاقہ کے تقریباً نصف میں کاشت ہوتی ہے۔ کاشت زیادہ تر مستقل چراگاہوں میں ہوتی ہے جن پر نیوزیلینڈ کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نیوزیلینڈ کا سرمایہ اس کی چراگاہیں ہیں۔

نیوزیلینڈ میں یورپ کے نو وارد اور مقامی ماوری رہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے نیوزیلینڈ میں رنگ اور نسل کی تمیز نہیں کی جاتی۔ اس لئے ماوریوں کو وہی حقوق اور شہری آزادی حاصل ہے جو نو واردوں کو۔ انھیں یہ خود بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ملک میں عزت کے ساتھ رہتے ہیں اور انھیں ملک کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ہمیشہ سے یہ بات نہیں ہے۔ ابھی کچھ سال گزرے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ دوسری ساری پولی نیشی قوموں کی طرح ماوری بھی رفتہ رفتہ ناپید ہو جائیں گے۔ جس طرح ان سے پہلی نسل کے آخری شخص نے سنہ ۱۹۳۳ء میں وفات پائی اور وہ نسل ختم ہوگئی لیکن نیوزیلینڈ کے سفید نو واردوں نے عین وقت پر ماوریوں کی ضرورت کو محسوس کر لیا۔ اس لئے اب وہ نیوزیلینڈ کی زندگی کا اہم حصہ ہیں اور ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے یورپی مہم جوؤں نے معلوم کیا تھا کہ اسی زمانہ میں نیوزیلینڈ میں تعمیر کے عمدہ آلات بنائے جاتے تھے اور لکڑی میں کھدائی اور نقش نگاری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ بہت سے انقلابات اور نو واردین سے لڑائی جھگڑے کے بعد اب ماوریوں نے نو واردوں سے تعاون شروع کر دیا ہے۔

جب سنہ ۱۹۳۹ء میں لڑائی شروع ہوئی تو اتنے ماوری فوج میں بھرتی ہونے کے لئے تیار ہو گئے کہ ان کا ایک الگ بٹیلین بنانا پڑا۔ ماوریوں نے لڑائی میں اپنے آپ کو نیوزیلینڈ کے بہترین جانباز سپاہی ثابت کر دیا۔ یونان میں تھرموپلی اور دوسرے تاریخی مقامات پر یہ مسلح جرمن دستوں کے خلاف فوج کے پیچھے سے لڑے۔ کریٹ میں انھوں نے اپنی سنگینوں سے جرمنوں کو زبردست نقصان پہنچایا۔ اسی طرح لیبیا اور مصر میں بھی اس بٹیلین نے مستعدی اور اولوالعزمی کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کا پہلا کمانڈر پاکیہا غیر ملکی تھا مگر یہ نیوزیلینڈ کی فوج کا مستقل سپاہی تھا لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں مصر کی لڑائی میں اس بٹیلین کی کمان ایک توئی کو نامی ماوری کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لڑائی میں کام آیا اور اس کے بعد لفٹیننٹ کرنل فریڈ بیکر کمانڈر مقرر ہوا نسل کے لحاظ سے یہ بھی ماوری ہی تھا۔ یہ بھی لڑائی میں زخمی ہو گیا اور اس لئے اسے سنہ ۱۹۴۳ء میں فوج سے برطرف ہونا پڑا۔ اب یہ محکمہ بحالی کا ڈائرکٹر ہے۔

اگرچہ نیوزیلینڈ میں صنعتی ترقی کا آغاز ہو رہا ہے پھر بھی یہ زیادہ تر پیداواری ملک ہے۔ اس کی بین الاقوامی تجارت میں کچا مال اور مصنوعات دونوں شامل ہیں۔ ہندوستان اور نیوزیلینڈ کے درمیان کافی تجارت ہوتی ہے۔ نیوزیلینڈ ہندوستان سے سن، کپاس، کپڑے، ناریل کے ریشے، نیل، لاکھ، تیل اور چائے منگاتا ہے اور ہندوستان کو تیزی کے ساتھ آبادی بڑھنے اور صنعتی ترقی کی وجہ سے نیوزیلینڈ کی اون، دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ تجارت کا یہ سلسلہ عرصہ دراز سے قائم ہے لیکن لڑائی کے دنوں میں اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے خاصکر اس جرمنوں کے پولینڈ پر حملہ کرنے سے پرل ہاربر پر جاپانی حملہ کے درمیانی زمانہ میں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جس زمانہ میں یورپ سے ہندوستان اور نیوزیلینڈ کے درمیان سمندری راستہ خطرناک ہو گیا تھا اس وقت ہندوستان اور نیوزیلینڈ کے درمیان بحری راستہ کھلا ہوا تھا۔ ہندوستان اپنی صنعتوں کو ترقی دے سکتا تھا اور نیوزیلینڈ کو ضرورت کا سامان آسانی سے فراہم کر سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس امر کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

نیوزیلینڈ سے ہندوستان کے لئے برآمد (روپوں میں)

مال	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	سنہ ۴۰-۴۱ء	سنہ ۴۱-۴۲ء	سنہ ۴۲-۴۳ء	سنہ ۴۳-۴۴ء
پھل	۱۴۹۰۰۰	—	—	—	—
لوہے کے برتن	—	۷۵۸۰۰۰	—	—	—
کچی کھالیں	۲۷۷۸۴۰۰۰	—	—	—	—
سائنسی آلات	۲۷۰۰۰۰	—	—	—	—
شراب	—	۱۸۱۶۲۰۰۰	۱۳۸۰۰۰	—	—
روغن	۴۸۷۵۱۰۰۰۰	۴۵۲۶۷۳۰۰۰	۴۶۱۲۷۳۰۰۰	۵۹۵۲۴۰۰۰	۷۲۴۷۹۰۰۰
چربی	۷۳۷۱۹۳۰۰۰	۷۸۸۰۸۵۰۰۰	۷۴۴۲۷۱۰۰۰	۱۳۶۰۶۵۰۰۰	۱۶۸۲۶۴۰۰۰
شحمہ (چربیلا مادہ)	—	۱۴۴۶۱۰۰۰	—	—	—
اون	۱۱۹۴۱۰۰۰	۱۰۴۸۲۳۵۱۰۰۰	۲۸۸۲۴۹۲۰۰۰	۳۶۳۵۰۰۱۰۰۰	۲۵۰۰۹۱۱۰۰۰
متفرقات	۱۶۷۰۰۰۰	۱۸۸۷۰۰۰	—	—	—

ہندوستان سے نیوزیلینڈ کے لئے برآمد (روپوں میں)

مال	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	سنہ ۴۰-۴۱ء	سنہ ۴۱-۴۲ء	سنہ ۴۲-۴۳ء	سنہ ۴۳-۴۴ء
کپڑے	۱۵۰۰۰۰	۶۸۷۴۰۰۰	—	—	—
جوتے	۷۷۳۷۰۰۰۰	۱۹۹۹۵۰۰۰	۴۳۳۷۰۰۰	—	—
کانی	۵۵۴۸۲۰۰۰	۴۵۸۹۳۰۰۰	۷۷۵۲۵۰۰۰	۲۹۱۳۹۰۰۰	۱۰۲۰۰۰۰۰
ناریل کے ریشے	۱۶۴۱۹۰۰۰	۴۶۸۶۵۰۰۰	۹۲۶۴۴۰۰۰	۲۱۵۲۰۸۰۰۰	۲۶۴۳۱۳۰۰۰
رنگ	۷۴۶۶۷۰۰۰	۴۸۵۶۸۰۰۰	۶۹۱۸۹۰۰۰	۱۳۲۶۳۰۰۰	۵۸۷۶۵۰۰۰
سوت	۹۷۸۱۰۰۰	۲۷۶۸۴۰۰۰	۱۴۶۴۶۰۰۰	۳۷۰۶۹۰۰۰	۴۴۷۳۸۰۰۰
پھل	۳۱۸۸۲۰۰۰	۳۳۰۲۴۰۰۰	۴۰۹۹۱۰۰۰	۱۳۵۳۵۷۰۰۰	۱۴۹۲۴۶۰۰۰
دال	۱۸۲۵۴۰۰۰	۲۷۷۲۲۰۰۰	۳۰۷۰۴۰۰۰	۵۲۴۹۴۰۰۰	—
کچی کھالیں	—	۱۳۸۶۱۰۰۰	—	—	—
لاکھ	۶۸۷۰۱۰۰۰	۸۵۹۳۲۰۰۰	۱۲۵۱۷۰۰۰۰	۳۲۳۰۷۶۰۰۰	۳۷۱۵۰۰۰۰
دھات	۴۸۵۲۰۰۰	۴۹۸۷۶۰۰۰	۱۱۲۵۳۶۰۰۰	—	۱۲۰۰۰
ابرق	۴۱۳۷۰۰۰	۲۹۴۴۴۰۰۰	۱۲۸۲۸۰۰۰	۱۶۶۴۹۰۰۰	۳۱۴۷۵۰۰۰
تیل	۱۵۰۶۵۸۰۰۰	۶۷۶۸۰۵۰۰۰	۴۱۱۲۹۸۰۰۰	۵۲۱۶۵۴۰۰۰	۳۱۹۸۷۱۰۰۰
تیل کی اشیاء	۲۶۴۴۰۰۰	۱۱۱۷۰۰۰	۵۶۰۹۰۰۰	۲۵۰۰۰۰۰	۲۰۰۰۰۰۰
مسالے	۲۶۱۲۰۰۰	۱۲۰۹۷۰۰۰	۱۰۸۳۸۰۰۰	۲۲۴۹۳۰۰۰۰	۸۴۰۹۸۰۰۰
چائے	۴۷۶۹۶۶۰۰۰	۲۴۷۵۹۴۰۰۰	۱۰۵۱۹۸۷۰۰۰	۱۴۷۳۱۰۰۰	۱۳۱۷۲۱۴۰۰۰
کپڑا	۹۶۹۲۸۰۰۰	۶۴۸۲۹۶۰۰۰	۱۷۸۱۳۳۶۰۰۰	۶۵۹۹۸۶۷۰۰۰	۳۱۲۴۴۴۱۰۰۰

مال	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	سنہ ۴۰-۴۱ء	سنہ ۴۱-۴۲ء	سنہ ۴۲-۴۳ء	سنہ ۴۳-۴۴ء
سن	۴۰۰۰۰۰	۱۱۵۳۷۰۰۰	۲۴۰۸۰۰۰	۳۰۲۴۰۰۰	—
سن (بنا ہوا)	۴۱۵۷۶۳۴۰۰۰	۱۰۸۶۵۰۸۹۰۰۰	۶۰۹۴۰۰۸۰۰	۷۶۴۹۳۵۵۰۰۰	۱۰۵۷۲۰۸۴۰۰۰
قالین	۲۹۳۷۰۰	—	—	—	—
کھلونے	۲۶۹۶۵۰۰	۶۳۸۷۰۰۰	۷۰۳۸۰۰۰	—	—
متفرقات	۴۰۰۹۸۰۰۰	۹۷۲۱۸۰۰۰	—	—	

رباعیات

پھولوں پہ بھی افتخار کرتا ہوں میں
کانٹوں کو بھی دل سے پیار کرتا ہوں میں
عارض ہیں اگر وہ تو [illegible] ہیں تیری
دونوں ہی پہ دل نثار کرتا ہوں میں

گو دشمن تسکیں ہے محبت تیری
پھر بھی اکسیر ہے محبت تیری
پانا اچھا نہ اس کا کھونا اچھا
اک [illegible] ہے محبت تیری

[illegible]

فریاد

اختر عادل

*

تجھ بن چاردں اور اندھیرا۔ چاروں اور اُداسی
تجھ بن سارا کنبہ نیارا۔ گھر میں ہوں بن باسی
ساتھی چھوٹے پنگھٹ چھوٹا۔ گاگر تک ہے پیاسی
نس دن تجھ کو یاد کرے ہے۔ رو رو کر دکھیاری

بیتے سُکھ کی میٹھی سمرن۔ نکلی جی کی بیرن
آیا شور مچاتا ساون۔ لیکن گم سم ہے من
یں کیا بدلی بدلا جیون۔ اک تیرے بن ساجن
تجھ سے کچھ فریاد کرے ہے۔ ایک گھمنڈی ناری

دُکھ کا جیون جیتے جیتے۔ بیت نہ جائے جوبن
کھارے آنسو پیتے پیتے۔ بیت نہ جائے جوبن
گھائل دل کو سیتے سیتے۔ بیت نہ جائے جوبن
بیتے سُکھ کو یاد کرے ہے۔ اک بپتا کی ماری

عالمگیر اتحاد کی طرف

دنیا کی قوموں میں مفاہمت اور عہد ناموں کے ذریعہ اتحاد قائم کرنے کی بہت سی کوششیں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ جیسے "دنیا کا معیاری وقت" اور "عالمگیر پوسٹل سروس" ہماری روزانہ زندگی کا ایک ایسا حصہ بن چکی ہیں کہ آج بہت کم لوگوں کو انکی ترتیب و قیام کی ابتدائی دشواریوں کا صحیح احساس ہے۔ اب جبکہ دنیا اتحاد کے لئے بے چین ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل تشکیلات کی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

صلیب احمر کا بین الاقوامی ادارہ

۹ فروری ۱۸۶۳ء کو جنیوا میں ایک مجلس کا انعقاد ہوا جس میں موسیو ہنری دوناں کی ایک کتاب کی تجویزوں کے متعلق بحث کی گئی۔ اس کتاب میں ۱۸۵۹ء کی جنگ کے مجروحین کی تکلیفوں کا رقت انگیز بیان تھا۔ اس بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنیوا کی بین الاقوامی کانفرنس نے فوجی سپتالوں کے آدمیوں کے تحفظ کو اصولاً منظور کر لیا اور اس تحفظ کی نشانی سفید زمین پر سرخ صلیب کو قرار دیا۔ یہ نشانی اب بہت عام ہے۔ ۲۲ اگست ۱۸۶۴ء کو جنیوا میں دنیا کی بڑی قوموں نے ایک عہد نامہ پر دستخط کئے۔ پھر جولائی ۱۹۰۶ء کو اس میں کچھ ترمیمات کی گئیں۔ اس نے جنگ کے زخمیوں کا بہتر علاج منظور کیا اور صلیب احمر کے جھنڈے کا ناجائز استعمال ممنوع قرار دیا۔

جنیوا کے عہد نامے کے مطابق عملی کاموں کی نگرانی کے لئے ایک بین الاقوامی کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کا کام ساری دنیا میں صلیب احمر کی انجمنیں قائم کرنا اور جنگ اور دوسری قسم کی مصیبتوں مثلاً زلزلوں، سیلابوں، قحط اور وباؤں میں ایک دوسرے کو مدد پہنچانا بھی تھا۔ لڑائی کے دنوں میں صلیب احمر کی خدمات بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب یہ ادارہ ہسپتال فراہم کرتا ہے۔ لڑائی میں نقصان اٹھانے والوں اور پناہ گزینوں کو آرام اور فائدہ پہنچاتا ہے، جنگی قیدیوں کو خوراک اور کپڑے کے پارسل بھیجتا ہے اور ٹریننگ حاصل کی ہوئی نرسیں مہیا کرتا ہے۔ برطانوی صلیب احمر کے ادارہ میں آخر الذکر خدمت اس کی ملحقہ انجمن سینٹ ایمبولینس ایسوسی ایشن انجام دیتی ہے۔ یہ انجمن یروشلم کے آرڈر آف دی سینٹ جان کے تحت میں ہے اور صلیبی جنگوں کے زمانہ سے قائم ہے۔

صلیب احمر کا جھنڈا سوئٹزرلینڈ ہی کا ہے مگر اس کے رنگ بدلے ہوئے ہیں۔ یہ جھنڈا اسی ملک کے اعزاز میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس جھنڈے کی ابتدا تیرھویں صدی یا اس سے بھی قبل ہو چکی تھی۔ اسلامی ملکوں مثلاً ترکی، مصر، ہندوستان کی مسلم ریاستوں، روس کی مسلم جمہوریتوں کے سفید جھنڈوں پر سرخ صلیب کی جگہ سرخ ہلال ہوتا ہے اور ان ملکوں کی انجمنیں "ہلال احمر" کہلاتی ہیں۔ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے دوران میں صلیب احمر کے قومی اور بین الاقوامی اداروں نے بڑی محنت اور اولوالعزمی سے کام کیا۔ ان خدمات میں جنگی قیدیوں کی وطن کو واپسی میں مدد، قحط، طوفان، آتشزدگی، زلزلے وغیرہ کے موقعوں پر امداد، تپ دق کا دفاع اور اسکولوں میں صفائی کے متعلق ہدایات شامل ہیں۔

مجلس اقوام

مجلس اقوام ۵۵ حکومتوں کی مجلس تھی جنھوں نے اس مجلس کا دستور العمل قبول کر کے بین الاقوامی مفاد کے معاملات میں اشتراک عمل کی ذمہ داری لی تھی یعنی یہ کہ ہم اپنے جھگڑے امن پسندی کے ساتھ فیصل کریں گے اور اگر اس کی ممبر قوموں میں سے کسی پر کوئی ملک حملہ کریگا تو مجلس کی ساری قومیں حملہ آور ملک کے خلاف لڑینگی۔ قانوناً اس کی ابتدا ۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء سے ہوتی ہے جبکہ وارسائی کے صلحنامہ پر عملدرآمد شروع ہوا۔ اس مجلس میں ہر وہ ملک شامل ہو سکتا تھا جو پوری طرح مختار ہو یا درجۂ نوآبادی رکھتا ہو۔ اس غرض سے مختلف قوموں کے نمائندے وقتاً فوقتاً عام یا مخصوص کانفرنسوں میں ملتے رہے۔ ان میں اول الذکر اسمبلی اور دوسری کونسل کہلاتی تھی۔ ان کے علاوہ لیگ میں ایک سکریٹریٹ جنرل، بہت سی فنی مشاورتی کمیٹیاں شامل تھیں اور ہیگ میں ایک مستقل بین الاقوامی عدالت تھی جو جھگڑوں کی صورت میں قانونی مشورہ دیتی تھی۔ مجلس کا مقام بمقام جنیوا تھا اور سرکاری زبانیں انگریزی اور فرانسیسی تھیں۔ روس ستمبر ۱۹۳۴ء میں مجلس اقوام کا ممبر بنا اور ۱۴ دسمبر ۱۹۳۹ء تک رہا۔ ممالک متحدہ امریکہ اس مجلس میں شریک نہیں ہوا۔

مجلس اقوام کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ جنیوا کے مقام پر ہوتا تھا جس میں ہر ممبر ملک کو ایک رائے حاصل تھی اور تین نمائندے تک بھیج سکتا تھا۔ اسمبلی چندہ، دستور العمل، اور بحث و مباحثہ کے حقوق حاصل تھے۔ یہ بجٹ کے متعلق فیصلہ کرتی تھی۔ کونسل کے عارضی ارکین کا انتخاب بھی اسی کا کام تھا۔ یہ انتخاب اکثریت کے حق میں ہونے سے ہو سکتا تھا لیکن ان کے زمانہ کا تعین، داخلہ کے قواعد بنانا وغیرہ دو تہائی اکثریت ہی سے ممکن تھا۔

مجلس اقوام کی کونسل میں چودہ ارکین تھے۔ ان میں سے پانچ، فرانس، جرمنی، برطانیہ، اٹلی اور جاپان مستقل رکن تھے اور باقی نو یعنی کینیڈا، چلی، کیوبا، فن لینڈ، پولینڈ، رومانیہ، اسپین، ایران اور وینیزوئلا

میں سے ہر ایک کو اسمبلی نے تین سال کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان عارضی اراکین میں سے ہر ایک تین برس کے بعد الگ ہوتا تھا۔

کونسل کے ہر رکن کا ایک نمائندہ ہوتا تھا جسے ایک رائے دینے کا حق ہوتا تھا۔ یورپی حکومتوں کا نمائندہ عموماً وزیر خارجہ ہوتا تھا اور غیر یورپی ملکوں کا نمائندہ وہ خاص شخص ہوتا تھا جو کسی یورپی ملک میں ان ملکوں کی سیاسی نمائندگی کرتا ہو کونسل کے ہر سال چار اجلاس ہوتے تھے یعنی مارچ، جون ستمبر اور دسمبر میں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ خاص اجلاس ہوتے تھے۔ جنیوا کی مستقل سکرٹریٹ میں مختلف چیزوں کے ماہر شامل ہوتے تھے۔ یہ سب پہلے سیکرٹری جنرل سر ایرک ڈرمنڈ کے ماتحت تھے ۱۹۳۸ء میں مجلس کا بجٹ دس لاکھ سے زیادہ تھا۔ ادارہ اقوام متحدہ کے قیام سے مجلس اقوام کا کل سرمایہ جو تیس لاکھ پونڈ کے قریب ہے ادارہ اقوام متحدہ کو منتقل کر دیا گیا ہے۔

بین الاقوامی عدالت

۱۸۹۹ء میں ہیگ میں امن پسندانہ طریقوں سے بین الاقوامی تنازعوں کے فیصلے کے لئے ایک مستقل ادارے کا قیام بین الاقوامی انصاف کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے اس کا سہرا اول تو روس کے زار نکولس ثانی کے سر ہے جس نے ۱۸۹۹ء میں ہیگ کانفرنس کی بنیاد ڈالی، دوسرے ڈیوڈ جین ہل کے جو اس زمانہ میں ممالک متحدہ امریکہ کا نائب سیکرٹری آف اسٹیٹ تھا۔ اور تیسرے لارڈ پانسفٹ جو اس وقت واشنگٹن میں برطانوی سفیر تھا اور جس نے کانفرنس کی ایک کمیٹی میں ایک مستقل بین الاقوامی عدالت قائم کرنے کی پر زور سفارش کی اور اس عدالت کے کام کا خاکہ بھی پیش کیا۔ یہ عدالت کسی وقت بھی کام کر سکتی تھی۔

مجلس اقوام کے قائم ہونے پر فروری ۱۹۲۰ء میں مستقل بین الاقوامی عدالت قائم ہوئی۔ یہ معاہدہ کی دفعہ ۱۴ کے مطابق وجود میں آئی۔

اس عدالت میں گیارہ جج اور چار نائب جج تھے۔ انہیں لیگ کی کونسل اور اسمبلی الگ الگ نشستوں میں منتخب کرتی تھی لیکن ان دونوں کی اکثریت کا حق میں ہونا ضروری تھا۔ یہ عدالت معاہدہ یا صلحنامہ پر کسی تنازعہ کا دفعہ ۱۴ کے مطابق فیصلہ کرتی تھی بشرطیکہ دونوں فریقین اس کی خواہشمند ہوں۔ یہی نہیں بلکہ جن قوموں نے عہدنامہ کی ایک غیر لازمی دفعہ کو منظور کیا تھا جس کی رو سے کوئی بھی ایک فریق دوسری فریق کو عدالت میں بلوا سکتی تھی، ان کے لئے دونوں فریقین کا مقدمہ پیش کرنا ضروری نہیں تھا صلحناموں، لوکارنو کے معاہدوں وغیرہ کی رو سے بھی اسے یہ حقوق حاصل تھے۔ عدالت میں باقاعدہ عدالتی کارروائی عمل میں آتی تھی۔ ہر فریق کا وکیل پیش ہوتا تھا۔ اس عدالت میں حکومتیں ہی فریق بن سکتی تھیں۔

سال میں ایک مرتبہ یعنی ۱۶ جون کو عدالت کا اجلاس ہونا ضروری تھا۔ مگر اس کے علاوہ بھی خاص اجلاس ہوتے رہتے تھے۔

محنت کا بین الاقوامی ادارہ

محنت کا بین الاقوامی ادارہ ورسائی کے صلحنامہ کی دفعہ ۱۳ کے مطابق وجود میں آیا۔ یہ پچپن حکومتوں کا سرکاری ادارہ ہے جو تسلیم کرتی ہیں کہ "بیشمار مزدور نا انصافی اور مصیبت کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔" اور جو بین الاقوامی کارروائی کے ذریعہ ان حالات کو بہتر بنانے کا عہد کرتی ہیں ادارہ کے دستور اور طریق کار سے مختصراً حسب ذیل چیزیں وجود میں آئیں:—

اس ادارہ کے: کم سے کم سال میں ایک مرتبہ بین الاقوامی کانفرنس کا اجلاس کرینگے جس میں ملک کے چار نمائندے شامل ہونگے۔ ان میں دو سرکاری ہونگے جو حکومت کی ہدایت پر عمل کرینگے اور دو غیر سرکاری ہونگے جن میں سے ہر ایک اپنے ملک کے کارخانہ داروں اور مزدوروں کے مفاد کو پیش کرے گا۔ ان غیر سرکاری نمائندوں کو حکومت ہی مقرر کرتی ہے کارخانہ داروں اور مزدوروں کے نمائندہ اداروں کی رضامندی سے۔

کانفرنس کی مجلس عاملہ میں بھی تین طرح کے رکن ہوتے ہیں۔ چوبیس اراکین میں بارہ حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں، چھ مزدوروں کے اور چھ کارخانہ داروں کے۔ حکومت کی آٹھ نشستیں خاص صنعتی ملکوں کے نمائندوں کے لئے ہیں، باقی چار نشستوں کے لئے باقی حکومتیں ہر تیسرے سال انتخاب کرتی ہیں مزدوروں اور کارخانہ داروں کے چھ چھ نمائندوں کو کانفرنس ہی کے موقع پر منتخب کیا جاتا ہے مزدوروں کا بین الاقوامی ادارہ دنیا کے مزدوروں کی کے مصارف، روزگار اور ہجرت کے متعلق اعداد و شمار شائع کرتا رہتا ہے اور حکومتوں، کارخانہ داروں اور مزدوروں کو اپنے رسالہ "صنعتی اور مزدوروں کی اطلاعات" کے ذریعہ اپنی مختلف تحقیقات سے مطلع کرتا رہتا ہے۔

بین الاقوامی ذہنی کمیٹی

مجلس اقوام نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مجلس کے کام کے لئے سیاسی اور صنعتی تعاون کی طرح دماغی اور نظریاتی اشتراک عمل بھی ناگزیر ہے۔ ۱۹۲۰ء میں کونسل کو مشورہ دیا کہ اس کام میں جس پر ابھی توجہ نہیں دی گئی تھی دلچسپی لے۔ اس نے بتایا کہ لیگ کو اپنے فرائض بخوبی انجام دینے کے لئے اس ادارہ کی سخت ضرورت ہے۔ اول تو اس لئے کہ ذہین لوگوں کی رائے عوام کی رائے کا حصہ ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ لوگ عوام کے خیالات کو بے حد متاثر کرتے ہیں اور تیسرے اس لئے کہ اس قسم کے ادارہ کے بغیر دنیا کے اہل دماغ لوگوں میں مناسب وحدت افکار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا اس خاص اور عملی ضرورت کے پیش نظر لیگ کی کونسل نے

اسمبلی کی ہدایات کے مطابق مفکروں کی ایک بین الاقوامی کمیٹی مقرر کی جس میں مختلف ملکوں کے مشہور مصنف اور سائنسداں شریک تھے۔ اس کے بعد بہت سے ملکوں میں، نیز ممالک متحدہ امریکہ میں، قومی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔

اب شاید یہ کام ادارہ اقوام متحدہ کے تعلیمی، سماجی اور ثقافتی ادارہ کو منتقل کر دیا جائے گا کیونکہ لیگ کے سارے ادارے اور سرمایہ اس ادارے کو منتقل ہوگا۔ اسوقت ممکن ہے محنت کا بین الاقوامی ادارہ بھی ادارہ اقوام متحدہ ہی کے تحت میں آجائے۔

جنگ کی تباہکاریوں سے دنیا کے ثقافتی اور فنی خزانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کیا گیا۔ اس کے لئے صلیب احمر کے ایسے جھنڈے کی تجویز ہوئی جس پر سفید زمین پر سرخ دائرے کے اندر تین سرخ نقطے ہوں۔ اس "تحفظ خزان ہائے ثقافتی" نامی ادارہ نے "امن بذریعہ ثقافت" کا نعرہ بلند کیا۔ اس تحریک کا بانی ایک روسی نکولس رد مرتح تھا۔ اس کے نام پر ایک معاہدہ ہوا جس پر ۱۵ اپریل ۱۹۳۵ء کو صدر روزولٹ کے دفتر واقع وائٹ ہاؤس واشنگٹن میں ممالک متحدہ امریکہ، اور امریکہ کے دوسرے بیس لاطینی ملکوں نے دستخط کئے جو "امریکی اتحاد" کے رکن تھے۔ اگرچہ اب ایٹم بم کی ایجاد سے نشان کے ذریعہ ثقافتی خزانوں کا تحفظ دشوار ہوگیا ہے۔ پھر بھی "امن بذریعہ ثقافت" کا بلند مطمح نظر آئندہ زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرتا جائے گا۔

ٹریڈ یونینوں کی عالمگیر فیڈریشن

دنیا کی ساری ٹریڈ یونینوں کے اتحاد کی پہلی کوشش ۱۹۰۱ء میں عمل میں آئی۔ اس سال سات ملکوں نے مل کر بین الاقوامی ٹریڈ یونین دفتر قائم کیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کی وجہ سے اس کی ترقی رک گئی لیکن لڑائی ختم ہونے پر ۱۹۱۹ء میں چودہ ملکوں کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تاکہ نئے ادارہ کی بنیاد ڈالی جائے۔ ۱۹۲۷ء میں اسمیں ۲۸ ملکوں کا الحاق ہوا اور اراکین کی تعداد ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ہوگئی۔ ان میں ممالک متحدہ امریکہ، میکسیکو، آسٹریلیا اور روس شامل نہیں تھے۔ پچھلے سال کے شروع میں ممالک متحدہ امریکہ میں مزدوروں کے دو ادارے تھے ایک "ٹریڈ یونینوں کی امریکی فیڈریشن" اور ایک صنعتی اداروں کی کانگریس۔ روس کا اپنا ادارہ تھا جو کل ٹریڈ یونینوں کی جنرل کونسل" کہلاتا تھا۔ روس بین الاقوامی ٹریڈ یونینوں کے ادارہ میں فروری ۱۹۴۵ء میں شامل ہوا جبکہ لندن میں ٹریڈ یونینوں کی عام کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ٹریڈ یونینوں کی عالمگیر فیڈریشن کی بنیاد پڑی۔ اس سلسلے میں ۲۵ ستمبر کو پیرس میں ایک کانفرنس ہوئی اور نمائندوں نے ایک خاص کمیشن کے مرتب کئے ہوئے دستور العمل کو نہایت گرمجوشی کے ساتھ منظور کیا۔ پیرس کے اجلاس میں ۵۶ قوموں کے نمائندے شامل تھے جو سات کروڑ مزدوروں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس طرح یہ ادارہ اب تک قائم ہونے والے کل اداروں میں سب سے زیادہ افراد کا نمائندہ تھا۔

فیڈریشن کا صدر مقام پیرس ہے۔ اس کے صدر سر والٹر سٹرین اور سکریٹری فرانسیسی دفاعی رہنما موسیو لوئی سیلاں ہیں۔ سات نائب صدر، جوہو (فرانس) ہل مین (ممالک متحدہ امریکہ) کوزنیتوف (روس) چیر (چین) دی ویٹوریو (اٹلی) کوپرز (ہالینڈ) اور ٹولیڈ انو (لاطینی امریکہ) ہیں۔

۱۲ فروری کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی سیاسی اور حفاظتی کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی۔ یہ کہ "ٹریڈ یونینوں کی بین الاقوامی فیڈریشن" اور "محنت کی امریکی فیڈریشن" کو اقتصادی اور سماجی کونسل سے مشورہ کرنے کے لئے مدعو کیا جائے۔ اجلاس کے اختتام پر جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کو منظور کیا۔

ادارۂ اقوام متحدہ کا جنم

جنگ کے بعد کا سب سے اہم واقعہ ادارہ اقوام متحدہ کا قیام ہے۔ ۵۱ قوموں نے ایک منشور پر دستخط کئے تاکہ صلح کے زمانہ میں بھی جنگ کا اشتراک عمل جاری رہے۔ یہ منشور سان فرانسسکو میں مرتب ہوا جہاں کہ ڈمبارٹن اوکس کے بعد چین، برطانیہ، ممالک متحدہ امریکہ اور روس کی تجویزوں پر پچاس قوموں نے غور کیا اور ان میں ترمیم و تنسیخ کی۔ یہ تاریخی کانفرنس ۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء کو ممالک متحدہ امریکہ نے سان فرانسسکو میں بلائی تھی۔ ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو منشور مرتب ہوا۔ اگرچہ ہر معاملہ میں ہر قوم متفق نہ تھی لیکن پھر بھی مجموعی طور پر اسکا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ کانفرنس کی پچاسی قوموں نے باری باری منشور پر دستخط کئے۔ پولینڈ میں نئی حکومت قائم ہوئی اور اس نے بھی ۱۵ اکتوبر کو اس پر دستخط کر دئے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا پہلا اجلاس ویسٹ منسٹر کے سنٹرل ہال میں ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو شروع ہوا۔ اس میں ۲۷۹ نمائندے شامل ہوئے۔ ۵۱ قوموں میں سے ہر ایک پانچ نمائندے مقرر کر سکتی تھی۔ اگرچہ ہر قوم کو صرف ایک ہی رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ہر ملک پانچ اور نمائندے اور مشیر اور نائب معتمد بھی حسب ضرورت مقرر کر سکتا تھا۔

ابتدائی کمیشن کے صدر ڈاکٹر زلیٹا اینجل نے افتتاحی رسم ادا کی اور اس نے اس اجلاس کو اہمیت، مقصد اور شان و شوکت کے لحاظ سے بہترین بتایا اس کے بعد مسٹر اٹیلی نے ایک مدبرانہ لیکن سیدھی سادی تقریر میں نمائندوں کا خیر مقدم کیا اور ممالک متحدہ کے مقاصد اور عمل میں اعتقاد کا اظہار کیا۔ پھر

اسمبلی نے صدر منتخب کیا۔

روس کے نمائندے نے مسٹر ٹری گیولی کو نامزد کیا جو ناروے کا وزیر خارجہ ہے۔ پولینڈ، سوئیڈن اور یوکرائن کے نمائندوں نے اس کی تائید کی لیکن جب خفیہ رائے شماری ہوئی تو بلجیم کا وزیر خارجہ مسٹر اسپاک نے ۲۸ ووٹ حاصل کئے اور ۲۹ صدر منتخب ہوگیا۔ مسٹر لی کو ۲۳ ووٹ ملے۔ اکثر اخباروں نے جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں اس ظاہر اختلاف کو نمک مرچ لگا کر شائع کیا۔ اس خبر سے قطع نظر کہ مسٹر لی کو جن نمائندوں نے نامزد کیا اور کس نے اس کی تائید کی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اسے ممالک متحدہ امریکہ کی تائید حاصل تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ معمولی اختلاف رائے کا نتیجہ تھا

ابتدائی کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے اور ذیل کی چھ کمیٹیوں کی منظوری کے بعد ان کے صدر منتخب ہوئے :-

	کمیٹی	صدر	
(۱)	سیاسی اور حفاظتی	موسیو منوالسکی	(یوکرائن)
(۲)	اقتصادی اور مالی	موسیو کونڈرسکی	(پولینڈ)
(۳)	سماجی، انسانی اور ثقافتی	مسٹر فریزر	(نیوزیلینڈ)
(۴)	تولیت	موسیو میک ایچن	(یوراگوے)
(۵)	انتظام اور بجٹ	جناب فیرس الخوری	(شام)
(۶)	قانونی	موسیو جمینز	(پاناما)

جنرل اسمبلی کے جو سات نائب صدر منتخب ہوئے وہ چین، فرانس جنوبی افریقہ، روس، برطانیہ، ممالک متحدہ امریکہ اور وینزویلا کے خاص نمائندے تھے۔

اس کے بعد حفاظتی کونسل کے چھ عارضی نمائندوں اور اقتصادی اور سماجی کونسل کے ۱۸ ارکین کے انتخاب کا سوال تھا۔ پھر یہ طے ہوا کہ تولیت کی کونسل کے ارکین کا انتخاب جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس پر ملتوی کر دیا جائے۔ یہ اجلاس ستمبر میں ہوگا۔

مسٹر اسٹیٹنین کی تقریر کے ایک اقتباس سے حفاظتی کونسل اور اقوام متحدہ کے دوسرے اداروں کے باہمی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے کہا: "اسمبلی اور اس کی اقتصادی اور سماجی اور تولیتی کونسل کا کام ایسی دنیا بنانا ہے جس میں عرصہ دراز تک امن و امان قائم رہے لیکن حفاظتی کونسل اس امکان کو یقین میں تبدیل کرنے کے لئے ہے۔"

۱۶ جنوری کے افتتاحی اجلاس میں حفاظتی کونسل نے مسٹر ان جے ماکین (آسٹریلیا) کو صدر منتخب کیا اور طریقہ عمل کے قاعدہ نمبر ۹ کو منظور کیا یعنی حفاظتی کونسل کے ممبر انگریزی کے حروف تہجی کی ترتیب سے باری باری صدر ہوں گے اور ہر صدر ایک مہینے تک رہے گا۔

اقتصادی اور سماجی کونسل کا پہلا اجلاس ۲۳ جنوری کو ہوا جس میں مسٹر اے راماسوامی مدالیار کو صدر منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر اسٹامپر (یوگوسلاویہ) اور ڈاکٹر لیراس ریسٹریپو (کولمبیا) نائب صدر منتخب ہوئے۔

سارے نمائندوں کے سترھویں اجلاس میں ایٹم کی قوت کے پیدا کردہ مسائل حل کرنے کے لئے ایک "کمیشن" کے متعلق سیاسی اور حفاظتی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کیا گیا اور آخر وہ اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ کل کی کل ۴۶ رائیں اس کے حق میں تھیں۔ رپورٹ نے سفارش کی تھی کہ یہ کمیشن ایٹم کی قوت کے متعلق ہر مسئلہ اور ہر پہلو پر غور کرے گا اور وقتاً فوقتاً جامع و مانع تجاویز پیش کرے گا تاکہ (ا) امن پسندانہ مقاصد کے لئے تمام قوموں کی ایٹم کی قوت کے متعلق بنیادی سائنسی معلومات فراہم کرے (ب) ایٹم کی قوت پر کنٹرول رکھے تاکہ نقص امن کا اندیشہ پیدا نہ ہو سکے۔ (ج) قومی اسلحہ جات میں سے ایٹم کی قوت سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے تباہ کن ہتھیار نکلوائے۔ (د) معائنہ اور دوسرے ذریعوں سے امن پسند قوموں کو مفسدوں کی شر انگیزی سے محفوظ رکھے۔

ایٹم کمیشن نے ہمیشہ کے لئے گمان پرستوں کے دلائل پر پانی پھیر دیا جنکا خیال تھا کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ تیزی اور کامیابی کے ساتھ عمل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ سب سے اہم اور فیصلہ کن معاملہ غیر معمولی سہولت کیساتھ طے ہوگیا۔

ایجنڈا کی ایک اور مد ادارہ اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل کا انتخاب تھا۔ ۳۰ جنوری کی حفاظتی کونسل کی متفقہ سفارش پر اسمبلی نے مسٹر ٹری گیولی کو ۴۶ ووٹوں سے منتخب کیا۔ تین ووٹ ان کے خلاف پڑے۔ ۳۱ جنوری کو سکریٹری جنرل نے اپنا کام سنبھال لیا۔

جنرل اسمبلی نے یہ بھی منظور کر لیا کہ پہلے کی طرح چینی، انگریزی، فرانسیسی، روسی اور ہسپانوی زبانیں، ادارہ اقوام متحدہ کی سرکاری زبانیں ہونگی اور کام انگریزی اور فرانسیسی میں ہوگا۔ اسکا تعلق اقوام متحدہ کے سارے اداروں سے ہے سوائے بین الاقوامی عدالت کے۔ یہ پانچ زبانیں سیاسی نقطۂ نگاہ سے بہت مفید ہیں لیکن خرچ بہت زیادہ ہے۔ پانچ زبانوں کے لئے ۲۵ مترجموں، ٹائپسٹوں اور مدد گاروں وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا تعلق بین الاقوامی ادارہ کے شعبہ لسانیات سے ہے۔

یہ بات تو پہلے ہی طے ہوگئی تھی کہ ادارہ اقوام متحدہ کے مستقل صدر دفاتر ممالک متحدہ امریکہ کے مشرقی علاقہ میں واقع ہونگے۔ لہذا انتخاب محل وقوع کی خاص کمیٹی نے اسٹیمفورڈ گرین وچ کے علاقہ کو پسند کیا جو نیویارک اور کنکٹی کٹ ریاستوں کی سرحد پر واقع ہے۔ نیویارک کی ایک سو دو منزلہ (باقی ص۵۱ پر)

ایک ازبک مطربہ

وسط ایشیا کی چند فنکار ہستیاں

(۱)

حلیمہ نصیروفا ازبکستان کی ایک مقبول مغنیہ اور مشہور ایکٹریس ہے۔ سویٹ یونین میں فن وضاعت کے ماہروں کو جو سب سے بڑا خطاب دیا جاتا ہے وہ "عوام کا صناع" ہے۔ یہ خطاب حلیمہ کو ۳۷ء میں ملا تھا۔ اس خطاب کے پانے والوں میں جو کم عمر صناع ہیں، ان میں ایک حلیمہ بھی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حلیمہ کو پوری سویٹ یونین کے نغماتی (میوزیکل) تھیٹر یعنی اوپیرا کا فخر زنگین سمجھا جاتا ہے اور بلبل ازبکستان لقب دیا گیا ہے۔

اس جنگ سے پہلے تک ماسکو میں ہر وفاقی جمہوریت کے فن وضاعت کی نمائش کے لئے دس روز کا ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۷ء کے میلے میں ازبکستان کے پانچ سو ساٹھ فنون لطیفہ کے ماہر شریک ہوئے اور ان میں ایک حلیمہ نصیروفا بھی تھی۔ حلیمہ کے فن کی نمائش ماسکو کے مشہور و معزز تھیٹر یعنی بولشوی تھیٹر میں ہوئی تھی۔ اسوقت ماسکو باسیوں نے جانا کہ رفیق جمہوریت ازبکستان نے نغماتی تھیٹر میں کتنی حیرتناک ترقی کی ہے۔ حلیمہ کو یہ خطاب ۴۰ء کے میلے ہی میں ملا تھا۔ ان میلوں میں سویٹ حکومت کے تمام بڑے رکن حتیٰ کہ اسٹالین بھی شریک ہوتا ہے اور اسی دن یہ خطاب تقسیم کئے جاتے ہیں۔

روس خاص میں فن ڈراما تقریباً دو سو برس سے ترقی کر رہا ہے۔ مگر دوسری وفاقی جمہوریتیں اس صنف صناعت کی طرف انقلاب کے بعد متوجہ ہوئیں۔ اتنی کم مدت میں ازبکستان میں اوپیرا نغمہ وایکٹنگ کی یہ ترقی سچ مچ حیرتناک تھی۔ اور یہ برکت ہے کامل آزادی کی کہ ہر قوم اپنے کلچر اور صناعت کو خاطر خواہ ترقی دے سکی۔

ازبکستانی سوویٹ جمہوریت کا تسلط ۲۶ء میں قائم ہوا تو سب سے پہلے نغمہ و موسیقی کے ماہروں اور عطائیوں کا ایک ملا جلا طائفہ مرتب کیا گیا۔ اور قاری یعقوب نے اسکی ڈائرکیٹری کی۔ اس کے بعد ۲۹ء میں حکومت کی طرف سے تاشقند میں ایک اسٹیٹ میوزیکل تھیٹر قائم کیا گیا۔

اسوقت تک تحریری یا علامتی موسیقی جاری نہ ہوئی تھی۔ ارکسٹرا خالص ازبک سازوں پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سازوں کی موسیقیانہ اظہار کی وسعت محدود تھی۔ اس سلئے کہ سازندوں کو گویّے کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔

ازبک موسیقی نے یورپ کی موسیقی کے تکنیک یا اسلوب ۳۲ء میں اختیار کئے اور علاماتی یعنی مطبوعہ اشاروں کا استعمال ہونے لگا۔ ساتھ ہی ازبک موسیقی نے یورپ کے بعض ساز بھی شامل کر لئے لیکن فنی اعتبار سے قدیم ازبک موسیقی کی روایات کو ترک نہیں کیا چنانچہ اب ازبک نغماتی تھیٹر میں مشرقی و مغربی ساز ملے جلے بجائے جاتے ہیں اور اس تھیٹر کی ہر دلعزیز ایکٹریس اور مطربہ حلیمہ نصیروفا ہے۔

وسط ایشیا کی مسلمان عورتوں میں پردہ سخت تھا اور منہ پر ایک نقاب ڈالی جاتی تھی جسکو فارنجہ کہتے تھے۔ مگر جب انقلاب رونما ہوا تو وہ گونگی لونڈی کی حیثیت سے نکل کر وسط ایشیا کی مسلمان عورت آزاد انسانوں کے مرتبے پر فائز ہو گئی۔

ازبک عورتوں میں سب سے پہلے جن عورتوں نے فارنجے کو خیرباد کہا ان میں ایک حلیمہ کی ماں بھی تھی۔ حلیمہ کی ماں اطفال خانے کی نگراں مقرر کی گئی۔ اور حلیمہ کی تربیت آزاد ماحول اور جمہوریت کی فضا میں ہونے لگی۔ ماں نے اس کو بے خوفی سکھائی۔ خود اعتمادی کا سبق دیا اور مولعات پر استقلال و استقامت سے فتح پالینا بتایا۔ نغمہ و ترنم کی پہلی تعلیم بھی حلیمہ کو اپنی ماں ہی سے ملی۔ ماں حلیمہ کے بچپنے میں اسے جو گیت اور لوریاں سنایا کرتی تھی، ان کا نغمہ و ترنم حلیمہ کی روح میں پیوست ہو گیا۔ اس کے خون میں سرایت کر گیا۔ اور ان گیتوں نے حلیمہ کو خلوص مقصد بھی سکھا دیا۔ اس ابتدائی تربیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ حلیمہ کو شعور آیا تو اسٹیج سے عشق ہو گیا تھا۔

چنانچہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے حلیمہ باکو گئی اور ترکی میوزیکل تھیٹر اسکول میں داخل ہو گئی۔ تھوڑے ہی دن میں استادوں نے حلیمہ کے جوہر قابل کا اندازہ کر لیا اور باکو میں تعلیم ختم ہونے کے بعد اس کی تعلیم جاری رہنے کی سفارش کی۔ استادوں کی اس سفارش پر وہ اپنی نغمہ و اداکاری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو کے ازبک اوپیرا اسٹوڈیو میں داخل کر لی گئی۔ جہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ازبک اسٹیج پر نمودار ہوئی۔

حلیمہ کا قد میانے سے کچھ نکلتا ہوا ہے۔ بھرے بدن پر قبائے چست اور بیضوی چہرے پر کلاہ تتری، ایک ایسی حسین و دلکش شخصیت سامنے کر دیتے ہیں کہ انسان دیکھا ہی کرے۔ حلیمہ کی آواز نہایت صاف ہے اور شفاف بھی۔ بات کرنے میں آواز کا زیر و بم اپنی جگہ نغمہ و موسیقی ہوتا ہے۔ جسوقت وہ اس طرز و وضع میں اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے تو پورا سراپا مجسم نغمہ اور مشکل موسیقی محسوس ہوتا ہے۔

اوپیرا اسٹیج پر وہ مختلف شخصیتوں کو پیش کیا کرتی ہے لیکن ہر روپ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حلیمہ اسی کے لئے موضوع ہوئی تھی، یہی فطری چیز ہے۔ یہ قدرت کا انعام ہے کہ اسکا ایکٹنگ حقیقت بن جاتا ہے۔ ایسا تماشائی بھی جس کی سمجھ سنجیدہ نہ ہوئی ہو،

ل۔ احمد

محسوس نہیں کرتا کہ وہ نقل کر رہی ہے۔ اور خود حلیمہ تو اپنے آپ کو بھول ہی جاتی ہے۔ ہر ایکٹنگ اس کے لئے فطری ہے اور کوئی کردار اس کے لئے اجنبی نہیں۔

حلیمہ کی سب سے زیادہ شاندار کامیابی اس اوپیرا (نغماتی ڈراما) کے سبب سے ہوتی جسکا نام "گُوزل سارا" ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ایسی عورت کو پیش کیا گیا ہے جو غلامی و کنیزی کی ذلیل حالت سے نکل کر سوویٹ مملکت کی پُر مسرت زندگی میں دلیرانہ داخل ہوتی ہے۔ حلیمہ جب اس کردار کے روپ میں تماشائیوں کے سامنے آتی ہے تو اس کے ایکٹنگ کی سچائی اور گہرائی اور کردار کی حقیقت و صداقت دیکھنے والوں کو بھونچک کر دیتی ہے۔ اس کی ہر حرکت میں رکھ رکھاؤ ہوتا ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے حسین ترین نمونے تراش رہی ہے۔ وہ چلتی ہے تو رعنائی اور دلآویزی کا پیکر معلوم ہوتی ہے۔ ایک شباب آغاز لڑکی کے لاابالیانہ انداز مسرت کے محسوسات کو حلیمہ اپنی پیش کش سے ڈرامائی جذبے کے علو پر پہنچا دیتی ہے۔

ازبک عوام میں شیریں فرہاد کا قصہ بہت مقبول ہے۔ ایک بہادر اور حی دار شاہزادہ اور ایک بدنصیب شہزادی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن زردار لوگ ان کی جدائی کا سبب بنجاتے ہیں۔ اس نغماتی ڈرامے کو حلیمہ کی صناعت ایسی سحر آفریں صورت دیدیتی ہے کہ بقول نکولائی خمیادسے جو ماسکو آرٹ تھیٹر کا مشہور و معروف ڈائرکیٹر ہے، حلیمہ کا درجہ جولیٹ اور اوفیلیا کا درجہ ہو جاتا ہے۔

حلیمہ صرف مشرقی موسیقی کی مغنیہ اور مشرقی موضوعات کی ہی ایکٹرس نہیں ہے۔ وہ روسی نغمہ و موسیقی کی بھی ویسی ہی ماہر ہے۔ یورپی اوپیرا کا ایکٹنگ اور نغمہ نوازی بھی اسی تکمیل کے ساتھ کرتی ہے۔ یورپی اوپیرا اسٹیج پر اوپیرا "کارمین" نہ جانے کتنی مدت سے مشہور و مقبول ہے۔ حلیمہ نے "کارمن" کی پیشکش سے بھی بے مثال شہرت و عزت پائی۔

سورج کی روشنی میں دمکتے ہوئے ازبکستان کی یہ دختر جب پہلی مرتبہ ماسکو کے اسٹیج پر نمودار ہوئی تو تماشائیوں کو گم سم بنا دیا اور بلبل ازبکستان کا لقب حاصل کیا۔

اس کے بعد سوویٹ یونین کی ہر جمہوریت، اس کے ہر شہر اور اسکے ہر گلی کوچے میں حلیمہ کے گانے اور اس کی دھنیں گونجنے لگیں اور سننے والوں کے دلوں میں شادمانی کی وہی لہر دوڑانے لگیں جو حلیمہ کو سُن کر تاشقند کو اور ازبکوں کی روح و جاں میں دوڑ جاتی ہے ٭

نوٹ:- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے — (ادارہ)

عالمگیر اتحاد کی طرف

بقیہ صفحہ ۴۹

سرکاری عمارت پانچ سال کے لئے ادارہ اقوام متحدہ کا عارضی صدر دفتر رہیگی۔

برطانیہ کی تحریک پر ۷ فروری کو ایک قرارداد پیش کی گئی۔ اسوقت پہلے اجلاس کے لئے نئی قراردادیں قبول کرنے کا آخری وقت بہت قریب آ چکا تھا۔ اس قرارداد میں ادارہ اقوام متحدہ سے دنیا میں خوراک کی نازک حالت پر غور کرنے اور حل تلاش کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ ۱۴ فروری کو جنرل اسمبلی نے پانچ بڑی طاقتوں کی قرارداد کو منظور کیا اور اس نازک حالت کی طرف تمام اقوام متحدہ کی توجہ مبذول کرائی گئی، اور خوراک کی کمی کو دور کرنے کے لئے متحدہ عمل کا مشورہ دیا گیا۔ اس قرارداد نے ساری حکومتوں سے خوراک کی انتہائی کفایت، غلہ جمع کرنے اور آئندہ مہینوں کی فصلوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی سفارش کی اور ساری حکومتوں سے اپنی خوراک کی ضرورت اور برآمد کی گنجائش کے متعلق اطلاعات شائع کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

۶ فروری کو حفاظتی کونسل اور جنرل اسمبلی نے اپنے اجلاسوں میں ہیگ کی بین الاقوامی عدالت کے پندرہ جج منتخب کئے۔

(۱) ڈاکٹر مو ہسو (چین) (۲) ڈاکٹر ڈی دیچر (بلجیم) (۳) پروفیسر باسدیواں (فرانس) (۴) ڈاکٹر گریرو (سیلویڈور) (۵) پروفیسر کرائلوف (روس) (۶) سر آرنلڈ ڈی مکنیر (برطانیہ) (۷) مسٹر الیف الفارز (میکسیکو) (۸) ڈاکٹر الوارز (چلی) (۹) ڈاکٹر ایلزدیڈو (برازیل) (۱۰) ایچ۔ ای بدوی پاشا (مصر) (۱۱) مسٹر جے۔ ای۔ رِیڈ (کنیڈا) (۱۲) ڈاکٹر زوریک (یوگوسلاویہ) (۱۳) ڈاکٹر کلیسٹڈ (ناروے) (۱۴) مسٹر وِنیارسکی (پولینڈ) (۱۵) آنریبل جی ایچ ہیک ورتھ (ممالک متحدہ امریکہ)

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ۱۴ فروری کو ختم ہو گیا۔ اسکا دوسرا اجلاس ممالک متحدہ امریکہ میں آئندہ ستمبر میں ہوگا کچھ کونسلوں اور جنرل سکریٹریٹ کا کام سال بھر جاری رہتا ہے۔

برطانیہ کے ماہر مالیات لارڈ کینیز انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ اور بین الاقوامی بنک کے گورنر مقرر ہوئے ہیں۔

حالانکہ جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک قومی بین الاقوامی ادارہ قائم کرنے کے لئے انتظامی معاملات سے بحث کرے لیکن اس نے بہت سے موجودہ بین الاقوامی مسائل پر بھی غور کیا۔ یہ مسائل دنیا بھر کے روزناموں کے پہلے صفحے پر جگہ پاتے ہیں اس لئے ادارہ اقوام متحدہ کے جنم پر تبصرہ کرتے وقت ان کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(فارین نیوز سے ماخوذ)

جاوی عورتیں

جاوا کی سرزمین مفرط اور نت نئی رنگینیوں سے مالامال ہے منطقۂ حارہ میں پائی جانے والی نباتات اور دہکتے ہوئے رنگوں کے پھول گہرے سبز رنگ کے پس منظر میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے نگینے۔ ساگو دانہ، تاڑ اور کھجور کے درختوں کے پتے ایسے ہلتے ہیں جیسے پنکھا۔ بھانت بھانت کی چڑیاں جب ہوا میں اڑتی ہیں تو ہر گاؤں کی فضا میں ایک بدیسی ایسا رنگ چھا جاتا ہے۔ اس جزیرہ کی آب و ہوا بڑی عجیب ہے یہاں کا درجۂ حرارت تقریباً ہر وقت ۸۰ رہتا ہے اس کی آتش فشانی مٹی بہت ہی زرخیز ہے اور زمین میں کاشت بھی بہت زیادہ کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اتنی گنجان آبادی کا پیٹ ملتا ہے۔ یہاں کے باشندے مختلف نسلوں کے ہیں۔ یورپ، عربستان اور چین کے آدمیوں کے علاوہ یہاں کے اصل رہنے والے غالباً سب ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں۔ اس جزیرے کے باشندوں میں سب سے زیادہ تعداد میں اور سب سے زیادہ تہذیب یافتہ لوگ خود جاوی ہی ہیں اگرچہ یہاں سنڈان اور مدورا کے آدمی بھی موجود ہیں جو اپنی اپنی زبان میں بولتے چالتے ہیں۔

جاوی لوگ جو مختلف اندونیشیائی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، بہ حیثیت مجموعی خوش خلق ہوتے ہیں۔ ان کے قد کسی قدر چھوٹے، بدن ہلکے، ہڈی سیدھی اور رنگ چمکدار بادامی سے لے کر سنہرا تک پایا جاتا ہے۔ ان کی سیاہ آنکھیں کسی قدر ترچھی ہوتی ہیں، ہونٹ موٹے اور بال گھنے کالے اور موٹے۔ اونچے طبقہ کے آدمی زیادہ تر کاہل اور نکمے ہوتے ہیں لیکن نیچے طبقہ کے لوگ محنتی ہیں اور کامیاب کاشتکار۔ اگرچہ بڑے شہر بھی وہاں کئی ہیں لیکن دو تہائی سے زیادہ آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ مغربی جاوا میں جہاں بارش بکثرت ہوتی ہے چاول کی کاشت تمام سال ہوتی ہے اور دھان کے کھیتوں سے قدرتی نظارے بڑے خوش نما ہو جاتے ہیں۔ چونکہ چاول سال کے ہر حصہ میں بویا جاتا ہے اس لئے ایک ہی وقت میں قریب ہی قریب کے کھیتوں میں فصل مختلف درجوں میں نظر آتی ہے کہیں تخم پاشی ہو رہی ہے تو کہیں نلائی، کہیں دھان ہرے ہیں تو کہیں پکے۔

جاوی لوگ ہر خوشی کے موقع پر جی کھول کر خرچ کرتے ہیں خواہ وہ موقع تہوار کا ہو خواہ بیاہ شادی کا، خواہ کسی کو سرکاری ملازمت کے ملنے کا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشوں کا بڑا رواج ہے اور چپ سوانگ بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان میں کلاکار بہروپ بھر لیتے ہیں اور اداکاری چپ سادھ کر کرتے ہیں۔ زبان سے کہنے کی باتیں ایک اور شخص پڑھ کر سناتا رہتا ہے۔ قومی کردار میں ایک قسم کا اضطرار مضمر ہے۔ اسکا اظہار ان کے ناچ گانوں سے ہوتا رہتا ہے جن کا انھیں بہت شوق ہے۔

اس وقت جاوا کے باشندوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہ حال پندرہویں صدی سے ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ زیادہ تر بودھ یا ہندو تھے۔ اور یہاں حکومت بھی بالکل ہندوستانی طریقہ پر ہوتی تھی بعض ہندو۔ بودھ حکومتیں بہت طاقتور منظم اور خوب پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان کے حدود جاوا سے باہر کے ممالک تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہ قدیم تمدن اسکے ہمسایہ جزیرہ بالی میں بھی پھیلا ہوا ہے اور خود جاوا کی قدیم عمارتوں اور کھنڈروں سے اتبک ہویدا ہے۔ جزیرہ کے وسط میں "بورو بودر" کا خرابہ اتباک موجود ہے۔ اور اپنی شان رفتہ اور عظمت گزشتہ کا اتبک مرثیہ خواں ہے۔ اس کے دالانوں میں قدیم سنسکرتی تحریرات اتباک پڑھی جا سکتی ہیں۔

جاوی عورتوں کی پوشاک بہت سادہ لیکن اکثر بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح کا تہمد باندھتی ہیں جو ساری سے ملتا جلتا ہے اور اس پر خوبصورت پھول بوٹے بنے رہتے ہیں۔ اوپر کے حصہ پر کپڑے کی ایک چوڑی پٹی ہوتی ہے جو کمر کو پیٹی کی طرح کسے رہتی ہے۔ یہ بھی رنگین اور خوشنما ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایک چھوٹی سی سفید قمیص یا چولی ہوتی ہے یا ایک لمبا لٹکتا ہوا اور ڈھیلا جبہ ہوتا ہے لیکن اکثر جاوی عورتیں اپنے کندھوں کو بالکل نہیں ڈھکتیں لیکن ایک قسم کے گلوبند کو اپنے جسم کی زینت ضرور بناتی ہیں جو لباس کے حسن کو دوبالا کرنے کے علاوہ کسی بوجھ یا بچہ کو لادنے یا اٹھانے میں مدد دیتا ہے۔

جاوی مرد ایک نیم جامہ پہنتے ہیں جو عام طور پر زرد یا سرخی مائل زرد رنگ کا ہوتا ہے اس کو "کین" کہتے ہیں۔ ان کے بال بہت لمبے ہوتے ہیں اور پیچھے کی طرف ان کا جوڑا ابھار رہتا ہے۔ جوڑے پر بھی ایک چھوٹا سا کپڑا پڑا رہتا ہے اس کو بھی "کین" ہی کہتے ہیں۔ سر پر اس میں گرہیں ایسی بندھی رہتی ہیں جو بالکل سینگ ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بڑے چھجے والا ہیٹ جو بانس یا چوڑے پتوں کا بنا ہوتا ہے بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے واسطے استعمال کرتے ہیں۔ مردوں کا نیم جامہ بھی عورتوں کی پوشاک کی طرح خوب منقش ہوتا ہے ہر جاوی کی پیٹی میں ایک خنجر ہوتا ہے جو کمر کے بیچ میں لٹکتا رہتا ہے۔ یہ خنجر آدمی کی حیثیت اور درجہ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ خنجر کا پھلکا تقریباً ایک فٹ لمبا ہوتا ہے اور نیام اور دستہ خوب جڑاؤ ہوتا ہے۔ جاوا کی خاص دستکاریاں کپڑوں کی چھپائی اور خنجر بنانا ہیں۔ شہروں میں مرد عورت عام طور پر مغربی وضع کا لباس پہنتے ہیں۔

جانی جہان

دیہات میں مکانات عام طور پر زمین میں بانس گاڑ کر بنائے جاتے ہیں لیکن سنڈانی

علاقوں نیچے اتنی جگہ کھلی رکھتے ہیں کہ مویشی ان میں سے آجا سکیں۔ بعض امیر جاویوں کے مکانات پتھر کے بھی ہیں۔ ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے جاوی کے مکان کے بالعموم تین حصے ہوتے ہیں:۔ ایک حصہ مہمانوں کے استقبال کے واسطے دوسرا ان کے سونے کے لئے اور تیسرا خود صاحبِ خانہ اور اسکے کنبہ کے رہنے کے واسطے۔ مکانات میں چمنیاں اور کھڑکیاں نہیں ہوتیں۔ روشنی دروازوں میں سے ہو کر آتی ہے اور دھواں جتنا بھی ممکن ہوتا ہے بانسوں کی درازوں میں سے باہر نکل جاتا ہے۔ ذرا کم حیثیت کے آدمی دو ہی درجوں کے مکان پر اکتفا کرتے ہیں اور غریب آدمی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو بانسوں یا سینٹھوں کی بنی ہوتی ہیں اور ان پر چھپر کھجور کے پتوں کا ہوتا ہے۔

امیر آدمی بڑے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ایک مرد کئی کئی بیویاں رکھتا ہے لیکن غریب لوگوں میں ایسا رواج نہیں ہے۔ امیر آدمی بجے رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ رہتے ہیں جیسا کہ اہلِ مشرق کا قاعدہ ہے۔ جاوا کے وسط میں دو خودمختار ریاستیں ہیں ایک "سوئرا کرت" جسکا رقبہ ایک سو تیرہ مربع میل ہے اور اسکا حکمراں خاندانِ "سولو" کا ایک فرد ہے۔ دوسری "جکجو کرت" جو ۔ ۔ چھین مربع میل کی ہے اس پر ایک سلطان حکومت کرتا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں میں ابھی تک انہی تکلفات اور آدابِ معاشرت کا دخل ہے جو عہدِ وسطیٰ کی محض یادگار ہیں لیکن جن کو اب اس زمانہ میں باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ روٴسا اور امرا کے نزدیک چترِ شاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ لوگ اسوقت تک باہر قدم نہیں نکالتے جبوقت تک ان کے حلقہ بگوش ملازم ان کے سر پر چتر لئے ہوئے نہیں چلتے۔ ان کے محلات میں مسلسل رقص ہوتا رہتا ہے اور ناچنے والیاں شاہی خاندان سے ہوتی ہیں۔

جاوا کا صدر مقام "بٹاویہ" ایک پرانی دنیا کی چیز ہے لیکن "سورا بایہ" ایک تجارتی شہر ہے جہاں روپیہ کی بڑی بہتات ہے۔ یہاں مختلف اقوام اور ممالک کے آدمی موجود رہتے ہیں۔ شہر کے تین خاص حصے ہیں (۱) چینیوں کی آبادی (۲) عربوں کی اور (۳) انڈونیشیائیوں کی۔

اگرچہ جاوا کوئی بڑا جزیرہ نہیں ہے لیکن یہاں کے قدرتی مناظر بھی قسم قسم کے ہیں۔ کوہستانِ پرنگر میں پہاڑی کھوئیں، غار اور درے، تیز بہتے ہوئے دھارے اور گہرے ہرے جنگلات روح کو بڑی فرحت مہیا کرتے ہیں کوہستانِ ٹینگر بھوتوں اور پاشتیوں کی دنیا ہے۔ یہاں کے سیاہ ریگزاروں اور آتش فشاں پہاڑوں (جاوا میں ان کی تعداد ۱۲۵ ہے) کو دیکھکر ہمارے ذہن میں ڈانٹے کی "انفرنو" گھوم جاتی ہے اور ہم خود بخود سمجھنے لگتے ہیں کہ مافوق الفطرت قصوں کی جنم بھومی شاید یہی مقام ہے۔

مستانی کا ٹیلہ

بقیہ صفحہ ۴۱

کتنے دانت ہمارے بیٹھے ہیں
دنیا کے بطن سے
ہابیل کا ایک اور بھائی پیدا ہوا۔
مریم نے قصاص لے لیا
شرع کی حد پوری ہو گئی
فتنہ سو گیا۔

یہ کہہ کر مریم نے شریفو کے منہ پر تھوک دیا اور سر اس کے کنبے کے آدمیوں کی طرف پھینک دیا۔ اس خونی واقعہ سے ساری بستی پر خوف و ہراس چھا گیا اور آئے دن کے جھگڑے خود ہی مٹ گئے۔ کچھ روز بعد مریم نے اپنے دیور سے جو بمشکل پانچ چھ سال کا تھا بیاہ کر لیا لیکن اب اس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے اور وہ اپنے چھوٹے سے دولہا کو ہر وقت کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتی اور لوگوں سے کہتی کہ دیکھو! میرا دولہا کتنا خوبصورت ہے۔ اور شام ہوتے ہی اس ٹیلے پر جا بیٹھتی جہاں شیخ کردہ جہابت کی راہ دیکھا کرتی تھی اور کچھ روز بعد تو یہ حالت ہو گئی کہ دن ہو یا رات مریم اسی ٹیلہ پر بیٹھی جہابت کو آوازیں دیا کرتی۔ گھر کے لوگ وہیں کھانے پینے کی چیزیں پہنچا دیا کرتے لیکن اب کھانا پینا تقریباً چھوٹ چکا تھا اور دنیا سے مستانی کہتی تھی۔ ایک روز جو کوئی ردی لے کر گیا تو مریم اسی ٹیلہ پر مری پڑی تھی اور لوگوں نے وہیں اسے دفن کر دیا اور اس روز سے وہ ٹیلہ مستانی کا ٹیلہ کہلاتا ہے۔

سائنسدانوں کی اولوالعزمیاں

شباہت حسین ادریوی

سرعت سے ترقی کرنے والی دنیا نے اپنے عجائبات سے ایک عالم کو ششدر کر رکھا ہے۔ ہر آنے والا دن ایک ناممکن چیز کو ممکن بنا دیتا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے کس قدر عجیب۔ کس قدر حیرت افزا اور کتنا شاندار ہوگا۔ آدم کی اولاد نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ شاہد فطرت کو پردۂ راز سے باہر نکال لائے۔ ناظرین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ ان کے ہم جنسوں نے "موت" پر فتح پانے کی کوشش شروع کر دی ہے اور روس کے حکما اس کے متعلق تجربے کر رہے ہیں۔

"مردے" زندہ کرنے کا خیال کوئی نیا خیال نہیں۔ حکمائے یونان و ہند کے متعلق بھی سنا جاتا ہے کہ انھوں نے اس کی کوشش کی تھی مگر ان کے نتائج سے ہم واقف نہیں۔ زمانۂ حال کے بہتیرے سائنسدان بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن میں سے ایک روسی ڈاکٹر ایس۔ جے شیچوکن کے تجربے قابل ذکر ہیں۔

عام حالات میں مرکزی نظام اعصابی کے اعمال و افعال دورانِ خون میں خلل پڑ جانے کے سبب جسم کے دوسرے نظام کے اعمال و افعال سے پہلے رک جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے تجربوں کا خاص مقصد اس بات کو ثابت کر دکھانا تھا کہ مرکزی اعصابی نظام حسب دلخواہ مصنوعی حالات کے تحت اپنے اعمال جاری رکھ سکتا ہے۔ اور اس رنگ میں وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے مختلف ہے۔

مرکزی اعصابی نظام یعنی دماغ اور نخاع کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جسم کے سارے عضو کی باگ ڈور اسی کے قبضے میں ہے اور اعضاء کے اعمال کی کمی بیشی یا حد اعتدال پر قائم رکھنا اسی کے بس کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی اعصابی نظام کے اعمال کا دوبارہ جاری کرنا جاندار میں زندگی کے دوبارہ آثار پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اور یوں تو پہلے ہی جسم کے دوسرے نظام اور اعضاء کے اعمال کو وقتی طور پر دوبارہ قائم کرنا ممکن تھا۔

ڈاکٹر شیچوکن نے اپنا تجربہ کتے کے سر پر کیا کتے کا سر تراش کے جسم سے علیحدہ کر لیا گیا اور اس کو ایک سیال مادے کے ذریعہ غذا پہنچائی گئی۔ یہ مادہ خون کا بدل تھا۔ غذا پہنچانے کا عمل ایک خاص آلے کی مدد سے کیا گیا اس تجربے میں دماغ کے بنیادی اعمال برقرار رہے۔ آنکھوں میں آثار حیات باقی تھے۔ سر کو چھونے سے اس میں حرکت پیدا ہوتی تھی کتے کے منہ میں ایک ٹکڑا جنر ڈالی گئی اور جس نے تو مادی اور پیپر کا ایک ٹکڑا اس کی زبان پر رکھ دیا تو اس نے اسے قبول کر لیا یہ اثرات سر کاٹنے کے بعد ساڑھے تین چار گھنٹے تک موجود رہے۔

اس مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ اعضاء کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سارے جسم سے بکلی ملحق رہیں۔ حتیٰ کہ دماغ جیسے سریع الحس عضو کے لئے بھی یہ ضروری نہیں۔

مذکورہ بالا تجربے سے چند نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں مثلاً یہ کہ تجربے کے طور پر دورانِ خون دوبارہ جاری کرنا مشکل نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فطری دورانِ خون کی نقل ایک ایسے مصنوعی آلہ کے ذریعے کی جا سکتی ہے کہ جو شریانوں میں خون پہنچا سکے اور وریدوں سے خون نکالنے کے قابل ہو اور اس طرح دل بن سکے۔

ایسا آلہ جو دل کے مصنوعی اعمال و افعال کی نقل کر سکتا ہو اس کام کو بخوبی انجام دے گا۔ اور ایسے آلے کو نقلی دل کہہ سکتے ہیں

سب سے پہلی مشکل جس پر فتح پانا ضروری ہے وہ ایک ایسا سیال مادہ پیدا کرنا ہے جو واقعی خون کا قائم مقام ہو سکے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ جسم کے سارے نظام بیک وقت منقطع نہیں ہوتے۔ اور سارے اعضا پر ایک ہی وقت میں موت نہیں آتی۔ اور یہ کہ "انتشار بعد الموت" کا عمل مثلاً "خود غارت گری" جسم کے ہر کیسہ میں ایک ہی ساتھ نہیں شروع ہوتا۔ مرکزی اعصابی نظام میں "موت" کے بعد فوراً انتشار شروع ہو جاتا ہے اور دماغ کے افعال کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے فوراً عمل کرنا لازمی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے تجربوں کی بنا پر دماغ کے اعمال کا اعادہ موت کے دس منٹ بعد نہیں ہو سکتا۔

سب سے بڑھ کر ان حالات کا پتہ چلانا ضروری ہے جن کے تحت انتشار بعد الموت کی رو کو پھیر کر استقلال کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور زندہ پروٹین کو پھر اس کی فطری حالت کی طرف واپس لایا جا سکتا ہے۔

ایسے جاندار کے جسم میں مصنوعی سیلان خون پیدا کرنے کا مسئلہ جو حقیقتاً مردہ نہیں۔ بلکہ اس کا صرف دورانِ خون بند ہو گیا ہو ایک حد تک حل ہو چکا۔ مگر ابھی تک کسی ایسے سیال مادے کا پتہ نہیں چلا جو کلی خون کا بدل ہو سکے اور جسم کے سب سے زیادہ اہم نظام یعنی مرکزی اعصابی نظام کے اعمال کا محرک اور اس کے قیام کا باعث بن سکے۔

ڈاکٹر موصوف کے تجربوں سے پتہ چلتا ہے کہ اعصابی افعال کا

احیا، بڑی حد تک اعصابی اجزا کو کافی طور پر آکسیجن گیس پہنچانے پر منحصر ہے۔

کامل مصنوعی خون میں آکسیجن گیس کو جذب کرنے کی خاصیت اصلی خون جیسی ہونی چاہئے۔ اب تک کوئی ایسا سیّال مادہ نہیں دریافت ہو سکا ہے جس میں یہ خاصیت کامل طور پر موجود ہو۔ اس لئے ابھی مرکزی اعصابی نظام کو دوبارہ زندہ کرنا اور کسی مصنوعی سیّال مادّے سے اس کے عمل کو جاری رکھنا غیر ممکن ہے۔
ڈاکٹر سیچولن نے کتے کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ تجربہ کرنے میں دوسرے کتے کا خون استعمال کیا۔ اور اس کو جمنے سے روکنے کے لئے ایک دوا ملائی گئی۔ یہ دوا جرمنی کے ایک کارخانہ نے تیار کی تھی۔ اسی مناسبت سے دوا کا نام "جرمینن" رکھا گیا۔ جس دوسرے کتے کا خون استعمال کیا جانے والا تھا اس کی ایک ورید میں مذکورہ بالا دوا کا انجکشن دیا گیا۔ اس طرح چند گھنٹوں کے لئے انجماد خون رک گیا۔ اور یہی عمل اس تجربے کو کامیاب بنانے میں ممد ہوا کیونکہ سیّال خون کے ذریعہ دماغ کے کیسوں کو آکسیجن کی غذا ملتی رہی اور اس کے اعمال و افعال قائم رہے۔

یادِ جلیل

علی احمد۔ بی۔ اے

آہ! تو نے بھی پیا موت کا جام اے ساقی ۔۔۔ ہو گیا آج سے تو عرش مقام اے ساقی
اب کہاں وہ تری محفل، وہ ترا میخانہ ۔۔۔ ہو گیا درہم و برہم وہ نظام اے ساقی
منہ چھپے بیٹھے ہیں چپ، بنتِ عنب روتی ہے ۔۔۔ خم میں بھوٹے ہوئے ٹوٹے ہوئے جام اے ساقی
بے ترے بادہ کشی کا کوئی حاصل نہ رہا ۔۔۔ آج سے مے ہوئی رندوں پہ حرام اے ساقی
منتشر ہوگئیں کیا نسخۂ سخن کی زلفیں! ۔۔۔ صبح بھی آج نظر آتی ہے شام اے ساقی
حسن اور عشق کی تفسیر ترا ہر مصرعہ ۔۔۔ ہر غزل تیری جوانی کا پیام اے ساقی
تیری گفتار کے چرچے ہیں فلک والوں میں ۔۔۔ قدسیوں کی ہر زباں پر ترا نام اے ساقی
تجھے تقویٰ کی قسم زہد و ورع کی سوگند ۔۔۔ خاص ہے تیرے لئے رحمتِ عام اے ساقی
ہے تری موت بعنوانِ دگر اصلِ حیات ۔۔۔ تیرا ہر نقش ہے اک نقشِ دوام اے ساقی

حسرتا دستِ اجل ایں چہ قیامت افتاد
کاروانِ سخن و شعر بہ غارت افتاد

سُن ذرا، خود تو کرے تو جواب اے ساقی ۔۔۔ کیا کریں اب یہ ترے خانہ خراب اے ساقی
نہ وہ محفل، نہ وہ ہنگامہ، نہ وہ جوش و خروش ۔۔۔ نہ وہ دستور، نہ وہ بادۂ ناب اے ساقی
بے صدا ساز ہے مطرب بھی گلوگیر ہے آج ۔۔۔ دخترِ رز بیٹھی ہے با چشم پُر آب اے ساقی
اس طرف فرش پہ دو چار شکستہ ساغر ۔۔۔ اس طرف ٹوٹے ہوئے چند رباب اے ساقی
برق تا آکے تڑپتی ہے سرِ بامِ فلک ۔۔۔ خون کے اشک بہاتا ہے سحاب اے ساقی
آبدیدہ ہے عروسِ حرمِ میخانہ ۔۔۔ سوگوار آج ہے کس کس کا شباب اے ساقی
داستانِ سخنت حیف بہ پایاں برسید ۔۔۔ ختم شد سلسلۂ شعر و شراب اے ساقی

مئے مینائے امیرؔ آہ بہ جامِ تو نماند
نام تو ماند بہ دنیا و تیامِ تو نماند

یادِ جلیل

عزیز احمد۔ بی۔ اے

کتنی بے رونق ہے بزمِ شاعری تیرے بغیر
چاند تاروں میں نہیں تابندگی تیرے بغیر
نغمہ سنجی بلبلِ گلزار کی وہ کیا ہوئی
بار ہے کلیوں کے لب پر اب ہنسی تیرے بغیر
منہ چھپے روٹھے ہوئے ساقی کی آنکھوں میں تری
ہو گیا ہے خواب لطفِ میکشی تیرے بغیر
کون دے سکتا ہے تیری طبعِ رنگیں کا جواب
کون لے سکتا ہے نامِ دلبری تیرے بغیر
بے پئے جو محو ہو جاتے تھے تیرے شعر سے
کون دیگا ان کو اذنِ بیخودی تیرے بغیر
ہوشوں پر سحر سا چھایا تیرے افکار کا
کون اٹھا سکتا ہے نازِ عاشقی تیرے بغیر
شمع بنکر کون دکھلائیگا جلوے طور کے
کون دے گا گمرہوں کو روشنی تیرے بغیر
کون اب غزلوں میں ڈھونڈیگا رموزِ کائنات
کون اب پائے گا رازِ زندگی تیرے بغیر
جام خالی ہے شکستہ ساز ویراں میکدہ
ہوگئی ہے جیسے ہر شے میں کمی تیرے بغیر
نظم ہوگی گیت ہونگے شاعری ہوگی ضرور
اس طرح ہوگی نہ اب جادوگری تیرے بغیر

گیت

چنچل من کیا ایسا تھمنا سکا
جب بیتے دن یاد آئیں تھمنا
پھولوں سے جب ٹھنکیں آنچل * اور شام سے سہیلے کا جب
یاروں کی چھنکی پایل * چنچل من کیا سبھلے گا ؟
پنگھٹ کے ناتے کیسے توڑوں * گیت کی لہریں کیسے چھوڑوں
لوٹے بندھن کیسے جوڑوں * چنچل من کیا سبھلے گا ؟
جب بیتے دن یاد آئیں تمنا
جب باغ میں کوئل بولے گی * جب جھولی ڈالی ڈولے گی
جب بن کی پنچھی کھولے گی * جب بیتے دن یاد آئیں تمنا
چنچل من کیا سبھلے گا ؟

ا پیپی ارسوری

نوٹ:۔ علی احمد اور عزیز احمد صاحبان حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ مرحوم و مغفور کے صاحبزادے ہیں۔

ایران میں قالین کی صنعت

مشہور سیاح سر ادریل اسٹائن کو ترکستان میں کھدائی کے دوران میں قالینوں کے کچھ فرسودہ ٹکڑے ملے جن کی بُنت، اون، نقش و نگار اور رنگوں سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ قالین عہدِ مسیح کے آغاز میں بُنے گئے تھے اور قالین بافی کے بہترین نمونے ہیں۔ لیکن تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صنعت مصر، یونان، آشور اور کلدیہ میں میلادِ مسیح سے صدیوں پہلے بھی پورے جوبن پر تھی اور وہاں کے قالین سونے کے بھاؤ بکتے تھے۔ قدیم یونانی شاعر ہومر اپنے مشہور شاہکار ایلیاڈ میں لکھتا ہے کہ ملکہ ہیلن نے شہر ٹرائے میں خود ایک قالین بُنا۔ یونانی مورخ پلیوٹس کے قول کے بموجب پرگامم کے بادشاہ آٹیلس کے ایما سے قالین کی بافت میں کلابتون کے سنہری ڈورے بھی شامل کئے گئے۔ قدیم رومی شعراء وڈّا اور ورجل بھی قالینوں کا ذکر بڑی شرح و بسط کے ساتھ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنعت میلادِ مسیح سے بہت پہلے پروان چڑھ چکی تھی۔

اس صنعت کی قدامت مسلّم لیکن اس کا جنم کب اور کہاں ہوا اس میں اختلاف ہے۔ نظریے تو کئی ہیں مگر دو نظریے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ اس صنعت نے وسطِ ایشیا کے مرتفع خطّہ میں جو ایشیائے کوچک سے دیوارِ چین تک چلا گیا ہے جنم لیا، وہاں کی خانہ بدوش اقوام کی گود میں پلی پھولی اور پھر مغرب کی سمت پھیلی۔ یہ بات دل کو لگتی ہے کیونکہ قدرت نے اس صنعت کے خاص ذرائع اور لوازمات جس فراخدلی سے اس خطّہ کو بخشے ہیں اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اس خطّہ میں چراگاہوں اور بھیڑوں کی بے پناہ بہتات ہے۔ وہاں کی بھیڑوں کی اون رنگ برنگ اور بہت ملائم ہوتی ہے اور اس کے ریشے لمبے، سیدھے اور نہایت باریک ہوتے ہیں اور ان میں دوسرے رنگ پکڑنے کی خاص صلاحیت ہے۔ اس اون میں ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ استعمال سے ملائم تر ہو جاتی ہے اور اس کے رنگ میں خاص نکھار اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں کی اون شروع ہی سے چمکیلی ہوتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ سب خوبیاں اس خطّہ کی گھاس کی مرہون ہیں جس کے مخصوص کیمیاوی اجزاء کا بدل سائنسی تحقیق ابھی تک معلوم نہیں کر سکی ہے۔ اس خطّہ کی ندیوں اور چشموں کا لطیف اور شفاف پانی اون دھونے کے لئے خاص طور پر مفید ہے اور وہاں وہ پودے اور جھاڑیاں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں جن کے پتوں، پھولوں اور چھلکوں سے پکے رنگ بنائے جاتے ہیں۔ اگرچہ کیمیاوی رنگوں کی وبا سے یہ خطّہ بھی نہیں بچ سکا، پھر بھی ہاتھ کے بنے ہوئے بہترین قالین اسی خطّہ میں ملتے ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس صنعت کا آغاز شمالی امریکہ کے ملک میکسیکو میں ہوا جہاں کا تمدن، تازہ تحقیقات کی رو سے، مصریوں کے تمدن سے بھی کئی ہزار سال زیادہ پرانا ہے۔ وہاں کے قدیم شہر یوکیٹن کے آثار، خاصکر مندروں میں جو نقش و نگار پائے گئے ہیں وہی نقش و نگار بہت سے قدیم ترین ایشیائی پردوں اور قالینوں میں ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میکسیکو کی قوم مایا کے مبلغ بحرالکاہل کے راستے دکن آئے اور ایشیا سے ہوتے ہوئے مصر پہنچے، جہاں انھوں نے مصر کے قدیم تمدن کی بنا ڈالی اور منجملہ دیگر صنائع کے قالین بُننا سکھایا۔ پھر یہ صنعت مصر سے آشور، کلدیہ، فنیشیا اور یونان سے ہوتی ہوئی ایران، توران، ہندوستان، عرب اور بالآخر یورپ اور امریکہ پہنچی۔ یورپ میں اس صنعت کو عربوں اور ترکوں نے متعارف کرایا۔ سب سے پہلے عرب مشرقی کرگے ہسپانیہ لے گئے اور قرطبہ اور غرناطہ کے قالین یورپ کے محلوں اور گرجوں کی زینت بنے۔ ایسے ہی کرگے سسلیہ اور اطالیہ میں بھی قائم کئے گئے۔ اِدھر سے ایرانی اور ترکی قالین بھی بحیرہ روم کے راستے یورپ پہنچے۔ قالینوں کے نقش و نگار میں مقامی مذاق کے زیر اثر بہت سی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ اطالیہ میں تو اس صنعت کو وہ عروج حاصل ہوا کہ شاہ عباس کبیر نے کئی ایرانی طلباء اس غرض سے اطالیہ بھیجے کہ وہاں کے شہرۂ آفاق مصوّر ریفیل سے قالین بافی کے نئے نئے نقش و نگار سیکھیں۔ یہ اطالوی طرز جس میں گل پھول، بیل بوٹے کثرت سے ہوتے ہیں، ایرانی (خاصکر کرمانی اور تبریزی) صنعت میں اب بھی کارفرما ہے۔ سولہویں صدی میں فرانس میں ترکی طرز کی قالین بافی شروع ہوئی۔ لوئی چہاردہم کے وزیر کولبرٹ نے کئی کارخانے کھولے جن میں ترکی اور ایرانی طرزِ بافت کو نئے نئے نقوش کے ساتھ اپنایا گیا۔ فرانس میں "گوبلن" کا کارخانہ اب بھی مشہور ہے۔ انگلستان میں مشرقی طرز کے قالین سب سے پہلے تیرہویں صدی میں پہنچے جب ملکہ ایلینور ہسپانیہ سے آتے وقت قرطبہ اور غرناطہ کے بہترین نمونے اپنے ساتھ لے گئی۔ جیمز اول نے مورٹ لیک (ضلع سرے) میں کرگے قائم کئے لیکن خانہ جنگی کے باعث بند کرنا پڑے۔ بعد میں بہت سے کرگے وجود میں آئے جن میں سے کچھ تو خالص ترکی طرز کے قالین بنتے تھے اور کچھ ترکی اور انگریزی ملی جلی طرز کے۔ سب سے پرانا (ملی جلی طرز کا) قالین جو ارل آف ویرولم کے گھرانے میں موجود ہے سنہ ۱۵۷۰ء میں بنا گیا تھا۔ ڈیوک آف بکلیوچ کے پاس بھی سنہ ۱۵۸۴ء کا خالص ترکی طرز کا (

محمد یعقوب داشی

بنا ہوا قالین موجود ہے۔ اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں کئی نئے کارخانے کھولے گئے جہاں قالین ہاتھ سے بُنے جاتے تھے لیکن اب تو تقریباً سب کے سب مشین سے بنے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اکبر نے ایرانی کاریگر بلوائے اور مغلیہ دور میں ایرانی قالینوں کا کافی دور دورہ رہا لیکن اب زیادہ تر مشین سے بنے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں کہیں کہیں اب بھی پرانے قالین پائے جاتے ہیں۔ ریاست جے پور کے عجائب گھر میں شاہ عباس کے زمانہ کا ایک بارہ گز لمبا اور ساڑھے چار گز چوڑا قالین موجود ہے جسکی چمک دمک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ امریکہ میں پہلا کارخانہ ۱۷۹۱ء میں فلیڈلفیا کے مقام پر کھولا گیا اور اب تو وہاں سینکڑوں کارخانے ہیں جہاں مشین سے قالین بنے جاتے ہیں۔

ایرانی صنعت (جسمیں ترکی طرز یا فن بھی شامل ہے) ساری دنیا کے لئے شغل رہی اور اب تو یورپ اور امریکہ کچھ عرصے سے نہ صرف اپنی ضروریات خود پوری کرنے لگے ہیں۔ ذیل کے گوشوارہ میں ایرانی قالینوں کی درآمد جو ۱۹۳۰ء میں ان ملکوں میں ہوئی قران کے حساب سے دکھائی گئی ہے۔ قران کو ایران میں اب ریال کہتے ہیں اور تقریباً دس قران یا ریال ایک روپیہ کے برابر ہیں۔ واضح رہے کہ ان ملکوں کے قالینوں میں کیمیاوی رنگ کچے اور پکے دونوں استعمال ہوتے ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۹۰۰۷۱۹۹	اطالیہ	۵۲۵۱۸۵
برطانیہ	۲۰۲۸۲۷۲۴	پولینڈ	۱۶۸۳۱
جرمنی	۴۸۶۸۵۰۲	سوئیڈن	۱۴۴۰
بلجیم	۱۶۲۱۵۹	سوئٹزرلینڈ	۳۵۵۳۶۳
فرانس	۱۹۷۵۴۷۴	جیکوسلویکیہ	۹۹۰۵
آسٹریا	۴۰۳۲۶۴۰	ہالینڈ	۸۱۲۵۳
یونان	۴۱۲۲۳۵	سوویٹ یونین	۴۷۶۲۰

ایشیا میں قالینوں کی برآمد زیادہ تر ایران، ترکی، ہندوستان اور چین سے ہوتی ہے۔ ذیل کے گوشوارہ میں ان ممالک کی برآمد کے اعداد مربع گزوں میں دیئے گئے ہیں:-

سال	ایران	ترکی	ہندوستان	چین
۱۹۰۷ء	۵۳۵۳۰	۶۷۰۴۹۷	۳۹۶۹۵	۱۲۲۹
۱۹۱۳ء	۲۵۲۸۱۷	۳۲۷۲۷۸	۸۲۳۳۷	۲۸۰۴
۱۹۱۷ء	۲۶۱۵۱۶	ایضاً	۸۳۳۴۸	۱۳۰۵۸۱
۱۹۲۲ء	۵۴۱۲۱۳	۲۵۶۲۹۲	۱۰۲۶۳۰	۴۶۸۷۳۲
۱۹۲۵ء	۶۵۱۷۷۶	۱۱۲۲۸۵	۱۱۸۸۳۳	۶۸۱۰۰۸

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ جہاں ایران، ہندوستان اور چین کی برآمد بڑھتی گئی وہاں ترکی کی گرتی گئی اور چین کی برآمد تو اس سرعت سے بڑھی ہے کہ وہ ایران سے بھی سبقت لے گیا ہے۔

یوں تو ایران میں شاید ہی کوئی شہر یا قریہ ہو جہاں قالین نہ بُنے جاتے ہوں لیکن ذیل کے مقامات میں یہ صنعت باقاعدہ طور پر قائم ہے:-

(۱) صوبہ آذربائیجان میں تبریز، قراداغ، سراب، قوی اور افشار (۲) صوبہ خراسان میں مشہد، سمنان، شاہرود، بجنورد، قائن اور ترکمنی علاقے (۳) استرآباد (۴) طہران اور ورامین (۵) ضلع خمسہ میں گروس اور بیجار (۶) صوبہ عراق میں سلطان آباد فراہان، ساروق، میقان، مشک آباد، جوزان، تفرش اور مہاجران (۷) ہمدان، (۸) کرمانشاہ (۹) کردستان میں ساوجبلاغ اور سنندج (۱۰) اصفہان (۱۱) کرمان (۱۲) کاشان (۱۳) یزد اور (۱۴) شیراز۔ ان میں سے تبریز، کرمان، کاشان مشہد، سلطان آباد اور ترکمنی علاقے کے قالین زیادہ مشہور ہیں۔

اس صنعت کے لازمی اجزا یا عوامل یہ ہیں:- اون، ریشم، سوت، رنگ نقش اور کاریگر۔

اون سب سے بڑا جزو اون ہے۔ قالین بافی کے لئے اون کا مضبوط، نرم، شفاف اور اسکے ریشوں کا لمبا، سیدھا اور نازک ہونا بہت ضروری ہے۔ ایران، خاصکر خراسان، کردستان، فارس اور کرمان کی اون میں خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور خراسان اور کردستان کی اون میں تو خاص قسم کی چمک بھی ہوتی ہے یوں تو ہسپانیہ اور آسٹریلیا کی اون بھی بہت نفیس ہے لیکن چونکہ اس کے ریشے پیچدار اور ایرانی ریشوں کی مانند بالکل سیدھے نہیں ہوتے اسلئے وہ قالین بافی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ مزید برآں خوردبین سے دیکھا گیا ہے کہ ایرانی ریشے میں نہایت باریک باریک دندانے سے ہوتے ہیں جس سے قالین بافی میں بہت مدد ملتی ہے۔ یہ خوبی دوسرے ملکوں کی اون میں اسدرجہ نہیں پائی جاتی ایران میں بھیڑ کے مختلف حصوں کی اون مختلف اونی چیزوں کے بُننے میں کام آتی ہے۔ قالین بافی میں صرف پیٹھ اور پہلوؤں کی اون استعمال ہوتی ہے۔ ران کی اون سے موٹے پارچے بنتے ہیں، پیٹ کی اون سے کمبل بنتے اور خود چین اور سر، گردن کی اور پنڈلیوں کی اون سے رسّے وغیرہ۔ قالین بافی کے لئے بیحد ضروری ہے کہ بھیڑ ذبح کرنے سے پہلے اسکی اون اتار لی جائے۔ کیونکہ مری ہوئی بھیڑ کی اون اچھی طرح رنگ نہیں پکڑتی۔ اون کئی کئی مرتبہ ٹھنڈے، شفاف پانی سے دھوئی جاتی ہے اور خاص موسم میں ہوا کی خاص حدت میں سکھائی جاتی ہے۔

ریشم خالص ریشمی قالین عہد صفوی میں بہت مروج پر تھے۔ لارڈ کرزن کی رائے میں ان ریشمی قالینوں سے زیادہ لطیف اور نازک چیز

انسانی ہاتھ نہیں بُن سکتے ہیں۔ غالباً ان کے ذہن میں اسوقت ڈھاکہ کی ململ اور کشمیر کے شال نہیں تھے۔ خیر یہ مبالغہ ایک حد تک قابلِ عفو ہے اس میں کلام نہیں کہ صفوی عہد کا ریشمی قالین اپنی جگہ ایک کرشمہ تھا جو باذوق بادشاہوں کی انتہائی فن پروری ہی سے وجود میں آسکا۔ ریشمی قالین اب بھی کاشان میں ہاتھ سے بُنے جاتے ہیں اور امریکہ میں مشین سے لیکن وہ بات کہاں۔ ایران میں ریشمی قالین بافی اسلئے بھی ترقی نہیں کرسکی کہ ان پر بہت لاگت آتی ہے اور ان کی مانگ دولتمند طبقے تک محدود ہے۔ کہیں کہیں ریشم اونی قالینوں میں تانے بانے کا بھی کام دیتا ہے اور ایسے قالین مضبوطی اور لطافت کے اعتبار سے بےنظیر ہیں۔

سُوت کردستان، آذربائیجان کے بعض حصوں اور ترکمنی علاقوں میں اونی قالین کا تانا بانا بھی اون ہی کا ہوتا ہے لیکن ایران کے دوسرے مقامات میں تانا بانا عام طور پر سوت کے ڈوروں کا ہوتا ہے۔ یہ ڈورے خاص طور سے بٹے جاتے ہیں اور جتنے زیادہ بٹے ہوئے ہوں، اتنا ہی قالین نفیس اور مضبوط ہوتا ہے۔

رنگ ایرانی قالینوں کی برتری اور خاص مقبولیت ان رنگوں کی وجہ سے بھی ہے جو زمانہ قدیم سے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ یہ رنگ قدرتی ہیں اور نباتی بھی ہیں اور حیوانی بھی۔ ان رنگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ صرف پکے ہیں اور دھوپ اور پانی میں بگڑتے نہیں بلکہ قالین کے استعمال کے ساتھ ساتھ یہ نکھرتے رہتے ہیں اور ان میں ایک خاص چمک پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اسی لئے تجار اپنے قالین بازاروں میں پھیلا دیتے ہیں تاکہ لوگ انکے اوپر چلے پھریں۔ یہ رنگ مجیٹھ (MADDER) قرمز کیڑے، بھیڑ کے خون، نیل، انگور کے پتوں، بادام اخروٹ، پستہ اور انار کے چھلکوں اور مختلف گھاسوں اور بوٹیوں سے بنائے جاتے ہیں۔ ان رنگوں سے یا ان کے امتزاج سے سینکڑوں تدریجی کیفیتوں کے رنگ پیدا ہوتے۔ ان چیزوں سے رنگ حاصل کرنا ایرانیوں کا مخصوص فن ہے، اور اس کے اصول اور طریقے مرموز اور ناقابلِ تقلید ہیں۔ قرمز کیڑا (KERMES) جس سے سرخ رنگ بنایا جاتا ہے شاہ بلوط کے درختوں میں پایا جاتا ہے جو زیادہ تر بحیرہ روم کے آس پاس کے ملکوں میں ملتے ہیں۔ یہ رنگ چکیلا بھی ہے اور دیرپا بھی۔ یہی رنگ ترکوں نے یورپ میں متعارف کرایا تھا۔ حال ہی میں میکسیکو میں ایک کیڑے سے اسی قسم کا سرخ رنگ لیا گیا ہے جو قرمز کی جگہ استعمال ہونے لگا ہے۔ یہ رنگ بھڑکیلا تو بہت ہے لیکن دیرپا نہیں۔ نیلا رنگ جو نیل سے تیار ہوتا ہے ایران کا ایک ممتاز رنگ ہے۔ اس کے بنانے کے طریقے طویل اور پیچیدہ ہیں لیکن اب یہ رنگ بہت کم استعمال ہوتا ہے اور اب تو شاید بہت کم ایرانیوں کو اس کے بنانے کا راز معلوم ہو۔ وجہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں یورپ میں کول تار سے مصنوعی نیلا رنگ جو نیلین کہلاتا ہے ایجاد ہوا اور کثیر مقدار میں ایران اور دیگر مشرقی ممالک میں آنے لگا۔ یہ رنگ بہت سستا ہے اور آسانی سے مل سکتا ہے۔ ایرانی نیل سے رنگ بنانا تقریباً ترک کرچکے ہیں اور نیلین ہی استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن اس مصنوعی رنگ میں وہ پختگی اور پائیداری نہیں جو ایرانی نیلے رنگ میں ہے۔ ایرانی حکومت اس رنگ کی درآمد اور استعمال کو اپنی صنعت کے لئے زہرِ قاتل سمجھتی رہی ہے۔ ناصرالدین شاہ قاچار نے اس کی درآمد ممنوع کردی تھی اور یہ فرمان جاری کیا تھا کہ جو شخص قالین بافی میں نیلین استعمال کریگا اسکا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائیگا لیکن اس پر چنداں عمل نہ ہوا اور نیلین اور دیگر مصنوعی رنگوں کا (جو یورپ سے آتے تھے) رواج بڑھتا گیا۔ ناصرالدین شاہ کے بیٹے مظفرالدین شاہ نے سنہ ۱۹[illegible]ء میں تخت پر بیٹھتے ہی نیلین کی درآمد کے خلاف ایک مفصل فرمان جاری کیا جسمیں یہ ہدایت تھی کہ جتنا نیلین درآمد ہو فوراً ضبط اور ضائع کردیا جائے اور درآمد اور استعمال کرنیوالوں کے لئے قید اور جرمانے کی سزائیں مقرر کی گئیں۔ چنانچہ سینکڑوں من نیلین ضبط ہوکر سرِ عام جلادی گئی۔ اس فرمان کی ایک ایک نقل تمام سفارتخانوں کو بھی بھیجی گئی۔ اس گیر و گرفت کے باوجود نیلین اور دیگر جوہری رنگ کسی نہ کسی طرح ایران میں درآمد ہوتے رہے اور اب تو ان کا استعمال عام ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ بنیاد جس پر ایرانی صنعت کی فضیلت اور شہرت بجا طور پر بنی تھی اس کو گھن لگ گیا ہے۔ یہ صنعت فن سے زیادہ تجارت بن کر رہ گئی ہے۔

نقش و نگار پرانے قالینوں کے نقش و نگار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی، ترکمنی اور قفقازی نقش و نگار عام طور پر ہندسی شکلوں کے ہیں اور ایرانی نقش و نگار زندگی سے زیادہ قریب اور زیادہ تر درختوں، پھولوں اور بیلوں کے نقوش پر مشتمل ہیں۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ ترکی، ترکمنی اور قفقازی طرزیں گل پھول بیل سے عاری نہیں ہیں یا یہ کہ ایرانی طرزیں ہندسی شکلیں ناپید ہیں۔ "شجرِ حیات" وسطی ایشیا کا پرانا تخیل ہے اور ایرانی طرزیں ایک حد تک قدیم مصر کے "سوسن نیل" کے تخیل کو بھی دخل ہے۔ ان نقوش میں ایک خاص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ایرانی نقش و نگار کی بڑی اور مقبول طرزیں یہ ہیں:— طرح شاہ عباس، طرح سردار، طرح گل حنائی، طرح ترنجی، طرح سیبی۔ اسلام کا اثر ایرانی صنعت پر یہ پڑا کہ قالینوں اور دیگر فنی اشیاء میں جانداروں کی شبیہیں نہیں بنائی جاتی تھیں لیکن اب تو بادشاہوں اور سورماؤں کی شبیہیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ میں خود ایک غالیچہ لایا تھا جس میں نادر شاہ کی شبیہہ بنی ہوئی ہے۔ پرانے طرز کے نقوش کے علاوہ اب ایرانی قالینوں میں اطالوی، فرانسیسی اور ہسپانوی طرزیں اپنائی جارہی ہیں لیکن ہندسی شکلوں کے اندر مغربی ماہرین کا خیال ہے کہ ایرانی صنعت میں اس صدی کے شروع سے اسقدر نقالی بڑھ گئی ہے کہ ان کی اپنی اپج ماری گئی ہے اور وہ اپنے پرانے نقش و نگار بھی بھولتے

جلتے ہیں جن کی وجہ سے باہری ملکوں کے لوگ ایرانی قالینوں کے اب بھی گردیدہ اور تلاشی ہیں۔ کاریگر بھی کیا کریں۔ یورپی اور امریکی فرموں کے نمائندے ایران میں رہتے ہیں اور اپنے نقش ونگار تجویز کرتے ہیں۔ چونکہ وہ لوگ مقامی نرخوں سے بہت زیادہ اُجرت دیتے ہیں کاریگر مان جاتے ہیں لیکن شہروں سے دور، دیہات اور کوہستانی علاقوں کے کاریگر اب بھی وہی پرانے نقش ونگار اور وہی اصلی رنگ استعمال کر رہے ہیں گو ان بیچاروں سے دلال کہیں زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ ایرانی حکومت ان نقائص کو دفع کرنے کی کوشش میں ہے۔

کرگے ایرانی قالین ہاتھ سے بُنے جاتے ہیں، اور سیدھے سادے لکڑی کے کرگوں پر۔ بافت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک ایرانی دوسری ترکی۔ فرق یہ ہے۔ ایرانی بافت میں قالین کا تار ایک ہی مرتبہ کرگے کے دو تاروں پر لپیٹا جاتا ہے اور پھر گرہ یا پھندا ڈال دیا جاتا ہے۔ ترکی بافت میں ان میں پہلے ایک تار پر پھر دوسرے تار پر لپیٹا جاتا ہے اور پھر گرہ ڈال دی جاتی ہے۔ ایرانی قالین کا رواں اونچا نہیں ہوتا اور بنائی کے بعد یکساں طور پر کاٹ دیا جاتا ہے۔ قالین کی باریکی اور مضبوطی اور قیمت گرہوں یا پھندوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ عام قالینوں میں اسی سے سو تک گرہیں فی مربع انچ ہوتی ہیں لیکن اعلیٰ قالین میں ایک مربع قدم میں چالیس ہزار تک گرہیں ہوتی ہیں جتنی زیادہ گرہیں، اتنی ہی زیادہ قیمت۔

مستقبل ایرانی صنعت کے موجودہ تنزل کی وجہ زیادہ تر اقتصادی ہے۔ کاریگروں (جن میں عورتیں اور بچے کثرت سے ہیں) کو انکی محنت کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ ان کا رہن سہن کا طریقہ، صحت اور تعلیم کی حالت خاطر خواہ نہیں۔ ان میں صلاحیت اب بھی موجود ہے اور اگر حالات سُدھر جائیں تو پرانی صلاحیتیں بروئے کار آسکتی ہیں اور یہ صنعت، فن اور منفعت کے اعتبار سے اب بھی اپنی پرانی رشک آور حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ سرجو برسل جو برسوں برطانوی سفارتخانہ طہران میں سیکرٹری رہ چکا ہے بہت فکر انگیز اور امید افزا رنگ میں لکھتا ہے:-

"جب ہم کاریگروں کی مشکلات پر غور کرتے ہیں، جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں اپنی محنت کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے، جب ہم سوچتے ہیں کہ وہ بالکل ان پڑھ ہیں اور سخت عسرت سے گزر کرتے ہیں بلکہ قوت لایموت کیلئے ترستے رہتے ہیں ... جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مصیبتوں کے علاوہ ان سے بیگار لی جاتی ہے، وہ بادل کا شکار رہتے ہیں اور انکی عورتیں زچگی اور پرورش اولاد کی پریشانیوں میں مبتلا رہتی ہیں تو ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ یہ صنعت کیوں تنزل کر گئی بلکہ اس بات پر ہوتا ہے کہ ایسے گھناؤنے حالات میں یہ صنعت باقی کیسے رہ گئی تاہم میرا یہ ایمان ہے کہ اگر آج کے ایرانی کاریگر کی خاطر خواہ حق رسی اور ہمت افزائی کی جائے تو وہ نہ صرف پرانے کاریگروں سے ٹکر لے سکتا ہے بلکہ ان سے سبقت لیجا سکتا ہے۔"

* ایرانی حکومت اس صنعت کے صحت مند رجحانات کی طرف متوجہ ہے۔ ایرانی قالین کے مداح دنیا بھر میں اس دن کے منتظر ہیں جب یہ صنعت جو ایرانی مالیات کا سب سے بڑا جزو بھی ہے پھر اپنے اصلی اور رشک آور عروج پر پہنچ جائے گی۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضمون	مصنف
۱- تضمین میر حسن دہلوی (غیر مطبوعہ) ..	مرسلہ جناب عبدالعلیم شیر کوٹی
۲- غزل	حضرت وحشت کلکتوی
۳- رائٹ آنریبل سر نیواسا سستری	جناب سیّد بادشاہ حسین حیدرآبادی
۴- حادثہ (افسانہ) ..	جناب قیسی رامپوری .. ..
۵- ہندوستانی موسیقی (۱)	.. جناب شاہد احمد دہلوی .. ..
۶- روس میں آبپاشی	پروفیسر اے وی پولیاکوف ..
۷- موت کا جنم (نئی کہانی) (۱)	پروفیسر محمود ہاشمی
۸- تحسین ناشناس	جناب غلام محمد بٹ .. ..
۹- ہیرے کی انگوٹھی	محترمہ بدر النساء ظفر .. ..
۱۰- فتح یورپ کے بعد پہلا موسم سرما	محترمہ شانتا رانی .. ..
۱۱- نکات شکسپیر	پروفیسر تلوک چند محروم .. ..
۱۲- چند پشتو شاعرات	محمد یعقوب دواشی .. .. ..
۱۳- اُردو غزل گوئی کی نئی کروٹ	جناب ابن الحسن رضوی .. ..
۱۴- لندن کی نشرگاہ	.. جناب ستیا پال .. .. ..

مشہور و معروف حلوہ سوہن کی واحد
قدیمی شاہی دکان
حلوہ سوہن کی ہر قسم ۔ حبشی ۔ پستئی ، جوزی ، بادامی ، پپڑی ، پیڑی ، گری مکھنی
پپڑی ، زعفرانی وغیرہ ہمارے ہاں تیار ملتی ہیں۔
اس کے علاوہ تمام ہندوستانی مٹھائیاں بھی ملتی ہیں۔
نوٹ :- آرڈر آنے پر مال بذریعہ وی ۔ پی بھیجا جاتا ہے۔
شیخ عبدالخالق شاہی حلوہ سوہن والے چاندنی چوک دہلی
اردو کی خدمت کیجئے
اردو کی
ہر قسم کی کتابیں
ہم سے طلب کیجئے
بک ڈپو انجمن ترقی اردو
اردو بازار دہلی
سید الانبیاء ، خاتم النبیین ، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم
کی
سیرت پر مشہور عالم کتاب
رحمتہ اللعالمین کامل تین جلد
(سیرت النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم)
مصنفہ :- علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری
رحمتہ اللعالمین نے شائع ہوتے ہی سیرت رسول کے شیدائیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی ۔ اور اس کو جملہ حلقوں میں مستند قرار دیکر پسند کیا گیا ۔ اب اس کی جگہ تینوں جلدیں تیار ہو گئی ہیں ۔
یقیناً اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر تڑپ جائینگے ۔ اتنی دلچسپ اتنی مکمل اور اتنی اعلیٰ کتاب سیرۃ النبی صلعم پر آپکو کہیں وہ نہیں ملے گی ۔ طرز بیان محبت اور عقیدت کے رنگ میں سلجھا ہوا ۔ طریقہ استدلال سنجیدہ ہی سیرت کیساتھ ساتھ مختلف مذہبی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اس کی افادی حیثیت بڑھ گئی ہے۔
کتابت روشن اور خوشخط ۔ کاغذ چکنا عمدہ دبیز ۔ طباعت دیدہ زیب ۔ جلد پائدار ولایتی کپڑے کی
گردپوش سہ رنگا خوبصورت
کامل تین حصہ مجلد ستره روپے
ہم اسلامی و ادبی کتابیں ۔ قرآن مجید اور پاکٹ بکس شائع کرتے ہیں ۔
ملنے کا پتہ :- شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار لاہور

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۳ | یکم جولائی ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا
ایم اے
فضل حق قریشی
دہلوی
مشیر احمد
ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

حیدر آباد کا نیا صنعتی خاکہ

حیدر آباد کے محکمہ جات تجارت اور صنعت و حرفت کے رکن نواب لیاقت جنگ بہادر نے ایک تقریر کرتے ہوئے اخبارات کے نمائندوں کو بتایا کہ حکومت حیدر آباد اپنی ریاست میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے آئندہ دس سال کے دوران میں ساڑھے تین ارب روپے خرچ کرے گی۔ اور اس سلسلے میں اسکی ہر کارروائی بالکل آزادانہ ہوگی۔ سب سے پہلے اسے کوئلے کی کانوں پر پورا پورا اختیار حاصل کرنا ہوگا کیونکہ کوئلہ ہر صنعت کی ترقی کے لئے ایک اہم جزو ہے۔ لیکن حکومت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ نجی اداروں سے کسی قسم کا مقابلہ کرے۔ سوت کاتنے کا ایک کارخانہ قائم کیا جائیگا جس میں کم و بیش پچیس ہزار چرخے ہونگے تاکہ جلاہوں کو کم سے کم قیمت پر اچھا سوت حسب ضرورت مقدار میں مل سکے۔ ایک تیل کے اور دو مصنوعی ریشم کے کارخانوں کے علاوہ پارچہ بافی کے سات کارخانے قائم کئے جائینگے۔ آخر الذکر کے چھ کارخانے اسوقت موجود ہیں۔ دریائے گوداوری کے علاقے میں لوہے اور فولاد کا کام شروع کرنا زیر غور ہے۔ اس مقصد کے لئے دریائے گوداوری کے اس مخصوص علاقے سے ریاست بستار تک سو میل لمبی ریلوے لائن ڈالی جائیگی۔ ریاست مذکور سے کچا لوہا نکالنے کے لئے اسکی حکومت سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ قیاس ہے کہ وہاں کان کنی کی مراعات مل جائینگی۔ حکومتِ حیدر آباد سلمے ستارے کی قسم کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بھی کوشاں ہے۔ کیونکہ وہاں کی یہ مشہور صنعت کبھی دنیا بھر میں مشہور تھی۔ خیال ہے کہ ضلع اورنگ آباد میں اس کام کو تین لاکھ کے سرمائے سے شروع کیا جائے۔ اس ضمن میں پچیس فیصدی سرمائے کے حصے عوام کو دیدئے جائینگے تاکہ وہ بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔

لندن میں جشنِ فتح

۸ جون کی صبح اہلِ لندن کے لئے حد درجہ مسعود و مبارک ثابت ہوئی کیونکہ اس روز ایک ایسا شاندار جشنِ فتح منایا گیا جو تاریخ انگلستان میں ہمیشہ یادگار ثابت ہو سکتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں موجودہ شہنشاہ کی تقریب تاجپوشی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ پہلا نعرۂ مسرت تھا جو حدودِ برطانیہ کی اس فضا میں بلند ہوا جسے چھ سال کی طویل صبر آزما جنگ نے مکدر بنا دیا تھا۔ اس میں شریک ہونے کے لئے لوگ پورے ذوق و شوق کے ساتھ انگلستان کے ہر حصے سے آئے اور ایک ہنگامۂ نشاط برپا کر دیا۔ اس میں بحری، بری، اور فضائی فوجوں کے علاوہ وہ محب وطن بھی شامل ہوئے جنھوں نے محاذ جنگ سے دور شہروں کی پرسکون فضا میں رہ کر کئی لحاظ سے جنگی خدمات انجام دی تھیں۔ ان سب کی تعداد دو لاکھ انیس ہزار تھی۔ بادشاہ سلامت کو سلامی دیتے ہوئے جب یہ لوگ گذرے تو جلوس کئی میل لمبا ہو گیا۔ اس موقعہ کی ہزاروں لاکھوں تصویریں کھینچی گئیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ٹیلی وژن کا انتظام تھا جو توقعات سے زیادہ کامیاب رہا۔ خیال یہ تھا کہ اس ٹیلی وژن کے ذریعہ اس جشن کے مناظر پچیس میل کے دائرے میں دکھائے جا سکیں گے لیکن تعجب ہوا جب ایک سو ستر میل دور رہنے والے لوگ بھی اچھی طرح اسکی زیارت کر سکے۔ اس جشن کا سب سے زیادہ لطف ان لوگوں کو حاصل ہوا ہوگا جو جنگ کے میدانوں میں بہادری کے کارنامے پیش کرتے ہوئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کر چکے تھے۔

انجمن نوساختہ انڈو ایرانین

ہندوستان اور ایران کے مابین ثقافتی تعلقات کو زیادہ وسیع کرنے اور استوار رکھنے کے لئے دہلی میں ایک نئی انجمن کی داغ بیل ڈالی گئی ہے جسکا نام "انڈو ایرانین ایسوسی ایشن" رکھا گیا ہے۔ یہ انجمن علمی اور صنعتی نمائشوں، فلموں اور تقریروں وغیرہ کے ذریعہ دونوں ملکوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ طلباء اور اساتذہ ایک دوسرے ملک میں بھیجے جائیں گے تاکہ اس طرح مل جل کر اکتساب علوم و فنون کی عملی صورت پیدا ہو سکے۔ اس امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ مختلف کھیلوں اور ورزشوں کے مظاہرے ایک دوسرے کے ملک میں کئے جائیں۔ حسب ضرورت کتابوں اور قلمی مسودوں وغیرہ کا تبادلہ عمل میں آئیگا۔ امید ہے کہ یہ انجمن، جیسا کہ اس کے مقاصد سے ظاہر ہے دونوں ملکوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اس انجمن کے ناظم اعلیٰ حضرت منظور حسن موسوی ایم اے ہیں جو عرصۂ دراز تک دہلی کے اینگلو عربک کالج میں شعبۂ السنۂ شرقیہ کے معلم اساتذہ رہے ہیں۔

موصوف بذاتِ خود ایران کا دورہ لگا کر وہاں کے جملہ حالات کا غائر مطالعہ فرما چکے ہیں۔

شاہ اطالیہ کی جلاوطنی

یورپ میں امن چین ہونے کے بعد جب اطالیہ کی فضا بھی پرسکون ہوگئی تو امبرٹو ثانی کو جو خانوادۂ سیوائے کے رکن اور تاج و تخت کے مستحق تھے بادشاہ بنا دیا گیا۔ اطالیہ کے اس مشہور خاندان کے افراد گذشتہ چھیاسی سال سے عنانِ حکومت سنبھالے رہے ہیں۔ لیکن زمانے کا رنگ چونکہ بہت کچھ بدل چکا تھا اس لئے فوراً ہی اعتراضات شروع ہو گئے اور جمہوریت پسندوں نے زور دیا کہ شہنشاہیت کے سلسلے کو ختم کر دیا جائے۔ مجبوراً عوام سے استصواب رائے کیا گیا۔ ۱۲،۰۹۲،۰۵۵ اشخاص نے جمہوریت قائم ہونے کے حق میں اپنی رائے پیش کی۔ اس کے برعکس ۱۰،۳۶۲،۷۰۹ اشخاص نے شہنشاہیت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی مرضی ظاہر کی۔ اس شکست کے بعد ظاہر تھا کہ امبرٹو ثانی کو تاج و تخت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنی ملکہ میریا اور چار بچوں سمیت روم سے جلاوطن ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر اکتالیس سال ہے۔ ان کی روانگی کے بعد سے سامراجیوں نے شورش برپا کر رکھی ہے۔ وہ اپنے بادشاہ کو واپس بلانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ شاہ امبرٹو کے سر پر تاج انتیس دن سے زیادہ نہیں رہ سکا تھا۔

پانی کیلئے نل والے دس ہزار کوئیں

محکمہ جات تعلیم صحت عامہ اور زراعت کے رکن سر جوگندر سنگھ نے شملہ کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اشیائے خوراک کی کمی محض اسلئے ہے کہ زراعت کے ضمن میں ہر لحاظ سے لاپرواہی برتی جاتی رہی ہے مثلاً مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے، مچھلیاں پکڑنے، مرغیاں وغیرہ پالنے اور پھل اگانے کے سلسلے میں پوری پوری توجہ کبھی نہیں دی گئی۔ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے دیہاتیوں کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ ملک کے اربابِ حل و عقد اور حاملانِ علم و عرفان کاشتکاری کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے سیاسی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ زراعتی اور صنعتی کاموں میں بالکل نہیں پڑتے۔ انھوں نے پانی کے لئے نل والے دس ہزار کوئیں تیار کرانے کے لئے ایک پنج سالہ خاکہ مرتب کیا ہے جس کی تکمیل پر ایک کروڑ ایکڑ زمین میں اچھی طرح آبپاشی ممکن ہو سکیگی۔ اس خاکے کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ برطانیہ عظمیٰ کی طرح ہمارے ملک کو بھی ایک انڈین مارکٹنگ بورڈ قائم کر لینا چاہئے۔

امریکی دعوت نامے اسٹالن کے نام

صدر ٹرومین نے اخباری نمائندوں کے ایک اجلاس میں اس راز کو منکشف کیا کہ جنرلیسیمو اسٹالن کو دو بار واشنگٹن آنے کی دعوت دی گئی اور دونوں بار موصوف نے عذرِ صحت پیش کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ پہلا دعوت نامہ پوٹس ڈیم کانفرنس کے موقعہ پر بھیجا گیا تھا اور دوسرا اس وقت جب غیر ملکی وزرائے خارجہ کا جلسہ پیرس میں منعقد ہونے والا تھا۔ اسی دوسرے دعوت نامے میں صدر ٹرومین نے جنرلیسیمو اسٹالن کی توجہ عالمگیر مسئلۂ خوراک کی طرف مبذول کراتے ہوئے روسی امداد و تعاون کی استدعا کی تھی کیونکہ دنیا جانتی تھی کہ اس وقت جبکہ بیشتر ملکوں کے لوگ بھوکے مر رہے تھے، سرزمینِ روس پر غلے کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ اپنی ضرورت سے زیادہ مقدار میں ہر قسم کا اناج موجود تھا۔ موصوف نے دعوت نامہ قبول نہ کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اتنا طویل سفر کرنا میرے لئے حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں۔" غذائی تعاون کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

کمانڈر انچیف کے اعزاز میں ترقی

ہندوستان کے کمانڈر انچیف جنرل سر کلاڈ آکنلک کی گرانقدر جنگی خدمات کا لحاظ رکھتے ہوئے بادشاہ سلامت نے انھیں فیلڈ مارشل کا اعزاز بخشا ہے۔ موصوف ۱۹۰۴ء میں پہلی بار ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اس وقت ۶۲ پنجابی فوج کی کمان ان کے سپرد کی گئی تھی۔ ۱۹۴۱ء کے شروع میں ان کو کمانڈر انچیف بنایا گیا لیکن پانچ ہی مہینے بعد ان کو مشرقِ وسطیٰ میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے بھیج دیا گیا۔ وہاں انھوں نے لارڈ ویول کے نقوشِ قدم پر چلتے ہوئے زبردست سرگرمیٔ عمل دکھائی اور انھوں نے بھی رومیل کے ان افریقی دستوں کے خلاف جنگی محاذ قائم کیا جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں انھوں نے آٹھویں فوج مرتب کی اور العالمین کے مورچہ پر اسکی کمان ذاتی طور پر اپنے ہاتھ میں لیکر مقابلہ کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کو خیرباد کہنے سے قبل انھوں نے زبردست حملوں کا ایسا مضبوط اڈا قائم کر دیا تھا جس نے شمالی افریقہ کی محوری فوجوں کو بری طرح مار بھگایا۔ آپ کے یہ کارنامے یقیناً لائقِ وقعت تھے۔

جوہری قوت اور صنعتی ادارے

لندن میں کچھ عرصہ سے دنیا بھر کے سائنسدانوں کا ایک اہم اجلاس ہو رہا ہے۔ اسکا مقصد بیشتر ایسی تجاویز پر غور و خوض کرنا ہے جنکو دائرۂ عمل میں لاکر سائنسی قوتوں کے ذریعے صنعت و حرفت کو ترقی دی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس اجلاس کے فیصلے نوعِ انسان کے لئے بہت ہی مفید رہیں گے۔ اس سلسلے میں ہندوستان سے بھی ایک سائنسی وفد بھیجا گیا ہے جس کی قیادت ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر فرما رہے ہیں۔ ہندوستانی ارکین کی کل تعداد چودہ ہے۔ کراچی سے وفد کی روانگی کے وقت ڈاکٹر بھٹناگر نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ ہم ہندوستانی نمائندے اس اجلاس میں تجویز پیش کریں گے کہ جوہری قوت کو آئندہ صرف صنعت و حرفت کے اداروں میں استعمال کیا جائے۔ اس سے ہم ہرگز تیار نہ ہوں کیونکہ جاپان میں گرائے ہوئے بموں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ جان و مال کی ایسی ہولناک تباہی کو آئندہ کسی قیمت پر بھی گوارا

نہیں کیا جا سکتا۔ سنا گیا ہے کہ دنیا کے دوسرے سائنسداں بھی اس تجویز کی حمایت کرینگے۔

درمیانی عرصے کی حکومت

جیسا کہ پچھلی اشاعت میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں برطانوی وزارتی وفد نے چند اہم نکات پر مشتمل اپنی سفارشات مرتب کیں اور قبول کرنے کے لئے پرنس چیمبر کے علاوہ ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں یعنی لیگ اور کانگریس کو بھیجدیں۔ کافی غور و خوض کے بعد مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ان سفارشات کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد پرنسس چیمبر نے بھی اپنی منظوری دیدی۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی نے چند اعتراضات کے ساتھ انہیں رد کر دیا۔ اعتراضات میں زیادہ اہمیت تین امور کو حاصل تھی:- (۱) کانگریس اور لیگ کے مابین باعتبار تعداد مساوات نہ ہو۔ (۲) آسلم بنگال کے یورپین باشندوں کو اسمبلی کے لئے کھڑے ہونے یا رائے دینے کا حق نہ دیا جائے۔ (۳) صوبوں کو گروپوں میں تقسیم کرنے پر زور نہ دیا جائے۔

چونکہ حکومت برطانیہ کسی نہ کسی طرح درمیانی عرصہ کی حکومت بنانے کے لئے تلی ہوئی تھی اس لئے برطانوی وزارتی وفد اور وائسرائے ہند کی جانب سے چودہ حضرات کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ قبول کریں تو درمیانی عرصے کی حکومت بنالی جائے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں:-

۱۔ مسٹر محمد علی جناح
۲۔ نوابزادہ لیاقت علی خان
۳۔ خواجہ سر ناظم الدین
۴۔ نواب محمد اسمعیل خاں
۵۔ سردار عبد الرب نشتر
(مسلم لیگ)

۶۔ پنڈت جواہر لال نہرو
۷۔ مسٹر ایچ کے مہتاب
۸۔ مسٹر راجگوپال آچاری
۹۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد
۱۰۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل
(کانگریس)

۱۱۔ سردار بلدیو سنگھ (سکھ)
۱۲۔ سر این۔ پی انجنیر (پارسی)
۱۳۔ ڈاکٹر جان متھائی (ہندوستانی عیسائی)
۱۴۔ مسٹر جگ جیون رام (اچھوت)

اس اعلان نامے میں ہندوستان کی موجودہ مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے تاہم توقع ظاہر کی گئی ہے کہ اشتراکِ عمل کے ساتھ اس حکومت کو چلانے کی کوشش کی جائیگی۔ اس امر کا موقع دیا گیا ہے کہ اگر نامزد حضرات میں سے کسی کو ذاتی طور پر شرکت کرنے سے احتراز ہو تو اسکی جگہ دوسرا نام باہمی سمجھوتے کے بعد تجویز کر دیا جائیگا۔ اس امر کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا ہے کہ کون سا محکمہ کس رکن کو تفویض کیا جائے گا۔

ایران اور آذربائیجان

یورپ کی لڑائی ختم ہونے کے بعد ہی ایران اور اس کے شمالی "خود مختار صوبے" آذربائیجان کے مابین چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں دونوں طرف سے مصالحت کی موثر پیدا کی جاتی رہی اور آخر کار اب ایک معاہدے کی رو سے امن و عافیت قائم ہو گئی ہے۔ ایران کی کابینہ نے بھی اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ طہران کے سیاسی حلقوں میں قیاس لگایا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر سلام اللہ جاوید کو جو آذربائیجان کی موجودہ حکومت کے اندرونی معاملات کے وزیر ہیں، اس صوبہ کا گورنر جنرل بنا دیا جائیگا۔ نئے معاہدے کے بموجب آذربائیجان اپنے "حق خود مختاری" سے دستبردار ہو گیا ہے اور ایک بار پھر اسے ایران کا ایک حصہ سمجھا جانے لگا ہے۔

آسٹریلیا کا گیہوں

اگر صورت حالات غیر معمولی نہ ہو تو آسٹریلیا میں گیہوں کی کل پیداوار وہاں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے اسکا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فصل کی تیاری بہت کچھ موسمی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ کسی سال اسکی مقدار کم ہو اور کسی سال زیادہ چنانچہ اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ سنہ ۳۹ء میں وہاں سے گیہوں کی برآمد ۹۰,۸۵,۰۰۰ بشل اور سنہ ۱۹۴۴ء میں ۹,۱۱,۸۵,۰۰۰ بشل رہی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں ایک دانہ بھی باہر نہ بھیجا جا سکا کیونکہ آندھیوں نے فصلیں تباہ کر دی تھیں۔ اس سال کیلئے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۵۰,۰۰,۰۰۰ بشل گیہوں باہر بھیجا جا سکیگا۔

(ساڑھے سینتیس بشل ایک ٹن یا اٹھائیس من کے برابر ہوتے ہیں)۔

ٹیلی وژن کا موجد

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ ٹیلی وژن کے موجد کپتان جے ایل بیرڈ ۱۴ جون کو اس دار فانی سے چل بسے۔ موصوف کی عمر ۵۸ سال تھی۔ وہ گذشتہ تیس سال سے دوسری تحقیقات کے ساتھ ساتھ ٹیلی وژن کے نت نئے تجربات میں مصروف تھے چنانچہ حال ہی میں ٹیلی فلم کی ایجاد پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ انکی وفات اسوقت ہوئی جبکہ بہت سی مفید سائنسی تحقیقات کو جنگ کے باعث معرض التوا میں پڑے رہنے کے بعد، اب فروغ پانیکا موقعہ ملا تھا۔ ساری متمدن دنیا موصوف کی حسرتناک موت پر افسوس اور پسماندگان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے۔

تصحیح

۲۴ جون سنہ ۱۹۴۷ء کے آجکل میں ایک مقالہ بعنوان "ایران میں قالین کی صنعت" شریک اشاعت تھا اس کے صفحہ ۸ پر سطر ۱۲ میں "یکرنے لگے ہیں" کے بعد یہ الفاظ بڑھا لیجئے "بلکہ اپنے قالین دوسرے ملکوں میں بھی بھیجتے ہیں"۔ نیز سطر ۱۵ میں سے "ملکوں کے" کو حذف کر دیجئے۔

(ادارہ)

تضمین میر حسن دہلوی بر غزل قائم چاندپوری

کیوں بناتے ہو رکھائی مجھے تم یار بہت
میں بھی اس وضع سے گھبراتا ہوں ہر بار بہت
صلح کل یہ ہے کہ بس ذوہ نہ اب آزار بہت
ہو اگر ایسے مری شکل سے بیزار بہت

تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت

اس کدورت کی ملاقات میں ہے کچھ بھی مزا؟
روکوں میں آپ کو جی میں رہو تم مجھ سے خفا
قصہ کوتہ یہ ہے بیجا ہے سب آپس میں گلا
بلکہ گر جب خفگی آوے تو جھگڑا ہی کیا

تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت

میرے احوال سے واقف ہیں سبھی انس و جن
کہ ہوئے جاتے ہیں کم تاب و تواں دن یہ دن
ناتواں بسکہ ہوا ہوں مری جاں تیرے بن
آج کے رونے میں جی ڈوب چلا تھا لیکن

نالۂ دل نے رکھا مجھ کو خبردار بہت

ایک تو دل شدگاں پر نہیں کرتا تو نظر
تسپہ اٹھواتا ہے کوچے سے انہیں اے دلبر
ظلم اتنا بھی نہیں خوب خدا سے تو ڈر!
مر ہی جاوے گا کوئی دیکھ جفا زیادہ نہ کر

اپنے جی سے بھی یہاں بیٹھے ہیں بیزار بہت

آج کی نیتِ فاسد یہ کدھر باندھی ہے؟
کس ارادے پہ میاں تیغ و سپر باندھی ہے؟
ہے نشانا کوئی جس پر کہ نظر باندھی ہے؟
سچ کہو قتل پہ اب کس کے کمر باندھی ہے؟

ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

جو کہ واقف نہ ہو تجھ سے تری عیاری سے
بیچ میں لاتو اسے مکر سے بیکاری سے
باز آیا میں تو ایسی تری غمخواری سے
شیخ مت مجھ کو ڈرا گور کی اندھیاری سے

ہجر کی میں نے تو کاٹی ہیں شبِ تار بہت

قیس و فرہاد کی حالت وہ ہوئی جو کہ سنی
اور بھی ان کے سوا جان گئی کتنوں کی
کل کی ہے بات حسن نے بھی دیا اپنا جی
قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری

مر گئے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

مرسلہ عبد العلیم شیرکوٹی

سری نواس شاستری

بین الاقوامی شہرت کا ہندوستانی خطیب

بادشاہ حسین

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

وی۔ ایس شاستری قصبہ ولنگمن جو کمبکنم کے جنوب میں چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک غریب گھرانے میں ۲۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے ان کی مثال سامنے رکھکر ہم کہہ سکتے ہیں کہ والدین کی ناداری لڑکے کی ذہانتی حالت پر کوئی اثر نہیں ڈالتی بلکہ زندگی کی تلخیاں دماغی جوہر کو جلا دیتی ہیں۔ سونے کو تپایا جاتا ہے تو اس کا رنگ اور روپ زیادہ نکھرتا ہے۔

ان کی ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے سے شروع ہوئی اور تحتانوی نصاب ختم کرکے وہ کمبکنم ہائی اسکول میں شریک کرائے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۸۸۲ء میں میٹرک کا امتحان بدرجہ اعلیٰ کامیاب کیا۔ ثانوی تعلیم سے فراغت پاکر وہ گورنمنٹ کالج کمبکنم میں داخل ہوئے یہ وہی درسگاہ ہے جو جنوبی ہند کی "کیمبرج" مشہور ہے اور اسی مادر جامعہ نے سرانے شیشیا شاستری۔ سری سی سوامی ایئر۔ سرٹی مدلیوا آئر مسٹر دی مادھوا راؤ۔ آنریبل مسٹر سرینواس اینگار جیسے نامور سپوت پیدا کئے۔

۱۸۸۵ء میں ایف اے اور ۱۸۸۸ء میں بی اے کے امتحانات میں اول رہے اور سنسکرت اور انگریزی کی غیر معمولی قابلیت کے صلہ میں متعدد انعامات حاصل کئے۔ ان امتیازات سے کہیں یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ مثل دوسرے ہندوستانی طالب علموں کے وہ بھی درسی کتابوں کے کیڑے تھے۔ انہیں رٹنے یا پڑھی اور سمجھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پڑھنے سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ایک ذہین اور فریس طالب علم کی طرح وہ نصاب کو سمجھ کر پڑھ لینے ہی پر اکتفا کرتے تھے اور باقی وقت تفریحی مشاغل خصوصاً کھیل کود میں صرف کرتے تھے۔ ایک طرف تو اساتذہ میں اپنی فراست و ذکاوت کی وجہ سے اپنا خاص وقار قائم تھا اور دوسری طرف طلباء میں کھلاڑی کی حیثیت سے ہر دل عزیزی حاصل تھی۔

مدرس کی حیثیت سے

عام طور پر مدرسی کا پیشہ کچھ بدنام سا ہے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں کوہ کندن وکاہ برآوردن کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ استاد کو یہ شکایت رہتی ہے کہ اس کی دماغ سوزیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور شاگرد کا یہ گلہ کہ اسے کام کی باتیں نہیں بتائی جاتیں۔

غرضیکہ ان ہی غلط فہمیوں کے ہر وہ نوجوان جو آزاد زندگی کی پر کھڑا ہوتا ہے مدرس کے نام کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ مگر کیا شاستری کی مثال پیش نظر رکھ بھی ہچکچانے کی ضرورت ہے؟ کیا ان لوگوں نے حیثیت سے اساتذہ کی سی زندگی نہیں شروع کی اور کیا انہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیتوں کے لئے نئی راہیں نہیں ڈھونڈ نکالیں؟ کیا انہوں نے وہ سب کچھ حاصل نہیں کیا جو اس دنیا میں حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہی شاستری جو کبھی ایک دیہاتی مدرسہ کی معمولی جماعتوں کے مدرس کی حیثیت سے بک بک کیا کرتا تھا آج دنیا کے پانچ مشہور ترین مقرروں میں سے نہیں ہے؟ کبھی وہ بے سمجھ بچوں کو سبق پڑھایا کرتے تھے اور آج بڑے مدبروں کے لئے درس حکمت چھوڑ گئے — کیا ابتدا تھی اور کیا انتہا!

تعلیم ختم کرکے وہ میونسپل ہائی اسکول مایاورم میں ملازم ہوگئے بعض اور مدارس میں بھی مدرس رہکر وہ بالآخر ۱۸۹۹ء میں ہندو ہائی اسکول ٹریپلیکین کے صدر مدرس ہوگئے۔ مدرس کی حیثیت سے ان کی ہر دلعزیزی کا سبب زیادہ تر ان کا برتاؤ تھا۔ وہ لڑکوں سے اس طرح ملتے تھے گویا کہ وہ ان کے نوجوان دوست ہیں۔ ان کے ساتھ ملنا جلنا رہنا سہنا اور کہنا سننا سب اسی طرح تھا کہ رعونت اور حکومت کا کوئی شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ لڑکوں کی تفریحی سفر میں ان کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں شریک۔ انجمنوں اور اداروں میں برابر کے حصہ دار غرضکہ لڑکوں کے ساتھ وہ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ طلباء انہیں اجنبی خیال نہ کرتے تھے مگر یہ سب کچھ کلاس کے باہر تھا اور جماعت کے اندر ان کا ضبط ضرب المثل کی حد تک مشہور تھا۔ اپنے فرائض کو انہوں نے دو حیثیتوں میں تقسیم کر لیا تھا ایک تو جماعت کے باہر اور دوسری جماعت کے اندر۔ جماعت کے اندر وہ ایک سخت گیر اور اصول کے پابند استاد تھے اور جماعت کے باہر وہ ایک ملنسار، خلیق اور ہمدرد مصاحب۔

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شرکت

صدر مدرسی کے زمانہ میں شاستری نے گوکھلے سے روحانی تعلق پیدا کیا اور یہ دلچسپی روز بروز بڑھتی گئی بالآخر ۱۹۰۵ء میں اسی جذبہ خلوص کے تحت انہوں نے مشن کے سلسلہ کیلئے گوکھلے کے سوانح حیات لکھے۔ ان ہی دنوں گوکھلے اپنی کام کی اشاعت کے سلسلہ میں مدراس آئے اور لوگوں کو ملک اور قوم کی خدمت کے لئے آمادہ کرنے لگے۔ شاستری

کے سینہ میں جو چنگاری عرصہ سے جل رہی تھی دفعتاً شعلہ کی صورت میں بھڑک اٹھی اور انہوں نے عزم صمیم کر لیا کہ گوکھلے کا ساتھ دینگے چاہے انہیں کتنی قربانیاں ہی کیوں نہ دینی پڑیں۔ ۱۹۰۷ء میں سوسائٹی کے رکن ہو گئے۔ ان کے اس ایثار کا اعتراف اس طرح کیا گیا:۔

"شاستری کی غیر معمولی شریف قربانیوں پر کبھی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا انہوں نے اس وقت ایثار سے کام لیا جبکہ یہ صفت عنقا نہیں تو کمیاب ضرور تھی، اور یقین کے مطابق بھی یقیناً نہ تھی جس مستعدی اور گرمجوشی کے ساتھ انہوں نے سوسائٹی کے لئے چندہ فراہم کیا ہے وہ انہیں کے حوصلہ کا کام تھا۔ چندہ کی ہر قسط کے ساتھ ان کی رگوں میں نیا خون دوڑتا تھا اور وہ کمر پہلے سے زیادہ چست کس لیتے تھے۔"

۱۹۱۰ء میں شاستری نے ملک کی ضروریات کا مطالعہ شروع کیا اور پانچ سال کے عرصہ میں ہندوستانی ماحول پر انہیں اتنی قدرت حاصل ہو گئی کہ سارے نامور یک و روشن پہلوان کی نظروں کے آگے محتاج توجہ نظر آئے۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جبکہ شاستری اپنے اندر عزم صمیم اور خلوص عظیم پرورش کر رہے تھے۔ اس کے بعد جب انہوں نے میدان عمل میں پہلا قدم بڑھایا تو ان کے آگے ترقی کی راہ کھلی پڑی تھی اور کوئی سنگِ گراں ایسا نظر نہ آتا جو ان کے اور منزلِ مقصود کے درمیان حائل ہو۔

مدراس یونیورسٹی اور مدراس لیجسلیٹو کونسل میں

۱۹۱۰ء میں وہ مدراس یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے اور ۱۹۲۰ء تک یہ اعزاز مسلسل باقی رہا۔ ۱۹۱۳ء میں مدراس لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے۔ کونسل میں وہ آپ کو تعلیمات کا نمائندہ خیال کرتے تھے۔ سر سی پی راج گوپال چاری جنکی اسوقت کونسل میں دھوم تھی شاستری کے مقابل میں بے زبان نظر آنے لگے۔ آنریبل ایف۔ ایچ۔ ایم۔ کارٹ جو کبھی ایڈوکیٹ جنرل بھی تھے انکے مباحثوں کے متعلق کہتے ہیں۔

"شاستری کی شخصیت میں ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جس پر ہماری قانون سازی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے سب سے زیادہ خوشی مجھے کونسل میں اسوقت ہوتی ہے جب میں انہیں بحث کرتے سنتا ہوں۔ انکی منطق زور بیان طرز کلام اور سب سے زیادہ ان کا وہ مخصوص انداز کہ ہاری ہوئی بحث پر مسکرا دینا قابل رشک ہے۔ وہ اپنی بات پر اصرار تو کرتے ہیں لیکن اس میں ناکام ہو کر کھسیانے نہیں ہوتے۔ وہ کسی تحریک کی تائید کرتے ہیں تو آخر تک ڈٹے رہتے ہیں۔"

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے صدر

گوکھلے کے انتقال پر ۱۹۱۵ء میں شاستری صدر منتخب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ گوکھلے کے بعد صدارت کا لبادہ سوائے ان کے قد موزوں کے کسی اور جسم پر زیب دیتا ہی نہ تھا۔ شاستری کے انہماک نے لوگوں کو یہ محسوس تک ہونے نہ دیا کہ اس سوسائٹی کا اتنا بڑا کارکن اس سے علیحدہ ہو گیا۔ ان کی اس کارگزاری پر بارہا اراکین نے انہیں دائمی صدر منتخب کیا لیکن ہر دفعہ انہوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کیا کہ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اعزاز انہیں سست نہ کر دے۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں

امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کا جب سوال پیدا ہوا تو مدراس کونسل سے بعض اور امیدوار مقابلہ پر اتر آئے۔ کچھ لوگوں نے شاستری کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ ان کی تقاریر اکثر و بیشتر مواقع پر "موم رول" کے سلسلہ میں ضرورت سے زیادہ آزاد لہجہ اختیار کر چکی ہیں یا یہ کہ اس کا بہت امکان ہے کہ شاستری کی زبان آئندہ بہت کچھ گل کھلائے گی لیکن کیا آفتاب خاک اڑانے سے چھپ سکتا ہے؟ نتیجہ الٹا ہوا اور نامور اور تجربہ کار امیدواروں کو ان کی توقع کے خلاف ناکامی ہوئی اور شاستری کو حیرت ناک حد تک کامیابی۔ شاستری کے طرفداروں کو ان کی تقریروں پر بھروسہ تھا اور ظاہر ہے کہ انکی توقعات بے جا نہ تھیں۔ کونسل میں جس کی زبان چلتی ہے اسی کا طوطی بولتا ہے۔ جس بحث میں انہوں نے حصہ لیا اس کو چمکا دیا جسکی طرفداری کی اسکو منظور کروا کے چھوڑا اور جسکی مخالفت پر اتر آئے اس سے سامعین کو متنفر کر دیا۔ ان کی وہ شہرہ آفاق تقریر جو "رولٹ بل" کے سلسلہ میں کی گئی تھی ایک تاریخی یادگار ہے اور جس نے بھی سنی دشمن ہو کہ دوست مسحور ہو گیا۔ دوران تقریر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حاضرین کو سانپ سونگھ گیا ہو ان کی پھٹی ہوئی آنکھوں اور کھلی ہوئی باچھوں سے بیخودی کا ایک عجیب عالم پیدا ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے انگریز عہدہ دار اور گورنمنٹ کے زیادہ سے زیادہ طرفدار بھی تقریر کے اختتام پر پر جوش تالیوں کی گونج پیدا کرنے پر مجبور ہوئے۔

کانگریسی کی حیثیت سے

کانگریس کو ضرورت تھی ایک بلبل ہزار داستاں کی ایک آتش نفس مقرر کی، ایک سحر آفریں لغمہ سنج کی تاکہ پروپیگنڈا ہو سکے۔ اسکے اغراض و مقاصد لوگوں میں ہر دلعزیز ہو سکیں۔ اس اہم خدمت کیلئے شاستری سے زیادہ کوئی اور موزوں ہو سکتا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ ۱۹۱۷ء میں اسوقت ہوا جبکہ وہ بمبئی کی صوبہ وار کانفرنس کی ناسک میں صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے جو خطبہ پڑھا وہ کانگریس کی تاریخ میں ایک یادگار ہے۔ کوئی فرقہ۔ کوئی طبقہ اور کوئی مکتب خیال ایسا نہ تھا جو اس خطبہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا ہو۔ انہوں نے کہا:۔

"میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے جب میں اس "سلف گورنمنٹ" کی تحریک کا خیال کرتا ہوں جو نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے متحدہ مطالبہ

"لکھنؤ کے پیکٹ میں طے کی تھی ایک ہندوستانی قائد کی نظروں کے آگے وہ منزل دکھائی دیتی ہے جس تک پہنچنے کی کوشش میں کئی پشتیں دوگم ہوچکی ہیں۔ برطانوی پرچم کے سایہ میں "سلف گورنمنٹ" کا حصول اور برطانیہ عظمیٰ کا اپنا خود مختار صوبہ کہلانا۔ کیا یہی وہ مدعا نہیں ہے جس کی تگ و دو میں ہم مصروف ہیں؟ کیا اس کے حصول سے مغرور سے مغرور ہندوستانی کی خواہشات پوری نہ ہونگی؟ میں اپنے ساتھیوں کی خوش بختی خیال کرتا ہوں کہ ان کے دور میں ہندوستان ایک نیا جنم لینے والا ہے۔ نوجوانو! وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کا صفحہ الٹنے والا ہے اور ایک نیا باب جو زریں حروف میں لکھا جائیگا تمہاری نظروں کے آگے آئیگا۔ تمہارے بزرگوں نے جو بیج بویا تھا اب وہ ایک تناور درخت کی شکل میں لہلہا رہا ہے۔"

۱۹۱۸ء کے "مانٹیگو چیلمسفورڈ" اسکیم میں "حق رائے دہی" کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے شاستری نے سر سریندر ناتھ بانرجی کا ساتھ دیا اور اس سلسلہ میں جو کچھ حاصل ہوا وہ ان ہی دونوں ہندوستانی نمائندوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں یہ اصلاحات کے سلسلہ میں گفت و شنید کرنے کے لئے ہندوستانی نمائندے مقرر ہوگئے اور انگلستان میں انہوں نے جو تقریریں کیں وہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا لیکن عجب اتفاق دیکھئے کہ جب یہ ہندوستان واپس ہوئے ہیں تو ملک کا بیشتر طبقہ اصلاحات کے خلاف ہوگیا۔ اس کا سبب شاید کانگریس کا پروپیگنڈا تھا لیکن شاستری کو اب بھی امید تھی کہ ان کی کوششوں سے کوئی سمجھوتا ہو سکیگا اسلئے انہوں نے کانگریس سے استعفا نہیں دیا بلکہ اصلاحات قبول کرنے کی ترغیب دی مگر ساری کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں۔

کونسل آف اسٹیٹ میں

۱۹۲۰ء میں انہیں کونسل آف اسٹیٹ کا رکن نامزد کیا گیا۔ یہاں انہوں نے جو کار نمایاں کئے اس کی بناء پر عام طور پر انہیں کونسل کا لیڈر سمجھا گیا۔ پریس ایکٹ اور "رولٹ" ایکٹ کے بارے میں انہوں نے جو دلچسپی لی اور جس زور بیان سے جو اثرات پیدا کئے وہ ایسے نہ تھے کہ ان قوانین کی نوعیت پر اثر انداز ہوئے بغیر رہ سکتے۔

امپیریل کانفرنس

۱۹۲۱ء میں شاستری ہندوستان کے نمائندہ ہو کر امپیریل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان گئے اپنی چرب زبانی اور طراری سے انہوں نے جو فائدہ اس کانفرنس میں اٹھایا اس کا اندازہ انکی شرکت سے پہلے بہت کم لوگوں نے کیا تھا۔ مملکتِ برطانیہ میں ہندوستانیوں کی فلاح و بہبودگی کے جن طریقوں پر انہوں نے زور دیا اور ہندوستانیوں کے حقوق کی طرف جس طرح انہوں نے توجہ دلا[ئی] وہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

ان کی تقریروں نے جو اثر برطانیہ اور مملکت برطانیہ کے نمائندوں [پر ڈالا] کیا اسکا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوسکیگا۔

"مسٹر شاستری کی تقریریں ابتدائی نشستوں میں مختصر سی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ان کی طرز گفتگو کا اثر بڑھتا گیا اور لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ خطابت کا کمال انہوں نے اسوقت دکھایا جبکہ ایک اہم نشست میں انہیں مقرر خصوصی بنایا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے کامل دو گھنٹہ تک تقریر کی۔ ساری تقریر ان ہندوستانیوں کے حالات پر مشتمل تھی جو "ناٹال" اور جنوبی افریقہ میں بس گئے ہیں انکی تکالیف کو دور کرنے۔ انکو شہریوں کو حقوق دینے اور انکے ساتھ مساویانہ سلوک کرنے پر خاص زور دیا تقریر اتنی طول طویل اور انگریزوں کی ذہنیت اور رجحان کے خلاف ہونیکے باوجود بھی اتنی دلچسپی سے سنی گئی کہ کوئی تقریر اس کانفرنس میں اسکے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکی۔ لائڈ جارج کو بہت ضروری کام کاج تھے اور وہ محض رسماً کانفرنس کی اس نشست میں چلے آئے اور ان کا قطعی ارادہ تھا کہ دس پندرہ منٹ بعد چلے جائیں لیکن کامل دو گھنٹہ تک انہیں واپس جانے کا خیال تک نہیں آیا۔ اور واپس جاتے وقت انہوں نے کہا اگرچہ میرے ضروری کام خراب ہوگئے لیکن میں خوش ہوں کہ میرا وقت اچھا گذرا۔"

جمعیت اقوام میں

ستمبر ۱۹۲۱ء میں شاستری نے جمعیت اقوام میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر جو تقریر انہوں نے کی اس کے متعلق اہل الرائے متفق ہیں کہ وہ فن خطابت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔ ایسے مجمع میں جہاں قوموں کے منتخب دماغ ہوں اور ملکوں کے بہترین نمائندے وہاں بڑے بڑوں کی زبانوں میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے مگر شاستری ایسے موقعوں پر اپنے کمال کی نمائش زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ اس "لسان الہند" کو موقع اس نشست میں دیا گیا جبکہ ساری دنیا کے نمائندے اپنے اپنے مطالبات پیش کر چکے تھے اور جلسہ برخاست ہونے ہی والا تھا۔ اس آخری موقع پر جبکہ لوگوں کے دماغ تھکے ہوئے ہوں اثر پیدا کرنا ایسا نہ تھا کہ ہر شخص کے بس کا ہو جب تک "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ شاستری جب تقریر کیلئے کھڑے ہوئے تو کچھ لوگ باہر چلے گئے اور بہت سے تبرکاً دو چار جملے سن کر چلے جانا چاہتے تھے مگر سفید صافہ اور کالی ابروں کے نیچے چمکنے والی ہندوستانی آنکھوں نے لوگوں کی اس بے چینی کا اندازہ کر لیا اور پہلا ہی جملہ اس انداز میں شروع کیا کہ لوگ اس کو نغمۂ ہوش ربا سمجھے

لگے۔ ایک جملے کے بعد دوسرے جملے کے لئے لوگ ایسے منتظر تھے کہ جیسے انکی زندگیوں کے عقدے اسکے بغیر حل ہی نہ ہونگے۔ ایک مشہور اخبار کا نمائندہ لکھتا ہے:

جلسہ برخاست ہونے سے پہلے ایک شخص مشرقی لباس میں سفید صافہ باندھے منظر عام پر آیا لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان کا یہ برہمن بین الاقوامی سیاست اور تدبر کے متعلق کیا خاک کہیگا۔ مہذب اقوام کے متمدن نمائندوں نے نہایت اخلاق کے ساتھ جو رویہ ابتدا میں برتا وہ ایسا نہ تھا کہ ایک غیر مہذب سے غیر مہذب شخص بھی محسوس نہ کرتا۔ لیکن ابتدائی چند جملے ایسے تھے جیسے رباب کے شیریں نغمے۔ ہر شخص مسحور ہو گیا۔ یا تو وہ مجمع کی بے چینی تھی یا اب یہ عالم تھا کہ گویا سانپ سونگھ گیا ہے۔ پرشکوہ الفاظ ایک کے بعد ایک تلے جملوں میں کچھ اس طرح ادا کئے گئے کہ زبان و بیان کا لطف بیجا ہو گیا۔ تقریر ختم ہوئی تو بڑی دیر تک تالیاں اتنی بجتی رہیں کہ اس سے پہلے اس جلسہ میں کبھی نہیں بجی تھیں۔ تقریر ختم ہو چکی تھی لیکن اسکے نغمے ابھی سننے والوں کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوا ہے کہ مشرق کے نغموں نے مغرب کو بالکل ہی مسحور کر لیا ہو۔ لوگوں نے عام طور پر یہ تسلیم کیا کہ "مشرق نے آج مغرب کو اسکے اپنے میدان میں پچھاڑا"۔

اور یہاں شاستری نے کیا کہا (۳) ساری تقریریں؟ اول یہ کہ جمعیت اقوام کی اہمیت کا اقرار اور ہندوستان کا اس سے اخلاص دوم یہ کہ ہندوستان کو جمعیت کی معتمدی میں برابر کی نمائندگی کا حق اور اس کی صنعتی اور حرفتی طاقت کا اعتراف اور آخر میں ایک صدائے احتجاج اس غیر مساویانہ سلوک کے خلاف جو ہندوستانیوں کے ساتھ مملکت برطانیہ میں کیا جا رہا ہے۔

واشنگٹن کانفرنس

واشنگٹن میں جب تقلیل اسلحہ کی کانفرنس ہوئی تو ہندوستانی نمائندگی کا بار شاستری کے کندھے پر ڈالا گیا حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر شخصیت ایسے موقع کیلئے اور کوئی موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ صرف ان کی لسانی قوت سے امریکی تخیل میں مشرقی بالخصوص ہندوستان کی پستی کا جو قلعہ تعمیر ہو رہا تھا مسمار ہو گیا بلکہ ان کی مدبرانہ قابلیت کا لوہا بھی ان کے سلجھے ہوئے خیالات نے منوا لیا جسطرح لندن میں انہوں نے اپنا سکہ جمایا اسی طرح واشنگٹن کانفرنس کے نمائندوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ایک مقامی اخبار "ایوننگ اسٹار" نے لکھا:-

وہ بہترین انگریزی بولتے ہیں۔ ان کی صاف اور موثر آواز دلوں کو گرماتی ہے اور ہندوستانی شخصیت پر سیاہ لباس آنکھوں میں کھب جاتا ہے۔ ان کے رعب دار چہرہ پر سفید ریشم کا صافہ آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

مشہور ادیب مسٹر "ایلمر ڈیوس" نے "نیویارک ٹائمس" میں "برطانوی ہند کا نمائندہ اپنی بے باک اور پرزور تقریروں کی بنا پر تعجب خیز منظر پیدا کرتا ہے" کے عنوان کے تحت لکھا۔

"برطانیہ کے ایک اور نمائندہ کا تعارف کرانا میرا خوشگوار فرض ہے۔ ان کا نام مسٹر سری نواس شاستری ہے اور یہ ہندوستان کے باشندے ہیں۔ یہ پہلی دفعہ امریکہ میں منظر عام پر آئے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہم آئندہ انہیں زیادہ دیکھیں گے انہوں نے اس جلسہ میں دو مرتبہ تقریریں کیں اور ان لوگوں کو جو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ برطانوی ہند کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت ہی کی آواز دہرائیں گے بڑی حد تک مایوسی ہوئی وہ ہندوستان کے لئے "سلف گورنمنٹ" چاہتے ہیں اور وہ اتنے بزدل نظر نہیں آتے کہ اپنے اس خیال کو چھپائیں۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک ہی دن میں ہندوستان کی کایا پلٹ دینا چاہتے ہیں۔ وہ ایک صاحب دماغ مدبر ہیں شورش پسند انقلابی نہیں۔

وہ انگریزی اتنی اچھی بولتے ہیں کہ برطانیہ کا یا امریکہ کوئی نمائندہ اس جلسہ میں ان کی برابری نہیں کر سکا۔"

یہ ظاہر ہے کہ شاستری نے اس کانفرنس میں اپنی زبان کے جوہر دکھا کر ساری دنیا میں اپنی شہرت کا ڈنکا بجا دیا اور یہیں سے وہ دنیا کے بہترین خطیبوں میں شمار ہونے لگے۔

بمبئی کی صوبہ وارانہ لبرل کانفرنس

ہندوستان کا نام روشن کر کے شاستری ۱۹۲۲ء میں واپس ہوئے۔ کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی کے ارکان نے ان کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ بمبئی کی صوبہ وارانہ لبرل کانفرنس نے خطبہ صدارت پڑھنے کیلئے مدعو کیا۔ سیاست کیلئے یہ بڑا پرآشوب زمانہ تھا۔ گاندھی کو قید کر لیا گیا تھا اور ملک میں ایک انتشار سا تھا۔ شاستری نے ایسی نازک حالت پر قابو اس طرح پایا کہ لیجسلیٹو اسمبلی کے ذریعہ حکومت کے آگے "سلف گورنمنٹ" کی تحریک پیش کرا دی اور اس پر ہر طرف سے اتنا زور ڈلوایا کہ بالاخر اس پر غور و خوض کرنے کے لئے برطانوی کابینہ میں بارہ با اثر ہندوستانیوں کو انگلستان بھیجا گیا۔

تحریک عدم تعاون

اسی خطبہ میں شاستری نے تحریک عدم تعاون کی ناکامی پر بہت افسوس کیا کہ کس طرح بالواسطہ

یا بلاواسطہ تقریباً بیس ہزار افراد اس کی زد میں آگئے مگر اس کی تحریک کے نتائج کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی صاف کر دیا کہ اس تحریک کے بانی مہاتما گاندھی ان برائیوں کے ذمہ دار نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ کیونکہ ان کی شخصیت مجسمہ خلوص ہے۔ ان کا ارادہ سودیشی تحریک کو عام کرنا اور سوراج کے امکانات کو قریب سے قریب تر کرنا تھا۔ باوجود اسکے کہ شاستری نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ تحریک کی کامیابی محرک کے خلوص اور نیک نیتی پر حرف نہیں لاسکتی مگر پھر بھی بعض تنگ نظر اشخاص ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ شاستری کے دل میں کھوٹ نہ تھا اسلئے انہوں نے اسکی پرواہ نہ کی بلکہ دستوری اصلاحات کی برابر طرفداری کرتے رہے اور ملک کا ایک غیر جانبدار طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

امپیریل مشن

لندن کی امپیریل کانفرنس میں شاستری نے جو شہرت حاصل کی اسی بنا پر نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا کے وزراء نے انہیں دعوتیں دیں۔ حکومت برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ تجویز کی کہ ایک وفد برطانیہ عظمیٰ کے زیر اقتدار ممالک کو انکی صدارت میں بھیجا جائے۔ اس اعزاز کی خوشی میں مختلف انجمنوں نے انہیں دعوتیں دیں لیکن سب سے زیادہ نمایاں ضیافت وائسریگل لاج کی تھی۔ وائسرائے ہندلارڈ ریڈنگ نے وائیکاؤنٹ پیل" کا جو اسوقت سکریٹری آف اسٹیٹ تھے تہنیت نامہ سنایا اور اسکے بعد خود اس وفد کی کامیابی کی تمنا کی۔ شاستری نے جو جواب اس موقع پر دیا وہ عام طور پر ایسی تقریبوں میں نہیں سنا جاتا۔

جو پیغام کہ شاستری نے ان ممالک کو پہنچایا اسکے متعلق ایک ذمہ دار ہستی مسٹر پولاک" کا بیان ہے۔

"مسٹر شاستری ان چند افراد میں سے ہیں جو نوآبادیات کے پیچیدہ اور اہم مسئلہ پر پوری قدرت کے ساتھ بحث کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنا لوہا ان سے منوایا جو اس مسئلہ پر شاستری سے بلند تر قابلیت رکھتے ہیں لیکن باوجود اس قلیل تدبر اور تفکر و غور کے اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے مزید الجھنوں میں مبتلا کرتے تھے۔ میں نے یہ خیال اٹھارہ سال تک اسی قسم کے افراد کے ساتھ بسر کرنے کے بعد قائم کیا ہے۔ یقیناً یہ کارگذاری شاستری کو ایک بہت بلند پایہ مدبر بنا سکتی ہے۔ اسکے علاوہ انکا ایک غیر معمولی اعزاز بھی یہاں قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ انکا بیان سرکاری اعلانات میں بلا کم و کاست اور بغیر اعتنا کے قابل قبول سمجھا گیا۔"

پریوی کونسلر اور لندن کے شہری کا اعزاز

ملک معظم نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں پریوی کونسل کا رکن نامزد کیا اور رعایان شہر لندن نے انہیں شہری حقوق دیئے۔ "گلڈ ہال" میں جو عشائیہ ترتیب دیا گیا اس میں انہوں نے آزادی کے متعلق کہا:۔

"تمدن، علم اور نیکی کی طرح آزادی بھی جتنی زیادہ دی جائیگی اتنی ہی زیادہ بڑھیگی جتنی دور تک وہ پھیلائی جائیگی اتنی دور تک اس کی خوشبو کی مہک پہنچیگی۔ اور جس قدر تیزی کے ساتھ وہ ہر متنفس تک پہنچائی جائیگی اسیقدر سرعت کے ساتھ وہ فائدہ پہنچائیگی۔ برخلاف اس کے جو حکومت یا شخصیت آزادی کو محدود کرنے کی فکر کریگی وہ ظاہر ہے کہ انسانیت کو شدید ضرب پہنچائیگی۔

اس کے بعد انہوں نے برطانیہ کو انصاف کی طرف متوجہ کیا:۔

"خواتین و حاضرین! وہ جو برطانیہ کے سایہ عاطفت میں آزادی کا سانس لے رہے ہیں جنکے حقوق کی نگرانی ایک طرف پارلیمنٹ کر رہی ہے تو دوسری طرف ان کا حق نمائندگی ان کی پشت پناہ بنی ہوتی ہے کیا ان سے یہ توقع کیجا سکتی ہے کہ خود جس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اسی کو دوسروں کیلئے مضر خیال کریں گے۔ یا اس بخیل کی مثال قائم کریں گے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ خود نقصان اٹھائے بغیر دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ محض طبیعت کے بخل کی وجہ سے انجان ہو جاتا ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایجنٹ

شاستری ایک عرصہ تک افریقہ میں ایجنٹ کی حیثیت سے رہ چکے ہیں اور وہاں ہندوستانیوں کے مفاد کیلئے انہوں نے جو کام کئے وہ ہر طریقہ سے قابل لحاظ ہیں۔ وہ ہندوستانی جو جنوبی افریقہ میں رہ بس گئے ہیں ان کو حقوق شہری دلانا اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کی تجویز پر زور دینا ان کی نمایاں کوششیں ہیں۔

خصوصیات

شاستری شل گوکھلے کے۔ ان لیڈروں میں نہیں ہیں جو انتہا پسند ہیں۔ وہ یقیناً "سلف گورنمنٹ" مانگتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ہندوستان اب اس قابل ہو چکا ہے کہ اس کے کندھوں پر یہ بوجھ بلا تکلف رکھدیا جائے مگر وہ آئینی۔ دستوری اصلاحی طریقوں کے طرفدار ہیں یہی سبب ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون کی مخالفت کی۔ مگر بعض دفعہ ان کا جوش و خروش انہیں آگے بھی بڑھا دیتا ہے چنانچہ "مانٹ ریال رفارم کلب" میں انہوں نے کہا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ برطانیہ ہندوستان پر سے اپنی سختیاں اٹھالے۔ اگر برطانیہ چاہتا ہے کہ ہندوستان اس کی طاقت و قوت میں مزید اضافہ کرے تو یہ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ وہ اسکو اپنے پہلو میں برابر کا رتبہ دے وہ برطانیہ ہی کے جھنڈے کے نیچے رہنے پر تیار ہے لیکن ایک مساوی طاقت اور برابر کی مملکت کی حیثیت سے اگر یہ مساویانہ برتاؤ نہ ہوسکا تو ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برطانیہ سے الگ رہکر اپنی آزادی و حریت کی تدبیریں سوچنی پڑیں گی۔"

خطیب کی حیثیت سے شاستری کے حالات ان کی خطابت کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے۔

اہل بالفور عصر حاضرہ کے پانچ بہترین خطیبوں میں شمار کرتے ہیں۔ سر تھامس اسمارٹ آیف امپائر کا نقرئی زبان خطیب" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ماسٹر آف بالیل؟ نے لارڈ ڈلٹن سے کہا کہ وہ زبان کی خوبیوں سے اس وقت تک ناواقف تھے جب تک کہ انہوں نے شاستری کو نہ سنا۔ "ٹورنٹو" کے ایک اخبار نے لکھا تھا۔

"مسٹر شاستری کو شکر ادا نہ ہو سکتا ہے کہ اس ہندوستانی کو انگریزی زبان پر کتنا غیر معمولی عبور ہے نہ صرف انہیں الفاظ پر قدرت ہے بلکہ امتیازیت بھی ان کے قبضہ میں ہے اور یہی نہیں بلکہ ان سب سے بالاتر خیالات پر قابو رکھنا اور ان کو اسی طرح پیش کرنا جس طرح کہ وہ ان کے دماغ میں پیدا ہوئے تھے ان کا ایک ایسا کمال ہے جو دنیا کے بڑے بڑے خطیبوں کے لئے باعث رشک ہے"

انتقال ۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو شب کے نو بجکر پینتالیس منٹ پر اپنی قیام گاہ واقع میلاپور میں چھہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

لندن کی نشرگاہ

ستیاپال

زمین اپنے محور پر گھومتی اور ایک خاص حلقہ میں سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ لندن سے سمندر پار ملکوں کے لئے خبریں نشر کرنے کے سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جب لندن میں گرمی کا موسم ہوتا ہے تو کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں سردی ہوتی ہے، ایک جگہ دن ہوتا ہے تو دوسری جگہ رات، دن ہو یا رات مرد اور عورتیں برابر کام کرتی رہتی ہیں اور زندگی کے دوسرے مشاغل میں مصروف رہتی ہیں۔ غرض زندگی بدستور جاری ہے۔ دنیا کے ہر حصہ میں اخبار نویس اور مستری بھی کام کرتے ہیں، نامہ نگار اپنے اداروں کو خبریں فراہم کرتے ہیں، تاروں میں آواز پیدا ہوتی ہے، روٹیری مشینیں چلتی ہیں اور وسیع فضا میں آوازوں کی لہریں دوڑتی رہتی ہیں۔ خبریں دن رات آتی رہتی ہیں لیکن یہ خبریں حاصل کرکے دنیا کے اہم واقعات کیسے معلوم کئے جاتے ہیں؟ لوگ ریڈیو کے ذریعہ لندن کی خبریں سنتے ہیں، لندن سے مانوس مکالمہ اور جلد سمجھ میں آنے والی آواز سنائی دیتی ہے۔ آخر صاحب آواز ساری دنیا کے اہم واقعات سے ہمیں چوتھائی گھنٹہ میں کیسے مطلع کر سکا؟

صبح کو ایڈیٹروں کی کانفرنس ہوتی۔ یہ دن کے نہایت اہم کاموں کا موقع ہے۔ خبریں تمام دن آتی رہتی ہیں اور اسیطرح برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (بی بی سی) کا کام بھی چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے مختلف قسموں کی خبریں موصول ہوتی ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے سے خبریں آ رہی ہیں اور ان کے نشر کا طریقہ بھی بن رہا ہے۔ آپ نے ایسا کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ اگر ٹائمز کی خاص سرخی چین کے قحط کے بارے میں ہے تو ڈیلی ٹیلیگراف کی اسکاٹلینڈ میں ریلوے کے حادثے کے متعلق اور ڈیلی ایکسپریس نے روس کے سیاسی واقعات کو زیادہ اہمیت دی ہو۔ چاہے سب اخباروں میں یہ خبریں موجود ہوں۔

صبح کے وقت ایڈیٹر کے کمرے میں جمع ہونے والے لوگ بھی اسی طرح متفق ہوتے ہیں۔ خبر کی اہمیت سمجھنے کے لئے ایک ملکہ کی ضرورت ہے جسے چھٹا ملکہ کہتے ہیں لیکن یہ تو صحافت کی اصطلاح ہے۔ دراصل خبروں کی اہمیت کا اندازہ کسی خاص ملکہ سے نہیں بلکہ معمولی سمجھ بوجھ سے لگایا جاتا ہے۔ ایڈیٹروں کی کانفرنس کے سارے افراد جانتے ہیں کہ انھیں اٹلی، روس، مشرق بعید، امریکہ، یورپ اور سلطنت برطانیہ کی خاص خبروں کے متعلق فیصلے کرنے ہیں۔ مگر ایک ہی خبر سے متعلق ان کا کام مختلف ہو سکتا ہے مثلاً اگر ایڈیٹر بحیرۂ روم کی خبر کا ذکر کرتا ہے تو ڈیوٹی ایڈیٹر اس سلسلہ میں صبح تک کے واقعات بیان کرتا ہے۔ ذمہ داری تو ساری ایڈیٹر ہی کی ہوتی ہے مگر وہ چوبیس گھنٹہ حاضر رہ کر خود کیسے فیصلہ کر سکتا ہے لہٰذا ایسے ڈیوٹی ایڈیٹر مقرر کرنے ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹہ میں چار ڈیوٹی ایڈیٹر کام کرتے ہیں۔ تین آٹھ آٹھ گھنٹہ کام کرتے ہیں اور ایک کی چھٹی رہتی ہے۔ اس لئے ڈیوٹی ایڈیٹر خبروں سے واقف ہوتا ہے اور جب وہ کانفرنس میں خبریں بتاتا ہے تو ایڈیٹر فیصلہ کرتا ہے کہ ان خبروں کو کس پیرایہ میں نشر کیا جائے۔ بحیرۂ روم ہی کی خبر کو لیجئے وہ بتائے گا کہ اسے سب سے پہلے رکھا جائے یا اس کے ایک حصہ پر زیادہ زور دیا جائے تاکہ سننے والوں کے سامنے دونوں رخ آجائیں یا اسے دوسری خبروں سے کم یا زیادہ اہم سمجھا جائے۔

ڈیوٹی ایڈیٹر کا کام محض بلیٹنوں کے متعلق اظہار خیال کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک خبروں کے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر بھی ہوتا ہے۔ یہ اخبار کے میگزین یا فیچر کے ایڈیٹر کی طرح ہوتا ہے اور ایسی تقریریں کرتا ہے جو خبروں کی تفصیلات بیان کریں۔ وہ کانفرنس میں سوال کر سکتا ہے کہ "کیا کریٹ کے متعلق تقریر کرائی جائے۔ ایک شخص ابھی بحیرۂ روم سے ہوائی جہاز کے ذریعہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔ وہ بہت اچھی تقریر کرے گا اور پھر اس کی آواز بھی اچھی ہے۔"

تبصرہ کے ایڈیٹر کا کام کسی قدر مختلف ہے۔ اخبار پڑھنے والے کی طرح اسے بھی کبھی کبھی خبریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ واقعات عالم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اخباروں کے اڈیٹوریل پڑھتا ہے۔ بہت سے لوگ بلیٹن سننے کے بعد خبروں پر تبصرہ سن کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کونسی خبریں زیادہ اہم ہیں۔ اس طرح تبصرہ سے ایک ایسا پس منظر قائم ہو جاتا ہے جو محض بلیٹنیں سن کر قائم کرنا مشکل ہے۔ ایڈیٹروں کی کانفرنس میں یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کن موضوعات پر تبصرہ کیا جائے۔ خاص علاقوں کی خبروں کے انچارج اپنے سامعین کی ضروریات کا آسانی سے پتہ چلا لیتے ہیں۔ جب ہر شخص یہ جان جاتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے تو مجلس برخاست ہو جاتی ہے اور مجوزہ باتوں پر عملدرآمد شروع ہو جاتا ہے۔

ایڈیٹر دن بھر کام میں مصروف رہتا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس سے

خاص خبروں کے متعلق مشورہ کیا جاتا ہے۔ وہ کنٹرولر کی میٹنگ میں بھی جاتا ہے جہاں اس کے اور بی بی سی کے دوسرے محکموں کے کام میں تناسب قائم کیا جاتا ہے۔ اسے اپنے محکمہ کے نظام کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ وہ سمندر پار کے بحری تاروں کو پڑھتا ہے جن میں سے کچھ نہایت مفید معلومات فراہم کرتے ہیں اور کچھ محض تنقیدی ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور ٹیلیفون پر باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہ کام پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا کہ شام آ پہنچی یہ دن بھر کے کام کے متعلق دوسری بڑی کانفرنس کا وقت ہے۔

خبروں کے کمرے کا اچھی طرح معائنہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ خبروں سے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر کیا کرتا ہے۔ اس کی زیادہ توجہ اس پروگرام پر صرف ہوتی ہے جسے دنیا "ریڈیو نیوز ریل" کے نام سے جانتی ہے۔ یہ چوبیس گھنٹہ میں آدھے گھنٹے کے تین پروگرام ریڈیو کے تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کو مفصل بیان کرتے ہیں۔ سمندر پار کے نامہ نگاروں کی خبریں جو بلیٹین میں بھی استعمال ہوتی ہیں، نیوز ریل میں اس طرح پڑھی جاتی ہیں گویا خود نامہ نگار سنا رہے ہیں۔ خبروں کے متعلق تقریروں کا ایڈیٹر، ایڈیٹروں کی کانفرنس سے اپنے عملہ کے پاس جاتا ہے جو نامہ نگاروں سے حاصل ہونے والی خبروں پر غور کرتے ہیں اور دن کی خبروں کو قاعدہ میں نشر کرنے کے متعلق سوچتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کا ایک مشہور شخص آیا ہے۔ اسے ایک مختصر تقریر نشر کرنے یا یونہی باتیں کرنے کے لئے مدعو کرنا چاہیئے۔ اس طرح اگر قصر بکنگھم میں عطائے خطاب کی رسم ادا کی جا رہی ہے یا شہر میں کوئی تاریخی جشن ہے یا وزیر خوراک کے دفتر میں کوئی بڑی کانفرنس ہے یا کسی عوامی مظاہرہ کے لئے کوئی بڑا ہال سجایا گیا ہے یا ملک کے کسی گوشے میں ہولستانی موسیقی کی محفل ہے تو وہاں ریکارڈ بھرنے والے کو بھیجا جاتا ہے جہاں وہ کسی اونچی جگہ بیٹھ کر ریکارڈ تیار کرتا ہے۔

جب چیف سب ایڈیٹر خبریں پڑھ لیتا ہے تو وہ ان پر دستخط کر کے پڑھنے والے کے حوالے کرتا ہے۔ اس کے بعد خبریں پڑھنے والا ان کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سب ایڈیٹر سے یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے "اگر یہ یوں لکھا جائے تو بہتر نہ ہو جائے گا اس سے آپ کی بات بھی جوں کی توں رہے گی اور مجھے پڑھنے میں بھی آسانی ہو جائے گی"۔ سب ایڈیٹر اس سے اتفاق بھی کر سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو جملہ تبدیل کیا جائے گا۔ یہ بلیٹین سنانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ پڑھنے کیلئے اور خبریں سنانے والا ہی صحیح رائے قائم کر سکتا ہے کہ کس چیز کے نشر کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں اسے فقرے بدلنا بھی بہتر آتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی صوتی قابلیت کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔

برما کی لڑائی میں ایک نیا نام آتا ہے۔ وہ تلفظ کے ماہرین کو ٹیلیفون کرتا ہے۔ جو برمی زبان کے ماہرین کو وزارت اطلاعات میں ٹیلیفون کرتے ہیں اور اس طرح دو منٹ میں صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے۔ خبریں پڑھنے والا تلفظ لکھ لیتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی یادداشت کے طور پر کارڈ انڈکس پر لکھ دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے خبریں پڑھنے والے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ یا مثلاً یورپ کے محاذ پر ایک نئے امریکی جنرل کے نام کا اعلان ہوتا ہے۔ اس کا صحیح تلفظ معلوم نہیں ہے۔ وہ طرح تلفظ کیا جاتا ہے ایسی صورت میں خبریں پڑھنے والا امریکی سفارت خانہ سے ٹیلیفون پر پوچھ لے گا اور صحیح تلفظ معلوم ہو جائے گا۔ ورنہ اگر غلط تلفظ میں نشر کیا گیا تو صحیح نام جاننے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آئے گی یا ممکن ہے ناراض بھی ہو جائیں۔

دنیا کے سامنے دن بھر خبریں پڑھنے والے میں اور کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ سمندر پار کے لئے خبریں نشر کرنے والا شخص دوسروں سے کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔ اسے مختلف ممالک کے لوگ سنتے ہیں جن کے حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور زندگی، گفتگو کا طریقہ اور عادتیں وغیرہ بھی۔ اسے وہ لوگ سنتے ہیں جنہیں شاید اس کے انگریزی لہجہ پر ہنسی آ جائے اور جو ممکن ہے برطانیہ کی ہر بات کا مضحکہ اڑاتے ہوں۔ اس کی آواز کا صاف، مخلصانہ اور مستند ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ لنڈن سے نشر کی جا رہی ہے۔ سارے غیر ملکی بلیٹینوں میں لنڈن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ خبریں سناتے وقت آپ نے ہر کئی مرتبہ کہتے سنا ہوگا: "یہ خبریں لنڈن سے سنائی جا رہی ہیں"۔ یا "یہ لنڈن ہے"۔ اس سے لوگوں کو یہ شبہ ہونے کا کوئی موقع نہیں ملنا چاہیئے کہ لنڈن سے نشر ہونے والی خبریں سچی یا مستند نہیں ہوتیں۔

باجا بجتا ہے اسٹوڈیو میں روشنی ہوتی ہے۔ خبریں پڑھنے والا سانس لے کر کہتا ہے: "یہ لنڈن ہے۔ اب آپ خبریں سنئے"۔ خاموشی کے ساتھ اسٹوڈیو کا دروازہ کھلتا ہے اور چیف سب ایڈیٹر بہت سے کاغذ لیے ہوئے اندر آتا ہے، گھڑی کا دھیان رکھتا ہے، خبریں پڑھنے والے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور جیسے جیسے اسے ضرورت پڑتی ہے مواد فراہم کرتا رہتا ہے۔ ایک لڑکی کاغذ کا ٹکڑا لئے داخل ہوتی ہے جو ابھی ابھی مشین سے پھاڑ کر لایا گیا ہے۔ شاید یہ ماسکو کا خاص اعلان ہے۔ چیف سب ایڈیٹر اسے دیکھ کر گھڑی پر نظر ڈالتا ہے۔ ابھی اسے شامل

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ہیرے کی انگوٹھی

بدر النساطف

سورج سلمہ کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح غروب ہورہا تھا۔ اس کی سنہری مگر دل میں اتر جانے والی شعاعیں دینا پور کے کچے مکانوں پر اس طرح جگمگا رہی تھیں جیسے بڑی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے۔ وہ اپنے گھر سے تھوڑی دور پتھر کی ایک سفید چٹان پر کہنی ٹکائے آنسو ٹپکا رہی تھی اس کے اشک کا ہر قطرہ پتھر پر گرتے ہی پھیل جاتا تھا - - - -

آج سلمہ کو ـــ سلیم سے وہ بات کہنا تھی جس کا نتیجہ ٹریجڈی افسانے کا آخر جملہ یا زندگی کا آخری سانس کہا جا سکتا ہے۔

کیا آج نہیں آؤگے؟ امید نہیں نا امیدی۔ آس نہیں افسوس۔ زندگی نہیں بلکہ "موت" کا فیصلہ نہ کروگے؟ کیا اپنے ہاتھ سے جلائے چراغ کو بجھتے ہوئے دیکھوگے؟ کیا اپنے چاند کی ڈوبتی ہوئی شعاعوں کے مناظر سے متاثر نہ ہوگے؟ کیا میرے آنسوؤں میں اپنے آنسو نہ ملاؤگے؟۔

شام ہوگئی۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ پہاڑ کالی گھٹا بن کر سلمہ کی بڑی آنکھوں پر چھا گیا۔ وہ چپکے چپکے گھر کی طرف روانہ ہوگئی ـــ

پہاڑی راستہ۔ رات کا وقت، سناٹا اور تنہا سلمہ سر جھکائے آرہی ہے۔ اس کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ وہ پہاڑ کے کسی کھڈ میں گر جائے۔ اور اس گھر کی صورت نہ دیکھے جہاں "محبت بھرا دل" دولت کے بھاؤ میں فروخت ہونے کی اسکیم پوری ہوچکی ہے۔ اس نے گھر پہنچ کر وہی دیکھا جس کا خیال اس کو موت کی بھیانک تصویر راستے بھر دکھاتا آرہا تھا۔

اس کی ماں نے کہا: "سلمہ پرسوں شادی ہے چار دن میں سسرال چلی جاؤگی۔ اب بھی تمہارا گھومنا پھرنا نہیں جاتا۔" وہ کوئی جواب دئے بغیر ایک گوشے میں سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ سلمہ کا باپ گھر میں ایک خوش آیند قہقہے کے ساتھ داخل ہوا۔ دینا پور کا وہ غریب کسان تھا۔ کون مفلس دولتمند ہونے کی تمنا نہیں کرتا۔ کون نہیں چاہتا کہ کچا مکان کوٹھی سے اور گاؤں کی زندگی شہر سے بدل جائے۔ ایک ہزار روپیہ کل رشید احمد خاں تعلقدار نے اس کو سلمہ کی شادی کے سلسلے میں دیا تھا اور آج تو چار ہزار نقد اور دو ہزار کے زیورات بھی حوالے کردئے - - - - وہ خوشی خوشی سلمہ کی ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ "لو یہ چار سو نہیں چار ہزار کے نوٹ بھی وہیں رکھو جہاں کل کا روپیہ رکھا تھا۔ سلمہ کی ماں! تمہاری اکلوتی لڑکی کی تقدیر نے ہماری تمہاری قسمت کو چار چاند لگا دئے۔ شادی سے پہلے تو یہ حالت ہے اور شادی کے بعد؟" قہقہہ،

سلمہ کی ماں نے خوشی خوشی نوٹ رکھ لئے۔ تعلقدار صاحب کی تعریفیں رات گئے تک میاں بیوی کرتے رہے۔

(۲)

سلیم کی جوانی کا یہ پہلا دن تھا جس روز اس نے سلمہ کو نہیں دیکھا۔ واپسی میں اسے کتابیں خریدنے میں دیر لگ گئی۔ شہر سے آنے والی لاری چھوٹ گئی۔ اٹھارہ کوس پہاڑی راستہ مگر اس کے باوجود بھی بغیر کسی سواری کے دینا پور کی طرف قدم بڑھادئے۔

دو بجے دن کا چلا ہوا سلیم ایک بجے رات کے بعد دینا پور پہنچا۔ وہ اپنے گھر جانے سے پہلے سلمہ کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا۔ گھٹنوں تک اس کے پاؤں خاک میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پسینے میں سر سے پاؤں تک غرق تھا۔

سلیم نے ہلکی سی سیٹی بجائی جس کی آواز فضا میں لہرا کر سلمہ کے نازک کانوں سے ٹکرائی ـــ دل دھڑکا، اٹھی اور دروازے تک آئی۔ چپکے سے زنجیر کھولی۔ سلیم چاندنی میں کھڑا مسکرا رہا تھا ـــ اس نے سلمہ کو دیکھتے ہی (جیب سے ایک ہیرے کی انگوٹھی نکال کر) کہا یہ ناچیز ہدیہ شہر سے دیہات کی سلمہ کے لئے لایا ہوں۔

سلمہ: (انگوٹھی لیتے اور اپنے آنسو انگوٹھی پر ٹپکاتے ہوئے) "شہر کیوں گئے تھے سلیم؟"

سلیم: "کتابیں خریدنے۔ کیونکہ چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ کل مجھے علیگڈھ ضرور جانا پڑے گا۔ اب اس کے بعد جب قسمت کروٹ بدلے۔"

سلمہ: "میں بھی یہی چاہتی تھی کہ جس محبت کی تم نے میرے دل میں پرورش کی ہے اس کی قبر اپنے ہاتھ سے بنا کر جاؤ۔"

ستارے چھپ رہے تھے اور آنسو ٹپک رہے تھے۔ سسکیوں کی آواز گاؤں کی فضا کو ہچکولے دے رہی تھی۔ سلمہ کے گرم اور بڑے آنسو سلیم کی کلائی پر برابر گر رہے تھے۔ وہ مسلسل پوچھ رہا تھا کیا ہوا سلمہ؟ کیوں رو رہی ہو سلمہ؟ کیا وجہ ہے مگر سلمہ زبان کے بدلے آنسوؤں سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔

سلیم: بتاؤ سلمہ۔ بولو۔ کہو۔ کیا بات ہے۔

سلمہ: چھپانا موت، بتانا گناہ۔ جاؤ سلیم دیر ہو رہی ہے۔

(۳)

سلیم دینا پور کے ایک چھوٹے سے زمیندار ممتاز احمد کا لڑکا تھا۔ ممتاز احمد دو سال قبل مر چکے تھے۔ بیوہ ماں دینا پور میں رہتی تھی اور

ساجدہ اس کی بڑی بہن، علیگڈھ میں افتخار احمد کو بیاہی ہوئی تھی جو سی، پی کے کسی ضلع میں نائب تحصیلدار تھے۔ سلیم کی تعلیم کے کل اخراجات افتخار احمد ہی سے متعلق تھے کیونکہ اس کی زمینداری صرف اس قدر تھی کہ سال بھر کی جنس خریدنا نہ پڑے۔ سلیم تین بجے رات کو گھر پہنچا تھا۔ اس لئے صبح کو دیر میں آنکھ کھلی۔ لاری چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ جلدی جلدی اسباب باندھ کر اور یہاں سے رخصت ہو کر علیگڈھ کے ارادہ سے روانہ ہو گیا۔

سلمہ کے مکان سے قریب ہو کر نکلا۔ آج غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر اس کے بڑھتے ہوئے قدم لڑکھڑائے۔ لیکن دن کا وقت تھا لوگ آجا رہے تھے۔ اس لئے یہ سر جھکا کر گذر گیا۔ تھوڑی دور بڑھنے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو سلمہ کوٹھے پر اسی بوسیدہ چھپر کے نیچے کھڑی ہوئی نظر آئی جو محبت کی پہلی جلوہ گاہ تھی۔ سلیم نے خدا حافظ کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا لیکن سلمہ کی خاموشی نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا کہ کہیں یہ آخری ملاقات نہ ہو۔

لاری روانہ ہوئی اور یہ ۲ ½ بجے شہر پہنچا جہاں سے علیگڈھ جانے کے لئے ۶ بجے شب کو گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔

(۴)

جس پتھر سے محبت کی نگاہ چاند کی شعاعیں کھینچتی ہے اسی پتھر سے وقت آنے پر چنگاریاں بھی اڑتی ہیں۔ رشید احمد خاں دنیا پور کے سب سے بڑے تعلقدار تھے: ان کی آمدنی کسی طرح ڈیڑھ لاکھ سے کم نہ تھی۔ پچاس سال سے زائد عمر کے باوجود ان کی دولت ان کے جذبات روندنے میں ناکامیاب ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ سولہ برس کی لڑکی سے شادی کر کے وہ اپنے دل کو پھر سے سیلاب شباب میں بہانے کے قابل ہو سکیں گے۔ سلمہ کے حسن کی شہرت نے ان کو گرویدہ کر رکھا تھا۔ ان کے مصاحبوں اور خوشامدیوں نے یہ سمجھانے سے پرہیز کیا تھا کہ سولہ برس کی سلمہ پچپن سالہ تعلقدار کے لئے موزوں نہیں ہے۔

رشید احمد خاں: میں نے آموں کا باغ خرید کر جب سے اس میں بنگلہ ڈلوایا تھا۔ میرا دل رہ رہ کر مجھے ٹھوکے دے رہا تھا کہ ایسے مکان میں ایسا ہی مکین ہو۔

اختر: (مصاحب) کیوں نہیں سرکار، اور پھر نظر انتخاب کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سلمہ پانچ انگلیاں پانچ چراغ ہے۔

رشید احمد خاں۔ (بات کاٹ کر) پانچ چراغ ہے پانچ چراغ! جس وقت وہ تالاب سے پانی بھرنے جاتی ہے تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابر کی گود میں چودھویں رات کا چاند دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ اور جب وہ نازک کمر پر پھولوں کی ٹوکری کے بجائے پچیس سیر کا گھڑا اٹھا کر چلتی ہے تو میری بے پناہ دولت کہتی ہے کہ اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہئے۔

(۵)

علیگڈھ کی فضا سلیم کے لئے اندوہناک تاریک اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ کسی جگہ اس کا دل نہ لگا۔ وہ سیدھا ساجدہ کے گھر آیا۔ بہن کی محبت بھری نظر نے سلیم کے چہرے سے ٹکرا کر دل کی حالت معلوم کر لی۔ وہ بھائی کی محبت کے حال سے واقف تھی۔ وہ یہ سمجھی کہ معلوم ہوتا ہے ابھی سلمہ نے سلیم سے بات چیت نہیں کی۔

ساجدہ: کیوں سلیم پریشان کیوں آئے؟ گھر میں خیریت تو ہے؟

سلیم: ہاں خیریت ہے۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔

ساجدہ: (مسکرا کر) بھابی کیسی ہیں بھیا؟

سلیم: (مسکراہٹ کا جواب دیتے ہوئے) تمہارے بھیا کی شادی ہی کہاں ہوئی جو بھابی کا ذکر کر رہی ہو اور شاید؟ ...... سلیم کہتے کہتے رکا اس کی ہنسی کروٹ بدل کر آنسوؤں میں ڈبڈبا گئی اور وہ بے ساختہ رونے لگا۔

ساجدہ: (گھبرا کر) کیوں سلیم سچ بتاؤ کیا بات ہوئی؟

سلیم: کہہ تو دیا کہ کوئی خاص بات نہیں۔

ساجدہ: سلمہ کس حال میں ہے؟

سلیم: جس حال میں بھی ہے اچھی ہے۔

ساجدہ: امی جان کے ذریعہ تمہارا پیغام سلمہ کے لئے گیا؟

سلیم: تم یہاں علیگڈھ میں ہو اور میں کوشش کے باوجود بھی امی جان سے نہ کہہ سکا۔

ساجدہ: کہیں ایسا نہ ہو کہ سلمہ کسی اور کی ہو جائے۔

سلیم: ہو سکتا ہے — اور — اب کی تو — جیسے میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دنیا پور کا چاند آخری مرتبہ دیکھا ہے۔

ساجدہ: تم نے اس کی شادی کے متعلق کچھ سنا ہے؟

سلیم: سنا تو کچھ بھی نہیں لیکن گذشتہ رات کو جس غم انگیز طریقے سے سلمہ ملی شاید یہ پہلا اتفاق تھا۔

(۶)

سلمہ آنسوؤں کی چھاؤں میں دلہن بن رہی تھی۔ دنیا پور میں اس کا میل جول عام تھا۔ محلہ میں اس کی پچاسوں سہیلیاں تھیں اور اس وقت اس کو دلہن بنانے میں سب کے ہاتھ لگے ہوئے تھے۔ دیہاتی قسم کی نوبت فضاؤں میں چھائی ہوئی تھی۔ سلمہ کا گھر مہمانوں سے چھلک رہا تھا

اس کا باپ رشید احمد خاں تعلقدار کو گھڑی گھڑی کی خبر دے رہا تھا اور روپیہ پہ روپیہ لا رہا تھا۔

رشید احمد خاں دیناپور کے جہاں سب سے بڑے تعلقدار تھے وہاں سب سے بڑے کنجوس بھی مشہور تھے۔ انھوں نے ہمیشہ روپیہ پہ روپیہ جمع کیا۔ وہ خرچ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جب دریا کا بند کسی وجہ سے ٹوٹتا ہے تو دھارا تیز بہتا ہے۔ یہ موقع تھا کہ وہ پیسہ کو پانی کی طرح بہا کر سلمہ کو اس کے گھربار اور ماں باپ سمیت خرید لیں۔

اختر: (مصاحب) سرکار اور کچھ بھی سنا؟

رشید احمد خاں: کیا؟

اختر: سلمہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔

رشید احمد خاں: یہ کیسے معلوم؟

اختر: اس طرح کہ سلمہ کی ایک سہیلی سلطانہ ہے جو ہمیشہ اس کی رازدار رہی ہے۔ کل شام جس وقت میں گھر جا رہا تھا تو اس نے مجھ کو بلا کر کہا کہ جب سے سلیم علیگڈھ گیا ہے سلمہ کا آنسو نہیں ٹھہرا۔

رشید احمد خاں: یہ سلیم کون؟

اختر: ممتاز احمد کا لڑکا۔

رشید احمد خاں: ممتاز احمد کون؟

اختر: اسے سرکار، وہی ممتاز احمد جس نے مکھی بن کر ہمیشہ سرکار کے دسترخوان پر حملے کئے۔

رشید احمد خاں: وہ ممتاز احمد جس نے ایک مقدمہ کے دوران میں میری مدد لی تھی اور سات سو روپیہ قرض لے کر سود اصل کچھ نہ دیا؟

اختر: جی ہاں سرکار وہی۔

رشید احمد خاں: وہ تو کب کا مر گیا۔

اختر: لیکن اس کا لڑکا سلیم تو زندہ ہے اور سلمہ اسے چاہتی ہے۔

رشید احمد خاں: سلیم تو علیگڈھ میں پڑھتا ہے۔

اختر: جی ہاں پرسوں آیا تھا اور کل پھر علیگڈھ گیا۔

رشید احمد خاں: یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔

اختر: مگر اپنی محبت تو سلمہ کے دل میں چھوڑ گیا۔ سرکار جب تک یہ کانٹا نہ نکلے گا آرام نہیں مل سکتا۔

(۷)

ساجدہ: تو سلیم کیا سوچا؟

سلیم: سوچا کیا۔ روپیہ پاس نہیں جو گھڑی گھڑی علیگڈھ سے دیناپور جاؤں۔

ساجدہ: تمہارے بہنوئی کے سو روپے میرے پاس رکھے ہیں۔ تم یہ لے کر دیناپور چلے جاؤ اور سلمہ سے اپنی نسبت امی جان [illegible] کر لو۔

سلیم: میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا۔

ساجدہ: میں لکھے دیتی ہوں یہ خط امی جان کو دیدینا وہ طے کر دیں گی۔

سلیم نے آٹھ دن کی رخصت اور لے لی۔ روپیہ اور خط لے کر دیناپور روانہ ہو گیا۔ وہ سفر میں تھا لیکن اس کی روح دیناپور کی گلیوں میں چکر لگا رہی تھی۔ کبھی وہ اس تالاب پر جاتا تھا جہاں سے سلمہ پانی بھرتی تھی۔ کبھی وہ اس اس پہاڑی پر پہنچتا تھا جہاں سلمہ پتھر کی چٹان پر کہنی ٹیک کر کھڑی ہوتی تھی اور روزانہ دونوں وقت ملتے سلیم کا انتظار کرتی تھی۔ اس نے پچاس روپے میں علیگڈھ سے کچھ پوڈر کے ڈبے، کریم کی شیشیاں اور ایک جگمگاتی ہوئی ساری خریدی۔ اور یہ سوچ کر سفر طے کر رہا تھا کہ اپنی سلمہ کو یہ سوغات دوں گا۔ اور وہ خوشی خوشی میرے ہدیہ کو قبول کرے گی۔ جب وہ چاندنی رات میں یہ جگمگاتی ہوئی ساری پہن کر کچے مکان کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوگی تو یہ معلوم ہوگا کہ ستاروں نے چودھویں کے چاند کو گھیر لیا۔ یہ سب کچھ تو تھا۔ لیکن سلیم کا دل رہ رہ کر یہ کہہ رہا تھا کہ خدا اس خواب کو سچ کرے۔

(۸)

دیناپور میں چراغاں تھا۔ وہاں کے سب سے بڑے زمیندار کی شادی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ آسمان کے ستارے بلندی پر اور زمین کے چراغ پستی پر جگمگا رہے تھے۔ لیکن یہ چراغ سلمہ کے آنسوؤں میں جل رہے تھے۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی: "سلمہ اگر رشید احمد خاں سے بہتر کوئی شوہر تیرے لئے جڑ سکتا تو تیری شادی وہیں کرتی"۔ سہیلیاں کہہ رہی تھیں: "سلمہ دیناپور کی ملکہ بن رہی ہو۔ بڑا علاقہ، اتنی رعایا، اتنی دولت، سب تمہاری ہے"۔ سلمہ ڈبڈبائی اور سوجی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی اور سر جھکا لیتی۔ دو بجے رات کو بڑی دھوم سے برات آئی۔ آتشبازی چھوٹی۔ پٹاخوں کے دھماکوں سے دیناپور کی فضا ہل گئی۔

عین اس وقت جبکہ نکاح شروع ہوا دلہن کے حجرے سے رونے کی آواز آئی۔ شادی کے گھر میں رونے کی صدا گونجتے ہی سناٹا چھا گیا۔ کیا ہوا؟

رشید احمد خاں سہرا الٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سلمہ کے باپ اندر سے باہر آئے۔ دلہن بیہوش ہو گئی۔ اس کی نبضیں سحر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئیں۔ دو ہچکیوں نے شادی کے گھر کو غم سے بدل دیا۔ ہیرے کی وہ انگوٹھی جو سلیم کی سوغات تھی آج سلمہ کی روح کو آزاد کرنے کیلئے کام آئی۔

[illegible] جب ہاتھ کی انگوٹھی پر پڑی تو اس میں نگ نہ تھا سلمہ [illegible] رخسار زرد ہو چکے تھے اور رخسار کے سوکھے ہوئے آنسو [illegible]یم کو یاد کر رہے تھے

(۹)

سلیم صبح ہوتے دیناپور میں داخل ہوا۔ وطن کی زمین نے پاؤں پکڑ کر پیغام تعزیت دیا۔ سلیم کے ایک دوست نے بڑھ کر کہا: کب آئے سلیم؟

سلیم: ابھی آرہا ہوں کیوں خیریت تو ہے؟

دوست: اور سب تو خیریت مگر کل دیناپور میں ایک تاریخی واقعہ ہوگیا۔

سلیم: (گھبرا کر) کیا؟

دوست: سلمہ مر گئی۔

سلیم: سلمہ مر گئی — سلمہ — مر — گئی — ہاتھ سے سب اسباب چھوٹ کر زمین پر گرا — اور ساتھ ہی ساتھ سلیم بھی؟

صبح کی دھوپ دیناپور کے درختوں کی بلند چوٹیوں پر تعزیتی پیغام دے رہی تھی اور محبت کا یہ المیہ افسانہ انجام کو پہنچ چکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلیم اٹھ کر مکان آیا۔ ماں نے کہا: "ابھی پرسوں گئے اور آج پھر چلے آئے سلیم؟"

سلیم: غلطی ہوئی امی جان — آئندہ سے دیناپور کی زمین پر آپ سلیم کو نہ دیکھیں گی — سلیم کی ماں پکارتی رہی مگر سلیم لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی پہاڑیوں میں ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح غروب ہوگیا۔

لندن کی نشرگاہ:

بقیہ صفحہ ۱۵

کرنے کے لئے وقت ہے۔ اگلی خبر ختم ہوتے ہی وہ بٹن دباتا ہے اور مائکروفون کو غیر منسلک کر دیتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے: "ماسکو کا سرکاری اعلان شامل کرنا ہے جس طرح بھی ہوسکے شامل کیجئے۔" پھر دوبارہ مائکروفون کو چالو کر دیتا ہے اور آواز آتی ہے: "ایک بالکل تازہ خبر سنیئے۔" خبریں پڑھنے والا اسی کا نمبر ہے بالکل صحیح صحیح خبریں پڑھ دیتا ہے۔ دونوں کو وقت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اگر خبریں وقت پر ختم نہ ہوسکیں تو سنائی بند ہو جائیں گی چاہے اس وقت کچھ بھی کیوں نہ کہا جا رہا ہو۔ پروگراموں کے لئے وقت کی پابندی بہت ضروری ہے تاکہ دوسرے نشر کرنے والوں کو دقت نہ ہو۔ تحریر کی لمبائی کا خیال رکھنا سب ایڈیٹر کا کام ہے۔ جب دو سکنڈ باقی رہتے ہیں تو بات ختم ہو جانی چاہیئے۔ سرخ روشنی کے غائب ہوتے ہی خبریں پڑھنے والا اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر لندن سے دنیا کے لئے دوسرا بلیٹن نشر کیا جاتا ہے۔ (فاران ریویو سے ماخوذ)

غزل

وحشت کلکتوی

ایسا بھی ترا غمزدہ مجبور نہیں ہے
تنگ آکے جو مر جائے تو کچھ دور نہیں ہے

دلجوئی وہ کیوں کرنے لگے لیکے مرا دل
یہ قاعدہ یہ رسم یہ دستور نہیں ہے

اب تک نظر آجاتی ہے مشتاق کو نہیں
وہ برق تجلی جو سر طور نہیں ہے

دل والے ہیں واقف مری بربادیٔ دل سے
ہر چند کہ یہ واقعہ مشہور نہیں ہے

کیا مہر و وفا کا ہی ہوتا ہے طریقہ
کیوں کہہ نہیں دیتے ہیں منظور نہیں ہے

کرتا ہوں اسی بزم کا میں تذکرہ ہر دم
جس بزم میں میرا کوئی مذکور نہیں ہے

ہر شخص سے مانوس جو ہوتا نہیں وحشت
یہ ہے کہ کم آمیز ہے، مغرور نہیں ہے

ہندوستانی موسیقی

شاہد احمد دہلوی

ہندوستانی موسیقی کی ابتدا ماضی کے دھندلکے میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لئے اسکے آغاز کے متعلق صرف قیاس ہی ہماری رہبری کرتا ہے۔ ہندوؤں کے علم الاصنام کے مطابق سنگیت برہما کی ایجاد ہے، مہادیو نے اسے برتا اور نرد نے اسے رواج دیا۔ گندھروں اور اپسراؤں نے دیوتاؤں کے آگے اس کی نمائش کی۔ جب آکاش پر دیوتاؤں میں سنگیت رائج ہوا تو دھرتی کے باسیوں پر بھی اس کا اثر ہوا اور راجہ مہاراجاؤں کے جشن رسیلے نغموں سے گونجنے لگے۔ رفتہ رفتہ ملک میں سنگیت عام ہوا۔ اس کی باقاعدہ تعلیم دی جانے لگی۔ اور ہر طبقے کے لوگ اس سے بقدرِ استطاعت لطف اٹھانے لگے۔

انسانی فطرت کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن الفاظ کے ادا کرنے میں جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا لوگ انہیں گانے لگے۔ جوش کا اظہار یا تو دینی امور میں ہوتا ہے یا بعض دنیوی امور میں۔ دینی امور میں سب سے زیادہ جوش کا اظہار عبادت میں ہوتا ہے اور دنیوی امور میں عشق و محبت میں۔ اسلئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گانے کی ابتدا عبادت اور عشق سے ہوئی۔

ہندوستانی سنگیت کا بچپن مندروں میں گذرا۔ برہمنوں نے دیوتاؤں کی پوجا پاٹ میں بھجن گائے اور اپنے چیلوں کو مذہبی تعلیم گانے میں دی۔ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب شاعری نے نغمے میں جگہ پائی تو لے نے بھی صورت دکھائی۔ گیت، چھند، اور جوگیاں تال کے ساتھ گائی جانے لگیں۔ جب سنگیت کا رواج عام ہوا تو اس کی ترتیب و تہذیب بحیثیت ایک فن کے کی گئی اور راگ راگنیوں کا تعین کیا گیا۔ ان کے اصول مقرر کئے گئے اور یوں سنگیت کا علم و فن وجود میں آیا۔

آواز ارتعاش یا لرزش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ آواز جو محض آواز ہو جسمیں کوئی رسیلاپن یا خوش آئند کیفیت نہ ہو مثلاً بادل کی گرج یا دھماکہ۔ یا ایسی آواز جو کانوں کو بھی بھلی لگے۔ یہ سریلی یا موسیقانہ آواز کہلاتی ہے۔ صدائے محض سے جو تموج پیدا ہوتا ہے اسکے درمیانی وقفوں میں تناسب نہیں ہوتا۔ سریلی آواز کے تموج میں درمیانی وقفے برابر کے ہوتے ہیں۔ سائینس کی تحقیقات بتاتی ہے کہ موسیقانہ صدا کم از کم ۱۶ تموجات فی سکنڈ سے پیدا ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیس ہزار تموجات فی سکنڈ سے۔

ہندوستانی موسیقی کا دار و مدار صرف ۱۲ سروں پر ہے۔ ہزاروں سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انہی بارہ سروں میں ساری راگ بدیا ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس کی اور زیادہ چھان بین کی گئی اور باریکیاں نکالی گئیں تو معلوم ہوا کہ آواز کے ایک مکمل ٹکڑے کو (جسے اصطلاح میں سپتک کہتے ہیں) بائیس مقاموں یا سرتیوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ انہی میں بارہ وہ مقام بھی شامل ہیں جنہیں سر کہا جاتا ہے۔ عام ہندوستانی سنگیت میں بارہ سر ہی برتے جاتے ہیں۔ سرتیوں کی ادائیگی صرف بڑے فنکاروں ہی کے بس کی بات ہے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہت اعلیٰ تربیت یافتہ سماعت درکار ہے۔ اگر ایک تار کے دونوں سروں کو تان دیا جائے اور اس کے پہلے سرے کو سُر مان لیا جائے تو جیسے جیسے ہم اس تار پر آگے بڑھتے جائینگے سُر بدلتے جائینگے یہاں تک کہ بارہ نمایاں سر اس سے پیدا ہو جائینگے یا اگر باریک بینی سے کام لیا جائے تو بائیس سُرتیاں پیدا ہونگی۔ اس کے بعد جب آپ اور آگے بڑھینگے تو تیرھویں سُر یا تیئیسویں سرتی پر پھر وہی پہلا سُر آواز دیگا جہاں سے تار کا آغاز ہوا ہے۔ اور اس کے بعد پھر وہی سب سُر اور سُرتیاں دوبارہ ادا ہونے لگیں گی جو پہلے حصہ میں ہو چکی ہیں۔ فرق صرف اکہرے اور دوگنے کا ہوگا۔ بارہ نمایاں سُروں کے بعد دُون کے سر یا ٹیپ کے سر ادا ہونے لگینگے اور دوسری سپتک یا استھان شروع ہو جائے گا، اور پھر بارہ سروں کے بعد تیسری سپتک۔ بالعموم انسانی گلے کی دوڑ انہی تین سپتکوں میں محدود ہوتی ہیں اور سازوں میں بھی انہی تین سپتکوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ان تین سپتکوں یا استھانوں کے نام درجہ بدرجہ مَندر، مدھ اور تار رکھے گئے ہیں۔

بارہ سُروں کی تقسیم اگلے لوگوں نے اس طرح کی ہے کہ سات سُروں کو بنیادی سر مانا ہے۔ ان کے نام ہیں:- (۱) کھرج (۲) رکھب (۳) گندھار (۴) مدھم (۵) پنچم۔ (۶) دھیوت اور (۷) نکھاد آوازوں کے فصل کے اعتبار سے ان سات سروں کو شدھ یعنی خالص سُر مانا گیا ہے۔ اس کے بعد تحقیق ہوا کہ پہلے اور پانچویں کے علاوہ باقی پانچ سروں کی دو دو شکلیں ہیں۔ چنانچہ پہلی شکل کے سروں کو کومل سُر کہا گیا۔ کومل کے معنے ہیں ملائم دوسری شکل کے سُران سروں سے چونکہ تیز ہیں اسلئے ان کا نام تیور رکھا گیا۔ اس لحاظ سے ایک سپتک کے بارہ سُر یہ ہوئے۔

(۱) کھرج۔ (۲) کومل رکھب (۳) تیور رکھب۔ (۴) کومل گندھار (۵) تیور گندھار۔ (۶) کومل مدھم (۷) تیور مدھم (۸) پنچم (۹) کومل دھیوت (۱۰) تیور دھیوت (۱۱) کومل نکھاد اور (۱۲) تیور نکھاد

کھرج اور پنچم اچل یا قائم سر کہلاتے ہیں۔ ان کے اترے چڑھے سُر نہیں ہوتے۔

متقدمین نے اس علم کی اتنی چھان بین کی ہے کہ سروں کا تعلق سیاروں سے، ان کی تاثیر اور تاثر، اور ان کے رنگ تک معلوم کر لئے ہیں۔ یہ سب باتیں ہزاروں برس کے تجربوں سے معلوم کی گئی ہیں اور نتائج کے اعتبار سے اتنی صحیح ہیں کہ ان کی سائنٹفک توجیح ناممکن نہیں ہے۔ سات بنیادی سروں کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ ہفت افلاک کی گردش سے جو سات مختلف موسیقانہ آوازیں پیدا ہوتی ہیں انہیں پر موجودہ سات سروں کو منطبق کیا گیا ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ سات سیاروں سے سات سُر وابستہ کئے گئے ہیں، اور ان سیاروں کے اچھے برے اثرات ان سات سروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ ہر سُر کا ایک مزاج بھی دریافت کیا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ کونسا سُر انسان کے کس جذبہ کو ابھارتا ہے۔ اسی کی رعایت سے سروں کے رنگ بھی متعین کئے گئے ہیں۔ مثلاً جو سُر دل میں خوشی اور سرور پیدا کرتا ہو اس کا رنگ گلابی یا جو سُر غم و اندوہ کا محرک ہو اس کا رنگ سیاہ مقرر کیا گیا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ان نظریوں کو صحیح ماننے میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ تاثیر تو ہر سُریلی آوازیں ہوتی ہی ہے اور تاثیر نام ہے کسی ایک جذبے کے متاثر ہونے کا۔ موسیقی کے اثر و تاثیر کے سلسلہ میں آئندہ بحث کی جائے گی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ موسیقی حسنِ سمع کے ذریعہ روح کو اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ خود فراموشی اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ حکمائے قدیم نے موسیقی کی اثر آفرینی کے تجربے کر کے سروں کے مزاج بھی تشخیص کر لئے۔ چنانچہ گرم، سرد، خشک و تر تاثیریں سروں سے منسوب کی گئیں اور سروں کی مناسب ترتیب سے بعض ناقابل علاج امراض کا تدارک کیا۔

ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے جس سے سُروں کی خصوصیات واضح ہو جائینگی۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا دارومدار انہی سات شدھ اور پانچ کومل کل بارہ سروں پر ہے۔ انہی سروں کی ترتیب سے ہزاروں راگ بنتے ہیں۔ راگ سُروں کے ایک دلکش مجموعہ کا نام ہے۔ اگلے لوگوں نے کم سے کم پانچ مختلف سُر ہر راگ کے لئے ضروری قرار دیئے ہیں، پانچ سے کم کے راگ کو راگ نہیں مانا، گو رواج میں چار سُر اور تین سر کے راگ بھی ہیں۔

قدیم روایت اور اہل ہنود کے علم الاصنام کے مطابق مہادیو جی نے سروں کے قیام کے بعد چھ راگ بنائے۔ وہ اس طرح کے علاوہ کھرج کے ہر سر سے ایک راگ پیدا کیا۔ چنانچہ رکھب سے بھیروں، گندھار سے دیپک، مدھم سے میگھ، پنچم سے سری، دھیوت سے ہنڈول اور نکھاد سے مالکوس۔ کھرج سروں کا بادشاہ ہے اور بغیر اس کے کوئی بنیاد قایم نہیں ہو سکتی۔ یہ ہر راگ میں بنیادی حیثیت سے شامل ہوتا ہے اسلئے اسے ہر راگ کا مشترک سُر سمجھنا چاہئے۔ کسی ایک خاص راگ سے اسے منسوب یا مخصوص نہیں کیا گیا۔ مگر یہ صرف روایت ہی روایت ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔

متقدمین نے راگوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کی قلمی تصویریں بھی بنا دی ہیں۔ سُروں کی طرح راگوں سے بھی اچھے بُرے اثرات وابستہ کئے گئے ہیں اور غالباً اسی اثر و تاثیر کے لحاظ سے ان کی شکلیں متصور و مصور کی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے اس لئے مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) بھیروں گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی۔ گول منہ۔ مونچھیں چڑھی ہوئیں۔ بالوں کا جوڑا بندھا ہوا اسپر ایک سانپ لپٹا ہوا۔ دوسرا سانپ کمر میں لپٹا ہوا۔ بیل پر سوار۔ گلے میں زنار۔ سرخ ریشمی دھوتی پہنے ہوئے۔ انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی۔ ہاتھ میں

سُر	مختصر نام	نسبت	مشابہت آواز	مخرج	ستارہ	تاثیر	مزاج	رنگ
کھرج (سر)	سا	برہما	مور	ناف	کنول	خوشی۔ سرور	سرد و تر	گلابی
رکھب	رے	برہما	پپیہا	دل	عطارد	خوشی و سرور	سرد و خشک	دھانی
گندھار	گا	سرسوتی	بھیڑ	سینہ	زہرہ	غم و یاس	سرد و تر	نارنجی
مدھم	ما	مہادیو	سارس	حلق	شمس	بےچینی و بیقراری	گرم و خشک	مونیا
پنچم	پا	لکشمی	کوئل	منہہ	مریخ	غمی، قہر و جبر اور غصہ	گرم و خشک	زعفرانی
دھیوت	دھا	گنیش	سانپ	تالو	مشتری	خوشی اور سرور، قہر و جبر	سرد و گرم	زرد
نکھاد	نی	سُوریا	ہاتھی	ناک	زحل	سنگار، جذبات انگیز	سرد و خشک	سیاہ

موتیوں کی سمرن۔ عمر بارہ ہزار دو سو برس۔ ایک دھار پانی دریائے گنگ کی گائے کے منہ سے نکل کر مہادیو کے داہنے شانے پر گرتی ہے بھیروں کی شکل مہادیو سے مشابہ ہے۔

(۲) مالکوس جامۂ سرخ پرزر سے آراستہ، ہوا کے تخت پر براجمان۔ بیلے کا گجرا گلے میں۔ ہاتھ میں یاقوت کی انگوٹھی۔ نو رتن بازو پر۔ چمپاکلی مرصع گلے میں۔ سرخ زرکار پٹکا کمر میں۔ کانوں میں یاقوت کے حلقے۔ بالوں کی چوٹی بندھی ہوئی۔ ہاتھ میں میزان عدل مصاحبین پری پیکر حلقہ بدوش سبز فام مثل کندن خام، از حد خوبصورت دھوتی چھبری پہنے ہوئے۔ عمر پانسو پچاس برس کی۔

(۳) ہنڈول گندمی رنگ مائل بہ زردی۔ کشادہ پیشانی۔ پیوستہ ابرو۔ مونچھیں چڑھی۔ آنکھیں سرخ۔ مالائے مرجان گلے میں پوشاک سفید ہتھیاروں سے آراستہ۔ اسپ پری پیکر پر سوار۔ ہاتھ میں خنجر آبدار۔ سر پر کلاہ کج۔ ایک طرف زعفران زار دوسری سمت کوڑیالے کی بہار۔

(۴) دیپک شبیہ ایک حسین نوجوان کی ہے جو ڈھاتا سرخ جوڑا پہنے گرڑ پنکھ پر آسن جمائے بھگوان سے لو لگائے بیٹھا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ نوجوان کے جسم میں سے نور کی شعاعیں اس طرح نکل رہی ہیں جیسے آگ کے شعلے پھوٹ رہے ہوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آگ کی لپٹیں اس طرح اٹھ رہی ہیں کہ آتشیں کنول سے کھلے نظر آتے ہیں۔ گرڑ پنکھ کی سات چونچیں ہیں جنمیں سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ یہ موسیقار اڑتا رہتا ہے۔ فضا میں سے آگ نکلتا اور اسی میں اگلتا رہتا ہے۔ عمر ساٹھ اوپر دو ہزار برس کی۔

(۵) سری راگ شیر کی کھال کا جامہ پہنے ہوئے۔ مردے کے تلوے کی ہڈیاں گلے میں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی۔ تین ستارہ پیشانی پر روشن انگیٹھی پیش نگاہ مشتعل۔ افراط سرما سے لرزاں۔ دوسری تصویر میں از حد خوبصورت جوان۔ خوش رنگ پوشاک سفید بدن میں مالائے مروارید۔ گلے میں یاقوت بے بہا حمائل کئے ہوئے مغنیان پریوش بیٹھی گا رہی ہیں۔

میگھ جامہ سرخ پرزر سے آراستہ تخت ہوا پر سوار بیلے کے پھولوں کا کنٹھا گلے میں۔ ہاتھ میں یاقوت کی انگشتری۔ نو رتن بازو پر۔ گلے میں چمپاکلی۔ کانوں میں زمردیں حلقے۔ سرخ زرکار کمربند۔ جوڑا بالوں کا بندھا ہوا۔ مصاحبین جھولا جھلا رہے ہیں۔ یاقوت کا تازیانہ ہاتھ میں۔ آنکھیں خمار آلود۔ آہو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے۔ دوسری تصویر میں سیاہ فام شمشیر برہنہ ہاتھ میں۔ گھنگھور گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئیں۔ ان میں کڑک بجلیوں کے سانپ بن رہے ہیں۔

راگوں کے بعد راگنیاں وضع کی گئی ہیں۔ ہر ایک راگ کی پانچ پانچ راگنیاں مقرر ہیں۔ کل تیس راگنیاں ہوئیں۔

بھیروں راگ کی راگنیاں

(۱) بھیروی۔ زرد فام چمپئی رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ پیوستہ ابرو۔ آہو چشم اوسط بینی۔ گردن بلند۔ باریک کمر۔

(۲) براری:۔ سبز فام۔ پوشاک زعفرانی۔ فراخ پیشانی۔ بلند بینی میانہ قد لاغر اندام۔ نہایت ملیح چہرہ ہاتھ میں۔

(۳) مدھ مات:۔ طلائی رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ باریک ابرو۔ چشم کلاں۔ بلند بینی۔ اوسط اندام۔ زرد لباس قشقہ زعفرانی پیشانی پہ۔ ہم آغوش حریف۔ لب دریا بیٹھی ہوئی۔

(۴) سندھوری:۔ گندمی رنگ۔ فراخ پیشانی میشی چشم اوسط اندام۔ میانہ قد۔ سرخ پوشاک۔ ڈری ڈری سہمی سہمی۔

(۵) بنگالی:۔ سبز رنگ میانہ قد پیشانی کشادہ۔ بچوی آنکھیں۔ پستہ قد۔ زعفرانی قشقہ۔ زرد لباس جوگنوں کی طرح کا۔ بھبھوت بدن میں لگائے نہایت حسین۔ حسب دچالاک شوخی و گستاخی بشرہ سے عیاں۔

مالکوس راگ کی راگنیاں

(۱) ٹوڑی:۔ سبزہ رنگ۔ آہو چشم۔ دراز قد۔ فربہ اندام۔ سفید لباس قشقہ زعفرانی۔ بین کندھے پر دھرے بین بجا رہی ہے، جانوران صحرائی بیہوش پڑے یا حیران کھڑے ہیں۔

(۲) گوری:۔ گورا رنگ۔ فربہ اندام میش چشم۔ پوشاک سبز۔ آم کا بور کانوں میں۔ تنبورہ لئے گا رہی ہے۔

(۳) گن کلی:۔ گورا رنگ۔ کھلی پیشانی۔ آہو چشم۔ بلند بینی۔ دراز قد۔ وقت صبح گاہی۔ فراق زدہ۔ بال پریشان۔ قدم کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی ہے۔

(۴) کھمباوتی گورا رنگ میش چشم۔ اوسط اندام۔ میانہ قد۔ انگیا ساری سرخ پہنے ہوئے بشاش بیٹھی ہے۔ تنبور گستاخ۔

(۵) کوکب:۔ سیمیں بدن۔ کشادہ ابرو۔ آہو چشم۔ دراز قد۔ پوشاک سرخ۔ بعد انفراغ کار ہائے دنیاوی سے مست بے خبر سو رہی ہے۔

ہنڈول راگ کی راگنیاں

(۱) **رام کلی**:- طلائی رنگ - پیوستہ ابرو - آہو چشم، میانہ قد نیلی پوشاک خوشامد سے اپنے مالک کے پاؤں دبا رہی ہے -

(۲) **دلیساکھی**:- سبز فام، کشادہ ابرو - فربہ اندام - دراز قد - پوشاک دھانی شمشیر برہنہ ہاتھ میں، غصہ میں بھری ہے -

(۳) **دیوگری**:- طلائی رنگ کشادہ ابرو میش چشم - اوسط اندام - قشقہ صندل - اپنے مالک کے ساتھ محظوظ بیٹھی ہے -

(۴) **باسنتی**:- سبزہ رنگ پیوستہ ابرو - آہو چشم - اوسط بینی - میانہ قد فربہ اندام - زرد لباس - زیور مرصع سے آراستہ - اپنے حریف کے پاس خوش بیٹھی ہوئی ہے -

(۵) **تیلنگی**:- پیوستہ ابرو - فراخ پیشانی - آہو چشم - بلند بینی فربہ اندام - سرخ رنگ، لباس سفید پہنے مع ہمراہیان بطرز امیرانہ بیٹھی ہوئی ہے -

دیپک راگ کی راگنیاں

(۱) **کاموری**:- طلائی رنگ - کشادہ پیشانی - بلند بینی - آہو چشم - اوسط اندام سرخ لباس

(۲) **پٹ منجری**:- سفید رنگ کشادہ ابرو - میانہ قد - سرخ پوشاک سفید پیشانی پر قشقہ -

(۳) **سارنگی**:- گندمی رنگ - فراخ پیشانی میش چشم - لاجوردی لباس - ساتھ سہیلیوں کے گانے بجانے میں مشغول ہے -

(۴) **گندھاری**:- سفید رنگ - کشادہ پیشانی - پست قد - لاغر اندام - سنہری تن - اپنے نائک کے آگے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے -

(۵) **گونڈگری**:- سبز فام - فراخ پیشانی - دراز قد - فربہ اندام - زیر درخت انار خوش بیٹھی ہوئی ہے -

سری راگ کی راگنیاں

(۱) **بھراڑی**:- سیہ فام - فراخ پیشانی - آہو چشم - میانہ قد - سفید پوشاک مرصع زیور چاندی سے آراستہ - گلدستہ ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے -

(۲) **کرناٹی**:- سبز فام - کشادہ پیشانی میانہ قد - اوسط اندام - زیور طلائی مرصع سے آراستہ زرد لباس - لونڈیاں پری وش دست بستہ آگے کھڑی ہیں -

(۳) **مالسری**:- سیہ فام - فراخ پیشانی - بلند بینی - ملیح و حسین - فربہ اندام دراز قد - سرخ پوش -

(۴) **ساویری**:- سرخ رنگ - کشادہ ابرو - اوسط اندام - لباس سرخ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سرو کی شاخ پکڑے کھڑی ہے -

(۵) **دھناسری**:- طلائی رنگ - فراخ پیشانی - فربہ اندام - طلائی پیشانی پر قشقہ - پوشاک سرخ - اپنے نائک کے ساتھ خوش بیٹھی ہے -

میگھ راگ کی راگنیاں

(۱) **ملاری**:- سیاہ فام - کشادہ پیشانی - بڑی بڑی آنکھیں نوکیلی - میانہ قد زرد لباس - آغوش حریف میں نشۂ جوانی میں چور، زانو پر بیٹھی ہے -

(۲) **سورٹھ**:- سرخ رنگ - کشادہ ابرو - آہو چشم پست بینی - میانہ قد پوشاک سفید پہنے خوش بیٹھی ہے -

(۳) **سوہنی**:- طلائی رنگ - فراخ پیشانی - بلند بینی - اوسط اندام - سرخ صندل کا ٹیکہ - زعفرانی پوشاک گلاب کا پھول ہاتھ میں -

(۴) **اساوری**:- سبز فام - کشادہ ابرو - اوسط بینی - دراز قد - زیور مرصع سے آراستہ - سرخ پوشاک صندل سفید کا قشقہ اپنے نائک کے ساتھ خوش بیٹھی ہے -

(۵) **کنکنی**:- گورا رنگ - فراخ پیشانی - بلند بینی - چیتان کلاں - میانہ قد - لباس گلابی - فیل مست پر سوار - پژمردہ اور فراق زدہ -

اگلے گن کاروں نے راگنیوں کے بعد پتروں میں مزید تقسیم کی ہے جسے بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے - راگ راگنیوں کی یہ پرانی تقسیم کچھ عرصے پہلے تک رائج تھی مگر ربع صدی ادھر کی بات ہے کہ جب اس فن کی عقلی جانچ کی گئی تو اس تقسیم میں کوئی اصول کار فرما نظر نہیں آتا - منوں میں بھی باہمی اختلاف ہے - کسی نے چھ راگ اور تیس راگنیاں مانی ہیں اور کسی نے چھ راگ اور چھتیس راگنیاں اور ہر راگ کے آٹھ آٹھ لونڈی پتر بھی پیش کئے ہیں - غرض اسی پرانی تقسیم کا سارا دارومدار روایتوں پر ہے - اور ہماری ضرب المثل قدامت پرستی نے ہمیں کبھی اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دی کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ چنانچہ صدیاں بیت گئیں اور فن موسیقی کا یہی دستور رہا - ہر زمانہ میں رواج کے مطابق گرنتھ لکھے گئے اور نئے نئے قاعدے، اور اصول مقرر کئے گئے - نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہمارا سنگیت ایک مجموعۂ اضداد بن کر رہ گیا - کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور غور کرو تو معقول بحث کوئی بھی نہیں کرتا - ایک تو ہندوستانی موسیقی ویسے ہی ایک نہایت دشوار فن ہے - اس پر گرنتھوں اور پنڈتوں کے باہمی اختلاف نے

اسے بالکل ہی گورکھ دھندا بنادیا۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بمبئی کے ایک ایڈوکیٹ پنڈت وشنو نرائن بھات کھنڈے نے بڑے غور و خوض کے بعد کل نظام موسیقی کی کایا پلٹ کی اور اسے علمی اور اصولی شکل دی۔ ایک قدیم تقسیم کے مطابق بارہ مروجہ سروں سے بہتر ٹھاٹھ پیدا کئے گئے ہیں۔ سات مختلف سروں کے مجموعہ کو جس میں سُر ترتیب وار لگائے جائیں ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ چتر پنڈت نے ان ۷۲ ٹھاٹھوں میں سے صرف دس ٹھاٹھ انتخاب کئے ہیں اور ان میں وہ سب راگ آجاتے ہیں جو آجکل برتے جاتے ہیں۔ مروجہ بارہ سروں سے چونتیس ہزار آٹھ سو اڑتالیس راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کو علیحدہ علیحدہ یاد رکھنا ناممکن ہے اس لئے ٹھاٹھ بنائے گئے اور جن راگوں کے بنیادی سُر ایک سے ہیں انہیں ایک ہی ٹھاٹھ میں رکھا گیا۔ ٹھاٹھ کو خاندان سمجھنا چاہیئے اور اس سے متعلق راگوں کو افراد خاندان جیسے کسی خاندان کا نام لینے سے اس خاندان کے افراد کی جملہ خصائص ذہن میں آجاتی ہیں اسی طرح ٹھاٹھ معلوم ہوتے ہی اسکے راگوں کے اترے چڑھے سر سب واضح ہوجاتے ہیں۔ فی زماننا کم و بیش دو سو راگ رواج میں ہیں اور دس ٹھاٹھ کی تقسیم کی وجہ سے انہیں یاد رکھنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ ذیل میں چتر پنڈت کے دس ٹھاٹھ اور ان کے راگ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) کلیان ٹھاٹھ:۔ ایمن۔ شدھ کلیان۔ بھوپ کلیان۔ ہمیر۔ کیدارا۔ چھایا نٹ۔ کامود۔ شام کلیان۔ ہنڈول۔ گونڈ سارنگ مالسری۔ ایمنی بلاول۔ چندر کانت۔ ساونی کلیان جیت کلیان۔

(۲) بلاول ٹھاٹھ:۔ بلاول۔ بھاگ۔ بھاگڑا۔ دیسکار۔ پہاڑی۔ ککب۔ شنکرا۔ نٹ۔ مانڈ۔ سرپردہ۔ الیا۔ گن کلی۔ مُنکل۔ نٹ بلاولی ہنس دھن۔ لچھا ساکھ۔ بیم۔ دُرگا۔ ملوہا کیدارا۔ دیوگری۔ جلدھر کیدارا پٹ منجری۔

(۳) کھماج ٹھاٹھ:۔ کھماج جھنجھوٹی۔ سورٹھ۔ دیس۔ کھمباوتی۔ تلنگ۔ دُرگا۔ راگیسری۔ جے جے ونتی۔ گونڈ ملار۔ نٹ ملار۔ تلک کامود۔ بڈہنس بھارا۔ نارائنی۔ پرتاب ورالی۔ ناگ سُر ولی۔

(۴) بھیروں ٹھاٹھ:۔ بھیروں۔ کالنگڑا۔ بیگھ رنجنی۔ سوراشٹر۔ جوگیا۔ رام کلی۔ پربھاوتی۔ بھباس۔ للت پنچم۔ گوری۔ ساویری۔ بنگال بھیروں۔ شیومت بھیروں۔ انند بھیروں۔ گن کلی۔ اہیر بھیروں۔ زیلف

(۵) بھیرویں ٹھاٹھ:۔ بھیرویں۔ مالکوس۔ اساوری۔ دھناسری۔ بھوپال۔ زنگولہ۔ موٹکی۔ سدھ ساونت۔ بسنت کھماری۔ بلاس خانی توڑی۔

(۶) اساوری ٹھاٹھ:۔ اساوری۔ جونپوری۔ دیوگندھار۔ سندھ۔ اڈانہ۔ کوسی۔ درباری۔ دیسی۔ کھٹ۔ ابھیری۔

(۷) توڑی ٹھاٹھ:۔ شدھ توڑی۔ گوجری۔ میاں کی توڑی۔ ملتانی۔ بہادری توڑی۔

(۸) پوربی ٹھاٹھ:۔ پوربی۔ گوری۔ ریوا۔ بھباس۔ دیپک۔ ترہینی۔ مالوی۔ سری راگ۔ جیت سری۔ بسنت۔ پرج۔ دھناسری۔ پوربا دھناسری ہنس نرائن۔

(۹) مارواٹھاٹھ:۔ مارواپوریا۔ سوہنی۔ برابری۔ جیت بھنکار۔ بھٹیار بھباس۔ سازگری۔ مالیگورا۔ پنچم۔ پوریا کلیان۔

(۱۰) کافی ٹھاٹھ:۔ دھناسری۔ سیندھوی یا سیندورا۔ کافی۔ دھانی بھیم پلاسی۔ بہار۔ مدھ ماد۔ باگیسری حسینی کانہرا۔ میگھ ملار۔ رام داسی ملار میاں کی ملار میرابائی کی ملار۔ سوہا۔ نیلامبری۔ سور ملار۔ پردیپکی۔ شہلنا۔ دیوساکھ ہنس کنکنی۔ بندارانبی۔ پیلو۔ کوسی کانہرا۔ نائیکی کانہرا۔ میاں کا سارنگ سگھرئی۔ سدھ سارنگ۔ بروا۔ ساونت سارنگ۔ سری رنجنی۔ لنکدھن

مرقومۂ بالا راگوں کے علاوہ بھی بیسوں راگ گائے جاتے ہیں۔ ان کی سرگم کرکے دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ کس ٹھاٹھ سے ان کا تعلق ہے۔ یا اگر کسی راگ کا ٹھاٹھ معلوم ہوجائے تو راگ کے سروں کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ انہی دس ٹھاٹھوں سے سب راگ نکلے ہیں اسلئے یہی صحیح اور اصولی تقسیم ہے اور یہی سسٹم ہندوستانی سنگیت میں آجکل مروج ہے۔

ہندوستانی موسیقی میں کہانیوں اور روایتوں کو بہت دخل ہے، اتنا کہ روایت پرستی نے ہمارے ملک میں ایک مقدس فریضے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اور روایات و توہمات جزو عقیدہ ہوگئے ہیں۔ دراصل شاعری کی طرح موسیقی میں بھی مبالغہ ایک صنعت ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ موسیقی ایک نہایت موثر فن ہے۔ انسان تو خیر اشرف المخلوقات ہے، جانور تک اسکے اثر سے مست و مسحور ہوجاتے ہیں۔ عرب میں جب کارواں روانہ ہوتے ہیں تو بدو ایک قسم کا گیت گاتے ہیں جسے حُدی کہتے ہیں۔ اسکے اثر سے اونٹوں کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور وہ بغیر تھکے منزل پر منزل مارتے چلے جاتے ہیں۔ یا دور کیوں جایئے آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ کالا زہریلا ناگ سپیرے کی پونگی پر کیسا جھومتا رہتا ہے۔ انسانی طبائع پر موسیقی کا اس سے بھی زیادہ اثر ہوتا ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے "جن جذبات" دل کے اظہار سے زبان و الفاظ عاجز رہ جاتے ہیں ان کو نغمہ اپنے سروں، اپنی لے اور اپنے زمزموں سے ادا کرتا ہے۔ اور ایسی خوبی سے ادا کرتا ہے کہ نفس انسانی اس پر عاشق ہوجاتا ہے اور روح میں عجیب رقت و نرمی پیدا ہوجاتی ہے"

مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا کسے نہیں آتا گانا انسانی سرشت میں داخل ہے۔ کسی میں یہ صلاحیت بالکل بیکار پڑی رہ جاتی ہے اور کوئی اسے بقدرِ ذوق بڑھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے کلاونت ہوجاتا ہے۔ موسیقی کی اثر انگیزی سے کون انکار کرسکتا ہے؟ — روح کی راحت اور قلب کے سکون کے لئے موسیقی کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف نے راگوں کی تاثیروں کو ان کی انتہائی اکمل صورت میں تصور کرکے عجیب عجیب روایتوں کا ترکہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ مثلاً پرانی تقسیم کے چھ راگوں کے اثرات یوں بیان کئے ہیں۔

(۱) بھیروں راگ کے گانے سے بغیر کسی کی اعانت کے کولھو خود بخود چلنے لگتا تھا۔
(۲) مالکوس کے گانے سے بہتا ہوا پانی رُک جاتا تھا۔ اندھیرے میں روشنی ہوجاتی تھی۔ (۳) ہنڈول کے گانے سے جھولا از خود جنبش میں آجاتا اور لالہ وگل سرسبز ہوتے تھے۔ (۴) دیپک کے گانے سے آگ لگ جاتی تھی اور چراغ خود بخود روشن ہوجاتے تھے۔ (۵) سری راگ کے گانے سے وحش وطیور اور انسان تک مبہوت ہوجاتے تھے اور آندھی سیاہ آجاتی تھی۔ (۶) میگھ کے گانے سے مینہ برسنے لگتا تھا۔

ان کے علاوہ بعض اور راگنیوں کے بھی عجیب وغریب اثرات بتائے گئے ہیں، مثلاً سوہنی گانے سے مینہ برسنا بند ہوجاتا تھا۔ ٹوڈی گانے سے ہوا چلنی بند ہوجاتی تھی۔ سارنگ گانے سے حیوان اور انسان پریشان وحیران بلکہ سکتہ اور محویت میں ہوجاتے تھے۔ زیلف گانے سے سوکھے ہوئے درختوں میں سبز پتے پھوٹ آتے تھے اور مردہ دل سے مردہ دل انسان کی طبیعت بشاش ہوجاتی تھی۔ پوربی کے گانے سے پتھر موم ہوجاتے تھے۔

سائنس اور عقلیات کے موجودہ ترقی یافتہ دور میں یہ سب باتیں مبالغہ آمیز حکایتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاثیر کے سلسلے میں اتنا ضرور دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر انسانوں پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ کوئی تڑپ اٹھتا ہے۔ کوئی سر دھننے لگتا ہے اور کسی پر رقت طاری ہوجاتی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ ایسی حالت طاری ہوجاتی ہے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجاتی ہے۔ ہمارے فنکاروں کا سچا امتیاز مذہب اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ راگوں میں وہی تاثیریں ہیں جن کا مذکور ہوچکا ہے۔ لیکن اب اس وجہ سے اثر نہیں رہا کہ اس فن میں لالچ اور دنیا داری داخل ہوگئی۔ اگلے تائک اس علم کو عبادت کرتے تھے اور اس میں ان کا انہماک اور کمال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ سحر واعجاز کے کرشمے ان سے صادر ہوتے تھے۔ اب طلبِ زر اور نفسانیت کا دخل ہوگیا ہے۔ نہ تو وہ اگلی سی ریاضت ہے اور نہ خلوصِ نیت۔ وہ اثر ہو تو کیونکر؟

(باقی)

غزل —— ضیا فتح آبادی

دامِ خیال کے لئے وسعتِ کائنات ہے
کون ومکاں پہ حکمراں میں ہوں، مری حیات ہے

لے کے چراغِ بیخودی، صبحِ نشاط کر تلاش
دسترسِ خودی سے دُور حسنِ ازل کی ذات ہے

چھیڑ ترانۂ امید، قلبِ فسُردہ جھنجھوڑ دے
کھوئی ہوئی سی یاس میں محفلِ شش جہات ہے

غم سے نجات کیا ملے، غم جو نہیں تو کچھ نہیں
دل کی تڑپ حقیقتاً حاصلِ کائنات ہے

نورِ حیات تجھ سے ہے، کیفِ حیات تجھ سے ہے
دن ہے نہ دن ترے بغیر اور نہ رات رات ہے

درسِ جنوں ہے گمرہی، خضر کی بات پر نہ جا
موت قیام کا ہے نام اور سفر حیات ہے

چاندنے جگمگا دیا، شمع نے گنگنا دیا
عشق نہیں تو زندگی ایک اندھیری رات ہے

حسن فریبِ ذوقِ دید، عشق طلسمِ سوزِ قلب
حسن نہیں ہے پائدار، عشق بھی بے ثبات ہے

گوشۂ ذہن میں ترے، میرا کہیں نشاں نہیں
یاد ہے تو مگر مجھے اب بھی، عجیب بات ہے

شادی وغم سے اے ضیاؔ، کوئی اثر نہ لیجئے
نور فشاں ہے دن کہیں، تیرگی بیز رات ہے

غزل —— شفیع منصور

پھر وہ کاشانۂ غمہائے کہن یاد آیا
دلِ آسودۂ غربت کو وطن یاد آیا

آج پھر بلبلِ بیکس کو باندازِ دگر
آشیاں جس میں جلا تھا، وہ چمن یاد آیا

جو مجھے بھول گیا دردِ محبت دے کر
پھر وہی چارہ گرِ رنج ومحن یاد آیا

در و دیوار کی صورت نہ رہی گو افسوس
میں وطن میں کبھی پہنچا تو وطن یاد آیا

ایک فریادِ مجسم تھا وہ ہنگامِ وداع!
عشقِ مجبور کا اندازِ سخن یاد آیا

یاد آیا دلِ منصور کو پھر جادۂ شوق
پھر وہ اک سلسلۂ دار ورسن یاد آیا

دو غزلیں

ادیب مالیگانوی

غمِ دل اب اتنا بھی بڑھتا نہ جائے
وہ دیکھیں مجھے اور دیکھا نہ جائے

جسے خوف ہو میری دیوانگی سے
وہ خود آئے، اور آکے سمجھا نہ جائے

چمک جائے تاروں سے پھولوں سی رنگت
مگر دل سے تیری تمنا نہ جائے

سجائی تو ہے انجمن حسرتوں سے
دل اس "انجمن" سے بھی اُکتا نہ جائے

محبت کی مجبوریاں، اللہ اللہ
نظر سے بھی اُن کو پکارا نہ جائے

وہ کشتی جو نکلی ہے طوفاں سے بچکر
کہیں جا کے ساحل سے ٹکرا نہ جائے

زباں چُپ، دل اُمڈا ہوا، گرم آنسو
کہیں ایسے عالم میں تو آنہ جائے

کرم کے فسانے ہیں اُن کی زباں پر
ہنسی، مجکو بے ساختہ آ نہ جائے

ادیب اس جوانی کا قائل نہیں ہیں
فرشتوں کا دل جس سے تھرا نہ جائے

غم کیا؟ مری خوشی بھی جو ناکام ہو چکی
تیری خوشی تو، گردشِ ایام ہو چکی

کیا ظلم ہے کہ اُن کی خوشی کے ساتھ ساتھ
اُن کی نگاہِ ناز بھی بدنام ہو چکی

دل "زخم آشنا" ہے ترے التفات کا
اب مجھ سے سعیِ راحتِ آلام ہو چکی

اب اے زبانِ عشق، کوئی تازہ واردات
دنیا تمام منکرِ الہام ہو چکی

اے دل، رہینِ خوابِ تمنا کہاں تلک
کم بخت، اب تو ہوش میں آ شام ہو چکی

دل ہے کہ ہر شکست پہ ہوتا ہے مشتعل
سو بار سرنگوں ہوسِ خام ہو چکی

جس زندگی کو ناز تھا، تیری پناہ کا
وہ زندگی بھی خیر سے ناکام ہو چکی

مجھ سے نہ پوچھ، میری تباہی کی داستاں
آنکھیں اِدھر کھلی تھیں، اُدھر شام ہو چکی

اُٹھ جاؤ لیکے اپنا "مذاقِ نظر" ادیب
وہ بزمِ خاص، انجمنِ عام ہو چکی

درجة کی نئی

گاڑیاں تیسرے درجے

کا ایک عام نظارہ ان
کے تیسرے درجوں کے
موجودہ درجوں سے
ک سو تیس مربع فٹ
ہ دیکتی ہے۔ اس سے
کو بھی آرام ملے گا اور
ں کے واسطے بھی زیادہ
گہ نکل آتی ہے۔ ←
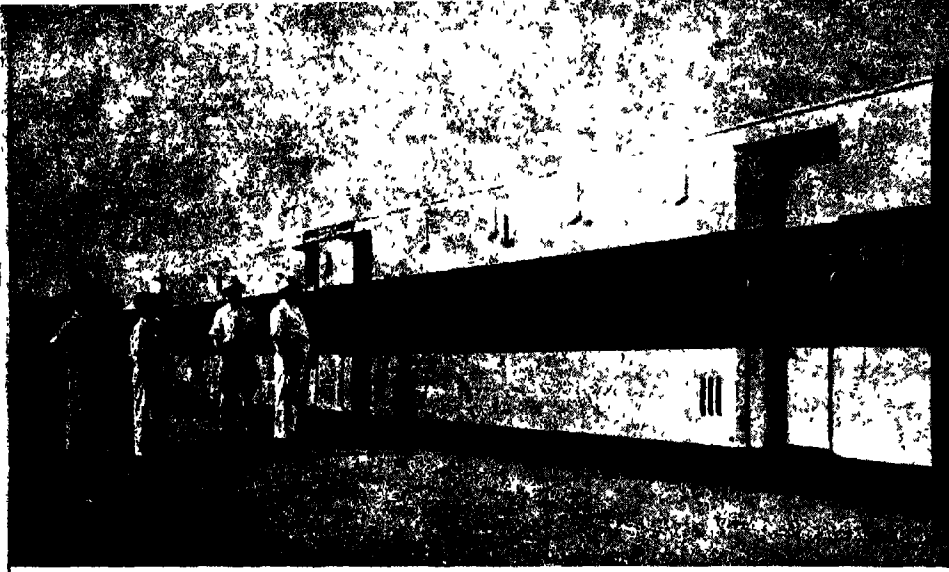
« ہندوستان ایئر کرافٹ لمیٹیڈ »
بنگلور کی بنائی ہوئی تیسرے
درجہ کی ایک نئی گاڑی۔ ان نئی
گاڑیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے
کہ انکے کواڑ اندر کی طرف
کھلتے ہیں اور پکڑنے کے ڈنڈے
بھی اندر ہی کی جانب ہیں۔
اسکی وجہ سے مسافر پائیدانوں
پر سفر نہیں کرسکیں گے ←
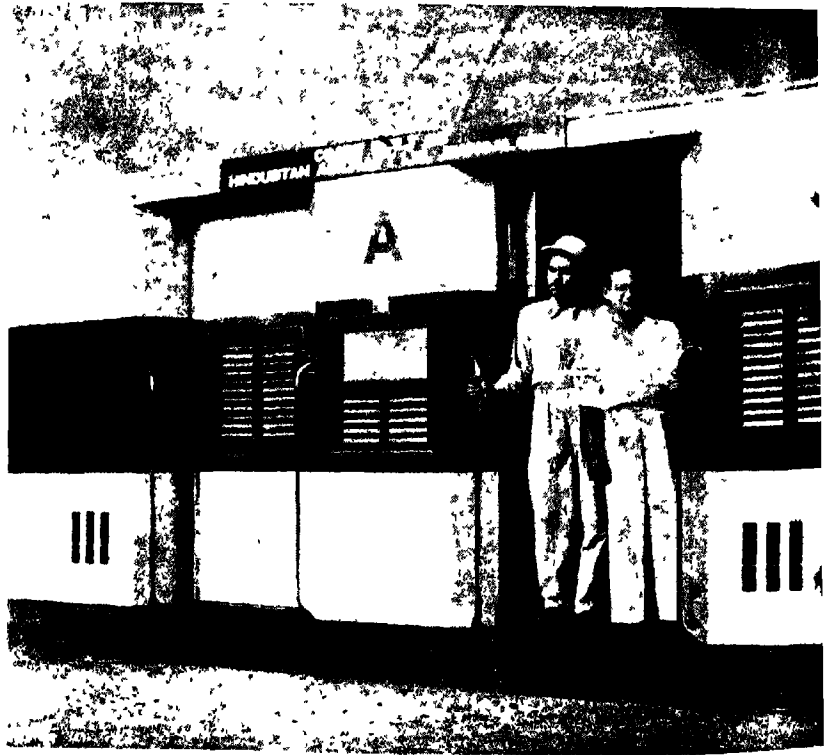
نئی وضع کی ملکی گاڑیوں کا ایک درجہ۔ سیٹیں آرام دہ اور کشادہ ہیں۔
سیٹوں تک جانے اور چلنے پھرنے کے واسطے دو فٹ چوڑا راستہ
چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے مسافروں کو نقل و حرکت میں کوئی
دقت نہ ہوگی۔ ←

چین کے دریائی مکانات

چین ایک عجیب و غریب ملک ہے اسکی تاریخ دلچ
بھی ہے اور غم انگیز بھی۔ گزشتہ چار ہزار سال سے یہ م
طوفان، قحط، بیماری، افلاس اور جنگ کا شکار چلا آرہا ،
'ن مصیبتوں کے باوجود چینی عالم، ادیب اور فنکار خد
خلق، مساوات، اخوت اور بلند اخلاق کا سبق دیتے اور ا
سے اعلی حسین فن پارے دنیا کے سامنے پیش کرتے ر
ہیں۔ میدان جنگ میں بھی یہ لوگ ہیٹے نہیں رہے ہیں۔ ؛
حملہ آور غنیم کو پسپا کردیا یا پھر رفتہ رفتہ اسکو اپنے ا
جذب کرلیا۔ ملک بہت وسیع ہے لیکن یہاں کی آبادی کی
ہمیشہ نا کافی رہاہے اسی لئے انہوں نے خشکی کے علاوہ ا
بڑے بڑے دریاؤں میں بھی رہنے سہنے کے مستقل مکا
بنا ڈالے مکان کیا ہیں بڑی بڑی کشتیاں ہیں جن ،
ضروریات کا سب سامان موجود رہتا ہے پرل دریا میں
قسم کے مکانات سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔
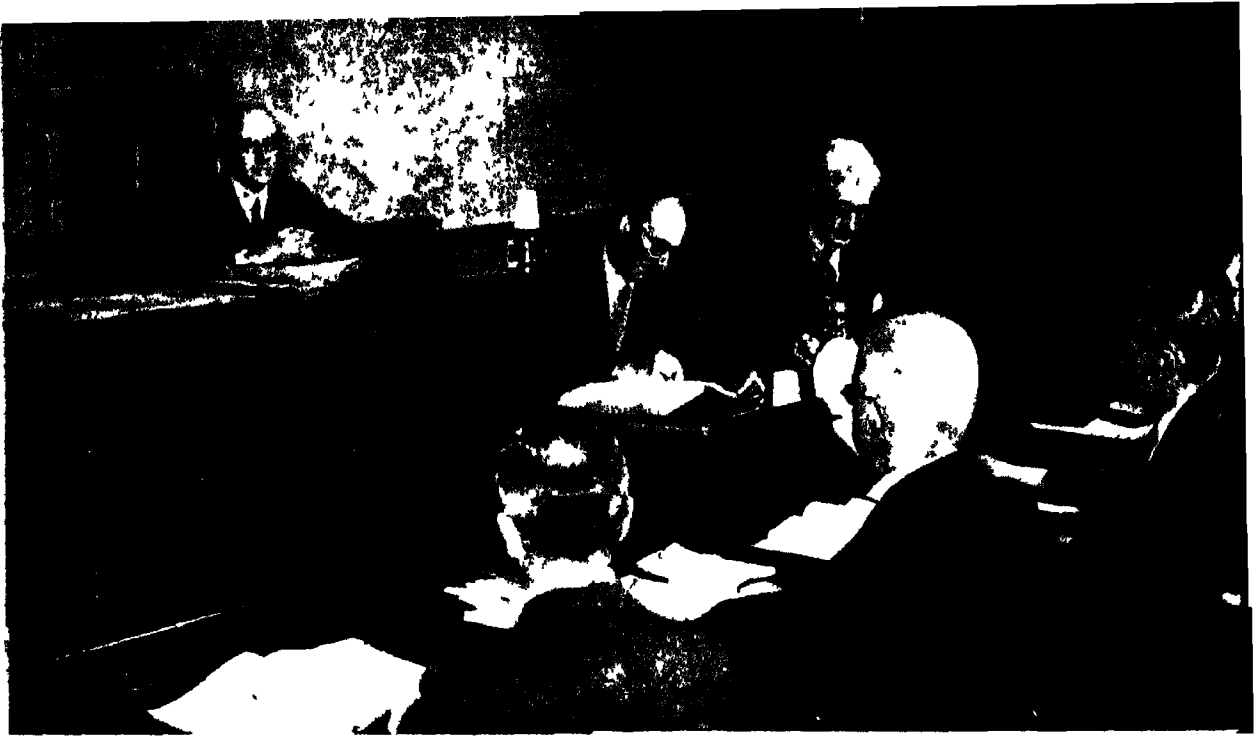
کے 'پیٹنٹ آفس' کا عدالتی کمرہ۔ معترضین اپنے دعوے اسی عدالت میں دائر کرتے ہیں اور فریقین کے بیانات وغیرہ بھی سنے جاتے ہیں۔ اس عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل عدالت عالیہ میں ہو سکتی ہے۔

پیٹنٹ آفس کا محافظخانہ۔ ۱۸۵۵ء سے لےکر اب تک جو جو چیز پیٹنٹ کی جا چکی ہیں انکی مکمل یاد داشت یہاں موجود ہے ا بہت تھوڑی سی رقم کی ادائیگی پر جو چاہے دیکھ سکتا ہے۔

ایجادات کا تحفظ

جب کوئی انجینئر یا سائنسدان کوئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے ی ایجاد سے تجارتی منافع اٹھانا چاہتا ہے تو وہ سب سے پہلا کرتا ہے کہ اپنے ملک کے پیٹنٹ آفس میں پیٹنٹ حاصل کی درخواست دیتا ہے۔ درخواست پہونچنے پر یہ دفتر ی تحقیقات کرتا ہے اور جب یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی اسی شخص کی ایجاد ہے اور اس سے پہلے اسی چیز کوئی اور شخص پیٹنٹ حاصل نہیں کرچکا ہے تو درخواست ، کو پیٹنٹ دیدیا جاتا ہے۔

لندن کا پیٹنٹ آفس فلیٹ اسٹریٹ اور عدالتوں کے قریب ہی " طور پر پیٹنٹ کی مدت سولہ سال ہوتی ہے لیکن اگر کوئی عرصہ میں کافی رقم پیدا نہیں کر سکتا تو اس مدت میں ؛ ر دی جاتی ہے۔

بحرین کے تیل کے کارخانے کا ایک حصہ جہاں تیل صاف کیا جاتا ہے۔

بحرین میں تیل صاف کرنے کے کارخانے

مشرق وسطےٰ کے بہت سے ملک تیل کی وجہ سے بڑے خوشحال اور دولتمند بنے ہوئے ہیں۔ انہی ملکوں میں بحرین بھی ہے۔ بحرین کی سالانہ آمدنی کا اکثر حصہ تیل ہی سے وصول ہوتا ہے۔ بحرین کا رقبہ تقریباً دوسو مربع میل ہے اور اسکی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ اتنے چھوٹے سے ملک کی ایک سال کی آمدنی کا (صرف تیل سے) چھبیس لاکھ روپیہ ہونا ایک غیر معمولی بات ہے۔ تیل روزانہ کی زندگی ہی میں کافی اہمیت کا حامل ہے مگر جدید طرز کی جنگ نے تو اسکی اہمیت میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیا۔

شیخ البحرین نے ۱۹۳۰ء میں ' بحرین پیٹرولیم کمپنی ' کو تیل نکالنے کا ٹھیکہ دیا تھا لیکن ۱۹۳۲ء میں تیل برآمد ہوا۔ بحرین کی اکثر آبادی عربوں کی ہے۔ ان عربوں کے تعلقات ۱۹۲۰ء سے حکومت ہند کے ساتھ بڑے خوشگوار چلے آئے ہیں۔ بہت قدیم زمانے سے یہ جزیرہ موتیوں کے لئے مشہور چلا آتا ہے۔ یہاں ماہی گیری کے اڈے بھی بہت اچھے ہیں۔

تیل کی برآمد کے بعد سے موتیوں کا کاروبار ٹھنڈا پڑگیا۔ جنگ کے زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے بازار موتیوں کیلئے بند رہے اسلئے اب سب سے اہم تجارت تیل ہی کی ہے ' بحرین پیٹرولیم کمپنی ' جسکے پاس بحرین کے تیل کا ٹھیکہ ہے' کیلیفورنیا کی ' اسٹینڈرڈ آئل کمپنی ' اور ٹکساز کارپوریشن ' ہی کی ایک شاخ ہے گو پیٹرول سب سے زیادہ مقدار میں برآمد ہوتا ہے اور اسکی برآمد کی سالانہ مقدار چار لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہے لیکن مٹی کا تیل' ایندھن کے کام آنے والا تیل اور چکنا کرنے کا تیل بھی دستیاب ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانہ کے ایک سال میں یہاں سے سات لاکھ سے زیادہ پیٹرول کی برآمد ہوئی۔ اتحادیوں کی امداد کے سلسلہ میں بحرین کی یہ امداد بڑی قابل قدر ہے۔

مخصوص جغرافیائی محل وقوع' عمدہ بندرگاہوں اور ہوائی اور آبی جہازوں کے اچھے ٹھکانوں کی وجہ سے بحرین یورپ اور ہندوستان کے درمیانی ہوائی راستہ پر ایک اہم حیثیت کا مالک ہے۔

کالکر تیل کو یہاں جمع کیا جاتا ہے۔ ان برتنوں کی سمائی بہت زیادہ ہے
ہاے سے سدرگاہ سیترانک ان ہی بڑے بڑے ٹنکوں کے ذریعہ لےجایا جاتا ہے۔

یہاں بھی کارخانہ میں کام کرنے والوں کے مکانات ہیں۔ یہ مکان
بہت اچھی طرز کے بنائے گئے ہیں۔

کے مکانات۔ تیل کے میدانوں اور کارخانوں میں شدید آب و
جہ سے کام کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے اسلئے کمیروں کو وہی
سہں کا ہر طرح کا آرام پہونچایا جاتا ہے۔

قطب مینار

دھلی صدھا سال تک ھندو راجاؤں اور مسلمان بادشاھوں کی پایۂ تخت رہ چکی ھے اسلئے یہاں بیشمار تاریخی عمارتیں اتنک موجود ھیں۔ ان میں قطب مینار کو خاص اھمیت حاصل ھے۔ اسکی تعمیر کو تقریباً سات سو سال گزر چکے ھیں اور اس دوران میں اس نے زمانہ کے سینکڑوں انقلاب دیکھے ھیں۔ یہ مینارہ قطب الدین ایبک کا بنایا ھوا ھے۔ اسکی پانچ منزلیں ھیں کل اونچائی ۲۳۸ فٹ ھے اور اوپر تک پہونچنے کیلئے زینہ ھے جو بالائی حصہ میں زیادہ تنگ ھوگیا ھے، پھر بھی شوقین لوگ سب سے اوپر کی چوٹی تک پہونچ ھی جاتے ھیں۔ جس ملک کے بھی سیاح یہاں آئے انھوں نے اس مینار کے بنانے والوں کی مہارت اور کمال کی داد ضرور دی۔
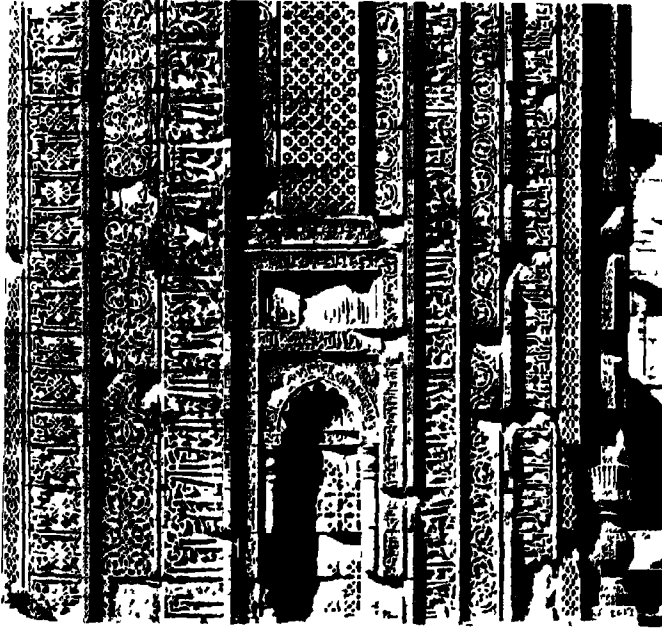
سلطان التمش کی مسجد کی دیواروں پر آیات قرآنی۔ ظاھر ھے کہ پتھر میں ان آیات کو کندہ کرنے میں کتنی دقت ھوئی ھوگی اور وہ سنگتراش جنھوں نے یہ ریزہ کاری کی ھے اپنے فن کے کیسے ماھر ھونگے۔
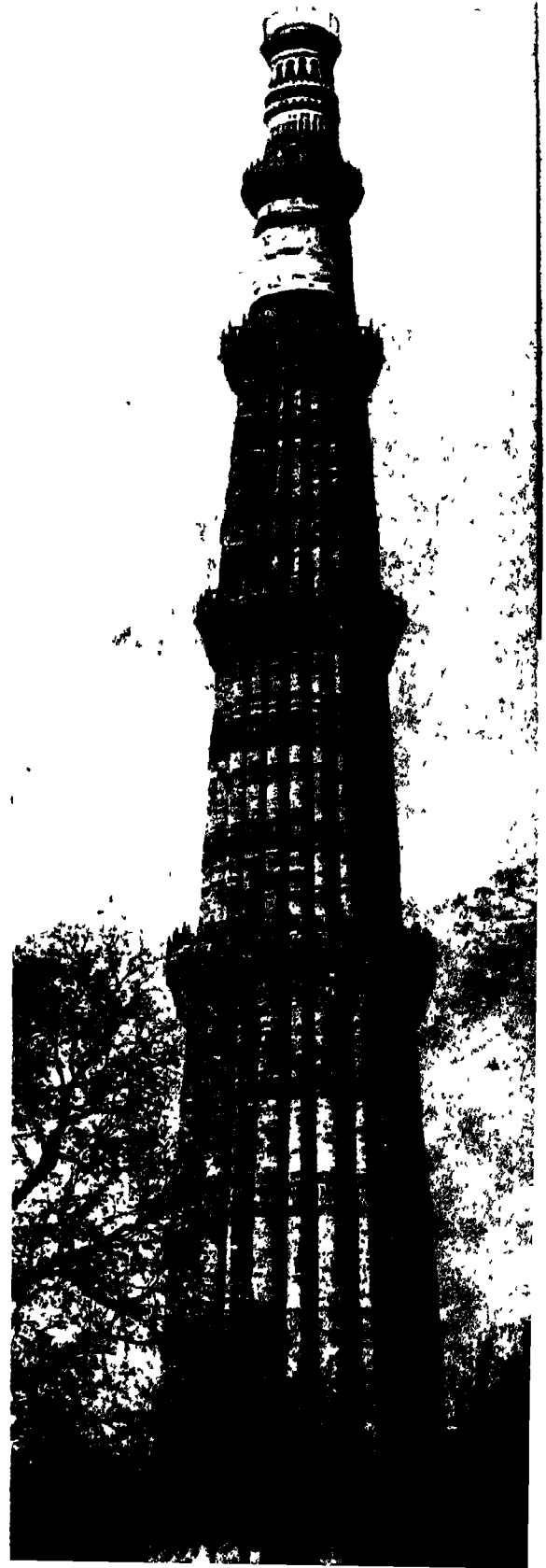
اصل حالت پر بہت سے مدارج طے کرکے پہونچتا ہے۔ انڈے سے نکل کر یہ خوب کودتا پھاندتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسکا جسم بڑھتا ہے۔ پہلے منہ بہت تنگ ہوتا ہے اور دم بہت لمبی۔ منہ رفتہ رفتہ چوڑا ہوتا جاتا ہے اور دم گھٹنے لگتی ہے۔ ٹانگیں بھی رفتہ رفتہ بڑھتی ہیں۔ ایک پورے طور پر پرورش یافتہ مینڈک چھ انچ لمبا ہوتا ہے اور دس فٹ کی چھلانگ مارسکتا ہے۔ اسکی آواز اس قدر تیز ہوتی ہے کہ پون میل تک سنائی دیتی ہے جس سے سونے والوں کی نیند میں بڑا خلل پڑتا ہے۔

ڈک کے یہ بچے ابھی انڈوں سے نکلے ہیں اور ی نئی دنیا میں خوب کود پھاند رہے ہیں۔ کلے سال سے ان میں جسمانی تبدیلی شروع ہوگی۔

بچہ کا منہ جبتک پورے طور پر چوڑا نہ ہوجائے یہ کچھ کھانے کے قابل نہیں ہوتا اس عرصہ میں یہ اپنی دم کو اندر ہی اندر سٹکتا رہتا ہے۔

ں بچہ کی چھلی ٹانگیں کل آئی ہیں و ابھی اسکے یہ بیکار ہیں کن ایک دن ہی ٹانگیں سکو بے پناہ راک بنا دینگی۔

اس مینڈک کی دم غایب ہوچکی ہے ۔ منہ پورے طور پر چوڑا ہوچکا ہے اور اب یہ ایک نئی دنیا میں پہونچنے والا ہے ۔

مینڈک کی اگلی ٹانگیں کھال کے اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہیں ۔ مکمل ہوجانے کے بعد ایک دم پھوٹ نکلتی ہیں ۔ اس بچہ کی ایک ٹانگ نکل آئی ہے اور دوسری نکلنے والی ہے ۔
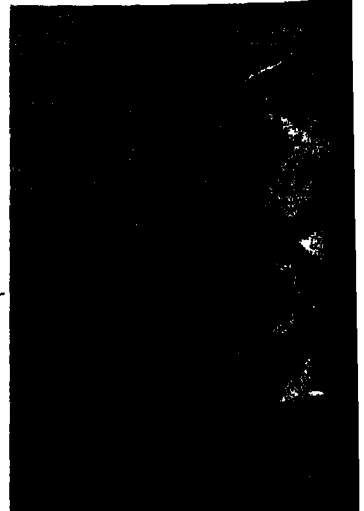
ہر دلعزیز فلمی ستارہ اشوک کمار   فلم «شکاری» میں

اردو غزل گوئی کی نئی کروٹ

ابن الحسن رضوی

۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کے آجکل میں حضرت نظار اصیر پالوی کا مضمون "غزل کا مستقبل میری نظر میں" دیکھ کر میں نے یہ سمجھا تھا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور پروفیسر کلیم الدین احمد کے "صنف غزل" پر پیہم حملوں سے جو غزل کے طرفداروں میں ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کا ازالہ صاحب مضمون نے اس طرح کرنا چاہا ہے کہ اس کے مستقبل کا ایک روشن خاکہ پیش کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اگرچہ موجودہ غزل "نیم وحشیانہ صنف شاعری" کا الزام ہے لیکن اس میں وہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کو بروئے کار لا کر غزل کو اصناف سخن میں ایک خاص جگہ دی جا سکتی ہے۔ مضمون کو پڑھنے کے بعد میرا خیال ایک حد تک صحیح نکلا۔ حضرت پالوی نے ایک مختصر تمہید میں جس میں علاوہ ڈاکٹر عندلیب اور میرزا ناصر علی کے مقولے شامل ہیں یہ فرمایا ہے کہ "ہندی شاعری کو تمام دنیا کی شاعری میں محمود و ممتاز درجہ ملنے کی محض وجہ یہ تھی کہ...... اس میں جذبات محبت عورت کی طرف سے اور عورت کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اس میں مخاطب شوق مرد بلکہ شوہر ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ یہ اشعار چار درجہ چوٹیلے، البیلے اور رسیلے ہوتے تھے...... مگر واقعاتی اعتبار سے ان میں ایک نقص باقی رہتا تھا۔ وہ یہ کہ گو اس میں سب کچھ عورت ہی کی طرف سے ہوتا تھا مگر اس کو بیان کرنے والے عبدالرحیم، تلسی داس، بدیاکو، سورداس رسیں اور بہاری لال وغیرہ تھے جو مرد تھے حقیقتاً کوئی عورت نہ تھی اور اس صورت سے گویا ایک جھوٹ بولا جاتا تھا اس لئے کہ مرد نسوانی جذبات کو تمامتر سمجھنے اور بیان کرنے سے قدرتاً مجبور ہے اور شاید اسی وجہ سے ایسی شاعری کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔" اس تمہید کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "اس میں شک نہیں کہ بیانیہ اسباب جن کی بنا پر یہ حکم کہ اردو غزل میں جو کمی و کوتاہی محسوس کی گئی ہے وہ غلط نہیں مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ نے جو نئی کروٹ لی ہے اس کے پیش نظر اب اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ اردو زبان کی حیات میں غزل کو موت آجائے۔" اس لئے کہ وہ نئی کروٹ جو زمانہ نے لی ہے یہ ہے کہ ہندی شاعری کی طرح اردو غزل میں بھی جذبات محبت عورت کی طرف سے عورتوں کی زبان میں بیان کئے جا رہے ہیں اور ایک بڑا نقص جو ہندی شاعری کا یہ تھا کہ بیان کرنیوالے بھی مرد تھے اس کو بھی دور کر دیا گیا ہے اور پڑھی لکھی عورتیں اپنے جذبات اپنی زبان میں بیان کرنے لگی ہیں۔ نتیجہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عورت کی غزل گوئی سے غزل کی دونوں داخلی اور خارجی کوتاہیاں دور ہو گئی ہیں اور غزل کی سچی داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا اور اس صورت میں غزل کا مستقبل تاریک ہوتا کیا معنی پہلے سے بھی زیادہ تابناک ہے۔"

غزل پر جو اعتراضات ہوئے ہیں وہ صرف بیانیہ اسباب کی بنا پر نہیں کئے گئے ہیں بلکہ اصل اعتراض یہ ہے کہ غزل کا قوام اور اس کی ہیئت ترکیبی ایسے عناصر کی رہین منت ہے جو اس کو صنف سخن کے دائرہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ اصناف سخن کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعر کے تخیلی تجربات کے اظہار کے ایسے ذریعے ہوں جن کے ذریعہ شاعر بلا تکلف اظہار خیال کر سکے۔ شاعری نام ہے فطرت کے غائر مطالعہ سے پیدا شدہ تجربات اور ان تجربات کے پیدا کئے ہوئے تاثرات کے مکمل و موزوں بیان کا۔ شاعر کی قوت حاسہ اس کا بلند پرواز تخیل اس کا تیز ادراک اسی عالم رنگ و بو سے رنگین و دلکش تجربات حاصل کرتے ہیں اور جب وہ ان تجربات کو بیان کرتا ہے تو یہ اس کے مختلف اثرات، جذبات اور ان کے مکمل، صاف اور مربوط نقوش کی شکل میں شاعر کے واردات قلبی اور ان کے داخلی اور خارجی مشاہدات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اصناف سخن شاعر کے لئے صرف ذریعہ اظہار ہیں اور غزل بحیثیت ایک صنف سخن کے صرف اسی حالت میں قابل قبول ہو سکتی ہے کہ شاعر کے تجربات کے انکشاف کا ذریعہ ہو۔ لیکن غزل اپنی ہیئت ترکیبی کی وجہ سے اس صلاحیت سے محروم ہے کہ اس میں بلند پایہ اور اعلیٰ قسم کی شاعری کی جا سکے۔ ردیف کی قید سے آزاد ہو کر بھی اعلیٰ قسم کی شاعری ممکن نہیں ہے اس لئے کہ غزل کے اشعار ایک دوسرے سے غیر متعلق اور معناً بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی تجربہ کا مربوط و مکمل بیان بالکل محال ہے۔ یہ کہنا کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل خیال کا اظہار کرتا ہے اس لئے بلند پایہ شاعری کے محاسن کا حامل ہوتا ہے شاعری کی غلط تعریف پر مبنی ہے۔ شاعری کسی ایک خیال کے مکمل اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ مختلف تجربات اور ان سے پیدا شدہ

تاثرات کا مربوط و مکمل بیان ہے۔ اس میں خیال کی ابتدا، وسط اور انتہا کا ہونا از بس ضروری ہے۔ غزل میں سرے سے اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ شاعر کے تخیلی تجربات کے اس طرح اظہار میں مدد دے۔ پالوی صاحب شاعری کے بنیادی اصولوں کے پیش نظر اگر یہ ثابت کر سکتے کہ اردو غزل گوئی نے جو نیا دور شروع کیا ہے اس میں بلند پایہ شاعری ہو سکتی ہے یا ہونے کا امکان ہے تو یہ فرمانا بجا ہوتا کہ "غزل کی سچی داغ بیل اب پڑی ہے"۔ حضرت پالوی صاحب نے غزل کے مستقبل کو تابناک بننے کے لئے صرف دو چیزوں کو ضروری خیال کیا ہے (۱) عورت کی طرف سے اظہار محبت جو ہندی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اور (۲) عورتوں کی زبان میں عورتوں کا اظہار الفت جو اردو غزل کو ہندی شاعری سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن کیا صرف یہ دو خصوصیتیں ہی بلند پایہ اور اعلیٰ شاعری کے لئے ضروری ہیں؟ میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ حضرت پالوی عورت کی جانب سے اظہار محبت کی بنا پر غزل کے مستقبل کو تابناک کہنے پر کیوں مصر ہیں جبکہ شاعری فی نفسہ اس سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہے۔ شاعری میں نہ تو مرد کی طرف سے اظہار الفت کی کوئی اہمیت ہے اور نہ عورت کی جانب سے اظہار محبت کی کوئی وقعت۔ شاعری کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ کون کہتا ہے بلکہ وہ تو یہ دیکھتی ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ شاعری کی وسعت عالمگیر ہے اور یہ زندگی کے براہ راست اور اعلیٰ تجربات اور ان کے صاف و مکمل اظہار سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں عطاء اللہ صاحب کا عورت کی جانب سے اظہار پر خوش ہونا شاعری کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کے برابر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ "غزل کی سچی داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا"۔ اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی میں مردوں کا حصہ اب بالکل نہیں رہا اس لئے کہ غزل کی سچی داغ بیل عورت نے ڈالی اور اس کا موضوع عورت کی طرف سے عورتوں کی زبان میں اظہار محبت رکھا گیا تو ایسی حالت میں اگر مرد غزل کہیں گے تو مندرجہ ذیل صورتیں پیدا ہوں گی اور عطاء اللہ صاحب کے خیال میں سب کی سب ناقص ہوں گی۔

(۱) پہلی صورت تو یہ ہوگی کہ مرد عورتوں کی زبان میں عورتوں کی طرف سے اظہار الفت کریں لیکن یہ صورت عبدالرحیم اور تلسی داس کے اتباع میں ہوگی۔ لہٰذا ایک قسم کا جھوٹ بولا جائے گا۔ اور نیز یہ کہ چونکہ مرد نسوانی جذبات کو تمامتر سمجھنے اور بیان کرنے سے مجبور ہے اس وجہ سے اس میں وہی نقص باقی رہے گا جو ہندی شاعری میں ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مرد اپنے جذبات کا عورتوں کے اتباع میں اظہار کریں۔ یہ صورت اس وقت موجود ہے لیکن پالوی صاحب نے یہ حکم لگا دیا ہے کہ "غزل کی سچی داغ بیل اب پڑی اور اس کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جبکہ عورت نے غزل کہنا شروع کیا۔ لہٰذا مردوں کا اپنے جذبات کا اظہار غزل کے مستقبل کو تاریک بنا دے گا۔ اس لئے کہ اس دور میں غزل کے مستقبل کو صرف عورت ہی تابناک بنا سکتی ہے اور اس کا واحد ذریعہ عورت کا عورت کی زبان میں اظہار محبت ہے۔

(۳) تیسری اور آخری صورت مندرجہ بالا صورتوں سے بھی گئی گزری ہے یعنی یہ کہ مرد شعرائے متقدمین کا اتباع کریں اور اب تک جو کچھ ان لوگوں نے کہی ہے دہرایا کریں لیکن اس صورت میں ان پراگندہ غزلوں کے سرمایہ میں اضافہ کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا جو ان بزرگوں سے ہم لوگوں کو ملا ہے اور جس کی درستگی میں ہماری نوجوان خواتین ہمہ تن مصروف ہو کر غزل کی سچی داغ بیل ڈال رہی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ مردوں کو غزل گوئی ترک کر دینی چاہیئے اس لئے کہ یہ ان کے بس کی بات نہ رہی۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پالوی کے ان منتخب اشعار کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لوں جو انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ پالوی صاحب نے دس غزلیں (لقبیہ پانچ شعر) دس مشہور اور معروف غزل گو خواتین کی پیش کی ہیں اور فرمایا ہے کہ "دیکھئے کہ غزل کا مستقبل جیسا کہ اوروں کا خیال ہے کہ تاریک نظر آتا ہے یا جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں روشن معلوم ہوتا ہے"۔ مجموعی طور پر پچاس اشعار لکھے ہیں جن میں ۳۴ شعر (۵۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے ہیں جو تخلص کے ساتھ بھی مردوں کی طرف منسوب کئے جا سکتے ہیں۔ محترمہ صفیہ شمیم، محترمہ انیس بانو، محترمہ عظمت شمع، محترمہ رابعہ پنہاں، محترمہ صفیہ رعنا، محترمہ سحاب آغا شاعر اور محترمہ ناز کی پوری پوری غزلیں ایسی ہیں جن میں عورت کی جانب سے اظہار محبت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ محترمہ کنیز فاطمہ کاش، محترمہ سیدہ اختر اور محترمہ شانتی بھوشن کی غزلوں میں اگر کسی چیز سے نسوانیت کا اظہار ہوتا ہے تو وہ صرف قافیہ اور ردیف ہے۔ اگر ان تانیثی افعال کو تذکیر افعال سے بدل دیا جائے مثلاً اس شعر کو

کسی کی یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں
حدیث درد محبت سنا رہی ہوں میں

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

حادثہ

افسانہ

قیسی رامپوری

ایک زمانہ میں میری تجارت بڑی ترقی پر تھی لیکن جنگ چھڑنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے شکست پڑ گئی اور مجھے خطرہ لاحق ہونے لگا کہیں بالکل ہی نہ بیٹھ جائے چنانچہ اپنے پھیلے ہوئے سرمایہ کو لے کر کلکتہ چلا گیا بمبئی ابتدائے جنگ میں اطمینان کے قابل جگہ نہ تھی۔ ہر چند مجھے کلکتہ کے مقابلہ میں بمبئی زیادہ پسند ہے کیونکہ وہاں زیادہ اجنبیت سی محسوس نہیں کرتا۔ مگر یہ سرمایہ کا سوال تھا اور جہاں وہ محفوظ رہے وہیں اس کو لیجانے کی ضرورت تھی۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں نے کلکتہ پہنچکر بہت سا ایسا مال خرید لیا جکی چند ہی روز بعد قیمت دوگنی سے زیادہ ہوگئی تھی۔ اس کو بہت معقول منافع کے ساتھ فروخت کر دیا۔ دو چار دفعہ ایسا ہی کیا۔ غرض کلکتہ میں میری تجارت تھوڑے ہی عرصہ بعد جم گئی اور اس کے ساتھ میں بھی جم گیا۔

خدا نے مجھے شروع ہی سے بہت کچھ دیا تھا مگر میں نے ابتدا ہی سے سرمایہ ہی کو سب کچھ نہیں سمجھا تھا۔ میں زکوٰۃ ادا کرکے ہمیشہ سرمایہ کو مستحقین تک پہنچاتا رہا۔ اس کے علاوہ قابل امداد لوگوں اور اداروں کی امداد کا سلسلہ بھی جاری رکھتا اور پھر اپنی خطیر آمدنی سے خود بھی جائز طریقے پر زندگی کا لطف لیتا۔ مشکل یہ ہے کہ سرمایہ اور تقویٰ یکجا ہوکر ہزار مثالوں میں ایک مثال ایسی پیش کرسکتے ہیں کہ انسان جائز اور ناجائز "سرمستیوں" کے خیال کے لئے باہوش رہے۔ سرمایہ کی عطا کی ہوئی قدرت اور اپنے جوان دل کی شورشیں مجھے ترغیب دیتی رہتیں کہ تیری شاندار موٹر کی یہ ملائم گدیاں کیا اس لئے ہیں کہ ہمیشہ یوں ہی ویران رہیں اور تو تنہا تو ہی اس طرح بیٹھا رہے جیسے شاداب چمن کے درمیان کسی درخت کا سوکھا ہوا تنا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ دل اور اس کی امنگوں کا مطالبہ سراسر غلط تھا یا صحیح لیکن اتنا وثوق سے ظاہر کرسکتا ہوں کہ یہ آرزو میرے خون میں تیزی اور جسم میں حرارت سی بڑھا دیتی تھی اور جب یہ حرارت قابو کی حد سے متجاوز ہو جاتی تو دہکتی ہوئی چنگاریوں میں بدل جاتی۔ یہی تو وہ مسئلہ ہے جو دل کی تڑپ اور روح کے جمود کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھ سکتا۔ پھر کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ زندگی احتیاط ہی احتیاط کا نام ہے۔ اصول ہی اصول کے مجموعے کی صورت ہے۔ تقویٰ اور ریاضت ہی سے پُر ہے۔ زندگی میں بے احتیاطیاں بھی ہیں۔ لغزشیں بھی ہیں اور گناہ بھی۔ مگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ان سے اجتناب بہرصورت اچھا ہے۔

اس احساس خوب و زشت نے مجھے سنبھال رکھا تھا اور اگر کسی کا فرادا کو دیکھ کر دل ایک مبہم سی طلب کے بعد صبر کر لیتا تھا تو اس کو بھی میں یہی سمجھتا تھا کہ سنبھلا ہوا ہوں۔ دقت یہ کہ حیات چند روزہ کے سامنے برائیاں دکھلائیاں کچھ اس طرح مخلوط طور پر بکھری ہوئی ہیں کہ ایک کو سمیٹیں تو دوسری بھی انکے ساتھ لگی چلی آتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ چند نیکیاں جمع کرنی چاہی تھیں لیکن یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوا ——— رنج کیا ہوا دل کا خون ہوگیا کیونکہ نیکیاں کم نکلیں اور "پشیمانیاں" زیادہ۔

ایک روز شام کو میں تھکا تھکایا اپنے مکان کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ سڑک سے ہٹ کر میری موٹر کسی قدر تنگ سے بازار سے گذر رہی تھی بھیڑ زیادہ تھی اس لئے میں آہستہ آہستہ موٹر چلا رہا تھا۔ ایک مقام پر تو آکر مجھے رک جانا پڑا۔ عین سڑک پر لوگ اس طرح حلقہ بنائے کھڑے تھے جیسے مداری کا تماشہ دیکھ رہے ہوں۔ میں نے ایک دو منٹ تک تو انتظار کیا جب دیکھا کہ راہ نہیں ملتی تو تماشا دیکھنے خود بھی تماشائیوں میں جا کھڑا ہوا۔

تماشا تو کچھ نہ تھا ہاں ایک لڑکی سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر اینٹھے ہوئے تھے، آنکھیں بند تھیں اور منہ سے کف جاری تھا۔ لوگ اسکے ارد گرد کھڑے تماشا تو دیکھ رہے تھے اور اپنی زبان میں اظہار افسوس تو کر رہے تھے لیکن کسی کو اتنی توفیق نہ تھی کہ اس کو سنبھالتا اور اٹھاکر آرام سے محفوظ سی جگہ میں لٹا دیتا۔ وہی احتیاط کا معاملہ سامنے آجاتا ہے۔ عورت ہمارے ہاں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ویسے ہی ہماری شاعری و ادب میں بسی ہوئی ہے، ہماری جلوت و خلوت اس سے آباد ہے ہمارا آرٹ اور فلمی لائن اس سے چمک رہی ہے مگر ہماری انسانی ہمدردی سونی ہے جب اس کو ہماری ضرورت پڑتی ہے تو ہم اس کو ہاتھ لگانے میں جھجکتے ہیں اور دور سے کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

بے ہوش لڑکی کو اس کی ہی ہم عمر لڑکی نے سنبھال رکھا تھا اور وہ غریب گھبرا گھبرا کر ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ دونوں کی کتابیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ قیاس ہوتا تھا کہ اسکول یا کالج سے آرہی ہوں گی کہ ایک پر کسی مرض کا دورہ پڑ گیا، شاید مرگی، شاید ہسٹریا اور اب عالم بے کسی میں تماشا بنی ہوئی یہاں پڑی ہے۔ تماشائیوں کی بے رحم آنکھیں کس طرح اس مبتلائے کرب جوان جسم کو دیکھ رہی تھیں۔ ان بیحیا آنکھوں میں مردانہ غیرت نہیں رہی تھی، ان ہوس کار سینوں میں تہور سو چکا تھا ورنہ کوئی بات نہ تھی کہ اتنی دیر تک ایک جوان لڑکی شاہراہ عام پر تماشا بنی پڑی رہتی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں بھی تقریباً انہی اصولوں کا مارا ہوا ایک انسان تھا جن کا یہ مجمع شکار تھا۔ غیر عورت کے جسم کو چھونا میرے لئے بھی باعث شرم تھا۔ رسوائی کا سبب تھا مگر میں ذرا بے باک تھا۔ جب دیکھا کہ کوئی اس غریب لڑکی کو سنبھالنے کے لئے نہیں بڑھتا تو میں مجمع کو ہٹا

اور آگے بڑھ کر بے خوفی کے ساتھ اس کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ لاش کی طرح میرے ہاتھوں میں لٹک رہی تھی اور اس کا کف بھرا منہ میرے کوٹ میں گھسا ہوا تھا جب میں نے اس حجاب کو توڑ دیا تو اور بھی چند لوگوں کو ہوش آگیا۔ وہ بھی ذرا بے حجاب ہوئے اور بے ہوش لڑکی کے "حجابات" کو میری آغوش میں اس کی سہیلی سے سنبھالنے لگے میں نے حقارت سے ان کی اس ہمدردی کو دیکھا اور اس کی سہیلی کو ساتھ لے کر اپنی موٹر میں آبیٹھا۔ اس کے بعد مجمع نے مجھے اس طرح راستہ دے دیا گویا یہ خدا کی موٹر تھی اور بھیڑ کو فرشتوں نے چیر کر راستہ دیا تھا۔

سب سے پہلے میں اپنے ایک شناسا ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس کو ہمراہ لے کر دوسری لڑکی کی رہبری پر مریضہ کے مکان پر پہنچا۔ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا مکان تھا جس میں امارت کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ لیکن افلاس بھی چھپایا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے موٹر کا دروازہ کھولا۔ سہیلی بھاگی ہوئی مریضہ کی ماں کو بلانے گئی اور میں مریضہ کو ہاتھوں میں سنبھالے ایک پلنگ کی طرف لے گیا۔

جب اس کی ماں آئی تو اس نے اپنی بچی کی حالت کو دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ چند منٹ بعد باپ بھی آگیا اور وہ بھی سخت پریشان ہوا۔ میں نے جلد جلد ڈاکٹر سے درخواست کی کہ لڑکی کی علالت سے اس کے والدین کو اپنی زبان میں باخبر کر دے اور اس کی جانب سے ذرا ان کو اطمینان بھی دلا دے۔ ڈاکٹر نے اپنا فرض ادا کیا۔

ڈاکٹر ہوشیار تھا۔ اس کی کوششوں سے لڑکی کو تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا اور حالت بھی کسی قدر درست ہوگئی۔ ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں کا اضطراب ابھی بدستور تھا۔ باپ اب ذرا مطمئن تھا۔ اس نے بڑی لجاجت سے میرا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت چائے پان سے ہماری تواضع میں لگ گیا۔ اپنی بچی کی حالت کو درست پاکر ذرا وقفہ کے بعد ماں کے بھی حواس درست ہوئے اور منت پذیری کے اظہار میں مجھے اس نے اپنے بچہ کی طرح پیار کیا۔ اس کو شکریہ کے الفاظ نہیں مل رہے تھے صرف آنکھوں سے احسان کے آنسو جاری تھے۔

"اب آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی بچی جلد اچھی ہو جائے گی" میں نے صاف اردو میں اس سے کہا۔

"کیا اس سے پہلے بھی آپ کی لڑکی پر کبھی ایسا ہی دورہ پڑا ہے؟" ڈاکٹر نے اپنی زبان میں اس سے دریافت کیا۔

"ہاں دو سال ہوئے جب اس کی یہی حالت ہوگئی تھی پھر تین چار مہینے ہوئے ایک ہلکا سا دورہ اور پڑا تھا" اس کی ماں نے کہا۔

"علاج جاری رکھئے اور اگر ممکن ہو تو جلد اس کی کہیں شادی کر دیجئے یہ ہسٹریا کے آثار ہیں مرگی نہیں ہے۔ ابھی بالکل آغاز ہے اگر مرض زور پکڑ گیا تو مشکل ہو جائے گی" ڈاکٹر نے کہا۔

شادی کا نام سن کر بڑھیا نے ایک دھیمی سی آہ بھری، اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو میز پر چائے کا سامان چن رہا تھا۔ پھر اپنے مکان کی بے سر و سامانی پر نظر ڈال کر چپ ہوگئی۔

"یہ ڈاکٹر صاحب روزانہ آپ کے مکان پہ آتے رہیں گے اور جب تک یہ خود علیحدہ نہ ہو جائیں ان کا علاج جاری رکھئے۔ خرچ کی پرواہ نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب میرے دوست ہیں" میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ مریضہ کو ہوش آئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب اس کی حالت بھی درست تھی اس کی سہیلی پیار سے اس پر جھکی ہوئی تھی اور دونوں جوان لڑکیاں چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں جن میں کچھ مسکراہٹیں اور کبھی کبھی ضعیف سی ہنسی کی آواز بھی شامل تھی۔

مریض لڑکی مجھ سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے دوسری پیالی پیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، اس کی طرف کیا دیکھا حقیقتاً اب اس کو دیکھا ایک زعفرانی رنگ کی نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ افسانوں کی تمام لڑکیاں خوبصورت ہوتی ہیں مگر یہ تو حادثہ کی ایک حسین دوشیزہ تھی جس کی کوئلے کی طرح سیاہ سیاہ بڑی بڑی آنکھیں منت پذیری کے جذبہ کے ساتھ میری جانب نگراں تھیں۔

میں نے ایک پیالی میں چائے لوٹی اور اس کے پاس لے جاکر انگریزی میں کہا "یہ اس حادثہ کی یاد میں جس کو آپ بھول جائیں تو جلد اچھی ہو جائیں اور اگر میں بھول گیا تو میرے لئے یہ ایک اور حادثہ ہوگا" اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پیالی لینے کو اپنا خوبصورت ہاتھ بڑھا دیا لیکن پیچھے سے ڈاکٹر کی ڈانٹ سنائی دی۔

"ہیں ہیں۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ چائے نہ پلا دینا ان کو۔ چلے بڑے ڈاکٹر بن کر!" یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ سے پیالی جھپٹ لی۔

"یہ دوسرا حادثہ ہے مگر افسوس ناتمام" حسینہ نے ہنس کر کہا۔ اپنی بچی کو ہنستا دیکھ کر ماں بھی خوش خوش ہمارے قریب آگئی۔ تھوڑی دیر اور بیٹھ کر ہم یہاں سے چل دئے۔

مکان پہنچ کر کاروبار میں میں نے اس واقعہ کو بھلا دینا چاہا، مگر وہ صاف ستھرا غریب گھر۔ وہ محبت کرنے والے احسانمند والدین اور آخر میں (بلکہ سب سے پہلے) وہ حسین بیمار جسم ایک لمحہ کے لئے میرے حافظہ سے نہ نکلا۔ میری زندگی کی تنی ہوئی چادر کے درمیان ایک وزن آپڑا تھا

بس نے اس میں جھول ڈال دیا - وہ لڑکی، وہ اس کی حسین آنکھیں، اور وہ اس کی میرے دل میں پیدا کی ہوئی قیامت ——— اثار اچھے نہ تھے تار کی کس کو فکر ہے - یہاں تو جو چیز مار ڈالتی ہے وہ اختلافات ہیں - زبان کا اختلاف، تہذیب کا اختلاف، عقائد کا اختلاف حتیٰ کہ صوبہ کا اختلاف - کس میں ہمت ہے کہ ان کو مٹائے اگر یہ مٹ سکتے ہیں تو صرف پیار سے اور پیار کرنا اب انسان کا شیوہ نہیں رہا - میں خود ——— خود میرے اندر جرأت نہ تھی کہ اپنے پیار کا اعلان کر سکتا - میں اس لڑکی کو پیار کرنے لگا تھا -

پانچ چھ بار مزاج پرسی کے سلسلہ میں جو میں اس کے مکان پر گیا تو اس کو پیار کرنے لگا - شاید غلط ہے پہلے ہی روز سے پیار شروع ہو گیا تھا جس نے کسی سامنے پھیلے ہوئے اختلاف کی پرواہ نہ کی - ایسے پیار بعض آنے والی مصیبتوں کے پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں - مگر میں پیار اور پیار ہمیشہ پیار ہے -

اس گھرانے میں آنے جانے کی وجہ سے میں کافی بے تکلف ہو گیا تھا - اس کے والدین مجھ سے محبت کرتے تھے اور اپنا تمام دکھ درد بیان کر دیا کرتے تھے - ان کی آمدنی کے ذرائع بہت محدود تھے جن کا زیادہ حصہ لڑکی کی تعلیم پر صرف ہو رہا تھا کیونکہ اگر کملا کو جلد شوہر مل سکتا تھا تو دولت تعلیم اور موسیقی کے ذریعہ ہی مل سکتا تھا تعلیم اس کی اچھی تھی - موسیقی میں اس کو خاص دستگاہ تھی ہاں دولت کی کمی تھی بہت کمی، بلکہ اس کا نشان تک نہ تھا - یہ بنگال کی رسم تھی - ایک لڑکی کو اس وقت تک اچھا شوہر میسر نہیں آسکتا جب تک شادی میں تاوان کے طور پر دینے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہ ہو - تعلیم و موسیقی بھی نہایت ضروری چیز سمجھی جاتی ہے -

"کملا اب کب تک ہوگی تمہاری شادی؟" میں اس سے دریافت کرتا -

"جب کوئی دوسرا حادثہ ہوگا"، وہ شرما کر شوخی سے کہتی - اور پھر مجھے مطمئن نظروں سے دیکھنے لگتی - جو اذیتیں جن دی گئی ہیں وہ کہیں اس کے ہنس بول لینے سے گر سکتی تھیں -

تین چار ماہ بعد کملا پر پھر ہلکا سا دورہ ہسٹریا کا پڑا پھر اس کے والدین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور پھر ڈاکٹر نے آکر وہی فتویٰ دیا کہ اس کی شادی جلد ہو جانی چاہئے - بے شک جلد ہو جانی چاہئے میں نے بھی کلیجہ تھام کر اس کی تائید کی -

ایک دولتمند مجسٹریٹ کے لڑکے سے کملا کے والدین اپنی لڑکی کے معاملہ کو طے کرنے کا ارادہ کر چکے تھے مگر جہیز کے لئے روپیہ فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ڈھیل پڑی ہوئی تھی - ادھر کملا کے مرض کے پیہم دورے اور ڈاکٹروں کے فتوے اصرار کئے جا رہے تھے کہ اس عزیز جان کی سلامتی کے لئے جلد اس کو کسی دولت مند قصاب کے سپرد کر دیا جائے -

میرے لئے محبت کی بے چارگی کا وہ مقام وقت سے پہلے آگیا جہاں قدیم خودکشی کا تصور ہی اس جنجال سے رستگاری دلاتا ہے - یہ خودکشی جان کی نہ ہوگی بلکہ اپنی تمام ہستی کی ہوگی جس میں انسان زندہ تو بچا تا ہے مگر احساس زندگی سے خالی ہو کر -

میں نے ایک مہینے کے بعد کملا کے والدین کو اس کے جہیز کے لئے بیس ہزار روپے دیدئے - وہ میرے قدموں پر گر پڑے - میرے اس عطیہ میں سپاس و احسان کا شائبہ تک نہ تھا - میں اپنی روح کا علاج کر رہا تھا - مجھے اپنی جان کا علاج مقصود نہ تھا اور میرا معالج مجسٹریٹ کا بیٹا تھا جس کو بالاتفاق سوسائٹی نے تجویز کیا تھا -

کملا کو جو معلوم ہوا کہ میں نے اس کو اپنے سے جدا کرنے کو بیس ہزار روپیہ اس کے والدین کو دیا ہے تو وہ پر شکوہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر خفا ہو گئی - یہ اس کی غلطی تھی - ہمارے اختلافات اس کی بیماری کو کبھی اچھا نہیں ہونے دیتے - ایک پیار درمیان میں موجود تھا جو دونوں کو مار دیتا تا اور پیار ہی پیار میں مر جاتا اب اس عالم اسباب میں یہ پرانی سی چیز ہو گئی ہے - یوں مرنے کو اب بھی محبت میں جی چاہتا ہے بلکہ مر ہی جاتے ہیں مگر وہ ایسی ہی خودکشی ہوتی ہے جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں -

آج میں غور کرتا ہوں تو کملا کی بیہوشی کا تماشا دیکھنے والے ان تمام لوگوں کو اپنی بے حسی میں حق بجانب پاتا ہوں - نفرت، احتیاط اور گریز بعض اوقات آنے والی مصیبتوں سے انسان کو بچا لیتے ہیں مگر کیا مصیبتوں سے گریز کرنا آدمیت ہے؟ بالخصوص پیار کی مصیبتوں سے!

اردو غزل گوئی کی نئی کروٹ: ——— بقیہ صفحہ ۳۶

اگر اس طرح پڑھا جائے

کسی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں میں
حدیث درد محبت سنا رہا ہوں میں

تو یہ غزلیں بھی مردوں کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں - پالوی صاحب نے اشعار کے انتخاب کے وقت شاید اپنے دعوے کو پیش نظر نہیں رکھا ورنہ کاوش سے اشعار منتخب کرتے -

آخر میں حضرت پالوی سے گذارش ہے کہ وہ غزل میں تبدیلی وغیرہ کا خیال چھوڑ کر اس کی کوشش کریں کہ اردو شعراء غزلوں سے کنارہ کش ہو جائیں اس لئے کہ یہ وہ صنف سخن ہے جو اعلیٰ شاعری کے لئے بالکل فضول، لغو اور مہمل ہے -

فتح یورپ کے بعد پہلا موسم سرما

جنگ بیکار اور امن و عافیت کی بابت سینکڑوں پیشین گوئیاں کی جاتی رہیں اور جن حالات کا پہلے سے اظہار کیا گیا، وہ اب رونما ہو رہے ہیں۔ منہدم شہر مواصلات کے ٹوٹے ہوئے رشتے اور ان اشیا کی عالمگیر کمی جن پر روزمرہ کی زندگی کا انحصار ہے، یہ سب باتیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ لیکن کم سے کم دو اہم اعتبارات سے حقیقت اتنی ہولناک نہیں ہے جتنی کہ تباہی آئی تھی۔ اول جرمن شہروں کی تباہی کو لیجئے ہر چند اتنی تباہ کن ہوائی بمباری پہلے کبھی نہیں ہوئی تاہم مادی نقصانات کا اندازہ وہ نہیں ہے جس کا قیاس لگایا گیا تھا۔ کوئلے کی کانیں تقریباً ٹھیک حالت میں ہیں اور تمام یورپ کو مجموعی حیثیت سے لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ بہت سے صنعتی کارخانے تباہ ہونے سے بچے رہے یا جلدی ہی مرمت ہو جانے کے لائق ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی اٹلی کے کارخانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں جرمن دستوں کے یکلخت ہٹ جانے سے متوقع لڑائی بالکل نہیں ہوئی۔ یہی بات فرانس اور ان بیشتر ممالک کے کارخانوں کیلئے صادق آسکتی ہے جن کے علاقوں میں رہ کر جرمنوں نے اتحادی حملوں کو برداشت کیا تھا۔ یا جن پر اتحادیوں نے بمباری نہیں کی یا جن کو خود جرمنوں نے تباہ و برباد نہیں کیا۔ ڈنمارک اور ناروے کے صنعتی اداروں کا بھی یہی حال رہا۔ دوم اشیائے ضرورت خصوصاً اشیائے خوراک کی کمی کے اعداد و شمار کو لیجئے۔ وہ پیشین گوئی کے مطابق ایسے زیادہ ہولناک نہیں رہے ہیں۔

اسوقت تقریباً ہر چیز کمیاب ہے لیکن صحیح اعداد و شمار کا لحاظ رکھتے ہوئے حساب لگایا جائے تو ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ گیہوں وغیرہ کی مقدار اناج پیدا کرنے والے ملکوں میں اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اس کو کسی غلط طریقے سے خصوصاً مویشیوں کو کھلا کر ضائع نہ کیا جائے تو انسانی ضرورتیں اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اہل یورپ کے لئے گوشت کمیاب بلکہ بالکل نایاب ہے لیکن ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں اس کی مقدار امریکہ میں بے قیاس ہے۔ اگر یورپ میں چقندر سے کھانڈ بنانے والے کارخانوں کو حسب ضرورت کوئلہ مل جائے تو گنے کی اس شکر کے ساتھ مل کر جو باہر سے منگائی جا سکتی ہے سب کی احتیاج پوری کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد حمل و نقل کا اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ لڑائی کے دوران میں مال کے جہازوں کی سخت کمی رہی۔

لیکن غیر متوقع طور پر جب جاپان کا خاتمہ بہت جلد ہو گیا تو سینکڑوں جہاز جو فوجی سامان بحرالکاہل کے پار لیجانے کے لئے مصروف عمل تھے، دوسرے کاموں میں لگا دئے گئے۔ حقیقتاً اب مال کے جہازوں کی بالکل کمی نہیں ہے بلکہ مسافر جہاز ہر وقت ان فوجیوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں جو لڑائی ختم ہونے کے باعث چھٹی جا رہے ہوں یا جنکو واپس وطن بھیجا جا رہا ہو۔ مشرق بعید کی لڑائی ختم ہو جانے سے فوجیوں کا محفوظ ذخیرۂ خوراک، کمبل کپڑے، پیٹرول اور دوائیں وغیرہ بچ گئیں جنکی اب انہیں ضرورت نہیں رہی تھی۔

بحالت موجودہ یورپ کے مختلف ملکوں میں معیار اغذیہ کا اندازہ لگانا بہت ہی دشوار ہے، ایک عام طریقہ یہ ہے کہ ہر شہری کو سرکاری طور پر خوراک کی مقررہ مقدار دی جائے اور اس کی غذائی ماہیت کو اس کی حرارت عزیزی کے اعتبار سے ظاہر کیا جائے۔ خوراک کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہونی چاہیئے کہ وہ جسم انسانی کی اس حرارت میں اضافہ کرے۔ ایسی حرارت کے ایک درجے کو انگریزی زبان میں ایک کیلوری کہتے ہیں۔ ایک نوجوان کے لئے جو معتدل آب و ہوا میں سیدھی سادی زندگی بسر کر رہا ہو روزانہ دو ہزار چارسو کیلوریز کافی ہو سکتی ہیں۔ محنت شاقہ کرنے والوں کے لئے اسکی تعداد چار ہزار تک ہو سکتی ہے۔

اکتوبر کے آخر میں مغربی یورپ کے ایک عام شہری کی روزمرہ کی خوراک میں کیلوریز کا معیار حسب ذیل تھا۔

فرانس میں دو ہزار، بلجیم اور ہالینڈ میں تقریباً دو ہزار دوسو ناروے میں دو ہزار چار سو، ڈنمارک میں تین ہزار اور برطانیہ میں دو ہزار آٹھ سو اور دو ہزار نوسو کے درمیان۔ گذشتہ سرما کے بعد سے ان معیاروں میں قدرے اضافہ ہوا ہے لیکن ان ملکوں میں سے جن پر جرمنی کا تسلط رہا صرف ڈنمارک کا معیار وہ ہو گیا جو جنگ سے پہلے تھا۔

اگرچہ تعمیر نو کا کام بڑی تیزی کے ساتھ شروع کیا گیا تاہم اس خطے میں سب سے زیادہ بد قسمت ہالینڈ رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ملک کے بیشتر افراد کو شدید ترین قسم کا قحط برداشت کرنے کے چند مہینے بعد ہی موسم سرما کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ تقریباً تمام اشیائے خوراک کا

شانتا رانی

سخت قسم کی کوئی چیز کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ چور بازاری کے انسداد کے لئے بڑی احتیاط برتی گئی ہے اور ملک کے لوگ جو کچھ عرصے پہلے اپنی اشیائے خوراک کو کپڑوں اور زیوروں سے بدل لیتے تھے ایسی بے سود تجارت سے باز رہنے لگے۔ راشن میں ہر شہری کو صرف اتنی روٹی مل جاتی ہے جس سے گذارہ ہو سکے اور اگرچہ خوراک کی بہت سی قسمیں رائج ہیں مگر مقررہ مقدار بہت ہی کم ہے۔ مثلاً ہر ہفتے ڈھائی چھٹانک کے قریب گوشت ملتا ہے۔

بلجیم میں شکم پری کا معیار ہالینڈ سے زیادہ بلند ہے۔ تازہ ترکاریوں کی طرح بہت سی چیزیں راشن کے علاوہ عام دکانوں سے بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا ان گھٹیا قسم کے اہلکاروں کو کرنا پڑ رہا ہے جو بنکوں یا تجارتی اداروں میں معمولی محرر ہیں یا جنگو پنشن کی قلیل رقم ملتی ہے۔ بلجیم میں ایک اور اہم بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ بچوں میں تپدق کا مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

پیرس اور آس پاس کے بڑے شہروں میں زندگی کسیقدر سدھر گئی ہے۔ چھوٹے بچوں کے سوا دوسرے لوگوں کو سیّال دودھ نہیں مل سکتا تاہم راشن کارڈ پیش کرنے پر تھوڑا بہت گوشت دستیاب ہو سکتا ہے۔ خالص قہوہ جو فرانس کے گھرانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے، قلیل مقدار میں ملنے لگا ہے تاہم کوکو اب بھی نایاب ہے اور صرف بچوں کے لئے تھوڑے سے چاکلیٹ مل جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں عام ضروریات کی چیزیں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتیں، اشیائے خوراک سے بدل لی جاتی ہیں۔ راشن کی دقت زیادہ تر شہریوں کے لئے ہے۔ دیہات والے مزے کرتے ہیں بلکہ ان کے شہری دوست اور رشتہ دار بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

انسان کے جسم میں اگر حرارتِ غریزی کی کمی ہو تو سردی کی سہار مشکل سے ہو سکتی ہے۔ مغربی یورپ میں نہ تو موسمی اثرات سے بناہ ملتی ہے نہ پہننے کے لئے گرم کپڑے۔ لباس کا راشن بہت ہی قلیل مقدار میں ہے اور مشکل یہ کہ چور بازار سے کچھ نہیں مل سکتا۔ اس سلسلے میں بھی غریب لوگ زیادہ مصیبت میں گرفتار ہیں کیونکہ ان کے لباس ناکافی ہونے کے ساتھ ساتھ بوسیدہ حال ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ہالینڈ کو لیجیے مشہور بات ہے کہ وہاں کے لوگ سب سے زیادہ صاف ستھرا اور اچھا لباس پہنتے ہیں۔ لیکن اس وقت بچوں کا یہ عالم ہے کہ وہ سینما گھروں میں غلیظ چیتھڑے پہن کر جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ملک میں بھی پڑوس والوں کی طرح صابن نایاب ہے۔ اسی سبب سے متوسط درجہ کے گھرانوں میں بھی جوؤں اور پسوؤں کی بہتات ہو گئی ہے اور نتیجہ کے طور پر لوگ خارش کے مرض میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

یورپ میں کوئلے کا بھی سخت کال ہے اور اگرچہ مغربی یورپ کی حالت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہتر ہے تاہم روشنی کرنے اور آگ جلانے یا گرمائی کرنے کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں۔ ہالینڈ میں خانگی کاموں کے لئے کوئلے کی مقدار صرف اتنی ملتی ہے کہ اس سے سارے دن چولھا گرم نہیں رہ سکتا۔ فرانس کے بعض اضلاع میں حالت زیادہ خراب ہے۔ اکثر شہروں میں تقریباً دس من کوئلہ تین آدمیوں کو جاڑے بھر کے لئے دیا جاتا ہے۔ گیس اور بجلی پر سختی کے ساتھ پابندی ہے کہ وہ کھانا پکانے یا روشنی کرنے کے سوا کسی اور کام میں نہ لائی جائیں۔

کوئلہ نہ ہونے کے باعث صنعتی کارخانے بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئلہ موجود ہے لیکن کوئلہ نکالنے والے مفقود۔ اس لئے زیادہ مقدار برآمد نہیں ہو سکتی۔ اس پر طرہ یہ کہ ذرائع حمل ونقل میں رخنے پڑ گئے ہیں مثلاً سڑکیں شکستہ حالت میں ہیں، پل ٹوٹ گئے ہیں، انجنوں اور گاڑیوں کی کمی ہے اور لاریوں کی تعداد برائے نام ہے۔

اب تک ان ملکوں کا ذکر ہوا ہے جنھوں نے اپنی فلاح وبہبود اور حفظ وامان کے لئے خود کوشش کی ہے۔ انجمن تنظیم ورفاہِ مشترک نے اشد ضرورت کی محض چند چیزیں فراہم کر کے انکی مدد کی ہے۔ جنوبی اور مشرقی یورپ کی تمام حکومتیں جو انجمن تنظیم ورفاہِ مشترک کی مستحق تھیں، اس سے مدد لیتی رہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خوراک، کپڑے، ادویات، اور لاریوں بلکہ امدادی کارکنوں تک کے سلسلے میں اس پر بھروسہ کئے رہیں۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ انجمن تنظیم ورفاہِ مشترک اپنی خدمات صرف اتحادی ملکوں یا قابل رحم لوگوں تک محدود رکھے۔ اور اگر کبھی اس حد سے آگے بڑھنا ہو تو اپنی کونسل سے اجازت لے نتیجہ یہ کہ اٹلی کو اس انجمن سے ابتک کوئی فائدہ نہ پہونچا سوائے اس کے کہ حاملہ عورتوں اور چھوٹے بچوں کو مدد دی گئی۔ تاہم اس کے بعد کونسل نے منظور کر لیا کہ ۱۹۴۶ء کے شروع سے ہر قسم کی امداد دی جائے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ اس وقت اٹلی کے لوگ بری طرح غربت وافلاس میں پھنسے ہوئے ہیں اور کوئلہ نہ ہونے کے باعث صنعتی ادارے بھی انھیں کسی کام پر نہیں لگا سکتے۔ عام ضروریات زندگی کے علاوہ انھیں کھانے اور کپڑے کی کمی کے باعث سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ بہت سے مکان مسمار ہو گئے ہیں یا ان کی چھتیں ٹپک رہی ہیں اور کھڑکیاں بھی نہیں ہیں۔ بے روزگاری کا مسئلہ ان سب پر بھاری ہے۔ اٹلی لڑائی سے پہلے بھی

اپنی تمام آبادی کا معاشی بار اٹھانے کا اہل نہیں تھا۔ اسی لئے بہت سے باشندے ملک بدر رہتے اور وہاں سے روزی کما کر اپنے وطن والوں کو بھیجتے تھے۔ اب اس بہاؤ کا رخ بدل گیا ہے۔ بہت سے لوگ جو ترک وطن کر گئے تھے اب شمالی افریقہ سے لوٹ رہے ہیں۔ ہزاروں جنگی قیدی بھی رہا ہو کر اپنے گھر جا رہے ہیں۔ کمیٔ خوراک کا خطرہ لاحق ہو چلا ہے۔ دسمبر کے مہینے میں ہفتہ وار راشن تقریبًا ایک سیر دس چھٹانک فی کس تھا۔ گوشت کی فراہمی صرف چور بازار کے ذریعہ ممکن تھی چینی صرف دو چھٹانک ماہانہ مل سکتی تھی تاہم اسے بھی تقریبًا چلیس روپے سیر کے حساب سے چور بازار سے خریدا جا سکتا تھا۔

یونان کے بعض اضلاع میں جہاں ۱۹۴۱ء کے دوران میں جرمن تسلط رہا، مفرصحت اغذیہ پر گزارہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ بارہ مہینے میں انجمن تنظیم و رفاہِ مشترک کے ان ارباب حل و عقد نے جو یونان میں متعین تھے، قحط دور کرنے کی کوشش کی ہیں پہاڑی ملک کے اکثر حصوں میں ریلوں کا نظام بگڑا پڑا ہے۔ پل وغیرہ ٹوٹ چکے ہیں اور لاریوں کا فقدان ہے۔ اس لئے دور افتادہ دیہاتوں میں اسوقت تک کسی قسم کی امداد نہیں پہنچائی جا سکی۔ موسمی بخار جو اس ملک کے باشندوں کے لئے ایک عام مرض رہا ہے، لڑائی کے نتائج کے طور پر اور بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چکا۔ ابتک یونان کے نہ پنپ سکنے کی وجہ سیاسی بھی ہے۔ لڑائی کے بعد سے یونان میں کوئی ایسی طاقتور حکومت قائم نہیں ہو سکی جس کو عوام کا اعتماد حاصل ہو، جو مالیانہ پر قابو پا سکے اور مناسب اقتصادی تدابیر پیش کر سکے چونکہ ملک کا سرکاری نظام ابتر ہے اس لئے بہت سی چیزیں جو انجمن تنظیم و رفاہ مشترک نے بھیجی تھیں، چور بازار میں لے جا کر فروخت کر دی گئیں۔ یوگوسلافیہ میں بھی بعد جنگ کے بعض مسائل یونان کی طرح خراب ہیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے دیہاتوں میں کپڑے کا معاملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی کمی سے قطع نظر

ان تیس لاکھ باشندوں کے پیٹ بھرنے کا سوال زیادہ دشواریاں پیدا کر رہا ہے جو ایڈریاٹک کے علاقے بلکہ اس سے بھی پرے آباد ہیں لنڈرتن ملک رہنے والوں کا پیٹ بھرنے کے لئے اناج کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ ان لوگوں کی نجات انجمن مذکور کی امداد پر منحصر ہے۔

یورپ میں سویت خیالات کے زیر اثر رہنے والے ملکوں اور روس کے ان علاقوں کی بابت جو جرمنوں کے دور تسلط میں نقصان اٹھا رہے بہت کم حالات روشنی میں آسکے ہیں۔ بعض باتوں کا پتہ اب چلنا شروع ہوا ہے۔ رومانیہ اور بلغاریہ کی بابت بھی بہت کم حال معلوم ہو سکا۔ صرف اتنا پتہ چل سکا ہے کہ ان دو ملکوں کے پاس جو لڑائی سے پہلے اشیائے خوراک بھیجنے میں شہرت رکھتے تھے، کوئی فالتو چیز موجود نہیں ہے ہنگری کے میدان زراعتی زرخیزی کے اعتبار سے دنیا بھر کے میدانوں سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ۱۹۴۵ء میں گیہوں کی فصل اتنی ناقص رہی کہ اس سے وہاں کی نصف آبادی کا پیٹ بھرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پچھتر فیصدی مویشی تلف ہو گئے۔ صرف کانوں یا لوہا گلانے والے کارخانوں کے مزدوروں کو چربی میسر آسکتی ہے۔ توفیر زر کے باعث بھی صورت حالات زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ جاڑے کے دوران میں قبضہ کرنے والی روسی فوج نے بھی اپنا بوجھ ہنگری پر ڈال دیا۔ ریلوے لائنوں اور گاڑیوں کی حالت قابل رحم ہے۔ بڈاپیسٹ میں قحط پھیل رہا ہے کیونکہ سامان لے جانے والی کوئی گاڑی اس کے صدر مقام تک نہیں پہونچ سکتی۔ زیکوسلوکیہ میں اگرچہ کھانے کی مقدار قلیل اور کم تقویت بخش ہے اور ذرائع حمل و نقل بھی ٹھیک نہیں ہیں تاہم اسکی حالت پڑوسی ملکوں کے مقابلے میں پھر غنیمت ہے۔ ملک کا وہ حصہ جہاں معیار خوراک سب سے کم ہے، ان جرمنوں سے آباد ہے جو الحاق ز

غزل — مائل نقوی

دل کو ہین آرزدۂ عشق ہی یوں بنا دیا : رنج کو واسطہ دیا، درد کا آسرا دیا
کیوں نہ دعائیں دوں اُسے جس نے کہ دل دکھا دیا : روح تڑپ تڑپ اٹھی درد نے وہ مزا دیا
طے ہوئی یوں رہِ ستم ساتھ تھا عشق کا کرم : رک گئے جس جگہ قدم حوصلہ کچھ بڑھا دیا
جاؤ نگا اُٹھ کے اب کہاں کوئے حریم ناز سے : تیرے قدم کے نقش نے نقش قدم بنا دیا
شکر کے ساتھ لے لیا اُس نے جو غم عطا کیا : اس کا گلہ نہیں کیا، کم دیا، یا سوا دیا
کچھ نہ کی قدرِ آرزو جب یہاں کے روبرو : اب ہوئی میری جستجو خاک میں جب ملا دیا
یہ بھی اسی کا ہے کرم یوں نہ سہی تو یوں سہی : دی نہ اگر دوائے دل، درد تو لا دوا دیا
جوشش عشق کا اثر اب تو ہوا ہے اسقدر : اٹھ گئی جس طرف نظر اس نے نقاب اٹھا دیا

شکر ہو یار کا ادا مائل بے نوا سے کیا
دردِ جگر عطا کیا، نالۂ نارسا دیا

بعد وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ بہت سے افراد کو نکالا جا چکا ہے۔

سب سے زیادہ صدمات اہل پولینڈ کو پہنچے ہیں۔ مشرق و مغرب دونوں طرف سے اس پر آتشناک حملے ہوئے۔ پھر دو مختلف حکومتوں کا تسلط ہو گیا۔ کچھ لوگ مشرقی روس میں بھیجے گئے اور کچھ جرمنی میں۔ ظلم و ستم سہنے کے علاوہ انھیں فاقے کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مشرقی اضلاع تو اب بھی ان کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے ہیں۔ البتہ مغرب میں وہ اپنی حالت سدھار رہے ہیں۔ وہاں کے چند اعداد و شما قابل غور ہیں۔ ستر لاکھ بچوں میں سے ساڑھے چھ لاکھ لازمی طور پر یتیم ہو گئے ہیں۔ پانچ لاکھ کسان گھرانوں کے مکانات لڑائی کے ہاتھوں مسمار ہو چکے ہیں۔ گذشتہ ماہ نومبر کے اندازے کے مطابق ان میں سے تین لاکھ زمین میں غار بنا کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے پاس نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ہے نہ پہننے کو جوتے۔ تاہم اس علاقے میں خوراک کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہیں ہے جتنی کہ قیاس کی گئی تھی۔ کام کاج میں لگا ہوا ہر شخص آسانی کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ حاصل کر سکتا ہے۔

آسٹریا اور خصوصاً جرمنی کے لوگ مذکورہ بالا ملکوں کے لوگوں سے جسمانی طور پر زیادہ طاقتور تھے اس لئے وہ شدید جاڑے کا مقابلہ اچھی طرح کر سکے۔ موسم سرما میں ان کے لئے معیار خوراک کچھ اچھا نہیں رہا تاہم وہ دیہاتوں اور دوسرے ذخیروں سے تھوڑی بہت مقدار لیتے رہے۔ غذا کی کمی کا سب سے زیادہ ناگوار اثر شہر کے بچوں پر پڑا۔ تاہم اتحادیوں کے تعاون سے بہت سے بچوں کو ان کی رضامندی کے مطابق دوسرے مقامات پر بھیج دیا گیا۔ اس سلسلے میں وائنا کی مجلس بلدیہ نے بھی بڑی مدد کی۔ ان بچوں نے سردی کے علاوہ خود جرمنوں اور آسٹریا والوں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ خانگی ضروریات کے لئے ان دونوں ملکوں میں کوئلہ نہیں ہے بعض لوگ دیہاتوں یا بموں سے منہدم عمارتوں سے کچھ لکڑی چن لاتے ہیں اور بس اسی سے کھانا پکاتے اور گھروں کو گرم کرتے ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے صدر مقامات میں لکڑیوں سے لدے پھندے دستی ٹھیلے عموماً نظر آتے ہیں۔

وسطی یورپ میں سردی اور فاقے سے بچنے کی جد و جہد میں ایک ایسی تدبیر اختیار کی جا رہی ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ سرحدوں کو پار کر کے نئے گھروں کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔ اس زبردست نقل و حرکت نے صورتِ حالات کو اور بھی بگاڑ دیا ہے۔ بڑی تعداد میں واپس آئے ہوئے اسیرانِ جنگ اور بے روزگار مزدوروں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ مسٹر ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "لاکھوں خانماں برباد جرمن آوارہ پھر رہے ہیں یا ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

کیونکہ ان کے گھر باقی نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں گھسنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کے لئے دشواریاں پیدا ہو جائیں گی جو نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش میں ہیں۔" اس نئے مرحلے نے بڑا ناگوار اثر پیدا کیا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وسطی یورپ میں قحط اور بیماری وغیرہ کی روک تھام کے لئے جد و جہد ہو رہی ہے، اس میں رخنہ پڑ رہا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جرمن کون ہیں؟ اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیوں بھٹکتے پھر رہے ہیں؟ جب اتحادیوں نے برلن اور مغربی جرمنی پر شدید بمباری شروع کی تو بہت سی شہری آبادی ترک وطن کر کے مشرقی جانب محفوظ علاقوں میں چلی گئی۔ بیمار اور زخمی بھی اسی جانب لے جائے گئے۔ ان میں سے وہ لوگ جو مشرقی پرشیا کی طرف گئے تھے اور جن کو بڑھتی ہوئی سرخ فوج نے مار بھگایا تھا، سقوط المانیہ سے پہلے یا فوراً ہی بعد لوٹ گئے۔ لیکن جو ایسا نہ کر سکے وہ روسی یا پولستانی علاقوں میں پھنس کر رہ گئے۔ تاہم دھمکیوں کے ماتحت انھیں بھی مغربی جانب بھاگ جانا پڑا۔ مغربی جرمنی میں گھسنے کی مجنونانہ کوشش میں ان میں سے بعض لوگوں کو چوری چھپے سرحد پار کرنی پڑی کہیں جنگلوں کے راستے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے، اور کبھی تاریک فضا میں دریاؤں کو تیر کر پار کرتے ہوئے۔ شروع نومبر میں وہ دس ہزار یومیہ کی اوسط سے داخل ہو رہے تھے۔ مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے جرمنوں کو دو اہم قسموں میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اول وہ چالیس لاکھ جرمن جو پہلے اس علاقے میں رہتے تھے جو اب پولستانی کہلاتا ہے اور جن کو وارسائی حکومت نے علاقہ پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ہی ملک بدر کر دیا۔ جرمنوں کی دوسری بڑی نقل و حرکت ہنگری اور زیکوسلوکیہ سے ہوئی (اور تھوڑی تعداد میں رومانیہ سے بھی) کیونکہ جنگ کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں نے فیصلہ کر دیا۔ ان سب کو خارج البلد کر دینے کا جو جرمن نسل سے تھے یا جن کی زبان جرمنی تھی۔ ان میں دہ چالیس لاکھ جرمن شامل تھے جو ان ملکوں میں آباد تھے نیز وہ تیس لاکھ سوڈٹین جرمن بھی جو جرمنی بولتے اور اقلیت کی حیثیت سے زیکوسلوکیہ میں رہتے تھے۔ پوٹسڈم کانفرنس نے پولینڈ، ہنگری، اور زیکوسلوکیہ کی حکومتوں کو پُرزور الفاظ میں کہا کہ ملک سے اخراج کی کارروائی انسانیت کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ اور جب یہ سوال بار بار دارالعوام میں اٹھایا گیا تو ناظم خارجہ نے یہی جواب دیا کہ حکومت برطانیہ ذمہ دار حکومتوں سے متواتر اس امر کی استدعا کر رہی ہے۔ یہ صورت اب بالکل ختم ہو گئی ہے لیکن عارضی ہے۔

ان تمام حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معلوم کرنا قدرتی

باقی صفحہ ۶۴ پر

چند پشتو شاعرات

محمد یعقوب دواشی

یوں تو افغانستان کے بہت سے ادیبوں نے اپنی قومی زبان پشتو کی ادبی تاریخ اور صلاحیت کو اجاگر کرنے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن اس سلسلے میں جس قدر ٹھوس کام کابل یونیورسٹی کے صدر شعبۂ ادبیات اور پشتو اکاڈیمی کے رُوح رواں آقائے عبدالحی حبیبی نے کیا ہے افغانستان کے شاید ہی کسی اور ادیب نے کیا ہو۔ اس نوجوان ادیب نے بہت سے تحقیقی مقالے لکھے اور حال ہی میں دو نادر کتابیں "پختانہ شعرا" (پشتو شعرا) اور "پٹہ خزانہ" (مخفی خزانہ) مفصل حواشی اور ضمیموں کے ساتھ شائع کی ہیں جن میں افغانستان کے پشتو شعرا کے سوانح حیات اور اصناف کلام کے نمونے درج ہیں۔ ان کتابوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پشتو زبان اسلامی دور کے آغاز ہی میں مستقل ادبی حیثیت رکھتی تھی اور اس طویل مدت میں اس زبان کی لغت اور طرز بیان نے بہت سی کروٹیں لی ہیں۔ یہ کتابیں لسانیات اور ادب کی تاریخ میں ایک دلچسپ اضافہ ہیں۔

"پختانہ شعرا" اور "پٹہ خزانہ" میں خاص فرق یہ ہے کہ "پختانہ شعرا" میں کسی شاعرہ کا ذکر نہیں۔ جب کہ "پٹہ خزانہ" میں چھ شاعرات کے سوانح حیات اور ان کے کلام کے نمونے شامل ہیں۔ یہی شاعرات ہمارا موضوع ہیں اور ان کے حالات اور کلام کے نمونے "پٹہ خزانہ" ہی سے ماخوذ ہیں۔ ہمارا مقصود ان کے کلام کے اقدار پر بحث کرنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں "پختون" قوم کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔

"پٹہ خزانہ" قندھار کے غلزئی بادشاہ شاہ حسین[1] ہوتک (جو خود بھی پشتو اور فارسی میں شعر کہتا تھا) کے ایما سے اس کے دربار کے ایک شاعر محمد ہوتک نے ۲۹-۱۷۲۸ء میں لکھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو کوئٹہ کے کاتب محمد عباسی کاسی نے ۱۸۸۵ء میں لکھا تھا ۱۹۴۲ء میں آقائے حبیبی کے ہاتھ لگا جسے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔

اب ہم ان چھ شاعرات کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے قارئین آجکل کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

بی بی نیکبختہ

یہ خاتون موزئی قبیلہ کے سردار شیخ الٰہ داد کی بیٹی شیخ قدم[2] (قدس سرہ) کی زوجہ اور شیخ قاسم[3] سلیمانی (قدس سرہ) کی ماں تھی۔ اس نے ۱۵۶۱ء میں "ارشاد الفقرا" کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی۔ یہ خاتون بڑی عالمہ اور عارفہ تھی اور شیخ امام الدین موزئی کی کتاب "اولیائے افغان" اور نعمت اللہ ہروی کی کتاب "مخزن" میں بھی اس کے علم و عرفان کا ذکر آیا ہے۔ اس کا کلام پند و نصائح سے مملو ہے۔ نمونہ کلام

دَخدائے حق تہ غاړہ کیږدہ	نوری نوری وینا پریږدہ
دنیا پاتہ دھرچا دہ	پہ اخلاص کښې ځنې لیږدہ
څو قوت لری پہ ځان کښ	سر دیار پہ رضا کیږدہ
ځان لہ بدہ خویہ ژغورہ	زړہ پہ ذکر دیار بلیږدہ

دنیا ترک وھہ کہ پوہ یې
دَ بقا پر لوری پښې بږدہ

خدا کے حکم کی اطاعت کر	دوسری باتوں کو چھوڑ
دنیا سب کو چھوڑنی ہے	اسے خلوص کیساتھ چھوڑ
جب تک تن میں جان ہے	مزاج یار کے سامنے سر تسلیم خم کر
خود کو بری عادتوں سے بچا	دلکو ذکر یار کے لئے وقف کر
سمجھ دار ہے تو دنیا کو ترک کر	اور راہ بقا پر چل

۲

نازو توخی

نازو توخی غزنی کے سلطان ملخی توخی کی بیٹی تھی ۱۶۵۰ء میں پیدا ہوئی۔ یہ خاتون بڑی عابدہ، سمجھدار، بہادر اور

---

[1] میرویس خان نے قندہار کو ایرانی حکومت سے آزاد کرایا اور غلزئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے دو بیٹے تھے، شاہ محمود اور شاہ حسین۔ شاہ محمود نے ۱۷۲۲ء میں ایران پر حملہ کرکے سلطان حسین صفوی کو معزول اور خود ایران کا بادشاہ بنا۔ اور شاہ حسین کو قندہار کی سلطنت دے دی شاہ حسین شاعر تھا اور شعرا اور ادبا کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس نے پشاور سے مشہور پشتو شاعر رحمٰن بابا کے دیوان کی نقل منگوائی اور اپنی زیر نگرانی کتابت کرائی۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے قندہار کا محاصرہ کیا۔ تو شاہ حسین نے سال بھر مقاومت کی۔ آخر کار امان مانگی۔ نادر نے اسے قید کرکے ماژندران بھیجدیا۔

[2] شیخ قدم اپنے زمانے کے مشہور عارف تھے۔ سرہند میں فوت اور دفن ہوئے۔ بابر کے ہمعصر تھے۔

[3] شیخ قاسم شیخ قدم کے صاحبزادے تھے ان کے علم و عرفان کا آوازہ نہ صرف افغانستان بلکہ ہندوستان میں بھی تھا۔ اور "غوث الزمان" کہلاتے تھے۔ ان کے اثر و نفوذ سے جہانگیر خائف رہتا تھا۔ آخر کار اس نے انہیں قلعہ چنار میں نظر بند کردیا۔ وہ وہیں فوت اور دفن ہوئے۔ تصنیف :- "تذکرۃ الاولیا"

غربا پرور تھی۔ جب اس کا باپ لڑائی میں مارا گیا اور اس کے بھائی حاجی عادل نے دشمنوں کے خلاف لشکر کشی کی تو اس کی عدم موجودگی میں نازو توخی سلطنت کا کام سنبھالتی رہی۔ جب کوئی قافلہ آتا تو اس کے قیام اور خورد و نوش کا انتظام خود کرتی۔ اس کی شادی شالم خان ہوتک سے ہوئی جس سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا حاجی میرویس خان تھا جس نے ایرانیوں کے اقتدار کا خاتمہ کر کے قندھار میں غلزئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ نازو توخی پشتو میں شعر کہتی تھی اور اس نے دو ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا۔ نمونۂ کلام ؎

سحر کړه د نرګس لیمه لانده
څاڅکي څاڅکي ئې له سترګو څڅیده
ما ویل څه دي ګلبنه ولې ژاړې؟
ده ویل ژوندم دی یوه خوله خندیده

صبح کے وقت نرگس کی آنکھ تر تھی — قطرے اس کی آنکھ سے گر رہے تھے
میں نے پوچھا: حسینہ کیوں رو رہی ہو — کہا: میری زندگی ایک ہنسی کے برابر ہے

—۳—

بی بی زینب | یہ خاتون حاجی میرویس خان کی بیٹی تھی اس نے قرآن، فقہ وغیرہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور فارسی ادب پر بھی کافی عبور تھا۔ اس کا بھائی شاہ حسین امور سلطنت میں ہمیشہ اس سے مشورہ کرتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ جب اس کا بھائی شاہ محمود جس نے ایران فتح کیا اور وہاں غلزئی سلطنت کی بنا ڈالی تھی۔ اصفہان میں مارا گیا تو بی بی زینب نے ایک طویل مرثیہ کہا۔ جس کے چند بند ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ؎

ځوان، ومیره د توری جنګ ته ❖ ولاړ د قام په نام ونګ وته
دښمن له ده په وینو رنګ وونا ❖ په میدان شیرو۔ یا پلنګ وونا
افسوس چه مرګ ده په خوا شو ته
قندهار واړه په ژړا شو ته

وہ جوان تھا، تلوار کا دھنی تھا — قوم کے نام اور آبرو کا ساتھی تھا
اس کے ہاتھ سے دشمن کا خون بہا — میدان جنگ میں شیر تھا یا چیتا
افسوس موت نے اس کو آن دبایا — سارا قندھار رو رہا ہے ....

اصفهان پاته تاج نسکور عالمه ❖ چه شاه محمود شونه په ګور عالمه
ګرلښتون لمر شو، تیاره تور عالمه ❖ راته دښمن به کا پیغور عالمه
چه پاچا لاړ پښتون ګدا شو ته
قندهار واړه په ژړا شو ته

اصفہان رہ گیا، ہمارا تاج سرنگوں ہوا — جب شاہ محمود قبر میں جا سویا۔
پختون قوم کا سورج سیاہ پڑ گیا — اب دشمن طعنہ دے گا۔
کہ بادشاہ مر گیا اور پختون قوم کنگال ہو گئی — سارا قندھار رو رہا ہے ....

هوتکو ژاړئ، محمود شاه څه شو نا؟
پښتنو! ستاسی لوی سپاه څه شو نا؟
له اصفهانه تر فراه څه شو نا؟ ❖ پاچاچه حشمت پناه څه شو نا؟
د پښتنو پر تم فنا شو نا
قندهار واړه په ژړا شو نا

اے ہوتکو! روؤ، شاہ محمود کیا ہوا؟ — اے افغانو! تمہارا لشکر جرار کیا ہوا؟
اصفہان سے فراہ تک کی سلطنت کیا ہوئی؟ — تمہارا حشمت پناہ بادشاہ کیا ہوا؟
پختونوں کی عظمت مٹ گئی۔ — سارا قندھار رو رہا ہے .....

—۴—

حافظ حلیمہ | خوشحال[1] خان خٹک کی بیٹی تھی۔ بٹوں میں رہتی تھی۔ بڑی فاضلہ اور عارفہ تھی۔ ساری عمر تجرد میں گذاری۔ تصوف سے خاص شغف رکھتی تھی۔ حضرت شیخ سعدیؒ لاہوری کی مرید تھی۔ شعر کہتی تھی اور اس کا کلام متصوفانہ ہے۔ نمونۂ کلام

د آشنا په فکر خوشحالی تسانی شوم ❖ نه پوهیږم چه ممتاز که نور جهان شوم
چه مجاز م د ایاز لاړ د زړه نه ❖ سر بلند تر محمود غوندې سلطان شوم
غیر فکر م له زړه نه رابهر شو ❖ په خلیل او په عدو باندې یکسان شوم
"حلیمې" د غماز مکر زیات له حده شو
چه د بیل له یاره نکه په ګمان شوم

دوست کی یاد میں اتنی مسرور ہوں — کہ کبھی خود کو ممتاز سمجھتی ہوں کبھی نور جہاں
جب مجازی ایاز میرے دل سے نکل گیا — تو میں خود کو محمود جیسے بادشاہ سے برتر سمجھنے لگی
جب غیر کا خیال دل سے نکلا — میری نظر میں دوست و دشمن سب برابر ہو گئے
اے حلیمہ مکر غماز حد سے گذر گیا — کہیں تجھے تیرے دوست سے جدا نہ کر دے

—۵—

زرغونہ | یہ خاتون ملا دین محمد کاکڑ کی بیٹی اور پنجوائی میں رہتی تھی۔ باپ سے علوم مروجہ (خاص کر) علم فصاحت) سیکھے۔ نہایت

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

[1] خوشحال خان خٹک (۱۶۱۳ء۔ ۱۶۸۹ء) اورنگ زیب عالمگیر سے ساری عمر برسرپیکار رہا۔ بالآخر تنبہ اور اورنگ زیب نے اسے قلعہ رن تنبھور میں نظربند کر دیا۔ لیکن افغانوں کی مدد سے نکل بھاگا۔ اس نے "ہدایہ فقہ" کا پشتو میں ترجمہ کیا اور کئی اور کتابیں لکھیں۔ پشتو کا مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر تھا۔ اس کا دیوان افغانستان اور سرحدات میں بہت مقبول ہے ❖

تحسین ناشناس

ڈاکٹر تاثیر کے مضمون "اقبال میں تضاد نہیں" کا تجزیہ

"آجکل" مورخہ یکم اپریل ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر تاثیر کا ایک مقالہ "اقبال میں تضاد نہیں" سکش اکبر آبادی کے مضمون "اقبال کے متضاد نظریئے" کے جواب میں چھپا ہے۔ موضوع کی افادیت کے پیش نظر اہل قلم حضرات کی خاموشی نہایت افسوسناک اور حضرت تاثیر کی جرأت قابل داد ہے۔ علیٰ وجہ البصیرت یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے نظریات تضاد و تباین کے حامل نہیں بلکہ ایک مخصوص و مشرح فکر کے آئینہ دار ہیں مگر حیرانی ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے بجائے رفع اعتراضات کے اپنے مضمون میں سکش کے مفروضات کو ہی تسلیم کر لیا۔

ڈاکٹر تاثیر کی سادگی دیکھیے کس معصومانہ انداز میں سکش کا دعویٰ اقبال کے نظریات کا تضاد تسلیم فرماتے ہیں۔ "خدا رحیم بھی ہے اور قہار بھی تو پھر تضاد بیان پر کیا اعتراض ہے جب مظاہر عالم کی بنیاد تضاد پر ہے اگر تضاد ایک حقیقت ہے تو ترجمان حقیقت اقبال ان تضاد بیان کی وجہ سے کیوں نامحمود گردانا جائے۔" (آجکل مورخہ یکم اپریل صفحہ ۱۸) یعنی اقبال کی تضاد بیانی ڈاکٹر تاثیر کے نزدیک مسلم مگر اعتراض صرف اس کے نامحمود گردانے پر ہے۔ صفحہ ۱۸ پر ارشاد ہوتا ہے: سکش صاحب یہاں اقبال کو ہمہ اوست کا مخالف قرار دیتے ہیں اور بعد ازاں موافق بھی اور مخالف بھی۔ کیا یہ تضاد نہیں؟" حضرت تاثیر کی خدمت میں بصد ادب گزارش ہے کہ وہ "کیا یہ تضاد نہیں" کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اگر "کیا یہ تضاد نہیں" کا مشار الیہ سکش اکبر آبادی کا تضاد ہے تو یہ ان کے موضوع سے خارج۔ اس لیے اس کا ثابت کرنا بے معنی۔ کیونکہ سکش کا تضاد ثابت کر دینے سے اقبال کے تضاد کا جواز نہیں نکلتا یا ان کا تضاد رفع نہیں ہو جاتا۔ اور اگر اس "کیا یہ تضاد نہیں" کا مقصود اقبال کے تضاد کو اجاگر کرنا ہے تو یہ حرکت ضرور "نامحمود" گردانی جائے گی۔ ؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ڈاکٹر صاحب خود تسلیم فرماتے ہیں کہ "یہ ہو گئی شاعری اور ہمارا مدعا ہے خالص علمی بحث (صفحہ ۱۸)۔ شاعری کی بھی ایک ہی رہی اور علمی بحث کا نمونہ بھی پیش ہو چکا۔ انھیں اپنی کمزوری کا خود احساس ہے مضمون کے آخری پیرے میں فرماتے ہیں: "مگر چونکہ میری ذاتی دلچسپی محض ادب سے ہے عقلی فلسفہ سے کم اور تصوف سے کمتر۔ مجھے قطعیت کا دعویٰ نہیں نہ مجھے اقبال کے جملہ عقائد سے اتفاق ہے بحث محض تضاد بیانی کی ہے۔ اقبال غلط ہو یا صحیح اس کے نظریات میں بنیادی تضاد نہیں۔ مجھے فقط یہی کہنا تھا۔" یہ ہے ان کی دلیل حصر۔ ظاہر ہے کہ عقلی فلسفہ اور تصوف بھی علم کی ذیل میں آتے ہیں اور جناب تاثیر ان میں بہت ہی کم دلچسپی لیتے ہیں تو پھر یہ خالص علمی بحث کے کیا معنی؟ مظاہر عالم کی بنیاد میں تضاد بھی مانا گیا اور اقبال کو انہی حقائق کا ترجمان بھی۔ مگر یہاں بنیادی تضاد سے انکار بھی ہو رہا ہے۔ آخر یہ کیا مخمصہ ہے؟

اقبال کی تضاد بیانی کے قرار سے قطع نظر یہ اقبال کے جملہ عقائد سے نااتفاقی کیا چیز ہے جبکہ تاثیر صاحب خود اسی مضمون میں حضرت علامہ کو ترجمان حقیقت قرار دے چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ انھیں حقیقت سے بھی کلی اتفاق نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۱۹۔ اپنے جملہ عقائد یا کم از کم اقبال سے اختلافی عقائد ہی گنوا دیے ہوتے۔

ایک اور مفروضہ ملاحظہ فرمائیے۔ "یہ رومی، قونوی، ابن عربی، بایزید، ابن تیمیہ، ابو حنیفہ، عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہم سب قرآن و حدیث کے پیرو تھے اہل اسلام تھے۔ اگر ان کے درمیان بنیادی تضاد تھا تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام تضاد کا منبع ہے؟" گزارش ہے کہ ڈاکٹر تاثیر کے کلیہ کے مطابق اسلام کو تضاد کا منبع ہونا ہی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب تضاد کو حقیقت تسلیم کر چکے اور ان کے نام ظاہر ہے کہ وہ اسلام کو بھی حقیقت مانتے ہوں گے تو پھر اسلام میں تضاد کیونکر نہ ہو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلسفۂ تضاد کی تاثیر ہے۔ خواہ اس فلسفہ کا مقصد کچھ اور ہی کیوں نہ ہو۔ اور سنیے: "بکھری ہوئی کرنوں کو سمیٹ کر ایک نیا آفتاب بناتا ہے" (صفحہ ۱۸) حیرت ہے کہ تاثیر کی شاعری کے صدقے میں اقبال کی حقیقت بھی مجاز ہے اور اقبال کا مجاز بھی حقیقت۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱ پر ان کا فٹ نوٹ: "تشبیہ عام فہم ہے اقبال حقیقت کو کرن نہیں بلکہ ہمہ آفتاب سمجھتا ہے ہمہ آفتاب کو چھوڑئیے غالباً یہ ایں خانہ ہمہ آفتاب کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر تاثیر، اگر علامہ مرحوم آفتاب کو حقیقت حقیقت کو آفتاب مانتے تھے اور کرنوں کو مجاز تو پھر کس طرح بکھری ہوئی کرنوں یعنی بکھرے ہوئے مجاز کو سمیٹ کر ایک نیا آفتاب یا حقیقت

غلام محمد بٹ

بن سکتی ہے ؟ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اقبال میں تضاد بیان نہیں بلکہ اجتماع و تلفیقِ اضداد ہے۔ اس کا بیان تضاد بالذات نہیں بلکہ جامع اضداد ہے بعینہٖ جس طرح جبر و اختیار میں قرآن کا رویہ ہے" (صفحہ ۱۹) تاثیر صاحب کے خیال میں علامہ اقبال کے کلام میں اجتماع اضداد ہے۔ خالص علمی بحث کا دعوٰے فرمانے کے باوجود حضرت تاثیر کسی کلام میں اجتماع اضداد کو صحیح ثابت نہیں کر سکیں گے۔ فلسفہ کا ایک ابتدائی طالب علم بھی یہ جانتا ہوگا کہ اجتماع اضداد محال ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ قرآن کا مسئلہ جبر و اختیار بھی قطعیت کے ساتھ تائید میں پیش کر دیا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ جبر و اختیار کے متعلق علامہ اقبال اور قرآن مجید کا بغور مطالعہ کر لیا ہوتا۔ جبر و اختیار ضدین نہیں ہیں بلکہ مادہ کی ارتقائی حالتوں کے دو نام۔ بقول غالب ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مادہ کی ابعاد ثلاثہ کو ہم نظری طور پر ضدین کہہ لیں تو کہہ لیں مگر عملی طور پر یہ اضداد نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان میں ایک نسبت مرکزی موجود ہے۔

میرا اپنا ایمان ہے کہ اقبال میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ بلکہ ان کے نظریات ایک باقاعدہ اور مربوط فکری نظام کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے خود اقبال کی وحدت فکر کو اپنے ایک مضمون میں جو کہ ۵ ارمئی اور ۱۵ ارجون کے آجکل میں شائع ہو چکا ہے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے لئے میں علامہ کی منظومات سے ان کی نثری تحریروں کا زیادہ ممنون ہوں۔ مگر ڈاکٹر تاثیر ہیں کہ جن کا مدارِ علم صرف منظومات ہیں۔

چند پشتو شاعرات :- بقیہ ص ۴۵

خوش خط اور مشہور شاعرہ تھی۔ ۱۷۹۶ء میں اس نے شیخ سعدیؒ کی بوستان کا پشتو میں منظوم ترجمہ کیا جو مقبول خاص و عام ہوا۔

۶

رابعہ یہ خاتون بابر کی ہمعصر اور قندھار میں رہتی تھی۔ اس نے ایک پورے دیوان کے علاوہ بہت سے متفرق اشعار چھوڑے

نمونۂ کلام ؎

رباعی

آدم ئی خکلی وتہ راستون کڑ ÷ پہ اور دغم ئی سوی لہمون کڑ
دوزخ ئی روغ کہ پر مخ دمخکی ÷ نوم ئی دھغہ، دلتہ بیلتون کڑ

ترجمہ

آدم کو زمین پر اتارا اسے آتش غم میں جھونک دیا
زمین پر دوزخ بنائی اس کا نام فراق رکھا

فتح یورپ کے بعد پہلا موسم سرما — بقیہ صفحہ ۴۳

امر ہے کہ نجات اور خلاصی کی صورت جلدی کیوں پیدا نہیں کی جاتی جبکہ یورپ کی لڑائی کو ختم ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے ؟ آخر یورپ اس جدوجہد کے لئے تیار کیوں نہیں ہے ؟ اسکا آسان جواب صرف یہی ہے کہ ساری دنیا میں سیاسی انتشار پھیلا ہوا ہے۔ پھر فوری نتیجہ کیا رہے گا ؟ سب سے پہلے ملک سے اخراج کی صورت یعنی وہ تدبیر جو سوویت کے زیر اثر ریاستوں نے اختیار کی۔ دوسرے امریکہ کی حکمتِ عملی کہ اس نے فی الحال کچھ عرصے کے لئے یورپ کے معاملات سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا ہے۔ امریکہ میں چینی کے سوا کسی اور چیز پر راشن نہیں ہے۔ وہاں چیزوں کا خرچ نہ صرف یہاں کے ملکوں سے زیادہ ہے بلکہ اس معیار سے بھی بڑھا ہوا ہے جو جنگ سے قبل وہاں قائم تھا تیسرے یہ کہ مشرقی اور مغربی یورپ کے حصے بڑی تیزی سے بٹ رہے ہیں۔ مشرقی یورپ کے زراعتی ممالک روسی اقتدار کے زیر اثر ہیں۔ یہاں کھیتوں کے ساز و سامان اور مویشیوں کو بری طرح ضبط کیا جا رہا ہے اور جاگیروں اور زمینوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہے ہیں جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ زمین میں کاشت اس طرح کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو چوتھے یہ کہ جرمنی اور آسٹریا میں بھی حد بندیاں ہو رہی ہیں اور ابتک ہاں کوئی اعلیٰ نظام حکومت قائم نہیں ہو سکا ہے۔

موت کا جنم

فجی جزیرے کی ایک لوک کہانی

محمود ہاشمی

(۱) برائی کی پہلی انگڑائیاں

ابتدا میں یہ دھرتی نہ تھی۔ بس پانی ہی پانی تھا۔ اور یا وہ نیلا آسمان جو اس پانی پر ذرا سا جھکے ہوئے ہر وقت جھانکتا رہتا تھا۔ اور جس کا نیلا رنگ پانی کے آئینے میں جیسے گھل کر اسے بھی نیلا بنائے رکھتا تھا۔ ان دنوں نہ رات تھی نہ دن۔ نہ سورج تھا نہ چاند اور نہ ستارے۔ بس ایک ہلکی سی مدھم مدھم روشنی تھی جیسے چاند اور سورج کسی بادل کی اوٹ میں آ گئے ہوں۔ اور یہ مدھم سی روشنی چوری چوری کسی نئی سرزمین کی تلاش میں کھوئی کھوئی آوارہ پھر رہی ہو۔

دیوتاؤں نے ان دنوں بلولوتو کی مختصر بستی کو اپنے بسیرے کے لئے چن رکھا تھا۔ بلولوٹو کی یہ بستی آسمان کے اس کنارے پر تھی جہاں آجکل دھرتی اور آکاس ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جہاں کچھ عرصہ سے دیوتاؤں نے سورج کی وہ سیڑھی رکھ چھوڑی ہے۔ جس پر سے ہر صبح وہ ہماری دنیا کو روشن کرنے کے لئے اب نیچے اترتا ہے اور پھر شام کو واپس لوٹ جاتا ہے۔

بولوتو میں اس زمانے میں سارے دیوتا ایک ساتھ رہتے تھے۔ دیوتا مالیوئی جو کہ سب سے بڑا تھا اور اس کے دو بیٹے ابٹالانگا اور تیکی تیکی اور ان کے علاوہ اس کے بھائی تانگالوو۔ ہمیاتا اور لی اولی اور سیکولیو سب کے سب اسی ایک جگہ آباد تھے۔

کہتے ہیں یہ ایک حسین بستی تھی دیوتا یہاں "شجر کلام" کے سائے تلے بیٹھ جاتے۔ آبِ حیات کا چشمہ ابل ابل کر ان کے لئے قہوہ تیار کرتا۔ اور چونکہ پیالہ ایک ہی ہوتا تھا۔ اس لئے "شجر کلام" ان کی باری مقرر کرتا اور وہ چسکیاں لے لے کے اسے پیتے رہتے۔ اور جب قہوے کا یہ دور ختم ہو جاتا تو انہیں ایک گہری نیند گھیر لیتی اور وہ سو جاتے۔ قہوہ پینا اور سو جانا یا کبھی کبھار "شجر کلام" کی دو ایک نصیحت آمیز باتیں سن لینا۔ بس یہی ان کی زندگی تھی۔ اور یہ زندگی جو سونے اور جاگنے کا ایک حسین سپنا تھی۔ خوشیوں کے جادو میں بہتے ہوئے بڑے مزے سے بیت رہی تھی۔ پر اسی زمانے میں ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب سکھ کے اس جھرمٹ میں دکھ کی ایک گھڑی نے چپکے سے آ جنم لیا۔

ایک دن قہوہ پیتے پیتے دیوتاؤں کے سردار مالیوئی نے ایکا ایکی ایک انگڑائی لی۔ اور پھر دور تک پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف خوابناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا "میں تھک گیا ہوں دیوتا۔ میں تھک گیا ہوں"۔ اور پھر ذرا سا رک کے وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "میرے ساتھیو کیا تم اسی کو زندگی سمجھتے ہو۔ مجھے تو زندگی کا یہ چکر بڑا بے معنی نظر آتا ہے۔ قہوہ پیو۔ سو جاؤ، جاگو اور پھر قہوہ پیو"۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سمندر کی اس سطح پر جہاں اس کی کشتی کھڑی تھی نگاہیں جمائے بولا۔ "میرے ملاحو، کھول دو یہ بادبان، اٹھا دو لنگر اور اگر تمہیں زندگی سے ذرا بھی محبت ہے تو آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں جینے کا ڈھنگ سکھا دوں گا۔ میں جینا چاہتا ہوں اور یہ جینا مجھے پسند نہیں"۔

اور اس وقت جب کہ مالیوئی یہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی عزم کی چمک سے بھر رہی تھیں اور سارے دیوتا اس کی طرف ہکا بکا ہو کر دیکھ رہے تھے، فضا میں اس کے بھائی سیکولیو کا طنزیہ قہقہہ گونجا۔ اور اس کی دو آنکھیں جو کہ اس کی دم پر لگی تھیں مضحکہ خیز طور پر ابھرتی ہوئی سی دکھائی دینے لگیں۔ "خوب سردار بھائی۔ بہت خوب۔ مگر آخر جاؤ گے کہاں؟"

"جہاں ہمیں آسرا ملا۔ مگر تم کیوں تلملا رہے ہو؟ تم جاؤ قہوہ پیو اور سو جاؤ۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ لیکن ہاں۔ ذرا اپنی دم کا خیال رکھنا۔ کہیں سوتے میں کوئی شریر اسے چرا نہ لے جائے۔ بھاگ کر اسے پکڑ بھی نہ سکو گے۔ تمہارے نصیب میں ملتا کہاں"۔ اور یہ کہتے کہتے مالیوئی نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے کوئی نفرت بھری چنگاری اس پر پھینک دی ہو۔

اور سیکولیو جیسے اس چنگاری سے بلبلا اٹھا اور چیختے ہوئے کہنے لگا۔ "تو پھر جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور اے کاش! یہ پانی تمہیں کبھی واپس نہ لائیں۔ تم ان کی خوراک بن کے رہو۔ اور یہ دھند بلولوٹو کی بستی کو تمہاری نگاہوں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھپا دے تم یہاں کبھی نہ واپس آ سکو"۔

مالیوئی کے دونوں لڑکے بھی اس سے اس سے کچھ کہنے کیلئے آگے بڑھے مگر انہیں کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کیونکہ عین اسی گھڑی "شجر کلام" کی شاخوں کو جنبش ہوئی اور اس کے پتے اس انداز میں کھڑکھڑ کرنے لگے جیسے اس کی شاخوں کے درمیان کوئی ان جانی ہوا چلنے لگی ہو۔ سارے دیوتاؤں نے چپ چاپ اپنی گردنیں جھکا لیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے اب شجر کلام کچھ کہنے والا ہے۔

اور جلد ہی شجر کلام نے کہا۔ "اے مالیوئی۔ اے دیوتاؤں کے سردار میری سن۔ اور اپنا گھر نہ چھوڑ۔ اگر تو چلا گیا تو برائی کی جھجک دور

ہو جائے گی اور اسے تیرے پاس آنے کا موقع مل جائے گا۔ اور یہ برائی اتنی بڑی ہے اور اتنی گمبھیر کہ اگر میں تجھے سمجھنا چاہوں تو سمجھا نہ سکوں اور اگر تو بھی سمجھنا چاہے تو سمجھ نہ سکے۔"

لیکن ماآیوئی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "آنے دو، برائی اگر یوں آتی ہے تو اسے آنے دو۔ میں نہیں ڈرتا۔ مجھ میں مقابلہ کی ہمت ہے۔" اور پھر اپنی گردن کو زیادہ بلند اور اپنی آواز کو زیادہ اونچا کرتے ہوئے اس نے دیوتاؤں کی طرف دیکھا اور کہا "وہ جو میرے ساتھ آنا چاہتے ہیں آگے بڑھ آئیں۔ اور وہ جو ڈرپوک ہیں ہیکو تیو کے ساتھ یہیں پڑے سڑیں۔" اور اس کے بعد اس نے اپنے قدم آگے بڑھا لئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ذرا دور جانے کے بعد مڑ کے دیوتاؤں کے خاموش اور ساکت ہجوم پر ایک اور نگاہ ڈالی۔ اور ذرا تحکمانہ انداز میں کہا۔ "وہ جو میرے بیٹے ہیں۔ میرے ساتھ آ جائیں۔" اور پھر لہجے کو ذرا نرم کر کے اس نے یہ بھی کہا۔ "اگر میرے بھائی بھی میرے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو آ جائیں۔"

دیوتاؤں کی محفل بدستور خاموش رہی۔ مگر چند ہی لمحوں بعد ان کے درمیان جیسے ایک نعرہ گونجا۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" اور ماآیوئی کے بھائی اور بیٹے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ ہی چند اور دیوتا بھی۔ اسوقت ہیکو تیو غصے سے بے تاب ہو گیا اور اپنی دم کو لپیٹتے، دانتوں کو پیستے، لال بھبھوکا سا ہو کر دوسری جانب چلا گیا۔ اب "شجرِ کلام" کی شاخیں بھی پر اسرار طور پر خاموش ہو گئیں۔ اور یہ گنتی کے چند گنے والے من چلے کسی نئی منزل کی طرف روانہ ہونے کیلئے سمندری کشتی پر سوار ہو گئے۔ مگر کشتی ابھی جنبش کرنے کو تھی کہ ماآیوئی نے دفعتاً ایک نئی سوچ سوچی۔ اس نے اپنے بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہا: "میرے اچھے بھائیو! تم اتر جاؤ اور کچھ دیر اور یہیں ٹھہرو۔ اگر میرے بعد وہ برائی جس کی پیشین گوئی "شجرِ کلام" نے کی ہے آنے لگے تو اسے روک لو۔ مجھے ہیکو تیو کی نیت نیک نہیں معلوم ہوتی۔ کون جانے جب ہم میں یہاں کوئی نہ ہو تو وہی کسی برائی کو بلا لے غصے میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ شجرِ کلام کی شاخیں کاٹ کے وہ اسے اپاہج بھی بنا سکتا ہے اور آبِ حیات کے چشمہ میں کوئی گندگی بھر کے ہمیں ہمیشہ کی کسی لعنت میں بھی گرفتار کر سکتا ہے۔ اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے باز رکھنے کے لئے یہیں رک جاؤ اور اس وقت تک اس کی نگہداری کرو جب تک کہ میں واپس نہ آؤں۔ اور یقین جانو کہ میں جلد ہی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے لوٹوں گا۔ اس وقت

حالات بھی بہتر ہوں گے اور نصیب بھی ہمارا ساتھ دے گا۔"

ماآیوئی کے اس کہے کو اس کے بھائیوں نے اپنے دل میں جگہ دی۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ کشتی سے اتر گئے۔ کہ "اے ہمارے سردار بھائی۔ تمہارا کہا ہمارے سر آنکھوں پر۔ تم جاؤ۔ اور جب تک تم نہیں آتے ہم تمہاری راہ دیکھیں گے۔"

اس کے بعد ماآیوئی کی کشتی سمندر کی لہروں کے بہاؤ پر روانہ ہو گئی اور ان لہروں کی چٹانوں، لہروں کے پہاڑوں اور ان پہاڑوں کے دور دراز تک پھیلے ہوئے سلسلوں کو روندتے روندتے آخر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر کا نیلا پانی سیاہی مائل تھا۔ اور جہاں لہریں نہ پہنچتی تھیں اور نہ ہی ڈرائونی معلوم ہوتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر ماآیوئی نے ملاحوں کو حکم دیا۔ "رک جاؤ"۔

اور وہ رک گئے۔ بادبان باندھ دئے گئے اور لنگر ڈال دیا گیا۔

پھر ماآیوئی نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی اور کچھ دیر کشتی کے کنارا پر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد اس نے اپنا مچھلی پکڑنے کا کانٹا پکڑا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔ پانی میں اس سے کہکشاں کی سی ایک لکیر بن گئی اور پھر تھوڑی دور جا کر وہ کانٹا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

ماآیوئی کے ساتھی دیوتا حیران سے ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر انہیں جرأت نہ ہوتی تھی۔

لیکن اس کا بیٹا اٹیالانگا خاموش نہ رہ سکا اور چلا اٹھا "اے ابا آخر یہ کیا مذاق ہے۔ کیا ہم نے یہ ساری دوڑ دھوپ محض مچھلی کے اس شکار کے لئے کی ہے؟ کیا بلوتو کی مچھلیاں ختم ہو گئی تھیں۔ جو تم اس لمبے چوڑے سفر کی کوفت اٹھانے کی ٹھانی تھی۔"

اٹیالانگا ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ماآیوئی نے اپنا پروقار ہاتھ کھڑا کر کے اسے خاموش کر دیا۔ "بے صبر نہ بنو۔ اٹیالانگا انتظار کرو اور دیکھو۔"

مگر اٹیالانگا تھوڑی دیر بعد ہی پھر بے تاب ہو گیا۔

اب کے پھر ماآیوئی نے اپنے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کو کہا اور ساتھ ہی اسے ٹوک بھی دیا۔ "میرے بیٹے۔ چھوٹے بڑوں کے سامنے ذرا چپ رہیں تو ہی اچھے لگتے ہیں۔"

پر اٹیالانگا لمحہ بہ لمحہ گستاخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بدتمیز بن کر کہا۔ "ابا۔ یہ خاموش رہنے کی بھی تم نے اچھی کہی۔ پر کہنے سے پہلے اپنی الٹ پٹانگ حرکتوں پر بھی تو ذرا غور کر لیا ہوتا۔"

"خاموش۔ بدتمیز! اپنی زبان سنبھال۔" ماآیوئی نے چیخ کر کہا۔

...ں کے بعد اس کہکشاں کی سی لکیر پر جو مچھلی کے کانٹے سے بنی تھی نگاہیں گاڑتے ہوئے اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کانٹے کا سرا اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ اور سب کے سب اپنے پورے زور سے اسے اپنی طرف کھینچیں۔

اور جب انہوں نے کانٹے کو اپنی طرف کھینچا تو بوجھ کی وجہ سے ان کے پسینے چھوٹ گئے اور انہوں نے اندازہ لگایا کہ اس میں کوئی بڑی سی بھاری بھرکم مچھلی آ پھنسی ہے۔ مگر چونکہ وہ مچھلی حرکت نہ کر رہی تھی اس لئے انہیں ذرا ذرا شبہ بھی تھا۔ تاہم وہ اسے بدستور کھینچتے رہے۔ حتیٰ کہ تھوڑی دیر بعد سمندر کے اس پانی میں جہاں وہ لکیر سی تھی۔ اُبال سا آنا شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ پانی کے اندر سے اب چیخوں کی سی آوازیں بھی آنے لگیں۔ جیسے وہاں کوئی قیامت آ گئی ہو۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود مایوئی کی بلند آواز اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ "شاباش بہادرو کھینچے جاؤ۔ ہمت نہ ہارو۔ بس تمہاری محنتوں کا پھل تمہیں ملنے ہی والا ہے۔ جی چھوٹا نہ کرو۔"

اور واقعی انہوں نے نہ جی چھوٹا کیا نہ ہمت ہاری۔ بس کھینچتے رہے۔ مگر جونہی کانٹے کا سرا اوپر آیا اور انہوں نے اس کے ساتھ ایک بڑے سے مٹیالے بادل کا سا لگڑا اٹکا ہوا دیکھا وہ سہم سے گئے اور ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے اچھے سردار۔ یہ کیا ہے"۔ وہ سب کے سب ایک ساتھ چیخ اٹھے۔ "کچھ نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے۔ بس تم کھینچے جاؤ۔ میں کہتا ہوں کھینچے جاؤ۔ ڈرتے کیوں ہو۔"

مایوئی کی حوصلہ افزا آواز نے پھر سے ان کی ہمت تازہ کر دی اور وہ دوبارہ کھینچنے لگے حتیٰ کہ سمندر کے نیلے پانیوں میں سے دھرتی کا ایک ٹکڑا ابھر آیا۔ جو پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور پہاڑ اوپر آیا۔ پھر ایک اور ایک اور۔ اس طرح سات پہاڑ یکے بعد دیگرے اس گہرے پانی میں سے باہر نکل کے وہاں ایک خشک زمین بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے درمیان سرسبز وادیاں بھی تھیں۔ اور ان کے قدموں میں ہموار زمین کے کچھ ٹکڑے بھی بکھرے نظر آتے تھے۔

اب مایوئی کا سر فخر اور غرور سے اونچا ہو گیا اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک ایسی آواز میں جو خوشی کے نشے میں چور معلوم ہوتی تھی کہا "یہ ہے ہماری محنتوں کا پھل۔ اب ہم اسی دھرتی کے ٹکڑے کو اپنا گھر بنائیں گے اور سیکولیو پر ثابت کرینگے کہ یہاں کی زندگی کم از کم اس بلولوٹو کی زندگی سے تو بدرجہا بہتر ہے جہاں لوگ قہوہ پی پی کے صرف سونا ہی جانتے ہیں۔ کیوں میرے ساتھیو اب تم کیا کہتے ہو؟"

سب کے سر جھک گئے۔ البتہ ایک سر اب بھی نہ جھکا۔ اس کا اپنا بیٹا اِیٹالانگا جو کچھ دیر سے گستاخ بنتا جا رہا تھا اب بھی مرعوب نہ ہوا۔ "اہا! ان پہاڑیوں پر رہ کے ہم کیا کریں گے؟ کیا ان کی اونچائی ہمارے لئے زحمت نہ بن جائے گی؟ اِدھر اُدھر جانے کے لئے کیا ہمیں بھی اب بندروں کی طرح کودنا پھاندنا پڑے گا؟"

اور اِیٹالانگا کی شہ پاکر چند ایک اوروں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ہاں سردار۔ یہ تو بڑی کٹھن زندگی ہو گی۔ دیوتاؤں کے بعد بندر بنا کچھ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔"

"سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا" مایوئی نے انہیں تسلی دی اور پھر وہ پھلانگ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور وہاں زور زور سے اپنے پاؤں مارنے لگا۔ اب وہاں ایک ہلچل سی پڑ گئی۔ اور وہ پہاڑ اس کے پاؤں کے بوجھ سے دب دب کے چھوٹے چھوٹے ذروں میں بکھرنے لگا۔ اور دوسروں کے دیکھتے دیکھتے ہی وہ ایک ہموار زمین کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے پہاڑ پر چڑھا اور اس کے بعد تیسرے پر۔ اور یوں جب ان سات پہاڑوں میں سے چار بالکل ہموار ہو گئے تو وہ کچھ تھک سا گیا۔ اس لئے باقی چار پہاڑوں کو ویسے کا ویسا ہی چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔

اور یوں ان تین پہاڑوں سے جو نئی سرزمین بنی، وہ تھی ایٹا آج کے فیجی جزیرہ کا حسین ترین حصہ۔ اس کے بعد جلد ہی ٹانگا بھی وجود میں آیا جو فیجی کا ایک اور خوبصورت ٹکڑا ہے معلوم ہوتا ہے اس زمانے کے سب سے بڑے دیوتا مایوئی ان دنوں نت نئی آبادیاں کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ مچھلیوں کے ایک لاپروا لیکن پرجوش شکاری کی طرح اس نے ان دنوں سمندر کی گہرائیوں سے بہت سے جزیرے نکال باہر کئے۔ کبھی اس کے کانٹے کی نوک تاہی کو جا چھوتی اور کبھی نیوپلیکے جزیرے کو اور کبھی رارا ٹونگا کو۔ ان جزیروں کے درمیان اپنے پھرتیلے پاؤں کی مدد سے اس نے کچھ خوبصورت نہریں بھی بہا دیں اور ان کے درمیان لذیذ سبزیوں اور میٹھے پھلوں کے باغ بھی اگا دئیے تاکہ اس کے ساتھی اس نئے مقام سے پورے طور پر مانوس ہو جائیں۔

پھر جب مایوئی اپنے اس نئے کاروبار سے فارغ ہو چکا اور اسے فرصتیں نصیب ہوئیں تو ایک دن جب کہ وہ اپنے پاؤں پھیلائے ایک نہر کے کنارے لیٹے ہوئے جاگتے کے سپنے دیکھ رہا تھا، اسے ایکا ایکی بلولوٹو کے خیال نے آ گھیرا اور اپنے پرانے گھر کی یاد نے اس کے دل میں گدگدی سی شروع کر دی۔ اس نے سوچا کیوں نہ ایک مرتبہ پھر ذرا بلولوٹو جا جائے

ایک مرتبہ پھر شجر کلام کے نیچے بیٹھ کے قہوہ کی چسکیاں لی جائیں آبِ حیات کے چشمے میں جھانکا جائے۔ اور ہیکوتیبو کو اپنی کامیابی کی کہانی سنا کے اسکے تن بدن میں جلن کی آگ روشن کی جائے۔"

اور ہیکوتیبو کا نام ذہن میں آتے ہی اسے اپنا وہ وعدہ بھی یاد آیا جو وہاں سے آتی مرتبہ اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا۔ "میں لوٹ آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔"

چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت وہ پھر بلوتوکی بستی میں گیا۔ وہاں اس نے قہوہ بھی پیا۔ آبِ حیات کے چشمہ میں بھی جھانک کے دیکھا اور ہیلو تیبو سے جلی کٹی باتیں بھی کہیں۔ مگر اس سارے دوران میں وہ یوں محسوس کرتا رہا جیسے کہیں نہ کہیں کوئی خلا اب بھی رہ گیا ہو، جیسے فضائیں ابھی تک کسی اور شے کی راہ دیکھ رہی ہوں، جیسے وہ کہانی جو اس نے شروع کی تھی ابھی ادھوری ہو، وہ برائی جس کی آمد کی پیشین گوئی شجر کلام نے کی تھی ابھی تک کہیں دھندلکوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ کیا وہ برائی ضرور آئے گی؟ مگر وہ ہوگی کیا؟ اور وہ آئے گی کب؟ — کب؟؟

(۲)

برائی کا بیج

بلوتوکی بستی میں ایک بھید نرں بھری خاموشی کا راج تھا اور وہ لوگ جو مستقبل کو ہمیشہ دیکھ سکتے ہیں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک انوکھا سا اندھیرا پھیلا ہوا محسوس کرتے تھے۔ جیسے وہ دھند جو اس سے پہلے صرف دور تک پھیلے ہوئے پانیوں پر ہی نظر آیا کرتی تھی اب ان کی آنکھوں کا بھی ڈھکنا بن گئی ہو۔

اور اسی زمانے میں اٹیالانگا نے بلوتو بستی کی اس دھند کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ اداس ہے۔ اور ایکا ایکی اسے اپنے باپ مایوئی کے وہ الفاظ رلانے لگے جو اس نے اسے نئی بستی میں گستاخ سمجھ کے کہے تھے۔ خیال ہی خیال میں اس نے اس نئی بستی کو بھی دیکھا جو مایوئی نے مچھلی کی مانند سمندر سے نکالی تھی اور عین اس وقت اس کے ذہن میں ایک باغیانہ سوچ انگڑائیاں لینے لگی۔ اس نے اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چھوٹے دیوتاؤں کو اپنے ساتھ ملانے کا قصد کیا۔

اس نے انہیں جمع کیا اور کہا "میرے ہم جولیو! ہم سب جوان ہیں اور ہمارے باپ اور چچے بوڑھے۔ میں نے تمہیں یہاں صرف ایک سوال پوچھنے کے لئے بلایا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ تم مجھے بتاؤ۔ کیا جوانی بڑھاپے کے سامنے سر جھکانے میں حق بجانب ہے؟"

چھوٹے دیوتاؤں میں سے کوئی بھی اس کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ اس لئے وہ سب کے سب چپ رہے۔ چنانچہ اس نے تھوڑی دیر بعد خود ہی وضاحت کی "میرے دوستو! مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ لڑکپن جونہی جوانی کی منزل میں داخل ہوتا ہے، باپ اور بیٹے، چچا اور بھتیجے کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے —"

وہ ذرا کی ذرا رک گیا اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگا "تم جانتے ہو کہ میں تمہارے سردار اور دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا مایوئی کا بیٹا ہوں۔ مگر اس کے باوجود میں اپنی جوانی کو بوڑھے مایوئی کا غلام بنانا نہیں چاہتا۔ خود مختاری جوانی کا اولین حق ہے۔ اور میں جوان ہوں۔"

وہ مسکرایا اور پھر ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "تم بھی جوان ہو۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر جلد ہی اپنے چہرے پر ایک نئی طرز کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہنے لگا "ہم بھی دیوتا ہیں۔ دیوتاؤں کی اولاد اور ہم بھی وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔"

اب اپنی آواز میں اس نے ایک عزم کا سا تناؤ پیدا کر دیا اور ذرا پرزور لہجے میں کہا "ساتھیو، مایوئی اگر ایک نئی بستی میں امن چین سے رہ سکتا ہے تو ہم بھی وہاں امن چین سے رہ سکتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کے سامنے جھک کے رہیں۔" اور پھر اس کی آواز اونچی اور تند ہونے لگی۔ "ساتھیو! میں وہاں مایوئی کے بغیر جانا چاہتا ہوں۔ میں اسی بستی میں مایوئی کے بغیر رہنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم میرا بھی ساتھ دو۔ کیا تم میرا ساتھ دوگے؟"

اور اس کی طوفانی آواز ایک جھٹکے کے ساتھ تھم گئی۔

سننے والوں پر ایک طویل خاموشی طاری تھی۔ اور ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ بھی کسی نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگی ہوں۔ مگر وہ سب چپ تھے۔

آخر اس چپ کو ان میں سے ایک نے جسکا نام نی فی تا تھا توڑا وہ دوسرے ساتھیوں سے ذرا آگے بڑھا اور کہنے لگا "محترم اٹیالانگا میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میں تیار ہوں۔ مگر ہم جائیں گے کیسے؟"

"جائیں گے کیسے؟" اٹیالانگا نے اس کے سوال کو دہرایا۔ اور پھر اس سمندری کشتی کی طرف اشارہ کیا جو ایک مرتبہ نئے جزیروں کی سیر کرا آئی تھی۔ "وہ دیکھو۔ ہم اس کشتی پر جائیں گے۔ یہ کشتی چھوٹی ہے۔ اور ہم زیادہ۔ لیکن چونکہ ہمارا اعتماد ہمارے ساتھ ہوگا۔ اور ہماری ہمت بھی۔ اس لئے ہمیں گھبرانا نہیں چاہئے۔ اور ہاں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ جو کچھ ہو، جلد ہو۔ آج جب کہ مایوئی قہوہ پی کر سو رہا ہوگا ہم کشتی کا لنگر اٹھا دیں گے۔ بولو تمہیں منظور ہے؟"

"منظور ہے" ایک نعرہ سا فضا میں گونجا۔

اور یوں بلو لوٹو کے قہوہ پی پی کے چلنے والوں نے ایک نئی زندگی کو اپنانے کے لئے سب کچھ منظور کر لیا۔

عین اسی وقت ایٹا لا انگا نے انہیں ایک تنبیہ کی "دیکھو۔ ہمارے اس ارادے کی عورتوں اور بچوں کے کانوں تک بھنک بھی نہ پڑے ورنہ سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

"یونہی ہوگا" ایک اور نعرہ فضا میں گونجا۔

اور یوں ایٹا لا انگا نے ان نادانوں کی نادانی سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنا بنا کے ان کا سب کچھ لوٹ لیا۔

اس کے بعد ایٹا لا انگا اپنے باپ مایوئی کے پاس گیا۔ اس انداز میں کہ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے سعادت مندی اسے باپ کے سامنے نگاہ اونچی کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔

"ابا۔ میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں اپنی اس گستاخی پر نادم ہوں جو میں نے نئی بستی میں کی تھی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میں نے ایسی ایسی باتیں کہیں جو مجھے نہ کرنی چاہیے تھیں۔"

اور باپ ساری پرانی رنجش بھول گیا۔ "نادان خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے۔"

اور اس نے اس کی پیٹھ پر اسے تھپکی دی اور اپنے ساتھ لئے ہوئے 'شجر کلام' کے سائے تلے قہوہ پینے جا بیٹھا۔

قہوہ پیتے ہوئے جان بوجھ کے ایٹا لا انگا نے محض اپنے ہونٹ ہی تر کئے اور پیالے کو منہ کے ساتھ لگا کے بس جھوٹ موٹ کی چسکیاں لیتا رہا یہی وجہ تھی کہ بعد میں جب اس کا باپ اور چند دوسرے بڑے دیوتا گہری نیند سو گئے تو وہ بدستور جاگتا رہا۔ وہ اور اس کے دوسرے ساتھی بھی جن کی روحیں باغی ہو چکی تھیں۔ اور جو اپنے بزرگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کے بھاگ جانے پر تلے ہوئے تھے۔

اور کچھ دیر بعد جب کہ ان کے بزرگ نیند میں خراٹے لے رہے تھے وہ چپ چاپ اٹھے۔ اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور سمندری کشتی میں بیٹھ کر اس کے بادبان کھول دئے۔ اور بھاگ گئے۔ (باقی)

اعلان

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم بڑی مقدار میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحاتِ قلم روانہ نہ فرمائیں۔

ادارہ

نقد و نظر

ف۔ح

مطبوعات ادارۂ اشاعتِ اسلامیات

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ادارہ اسلام کی تبلیغ اور احکامات مذہب کی تشریح و توضیح کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ مشیروں اور مصلح کاروں میں جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج کی مستند و مقتدر ہستیاں شامل ہیں۔ اب تک اس ادارے نے چار کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں سے دو یعنی رہنمائے قرآن اور قرآن و سیرت سازی ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کی فکر بلیغ کا نتیجہ ہیں۔ باقی دو یعنی تعلیم قرآن اور اسلامی تقاریب مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم۔ اے پروفیسر نظام کالج کی تالیفات ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے بارہا کہی ہوئی باتوں کو بالکل ہی نئے، انوکھے اور دلنشین انداز میں بیان کیا ہے، اور اسی لئے ان کی یہ کاوشات بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ ہر کتاب میں بہت سے مسائل دین کو ایمان اور عقیدے کی حدود سے آگے بڑھ کر فلسفے اور خصوصاً نفسیات کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے جو نئے دور کے اثرات کے ماتحت روحِ اسلام کو اطمینان بخش صورت میں سمجھنے سے قاصر ہیں، انکا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

رہنمائے قرآن یہ الحاج نواب سر نظامت جنگ بہادر کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے پانچ باب ہیں پہلے میں قرآن کو صحیفۂ فطرت اور اسلام کو ایک کامل تہذیب ثابت کیا ہے۔ دوسرے میں ان غلط تعبیرات کا جواب دیا ہے جو مذہب اور قرآن کے خلاف پیش کی جاتی ہیں۔ تیسرے میں وحی اور نبوت کی حقیقت سمجھائی ہے۔ چوتھے میں قرآن کا دائرۂ عمل واضح کیا ہے۔ پانچویں میں رابطۂ وحدتِ خلق پر روشنی ڈالی ہے۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ جلد معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔

قرآن اور سیرت سازی نفسیاتی اعتبار سے اس دعوے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ قرآن کا صحیح مطالعہ انسان کو نیک سیرت بنانے میں حد درجہ ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ انسانی کردار کی بہت سی کمزوریوں خصوصاً غصے، خوف اور حزن کا علاج قرآن سے ممکن ہے۔ اس کتاب کے آٹھ باب ہیں۔ مختلف موضوعات پر اصولی بحث کرنے کے بعد آخری باب میں انسان کی کامیاب زندگی کا قرآنی تصور پیش کیا ہے جس کے مطالعے سے تعمیر حالات میں یقیناً بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سوا تین روپے۔

تعلیم قرآن سورۂ فاتحہ اور سورۂ الناس سے سورۂ والضحیٰ تک اکیس سورتوں کے لفظی اور بامحاورہ ترجموں کے بعد سیر حاصل تفسیریں پیش کی ہیں۔ یہ وہ سورتیں ہیں جن کا عام مسلمانوں کی پنج وقتہ نمازوں میں روزانہ ورد رہتا ہے۔ اس لئے اگر ان فرمودات الٰہی کے نفسِ موضوع اور صحیح مطلب و مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ عبادت میں دلی لگاؤ کے ساتھ ساتھ کس درجہ صداقت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر طلبائے مدارس کے لئے لکھی گئی ہے لیکن عام مسلمان بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ضخامت ۱۰۸ صفحے۔ بلا جلد قیمت بارہ آنے۔

اسلامی تقاریب چاند کے بارہ مہینوں میں مختلف دنوں کو مقدس سمجھتے ہوئے جو تقریبیں مسلمانوں میں رائج ہیں، ان پر مذہبی اور نفسیاتی زاویہ ہائے نظر سے ملک بھر کے مشہور اصحاب قلم نے روشنی ڈالی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عید، بقر عید اور شب برات جیسے تہواروں کے علاوہ یوم جمعہ، یوم فاروق، یوم حسین، یوم عثمان، شب معراج، عید میلاد النبی وغیرہ کی تقاریب پر اس طرح بحث کی گئی ہے کہ ان نگارشات کے مطالعے کے بعد عقیدت کی روشنی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت چار روپے۔ یہ چاروں کتابیں ادارۂ اشاعت اسلامیات۔ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔

مطبوعات رائل ایجوکیشنل بک ڈپو

نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ادارے سے صرف تعلیمی کتابیں شائع ہوتی ہوں گی لیکن ادب و انشا کے میدان عمل میں یہ اپنے ہمعصروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہے۔ اب تک جتنی کتابیں اس کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں وہ بلحاظ کتابت و طباعت اور باعتبار نفس مضمون اعلیٰ، عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ حال ہی میں اس نے جناب قیسی رامپوری کے تین ناول اور جناب بہار کوٹی کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھاپ کر ایوانِ ادب میں چار نئے ستونوں کا اضافہ کیا ہے۔ قیسی صاحب بڑے کہنہ مشق افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ اب تک ڈیڑھ درجن کے قریب ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحریر میں حقیقت و صداقت کی ترجمانی اس شدت سے موجود ہوتی ہے کہ بعض دفعہ وہ اس کا لحاظ رکھنے میں ناول کی صحیح تکنیک کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح زود نویسی کے باعث بعض جملوں کی ترکیب میں جھول پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے جوش و خروش کے اظہار میں ذرا احتیاط برتیں اور خدمت ادب کے جذبے کے ساتھ ساتھ اس کی جملہ نزاکتوں کا حقیقی احساس اپنے دل میں پیدا کریں۔

رونق ۲۸۰ صفحات کا یہ اصلاحی ناول حد درجہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس میں نیکی اور بدی کی باہمی کشمکش کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت جس کی ازلی عظمت مسلم ہے، غلط ماحول اور ناسازگار فضا کے سایوں میں گھر جانے کے باوجود اپنی شان دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ موصوف کے دوسرے ناولوں کی طرح مکالمے کی بیساختگی اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قیمت تین روپے۔

پھندا اس میں کردار نویسی کا وہ رنگ جو قیصی صاحب کے اکثر ناولوں کو ایک امتیازی حیثیت بخشتا ہے، خوب نکھر کر اپنی شان دکھا رہا ہے۔ ایک طرف ایک پابند مذہب انسان ہے جس کی ذہنیت کورانہ تقلید کی بجائے عقل سلیم سے کام لیتی ہے۔ دوسری طرف اسی کا چھوٹا بھائی اپنی لاابالی کے باعث طبعاً دنیادار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک تیسرے اشتراکی دوست ایثار جنگ جلتے نظر آتے ہیں لیکن اس طرح یہ کتاب مذہبی یا سیاسی موشگافیوں ہی کی حامل نہیں ہے بلکہ محبت کی بے پناہ قوتیں بھی عام خیالات و افکار اور افعال کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سامانِ دل بستگی میں کوئی کمی پیدا ہونے نہیں پائی۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات۔ قیمت سوا دو روپے۔

برہنہ اس میں عہد حاضر کی ایک دکھ بھری پکار ہے، جسے موجودہ جنگ اور اس کے اثرات نے پیدا کیا ہے۔ یہ ظلم و ستم کی داستانِ حزیں ہے۔ جس کے دل سوز نقوش واقعاتِ زمانہ نے تخلیق اور قیصی صاحب نے مربوط کئے ہیں۔ اس میں موصوف کی تحریر کا طنزیہ رنگ بڑی شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ البتہ کہیں کہیں خطیبانہ شان بار خاطر ہونے لگتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ناول نہایت عمدہ اور اس دور کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپے۔

خاکستر جناب بہار کوٹی کے انیس افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں قیصی صاحب کی طرح حقیقت و واقعیت کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے اور شاید اسی لئے ان کو دیباچہ لکھنے کی زحمت دی ہے۔ ان افسانوں میں تلخی اور طنز کا رنگ غالب ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے ان مسائل کو چھیڑا ہے جو گگڑی میں لگے ہوئے گھن کی طرح اس وقت کی زندگی کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ خیالات میں فرسودگی لیکن انداز بیان میں اچھوتا پن ضرور ہے۔ بہار صاحب ابھی نئے لکھنے والوں کی صف میں ہیں لیکن تحریر کی پختگی ان کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

یہ سب کتابیں مجلد ہیں اور رائل ایجوکیشنل بکڈپو، اردو بازار دہلی سے مل سکتی ہیں۔

نکاتِ شیکسپیر

اگر تم کو نہ یاد آئے کوئی دیوانہ پن ایسا
ہوا جو تم سے سرزد عشق میں جب تم ہوئے رسوا
اگر میری طرح معشوق کی توصیف کے پھندے
کبھی اپنے مخاطب کی سماعت پر نہیں ڈالے
اگر میری طرح مغلوب ہو کر دل کی وحشت سے
کبھی تم دفعتہً بزم احبا سے نہیں نکلے
تو یہ سمجھو کہ جھوٹا تھا تمہارے عشق کا سودا

(As You Like It Act 2, Sc. 4).

الوداع! اے عظمت و جاہ و جلال
آدمی کا ہے یہی دنیا میں حال
آج اس کے بوتۂ امید میں
پھوٹتی ہیں نرم و نازک کونپلیں
کل دکھاتا ہے وہ پھولوں کی بہار
سرمگیں اعزاز کا رنگیں نکھار
تیسرے دن آ کے پڑتی ہے وہ کہر
برگ و گل پر جو ہلاکت کی ہے مُہر
جب وہ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اب
پختہ تر ہونے کو ہے دورِ طرب
بیخ و بن تک جا پہنچتی ہے قضا
خاک میں ملتا ہے نخل امید کا!

(Henry VIII, Act 3, Sc. 2)

احساس نہ کچھ ہو دل میں غم کا
پھر بھی کر دیں زباں سے اظہار
یہ کام بہت کٹھن ہے لیکن
آساں ہے برائے مردِ عیار!

(Macbeth, Act 2, Sc. 3)

زمین و آسماں میں ہیں ابھی تک بے شمار اشیاء
تمہارے فلسفے نے خواب بھی جن کا نہیں دیکھا

(Hamlet Act 1, Sc 5)

تلوک چند محروم

روس میں آب پاشی

ممالک مشرق کی تاریخ تمدن ہمیشہ سے آب پاشی کے مسئلہ سے وابستہ رہی ہے۔ یہاں پانی کی تلاش اور اس کے حصول کی کشمکش زندگی اور موت کا سوال بنا رہا ہے۔ یہ امر ایران، ہندوستان، افغانستان، ازبکستان، تاجکستان اور سویت روس کی دوسری وسط ایشیائی جمہوریتوں پر یکساں طور پر صادق آتا رہا ہے۔

انسانی تہذیب نے اول اول مشرقی دریاؤں دجلہ و فرات، مرغاب و تجند، جیحون و سیحون، سندھ، گنگ اور نیل کی وادیوں میں جڑ پکڑی۔ ایک قدیم عربی کہاوت ہے کہ ہر صحرا کا ایک مستقبل ہوتا ہے۔ یہ بات بڑی پرانی ہے ممالک مشرق میں متعدد صحرا ہیں لیکن پرانے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ تھے ہزارہا سال کی کوششوں سے وہ ریتیلے چٹیل میدان ہرے بھرے مرغزاروں میں تبدیل ہوگئے۔ انسان ہمیشہ سے دریاؤں کے قریب کے ریتیلے میدانوں کو پانی دینے کے طریقے سیکھنے کی فکر میں رہا ہے۔ ان بنجر میدانوں میں پانی آجانے سے ایک نئی جان پڑی اور کسانوں نے غلہ، کپاس، چاول، ترکاریوں اور پھلوں کی بڑی بڑی فصلیں تیار کیں۔ اندرونی ضروریات سے زائد اشیاء ان بیرونی مقامات کو بھیجی گئیں جہاں بارش کی قلت ہوئی اور پانی کی کمی۔ اس طرح ایسی نو آبادیات قائم ہوئیں جہاں کاشتکاری خاص پیشہ ہوتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ تجارت اور دستکاریوں کو بھی فروغ ہو جاتا تھا یہی چھوٹی چھوٹی زرخیز آراضیاں رفتہ رفتہ آب پاشی کے لیے بڑے بڑے مرکز بن گئے جہاں نہریں بیسیوں نہیں ہزاروں ہیکٹر زمین کو پانی پہنچاتی تھیں۔ غیر مزروعہ زمین کے طول میں لوگوں نے آب پاشی کے واسطے بڑی بڑی نہریں بنانا سیکھ لیا جن سے درجنوں کلومیٹر زمین کو پانی پہنچے لگا پانی ان نہروں سے چھوٹی چھوٹی شاخوں میں ہوتا ہوا بنجر زمین میں پہنچا اور ہزاروں گاؤں پانی کی برکت سے بڑے مرفہ الحال زراعتی مرکز بن گئے لوگوں کو اس "حیات بخش رطوبت" (پانی) کے خرچ میں کفایت کرنے کا ڈھنگ آگیا۔

"آب پاشی" کے معنی ہیں آراضی کو مصنوعی طریقہ سے کاشت کے لئے پانی دینا۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ فن آب پاشی اب سے دس ہزار سال پہلے کے لوگوں کو بھی معلوم تھا۔ اگرچہ آب پاشی کی تاریخ بہت قدیم ہے لیکن اس سلسلہ میں انجنیری سے کام لینا، طرح طرح کی نہریں تعمیر کرنا اور انکا جال پھیلا دینا غرض میکانکی آب پاشی ایک جدید چیز ہے۔ جدید مشینوں اور نئے نئے آلوں سے زراعت اور کاشت کے طریقوں میں ایک بڑا انقلاب ہو گیا ہے اور ریت سے بنجر علاقوں میں آب پاشی کا کام بڑے عمدہ طریقہ پر انجام پا رہا ہے۔

اسوقت تمام دنیا میں تقریباً اکیس کروڑ ستر لاکھ ایکڑ زمین کی آبپاشی کیجا رہی ہے اس میں سے نصف سے زیادہ زمین ہندوستان اور چین کی ہے۔

سویت روس میں اسوقت آب پاشی کی آراضی تقریباً ینتیھ لاکھ سات ہزار ایکڑ ہے سنہ ۱۹۱۷ء سے پہلے روس میں آب پاشی کا علاقہ بیالیس لاکھ نو ہزار پانچسو ایکڑ تھا اس میں سے چھیاسی لاکھ بنتیالیس ہزار ایکڑ زمین کی آب پاشی سویت روس کی موجودہ وسط ایشیائی جمہوریتوں کی آبادی کی کوششوں اور ذرائع سے ہوئی تھی۔ آٹھ لاکھ ستاون ہزار نوسے ایکڑ زمین کی آب پاشی سرکاری خرچے سے ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں سرکاری صرفہ دس کروڑ سے کچھ کم ہوتا تھا (اس میں آب پاشی کے علاوہ صفائی وغیرہ کا خرچ بھی شامل تھا) گویا سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد کے زمانہ میں آب پاشی کے علاقہ میں جو اضافہ ہوا وہ اس سے آٹھ گنا تھا جو شروع سے لے کر سنہ ۱۹۱۷ء تک ہوا تھا۔ پنج سالہ منصوبہ بندی کی پہلی اور دوسری مدت میں ہی سویت حکومت نے ایک ارب، اکتالیس کروڑ تیس لاکھ کی رقم آب رسانی پر خرچ کی تھی۔

سویت روس کی مختلف جمہوریتوں میں آب پاشی کے علاقوں کی فی صدی شرح (اپنے کل علاقوں کے بالمقابل) حسب ذیل ہے:-

ازبکستان :-	۳۲ فیصدی ÷	قازقستان :-	۱۲ فیصدی
قرقزیہ :-	۱۳ " ÷	آذربائیجان :-	۱۱ "
ترکمانیہ :-	۷ " ÷	تاجکستان :-	۵ "
آرمینیہ :-	۳ " ÷	گرجستان :-	۳ "
یوکرین :-	۱ " ÷	روسی فیڈریٹیڈ اسٹیٹس	۹ "

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مرکزی ایشیائی جمہوریتیں روس کے آب پاشی کے کل علاقے کی ۳/۴ ہیں (۷۶ فیصدی) ماورائے قفقاز ۱۴ فیصدی اور یورپی حصہ ۱۰ فیصدی۔

سویت روس کے مخصوص جغرافیائی اور آبی حالات کے پیش نظر آب پاشی کے علاقے کے ۹۳ فیصدی حصہ میں پانی بغیر "پمپنگ" کے بہتے سے پہنچایا جاتا ہے اور باقی کے صرف ۷ فیصدی حصہ کے لئے مشینیں وغیرہ لگائی گئی ہیں۔ آبپاشی کی

این وی پولیاکوف

مزید ترقی کے سلسلہ میں سویت روس اپنے قدرتی ذرائع اور علاقے کی وسعت کی وجہ سے تمام دنیا کے ملکوں سے بازی لے جا سکتا ہے معقول طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ سویت روس میں آب پاشی کے قابل علاقہ آٹھ کروڑ چھہتر لاکھ پچاسی ہزار ایکڑ ہے۔ اسکا بڑا حصہ مرکزی ایشیائی جمہوریتوں اور ماورائے قفقاز میں واقع ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے فی الحال کل علاقہ کا ۲۰ فیصدی حصہ زیر آب پاشی ہے۔

روس کی قومی اقتصادیات میں آب پاشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ آب پاشی کے تحت تیس ہزار سے زائد کھیت ہیں چودہ سو سے زیادہ مشینیں وغیرہ کام کر رہی ہیں سات سو سے زیادہ سرکاری فارم ہیں، سارے تیرہ ہزار شہر، اور نو آبادیاں ہیں اور پینتیس ہزار سے زیادہ آدمی فائدہ اٹھانے والے ہیں۔

سویت روس میں نہروں کا جال بہت رعب دار معلوم ہوتا ہے۔ بڑی بڑی نہروں کا طول ایک لاکھ چودہ ہزار آٹھ سو پچاسی میل سے زیادہ ہے اور چھوٹی چھوٹی نہروں کا چار لاکھ ترپن ہزار تین سو تئیس میل ہے۔ آب پاشی کی نہروں کے علاوہ دوسری نہروں اور نالیوں کی لمبائی تقریباً چھ ہزار دو سو دس میل ہے۔ آب پاشی اور صفائی کے لئے مشینوں اور کلوں کے بڑے بڑے کارخانے ایک لاکھ تیس ہزار کے قریب ہیں یہ تو ہیں بڑی نہروں کے واسطے اور چھوٹی نہروں کے لئے تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔

سویت روس میں آب پاشی کا کام چلانے کے لئے پانچ ہزار آدمیوں کا عملہ مامور ہے (اس میں آب پاشی کے انجینئر اور مستری وغیرہ شامل ہیں) مستقبل قریب میں ان کارخانوں کی تعداد اور موجودہ عملہ میں اور زیادہ اضافہ ہونیوالا ہے۔

آب پاشی کی ضرورت کا اندازہ فصل کے موقع پر بارش کی مقدار سے لگایا جاتا ہے۔ امریکی تخمینہ کے مطابق کرۂ ارض کے ایک تہائی حصہ میں سالانہ بارش کی مقدار دس انچ سے بھی کم ہے اور دوسرے تہائی حصہ میں دس سے بیس انچ تک ہے سویت روس کی مرکزی ایشیائی جمہوریتوں میں

ایک دوشیزہ سے
عبدالعلیم نیر کوٹی

بھڑک اٹھا دلِ غیرت پسند سینے میں
جو دیکھے چند غلامانِ نفس تیرہ داغ
ہوس کی صرصرِ محشر خرام سے یہ لوگ
بجھانا چاہتے تھے محفلِ حرم کا چراغ
بہت نگاہِ خرد آشنا نے کوشش کی
نہ مل سکا دلِ تاریک میں جنوں کا سراغ
نگاہِ شوق کی گستاخیوں سے حاصل ہو
تری جبیں کی ملائک فریبیوں کو فروغ
"حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ" (اقبال)

بارش کی مقدار دو سے ۲۵ انچ تک ہے اور سویت روس کے یورپی حصہ میں اس کی مقدار بیس سے بائیس انچ تک ہے۔ بہت سے علاقوں میں مقدار اس سے زیادہ ضرور ہے لیکن ان علاقوں کی فصلوں کو بارش سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچتا ہے کیونکہ بارشیں ناوقت اور ناگہانی ہوتی ہیں اس وجہ سے آب پاشی کی ضرورت کا اندازہ لگاتے ہو صرف سالانہ بارش کی مقدار ہی کو پیش نظر رکھنا کافی نہیں بلکہ سال کے دوران میں بارش کے وقفوں، مختلف فصلوں کی اپنی اپنی ضرورتوں بارش کے اوقات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے ترکاریوں اور بے گٹھلی کے پھلوں دوسری فصلوں کی بہ نسبت ز پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کے یورپی حصہ میں مثلاً ماسکو میں بارش کم نہیں ہوتی، ترکاریوں لئے آب پاشی کی زیادتی اس کی شاہد ہے لیکن صرف تری ہی کی کمی کی وجہ سے آب کی ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ سویت روس میں اس ترقی محرک شہری اور صنعتی مرکزوں زیادتی ہوئی ہے صنعتی نو آبا روس کی صنعتی ترقی کی وجہ ظہور میں آئی ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں سویت میں یہ کوشش ہوتی رہی ہے قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی جگہوں پر کارخانے وغیرہ قائم جائیں جہاں کچا مال قریب ہو خاص طور پر ترکاریوں وغیرہ کی کاشت کا کا جگہ کیا جائے جہاں سے نقل و حمل پر زیادہ خرچ نہ ہو۔ اس لئے آب پاشی کی پرانی ہی جگہوں پر نہیں بلکہ سویت روس کے شمالی علاقوں میں بھی ہوتی جس کی وجہ سے اس کو زراعت کا خاص جزو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

وادیٔ فرغانہ میں کپاس بونے والوں کی کہاوت ہے "پانی کپاس کی ماں ہے، زمین باپ ہے اور سورج اس کی دایہ ہے"۔ جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا اب آب پاشی کو عمدہ اور مستحکم فصل کا واحد ضامن نہیں مانا جاتا۔ سویت روس میں تجربہ نے بتایا ہے کہ فصل کا استحکام اور اسکی عمدگی کا دارومدار ضرور

بیادی کھاد اور ہوشیاری کے ساتھ جوتنے بونے پر ہے اس لئے آب پاشی کی
شینیں نصب کرتے وقت زراعت سے متعلق دوسری باتوں کا بھی دھیان
لھا جاتا ہے مثلاً فصلوں کی ادل بدل، زمین کی نگہداشت اور پرورش، پیداوار کا
نخاب کیمیاوی کھاد کی مہیائی اور کیمیروں کا عمدہ انتظام۔

پرانے زمانہ کی آب پاشی کے طریقوں میں کچھ ایسے نقائص تھے جنکی وجہ
ے جدید انجنیری کی راہ میں بھی کھنڈت پڑی۔ ان میں سے اکثر بہت طویل
ے، نہروں کے موڑ اور زاویئے غلط تھے اور قابو رکھنے والی کلیں مفقود تھیں۔
ن اور بعض دوسرے نقائص کی وجہ سے پانی سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا
ا سکا اور زمینوں کو اتنا پانی بہم نہ پہونچ سکا جتنا ممکن تھا۔ اس سبب سے
آب پاشی والی زمینوں میں طرح طرح کے نقائص پیدا ہو جاتے تھے اور
فصلیں بھی خراب ہو جاتی تھیں۔

میکانکی آلات بھی ذرا گھٹیا درجہ ہی کے تھے۔ آب پاشی کے ان انتظامات
سے چھوٹے چھوٹے کھیتوں ہی کا بھلا ہوتا تھا۔ تمام کام سوائے ہل چلانے کے
ہاتھوں سے کیا جاتا تھا۔ ہل گھوڑے چلاتے تھے۔ غرض آب پاشی کے کام میں
کسی طرح کا کوئی نظم ونسق نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کوئی ضابطہ بھی نہ تھا۔ ذمہ دار
لوگ صرف وہ افسران سمجھے جاتے تھے جنکو "ارک آتقصال" اور "میر آب" کہتے
تھے۔ یہ لوگ بڑے بڑے، خان اور بے لوگوں کے مفاد کا تحفظ کرتے تھے اور
چھوٹے چھوٹے لوگوں کی ضروریات اور مفاد کا قطعی خیال نہ رکھا جاتا تھا
حالانکہ یہی لوگ دراصل اس کے مستحق تھے

سویت حکومت کے قیام کے وقت سے آب پاشی کے کام کو بڑی ترقی
ہوگئی ہے۔ اگرچہ تنظیم تو تکمیل کو نہیں پہونچی ہے گو بڑے حصہ پر عبور پا لیا جا چکا
ہے۔ آب پاشی کے علاقہ میں جو اضافہ ہوا ہے اسکا ۹۰ فیصدی حصہ تو پچھلے
سلسلہ کی ازسرِ نو تنظیم سے وجود میں آیا ہے اور ۱۰ فیصدی تعمیرِ نو سے تنظیم نو
بڑے پیمانہ پر جدید وسیع کے میکانکی آلات کے ذریعہ کی گئی ہے۔

سویت روس میں آب پاشی کے علاقے چند کلو میٹر کے لیے چھوٹے چھوٹے
کھیتوں پر مشتمل نہیں ہیں جہاں سب کام ہاتھوں سے یا زیادہ سے زیادہ
گھوڑوں سے ہوتا ہو بلکہ وہاں آب پاشی کے علاقے بارہ سے اڑتالیس
ایکڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے ہوتے ہیں۔ ان میں نہروں کے جال بچھے
رہتے ہیں۔ آب پاشی کا ہر علاقہ عام طور پر سولہ سو پچیس سے کر اڑتالیس سو
پچھتر فٹ لمبا اور تین سو پچیس سے لے کر چھ سو پچاس فٹ چوڑا ہوتا ہے۔
ہر ایک علاقہ کے لئے ایک نہر کا ٹکڑا مخصوص ہوتا ہے اور اس میں پانی کی
مقدار ۳٫۵ مکعب فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ ہر کھیت سے متعلقہ نہر
عارضی طور پر بنائی جاتی ہے اور جب کھیت میں پورے طور پر ہل چلایا جا چکا

ہوتا ہے تو ہر موسم بہار میں اس کی ازسرِ نو تنظیم وترتیب کی جاتی ہے۔

پرانے زمانہ میں کھیتوں میں پانی بھرنے کے طریقے ابتدائی درجہ کے اور
ناقص ہوتے تھے۔ آج آبپاشی کے طریقوں میں بڑی ترقی ہو چکی ہے۔
فی زمانہ، حدبندی اور نالیاں بنانے، کا عام رواج ہوگیا ہے۔ ان طریقوں کی وجہ
سے کھیتوں کو پانی صرف میکانکی ذرائع ہی سے دیا جاسکتا ہے (نالیاں
کاٹی جاتی ہیں، حدبندیاں کی جاتی ہیں اور سطح کو ہموار بنایا جاتا ہے) پرانے
زمانہ میں یہ کام ہاتھوں سے لئے جاتے تھے لیکن جدید طریقوں پر عمل درآمد
کرنے سے پیداوار میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ مذکورۂ بالا طریقہ "آب پاشی سطحی
آب پاشی" کے تحت میں آتا ہے۔ ایک میکانکی طریقہ اور بھی ہے جسکو "چھڑکاؤ"
یا "پھوار" کا طریقہ کہتے ہیں۔ آجکل یہ طریقہ زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے چھڑکاؤ کے طریقے کے سلسلے میں نئی نئی تحقیقات
ہو رہی ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں نئے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں
جگہ جگہ نئی نئی مشینیں اور آلات لگائے گئے ہیں اور یہ نئے آلے بہت بڑی
تعداد میں تیار کئے جا رہے ہیں۔ اس قسم کی میکانکی آب پاشی" نالی دار" باغات
میں اور ایسے علاقوں کی فصلوں کے لئے اختیار کی جاتی ہے جہاں بارش
اور قدرتی رطوبت کی کمی ہوتی ہے۔ سب سے آسان طریقہ وہی چھڑکاؤ والا
ہے اور اس قسم کی چھڑکاؤ کرنے والا ایک آلہ فی فصل پچاس سے لیکر ساٹھ
ایکڑ تک آراضی میں آب پاشی کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ طاقت والا
ایک آلہ ہے جو ایک فصل میں دو سو چھیانوے ایکڑ تک میں آبپاشی کر دیتا ہے۔

۲ء۴۷ ایکڑ رقبہ میں آب پاشی کرنے کے سلسلے میں جو پانی خرچ ہوتا
ہے اس کی آب پاشی کی ایک "اکائی" مانا جاتا ہے اور اتنی ہی زمین میں تمام موسم
کے دوران میں جتنا پانی صرف ہوتا ہے اس کو پورے موسم کی آب پاشی کی اکائی
سمجھا جاتا ہے۔ مختلف حالات میں یہ اکائی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پانی کے
بہاؤ والے طریقہ میں اس کی مقدار ۳،۶۰۰ اور ۴،۸۰۰ مکعب فٹ کے درمیان
رہتی ہے اور چھڑکاؤ والے طریقے میں ۳،۴۰۰ اور ۱۲،۶۰۰ مکعب فٹ کے درمیان
ایک کھیت میں ایک یا دو سے کر پندرہ مرتبہ پانی دینے کی ضرورت پڑتی
ہے۔ پانی کتنے کتنے عرصہ بعد دینا چاہیئے اسکا انحصار فصل کی نوعیت اور زمین
کی قدرتی حالت وغیرہ پر ہے) پانی دیتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا
چاہئے کہ پانی وہاں تک پہنچ جائے جہاں تک جڑیں پہونچتی ہیں۔ ترکاریوں
کے لئے یہ گہرائی سولہ سے چوبیس انچ تک سمجھی جاتی ہے۔ غلہ کے واسطے
چوبیس سے چھتیس انچ تک اور دوامی پودوں، باغوں اور انگور کی بیلوں
کے لئے تین سے اکتالیس فٹ تک۔ سویت روس میں ہر علاقہ کے لئے آب پاشی
کی مقدار، عمیق، طریقہ اور عرصہ وغیرہ کا ایک تفصیلی گوشوارہ تیار کر لیا گیا ہے۔

یہ تفصیلی گوشوارہ کئی سال کی محنت ریسرچ اور تجربہ کے بعد تیار ہو سکا ہے۔ اس سلسلہ میں کفایت پیدا کرنے کے طریقے خود روس میں اور اس کے علاوہ بیرونی ملکوں خصوصاً امریکہ میں عملی تجربات کرنے سے دریافت ہو سکے ہیں۔

روس میں پرانی مشینوں کی نئے سرے سے تنظیم کرنے کے علاوہ نئے نئے کارخانے بھی بنائے گئے ہیں جن کی وجہ سے فنِ آب پاشی کو بڑی ترقی ہو گئی ہے۔ نئے آلاتِ آب پاشی مندرجۂ ذیل مقامات پر نصب کئے گئے ہیں:—

دریائے چو پر چمش نامی بند، کریمیا میں تنغاں اور بازار حلقہ، مالو۔ کباو نسکیا، ترکوکم اور انجم زنٹ۔ کوبان الیخورنک پر آب پاشی کا کام زیر تعمیر ہے اور ما ندرائے وانگا بھی کام جاری ہے۔ اس سے ایک کروڑ ایکڑ زمین میں آب پاشی کرانا ہے۔

سوویت روس میں مزدوروں کی بھرتی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس تیزی کا سلسلہ "اسٹالن فرغانہ نہر" کی تعمیر سے شروع ہوا ہے۔ یہ کام یکم اگست کو شروع ہوا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ختم ہو گیا۔ یہ نہر ایک سو ننانوے میل لمبی ہے اور اس میں پانی کی مقدار ۴۲,۳۲ مکعب فٹ فی سیکنڈ ہے۔ اس کے بنانے میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار ازبک اور تاجیک کسانوں نے کام کیا اور اکہتر لاکھ چوبیس ہزار آٹھ سو دن اس کام میں صرف کئے۔ فرغانہ کے ان کسانوں کی نقل ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کی گئی۔ اس قسم کے کاموں کے سلسلہ میں حکومت کو زیادہ خرچ برداشت کرنا نہیں پڑا کیونکہ دو تہائی بار عوام نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ یہ تمام کام بہت تھوڑے وقت میں ہوئے اور زیادہ تر مقامی سامان ہی پر اکتفا کی گئی۔ فنی نگہداشت بہترین ماہرین اور انجنیروں کے سپرد رہی۔

ہر مزدور کے کام کا اوسطاً بیاسی سے لے کر ایک سو دو مکعب فٹ (کھدائی) تھا اور کارڈ دو سو پچپن سے لے کر دو سو بہتر مکعب فٹ تک۔ کھدائی کا کام زیادہ تر مزدوروں نے پھاوڑوں وغیرہ ہی سے کیا اور مٹی ہٹانے کا کام گھوڑوں گدھوں اور اونٹوں کی گاڑیوں سے لیا گیا۔ کچھ مشینیں بھی استعمال کی گئیں، جن کی وجہ سے مزدوروں کے کرنے کے کام آٹھ گنی پھرتی سے انجام پا گئے۔

مزدوروں اور کمیروں کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ کل کام کی ترتیب اس طرح کی گئی تھی:—

کام کی نگرانی پر مخصوص عملہ مامور تھا۔ تعمیرات کے مواقع انتظامی مراکز میں معین کئے گئے اور ہر موقع کے لئے کام مخصوص کر دئے گئے (کتنے کلومیٹر نہر بنے گی اور کتنے مکعب میٹر کھدائی کا کام ہوگا) بڑے بڑے علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔ ہر حصہ میں تقریباً ایک ہزار مزدور کام کرتے تھے اور ہر حصہ میں متعدد اجتماعی فارم ہوتے تھے۔ یہی فارم تعمیری کام کے خاص ذریعے تھے۔ ہر فارم کے لئے زیر تعمیر نہر کے کام کا ایک خاص حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا۔ ہر فارم کے متعلقہ مزدوروں کو چھوٹے بڑے جتھوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر جتھے کے آدمیوں کی تعداد کا انحصار زمین اور کام کی نوعیت پر تھا۔ کام کی یہ ترتیب و تنظیم بہت مفید ثابت ہوئی۔

ذیل کے گوشوارہ سے پتہ لگ سکتا ہے کہ مرکزی ایشیا میں یہ کام کہاں کہاں اور کیا کیا ہوا:—

علاقہ	کتنے کام ہوئے	نہروں کی لمبائی (میلوں میں)	انجنیری کے ڈھانچے	کھدائی کا کام (مکعب فٹ میں)
فرغانہ	۱۹	۲۹۹	۱۳۴۳	۵۸۴۳۲۱۰۰۰
تاشقند	۹	۱۲۵	۶۳	۲۲۶۸۳۰۰۰
بخارا	۷	۱۲۶	۶۶	۲۵۰۰۷۰۰۰
خوارزم	۵	۱۰۷	۳	۷۴۸۰۰۰۰۰
سمرقند	۲	۱۷	۱۰	۳۴۵۱۷۰۰۰
روس کی خود	۲	۱۹٫۲۵	—	۱۱۷۳۰۰۰
مختار ریاستیں	″	.	″	
میزان	۴۴	۶۹۳٫۲۵	۱۴۸۵	۷۵۷۰۵۸۰۰۰

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... حضرت نوح ناروی ......
۲۔ امجد حیدرآبادی کی شاعری (مع تنقید) جناب نصیر الدین ہاشمی ...
۳۔ جدید ترکی ادب .... جناب روشن اشرف انائیدن ...
۴۔ ہندوستانی موسیقی (۲) ...... جناب شاہد احمد دہلوی ...
۵۔ بہانہ (ڈرامہ) .... جناب انتصار نیوتنوی ......
۶۔ سید احتشام حسین (مع تنقید) ...... پروفیسر عبادت بریلوی ......
۷۔ برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ ... جناب کدار ناتھ بین ......
۸۔ ٹوٹ گئے شبنم کے موتی (افسانہ) محترمہ اختر جہاں بیگم ......
۹۔ اقوام متحدہ کا ادارۂ غذا و زراعت ... جناب سید رضا علی ......
۱۰۔ غالبیت اور قنوطیت ...... جناب علی حماد عباسی ......
۱۱۔ موت کا جنم (ایک کہانی) (۲) ... جناب محمود ہاشمی ......
۱۲۔ کرچ کا جرمنی .... جناب شنکر دیال ......
۱۳۔ حشر جذبات .... جناب ثاقب کانپوری
۱۴۔ آزاد شاعر .... ظریف الملک جناب ظریف دہلوی

آج کل
اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۴ | ۱۵ر جولائی ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا ایم اے
فضل حق قریشی دہلوی
مشیر احمد ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

اعزازی ڈگریاں

برطانیہ کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی بھی، ان عام ڈگریوں کے علاوہ جو وہاں تعلیم پانے اور کامیاب ہونے والے طلباء کو ملتی ہیں، ممتاز شخصیتوں کو اعزازی ڈگریاں بھی دیتی ہے۔ کنووکیشن میں ڈگریاں دیتے وقت یونیورسٹی کا وائس چانسلر صدارت کرتا ہے۔ اس موقعہ پر لاطینی زبان استعمال ہونے کے علاوہ ایسی لاطینی رسوم کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے جو یونیورسٹی کے ابتدائی دور یعنی بارھویں صدی عیسوی سے رائج ہیں۔ اس سال بھی یہ اعزازی ڈگریاں دنیا کی معزز ہستیوں کو عطا کی گئیں۔ باشندگان ہند میں سے ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر، سر راما سوامی مدالیار اور ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کو یہ فخر حاصل ہوا۔ اول الذکر کو ڈاکٹر آف سائنس اور باقی دو اصحاب کو ڈاکٹر آف سول لا کی ڈگریاں دی گئیں۔ یہ امر ملکی بھلے نہیں سارے ہندوستان کے واسطے باعث فخر ہے کہ اب اسے بھی دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ شمار کیا جانے لگا ہے۔

ہندوستانی مال اور مشرقی افریقہ

سنہ ۱۹۴۴ء میں مشرقی افریقہ سے ۱،۹۰،۱۴،۳۰،۸ روپے کا سامان ہندوستان آیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان سے ۹،۲۳،۵۰،۳۳،۸،۳۰ روپے کا سامان مشرقی افریقہ گیا۔ وہاں کے باشندے ہندوستانی فلم بھی بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۳ء کے مقابلے میں سنہ ۱۹۴۴ء میں دوگنی رقم کے ہندوستانی فلم وہاں بھیجے گئے۔ ان کے علاوہ سوتی کپڑا اور سن کی بنی ہوئی مختلف چیزیں بھی وہاں پسند کی جاتی ہیں۔ تاہم واقعات حاضرہ سے جو کشیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل کی تجارت پر ناگوار اثر پڑے گا۔ اگر مشرقی افریقہ والوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ اپنا طرز عمل نہ بدلا تو یہ تجارتی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور شاید اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں ہو سکے گی۔

نٹال میں ہندوستانی

اس وقت نٹال میں ہندوستانیوں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ حکومت نٹال کی پیہم درخواستوں پر ہندوستانیوں نے پہلے پہل سنہ ۱۸۶۰ء میں نٹال جانا شروع کیا۔ جب مزدوروں کے متعلق پہلے اقرارنامے کی میعاد ختم ہوئی اور ہندوستانی وہاں سے واپس آنے لگے تو پھر حکومت نٹال نے حکومت ہند سے مزدوروں کے لئے درخواست کی اور دونوں حکومتوں کے مابین معاہدہ ہوا جس کی ایک اہم شرط یہ تھی کہ اگر مزدور میعاد ختم ہونے کے بعد بھی وہاں رہنا چاہیں تو ان کو وہی درجہ حاصل ہوگا جو وہاں کے دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔ وہ ملک کے عام قانون کے تحت زندگی بسر کریں گے اور انہیں کسی امتیازی قانون کا شکار نہیں بنایا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ اس معاہدے کی اب پابندی نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ عمل بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ عوام کا رویہ بدل گیا ہے بلکہ حکومت ایسے قانون مرتب کر رہی ہے جو ہندوستانیوں کے لئے تکلیف دہ اور نقصان رساں ہو سکتے ہیں۔

مصر میں بجلی گھر

مصر میں بعد جنگ کی نت نئی منصوبہ بندیوں کے سلسلے میں ایک اہم خاکہ مرتب ہوا ہے جس کی رو سے دریائے نیل اور بحیرۂ قلزم کے پانیوں کو مختلف مقامات پر بند لگا کر آبی بجلی بنانے کے کام میں لایا جائیگا۔ ان دونوں مقامات پر اتنی بجلی تیار ہو سکیگی جو امریکہ کے زبردست بولڈر بند پر تیار ہونے والی بجلی سے مقدار میں نصف ہوگی۔ ایسی صورت میں مصر میں بجلی کی کل مقدار موجودہ صورت کے مقابلے میں تین گنی ہو جائے گی جو وہاں کے ایک کروڑ اسی لاکھ نفوس کے لئے کافی ہوگی۔ مجوزہ خاکے کے مطابق ایک بجلی گھر آسوان بند پر تعمیر ہوگا جو تقریباً جانب جنوب پانچ میل کے علاقوں میں آبپاشی کے کام آتا ہے۔ اس نئی قوت برقابی کے ذریعہ روشنی کرنے کے علاوہ کارخانوں اور کھیتوں میں بھی کام لیا جاسکیگا تاکہ صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہو اور لوگ زیادہ خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

روسی سائنسدان اور آتش فشاں پہاڑ

روس کے بہت سے سائنسدانوں کا ایک وفد حال ہی میں جزائر کماچاٹکا اور کیورائل پہنچنے والا ہے تاکہ ان علاقوں کے

آتش فشاں پہاڑوں کا غائر مطالعہ کیا جاسکے۔ سویٹ یونین میں صرف اِنی دو علاقوں کے پہاڑ ابھی آتش فشانی کر رہے ہیں۔ باقی سرد پڑ چکے ہیں۔ سویٹ یونین کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہوگا کہ آتش فشاں پہاڑوں کی فضائی تصاویر کھینچکر ان کی اندرونی کیفیتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے قبل یہ کام کبھی انجام نہیں پایا اس مہم کا سب سے بڑا مقصد اس نظریے کی تصدیق کرنا ہے کہ کہا جاتا کہ آتش فشاں پہاڑ ٹھیک اس خط پر واقع ہیں جہاں سے زمین کی سطح اندرونی طبقات تک شق ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان تحقیقات کے سلسلے میں بہت سی دوسری مفید باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اگر کبھی وہ پہاڑ گرم ہوکر لاوا اگلنے لگے تو وہاں کے لوگ تباہی کا سامنا کرنے کی بجائے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ وفد اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب رہتا ہے۔

ہندوستانی سپاہی اور قحط

ہندوستانی فوج کی تاریخ میں پہلی بار بہادر سپاہی اپنے ملک کے گوشے گوشے میں ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں جو نظر نہیں آتا لیکن اس کی تباہکاریاں روز روشن کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اس دشمن کا نام ہے قحط جسکا کھٹکا ہر گھڑی لگا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ پتہ لگتا ہے کہ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء کے دوران میں علاقہ بمبئی کے سپاہیوں نے ۲۲۰ ایکڑ زمین کو زیر کاشت کرنے کے لئے اسقدر تن دہی سے کام کیا کہ انکی مجموعی مدت دس ہزار گھنٹے کے قریب ہوئی۔ اس زمین میں مکئی، جوار، باجرہ اور جیا بویا گیا۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سو ایکڑ زمین کاشتکاری کے لئے علیحدہ تیار کی جارہی ہے۔ سندھ کے علاقے میں فوج نے اپنی زیر نگرانی اعلیٰ قسم کے بیج اور کھاد وغیرہ کی فراہمی کا انتظام کیا اور ٹکنیکل مشورے دئیے اور شہری ماہرین نے اپنے سرمائے اور مزدوروں کے ذریعہ ڈھائی ہزار ایکڑ زمین میں ایسی ترکاریاں بوئیں جو فوجی ضروریات کو پورا کر سکتی تھیں نتیجہ یہ کہ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کے دوران میں اس باہمی تعاون کے طفیل کراچی میں متعینہ فوجی دستوں کو دو لاکھ چون ہزار پونڈ ترکاری مل سکی۔ پچھلے سال کی تمام مقدار محسوب کی جائے تو وہ بیس لاکھ پونڈ ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ شہری منڈیوں پر فوجی ضروریات کی مانگ کا مطلق اثر نہیں پڑا۔ بمبئی اور کراچی کے علاقوں میں فوج نے اپنے کھانے کے لئے پچاس ہزار پونڈ ترکاریاں اگائیں۔ فوج نے اپنے واسطے اناج محفوظ رکھنے کے لئے جگہ جگہ ذخیرے کے گودام بھی بنا لئے ہیں۔ اگر یہ صورت آئندہ بھی قائم رہی تو ظاہر ہے کہ اہل شہر کو ان دقتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑے گا جو فوجی ضروریات کے بڑھ جانے سے بعض مقامات پر اٹھانا پڑا ہے۔

ترکی کا نیا قانونِ صحافت

ترکی کی مجلس ملی نے اپنے ملک میں جمہوری طریقہ کار کو رائج کرنے کے سلسلے میں ایک قدم اصلاح اٹھایا کہ اس مسودۂ قانون کو منظور کر لیا جسکی رو سے ضابطۂ صحافت کی دفعہ نمبر ۵۰ میں ترمیم کی تجویز کی گئی تھی۔ اس دفعہ کے مطابق حکومت ترکی کو اختیار حاصل تھا کہ وہ ہر اس اخبار کو جو اس کے خیال کے مطابق حکومت کی حکمت عملی میں رخنہ ڈال رہا یا اس کے نظام کو قائم رکھنے کے سلسلے میں نقصان دہ ثابت ہو رہا ہو، شائع ہونے سے روک دے۔ اب ترکی اخبارات کو قلم کی پوری آزادی حاصل ہوگئی ہے سوائے اس کے کہ وہ محکمۂ عدل و انصاف کی کارگذاریوں پر کسی قسم کا حملہ نہیں کر سکتے۔ رفتہ رفتہ شاید یہ پابندی بھی دور ہو جائے۔ یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ ترکی اخبارات کے نامہ نگاروں نے امریکی اور برطانوی اخبارات کے نمائندوں سے حال ہی میں بہت ربط ضبط بڑھا لیا تھا اور وہ انکی آزادئ رائے سے متاثر ہو رہے تھے۔

جاپان کا مستقبل

حال ہی میں امریکی حکومت نے ایک گشتی چٹھی برطانیہ، روس اور چین کی حکومتوں کو بھیجی ہے اور دعوت دی ہے کہ چاروں ملکوں کے مابین پچیس سال کے لئے ایک ایسا معاہدہ ہو جائے جسکی رو سے وہ سب باہمی تعاون اور سعئ عمل سے جاپانی فتنہ کو آئندہ ابھرنے سے دبائے رکھیں۔ ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ان کے دماغوں سے نبرد آزمائی کے جراثیم فنا ہو جائیں اور وہ امن عالم میں کوئی رخنہ پیدا نہ کر سکیں ہر چند اب بھی اس لڑائی کی ہولناک تباہکاریوں نے ان کے عزم وارادے کو ہمیشہ کے لئے کچل کر رکھدیا ہے لیکن اندیشہ دامنگیر رہتا ہے کہ کہیں وہ کیڑے مکوڑوں کی سرزمین کے رہنے والے کچھ عرصے سستا کر پھر کسی قابل نہ ہو جائیں۔ چونکہ اتحادی آئندہ دنیا بھر میں صلح و آشتی کی فضا قائم رکھنے کے درپے ہیں، اس لئے پیش بندی کے طور پر یہ سب تدبیر عمل میں آ رہی ہیں۔

جوہری بموں کے تجربات

سنا گیا ہے کہ جوہری بم کی صحیح قوت معلوم کرنے کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کئے جائیں گے۔ اس حقیقت کا انکشاف حال ہی میں امریکی بحریہ کے نائب امیر البحر نے کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ بحرالکاہل میں ایک خاص مقام پر سمندری جہازوں کا ایک بڑا کھڑا کر کے اس پر بم پھینکا جائیگا۔ ان کا خیال ہے کہ نتیجہ اتنا ہی ہولناک رہے گا جتنا کہ جاپان کے صوبہ ناگاساکی میں رہ چکا ہے۔ اسکا اثر موجودہ اور آئندہ دور کے مرد و عورت اور بچّوں پر بڑا خوفناک رہے گا۔ دوسرے تجربے کے طور پر ایک جوہری بم سمندر کی سطح کے نیچے آہستہ سے پھینکا جائے گا۔ قیاس ہے کہ اس کے پھٹنے پر پانی کی لہریں سخت تک اونچی اٹھینگی، جو ایک ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے لگے گی اور درجۂ حرارت کئی کروڑ تک پہنچ جائیگا۔ تیسرے تجربے کے طور پر سمندر کی نصف میل کی گہرائی میں جہازوں کے

عین نیچے ایک بم پھینکا جائیگا۔ اس کے نتائج کے بارے میں ابھی کوئی آخری رائے قائم نہیں کی گئی ہے لیکن خیال یہی ہے کہ وہ سمندری آبادی کے لئے ہلاک ترین حادثہ ہوگا۔ ان تجربات کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جوہری بم میدانِ جنگ کا سب سے زیادہ تباہ کن ہتھیار ہے اور آئندہ اس مقصد کے لئے اس سے احتراز کرنا ہی بہتر ہے۔

مفتیٔ اعظم مصر میں

اس خبر کے گرم ہوتے ہی کہ یروشلم کے مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی سرزمینِ فرانس سے فرار ہوکر مشرقِ وسطیٰ کے کسی محفوظ مقام پر پناہ گزیں ہونے کے لئے چلے گئے ہیں، ساری دنیا میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور میدانِ سیاست کے اربابِ حل و عقد ورطۂ استعجاب میں ڈوب گئے۔ شروع میں یہ خبر افواہ کی صورت میں پھیلتی رہی لیکن جب فرانس کے افسرانِ اعلیٰ نے بھی اسکی تصدیق کردی تو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا۔ قیاس لگایا گیا کہ وہ ملکِ شام میں پوشیدہ طور پر مقیم ہیں اور عرب لیگ کے اس اجلاس میں جو لبنان میں ہو رہا تھا شرکت کریں گے۔ اچانک سننے میں آیا کہ انھوں نے مصر میں پہنچکر براہِ راست شاہ فاروق سے اعانت طلب کی اور ان کے مہمان ہوگئے۔ شاہِ مصر نے اپنی ملکی اور قومی روایات کے پیشِ نظر ان کو پناہ دی اور وزیرِ خارجہ سید لطفی پاشا نے صاف لفظوں میں کہدیا کہ اگر سیاسی اختلافات کی بنا پر کسی بھی ملک نے مفتیٔ اعظم کو ہم سے طلب کیا تو ہم انکار کردیں گے کیونکہ وہ چاہے کتنے ہی بڑے سیاسی مفرور ہوں مگر مصر ان کو اپنی پناہ میں لے چکا ہے اور اب اس سرزمین کا ذرہ ذرہ انکی حفاظت کریگا۔ اس ضمن میں برطانوی سفیر متعینہ قاہرہ کو ہدایت بھیجی گئی کہ وہ حکومتِ مصر سے یہ دریافت کریں کہ مفتیٔ اعظم کے سلسلے میں اس کے آئندہ ارادے کیا ہیں۔ نیز یہ کہ برطانیہ کو اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ مفتیٔ اعظم کسی سیاسی سرگرمی میں عملی حصہ نہیں لیں گے۔ حکومتِ برطانیہ کی ان تحقیقات وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ موصوف کی واپسی کا مطالبہ نہیں کررہی۔ کچھ دن قاہرہ میں رہنے کے بعد وہ شاہ فاروق اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اسکندریہ چلے گئے۔ ان کا جلوس بہت شاندار طریقہ پر نکالا گیا جس کی تفصیلات مصطفیٰ امین بے نے اپنے روزنامے "اخبار الیوم" میں درج کی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مفتیٔ اعظم نے شاہ فاروق سے کہا کہ "میں نے کسی غیر ملک کے لئے کوئی سیاسی خدمت انجام نہیں دی۔ میں شام، فلسطین، لبنان، عراق، مصر اور دوسرے عرب ممالک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرتا رہا ہے مجھے برطانیہ سے نفرت نہیں ہے، امریکہ سے نفرت نہیں ہے، حتیٰ کہ یہودیوں سے بھی نفرت نہیں ہے۔"

روس میں ترقی کے نئے خاکے

سوویت یونین نے اپنے چوتھے پنج سالہ خاکے کو دائرۂ عمل میں لانا شروع کردیا ہے۔ ترقی کے نت نئے خاکے تیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے قفقاز کے جانب شمال ستافروپول کے علاقے میں ایک زبردست نہر بنائی جارہی ہے جو کیوبان اور یرگورو یک دریاؤں کو آپس میں ملادیگی۔ آبپاشی کے سلسلے میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس نہر کی بدولت اس علاقے کے رہنے والوں کی دوسری ضروریات بھی پوری ہوسکیں گی جس زمین میں آبپاشی کرنی ہے اسکا رقبہ تقریباً پچیس ہزار ایکڑ ہے۔ اس نہر پر برقابی کے دو کارخانے بھی کھولے جائیں گے۔ ان میں سے ایک کی تعمیر بھی شروع ہوگئی ہے دریائے زرادلیشان کی وادی میں پانی کا ایک عظیم الشان حوض تیار کرنے کے سلسلے میں جو کام جنگ چھڑ جانے کے باعث رُک گیا تھا، وہ دوبارہ شروع کردیا گیا ہے۔ یہ سوویت یونین کے بہت بڑے حوضوں میں سے ہوگا۔ اس میں ساٹھ کروڑ مکعب میٹر پانی بیک وقت جمع رہ سکیگا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اہم کام شروع کردئے گئے ہیں اور ان کی تکمیل میں عجلت برتی جارہی ہے۔

جاپان کے سابق وزیرِ خارجہ

تپ دق اور ایسی ہی کئی دوسری جان لیوا بیماریوں میں مبتلا رہنے کے بعد ٹوکیو کے ایک اسپتال میں جاپان کے سابق وزیرِ خارجہ یوسوکے متسوکا کا انتقال ہوگیا ان کی عمر تقریباً ۶۶ سال تھی۔ انھیں جنگی مجرم کی حیثیت سے گرفتار کرنے کے لئے جنرل میک آرتھر نے نومبر ۱۹۴۵ء میں احکام جاری کئے تھے۔ اس سال ماہ جنوری میں مسٹر متسوکا نے ہار مان کر اپنے آپ کو امریکی فوج کے حوالے کردیا۔ جنگی مجرمین کی فہرست میں ان کا نام شامل کیا گیا لیکن مہلک علالت کی بنا پر اسے خارج کرکے انھیں اسپتال میں بھیجدیا گیا۔ مسٹر متسوکا جولائی ۱۹۴۰ء سے پرل ہاربر کے حملے سے کچھ عرصے پہلے تک، جو دسمبر ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا، جاپان کے وزیرِ خارجہ رہے۔ منچوریا کے سلسلے میں جو لڑائی چین اور جاپان کے مابین چھڑی تھی، اس میں بھی ان کی فتنہ پردازیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو سیاسی کتابیں بھی لکھیں۔ ایک مسئلہ منچوریا پر اور دوسری تمام مشرقی ایشیا سے متعلق۔ ان کی موت اس وقت واقع ہوئی جب ساری دنیا نے ان کو بیماری کے باعث قابلِ رحم سمجھ لیا تھا۔

اعلان

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم کافی مقدار میں جمع ہوگئے ہیں اسلئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحاتِ قلم روانہ نہ فرمائیں۔ —— ادارہ

غزل

نوح ناروی

کیا کوئی تیر حسینوں کی نظر ہوتی ہے
دل میں چبھتی ہے اِدھر پار اُدھر ہوتی ہے

حشر اُدھر اٹھتا ہے مائل یہ جدھر ہوتی ہے
خوب رویوں کی نظر اور نظر ہوتی ہے

کس مصیبت سے شبِ ہجر بسر ہوتی ہے
نہ قضا آتی ہے مجھ کو نہ سحر ہوتی ہے

ذکر کلیوں کا تو کیا دم فیضان بہار
خشک پتی بھی نکھر کر گل تر ہوتی ہے

کیا مرے کشفِ محبت میں اثر یہ بھی نہیں
آپ جاتے ہیں جہاں مجھ کو خبر ہوتی ہے

اہل غم کچھ بھی کہیں ہم یہ کہے جائیں گے
داغِ الفت ہی سے تزئینِ جگر ہوتی ہے

فطرتِ عشق و وفا غیر کی محتاج نہیں
خود وہ مٹ جاتی ہے جو کور کسر ہوتی ہے

کیا کہا آپ نے دیکھا نہ کرو تم مجھکو
دیکھنے کے لئے آنکھوں میں نظر ہوتی ہے

چرخ پر ڈوب گئے ڈوبنے والے تارے
اب کوئی دم میں شب غم کی سحر ہوتی ہے

دل کی اب خیر نہیں ہم یہ سمجھ لیتے ہیں
ملتفت وہ نگہ ناز اگر ہوتی ہے

پہلے یہ سوچ لے پھر مجھ کو ستائے کوئی
آہِ مظلوم بڑی زود اثر ہوتی ہے

ہر طرف اہل نظر مجھ کو نظر آتے ہیں
دیکھنا یہ ہے نظر تیری کدھر ہوتی ہے

اس نے مرنے کو مرے اس لئے باور نہ کیا
اکثر اخبار کی جھوٹی بھی خبر ہوتی ہے

حشر کا دن ہم اُسی دن کو سمجھ لیتے ہیں
عیش کی رات گذر کر جو سحر ہوتی ہے

کم سے کم جلوۂ دیدار میں دیکھا یہ اثر
اور کچھ ہو نہ ہو تسکین نظر ہوتی ہے

مطمئن داد طلب اپنی فغاں پر نہ رہیں
تم جدھر ہوتے ہو یہ بھی تو اُدھر ہوتی ہے

کوچہ گردی نے شرف خضر کا بخشا مجھ کو
چلنے پھرنے میں مری اوقات بسر ہوتی ہے

خارِ گلشن سے نہیں دامنِ گل سے پوچھو
بوند شبنم سے جو گرتی ہے گہر ہوتی ہے

عرش تک جلد پہنچتی نہیں فریاد مری
ہونے ہوتے کہیں مائل بہ اثر ہوتی ہے

کھل گیا الفتِ صادق کا نتیجہ ہم پر
سو میں ایک آدھ کو ہوتی ہے اگر ہوتی ہے

مختصر عیش کی راتوں میں یہ دیکھا ہم نے
شام ہوتی ہے اِدھر صبح اُدھر ہوتی ہے

دیکھ سب کو نگہ لطف سے دیکھا بھی نہ کر
اس میں بے حد تری توہینِ نظر ہوتی ہے

دیکھنے میں جو نہیں کچھ بھی وہی اُن کی نگاہ
جزوِ دل بنتی ہے پیوستِ جگر ہوتی ہے

یہ سمجھ کر نہ کبھی دل سے تمنا نکلی
اپنی تو تیر فقط اپنے ہی گھر ہوتی ہے

اقتضا کہئے اسے فطرت انسانی کا
لوگ الفت نہیں کرتے ہیں مگر ہوتی ہے

کیا نظر آئے گا مجھ کو شب وعدہ کا وجود
شام ہونے نہیں پاتی کہ سحر ہوتی ہے

کبھی طوفاں کا تصور کبھی کشتی کا خیال ✣ نوح کی عمر انھیں دونوں میں بسر ہوتی ہے

امجد حیدرآبادی کی شاعری

نصیر الدین ہاشمی

(۱)

اردو زبان کے اکثر شعراء ایسے ہیں جنہوں نے صرف شاعری کے میدان میں دادِ سخنوری دی ہے۔ نثر نگاری میں ان کے کارنامے مفقود ہیں۔ غالب کی شخصیت دنیائے اردو میں اس لئے ممتاز ہے کہ نہ صرف ان کا کلام معجز بیان بلکہ خطوط یا دوسرے الفاظ میں نثر بھی اردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے زمانہ گذشتہ کے قطع نظر عصر حاضر کے بعض اصحاب بھی شاعری اور نثر نگاری کے لحاظ سے ممتاز ہوئے ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی، حالی، آزاد، ظفر علی خاں وغیرہ اسی قسم کی ایک شخصیت حضرت امجد کی ہے جسطرح آپ اقلیم سخنوری میں ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں اسی طرح نثر نگاری میں بھی آپ کا قلم گوہر بار گوہر افشانی کرتا ہے جن کی چمک نے ملک دنیائے اردو میں مدتوں باقی رہے گی۔ یہاں ہم مختصر طور پر آپ کی شاعری اور نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں۔

کسی شاعر یا نثر نگار کے دماغی افکار اور ذہنی کاوشوں کو جانچنے کے لئے اولاً اس کی زندگی تعلیم و تربیت اور اس کے ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ کس ماحول میں اسکی شاعری پھلی پھولی اور کس فضا میں پروان چڑھی۔

(۲)

حضرت امجد کی پیدائش چودھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یعنی سنہ ۱۳۰۳ھ یا ۱۳۰۴ھ میں بمقام حیدرآباد ہوئی آپ کے والد ایک صوفی مشرب باخدا شخص تھے۔ مگر امجد کی پیدائش کے چالیس دن کے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا سوائے والدہ کے ان کا کوئی عزیز قریب نہ تھا وہی ان کی پرورش کی کفیل تھیں۔ آمدنی کے ذرائع مفقود تھے۔ زندگی نہایت تکلیف سے بسر ہوتی تھی مگر اس کے باوجود تعلیم کی رغبت اور شوق دلانے اور تعلیم کے جاری رکھنے میں ایک غریب اور بیوہ ماں نے جو کد و کاوش کی وہ بار آور ہوکر رہی۔ قابل فرزند نے اپنے کلام نظم و نثر سے جو خدمت ملک و ملت کی انجام دی اور دے رہے ہیں وہ زندگی جاوید رکھتی ہے۔

آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ، بمبئی، مدراس کی یونیورسٹیاں قائم ہوکر عرصہ ہوچکا تھا اور ان جامعات سے مرد تو مرد، خواتین بھی اعلیٰ ڈگریاں لے کر میدانِ عمل میں بازی لگا رہی تھیں مگر حیدرآباد پر جمود طاری تھا۔ مغربی علوم سے دلچسپی نہیں تھی۔ دارالعلوم اور مدرسہ نظامیہ مشرقی علوم کا درس دیتے تھے خصوصاً آخرالذکر مدرسہ اور اسکے ساتھ دارالاقامہ غریب اور محنتی طلبا کا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ قدیم علماء شائقین علم کو اپنے مکانوں پر بھی مشرقی علوم کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے گھر تشنگان علم کے لئے آبِ حیات بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا بول بالا تھا۔ ایک طرف حضرت فیض کے شاگرد اپنے اُستاد کی میراث تقسیم کر رہے تھے تو دوسری طرف داغ کی محفل آراستہ تھی۔ سرشار، ترکی، گرامی، ظہیر وغیرہ شمالی ہند سے آکر حیدرآباد کی فضا کو شعر و سخن سے گرما رہے تھے۔

معاشرت میں اگرچہ مغربی طرز کی آمیزش ہوچکی تھی مگر مشرقیت کو غلبہ تھا۔ عام طور سے متوسط بلکہ اعلیٰ طبقہ کا رجحان مشرقی نہج پر تھا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں مشرقی تہذیب مشرقی معاشرت کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ تھی وہ فضا، اور یہ تھا وہ ماحول جس میں حضرت امجد نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر کیا۔

حضرت امجد مکتب کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ میں شریک ہوکر نظامیہ کورس کا درس لینے لگے۔ اس کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا شوق ہوا۔ خانگی طور پر فارسی کی جانب متوجہ ہوئے۔ ادیب زمانہ آغا سید علی شوشتری المخاطب بہ نادر الملک سے استفادہ کرنے کے لئے ۱۲ میل کی مسافت طے کرکے جاتے تھے۔ مطالعہ کا شوق دامن گیر تھا۔ فارسی کے امتحانات، منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں کامیابی حاصل کرلی۔

بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتداً ناسخ کا دیوان ہاتھ لگ گیا۔ اس کو دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ سب سے پہلے آپ نے یہ شعر موزوں کیا:—

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسماں اپنا ؎ مگر یارب نہ ہونا مہرباں وہ مہرباں اپنا

نوجوانی میں قوتِ لبسری کی تلاش میں حیدرآباد چھوڑ کر بنگلور جانے اور وہاں کچھ عرصہ تک عیسائی مشنری کے مباحث میں حصہ لیتے رہے اور کچھ عرصہ خانگی طور پر فارسی کے درس دیتے اور کچھ عرصہ بنگلور ٹریننگ اسکول میں مدرس کے فرائض ادا کرتے رہے مگر چند ماہ کے بعد وطن کی کشش حیدرآباد واپس لاتی ہے۔

اب مدرسہ دارالعلوم میں مدرس کی خدمت کو قبول کیا اور اس عرصہ میں ماں نے اپنے اکلوتے فرزند کی شادی رچائی۔ ذمہ داری کا بار زیادہ ہوگیا کسی طرح اسی قلیل تنخواہ میں گذر کرتے رہے۔

اب طغیانی رود موسیٰ کا قیامت خیز سیلاب آتا ہے جس میں حضرت امجد کی ماں، بی بی اور بچی تینوں نذرِ سیلاب اجل

ہو جاتے ہیں۔ صرف ذاتِ امجد کئی فرلانگ موجوں کے ساتھ بہنے کے بعد سلامتی کے کنارے پر پہنچے۔

اس افسوسناک عظیم حادثہ نے امجد کو کئی سال تک تجرد کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ شاہ خاموش صاحب کے سجادہ نشین حضرت سید ہاشم حسینی کے گھر اقامت فرمائی۔ ان کے پوتے سید صابر حسینی (موجودہ سجادہ نشین) کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اسی زمانہ میں استاد فلسفہ علامہ مولانا سید نادر الدین سے (جو علامہ عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے) فلسفہ کلام وغیرہ کا درس بھی جاری رکھا۔

استاد نے اپنے قابل شاگرد سے اپنی لختِ جگر کا پیوند مناسب تصور کیا۔ مولانا سید نادر الدین نے اپنی بڑی لڑکی جمال النساء کی تعلیم میں بہت کوشش کی تھی جس کی وجہ سے علوم عربی، اور فارسی، تصوف اور خطاطی میں خاصی مہارت رکھتی تھی اور حضرت امجد کے گھر آنے کے بعد کبھی کبھی سحر اور رباعی کہنے لگی تھی۔

اس شادی کے بعد امجد کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ تصوف کی مناسبت سے زہد اور ریاضت کا آغاز ہوا۔ طریقت اور سلوک کے منزل کی ابتداء ہوئی۔ پھر چند سال کے بعد آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ حج سے واپسی کے دو ہفتے کے بعد آپ کی رفیقِ حیات کا انتقال ہو گیا اس کا آپ کو بے حد صدمہ ہوا۔ عرصہ تک متاثر رہے۔

مدرسہ دار العلوم کی مدرسی پر کئی سال تک مامور رہے۔ اس کے بعد دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہوئے۔ اور ترقی کرتے ہوئے پچپن سال عمر کے آخر زمانہ میں مددگار صدر محاسب ہو گئے، اور وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے اب اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت امجد بڑے خوددار شخص ہیں کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے۔ خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں آپ بڑے مہمان نواز ہیں مہینوں مہمان داری کر کے خوش ہوتے ہیں۔ عام طور سے آپ کسی کے یہاں نہیں جاتے مگر جب تعلقات ہو جاتے ہیں تو ان سے ترکِ تعلق پسند نہیں کرتے حتی الامکان سابقہ تعلقات کو قائم رکھتے ہیں۔ تواضع اور انکساری کی صفت امجد صاحب کا ایک خاصہ ہے۔ غریبوں سے خندہ پیشانی سے ملنا، ان کی دستگیری کرنا آپ کا معمول ہے۔ مجلس میں صدر نشین یا صدر بننا پسند نہیں کرتے۔ آپ نہایت سادگی پسند ہیں۔ کھانے پینے، اوڑھنے پہننے اوڑھنے میں انتہائی سادگی ہوتی ہے جو مل جائے وہ خوشی سے کھانا، جو مل جائے وہ پہننا آپ کی عادت ہے۔ گھر میں آپ معمولی قمیص تہمند میں رہا کرتے ہیں اور اس لباس میں بڑی بڑی ہستیوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ باہر جانا ہو تو پائجامہ اور سفید یا خاکستر رنگ کی شیروانی زیب تن کرتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں اکثر خود خرید کر لاتے ہیں۔ سائیکل پر اکثر سوار ہوتے ہیں۔

آپ کے ملنے والوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے جس میں ہر طبقہ کے اشخاص شامل ہیں۔ اگر حیدرآباد کے امیر اور جاگیردار آپ کے دوست ہیں تو مفلوک الحال غریب کو بھی آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہے۔ اگر سرکاری اعلیٰ عہدیدار آپ کے دوست ہیں تو کم مواجبی اہلکار بھی آپ کے دوستوں میں شامل ہیں اور ہر ملنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے وہی سب سے زیادہ دوست ہے۔ دوستوں سے مروت اور محبت سے پیش آنا آپ کا معمول ہے۔ اپنے اور پرائے کا غم کھانا اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔

سینما کے دردناک فلم اکثر دیکھا کرتے اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ سماع سے بھی خاص مذاق ہے مجلس سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں، البتہ رو لیا کرتے ہیں کسی محفل میں طوائف کا گانا ہو تو اس سے بھی احتراز نہیں کرتے ہیں۔

عام طور پر آپ کسی کو مرید نہیں کرتے۔ مگر بعض خاص خاص اشخاص مریدین معتقدین ہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ آپ کا کلام نسوانی دنیا میں بھی بہت زیادہ مقبول ہے اور شیخ سعدی کی گلستاں کی طرح بچے بھی بہت شوق سے یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

(۳)

اس تفصیل کے بعد اب ہم آپکی شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ آپکی شاعری کو چار دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور تو وہ ہے جو ابتدائی شاعری سے لے کر طغیانی رود موسیٰ پر ختم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کا کلام اس وقت تقریباً مفقود ہے۔ اگرچہ ایک سو رباعیات کا ایک حصہ اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا اور بڑے بڑے شعراء سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا۔ اس سے آپ کے ہونہار ہونے کی خبر مل رہی تھی۔

شاعری کا دوسرا دور طغیانی رود موسیٰ کے بعد سے جمال النساء بیگم کی شادی تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں آپ نے نظموں کے علاوہ زیادہ تر تضمین موزوں کی ہیں۔ حمد، نعت پر کلام مشتمل ہے۔ ساتھ ساتھ رباعیات بھی موزوں ہوتی رہیں۔ کلام میں تصوف کا رنگ آنے لگا۔

تیسرا دور جمال النساء بیگم کی شادی سے ان کے انتقال تک قرار دینا چاہئے۔ اس دور میں آپ کا کلام از سر تا پا تصوف میں رنگ گیا خواہ رباعیات ہوں یا نظمیں سب کچھ تصوف سے لبریز ہیں۔ اس دور میں کچھ غزلیں بھی سفر حجاز میں لکھی گئی ہیں۔

چوتھا دَور اسکے بعد کا ہے جس میں تصوف کا رنگ پختہ ہوگیا ہے۔ اس دَور میں بھی آپ نے چند غزلیں موزوں فرمائی ہیں۔ رباعیات تو ہر دَور میں آپ کے کلام کا جزو لاینفک رہی ہیں۔

آپ کی تصانیف نظم اور نثر کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

(۱ و ۲) ریاضِ امجد حصہ اول و دوم (۳ و ۴) رباعیات حصہ اول و دوم (۵) خرقۂ امجد (۶) نذرِ امجد۔

یہ کتابیں صرف نظم پر مشتمل ہیں جو کتابیں نظم اور نثر سے ملی ہیں وہ یہ ہیں:۔
(۱) جمالِ امجد (۲) حجِ امجد (۳) گلستانِ امجد (۴) حکایاتِ امجد (۵) میاں بی بی کی کہانی۔

امجد کے کلام کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے وہ خواہ کسی دَور کا ہو اس میں تین باتیں خصوصیت سے پائی جاتی ہیں۔ سادگی، نازک خیالی اور تاثر۔ اور عمدہ نظم کے لئے یہی تینوں باتیں ضروری ہیں۔

اگر سادگی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امجد کا کلام اکثر نہایت صاف ہے اور عام فہم بھی۔ قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہوتا۔ صفائی اور سادگی کے لحاظ سے آپکے اشعار نظم نہیں معلوم ہوتے بلکہ نثر معلوم ہوتے ہیں۔ نازک خیالی کے لحاظ سے بھی امجد کا کلام خصوصیت رکھتا ہے لطیف تخیلوں اور تشبیہوں سے چار چاند لگ جاتے ہیں اور پھر یہ تشبیہیں مبالغہ آمیز نہیں ہوتیں سادگی کے ساتھ نازک خیالی سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کلام میں نگینے جڑے ہوئے ہیں جنکی صفائی اور چمک دمک آنکھوں کو خیرہ نہیں کر دیتی بلکہ دل و دماغ کو متاثر کر دیتی ہے۔

امجد کے کلام میں مختلف حیثیت سے تاثر ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ درد و الم میں ڈوبا ہوا سوز و گداز کی تصویر ہوتا ہے کہیں پند و نصیحت کا آئینہ اور ساتھ ساتھ تصوف کی چاشنی ملی ہوتی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے امجد کا کلام چار دَور پر تقسیم کیا جا سکتا ہے اور پھر اس کو نظمیں، تضمین، غزلیں، رباعیات اور قطعات پر منقسم کر سکتے ہیں۔

نظمیں مختلف موضوع پر ملتی ہیں۔ مثلاً واقعہ نگاری۔ وصف نگاری۔ اخلاقی نظمیں۔ صوفیانہ نظمیں۔

واقعہ نگاری کی نظموں میں "قیامت صغرا" "طغیانی رود موسیٰ" "قتیل جفا" جو بنگال کی ایک المناک خاتون کی سرگذشت پر ہے "ایک بیکس کا خواب" جو اپنے ایک خواب کے متعلق تفصیلی نظمیں ہیں خصوصیت سے قابل ستائش ہیں۔ ان میں واقعہ نگاری کا نہایت عمدہ اظہار ہوا ہے۔ واقعہ نگاری کی طرح وصف نگاری میں بھی امجد کا قلم روانی سے چلتا ہے "میری قمری"۔ "ماں اور بچی" "یتیم کی دعا" وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ اخلاقی حیثیت سے بھی کئی نظمیں ملتی ہیں جن میں بہترین اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے امجد کی شاعری میں تصوف کا حصہ زیادہ ہے۔ آپ کی بے شمار نظمیں تصوف کی حامل ہیں جن میں تصوف کے اہم مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ آپ کی نظمیں قال نہیں بلکہ حال ہوتی ہیں "خرقۂ امجد" کی پوری تیس نظمیں تصوف کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

اس موقع پر ہم صرف دو نظموں کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں۔ ایک وصف نگاری سے متعلق ہے اور دوسری تصوف سے۔

"میری قمری"

ہم نے قمری عجیب پالی ہے — منتظر نغمۂ بلالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے — قفس نقرئی میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں — اس کی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کا سناتی ہے — راہِ حق کی طرف بلاتی ہے
پیاری پیاری وہ نور کی گردن — جس پہ قربان حور کی گردن
لال لال اس کی نرگسِ گلفام — یا بھرا ہے شرابِ سرخ کا جام
اس پہ طرہ ہے سرخیٔ منقار — گل سمجھکر نہ کر لے بلبل پیار
رنگِ منقار ارغواں یک سر — یا دھڑی پان کی ہے ہونٹوں پر
یا کوئی ناخنِ حنائی ہے — ہائے کیا سرخ چونچ پائی ہے
پاؤں بھی سرخ رنگ لیتے ہے — دل حنا کا اسی سے پستا ہے
زیبِ زینت سراسر اکی ان بن ہر — سادگی میں ہزار جوبن ہے
جسم نقرہ صفت تمام سپید — صاف براق رنگ قابلِ دید
ہے صدا اس کی مونسِ دلِ زار — جس پہ قربان ہزار صوت ہزار

ہے غضب اس کی مست کن آواز
گویا باب سماع ہو گیا باز

ایک تصوف کی نظم ملاحظہ ہو:۔

ہر جزو کو اپنے کل سے اک نسبت ہے — کثرت میں گر اتفاق ہو وحدت ہے
ہر عضو کے حسن پر ہے تعریف مری — افعال جوارح پہ ہے توصیف مری
ہر عضو کے ہر فعل سے منسوب ہوں میں — سر سے پا تک ہر اک کا مطلوب ہوں میں
بحر متلاطم ہے ہر اک قطرۂ خوں — ہر جزو بدن کہتا ہے میں بحر میں ہوں
ہر جزو یہ کہہ رہا ہے امجد ہوں میں — ہر سنگ کا دعویٰ ہے زبرجد ہوں میں
اپنی ہی ہر اک مدح و ثنا کرتا ہے — جس کو دیکھو انا انا کرتا ہے
ہر جزو یہ کہہ رہا ہے میں بھی گل ہوں — ہر خار میں ہے کھٹک کہ میں بھی گل ہوں
کہتا ہے ہر اک مرے ہنر تو دیکھو — ہر جزو کی ہے صدا ادھر تو دیکھو

تضمین اسکو کہتے ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام پر مصرعے لگائے جائیں

یہ ضروری نہیں ہے کہ جس زبان کی غزل یا نظم ہو اسی زبان میں مصرعے لگائے جائیں، بلکہ عربی اور فارسی کے ساتھ بھی اردو مصرعے لگا کر تضمین کی جاتی ہے جہاں تک میرا خیال ہے امجد نے جو ذخیرہ تضمین کا فراہم کیا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ آپ نے عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے ساتھ اردو مصرعے لگائے ہیں اور پھر خوبی یہ ہے کہ ان مصرعوں سے اصل نظم کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ایک مختصر تضمین ملاحظہ ہو:—

"تضمین"

منظہر اعجاز آمد نرگس جادوئے تو — جلوۂ ذات احد دارد قد دلجوئے تو
سورۃ الشمس اخا رہی نمایہ روئے تو — ایکہ شرح فاضحی آمد جمال روئے تو
نکتۂ واللیل وصف زلف عنبر بوئے تو

کوئی میرے دل سے پوچھے ان نگاہوں کا اثر — ہے کبھی نشتر کبھی ہے مرہم زخم جگر
معنی ہے سحر ہے اعجاز ہے ترچھی نظر — اے دو چشم سرمہ ناکت کحل مازاغ البصر
قاب قوسین است رمز گوشۂ ابروئے تو

ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے یا محمد المدد — کون پا سکتا ہے تیری شان اللہ الصمد
نور کی آیت ہے سراپا ترا اے نور احد — سین دنداں تو الیس نشانے می دہد
صورت حم دارد حلقۂ گیسوئے تو

ہے سراپائے مقدس مظہر کنز خفی — صاف بے صورت ہی ہے حق ہو کی تصویر تری
تیرا امجد کیوں نہ ہو قربان تجھ پر ہر گھڑی — قبلۂ دل کعبۂ جاں یا رسول اللہ توئی
سجدۂ مسکین حسن ہر لحظہ باد اسوئے تو

حضرت امجد کی غزلیں تیسرے اور چوتھے دور کی یادگار ہیں اور انکی مقدار دوسرے کلام کے مدنظر نہایت قلیل ہے۔ آپ کی تمام غزلیں تصوف میں رنگی ہوئی ہیں اور فلسفی مسائل کی حامل بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے ان سے راز پنہانی جلوہ نما ہوتے ہیں جن تک رسائی اور پردہ دری ہر ایک کا کام نہیں ہوتا سوہ فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر بے پایاں ہیں جو تموج و تلاطم میں ہے۔ حقائق و معارف کا ایک بحر بیکراں ہے، جسکا کنارہ نہیں ملتا۔ پند و نصیحت کا ایک خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ امجد نے غالب کی بعض غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً ؎

"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں"

کے جواب میں امجد کی غزل کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:—

نالۂ جان خستہ جاں عرش بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں

لوزمین و آسماں دیدۂ دل میں آئے کیوں
میرے سیاہ خانہ میں کوئی دیا جلائے کیوں

اس غزل کے دو شعر خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہیں ؎

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤ
لبستہ ہو کو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں

بخشنے والا جب مرا عفو پہ ہے تلا ہوا
مجھ سا گنہگار پھر جرم سے باز آئے کیوں

اور مقطع کس غضب کا ہے:—

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیونکر آرزو
دل ہی نہیں جب اسکے پاس مطلب دل بر آئے کیوں

جیسا کہ بیان کر دیا گیا ہے حضرت امجد کی غزلوں کا پورا سرمایہ تصوف پر مشتمل ہے۔ اور غزل کے ایک ایک مصرع میں ایک نیا مضمون ہوتی ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔ اس میں کیفیت عبدیت اور معرفت الٰہی۔ توحید وجودی کے مسئلے کو صاف کہا گیا ہے اور موجودہ زمانہ کے صوفیا جسطرح بندگی میں کبریائی کرتے ہیں، ان کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر تعلیم نہیں ہو سکتی۔

ہم تو ایکبار اس کے ہو جائیں — وہ ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا
ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو — ایک نفس مجھ کو جو جدا نہ ہوا
کیا ملا وحدت وجودی سے — بندہ بندہ رہا خدا نہ ہوا
بندگی میں یہ کبریائی ہے — خیر گذری کہ میں خدا نہ ہوا
جا چکے عقل و ہوش تاب و تواں — لیکن اب تک ا نا فنا نہ ہوا

حضرت میر درد فرماتے ہیں:—

آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں — اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں

امجد کے رنگ میں اس کو ملاحظہ فرمائیں:—

کسطرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد — ہر پردے کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

تقدیر اور تدبیر کے مسئلہ پر شیخ ناسخ فرماتے ہیں:—

ہم خواب میں واں پہنچے تدبیر اسے کہتے ہیں — وہ نیند سے چونک اٹھے تقدیر اسے کہتے ہیں

اب امجد کی زبان سے سنو:—

وہ کرتے ہیں سب کچھ کر تدبیر اسے کہتے ہیں — ہم دھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

رباعیات

رباعیات کی قسم ایسی ہے جسپر امجد نے ہر زمانہ میں کثیر سرمایہ فراہم کیا ہے اور اگر اقلیم رباعی کا آپکو بادشاہ کہا جائے تو ناموزوں نہیں ہو سکتا ہے پنجاب کے مشہور شاعر حضرت گرامی مرحوم، جن کی بلند مرتبگی کا اعتراف علامہ اقبال کو بھی تھا، حضرت امجد کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:—

امجد بہ رباعی ست فرد امجد — کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز — رنج سرمد بگفت امجد امجد

امجد نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں رباعیاں کہی ہیں، مگر فارسی کی بہ نسبت اردو کا سرمایہ زیادہ ہے۔ رباعیات کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت امجد کی رباعیات مختلف موضوع پر مشتمل ہیں۔ اگر ان کو موضوع کے لحاظ سے منقسم کیا جائے تو حقایق و معارف، توحید و رسالت، عبادتِ الٰہی، اخلاق فلسفہ اور تصوف پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ان رباعیوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی رباعی میں دینی امور کو واضح کیا گیا ہے تو کسی میں دنیوی معاملات کہیں وحدانیت کی تبلیغ کی گئی ہے تو کہیں دنیا کی تباہی۔ بے نقاب کی گئی ہے کہیں سرمایہ داری اور دولت کی فریب کاریوں کو عریاں کیا گیا ہے تو کہیں مفلسی، تنگ دستی اور غریبی کو سراہا ہے کسی میں وجدانی، عرفان اور حقائق کے اسرار پنہاں ہیں تو کسی میں رسالت اور ختم النبوت کے شواہد پیش کئے ہیں کسی میں اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کو بیان کیا گیا ہے اور بہترین اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے تو کسی میں دنیا کی بے ثباتی اور نیکی کی ہدایت فرمائی ہے۔ رباعیات کا بڑا حصہ تصوف پر مشتمل ہے۔ تصوف کے اسرار، تصوف کے رموز، سلوک کی منزلیں، سلوک کے راستے صوفیاء کے مدارج اور تصوف کے مسائل سے یہ رباعیات مملو ہیں۔

یہاں چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:—

ہر ذرہ پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے — اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں — وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

ہر گام پہ چکرا کے گرا جاتا ہوں — نقشِ کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی تو سنبھال میرے لینے والے — میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے — کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی — سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

مشکل ہے بہت صاحبِ ایماں ہونا — کچھ کھیل نہیں ہے حق پہ قرباں ہونا
بس تن سے سرِ تسلیم ہوتا ہے — امجد آساں نہیں ہے مسلماں ہونا

اس جسم کی کینچلی میں اک ناگ بھی ہے — آوازِ شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے
سمجھا نہیں تنہا ہے اک تنکا بھی — خاموش دیا سلائی میں اک آگ بھی ہے

امجد مسلمان ہیں اور اسلامی شاعر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کی تعلیم عام انسانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہے۔ وہ دنیا میں نیک کام کرنے، نیکی کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی تعلیم قرآنی تعلیم ہے۔ آپ اپنے کلام کے ذریعہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر فرماتے ہیں۔ امجد کی نظمیں اور رباعیات میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کی کسی آیت یا کلمہ کی شرح کرتے ہیں۔ وہ ہر جگہ سچی مسلمانی اور ایمانداری کی ہدایت کرتے ہیں اور عمدہ زندگی اور بہترین زندگی کا نصب العین قرآن پر عمل کرنے کو بتاتے ہیں۔

امجد کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ آپ مختلف نہج سے انسان کو نیک بننے، نیکی کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ کی تعلیم کا ماحصل اور مقصد یہی ہے کہ چند روزہ زندگی کو نیک کاموں کی انجام دہی میں بسر کیا جائے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:—

اس نام کی زندگی میں کچھ جان تو ہو — گر بن نہ سکے فرشتہ انسان تو ہو
نیکی نہ ہوئی نہ ہو بدی بھی تو نہ کر — صوفی نہ ہوا نہ ہو مسلمان تو ہو

موجودہ زمانہ میں سرمایہ داری اور دولتمندی کی مذمت جدید شعراء کا ایک طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے اور دولت۔ دولت کی پکار ہے مفلس اور غریب یہ خیال کرتے ہیں کہ دولت مندی بڑی شے ہے اور اہلِ دولت بڑی راحت اور آرام میں ہونگے مگر اہلِ دولت سے پوچھو کیا واقعی ان کو راحت اور آرام میسر ہے تو جواب نفی میں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت آرام اور راحت کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ وبالِ جان ہوتی ہے۔ ان کو آرام سے سونا میسر نہیں ہوتا ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں اس کی دولت ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

امجد اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:—

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے — بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی — دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

انسان کا جسم ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں سینکڑوں کل پرزے کام کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی ایک گھڑی ہے جو چلتی رہتی ہے۔ انسان کے سانس میں ایک ایسی رفتار ہے جس پر زندگی کا دار و مدار ہے۔

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے — ہر وقت یہ شمعِ زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر — یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

خودی کے متعلق امجد کے خیالات ملاحظہ ہوں:—

ہیں مستِ مئے شہود تو بھی میں بھی — ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہان میں یا میں ہی نہیں — ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

حاصل نہ کیا مہر سے ذرہ تم نے — دریا سے پیا نہ ایک قطرہ تم نے
امجد صاحب خدا کو کیا سمجھو گے — اب تک خودی کو جب نہ سمجھا تم نے

دم بھر دمِ آدم کو سمجھتے ہوتے — دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے
یہ زعم ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں — اے کاش کہ ہم، ہم کو سمجھتے ہوتے

امجد کی زبان سے "رموزِ خودی" کو سنو۔

اس موتِ ناجات سے ڈرتا ہوں — زندہ ہونے کے واسطے مرتا ہوں
ظاہر ہوئے بے خودی میں اسرارِ خودی — بے خود ہو کر خودی کا دم بھرتا ہوں

جدید ترکی ادب

روشن اشرف انائیدن

؎ ترکی کے دستوری عہد کی سب سے بڑی خصوصیت ایک ادبی تحریک کا عروج ہے جو "ملی ادبیات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا سب سے بڑا رہنما عظیم المرتبت مفکر اور ماہر عمرانیات ضیا ر گیوک الپ تھا۔ اس اسکول کا عقیدہ تھا کہ قومی ادب کو اور زیادہ ترکی اسلوب پر ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ضیا گیوک الپ ایک فطری شاعر اور جوشیلا قوم پرست تھا۔ ساتھ ہی وہ مثال پرست بھی تھا اور اسے اخلاقی اور سماجی اصول بنانے اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ اس نے "ملی ادبیات" کو ترقی دی اور پھر اپنی فطری صلاحیت شہرت اور قابلیت سے "ینی مجموعہ" (نیا ریویو) کو چار چاند لگا دئے۔

ایک طرف تو یہ رسالہ اور ایک طرف "ترک یردو" (ترکی وطن) قومی ثقافت اور جذبات کو ابھار رہے تھے اور ثقافتی معلومات اور فنی تحقیقات میں اضافہ کر رہے تھے۔ جن جدید مصنفین کی تحقیقات ان دونوں رسالوں میں شائع ہوتی تھیں، انھوں نے ترکی نظم و نثر میں نئی طرح کی کشادگی، تازگی اور شوکت پیدا کی۔ خالدہ ادیب کے قلم میں بہت زور ہے اور نفسیات میں اس کی نظر بہت گہری پڑتی ہے، یعقوب قادری قارا عثمان اوغلو افسانے، ناول اور مضامین لکھتا ہے۔ اس کا اسلوب نہایت دلکش اور فنکارانہ ہے۔ رفیق خالد کو کہانیاں لکھنے کا خاص ملکہ ہے اور اس کی اظہار و بیان کی قوت تو اپنی مثال آپ ہے۔ عمر صفوتین روزانہ واقعات پر سنجیدہ تبصرے کرتا ہے اور فالح رفقی کے مختصر مگر چبھنے والے فقروں نے ترکی نثر میں ایک نیا لطف پیدا کر دیا ہے۔ مورخ احمد رفیق نے عثمانی عہد کے مفصل واقعات کی تصویریں کھینچ کر تاریخی واقعات کے بیان کا ایک اچھوتا اسلوب پیدا کیا ہے اور تاریخی موضوعات میں خاص دلچسپی پیدا کرا دی ہے۔ ترکی کے جید عالم فواد کوپرولو نے جو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے، ترکی ادب کی تاریخ میں ایک نیا رجحان اور وسعت اور گہرائی پیدا کی اور خود ضیا ر گیوک الپ کی عمرانیاتی تحریروں اور اصول سازی نے نوجوان طبقہ کو بے انتہا متاثر کیا۔ ساتھ ہی اس نے قدیم روایات نظم کیں۔ ان سب کے مضامین "ینی مجموعہ" میں شائع ہوتے تھے۔

اس رسالہ میں یحییٰ کمال کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ اگرچہ نظمیں تعداد میں بہت کم ہیں لیکن فنی لحاظ سے وہ حیرت انگیز خصوصیات کی حامل ہیں کیونکہ یحییٰ کمال کو جدید ترکی کا سب سے بڑا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ اسے زبان اور ٹکنیک پر اس قدر دسترس حاصل ہے کہ اس نے عروض کو جو ہزار برس پہلے سے رائج تھی۔ اظہار و بیان کا اکمل ذریعہ بنا دیا۔ اس کی نظموں کی شان و شوکت اور جزئیات کا بیان عہد ماضی کی شاندار تہذیب کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔

ایک بالکل دوسری قسم کا شاعر جس کا کلام دل و نظر کو موہ لیتا ہے احمد ہاشم ہے۔ اس کے خواب آور اشعار جن میں سنہری آسمان اور جھیل کے ساکت اور مسحور پانی پر شفق کے ہزاروں نازک رنگ ایک سماں پیدا کر دیتے ہیں اور جھیل کے کناروں پر بڑے پرندے محویت کے عالم میں کھڑے رہتے ہیں مگر رات کی آمد کا احساس ان کے دلوں میں ایک طرح کا انتشار بھی پیدا کر دیتا ہے۔

دونوں مذکورہ شاعر جدید ترکی شاعری کی عظیم الشان ہستیاں ہیں۔ یہ دونوں مغربی اور مشرقی تمدن سے بے حد متاثر تھے۔

دستوری عہد کی سماجی زندگی نے ایک اور ذریعہ اظہار پیدا کیا اور وہ ہے خطابت۔ حمد اللہ صوفی تانریور ترکی کا ایک مشہور شاعر اور نثار تھا۔ یہ پہلے استنبول یونیورسٹی میں مسلم فنون کا پروفیسر اور "ترکی اوجاغی" کا صدر تھا اور کسی زمانہ میں وزیر تعلیمات بھی رہا تھا۔ شاعر ہونے کے ساتھ ہی وہ مشہور مقرر بھی تھا۔ اس کی مرصع اور ٹھوس تقریروں کی دو جلدیں موجود ہیں۔

مزاحیہ نظم اور نثر بھی لکھی گئی۔ رفیق خالد نے اپنے شگفتہ اور چبھنے والے اسلوب اور فاضل احمد نے اپنی نظم و نثر کے مزاح اور اپنے بے پایاں علم و فضل سے نئے ادبی گلدستے تیار کئے۔ فاضل احمد نے "پیروڈی" کا نیا طرز نکالا۔ اسی طرح کا ایک اور مزاحیہ شاعر خالد نہاد ہے۔

اس زمانہ میں کچھ ڈراما نویسوں نے دوسروں کے ڈراموں سے استفادہ کر کے ڈرامے لکھے اور کچھ نے طبعزاد لکھے۔ ایک تھیٹریکل اسکول قائم ہوا جو دار البدائع کہلاتا تھا۔ رشاد نوری گونتکن، ابن الرفیق احمد نور الدین اور مصاحبزادہ جلال کے علاوہ جنھوں نے

؎ ۸ر فروری ۱۹۴۵ء کو ہز ایکسیلینسی روشن اشرف انائیدن سفیر ترکی نے "ترک خلق الیوی" میں ایک تقریر کی تھی۔ اس کا یہ اقتباس "فارن ریویو" سے لیا گیا ہے۔

خالص طبعزاد چیزیں لکھی ہیں۔ خالد فخری اور یوسف ضیا، نامی دو شاعروں نے دو منظوم ڈرامے بھی لکھے۔ یہ دونوں ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ یہ ڈرامے نئے تھیٹر میں بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلے گئے۔

اس اسکول کے علاوہ بھی بہت سے مشہور مصنفوں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً محمد عاکف۔ یہ روحانی زندگی اور جذبات کا شاعر تھا۔ اس کا مطمح نظر اسلام تھا۔ اس کی نظمیں صفحات کی عام سرخی کے تحت شائع ہوتی تھیں۔ یہ دور ان نظم میں اصلیت پر مبنی واقعات کی ترجمانی کرتا تھا جو نہ صرف اخلاقی اور سماجی کمزوری پر تنقیدات کی حیثیت رکھتی تھیں بلکہ اپنی رومانی اور مذہبی خصوصیات کی وجہ سے بہت دلکش بھی ہوتی تھیں۔ کچھ سال کے بعد اس شاعر کو عوام کے سامنے آزادی کا نغمہ لکھ کے پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ ایک اور اچھا شاعر مدحت عال تھا۔ یہ محمد عاکف کا بڑا دوست تھا۔ اس نے محمد عاکف کی سوانحعمری لکھتے وقت اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ مدحت عال نے حال ہی میں "استنبول سوم" کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے جس میں قدیم دار الخلافہ کی سماجی جھلکیاں نظر آتی ہیں ساتھ ہی اس میں انقلابی اور بین الاقوامی جذبہ کو بڑے اہتمام اور صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت "ملی ادبیات" کے اثر سے ترکی لغت کا استعمال اور ترقی رہی ہے اور بہترین تصنیفات پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک وجود میں آئیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت کے زوال ہی نے قومی ادب کو عروج بخشا۔

جنگ عظیم نے ترکی سلطنت پر برا اثر ڈالا۔ اس کے مقبوضات چھین لئے گئے اور دار السلطنت پر سنڈورس کے صلحنامہ کی رو سے اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ فاتحین نے ترکی کی فوجیں گھٹا دیں، برے انتظام اور مستقل خوفناک جنگ نے آبادی کم کر دی، حکومت پرانے اصولوں ہی پر چل رہی تھی جس کی وجہ سے کوئی فوری تنظیم تو غیر ممکن ہو گئی۔

تجلیات

امین حزین سیالکوٹی

آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
مسکراتی حسین آنکھوں سے
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
گل محبت نے جو کھلایا ہے
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!
منکر آتش درون جگر!
آنسوؤں کی بہار دیکھتا جا!

"ابر غم کی پھوار" دیکھتا جا!
"درد کا اشتہار" دیکھتا جا!
"شبنم لالہ زار" دیکھتا جا!
اس کا "بھیگا نکھار" دیکھتا جا!
لالہ رنگ آبشار دیکھتا جا!
آ کے سیل شرار دیکھتا جا!
او تغافل شعار دیکھتا جا!

یعنی بربادیوں سے پہلے ہی
"خرمن انتظار" دیکھتا جا!

سلطان اپنے تخت و تاج سے زیادہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس لئے سلطنت کا رعب جاتا رہا اور آخرکار وہ خود بھی جاتی رہی۔ لیکن ترک قوم میں زبردست قوت اور صلاحیت موجود تھی اس لئے اس نے سلطان وحید الدین کے ساتھ زوال پذیر ہونا پسند نہ کیا۔ ترک قوم میں جس نے تاریخ میں بڑے کارنامے کر دکھائے ہیں وطنیت کا جذبہ عود کر آیا۔ اس نے آزاد ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ اناطولیہ کے وطن پرستوں نے زندہ جاوید رہنما اتاترک کی دانشمندانہ قیادت قبول کر لی۔

ترکوں کی فتح کے بعد سے قوم کی تاریخ نئی راہوں پر گامزن ہوئی۔ اناطولیہ کے دار الخلافہ انقرہ میں جدید اصولوں پر ایک نئی ترکی جمہوریت قائم ہوئی۔ اب ترکی سلطنت کی بجائے ایک متحد، ہم آہنگ اور آزاد ملک بن گیا۔

نئی حکومت کے قیام سے نئے عہد کا آغاز ہوا۔ نئی راہیں نکلیں اور بہت سی اصلاحیں وجود میں آئیں۔ نئی جمہوریت کی خصوصیات قومیت، ارضیت اور انقلاب تھیں۔ ان تبدیلیوں کا تہذیب اور فنون وغیرہ پر بھی اثر پڑنا ضروری تھا۔ تعلیم میں ثانویت کا تو شروع ہی میں خاتمہ ہو گیا اس کے بعد مذہبی مدارس اور خانقاہیں بند کر دی گئیں اور لازمی دنیاوی تعلیم کی بنیاد پڑی۔

لیکن اس سے زیادہ اہم اصلاح رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ یہ بنیادی اور جدید زمانہ کے پیش نظر ایک عجیب و غریب قسم کی تبدیلی تھی۔ عربی حروف کے رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط اختیار کیا گیا۔ یہ ترکی زبان کے لئے نہایت مناسب تھا کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسے سیکھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس طرح عام خواندگی میں مدد ملتی ہے بلکہ اسے اختیار کرنے سے بہت سے عربی فارسی کے مترادف الفاظ بھی ترک کرنے میں سہولت ہوئی۔ یہ الفاظ صدیوں سے ترکی میں داخل ہو رہے تھے۔ ہم اسے زبان کی "خارجی رعایت" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ اس طرح بیکار کے لفظوں اور فقروں سے

نجات مل گئی اور اب زیادہ مختصر، صاف اور ترکی خصوصیات کی حامل ہوتی جا رہی ہے۔

نئے رسم الخط کے رائج ہونے سے دوسرے نتائج بھی پیدا ہوئے۔ اتاترک نے لسانی اور تاریخی تحقیقات کی دو انجمنیں قائم کی تھیں۔ پہلی انجمن کا مقصد زبان اور دیہاتی گیتوں کے متعلق تحقیقات کرنا تھا۔ اس نے ضروری اصطلاحات اختراع کیں اور ایک لغت تیار کی جبکہ دوسری انجمن نے ترکی تاریخ کے مختلف شعبوں میں تحقیقات کی جو تاریخ سلاطین کے زمانہ سے عثمانی عہد تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ عظیم الشان عہد تاریخ کا محض ایک باب بنا۔ یہ دونوں انجمنیں آج بھی کام میں مصروف ہیں اور انہیں صدر جمہوریہ عصمت انونو کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔

ان کوششوں میں "خلق الوی" (عوام کے گھر، یعنی ثقافتی مراکز) اور ڈرامہ کی ایک اکیڈمی کا اور اضافہ ہوا۔

دنیا کے ادب سے تراجم کا بھی نیا دور شروع ہوا۔ دوسری قوموں کے شاہکار ترکی میں منتقل کیے گئے۔ آندرے جیڈ، آندرے مورو، پیئر لوتی، اناطول فرانس، ایمیلی زولا، مے دی موپاساں، گستیو فلوبیرت، بالزاک، پریمی، اسٹنڈھل، موست، الا رتاگن، بودیلیر، وکٹر ہیوگو، برینارڈین دے سین پیری، والٹیر، روسو، مونٹسکیو، راسین، کارنیل، مولیئر، لافونٹین، شلر، گوئٹے، ڈکنس، ایڈگر ایلن پو، اوسکر وائلڈ، بائرن، شیکسپیئر، گورکی، چیخوف، ٹالسٹائے، دوستووسکی، ترگنیف، لیرمنتوف، پشکن، گوگول، جبریل دی اننزیو، ابسن، کے شاہکار اور زلاہی لاجو کی ایک کتاب ترکی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

ترکی میں جدید مصنفین اور حال کے شاہکاروں ہی کے ترجمے نہیں ہوئے ہیں بلکہ نشاۃ الثانیہ کے شاعروں اور ادیبوں مثلاً دانتے، پیٹرارک، بوکیشیا اور قدما مثلاً ہومر، افلاطون، ارسطو، سقراط، ہیرودوتس، ورجل، ہوریس، شیلس اور اوڈیو کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان بے شمار کتابوں سے ترک نوجوانوں کو متعدد مشاہیر کے کلام سے واقفیت ہو گئی ہے۔ اس طرح وہ ہر قوم اور عہد کے خیالات سے آشنا ہو گئے ہیں۔ ان میں جدید اور شاعر بھی شامل ہیں، نشاۃ الثانیہ اور عہد قدیم کے بھی۔

تقریر کے فن نے بھی بہت ترقی کی ہے۔ سخت جد و جہد، آخری نجات کا یقین محکم، قومی آزادی اور فتح کی خوشی اور پھر حیرت انگیز سماجی اور سیاسی اصلاحات نے ترکی میں دو بڑے مقرر کمال اتاترک اور عصمت انونو پیدا کئے۔

آج ترکی کی ادبی دنیا میں مشہور ناول نویس، مضمون نگار، نقاد، شاعر اور ڈرامہ نویس موجود ہیں مثلاً خالدہ ادیب، یعقوب قادری اور رشاد نوری گنتکن۔ ان میں آخری ادیب کی عمر دوسروں سے کم ہے لیکن اس کے ناولوں کا اسلوب نہایت شگفتہ، اس کی مشہور مختصر کہانیاں بالکل اچھوتی اور ڈرامے نہایت کامیاب ہوتے ہیں۔ ان تینوں مصنفوں کی کتابیں دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

کامیاب نثاروں میں فالح رفقی آتے کا نام لینا ضروری ہے۔ اس کے اسلوب کی خصوصیات اختصار، جذباتیت، اور حیرت انگیز شوخی اور بوقلمونی ہیں۔ ایک اور غیر معمولی مصنف عبدالحق سناسی حصار ہے جو پچھلے چند برسوں میں نہایت مشہور ہو گیا ہے۔ اس کا ایک ناول جس کا نام "فہیم بے اور ہم" ہے ابھی شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک جذباتی کردار کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اسی مصنف نے حال ہی میں حافظہ کا شاندار تجزیہ اور حقیقت کی ماہیت کے متعلق ایک مجرّد تصنیف پیش کی ہے اور اس کا نام "باسفورس کی چاندنی" رکھا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں ادبی تنقید اور مضمون نگاری میں بہت ترقی اور کامیابی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ کی اہم شخصیتیں وزیر تعلیمات، شاعر اور مضمون نگار حسن عالی یوجل اور باشعور ادبی ناقد نور اللہ آتاچ اور پچھلی صدی کے ترکی ادب کا ماہر اور صدیوں کے ترکی اور مغربی ادب کا موازنہ کرنے والا اسمٰعیل حبیب ہیں۔

ترکی زبان اور اس کے ادب کی تاریخ کا خاص ماہر پروفیسر محمد فواد قوپرولو ہے جبکہ مشہور شاعروں، قدیم افسانوی نظموں اور دیہاتی گیتوں پر دوسرے شاعروں نے مفید معلوماتی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ اب کچھ نئے شاعر بھی منظر عام پر آ رہے ہیں مثلاً فاروق نافذ چاملی بیل، نجیب فاضل قیصا کورک، کمال الدین کامی، بہجت کمال چاغلار، یامسی، محمدی تانپی نار اور حبیب ورانس۔ ان سے نہایت عمدہ شعری تخلیق کی امید کی جاتی ہے۔ ان شاعروں نے ترکی زبان کو گھر کی یاد سے لے کر خونیں تمنا، زندگی گزرنے کا افسوس، کمال اور حسن کے لئے دلیرانہ جذبات اور روح کے پوشیدہ اور حیرت انگیز خواب تک کو روشناس کرایا ہے۔ ان کے شعروں میں حلاوت اور شرارت جذبات کارفرما ہے۔ فاروق نافذ چاملی بیل، نجیب فاضل قیصا کورک اور داد نہیم طور نے ڈرامے لکھے ہیں۔ اول الذکر منظوم ڈرامے لکھتا ہے

اور باقی دونثر ہیں۔ یہ ڈرامے ان کے دقیق شعور کے مظہر ہیں۔

ان فنکاروں کی متحدہ کوششوں سے وہ ساری رکاوٹیں جو ایک نسل پیشتر فنکاروں کے لئے وبال جان تھیں اب اس طرح ناپید ہوگئی ہیں جیسے کہ ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اب میدان صاف ہے۔ ترکی نظم و نثر سے غیر ملکی اثرات اور تعلقات خارج ہو گئے ہیں اور اب ان میں سادگی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ نظم و نثر اپنے نرم اور سخت لہجوں سے صحیح جمالیاتی ذوق کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور الفاظ اپنے مناسب اور متعین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور اب خارجی تصنع اور تکلف کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ پُرتکلف صنائع و بدائع تشبیہات اور استعارات کی جگہ سادہ زبان استعمال ہوتی ہے اور عوام اور خواص کے شاعروں کے درمیان صدیوں تک خلا رہا تھا اب وہ بھی پُر ہو گیا۔ جدید قومی شاعری میں ان دونوں قسموں کا ملاپ پایا جاتا ہے، ترکی نثر عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد تک پہنچ رہی ہے اور اب اظہار خیالات کا بہتر سے بہتر ذریعہ بنتی جارہی ہے۔ اب راستہ ڈھونڈنے کے لئے اندھیرے میں ٹٹولتے پھرنا نہیں پڑتا۔ راستہ مل گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ زندہ فن کا قوم کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچنا ضروری ہے اور یہی اس کی جدت اور تاثیر کا راز ہے۔

ایک عرصہ سے دوسری قوموں کے ادب سے متاثر ہوتے رہنے کی وجہ سے ترکی ادب بہت مالدار ہو چکا ہے اور اب بڑی ترقی کر رہا ہے۔ میں نے کچھ مصنفوں کا ذکر کیا ہے جن کی تصنیفات اس بات کی شہادت پیش کرتی ہیں اور نوجوان ادیبوں سے تو اور بھی کامیاب تصنیفات کی امید کی جاتی ہے۔

اس کے باوجود جدید ترکی ادب اپنی روایات سے مطمئن ہونے کے بجائے اپنی تنقید میں مصروف ہے کیونکہ اس کے سامنے ساری قوم کی روح اور خصوصیات کی صحیح ترجمانی کرنے کا نصب العین موجود ہے۔ یہ قومی زندگی کے ہر پوشیدہ پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اسے صحیح اور مکمل اپج کا شرف حاصل ہو سکے اس طرح وہ دنیا کے ادب میں اپنے لئے مناسب جگہ حاصل کرے گا۔ (فارن ریویو سے ماخوذ)

اعلان

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔

(ادارہ)

ہندوستانی موسیقی

۲

شاہد احمد دہلوی

تال

ہندوستانی موسیقی میں سُر کے بعد دوسری اہم چیز تال ہے۔ گانے بجانے اور ناچنے میں وقفے اور تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے تال وجود میں آئی۔

ہماری موسیقی میں تال نے بڑے پیچیدہ رُوپ دھار رکھے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے سنگیت میں صرف بار بار کے وقفوں کی تالیں مروّج ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی ہزاروں شکلیں تھیں جن میں سے سینکڑوں اب بھی رواج میں ہیں۔ تال ایک مکمل اور دقیق علم ہے اور فن بھی۔ ہندوستانی موسیقی کے اور شعبوں کی طرح تال بجانا خود ایک بڑا آرٹ ہے جس کے بغیر گانے بجانے اور ناچنے کا کوئی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔

سارا نظام عالم کل کائنات اور اس کی موجودات "لے" یعنی باقاعدہ اور منظم حرکت پر قائم ہے۔ کائنات میں جتنی بھی مادّی چیزیں ہیں وہ یا تو متحرک ہیں یا ساکن۔ اور اگر نظام عالم کو علم ہیئت کی روشنی میں دیکھا جائے تو ساکن و جامد کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ یہ زمین جس پر ہم بستے ہیں سورج کے گرد فضائے بسیط میں محو رقص ہے۔ ہزاروں سال سے ایک تسلسل اور ہم آہنگی سے رقص جاری ہے اور یہ رقص بھی دوگونہ ہے۔ ایک تو سورج کے گرد اور دوسرا اپنے محور پر۔ ایک کا نتیجہ موسم اور دوسرے کا دن اور رات۔ یہ سبق آپ نے اسکول میں پڑھا ہوگا۔ اس لئے اب اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری زمین ایک دن اور ایک رات یعنی چوبیس گھنٹے میں اپنا چکر پورا کرتی ہے اور سورج کے گرد ایک سال میں۔ اس رفتار میں کبھی فرق نہیں آتا۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ ایسا کیوں ہے؟ نظام کائنات ایک مقررہ اصول کے ماتحت حرکت میں ہے اس حرکت کی رفتار دائم و قائم ہے۔ یہ کرشمہ ہے ہم آہنگ گردش کا۔ ایک مقررہ رفتار کا جسے انگریزی میں (Rythmic Motion) اور موسیقی کی اصطلاح میں "لے" کہتے ہیں۔ "تال" لے کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ ہاں تو ہماری دنیا ہزاروں سال سے ایک مقررہ لے پر ناچ رہی ہے اور اس کی تال کا شمار شب و روز اور ماہ و سال سے کیا جاتا ہے۔

تال کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ مخفف ہے تانڈو اور لیستو کا۔ تانڈو کا "تا" اور لیستو کا "ل" کر تال بنا ہے۔ روایت ہے کہ گردش کائنات سے پیدا ہونے والے نغمۂ کیف انگیز کی لے پر مہادیو اور پاربتی نے رقص کیا۔ مہادیو کا رقص تانڈو کہلایا اور پاربتی کا لیستو ناچ کہلایا۔ دونوں طریقوں نے کرشن اور رادھا کی گوپیوں میں بھی رواج پایا۔

لے کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ موجودات میں کوئی شے لے سے خالی نہیں ہے مثلاً قلب انسانی کی ضربات۔ سانس کا آنا جانا۔ پرندوں میں پروں کی جنبش۔ دریا کی روانی۔ چڑیوں کی چہکار سب میں ایک تناسب رفتار یعنی لے ہے۔ یونانیوں نے اس لفظ کے مفہوم کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ بیجان چیزوں کے لئے بھی تناسب کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ مثلاً صنم گری اور مصوری میں بھی لے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ شاعری اور موسیقی کا دارومدار لے ہی پر ہے۔ کیونکہ لے کا مصرف یہ ہے کہ جو آوازیں سنائی دیں ان کا درمیانی وقفہ یا فصل متعین کرے۔ یہ آوازیں چاہے موسیقانہ ہوں یا نہ ہوں۔ جو حیثیت شاعری میں بحر کو حاصل ہے وہی حیثیت موسیقی میں لے کی ہے۔ شاعری میں لے کی پیمائش کا پیمانہ رکن مقرر کیا گیا ہے اور موسیقی میں اس کا مرادف ماترہ ہے۔ لکھنؤ کے ایک نازک خیال اُستاد سُنا ہے کہ عروض و بحر کی تعلیم اپنے شاگردوں کو طبلے پر دیتے تھے۔ یہ بالکل قرین قیاس بھی ہے کیونکہ شعر کی بحر اور طبلے کی ضربات میں مکمل صوتی مماثلت ہے۔ مثلاً اس مصرعہ کو لیجئے:- تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ اس مصرعہ کی تقطیع ازروئے شاعری یہ ہوگی:- فعولن فعولن فعولن فعولن۔ اور طبلے کی زبان میں اس کے بول یہ ہوں گے:- دھا دھن: دھا دھن نا دھا دھن نا دھا دھن نا۔ وزن ایک ہی ہے، صرف بولوں کا فرق ہے۔ اگر مصرعہ میں کوئی بحر نہ ہو تو وہ شاعری سے خارج سمجھا جائے گا۔ اسی طرح موسیقی بھی لے کی محتاج ہے گویا اصل بنیاد بحر اور لے ہے۔ شاعری میں جس طرح بحریں مختلف ہوتی ہیں موسیقی میں تالیں مختلف ہوتی ہیں اول الذکر کے علم کو علم عروض اور ثانی الذکر کو علم ضربات یا ہندی میں تال ادھیائے کہتے ہیں دوسرے علوم کی طرح یہ علم بھی ایک ناپید اکنار سمندر ہے جس کی شناوری کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ وقت کوتاہ و قصۂ طولانی۔ یہاں صرف مختصراً کچھ عرض کیا جائے گا۔

گانے والا جو کچھ بھی گاتا ہے کسی نہ کسی ٹھیکے یا تال میں گاتا ہے اس کے بول ایک مقررہ فصل سے ادا ہوتے ہیں۔ اس رفتار کو تال کہتے ہیں۔ تال کے چار جزو ہوتے ہیں (۱) ماترے (۲) ضربیں (۳) بول اور (۴) لے۔

(۱) ماترہ:- چھوٹے سے چھوٹے جزو یا اکائی کو کہتے ہیں۔ مثلاً جیسے ہم کہتے ہیں نا دھن دھن نا تو ان میں سے ہر لفظ ایک ماترہ ہے۔ اس ٹکڑے کو ہم جلدی جلدی بھی کہہ سکتے ہیں اور رُک رُک کر بھی۔ تو پھر ماترہ کا معیار کیا ہوگا؟ اس کا اوسط وقفہ نبض انسانی کی دو ضربوں کے درمیانی وقفے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ ماتروں کی تعداد مختلف تالوں میں چار سے لے کر اٹھاسی تک پائی جاتی ہے۔

(۲) ضرب:- تال یا ٹھیکہ کے ان حصوں کو کہتے ہیں جن پر تالی بجائی جاتی

ہے یا خالی دکھائی جاتی ہے یعنی تال نہیں بجائی جاتی بلکہ صرف اشارہ کیا جاتا ہے

(۳) بول :- ماتروں کی آوازوں میں بوقلمونی پیدا کرنے کے لئے مختلف صوتی الفاظ وضع کئے گئے ہیں جیسے دھن، نا، ترکٹ، دھرکٹ، تک دھن، تن، تا، گد، گن وغیرہ۔

(۴) لے :- ٹھیکے کی رفتار یا مزاج کو کہتے ہیں۔ اس کے تین درجے ہوتے ہیں بلمپت۔ مدھ اور درُت۔ یعنی ٹھہری ہوئی، درمیانی اور تیز۔ اچھے گانے بجانے والے ان سب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی باریکیوں مثلاً آڑ، کواڑ، برآڑ، اور دُگنی، ڈیوڑھی، چوگنی لے کرکے دکھاتے ہیں۔ تال اور لے علم ہندسہ سے تعلق ہے اور جسے معمولی حساب آتا ہے وہ اس کی تقسیم کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

حسابی علم کے مطابق ہزاروں تالیں وجود میں آسکتی ہیں لیکن زمانۂ قدیم میں بھی کہا جاتا ہے کہ تین سو ساٹھ تالیں برتی جاتی تھیں انہیں گھٹا کر ۹۲ بنیادی تالیں میاں تان سین نے قائم کیں۔ زمانے کی سہل پسندی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان میں بھی کمی آتی گئی یہاں تک کہ بیس پچیس تالوں کا برتنے والا بڑا گانا تک سمجھا جاتا تھا۔ آج کل صرف دس بارہ تالیں رائج ہیں جن میں سے معروف درج ذیل ہیں :-

(۱) اکتالہ (بارہ ماترے) :- دھن دھن / دھاترک / تونا / کت تا / دھاترک / دھی نا۔

(۲) دھمار یا چوتالا (بارہ ماترے) :- دھا دھا / گھن تا / کت تا / گھن تا / کت تا / گھن تا / تٹ کٹ / گد گن۔

(۳) سول فاختہ (دس ماترے) :- دھن دھن / دھا دکٹ / دھن دھن / دھاترکٹ / تن نا۔

(۴) جھپ تال (دس ماترے) دھن نا / دھن دھن نا / کت نا / دھن دھن نا۔

(۵) جھومرا (چودہ ماترے) دھن دھاترکٹ / دھن دھن دھاترکٹ تن تاترکٹ / دھن دھن دھاترکٹ۔

(۶) دھمار (چودہ ماترے) :- کا دھی ٹ / دھی ٹ / دھا کے / تی تے / تی تے / تا آ۔

(۷) روپک (سات ماترے) تن تن تا / دھن نا / ...

(۸) پشتو (سات ماترے) :- ترکٹ دھین / دھیا دھا / تین۔

(۹) تتالہ (سولہ ماترے) :- نا دھن دھن نا / نا دھن دھن نا / تن تن نا / تا دھن دھن نا۔

(۱۰) تلواڑہ (سولہ ماترے) دھا ترکٹ دھن دھن / دھا دھا تن تن / تا ترکٹ دھن دھن / دھا دھا دھن دھن۔

لے اور تال کا حساب شعوری اور محسوس طریقے پر گنتی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی کو تال اور لے کی اچھی سمجھ ہو جاتی ہے تو لے اس کے مزاج میں رچ جاتی ہے گویا لے اس کی ذات کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ اس طرح اسے لے کا غیر شعوری احساس ہو جاتا ہے اور ماتروں کو انگلیوں پر شمار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ درجہ مشق و مزاولت سے حاصل ہوتا ہے۔ تال کی ضربات سماعت میں ایک لطیف ہیجان پیدا کرتی ہیں جو تخیل میں ایک پُرکیف تموج برپا کردیتی ہیں۔ اس عمل سے متفکرہ قوت سے فعل میں آتی ہے اور وہ دھندلی تصویریں یا پرچھائیاں جو لے سے وابستہ ہوتی ہیں اُجاگر ہو کر روح کو ایک طربناک حیات تازہ سے دوچار کردیتی ہیں۔ قدما اس احساس سرخوشی کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ جب لے کا زیر و بم گردش کائنات کے نغمۂ شیریں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو ہمارے احساسات و مدرکات آزاد ہو کر اپنی اصل سے وصل ہو جاتے ہیں۔ ہر چیز کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے اور اپنی اصل سے مل جانے کے لئے بیقرار رہتی ہے اور جب کسی بیرونی تحریک سے اس لے میں جو ہمارے وجود میں خفتہ ہے، بیداری اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے تو ہماری روح نشاط و سرمدی حاصل کرتی ہے۔

تال کے کئی ساز زمانہ نامعلوم سے چلے آتے ہیں۔ ضرورت اور رواج کے مطابق کئی ساز وجود میں آئے ان میں سے بعض ہم آہنگ نہیں ہو سکے یا سنگیت کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکے اور ماضی کو سونپ دیئے گئے۔ بعض نے مطابقت کی اور رائج ہوئے۔ بعض ایسے گھلے ملے کہ ناگزیر ہو گئے بعض سنگت کے لئے مخصوص ہوئے اور بعض علیحدہ بجائے جانے کے لئے ان میں سے معروف یہ ہیں :-

پکھاوج - طبلہ - ڈھول - تاشہ - نوبت - نقارہ - ڈھولک - خول ڈیرو - ڈمرو - دف - دائرہ - مرونہ - کھنجری - مربع - جھیل - جلبل اور چوگھڑا۔ یہ سب تال کے ساز ہیں اور سب کا بنیادی اصول ایک ہے۔ فرق شکل، باج اور آواز کا ہے۔ کوئی ایک ہاتھ سے بجایا جاتا ہے، کوئی دونوں سے اور کوئی چوبوں سے۔ کوئی جلسوں میں بجایا جاتا ہے، کوئی جلوسوں میں ہر ساز کا موقع محل جدا ہے۔ تمدن کی چڑھتی ہوئی اُمنگ اور تہذیب کی پھیلتی ہوئی روشنی کے ساتھ ساتھ تال کے مختلف ساز وجود میں آتے رہے ان ایجادوں کے بے رنگ خاکوں میں اختراع کے فنکار نے رنگ بھر کر ارتقائے زمانہ کو سونپا اور موجودہ زمانے میں جتنے بھی تال کے ساز ہیں سب نہیں تو ان میں سے بیشتر انہی قدیم سازوں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں ہندوستان کے قدیم ترین سازوں میں سے پکھاوج اب تک موجود ہے۔

یہ تال کا ایک نہایت مکمل ساز ہے۔ ہندو علم الاصنام کے مطابق پکھاوج گنیش دیوتا نے ایجاد کی ہے۔ گائیکی کے قدیم طریقوں یعنی دھرپد اور ہوری کا ساتھ پکھاوج ہی پر کیا جاتا تھا۔ طبلہ بعد کی ایجاد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے پکھاوج کے دو ٹکڑے بیچ میں سے کر کے طبلہ بنایا اور اس کے بول پکھاوج سے جداگانہ مقرر کئے۔ پکھاوج پر کھلے بول بجائے جاتے ہیں یعنی پورا ہاتھ کھول کر ضرب لگائی جاتی ہے اور اس طرح جو آواز پیدا ہوتی ہے اس میں ایک ایسا شکوہ ہوتا ہے کہ سننے والے دہل کے رہ گئے ہیں کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور سہانی توپیں چھوٹ رہی ہیں۔ کبھی بادلوں کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور بجلی سی کڑکتی چلی آتی ہے جو سمع پر اس طرح گرتی ہے کہ سننے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کبھی خوش گلو پرندوں کی چہکار سنائی دیتی ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پہاڑی چشمہ اپنا راحت آفریں نغمہ گنگناتا عالم خواب میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ طبلہ اپنے بولوں کی خوبصورتی اور نزاکت کی وجہ سے مقبول ہوتا چلا گیا اور پکھاوج آہستہ آہستہ منظر عام پر سے ہٹتے ہٹتے مخصوص فنکاروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ آجکل شمالی ہند میں پکھاوجیوں کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ جنوبی ہند میں اس کا اب بھی رواج ہے اور کرناٹکی موسیقی کا اہم جزو۔

دلی میں جب سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہوئی۔ تو شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی۔ رقص و سرود کی محفلوں سے یہاں کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ موسیقی جیسے فن لطیف کو یہ فضا خوب راس آئی اور فنکاروں نے اسے بہت ترقی دی۔ خود بادشاہوں اور سلاطین زادوں نے یہ فن سیکھا اور اس میں استادی کا درجہ حاصل کیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ ظفر کی بنائی ہوئی چیزیں اب بھی گائی جاتی ہیں۔ دلی میں چونکہ شاہی تھی۔ اس لئے بھانت بھانت کا فنکار یہیں آتا اور اپنے نصیب چمکاتا جسوں کی یکجائی اور میل ملاپ نے اپنے پرائے، شہر والے اور باہر والے کا فرق مٹا دیا تھا۔ دلی کے رنگ میں رنگ کر سب دلی والے ہی بن گئے تھے۔ چنانچہ یہاں کی ستھری تہذیب اور ٹکسالی زبان کی طرح یہاں کی گائیکی اور بجائیکی بھی ایک خاص رنگ کی چیز بن گئی تھی، دلی اجڑی تو لکھنؤ آباد ہوا۔ دلی کی خزاں لکھنؤ کی بہار بنی۔ پروانے وہیں گرتے ہیں جہاں شمع ہوتی ہے۔ نواب وزیر کی شمع نے دلی کے پروانوں کو کھینچ لیا۔ کچھ ماحول اور فضا کا اثر، کچھ اپنی تراش خراش کا شوق، زبان کی طرح سازوں کے باجوں میں بھی جدتیں پیدا کی گئیں۔ ان تبدیلیوں میں سب سے زیادہ طبلہ کا باج متاثر ہوا۔ چنانچہ دلی کے باج سے علیحدہ پورب کا باج وضع ہوا۔ جس طرح شاعری میں مختلف بحریں ہوتی ہیں اسی طرح طبلے میں ٹھیکہ، قاعدہ، دوہرا، ٹیپہ، گت، پرن، ٹکڑا، فقرہ، چیکارہ، پرن اور تہائی یعنی سات مختلف اوزان ہیں۔ دلی والے طبلے کا خالص باج بجاتے ہیں۔ پورب والوں نے پکھاوج، نقارہ اور تاشہ وغیرہ کے نقشے طبلے میں شامل کر لئے۔ دلی والوں نے قاعدے، چیکارے، ریلے اور چار باغ پر زور دیا۔ پورب والوں نے گت، پرن، چکی، چپکی اور ٹکڑوں کو نکھارا۔ دلی والے کنار بجاتے ہیں اور پورب والے سیاہی۔ دلی کا طبلہ پوروں سے اور پورب کا پورے ہاتھ سے بجتا ہے۔ انہیں اپنے باج پر ناز ہے اور انہیں اپنے پر۔ ہماری رائے میں اچھے تو دونوں ہی ہیں مگر بہتر وہ ہے جو سننے والے کو پسند آ جائے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ ہاں ایک تیسرا باج اور بھی ہے اس کا نام ہے اجراڑا۔ میرٹھ کے قریب جوار کا علاقہ اجراڑا کہلاتا ہے یہاں کے طبلہ نوازوں نے باج تو دلی ہی کا لیا ہے مگر انھوں نے اس کو اپنا طرۂ امتیاز بنا لیا۔

تال کے سازوں کا ذکر آیا ہے تو مختصراً چند اور سازوں کا حال بھی سن لیجئے۔

تانت اور تاروں کے ساز دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مضراب سے بجائے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو گز سے بجائے جاتے ہیں۔ مضراب یا جوے سے بجائے جانے والے سازوں میں رُدر بین، سرسوتی بین، وچتر بین، رباب، سرود، سُر سنگھار اور ستار ہیں اور گز سے بجائے جانے والے سازوں میں طاؤس کا بچھو، دلربا، سارندہ، دوتارہ، چکارہ، اور سارنگی ہیں۔ انکی شکلوں میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے مگر ان کے بجانے کے اصولوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے مضراب سے بجانے والا ساز تار پر گز چلانے سے بجتے ہیں۔ کسی میں پردے ہوتے ہیں جیسے ستار اور دلربا میں۔ کسی میں پردے نہیں ہوتے۔ مثلاً بین، سرود اور سارنگی۔ کسی میں باج کی انگلیاں تار پر رکھی جاتی ہیں اور کسی میں تار سے ملا کر تار کے پہلو میں۔ سارنگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسکا اصلی نام سو رنگی ہے اور یہ نام اسوجہ سے پڑا تھا کہ اس میں سینکڑوں رنگ گائیکی کے پیدا ہوتے ہیں۔ گلے کا ساتھ جتنا اچھا اس ساز پر ہو سکتا ہے کسی اور ساز پر نہیں ہو سکتا گلے کی تمام حرکتوں کی ادائیگی کے علاوہ سارنگی میں یہ خوبی بھی ہے کہ اس میں دوسرے معروف سازوں کے باج بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یوں گائیکی اور بجائیکی کی جملہ شکلوں کے صحیح اور سچے نقشے سارنگی میں اتارنے کی صلاحیت ہے۔ سارنگی جتنا مکمل ساز ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ سُروں کے باریک مقام اچھے فنکار ہر تار کے ساز میں ادا کر سکتے ہیں لیکن گمک، دمک، گدا دھماکا، تان بندہان، شدھ و سنکیرن تانوں اور انگوں کو ادا کرنا صرف سارنگی ہی میں ممکن ہے۔ اس کے علاوہ الاپ، جوڑ، سُوت، میینڈ، سگلاؤ، بچاؤ، گمک لہک، ٹھاٹ جیسی باریکیاں جتنی نمایاں ہوتی ہیں کسی اور ساز میں نہیں ہوتیں۔ مضراب کے سازوں کا باج جیسے جھالے، مضرابیں، لڑکھتا، ٹوٹ اور چنگاری وغیرہ بھی سارنگی ہی میں آسانی سے ادا ہو سکتا ہے

اس کی بھی دو شکلیں ہیں ایک میں گز کو تقریباً دہی حیثیت دیدی جاتی ہے جو مضراب کی ہے۔ دوسری میں انگلیوں کی مشق کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ مضراب کا انگ ان سے پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی سنگیت گانے کے چند طریقوں یا ڈھنگوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:—

(۱) الاپ (۲) دھرپد (۳) ہوری (۴) سادرہ (۵) ٹپہ (۶) خیال (۷) ٹھمری (۸) دادرا (۹) ترانہ (۱۰) تروٹ (۱۱) چترنگ (۱۲) غزل (۱۳) قوالی (۱۴) تھیٹر کی دھنیں (۱۵) گیت اور (۱۶) فلمی گانے۔

(۱) راگ راگنیوں کی شکلیں اور خصوصیات واضح کرنے کے لئے الاپ کا طریقہ ایجاد ہوا۔ الاپ راگ کے اظہار کا سب سے شدھ اور صحیح طریقہ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ راگ الاپ اور روپک الاپ۔ راگ الاپ میں گرہ، انش، منذ، تار، نیاس، اپ نیاس، الپت وغیرہ سب خصوصیات راگ کی پائی جاتی ہیں۔ روپک الاپ میں استھائی اور انترہ صاف دکھایا جاتا ہے۔ الاپ میں چند مخصوص الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً آ۔ نا۔ تے۔ ممے۔ نا۔ ری۔ نوم۔ توم۔ آجکل الاپ بھی دھرپد کے انگ پر کیا جاتا ہے۔ یعنی الاپ کے بھی چار حصے کر دئے گئے ہیں۔ استھائی۔ انترہ۔ سنچاری اور ابھوگ۔ الاپ کے ساتھ کوئی تال نہیں بجائی جاتی ہے کا لنگر البتہ قائم کیا جاتا ہے۔

(۲) جب موسیقی میں شاعری شامل ہوئی اور تال سے اس کی شیرازہ بندی ہوئی تو دھرپد وجود میں آیا۔ اسمیں سُر، بول، اور تال تینوں یکجا کئے گئے۔ اس کے علاوہ اس کے چار تک بھی قائم کئے گئے۔ پہلا حصہ استھائی کہلایا، دوسرا انترہ، تیسرا سنچاری اور چوتھا ابھوگ۔ جب اس فن میں پختگی آئی تو مشکل تالوں میں دھرپد بنائے گئے مگر سب سے زیادہ چوتال یعنی دھرپد کا خاص ٹھیکہ برتا گیا۔ یہ بارہ ماترے کا کھلے بولوں کا ٹھیکہ ہے جسے دھرپد کی میزان بنایا گیا اور اس کی بنیاد پر پکھاوجی یا طبلہ نواز بول ادا کرتے ہیں جس ڈھنگ سے گویا بول کہتا ہے۔ اسی انگ کے ٹکڑے یا پرن پکھاوج یا طبلے پر کہی جاتی ہے۔ یہ گانے کا طریقہ نہایت اور بھاری ہے۔ عموماً اس کا نفس مضمون پروردگار کی عبادت، ریاضت یا بادشاہوں کی ثنا و صفت یا مورثوں کی شجاعت سے متعلق ہوتا ہے۔ گانے کے اس طریقے میں تان نہیں دی۔ دُرت لے کی سرگم اور گمک کی وجہ سے تان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

(۳) ہوری بھی دھرپد انگ ہی کو گاتا ہے۔ فرق صرف تال کا ہوتا ہے۔ اس کی مخصوص تال دھمار یا دھمال ہے۔

سادرہ بھی دھرپد ہی کے ڈھنگ کو گاتا ہے۔ اس کی خاص تال جھپ تال ہے۔ باقی سب وہی خصوصیات ہیں جو دھرپد کی۔

(۵) ٹپہ گانے کا رواج پنجاب سے آیا۔ اس میں ہیر رانجھا کی والہانہ شیفتگی کا ذکر رہتا ہے۔ میاں شوری نے اس ڈھنگ کے اصول و قواعد متعین کئے اور پیچیدہ تانوں سے اسے مزین کیا۔ یہ مرتا نوں کا گانا ہے۔ سہولت ان میں ادا کیا جاتا ہے۔

(۶) دھرپد کا رواج ایک مدت تک رہا۔ اب سے تقریباً پانسو سال ادھر سلطان حسین شرقی نے جو سلاطین شرقیہ کا آخری بادشاہ تھا خیال ایجاد کیا۔ اس کی وضع قطع اور کینڈا تو وہی ہے جو دھرپد کا ہے لیکن اس میں طرح طرح کی تانوں اور پیچیدہ ترکیبوں کا اضافہ کیا گیا۔ ہندوستان کی قدامت پسند اور روایت پرست آبادی میں خیال تین سو سال تک پنپ نہ سکا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ خیال میں عاشقانہ مضامین باندھے گئے اور سدا رنگ اور ادا رنگ جیسے گویوں نے خیال کو اتنا فروغ دیا کہ دھرپد کی گرم بازاری جاتی رہی۔ تانوں کے خوبصورت جال میں سننے والے پھنس کر رہ جاتے ہیں اور اس سے رہائی صرف اسی وقت ہوتی ہے جب گانا ختم ہوتا ہے بلمپت گانے میں اس کی مخصوص تالیں تیواڑہ، جھومرا، آڑا چوتالہ اور اکتالہ ہیں۔ دُرت میں تین تال، جھپ تال، اکتالہ اور روپک ہیں۔

(۷) ہمارے ادب و شعر کی طرح ہمارا سنگیت بھی زندگی سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ لکھنؤ میں واجد علی شاہ اور دوسرے جس انداز سے داد عیش دی محتاج بیان نہیں۔ مردانہ فنون کی جگہ نسوانی راحت پسندی نے لے لی تھی۔ موسیقی میں دھرپد کے رزمیہ اور جوشیلے مضامین کی جگہ پہلے خیال کے عاشقانہ مضامین نے لی اور جب اخلاقی تنزل میں اور پستی آئی تو سنگیت میں بھی ابتذال اور فحش کی حد تک ہوسکارانہ مضامین باندھے جانے لگے اور سفلی جذبات کو ابھارنے کے لئے ٹھمری ایجاد ہوئی جسے پہلے عورتوں کے گانے کا مستور کر لیا گیا۔ اسی لئے اسمیں اظہار عشق اور محبت کی دوسری کیفیات کا ذکر عورت کی زبانی ہوتا ہے اس کے بعد مرد و عورت کی تخصیص بھی مٹ گئی، اور عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی ٹھمریاں گانی شروع کر دیں طبیعتوں کی سہل پسندی اور عیش کوشی نے اس ہلکے پھلکے گانے کو قبول کیا اور اس درجہ مقبول کیا۔ آج تک پورب کی ٹھمری مشہور ہے۔ ٹھمری میں بول بنانے کی خوبصورتی دیکھنے کی چیز ہے۔ ایک ہی بول کو طرح طرح سے ادا کیا جاتا ہے، اور رقاصہ جب بھاؤ بتا کر اسے گاتی ہیں تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس کی خاص تالیں چاچر، پنجابی یا دیپ چندی ہیں۔

(۸) دادرا بھی ٹھمری کی طرح پورب کا تحفہ ہے۔ اس میں بھی پوربی زبان میں شاعری کی جاتی ہے۔ عشق و ہوس کے تمام درجے طے کئے جاتے ہیں۔ پوربی بولوں کے علاوہ اس میں اردو کے عاشقانہ اشعار اور سہرے لگائے جاتے ہیں جنہیں سنکر سامعین پھڑک جاتے ہیں۔ یہ بھی نرت بھاؤ کا گانا ہے، اور بالعموم دادرا یا کہروے میں گایا جاتا ہے۔

(۹) ترانہ حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے اس کے لئے چند الفاظ مخصوص ہیں۔ مثلاً تے۔ نا۔ در توم۔ توم۔ دانی وغیرہ۔ یہ بلمپت لے میں بھی گایا جاتا ہے لیکن اس کا لطف دُرت ہی میں آتا ہے۔ یہ گویا گانے میں ستار کی نقل ہے۔

جھپ تال، تین تال اور اکتالہ میں گایا جاتا ہے۔

(۱۰) ترانے انگ کا گانا تروٹ بھی ہے؟ اس میں طبلے کے بول گائے جاتے ہیں۔

(۱۱) چترنگ میں چار رنگ شامل ہوتے ہیں۔ خیال کے بول، ترانہ، تروٹ اور سرگم سب ملے جلے ہوتے ہیں۔

(۱۲) غزل سرائی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی۔ گانے کی سب سے مقبول صنف یہی ہے۔ دادرا، کہروا اور پشتو میں گائی جاتی ہے۔

(۱۳) قوالی حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے۔ حضرت امیر کی کئی ایجادات ہیں۔ مثلاً قول، قلبانہ، نقش، گل، نگار، ہوا، بسیط اور سوہلہ۔ ناقدری اور سہل پسندی نے ان سب طریقوں کو رفتہ رفتہ طاقِ نسیاں کو سونپ دیا۔ ان کے برتنے والے اب الشاذ کالمعدوم ہیں۔ انہی کے گانے والے قوال کہلاتے تھے۔ آجکل غزلوں کو ایک خاص ڈھنگ سے گانے کو قوالی کہتے ہیں۔ لفظوں کی تکرار اور ڈھولک کی تھاپ بڑی اثر انگیز ہوتی ہے۔

(۱۴) تھیٹر کی دھنیں پارسیوں کے بنائے ہوئے تھیٹروں کی بدولت ایک زمانے میں بہت مقبول تھیں۔ ان میں موسیقی کے بعض نئے تجربات کئے گئے تھے جو بہت کامیاب اور دلکش ثابت ہوئے۔ غنا یعنی اوپرا ہماری موسیقی میں ایک نئی چیز تھی۔ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود۔ ہمارے ملک میں اب اسٹیج ہی نہیں رہا ہے تو اس کی دھنیں کیا باقی رہتیں۔

(۱۵) گیتوں نے یوں تو ہمارے دیہاتوں میں جنم لیا لیکن شہروں میں آکر نکھر گئے۔ ان کی چلتی ہوئی دھنیں اور آسان مضمون ان کی مقبولیت کے سفارشی تھے۔

(۱۶) بیس سال کے عرصے میں فلمی گیتوں نے وہ زور پکڑا ہے کہ اب کوئی اور طریقہ ان کا حریف نہیں بن سکتا۔ ان کی چلتی ہوئی دھنیں بچے بچے کی زبان پر آجاتی ہیں۔ فلم کی کہانی گیت کی اہمیت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ بعض گیت اپنی نرالی دھنوں کی وجہ سے مقبول ہو جاتے ہیں چاہے ان کے اشعار موزوں ہوں یا ناموزوں چاہے ان میں کوئی مفہوم ہی نہ ہو تب بھی۔ ان دھنوں کو ہماری موسیقی سے کم اور سات سمندر پار کی موسیقی سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ یہ آمیزش بھی ایک مفید تجربہ ہے۔ عجیب بات ہے کہ جس شدت سے ان گیتوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اتنی ہی سرعت سے یہ فراموش اور محو بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ ناپائیداری ان کی بے وقعتی کی دلیل ہے۔

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور عوام کی سہل پسندیوں سے ہمارے سنگیت کا زوال ہو گیا یہاں تک کہ فن صرف بازی گری رہ گیا۔ راگ راگنیوں کی صحت جاتی رہی اور علم کی جگہ فریب کاری نے لے لی۔ پہلے موسیقی عبادت میں شامل تھی اب صرف دل بہلاوا اور حظِ نفس کا ایک سستا ذریعہ ہے جب کسی فنِ لطیف میں اتنی پستی آجاتی ہے تو اس کا روحانی عنصر فنا ہو جاتا ہے اور اس کے وہ کمالات جنہیں اعجاز کہا جاتا ہے زائل ہو کر ماضی کی روایات بن جاتے ہیں۔ ہمارا اسٹیج اور سچا سنگیت اب بھی موجود ہے مگر اب نہ تو وہ اگلے سے ریاضی کیسے فنکار ہیں اور نہ وہ اگلا سا ذوق شوق اور قدر دانی۔ زمانہ بدل گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے دیس کا سنگیت بھی کچھ سے کچھ ہو گیا ؎

اے ہمنشیں یہی روز کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے ایسے نقشے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

غزل

عامر عثمانی

جب موت کے بادل آنکھوں سے ہر چیز کو پنہاں کر دیں گے
ہم اپنے تصور کی ضو سے اک شمع فروزاں کر دیں گے

بھولے سے اگر وہ آ بھی گئے کیا درد کا درماں کر دینگے
اجڑے ہوئے گھر کی ویرانی کچھ اور نمایاں کر دینگے

ناموسِ غمِ جاناں کی قسم وہ غم بھی خوشی بن جائے گا
ہم جوشِ وفا میں جس غم کو وابستۂ جاناں کر دینگے

للہ گرا دو کچھ پردے ہر غنچہ و گل کے عارض پر
ورنہ یہ تمہارے دیوانے ہر شے کو گریباں کر دینگے

مایوسِ کرم بیماروں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے
تسکینِ رگِ جاں کی خاطر نشتر کو رگِ جاں کر دینگے

ہم دردِ فراواں سہنے کے خوگر بھی ہوئے تو کیا حاصل
جب درد میں لذت آئے گی وہ درد کو درماں کر دینگے

اے گریۂ غم اے دیدۂ نم رہنے دے خدارا کچھ آنسو
وہ آئے تو ہم ان شمعوں کو روشن سرِ مژگاں کر دینگے

جب تو ہی نہیں تو جنت کیا، مت بھیج وہاں دیوانوں کو
دو چار اگر پل جائیں گے جنت کو بھی ویراں کر دینگے

یہ گردشِ دوراں بخشے تو اک رات وصالِ جاناں کی
ہر ساعتِ رنگیں میں شامل طولِ شبِ ہجراں کر دینگے

فردوسِ حریمِ الفت میں جلوے ہیں نہاں کچھ ایسے بھی
ہو جائیں گے جس دن بے پردہ خود حسن کو حیراں کر دینگے

احسان کہ تم نے رکھا ہے انعامِ دل و جاں دینے پر
ورنہ یہ دل و جاں کس کے ہیں کیا نذرِ دل و جاں کر دینگے

فرصت نہ ملی جن سجدوں کو فردوس و جہنم کے غم سے
اک روز وہی سجدے عامرؔ زاہد کو پشیماں کر دینگے

بہانہ

ڈرامہ

انتصار نوتوی

ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑتی ہے۔ پہلے تیز پھر آہستہ آہستہ یہ آواز ڈوبتی ہوئی دور ہوتی ہے۔ بجنسہ جیسے کوئی گاڑی مکان کے پاس سے گذرتی ہوئی چلی گئی ہو۔

(ایک لمبا وقفہ جس میں کوئی بوڑھا شخص لگاتار کھانستا رہتا ہے)

زاہدہ:۔ کیا بجا ہوگا؟ ...... کیوں جی۔ (کوئی جواب نہیں ملتا۔ کھانسی برابر آتی رہتی ہے) میں تمہیں سے پوچھ رہی ہوں، ذرا وقت بتاؤ۔

سلیم:۔ (کھانستے ہوئے) ذرا کھانسی دم لینے دے تو بتاؤں (تھوڑی دیر تک کھانستا رہتا ہے) دو بج چکا ہے ڈھائی کا عمل ہوگا۔ سنا نہیں تم نے پنجاب میل نکل گیا ہے ابھی ابھی۔ اس گاؤں میں دلت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ اب چار بجے اکسپریس گذرے گا۔ پھر دس بجے رات کو پسینجر، دو بجے رات کو طوفان میل۔ چار بجے صبح......

زاہدہ:۔ (بات کاٹ کر) میں نے صرف وقت پوچھا تھا۔ تم تو سارا ٹائم ٹیبل بتلانے لگے۔ تمہاری بیماری شاید اس لئے طول کھینچتی جارہی ہے کہ تم باتیں بہت کرتے ہو۔ اسی لئے میں تم سے بات کم کرتی ہوں۔ ڈاکٹر نے تمہیں کم بولنے کی تاکید کی ہے۔ اس گاؤں کے وید جی اور حکیم بھی یہی کہہ رہے تھے۔ مگر تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا۔

سلیم:۔ ڈاکٹر، حکیم، وید میری سمجھ میں کیا خاک پتھر آئے۔ وہ لوگ میرا مرض ہی نہیں سمجھے۔ (کھانسنا شروع کرتا ہے) اسی لئے تاکید خوب کرتے ہیں۔

زاہدہ:۔ ڈاکٹر انور بھی تمہارا مرض نہیں سمجھتے؟ وہ تو اسپیشلسٹ ہیں۔

سلیم:۔ وہ بھی نہیں سمجھے۔ تم نے انہیں بیکار یہاں بلا بھیجا۔ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ بجز ضعیفی کے۔ کشور کی فکر ضرور ہے جو ہر وقت دل میں چٹکیاں لیا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ سچ کہتا ہوں زاہدہ میرا کشور اگر آجائے تو یہ بڑھاپا جوانی میں بدل سکتا ہے۔ دل، دماغ، قوائے سب میں طاقت آسکتی ہے ضعیفی میں اولاد کا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔

زاہدہ:۔ کشور بھی آجائیگا خدا پر بھروسہ رکھو۔ اسی لئے میں نے اسکی قد آدم تصویر تمہاری نگاہوں کے سامنے لگا دی۔ وہ دیکھو وہ کیا ہے تمہارا کشور۔ ہم دونوں کی ناقابل مزاج طبیعتوں پر کھڑا مسکرا رہا ہے۔ شہر سے میں اسی لئے تمہیں اس گاؤں میں لائی کہ یہاں کی تازی آب و ہوا تمہاری صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ مگر تم اپنی طبیعت کو سمجھانے کی بالکل کوشش نہیں کرتے۔ شہر چھوڑنے سے ہمارا کس قدر نقصان ہوا۔ وکالت کی ساری آمدنی ختم ہوگئی۔ اب پھر نئے سرے سے کام جمانا پڑیگا، وہاں آپ کو ڈاکٹر انور کے علاج سے کافی فائدہ تھا۔ کھانسی اور خفقان دونوں میں کمی تھی۔ اسوقت کشور کو گئے ہوئے کچھ ہی دن گذرے ہونگے مگر اب تو مرض بڑھتا ہی جارہا ہے

سلیم:۔ تو پھر شہر لوٹ چلو۔ یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

زاہدہ:۔ آج ڈاکٹر انور کی رائے لونگی۔ یہ انہیں کا مشورہ تھا کہ شہر چھوڑ کر گاؤں میں رہا جائے۔

سلیم:۔ کس وقت آئیں گے ڈاکٹر انور؟

زاہدہ:۔ اسوقت تک تو انہیں آجانا چاہئے تھا۔ موٹر سے کل دو گھنٹہ کا تو راستہ ہے سڑک بھی کچھ ایسی خراب نہیں۔ شاید مطب کرنے کے بعد وہاں سے چلیں۔ ہاں میں ایک خوشخبری سنانا بھول گئی۔ آج کی ڈاک سے نرگس آرا کا خط آیا ہے انہیں رشتہ منظور ہے۔

سلیم:۔ کیسا رشتہ؟

زاہدہ:۔ بھول گئے۔ کشور کے جانے کے ایک ہفتہ بعد میں نے اسکا پیغام زلیخا کے ساتھ دیا تھا۔ تم سے بتایا تو تھا کہ اپنے کشور کی شادی زلیخا کے ساتھ طے ہوگئی۔

سلیم:۔ ہاں (کھانسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) اور کیا لکھا ہے نرگس آرا نے؟

زاہدہ:۔ آپکی طبیعت کا حال پوچھا ہے۔ کشور کے عراق سے واپسی کی تاریخ پوچھی ہے باقی تمام خط میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے، کیا یہ خط کشور کو عراق کے پتہ سے بھیج دیا جائے۔

سلیم:۔ اسکا پتہ کہاں ہے۔ عراق پہنچکر اس نے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اسکا کوئی خط آئے تو یہ خط اس کے پاس بھیجدینا۔ اسکی رضامندی بھی ضروری ہے۔

زاہدہ:۔ زلیخا تمہیں پسند ہے؟ کسقدر پیاری لڑکی ہے۔

سلیم:۔ عرصہ ہوا جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ اسوقت ضرور اچھی تھی۔ ممکن ہے آج باپ کے ساتھ آتی ہو۔

زاہدہ:۔ ہاں کیا عجب ہے مگر میں بھول گئی ورنہ خط میں ڈاکٹر انور کو یہ بھی لکھدیتی کہ وہ زلیخا کو اپنے ساتھ ضرور لیتے آئیں۔

سلیم:۔ دیر بہت ہوگئی ہے شاید ہی آج کوئی آئے۔

زاہدہ:۔ ابھی وقت تو ہے مطب کے بعد کھانا کھایا ہوگا۔ پھر تھوڑا سا آرام لینے کے بعد چلے ہونگے۔ میرے نزدیک چار بجے تک تو یہاں ضرور پہنچ جائینگے۔

سلیم:۔ واپس بھی تو انہیں آج ہی جانا ہوگا۔ انہیں اب تک آجانا چاہئے تھا۔ تم نے چائے وغیرہ کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ گاؤں ہے۔ یہاں ضرورت کی چیز وقت پر بہت کم ملتی ہے۔ انڈے وغیرہ گھر میں موجود ہیں نہ؟

زاہدہ:۔ ان معاملات میں میری ملازمہ نفیسن انتہائی منتظم ہے تازی ترکاریاں۔ دودھ۔ مکھن۔ موسمی پھل ہر چیز گھر میں موجود ہے۔

سلیم:- آج کی ڈاک آگئی؟

زاہدہ:- ہاں کشور کا کوئی خط نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیوں۔ اس نے ہمیں اپنی خیریت کی اطلاع اب تک نہیں دی۔

سلیم:- (فکر کے ساتھ) کیا بتایا جائے جوانی میں اس قسم کی ذمہ داریوں کا احساس لڑکوں میں کم ہو جاتا ہے ...... اور تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

زاہدہ:- میری ہرگز یہ رائے نہ تھی کہ وہ عراق جائے مگر وہ تو سیاحت کے نشہ میں چور تھا۔ تم نے بھی کوئی مخالفت نہیں کی۔

سلیم:- چلو اب لوٹ کر آجائے تو کہیں مت جانے دینا۔

زاہدہ:- اب کہاں جائیگا۔ آتے ہی اس کی شادی کردونگی۔ ایسی خوبصورت بیوی پاکر وہ پھولا نہ سمائے گا۔ خود زلیخا اُسے کہیں نہ جانے دیگی۔

سلیم:- کیا یہ ضروری ہے کہ وہ بھی زلیخا کو پسند کرے۔ خوبصورتی بذات خود کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ یہ پسند کا دوسرا نام ہے اور پھر وہ تو ایک سیاح ہے اس نے دنیا گھومی ہے۔ اس معاملہ میں اس کی نظر ہم سے زیادہ وسیع اور گہری ہوگی۔

زاہدہ:- (مسکرا کر محبت کے ساتھ) شریر کہیں کا۔ تصویر میں دیکھو اسکی خلقی مسکراہٹ آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ رگ رگ میں شرارت بھری پڑی ہے۔

سلیم:- (ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش رہتا ہے)

زاہدہ:- میری تو آنکھیں اُسے ہر وقت ڈھونڈا کرتی ہیں۔ خط نہ آنیکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ گھر واپس ہو رہا ہو۔

سلیم:- ہاں اور بھی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ زندہ رہنے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے۔

زاہدہ:- کل میں نے اس کے لئے ایک دیہاتی شگون کیا تھا۔ یہاں کی عورتوں نے مجھے بتایا کہ میں کسی دن سچے دل سے یہ سمجھکر کہ آج کشور آرہا ہے اسکا انتظار کروں۔ گھر کی صفائی کراؤں، کمروں کو سجاؤں عمدہ عمدہ کھانے پکاؤں اور چراغوں کو دن رہے سے گھر میں جلادوں (ہنسکر) کسقدر مضحکہ خیز چیزیں ہیں مگر گاؤں کی عورتیں اسے انتظار کا نیک شگون بتلاتی ہیں۔ بیچاری وہ سب کی سب میری بہت ہمدرد ہیں، کہتی تھیں کہ اس گاؤں کے بہت سے لڑکے جو لڑائی پر گئے تھے اس شگون کے مناتے ہی آگئے۔

سلیم:- اچھا۔ جب ہی کل پانچ بجے شام کو لعبین میرے کمرہ میں لیمپ جلا کر رکھ گئی تھی۔ بیشک یہ کوئی نیک شگون ہوگا۔ چراغ کو دن رہے سے جلا دینا انتظار کی آخری حد ہے۔

زاہدہ:- کشور کا یہ فوٹو یہاں سے ہٹا دوں؟

سلیم:- کیوں؟

زاہدہ:- ڈاکٹر انور کے ساتھ شاید زلیخا چلی آئے۔ بھولی لڑکی ہے کسی سے پوچھ بیٹھے یہ کون ہیں؟

سلیم:- (ہنسکر) کوئی جواب نہ پاکر خود ہی سمجھ جائیگی مگر کیا اس نے کشور کو دیکھا نہ ہوگا؟

زاہدہ:- اس نے کیا دیکھا ہوگا؟ کالج بند ہو جانے کے بعد جب وہ آئی تو کشور جا چکا تھا۔

سلیم:- لوگ بے حد ملنسار ہیں مگر رشتہ دینے کی ابھی کیا ضرورت تھی۔ کشور کو آ لینے دیتیں۔

زاہدہ:- کیا تم میرے کشور کو اسقدر نالائق سمجھتے ہو، وہ میرا کہنا نہ مانے گا؟

سلیم:- نہیں یہ بات نہیں۔ ہم نے قبل از وقت ایک چیز اٹھائی ہے — خیر مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے دوا لاکر پلاؤ۔ وقت ہوگیا۔

زاہدہ:- ہاں باتوں میں بھول گئی۔ ابھی لائی دوا آپ کی۔

(گلاس اور شیشی کے میز پر رکھنے کی آواز)

زاہدہ شیشی سے دوا انڈیل کر دیتی ہے اور سلیم ایک ایک گھونٹ کر کے پیتا ہے۔ موٹر کا ہارن سنائی پڑتا ہے۔ موٹر کی بھنبھناہٹ آہستہ آہستہ قریب ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مجمع کا شور و غل اور ہنگامہ بھی سنائی پڑتا ہے جو گاؤں میں موٹر کی آمد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

زاہدہ:- ڈاکٹر انور آگئے (قدموں کی آواز۔ غل شور کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ موٹر کے متعلق لوگ دیہاتی زبان میں باتیں کرتے ہوئے سنائی پڑتے ہیں)

ڈاکٹر انور:- آداب عرض۔

زاہدہ:- آداب۔

زلیخا:- آداب عرض کرتی ہوں۔

زاہدہ:- زلیخا جیتی رہو بیٹی، خوش رہو۔ آؤ اندر۔ آج بڑی زحمت ہوئی تم کو اور ڈاکٹر صاحب کو۔

(موٹر کا دروازہ کھل کر بند ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر:- جی زحمت کیسی۔ آپ کے حکم کی تعمیل اور زحمت (ہنسکر) کیا خوب۔ کیسے ہیں سلیم صاحب؟

زاہدہ:- وہی حال ہے ڈاکٹر صاحب۔ کھانسی بہت کم ہے مگر اختلاج اور الجھن میں کوئی کمی نہیں۔ چلئے اندر چلئے۔ آؤ بیٹی زلیخا آؤ۔

یہ گاؤں ہے۔ دیہات دیکھا ہے تم نے؟ یہاں سب کسان رہتے ہیں جس طرف نظر اٹھا کر دیکھو کھیت ہی کھیت نظر آئیں گے۔

زلیخا:- جی ہاں مجھے ایسی جگہ پسند ہے۔ شہر میں رہنے کے بعد اس قسم کی تبدیلی لطف سے خالی نہیں۔

(سب لوگ سلیم کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں)

ڈاکٹر انور:- آداب عرض کرتا ہوں سلیم صاحب۔

سلیم:- آداب عرض۔ آداب عرض۔ آئیے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اس زحمت کا۔

ڈاکٹر:- (تکلفاً) جی واہ زحمت کیسی۔ یہ تو میرا گھر ہے۔ کیا غیر کے یہاں میں آیا ہوں۔

سلیم:- بہت تکلیف ہوئی ہوگی راستہ میں؟

ڈاکٹر:- جی نہیں مجھے دو گھنٹہ سے بھی کم یہاں آنے میں لگے۔ سڑک صاف اور اچھی ہے ——— کیسے ہیں آپ؟

سلیم:- شکر ہے خدا کا۔ آپ کی دوا سے کھانسی بہت کم ہے۔ مجھے کوئی مرض نہیں۔ زاہدہ کو صرف وہم سما گیا ہے۔ (ہنس کر) بجائے میرے آپ ان کے وہم کا علاج کریں۔

ڈاکٹر:- یہ صحت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مریض اپنے کو تندرست سمجھے بیشک آپکو کوئی مرض نہیں۔ (زاہدہ کی طرف مڑ کر) اور آپکو محض وہم ہے۔

زاہدہ:- خدا کرے مجھے وہم ہی ہو اور انھیں کوئی مرض نہ ہو۔ پھر بھی آپ احتیاطاً ان کا بغور معائنہ کیجئے۔

ڈاکٹر:- (ہنس کر) میں آج فیصلہ کر دونگا کہ آپ کو وہم ہے یا ان کو مرض۔

زاہدہ:- (شوق کے ساتھ) اپنے کشور کی یہ تصویر دیکھی ڈاکٹر صاحب۔ یہ تصویر اس نے جرمنی میں بنوائی تھی۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) نہ جانے ہمارے گھر میں یہ سیاح کیوں پیدا ہوا۔ جرمنی، فرانس، بلجیم، ہالینڈ سب کہیں گھومنے کے بعد اب عراق گئے ہیں۔

ڈاکٹر:- حق تلفی تھی اگر نہ جاتے مشرقی ممالک برا مان جاتے (سب ہنستے ہیں)

زاہدہ:- مگر اب نہیں جانے دیا جائیگا کہیں۔ بس بہت سیاحت ہو چکی۔ دنیا گھوم لی۔ اب آکر باپ کی جگہ بیٹھ کر کام کریں۔ ولایت سے بالشٹی پاس کی آخر وہ کس دن کام آئے گی (مڑ کر) زلیخا ادھر آؤ بیٹی ادھر شرمائی کیوں کھڑی ہو۔ تھک گئی ہو شاید۔ چائے آرہی ہے پی لو پھر باہر کھیتوں اور باغوں میں گھومنے چلیں گے۔ لو چائے آگئی۔

(نعیمن چائے کے برتنوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ (وقفہ، چائے کا دور شروع ہوتا ہے)

ڈاکٹر:- کافی دن ہوئے کشور عراق میں۔ کوئی خط آیا ان کا اس طرف۔

سلیم:- نہیں۔ کوئی خط نہیں آیا۔

ڈاکٹر:- زلیخا۔ تمہیں یہ گھر پسند ہے یا میرا؟

زلیخا:- (مشکوک نگاہ سے) آپ کا مطلب گاؤں اور شہر سے ہے؟

ڈاکٹر:- ہاں۔ یہی یہی۔

زلیخا:- پسند تو مجھے شہری ہے مگر گاؤں بھی برا نہیں ہوتا۔

سلیم:- نہیں بیٹی برا ہوتا ہے۔ یہاں صرف کسانوں کے گھر ہیں۔ کسی وکیل یا ڈاکٹر کے نہیں۔ یہاں رہے تو کسان بنکر رہے۔

زلیخا:- (بھولے پن سے) اس گاؤں میں بندر بہت ہیں۔

زاہدہ:- (ہنس کر) ہاں بہت ہیں بیٹی۔ یہاں کے لوگ اپنے باپ داداؤں کو اب تک پہچانتے ہیں۔ انھیں کھانے کے لئے چنے اور بہت سی چیزیں دیا کرتے ہیں۔ میں ابھی تمہارے ساتھ تھوڑے سے چنے لیکر چلتی ہوں۔ پھر دیکھنا بہت سے بندر ہمیں آکر گھیر لیں گے۔ یہاں اس قسم کے تماشے بہت ہیں ——— تم چائے پی چکیں۔

زلیخا:- جی ہاں چلئے بندروں کا تماشہ دیکھا جائے۔

(قدموں کی آواز)

ڈاکٹر:- بہت دیر ہو گئی دیا۔ ابھی گھر واپس چلنا ہے۔

سلیم:- چلے بھی جائیگا۔ اگر رات ہو گئی تو گھر موجود ہے۔

ڈاکٹر:- جی بہت حرج ہو جائیگا۔ وہاں ایک دو کیس بہت ضروری ہیں ——— آپ اپنا حال بتائیے۔ یہاں کی آب و ہوا کا آپ کی صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں ہے۔ لیٹ جائیے تو میں آلہ سے آپکا سینہ دیکھوں

لمبا وقفہ۔ آلہ سے تمام سینہ دیکھنے کے بعد ہڈیوں کو ہاتھ سے بجا بجا کر) ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست ہے۔ کوئی خاص مرض آپکو نہیں۔

سلیم:- میں نے تو آپ سے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ البتہ ایک فکر ہے آپ سے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں مگر ڈرتا ہوں۔

ڈاکٹر:- اگر آپ مجھے بتا دیں تو مجھے آپ کے علاج میں بہت مدد ملے گی۔ آپ اطمینان رکھئے۔ میرے سینہ میں بہت سی پوشیدہ باتیں دفن ہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں مجھ پر یقین کیجئے۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جس کو آپ چھپانا چاہتے ہیں۔

سلیم:- ہاں۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ شاید کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ میں آج آپ سے اپنی ایک خفیہ بیماری کا اظہار کروں گا مگر وعدہ کیجئے کہ اس راز کو آپ کبھی اپنی زبان پر نہ لائیں گے۔

ڈاکٹر:- (سنجیدہ لہجہ میں) وعدہ کرتا ہوں آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔

سلیم:- (مضمحل آواز کے ساتھ) کشور کی اس تصویر کو دیکھا آپ نے؟

زاہدہ ابھی ابھی کہہ رہی تھی آپ سے کہ ایسے بے چینی کے ساتھ اسکا انتظار ہے۔ مگر...... (الفاظ منہ سے بمشکل نکلتے ہیں۔ کھانسی کا دورہ شروع ہوجاتا ہے)

ڈاکٹر:۔ ہاں ہاں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔

سلیم:۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ میرے منہ سے نہیں نکلتا۔(کھانستا رہتا ہے)...... کشور اس دنیا میں زندہ نہیں ہے وہ مر چکا ہے۔

ڈاکٹر:۔ (گھبرا کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سلیم صاحب۔

سلیم:۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر۔ وہ جہاز سمندر میں ڈوب گیا جس پر کشور سفر کر رہا تھا۔ بعد میں مرنے والوں کی ایک لسٹ شائع ہوئی جس میں کشور کا نام بھی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مر گیا۔ مگر میں نے زاہدہ کو نہیں بتایا۔ مجھ سے بتلایا نہیں گیا۔ وہ شاید اس صدمہ کو نہ برداشت کر سکتی بس یہی میرا مرض ہے۔ کتنا ہلک اور جان لیوا مرض۔ مگر وعدہ کیجئے کہ زاہدہ کو اسکا علم نہ ہوگا —— ذرا میرے ساتھ تصویر کے قریب چلئے۔ میرے اس مرض کو قریب سے حل کر دیکھئے۔(قدموں کی آواز) کتنا خوشرو جوان ہے۔ وکالت اس نے انگلینڈ ہی میں رہکر پڑھی۔ اس پیشہ کو پسند بھی کرتا تھا۔

(زاہدہ اور زلیخا باتیں کرتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی ہیں)

زاہدہ:۔ دیکھا بیٹی تم نے اس گاؤں میں کسانوں سے زیادہ بندر آباد ہیں (ڈاکٹر اور سلیم کی طرف مڑ کر) اوآپ لوگ میرے کشور کا فوٹو دیکھ رہے ہیں۔ یہی دکھا رہے ہونگے بھرایک کو فوٹو دکھایا کرتے ہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب یہ کشور کو۔ میں سمجھاتی ہوں کہ وہ جلد آجائیگا۔ خدا پر بھروسہ رکھو مگر ان کے دل کو کسی طرح سکون نہیں۔

ڈاکٹر:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) جی ہاں۔ جی ہاں۔ زلیخا چلو گھر چلیں۔ موٹر پر چلکر بیٹھو۔

سلیم:۔ ڈاکٹر صاحب......

ڈاکٹر:۔ آپ اطمینان رکھئے آپ کو کوئی مرض نہیں ہے۔ خوش رہنے کی کوشش کیجئے سکوت اور آرام کی ضرورت ہے۔

زاہدہ:۔ یہی تو میں کہا کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب (سلیم سے) اب آپ اپنے بستر پر جائیے ورنہ طبیعت بھاری ہو جائے گی۔ (قدموں کی چاپ)

ڈاکٹر:۔ مجھے اجازت دیجئے چلو زلیخا۔

(زاہدہ۔ ڈاکٹر اور زلیخا کمرے سے باہر نکلتے ہیں)

زاہدہ:۔ منع اسلئے نہیں کر سکتی کہ آپ کے پیشہ کو نقصان پہونچیگا۔ ورنہ دل نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں کو چھوڑ دوں (موٹر کا دروازہ کھلکر بند ہوتا۔ ڈاکٹر اور زلیخا اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوتا ہے) دیکھا آپ نے

حشر جذبات —— ثاقب کانپوری

اشک گلگوں سے خود ہے یہ گلزار ✤ اب قفس میں نہ آئے فصل بہار

کون سمجھے گا اس لطافت کو ✤ تیرے انکار میں بھی ہے اقرار

درد میں اس کے زندگی تو ہے ✤ ہو مبارک یہ عشق کا آزار

مجھ کو غربت کی کیا شکایت ہو ✤ میں وطن میں بھی ہوں غریب دیار

عشق میں ہر قدم ہے صبر طلب ✤ کس قدر ہے یہ راہ بھی دشوار

تیری صورت تو ہے سراپا رحم ✤ حسن تیرا ہی کیوں غریب آزار

وجد طاری ہے ذرے ذرے پر ✤ کون ہے تیری بزم میں ہشیار

اپنی قسمت پہ میں بھی ناز کروں ✤ ہو اگر عاشقوں میں میرا شمار

میری توبہ کا اعتبار رہی کیا ✤ لوٹ جائے جو آئے فصل بہار

ہم کو نسبت ہی تیری کافی ہے ✤ عشق میں اور کچھ نہیں درکار

تیری فرقت میں آیا جو آنسو ✤ بن گیا آنکھ میں دُرِ شہوار

ہے یہ سرمایہ عشق میں ثاقب
دل ہے زخمی تو آنکھ ہے خونبار

ڈاکٹر صاحب سلیم صاحب کی بے قراری۔ کشور کی طرف سے ایک منٹ بھی غافل نہیں رہتے (آواز بھاری ہو جاتی ہے) مگر آپ کو نہیں معلوم کشور مر گیا ہے، وہ جہاز ہی ڈوب گیا جس پر وہ گیا تھا۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر ان سے چھپا ڈالی۔ اگر وہ سنتے تو ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ ڈاکٹر صاحب میں عمداً اس خود فریبی میں مبتلا ہوں شاید اسے خدا نے بچا لیا ہو اور یہ خبر غلط نکلے۔ ہماری زندگی کے لئے یہ ایک بہانہ ہے۔

(موٹر اسٹارٹ ہو کر چل دیتا ہے)

آزاد شاعر

ظریف دھلوی

یہ مانا ہم نہیں ہیں صاحبِ ذوق
لیاقت ہے ہماری کچھ واجبی سی
مگر کالج کے ڈگری ہولڈر ہیں
کہو تو پُراثر تقریر کر دیں
نہیں معلوم ہیں سب شعر کے ڈھنگ
ردیف و قافیے سے دور ہیں ہم
ردیف و قافیے میں شعر کہنا
اگر اک مصرعہ ہے شیطان کی آنت
تو پھر اس کی نہیں پروا کیا ہے
ہماری آرزو تو ہے بس اتنی
اگر یہ اک ذرا سا کام ہو جائے
بہ اطمینان ہم دیوان لے کر
رکھے بھی جیب میں آئیں چھنا چھن
میں دعوت دے رہا ہوں آج سب کو
بلا نئی شاعری میں کیا دھرا ہے
شبِ ہجراں ہے اور اختر شماری

مگر ہے شاعری کا ہم کو بھی شوق
پڑھی ہے اک ذرا سی فارسی بھی
زمینِ نثر کے ہم سو لکھے ہیں
فسانہ دلنشیں تحریر کر دیں
مگر ہے شاعری میں قافیہ تنگ
بہت لاچار ہیں مجبور ہیں ہم
نہیں ہے روگ یہ تو اپنے بس کا
اور اک چھوٹا سا جیسے منہ میں ہو پان
ہمارا بحر سے کیا واسطہ ہے۔
بنیں ہم صاحبِ دیوان جلدی
ادیبوں میں ہمارا نام ہو جائے
چلیں مونچھوں پہ اپنی تاؤ دے کر
دلِ اللہ دور ہو جائیں یقیناً
نیا ملبوس پہنا دو ادب کو
گل و بلبل کا افسانہ بھرا ہے
جگر میں ٹیس لب پر آہ و زاری

کہیں مرقد پہ شمع رو رہی ہے
کہیں معشوق نے عاشق کو مارا
ہوا ہے مرتکب قتلِ عمد کا۔
نہیں پاسِ قوانین و شریعت
بھلا سوچو یہ کوئی شاعری ہے
یہ ہے آن نیچرل مجذوب کی بڑ
ہماری شاعری ہے عینِ فطرت
نمونہ دیکھیے اور داد دیجیے

کہیں کشتی عدو سے ہو رہی ہے
عدم آباد کا رستہ دکھایا
مگر مطلق نہیں پھانسی کا کھٹکا
اُسی کے گھر کی ہے جیسے حکومت
غلط ایران کی تقلید کی ہے
یہ سہری کا چرچا ہے اور نہ ہی دھڑ
کبھی ہوتی نہیں بارِ طبیعت
سبق اس شاعری کا ہم سے لیجیے

نمونہ

پھر ملیر اک دم کٹی سی فاختہ
جیسے دولتمند ساہوکار کی وہ داشتہ
حسن کے قزاق نے، جس کا کھسوٹا ہو جمال
سوگئیں جو حسنِ رفتہ کے مسہری پر پڑی روتی رہے ہو کر نڈھال
آہ بیکس فاختہ
یاد آتا ہے تجھے اپنا شباب
میں سمجھتا ہوں ترے جذبات کے ہیجانِ طوفاں خیز و عالم سوز کو
غم نہ کر
کیوں گھلی جاتی ہے رنج و فکر کے دریائے بے طوفان و بے امواج میں
اس سے کچھ حاصل نہیں
بس سمجھ لے یہ جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے
آئی اور پھر سے اُڑی۔

ریرۂ قبرص میں اس قسم کے پہاڑی گاؤں بہت سے ہیں۔ یہ گاؤں
اس راستہ پر واقع ہے جو ' ٹروڈور ' کو جاتا ہے۔

رص کا صدر مقام نکوشیا برطانوی سپاہیوں کی تفریح
ہے۔ یہ تصویر نکوشیا کے گورنمنٹ ہاؤس کی ہے ↓

قبرص کے صدر مقام نکوشیا میں مسز جوینڈیز کی دو
یہاں کی کشیدہ کاری اور دوسری دستکاریوں کی چ
بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس کے
پردے مسز جوینڈیز ہی نے مہیا کئے ہیں۔
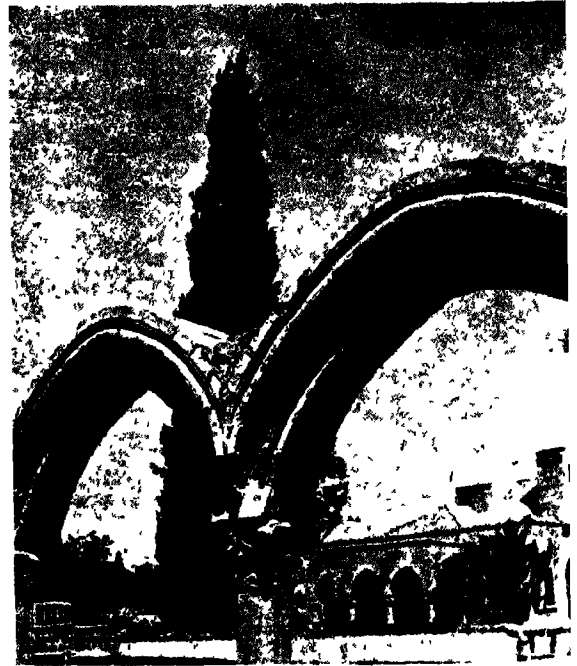
قبرص کی دیہاتی دوشیزائیں رنگ برنگ کے کپڑوں کی
بڑی شوقین ہوتی ہیں لیکن ایسے بھڑکیلے کپڑے انکو

مشہور مصور ایوان طبوطیقوف ایک قدیم شہر کا ایک حصہ دکھا رہا ہے۔ یہ شہر اب بہت ترقی کر چکا ہے۔

← فنکار طبوطیقوف اپنے کمرے میں کام کر رہا ہے۔

روسی آرٹ

سائبیریا اپنی معدنیات اور صنعتی ترقی کیلئے مشہور ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہاں روسی فنون کے بھی کئی مرکز ہیں۔ مثلاً مغربی سائبیریا میں متعدد روسی فنکار رہتے ہیں اور یہاں فنون کی نمائشیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس صفحہ پر سائبیریا کے فنکاروں کے چند مرقع پیش کئے جاتے ہیں۔

مصور لقمان ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ↓

مصور کرشوف کی بنائی ہوئی تصویر — ایک بوڑھا آدمی

نیا تجربہ

بام مچھلی جو برقی روشنی پیدا کرسکتی ہے اس تصویر میں اس مچھلی کا وہ حصہ دکھایا جارہا ہے جس میں برقی قوت پنہاں ہوتی ہے۔

حال ہی میں کولمبیا یونیورسٹی اور نیویارک کی ' روولوجیکل سوسائٹی ' کے ماہر سائنس اراکین نے بام مچھلی پر تجربات کرکے یہ اہم نتیجہ نکالا ہے کہ اسمیں برقی قوت بڑی کثیر مقدار میں موجود ہے۔ یہ تجربہ انسانی اعصاب کے متعلق بھی بہت اہم انکشافات کریگا۔

اس تجربہ گاہ میں ایک بام مچھلی کے جسم کی برقی قوت سے بجلی کے چند بلب جلائے جا رہے ہیں۔ (تصویریں ' السٹریٹڈ لندن نیوز ' سے لی گئیں۔)

زراعت میں ریسرچ کا یہ بڑا ادارہ ۱۹۰۵ میں بہار میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے ہولناک زلزلہ کے بعد اسکو نئی دھلی میں لے آیا گیا۔ یہاں بہت سی تجربہ گاھیں اور بڑے بڑے فارم ھیں۔ اس ادارہ کی کئی شاخیں ھیں اور ھرشاخ میں علیحدہ علیحدہ کام ھوتا ھے۔ پودوں کی حفاظت' کیڑوں سے بچاؤ اور درختوں کی غذاکی بہم رسانی کے واسطے یہاں بڑی اہم دریافتیں ھوتی رھتی ھیں۔ یہاں ماھرین زراعت کو اعلی تربیت بھی دی جاتی ھے۔ اس ادارے کی لائبریری اپنی نوعیت کی تمام ممالک مشرق میں واحد لائبریری ھے۔

"جراثیم کا کمرہ"۔ ان جراثیم سے پودوں میں مصنوعی طور پر بیماریاں پیدا کی جاسکتی ھیں۔

جوار باجرے کی ایک خاص بیماری کے اثرات کا معائنہ۔

(نیچے) مختلف کھادوں کا دھانوں پر کیا اثر ھوتا ھے!

کھاد کی حفاظت بڑی ضروری ھے۔ خاص سائنسی طریقہ سے ان کنسٹروں میں کھاد کو محفوظ کیا جارھا ھے۔

ک کے معمولی مرکب میں یہ ترکاریاں ۱۹۳۲ء
سے ابتک ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

اسٹی ٹیوٹ کے بعض تنومند مویشی جو بچے اور
دودھ دینے کے کام آتے ہیں۔

یل کیمسٹ مسٹر دیسائی بعض پودوں کی نازک جڑیں
مع کر رہے ہیں یہ بعض تجربات کے کام آتی ہیں۔

تمباکو کے پودوں کی بیماری کا معائنہ ہو رہا ہے

پودوں کی بیماریوں کا مطالعہ۔ اس بیماری میں
گنے بالکل سوکھ جاتے ہیں۔

افغانستان نے موجودہ زمانہ میں بڑی ترقی کرلی ہے۔ کابل او قندھار جدید وضع کے بڑے پر رونق شہر ہیں۔ قندھا افغانستان کا ایک بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں کئی بازار بہت بڑے اور پررونق ہیں۔ دور دور سے لوگ یہاں خرید و فروخت کیلئے آتے ہیں۔

ھار میں باباولی کا مزار یہ ایک مقدس اور متبرک جگہ ہے۔

آج کا قندھار

بازار۔ یہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ اسکی سڑک بہت چوڑی اور دوکانیں عالیشان ہیں۔
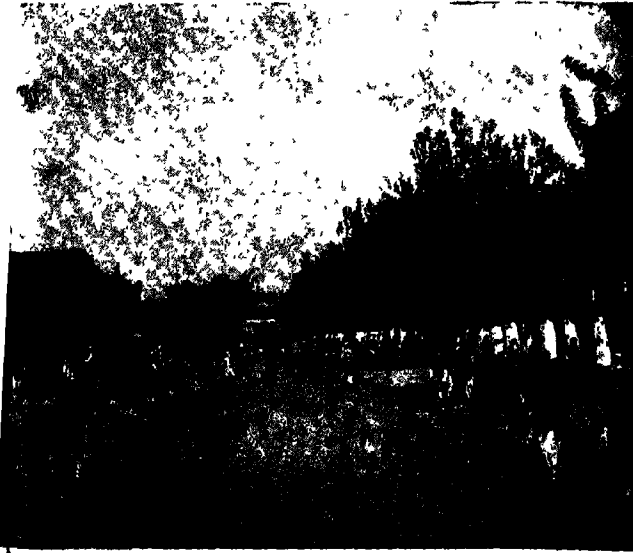
قندھار میں کئی بہت بڑے بڑے بازار ہیں جہاں بڑی چہل پہل اور ریل پیل رہتی ہے۔ انہی بازاروں میں ایک بازار شکار پور بازار ہے۔ قندھار کی یہ ایک بڑی منڈی ہے۔

شاہ خیرالدین اور شرفاخاں کے مقبرے
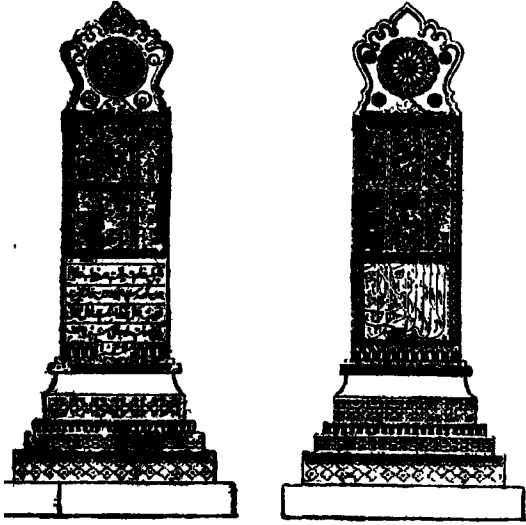
شرفاخاں کی قبر کی لوح
(پیچھے سے)

شرفاخاں کی قبر کی لو
(سامنے سے)
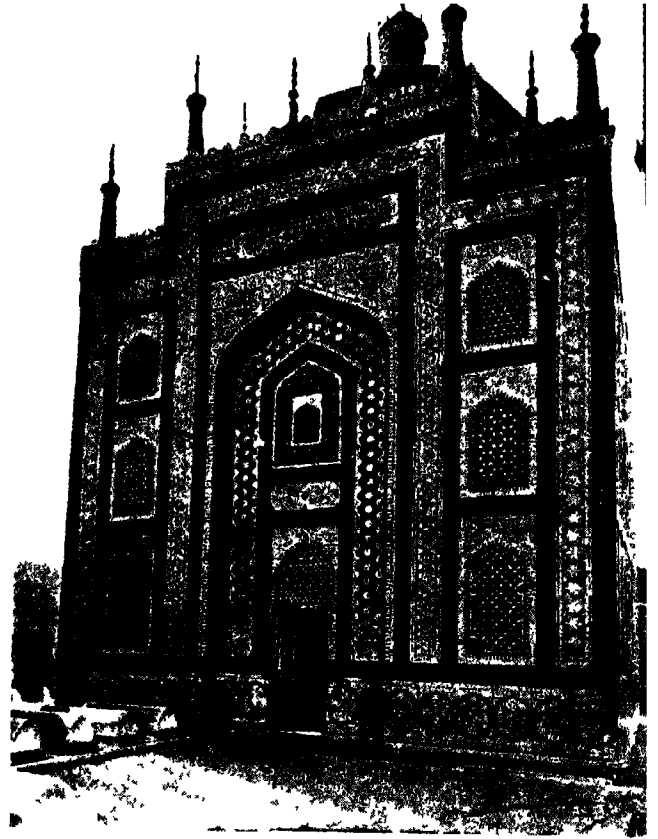
سکھر میں شاہ خیر الدین کا مقبرہ
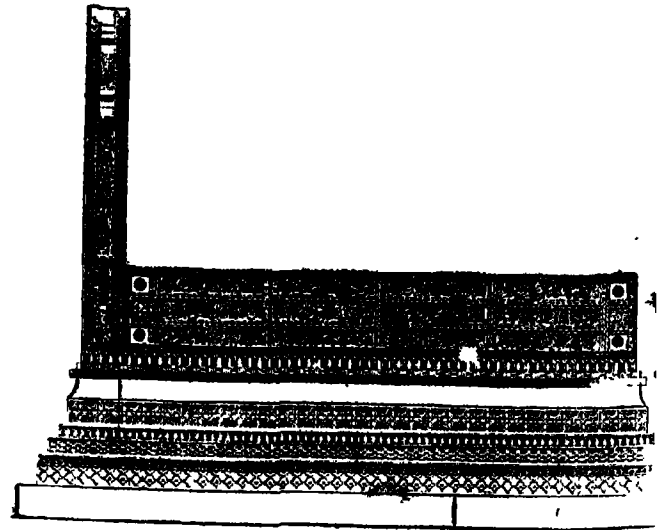
دیوان شرفاخاں کی قبر کا تعویذ

شرفاخاں کی قبر کا تعویذ اور لوح ←

ویرا

سید احتشام حسین

عبادت بریلوی

پچھلے[1] چند سالوں میں اردو ادب جو لئے نئے رجحانات سے دوچار ہوا ہے اس میں حالات و واقعات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان ادیبوں کی شعوری کوششوں کو بھی دخل ہے جن کے شعور میں پختگی، تخیل میں بلند پروازی، دلوں میں کشادگی، نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی کے عناصر کی فراوانی موجود ہے۔ ایسے ادیبوں نے ہمارے ادب کے قریب قریب ہر شعبے کو ایک انقلاب کی لہر سے دوچار کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، غرض یہ کہ ادب کی ہر شاخ ایک نئی دنیا میں سانس لیتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ادب میں ان تمام تبدیلیوں، ان تمام انقلابات اور ان تمام ترقیوں کا سہرا، ظاہر ہے کہ ادیبوں ہی کے سر ہے۔ اور ادب کے ان نئے رجحانات کی عمارت ظاہر ہے، انھیں کے سہارے کھڑی ہے۔

ایسے ہی ادیبوں میں سے ایک پروفیسر سید احتشام حسین بھی ہیں۔ جن کی ادبی زندگی کی عمر ابھی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ ادبی دنیا میں قدم رکھے ہوئے ابھی انھیں آٹھ دس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل سی مدت میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے اسی سے ان کے رنگ اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم ان کی تحریروں کو پڑھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی روح ایک بے چین روح ہے۔ ان کا دل ایک تڑپتا ہوا دل ہے۔ ان کا دماغ ایک روشن دماغ ہے غرض یہ کہ ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک باشعور فنکار ادیب میں ہونی چاہئیں۔ وہ سوچ سکتے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں۔ غور کر سکتے ہیں۔ تخیل کی پرواز کو آسمانوں سے پرے لے جا کر — وہ بہت دور ستاروں سے آگے بسنے والے جہانوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ ان کی نظر زمین کو چیرتی ہوئی، مختلف پردوں کو اٹھا کر تحت الثریٰ تک پہونچ سکتی ہے۔ وہ زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنوں کا پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ صرف ادب کو اپنا موضوع نہیں بناتے بلکہ ادب کے توسط سے زندگی پر ایک گہری نظر ڈالتے ہیں۔ یا زندگی کے راستے سے گزر کر ادب کی منزل تک پہونچتے ہیں جو کچھ بھی ہو۔ لیکن بہرحال یہ دونوں چیزیں ان کے یہاں لازم و ملزوم ہیں۔ اور جب تک یہ ایک دوسرے سے شیر و شکر نہ ہوں ان میں سے کسی ایک کی بھی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں زندگی سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے خود ایک زندگی پائی جاتی ہے۔

ان خصوصیات کی حامل ہیں احتشام صاحب کی تحریریں جنہوں نے ۱۹۱۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ماہل کی سرزمین پر سیدوں کے ایک پرانے خاندان میں آنکھ کھولی۔ بچپن میں پرانے طرز پر عربی فارسی پڑھنی شروع کی لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کے گھر والوں نے انھیں انگریزی ہی تعلیم دینا مناسب سمجھا چنانچہ اعظم گڑھ میں اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ جہاں سے وہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے الہ آباد چلے گئے۔ الہ آباد سے انھوں نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات دونوں اول نمبر میں پاس کئے جس کے بعد ۱۹۳۸ء میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ادبیات اردو کے لکچرار ہوگئے

پس پردہ آج بھی موجود ہیں

لیکن ان واقعات سے کہیں زیادہ دلچسپ ان کی ادبی زندگی کی نشو و نما کی کہانی ہے۔ انھوں نے شرفا کے ایک قدیم گھرانے میں آنکھ کھولی اس لئے ادب اور شاعری کے چرچے ہوش سنبھالتے ہی ان کے کانوں نے سنے۔ ظاہر ہے کہ جس حد تک ادب اور شاعری سے ان کے آس پاس کے لوگ دلچسپی لیتے تھے وہ ایک خاص قسم کی تھی جس میں قدیم اور روایتی رنگ تھا۔ ماحول اور وراثت کے ان اثرات نے احتشام صاحب کے اندر ادبی ذوق کی ایک شمع ضرور روشن کر دی اور بچپن ہی میں ادب اور شاعری سے والہانہ دلچسپی لینے لگے لیکن چونکہ وہ ذہین تھے۔ طباع تھے۔ ان کی اپنی ایک انفرادیت تھی اس لئے وہ اپنے ماحول کے ساتھ بہہ نہیں گئے بلکہ اپنی وراثت کی بالکل حلقہ بگوشی اختیار نہیں کی۔ بلکہ ان کی ذہانت، طباعی اور انفرادیت نے اپنے آس پاس کی چیزوں کو ایک تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا جس میں ان کو بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ اپنے ماحول میں سب سے زیادہ جس چیز نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ اس کی تضادی کیفیت تھی جس کو انھوں نے پسند نہیں کیا۔ ایک خاص ماحول میں رہ کر اس کے متعلق اس قسم کے خیالات کا قائم کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی صلاحیتیں فطری طور پر موجود تھیں، جن پر وقت کے ساتھ جلا ہوتی گئی۔ بہرحال شروع ہی سے وہ چیزوں کے متعلق دیکھنے بھالنے سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے عادی ہوگئے اور جب ان کے علم میں اضافہ ہوا تو یہ تنقیدی شعور بھی زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ جلا ہوتی گئی۔

الہ آباد کے قیام کے زمانے میں احتشام صاحب نے بہت کافی لکھا اور ادب کے ہر شعبے کی طرف توجہ کی۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید۔ غرضیکہ کوئی شعبہ بھی ان سے بچ نہ سکا۔ نظمیں اور افسانے انھوں نے کم لکھے لیکن جو کچھ لکھے ان میں ایک زندگی نظر آتی ہے۔ ان میں سماج کے بہت سے اہم اور ضروری مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ انسانوں کی آفاقی الجھنوں اور پریشانیوں کا ذکر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فنی اور جمالیاتی خوبیاں بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ ان کی شروع کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں لیکن ان میں بھی زندگی کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے جذبات و احساسات کو ان میں سمو دیا گیا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں رومان کے یہ نقوش مدھم پڑتے جاتے ہیں اور حقیقت کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔ یہاں ان کے

سلہ:- یہ مختصر سا مضمون احتشام صاحب کے تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ادبی کوششوں کا تفصیلی جائزہ اس میں ممکن نہیں۔ عبادت۔۔۔

خیالات میں زیادہ تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب وہ انسانیت کی زبوں حالی اور کس مپرسی پر روشنی ڈالنے لگتے ہیں اور زندگی کے ان تاریک پہلوؤں کو بے نقاب کرنے لگتے ہیں جن کا شکار آج ساری انسانیت ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے بیانات کے ساتھ ساتھ روشنی کی ایک کرن کسی وقت میں بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ یہ تمام خصوصیات "نظام کہنہ" "بیماری کی خبر" "رخِ تصویر مشرب" اور "تصویر کے دھندلے ہیں" پاورے طور پر نمایاں ہیں۔ افسانوں میں بھی کم و بیش یہی خصوصیات موجود ہیں۔ ان سب میں بھی زندگی کے بنیادی مسائل کو نفسیات سے ہم آہنگ کر کے دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے اور کہیں سماجی بدحالیوں کو موضوع بنا کر خارجی زندگی کی تصویریں سامنے لائی گئی ہیں جو فنی اور جمالیاتی رنگ سے مزین ہیں لیکن ان سب سے زیادہ اہم ان کی تنقید ہے کیونکہ انہوں نے اس طرف سب سے زیادہ مستقل طور پر توجہ کی ہے۔

تنقید ان کا خاص میدان ہے اور انھوں نے تنقید کے متعلق سب سے زیادہ لکھا بھی ہے۔ وہ اپنے آپ کو تنقید ہی سے وابستہ بھی کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ پہلے تنقید نگار ہیں اور اس کے بعد کچھ اور! ان کے اندر ایک تنقیدی شعور جس طرح پیدا ہوا وہ جیسے جیسے، وقت کے ساتھ ساتھ اس پر جلا ہوتی گئی اس کا بیان کہیں اوپر ہو چکا ہے۔ یہ تنقیدی شعور نہ صرف ان کی تنقیدوں میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ ان کی تخلیقی کوششوں میں بھی اس کے اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔ چنانچہ تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے افسانے اور نظمیں بھی گہری سوچ اور تفکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ احتشام صاحب نے ان میں سموئے ہوئے موضوعات کو ایک تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے جب وہ تنقید لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کا یہ تنقیدی شعور پوری طرح کام کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی تنقید صحیح معنوں میں تنقید بن جاتی ہے اور چونکہ وہ اپنے ان تنقیدی خیالات و نظریات کو نہایت غور و فکر اور سوجھ بوجھ کے بعد پیش کرتے ہیں اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

احتشام صاحب کی تنقید تخلیقی تنقید ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف برائیاں گنانا ان کے نزدیک تنقید نہیں ہے، وہ تنقید کو ان معمولی اور اوچھی باتوں سے بہت بلند سمجھتے ہیں جس موضوع پر بھی وہ لکھتے ہیں اس سے ان کو پوری پوری ہمدردی ہوتی ہے۔ کسی تخلیق پر تنقید کرتے وقت وہ اس خیال کو ایک لمحے کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے کہ اس تنقید پر ان کے خیالات بذات خود کسی اہمیت کے مالک ہوں۔ یعنی وہ کچھ ایسی سستی کی باتیں بتائیں کہیں ایسی گہرائی میں پہونچ کر معانی کے کچھ لیے موتی نکالیں جہاں دوسرے کے ذہن کا پہنچنا مشکل ہو جائے۔ کہیں ایسی فضاؤں میں آسمانوں پر پرواز کریں جہاں کسی دوسرے کے تخیل کی پرواز نہ پہونچ سکے کہیں دور کسی ایسی دنیا میں پہنچ کر نئی نئی باتوں، نئے نئے خیالات و نظریات کے لیے تارے توڑ لائیں جن تک کسی کی بھی رسائی ممکن نہ ہو۔ اپنی تنقید میں انھیں نئے نئے خیالات و نظریات کو پیدا کرنے کا ایک شعوری احساس ان کی تنقیدی تحریروں کو تخلیقی رنگ دے دیتا ہے۔ چنانچہ اسی شعوری احساس کے پیش نظر وہ مجبور ہو جاتے ہیں زیادہ سے زیادہ گہرائی میں جانے کے لئے! اور وہ جاتے ہیں جس سے نتیجے میں ان کی تنقیدی تحریریں اکثر اصولوں کی بحث کا مرکز بن جاتی ہیں یہی ان کے تنقیدی نظریات کی تخلیق ہے۔ جن کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تنقیص کو تنقید سمجھتے اور نہ تعریف کرنے کو بلکہ ان کو تو یہ خیال رہتا ہے کہ ان کے تنقیدی خیالات و نظریات علوم میں اضافے کریں ان خیالات میں تازگی اور جدت کا ہونا ضروری ہے تاکہ عوام اور خواص دونوں پر اثر کریں۔ اور ان کو منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔ ان کے خیالات میں سوچ اور تفکر کے عناصر کی فراوانی ہوتی ہے کیونکہ وہ غور و فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان میں جذباتیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ عقل و فہم اور شعور و ادراک کو دخل ہوتا ہے اور وہ ان سب کو پیش اس طرح کرتے ہیں، ان کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے جس سے دل ان کی طرف کھنچتے ہیں۔ ان کی تنقید کی یہ تمام خصوصیات اس کو تخلیق کا رنگ دے دیتی ہیں اور ان کی تنقید کو تخلیقی تنقید کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اپنی تنقید میں ان تمام خصوصیات کو پیدا کرنے کے لئے ان کو اردو تنقید کی روایت سے بغاوت بھی کرنی پڑی ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہماری تنقید نگاری میں ان کا مرتبہ ایک باغی کا مرتبہ ہے۔ انھوں نے اردو کی اس تنقیدی روایت کو توڑا جس کی بنیادیں سائنٹفک اصولوں پر قائم نہیں تھیں۔ یوں تو احتشام صاحب سے قبل بھی اردو تنقید میں روایتوں سے بغاوتیں ہو چکی تھیں جو اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں لیکن یہ بغاوت جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم اختر رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین وغیرہ نے کی وہ ان سب بغاوتوں سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔ حالی اور شبلی بھی اپنے اپنے وقت کے باغی تھے۔ ان کے خیالات نے اردو کے فرسودہ نظریات تنقید کو جڑ سے اکھاڑا، جو صرف الفاظ، زبان، روزمرہ و محاورہ اور عروض و قوافی کے مباحث کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ان دونوں نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ صرف ہیئت کی اہمیت ہی کو انھوں نے محسوس نہیں کیا بلکہ مواد کی طرف بھی توجہ کی اور اس طرح شعر و ادب کے جانچنے کے اصول منضبط کئے۔ یہ دونوں نقاد مغرب سے براہ راست متاثر نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے عربی تنقید کے زیر اثر اپنے نظریات اور اصولوں کی تشکیل کی۔ مغرب کے جو کچھ تھوڑے بہت اثرات ان کے یہاں ملتے ہیں وہ عربی ہی کے توسط سے ان تک پہنچے ہیں لیکن ان کی بغاوت نے بہت سی نئی راہیں ضرور تعمیر کر دیں۔ مغربیت نے ہمارے سارے ادب پر چھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ

ان کے بعد ادبی تنقید میں ایک اور روایت کی بنیاد پڑی جس میں رومانیت کو زیادہ دخل ہے ویسے بھی اس دور کے ادب کا رجحان مجموعی اعتبار سے رومانیت ہی کی طرف رہا۔ اسی وجہ سے تنقید میں بھی یہی اثرات آئے اور عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتحپوری، حامد اللہ افسر، لطیف الدین اور کسی حد تک فراق اور مجنوں بھی اس قسم کی تنقید کے علمبرداروں میں نظر آئے۔ فراق اور مجنوں نے آگے چل کر اپنا راستہ بدل دیا۔ انھوں نے اس رومانی اور خیالی تنقید کو چھوڑ دیا جس میں جذباتیت زیادہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ رومانیت ہمیشہ ہمیشہ چلنے والی نہیں تھی، کیونکہ خود حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خود فراق اور مجنوں نے بغاوت کی جس میں مجنوں تو پوری طرح ترقی پسند ہو گئے لیکن فراق تنقید کے ذوقی اور وجدانی ہونے کے قائل رہے۔ کیونکہ باوجود ترقی پسند تحریک سے ہمدردی رکھنے کے ان کی جذباتیت اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس بغاوت نے کئی اور نئے نقادوں کو پیدا کیا جس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، اختر رائے پوری اور خود احتشام صاحب بھی شامل تھے اور انھوں نے چونکہ تنقید کی طرف ان میں سب سے زیادہ توجہ کی اس لئے وہ اس بغاوت میں سب سے پیش پیش نظر آئے۔

احتشام صاحب کے خیال کے مطابق تنقید بڑی اہمیت کی مالک ہے۔ وہ اس کو ترقی پسند دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ترقی پسند تنقید ہی اصل تنقید ہے کیونکہ اس کی بنیادیں سائنٹفک اصولوں پر قائم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ترقی پسند نقاد کا معیار نقد بالکل دوسرے تصورات سے بنتا ہے جس میں اچھے برے، عمدہ، نفیس، خراب اور اس قسم کے سطحی لفظوں سے نقد نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے جانچنے، پرکھنے اور دیکھنے کے آلے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ وہ عام طور سے کتاب کی اچھائی یا برائی پر صرف انداز بیان یا طرز تحریر کو دیکھ کر رائے نہیں دیتا بلکہ کتاب کے سمجھنے، اس کے مفاہیم کا تجزیہ کرنے اس کے اندرونی رجحانات کو واضح کرنے اور اسے انسانی زندگی کے افعال و کردار سے مطابق کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ اس کے سامنے یہ تصور نہیں ہے کہ ادیب کوئی مافوق الفطرت شخصیت رکھتا ہے۔ اس کی تحریر میں الہام کی شان ہوتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ کتاب جو اپنے عہد کی یا جس عہد کا تذکرہ کرتی ہے، اس عہد کی پوری ترجمانی نہیں کرتی، اس نے اپنا ہر کام ہی پورا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی۔" اسی خیال کے پیش نظر وہ اپنی تنقید میں صرف اچھائی اور برائی کا ذکر نہیں کرتے۔ نہ تنقیدی نعروں اور فقروں کو دہراتے ہیں، بلکہ جو تخلیق جس عہد کی پیداوار ہوتی ہے اس کے پس منظر میں اسکا جائزہ لیتے ہیں۔ ادیب کے اوپر ماحول کے جو اثرات پڑے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر اس کے متعلق کوئی رائے دیتے ہیں۔ تنقید میں وہ ذوق اور وجدان کو رہنما نہیں بناتے بلکہ ایک "حکیمانہ شعور" کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حکیمانہ شعور ان کو مجبور کرتا ہے کہ ادبی تخلیق کو مختلف علوم کی روشنی میں دیکھ کر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کریں یہی وجوہات ہیں کہ ان کے اس قسم کے تجزیوں میں بڑی فلسفیانہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کا ہر تنقیدی خیال و نظریہ معقولیت پسندانہ ہوتا ہے۔

یہ خیالات رکھنے والا نقاد، ظاہر ہے کہ ادب کے مابعد الطبیعاتی، الہامی اور روحانی ہونے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ادب کو گردوپیش کے خارجی حالات اور مادی تغیرات کا مظہر خیال کرے۔ چنانچہ احتشام صاحب اسی طرح پر سوچتے ہیں وہ ادب برائے ادب کے نظریئے کے قائل نہیں بلکہ ادب کو ایک سماجی فعل سمجھتے ہیں جس میں افادیت کا ہونا لازمی ہے۔ ادب اجتماعی اور سماجی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اجتماعی اور سماجی ماحول ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا اس لئے ادب میں تغیرات ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہر حال اجتماعی اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس لئے ادب اپنا سماجی افادیت اور مقصدیت کے رنگ بھی دیتے رہتے ہیں۔ احتشام صاحب کہتے ہیں کہ "کوئی تحریک جو تہذیب تمدن کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے سیاست دانوں اور مدبروں کی زبان سے نکلتی ہے وہ شاعروں کے ہاتھوں میں پہنچ کر ادبی حقیقت بن جاتی ہے۔" اس لئے ادب کو سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی تغیرات و انقلابات سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسکو ان سب کا ساتھ دینا چاہئے اور پوری طرح ترجمانی کرنی چاہئے اور ان سب کو کسی صحیح راستے پر لگانا بھی اسکا فرض ہے۔ کیونکہ سماج کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مسائل ادیب کے بھی مسائل ہوئے اور وہ ان سے کسی حال میں بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا، کیونکہ انھیں اجتماعی مسائل کے سلجھنے میں اس کے انفرادی مسائل کے سلجھنے کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ سماج کے ایک معقول فرد کی حیثیت سے ادیب کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ تمام مسائل کو اپنا موضوع بنا کر کوئی ایسا پیغام دے جو اجتماعی طور پر سماج کے تمام افراد کے لئے مفید ثابت ہو۔ احتشام صاحب کے خیال کے مطابق "ادیب اور شاعر کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے۔ بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہئے اسکا اظہار بھی کر دے۔ پڑھے لکھے ہوشیار اور معمولی ادیب میں یہی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر زندگی کی نئی تخلیق کے پہلو پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔ بہتر زندگی بسر کرنے کے اصول بھی بنا سکتا ہے ظلم و جور کے خلاف آواز بھی بلند کر سکتا ہے۔ ناانصافی اور بے اعتدالی پر احتجاج بھی کر سکتا ہے۔ غلامی اور اقتصادی تاراجی جنگ جنگ اور منافرت کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کر سکتا ہے۔" یہ ہے ان کے خیال کے متعلق ادب اور ادیب کا آدرش!

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ

کدار ناتھ بسین

لڑائی کا زمانہ ہو یا امن کا، حفظانِ صحت، تیمارداری اور دایہ گری کے کام ہر ملک و قوم کے لئے سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ زچہ خانوں میں پیدائش کے وقت سے بھی پہلے سے لے کر سنِ بلوغت تک ہر شہری کے واسطے اس کی صحت کی حفاظت لازمی ہے بلکہ اس کی ضرورت بعد میں بھی اور بڑھاپے کے زمانہ میں بھی باقی رہتی ہے۔ تیمارداری کا کام ایک زمانہ میں سب سے زیادہ کٹھن سمجھا جاتا تھا اور اس کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی تھی لیکن فی زمانہ یہ کام انگلستان میں بہت موقر سمجھا جانے لگا ہے اور اس پیشہ کو مستند مان لیا گیا ہے۔ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۳۶ء کے قوانین دایہ گری کی رو سے بغیر سند حاصل کئے ہوئے کسی کا اپنے تئیں "دایہ" کہنا خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے اور خلاف ورزی پر سزائے قید یا سزائے جرمانہ ہو سکتی ہے۔

لڑائی سے پہلے سے اور جنگ کے دوران میں صحتِ عامہ کے شعبہ کو بڑی ترقی ہو گئی ہے۔ حال میں بعض مخصوص امراض مثلاً دق اور خلل دماغ کے معالجوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس نے نرسوں پر بڑی بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا ہے اور ان کو بڑا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ طبی دنیا میں ترقی کے ہر قدم کے ساتھ ساتھ نرسوں کو بھی اپنی استعداد بڑھانا لازمی ہو گیا ہے۔ ایک مکمل طور پر سند یافتہ سرکاری نرس کی ٹریننگ کا زمانہ اسی لئے طویل ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جنگ سے پہلے جو اقدامات کئے گئے تھے دورانِ جنگ میں ان کو استوار تر کر دیا گیا جن کی بدولت نرسوں اور دائیوں کو وہ درجہ اور مالی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کی وہ مستحق تھیں۔ گذشتہ جنگ کے زمانہ میں انگلستان اور ویلز میں تقریباً ترانوے ہزار نرسیں تھیں (امراضِ دماغی کے شفاخانوں وغیرہ کی نرسیں اس تعداد میں شامل نہیں ہیں) اور اسکاچستان میں تقریباً سولہ ہزار۔

دایہ گری کے پیشہ کو ۱۹۱۹ء سے قانونی حیثیت حاصل تھی۔ پھر "نرسز رجسٹریشن ایکٹس" کی رو سے انگلستان ویلز اور اسکاچستان میں ممتحن ادارے (جنرل نرسنگ کونسلز) قائم ہوئے۔ جن کے پاس نرسوں کا رجسٹر رہتا ہے۔ ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد مقررہ امتحان دے کر اس رجسٹر کے عام حصہ میں داخلہ مل جاتا ہے۔ اس حصہ کے علاوہ پانچ اور اضافی حصے بھی ہیں۔ (۱) بیمار بچوں کی نرسیں (۲) بخار کی نرسیں (۳) مردوں کی نرسیں (۴) دماغی مریضوں کی نرسیں (۵) پاگلوں کی نرسیں۔ ہر قسم کی ٹریننگ کے لئے ابتدائی امتحان یکساں ہوتا ہے۔ اگر کوئی نرس جو ایک قسم کی ٹریننگ حاصل کر چکی ہے کسی دوسری قسم کی ٹریننگ پانا چاہتی ہے تو اس دوسری ٹریننگ کی مدت میں ایک سال کی تخفیف کر دی جاتی ہے۔

۱۹۳۷ء میں ایک کمیٹی نے لارڈ ایتھلون کی صدارت میں اس بات پر غور کیا کہ وہ کیا حالات و شرائط ہیں جن کی وجہ سے اس پیشہ میں مناسب عورتوں کے لئے جاذبیت پیدا ہو اور نرسیں ضروری تعداد میں ہر وقت موجود رہیں۔ اگلا قدم ۱۹۴۱ء میں اٹھایا گیا۔ اس سال لارڈ رشکلف کی صدارت میں ایک کمیٹی تنخواہوں کے بارے میں سفارش کرنے کے واسطے مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی میں پیشہ ور اداروں کی نرسوں، ٹریڈ یونین کانگرس، مقامی حکام اور شفاخانوں کی مختلف مجالس کے نمائندے شریک تھے۔ شفاخانوں کی نرسوں کی تنخواہوں کی پہلی رپورٹ فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں مختصر یہ پہلے سے بہتر تنخواہوں کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ ایک ہفتہ واڑے میں چھیانوے گھنٹہ کی ڈیوٹی، رخصت کی مدت مناسب، غیر معمولی تعلیمی قابلیت کی بنا پر تنخواہ زیادہ اور بیماری کی رخصت کے زمانہ میں پوری تنخواہ ہو۔ وزیرِ صحتِ عامہ نے ان سفارشات کو منظور کر لیا۔

۱۹۴۳ء میں پارلیمنٹ نے "نرسز ایکٹ" پاس کیا۔ اس کی رو سے "اسسٹنٹ نرس" کا درجہ بڑھا دیا گیا، نرسیں مہیا کرنے والے اداروں (نرسز کوآپریشنز) کو معائنوں وغیرہ کے ذریعہ منظم کیا گیا۔ اور نرس کا خطاب صرف انھیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا جن کے پاس نرسنگ کوالیفیکیشنز موجود ہوں۔ اس قانون کی رو سے عوام نالائق اور جاہل نرسوں سے محفوظ ہو گئے اور ان عورات کا بھی تحفظ ہو گیا جو نرسنگ کا کام شروع کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر پورے طور پر ٹریننگ حاصل نہ کر سکی تھیں۔

نرسوں کی ٹریننگ بھی اتنی ہی کٹھن ہے جتنی ڈاکٹروں، انجنیروں یا اور قسم کے فن کاروں اور صناعوں کی۔ ٹریننگ کی مدت تین سال ہوتی ہے اور داخلہ کی عمر اٹھارہ اور تیس سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اچھی صحت اور کام چلانے کے قابل تعلیم اور دوسری اہم ضروریات میں سے ہیں۔ پہلے سال نرس بہ حیثیت ایک چھوٹے درجہ کی طالبہ کے شفاخانوں کے "وارڈس" میں دن کی اور رات کی ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ اس زمانہ میں اس کو بچھونا بچھانا، مریضوں کو بہلانا، اور ان کے ہاتھ پاؤں کو دھلانا،

کھانا دینا، معذور بیماروں کو کھانا خود کھلانا، طبی معائنہ کے لئے مختلف جسمانی رطوبتوں کو اکٹھا کرنا، اور مریضوں کو عمل جرّاحی کے کمرے، خاص خاص کلینکس اور ایکسرے کے شعبہ جات میں لے جانا سکھایا جاتا ہے۔ وہ پرانی نرسوں کی بھی مدد کرتی ہے اور اسے دکھایا جاتا ہے کہ مختلف آلات کو کیسے تیار کرتے ہیں۔

ٹریننگ کے دوسرے اور تیسرے سال مردانہ اور زنانہ طبی (میڈیکل)، خصوصی (اسپیشل) اور جرّاحی کے (سرجیکل) وارڈس میں گزرتے ہیں۔ تیمارداری کے زیادہ مشکل کاموں پر جن میں زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے لکچر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسے مریضوں کی دیکھ بھال جن کو آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے دواؤں، ان کی خوراک کے تعیّن اور جسم پر ان کے اثرات کا مطالعہ، ناک، کان اور گلے کی بیماریاں، عورتوں کے مخصوص امراض اور غذاؤں کی تاثیر، یہ سب باتیں بذریعہ لکچروں کے بتائی جاتی ہیں۔

آخری امتحان تین سال کی ٹریننگ کے اختتام پر ہوتا ہے۔ امتحان تحریری بھی ہوتا ہے اور عملی بھی۔ تحریری امتحان میں پرچے عام نرسنگ، دواؤں کے استعمال، اور جرّاحی اور صنفی امراض پر ہوتے ہیں اور عملی امتحان نرسنگ کے اصلی طریقوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ ٹریننگ کسی ایسے ہسپتال میں ہونا چاہئے جس کو سرکاری طور پر ٹریننگ اسکول کی حیثیت حاصل ہو۔ علمی ٹریننگ (لکچروں کے کمروں میں) اور عملی ٹریننگ (ہسپتال کے کمروں میں) بالعموم ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن بہت سی جگہ ٹریننگ کے پہلے تین ماہ وارڈس سے بالکل الگ تھلگ گزرتے ہیں۔ جس عورت کو سرکاری سند مل جاتی ہے وہ اگر خواہاں ہو تو مزید تعلیم پاکر یونیورسٹی سے نرسنگ کا ڈپلوما حاصل کر سکتی ہے۔ لندن اور لیڈس دونوں یونیورسٹیاں ایسے ڈپلومے دیتی ہیں۔ جو نرسنگ کی ٹریننگ لینا چاہیں۔ ان کی امداد کے لئے ٹریننگ کے زمانہ میں معقول رقم کے وظائف دئے جاتے ہیں۔

نرسنگ سروس میں داخل ہونے والیاں سب سے پہلے جو باتیں معلوم کرنا چاہتی ہیں وہ یہ ہیں کہ کس کس قسم کے کام کرنا ہوں گے کب کب فرصت مل سکے گی اور یہ کہ کیا ہر ہسپتال کا معیار یکساں ہی ہوتا ہے؟

اسی بنا پر وزارتِ صحتِ عامہ نے اس کے لئے ایک ضابطہ وضع کر دیا ہے جس پر شفاخانوں، نرسوں کی مجالس اور دوسرے متعلقہ اداروں کو پورا اتفاق رائے ہے۔ اس ضابطہ کی رو سے تمام وہ ہسپتال جہاں ٹریننگ کا انتظام ہے جدید ترین طریقۂ تعلیم پر عمل درآمد کریں گے۔ جو نرسیں ٹریننگ پائیں گی ان کو طالبات ہی سمجھا جائے گا۔ ٹریننگ کا کورس اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا جائے گا کہ نرسوں کو اس کے پڑھنے کا کافی وقت میسر ہے اور یہ کہ امتحان کا جو معیار رکھا گیا ہے وہ اس پر پوری اترنے کی اہل ہیں۔ عملی کام سیکھتے ہوئے ہسپتال کے اندر اور باہر ان کی تفریح کا بھی خیال اور انتظام رکھا جائیگا۔

ٹریننگ کے اسکولوں میں ابتدائی درجے ہونگے جہاں ٹریننگ پانے کی خواہاں نرسوں اور اسسٹنٹ نرسوں کو ہسپتال کے کمروں میں داخلہ سے قبل کی ٹریننگ دی جائے گی۔ لکچروں کا وقت متعین کرتے ہوئے پڑھانے والے عملہ اور خود ہسپتال کے ڈاکٹروں کا تعاون حاصل کیا جائیگا تاکہ نہ ڈیوٹی میں خلل پڑے نہ فرصت کے اوقات میں۔ تمام ٹریننگ اسکولوں میں جماعتیں میں اور پرائیویٹ پڑھائی کا معقول انتظام کیا جائے گا۔

ہر نرس کو ایک ہفتہ وار اڑتالیس چھیانوے گھنٹے کی ڈیوٹی دینی ہوتی ہے خواہ وہ دن کی ہو خواہ رات کی۔ تمام نرسوں کو ہفتہ میں کم از کم ایک پورے دن کی چھٹی ضرور ملا کرے گی اس کے علاوہ گاہ گاہ اور بھی رخصت مل سکا کرے گی۔ جو نرسیں رات کی ڈیوٹی پر ہوا کریں گی ان کو آدھی رات کو آرام اور کچھ کھانے پینے کے لئے وقفہ ملا کرے گا۔ بیماری کی چھٹی کے علاوہ، ہر نرس کو سال میں چار ہفتہ کی چھٹی پوری تنخواہ پر مل سکے گی۔

ہر ہسپتال میں نرسوں کی تندرستی کا خیال رکھنے کے لئے پورا پورا انتظام ہوگا اور اس کام کے واسطے ایک تجربہ کار ڈاکٹر مقرر ہوگا۔ داخلہ کے وقت ہر نرس کا طبی معائنہ ہوتا ہے اور آئندہ بھی وقت ضرورت اکثر ہوتا رہتا ہے۔ جو نرسیں چھوت کی بیماریوں کے سلسلہ میں متعین ہوتی ہیں ان کے معمولی ششماہی امتحانات کے ساتھ ساتھ اور بھی امتحان ہوتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

حیات جاوید — غلام ربّانی تاباں

ایک دن تاریخ کی ظلمت میں کھو جاؤں گا میں
زندگی کی راہ میں پامال ہو جاؤں گا میں

یہ شفق آلود شام میں نرم و نازک سی فضا
ڈھل گئی رعنائی فطرت مرے اشعار میں
گا چکا ہوں کتنے رنگیں گیت سازِ عشق پر
پڑھ چکا کتنے قصیدے حُسن کی سرکار میں
اہلِ گلشن سے کہا افسانۂ برق و شرار
قصۂ مفلس سنایا محفلِ زردار میں
دی بشارت صبح کی ظلمت زدہ انسان کو
قلبِ عصرِ نو کی دھڑکن ہے مرے افکار میں
محرمِ اسرارِ فطرت ہے مری فکرِ رسا
بارہا پہنچا سوادِ ثابت و سیّار میں

میرے مرنے پر مرے اشعار مر سکتے نہیں
میری تصنیفیں مرے افکار مر سکتے نہیں

ٹوٹ گئے شبنم کے موتی

افسانہ

اختر جہاں بیگم

پہلے دن تو کیشو کو شہر کی ہنگامی فضا ایک نئی دنیا معلوم ہوئی۔ سڑکوں پر پھسلتی ہوئی کاریں۔ رینگتی ہوئی بسیں۔ لاریاں۔ دمکیلے چہرے۔ لہراتے ہوئے ریشمی آنچل۔ ہر طرف گہما گہمی۔ جس چیز پر نظر ڈالتا ہٹانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یوں تو کیشو کو پہلے بھی کئی بار شہر آنے کا اتفاق ہوا لیکن محض چند گھنٹوں کے لئے۔ وہ ہر مرتبہ اپنے ساتھ کچھ اچٹتے ہوئے نظارے لے کر چلا جاتا جو گاؤں کی میلی کچیلی سادگیوں میں مدغم ہو کر رہ جاتے۔ اور شہر دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں ہر بار نیا جنم لیتی تھی۔ شہر کی فضاؤں پر بھی کیشو کو ہر دفعہ ایک تازہ بہار نظر آتی۔ تانگوں کی جست اور سرپٹ رفتار دیکھ کر اس کے ذہن میں گاؤں کی بیل گاڑی ہچکولے کھانے لگتی۔ کشادہ مکانوں کی بلندی اسے گاؤں کے کچے گھروندے سے مکانوں کی یاد دلاتی جن کے سامنے اکثر میلے کچیلے سوکھے سہمے بچوں کے گروہ ناچتے نظر آتے تھے۔ خوش پوش فیشن ایبل لڑکیوں کی شوخیاں دیکھ کر وہ دل ہی دل میں گاؤں کی ان سادہ لوح اور شرمیلی لڑکیوں پر مسکرا دیتا جو دیہاتی ملبوس میں سمٹی سمٹائی اسے اکثر پنگھٹ کی راہ پر ملتی تھیں اور کبھی گوبر اٹھاتی ہوئی۔ کیشو نے پھریری لی۔ گاؤں کے تخیلی ماحول پر گوبر کی بدبو چھا گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لبوں پر ایک نامعلوم عرصے تک شہر رہنے کا خیال مسکراہٹ بن کر پھیل گیا۔

کیشو کو "بابوجی" کے مکان سے زیادہ مکین بھلے لگے۔ وہ بچے (جن کی خدمت پر کیشو مامور کیا گیا تھا) بالکل پھول سے تھے۔ "بی بی جی" بھی ہنس مکھ تھیں لیکن چھوٹی بی بی جی کی تمکنت اور غصے نے کیشو کو پہلے ہی روز سہما دیا۔ وہ اسے کیشو کے بجائے "جانگلو" کہا کرتی تھیں۔ کیشو "جانگلو" کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھا شاید یہاں نوکروں کو اسی نام سے پکارتے ہوں گے لیکن اسے تسلی نہ ہوئی کیشو کتنے ہی دن ارادہ کرتا رہا کہ اس لفظ کا مطلب معلوم کرے۔ آخر ایک دن چھوٹی بی بی جی کو ذرا خوش دیکھ کر اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے بولا "بی بی جی یہ جانگلو کسے کہتے ہیں؟ ..." "تمہیں!" وہ کھکھلا دیں کیشو کے بھی ہونٹ پھیل گئے "چل بدتمیز ہنستا ہے! خبردار جو آج سے پیچھے تیرے دانت نظر آئے کمبخت بھٹے کے سے دانے!" کیشو سہم کر چپ ہو گیا لیکن بھٹے کے دانے اس کے دانتوں کے نیچے کچر کچر آ گئے میٹھے سوندھے سوندھے۔ کیشو کو بھٹے کھائے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ آجکل تو گاؤں میں خوب گنے ہو رہے ہوں گے۔ رامو کہہ تو رہا تھا لانے کو۔ رامو کیشو کا پرانا ساتھی تھا۔ جو شہر کے کسی کپڑے کے مل میں کام کرتا تھا۔ کیشو اسی کے توسل سے یہاں ملازم ہوا تھا۔ رامو ہر تیسرے چوتھے دن کیشو سے ملنے آتا اور اونچ نیچ سمجھا بجھا کر چلا جاتا۔ وہ جب سے مل میں ملازم ہوا تھا اور شہر میں مستقل طور پر رہنے لگا تھا اس کی وضع ہی بدل گئی تھی۔ دھوتی کی جگہ پاجامے اور گاڑھے کے کرتوں کی جگہ رنگین قمیضوں نے لے لی تھی۔ سر پر پگڑی کے بجائے انگریزی بال نظر آتے تھے۔ کچھ دن سے رامو نے مل میں کسی منشی سے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ رامو کی موجودگی میں کیشو کو اپنی زبوں حالی کا احساس بہت تکلیف دیتا تھا۔ اپنے لباس پر نظر دوڑا کر وہ جھنجلا اٹھتا۔ گھٹنوں تک کا بوسیدہ جانگیہ، بابوجی کی پھٹی پرانی قمیص، گھٹا ہوا سر۔ کیشو نے اپنی قمیص کے دامن جانگیے کے اندر اُڑس لئے اس طرح کچھ نیکر کی وضع ہو گئی تھی۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے قدرے مطمئن ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ چھوٹی بی بی جی کی آواز آئی۔ "ذرا دیکھو تو مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ نیکر کی حرص کر کے کیا اترا رہا ہے نامعقول!" چھوٹی بی بی جی کے ساتھ بچے بھی اسے دیکھ کر ہنسنے لگے اور کیشو کے چاروں طرف بھٹے کے سے دانے بکھر گئے۔ اس کا جی چاہا ان سب کے دانت بھٹوں کی طرح چبا ڈالے ... ننھی کے دانتوں پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ اس کے ہنستے ہوئے لب بالکل چمپا کی طرح پھول کی پنکھڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔ چمپا کیشو کی بہن تھی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی۔ راجکماریوں کی طرح حسین۔ کیشو کہتا تھا ماں اس سے گوبر نہ اٹھوایا کر۔ چمپا اور بھی پھول جاتی۔ جب کیشو گاؤں سے چلا تو چمپا نے مچل کر کہا تھا "بھیا میرے لئے گوٹے والی چندری لائیو شہر سے" "اری ایک چندری! دیکھ تو کیا کیا لاہوں تیرے لئے!" چمپا اپنی پھٹی ہوئی چندری میں انگلیاں پھنسا کر کھیلنے لگی "بس اب تو یہی چندری رہ گئی ..." "اچھا لاؤں کیسی؟" چمپا مسکرا دی اور آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی: "ایسی لائیو جیسے دھنک میں رنگ ہوتے ہیں اور کنیوں پر گوٹا بھی ہو۔" ..... "دھنک کے رنگ" کیشو نے آہستہ سے کہا۔ آج اسے چمپا یاد آرہی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی چندری اور بھی پھٹ گئی ہوگی اب تو۔ چمپا اپنی نئی چندری کے لئے کس قدر بے چین ہوگی۔ اپنی سہیلیوں سے

ناچ ناچ کر کہتی ہوگی: ”ارے ان چیتھڑوں کو کیا دیکھتی ہو، بس تھوڑے دن میں میری نئی چندری آجائے گی، میری اچھی چندری! دھنک سے زیادہ رنگ برنگی!“... کیشو نے اپنی جمع شدہ رقم ٹٹولی۔ ابھی تو صرف چند سکے چمک رہے تھے۔ ابھی وہ دھنک بہت دور تھی۔ کیشو کو چند دن سے پیسے جمع کرنے کی دھن سوار تھی۔ جس کے لئے اسے چھوٹی بی بی جی کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کا کمرہ بڑے شوق اور توجہ سے صاف کرتا۔ میز پوش میں ذرا دھبے لگے اور کیشو نے چھوٹی بی بی جی کی تنبیہ کے بغیر ہی صاف ستھرا میز پوش بچھا دیا۔ کبھی قلمدان دھل رہا ہے تو کبھی کتابیں سجائی جا رہی ہیں... چھوٹی بی بی جی کبھی کبھی خوش ہو کر دونی چونی بطور انعام دے دیا کرتی تھیں... ایک دن کیشو اپنے پیسوں میں سے کاغذ کے خوبصورت پھول خرید لایا اور سنگار میز پر سجا دئے۔ جب چھوٹی بی بی اندر داخل ہوئی تو وہ باہر کی طرف کھڑکی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھولوں کو دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا دیں۔ ”ارے!“ کیشو کے لبوں سے مسکراہٹ ابلی پڑتی تھی۔ ”ارے کیشو!“ انھوں نے آج پہلی بار جانگلو کے بجائے کیشو کہہ کر پکارا تھا ”جی بی بی جی!“ ”بس تو آج سے جانگلو نہیں رہا۔ آج سے میرے کمرے کی صفائی محض تمہارے سپرد ہے... یہ تو اپنا انعام!“ کیشو کے ہاتھ پر ایک روپیہ چمک رہا تھا۔

جوں جوں ڈبیا بھاری ہوتی جا رہی تھی اس کے ذہن میں بھی دھنک کے بھینے بھینے رنگ ابھرتے جا رہے تھے ہلکے ہلکے رنگیلے رنگ جو پھیلتے پھیلتے چندری کی شکل میں لہرا اٹھتے تھے۔ دھنک کا خیال آتے ہی اسے گاؤں کی ندی یاد آجاتی جس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دھنک کا جھولا کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اسی ندی کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ کیشو کو بچپن سے اس گاؤں میں جانے کا شوق تھا۔ لیکن وہ گاؤں اس سے امید کی طرح دور ہی رہا۔ جس طرح آرزوئیں ناامیدی کے تنہا ساحل پر ہار کر بیٹھ جاتی ہیں اسی طرح کیشو ندی کے کنارے بیٹھ کر اس گاؤں کو پُرشوق نظروں سے تکا کرتا تھا... لیکن اب تو وہ خوش آسانی سے خریدا جا سکتا تھا۔ جس کے لئے کیشو کو چار پیسے کی ضرورت اکثر پریشان رکھتی تھی۔ ندی پار کرنے کے لئے ملاح کو صرف پیسے دینے پڑتے تھے۔

ایک دن اچانک رامو نے خبر سنائی کہ چمپا بیمار ہے۔ کیشو دھک سے رہ گیا۔ اسے فوراً گاؤں جانا چاہئے تھا لیکن چندری؟ چمپا کی بیمار آرزو راہ تکتے تکتے سو نہ جائے کہیں! کیشو نے اپنی جمع شدہ رقم ٹٹولی صرف چار روپے چھ آنے پڑے گویا طنزاً مسکرا رہے تھے۔ ان سے کیا دال گلے گی۔ کیشو کا دل بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تمام کائنات چمپا کے نازک لبوں میں بدل کر لرز اٹھی ”چندری لائے بھیا؟“... کس منہ سے گاؤں جائے یکایک کیشو کے چہرے پر امید جھلک اٹھی۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا بچے کھیل میں لگے ہوئے تھے بڑی بی بی جی اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ کیشو ہر طرف سے مطمئن ہو کر سرلا (چھوٹی بی بی) کے کمرے میں داخل ہوا۔ سنگار میز پر اس کی امیدیں بکھری پڑی تھیں۔ چاندی کے چمکتے ہوئے سکے... کیشو نے آج سے پہلے کبھی چوری نہ کی تھی بلکہ چوری کا خیال ہی اس کے ہاتھوں کو بوجھل کر دیتا تھا جیسے سچ مچ اس کو اس خیال نے ہتھکڑیاں پہنا دی ہوں۔ لیکن آج وہ چمپا کے لئے ہتھکڑیاں پہن لینے پر بھی تیار تھا۔ کیشو نے دوبارہ چاروں طرف دیکھ کر روپیوں کو چھوا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا.. اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور کیشو کے دل کی دھک دھک دھم دھم میں بدل گئی۔ سامنے سرلا کھڑی تھی۔ کیشو کا ہاتھ جوں کا توں رہ گیا جیسے اس کا ہر عضو ہتھکڑیوں کی گرفت میں کھنچا جا رہا ہو۔ ”ڈرو نہیں..“ سرلا نے صورت حال کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ اس نے کتابیں میز پر رکھتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ کہا ”میں جانتی ہوں کیشو تم چور نہیں ہو.... مجھے بتا دو آخر کس ضرورت نے تمہیں اس کام پر مجبور کیا؟“ کیشو کے حلق میں سینکڑوں کانٹے ابھر آئے تھے زبان سوکھ کر تالو سے چپک گئی تھی... ”چمپا بیمار ہے...“ کیشو کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا امید کی یہ پہلی ٹھیس کھا کر آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ آج کیشو نے پہلی بار امید کا فریب کھایا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ جس طرح ایک بچہ اپنا کھلونا ٹوٹنے پر رو پڑتا ہے۔ ”اچھا تو گاؤں جانا چاہتے ہو تم؟“ سرلا نہایت ملائم لہجے میں بولی۔ ”چمپا نے چندری منگائی تھی گوٹے والی چندری... اس کی ساری چندری پھٹ گئی تھی اور اب تو اور بھی جھیر جھیر ہو گئی ہوگی۔“ ”ہاں ہاں تم آج ہی گاؤں چلے جاؤ اور چندری بھی لیتے جانا۔“ اس کے لئے سرلا کے چہرے سے دلی ہمدردی نمایاں تھی۔ اس نے اپنا بٹوہ کھولا اور کچھ نوٹ کیشو کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ کیشو کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی جو اس کی بے پناہ مسرت کا نچوڑ تھی۔ وہ مجسم شکریہ بنا کھڑا تھا لیکن شکریہ ادا کرنا نہ جانتا تھا۔

جب کیشو گاؤں سے لوٹا تو سرلا نے وہاں کی باتیں بڑے شوق اور توجہ سے سنیں چمپا کی باتیں سن کر خوب ہنسی۔ کیشو نے بتایا کہ چمپا چندری دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی میں اسے گھونگھٹ بنا کر جاؤں گی تو سچ مچ کی راجکماری معلوم ہوں گی۔ ”اور نہ بھلا راجکماریاں پانی بھرتی ہوں گی کہیں۔“ اور کیشو اس دفعہ اس بستی میں بھی گیا تھا جو ندی کے اس پار بسی ہوئی ہے۔

سرلا کے کمرے کی صفائی کے بعد اسی کے کہنے سے کیشو نے پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے لباس، تہذیب، طور طریقے میں نمایاں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ چند ہی روز میں کیشو کو خاصی شد بد ہو گئی۔ اب کیشو رامو کے سامنے بجائے احساس کمتری کے فخر محسوس کرتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی رامو سے کہیں بہتر ہوتے تھے۔ بعض مرتبہ کیشو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا۔ رامو کو کیشو کی یہ بے رخی کھٹکتی ضرور تھی لیکن اس کی کمتری نے کیشو سے شکایت کرنے کی ہمت نہ کی۔ آخر رفتہ رفتہ رامو نے کیشو کے پاس آنا جانا کم کر دیا۔

وقت کا دامن نہ کسی نے پکڑا ہے اور نہ کوئی پکڑے گا۔ دنوں سے ہفتے ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال جنم لیتے چلے گئے... اب کیشو۔ کیشو نہیں بلکہ بابو کشور چند پکارے جاتے تھے۔ صباحت، پرکاش اور انہیں جیسے دوستوں کے سامنے غریب رامو کا ٹھکانہ کہاں! سرلا کا خلوص اور بابوجی کی شفقت نے چمپا اور بوڑھی ماں کی محبت کو قطعاً بھلا دیا تھا۔ کیشو ہر ماہ ایک قلیل رقم گاؤں منی آڈر کرتا تھا۔ چمپا نے ایک مرتبہ رامو کی زبانی کہلا کر بھیجا بھی کہ بھیا سے کہنا ہمیں مایا نہیں موہ چاہیئے"۔ لیکن یہاں تو وہی مضمون تھا "چکنے گھڑے پر بوند گری اور پھسل گئی"۔

ایک دن کیشو کلب سے واپس آ رہا تھا کہ رامو باغ کے دروازے پر کھڑا مل گیا۔ "کیشو بھیا اچھے تو ہو اب تو بالکل ہی بدل گئے"۔ "فضول باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے چل کہو کیا کہنا ہے"۔ رامو کھسیانا ہو گیا۔ "کہنا کیا تھا بھیا۔ چاچی نے کہا تھا کہ کیشو سے کہنا گاؤں میں گلٹی کی بیماری پھیل رہی ہے۔ سب گاؤں والے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں ہمیں بھی شہر لے جائے"۔ "میں ایسا بیکار تو ہوں نہیں ان سے کہنا خود چلی آئیں"۔ اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ رامو بھی اسی جگہ کھڑا تھا حیران اور دم بخود۔

کیشو اپنے نئے آشیانے کے لئے سنہرے تار جمع کر رہا تھا۔ تخیل کی پرسکون نہر میں امیدوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ ہر طرف کلیاں ہی کلیاں، خوشبو ہی خوشبو بکھری پڑی تھی۔ اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ہوا کا دھیما سا بگولہ ہی اس چمن کی رت بدلنے کے لئے کافی ہے اور ان کاغذی کشتیوں کو ایک لمحے میں ڈبو سکتا ہے۔ اس نے ان کلیوں کا دامن کبھی نہیں ٹٹولا جس میں کانٹے ہی کانٹے بھرے ہوئے تھے۔۔

کیشو کچھ دن سے پریشان سا رہنے لگا تھا۔ ایک عجیب سا غیر شعوری تذبذب اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ غالباً اس کی وجہ سرلا اور پرکاش کا حد سے زیادہ میل جول تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پرکاش ایک آوارہ شخص ہے۔ آخر ایک دن اس نے سرلا کو باتوں باتوں میں سمجھا بھی دیا۔ وہ فوراً مان گئی اور پرکاش سے ملنا جلنا ترک کر دیا لیکن چند دن بعد کیشو نے محسوس کیا کہ سرلا کی توجہ اس کے نہایت عزیز دوست نریندر کی طرف رہتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ دلچسپی میں بدلتی جا رہی ہے۔ نریندر نہایت شریف اور نیک دل شخص تھا اور کیشو کا مخلص بھی۔ کیشو بعض مرتبہ سوچتا کاش نریندر بھی آوارہ اور عیاش ہوتا۔۔ لیکن آخر یہ سب کس لئے؟ اسے کوئی حق نہیں کہ سرلا کو کسی طرح کی تنبیہہ کرے یا کسی سے ملنے جلنے کو خواہ مخواہ منع کرے۔ کیشو نے تہیہ کر لیا کہ وہ سرلا کی راہ میں کسی طرح بھی حائل نہیں ہوگا۔ اس روز سرلا کی سالگرہ تھی۔ کیشو کلب سے آتے ہوئے سوچ رہا تھا بازار سے کوئی تحفہ خرید لے لیکن نہ جانے کیوں اس کے قدم گھر کی راہ پر اٹھ گئے جیسے وہ ادھر آنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔۔

گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ سرلا کے کمرے میں قہقہوں پر قہقہے لٹ جائے جا رہے تھے۔ کیشو سامنے سے گزرا۔ نریندر صاحب اس خوشی میں جھوم جھوم کر مہمانوں کو گانا سنا رہے تھے۔ سرلا نے کیشو کو جاتے دیکھا لیکن بلانا تو درکنار پوچھا تک نہیں۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سرلا کی یہ بے اعتنائی کہہ رہی ہے "تم وہی تو ہو... ایک دن پھٹے حال نوکر کی حیثیت سے آئے تھے"۔ کیشو نے آنکھیں بند کر لیں جیسے اس طعنے کی زد سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن ان آوازوں کا دم کسی طرح نہ گھٹتا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس طرح بھی بے چینی کم نہ ہوئی تو کھڑکی کی راہ سے باغ میں آ گیا۔ اس کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ اپنا تھکا تھکا بوجھل سر پھولوں جیسی بھینی بھینی آغوش میں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اسی ماں کی بوڑھی آغوش میں جو بچپن کی طرح اب بھی اس کے لئے وا ہو گی ایک بھکارن کی التجا بھری نظروں کی طرح۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ خیالات کے شریر پنچھی ذہن میں پھڑپھڑا کر گاؤں کی طرف پر تول رہے تھے۔ "بابوجی!" کیشو نے سر اٹھایا سامنے چوکیدار کھڑا تھا۔ "یہ پرچہ رامو دے گیا تھا شام کو۔ اسے جانے کی جلدی تھی اس لئے..." کیشو نے چوکیدار کی بات کو پورا کرنے کا موقع بھی نہ دیا اور روشنی کے لئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پرچہ کھولا ٹوٹی پھوٹی اردو میں یہ چند سطریں لکھی تھیں۔

"کیشو بھیا! میں جانتا ہوں تمہیں یہ پڑھ کر زیادہ رنج نہیں ہوگا کہ چمپا اپنی دکھیا ماں کو روتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چل دی۔ اسے گلٹی کی بیماری ہو گئی تھی۔ وہ مرتے مرتے بھی تمہیں یاد کرتی رہی۔ اپنی چندری ماں کو دے کر صرف اتنا کہا کہ بھیا سے کہنا تمہاری لائی ہوئی چندری اتنی اچھی تھی کہ میں اسے اوڑھ نہ سکی"۔

چمپا چل بسی!! کیشو کے ذہن میں گرم گرم سلاخیں گھس گئیں۔ جیسے کسی نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اس نے مسہری پر گر کر تکئے میں منہ چھپا لیا۔ "اس قدر سخت سزا!! میرے کئے کی یہ سزا تو نہ ہونی چاہئے تھی۔۔۔" کیشو تکئے میں منہ چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ کافی دیر بعد یکلخت اس کے آنسو تھم گئے وہ ایک دم نہایت چستی سے اٹھا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر کھسیانی مسکراہٹ سے بولا "خیر!" میز پر سے قلم اٹھائی اور لکھنا شروع کیا۔

چھوٹی بی بی جی

آج تمہارا وہی دس گیارہ سال پہلے کا کیشو تم سے مخاطب ہے۔ ہم غریبوں سے تو قسمت بھی مذاق کرتی ہے مجھے اتنے دن تھپکیاں دیتی رہی آخر آج اس نے ٹھوکر مار کر جگا دیا جیسے تم لوگ کتے کو چمکار کر کھانا کھلاتے ہو اور پھر دھتکار دیتے ہو۔ میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ جہاں کی سادگیاں مجھے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔ "آؤ کیشو بھیا ہم تو غریب ہی بھلے"۔ مجھے نمک حرام نہ کہنا کیونکہ میں تمہارا دیا ہوا سب کچھ یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ دولت، عزت، تہذیب، تمدن، حتیٰ کہ لباس بھی۔ تمہارا نوکر کیشو

کیشو نے خط میز پر رکھا اور اپنے پرانے بکس میں سے وہی گاڑھے کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور دھوتی نکالی (جو اس نے اپنے پیسے سے نوکری کے زمانے میں بنائی تھی) قمیص اور پتلون کو حقارت سے فرش پر پھینک دیا اور کرتا دھوتی پہن کر مسکرایا۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ کر آنکھ کھلنے پر مسکرا کر رہ جائے۔ اور ادھر ادھر کا جائزہ لئے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

چند دن بعد گاؤں کے لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ کیشو منہ اندھیرے اپنے بیل ہانکتا ہوا کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ندی کے کنارے ٹھہر کر ایک بار پرشوق نظروں سے اس بستی کو دیکھا جس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں میں اس کی امیدیں دھڑک رہی تھیں۔

غزل

رضا ٹونکی

بچتی مری نظر دلِ ناشادماں سے کیا
رہتا ہے کوئی رازِ نہاں رازداں سے کیا

عاشق ہوں واسطہ مجھے رسمِ جہاں سے کیا
منزل نظر میں ہے تو غرض کارواں سے کیا

اللہ رکھے حوصلۂ ضبط برقرار
اب تک تو ہے خیال کہ حاصل فغاں سے کیا

رنگینیٔ بہار ہے کیوں آج بیشتر
میں دور اڑ رہا ہوں کہیں آشیاں سے کیا

اُن کی نظر پہ چھوڑ دیا ہے معاملہ
اب مجھکو واسطہ مرے سود و زیاں سے کیا

مقبول گر نہ ہوں تو نہ ہوں سجدہائے شوق
اب سر کو لے کے جاؤں ترے آستاں سے کیا

اک برق اب بھی کوند رہی ہے نگاہ میں
ہرچند نسبت اس نگہ دلستاں سے کیا

اللہ رے حسن و عشق کی خاموش گفتگو
نظریں وہ کہہ رہی ہیں کہ کہئے زباں سے کیا

آلامِ روزگار سے کیوں مل گئی نجات
دنیائے عشق کوئی الگ ہے جہاں سے کیا

وہ اور خوئے جور یہ ممکن نہیں کبھی
کیا جانے مدعا ہے مرے امتحاں سے کیا

تسکین کی ہے میرے دلِ ناشگفتہ کی
غنچہ کو ورنہ کام رضا گلستاں سے کیا

مغنی

[illegible]

شاطر

قطعات

بقائے خیال

اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہیں دونوں
وجودِ غم کو مری ذات سے خوشی تم سے
تمہیں میں دل سے بھلا دوں یہ ہو نہیں سکتا
مرے خیال نے پائی ہے زندگی تم سے

یاد کرو

یوں بزمِ تمنا مری آباد کرو
آنکھوں میں سماؤ کبھی دل شاد کرو
وہ چاندنی رات وہ [illegible]
تم آج بھی گزرے [illegible] یاد کرو

حکیمی

اقوام متحدہ کا ادارۂ غذا و زراعت

سید علی رضا

۱۶ اکتوبر سے یکم نومبر ۱۹۴۵ء تک کینیڈا کے پایۂ تخت کیوبیک میں اقوام متحدہ کے قائم کئے ہوئے ادارۂ غذا و زراعت کے متعلق وہ عظیم کانفرنس منعقد ہوئی جو ارتقار تمدن کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ اس کانفرنس کے ذریعہ کیوبیک کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس کی سرزمین پر انسانی زندگی کی سب سے اہم بنیادی صنعت یعنی زراعت اور اس کے ملحقہ امور کی تنظیم کے لئے ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ کانفرنس شیٹو فرنٹناک نامی اس ہوٹل میں منعقد ہوئی جو جنگ عظیم ثانی کے دوران میں مسٹر چرچل اور مسٹر روزولٹ کی دو مرتبہ کی ملاقاتوں کے باعث پہلے ہی سے تاریخی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ گویا یہی وہ ہوٹل ہے جہاں اتحادیوں کی فتح کی تدابیر مرتب کی گئی تھیں اور اس لحاظ سے یہی ہوٹل اس امر کے لئے بھی سب سے زیادہ موزوں تھا کہ اس کے ضمن میں ایسا ادارہ قائم کرنے کے لئے مشورہ کیا جائے جس کا مقصد غذا کی پیداوار بڑھا کر نیز معلومات سائنس کو انسانی خدمت کے لئے صرف کر کے اور جنگ زدہ ممالک کو یا ایسے ممالک کے باشندوں کو جہاں جنگ کے اثرات بد نے اقتصادی تباہ کاری پھیلا دی ہے تمام ضروری امداد بہم پہنچا کر برکات امن کو عام سے عام تر کرنا ہو۔

کانفرنس کی ابتدائی نشست ۱۶ اکتوبر کو ہوئی۔ اس کی صدارت کینیڈا کے سفیر متعینہ امریکہ یعنی مسٹر ایل بی پیرسن نے انجام دی۔ مندرجۂ ذیل تیس ملکوں کے نمائندوں نے دستور عمل پر دستخط ثبت کئے یعنی۔ آسٹریلیا۔ بلجیم۔ کینیڈا۔ چین۔ زیکوسلوویکیا۔ ڈنمارک، ڈومینیکن جمہوریت۔ مصر۔ فرانس۔ یونان۔ گواٹیمالا۔ ہیٹی۔ ہنڈورا۔ آئس لینڈ۔ ہندوستان۔ عراق۔ لائبیریا۔ لکسمبرگ۔ میکسیکو۔ نذرلینڈز۔ نیوزیلینڈ۔ نکاراگوا۔ ناروے۔ پناما۔ پیرو۔ فلیپائن۔ جنوبی افریقہ۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ وینزویلا۔ اور برطانیہ۔

ان کے علاوہ برازیل۔ کولمبیا۔ کیوبا۔ پولینڈ۔ یوگوسلاویا۔ شام اور لبنان کے نمائندوں نے بھی بعد میں دستور العمل پر دستخط ثبت کر دئے۔ اس طرح صرف ایک اہم ملک یعنی روس دستخط کرنے سے رہ گیا۔ وہ اس لئے کہ گو اس ملک کے نمائندے کانفرنس کی نشستوں میں نیز مختلف کمیٹیوں میں برابر شریک رہے لیکن دستخط کرنے کے لئے روسی حکومت نے مزید غور کرنے کی مہلت ضروری خیال کی۔

کانفرنس کا افتتاحی جلسہ شیٹو فرنٹناک کے بال روم میں ہوا۔ ڈائس یعنی صدر کی نشست گاہ پر اقوام متحدہ کے جھنڈے نصب تھے۔ کینیڈا کے پوسٹماسٹر جنرل مسٹر ارنسٹ برٹرانڈ نے حکومت کینیڈا کی جانب سے تمام مختلف ملکوں کے نمائندوں کا خیر مقدم کیا۔ تمام بال روم روشنی سے جگمگا رہا تھا اور اس پر سے لحظہ بہ لحظہ فوٹوکشوں کے کیمروں کی روشنی جھلکتی رہتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ اجلاس کے خاص خاص موقعوں کے فوٹو لے رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے صدر سر گرجا شنکر باجپائی اور فرانس کے وفد کے صدر نے حکومت کینیڈا کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور خاص کر انٹرم کمیشن کے صدر مسٹر پیرسن کو ان کے حسن خدمات کی داد دی۔

کانفرنس کے سات اجلاسوں میں مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے ملک کے زراعتی اقتصادیات اور غذائی صورت حال پر مقالے پڑھے نیز یہ بتایا کہ انکی نظر میں ان معاملات کو حل کرنے کے لئے ادارۂ غذا و زراعت کو کیا شکل اختیار کرنا چاہئے۔ آٹھویں اجلاس میں جو کہ ۲۲ اکتوبر کو ہوا اسکاٹ لینڈ کے مشہور ماہر غذائیات عالم اور قانون داں سر جان بائڈ اور ادارۂ غذا و زراعت کے پہلے ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) مقرر ہوئے۔ اس تقرر پر سر جان نے اپنی قومیت ترک کر کے تمام دنیا کی شہری کی حیثیت اختیار کر لی۔ سر جان نے اپنی تقریر میں ادارہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی کہ اس ادارہ میں شمولیت کے ذریعہ تمام ملکوں نے نہ صرف اپنے اپنے باشندوں کے لئے حتی الوسع صحت بخش غذا مہیا کرنے کا عزم کیا ہے بلکہ انھوں نے تمام عالم کے لئے ایسی غذائی تنظیم کی بنا ڈالی ہے جو باہمی تعاون کے ذریعہ تمام انسانوں کو بلا امتیاز نسل و رنگ قحط کے خوف اور امکان سے نجات دلائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جنگ کے ٹینک زراعتی مشینوں میں تبدیل ہو جائیں اور جنگی اسلحہ تیار کرنے والے کارخانے کیمیاوی کھاد بنانا شروع کر دیں تاکہ انسانیت پھر امن و افراط ایسی نعمتوں سے فیضیاب ہو سکے۔

زیادہ تر نمائندے ہوائی سفر کے ذریعہ کیوبیک پہنچے تھے بعض تو بہت ہی دور دراز سے آئے تھے مثلاً چین۔ ہندوستان۔ افریقہ

اور یورپ کے نمائندے۔ ان سب لوگوں نے عملاً مشاہدہ کر لیا تھا کہ وہ سفر تو کبھی بیس تیس چالیس پچاس روز میں طے ہوتے تھے صرف تین یا چار روز میں ختم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کانفرنس میں جمع ہونے والے افراد یہ محسوس کرتے تھے کہ دنیا کی مسافتیں گھٹ کر پہلے کے دسویں حصہ کے برابر رہ گئی ہیں اور یہ کہ اب کسی ملک کے لئے باقی دنیا سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں ہے۔ کانفرنس کی کل کارروائی ایک خاص احساس خوشدلی اور یکجہتی کے ساتھ ہوئی اور کانفرنس کے تمام مباحث پر ایک عام جذبہ تعاون کا اثر نمایاں تھا۔ یہ کانفرنس ایک ایسی ہولناک جنگ کے ختم پر منعقد ہوئی جس نے انسانی خون اور اثاثہ کی تباہ کاری سے تمام عالم کی زراعت و صنعت کو یکسر تباہ کر ڈالا ہے۔ اور اسی کے ساتھ دماغوں میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ جنگ ایک ایسے آلہ یعنی ایٹم بم کے استعمال سے اختتام پر لائی جا سکی ہے جس کا استعمال اگر معقول پابندی سے نہ کیا جائے تو وہ تم کل انسانی تہذیب ہی کے لئے باعث فنا ہو سکتا ہے۔ سائنس کی اس نئی تحقیق نے انسانی تہذیب کے سامنے جو عقدہ پیش کر دیا ہے وہ آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اب انسانیت کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تعاون کے ذریعہ تدبیر عمل یا یکسر فنا۔ نیز یہ بھی محسوس کر لیا گیا کہ بیروزگاری افلاس اور بھوک ہی جنگ و جدال کے بنیادی عوامل ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ نیوزی لینڈ کے ممبر مسٹر ولسن نے کہا جب تک دنیا افلاس، وبا اور قحط ایسی آفات سے نجات نہیں پاتی جنگ و جدال کو نہ سیاسی معاہدے روک سکتے ہیں اور نہ فوجی اتحاد بندیاں۔ ایٹم بم یا مقامی تنظیمیں۔ تقریباً تمام نمائندے اس امر پر متفق تھے کہ زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں سنہ ۱۹۲۹ء کی سی تباہ کن کمی کو دوبارہ واقع ہونے سے روکنے کی ہر امکانی کوشش کرنا ضروری ہے تاکہ کسانوں کو ان کی محنتوں کی مناسب معاوضہ اور قیمت ملنے میں دشواری نہ ہو۔ عام رجحان خیال اس جانب تھا کہ کسانوں کو زیادہ غلہ پیدا نہ کرنے یا فاضل غذا کو ضائع کر کے مصنوعی قحط بنانے کے لئے امداد دینے کے بجائے ایسی حکمت زیادہ مناسب ہو گی جس میں پیداوار کی افراط اور روزگار کی فراہمی نمایاں ہو اور جس میں سائنس کی معلومات انسانی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دیں۔

ہندوستان کے نمائندوں نے اپنے ملک کی خاص ضروریات کو پر زور طریقہ پر کانفرنس کے روبرو پیش کیا۔ یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ ادارۂ غذا و زراعت ہمارے لئے مسیحائی کا کام کرے۔ کیونکہ ہمارے چار لاکھ سے زیادہ دیہاتوں پر سے روایتی مفلسی اور کساد بازاری کو دور کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ البتہ ہم دوسرے ملکوں سے علمی مشورہ اور مشینیں ضرور چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا عام افلاس ملک کے تمام وسائل کو جدید آلات کے استعمال کے ذریعہ دور ہو سکتا ہے لیکن اس کام میں ترقی یافتہ ملکوں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے بغیر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔

کانفرنس کا مقصد اولین اتحادی ممالک کے لئے ایک ادارۂ غذا و زراعت کی تشکیل تھا۔ اس مقصد میں کانفرنس کامیاب ہو گئی۔ ادارۂ غذا و زراعت سائنسی معلومات اور بنیادی نظریات کے تجزیہ کے ذریعہ تعاون کی روح پیدا کر کے دور افراط کو دنیا میں از سر نو لانے کے یقیناً قابل ہو گا۔ اس ادارہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ دنیا کی موجودہ پیداوار، کھپت اور خاص خاص جنسوں کی بین الاقوامی تجارت کا مقابلہ دنیا کی بڑھتی ہوئی مانگ سے ان اعداد و شمار کی روشنی میں کیا جائے تاکہ زراعتی پیداوار کی فاضل مقداروں کا علم ہوتا رہے اور اس کے مطابق بین الاقوامی تجارت چلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی انجمن کے مقاصد میں دنیا کی غذائی ضروریات اور ان تمام طریقوں کا مطالعہ بھی ہو گا جن کے ذریعہ غذائی اجناس کی تقسیم کی جائے۔ قیمتوں کی گاہ بگاہ رپورٹوں کا تجزیہ کیا جائے یا قیمتوں میں استقلال قائم کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ کم آمدنی والے ایسے رقبات کے لئے جہاں مستقل غذا کی کمی نمودار ہو فاضل اجناس بہم پہنچانے کے لئے خاص انتظام کیا جائے گا۔

غزل

عزیز شیرازی

پھر تری یاد دل میں پاتا ہوں — پھر فلک سے الجھا جاتا ہوں
پھر پکارا ہے عہد رنگیں ... کو — پھر جوانی کے گیت گاتا ہوں
رُت گھراتی ہے پھر نسیم بہار — پھر ہواؤں کو گدگداتا ہوں
جھوم کر آ گئے ہیں پھر بادل — میکشوں کو بلانے جاتا ہوں
آرزوؤں نے لی ہے انگڑائی — پھر زمانہ کو آزماتا ہوں
درد سا اٹھ رہا ہے پہلو میں — پھر کسی کو بلانے جاتا ہوں
عہد ماضی کو یاد کرتا ہوں — اپنی حالت پہ مسکراتا ہوں
سب پہ تو نے کرم کیا ساقی — ایک میں تشنہ کام جاتا ہوں
تیری تصویر سامنے رکھ کر — قصۂ درد و غم سناتا ہوں
ہچکیاں آ رہی ہیں کیوں پیہم — شاید ان کو میں یاد آتا ہوں
جتنی منزل قریب آتی ہے — اتنا ہی دور ہوتا جاتا ہوں
پھر اٹھا ہاتھ جیب و داماں کو — پھر انہیں آج دل میں پاتا ہوں
اپنی ہستی مٹا رہا ہوں عزیز
ان کی ہستی بنائے جاتا ہوں

تمام دنیا کے لئے ایک غذائی منشور تیار کرنے کے لئے سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک غذائی اعداد شماری کرنا تجویز کیا گیا ہے تاکہ دنیا کی غذا و زراعت کے متعلق ضروری اعداد و شمار مہیا ہو جائیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ادارۂ غذا و زراعت لیگ آف نیشنز (سابق مجلس اقوام) کی طرح کوئی مرکزی ادارہ نہیں ہوگا جو صرف شریک ملکوں سے محض اپنے تبلیغی افسروں کے ذریعہ ارتباط قائم رکھے بلکہ اس ادارہ کے مقامی دفتر ہوں گے جن کے ذریعہ یہ ادارہ تمام مختلف ممالک کے باشندوں اور ان کے معاملات کے متعلق باخبر رہے گا۔ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی اس کا ایک مقامی محکمہ قائم کیا جائے۔ بیشتر ملکوں کو یہ اہم شکایت تھی کہ لیگ آف نیشنز کے کارکن تمام تر یورپین اشخاص تھے۔ اسی لئے ادارۂ غذا و زراعت کے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ اس کے کارکن حقیقی معنوں میں بین الاقوامی ہوں گے اور مختلف جغرافیائی خطوں کی نمائندگی کر سکیں گے۔ تمام عہدوں کے لئے افراد سے اعلان کیا جائے گا اور کارکنوں کا انتخاب ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) مقابلہ کی رو سے کریں گے۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا ہے کہ اس ادارہ کا دفتر یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن (ادارۂ اقوام متحدہ) کے صدر دفتر کے ساتھ ہی ہوگا۔ چونکہ ابھی آخرالذکر کے دفتر ہی کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے اس لئے سردست ادارۂ غذا و زراعت کا دفتر واشنگٹن میں قائم کر دیا گیا ہے۔

سطور بالا سے واضح ہوگا کہ یہ ادارہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر۔ روم۔ کی مانند محض اعداد شماری کا ادارہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برخلاف پرزور تعمیری پروگرام کا حامل ہوگا۔ اس ادارہ کے ماتحت سائنس کی تحقیقات کے نتائج جمع و تالیف کے بعد ایک کتابی سلسلہ کے ذریعہ تمام شریک ملکوں کو بھیجے جایا کریں گے۔ یہ ادارہ افزائش پیداوار اور نسل کشی کے لئے سامان بھی مہیا کرے گا۔ یہ بات ہندوستان کے مویشی پالنے والوں کے لئے خاص طور پر مفید ہوگی۔ سائنس کی تحقیقات میں تنظیم بھی اسی قدر اہم ہے جس قدر کہ خیالات اور اسی لئے ہندوستان کے زراعتی تحقیقات کے اداروں کے لئے اس تنظیم کے فائدے نہایت قابل قدر ہوں گے۔ ہندوستان میں وقت کی اہم ضرورت سائنس کی تحقیقات کو کاشتکاروں تک پہنچانا ہے۔ کیونکہ یہ کام اب تک ابتدائی حالت سے آگے نہیں بڑھا ہے۔

ادارہ غذا و زراعت کتابچے نقشے۔ اشتہارات۔ لاسلکی تصویریں اور فلمیں اکٹھا کرکے یا ان خلاصے اور اقتباسات تیار کرکے شریک ملکوں میں تقسیم کرے گا۔ ہندوستان کے لئے یہ تمام مسالہ بہت مفید ہوگا۔ اس ادارہ نے ابھی سے زراعتی مشینوں اور کیمیاوی کھادوں کی ایسی مساویانہ تقسیم پر جو ہر ملک کے لئے ایک معیار پر مبنی ہو زور دیا ہے۔ اسی طرح یہ تجویز ہے کہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کو تعمیر ترقی کے بین الاقوامی بنک (انٹرنیشنل بنک آف ریکانسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ) کے ذریعہ قرض بہم پہنچا کر امداد دی جائے۔

اس ادارہ کے ماتحت ماہران فن مامور رہیں گے تاکہ عملی مشورہ طلب کرنے والے ملکوں کو ان کی خدمات سپرد کی جا سکیں۔ اس قسم کی امداد ہندوستان کے لئے نہایت کار آمد ہو سکتی ہے۔

(انڈین فارمنگ سے ماخوذ)

برطانیہ میں تیمارداری کا پیشہ ——— بقیہ صفحہ ۴۰

ٹریننگ کے ابتدائی زمانہ میں ہی نرسوں کو چھوت کی بیماریوں کے اندیشوں سے آگاہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کو ڈیوٹی کے دوران میں کیا کیا احتیاطیں برتنا چاہئیں۔ جو جو بیماریاں ان کی ڈیوٹی کے سلسلہ میں ان کو لاحق ہو سکتی ہیں ان کے معالجہ اور تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا جاتا ہے علالت کی صورت میں نرسوں کو چاہئے کہ فوراً اطلاع کر دیں۔ ان کی فوری صحتیابی کا ہر ممکن انتظام کیا جائے گا۔

ہر نرس کا اپنا علیحدہ کمرہ ہوتا ہے جس میں تمام ضروری سامان موجود ہوتا ہے۔ صفائی، روشنی اور گرمی کا بھی خاص انتظام ہوتا ہے۔ میدان کے کھیلوں کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے اور جہاں جہاں ممکن ہوتا ہے ٹینس کورٹ ضرور ہوتا ہے۔ ہسپتال کی فضا سے باہر نرسیں قدرتی طور پر تفریحی کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ نرسوں کا یہ شوق آسودگی پاتا رہے۔

نرس کی ایک خاص قسم بھی ہے جس کو (پبلک ہیلتھ نرس) کہتے ہیں۔ وہ یا تو گھر گھر مریضوں کی دیکھ بھال کرتی پھرتی ہے، بچوں کے شفاخانہ میں سپرنٹنڈنٹ ہوتی ہے، کسی اسکول میں متعین ہوتی ہے یا دق کے کسی ہسپتال میں۔ اس نرس کا فرض ہے کہ وہ اصل بیماری کے پیدا ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو اس سے بچائے اور گھروں اور مدرسوں میں صفائی اور تندرستی کا پرچار کرے۔ ملک میں صحت و تندرستی کو اعلیٰ پیمانہ پر برقرار رکھنے کے لئے یہ کام شفاخانوں میں مریضوں کی تیمارداری کے کام سے زیادہ اہم نہیں تو کم از کم اس کا ہم پلہ ضرور ہے۔ عام طور پر "ہیلتھ نرس" پورے طور پر سند یافتہ ہوتی ہے اور اس کے فرائض میں زچہ خانوں کے اندر حاملہ عورتوں، زچاؤں اور پانچ سال کی عمر تک کے بچوں کی دیکھ بھال شامل ہوتی ہے۔

THE NEW
Rexona
MEDICATED SOAP
Rexona
اب
جھاگ سے لبریز
خوشبو سے معطر

غالب اور قنوطیت

علی حماد عباسی

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مرزا غالب ان "تابوت بردوش" فلسفیوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے بالکل رونے پیٹنے کو اپنا شیوۂ زندگی بنا رکھا ہے بلکہ ان کی شاعری میں شوخی اور رنگینی کا عنصر غالب ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کی صد رنگ موجوں میں قنوطیت یعنی یاس و حرمان کا بھی رنگ پایا جاتا ہے جو کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیازی وصف کہا جا سکتا ہے کیونکہ انگریزی زبان کے شہرۂ آفاق شاعر شیلے کا مقولہ ہے کہ

وہی شاعری بہترین اور پر از تاثیر مانی جا سکتی ہے جس میں غم انگیز کیفیتوں کا تذکرہ ہو کیونکہ غمگین اور دردناک شاعری دل و دماغ دونوں سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے طرحدار اور لطف آمیز شاعری اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو مسرور کر دیتی ہے لیکن ہمارے دلوں پر کوئی دیرپا نقش نہیں چھوڑتی۔

اس سے پہلے کہ غالب کی شاعری اور قنوطیت پر کچھ لکھا جائے یہ ضروری ہے کہ قنوطیت کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ قنوطیت کے فلسفیانہ نظریہ کی تائید میں دو مخصوص دلائل پیش کئے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) لذتی دلیل اور (۲) تاریخی دلیل — لذتی دلیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حیاتِ انسانی میں خوشی سے زیادہ رنج ہے جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

جہان منزلِ درد و جائے غم است

درین دام گر شادمانی کم است

شوپنہار جو کہ زمانہ حاضرہ میں قنوطیت کا سب سے بڑا امام اور شارح مانا گیا ہے لکھتا ہے کہ درد و الم ایجابی ہیں اور لذت مسرت محض سلبی۔ جب ہم کسی چیز کی خواہش کرتے ہیں تو ہمارے اندر ایک طرح کی مسرت یا لذت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جوں ہی خواہش پوری ہو جاتی ہے، لذت موقوف ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خواہش اور احتیاج ایک ہی چیز ہے اور زندگی کے معنی دائمی خواہش کے ہیں اور احتیاج درد و الم کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں۔ لہٰذا زندگی کو دوسرے الفاظ میں ہم دائمی الم کہہ سکتے ہیں — تاریخی دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن میں انسان جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر ناشاد و نامراد ہوتا جاتا ہے۔

شوپنہار کہتا ہے کہ تہذیب کا رنج و الم اور درد و محن میں اضافہ ہوتا ہے اور فرانس کا مشہور مفکر روسو نہایت ہی زوردار طریقہ سے کہتا ہے کہ تہذیب اخلاق کو تباہ کرتی ہے اور انسان کو شریر و کمینہ بناتی ہے۔ اگر ہم انسان کے تاریخی ارتقاء پر غور کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جوں جوں اس کی عمر تجاوز کرتی جاتی ہے اس کو درد و تکلیف کا احساس شدت سے ہوتا جاتا ہے۔

میتھو آرنلڈ کا یہ ادعا کہ "شاعری تنقید حیات ہے" مرزا غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں اس وقت تک شوخی و رنگینی بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جب تک کہ ان کی زندگی عیش و عشرت اور آسائش سے گذری لیکن جوں ہی ان کی زندگی میں غمناک حادثات پیدا ہونا شروع ہوئے۔ ان کی شاعری پر قنوطیت کا رنگ چڑھنے لگا۔ جوانی کی پرکیف گھڑیوں میں مرزا غالب نوبہار ہی تاکتے رہے، چہرۂ خوباں کو دیکھ کر ان کے آرزوؤں کے سمندر میں ایک ہل چل سی مچ جاتی تھی اور ہر گھڑی وہ شراب کے نشہ میں تصورِ جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہتے تھے، لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ بزم کی یہ "رنگ آرائیاں" ایک "طاقِ نسیان" ہو کر رہ جائیں گی اور شباب کی یہ ہنگامہ خیزی جو کہ گل و لالہ میں لپٹی ہوئی ایک فریب مسلسل ہے رفتنی اور گذشتنی ہے۔ اس کے پس منظر میں دائمی کلفتوں کا ایک زبردست غار ہے۔ وہ خوابِ ہستی سے یک بیک چونک کر کہہ اٹھتے ہیں :-

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یا

فنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کرکے غالب کو قنوطیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جب تک زندگی ہے اور پہلو میں دل ہے رنج و الم سے کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ انسان کی فطرت میں غم کا احساس ہمیشہ موجود ہے چاہے مستی اور بے خودی میں تھوڑی دیر کے لئے وہ اس کو فراموش کر دے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :-

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

پھر

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ایک جگہ اور ؎

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ۔ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

اور آخرکار زندگی کی یاس انگیز کیفیتوں سے تنگ آکر کہہ اٹھتے ہیں :-

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یا

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ان کا خیال ہے کہ انسان کو دائمی آرام اس دنیا میں نہیں مل سکتا، اس کی زندگی عیش و عافیت سے عقبیٰ ہی میں کٹ سکتی ہے کیونکہ انسان کو دنیا کی چند روزہ زندگی میں بہت سے مصائب انگیز کرنے پڑتے ہیں اور وہاں نہ غمِ عشق ہے اور نہ غمِ روزگار۔

یوں تو مرزا غالب کی کتابِ حیات کے ہر باب میں دل شکستگیوں اور آلام کا تذکرہ ہے لیکن اس عظیم الشان انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی خونچکاں داستان ہے۔ جس کو ہم لوگ غدر ۵۷ء کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے لال قلعہ کی سطوت کو مٹتے ہوئے دیکھا، اپنے عزیزوں کو پھانسی کے تختہ پر چڑھتے ہوئے دیکھا، اپنی آنکھوں سے اذیت ناک اور تخریبی دور کا نظارہ کیا۔ اس ہنگامہ کی وجہ سے ان کی وہ پنشن بند ہو گئی جو کہ فیروزپور کی جاگیر سے ملتی تھی۔ بادشاہ بھی کس مپرسی کی حالت میں ہونے کی وجہ سے اس وقت ان کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ میر مجروح نے ایک خط کے ذریعہ پنشن کے متعلق پوچھا تو جواب میں لکھتے ہیں :-

"کیسا پنشن اور کیا اس کا ملنا، یہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو ۔ آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

...... اگر زندگی رہی تو پھر مل لیں گے۔"

ایک شعر میں اپنی حالتِ زار کے متعلق فرماتے ہیں :-

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر ۔ ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

پھر مرزا غالب اس سے اکتا گئے تو مجبوراً گھر کا دروازہ بند کرکے گوشہ نشین ہو گئے اور قیدی کی طرح زندگی گذارنے لگے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میری یہ آرزو ہے کہ دنیا میں نہ رہوں، اگر رہوں تو ہندوستان نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے...... نہ جانے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی قید سے جو اس گذری قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی اقرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔

وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی پر خون کے آنسو رویا کرتے تھے۔

ایک قطعہ میں جو کہ سوز و درد سے بھرا ہوا ہے فرماتے ہیں :-

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۔ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۔ میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۔ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں ۔ نے وہ سرور و شور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان کی زندگی کو جس چیز نے شروع ہی سے مضطرب و بے اطمینان بنا دیا تھا وہ ان کے یارانِ وطن کی بے مہری تھی۔ ذوق کے آگے ان کے کلام کو کوئی بھی ترجیح نہ دیتا تھا کیونکہ وہ شاہِ وقت کے استاد تھے اور مرزا غالب محض ایک پیشہ ور شاعر۔ وہ اپنی ادبی کوششوں کو بے قدر ثابت ہوتا دیکھ کر اپنے اربابِ وطن کی شکایت کرنے لگتے ہیں :-

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب ۔ تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

لیکن جب ان کی رسائی دربارِ شاہی میں ہو گئی اور بادشاہ نے ان کے کمالاتِ فن سے خوش ہو کر ان کو نجم الدولہ، دبیر الملک، اور نظام جنگ کے خطابات سے سرفراز کیا تو ہر طرف سے خوشامدی لوگ ان کے گرد جمع ہونے کیلئے آنے لگے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ انسان کی حالت اقبالمندی کے زمانہ میں ایک درخت کی سی ہے جس کے گرد لوگ اس وقت تک جمع رہتے ہیں جبتک کہ اس پر پھل رہتا ہے۔ جوں ہی پھل ختم ہوتا ہے لوگ اپنا اپنا راستہ لیتے ہیں اور اس درخت کو لُو اور سردی برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان مطلب پرست انسانوں سے دور چلے جانا چاہتے۔ فرماتے ہیں :-

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہئے ۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار ۔ اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

انسان کی فطرت میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے کہ جب اس پر غم کا بوجھ ہوتا ہے وہ خدا سے شکایت کرتا ہے اور اپنے آپ کو کوستا بھی ہے، لیکن شاعر شکایت کے ساتھ ساتھ طنز کا تیر بھی پھینکتا جاتا ہے جس کی وجہ سے شاعر کے قنوطی آرٹ میں ایک رفعت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ایک جگہ اور نہایت ہی زبردست تیر پھینکتے ہیں :-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اور اس شعر میں تو طنز کی حد ہو گئی ہے :-

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

موت کا جنم

فجی جزیرے کی ایک لوک کہانی

۲

محمود ہاشمی

(۳) بُرائی کا پہلا قدم

نیند۔ گہری نیند مایوئی سو کر اٹھا تو اسے پتہ چلا کہ نہ وہاں اس کی کشتی ہے نہ ایٹالا انگا اور نہ اس کے بچے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں ہیکولیو بھی نہ تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ مایوئی نے بغیر سوچے سمجھے سارا الزام ہیکولیو کے سر تھوپ دیا۔ "یہ سب اسی کی شرارت ہے میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب اسی کی شرارت ہے۔" انتہائی غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ چلایا۔ اور پھر اسی طرح دانت پیستے اور سر کو کھجاتے ہوئے اس نے سوچا "مگر کیا ایٹالا انگا بھی اس کے ساتھ ہی مل گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مایوئی کی پریشانی کو شجر کلام نے اور بھی بڑھا دیا۔

دفعتاً "شجر کلام" کی شاخوں میں جنبش سی ہوئی اور اس کے پتے سسکیاں لینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ان پتوں کے درمیان سے بارش کے قطروں سے ملتی جلتی پانی کی کچھ بوندیں بھی ٹپک ٹپک کر نیچے آب حیات کے چشمہ میں گرنے لگیں۔ جیسے وہ پتے آنسو بہا رہے ہوں۔

اس کے بعد "شجر کلام" کی شاخوں سے آواز آئی "وہ آ چکی ہے۔ وہ برائی جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ آ چکی ہے۔ آہ اے مایوئی! تم نے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا۔ کیوں گئے تھے۔ آخر کیوں گئے تھے؟"

اور مایوئی نے کانپتے ہوئے، بے بسی کے سے انداز میں کہا "اے شجر کلام" اے آنے والی باتیں بتانے والے وجود۔ میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ مگر اب جبکہ سب کچھ ہو چکا ہے مجھے یہ تو بتا کہ وہ برائی کیا ہے اور وہ ہم میں کیسے داخل ہوئی؟"

شجر کلام نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا: "اے مایوئی، وقت سب کچھ بتا دے گا۔ البتہ ایک بات تجھے ضرور ابھی سے جان لینی چاہئے اور وہ یہ کہ ہیکولیو بے قصور ہے۔ اسے تو اور ہی غم کھائے جا رہے ہیں اور وہ اس وقت اسی بستی میں ایک چٹان کے نیچے بیٹھا اپنی ہار پر جو تو نے اسے دی آنسو بہا رہا ہے۔ البتہ برائی کو جنم دینے والا تیرا اپنا بیٹا ہے۔ تیرا پیارا ایٹالا انگا۔ اسی نے سب کو بہکایا۔ وہی سب کو لے گیا۔ اور اب اسی کی نافرمانی اور گستاخی کی وجہ سے برائی کو جرأت ہوئی کہ وہ آ جائے اور تمہیں مٹا دے۔"

"مگر کیا ہم اب مٹ جائیں گے شجر کلام۔ کیا۔ اری لافانی زندگی ہم سے چھن جائے گی؟" مایوئی چلایا۔ اور اس کا چلانا ایسا تھا جیسے کوئی شیر شکاری کے کسی خونیں تیر کی چبھن سے بے چین ہو رہا ہو۔

"ہاں۔ اب وہ پہلی سی بات نہ رہے گی۔ اب برائی ہوگی۔ اور تمہارے بیٹے، تمہارے پوتے اور آنے والی ساری نسلیں۔ اب بھوک ہوگی اور پیاس، دکھ ہوگا اور اداسی، بیماری ہوگی اور موت۔"

"موت!" اور مایوئی ایک مرتبہ پھر چلایا "تو کیا آب حیات کا چشمہ ہمیشہ کے لئے ہم سے دور ہو جائے گا۔ مگر اے شجر کلام۔ کیا اس برائی کو کسی صورت نہیں روکا جا سکتا؟"

مگر "شجر کلام" اب خاموش ہو گیا تھا۔ البتہ اس کے پتوں کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں اور ان کا رنگ بدلنے لگا۔ پہلے وہ نیلے تھے اب آہستہ آہستہ زرد پڑنے لگے۔ اور پھر جب وہ پوری طرح زرد ہو گئے تو ان میں سے ایک پتہ جیسے بے جان سا ہو کر نیچے آب حیات کے چشمہ میں گر گیا۔ اس کے بعد ایک اور پتہ گرا اور پھر ایک اور۔ اور یوں آہستہ آہستہ ایک پوری کی پوری شاخ خالی ہو گئی۔ اب اس شاخ میں سے ایک چیخ کی سی آواز آئی اور اس کے بعد وہ بھی نیچے پانی میں گر گئی۔

مایوئی اور چند دوسرے دیوتا جو بلوٹا میں رہ گئے تھے یہ دیکھ کر خوف سے لرز اٹھے۔ کیونکہ اس سے پہلے انھوں نے یہ باتیں نہ کبھی سنی تھیں نہ دیکھی تھیں۔

اب ان کے دیکھتے دیکھتے ایک اور انوکھی بات ہوئی۔ وہ شاخ جو پانی میں گری تھی اس کے اب تین ٹکڑے ہو گئے۔ جن میں سے دو بڑے تھے اور ایک چھوٹا۔ پھر یوں ہی تیرتے تیرتے وہ تینوں ٹکڑے تین کشتیاں بن گئیں۔ جن میں سے دو بڑی تھیں اور ایک چھوٹی۔ اس کے بعد یہ کشتیاں اسی پانی کی گہرائیوں میں کہیں غائب ہو گئیں اور ان کے غائب ہوتے ہی چشمہ کا پانی دھواں بن کر آہستہ آہستہ اڑنے لگا۔

"میں نے برا کیا۔۔۔ بہت برا کیا" مایوئی نے ایک لمبی آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھی بھی سر جھکائے اس کے ساتھ ہی ایک طرف کو چلنے لگے۔ سب اداس تھے اور غمگین۔ مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ برائی آ چکی تھی اور اس سے نجات محال تھی۔

(۴) انجام ۔۔۔ اٹل موت

اس برائی نے جلد ہی اپنا روپ

ان نے جزیروں میں دکھایا۔ جہاں نافرنی کرنے والا اٹیالا لگا اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت رہ رہا تھا۔

نووارد دیوتا اس نئی بستی میں بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس بڑی کشتی کو جس میں کر وہ آئے تھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور اس سے آٹھ چھوٹی کشتیاں بنائی تھیں جنہیں وہ ہر وقت سمندر کے پانیوں پر بھگائے بھگائے پھرتے تھے۔ ان کشتیوں میں ہی بیٹھ کے وہ مچھلی کا شکار کیا کرتے اور پھر جب اچھے خاصے شکار سے ان میں سے ہر ایک کی کشتی بھر پور ہو جاتی تو وہ خشکی پر اترتے جہاں ان کے بیوی بچے مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتے اور ان کا دل خوشی سے ناچ اٹھتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں خشکی پر بھی اکثر گھوما کرتے اور اس وقت ان کے قہقہوں سے وادی میں بار بار ایک گونج سی پیدا ہوتی۔ اسی دوران میں ان کی بیویاں گھروں میں چولھے روشن کر کے اپنے شوہروں کے لئے مچھلی بھونتی رہتیں یا دور ساحل پر اپنے بچوں کو سیپ چنتے دیکھتیں اور ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ سے ان کا چہرہ دمکتا رہتا۔

یہ نئی زندگی یونہی ہنسی خوشی بسر ہو رہی تھی کہ ایک دن جب کہ نوعمر دیوتا فی فی تا مچھلیوں سے اپنی کشتی بھر کر ساحل پر اترا تو یہ دیکھ کر کہ ہمیشہ کی طرح اس کی بیوی موآ اور ان کی ننھی اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے وہاں نہیں ہیں وہ اداس ہو گیا۔ پھر جب وہ گھر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر اور بھی رنج ہوا کہ اس کی بیوی مچھلیاں پکڑنے والے ایک جال پر آسمان کی طرف آنکھیں کئے دراز ہے اور ساتھ ہی ننھی اس کے پہلو کے ساتھ چمٹ رہی ہے۔

"آہ کاہل۔ بلوٹو دور ہو گیا۔ مگر وہاں کی سستی سکھانے والی عادتیں نہ گئیں۔ موآ آخر نیند کی یہ مٹھاس کب تک تمہیں دھوکا دیتی رہے گی؟"

فی فی تا کی آواز سن کر اس کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر وہ اٹھی پھر بھی نہیں۔ اصل میں ہلنا اب اس کے بس کی بات ہی نہ تھی اس کی آنکھیں دھنستی جا رہی تھیں اور ان کا نیلا رنگ دھندلا ہو رہا تھا جیسے وہ آنکھیں بھی آب حیات کا ایک چشمہ ہوں جن کا نیلا پانی دھواں بن کر اڑ جانے پر تلا ہوا ہو۔

فی فی تا اب کچھ حیران سا ہو گیا "پیاری موآ۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی چمک کہاں گئی اور یہ تمہارے ہونٹ کیوں سوکھتے جا رہے ہیں؟"

مگر موآ خاموش تھی۔

البتہ تھوڑی دیر بعد اس نے کراہتے ہوئے کہا: "فی فی تا مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اندر ہی اندر کوئی شے مجھے ڈس رہی ہے۔" اور پھر اس نے رک رک کے کہنا شروع کیا: "فی فی تا ——— میرے پیارے آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو۔ مجھے کوئی شے اوپر کو اٹھا رہی ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں جیسے کوئی مجھے بہت دور لئے جا رہا ہے۔ دور ——— بہت دور ——— ہم نے بلوٹو چھوڑا اور اس نئی بستی میں آئے۔ مگر اب یہ بستی بھی چھوٹ رہی ہے ——— کیا میرے ساتھ نہ چلو گے پیارے فی فی تا ——— کیا مجھے اجنبی دیس اکیلے ہی جانا ہو گا ———"

"پگلی ——— اب تک خواب دیکھ رہی ہے" اور فی فی تا نے بیوی کے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "اٹھو موآ اب جاگو۔ آخر کب تک سوتی رہو گی؟"

اور اس کی بیوی نے اپنے خاوند کے بھولپن پر مسکرانا چاہا۔ مگر وہ مسکرا بھی نہ سکتی تھی۔ بے جان سی آواز میں اب اس نے کہا: "یہ خواب نہیں فی فی۔ یہ خواب نہیں بھیانک حقیقت ہے۔ روز کی طرح تمہیں لینے آج جب میں ساحل پر ننھی سمیت گئی تو میں اس حقیقت سے پہلی بار سامنا ہوا۔ میں ان نیلے پانیوں پر جہاں سے کہ تمہیں آنا تھا نگاہیں جمائے بیٹھی تھی کہ ننھی سیپ چنتے چنتے بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔ جیسے وہ سہم گئی ہو۔ اور پھر سمندر کے اس طرف جہاں بلوٹو آباد ہے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی: "امی وہاں سے ایک کشتی آئی ہے۔ مجھے لے جانے کیلئے۔" اور جب میں نے اس کے بھولپن پر ہنسنا چاہا اور پیار کرنے کے لئے اسے اپنی گود میں بٹھانے لگی تو مجھے محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ برف کا کوئی ٹکڑا ہو۔ میں نے چومتے وقت اس کے ماتھے پر بھی برف کی سی ٹھنڈک محسوس کی اور میں ابھی کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر لٹک گیا اور میری چھاتی سے آ لگا۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ میں نے بے چین ہو کر نیلے پانیوں کی طرف دیکھا کہ شاید تم آ جاؤ۔ مگر تم کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ چنانچہ میں ننھی کو اٹھا کے گھر آ گئی۔"

اتنی باتیں کرنے کے بعد جیسے وہ تھک سی گئی تھی۔ اس لئے ایک لمحہ وہ گویا سانس لینے کے لئے رکی۔ پھر کہنے لگی: "اور فی فی پیارے۔ اب میری حالت بھی غیر ہو رہی ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ہمارا وہ سفر جو بلوٹو سے شروع ہوا تھا ابھی ختم نہیں ہوا جیسے یہاں سے بھی کوئی کشتی مجھے کسی اور منزل پر لے جانے کے لئے آ رہی ہے۔"

اور اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ مگر پھر اس نے ایک سنبھالا سا لیا اور اپنی نیم جان آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کی طرف بار بار دیکھا۔ دیکھتے ہوئے بولی: "لو۔ فی فی پیارے۔ وہ کشتی آ پہونچی۔ اس کے ساتھ ہی ننھی والی کشتی

بھی ہے۔ اور دیکھو۔ ان کے ساتھ ایک تیسری کشتی بھی ہے۔ نہ جانے یہ کس کے لئے ہے؟ بہرکیف۔ میں چلی۔ پیارے۔ میں چلی۔ اچھا رخصت "

اور اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کے بازو ڈھیلے ہو کر گر پڑے۔

اور اس کا جسم ساکت ہوگیا۔

نی نی تا خوف سے لرزتا ہوا چیخا۔ " موآ۔ اٹھو۔ موآ۔ اٹھو۔ پیاری میں تمہیں جگا رہا ہوں۔ آنکھیں کھولو۔ میری طرف دیکھو "

مگر موآ بے حس وحرکت پڑی تھی۔

پر وہ بدستور چیختا رہا چیختا رہا۔

اس کی چیخیں سن کر اس کے سارے ساتھی دیوتا جمع ہوگئے " کیا ہوا نی نی تا۔ کیا ہوا "

اور نی نی تا نے ان کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔

" دوستو مدد کرو۔ میری بیوی اور بچی کو کچھ ہوگیا ہے "

اور یہ کہتے ہوئے اس نے پاگلوں کی طرح اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا مگر ہونی ٹل نہ سکتی تھی اور جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

پھر ذرا دیر بعد ہی جیسے ایک جھٹکا سا کھا کر نی نی تا کی گردن بھی تن گئی اور اس کی آنکھیں ڈراؤنی بن گئیں۔ اب بدلے ہوئے لہجے اور مدہم آواز میں وہ کہنے لگا: " دوستو۔ دیکھو وہ دیکھو۔ وہ کشتیاں آ گئی ہیں "

" کہاں ہیں وہ کشتیاں ؟ ہمیں تو کچھ نظر نہیں آ رہا " سارے دیوتاؤں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیران سا ہو کر پوچھا۔

نی نی تا نے اس جانب اشارہ کیا جہاں بلوٹو کی بستی تھی اور کہا: " وہ دیکھو تین کشتیاں ہیں۔ دو بڑی اور ایک چھوٹی۔ چھوٹی کشتی میں میری ننھی بیٹھی ہے۔ اور بڑی کشتیوں میں سے ایک میں میری چہیتی بیوی ہے اور دوسری اب تک خالی ہے۔ وہ میرے لئے ہے۔ اور مجھے اب جانا ہے۔ "

" کیا کہہ رہے ہو نی نی تا۔ تمہاری بیوی اور بچی تو یہ ہمارے سامنے پڑی ہیں " دیوتاؤں نے کہا۔ مگر خوف سے ان کی اپنی آواز بھی اب ہچکولے کھانے لگی تھی۔

نی نی تا نے اب کچھ نہ کہا۔ البتہ ہنس ضرور دیا۔

اور دیوتاؤں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ اس طرح کی وحشیانہ ہنسی اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہ سنی تھی۔

اس کے فوراً بعد ہی دیوتاؤں نے نی نی تا کی نگاہوں میں ایک انوکھی سی چمک دیکھی۔ ایک باوقار اور سنجیدہ چمک۔ مگر یہ چمک محض پل کا تماشا تھی۔ جلد ہی اس کی آنکھوں کے پپوٹے بند ہونے لگے۔ اس نے ایک گہری اور لمبی سانس لی، پھر بے دم سا ہو کر وہ لڑکھڑایا، اپنی بیوی کے پہلو میں جا گرا اور ڈھیر ہوگیا۔ دیوتاؤں نے اس کی آخری چیخ سنی۔ اور پھر قصہ ختم۔

اس کے بعد وہاں کی روشنی مٹنے لگی اور تاریکیاں لحظہ بہ لحظہ گہری ہونے لگیں۔ ان تاریکیوں کو چیرتی ہوئی اب کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت دور کہیں کوئی طوفان بپا ہو، درختوں کے پتے کھڑکھڑاتے ہوئے گر رہے ہوں اور ماتمی انداز میں کوئی رو رو کے سسکیاں لے رہا ہو۔

اور اسی وقت جبکہ حیرانی اور خوف سے ان دیوتاؤں کے منہ کھلے تھے اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، ان کے کانوں نے ایک ایسی آواز سنی جو آشنا معلوم ہوتی تھی۔ وہ چونک پڑے۔ یہ آواز " شجر کلام " کی تھی۔ فضاؤں پہ تیرتے ہوئے دور دراز سے آنے والی یہ آواز کہہ رہی تھی: " ان کے لئے بیماری ہے اور موت۔ اور تڑپنا۔ وہ جنہوں نے بڑوں کی نافرمانی کی اور اپنے بزرگوں کو دھوکہ دیا۔ ان کے لئے آب حیات کے چشمہ کا پانی ختم ہوگیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے دھتکار دئے گئے — بیماری اور پھر موت — مگر اب مُردوں کو زمین میں دبا دو — تم سب کا یہی انجام ہوگا تم سب تڑپوگے بیمار پڑوگے، اور مر جاؤ گے "۔

شجر کلام خاموش ہوگیا۔ اب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ موت کا کیا دھرا ہے۔ موت کا پہلا قدم اٹھ چکا ہے اور بدنصیبی کی پہلی قسط ادا کی جا چکی ہے۔ نی نی تا، اس کی بیوی اور ان کی ننھی۔ یہ تینوں موت کا پہلا شکار رہے اور موت کی کشتیاں انہیں دوسرے ساتھیوں سے کہیں دور لے جا چکی تھیں۔ اب نہ آنسو انہیں واپس لا سکتے تھے نہ آہیں اور نہ ہی کسی کی محبت یہ برائی

دنیا — شور (علیگ)

خون اتنا بہائے گی دنیا — خون میں ڈوب جائے گی دنیا
گدڑیوں میں سلگ رہی ہے جو آگ — مسندوں میں لگائیگی دنیا
غسل صحت کے واسطے اک بار — پھر لہو میں نہائے گی دنیا
جن کی لو سے چمن دھواں دینگے — پھول ایسے کھلائے گی دنیا
ساز تہذیب نو کے تار دبیر — خونچکاں گیت گائے گی دنیا
جن کو ترسی ہیں کشتیاں صدیوں — اب وہ طوفاں اٹھائیگی دنیا
اک طرف رو رہی ہو فطرت — اک طرف مسکرائے گی دنیا
تاج قیصر عصائے سلطانی — ٹھوکروں میں اڑائیگی دنیا
روتے روتے ہنسا چکی ہمدم — ہنستے ہنستے رلائے گی دنیا
خاک تہذیب نو کے تودوں سے — آدم نو بنائے گی دنیا

دیکھ وہ نبض سرد رہی چھوٹی
وہ کرن انقلاب کی پھوٹی

اپنا قدم جما چکی تھی۔

"شجر کلام" کے کہنے کے مطابق انھوں نے ایک گہری اور چوڑی قبر کھودی اور اس میں نی نی تا اور اس کی بیوی کو لٹا دیا گیا۔ نھی کو انھوں نے ماں کی چھاتی کے ساتھ چمٹا دیا۔ اور پھر قبر پر ریت بچھا دی۔

اس کے بعد انتہائی دکھ کے عالم میں ان نو آباد دیوتاؤں نے اپنی پنچایت بلائی اور فیصلہ کیا کہ وہ ایک بڑی سی کشتی بنائیں اور ان میں سے چند دیوتا اس کشتی میں سوار ہو کر واپس بلوٹو جائیں اور مایوئی سے اپنے قصور کی معافی مانگیں۔ اور ساتھ ہی اس سے یہ التجا بھی کریں کہ انھیں بلوٹو میں واپس جا کے آباد ہونے کی اجازت دیدی جائے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح ہی وہ بیماری اور موت کی لعنت سے بچ سکیں گے۔

چنانچہ انھوں نے ایک بڑی سی کشتی بنائی لیکن وہ بلوٹو پھر بھی نہ پہونچ سکے۔ مدتوں وہ پانیوں میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرے پر بلوٹو انکی نگاہوں سے اوجھل ہی رہا۔ حتیٰ کہ انھوں نے ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑا۔

اس پہلے قافلے کے بعد بھی کئی قافلے بلوٹو کی تلاش میں نکلے لیکن وہ دھند کے کسی ایسے غبار میں چھپ چکا تھا جہاں تک ان کی رسائی ممکن نہ تھی اور اس دن سے لے کر آج تک وہ بدنصیبی کے اس چکر سے نہیں نکل سکے۔ بیماری اور موت مایوئی کے نافرمان بیٹوں، بھتیجوں، اور پوتوں کا ازلی حق بن چکا ہے۔ وہ نئی بستی میں ہنسی خوشی رہتے ہیں لیکن ایک دن یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ بلوٹو جو شاید اب موت کا جزیرہ بن چکا ہے سے آنے والی کوئی کشتی انہیں اپنے دوسرے ساتھیوں سے چھین کر لے جاتی ہے اور دوسرے اس کشتی کو دیکھ تک نہیں سکتے۔ زندگی کے پھول کے ساتھ موت کا کانٹا ہمیشہ کے لئے پیوست کر دیا گیا ہے اور اس کی چبھن لاعلاج ہے ؎

نقد و نظر

ف۔ح

فنراک
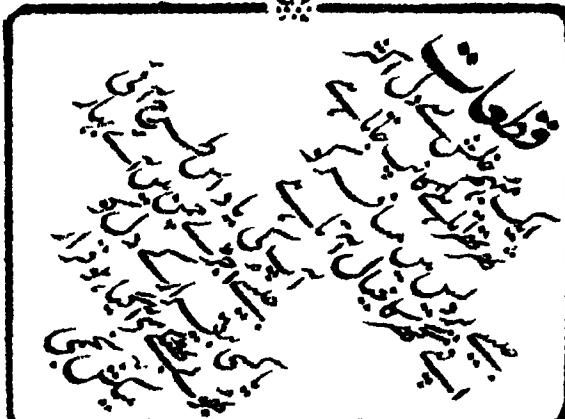
معنفہ:۔ محترمہ جہاں بانو نقوی ایم۔ اے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ شہاب، بیرون دبیر پورہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

یہ ستائیس دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں علمی اور ادبی رنگ بہت نمایاں ہے۔ لطف و مزاح کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ طنز کی تلخیاں بھی موجود ہیں۔ دو تین سیاحتی مضامین دلچسپ ہونے کے علاوہ معلومات افزا ہیں۔ اشعار کے برمحل استعمال نے عبارت میں شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ محترمہ کا طرز بیان خاص ہے جس میں دلکشی کے ساتھ گہرائی بھی ہے۔ پہلے ان کے مضامین شمالی ہند کے رسائل میں بھی چھپتے تھے مگر اب انھوں نے اپنی ادبی خدمات کو حیدرآباد دکن کیلئے وقف کر دیا ہے۔

عرفان حافظ

مترجم:۔ جناب شیاما چرن داس۔ ملنے کا پتہ:۔ ۱۶۴۹ دساں اسٹریٹ۔ دہلی۔ قیمت ایک روپیہ۔

حافظ شیراز پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور ان کی غزلوں کے ترجمے بھی کئی حضرات کر چکے ہیں لیکن شیاما جی نے اخلاق و تصوف کے تیئیس مختلف عنوانات کے تحت اس لسان الغیب کے اشعار کا سلیس ترجمہ پیش کیا ہے جو بہت اچھا ہے۔ ہر عنوان کے اشعار شروع کرنے سے پہلے مختصر طور پر بتایا گیا ہے کہ اس خاص ضمن میں حافظ کا نقطۂ نظر اور زاویۂ فکر کیا ہے۔ روحانیت اور عرفان کے دلدادگان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ حسب ضرورت اشعار کا مطالعہ کر کے فیض روحانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے مختصر سا پیش نامہ لکھا ہے۔

طبیب مرغی خانہ باتصویر

مصنف:۔ خواجہ عبدالسلام فرنگی۔ ملنے کا پتہ:۔ دارالبلاغ ہیورو روڈ لاہور۔ قیمت تین روپے۔

اس سے قبل خواجہ صاحب کی دو کتابوں یعنی "کامیاب مرغی خانہ" اور "تجارتی مرغی خانہ" پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ یہ اسی سلسلے کی تیسری کڑی اور ایک لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ مرغیاں پالنے کا شوق پیدا ہو جانے کے بعد یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کو مختلف بیماریوں سے کیونکر محفوظ رکھا جائے۔ اس کتاب میں حفظان صحت کے اصول سمجھانے کے بعد بیماریوں کی روک تھام، ان کی صحیح تشخیص اور طریقۂ علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹری طریقوں سے لے کر معمولی ٹوٹکوں تک سبھی کچھ شامل ہے۔ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مرغیوں کو نہ صرف تندرست رکھا جا سکتا ہے بلکہ زیادہ تعداد میں انڈے اور تندرست چوزے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

دنیا ہماری

مصنف:۔ جناب پردیسی۔ ملنے کا پتہ:۔ راج محل پبلشرز۔ جموں (کشمیر) قیمت ڈھائی روپے۔

افسانہ نگاری کی موجودہ روش اختیار کرتے ہوئے یہ پندرہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ ان میں زندگی اور زندگی کے تاریک پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر نفسیاتی اعتبار سے ہر پہلو کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ بیشتر افسانوں کا ماحول کشمیر اور وہاں کے غریب باشندوں کی قابل رحم زندگی ہے۔ جنسی مسائل بھی زیر بحث ہوئے ہیں مگر عریانی سے دامن بچاتے ہوئے زبان سادہ اور سلیس ہے۔

خوش انجام

مترجم:۔ جناب سعید اسحٰق صاحب عاشق ایم اے۔ ملنے کا پتہ: دانش محل، کوچہ ناہر خان۔ دہلی۔ قیمت سوا روپیہ۔

یہ ولیم شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے (Twelfth Night) کا ترجمہ ہے۔ شیکسپیئر کے بہت سے ڈرامے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور اس ڈرامے کا بھی ترجمہ چھپ گیا ہے۔ تاہم سلاست و روانی اور صحیح ترجمانی مفہوم کے اعتبار سے اس کو نسبتاً زیادہ لائق وقعت سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ عاشق صاحب نے اصل مکالمے کا ترجمہ کرنے کی بجائے عبارت کو محض اپنے الفاظ میں تبدیل کر دیا ہے لیکن ان کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کیونکہ شیکسپیئر کی زبان بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔ بہت سے اچھے پڑھے لکھے لوگ تو اسے سمجھنے ہی سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں قلم اٹھانا ہی قابل داد ہے۔ یہ ڈرامہ بہت سی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہتا ہے، اس لئے مترجم نے ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ درسی خدمت بھی انجام دی ہے

پیاسی آنکھیں

مصنف:۔ جناب دت بھارتی۔ ملنے کا پتہ:۔ ادبیات جدید۔ قرول باغ۔ دہلی۔ قیمت دو روپے۔

یہ بھارتی صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں روزمرہ کی زندگی کے عام واقعاتی پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں افسانویت پیدا ہونے نہیں پائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے افسانوں کے چند مجموعے پڑھ کر قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔ ذاتی مشاہدے کی ان میں سخت کمی ہے۔ زبان و بیان میں بھی ہنوز کچاپن موجود ہے۔ بعض الفاظ کے ہجے تک غلط ہیں اور ان غلطیوں کا ذمہ دار کاتب کو نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ کتاب کے دیباچے میں موصوف نے ان تمام مدیران رسائل کو کوسا ہے جنہوں نے ان کے رشحاتِ قلم چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ان میں عقلار تنزلی کا مادہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ خرابی شاید ان کو آگے بھی بڑھنے نہ دے۔ چھوٹے سائز کے ۱۶۸ صفحات کی قیمت دو روپے زیادہ ہے۔

کنٹراکٹ برج

مصنف:۔ جناب محمد ابراہیم۔ ملنے کا پتہ:۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

سید احتشام حسین :-

بقیہ صفحہ ۳۷

اگر کسی ادب و ادیب میں یہ خصوصیات نہیں ہیں تو وہ بے جان اور بے تیج نظر آئیگا۔

احتشام صاحب کے تنقیدی خیالات و نظریات کا مفصل تجزیہ یہاں اس چھوٹے سے مقالے میں ممکن نہیں پھر بھی مذکورہ بالا خیالات اس حقیقت کو ضرور ظاہر کر دیتے ہیں کہ انھوں نے اردو تنقید میں اپنے انہماک کے باعث کتنی بلندی پیدا کر دی ہے اور نہ صرف ادب کے لئے نئے راستے نئی منزلیں اور نئے لائحہ عمل تیار کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ زندگی کو بھی ان سب سے روشناس کیا ہے۔ کیونکہ زندگی اور ادب بہرحال ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں ؂

نقد و نظر

بقیہ صفحہ ۵۵

دفتر ماہنامہ شہاب۔ بیرون دبیر پورہ۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت تین روپے۔

یہ تاش کے مشہور کھیل "کنٹراکٹ برج" پر زبان اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کھیل مغربی دنیا سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق میں اور خصوصاً ہندوستان میں بھی خوب کھیلا جانے لگا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ کتاب نئے کھلاڑیوں کیلئے بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔ عام قاعدوں اور اصولوں کے علاوہ ایسے داؤں پیچ سکھائے گئے ہیں کہ اچھے پتے نہ ہوتے ہوئے بھی محض چالاکی اور ہوشیاری سے بازی جیتی جا سکتی ہے۔ پورے باون پتوں کی تقسیم کے نقشوں سے کھیل سمجھانے میں مدد لی گئی ہے۔

آج کا جرمنی

شنکر دیال

گذشتہ تیس سالوں میں جرمنی نے دو عالمگیر لڑائیاں شروع کیں۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ دنیا جرمنی کی طرف سے غافل رہی اگر دنیا کو کسی آئندہ آفت سے بچانا ہے تو ہر ملک کو جرمنی کے معاملات میں دلچسپی لینا چاہئے۔

اس وقت جرمنی کی باگ ڈور چار بڑے اتحادیوں برطانیہ، ریاستہائے متحدہ، روس اور فرانس کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک جرمنی کے ایک حصہ پر قابض ہے اور ان چاروں علاقوں کی سیاسیات کو ہم آہنگ کرنے کے لئے اتحادی کنٹرول کمیشن موجود ہے۔ یہ اتحادی جرمنی پر کیوں قابض ہیں؟ اس کا جواب یالٹا اور پوٹسڈم کے اعلانات میں مل سکتا ہے۔ دنیا بار بار کی لڑائیوں سے بیزار ہو گئی ہے اور اتحادی چاہتے ہیں کہ جرمنی میں پھر کوئی صورت حالات رونما نہ ہو جس سے دنیا کا امن خطرہ میں پڑ جائے۔ وہ جرمنی میں اس مصمم ارادے کے ساتھ داخل ہوئے ہیں کہ عسکریت اور نازیت کا صفایا کر کے جرمنی کی زندگی کو نئے سرے سے امن پسند اور جمہوری بنیادوں پر قائم کریں۔ لیکن ابتدا میں چند فوری مسائل کا حل کرنا ضروری تھا۔ مثلاً سیاسی اور جنگی قیدیوں کو آزاد کرنا اور لاکھوں آدمیوں کا جو بے خانماں ہو گئے تھے انتظام کرنا۔ خوراک، ایندھن اور رہائشی مکانات کی انتہائی قلت اور وسائل آمدورفت کے درہم برہم ہو جانے سے ملک کا حکومتی اور معاشی نظام سخت خطرے میں تھا۔ اتحادیوں نے سال بھر انتہائی کاوش کی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کس درجہ کامیاب ہوئے اور اب جرمنی کی کیا حالت ہے۔

آبادی

لڑائی کے نتیجہ میں جرمنی کی وسعت اور آبادی میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ دریائے اوڈر کے مشرق کی جانب جو علاقہ جرمنی کے پاس تھا وہ سب کا سب پولینڈ نے لے لیا۔ پچھتر لاکھ جرمن ضائع ہو گئے۔ ان میں سے کچھ تو مارے گئے، کچھ بیکار ہو گئے اور کچھ کا علم پتہ نہیں۔ ہمبرگ اور دوسرے جرمن شہروں میں بیس سے تیس سال عمر کے تندرست نوجوان بہت کم دکھائی پڑتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی صفایا ہو گیا ہے جو جرمن صنعت کو چلاتے تھے۔ وہ جرمن جو پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، آسٹریا اور رومانیہ میں آباد کر دئے گئے تھے اب جرمنی میں واپس لائے جا رہے ہیں اور آبادی کی کمی اس طرح پوری کی جا رہی ہے۔ معاہدہ پوٹسڈم کے مطابق پولینڈ کے جرمن جرمنی کے برطانوی اور روسی علاقوں میں اور آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے جرمن امریکی، روسی اور فرانسیسی علاقوں میں آباد کئے جا رہے ہیں۔

خوراک

جرمنوں کی سب سے اہم ضروریات خوراک، ایندھن اور رہائش ہیں اور یہ ابھی تک بہت کم پوری ہو سکی ہیں۔ خوراک کی سخت کمی ہے۔ جرمنی کو اپنے بہترین حالات میں بھی گیہوں، جو، چاول، مکئی، وغیرہ باہر سے منگانا پڑتے تھے۔ اب تو ان میں سے بہت سی چیزیں قطعاً میسر نہیں ہو سکتیں۔ پچھلے سال کی فصل پندرہ فیصدی کم رہی اور اس سے حالات زیادہ بگڑ گئے۔ اس کمی کا اثر جرمنوں کے روزانہ راشن پر پڑا۔ برطانوی علاقہ میں (جہاں زراعت بہت کم ہوتی ہے) گذشتہ مارچ تک فی کس ڈیڑھ ہزار کیلوری راشن دیا جاتا تھا۔ اور عالمگیر کمی خوراک کے پیش نظر اب ایک ہزار کیلوری کرنا پڑا۔ فرانسیسی علاقہ میں بھی یہی حالت ہے۔ امریکی علاقہ میں بھی ۱۲۷۵ کیلوری کر دیا گیا ہے۔ روسی علاقہ کے بڑے شہروں اور صنعتی مرکزوں میں ڈیڑھ ہزار کیلوری ہے اور دوسری جگہوں میں ۷۵۰ کیلوری حالانکہ ایک شخص کے لئے ۲۷۰۰ کیلوری ضروری ہے۔ نتیجہ یہ کہ چاروں علاقوں میں جرمنوں کو پیٹ بھر خوراک نہیں ملتی۔ برطانیہ کی آزاد مزدور پارٹی کے سیاسی سکرٹری مسٹر فنیر براکوے کے قول کے بموجب ہمبرگ کا ایک بچی ڈاکٹر انسانی بالوں سے خوراک تیار کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ یہ خوراک مچھلی کی چٹنی کی مانند ہے اور توسوں پر لگائی جاتی ہے۔ ایک اور نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اس نے کئی جرمنوں کو اپنی قیمتی چیزوں کے عوض آلو خریدتے دیکھا ہے۔ ایک امریکی نامہ نگار لکھتا ہے کہ جرمن بچے والدین کی شہ پر خوراک کے اڈوں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔

رہائش

خوراک کے بعد رہائش کا مسئلہ ہے۔ انگریز اخبار نویس کنگزلے مارٹن لکھتا ہے کہ شہر ڈوسلڈورف میں اسی فیصدی مکانات ناقابل رہائش ہیں۔ برلن کے برطانوی حصے میں صرف تیرہ فیصدی مکانات بچ رہے ہیں۔ آس پاس کے ملکوں سے واپس آنے والے جرمنوں اور اتحادی فوجوں کی ضروریات کے باعث رہائش کا مسئلہ اور بھی نازک ہو گیا ہے۔ اب مکانات کی مرمت ہو رہی ہے، عارضی جھونپڑیاں بنائی جا رہی ہیں اور جنگی قید خانوں اور سرکاری دفتروں کی عمارتوں میں لوگ رہ رہے ہیں۔ تعمیر مکانات میں سات لاکھ آدمی کام کر رہے ہیں حالانکہ قبل از جنگ

بیس لاکھ آدمی یہ کام کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۹ء تک ان کی تعداد پینتیس لاکھ ہو جائے گی۔ معماری سکھانے کے لئے اسکول کھولدئے گئے ہیں جہاں دو مہینے کام سیکھنے کے بعد سولہ مہینے ٹھیکیداروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔

صحت

خوراک اور مکانات کی کمی کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ زمانۂ قبل از جنگ کی بہ نسبت خناق، تپ دق اور رجاعی امراض بہت بڑھ گئے ہیں۔ صابن کی کمی کی وجہ سے کھجلی کی بیماری پھیل رہی ہے۔ انفلوئنزا، تپ محرقہ اور لال بخار کے پھیلنے کا اندیشہ ہو گیا تھا لیکن فوری تدابیر اختیار کی گئیں اور یہ وبائیں دب گئیں۔ برطانوی علاقہ میں کئی جگہ دوا سازی کے کارخانے کھولے گئے۔ اس طرح دواؤں کی کمی پوری کی گئی۔ اسکولوں کے لڑکوں کو علیحدہ کھانا دیا جاتا ہے اور کانوں اور کارخانوں کے مزدوروں کو خاص راشن دیا جاتا ہے۔

کوئلہ

نازیوں کے سقوط کے ساتھ جرمنی کا معاشی نظام بھی ابتر ہو گیا تھا لیکن اب اس میں پھر جان پڑ رہی ہے۔ اس بحالی میں کوئلہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ جرمنی میں کوئلہ زیادہ تر روہر میں پیدا ہوتا ہے جو برطانوی علاقہ میں واقعہ ہے۔ امن کے زمانہ میں جرمنی کی کوئلہ کی دو تہائی پیداوار روہر ہی سے حاصل ہوتی تھی۔ برطانوی حکام نے روہر کی تمام کوئلہ کی کانوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس وقت کوئلہ کی پیداوار جو تینتیس ہزار ٹن ماہانہ تھی۔ اب چالیس لاکھ ٹن ہے۔ اس کوئلہ سے نہ صرف جرمنی کے چاروں علاقوں کی صنعتوں اور شہریوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں بلکہ فرانس، ہالینڈ، ناروے اور ڈنمارک بھی بھیجا جاتا ہے۔ موجودہ پیداوار کافی نہیں ہے اور حکام اسے بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

صنعت

صنعت ہی نے جرمنی کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ دو لمبی اور خونیں لڑائیاں لڑ سکے۔ مثال کے طور پر کرپس کے کارخانے ہی کو لے لیجئے۔ یہ کارخانہ انیسویں صدی کے اوائل میں قائم ہوا۔ شروع میں اس کا مقصد محض تجارت تھا۔ بعد میں یہاں بہترین فولاد بننے لگا۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں اسی کارخانہ میں سب سے پہلی بڑی توپ بنی۔ چھوٹی توپیں بڑی ہوتی گئیں جن کا مصرف صرف لڑائی میں ہو سکتا تھا۔ اس کارخانے نے نہ صرف فولاد اور توپیں بنائیں بلکہ "خون اور فولاد" کی ایک روایت قائم کی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب تک جرمنی کی صنعتوں، خاکر بھاری صنعتوں کو قابو میں نہ لایا جائے اس وقت تک جنگ کا احتمال رہے گا۔ چنانچہ ۲۸ مارچ کو اتحادیوں نے جرمن صنعت کے انتظام کا ایک خاکہ تیار کیا جس کی رو سے جرمنی میں اتنے کارخانے رہنے دئے جن سے اس کی سنہ ۱۹۳۸ء کی نصف صنعتی پیداوار حاصل ہو سکے۔ اسلحہ اور ہوائی جہازوں اور مصنوعی چیزوں کا بنانا قدغن کر دیا۔ فولاد اور دیگر دھاتوں، کیمیاوی اجزا، مشینی آلات، رنگوں اور بجلی کی چیزوں پر قیدیں لگا دیں البتہ عام استعمال کی چیزیں بنانے میں پوری آزادی دی گئی۔ اس خاکہ پر بہت لے دے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاکہ کے نتیجہ میں جرمنی کی اقتصادیات میں توازن نہیں رہے گا، جرمنی کی معاشی بحالی رک جائے گی کیونکہ جب برآمد کی چیزیں پیدا نہ ہو سکیں گی تو درآمد بھی نہ ہو سکے گی، اور یہ کہ جرمنی کی معاشی کمزوری اور زبوں حالی آئندہ انقلاب کا پیش خیمہ ہو جائے گی۔ لیکن یہ خاکہ عارضی ہے اور برطانوی نمائندوں نے اسے اس شرط پر قبول کیا ہے کہ اگر جرمنی کا رقبہ کچھ اور کم ہو جائے، یا جرمنی کی آبادی چھ کروڑ پینسٹھ لاکھ سے بڑھ جائے یا اس میں بابری مطالبات پورا کرنے کی سکت نہ رہے یا اس کی معاشی وحدت جاتی رہے، تو اس خاکہ پر نظر ثانی ہو سکتی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ عنقریب ان صورتوں میں سے کچھ رونما ہو جائیں اور خاکہ میں تغیر کرنا پڑے۔

بہرکیف، جرمن صنعت نسبتاً کم پیمانہ پر چالو ہو گئی ہے پتھر کے کوئلے اور مزدوروں کی قلت کے باعث فولاد کی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ لازمی صنعتوں کی کم سے کم ضروریات کو پورا کر سکے۔ برطانوی علاقہ میں کھیتی باڑی کے آلات، موٹریں، شیشہ، کاغذ اور جوتے بھی بنائے جا رہے ہیں۔ امریکی علاقہ میں کئی کارخانے ہیں جہاں موٹریں، سائیکلیں اور ٹائپ رائٹر بنائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ کھاد، دوائیں، رنگ، کیمرے اور بجلی کے بلب بھی بنائے جاتے ہیں۔ فرانسیسی علاقہ میں زیادہ تر پیداوار سوتی اور ریشمی کپڑے، چمڑے اور شیشہ ہے۔ روسی علاقہ میں لوہے، تانبے اور مصنوعی تیل کے کارخانے پھر سے کام کرنے لگے ہیں۔

عسکریت کا خاتمہ

اتحادیوں کا ایک بڑا مقصد ایک نئے جرمنی کی تشکیل ہے۔ اس کا مثبت پہلو بھی ہے اور منفی بھی۔ منفی پہلو سے مراد عسکریت اور نازیت کا استیصال ہے۔ مثبت پہلو سے مراد جرمن قوم کو نئے سرے سے ذہنی، اخلاقی اور سیاسی تعلیم دینا ہے۔ عسکریت کے انسداد میں شروع شروع میں ایک دقت یہ تھی کہ جرمن فوج اور اسلحہ ملک بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ سب اکٹھا کر لئے گئے تو کام آسان ہو گیا۔ اور یہ کام ہر علاقہ میں رو بہ تکمیل ہے۔ اب فوجیوں کی بیشتر تعداد زراعت، صنعت، کان کنی اور دیگر پیشوں میں کھپ گئی ہے۔ جنگی سامان کی کثیر مقدار اتحادیوں کے ہاتھ آئی۔ برطانوی اور امریکی علاقوں میں

وہ جنگی سامان جو شہری پیداوار کے لئے موزوں تھا، کسانوں اور شہریوں کو بیچ دیا گیا۔ بقیہ سب تلف کر دیا گیا۔ وہ ہوائی میدان جو اتحادیوں کے لئے غیر ضروری تھے زراعت کے لئے مقامی جرمن حکام کو دے دئے گئے ہیں جرمن بحری بیڑہ اتحادیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔

عسکریت کے تمام لوازمات مثلاً فوجی وردی، نازی سلام، نشانات اور تمغے قدغن کر دئے گئے کسی شہری انجمن کو ایسے مشاغل اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے جو آئندہ کسی عسکری مقصد کے لئے کارآمد ہو سکیں۔ قرارداد پوٹسڈم کے مطابق جرمنی کی بھاری صنعتیں بیکار کیجا رہی ہیں۔

نازیت کا خاتمہ

اتحادیوں نے جرمنی میں داخل ہوتے ہی نازیت کو مٹانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو نازی لیڈر، نازیت کے با اثر طرفدار، نازی پارٹی کے خاص عہدہ دار خفیہ پولیس کے افسر، طوفانی دستے، اور وہ شہری عملہ جو اتحادیوں کے لئے مضر سمجھا گیا، سب گرفتار اور نظر بند کئے گئے طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا کہ نازی حکومت اور صنعت کے سب عہدہ داروں سے یا ان جرمنوں سے جو ملازمت کے خواہاں تھے، ان کی گذشتہ سیاسی سرگرمیوں سے متعلق تحریری استفسارات کئے گئے۔ یہ طریق کارکامیاب ثابت ہوا کیونکہ جب انھوں نے دیکھا کہ جو بھی غلط جواب دیتا تھا اسے سخت سزا دی جاتی تھی تو سبھی صحیح جواب دینے لگے۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے اخیر تک صرف برطانوی علاقہ میں ۷۷ر۷۰۸ جرمن ملازمت سے علیحدہ کر دئے گئے اور ۴۷ر۱۲۰ر۵ (ملازمت کی) درخواستیں نامنظور کی گئیں۔ امریکی علاقہ میں ۱۵ر نومبر ۱۹۴۵ء تک ...۱۴۱ر۱۱ جرمن ملازمت سے برطرف کئے گئے اور فرانسیسی علاقہ میں ۵۴۹ر۱۶۔ اس میں شک نہیں کہ ان جرمنوں کی برطرفی سے انتظامی اور صنعتی کاموں میں کچھ خلل پڑا لیکن یہ سب برداشت کرنا پڑا کیونکہ اس کے بغیر نازیت کا زیر نا بود نہیں ہو سکتا تھا۔

تعلیم

توپوں، بمباروں اور فوجوں کی کثرت ذہنی روگ کی علامت ہے۔ جرمن ذہنیت کا سدھار عسکریت اور نازیت کا خاتمہ کرنے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ذہنیت کے سدھار کے لئے نئے سرے سے تعلیم دینا لازمی ہے۔ جرمن بچوں اور نوجوانوں کی ذہنیت بگاڑنے کی غرض سے نازیوں نے ان کی تعلیم کو بہت پست کر دیا تھا حقیقتیں ان سے چھپائیں اور غلط قدریں انھیں سمجھائیں۔ انھیں یہ بتایا کہ آزادی اور رواداری بری چیزیں ہیں اور ظلم و تشدد اچھی۔ اتحادیوں کے قبضہ سے بہت پہلے ہی نازیوں کا نظام تعلیم کئی علاقوں میں متزلزل ہو گیا تھا۔ مثلاً ڈسلڈورف میں ایک سال پہلے سے اسکول بند کر دئے گئے تھے۔ کولون میں بانوے فیصدی اسکولوں کی عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں یا بیکار۔ کئی شہروں میں نازی حکومت نے فوجی اغراض کے لئے لے لی تھیں۔ ۸ر مئی ۱۹۴۵ء کو جو اسکول چالو تھے اتحادیوں نے وہ بھی بند کر دئے اور یہ فیصلہ کیا کہ جب تک قابل اعتراض استادوں اور کتابوں کا صفایا نہ ہو جائے اور ایک مشترکہ نظام تعلیم وضع نہ ہو جائے اس وقت تک سب اسکول بند رہیں۔ جب اتحادی کنٹرول کمیشن قائم ہوا تو نئے نظام تعلیم پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک تعلیمی کمیٹی قائم کی گئی جس نے نیا نظام تجویز کیا۔ فروری ۱۹۴۶ء تک برطانوی علاقہ میں ماسوائے برلن کے ۱۲ر۵۲۴ اسکول کھولے گئے جن میں طلبا کی تعداد ۱۰۵ر۸۱ر۲۸ تھی۔ یہ اسکول فارموں سے متعلق عمارات میں، نیز ان عمارات میں جو ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لئے بنائی گئی تھیں قائم کئے گئے۔ جرمن استاد تعداد میں تو کم ہیں لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کی نازیت دشمنی مسلم ہے۔ استادوں کی کمی اس طرح سے پوری کی گئی کہ انگلستان سے قابل استادوں اور استانیوں کی ایک کثیر تعداد جرمنی لائی گئی۔ نئی کتابیں مرتب کی گئیں۔ بچوں کی تعلیم کے لئے خاص ریڈیو پروگرام اور فلم جاری کئے گئے۔

یونیورسٹیاں پھر سے کھلنے لگی ہیں۔ برطانوی علاقہ کی چھ یونیورسٹیاں (گوٹنجن، منسٹر، بون، کیل، کولون اور ہیمبرگ) کام کرنے لگی ہیں۔ طلباء تو بہت ہیں لیکن جگہ ابھی کم ہے۔ گوٹنجن یونیورسٹی ہی کی مثال لے لیجئے۔ کنٹرول کمیشن نے اس یونیورسٹی میں طلباء کی تعداد ساڑھے تین ہزار تجویز کی ہے لیکن سات ہزار درخواستیں آئیں۔ جو لوگ طوفانی فوج یا خفیہ پولیس میں رہے ہیں وہ نہیں لئے جاتے۔ ان بچوں کو جو لڑائی کے زمانے میں یتیم ہوئے، ان عورتوں کو جن کے شوہر لڑائی میں کام آئے، ان فوجیوں کو جو لڑائی میں کسی نہ کسی طرح بیکار ہوئے، ان لوگوں کو جن پر نازیوں نے ظلم ڈھائے اور طالب علموں کو جو کم عرصہ میں امتحان پاس کر سکیں داخلہ کے وقت ترجیح دی جاتی ہے۔

سیاسی جماعتیں

اتحادی جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں کی تشکیل میں مدد کر رہے ہیں۔ اس طرح سے جرمن قوم کو نئی سیاسی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس وقت جرمنی میں تین سیاسی جماعتیں ہیں۔ ایک اشتراکیوں کی ہے۔ دوسری، اجتماعی جمہوریت پسندوں کی اور تیسری، مسیحی جمہوریت پسندوں کی۔ روسی علاقہ میں اشتراکی اور اجتماعی جمہوریت پسند پارٹیاں آپس میں مل گئی ہیں۔

اور جنھوں نے "متحدہ اجتماعی جماعت" بنائی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ ملاپ روسیوں کے دباؤ سے ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ جس طریقہ سے یہ ملاپ عمل میں آیا وہ بہت قابل اعتراض تھا لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہٹلر کا اقتدار اشتراکیوں اور اجتماعیوں کے اختلافات کا سبب تھا تو یہ ملاپ مستحسن نظر آتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں "متحدہ اجتماعی جماعت" بنانے کی سرکاری طور پر اجازت نہیں دی گئی ہے۔

برطانوی حکام اپنے علاقہ میں کچھ عرصہ تک غیر جانبدار رہے۔ اس سے اشتراکیوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ برطانوی علاقہ روسی علاقہ کے مقابلہ میں سماجی اعتبار سے بہت پست ہے۔ اب برطانوی حکام اجتماعی جمہوریت پسندوں کی پوری ہمت افزائی کر رہے ہیں کیونکہ نظریاً اور عملاً یہی جماعت برطانوی نظریۂ جمہوریت کے قریب تر ہے۔ اب یہ پارٹی برطانوی حکام سے پورا تعاون کر رہی ہے۔ اس جماعت کا عمر رسیدہ اور باا ثر لیڈر کرٹ شومیشر ہے جو مدت تک سیاسی قید خانے میں رہ چکا ہے۔

مجموعی حالت

گذشتہ سال میں جرمنی نے ہر لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اتحادیوں نے نراج کی جگہ پر امن نظم قائم کر دیا ہے، جرمنی کو ہمہ گیر قحط اور وباؤں سے بچا لیا ہے اور جرمن اقتصاد کے مفلوج ڈھانچے میں نئے سرے سے جان ڈال دی ہے۔ جرمنی کی ابتر حالت، باہری دنیا کی معاشی کمزوری اور مشترکہ قبضہ کی قباحتوں کے پیش نظر، اتحادیوں کا یہ کارنامہ کافی شاندار دکھائی دیتا ہے۔

اتحادیوں کو اپنے بڑے مقصد میں یقینی اور مسلسل کامیابی ہوئی ہے۔ جرمنی میں تخفیف فوج و اسلحہ عمل میں آ چکی ہے۔ حکومت، تعلیم اور اقتصادیات سے نازیت مٹا دی گئی ہے۔ لیکن جرمن قوم کو جمہوریت کے لئے تیار کرنا باقی ہے اور اس کے لئے وقت اور محنت درکار ہے۔

کلی

ہاشم عظیم آبادی

اے کلی تو اسطرح کیوں مضطر و دلگیر ہے
تو کلی ہے یا سراپا درد کی تصویر ہے
تیرے لب پہ مہر خاموشی ہے کیوں چھائی ہوئی
بے سبب کیا اس طرح تو کیوں ہے مرجھائی ہوئی
کچھ نہ کچھ ہے راز مخفی جس سے تو مجبور ہے
بیکلی دل کو ہے تیرے ظاہراً مسرور ہے
میں سمجھتا ہوں خموشی میں جو مخفی راز ہے
تیری ہستی بزم عالم کا شکستہ ساز ہے

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین، لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲ سے شائع کیا۔

شادی کے بعد دلہن سسرال جب پہنچتی ہے تو عجب عالم ہوتا ہے۔ دولہا صاحب تو شام کو واپس آتے ہیں۔ دلہن دن میں سسرال والوں سے آزادانہ بات چیت نہیں کر سکتی بس گھونگٹ نکالے کچھ کاڑھتی رہیں۔ دولہا کے لئے رومال۔ تکئے وغیرہ کاڑھنا۔ نندوں کو کھانے کی ترکیبیں بتلانا۔ اپنی سہیلیوں سے شادی کے متعلق دلچسپ خطوط۔ اور بچوں کو کہانیاں پڑھ پڑھ کے چپکے چپکے سنانا۔ اور کارآمد دلچسپ کتابیں پڑھنا؛ اس ضرورت کے لئے حسب ذیل کتابیں منگائیے۔ یہ کتابیں آپ کو لڑکیوں۔ بیگمات۔ سہیلیوں وغیرہ کو تحفتہً اور جہیز میں بھی دینی چاہئیں؛

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری

جس کے مقابلہ میں کوئی کتاب پیش نہیں کی جا سکتی۔ جس میں سینکڑوں انگریزی حروف کاڑھنے کے لئے فلور باسکٹ۔ چیر بیک۔ کرسی کی گدیاں۔ میزپوش کے کئی دلپسند ڈیزائن۔ سینٹر میزپوش پر ناشپاتی۔ رس بھری۔ خوبانیاں۔ آلو۔ مختلف دلکش مرکز میزپوش کے کونے۔ ٹی ٹیبل۔ چادروں کی بیلیں حسین و دلفریب کونے۔ شلوار کی بہترین و حسین بیلیں۔ جو فرانسیسی طرز کے ہیں۔ کرتوں کی دلکش بیلیں۔ انگریزی بوڈر۔ جمپر کی خوبصورت بیلیں۔ گلاب کی بیلیں۔ دوپٹے کی بیلیں۔ چھوٹی خوبصورت پتیاں اور بیلیں۔ گریبان کی حسین و جمیل بیلیں۔ قمیص کے بورڈر۔ انگور کے پتوں کی بیلیں۔ مختلف بوٹے۔ جمپر کے حسین گلے۔ بچوں کے حسین بب؛ کروشیا کا کام۔ کروشئے کی بیلیں۔ کروشیا۔ میزپوش پر مونوگرام۔ تولیہ پر کروشیا گلدان پر کروشیا۔ گلدستہ کروشیا۔ خوشہ انگور کروشئے میں۔ کروشئے کی نفیس بیلیں؛ دوسوتی کا کام؛ طغرے۔ انگریزی فقرے۔ عید مبارک۔ خوش آمدید۔ مزاج شریف۔ بخیر؛ موتیوں کا کام:۔ جالی کا کام؛ کٹائی کا کام؛ سلمے ستارہ کا کام؛ تارکشی کا کام؛ لکڑی کا کام؛ فریٹ ورک؛ تکیوں کے اشعار؛ سینکڑوں قسم کی حسین و جمیل چیزیں۔ یہ رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری" میں آپکو ملیں گی؛ رضیہ سلطانہ حسین دہلوی کی مرتب کی ہوئی یہ کتاب آپ اپنی لڑکیوں۔ بیویوں۔ بہنوں کو تحفہ دے کر اپنے گھر کو گلزار بنالیں۔ آپ کا دل گھر میں لگے گا۔ نئی شادی شدہ لڑکیوں کا بہترین مشغلہ ہے۔ بڑا سائز۔ قیمت مجلد ؏؎۔ محصولڈاک آٹھ آنے۔ دو جلدوں پر محصول ۱۰/ لگتا ہے۔ اس کے ساتھ:۔

رضیہ کا "شاہی دسترخوان"

ایک ایسی کتاب ہے جو مغل بادشاہوں کے باورچی سے حاصل کی گئی تھی۔ اب اس کتاب کو جدید انگریزی و دیسی کھانوں کو ملا کر شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہر قسم کے ناشتے، آئس کریم، فالودہ، کیک، شاہی ٹکڑے مختلف قسم کی لذیذ روٹیاں، مزیدار پوریاں، پکوان، حلوے، بیسیوں قسم کی دالیں، کھچڑی، انڈے، نگینہ، قورمہ، کباب، مرغ، شکار، یخنی، دہلی کی مشہور نہاری۔ سبزیاں۔ نرگسی کوفتے۔ مچھلی کے سالن۔ نورکباب۔ قیمہ پلاؤ۔ مختلف اقسام انگریزی و دیسی مٹھائیاں۔ نشاستہ۔ حلوہ سوہن۔ پھینیاں۔ سب قسم کے مربے اور چٹنیاں۔ بیسیوں قسم کی چائے۔ کافی شربت ۸۰ قسم کے انگریزی کھانے۔ گوشت کی مٹھائیاں۔ کیلے کا سالن۔ شاہی مچھلی۔ غرضیکہ کھانا پکانے کی بہترین کتاب ہے۔ ڈھائی سو صفحات۔ قیمت مجلد تین روپے۔ محصولڈاک سات آنے علاوہ۔

عورتوں کی دیگر کارآمد اور دلچسپ کتابیں

باپ کا خط بیٹی کے نام قیمت ۱۲/ فاطمہ کا لال قیمت ؏ فینسی کشیدہ کاری قیمت ؏
نذرانہ قیمت ؏ تازیانہ قیمت ؏ جمیلہ قیمت ایک روپیہ چھ آنے۔
عباسی کشیدہ کاری قیمت ؏

رضیہ کے خطوط

:۔ زنانہ خطوط بہ طرز جدید۔ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ محصول ڈاک چھ آنے ۶/

تمام کتابیں اکٹھی منگانے پر محصول ڈاک معاف

نیا کتاب گھر اُردو بازار (اے سی)، دہلی سے منگائیے

یہ اور ہندوستان کے تمام کتب خانوں کی ہر قسم کی علمی ادبی سیاسی تاریخی مذہبی کتابیں۔ مشہور شعراء کے کلام۔ بچوں کی عورتوں کی کتابیں

ہندوستان کا مستقبل

ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس) کی شہرۂ آفاق کتاب جس کا ایک عرصہ سے انتظار تھا شائع ہوگئی۔ اس کتاب میں ملک کا موجودہ سیاسی بحران کے سبب اور ہندو مسلم مسئلہ کے راز کا مصنف نے نہایت غائر اور عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی مورخانہ تحلیل اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کی نہایت مخلصانہ انداز میں تفسیر کی گئی ہے۔ جو لوگ سیاست، تاریخ اور عہد حاضر کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری نہیں شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپئے۔

ہماری دوسری کتابیں

خطبات اقبالؒ

یہ حضرت علامہ اقبال کے وہ خطبات ہیں جو مرحوم نے صدر کی حیثیت سے مختلف علمی و سیاسی مجالس میں دئے تھے اور علمی حلقے میں بڑی تلاش تھی۔ رضیہ فرحت بانو صاحبہ نے بڑی کاوش سے مرتب کئے ہیں۔ شروع میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا مقدمہ بھی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے

بیوہ منشی پریم چند (ناول) ۱۲؍
ماہ درخشاں بیگم احمد علی " ۸؍
شمیم فیاض علی " ۸؍
تصویر اے آر خاتون " ۱۲؍
خونی اختر انصاری (افسانے) ۱؍
واردات منشی پریم چند " ۱۲؍
آبگینے اختر انصاری (قطعات) ۱؍
تجلیات مہر عثمانی (غزلیں) ۱۲؍
مسدس حالی صدی ایڈیشن ۱۲؍
جمالیاتی شاعری سعید انصاری (ادب) ۱؍
خارستان آغا شاعر " ۱۲؍
آب حیات کے لطیفے از محمد حسین آزاد ۱۲؍
مقالات مولانا اسلم جیراجپوری " ۲؍

مضامین ابوالکلام آزاد۔ دوم (سیاسی) ۱؍
نئی تہذیب نئی تعلیم ترجمہ برکت علی فراق (تعلیم) ۱۲؍
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاست) ۸؍
غبار خاطر از ابوالکلام آزاد (ادب) ۱؍
مضامین ابوالکلام آزاد اول (مذہب) ۱؍

چیتھک لارنس سے خطاب (سیاسی) ۳؍
اقبال کا نظریۂ پاکستان " ۶؍
تاریخ آزاد ہند فوج از منشی عبدالقدیر (تاریخ) ۸؍
لندن کے ہوائی حملے۔ از آغا محمد اشرف (معلومات) ۱۲؍
خیال آفریں دماغ تمثیل ۶؍
حسن حسینؓ (مذہب) ۷؍
اسلام کیسے شروع ہوا " ۸؍
" پھیلا اول " ۸؍
" " دوم " [illegible]
سامان آخرت (خواجہ غلام الثقلین) ۱؍
اسلامی نظمیں از نیر صاحب ۱۰؍
وطنی نظمیں " " ۱۲؍
سبھاش بابو کس طرح جاپان گئے ۸؍

حالی پبلشنگ ہاؤس (بی) دہلی

آج کل
اُردو کا پندرہ روزہ
باتصویر رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۵ | فہرست | یکم اگست ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی — بی اے (علیگ) ایل ایل بی
ناشر: راجندر ناتھ شیدا — ایم اے
مدیران: فضل حق قریشی — دہلوی ؛ مشیر احمد — ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ، پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

حیدرآباد میں دستوری تبدیلیاں

حکومت نظام کی مجلس انتظامیہ کے صدر اعظم نواب صاحب چھتاری نے ایک اعلان میں فرمایا ہے کہ نئی حکومت اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ایک نئی مجلس آئین ساز قائم کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۹ء کی دستوری تجاویز میں اہم تبدیلیاں ہونے کے علاوہ مجلس آئین ساز کے ضابطے اور انتخاب وغیرہ کے قوانین میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوگی۔ آئندہ انتخابات سے متعلق لائحہ عمل کے عنقریب شائع ہونے کی توقع ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ترمیم شدہ قوانین میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر طبقے کے مفاد و مقاصد برقرار رہیں۔ بعض ایسی اہم تبدیلیاں بھی ہونگی جن کے دور اندیش نتائج کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ حضور نظام رعایا اور حکومت کے مابین ایک قریبی تعلق اور یگانگت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ عوام کی طرف سے دو نمائندے مجلس انتظامیہ میں بھی ہوا کریں گے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مجلس آئین ساز کے مرتب کئے ہوئے قواعد و ضوابط کو مجلس انتظامیہ پوری طرح عمل میں لاتی ہے یا نہیں، حضور نظام نے چند ہدایات جاری کی ہیں جنکا اعلان عنقریب ہو جائے گا۔

ایران اور صلح کانفرنس

ایران کے وزیر اعظم ایم قوام السلطنت نے امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور چین کے ان نمائندوں سے جو طہران میں موجود ہیں، گفتگو کے دوران میں کہا کہ ایران بھی صلح کانفرنس میں شامل ہونے کا آرزو مند ہے اور اسکا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ انھوں نے ایک بیان میں جو پانچوں نمائندوں کو بھیجا گیا، تحریر کیا ہے کہ ایران نے فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں اتحادیوں کی پوری پوری مدد کی ہے اسلئے اسکا حق ہے کہ وہ صلح کانفرنس میں بھی شریک ہو۔ انھوں نے بتایا کہ "اقوام متحدہ کے میثاق کی دفعہ ۳ کے بموجب ایران کو اس کانفرنس کے لئے دعوت دینی ضروری ہے" حالانکہ میثاق مذکور کی دفعہ ۳ میں صلح کانفرنس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کے پہلے پیراگراف میں کہا گیا ہے "یہ ادارہ اس اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ اس میں شامل ہونے والے تمام اراکین کامل آزادی میں برابر کے شریک ہوں گے۔

مفتیٔ اعظم اور حکومتِ مصر

یروشلم کے مفتیٔ اعظم الحاج امین الحسینی کے سرزمین مصر پر پناہ گزین ہوتے ہی حکومتِ برطانیہ نے حکومتِ مصر سے دریافت کیا تھا کہ مفتیٔ اعظم کے آئندہ ارادے کیا ہیں اور وہ سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیں گے یا نہیں۔ لندن کے محکمۂ امورِ خارجہ نے اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ حکومت اس امر کے لئے بالکل تیار ہے کہ وہ مفتی صاحب کو سیاسی چپقلشوں سے خصوصاً برطانیہ کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے سے حتی الامکان باز رکھے اور جہاں تک ہو سکے وہ انھیں سرزمین مصر پر شاہی مہمان کی حیثیت سے پرسکون زندگی بسر کرنے دے۔ اسوقت مفتی صاحب شاہ فاروق کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے شاہی محل میں خیر و عافیت کے ساتھ دن گزار رہے ہیں۔ سیاسی حلقوں میں یہی امید قائم کی گئی ہے کہ وہ خود بھی خاموش رہنے کو ترجیح دینگے۔

سرخ فوجوں کا جال

واشنگٹن کے سیاسی حلقوں میں یہ یقین بڑی سرعت کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں بیٹھتا چلا جا رہا ہے کہ روس اپنی خاص حکمتِ عملی سے اس کوشش میں ہے کہ تمام مشرقی یورپ میں جتنی دور تک ممکن ہو سکے اپنی فوجوں کو پھیلا دے۔ ایک طرف یہ چال چلی جا رہی ہے اور دوسری طرف پیرس میں صلح کانفرنس کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے۔ ان باتوں سے صورتِ حالات کے نازک ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسوقت امریکہ کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ قبضہ و تسلط حاصل کرنے والی فوجیں فوراً دوسرے ملکوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے وطن چلی جائیں۔ اس غرض کے ماتحت امریکہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کی کوشش ہے کہ بہت جلد رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور فن لینڈ کے ساتھ معاہدۂ صلح کر لیا جائے کیونکہ ایسا ہو جانے کے بعد ہی روسی فوجوں کو ان ملکوں سے دور رکھنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا جا سکیگا۔ مسٹر برنس کے خیال کے مطابق قدرتی طور پر ان کا دوسرا قدم آسٹریا کے ساتھ معاہدۂ امن کرنے کا اٹھیگا۔ نیز اس مسئلے کو طے کرنے کیلئے بھی کہ پولینڈ میں روسی فوج کتنی تعداد

اپنے ڈیرے ڈالے ہیں۔

پونہ کے قریب جنگی اکاڈمی

حال ہی میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک پونہ تشریف لے گئے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے ہندوستان کی قومی جنگی اکاڈمی قائم کرنے کے لئے جھیل کرک واسلا کے قریب ایک وسیع قطع زمین منتخب فرمایا جسے اکاڈمی کی مجلس عاملہ نے بھی پسند کر لیا۔ مکمل ہو جانے پر اس اکاڈمی کی عمارت میں سولہ ہزار سپاہی بیک وقت رہ سکیں گے جن میں سے دو ہزار چار سو کے قریب فوجی طالب علم، اساتذہ، نجی عملہ اور ان کے کنبہ دار ہونگے۔ حکومت ہند کا محکمہ جنگ جھیل مذکورہ کے قریب پانچ ہزار ایکڑ زمین حاصل کرنے کے لئے حکومت بمبئی سے مدد لے رہا ہے۔ قوی امید ہے کہ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی عمارت کی تعمیر شروع ہو جائے گی اور دو تین سال کی مدت میں اکاڈمی کا نظام عمل قائم ہو جائے گا۔ سنا گیا ہے کہ اس سب کمیٹی کی تجاویز بھی جو نصاب و عملہ تعلیم اور تعمیر ترتیب کی جزئیات پر غور و خوض کرنے کے لئے بنائی گئی تھی مجلس عاملہ نے منظور کر لی ہیں۔ مجلس مذکورہ نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اکاڈمی میں داخلے کی کیا صورت ہوگی، کس قسم کی تعلیم و تربیت دی جائیگی اور کتنے طلبا شروع میں داخل ہو سکیں گے۔ اس امر کا لحاظ رکھا جائیگا کہ اکاڈمی اپنی کیفیت اور قومی یادگار کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہو۔

ایران میں جمہوری جماعت

ایران کے وزیر اعظم ایم قوام السلطنت نے طہران سے تقریر نشر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایک نئی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں جسکا نام ایران کی جمہوری جماعت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اسکی سب سے بڑی پالیسی یہ ہوگی کہ ہمیشہ کی طرح ایران کی آزادی اور اس کے مفاد کو برقرار رکھنے کے لئے مناسب طریقہ کار اختیار کرے اور ان تعلقات کو جو اتحادی ملکوں خصوصاً روس، برطانیہ اور امریکہ سے قائم ہیں، زیادہ سے زیادہ استوار رکھے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ میں ایران کے اندرونی معاملات میں کسی غیر ملکی مداخلت کو ہرگز گوارا نہیں کروں گا کیونکہ دوسروں کے دخل در معقولات سے بچے رہنے ہی پر قومی زندگی کی بقا منحصر ہوتی ہے۔ اسی لئے خارجی تعلقات میں اس خبر کو میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ میں ان تمام اصلاحات کو بروئے کار لاؤں گا جو تمام ایرانیوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اہل وطن کا فرض ہے کہ وہ خود غرض اور فتنہ پرداز لوگوں کی طرف سے ہوشیار رہیں اور انکی کسی بات پر توجہ نہ دیں۔

چین میں پہلا افغانی سفیر

لڑائی کے دوران میں اور خصوصاً لڑائی کے بعد سے افغانستان کو عالمگیر سیاست میں خاص اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے قبل اس ملک کا کوئی سفیر یا سیاسی نمائندہ چین میں نہیں بھیجا جاتا تھا لیکن اب دونوں ملکوں کے مابین فیصلہ ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ملک میں اپنے اپنے نمائندے بھیجیں تاکہ دوستانہ تعلقات پوری تقویت کے ساتھ قائم ہوں۔ چنانچہ مسٹر حبیب اللہ کو جو اسوقت افغانستان کے محکمۂ امور خارجہ کے نائب وزیر ہیں، نامزد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ملک کے پہلے سفیر کی حیثیت سے چین تشریف لے جائیں۔ قوی امید ہے کہ یہ سلسلہ دونوں ملکوں کے تجارتی، ثقافتی اور سیاسی تعلقات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ افغانستان نے ادارۂ اقوام متحدہ کی رکنیت کے لئے بھی درخواست دی ہے۔

کائناتی شعاعیں

اس کرۂ ارض کی فضائے بسیط سے گذرتے وقت کائناتی شعاعوں کے مدہلم کے مفید اجزا تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ قیاس ہے کہ وہ اجزا بھی ہماری زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نازک حصوں کی حقیقت جو فضائی چھلنی میں چھنتے رہنے کے باعث ہم تک نہیں پہنچ سکتے، پوری طرح سمجھنے کے لئے سائنسداں کو اس فضا سے باہر جانا پڑیگا کم و بیش چالیس ہزار فٹ کی بلندی اس جانچ پڑتال کے لئے کافی ثابت ہوگی۔ چنانچہ حکومت نے ایک کثیر رقم کائناتی شعاعوں کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر بلیکیٹ کو بخشی دیدی ہے تاکہ وہ اپنے تجربات میں مصروف ہو جائیں۔ بعض بہت اونچے اڑنے والے جہازوں کی شکل میں اپنے فضائی معمل بنانے ہونگے۔ ان کے تحقیقاتی لائحہ عمل کا نظام ایر بورن ریسرچ کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے جس کے صدر سر ہنری ترزارڈ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سائنسداں ان اجزا کی جانچ پڑتال ہی پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ وہ ان کو اس دنیا میں خود تخلیق کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ان چیزوں سے استفادہ کیا جا سکے جن سے قدرت ہمیں محروم کر دیتی ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے سلسلے میں بمبئی کے مشہور پروفیسر ایچ جے بھابھا مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ اچھے سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ مصور بھی ہیں۔ یہ دو خوبیاں ہیں جو ایک ہی ذات میں بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔

ہندوستان اور مسئلۂ خوراک

ادارۂ اغذیہ و زراعت کے ڈائرکٹر جنرل سر جان بائڈ اور نے ایک بیان میں فرمایا کہ ہندوستان میں کال پڑنے کا سبب آبادی کا ضرورت سے زیادہ ہونا نہیں ہے بلکہ اسکی وجہ قلت پیداوار ہے۔ لوگوں نے سائنس کے جدید ترین طریقہ ہائے زراعت کے ماتحت پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ حکومت ہند کے رکن اغذیہ سر جے پی سریواستو نے اپنے عہدے سے دستبردار ہوتے وقت مسئلۂ خوراک پر تبصرہ کیا اور کہا کہ

اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ کوششیں کی گئی ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر ریاست میں بہت بڑا سرکاری عملہ اشیائے خوراک فراہم کرنے اور انہیں صحیح اور مساوی طریقہ پر تقسیم کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس عارضی محکمے میں تقریباً ایک لاکھ نفوس کام کر رہے ہیں۔ درآمد کے اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے موصوف نے کہا: "۱۹۴۶ء کے شروع سے اب تک ہم کو حقیقتاً پانچ لاکھ تینتیس ہزار ٹن گیہوں، آٹا، اور میدا وغیرہ مل چکا ہے۔ تینتیس ہزار ٹن چاول اس کے علاوہ ہیں۔ ایک لاکھ تیس ہزار ٹن اناج جہازوں پر لدا ہوا راستے میں ہے اور عنقریب ہندوستان پہنچنے والا ہے۔ تین لاکھ بیالیس ہزار ٹن دوسرے ملکوں کی بندرگاہوں پر خالی جہازوں کے انتظار میں پڑا ہے۔ یہ اعداد و شمار کمبائنڈ فوڈ بورڈ کے لائحہ عمل کے بموجب ہیں اور امید ہے کہ اگر مزید کوشش کی جائے تو ان میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

فلپائن میں آزاد جمہوریت

عین اس روز جبکہ امریکہ والے اپنے ملک کی آزادی کی سالگرہ منا رہے تھے فلپائن کے طول و عرض میں بھی نعرۂ آزادی گونج اٹھا۔ صدر ٹرومین کی جانب سے امریکی ہائی کمشنر مسٹر پال میکنٹ نے اسکا اعلان کیا۔ اس موقعہ پر جنرل میک آرتھر نے امریکی فوجوں کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کلیرن موجود تھے جو جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی اسپیشل کمشنر ہیں۔ مسٹر میکنٹ نے فرمایا کہ امریکہ نے فلپائن کو آزادی دینے کے سلسلے میں اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ فلپائن پر امریکی تسلط اڑتالیس سال تک قائم رہا ہے۔ امریکہ آئندہ بھی اس نئی جمہوریت کو پروان چڑھانے میں ہر قسم کی مدد دیتا رہے گا۔ اس جمہوریت کے پہلے صدر ڈاکٹر مینوئل روکساس مقرر کئے گئے ہیں۔ جنرل میک آرتھر نے جشن آزادی میں حصہ لینے والے لاکھوں انسانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان تمام لوگوں کے کان جو جاپانیوں کے ظلم و ستم برداشت کر چکے ہیں، نعرۂ آزادی سننے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور ان کے دلوں میں ایک نئے اعتقاد کی روشنی فروزاں تھی۔ اس موقعہ پر اگر انہیں آزادی نہ دی جاتی تو یقیناً زبردست مایوسی ہوتی۔ صدر ٹرومین نے فلپائن والوں کے لئے اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ فلپائن کو آزادی دے کر گویا جزائر بحرالکاہل میں جمہوریت کی بنا رکھنے کا ایک زبردست تجربہ کیا گیا ہے خدا کرے یہ تجربہ راس آئے اور کامیاب رہے۔

طبقاتی تقسیم

ادارۂ اقوام متحدہ کا ایک شعبہ تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیمات سے متعلق ہے۔ اس کے سکرٹری ڈاکٹر جولین ہکسلے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے ادارے کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ادارے کی مرکزی حیثیت ختم کر کے اسکو دنیا کے دس مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر طبقے کا نظام عمل بالکل جدا ہو۔ ان کے خیال کے مطابق تقسیم ان دس طبقات میں ہو سکتی ہے ۱۔ شمالی امریکہ ۲۔ کیریبین ۳۔ جنوبی امریکہ ۴۔ مغربی یورپ ۵۔ مشرقی یورپ اور سوویٹ روس کی ریاست ہائے متحدہ ۶۔ مشرق وسطیٰ (معہ شمالی افریقہ) ۷۔ افریقہ ۸۔ صحرا کا جنوبی حصہ ۹۔ ہندوستان برما اور لنکا ۱۰۔ مشرق بعید اور آسٹریلیا۔ انھوں نے اس خاکے کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ ان میں سے ہر ایک نظام کو چلاتے اور قائم رکھتے وقت اس امر کا خاص لحاظ رکھنا پڑے گا کہ کہیں ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی طبقہ نکتۂ نظر کے اعتبار سے اپنی کوئی محدود انفرادیت پیدا کر کے ایک الگ ثقافتی قومیت بنا بیٹھے۔ یا وہ کلیتہً کسی طاقتور قوم کے زیر اثر ہو کر اپنی انانیت کو ختم کر دے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اہم باتوں کے اعتبار سے بین الاقوامی نظام پھر بھی قائم رہیگا۔ مثلاً ایٹم بم کے معاملے میں ایک مرکز پر رہنا ضروری ہے لیکن دوسرے ثقافتی معاملات میں تقسیم مفید اور قابل عمل بن سکتی ہے۔

برما میں تعمیر کا لائحۂ عمل

سب جانتے ہیں کہ جاپانی حملوں کے باعث برما میں شدید قسم کی تباہی رونما ہوئی اور جان و مال کے نقصانات کے ساتھ ساتھ عمارتیں بھی مسمار ہو گئیں۔ امن و عافیت کی فضا قائم ہوتے ہی بعد جنگ کے منصوبے عمل میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ اب حکومت سب سے زیادہ توجہ سرکاری کوارٹروں کی طرف مبذول کر رہی ہے کیونکہ سرکاری اہلکار اور افسران جائے رہائش نہ ہونے کے باعث سخت دقتوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاکہ اور لاگت کا تخمینہ مرتب کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر کم و بیش ایک کروڑ روپے خرچ ہونگے۔ سرکاری ملازمین کو وہ کوارٹر مل جانے کے بعد عوام کو خود بخود رہائش کی سہولت حاصل ہو جائے گی۔

جرمنی کے حصے بخرے کرنے پر اعتراض

پیرس میں ہونیوالی مجلس وزرائے خارجہ کے ایک اجلاس میں سوویت روس کے نمائندے مسٹر مولوٹوف نے بڑی شدومد کے ساتھ کہا کہ جرمنی کو اس کے باشندوں کی مرضی کے بغیر نہ تو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے اور نہ وہاں نفاق قائم کرنیکی صورت پیدا کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہارے ہوئے دشمن سے بدلا لینا کوئی قابل تحسین سیاسی حکمت عملی نہیں ہے۔ انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ جرمنی کو صرف کسانوں ہی کی نگری نہ بنایا جائے بلکہ اسکے صنعتی اداروں کو قائم رکھتے ہوئے کوشش کی جائے کہ وہاں فولاد کی پیداوار بدستور ترقی کرے بشرطیکہ حفاظت کے لیے ذرائع بھی اختیار کئے جائیں کہ آئندہ اس کی طرف سے لڑائی کا امکان پیدا نہ ہو۔

موجِ ترنّم

فراق گورکھپوری

بس اک دامنِ دل گلستاں گلستاں
گریباں گریباں بیاباں بیاباں

حجابات میں تو نمایاں نمایاں
فروزاں فروزاں درخشاں درخشاں

ترے زلف و رُخ کا بدل ڈھونڈھتا ہوں
شبستاں شبستاں چراغاں چراغاں

خط و خال کی تیرے پرچھائیاں ہیں
خیاباں خیاباں گلستاں گلستاں

وہی حیرتیں ہیں وہی وحشتیں ہیں
گلستاں گلستاں بیاباں بیاباں

سراسر ہے جمعیتِ دل کی تصویر
تری زلفِ پُرخم پریشاں پریشاں

ہو قوسِ قزح شبنم آلود جیسے
ترا قدِ رنگیں پشیماں پشیماں

وہی اک تبسم چمن در چمن ہے
وہی پنکھڑی ہے گلستاں گلستاں

لپٹ زلفِ مشکیں کی تاتار تاتار
دمکِ لعلِ لب کی بدخشاں بدخشاں

جنونِ محبت ان آنکھوں کی وحشت
بیاباں بیاباں غزالاں غزالاں

یہ سازِ خموش آج تو دے اٹھا ہے
سکوتِ نظر بھی غزلخواں غزلخواں

ہے سینہ کہ سنگیت پچھلے پہر کا
وہ چہرہ کہ اُوشا[1] پشیماں پشیماں

جھلاجھل سجل روپ کی رسمساہٹ
تہِ شبنمستاں چراغاں چراغاں

دھواں بوئے گیسو کا دشتِ ختن ہے
ان آنکھوں کا جادو پرستاں پرستاں

کمر سے خجل رقصِ شعلہ کی موجیں
نظر سے فضائیں گلستاں گلستاں

وہ تھے رازِ پنہاں جنہیں سب نے جانا
ہویدا ہویدا نمایاں نمایاں

یہی جذبِ پنہاں کی ہے داد کافی
چلے آؤ مجھ تک گریزاں گریزاں

زمیں تا فلک شامِ غم کا دھندلکا
محبت کی دنیا ہراساں ہراساں

کہاں اٹھ رہی ہے کہاں گر رہی ہے
نگاہِ محبت پریشاں پریشاں

چلے آرہے ہیں چلے جا رہے ہیں
کدھر سے کدھر کو خراماں خراماں

ہر اک واقعہ دردآموزِ اُلفت
بس اک دیس ماتم دلستاں دلستاں

وہی اک نظر ڈوبتی جا رہی ہے
وہی ایک نشتر رگِ جاں رگِ جاں

کہیں یوں بھی بدلی ہیں غم کی فضائیں
وہی باد و باراں بہاراں بہاراں

وہ شوخی میں اندازِ پنہاں حیا کے
حیا میں وہ شوخی نمایاں نمایاں

فراق حزیں سے تو واقف تھے تم بھی
وہ کچھ کھویا کھویا پریشاں پریشاں

[1] اُوشا صبح کی دیوی جو پو پھٹنے سے پہلے شفق کے ہلکے نقوش کے پیچھے جلوہ گر ہوتی ہے

سر شاہ محمد سلیمان مرحوم

سر شاہ محمد سلیمان صاحب سنہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میری سب سے پہلی ملاقات پینتالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا سنہ ۱۹۰۰ء میں چرچ مشن ہائی اسکول جونپور میں ہوئی تھی۔ اسوقت انھوں نے اس زمانے کا انگریزی مڈل امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے بہت تیز طلبا میں سے تھے۔ ہر شخص ان کی ذہانت کا معترف تھا وہ بہت سادہ مزاج، شرمیلے اور کم گو تھے اور اپنے اسکول کے ذہین ترین طلبا میں سے تھے۔ ان کا نام آج تک وہاں کے طلباء میں ضرب المثل ہے۔ ان کے عادات و اطوار، ان کی محنت اور ان کی ذہانت کی داستان اب تک تازہ ہے۔

مرحوم نہ صرف ذہانت اور قوت حافظہ کے اعتبار سے اپنا جواب نہ رکھتے تھے، بلکہ ان میں بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ حد درجہ محنتی تھے۔ جس کام کو شروع کرتے اس کو ختم کرکے ہی چھوڑتے۔ یہی وصف ان کا آخری دم تک قائم رہا۔ طالب علمی کے زمانے کی عادتیں کچھ ایسی راسخ ہو گئی تھیں کہ بیرسٹری، ججی، چیف ججی میں بھی ایک لمحے کے لئے نہیں چھوٹیں اور ان ہی پر ان کی کامیابی اور زبردست شخصیت کا انحصار تھا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں محمد سلیمان انٹرنس کے امتحان میں اوّل نمبر پر پاس ہوئے اب وہ الہ آباد میں آ گئے اور چار سال تک مسلم ہوسٹل میں مقیم رہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے ایف اے کا امتحان شاندار طریقے سے پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر رہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے بی اے کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وہ اول نمبر رہے، سرکاری وظیفہ پایا اور مزید تعلیم کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔

ہمارے یہاں طالبعلموں میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ تندہی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مصروف نہیں ہوتے۔ نہ ان کے نوشت و خواند کے اوقات مقرر ہوتے ہیں اور نہ وہ جی لگاکر محنت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں زیادہ تر ناکام رہتے ہیں۔ شاہ محمد سلیمان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ شدید محنت کرتے تھے اپنے اوقات کی پوری پوری پابندی کرتے تھے۔ جس کتاب کو ہاتھ لگاتے اُسے ختم کرکے چھوڑتے۔ جس مسئلے کو حل کرنے میں لگتے اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے۔ جب وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں پہنچ جاتے تو تاوقتیکہ ان کے پڑھنے کا وقت ختم نہ ہو جاتا وہ باہر نہ نکلتے۔ ان کی طالبعلمانہ زندگی کا شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جس میں انھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق لکھنے پڑھنے سے گریز کیا ہو۔ اُن کا اصول یہ تھا کہ پہلے اپنی درسی کتابیں پڑھکر ان پر قابو کر لیتے اور پھر ادھر اُدھر کی کتابیں پڑھتے۔ ان کے پاس بیکار باتوں کے لئے وقت بالکل نہیں تھا نہ تو وہ کسی سماجی کام میں دلچسپی لیتے تھے اور نہ کسی سیاسی تحریک میں۔ ان کا خیال تھا کہ ایک طالبعلم کو خارجی تحریکوں سے الگ تھلگ رہنا چاہئے اور وہ اس پر خود سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔

ولایت میں مرحوم نے کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں بھی انھوں نے محنت سے منہ نہ موڑا اور اسی تندہی کے ساتھ اپنی پڑھائی میں لگے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سائنس میں اور قانون میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ سر جے جے ٹامسن کے شاگرد رشید تھے اور ان کے زندگی بھر معترف اور احسانمند رہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں شاہ سلیمان ولایت سے واپس آئے اور قانون ہند کے عمیق مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک یعنی الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہونے سے پہلے انھوں نے پبلک کے کسی کام میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ ان کے وقت کا ہر لمحہ ایک ہی کام کے لئے وقف تھا اور وہ تھا وکالت کا کام۔ اسی میں آپ ہر وقت لگے رہتے تھے۔ آپ وکالت کو مشکل کام سمجھتے تھے اور اس پر کمال حاصل کرنے کے لئے اس میں زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ چند ہی سال میں آسمان وکالت پر آفتاب بن کر چمکنے لگے اور اوائل عمری میں کامیابی اور کامرانی ان کے قدم چومنے لگی۔

جب آپ الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے تو اپنے وقت کا کچھ حصہ قانون کے علاوہ اور دوسرے مشاغل کو بھی دینے لگے۔ آپکی ذہانت و ذکاوت ہمہ گیر تھی۔ آپ کو نہ صرف قانون سے حد درجہ شغف تھا بلکہ آپ کو دیگر علوم میں بھی کافی دسترس حاصل تھا۔ خصوصاً ریاضیات اور طبعیات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کو اردو شاعری کا بھی خاص ذوق تھا۔ چنانچہ آپ نے ذوق اور میر کے دیوان مرتب کئے اور ان کو اپنے حواشی کے ساتھ اپنے اخراجات سے چھپوایا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپکو اردو ادب سے کتنی محبت تھی۔ وکالت کے زمانے میں آپ کو دوسرے شہروں میں جانے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ آپ جس شہر میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں اردو کے پرانے قلمی نسخے تلاش کرتے تھے اور ان کو اپنے ذاتی کتب خانہ کے لئے خرید لیتے تھے۔ آخر میں آپ نے ایک ہزار سے زائد ایسے قلمی نسخے علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری کو پیش کر دئے تھے۔ آپ کو عربی میں بھی اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ نے حدیث اور فقہ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

محمد حفیظ سید

سائنس اور ریاضی کے ماہر ہوتے ہوئے بھی آپ کے عقائد ایک سچے مسلمان کے عقائد تھے۔ آپ قدیم و جدید فلسفے سے بھی ناآشنا نہ تھے۔ اور ہر لحہ مزید تحقیقات اور معلومات حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ نے سالمہ (ایٹم) پر ایک بسیط لکچر دیا اور اسکی تاریخ یونانی حکما کے زمانے سے بیان کی۔ آپ کو سالمہ کے بارے میں زمانہ سلف کے ہندوؤں کے خیالات کا علم بالکل نہ تھا۔ اتفاقاً ایک دوست نے آپ سے ذکر کیا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رادھا مشرا نے مادے کے ہندوستانی تخیل پر ایک کتاب لکھی ہے۔ آپنے فوراً اس کتاب کو منگوا بھیجا اور اسکا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستانی مطمح نظر کو بھی اپنے خیالات میں شامل کرلیا۔

شاہ محمد سلیمان مرحوم متوسط طبقے کے ایک فارغ البال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانے نسبتاً عیش و آرام سے گذرے۔ آپ ہمیشہ جمہوری خیالات کے حامی رہے اور ان کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔ خداوند تعالےٰ نے آپ کو ایک دردمند دل عطا فرمایا تھا۔ آپ اپنے ملازموں تک سے مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔ اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ چیف جسٹس کے ممتاز عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی آپ ملاقات کرنے کے مقررہ دنوں پر ہرکس و ناکس سے انتہائی شرافت سے ملتے تھے اور ملاقات کرنے والوں کلرکوں تک کو کرسی پر بٹھاتے تھے اور پان سگریٹ سے ان کی تواضع کرتے تھے۔ دراصل خاطر تواضع کا یہ وصف آپکو اپنے آباؤ اجداد سے ترکے میں ملا تھا۔ جنکا شمار علمائے جونپور میں ہوتا تھا۔

مرحوم ایک سچے پاکباز مسلمان تھے اور اسلامی زندگی کا ایک پاکیزہ نمونہ۔ منصب اعلیٰ پر ہوتے ہوئے بھی آپ میں غرور نام کو نہ تھا۔ آپ مجسم نیکی تھے اور دوسروں کی نیکیوں کا اعتراف کرتے تھے۔ خود کام کرنے کے عادی تھے اور کام کرنے والوں کی عزت کرتے تھے۔

آپ نے جب انتقال فرمایا تو کوئی وصیت نامہ نہیں چھوڑا۔ آپکا عقیدہ تھا کہ ایک مسلمان کو وصیت نامے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ترکہ کی تقسیم کے لئے احکامات ربانی موجود ہیں اور ان میں ترمیم کرنے کی مجال ایک مسلمان کو ہرگز نہیں ہے۔ آپ اتنے محتاط تھے کہ بنک میں جو روپیہ آپ کا جمع رہتا تھا اس پر سود نہ لیتے تھے۔ اسی طرح آپ زندگی کا بیمہ کرانے کے بھی خلاف تھے اور اپنی زندگی کبھی بیمہ نہیں کرائی۔ ولایت میں آپ نے اسلامی عقائد کی پابندی سختی کے ساتھ کی حتیٰ کہ آپ نے گوشت کھانے سے بھی اس لئے پرہیز کیا کہ وہ اسلامی طریقہ کے مطابق ذبیحہ نہ ہوتا تھا۔

شاہ مرحوم نے اپنی قوم کو مدد پہنچانے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ آپ کئی سال تک مسلم ہوسٹل الہ آباد کے اعزازی سکریٹری اور مجیدیہ اسلامیہ کالج کے صدر رہے اور اسکی ترقی میں نمایاں حصہ لیا آپ تین سال سے زائد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور جب کبھی آپ کو علی گڈھ جانا ہوتا تھا تو اپنے ہی اخراجات سے آتے جاتے تھے۔ الغرض جب کبھی قوم کو آپکی خدمات کی ضرورت پڑی آپنے فراخدلی سے اپنی خدمات پیش کردیں۔

جب ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر صاحب کو عارضی طور پر ہائی کورٹ کی ججی تفویض ہوئی، اسوقت وہ وکالت کے پیشے میں سب پر فائق تھے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں وہ کچھ عرصے کے لئے عارضی طور پر جج رہے۔ بالآخر جب ۱۹۲۳ء میں سر محمد رفیق صاحب ریٹائر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کو ججی کا مستقل عہدہ ملا، اس وقت وہ تمام وکالت پیشہ برادری کے سردار تھے، اور نہ صرف ہائی کورٹ میں بلکہ تمام صوبے میں ان کی وکالت کی دھوم تھی۔ آگرہ اور اودھ کے صوبے میں شاید ہی کوئی اہم مقدمہ ایسا ہوگا جس میں وہ شریک نہ ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ جج کی حیثیت سے نمایاں ترقی کی۔ بلکہ ان کی ججی کا کل زمانہ نہایت درخشاں ہے۔ ان کے وقاد ذہن کے لئے نہ کوئی مقدمہ پیچیدہ تھا نہ کوئی امر دقیق تھا، ان کی روشن طبعی خود وکلاء کے لئے بلا ہوجاتی تھی۔ وہ وکلا کی تقریروں اور ان کی مفروضہ پیچیدگیوں سے نہ گھبراتے تھے نہ ان کے الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنستے تھے، بلکہ ان کی تنبیہہ سے وکیل کو اس امر کا یقین ہوجاتا تھا کہ وہ کسی ایسے زبردست اہل دماغ کے سامنے حاضر ہے جسکا ذہن ہمہ وقت اخذ و غور اور استیقان کے لئے آمادہ ہے۔ ان کے ججی کے عہدے پر فائز ہونے کے قلیل عرصے ہی کے بعد اہل رائے اس امر پر متفق ہو گئے تھے کہ ڈاکٹر سلیمان صاحب کل ہند کے سربرآوردہ ججوں میں سے ایک تھے۔

۱۹۲۹ء میں ان کو نائٹ کا خطاب ملا، اور ۱۹۳۲ء میں چیف جج ہوگئے۔ اس کے بعد سرکار ہند کو فیڈرل کورٹ کے لئے قابل ججوں کی تلاش ہوئی تو ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان ہی پر نظر انتخاب پڑی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں وہ فیڈرل کورٹ کے جج ہوکر دہلی تشریف لے گئے۔ اور وہاں بھی انھوں نے قابلیت و ذہانت اور کمال کا سکہ بٹھا دیا۔ اور غایت درجہ کامیابی حاصل کی۔ حق یہ ہے کہ ان کے فیصلے آئندہ نسلوں کے لئے ذہانت، محنت شاقہ اور قابلیت فائقہ کے نمونے ہوں گے۔ آئندہ نسلیں قانونی رپورٹوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی ان تھک محنت۔ فاضلانہ تحقیق، غائر مطالعہ، دلیل آفرینی اور استادانہ قوت بیان کی داد دیں گی۔ اور فخر کریں گی کہ ان کے وطن نے ایسی لائق و فائق ہستی بھی پیدا کی تھی۔

قانونی پیشے کے علاوہ سر سلیمان مرحوم طبیعیات اور ریاضیات میں بھی کمال رکھتے تھے۔ آپ کی طباعی کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ

آپ نے مشہور زمانہ نیوٹن اور آئنسٹائن جیسے ماہرین ریاضی کے نظریوں کے مقابلے میں اپنا ایک الگ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے آپکی دھوم ساری دنیا میں مچ گئی اور دنیا کو معلوم ہوگیا کہ الہ آباد ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نہ صرف عدل و انصاف اور قانون کا ماہر ہے بلکہ سائنس میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا ہے۔ آپ کے نظریہ اضافت نے یورپ اور امریکہ سے حد درجہ خراج تحسین وصول کیا۔ ڈاکٹر شیپلے مشہور ہیئت داں نے ۱۹۳۵ء میں کہا تھا کہ "سر سلیمان کا نظریہ گذشتہ سال کے علم ہیئت کا شاہکار ہے۔" اسی طرح امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ماڈ میکم تسن نے بھی اس نظریہ کی بہت تعریف کی اور پیشنگوئی کی کہ "یہ نظریہ ثابت ہوگیا تو وہ نظام شمسی کے ارتقا کے متعلق موجودہ مقبول عام نظریوں میں انقلاب عظیم بپا کردے گا۔" آپ نے اپنا نظریہ بالکل مکمل کر لیا تھا البتہ وہ مشاہدات کا محتاج تھا۔ آپکو انتظار تھا کہ آپ پورا چاند گرہن دیکھیں اور اس موقع پر اپنے مشاہدات سے اپنے خیالات اور نظریوں کی صداقت آزمائیں۔ افسوس کہ دست اجل نے آپ کو یہ موقع نہ دیا۔

بظاہر ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم مغفور نے اس تمام علم و فضل اور وکالت میں تبحر اور کمال کے باوجود علم قانون یا مسائل قانون کے متعلق کوئی تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی۔ لیکن یہ حیرت بے جا ہے کیونکہ راقم کو بخوبی اور بصحت تمام معلوم ہے کہ جناب مغفور نے علم قانون پر ایک کتاب نہایت محنت اور قابلیت سے تصنیف فرمائی تھی۔ جسکا مسودہ بالکل مکمل ہوچکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے فرزندان سعادتمند اس کتاب کو جلد سے جلد شائع کرکے اہل علم و فضل کے لئے ذہنی تسکین کا سامان فراہم کریں گے۔

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بھی فیڈرل کورٹ کی ججی ہی پر فائز تھے کہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو دہلی ہی میں اجل کی موت پر اس دنیائے ناپائدار سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی۔

تاثرات

قمر مراد آبادی

چند بے ربط خیالات لئے بیٹھا ہوں ٭ اپنے الجھے ہوئے حالات لئے بیٹھا ہوں
دل میں ہنگامۂ جذبات لئے بیٹھا ہوں ٭ شورش ارض و سماوات لئے بیٹھا ہوں
وہ تو مدت ہوئی بیزار وفا ہو بھی چکے ٭ میں ابھی شکوہ شکایات لئے بیٹھا ہوں
تم ہی آئے نہیں اب جان تمنا بن کر ٭ میں تو [illegible] دن رات لئے بیٹھا ہوں
وہ وہاں وقف ادا و تغافل میں قمر
میں یہاں شوق ملاقات لئے بیٹھا ہوں

کانٹے

(میرے شعر)

ہیں یہ آہیں مری جوانی کی ٭ زہر میں ہیں بجھے ہوئے نشتر
ہیں مرے غم کی مختلف شکلیں ٭ یہ مرے دل کے داغ ہیں اظہر

(بیزارگی)

زندگی کی "مسرتیں" — توبہ! ٭ اور دل کو جلائے جاتی ہیں
سوگئیں تھک کے سب تمنائیں ٭ حسرتیں جان کھائے جاتی ہیں

(آرزوئے حیات)

دل کے زخموں سے کھیل لو اظہر ٭ ابھی کچھ اور رات باقی ہے
زندگی ختم ہوچکی — لیکن ٭ آرزوئے حیات باقی ہے

(خلش)

ایک چھوٹا سا ابر کا ٹکڑا ٭ چاند کو اپنی گود میں لیتا
رات کو دیکھ کر خدا جانے؟ ٭ کیوں مرے دل میں درد ہونے لگا؟

(مجبور زندگی)

رونا چاہوں تو رو نہیں سکتا ٭ ایسی حسرت خدا کسی کو نہ دے
اور ہنسنا کہاں مقدر میں ٭ آگ لگ جائے اس جوانی کو

(دیوانگی)

دوڑتا ہوں خیال کے پیچھے ٭ جیسے دیوانہ ہوگیا ہوں میں
ہائے وارفتگی ہیں یوں اب تک ٭ تم کو اپنا سمجھ رہا ہوں میں

(زندگی)

آہ اظہر یہ زندگی میری ٭ ایک ناکامیوں کا دھارا ہے
جی رہا تھا کسی کی حسرت میں ٭ اب خدا جانے کیا سہارا ہے

اظہر رضوی

مشرق وسطیٰ

نکولس رسکن

"مشرق وسطیٰ" کسی قدر نئی اصطلاح ہے۔ لڑائی سے پہلے اس کے معانی متعین نہیں تھے کبھی کبھی یہ لیوانت کے لئے استعمال ہوتی تھی اور کبھی اس سے مراد دردانیال سے لے کر دیوار چین تک کا سارا علاقہ ہوتا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے دوران میں "مشرق وسطیٰ" کی اصطلاح شمالی افریقہ، شام، عراق اور ایران کی تمام لڑائیوں کے سلسلہ میں استعمال ہوئی۔

شمالی افریقہ کی جنگ کو مشرق وسطیٰ کی جنگ اس لئے کہا گیا کہ اس دوران میں اتحادی ہیڈ کوارٹر زیادہ تر قاہرہ رہا۔ ان لڑائیوں کے علاوہ، جو صحیح معنوں میں مشرق وسطیٰ کی لڑائیاں نہیں کہلا سکتیں، جنگ میں مشرق وسطیٰ کو اتنی اہمیت نہیں حاصل ہوئی جتنی کہ محوری خیال کرتے تھے۔ ایک زمانہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ اٹلی، جرمنی اور جاپان کی فوجیں مغرب، شمال اور مشرق سے بڑھ کر کہیں ترکی میں مل جائیں گی لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اگرچہ مشرق وسطیٰ میں کوئی خاص لڑائی نہیں ہوئی تو کم سے کم اس کے ذریعہ دوسرے جنگی کاموں مثلاً روس کو سامان پہنچانے میں بڑی مدد حاصل ہوئی۔ اب جبکہ لڑائی ختم ہو چکی ہے مشرق وسطیٰ کو اور بھی زیادہ سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کیونکہ اس سے امریکہ، برطانیہ، روس اور کسی قدر کم فرانس کے مفاد وابستہ ہیں جن کی وجہ سے ممکن ہے دنیا کے امن کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے۔

اس میں کچھ اختلاف ضرور ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں کون کون سے ممالک شامل ہیں لیکن عام طور پر اب مغرب میں مصر اور لیبیا کی سرحد سے مشرق میں افغانستان اور ایران کی سرحد تک اور شمال میں دردانیال اور روس اور ترکی کی سرحد سے سوڈان اور ایریٹیریا کے بالکل جنوبی حصہ تک کا علاقہ مشرق وسطیٰ کہلاتا ہے۔ اس میں مصر، سوڈان، ایریٹیریا، حبش، سمالی لینڈ، سعودی عرب، خلیج فارس، فلسطین، ماورا النہر، شام، لبنان، عراق اور ایران شامل ہیں۔

بین الاقوامی معاملات میں مشرق وسطیٰ کی اہمیت سب سے زیادہ اس کے محل وقوع کی وجہ سے ہے۔ یہ دنیا بھر کی نقل و حرکت کا مرکز ہے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے درمیان بری، بحری، اور ہوائی راستے یہیں سے گزرتے ہیں۔ روس کے لئے خلیج فارس اور مشرقی بحیرۂ روم کے گرم پانی کے راستوں تک پہنچنے کا ذریعہ بھی مشرق وسطیٰ ہی ہے اور نہر سویز جیسی اہم چیز اس کے تقریباً بیچ میں واقع ہے۔ اس کے بعد یہاں کے قیمتی قدرتی ذرائع کو اہمیت حاصل ہے جن میں تیل اور کپاس شامل ہیں۔ سوم چونکہ یہاں کی آبادی چھ کروڑ سے زیادہ ہے اور زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اس لئے یہاں استعمال اور پیداوار کی چیزوں کی کافی مانگ ہو سکتی ہے۔ ان تینوں باتوں نے مل کر مشرق وسطیٰ کو بڑی طاقتوں کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنا دیا ہے۔

قومیت کا ارتقا

گذشتہ چالیس پچاس برس میں مشرق وسطیٰ کے لوگوں میں قومیت کے جذبات نے بہت ترقی کی ہے۔ یہ جذبہ مختلف صورتوں میں رونما ہوا۔ سماجی انقلاب نے جمہوریت پسندی کے جذبات کو ابھارا۔ لوگوں کے پیش نظر ترکی کا نمونہ تھا۔ کسانوں کی رجعتی تحریک کا مقصد حالات کو بدستور قائم رکھنا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بیرونی مداخلت کے مخالف ہیں (جو اب تک قومیت کا مشترکہ جذبہ رہا ہے)۔ اس کے علاوہ عربوں کی قومی تحریک ہے جو عرب تہذیب کی تجدید کی خواہشمند ہے۔ ان تحریکوں میں عرب قومیت سب سے اہم ہے لیکن یہ ایک لحاظ سے جمہوریت کی منافی ہے۔ یعنی اس کے رہنما عرب ملکوں کے بڑے بڑے جاگیر دار ہیں جو اپنے ملکوں کی اقتصادیات پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ دوسری طرح کی زیادہ سیاسی قومی تحریکیں ایک حد تک اس کی مخالفت کرتی ہیں جو مختلف عرب ملکوں میں رونما ہوئی ہیں۔ اور پھر یہودیوں کی قومیت ہے جو جنگ جویانہ، جمہوریت پسند اور حریص ہے اور عربوں کے اتحاد کا ایک بڑا سبب بھی ثابت ہو چکی ہے۔

یوں تو مغربی طاقتیں اور روس مشرق وسطیٰ میں الگ الگ قومی حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ترکی اور ایک دو اور ملکوں کے علاوہ اس علاقہ کی ریاستیں مختلف وجوہات سے خود اختیاری اور جمہوری حکومتیں قائم کرنے کی قابلیت نہیں رکھتیں۔ صنعت کے لئے ضروری سرمایہ کی کمی ہے۔ جہاں کہیں خود اختیاری حکومت قائم بھی ہوئی ہے وہاں قدیم جاگیرداروں کا طوطی بولتا ہے جو تعلیم، صحت عامہ اور سماجی ترقی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ بھی تجویز ہے کہ اس سارے علاقے کی دیکھ بھال ادارۂ اقوام متحدہ کرے لیکن اس کی عملی صورت اختیار کر لینے کے امکانات بہت کم ہیں کیونکہ برطانیہ غلبہ حاصل کرنے کی بجائے آزادانہ تعلقات قائم کرنے کا متمنی ہے، امریکہ خود اختیاری قومی حکومتیں قائم کرنا چاہتا ہے اور روس کسی بھی قسم کا بین الاقوامی قبضہ رکھنے کا مخالف ہے۔

برطانوی مفاد

یہ بات ظاہر ہے کہ مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ مفاد برطانیہ کا ہے۔ پول ہناؔ نے حال ہی میں ایک مقالہ "عہد حاضرہ کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ "اس علاقہ میں سب سے زیادہ مفاد اور اثر برطانوی شہنشاہیت کا ہے"۔ یہ مصنف مندرجہ ذیل واقعات

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مصر میں مصر اور برطانیہ کے درمیان سنہ ۱۹۳۶ء کے صلحنامہ کے مطابق برطانیہ کو نہر سوئز کا علاقہ، اسکندریہ، ذرائع نقل و حرکت اور خاص ہوائی اڈے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ سوڈان پر مصر اور برطانیہ کا مشترکہ قبضہ ہے جن میں برطانیہ فریق غالب ہے۔ حبش اٹلی کے قبضے سے آزاد ہو گیا ہے لیکن مصر کی طرح یہاں بھی صلحنامہ کے ذریعہ برطانیہ کے مفاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ برطانوی سمالی لینڈ اور عدن برطانیہ کی زیر نگرانی ہیں۔ اس طرح بحیرۂ سرخ کے جنوبی راستہ کی حفاظت ہوتی ہے۔ ایریٹریا اور اطالوی سمالی لینڈ اس وقت تک برطانیہ کے زیر انتظام ہیں جب تک کہ اٹلی کی نوآبادیات کے متعلق فیصلہ نہ ہو جائے۔ بحرین اور کویت کی حکومتیں بھی برطانیہ ہی کے زیر اثر ہیں۔ سعودی عرب کے حکمران ابن سعود کو برطانوی حکومت سے روپیہ ملتا ہے۔ فلسطین اور ماوراء النہر مجلس اقوام کے زیر اثر ہیں اور ان کی نگرانی بھی برطانیہ ہی کرتا ہے۔ کچھ زمانہ پہلے عراق کا بھی یہی حال تھا لیکن وہ اب آزاد ہے لیکن مصر کی طرح اس نے بھی برطانیہ سے ایک صلحنامہ پر دستخط کئے ہوئے ہیں جس سے شاہی ہوائی بیڑے کو ملک میں ہوائی اڈے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ عراق پیٹرولیم کمپنی جسے موصل میں تیل نکالنے کا حق حاصل ہے "ان بین الاقوامی کمپنیوں میں ہے جن میں چوتھائی سے زیادہ سرمایہ برطانیہ کا لگا ہوا ہے۔ موصل سے بحیرۂ روم کی بندرگاہ حیفہ تک کا تیل کا نل اور حیفہ کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ برطانیہ کے قبضہ میں ہیں۔ جنوبی ایران میں عرصۂ دراز سے برطانیہ کا اثر چلا آتا ہے۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی، اور آبادان کا تیل صاف کرنے کا کارخانہ اہل برطانیہ کا ہے۔"

یہ فہرست محنت سے مرتب کی گئی ہے اور دوسروں کے حسد کو ہوا دیتی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ پچھلے پچیس برس سے برطانیہ جبر کی جگہ رضامندی سے پرانے نظام کو بدلنے کی کوشش کر رہا ہے مگر اس پر اس کی صاف گوئی سے بھی زیادہ اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ جس مقالہ نگار کا اقتباس اوپر نقل کیا گیا ہے وہ برطانیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ "یہ اپنے جانوں کو اس امید میں قربان کر رہا ہے کہ اس کی قوت بدستور قائم رہے۔" دوسرے ناقد برطانیہ کو اپنے اثرات کو ختم کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں لیکن وہ یہ بھی ممکن سمجھتے ہیں کہ اگر برطانیہ جتنا نہیں تو کم از کم برطانیہ جیسا اثر قائم کرنے کے لئے دوسرے ملک بھی کوشش کریں گے۔ اگر برطانیہ کا اثر ہٹ جائے تو بہت ممکن ہے کہ مقامی لوگوں کی بجائے دوسرے ملکوں کا اثر بڑھ جائے لیکن سر ہنا اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ جب تک باقاعدہ جد و جہد نہ ہوگی برطانیہ اپنے اثر میں کوئی خاص کمی برداشت نہیں کر سکتا۔"

فرانسیسی مفاد

برطانیہ کے بعد فرانس کا مفاد سب سے اہم ہے جو اب بھی شام اور لبنان پر برائے نام قابض ہے اور جس کا فرانسیسی سمالی لینڈ پر قبضہ ہے۔ فرانسیسی سمالی لینڈ حبش کو جانے کے لئے بہترین راستہ ہے۔ اس کے علاوہ فرانس کا مصر پر بہت گہرا ثقافتی اثر پڑا ہے۔ فرانس کا مشرق وسطیٰ کے تیل میں بھی حصہ ہے کیونکہ یہ اب تک موصل اور بحیرۂ روم کے درمیانی نل کے منتہا طرابلس پر قابض تھا اور عراق پیٹرولیم کمپنی میں اس کا حصہ ہے۔ اب فرانس کی طاقت بہت کم ہو گئی ہے لیکن اسے بھی لبنان کے عیسائیوں کی امداد کی امید ہے۔

روس اور مشرق وسطیٰ

اگرچہ روس کا مشرق وسطیٰ سے فرانس کے مقابلہ میں براہ راست تعلق رہا ہے لیکن اس میں روس کی اہمیت فرانس سے کہیں زیادہ ہے۔ روس اور زیادہ محفوظ رہنے کا خواہشمند ہے اس لئے اسے اپنی جنوبی سرحدوں کا بہت خیال ہے اور پھر اسے مشرقی بحیرۂ روم کے ملکوں اور خلیج فارس میں اثر قائم بھی کرنا ہے۔ جیسا کہ روس بہت دنوں سے کوشش کر رہا ہے۔ روس ترکی پر اثر ڈال رہا ہے تاکہ اردا آہن، قارس اور ارتوین کے صوبوں کی سرحدیں پھر سے متعین ہوں اور منترو کے فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے درمیانی

غزل

شکایت دردِ دل کی تا زبان لائی نہیں جاتی ۔ یہ اک نعمت ہے قدرت کی جو ٹھکرائی نہیں جاتی

بکوشش جذبۂ الفت کبھی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ آتش خود بھڑک اٹھتی ہے بھڑکائی نہیں جاتی

حدیثِ عشق کی تشریح تجھ سے کیا کروں ناصح ۔ سمجھ میں خود تو آجاتی ہے سمجھائی نہیں جاتی

شریکِ دردِ دل کوئی نہیں ناصح ہزاروں ہیں ۔ بھری محفل میں ہوں اس پر بھی تنہائی نہیں جاتی

مری الفت کے منکر دل کی حالت کیا کہوں تجھ سے ۔ حقیقت مادی صورت میں دکھلائی نہیں جاتی

نہ جانے کن حسین ہاتھوں نے رکھی ہے بنا اس کی ۔ یہ دنیا لاکھ بگڑے اس کی رعنائی نہیں جاتی

ازل میں حسن و الفت کا تعارف اے معاذ اللہ! ۔ ہزاروں رنگ گو بدلے شناسائی نہیں جاتی

تجلی کو ازل میں داد کا ایسا پڑا چسکا ۔ کہ اب تک خوئے ذوق جلوہ آرائی نہیں جاتی

وہ گلگشت چمن ہو یا شب مہ کا کوئی منظر ۔ طبیعت جب بگڑتی ہے تو بہلائی نہیں جاتی

اثرؔ میں نے وفا کا ذکر جب ان سے کیا بولے
سنا تو ہے کہ ہوتی ہے مگر پائی نہیں جاتی

اثرؔ رامپوری

راستہ سے متعلق ہے۔ مصر اور عراق میں جو سفارت خانے قائم ہوئے ہیں ان میں روسیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور عربوں سے زیادہ گہرے تعلقات قائم کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ساتھ ہی روس فلسطین، شام اور لبنان میں مشرق کے قدیم عیسائی مذہب کی طرفداری کر رہا ہے۔ اگرچہ روس یہودیت کے خلاف ہے لیکن بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانفرنس میں روسی نمائندوں نے پچھلے سال یہودیوں کے اعلان کے حق میں رائے دی۔ حالانکہ کبھی کبھی یہ اقدامات متضاد نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پھر سے مشرق وسطیٰ اور مشرقی بحیرۂ روم کے ملکوں میں روس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

کچھ زمانہ سے ایران کے ساتھ روس کے تعلقات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ روس کو صلحنامہ کے مطابق ۲ مارچ ۱۹۴۶ء تک ایران سے اپنی فوجیں ہٹا لینی چاہئے تھیں لیکن ظاہر طور پر روس نے آذربائیجان میں انتشار ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آذربائیجان میں ایسے حالات خود روس نے پیدا کرائے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ روس نے دوسری مارچ تک اس لئے فوجیں نہیں ہٹائی تھیں کہ اسے اس تاریخ تک برطانیہ کے فوجیں ہٹا لینے کا یقین نہیں تھا۔ لہٰذا غلط ہو یا صحیح بہرحال روس کو برطانیہ کی طرف سے اندیشہ رہتا ہے اور وہ اپنی حفاظت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس نے اس وقت تک ایران میں فوجیں رکھیں جب تک کہ برطانوی اثر کے مقابلہ میں وہ اپنا اثر قائم نہ کر سکا۔ برطانیہ کا اثر خوزستان کی اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی وجہ سے ہے۔ اب ایک صلحنامہ پر دستخط ہو چکے ہیں جس سے روس کو اطمینان ہو گیا اور روس نے اپنی ساری فوجیں ہٹا لیں۔ مشرق وسطیٰ میں روس کی نئی سرگرمیوں کے متعلق معلومات آئندہ حاصل ہوں گی۔

امریکی مفاد

ابھی مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا مفاد نسبتاً کم ہے لیکن اس کے تیزی سے بڑھنے کی امید ہے۔ پول ہتنا نے امریکی مفاد کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ کا بہت سا روپیہ اور کوششیں مشرق وسطیٰ میں بری، بحری اور خصوصاً ہوائی حمل و نقل کے ذرائع کی تعمیر پر صرف ہوئیں۔ اب امریکہ کی فضائی اور بحری نقل و حمل کی کمپنیاں ان حقوق کی حفاظت کی تمنی ہیں۔ امریکہ نے حکومت برطانیہ سے مشرق وسطیٰ میں فوجوں کو سامان پہنچانے کے مرکز کے سلسلہ میں تعاون کیا اور ایک وسیع اقتصادی منصوبہ پر عمل کیا گیا تاکہ مشرق وسطیٰ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی ضرورت خود پوری کرے۔ پھر جہازوں کی کمی تھی لہٰذا زراعت اور صنعت کو خوب ترقی دی گئی۔ جب سے امریکہ کا خاص نمائندہ جیمز ایم۔ لینڈس اس ملک میں آیا ہے وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی تجارت کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ آجکل امریکہ والے یہ خیال کرتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کا تیل تجارت سے زیادہ نفع بخش ہے نیز امریکا اور سوکونی ویکم کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی عراق پیٹرولیم کمپنی میں چوتھائی کی حصہ دار ہے۔ عراق پیٹرولیم کمپنی کو عراق، قطر اور عمان وغیرہ میں تیل نکالنے کا حق حاصل ہے۔ امریکہ کی ایک اور کمپنی کویت میں تیل نکالنے کے لئے آدھے کی حصہ دار ہے۔ ٹیکساس کمپنی اور اسٹینڈرڈ آف کیلیفورنیا کی عرب اور امریکی آئل کمپنی سعودی عرب کے تیل کے خطہ میں تیل نکالنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ کمپنیاں بحرین کے کنوؤں کی بھی مالک ہیں۔ امریکہ کے مشرق وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات بھی ہیں خاص طور پر پادریوں اور بیروت (شام) اور قاہرہ (مصر) کی امریکی یونیورسٹیوں کے ذریعہ۔ اس کے علاوہ امریکہ میں یہودیوں کی کافی آبادی ہونے کی وجہ سے بھی امریکیوں کو فلسطین اور وہاں کے یہودیوں سے دلچسپی ہے۔

شہنشاہیت قدیم اور جدید

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چار بڑی طاقتوں میں سے کم سے کم تین کو مشرق وسطیٰ کی اقتصادیات اور سیاسیات میں بہت دلچسپی ہے اور روس اور امریکہ کو تو اپنے اثرات میں اضافہ کرنے کی خواہش ہے۔ ان دونوں کے خیال سے برطانیہ کا موجودہ رویہ صحیح نہیں ہے۔ اگر برطانیہ حقیقتاً اپنے مفاد کی حفاظت کی حکمت عملی کی جگہ شرق اردن جیسے رضاکارانہ معاہدوں کی حکمت عملی اختیار کرے تو اس پر شہنشاہیت کے جو اعتراضات عرصہ دراز سے کئے جا رہے ہیں بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ گذشتہ سالوں کی برطانوی حکمت عملی پر مختلف طرح کے اعتراضات کئے جا سکتے تھے لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ مشرق وسطیٰ برطانیہ کے مقابلہ میں روس اور امریکہ سے معاہدہ کرنا زیادہ پسند کرے گا۔ برطانیہ کی مصر اور ہندوستان سے گفت و شنید اور عراق اور ماوراء النہر سے موجودہ صلحناموں پر روس اور ایک حد تک امریکہ کے اعتراضات نہایت دلچسپ ہیں۔ ان کی بنیاد یہ ہے کہ برطانیہ آزاد معاہدوں کے متعلق جو کچھ کہتا ہے ان معترضوں کو اس کی صداقت اور خلوص پر اعتماد نہیں ہے لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نئے شہنشاہیت پرست برطانیہ کی آزاد معاہدوں کی حکمت عملی کو غلط نہیں بتاتے بلکہ انھیں یہ خطرہ ہے کہ برطانیہ کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ برطانیہ کی یہ نئی حکمت عملی ان ملکوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی جو برطانیہ کا مشرق وسطیٰ پر اثر کم ہونے سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک نئی بات

ایک نئی بات مشرق وسطیٰ پر بے حد اثر انداز ہوگی اور وہ ہے ہندوستان کا ایک آزاد اور بڑی طاقت بننا۔ فی الحال مشرق وسطیٰ والوں کو ہندوستان کے متعلق بہت کم

معلومات حاصل ہیں۔ انھیں یہ پتہ نہیں ہے کہ اگرچہ ہندوستانی قوم بہت اپنے ملک کو اجنبی ہاتھوں کا برباد کیا ہوا بتاتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ مشرق وسطیٰ کے ہر ملک سے آگے ہیں۔ مانا کہ ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد مایوس کن ہے لیکن پھر بھی مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ آزاد اور ترقی پسند ہندوستان کے لاکھوں بلکہ کروڑوں سپوت دنیا کے دوسرے ملکوں سے اشتراک عمل کر کے مشرق وسطیٰ کی سیاسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیں گے۔ اسی لئے جب روس کو یہ احساس ہوا کہ برطانیہ کا وزارتی مشن ہندوستان پہنچ گیا ہے اور یہ کہ ہندوستان کے قوم پرست برطانیہ کی نیت اور خلوص سے مطمئن ہیں اور ممکن ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ میں بہتر تعلقات قائم ہو جائیں تو وہ بہت مایوس ہوا کسی شخص مسٹر دیا خوتف نے "نیو ٹائمز" میں لکھا ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان میں کسی قسم کی مفاہمت کا امکان نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس کی ہندوستان کے متعلق معلومات کی قلعی کھلتی ہے بلکہ ذہنی پریشانی کا بھی راز افشا ہوتا ہے۔ مگر روس کا یہ ردعمل محض وقتی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات سے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے تو وہ معاہدہ کی مخالفت نہیں کرے گا۔ لیکن اس کا یقین آہستہ آہستہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ساری دنیا کو صبر اور استقلال سے کام لینا چاہیئے۔

دنیا کے کسی حصہ میں بین الاقوامی تعاون اتنا ضروری اور دشوار نہیں ہے جتنا کہ مشرق وسطیٰ میں۔ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ساری متعلقہ بڑی طاقتوں کا نقطۂ نظر مغربی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا اثر گہرا اور مفید ثابت ہوگا۔ ہندوستان لازمی طور پر اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے گا۔ اسے مشرق وسطیٰ کی ثقافت اور مقاصد سے بھی ہمدردی ہے اور یہ ہمدردی قائم رہے گی۔ اس ہمدردی کی بدولت نئی اور پرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو کر ایک ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس میں ہر ملک آزادی اور رضامندی سے شریک ہو کر ترقی کے راستہ پر گامزن ہوگا۔

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

ادارہ

غزل

اب اسکا ہے فیصلہ تمہیں پر کہو تم اس کو نظر کا دھوکہ
تمہاری جلوہ نمائی پر ہے طلوعِ شمس و قمر کا دھوکہ

یہ کائنات مسرت و غم تمام علم و خبر کا دھوکہ
فغانِ پیہم فریبِ تسکیں دعائے شب ہے اثر کا دھوکہ

یہ رنگ و بو کا نگار خانہ نگاہِ حسرت نگر کا دھوکہ
ہر ایک رنگِ مجاز میں ہے حقیقتِ منتظر کا دھوکہ

رہِ طلب میں گذر گیا ہوں میں درد و درماں کی منزلوں سے
مگر میرے چارہ گر کو اب تک وہی ہے دردِ جگر کا دھوکہ

یہی ہے تکمیل رازِ ہستی یہی ہے معراج رہ نوردی
بہ ہر نفس احتمالِ منزل بہ ہر قدم رہگذر کا دھوکہ

نہ پوچھ اے ہمنشیں یہ مجھ سے طلسمِ ہستی کا راز کیا ہے
فروغِ خورشید و ماہ و انجم یہ سب کا سب ہیں نظر کا دھوکہ

یہ زندگی بھی ہے اک قیامت بہ ہر نفس انقلاب تازہ
وجود میں ہے عدم کا پرتو قیام میں ہے سفر کا دھوکہ

تمہاری زلفِ سیاہ کیا ہے نمودِ شب کی حسیں تجلی
تمہارا روئے جمیل کیا ہے فقط جمالِ سحر کا دھوکہ

ادھر ہے پردہ ادھر ہے جلوہ نگاہ حیران و مضطرب ہے
حقیقت اب کھلا ہے ہم پر کمالِ فکر و نظر کا دھوکہ

ادھر تو صیاد تاک میں ہے ادھر یہ گلچیں کی فتنہ خیزی
میرے نشیمن کے چند تنکوں پہ ہے انھیں بال و پر کا دھوکہ

متاعِ تسکین جاودانی بس اک نگاہِ کرم تھی ان کی
بہت ہی محدود و مختصر تھا نوازشِ مختصر کا دھوکہ

یقیں ہے عہد وفا کا تیرے میں واقعی بدگماں نہیں ہوں
مگر یہ تیری سشر پر نظریں مگر یہ لفظ مگر کا دھوکہ

میں آج قصداً کسی سے ایفائے عہد باطل کا منتظر ہوں
میں آج دانستہ کھا رہا ہوں حیاتِ نامعتبر کا دھوکہ

ابھی تو تاروں میں روشنی ہے ابھی سے کیوں محو تیرگی ہے
ابھی تو آغازِ شب ہے کوثر ابھی سے پچھلے پہر کا دھوکہ

کوثر القادری

ناکردہ گناہ

افسانہ

علی عباس حسینی

لڑکیوں نے منور کو بری طرح گھیرا تھا۔ جیسے انھوں نے سازش کی تھی کہ آج اس ٹینی کے پر بالکل نوچ ہی کے چھوڑیں گی۔ وہ ہمیشہ ان کے راستے سے کترا کے چلا۔ درجہ میں سدا ان سے دور ہی بیٹھا مگر آج شامت کا مارا گردن جھکائے، خیالی پلاؤ لیکاتا وہ چلا آرہا تھا کہ دفعتہً پریوں کا پورا پرا حلقہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مرغ تو گرفتار کی طرح ان پر خوفزدہ نظر ڈالی۔

رشیدہ گرگرو کے بولی: "اللہ منور صاحب، ہم غریبوں سے کبھی تو دوگال ہنس بول لیا کیجئے!"

فیروزہ نے ہاتھ چمکا کر کہا:

"تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو، مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟"

منور نے رومال جیب سے نکال کر سمیٹتے ہوئے ہاتھ پونچھے۔ اس کی زبان پر سوائے "جی! جی! "کے کچھ نہ نکلا۔

جمیلہ عطر بیز ہوئیں: "ہم اپنی یونیورسٹی کے راجہ اندر سے پوچھنے آئے ہیں کہ ان کی باندیوں سے کیا قصور سرزد ہوا ہے....."

رشیدہ نے بڑی لمبی سانس لی: "بہن میں نے تو آج تک اس شکل صورت، اس قد و قامت کا جوان نہیں دیکھا....."

فیروزہ نے منور کے سر سے ایک فٹ بلندی پر اس طرح نظر جمائی جیسے وہ سچ مچ چھ فٹ ہی کا تو ہے "ہاں بہن اس نگوڑے ملک میں جسے دیکھو سوا بالشت کا ہے، اب جو یہ ماشاء اللہ ذرا بلند و بالا قد و قامت کے ہوئے..."

منور نے زبان ہونٹوں پر پھیر کے کہا: "آخر... آخر.. آپ.. ب... لوگوں کا مط.. مطلب کیا ہے؟"

انور چہک کے بولی: "اے ہے بہن دیکھو تو کیسی شیریں زبان ہے اللہ اللہ کیا طلاقت ہے، کیا روانی ہے!....."

شیلا نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا "چہ! چہ! چہ! اب اگر یہ ذرا ہکلاتے ہیں، تو اس میں ان غریب کا کیا قصور....."

انور جھٹ گل ریز ہوئی: "قصور کی بھی ایک ہی کہی۔ یہی تو ان کا سب سے بڑا حسن ہے۔ سچ مانئے منور صاحب! مجھے آپ کا ہکلانا اتنا ہی پسند ہے جتنا کہ حضرت موسیٰ کا ہکلانا اللہ میاں کو پسند تھا!....."

اور منور بھاگا۔ بے تحاشا بھاگا۔ تیز تیز قدم رکھتا، اٹھارہ سال کا نوجوان بری طرح ہانپتا، خشک سسکیاں لیتا۔ گھر لپٹا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، اس نے کتابیں میز پر پھینک دیں، اس نے شیروانی اور ٹوپی کرسی پر ڈال دی۔ اس نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ نقرئی قہقہوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ لب شکر سے رنگین ہونٹوں کی کمانیں اب بھی کھنچ رہی تھیں، بازوؤں پر بل کھاتی ہوئی لٹیں اب بھی منور کے حلق کا پھندا بن رہی تھیں۔ "یونیورسٹی کے راجہ اندر" نے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ لیا.....

سینما ہال میں اندھیرا ہو گیا، ہمایوں نے تاریخ کو جھٹلانے کے لئے بابر کی زندگی ہی میں حمیدہ سے عشق شروع کر دیا۔ اس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی۔ اس نے معمولی آدمی بن کر حمیدہ سے بے باکی کی، اور وہ شہزادہ بنکر قابل معافی بھی ٹھہرا۔ منور کی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک حمیدہ کے دل میں ہمایوں کی لیکار اٹھی۔ اسکا ہاتھ خود بخود منور کے زانو پر اس طرح آ گرا جس طرح گلاب کی پنکھڑی گلے کے ہار سے ٹوٹ کے حلقے کھاتی گود میں آ پڑتی ہے۔ منور نے اسے اپنی مٹھی میں اسی طرح بند کر لیا جس طرح بچے ناچتی ہوئی تتلی پکڑ لیتے ہیں۔ ایک برقی رو رگوں میں دوڑ گئی۔ ایک معطر جسم قریب تر کھسک آیا۔ کندھے سے کندھا، زانو سے زانو مل گیا۔ منور نے کان میں کچھ کہا۔ سرگوشی اور مسکراہٹ میں جواب ملا۔ انگلیوں میں انگلیاں کھنچتی رہیں، گرم گرم سانسیں نکلتی رہیں، تماشا ہوتا رہا۔ بابر نے محل ہی جان صدقہ کر دی، ہمایوں اور حمیدہ کا عشق جاری رہا....."

کمرہ میں پلنگ کے پائینتی دیوار پر قد آدم آئینہ نصب تھا۔ چہرہ نظر پڑا۔ سوکھا، لموترا، فاقہ زدہ سا۔ "اس شکل صورت کا جوان"

"جھٹ پٹا وقت ہے۔ دن کے نورانی چہرے کو رات نے اپنی زلف شکیں سے چھپانا شروع کر دیا ہے۔ چڑیاں شفق کے رنگین دامن میں اڑتی اپنے گھونسلوں کی گود میں جا رہی ہیں۔ منور اپنی نئی "بیوک" ڈرائیو کرتا ہوا نکلا ہے۔ آج اس نے حیدر آباد کی سلی ہوئی ہیرو کی نئی شیروانی پہن رکھی ہے۔ اسے خود محسوس ہو رہا ہے کہ وہ حسین ہے، جوان ہے، دولتمند ہے، لیکن اس کے دل میں مسرت و طمانیت کے جذبات سے ملی جلی ہوئی ایک بے اطمینانی بھی ہے۔ اس کے ان آثار دولت و شباب سے کوئی لطف اندوز ہونے والا کوئی نہیں! ایسی شریک نہیں جو چند پیسوں میں خریدا جا سکے وہ بھی نہیں جو دو میٹھے بولوں سے بہلایا جا سکے بلکہ وہ جسکی خوشی ہی رونے کو پیش کش بنا تا ہو، وہ جو قربانی کو تحفہ و ہدیہ سمجھے، وہ جو ہوا میں ناچتے ہوئے زردوں کی طرح ملے، ایک لمحہ کے لئے بغلگیر ہو کر رقص کرے اور پھر فضا کے وسیع دامن میں اس طرح غائب ہو جائے کہ نہ تو اس اضطراری قرار کے بعد پھر ملنے کی تمنا ہو، نہ خواہش، نہ جستجو۔ نہ تباہی کا ڈر، نہ رسوائی کا خطرہ، اور نہ بعد کی ذمہ داریاں۔ منور اس سے ملے، بالکل اسی طرح جیسے دو مغنیوں کی آوازیں مل کر کچھ دیر کے لئے ایک لے، ایک سر، ایک تان بنتی ہیں۔ پھر الگ ہو کر دو مختلف

ہیں۔ وہ چنگاری اور لکڑی کی طرح ملکر آگ لگائیں اور شعلہ جوالہ بنکر الگ ہوجائیں وہ دوساتھ ٹوٹتے ہوئے شہاب ثاقب بن کر اپنے دلوں کو پُرنور بنائیں اور پھر نظروں سے غائب ہوجائیں۔ انکی اتحادی چمک جگنو کی چمک ہو، وقتی، غیر پائندہ، اکیا بیتابی!—

منور نے اپنا موٹر شہر سے باہر موڑ دیا ہے۔ مضافات سے نکلتے ہی اسے گرانڈ ٹرنک روڈ مل گئی ہے۔ آم، املی، برگد، پیپل کے سایہ میں پروان چڑھتی ہوئی، بیوہ کی مانگ کی طرح سپید، دودھ کی دھلی— موٹر فاصلہ کو پھانکتا چلا جا رہا ہے۔ وہ خود سیٹی بجا رہا ہے۔ اسلئے نہیں کہ وہ مگن ہے بلکہ اس لئے کہ سیٹیاں اکثر بلانے میں دعوت نامہ کا کام دیتی ہیں— دفعتہً بیچ سڑک پر ایک ارغوانی گاؤن میں ملبوس ایک مغربی دوشیزہ ریشمی رومال ہلاتی کھڑی دکھائی دیتی ہے— خواب کی تعبیر مل گئی! جاودانی وابدی لمحہ عشرت! ایک غیر فانی مستقل بھینی بھینی خوشبو......"

لحاف چہرے سے ہٹا کان بجنے لگے "اب ہویا ما شاء اللہ ذرا بلند وبالا قد وقامت کے ہوگے"

تم ہنسنے پردہ ڈالدیا....

"لکھنؤ میں دنگل ہے، ساری دنیا کے پہلوان سمٹ کر آگئے ہیں۔ ہر ایک ہیل دماں، ہر ایک رستم زماں، چلتا زمین ہلتی، قدم رکھتا بوجھ نہ اٹھا سکتی۔ لوگ جوق جوق انکی کشتیاں دیکھنے آئے ہیں۔ منور بھی ایک کونے میں بیٹھا ہے کبھی زبسکو کے تن و توش پر ہنسی آتی ہے، کبھی کریبر کی اکڑ پر کبھی تعجب سے گاما کو دیکھتا ہے، کبھی غلام حسین کو، کبھی ہربنس سنگھ کو۔ کشتی شروع ہوئی چھوٹے پٹھے لڑ رہے ہیں۔ ان چھوٹی جوڑوں میں مزہ نہیں آرہا ہے۔ بارے کریبر کی باری آئی۔ مقابل چنگیز ہے۔ دیو کا دیو۔ اکھاڑے میں آتا بھی ہے تو چنگھاڑتا ہوا ہندوستانی سمجھ رہے ہیں کہ اب جرمن کی شامت آئی۔ یہ دیو ایسے ہتھی ہیں جیسے شکر منہ کا نوالہ بنا ڈالے گا۔ مگر ہاتھ ملاتے ہی معاملہ درگرگوں ہوگیا۔ کریبر کی بغل میں چنگیز کی گردن اس طرح دبی تھی جس طرح بلی کے منہ میں مرغی کی گردن، اور ہندوستانی پہلوان پھڑپھڑاتا کمان کی طرح دہرا ہوتا ہوا زمین سے مل گیا۔ پچاس ہزار ہندوستانیوں کا مجمع شرم سے عرق عرق ہوگیا۔

جرمن نے للکارا "کوئی ہندوستانی پہلوان آئے، ہما خود آئے، ہمیں پچھاڑ دے ہم دس ہزار کی چک دیگا!" سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے گاما کے بھائی بھتیجے کسمسائے مگر گاما نے انہیں آنکھوں کے اشارہ سے روک دیا۔ پہلوانوں کی قطار پر نظر حقارت ڈالکر جرمن پھر بولا! "ہم گاما سے کشتی مانگتا ہے، ابھی، یہیں!"

منور کتاب ضبط نہ رہی۔ وہ ملکی توہین برداشت نہ کرسکا۔ اچکتا پھاندتا، اچکن کے بٹن کھولتا اکھاڑے کے پاس پہنچ گیا سب لوگ استعجاب سے دیکھ رہے "اس نوجوان کو کیا ہوا ہے" اس نے جرمن کریبر سے کہا! "میں تم سے لڑوں گا" وہ ہنسا: "ہم بچوں سے نہیں لڑتا" منور نے امپیریل بنک کی چک بک نکالی۔ دس ہزار کی چک لکھ کے اکھاڑے کی مینڈھ پر رکھدی۔ "اگر مجھے چت کردو تو یہ دس ہزار تمہارے" جرمن اتنی بڑی رقم دیکھکر تیار ہوگیا۔ لوگوں نے کہا "بیٹا کرتا پاجامہ تو اتار ڈالیے، چٹ لنگوٹ باندھ لیجئے" منور نے کہا: "اس جرمن سے لڑنے میں میرے کپڑے مٹی میں نہ بھرینگے!" اکھاڑے میں اسطرح اترا جیسے گلگشت چمن کو جا رہا ہے۔ جرمن گھبرا گیا۔ سوئی سل سے لڑنے آئی ہے کوئی بھید ضرور ہے ہندوستانی جادو کا کوئی لٹکا یقینی ہے۔ حمل کرتا ہوا ذرا آنکھیں پیدا کرکے ہر طرف کے وار کو دیکھتا رہے۔ منور نے زیادہ غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہاتھ ملاتے ہی اکھیڑ ماری اور جرمن کو گہوارہ کی طرح زمین پر چت پھینکا۔ سراسیمہ جرمن کے سینے پر پاؤں رکھکر وہ بولا "اب پھر ہندوستانیوں کو اس طرح نہ للکارنا!"— شیروانی پہنکر جب وہ اپنی چک بک جیب میں ڈال کر چلا تو کھانے

غزل

بلقیس اکبرآبادی

کسقدر حسن نظر ہے ترے دیوانوں میں
کلیاں دامن کی سجائی ہیں گریبانوں میں

حسن کو کھینچ کے لے آئی محبت کی کشش
آکے خود شمع کو جلنا پڑا پروانوں میں

کیا خبر ہم کو حرم کیا ہے کلیسا کیا ہے
زندگی ہم نے گذاری انہیں میخانوں میں

ہم نے دیکھی ہے تری مست جوانی کی ادا
ہلتے پھولوں میں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

پھول کھلتا ہے جو کوئی تو خیال آتا ہے
یہ بھی شاید ہے ترے چاک گریبانوں میں

دل ناکام کے اجڑے ہوئے گیسو توبہ
ایک محفل بھی تھی شاید انہیں دیوانوں میں

ہمکو بلقیس تکلف کی ضرورت کیا ہے
پی لیا کرتے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں میں

لپک کر اسے کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا: "میں نے دنیا بھر کے پہلوانوں کو زیر کیا، مگر اتنی صفائی، اتنی پھرتی، میں بھی آج تک نہ دکھا سکا!......"

پھر وہی بے بسی، وہی دم گھٹنے والی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ وہی موجوں کے تھپیڑوں سے سانس رک جانے والا احساس۔ "باندیوں سے قصور" سرزد ہونے والا فقرہ دماغ میں گونجنے لگا۔ اس نے کروٹ لی، لب بند، مٹھیاں بند، آنکھیں بند!......

"کل ہند کرکٹ ٹیم سے اور آسٹریلیا والوں سے میچ ہے۔ آسٹریلیا والے پہلے "بیٹنگ" کر چکے ہیں۔ ہندوستانیوں کی بولنگ اچھی خاصی رہی ہے۔ آسٹریلیا والوں نے چار سو رن کئے۔ اب ہندوستانیوں کے کھیلنے کی باری ہے۔ ہندوستانیوں کو بڑا ڈر ہے کہ اب کے ضرور ہاریں گے۔ ابتدا بھی کچھ اچھی نہیں ہوتی۔ بارھویں رن پر ایک لڑکا آؤٹ ہو گیا۔ اب منور جاتا ہے۔ اس نے پہنچتے ہی وہ رنگ جمایا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس نے وہ وہ ہاتھ نکالے کہ بار بار تحسین و آفریں کے نعروں اور تعریفی تالیوں سے میدان گونج اٹھا۔ اس نے اکیلے تین سو بہتر رن کئے اور ایک بھی مشکوک ہاتھ نہ مارا۔ اس نے پچپن باؤنڈریاں لگائیں اور دس چھکے جھاڑے۔ جب وہ بغیر آؤٹ ہوئے شام کو میدان سے پلٹا تو ہندوستانی ٹیم کے کپتان مرچنٹ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور آسٹریلیا کے کپتان ہیسٹ نے کہا: "آج تم نے بریڈمین کو بھی مات کر دیا"

کھیل سے زیادہ اس کی انگلیاں کالج کی لڑکیوں کی ڈائریوں اور نوٹ بکوں پر دستخط کرتے کرتے دکھ گئیں۔ اور آسی، وہی جو کسی ہندوستانی لڑکے سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی، آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ اسے زبردستی موٹر میں بٹھا کر گھر لے گئی۔ وہ بڑے پیار سے بولی: "تم تھک گئے ہوگے، گرم پانی سے نہا لو"

وہ منور کو اپنے سونے کے کمرے میں سے ہو کر حمام میں لے گئی۔ اس نے سنگ مرمر کے بڑے ٹب میں گرم پانی کا نل کھول دیا۔ منور اس عجیب طرح کی گرفتاری پر گھبرایا کیا اور کھڑا رہا۔ آسی نے ہنس کر اسے کرسی پر بٹھایا اور خود جھک کر اس کے جوتے کے فیتے کھولنے لگی۔ منور نے روکتے ہوئے کہا: "ارے یہ کیا کر رہی ہو؟"
وہ اپنی لٹوں کو چہرے سے ہٹاتی ہوئی بولی: "میں ایک حمامی کی طرح تمہیں آج اپنے ہاتھوں سے نہلاؤں گی، میرے دیوتا!"......

منور نے آنکھیں کھول دیں، پھر وہی ہنستے ہوئے چہرے، وہی اشارہ کرتی ہوئی آنکھیں، وہی زہر اگلتے ہوئے شیریں لب! "کیسی شیریں زبان ہے اللہ، اللہ کیا طلاقت ہے، کیا روانی ہے!"......

یونیورسٹی میں تقریر کا مقابلہ ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے طلباء آئے ہیں۔ ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ، بنارس، الہ آباد، آگرہ، علی گڑھ، دلی، لاہور، بمبئی، ناگپور، حیدر آباد، مدراس۔ سب جگہ کے بولنے والے بلائے گئے ہیں۔ دنیا کے مشہور مقرر، چرچل، بیون، لاسکی، اسٹالن، مالٹو، ٹرومین، مادام شنکائی شیک، مسز پنڈت، سروجنی نائیڈو، گاندھی، پٹیل، راجگوپال آچاریہ، سری نواس شاستری، سرت چندر بوس، مسانی، پنتھ، جناح، کچلو، ذاکر حسین، آزاد، ہادی حسن، غلام السیدین، کلب عباس سب ہی موجود تھے۔ ریزولیوشن ہے "اس ایوان کی رائے میں سائنس کی جدید ایجادات دشمن انسانیت ہیں"

منور اس ریزولیوشن کی تحریک کرنے کھڑا ہوا۔ چند ہی منٹ کی تقریر میں اس نے مجمع کو مسحور کر دیا۔ لوگ جھومتے تھے، تالیاں بجاتے تھے، ہنستے تھے۔ رنجتے تھے، غصہ سے بوٹیاں نوچتے تھے، ہوا سے لڑتے، آگ میں پھاندنے کے لئے تیار تھے۔ معلوم ہوا فیاض خاں کے خیال کے بعد مایا بنرجی نے ایک فلمی گانا گایا۔ اسی کی یہ گت نہ بنی بلکہ ایک ایک کرکے سب بولے۔ چھوٹے بڑے۔ ملکی غیر ملکی۔ مگر سب کی تقریر اس کے آگے بالکل ویسی ہی تھی جیسے کہکشاں کے سامنے پھلجھڑی! منور نے آخر میں جوابی تقریر کی۔ تمام اعتراضوں کے مسکت جواب، اس البیلے انداز، اس اچھوتے ڈھنگ سے پیش کئے کہ شک نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا۔ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی، اور مخالفت موافقت بن گئی۔ لڑکوں نے نعرے لگائے۔ لڑکیوں نے ہار برسائے۔ لیڈروں نے تعریفیں کیں۔ شاستری نے کہا: "مجھے اس نوجوان کے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے!" آزاد نے کہا: "میرے بعد کانگریس کی صدارت اسی کو ملنا چاہیئے" جناح بولے: "میرے پاکستان کا پہلا صدر اعظم یہی ہوگا!" گاندھی نے کہا: "اس کی زبان میں میرے برت سے زیادہ زور ہے" چرچل نے کہا: "اگر میری جگہ یہ نوجوان برطانیہ کا وزیر اعظم ہوتا تو جنگ عظیم چٹکیوں میں ختم کر دیتا اور باتوں باتوں میں ہٹلر کا قلع قمع کر دیتا" اسٹالن نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا: "اس کی باتوں میں اسٹیلن گراڈ سے زیادہ استحکام ہے" ٹرومین عینک سیدھی کرکے بولے: "اس کی زبان میں ایٹم بم سے زیادہ زور ہے!"......

اس نے شان سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شیروانی اور ٹوپی کرسی پر، کتابیں کاپیاں میز پر بے ترتیب پڑی تھیں۔ دیکھتے ہی پھر گھبراہٹ عود کر آئی۔ فیروزہ نے کس طرح شعر پڑھا تھا ؎

تم جاؤ تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ٭ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

"شکیلہ کو اپنی حاضر جوابی اور شعر خوانی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ نہ جانے کتنے دیوان حفظ تھے اس کو، اس پر آواز بھی غضب کی پائی تھی۔ گانے کے فن سے بھی واقف تھی۔ خود بھی اچھا خاصا کہہ لیتی تھی۔ اسی لئے تو کہتی "اگر کوئی مجھ سے اچھے اشعار برمحل پڑھ کر سنائے تو میں اس کی عمر بھر کے لئے کنیز بن جاؤں گی:"

ایک دن لڑکیوں نے زبردستی اسکا منور سے مقابلہ کرادیا۔ کئی گھنٹے دونوں شعر پڑھا کئے۔ منور پہلے تو شعر کے جواب میں شعر پڑھتا رہا، پھر اس نے پورے پورے قصیدے، مثنویوں کے پورے پورے باب سنانا شروع کردئیے۔ شکیلہ سمجھ گئی یہ بھوت اس کے قابو کا نہیں۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں منور سے کہا: "میں ہار گئی میں تمہاری کنیز ہوں۔ لیکن ہم جنسوں میں ذلیل نہ کرو!" منور اسکا پیغام سمجھ گیا۔ اس نے ایک عجیب طرح کا مدہوش کن سرور محسوس کیا۔ اس نے اپنے دل کو قابو میں لانے کے لئے گلے کا بٹن کھولنا چاہا وہ نہ جانے کیوں الجھ گیا اور منور کے جھٹکا دینے پر ٹوٹ کر الگ جا گرا۔

شکیلہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سراج دکنی کا شعر پڑھ دیا۔

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے وہ لباس برہنگی
کہ جنوں کی جامہ دری رہی، نہ خرد کی بخیہ گری رہی!

منور یہ کہتا اٹھ آیا کہ اگر اس شعر کے بعد ٹکوں گا تو کپڑے پھاڑ ڈالنے پڑینگے" ۔۔ اسی شب میں جب وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹا تو تھوڑی دیر بعد شکیلہ آئی شب خوابی کے کپڑے پہنے، لیٹیں چھٹکائے، چہرہ گلنار کئے، جام بدست مے بجام! منور نے کنکھیوں سے دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اور قریب آئی خراماں خراماں، گل بکھیرتی، فضا کو معطر کرتی! اپنی مسکراہٹوں سے ہر چیز کو جگاتی۔ وہ آہستہ سے اس کے سرہانے جھک کر جھکی۔ اس نے گدگدانے والی آواز میں پوچھا: "کہ اے عاشق شوریدۂ من خوابست ہست؟"

ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا "منور! منور!"

اس نے لحاف ہٹا کر جواب دیا "کیا ہے امی؟"

"ارے تو یہاں لحاف میں منہ لپیٹے کمرہ بند کئے پڑا ہے، وہاں تیری بہن نے آج کالج کی ساری لڑکیوں کو چائے پر بلا رکھا ہے۔ وہاں چل، سب تیرا انتظار کررہی ہیں" ماں نادری حکم سنا کر چلی گئی۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ منور اٹھکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مٹھیاں کس لیں، دانت بھینچ لئے، سر اونچا کیا اور سینہ تان کر دروازے کی طرف اسی شان، اسی تمکنت اور اسی خودداری کے ساتھ چلا جو دار پر چڑھتے وقت چارلس اول نے دکھائی تھی۔ اس نے بڑی بے پروائی سے دروازہ کھولا ۔۔۔ نقرئی قہقہوں کے ساتھ جانی پہچانی آواز میں کوئی کہہ رہا تھا: "وہ بھاگے بے تحاشا بھاگے!"
۔۔۔ منور نے جلدی سے دروازہ بند کرلیا وہ کیواڑوں کے سہارے کھڑا ہو کر جھلانے چراغ کی لو کی طرح کانپنے لگا!

نوٹ:۔ خط و کتابت کرتے وقت حوالہ نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔ (ادارہ)

آسٹریلیا کی اونی صنعت

ڈبلیو پی گرڈون

آسٹریلیا میں تقریباً دس کروڑ پچاس لاکھ بھیڑیں ہیں۔ یعنی دنیا کی کل بھیڑوں کا چھٹا حصہ۔ ان کا اون دنیا بھر کے اون کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس عمدہ باریک اون میں سے جو ملینا بننے کے کام آتا ہے نصف آسٹریلیا میں پیدا ہوتا ہے۔ گوشت کی فراہمی کے اعتبار سے بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہر سال ایک ارب پونڈ اون کی پیداوار سے تقریباً اسی کروڑ تیس لاکھ روپے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ آسٹریلیا کی برآمدی تجارت کا تیس فیصدی حصہ ہے۔ زمانۂ جنگ میں آسٹریلیا میں اون کی پیداوار کا ریکارڈ سب سے زیادہ بڑھا رہا۔ تقریباً اسی فیصدی کی زیادتی رہی اور یہ صورت بھی اس وقت رہی جبکہ مسلسل شدید آندھیوں کے باعث بھیڑوں کی تعداد بقدر ڈیڑھ کروڑ کم ہو گئی۔ اور اس سلسلے میں کام کرنے والے مزدور بھی ناپید رہے۔ زمانۂ جنگ کی پانچ فصلوں پر حکومت برطانیہ نے ۱،۷۸،۰۲،۴۴ گانٹھیں خریدیں جن کی قیمت ۔۔۔۔۔۔،۶۵،۰۶،۳ روپے ہوئی۔

جنگ کے دوران میں ملک کے اون والے کارخانوں نے کپڑے کے تھان اور کمبل اس قدر زیادہ تیار کئے کہ وہ دس لاکھ امریکی، برطانوی اور آسٹریلوی سپاہیوں کے کام آ سکے۔ بھیڑ کی کھال سے بنی ہوئی ہزاروں گریاں روسی اور برطانوی سپاہیوں کیلئے فراہم کی گئیں۔ جنگ شروع ہونے کے بعد سے ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء تک بھیڑ اور بکری کا سوکھا ہوا گوشت جو آسٹریلیا سے بھیجا گیا تیراسی کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔ اور ۳۰ جون سنہ ۱۹۴۶ء تک ایک ارب اٹھارہ کروڑ چھپن لاکھ اٹھتر ہزار پونڈ۔

آسٹریلیا میں بھیڑوں کی پرورش کا علاقہ جنوب میں تسمانیا سے شمالی وکٹوریہ اور جنوب مشرقی نیو ساؤتھ ویلز کے پہاڑی خطوں سے ہوتا ہوا اور پھر مغربی نیو ساتھ ویلز کے میدانوں سے ہوتا ہوا کوئنز لینڈ تک پھیلا ہوا ہے۔ جنوبی آسٹریلیا میں اور بہت کچھ مغربی آسٹریلیا میں بھی بھیڑوں کی پرورش کی چراگاہیں موجود ہیں۔ نصف سے کچھ کم بھیڑیں نیو ساؤتھ ویلز میں پلی ہوئی ہیں۔

زیادہ گلے ایسے ہیں جن میں پانسو سے ایک ہزار تک بھیڑیں ہیں۔ ایسے گلوں کی تعداد ڈھائی سے پانچ سو تک ہے۔ اعداد و شمار لینے کے پچھلے موقعہ پر معلوم ہوا کہ اڑتیس گلے ایسے ہیں جن میں پچاس ہزار سے زیادہ اور بعض میں ایک لاکھ سے بھی زیادہ بھیڑیں ہیں۔ بھیڑوں کی ایسی بعض آبادیاں ایک ہزار اور پانچ ہزار ایکڑ کے درمیان جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ بھیڑوں کے ۱۵۴۲ مرکز ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پچاس ہزار ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے ۳۷۲ مغربی آسٹریلیا میں ۱۹۸ نیو ساؤتھ ویلز میں اور باقی ۱۸۷ کوئنز لینڈ میں ہیں۔ ان میں ہر ایک کم و بیش ایک لاکھ ایکڑ کے رقبے میں ہے۔ چنانچہ اس قدر وسعت کے باعث بھیڑوں کے بعض علاقے ایکڑوں کی بجائے مربع میلوں میں محسوب کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اعداد و شمار کے لحاظ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ ایک ایکڑ میں کتنی بھیڑیں رہتی ہیں بلکہ یہ کہ ایک بھیڑ کے لئے کتنے ایکڑ درکار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اس لئے ان کے چارے کی پیداوار زیادہ نہیں ہوتی۔

آسٹریلیا میں عمدہ باریک اور گھنی اون والی وہ بھیڑیں ہوتی ہیں جن کو باعتبار قسم "میرینو" کہا جاتا ہے، اور ان کی نسل کا رشتہ ہسپانوی بھیڑوں سے ملتا ہے۔ وہ قد آور جسیم اور توانا ہونے کے علاوہ اون سے لدی ہوتی ہیں۔ یہ صورت تقریباً سو سال کے بعد پیدا ہوئی ہے جبکہ ان کی پرورش کا نظام مطالعہ اصول حالات کے ماتحت ہوتا رہا ہے۔

شروع میں ہر ہسپانوی میرینو بھیڑ سے سال بھر میں چار پونڈ اون حاصل ہو جاتا تھا لیکن آج آسٹریلیا کی ہر بھیڑ سے پیدا ہونے والی اون کی اوسط نو پونڈ سالانہ ہے جبکہ تار بھی مقابلۃً زیادہ طویل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آسٹریلوی بھیڑ زیادہ بڑی اور جسمانی اعتبار سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ پیپین قسم کی بھیڑ خاص طور پر حوادث روزگار کا مقابلہ کرنے میں مشہور ہے۔ مثلاً نیو ساؤتھ ویلز میں بھیڑ کا ایک مرکز ایسا ہے کہ وہاں تیس ہزار ایکڑ کے علاقے میں پانی بالکل ناپید ہے۔ کہیں کہیں زمین کھود کر تالاب بنائے ہیں اور کہیں برمے لگا رکھے ہیں۔ نہ چراگاہیں اچھی ہیں، نہ قدرت ساتھ دیتی ہے۔ پھر بھی بھیڑوں کا گذارہ ہو جاتا ہے۔ اس مرکز کے گلے قدرتی گھاسوں، جھاڑیوں اور کسیلے پتوں پر اوقات بسر کرتے ہیں۔ گذشتہ چھتیس سال میں بارش کی اوسط چودہ انچ سالانہ رہی ہے۔ اور سنہ ۱۹۴۴ء سے تو بالکل خشک سالی کا دور دورہ ہے۔ بعض موسموں میں بارش بالکل نہیں ہوتی پھر بھی سنہ ۱۹۴۰ء کی ½۵ انچ بارش کے باوجود ہر بھیڑ سے

پیدا ہونے والی اون کا اوسط وزن سوا تیرہ پونڈ تھا۔

بھیڑوں نے بچے جننے میں بھی کمال کر دیا۔ اوسط بیاسی فیصدی کے قریب رہی۔ ۳۳-۱۹۳۰ء بہت ہی بھاگوان رہا۔ بچوں کی اوسط ۱۰۱ر۱۱ فی صدی رہی۔

پورے سو سال تک اہل آسٹریلیا نے اپنی توجہ میرینو والی بھیڑوں پر مبذول رکھی۔ کیونکہ آسٹریلیا سمندر پار کی منڈیوں سے اس قدر دور ہے کہ گوشت وہاں تک نہیں بھیجا جا سکتا۔ لیکن جب بیج دانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میرینو والی بھیڑوں کے ساتھ ساتھ ان بھیڑوں کی پرورش بھی عمل میں آنے لگی جو صرف کھائے جانے کے لائق ہیں۔ ایسی بھیڑیں عموماً دوغلی نسل کی ہوتی ہیں۔ گوشت کھانے کے علاوہ ان کا اون بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ ان کی پرورش زیادہ تر ساحل کے قریب ہوتی ہے یا اس سے ملحق قصبوں میں جہاں گھاس اور پانی کی زیادتی ہو۔ ملک کے اس حصے میں جو چٹیل میدانوں کی طرح ہموار، بنجر اور خشک ہے میرینو نامی بھیڑیں رہتی ہیں۔

برے دن آنے پر جس طرح اس کاروبار میں شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے یعنی ایسا نقصان جو لاکھوں تک پہنچ جائے اسی طرح اچھے دنوں میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ کامیابی کا منہ دیکھنا صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو کاروبار سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ گلوں کو بہت سے دشمنوں سے محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے مثلاً خرگوش اور کنگرو چراگاہوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ جنگلی کتے بھیڑوں کو زخمی کر ڈالتے اور مختلف قسم کی بیماریاں اور کیڑے ان کو الگ ختم کر ڈالتے ہیں۔ نوزائیدہ بچوں کی زبردست احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ خاص قسم کی بھیڑوں کے لئے خاص زمین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ایک مربع میل میں کتنی بھیڑیں آسانی سے پرورش پا سکتی ہیں۔ ان کو نہلانا دھلانا اور صاف حالت میں رکھنا بھی ایک اہم کام ہے۔ اس کے بعد بالوں کی کٹائی کا نمبر آتا ہے۔ بال کاٹنے والا اگر اچھا مشّاق ہو تو آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے کے دوران میں دو سو بھیڑوں کو بھگتا سکتا ہے۔ اس طرح ایک موسم میں اس کی آمدنی مبلغ ۴۲۰۰ روپے ہو سکتی ہے۔ بال کاٹنے کے مرکزوں پر دو، چار حتیٰ کہ چالیس تک مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ ایک اونچے سے تختہ پر بال کاٹنے کی مشین ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر بجلی سے چلتی ہیں۔

بعض مرکز بہت ہی بڑے ہیں جن میں ایک سو کے قریب مشینیں لگی ہوتی ہیں۔ جہاں ایک موسم میں چار پانچ لاکھ بھیڑوں کے بال کاٹے جا سکتے ہیں۔ بال کاٹنے والا گھسیٹ کر بھیڑ کو تختے پر لاتا ہے اسے ٹھیک حالت میں لٹاتا اور فوراً کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی کمر کے جھکتے ہی مشین تیزی سے چلنے لگتی ہے۔ اس کے ساتھی بھی اس کی طرح جھکے ہوتے ہیں اور ان سب کو کام کی جلدی ہوتی ہے۔ ایک جانور کے ختم ہوتے ہی دوسرا اس کی جگہ گھسیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ قائم رہتا ہے حتیٰ کہ سارا گلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب تمام اون اکٹھا ہو جاتا ہے تو اسے مختلف اقسام میں رکھا جاتا ہے آسٹریلیا کی اون کی کم و بیش سولہ سو قسمیں ہوتی ہیں، جن کی قیمتیں ان کی نفاست و عمدگی کے لحاظ سے مختلف رہتی ہیں۔ اقسام جانچنے والے سات سو سے ایک ہزار قسم کی اون میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں۔ جانچ لینے کے بعد اون کی گانٹھیں تیار کر لی جاتی ہیں اور ان کو قریب ترین اسٹیشن پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے وہ خرید و فروخت کی منڈیوں میں چلی جاتی ہیں۔

دوران جنگ میں آسٹریلین وول بورڈ نے برطانیہ کے ساتھ سامان کی فراہمی کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اب پھر کام کو نئے سرے سے منظم کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے مابین نیا معاہدہ ہوا ہے۔

تقریباً سو سال تک آسٹریلیا والوں نے اون کی بیرونی تجارت ہی کو اپنے لئے کافی سمجھا۔ لیکن اب مقامی طور پر مستقل صنعتی ادارے

رسمساہٹ

دل کے گوشوں میں اک تمنا
رنگین شمعیں جلا رہی ہے
دل کی رگ رگ میں خون کی رَو
میٹھے سرگم بجا رہی ہے
جو برگ ہے تال دے رہا ہے
جو موج ہے گنگنا رہی ہے
سورج برسا رہا ہے سونا
شبنم موتی لٹا رہی ہے
چلتے چلتے ٹھٹھک رہا ہوں
کوئی آواز آ رہی ہے
دھندلی دھندلی سے آنسوؤں میں
تصویر سی مسکرا رہی ہے
غنچہ بند کلی کھلی نہیں ہے
کھلنے ہی کو کسمسا رہی ہے
رہ رہ کے ہوائے سیر صحرا
در شوق کا کھٹ کھٹا رہی ہے
بھونرا رس پی رہا ہے چھپ کر
تتلی خوشبو چرا رہی ہے
مستی ظلمت کی وادیوں میں
سیمیں تارے لٹا رہی ہے
فرش امید پر تمنا
کچی کلیاں بچھا رہی ہے
سنسان گلی میں کھل کھلا کر
ہنسنے کی صدا سی آ رہی ہے

نرسی

کے قیام کی اہمیت محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ صورت زمانۂ جنگ کے کاروبار سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اونی کپڑا بنانے والوں نے اس بات کا ٹھیکہ لیا ہے کہ وہ ۱۹۴۶ء ختم ہونے تک ادارۂ فلاح و رفاہ مشترک کے لئے دس لاکھ گز کپڑا تیار کردیں گے حالانکہ وہاں کی مقامی منڈیوں میں کپڑے کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ کام بہت زیادہ ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ چھ لاکھ مرد و عورت جن کی واپسی میدانِ جنگ سے ہوئی ہے شہری آبادی میں شامل ہو کر اس کام میں منہمک ہو جائیں۔ اب بھی بہت سی چیزوں بالخصوص گرم کپڑے کی راشن ہے۔ اس لئے اندازہ ہے کہ یورپ کے آزاد کردہ ہوئے ممالک کو کپڑا سب سے پہلے دیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ کے ایک سو بیس کارخانوں میں جو اونی اور دوسرے گرم کپڑے بناتے ہیں تقریباً ستائیس ہزار آدمی ملازم ہیں۔ بنائی کے تقریباً سوا تین سو کارخانے ہیں جن میں بیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں یہ صنعتی ادارے ہر سال تقریباً چھ کروڑ مربع گز اونی کپڑا تیار کردیتے ہیں۔ ہاتھ کے بنے ہوئے اون اور مشین سے تیار کئے ہوئے لباس اس مقدار کے علاوہ ہیں۔ بہت سے کارخانوں کے مالک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا مال سو فیصدی خالص اون کا ہے اور اس میں خوبی یہ ہے کہ وہ دھلنے کے بعد سکڑ نہیں سکتا۔

زمانۂ جنگ میں آسٹریلیا کے کارخانوں نے اپنی ملکی ضروریات راشن کے مطابق پوری کرتے رہنے کے علاوہ بہت سامان باہر بھی بھیجا۔ مثلاً انہوں نے اونی کپڑے کے پچاس لاکھ بلاؤز و جیکٹ پچاس لاکھ پاجامے، ایک کروڑ پانچ لاکھ کمبل اور تین کروڑ دس لاکھ اونی کپڑا دوسری ضروریات کے لئے فراہم کیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کارخانوں کی زیادہ توجہ جنگی احتیاج کی جانب مبذول رہی گذشتہ دس سال میں اس صنعت کی کل پیداوار بے قیاس بھی ہے۔ ۳۸-۱۹۳۷ء میں آسٹریلیا کے کارخانوں میں ۲،۱۷۲،۲۴۲ گانٹھوں کی کھپت ہوئی جو کل پیداوار کا ۷۶۹ فیصدی ہے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں انہوں نے ۵۱۴،۲۰۷ گانٹھیں صرف کیں یعنی ۲۰۴۲ فیصدی۔ ۴۵-۱۹۴۴ء میں کسی قدر کمی واقع ہوئی کیونکہ مزدوروں کی کمی تھی۔ اس سال ۴۴۲،۶۷۴ گانٹھیں کام آئیں یعنی ۱۷،۴۱ فیصدی۔ ۱۹۴۵ء میں ۱۰۲ [illegible] ۱۹۴۲ء ۸ ۱۱ ہوگئے۔ اس زمانے میں کاروبار کی کل رقم بائیس کروڑ اڑتالیس لاکھ پچاس ہزار روپے سے انتیس کروڑ چھتیس لاکھ پچپن ہزار روپے ہوگئی۔ اس کے علاوہ سلائی سے بنے

عشرت ناتمام

ابتک حصولِ مہر و وفا کے لئے ندیم — غیروں کو میں نے اپنا بنایا ہے بارہا
ہر اک امیدِ زیست کا حاصل نہیں سہی — ہر آرزو نے دل کو سنبھالا ہے بارہا
ان دامنوں کی سمت جو میرے لئے اٹھے — میں نے نحیف ہاتھ بڑھایا ہے بارہا
ان مسکراہٹوں کے لئے جو حسین تھیں — اشک و غم کو چھپایا ہے بارہا
اکثر وہ صحبتوں کی جوانی گھلی رہی — جن کے طفیل خود کو ہنسایا ہے بارہا

اک خاص دھن میں گیت سے گا رہا ہوں میں
اکثر اسیر دام تمنا ہوں میں مگر

لیکن میں آج اپنا ہی ماتم گسار ہوں — ہر گام پر امید نے دھوکا دیا مجھے
از خود تواتر [illegible] — جن واسطوں نے ٹھیک سہارا دیا مجھے
جن کے لئے میں خود کو دیتا رہا فریب — ان مسکراہٹوں نے بھی ٹھکرا دیا مجھے
احباب نے سنا تھا مجھ سے ہزار بار — وہ نغمۂ بہار بھی لوٹا دیا مجھے
ناکامیوں کے فیض نے دل سرد کر دیا — میری مسرتوں نے رلا کیا دیا مجھے

خوش رنگ ساعتوں کا یہ انجام کیا کروں
کیسے جیوں میں حسرتِ ناکام کیا کروں

احمد ریاض

کے کارخانوں کا کل کاروبار تقریباً تیرہ کروڑ اکیانوے لاکھ اڑتیس ہزار روپے سالانہ کا رہا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ آسٹریلیا میں اونی صنعت نے بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے، اس کے مرکز اب بھی نیو ساؤتھ ویلز میں زیادہ ہیں جہاں ابتدائی حالت میں ان کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ پہلا کارخانہ ۱۸۶۳ء میں سڈنی کے قریب پیراماٹا میں قائم ہوا تھا جو اب بھی قائم ہے۔

ولائتی کپڑے سے مقابلہ ہونے کے باعث اس کی ترقی ہلکی رہی حتیٰ کہ ۱۸-۱۹۱۴ء کے دوران میں جنگ کے باعث پہلی بار ترقی ملی۔ اس کے بعد سے برابر آسٹریلیا میں یہ صنعت شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ واقفیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت ماہرین فن آسٹریلیا کے مال کا مقابلہ دوسرے ملکوں کے مال سے کرسکتے ہیں۔ باہر جانے والا مال خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ اور نفیس ہوتا ہے۔

(۱) سلمان آفندی

پینتیس سالہ مرد — خوش پوشاک، خوش قامت، چڑھی ہوئی مونچھیں، پاؤں میں چمک دار جوتا اور ریشمیں جرابیں، منہ میں قیمتی سگریٹ اور ہاتھ میں حسین و نازک بیت، جس کی سنہری موٹ، اعلیٰ درجہ کے جواہر سے مرصع عالی شان ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہے، جہاں شہر کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوتے ہیں اور شاندار گاڑی میں مشہور تفریحی مقامات کی سیر کو جاتا ہے جسے دو نہایت نفیس گھوڑے کھینچتے ہیں۔

سلمان آفندی کو اپنے باپ سے ایک کوڑی ورثہ میں نہیں ملی۔ اللہ بخشے اس کا باپ ایک غریب و مفلس آدمی تھا، جس نے نہ کبھی تجارت کی نہ دولت کمائی۔ وہ حد درجہ سست اور کاہل تھا، کام سے نفرت کرتا اور اسے اپنے مرتبہ سے گری ہوئی چیز سمجھتا۔ ہم نے ایک مرتبہ خود اس کی زبان سے سنا ہے کہ "میرا جسم اور میری فطرت کام سے میل نہیں کھاتی۔ کام ان لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے، جن کی فطرت، بے کیف اور جسم، کمزور ہے ہیں"۔

تو پھر سلمان آفندی نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی اور وہ کون سا جادوگر تھا، جس نے مٹی کو اس کی مٹھیوں میں سونے چاندی سے بدل دیا؟ یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بے شمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو عزرائیل نے ہمیں بتایا، اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

پانچ برس ہوتے ہیں کہ سلمان آفندی نے سیدہ فہیمہ سے شادی کی۔ سیدہ فہیمہ مرحوم پطرس نعمان تاجر کی بیوہ ہے، جو اپنی کوشش، استقلال اور دیانت کے لئے اپنے تمام ہمسروں میں شہرت رکھتا تھا۔ اس وقت سیدہ فہیمہ کی عمر پینتالیس سال ہے اور اس کے جذبات کی عمر سولہ سال۔ وہ ہر چند اپنے بالوں میں خضاب اور اپنی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے، اپنے چہرہ کو کریم اور پاؤڈر سے چمکاتی ہے لیکن سلمان آفندی آدھی رات سے پہلے کبھی گھر میں نہیں گھستا۔ شاید ہی کوئی گھڑی ہوتی ہو، جب وہ اپنے شوہر کی تیز تیز نظروں اور نا ملائم کلمات سے محفوظ رہتی ہو، جس کی وجہ یہ ہے کہ سلمان آفندی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے، جو اس کے پہلے شوہر نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے جمع کی تھی۔

(۲) ادیب آفندی

ستائیس سالہ جوان — لمبی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ناپاک چہرہ، ہاتھ روشنائی میں بھرے ہوئے، ناخن میل سے اٹے ہوئے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، جن پر جا بجا تیل، چکنائی اور قہوہ کے چھینٹے۔

اس مکروہ حالت کا سبب، ادیب آفندی کی غربت و محتاجی نہیں غفلت و بے پروائی ہے، وہ مصروفیت ہے جس نے بلند مسائل، معنوی امور اور الہیاتی مباحث کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں اس کے دماغ کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ ہم نے خود اسے امین جندی سے کہتے سنا ہے کہ "طبیعت دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی"۔ یعنی ادیب ایک وقت میں انشا پردازی اور پاکیزگی، دونوں کا خیال نہیں رکھ سکتا"۔

ادیب آفندی بہت بولتا ہے اور ہر وقت بولتا ہے: اس کے نزدیک بولنا، دنیا کی ہر چیز سے افضل ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیروت کے کسی مدرسہ میں دو سال تک ایک مشہور استاد سے علم بدیع کا درس لیا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس نے بہت سی نظمیں کہی ہیں مضامین لکھے ہیں اور کتابیں مرتب کی ہیں، جو مختلف اسباب کی بنا پر، جن میں سب سے بڑا سبب عربی صحافت کا انحطاط اور پڑھنے والوں کی جہالت، ہے ہنوز طبع و اشاعت سے محروم ہیں۔

کچھ دنوں سے ادیب آفندی اپنی توجہ قدیم و جدید فلسفہ کی باریکیوں پر صرف کر رہا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں سقراط کا بھی عقیدت مند ہے اور نیٹشے کا بھی۔ وہ آگسٹنس کے ملفوظات بھی اسی شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے، جس شوق و دلچسپی کے ساتھ والٹیر اور ژان ژاک روسو کی۔

ہم پہلی مرتبہ اس سے ایک شادی میں ملے تھے۔ لوگ اس کے چاروں طرف، نغمہ و شراب میں مست تھے اور وہ اپنے مشہور بلیغ انداز میں شکسپیر کے ڈرامہ، ہملٹ پر تبصرہ کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ ہم نے اسے ایک رئیس کے جنازہ میں دیکھا۔ لوگ اس کے پہلو میں، غمگین چہرے بنائے، سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور وہ اپنی مخصوص فصیح البیانی کے ساتھ فارض کی غزلوں اور ابو نواس

کی خصوصیات پر بحث کر رہا تھا۔

ان حالات میں ادیب آفندی کیوں جی رہا ہے؟ پرانی کتابوں اور بوسیدہ اوراق میں اپنے شب و روز برباد کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے؟ وہ ایک گدھا کیوں نہیں خرید لیتا اور اسے کرایہ پر چلا کر، دولت مند کرایہ چلانے والوں کی صف میں شامل کیوں نہیں ہو جاتا؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بےشمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو بعلزبول نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

تین برس ہوئے، ادیب آفندی نے پادری یوحنا شمعون کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حبیب بک سلوان کے گھر میں اس کے سامنے پڑھا۔ قصیدہ ختم ہو جانے کے بعد پادری نے اسے بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا:

"بیٹا! خدا تجھے زندہ و تندرست رکھے! تو بڑا نکتہ رس شاعر اور فطرت شناس ادیب ہے۔ میں تجھ جیسے باکمال پر فخر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا۔"

اس دن سے لے کر آج تک ادیب آفندی اپنے باپ، چچا اور ماموں کی تحسین و ستائش کا مرکز ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

"کیا پادری یوحنا شمعون نے ارشاد نہیں فرمایا تھا کہ وہ ایک دن مشرق کی بڑی شخصیتوں میں شمار کیا جائے گا؟"

(۳) فرید دعیبس

چالیس سال کا پختہ عمر انسان ——— لمبا قد، چھوٹا سا سر، بڑا دہانہ، تنگ پیشانی، اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ، سینہ نکال کر آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ اس کی رفتار اس اونٹ کی رفتار سے متوازن ہے جس کی پیٹھ پر محمل ہو۔ جب وہ بلند آواز اور پروقار انداز میں گفتگو کرتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا کوئی وزیر لوگوں کے معاملات سدھارنے اور رعایا کی تکلیفیں دور کرنے میں مصروف ہے۔

فرید بک کو اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ محفلوں میں صدر مقام پر بیٹھے اور اپنے بزرگ خاندان کے کارنامے گنوائے یا اپنی عالی نسبی کی خصوصیات بیان کرے۔ وہ نپولین اور عنترہ عبسی جیسے بہادروں اور بڑے لوگوں کے حالات اور کارنامے بہت دلچسپی سے سنتا ہے۔ نفیس اسلحہ جمع کرنے کا اسے خاص شوق ہے اور وہ اس کے گھر کی دیواروں پر ترتیب سے چنے ہوئے بھی ہیں، لیکن وہ ان کو استعمال کرنا نہیں جانتا۔

اس کا قول ہے کہ "اللہ نے انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک گروہ خدمت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا خدمت لینے کے لئے۔" اس کا دوسرا قول ہے کہ "خاندان ایک اڑیل ٹٹو ہے، جو اس وقت تک نہیں چلتا جب تک کوئی اس کی پیٹھ پر سوار نہ ہو جائے۔" یہ تیسرا قول بھی اسی سے منسوب ہے کہ "قلم کمزوروں کے لئے ہے اور تلوار قوت والوں کے لئے!"

اچھا تو وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر فرید بک اپنی بڑائی کے لئے شیخیاں مارتا ہے؟ از راہ غرور اپنی عالی نسبی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے؟ اور خود بینی و خود پسندی کا اظہار کر کے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے؟

یہ رنگے ہوئے گیدڑوں کے بےشمار رازوں میں سے ایک راز ہے، جو سطنائیل نے ہمیں بتایا اور ہم اب تمہیں بتاتے ہیں:

انیسویں صدی کے ثلث اول میں سلطان بشیر شہابی لبنان کے امیروں کے ساتھ لبنان کی وادیوں میں سیر و تفریح کے لئے آیا۔ اتفاق کی بات کہ جب وہ اس گاؤں کے قریب سے گزرا جس میں فرید بک عیبس کا دادا منصور دعیبس رہتا تھا، تو دھوپ تیز ہو گئی اور سورج کی باریک باریک شعاعیں زمین کا سینہ چھیدنے لگیں۔ سلطان گرمی کی تاب نہ لا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ساتھیوں سے کہا:

"آؤ! تھوڑی دیر اس بلوط کے سائے میں دم لے لیں!!"

جب منصور دعیبس کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے ہمسایہ کسانوں کو بلایا اور انھیں خبر دی کہ سلطان ان کے گاؤں کے قریب رونق افروز ہے۔ یہ سن کر وہ سب کے سب انجیر اور انگور کے خوان اور دودھ، شراب اور شہد کی تھلیاں لئے منصور کے پیچھے پیچھے بلوط کے درخت کی طرف چلے، جہاں سلطان بشیر شہابی قیام فرما تھا۔ منزل مقصود پر پہنچ کر منصور دعیبس آگے بڑھا اور عبائے شاہی کو بوسہ دیا۔ پھر اس کے قدموں میں ایک بکرا ذبح کیا اور بلند آواز میں کہا:

"یہ سب جہاں پناہ کی مراحم خسروانہ کا اثر ہے!"

سلطان نے اظہار خوشنودی کے طور پر اسے خلعت عطا فرمایا اور کہا:

"تم آج سے اس گاؤں کے سردار ہو، جسے ہماری خصوصی عنایتیں نوازتی رہیں گی۔ جاؤ! ما بدولت نے تمہارے گاؤں والوں پر سے اس سال کا شاہی لگان معاف فرمایا!"

امیر کے چلے جانے کے بعد اس رات کو گاؤں کے تمام آدمی سردار منصور دعیبس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے اپنے رنج و راحت کا آقا تسلیم کر لیا ——— اللہ ان سب پر رحم کرے

رنگے ہوئے گیدڑوں کے اور بھی بہت سے راز ہیں، جو بیت شیطان ہمیں دن رات آگاہ کرتے رہتے ہیں اور ہم اس سے پہلے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

قدیم چین میں ہاتھی دانت کا کام

لیونیا ایل بیلی

قدیم زمانہ سے ہاتھی دانت کی چیزیں مقبول عام رہی ہیں چاہے وہ سجاوٹ کی ہوں چاہے استعمال کی۔ یہ ایک ایسی شے ہے جس پر نہایت عمدہ اور نفیس کندہ کاری ہو سکتی ہے اور جو رنگ اور نرماہٹ میں برف جیسی ہوتی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ عنبر کا ہلکا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

چین میں ہاتھی دانت کا کام آغاز تاریخ ہی سے ہوتا ہے۔ چینیوں کو ہاتھی دانت ہمیشہ سے بہت پسند ہے جنہوں نے ہر قسم کے فن میں مہارت حاصل کی ہے لیکن ہاتھی دانت کو چین کی صنعت میں سینکڑوں برس سے اہمیت حاصل ہے اور اس کی کندہ کاری میں انھوں نے بڑے کمالات دکھائے ہیں۔ قدیم چین میں ہاتھی دانت کا جو کام ہوتا تھا اسے فلسفی خاص طور پر پسند کرتے تھے۔ اس زمانہ کی اشیاء بہت کم لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ اس موضوع پر لکھا بھی بہت کم گیا ہے اور اہل یورپ کو تو ان کے متعلق بہت ہی کم معلومات حاصل ہیں۔ عہد منگ اور کانگ ہسی کے فن کے نمونے تو بہت ہی نایاب ہیں کیونکہ یہ باہر بھیجنے کے لئے تیار نہیں کئے جاتے تھے۔ منچو خاندان کے عہد کے اواخر میں چینیوں نے اہل مغرب کے لئے ہاتھی دانت کی چیزیں بنائیں۔ اس کے بعد زوال کا زمانہ شروع ہو گیا۔ مغرب کی تہذیب نے نئے رجحانات کے لئے جگہ پیدا کی۔ اب ایسی چیزیں بننے لگیں جو عوام کو پسند آئیں مثلاً کارڈ رکھنے کے ڈبے، پنکھے اور جواہرات وغیرہ۔ ان سب پر بہت زیادہ کام ہوتا تھا لیکن ان پر چین کی تہذیب کے خاص اثرات نمایاں نہیں ہیں۔

جہاں تک چین میں ہاتھی دانت کے کام کا تعلق ہے ایک مغربی شخص کے سامنے صرف برآمد کئے ہوئے نمونے ہوتے تھے۔ اہل مغرب ہاتھی دانت کے قدیم فن کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ چین کئی صدیوں تک مختلف ملکوں کے نمائندوں کو بھی نفیس اشیاء تحفۃً پیش کرتا رہا لیکن ان میں ہاتھی دانت کی چیزیں بہت کم شامل ہوتی تھیں۔

جنگ خاندان کے عہد حکومت کے آخری زمانے سے جنگ عہد حکومت کا اسلوب بالکل مختلف تھا۔ جو بڑی اور سادہ اشیاء نفیس اور اہم تہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔ اب فن کے ہر شعبے میں احتیاط برتی جانے لگی، خواہ مصوری ہو، کندہ کاری ہو یا ماڈل بنانا ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس وقت ... کی گئی تھی۔ ہاتھی دانت کا کام کرنے والوں کے جوش اور جذبہ کا پتہ فلسفیوں اور بزرگوں کے مجسموں سے چلتا ہے جنہیں بڑی اہمیت دی گئی تھی اور ہر ایک کی خصوصیات نمایاں تھیں۔

ہاتھی دانت سے ... کی تقریباً ساری چیزیں کچھ معانی کی حامل ہیں۔ ان کے فن ثقافت، انفرادیت اور روایات پر اتنا عرصہ گزرنے پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ چینی فن سے لطف اندوز ہونے کے لئے چینیوں کے قدیم فلسفہ اور روایات کا علم ہونا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں جن لوگوں کو بار بار دہرائے جانے والے اور رسمی موضوعات میں بہت کم مزہ آتا ہے وہ بھی ان چیزوں سے لطف حاصل کرتے ہیں۔

ہاتھی دانت کے ... چھوٹے بت بدھ اور تاؤ مذہب کے مندروں اور گھریلو سجاوٹ کے کام آتے تھے۔ ان فنکاروں نے ان مجسموں میں ارضی اور سماوی جذبات پیدا کئے ہیں کیونکہ چین کے سارے قدیم فن کی روح رواں شدید مذہبی جذبہ ہے اور ہر ایک فنکار کا خیال اور ... ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ عمدہ ہاتھی دانت پر ماہر فنکار ہی کندہ کاری کرتے تھے۔ شکل، قسم، رنگوں کا اتار چڑھاؤ اور سایہ اور روشنی ہاتھی دانت میں کشش پیدا کر دیتے تھے۔ خوبصورت چیز بنانے میں وقت کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ ہر ممکن احتیاط برتی جاتی تھی اور نہایت باریک کام کیا جاتا تھا۔

چینی فنکار بڑی توجہ اور سنجیدگی سے ہاتھی دانت منتخب کرتا ہے کیونکہ اسے بخوبی معلوم ہے کہ کس قسم کے ہاتھی دانت کی ضرورت ہوگی۔ وہ شروع ہی سے اپنے تخیل کو ہاتھی دانت کے ٹکڑے میں سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اندھے کی لاٹھی بنانا چاہتا ہے تو ہاتھی دانت پسند کرتے وقت بھی اس کا خیال رکھے گا۔ سنجیدہ فنکار ہاتھی دانت کے ایک ہی ٹکڑے میں کندہ کاری کر کے ایک چیز تیار کرتا ہے کیونکہ اگر ہاتھی دانت کا ٹکڑا جوڑا جائے اور ڈیزائن بنانے کے بعد کچھ اضافہ کرنا پڑے تو نکتہ شناس کے نقطۂ نظر سے ڈیزائن بے مزہ ہو جاتا ہے۔ چینی فنکار ایسا بہت کم کرتے ہیں لیکن جاپانیوں کے یہاں ایسا اکثر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک

کاریگر ایک چیز پر سالوں صرف کر دیتا ہے۔ وہ کام کے دوران میں
کئی مرتبہ ارادہ بدل سکتا ہے مثلاً یہ کہ سونگھنے کی شیشی بنائی جائے
گلدان وغیرہ بنائے لیکن وہ عموماً اپنی پسندیدہ چیز ہی بناتا ہے
اور چونکہ وہ ایک ہی طرح کی کندہ کاری کرتا ہے اس لئے اپنے موضوع
کا ماہر ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جو چیز بنا رہا ہوں وہ میرے
بلکہ میری یاد کے مٹ جانے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک باقی رہے گی۔
اس لئے وہ بڑے استقلال اور محنت سے کام میں لگا رہتا ہے کیونکہ
آخرکار وہ بھی تو ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے نسل بعد نسل اپنے
کام کو بڑے شوق سے انجام دیا۔

اگر کسی شخص کے پاس ہاتھی دانت کے ایسے چینی نمونے ہوں
جن پر دستخط موجود ہوں تو اسے خوش قسمت سمجھنا چاہئے کیونکہ ایسی
چیزیں بہت ہی کمیاب ہیں۔ چینیوں کے یہاں ہاتھی دانت پر نام کندہ
کرنے کا دستور کبھی نہیں تھا۔ ایسا صرف خاص حالات میں ہوتا تھا۔
بادشاہ ہسی اور چین لنگ کے عہد ہی میں شہنشاہ کے حکم سے کچھ چیزیں
تیار کی گئی تھیں جن پر فنکار کا نام اور کبھی کبھی کندہ کاری کی تاریخ کندہ
کی گئی تھی۔ یہ کام کے ہاتھی دانت کے فشان، عالموں کو برش دان وغیرہ
تحفۃً پیش کئے جاتے تھے۔

ہاتھی دانت کے بہترین کام کا مرکز پیکنگ تھا کیونکہ شہنشاہ
کانگ ہسی یہاں کی کارگاہوں کی سرپرستی کرتا ہے اور اس طرح انکے معیار
بلند کرنے میں مدد پہنچاتا تھا۔ کانٹن کے کاریگر بھی پیچیدہ اور مثالی کندہ کاری
کے لئے مشہور ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے چند نمونے حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً
متحدالمرکز چیزیں سادہ اور پیچیدہ ڈیزائن میں متحرک گولیاں ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی میں فوچو، کانٹن اور اموے کے مقامات پر خصوصاً
برآمد کے لئے ہاتھی دانت کا کام ہوتا تھا یہ اسلوب کے لحاظ سے پیکنگ
کے کام سے بالکل مختلف تھا۔ اول الذکر کا ڈیزائن نہایت پیچیدہ ہوتا تھا
جبکہ دوسرا چینی تہذیب اور ثقافت کا صحیح نمائندہ تھا۔ ہاتھی دانت کی کندہ کاری
کا طریقہ ہمیشہ جیسا ہی ہے۔ بالکل معمولی آلات میں تیز دھار کی آری
چاقو، چھوڑی، اور چھوٹے چھوٹے برمے۔ کندہ کاری کے لئے
ایک اور تیز نوک والے آلے کی بھی ضرورت پڑتی ہے جسے اسٹائلس
کہتے ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے ہاتھی دانت کے ٹکڑے پر کندہ کاری شروع
کرنے سے پہلے کاریگر ایک سادہ ٹکڑے پر ڈیزائن بنا لیتا ہے۔ اسی
کی مدد سے وہ کندہ کاری کرتا ہے یہاں تک کہ ہاتھی دانت پر صرف
ڈیزائن باقی رہ جاتا ہے۔ ہوشیار فنکار کی مہارت کا پتہ چینی کی کندہ کاری
سے چلتا ہے۔ کبھی کبھی مختلف ہلکے رنگوں کی لائنیں بنانے کے ساتھ
سنہری رنگ بھی ہوتا ہے۔ قدیم کندہ کاری کے اب بھی ایسے بہت سے
نمونے ملتے ہیں۔ غالباً یہ پیکنگ میں بنے تھے کیونکہ اس ہاتھی دانت
کی رنگ سازی کی صنعت اس دارالخلافہ کی تین سو برس تک اہم خصوصیت
رہی ہے لیکن ہاتھی دانت کی صنعت یہاں پندرھویں صدی سے قائم ہے۔

ہاتھی دانت کی کچھ ایسی چیزیں جن میں زیادہ کندہ کاری ضروری
تھی جیسے پردے صرف کم ابھارے گئے ہیں اور ان کے آر پار دھندلی
روشنی بھی نظر آتی ہے مثلاً اگر روشنی کی طرف کر کے دیکھا جائے تو
گلابی سی روشنی نظر آئے گی۔ جب ہاتھی دانت میں تخلیق اور فطرت
کی گرمی داخل ہو جاتی ہے تو وہ ایک حد تک باقی رہتی ہے۔
انسان ایسا نہیں کر سکتے۔ (”اپالو“ میگزین سے ماخوذ)

غزل

جب یہ نسبت ہے تو پھر کیوں ہیں آج تک بیگانہ ہم
حسن کی تفسیر تم ہو عشق کا افسانہ ہم

ہچکیاں ہیں نزع کی اور اے غم جانانہ ہم
کہہ رہے ہیں اب نئے رخ سے نیا افسانہ ہم

اپنے ہی ہوش و جنوں سے یہ جہاں آباد ہے
رونق ہر خانہ ہم ہیں زینت ویرانہ ہم

کیف افزا بجلیاں رگ رگ میں دوڑاتا ہے عشق
بنتے جاتے ہیں شراب درد کا پیمانہ ہم

ناز ہے پردے پہ تجھ کو یہ خبر شاید نہیں
رہ گئے ہیں بنکے دنیا میں ترا افسانہ ہم

ذرہ ذرہ طور ہے اپنے فروغ نور سے
جس کے جلوے عام ہیں وہ ہیں چراغ خانہ ہم

لفظ مہمل بنکے رہ جائے گی ساری کائنات
کہہ گئے تفصیل سے جس دن ترا افسانہ ہم

ربط حسن و عشق ساحر کیوں نہ کرتا اپنا کام
جب بنے وہ شمع محفل بن گئے پروانہ ہم

ساحر بریلوی

سکون

نعیم صبا

ایک مدت سے تری زیست کی تابانی میں
اپنی سوئی ہوئی اُمید کو رخشاں کرکے
جا رہا تھا میں لرزتے ہوئے قدموں سے مگر
تیری آنکھوں نے مُبنے زلفِ سیہ کے جالے

اپنی سُلجھی ہوئی دزدیدہ نگاہوں سے کبھی
تجھ کو پیغام محبت کا دیا تھا میں نے
اپنے ایامِ محبت کی اندھیری راتیں
تیری تخئیل سے تابندہ کیا تھا میں نے

جب کبھی تیری محبت کا خیال آہی گیا
اپنی بجھتی ہوئی یادوں کو پکارا میں نے
تیری بھیگی ہوئی پلکوں کا تصوّر کرکے
اپنی راتوں کو کئی بار سنوارا میں نے

آہ لیکن غمِ ایامِ مسری راہوں میں
چھیڑ دیتا ہے محبت میں وہ ڈوبا ہوا ساز
جس کے نغموں میں فسردہ ہے کہانی میری
اور آنکھوں میں بکھر جاتے ہیں وہ رازِ نیاز

زندگی پہلے بھی شرمائی تھی اُن لمحوں میں
جب تری یاد میں افسردہ رہا کرتا تھا
تیری مخمور نگاہوں سے میں اپنی نظریں
یک بیک ملنے پہ اکثر میں ڈرا کرتا تھا

اب تجھے دیکھ کے نفرت سے نگاہیں اپنی
پھیر لوں گا تجھے آخر یہ بتانے کے لئے
میرے دل میں نہیں باقی ہے محبت تیری
تجھ کو تڑپاؤں گا اک بار ستانے کے لئے

ایک مدت سے تری زیست کی تابانی میں
یوں ہی خاموش پڑا تھا کہیں مجبور و حزیں
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں فروزاں کب تھا؟
دل کی بجھتی ہوئی یادوں میں ترا عکسِ حسیں

جرعاتِ تازہ

پیہم تلاشِ جلوۂ جاناں میں جو گئے ❖ کچھ پا گئے کچھ اپنی ہی ہستی سے کھو گئے
شاید نجات کشمکشِ غم سے مل گئی ❖ کیوں ورنہ غم نصیب سرِ شام سو گئے
آلامِ روزگار سے بگڑے کچھ اپنے طور ❖ تم بھی غرورِ حسن سے کچھ اور ہو گئے
سنجیدگی سے جب غمِ دنیا نہ سہہ سکو ❖ بیزار اپنے ہوش و خرد ہی سے ہو گئے
جو بن سکا کچھ اور نہ دنیا میں کر سکے ❖ الفت کے بیج مزرعِ ہستی میں بو گئے
جو سہہ سکے نہ تابِ غمِ ہجرِ دوست کی ❖ وہ عاشقی کا نام جہاں میں ڈبو گئے
یہ بھی ستم ظریفیٔ قدرت نہ ہو کہیں ❖ جاگیں جو حسن میں تو مرے بخت سو گئے
دم بھر حریمِ ناز کے سائے میں بیٹھ کر ❖ اک ایک تار اشک میں موتی پرو گئے
سرکارِ حسن سے انھیں کیا کچھ صلا ملا ❖ جو جان لے کے کوچۂ محبوب کو گئے
خالی کبھی رہے نہ غموں سے دل و جگر ❖ عالم یہی رہا ہے کہ چار آئے دو گئے

کیا جانئے کہ آگئی کیا ان کے جی میں آج
کعبے سے اٹھ کے شاد صنم خانے کو گئے

شادؔ قدوائی

حقائق

محیطِ بیکراں ذوقِ نظر ہے ❖ خرد لیکن ہلاکت کا بھنور ہے
حریف اس کی نہیں تہذیبِ حاضر ❖ انا الحق نکتۂ باریک تر ہے
جہاں بان و جہانگیر و جہاندار ❖ قلندر کا فسانہ مختصر ہے
فقیری پستیوں کی سرفرازی ❖ فقیری انقلابِ بحر و بر ہے
صنم خانے ہے سنگِ حرم سے ❖ فرنگی کا یہ افسونِ ہنر ہے
فضائے لامکاں میں پر فشاں ہوں ❖ ثریٰ سے تا ثریا زیرِ پر ہے
خودی جاگ اٹھی ہے خواب گراں سے ❖ قفس بہت فزائے بال و پر ہے
محبت مستیٔ اربابِ حیرت! ❖ محبت دل سے سوئے دل سفر ہے
وہ ہنگامے ابھی کچھ کچھ ہیں باقی ❖ اگر جیسے نہیں لیکن مگر ہے
غنیمت ہے میرا ذوقِ تمنا ❖ گھر یہ آپ ہی آب گھر ہے

بہت مشکل ہے ضبطِ حال انورؔ
مری رنگیں نوائی پردہ در ہے

انورؔ کرمانی

امیر عبداللہ کی واپسی

شرق الاردن کے قائم مقام وزیر اعظم (صافہ اور نار بوش میں) وزیر مالیات کا استقبال کر رہے ہیں۔

عبداللہ کی واپسی پر ہر شہر اور گاؤں میں خوشیاں منائی گئیں اور امیر کو خوش آمدید کہا گیا۔

ردن کا پایۂ تخت عمان ہر طرف سے چٹانوں سے گھرا
۔ پچھلی جنگ کے بعد سے اس نے بڑی ترقی کرلی ہے۔

• کو شاہی ہوائی بیڑہ کا ایک دستہ سلامی دے رہا ہے

چین میں ہاتھی دانت کی دستکاریاں

پھولوں کی دیوی۔ ہوا میں (لمبائی ۱۳ انچ)

شاؤ لاؤ عمر کا دیوتا (لمبائی ۱۱ انچ)

لافانی لاؤتزے (لمبائی ۱۲ انچ)

دان۔ ڈھکنہ پر کتا ہے، بیتل پر
وا ہسین، مع ایک خادمہ کے
اور داہنی جانب «ہان
ہسیانگ تزو» ہے۔
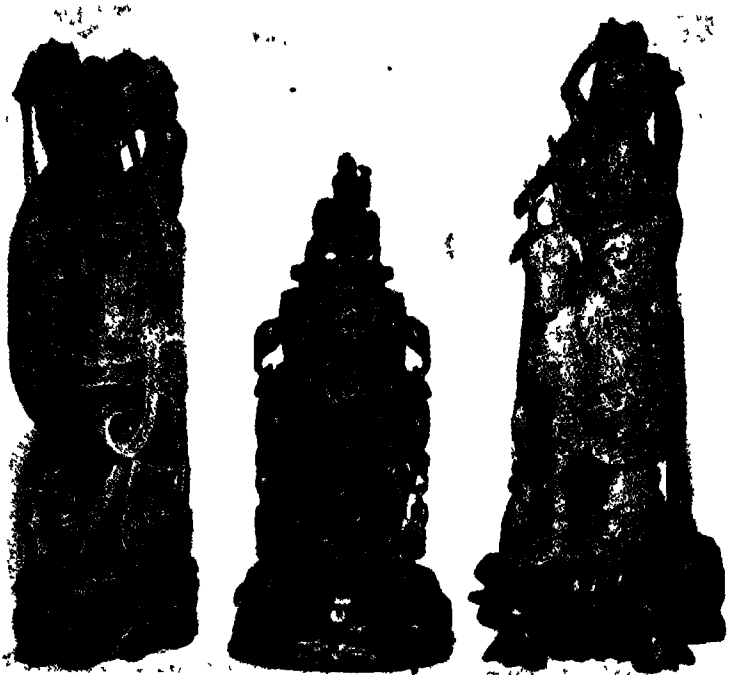
اس واز کی لمبائی ۱۹ انچ ہے۔ اس
بالائی حصہ پر شہنشاہ کا محل اور صحـ
ہے اور نیچے کی جانب ایک بالاخا
ہے جسمیں تین عورتیں موجود ہیں

(بائیں طرف) مغربی بہشت کی ملکہ «ہس وانگ مو» عنقا پر سوار ہے۔
(بیچ میں) ایک بخوردان جو خاندان سنگ کے زمانہ میں بنا۔
(داہنی طرف) ملکۂ فردوس کی خادمہ «تنگ سوانگ» ہرن پر
سوار ہے اور ہاتھ میں کنول کا پھول لئے ہوئے ہے۔

ریچھ بلاو

ریچھ بلاؤ کی خاص عدا باس کی کونپل ہے

یہ ریچھ بلاؤ اپنے پانی کے برتن سے کھیل رہا ہ

جیسے وہ ابھی کھانے کی کونپلوں سے کھیلنے لگا.

یہ ریچھ بلاؤ حال ہی میں چین سے آیا ہے اور آجکل لندن کے چڑیا گھر میں ہے۔ دیکھنے والوں میں بچے خاص طور پر اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کو ایک ننھا سا ایلچی سمجھنا چاہئے جیسے چین نے دوستی کا پیغام دے کر انگلستان بھیجا ہے۔

اس کٹہرے میں ابھی نیا ہی آیا ہے لیکن گھبراتا نہیں۔ ←

مشتاق علی ہندوستانی تماشائیوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کی کلائی اور پاؤں کی پھرتی اس کے کھیل کو بہت ہی دلکش بنا دیتی ہے۔

پٹودی کے نواب اور ٹیم کے کپتان نواب افتخار علی انگلستان میں پہلے ہی سے مشہور ہیں۔ ہاکی، کرکٹ اور ملیرڈس میں کیمبرج یونیورسٹی میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی مقابلہ کر چکے ہیں۔

مودی عمر کے لحاظ سے بالکل بچہ ہی ہے۔ شروع شروع میں ہچکچاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ رن خوب بنا لیتا ہے۔

کرکٹ کی ہندوستانی ٹیم کے پہونچ جانے سے انگلستان کا یہ موسم گرما بڑا بارونق بن گیا ہے ورنہ بارش کی وجہ سے بے کیف ہی گزرتا۔

ہندوستان میں کرکٹ کا رواج پچھلے پچاس سال سے ہے لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں اسنے اتنی ترقی کرلی ہے کہ شاید جلد ہی آسٹریلیا کی طرح ہندوستان بھی انگلستان پر خود اسی کے سکھائے ہوئے کھیل میں اپنی برتری کا سکہ بٹھادے

نواب پٹودی نے اس میچ میں کھیل کر رنجیت سنگھ اور دلیپ سنگھ کی یاد اور رکارڈ کو زندہ کر دیا ہے۔ نواب پٹودی نے ایک سیزن میں تین ڈبل سینچریوں کا رکارڈ قائم کر دیا۔ امرناتھ بھی ناقابل فراموش کھلاڑی ہے۔ پچھلی دفعہ ہندوستانی ٹیم سنہ ۱۹۳۶ء میں انگلستان گئی تھی۔ اب دس سال بعد پھر پرانی دوستی تازہ ہورہی ہے۔

(تصویریں "پکچر پوسٹ" سے لی گئیں)
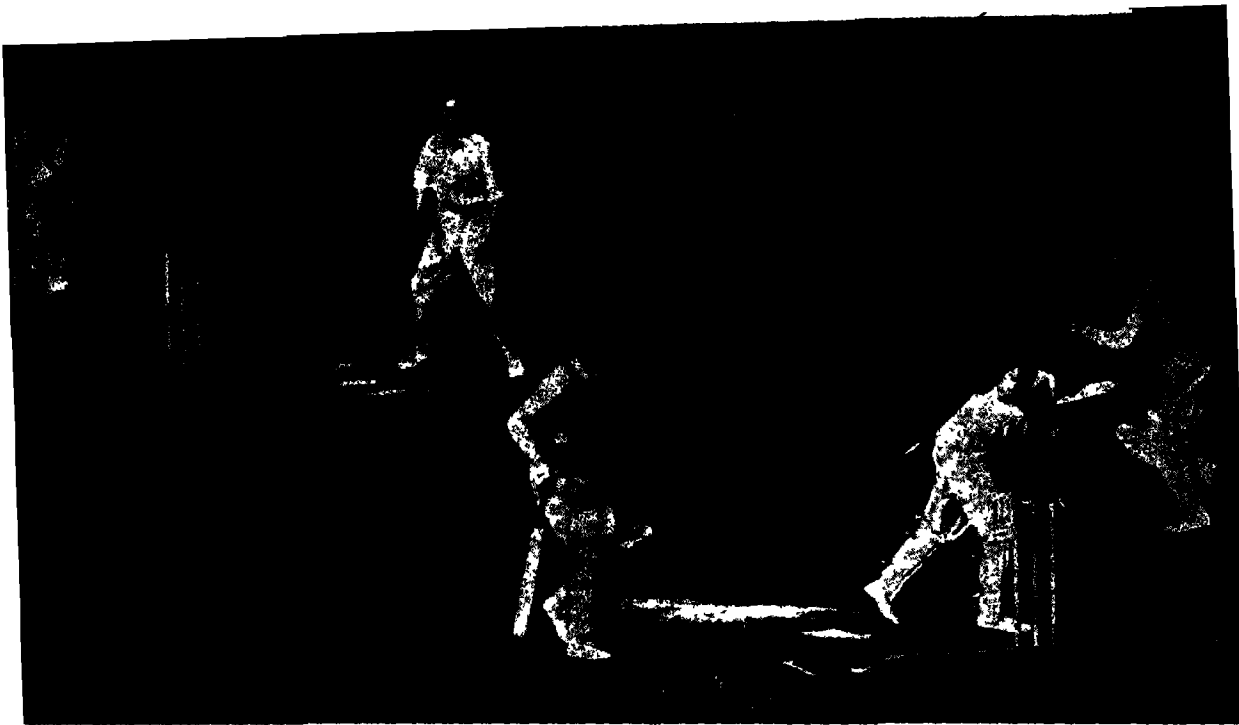
میچ کا ایک عجیب لمحہ۔ رن بنانے کے لئے مودی دوڑ پڑا ہے۔ نواب پٹودی کچھ مذبذب ہیں لیکن وکٹ کیپر نواب کا وکٹ توڑ چکا ہے۔

ہندوستان کی کرکٹ کی ٹیم انگلستان میں

ٹیم انگلستان کے موسم کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے ا
انگلستان کا موسم گرما بھی گرم نہیں ہوتا۔ ہوا ٹھنڈی ہے اور وکٹ گ
ہیں لیکن کھیل کی دھن اور شوق میں سب ہی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہ

مشتاق علی (بائیں) اور مرچنٹ (دائیں) میچ شروع کرنے جارہے ہیں۔

طہران میں زراعتی نمائش

حال ہی میں ایران کے پایۂ تخت طہران میں ایک شاندار نمائش ہوئی۔ اس کا افتتاح شاہ ایران نے خود کیا۔ نمائش بہت بڑے میدان میں ہوئی تھی اور ہر چیز کے لئے دوکانیں بڑے سلیقہ کے ساتھ سجائی گئی تھیں اس نمائش گاہ میں گائے، بیل، بکرے، مرغے، مرغیاں، طرح طرح کا اون اور کھالیں دکھائی گئیں اور مختلف قسم کی مشینوں کے علاوہ چاء، کپاس، تمولے، جانوروں اور پودوں کی بیماریوں کی دواؤں کی بھی نمائش کی گئی۔

ایران کی خوش رنگ، خوشبودار و خوش ذائقہ چاء کے نمونے نمائش کی ایک دوکان پر

اعلیحضرت شاہ ایران نمائش کی افتتاح کے لئے تشریف لارہے ہیں۔

نمائش کے سوتی شعبہ کا داخلہ
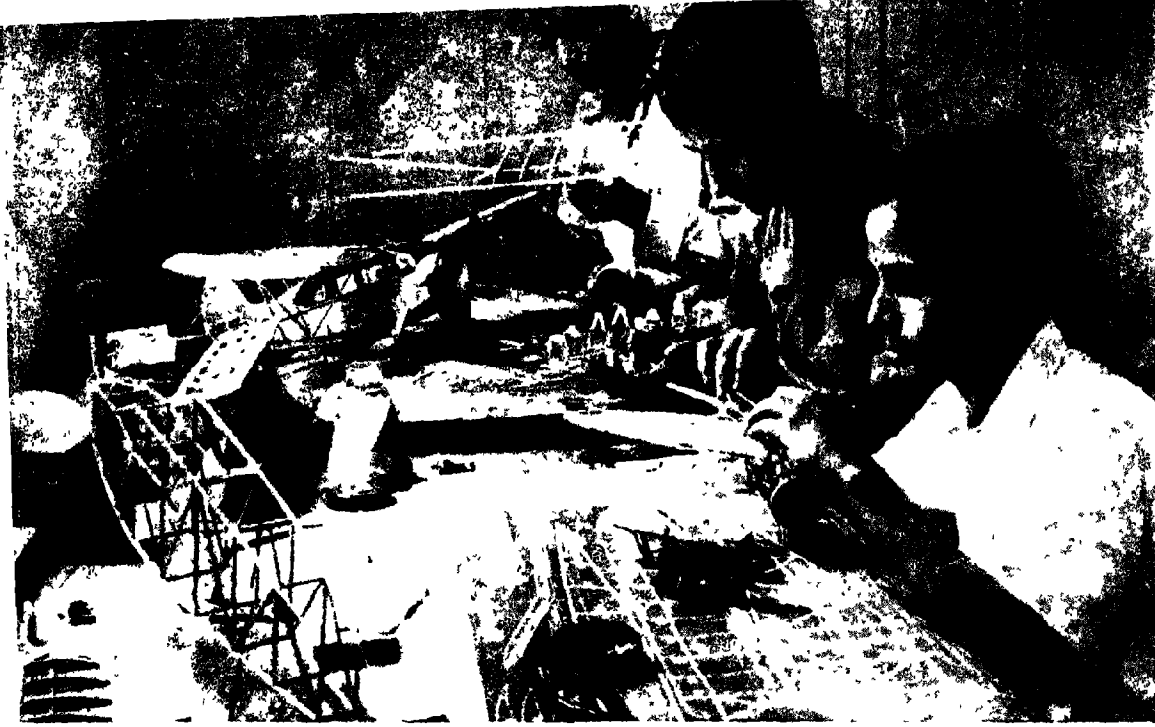
یہ نوعمر انجینئر ہوائی جہازوں کے موڈل بنا رہے ہیں۔ اس کام کیلئے بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔

موڈل بنانے والے

برطانوی شاہی گاڑی کا موڈل بنایا جارہا ہے۔

ہندوستان اب صنعت و حرفت میں بڑی ترقی کر رہا ہے۔ اس لئے یہاں زیادہ سے زیادہ انجینئروں اور فنکاروں کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے بہت سے نوجوان انجینئری میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کالجوں میں جو اعلی فنی تربیت دی جاتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ طلبا پہلے ہی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرکے وہاں داخل ہوں۔ چنانچہ متعدد ادارے اس ابتدائی تربیت کیلئے ہندوستان میں قائم ہوگئے ہیں۔ انہی اداروں میں سے ایک بمبئی کی "سوسوئٹی آف موڈل انجینئرز" ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں مسٹر پولسن نے اسکو قائم کیا تھا۔ اسوقت سے ابتک یہ برابر ترقی میں آگے بڑھتا جارہا ہے اس ادارے میں بنی ہوئی چیزیں فوراً ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ ان کی بکری کے داموں ہی سے اس ادارے کے کل اخراجات پورے ہوجاتے ہیں۔

ماهوش بیگم پارہ

افسانہ نگار عورتیں

مظہر ممتاز

مختصر افسانہ، مرد اور عورت دونوں کی کوششوں سے ترقی کی سنہری منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مضمون میں صرف موجودہ افسانہ نگار عورتوں کے زندہ گروہ کو منتخب کیا ہے۔ اس سے میری مُراد یہ نہیں کہ میں ان کو مردوں کی مخالف صف میں کھڑا کر رہا ہوں بلکہ میں ان کو مردوں کے دوش بدوش ہی سمجھتا ہوں۔ اور زندگی سے میرا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام بقیدِ حیات ہیں اور مختصر افسانے کو زندہ رکھنے، اس کو ترقی دینے میں ممکنہ کوشش کر رہی ہیں۔ اس گروہ میں آپ کو چند ایک عورتیں ایسی نظر آئیں گی جو ابتدا سے افسانوی میدان میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور چند ایک ایسی بھی دکھائی دیں گی جو ابھی ابھی حصہ لینے لگی ہیں۔ میں نے اس چناؤ میں دونوں طرح کا خیال رکھا ہے۔ مقبول اور غیر مقبول عورتوں کا چناؤ۔ ایک وہ جن کا فن پختہ ہو چکا ہے۔ ایک وہ جن کا فن ابھی کچا ہے۔ تازہ کلیوں کی طرح!

چونکہ مختصر افسانے کی عمر بہت کم ہے اس لئے ان عورتوں کی افسانہ نگاری کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ صرف ایک دو ایسی عورتیں ہیں جو اس کی اولین تحریک سے حصہ لے رہی ہیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں، عورتوں میں سب سے پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت میں شرکت کی۔ اور اس جماعت کی شعلہ ریز کتاب "انگارے" میں حصہ لیا جس کو بعد میں حکومت نے شر انگیز باغیانہ کتاب سمجھ کر ضبط کر لیا۔ رشید جہاں کے افسانے اس کتاب میں قدامت اور روایت کے خلاف حد درجہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ اثر اب تک ان کے افسانوں میں رچا رہا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "عورت و دیگر افسانے" میں بھی "انگارے" ایسا تیکھا پن، بیزاری اور بغاوت نظر آتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ پرانی سماج، پرانے نظام، پرانی روایتوں کی بنیادوں کو ڈھا دینا چاہتی ہیں۔ اور نئی سماج، نئے نظام اور نئے رسوم کی بنیادیں رکھنے کی آرزومند ہیں۔ جھوٹی مذہب پرستی پر بھی وہ بے باکانہ طنز کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ موجودہ سوسائٹی کی گندگیوں، کمزوریوں کو بھی بیان کرتی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں قدامت پرست طبقہ چھپا ہے وہاں پر وہ ایک گونجیلا نعرہ بلند کرتی ہیں۔ اور اپنے صحت مندانہ نظریوں کو بیان کرنے سے نہیں چوکتیں۔ ان کو انسانی فطرت کی کمزوریوں کی تصویریں کھینچنے میں بھی کافی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانے ایک ایسی عورت کے گرد گھومتے ہیں جو [illegible] لیکن اس قدامت کی گھٹن سے دور بھاگنا چاہتی ہے۔ نئی زندگی کی کھلی، پاک صاف فضا میں، جہاں سکون کی چاندنی اپنی سنہری کرنیں پھیلا رہی ہو!

آپ خان بہادر شیخ عبداللہ کی صاحبزادی ہیں اور صاحبزادہ محمود الظفر کی بیوی۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے طبی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے خاندان کو ہندوستان بھر میں یہ فخر ہے کہ خاندان کا ہر فرد ڈگری یافتہ ہے۔ (آجکل آپ اپنے شوہر کے ساتھ لکھنؤ ہی میں رہتی ہیں)

اس کے بعد عصمت چغتائی ایسی خاتون ہیں جو اپنے آپ کو نہ تو ترقی پسند کہتی ہیں، نہ رجعت پسند۔ شاید وہ کسی لیبل کو لگانا اسلئے پسند نہ کرتی ہوں کہ اس سے آجکل تعصبی جذبات زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ عصمت کی افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے سب سے پہلا مضمون "فسادی" رسالہ "ساقی" کو بھجوایا تھا جس پر مدیر نے لکھا تھا "آپ کا مضمون اچھا بلکہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ایک نشست میں ختم کر لیا! اسے سالنامے کے لئے رکھ لیا گیا ہے" اسی ہمت افزائی کی وجہ سے وہ آجکل صفِ اول کی افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے ان میں ابتدا سے ہی افسانہ نگاری کی فنی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اور پھر عظیم بیگ کے ماحول نے ان کو اپنی صلاحیتوں کو اُبھارنے کا صحیح موقع دیا۔ بقول عبادت بریلوی "وہ عظیم بیگ سے زیادہ بے باک، زیادہ انتہا پسند ہیں۔ عظیم بیگ کا فن اردو میں کھوکھلی رومانیت اور لایعنی جذباتیت کا ردِ عمل تھا جس کو عصمت نے انتہا کے کمال پر پہنچا دیا" پچھلے سالوں میں جب عصمت نے "لحاف" ایک جنسیاتی نفسیاتی، اور انقلابی افسانہ لکھا تھا تو ملک کے رجعت پسند ذہنوں میں بھونچال سا آگیا تھا۔ کیونکہ عصمت نے بعض سماجی ممنوعات کا ذکر کیا ہے۔ بقول [illegible] "اس افسانے کا مرکزی نقطہ یا تاکیدی نقطہ کوئی دل کا معاملہ نہیں بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے" لیکن میں سمجھتا ہوں عصمت کا یہ افسانہ فنی اعتبار سے اردو ادب کا شاہکار افسانہ ہے۔ اگر وہ افسانے میں ذہنی لذت سے نفرت کا تاثر پیدا کرتیں تو ان کی یہ کوشش بہت کامیاب رہتی!

اب تک عصمت کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "کلیاں" "چوٹیں" اور "ایک بات" ــــ ایک ناولٹ "ضدی" (ان کا ایک اور ناول "ٹیڑھی لکیر" اور ڈراموں کا مجموعہ "شیطان" زیرِ طبع ہیں) ان کا پہلا مجموعہ "کلیاں" جیسے کہ نام سے ظاہر ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی واقعی کلیاں ہیں۔ ننھی منی کلیاں۔ جن میں رنگت ہے، خوشبو ہے، جاذبیت ہے، اور جو پھول بننے کی آرزومند ہیں۔ "کلیاں" کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو ابھی ابھی جوان ہوئی ہے اور جو ابھی اسکول سے کالج میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ "کلیاں" میں گھریلو ملازموں کی مجبوریوں اور ان کی امنگوں کے بھی بہترین نقوش نظر آتے ہیں۔ لیکن عصمت کی فکری تلخیاں "چوٹیں" میں زیادہ ہیں۔ "چوٹیں" میں عصمت پہلے سے زیادہ

کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے وہ ایک چابکدست ناظر کی طرح اپنے اردگرد کی چیزوں کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔ اور اس ماحول میں سانس لینے والی زندگیوں کے تجزیے کرتی جا رہی ہیں اور ان کے افسانوں کو جو چیز جاندار بناتی ہے وہ ان کی بے باک طرز نگارش ہے۔ بقول پطرس "عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت، روانی ہے جلن کا زیر و بم روزمرہ کا سا پھرتیلا زیر و بم ہے"۔ ان کا اسلوب موضوع سے پورا پورا مناسبت رکھتا ہے۔ عصمت اپنے افسانوں میں ذاتی رائے کا کم اظہار کرتی ہیں اور جو موضوع لے آئے۔ زندگی کے جس پہلو سے وہ زیادہ واقف ہیں، اسی کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہیں۔ شاید وہ انہی چیزوں کو بیان کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ بقول منٹو "جب تک عورتوں مردوں کے جذبات کے درمیان موٹی دیوار حائل رہے گی عصمت اس کے چونے کو اپنے تیز ناخنوں سے کریدتی رہے گی"۔ سعادت حسن منٹو کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ "چوٹیں" میں یہی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایسی چوٹیں بھی ہیں جو سماج نے عورت پر لگائی ہیں اور ایسی بھی چوٹیں ہیں جو عورت نے سماج پر لگائی ہیں۔ عمل اور رد عمل یہ سائنٹفک نظریۂ عصمت کے افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے عصمت کو اپنی جنس سے حد درجہ ہمدردی اور خلوص ہے۔ وہ چاہتی ہیں نوجوان لڑکیاں قوت، اعتماد اور یقین حاصل کریں اور اس انتشاری زمانے میں اپنی ہستی کا صحیح مقصد سمجھیں ورنہ جانوروں کی طرح گھروں میں بند رہ کر سوکھتی رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ اس سے قوم کا زیادہ حصہ گل سڑ کر خراب ہو جائے گا اور ان کی نسلیں تباہی کے انگاروں پہ دم توڑتی رہیں گی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے بہت صحیح کہا تھا "عصمت اپنے افسانوں میں معیاری ہستیاں پیش نہیں کرتیں۔ وہ گوشت و خون کے پتلے ہمارے سامنے لا کھڑی کرتی ہیں جن میں محاسن و معائب کا ایسا ہی قدرتی امتزاج ہے اور کمزوریوں خوبیوں کی ویسی ہی سی ترکیب پائی جاتی ہے"۔ عصمت کے افسانوں کی ہیروئین مجھ کو امریکی فلم "وائٹ کارگو" کی ہیروئین ہیڈی لیمار جیسی نظر آتی ہے جو سفید نسل کے مردوں سے اپنی عزت آبرو بیچ کر انتقام لیتی تھی اور مرد کو زہر دے کر مار ڈالتی تھی۔ میں عصمت کو موجودہ افسانہ نگاروں میں بہترین فنکار سمجھتا ہوں۔ بقول پطرس "عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے اور عصمت کے کارناموں کے لئے اردو خوانوں کو ہی نہیں بلکہ اردو ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہیے"۔

عصمت، عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی چھوٹی بہن ہیں۔ علی گڑھ سے انھوں نے بی۔ اے، بی ٹی پاس کیا ہے اور علی گڑھ ہی میں ان کو علم نفسیات کے مطالعے، مشاہدے کا زیادہ موقع ملا۔ اور یہیں سے ان کے نفسیاتی، جنسیاتی نہاد اور جنسیات نگاری کا زور بڑھ جاتا ہے۔ کچھ دنوں عصمت جے پور، بمبئی کے اسکولوں میں استانی بھی رہیں لیکن آجکل وہ پونا میں اپنے شوہر شاہد لطیف کے ساتھ مقیم ہیں۔

اب ایک خالص رومانی افسانہ نگار حجاب امتیاز علی ہیں جو رومان، خالص رومان کو ہی اپنے افسانوں میں لکھے جاتی ہیں۔ میرے خیال میں خالص رومان، خاص حقیقتوں کو پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رومانیت کی پروازیں عقلی نہیں ہوا کرتیں۔ اس میں ذاتی وجدان کا عنصر حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور پھر موجودہ ترقی پسند دور میں خالص رومانیت کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ ایک نئے ماحول نئی سوسائٹی میں رہتے بستے ہوئے بھی ایک تخیلی دنیا کی تصویریں کھینچتی ہیں جس میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ کوئی زندگی — ! ان کے رومانی افسانوں کے موضوع، کردار، ماحول، سب ایک مخصوص رنگ میں لپٹے ہوتے ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے ان کے افسانوں کا دور اب ختم ہو چکا۔ اب ان کے افسانے بیتابی سے پڑھے نہیں جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے انہوں نے اپنے مخصوص ماحول خوبصورت اسٹائل سے انحراف نہیں کیا ہے۔ اب کسی جوان لڑکی کی یہ خواہش نہیں ہوتی وہ روحی بنے، روحی بننے کی تمنا محض بہلاوا اور میٹھا خواب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اب زمانہ، ماحول اور زندگی — سب کچھ بدل چکے ہیں! ان کے افسانے جو "ہیبتناک اور خوفناک" ہیں کچھ کچھ مغربی اثرات کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ایسے افسانے بہت کامیاب ہوا کرتے ہیں اور ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر بھی خوفناک اثرات ڈالتی ہیں اور اس کو اسی دہشتناک ڈراؤنے ماحول میں گم سم کر دیتی ہیں۔

حجاب — سید محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کی صاحبزادی ہیں جو نظام سرکار کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اور حجاب حیدرآباد میں ہی پیدا ہوئیں آپکی والدہ عباسی بیگم مرحومہ بھی ایک مشہور ادیبہ تھیں ۱۹۲۳ء کے بعد سے ازدواجی زندگی میں بھی آپ کو امتیاز علی تاج کا ادبی ماحول نصیب ہوا جہاں آپ کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے کا زرین موقع ہاتھ آیا۔ آپ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور ہوا باز بھی ہیں ۱۹۳۵ء میں آپ نے ہوا بازی کا (A) لائسنس حاصل کیا ہے۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے چند سال بعد صحت خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے نفسیاتی علاج کا مشورہ دیا چنانچہ آپ نے سگمنڈ فرائڈ مشہور نفسیاتی ماہر کے شاگرد جو لاہور میں رہتے ہیں — ان سے نفسیاتی علاج کرایا جس سے آپ کی صحت اب بہت اچھی ہے۔ اب تک آپکی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں: "لغزۂ حیات"، "ادب لطیف"، "میری ناتمام محبت"، "لاش"، "صنوبر کے سائے"، "خلوت کی انجمن"، "ظالم محبت"، "تحفے"، "ممی خانہ"، "کاؤنٹ الیاس کی موت"۔

ایک اور خالص رومان پسند طاہرہ دیوی شیرازی ہیں۔ یہ آجکل زیادہ

لکھا نہیں کرتیں۔ بہت پہلے لکھا کرتی تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا دور بھی ختم ہو چکا۔ ان کی تحریریں نیازی رنگ میں رنگی ہوتی تھیں۔ اور افسانوں کی ہیروئین کا کردار وہی "نیازی" "عورت" کا سا تھا۔ ان کی کتاب "سحر بنگال" میں یہی چیز نمایاں ہے۔ وہ جذبات کی رنگین بیانی سے شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہیرو ہیروئین کو محو کر دیتی تھیں لیکن اس میں کوئی حقیقت نہ ہوتی تھی محض شاعرانہ مبالغہ ـــ انکا موجودہ ترقی پسند ادب میں کوئی نمایاں درجہ نہیں۔ ان کو چاہئے کہ "ادب برائے ادب" کے نظرئیے کے بجائے" ادب برائے زندگی" پر کاربند ہوں۔

طاہرہ نسلاً ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں۔ آپ کو فرانسیسی فارسی بانوں سے بھی اچھی طرح واقفیت ہے۔ آپکو شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنیکا بھی موقع ملا۔ طاہرہ کو سیر و تفریح سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ایران، چین کی سیاحت بھی کر آئی ہیں۔

دہلی گروپ کی لکھنے والیوں میں زیادہ ترقی پسند صدیقہ بیگم سیوہاروی ہیں۔ رشید جہاں کی طرح ان کے خیالات بھی اشتراکی ہیں اپنے افسانوں میں غریب، مزدور کے ساتھ سرمایہ دار کی کشمکش کو دکھلاتی ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ غریب مزدور بھی انسان ہی گوشت و خون کا انسان ـــ اسکو بھی سکون، آرام، خوشی کی ضرورت ہے وہ کولہو کا بیل نہیں جس سے سرمایہ دار من مانے کام لیتے ہیں اس کو اس کے کام کا معمولی معاوضہ بھی نہیں دیتے! بقول احتشام حسین: "حساس غریبوں کی زندگی جو مفلسی ناداری اور بھوک کی وجہ سے اپنی ایک الگ نفسیاتی کیفیت رکھتے ہیں ان کے افسانوں میں بہت آتی ہے۔ اور اس بڑی حقیقت کی قائل معلوم ہوتی ہیں کہ مادی حقیقت ہی اصل حقیقت ہے۔ اس میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ خیالوں کی رو بھی بدل سکتے ہیں!"

اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے گھریلو واقعات کی الجھنوں کا بھی عکس نظر آتا ہے اور کہیں کہیں تلخ حقیقت نگاری سے زندگی کی خوفناک سچائیوں کو عریاں کرتی ہیں جو ان کے ترقی پسند ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ ان کا

غزل

رعنا اکبر آبادی

یہ درد محبت ہوس خام نہیں ہے ✤ آغاز یہاں تشنۂ انجام نہیں ہے

جز مرگ وفا عشق کا انجام نہیں ہے ✤ تو سوگ میں کیوں ہے یہ ترا کام نہیں ہے

دیکھے تو کوئی کوشش اخفائے محبت ✤ مرتا ہوں مگر لب پہ ترا نام نہیں ہے

اس بزم تماشا میں ہے قحط نظر و دل ✤ جلوہ ترا عریاں ہے مگر عام نہیں ہے

قصے مری مستی کے ہیں مینوشی کے چرچے ✤ رنگین فضاؤں پہ کچھ الزام نہیں ہے

پیغام محبت کا جواب آ تو چکا ہے ✤ کیا بیخبری حسن کا پیغام نہیں ہے

اب خود ہوں محبت میں تمنائے مجسم ✤ اب ان کی تمنا سے کوئی کام نہیں ہے

آئے ہیں وہ خود پرسش احوال کو رعنا

کس منہ سے یہ کہہ دوں مجھے آرام نہیں ہے

انداز بیان سیدھا سادھا اور شگفتہ ہے

صالحہ عابد حسین کی افسانہ نگاری کی مقبولیت زیادہ نہیں۔ پھر بھی دہلی گروپ کی عورتوں میں ان کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس اکثر ایسی عورتیں ہیں جن کے ورثے میں ادبی میراث ملی ہے۔ آپ کا تعلق مولانا حالی سے ہے۔ آپ کے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم بھی بلند پایۂ ادیب تھے۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ہندوستان کے مشہور ادیبوں میں سے ہیں۔ اور پھر آپ کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین جرمنی فلسفے کے ایک نامور ترجمان ہیں۔ اسی ادبی پس منظر اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ زیادہ رچا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا ادبی میدان ٹھوس تنقیدی ادب کے بجائے افسانوی ہلکا پھلکا ادب ہے۔ میں آپ کو ترقی پسند اس لئے سمجھتا ہوں کہ آپ زیادہ تر حقیقی واقعات کی عکاسی کرتی ہیں جس میں انسان کے غم اور اس کی خوشیاں ہوا کرتی ہیں۔ خود آپ کا خیال ہے "کہ سچے واقعات جو دل پر گہرا اثر ڈال سکیں ... افسانے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ انسان کی زندگی اور موت کو ہمدردی سے دیکھوں اور سچائی سے دکھلاؤں۔ اور اپنے قصے کے کردار سے اس طرح گھل مل جاؤں کہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھ سکوں۔"

ایک اور ابھرتی ہوئی افسانہ نگار سحاب قزلباش ہیں۔ ان کا تعلق بھی ادبی سرپرستوں سے ہے۔ آپ کے والد آغا شاعر قزلباش مرحوم دہلی کے مشہور شاعر تھے۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "بدلیاں" پڑھکر یہ اندازہ ہوتا ہے آپ میں لکھنے کی فنی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کتاب کے افسانے ایک ایسی نوجوان لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو رومان کو ہی زندگی کا سنہری مقصد سمجھتی ہے۔ لیکن سحاب کے افسانے حجاب کی طرح خالص رومان کے عکاس نہیں۔ ان میں سچی بے لوث اور پاک محبت کا بیان ہے۔ محض خیالی

وابستہ ہی نہیں - اور حجاب کو مستقبل قریب میں حجاب سے جو چیز نمایاں درجہ دلائیگی وہ افسانوں میں تاثر اور شگفتگی ہے۔ حقیقت افروز واقعات کی صحیح عکاسی اور گہری معنویت ہے!

پنجاب گروپ میں حجاب کے بعد ناہید عالم ادب کے نیلگوں آسمان پر چمکتی نظر آتی ہیں۔ بہت قلیل عرصے میں انہوں نے شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر ماہنامہ "چمنستان"، "عالمگیر" میں شائع ہوتے ہیں، ان کو پڑھ کر ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ناہید میں ابھرنے کی صلاحیتیں زیادہ ہیں۔ ان کے افسانے ایک کالج گرل، کنواری لڑکی کی امنگوں، آرزوؤں، تمناؤں کی مختلف تصویریں کھینچتے ہیں، جن میں میٹھی میٹھی سی چبھن اور کسک ہے۔ افسانہ "کھلاڑی" میں انہوں نے دبی دبی محبت کا اظہار بہت ہی دلچسپ، فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ اسی طرح "...." میں بھی انہوں نے ایک نوجوان لڑکی کے اندیشوں کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔ لاشعوری ذہن کے نفسیات نے افسانے کو شاہکار بنا دیا ہے۔ ہمیں ناہید سے بہت سی امیدیں ہیں کیونکہ وہ اس تاریک سیارہ میں ناہید بنکر چمکی ہیں تاکہ ادب جدید کی تاریکیوں کو دور کرسکیں!!

اب لکھنوی گروپ میں تین بہنوں کا ایک چھوٹا سا گروپ زیادہ مشہور ہے۔ یہ گروپ بیگم درانی۔ خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور پر مشتمل ہے - ان میں بیگم درانی بہت کم لکھا کرتی ہیں۔ شاید ازدواجی زندگی کی الجھنوں کی وجہ سے — لیکن خدیجہ اور ہاجرہ زیادہ لکھا کرتی ہیں۔ پہلے پہلے ان دونوں بہنوں کے افسانوں میں ایسی یکسانیت ہوا کرتی تھی کہ یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا تھا فلاں افسانہ کس نے لکھا؟ خدیجہ نے یا ہاجرہ نے! شاید اس یگانگت کی وجہ ان کی زندگیوں کا پس منظر ہو۔ کیونکہ دونوں کی پیدائش میں دو سال کا فرق ہے خدیجہ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں اور ہاجرہ مسرور ۱۹۲۹ء میں۔ دونوں ابتدائے شباب میں ساتھ ہی ساتھ پڑھیں اور بڑھیں - ایک ساتھ افسانے لکھے اور پھر نصب یہ کہ ایک ساتھ ہی چھپے لیکن اب ان کے افسانوں کی فضا، مواد، موضوع اور طرز بیان میں کچھ کچھ نمایاں تبدیلی ہوچکی ہے۔ خدیجہ مستور کے افسانوں میں پختگی گہرائی ہے، اور ہاجرہ کے افسانوں میں روانی اور فن کا زیادہ احساس پایا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر وقار عظیم "خدیجہ کے افسانے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ ان کے انداز کی جرأت اور بے باکی زندگی کے معمولی سے واقعہ میں بھی ایک عجیب کشش پیدا کرتی ہے - زبان کی صفائی، سادگی، ہلکی پھلکی ادبیت، ایک خاص قسم کی تشبیہوں کی چمک اور افسانے میں خود بخود ابھرتے ہوئے تصور ز اکثر ان کے افسانوں میں ایک دلکشی اور تازگی پیدا کردیتے ہیں" اور ہاجرہ کے افسانوں میں زیادہ تر ایسی عورتوں کی کہانیاں ہوا کرتی ہیں - وہ عورت جو ماں، بہن، بیوی بن کر اور ان تمام رشتہ داریوں سے الگ صرف عورت رہ کر طرح طرح کے ارمانوں آرزوؤں اور ان گنت دھڑکنوں کا گہوارہ ہے - جو روتی ہے، ہنستی ہے، قربانیاں کرتی ہے - ہزاروں طرح کی آگوں میں جلتی ہے - ہاجرہ نے اپنے افسانوں میں عورت اور اس کے دل کی کہانی ماحول کو بدل بدل کر سنائی ہے اور اس نت نئی فضا میں ہر جگہ کہانی کا عنصر دلچسپ ہے "

یہ تین بہنیں حضرت احمق پھپھوندوی کی لڑکیاں ہیں جن میں سے بیگم درانی کی شادی ہوچکی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ خدیجہ کی "کھیل"۔ ہاجرہ کی "چرکے" (اور خدیجہ کی "بوچھار"، ہاجرہ کی "ہائے اللہ" زیر طبع ہیں)!!

ایک اور لکھنوی گروپ سے تعلق رکھنے والی قرۃ العین حیدر ہیں - آپ بھی اردو کے مشہور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم مرحوم کی صاحبزادی ہیں آپکی والدہ نذر سجاد حیدر بھی اچھی افسانہ نگار رہیں - قرۃ العین کو ادبی میراث ماں باپ کی طرف سے ملی ہے جسکا وہ صحیح استعمال کررہی ہیں۔ قرۃ العین نے پچھلے سال دہلی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی - اور آجکل لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے کی تعلیم حاصل کررہی ہیں - ان کے افسانے بقول تیرتھ پہلے پہلے حجاب کے انداز میں رنگے ہوئے تھے لیکن ان کے افسانوں کا پس منظر تخیلی ماحول کے بجائے جدید انگریزی ماحول سے بنا ہے - اور ان کی تحریر میں زیادہ روانی اور حسیتی ہے اور ہری اونچے متوسط طبقے کے ساز و سامان اور معاشرتوں کا ذکر — لیکن بعد میں وہ ان چیزوں کو اس طرح پیش کرنے لگیں جیسے ان کا مقصد اس زندگی کی سطحیت، کھوکھلا پن دکھلانا ہو" لیکن میرا خیال ہے حجاب سے زیادہ ان پر اپنے ابا مرحوم کا اثر زیادہ ہے (یہ اثر اس وجہ سے گہرا ہے کہ سجاد حیدر مرحوم افسانوں کے لکھنے جاتے تھے اور قرۃ العین ان کو لکھتی جاتی تھیں) اور ان کے افسانوں میں مشرقی مغربی ماحول کا بھی کچھ ایسا دلکش امتزاج ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مغربی ماحول کو مشرقی ماحول میں ڈھال رہی ہیں مگر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کو مغربی اسلوب، مغربی موضوع مغربی ٹکنیک سے زیادہ دلچسپی ہے (اس کی وجہ ان کی کانونٹ اور مخلوط کالجوں کی تعلیم کا اثر معلوم ہوتا ہے) لیکن یہ ہمارے اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی بھی افسانہ نگار ہیں جو اونچے متوسط طبقے کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اور ان کے بیان میں زیادہ سچائی اور خلوص ہوا کرتا ہے جو دوسری افسانہ نگار عورتوں میں کم نظر آتا ہے - ان کے افسانے ایک کنواری لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو مغربی فیشن کی دلدادہ ہے جسکو سفید نسل کی عورتیں اور مرد، مغربی ماحول مغربی موسیقی سے حد درجہ محبت ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ افسانے خود ان کی اپنی زندگی کے سچے مرقع ہیں یا ان کے مشاہدے کے عکاس ہیں۔ غرض ان کے افسانوں کی ہیروئن حد درجہ رومانی ہے - وہ مغربی فلموں میں

دلچسپی لیتی ہے اور ایکٹنگ کرتی ہے۔ وہ بلیئرڈس، ٹینس، چائنیز چکر، کیرم کھیلتی ہے، اور ان سب کے علاوہ اس کی دلی تمنا ہے کہ شاندار موٹروں، پیکارڈ، ڈی سوٹو، ڈیمیو، مورس، ہلمن کی ایسیڈنگون پر میجک چلاکر کی خاموش سڑکوں پر گھوما کرے۔ مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر نہ جانے دو چیزوں کا کیوں خیال آتا ہے۔ ایک کشمیر کی بہار کا۔ دوسرا امریکی فلموں کی ایکٹرس سو تھا ہوفی۔ شاید یہ دونوں ان کے افسانوں کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں اپنے تاثرات ضرور بکھیر دیتے ہیں اور اسی لئے ان کے افسانوں کا پس منظر شفیق الرحمن کے افسانوں کے شوخ رنگوں کی طرح سرخ، نارنجی، زعفرانی نظر آتا ہے۔ افسانے کے عنوان بھی بڑے جاذب نگاہ رکھتی ہیں جیسے "دیودار کے درخت"، "دریچے کے سامنے"، "کوئی گاتی بہتی رہی"، "پرلز کے لئے"، "ستاروں سے آگے"، "آہ اے دوست" اور بعض وقت مصرعوں کو افسانوں کا عنوان بنادیتی ہیں، جیسے "میری گلی میں ایک پردیسی"، "سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیمیاگر تھا" — سچ تو یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ ایک مکمل شعر و نغمہ میں ڈوبا ہوا گیت ہے جس کا ہر بول شیریں اور میٹھا ہے!!

ایسے ہی رنگ میں لکھنے والی بیگم تسلیم چھتاری ہیں۔ آپ کا اصلی نام میمونہ تسنیم ہے لیکن نواب صاحب طالب نگر کے فرزند نواب سلیم سے شادی کرنے کے بعد آپ نے اپنا نام تسنیم سلیم رکھ لیا ہے۔ آپ نواب صاحب چھتاری وزیر اعظم ریاست حیدرآباد کی صاحبزادی ہیں۔ بسنہ ۱۹۲۷ء میں نینی تال میں پیدا ہوئیں۔

لیکن تسنیم کے افسانے قرۃ العین حیدر سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ قرۃ کے افسانوں کی طرح سرخی مائل ہوا ہے۔ اور کہیں کہیں زردی مائل شیاہ۔ کیونکہ ان کے افسانوں میں بہاروں کی تازگی نہیں ہوتی، بلکہ خزاؤں کی سی ویرانی روتی رہتی ہے۔ اور غم و الم کے شعلے رقص کرتے رہتے ہیں۔ اور قرۃ العین کے افسانوں میں زندگی ناچتی گاتی، چلتی پھرتی، ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ دونوں اپنے نرم دلوں کے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ لیکن تسنیم کے افسانے یوں معلوم ہوتا ہے۔ سکون آمیز جھیلیں! اور قرۃ العین کے افسانے دوڑتی لپکتی ہوئی نہریں!! ان کا خود خیال یہ ہے۔ "ہمیشہ المیہ چیزوں سے دلچسپی رہی ہے۔ میرے افسانوں کا مقصد نہ اصلاحی ہے نہ اخلاقی۔ میں صرف اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں"! افسانہ "کسک" ایسا معلوم ہوتا ہے خود ان کی زندگی کا عکس ہے۔ اور ان کا نیا افسانہ "جنگلی" بھی اس کی تائید کرتا ہے کوئی غم ہے جو ان کو اپنے غمگین جذبات کے اظہار کرنے پر مجبور کررہا ہے۔ مجھ کو ان کے افسانے پڑھ کر اس لئے خوشی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ نوابی شان و شوکت میں اپنے والی لڑکیوں کی زندگیوں کے تجزئے کرتی ہیں۔ انکا نوابی غرور محبت کے مقتولوں پر دفن ہو جاتا ہے۔ مسز تسنیم آجکل اپنے شوہر نواب سلیم کے ساتھ "بارہ چکیہ" میں رہتی ہیں جہاں فطرت کا خاموش حسن بکھرا پڑا ہے۔)

علی رشید بھی نئے چاند کی طرح ابھرتی جارہی ہیں یہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی ہیں (اور آجکل مسلم گرلز کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کررہی ہیں) اپنے ابا کی طرح ان کی تحریر میں شگفتگی، طنز اور مزاح کی جھلکیاں ہیں جو دوسری عورتوں سے ان کو امتیاز کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسری عورتیں زیادہ تر سنجیدہ افسانے لکھتی ہیں۔ اگر یہ اپنے مزاحیہ شمائل پر ہی لکھتی رہیں تو مستقبل قریب میں اپنے ابا کا درجہ حاصل کرسکتی ہیں"!

اب ایک کہنہ مشق نجیب آباد کی لکھنے والیوں میں سے شفیق بانو ہیں۔ ان کی ایک کتاب "باغی لڑکی" بھی شائع ہوئی ہے۔ ان کے افسانوں میں گھریلو جھگڑوں کا ذکر بہت عمدگی سے ہوا کرتا ہے۔ اور وہ ان جھگڑوں کے نتائج کو دکھلا کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ یہی جھگڑے ہماری زندگی کو گھن لگا رہے ہیں۔ ان کو ختم کردینا چاہئے۔ بقول آصف علی "اردو لکھنے والیوں میں شفیق بانو نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کی ہے وہ ان کی فطرتی ذہانت، مشاہدہ کی استعداد اور اس زبان کے قلمبند کرنے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ حقیقت کا فطری، سادہ زبان میں ظاہر کردینا ہی ادبی عمارتوں کی بنیاد ہے" غرض ان کے افسانوں میں بھی مسکراہٹوں اور خوشیوں کا ذکر کم ہوتا ہے۔ اور بے زاری اور غم کا ذکر زیادہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا دل بہت حساس ہے جو ہر معمولی دکھ سے گہرا اثر قبول کرتا ہے!!

صوبہ بہار کے گروپ میں شکیلہ اختر بلند مقام پر نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانے موجودہ کالج گرل، غریب، مزدور، بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات، احساسات اور ان کی امنگوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ان کا اپنا ذخیرہ اتنا اچھا ہے کہ افسانے میں نگینہ سا کام دیتا ہے۔ مگر یہ ان کی نفسیاتی کیفیت، اور زندگی کی ہلچل اور نشیب و فراز کو دکھلانے کے ساتھ ساتھ منظر کشی زیادہ کرتی ہیں جس سے بعض وقت اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن شکیلہ میں فن کا زیادہ احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے تمام افسانے فنی لحاظ سے بہت کامیاب ہوا کرتے ہیں۔

شکیلہ آجکل ہوڑہ میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک کتاب "درپن" بھی شائع ہوئی ہے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ چلنے والی عصمت قدر بھی ہیں۔ جو غریبوں مزدوروں کے دکھ درد کی تصویریں کھینچتی ہیں۔ ان میں بھی پختگی اور گہرائی ہے۔ عورتوں کی لغویات، گھریلو زندگی کی کشمکش کی تصویر کشی اچھے انداز میں کرتی ہیں!! کوشلیا اشک بھی اچھا لکھنے لگی ہیں۔ ان کو درد کے جذبات و احساسات کے اجاگر کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے اکثر افسانوں میں اسی چیز کو بیان کیا ہے۔ مجھ کو ان کے افسانوں کا رنگ زردی مائل مٹیالا نظر آتا ہے جو کسی قدر غمگین جذبے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ

ہندو عورتیں بھی اردو میں افسانے لکھ رہی ہیں۔ یہ پہلے ہندی میں لکھا کرتی تھیں۔ لیکن اب اردو افسانے میں شاندار اضافہ کرتی جا رہی ہیں۔ آپ کوشلیا ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئیں انہوں نے بی اے فرسٹ کلاس پاس کیا اور ۱۹۴۰ء میں بی۔ ٹی۔ آپ اردو وہندی کے ترقی پسند ادیب اپندر ناتھ اشک کی بیوی ہیں۔

ایک اور ابھرتی ہندو فنکار سرلا دیوی ہیں۔ آپ اردو کے مشہور ادیب کرشن چندر کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کے افسانے "ساقی" "نیا دور" میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے دل میں دماغ میں — خونیں سماج اور ظالم مرد کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ کیونکہ وہ عورت کو ایک حقیر کیڑا نہیں سمجھتیں۔ بلکہ ایک انسان کی طرح اس کو جینے کی تلقین کیا کرتی ہیں ان کی طرز نگارش میں ایک باغیانہ پن ہے لیکن ان کا باغیانہ نعرہ زندگی کی تخریب نہیں کرتا بلکہ تعمیر کرتا ہے۔

غرض جذبات کی بے باکی، پلاٹ کی گنجان فضا، نئی ترکیبیں، نفسیاتی الجھنیں، انوکھی تشبیہیں، اشارے ان سب کا امتزاج ان کے افسانے کو جاندار بنا دیتا ہے۔ مجھکو انکا مستقبل شاندار نظر آتا ہے۔ سرلا آجکل دہلی میں رہتی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی نوجوان افسانہ نگار عورتوں میں مجھ کو زینت ساجدہ زیادہ پسند ہیں! ان میں ترقی پسند رجحانات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور پھر ان کے افسانوں میں ہم کو ایسا ماحول ملتا ہے جس کی جھلک بہت کم ملتی ہے۔ وہ ہے حیدرآباد کا ماحول — کیونکہ ہمارے اردو افسانے میں ہندوستان کے ہر صوبے اور دیہات کی تصویریں چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں) ان کے افسانے ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتے ہیں جو رومان کرنا چاہتی ہے لیکن پردہ کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کے جذبات سینے میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں وہ اپنے افسانوں میں اس پردہ نشین لڑکی کے جذبات دکھلاتی ہیں جس کی شادی ہونے والی ہوتی ہے۔ جو اپنے شوہر کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے — ان کی تحریر میں ہم آہنگی اور تنوع ہے۔ تشبیہوں استعاروں کی بھی جدتیں خوب ہوا کرتی ہیں۔ زینت نے پچھلے سال جامعہ عثمانیہ سے بی اے پاس کیا ہے اور اب ایم اے میں پڑھ رہی ہیں!

جہاں بانو بھی ایک اچھی ادیبہ ہیں۔ ان کے افسانے، مضامین سبھی رنگین، دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے پاس کیا اور کلیہ اناث میں لکچرار ہیں۔ آپ کی ادبی دلچسپی کی وجہ سے کلیہ اناث کی نوجوان لڑکیوں میں ادب سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو چکا ہے۔ آپ کی ابتک چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ایک افسانوں کا مجموعہ "رفتارِ خیال"، ایک خطوط کا مجموعہ "بربطِ ناہید" اور مضامین کا مجموعہ "فتراک" اور تنقید کی کتاب "محمد حسین آزاد"!!

اب ایک اور جنوبی ہند کی ترقی پسند افسانہ نگار ممتاز شیریں ہیں جن کے افسانے ساقی، نیا دور، عالمگیر، ادبِ لطیف میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ "انگڑائی" کا مرکز ایک اہم نفسیاتی حقیقت ہے۔ ایک نوخیز پردہ نشین لڑکی اپنی ہی جنس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اور جب وہ اپنی محبوب کو مدتوں بعد دیکھتی ہے تو اس کی خفتہ امنگیں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن اسکی ہم جنسی محبت ناپائیدار رہتی ہے۔ کیونکہ جب اس کی نظریں مخالف جنس سے دوچار ہوتی ہیں تو وہ اس کی طرف بے اختیار کھنچ جاتی ہے اور اپنی پہلی محبوب سے بے پرواہی نہیں ہو جاتی بلکہ اس کو اپنے نئے محبوب کا ذکر کرکے جلانا چاہتی ہے۔ یہ ایک بہترین نفسیاتی نکتہ ہے جسکو ممتاز شیریں نے عصمت چغتائی کی طرح فن کی آڑ لے کر پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے "آئینہ" "شکست" "گھنیرے بادل" "اپنی نگریا" گہری نفسیاتی کیفیت، مشاہدہ کی باریک بینی کے عکاس ہیں۔ ان کے کنایوں، استعاروں اور تشبیہوں میں نیا پن ہوتا ہے اور تحریر کی روانی اور شگفتگی افسانوں میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ [illegible] میں پیدا ہوئیں [illegible] میں مہارانی کالج بنگلور سے بی اے پاس کیا اور آجکل [illegible] مقیم ہیں۔

کون سنے گا من کی بات — عرش ملسیانی

من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات
گھنگھور گھٹا کی جھلمل بجلیاں بھیانک کالی رات
[illegible] گرجے بجلی چمکے اور بھری برسات
ایسے میں اپنے ساجن کو ڈھونڈت ڈھونڈت ہاری
من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات
من میں راکھوں من کی بات

دیس میں رہ کر اب کیا ہوگی پیا گئے پردیس
تن پر راکھ ہے ہاتھ میں مالا جوگن کا ہے بھیس
پریتم میرا سب سے نیارا میں پریتم سے نیاری
من کی بات ہے مجھ سے نیاری من میں راکھوں من کی بات
پی سے کہوں گی من کی بات

ساگر سے ملنے ندی ابھاگی ہے بے بس
ساجن مجھ کو آپ ہی لے گا کھوج ہے میرا کام
اپنے آپ [illegible] آؤ ناری [illegible] ساری
پریتم من کی بات سنے گا پی سے کہوں گی من کی بات

تمناؤں کے جھولے میں

افسانہ

شاہدہ خاتون ملک چکوی

اور یکے بعد دیگرے اس کے چار بڑے بھائی بہن لقمۂ اجل ہوتے گئے۔ اس کی بڑی بہن ریحانہ اسے اس قدر پیار کرتی تھی۔ دن رات اسے پالنا جھلاتی۔ اور وہ پالنے میں جھولتے جھولتے بچپن کی میٹھی نیند سو جاتی —— معصوم نیند —— !

پھر جب وہ ذرا اور بڑی ہوئی تو بھی ریحانہ کی محبت ویسی ہی تھی۔ اس کی نظر میں وہ اب بھی پالنا ہی جھلانے کے قابل تھی۔ گھر میں اُگے ہوئے نیم میں ریحانہ نے جھولا ڈال دیا تھا اور اسے اپنی گود میں لے کر ہلکی ہلکی پینگیں لیا کرتی اور گنگناتی جاتی —— "آجا ری انندیا تو آ کیوں نہ جا" —— ہلکی ہلکی پینگوں سے اس کی باجی کے اڑتے ہوئے آنچل کی سرسراہٹیں۔ اور پھر مشفقانہ تھپکیاں —— اسے خواب کی دنیا میں لے جاتیں۔ اور جھولا کرتی —— مسلسل —— متواتر —— !

وہ جب آٹھ سال کی ہوئی تو شہر میں ہیضہ پھیل گیا —— اور یکے بعد دیگرے اس کے چار بڑے بھائی بہن لقمۂ اجل ہوتے گئے۔ کوئی اتنی زیادہ سمجھ تو اسے ہوئی نہ تھی —— ماں کو روتے دیکھ کر —— جانے کیوں وہ بھی معصومانہ انداز سے بلک کر رو دی —— مگر اس کے معصوم قطرات اشک بھی فرشتۂ موت کے دل کو نرم نہ کر سکے۔ بھلا آنسوؤں کی التجا کو قدرت کیوں شرف قبولیت بخشے —— ؟ وہ تو دنیا کے غم و آلام سے بے فکر —— لاپروا —— اپنے قوانین پر عمل کرتی ہے —— اور اس نے دیکھا کہ اسے محبت کے جھولے میں جھولانے والی آپا —— چند آدمیوں کے کاندھوں پر جھولتے ہوئے چلی جا رہی ہے۔ جانے کہاں ؟ اور وہ دیکھتی رہی —— حدِ نگاہ تک —— !

اور تب وہ ماں باپ کی اکلوتی رہ گئی —— ساعتیں —— پہریں —— دن —— راتیں —— مہینے —— سال —— گذرتے گئے —— نقوشِ ماضی مدھم ہوتے چلے گئے۔ پنہاں ہوتے چلے گئے —— وہ بڑی ہوتی گئی —— !

اور اسے جھولنے کی عادت ہو گئی تھی —— ننھے بچوں کو کھونے کے بعد —— ماں کی محبت صرف اس کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی —— وہ ماں کی تمناؤں کے جھولے میں —— جھولتی رہی —— جھولتی رہی —— بعض وقت وہ ایسا محسوس کرنے لگتی جیسے وہ تمناؤں کے جھولے میں بیٹھی ہوئی —— اڑی جا رہی ہو —— آسمان کی بیکراں وسعتوں میں —— افق کے پار —— جھولے کے مانند لٹکتے ہوئے چاند کی طرف —— چاندنی جھولے میں —— چاندنی راتوں میں —— سفید چاندنی راتوں میں —— برگزیدہ ضعیف کے قلب کی طرح سفید —— چاندنی راتوں میں —— چاندنی جھولے میں جھول رہی ہو —— نگینے لگے ہوئے مخملیں جھولے میں —— مگر یہ صرف خواب ہوتا —— حسین خواب —— !

بتدریج اس کی آشائیں —— اس کے معصوم دل کے پالنے میں جھولنے لگیں —— نت نئی امنگیں —— ارمانوں کی ڈال پر —— آرزوؤں کے جھولے میں —— تمناؤں کے سہارے جھولنے لگیں —— اب وہ سولہ برس کی تھی —— شباب کی امنگیں —— یکبارگی —— اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ —— اس دل میں کسک پیدا کرنے لگیں —— اور اب وہ جھولتے جھولتے —— ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتی —— افق سے پرے —— بہت پرے —— رومان کی دنیا میں —— ! اور کسی فردوسی تخیل میں محو —— وہ ایک عجیب انداز سے جھولے میں سو جاتی —— جانے عالم خواب میں وہ کیا سوچتی ؟ وہ اب خود سے پینگیں لینا پسند نہ کرتی —— محض تنہا جھولنا —— دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں ایک دبی دبی سی تمنا پیدا ہوئی —— کوئی اسے پینگیں دیتا اور لوری دے کر جھولے جھلاتا —— "سو جا راجکماری سو جا" —— وہ اداس غمگین، خموش خموش رہنے لگی —— !

ایک دن ایسے ہی —— جھولے میں بیٹھی بیٹھی —— خیالات میں غرق وہ نیند کی آغوش میں دراز ہو گئی —— ایک گلزار —— رشک فردوس —— چمن میں پہنچ گئی —— وہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی —— حیران تھی کہ کہاں پہنچ گئی —— ؟ اور پھر اس کی نگاہ گلاب کے پودوں کی کیاریوں کے درمیاں ایک جھولا دکھائی دیا۔ جس کی ڈوریوں سے عشق پیچاں کی بیلیں یوں لپٹی تھیں کہ ڈوریاں نظر ہی نہ آئیں —— وہ اس جھولے میں بیٹھ گئی —— اور —— ایک تمنا —— مبہم سی تمنا اس کے دل میں پیدا ہوئی —— کوئی اسے جھلاتا —— پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا —— ایک حسین نوجوان —— شاہانہ لباس میں ملبوس —— تاج زریں —— سر پر رکھے —— اس کی جانب بڑھا آ رہا تھا —— آنکھیں چار ہوئیں —— اس کی خمار آگیں آنکھیں حیا سے جھک گئیں —— وہ شرما کر سمٹ گئی —— وہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا —— اور پھر جھولے کی ڈوریں پکڑ کر اسے جھلانے لگا —— اس کی ماں اسے بیدار کر رہی تھی —— وہ آنکھیں مینچتی ہوئی اٹھ بیٹھی —— نہ وہ چمن تھا —— نہ شہزادہ —— ! خواب —— ! مگر یہ خواب ایک دن پورا ہوا —— اسے پینگیں دینے والا مل گیا —— وہ اسے جھلاتا —— اپنی تمناؤں کے جھولے میں —— !

اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی مجلس

واشنگٹن ۲۰ جون:- اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس امن عالم کیلئے کیا کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اس موضوع پر این۔ بی سی یونیورسٹی کی ہفتہ وار تقاریر کے سلسلہ (ہماری خارجی پالیسی) کی تقریروں میں گزشتہ شب مندرجہ ذیل حضرات نے حصہ لیا:-

(۱) انگریز سائنسدان ڈاکٹر جولین ہکسلے جو اس مجلس کے موجودہ سکریٹری بھی ہیں آپ نے نیو یارک سے تقریر نشر کی (۲) ڈاکٹر اسپنسر سی۔ برولوز جو اس مجلس میں امریکی نمائندہ ہیں اور (۳) چارلس طامسن جو بین الاقوامی اطلاعات اور ثقافتی معاملات کے محکمہ میں مشورے کار ہیں۔ آخری دو مقرروں نے واشنگٹن سے تقریریں نشر کیں۔

سب سے پہلی بات جو ان تقریروں میں کہی گئی یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی سائنسی، تعلیمی اور ثقافتی مجلس کا ابھی تک کوئی وجود نہیں ہے۔ ہکسلے نے کہا کہ یہ مجلس اپنی موجودہ شکل میں اصل مجلس کی تکمیل کے واسطے بنی ہے۔ آپ نے مزید کہا "اس وقت تک ہمارا کام عملہ تیار کرنا اور ان مسائل پر رپورٹ مرتب کرنا ہے جن سے اصل مجلس کو دوچار ہونا پڑے گا۔"

مجلس کے دستور پر اکتالیس اقوام کے دستخط

تقریر کے دوران میں طامسن اور ہکسلے نے کہا کہ مجلس کے اس دستور پر جو گزشتہ نومبر میں لندن میں طے ہوا تھا اکتالیس اقوام کے دستخط ہو چکے ہیں اور ان تمام اقوام کو موجودہ مجلس میں نمائندگی حاصل ہے۔ طامسن نے کہا کہ سات ممالک (برطانیہ، فرانس، نیوزی لینڈ، میکسکو، ہندوستان، شام اور سعودی عربستان) نے اس دستور کو منظور کر لیا ہے اور بہت سی دوسری قومیں اپنی منظوری بھیجنے والی ہیں (نارو کی پارلیمنٹ نے جمعہ کے دن اس مجلس کی رکنیت کو منظور کر لیا)

ہکسلے نے بیان کیا کہ اس مجلس کا دستور رفتہ رفتہ کام دے گا۔ اکثر ممالک کے محکمہ خارجہ اور مجالس قانون ساز اس دستور کا ترجمہ کریں گی۔ اسکا بغور مطالعہ کیا جائے گا۔ اسکے بعد منظوری ملے گی۔ طامسن نے کہا خود ہماری مجلس نمائندگان نے بھی اس تجویز کو ابھی پندرہ دن سے بھی کم ہوئے منظور کیا ہے سینیٹ کی مجلس خارجہ امید ہے عنقریب اس تجویز پر غور کرے گی۔ ہکسلے کو یقین ہے کہ اس مجلس کو عالم وجود میں لانے کیلئے جن دستخطوں کی ضرورت ہے وہ جلد ہی حاصل ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر برولوز نے کہا "اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس مجلس کو فی الفور صحیح راستہ پر ڈالدیا جائے تعلیم رفتہ ہی رفتہ اپنا رنگ اور اثر دکھاتی ہے۔ اگر ہمیں اس مجلس سے تعمیری کام لینا ہے اور بقول وزیر اعظم اٹیلی کے لوگوں کے دماغ میں امن کے استحکامات بنانا ہیں تو ہمیں فوراً ہی یہ قدم اٹھا لینا چاہئیے۔"

اس مجلس کا خاص مقصد

ڈاکٹر برولوز نے کہا "اس مجلس کا خاص مطمح نظر یہ ہے کہ انسانی معلومات کا کل خزانہ اقوام متحدہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جائے متحدہ طور پر سیکھنے، پڑھانے اور غور کرنے سے دنیا والے تمام جہان میں امن عامہ قائم کرنے کے لئے قریب تر ہو جائیں۔ مجلس کا یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ اسکے طریقے بتاتے ہوئے طامسن نے کہا: "ایک طریقہ تو یہی ہوگا کہ تعلیمات سائنس اور فنون میں جو کچھ ترقیاں ہوئی ہیں یا ہوں گی ان سے ہر ملک کو متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا "یہ مجلس فرداً فرداً بھی لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیگی مثلاً طلباء، اساتذہ اور کتابوں کے تبادلہ کے ذریعہ سے۔ گویا یہ مجلس ہر قسم کی رکاوٹوں کو دور کر کے جملہ اقوام عالم میں خیالات کی ایک رو بہا دیگی۔ ریڈیو، اخبارات و رسائل اور سینما سے پورا پورا استفادہ کیا جائے گا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہوگا کہ جو کام بین الاقوامی مزدور سبھا کی مرکزی مجلس گزشتہ پچیس سال سے کر رہی ہے وہی کام اس مخصوص سلسلہ میں یہ مجلس بھی انجام دے گی۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ بین الاقوامی جلسے کئے جایا کریں گے۔

ہکسلے نے اس مجلس کے عملہ کے اراکین کا ذکر کرتے ہوئے کہا "اسوقت تیس اعلیٰ درجہ کے فضلا جو ہر ملک کی نمائندگی کرتے ہیں اس مجلس کے عملہ میں موجود ہیں اس وقت ہم لوگ صرف یہ کام کر رہے ہیں کہ اقوام متحدہ سے متعلقہ ملکوں میں جنگ کی وجہ سے جو تعلیمی، ثقافتی اور سائنسی تخریب ہوئی ہے اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ یہ لوگ پہلے ضروریات معلوم کرتے ہیں اور پھر جنگ کے ستائے ہوئے ملکوں کی ان ضروریات کو ادارہ

فلاح و رفاہِ مشترک" پیدا کر دیتا ہے "

جہالت

ہکسلے نے کہا "اس وقت سب سے زیادہ جو چیز ہماری توجہ کی محتاج ہے وہ ناخواندگی ہے۔ ہم لوگ جلد ان طریقوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جو چین، روس، میکسیکو ترکی، برطانوی نوآبادیات اور دوسرے ممالک میں جہالت کو دور کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً میکسیکو میں جہالت دور کرنے کے واسطے جو طریقے اختیار کئے گئے انہوں نے گزشتہ سال بڑے حیرت انگیز نتائج ظاہر کئے ہیں۔ دوران جنگ کے اختیارات کے زمانہ میں صدر اویلا کماچو نے حکم دیدیا تھا کہ چھ اور چالیس سال کی درمیانی عمر کا ہر ناخواندہ شخص تعلیم حاصل کرے اور ہر تعلیم یافتہ کا فرض ہے کہ وہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو پڑھائے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ستر لاکھ آدمی لکھنا پڑھنا سیکھ گئے "

ڈاکٹر ہرولور نے ہکسلے سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا "ناخواندگی واقعی ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اگر اس مجلس سے حقیقی طور پر امن عالم کو قائم رکھنے کا کام لینا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں خبریں وغیرہ بے روک ٹوک جانے دیں۔ اس مجلس کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے واسطے کیا کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس مجلس کو چاہیئے کہ اخبارات، سینما اور ریڈیو کو بے جا اور فضول پابندیوں سے آزاد کر دے "

ہکسلے نے کہا: مجھکو یقین ہے کہ "ڈوکیومینٹری" فلموں کے ذریعہ سے بین الاقوامی اتحاد اور مفاہمت ایک بڑی حد تک پیدا کی جاسکتی ہے"۔

ڈاکٹر برونو نے ریڈیو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا "میں یقین کرتی ہوں کہ ریڈیو لاکھوں کروڑوں اشخاص سے تعلقات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے آپ نے کہا کہ اس مجلس کو اپنی آواز الگ رکھنی چاہیئے بلکہ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں اس کو اپنے ذاتی ریڈیو گھروں کا ایک جال پھیلا دینا چاہیئے۔

ہکسلے نے ریڈیو کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا بی۔ بی سی نے جنگ کے زمانہ میں یہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ ریڈیو بلاشک زیادہ سے زیادہ آدمیوں تک پہونچنے کا بہترین ذریعہ ہے"

طامسن نے کہا "نیویارک میں "وائس آوف امریکہ" سے جو سرکاری نشریات ہوتے ہیں ان کو ابتک بڑی مقبولیت حاصل ہے" آپ نے یہ بھی کہا "مجھکو بنٹن کے نائب معتمد سے پورا پورا اتفاق رائے ہے کہ ایک ایسی مرکزی ریڈیائی مجلس ہونا چاہیئے جسکے اختیارات مقررہ ہوں اور جو یا تو اقوام متحدہ کو جوابدہ ہو یا اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کو" آپ نے مزید فرمایا "اگر اقوام متحدہ ٹیکنیکل پہلو کو اپنے ذمہ لے تو پر زور طریقہ پر کہوں گا کہ نشریات کا ۷۵ فیصدی حصہ اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے سپرد کر دیا جائے"

ٹیکنیکل مشکلات (مثلاً لہروں اور زبان وغیرہ کے مسائل) کے بارے میں طامسن نے کہا "روسی ریڈیو نے ایک بڑی بھاری گتھی سلجھائی ہے۔ مجکو معلوم ہوا ہے کہ روسی ریڈیو اپنے ملکی حدود کے اندر ستر زبانوں میں اپنے پروگرام نشر کرتا ہے اور بیرونجات کے لئے تیس اور زبانوں میں۔ اگر ہم ایسی چھوٹی چھوٹی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے تو ہم کو کیا امید ہوسکتی ہے کہ ہم متحدہ طور پر جوہری بم ایسے اہم مسئلہ کو آپس میں طے کر سکیں گے۔

بین الاقوامی یونیورسٹی

اس مجلس کی مجوزہ تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں طامسن نے کہا "ہمیں تاریخ کا سبق دینے میں وسعتِ نظر اور ژرف نگاہی دونوں کی ضرورت ہے" ڈاکٹر برونو نے بین الاقوامی یونیورسٹی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا: ایسی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے بہترین عملی اقدام یہ ہوسکتا ہے کہ اساتذہ کیواسطے موسم گرما میں تعلیمی ادارے کھول دیئے جائیں"۔ ہکسلے نے کہا کہ بین الاقوامی سول سروس کی ٹریننگ کی بھی سخت ضرورت ہے۔ طامسن نے کہا "یہاں امریکہ میں سائنسی اور فنی معلومات کے پرچار میں بڑی دلچسپی لی جاتی ہے" انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ارکین عملہ جو اقوام متحدہ کی تعلیمی، ثقافتی اور سائنسی مجلس میں کام کررہے ہیں ماہرین تعلیم اور ماہر سائنسدانوں سے ملے جلے تو علاقہ جاتی اطلاعی مراکز قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، آپ نے کہا کہ اگر اس مجلس کو پورے طور پر موثر بنانا ہے تو ایسے اطلاعی مراکز ضرور قائم کئے جانے چاہئیں۔ ہکسلے نے کہا کہ یہ مراکز اقوام متحدہ کے تمام اداروں اور سرگرمیوں کے واسطے ہونا چاہئیں نہ کہ صرف اس ثقافتی تعلیمی اور سائنسی مجلس ہی کے لئے۔

اس مجلس میں روس کی شمولیت کے متعلق استفسار کا جواب دیتے ہوئے ہکسلے نے کہا "میرے خیال میں اس سلسلہ میں سوویت حکومت کا نظریہ یہ ہے کہ تعلیمی سائنسی اور ثقافتی مجلس بھی مجلسِ اقوام متحدہ ہی کا ایک جزو ہے اور تا وقتیکہ ان دونوں میں مفاہمت نہ ہوجائے۔ اس مجلس کا کوئی وجود تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مجھکو یقین ہے کہ روس اس مجلس میں ضرور شریک و شامل ہوجائے گا۔ پورے طور پر مفید ہونے کے لئے روسی اشتراک کی یقیناً ضرورت ہے، اور مجھے یقین ہے

کہ روس امن عالم کے ضمن میں اس مجلس کی اہمیت کو ضرور محسوس کریگا"
مکسلے نے بتایا کہ اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے موجودہ اراکین کو مجلس اقوام متحدہ کے ساتھ پورا تعاون حاصل ہے اور ہمیں امید ہے کہ جنرل اسمبلی ستمبر میں اس کو منظور کرے گی اور خود یہ مجلس بھی نومبر میں اس طرف قدم بڑھائے گی"

مکسلے نے یہ بھی کہا کہ یہ مجلس لیگ آف نیشنز کے "انسٹی ٹیوٹ آف انٹلکچول کوآپریشن" کی قائم مقام نہیں ہے۔ انہوں نے بیان کیا "فی الحال ان دونوں اداروں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ نئی مجلس بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر کام کرے گی۔ ہماری تجویز ہے کہ ہم انسٹی ٹیوٹ سے مستفیض ہو سکیں"

چند اندیشے

ڈاکٹر برنور نے کہا کہ اس مجلس کے ناکام رہنے کا بھی خدشہ ہے۔ مجھے تنبیہ کرنا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اگر بنٹین اسسٹنٹ سکریٹری اس وقت یہاں موجود ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے۔ لوگوں کے آپس کے مذاکرہ میں بہت سی چیزیں حائل ہو سکتی ہیں مثلاً ناخواندگی، افلاس اور اجارہ داری۔ ان سب پر قابو پانا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت کم لوگ اس قسم کے ارتباط معنوی کے فوائد کا یقین رکھتے ہیں۔ بہت سوں کو جمہوریت پر بنیادی طور پر اعتماد نہیں ہے۔

"اگر رجعت پسند سائنسدان اور پروفیسر اور غیر ضروری حد تک محتاط سرکاری حکام اس امر کو پس پشت ڈال دیں تو یہ مجلس اپنے اغراض و مقاصد میں ناکام رہے گی اور یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی کیونکہ ہمیں اس مجلس کو غیر موثر اور کمزور ثابت نہیں کرنا ہے۔ لوگوں کو غلط امیدیں دلانے اور پھر ان کو مایوس کرنے سے تو کہیں اچھا یہ ہے کہ اس مجلس کو قائم ہی نہ کیا جائے۔ مجھکو پھر بھی امید ہے کہ یہ مجلس آپس کے ربط ضبط کا ایک اچھا آلہ ثابت ہوگی"

طامسن نے کہا "اگر واقعی ایسا ہوا تو یہ مجلس اقوام متحدہ کی مجلس امن سے بھی کہیں زیادہ اہم ثابت ہوگی"

مکسلے نے آخر میں کہا "ہم کو یقین ہے کہ امن عالم کا انحصار عوام اور خواص کے آپس کے ربط ضبط ہی پر ہے اور اقوام متحدہ کی اس تعلیمی سائنسی اور ثقافتی انجمن کو ایک زندہ اور جاندار چیز بنانے کی ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا ہے"

("امریکن نیوز فائل" سے ماخوذ)

غزل ——— صباؔ اکبرآبادی

پیہم اسیر مرحلۂ جسم و جاں رہے ۔ کن سخت بندشوں میں ترے ناتواں رہے
آنکھوں سے یہ کہو کہ جو شب غم ضوفشاں رہے ۔ وہ تو چراغ ہو گئے آنسو کہاں رہے
آسودۂ نشاط جہاں مصلحت سے ہوں ۔ دل میں خوشی رہے تو محبت کہاں رہے
اتنی ہی دیر دل کی لگی کچھ دبی رہی ۔ آنکھوں سے جتنی دیر تک آنسو رواں رہے
گھبرا کے پھر قفس کی طرف لوٹنا پڑا ۔ جب ہم قفس سے چھوٹ کے بے آشیاں رہے
وہ میری اعتکاف حرم پر نداستیں ۔ ساقی کا وہ سوال کہ اب تک کہاں رہے
اب مل گیا ہے تیری تجلی کو اک مکاں ۔ جلوے نگاہ شوق سے پہلے کہاں رہے
اے حسن یار شرم کہ بے سوز ساز دل ۔ اس گھر میں روشنی بھی ہو تو جہاں رہے

مسرور ہم نہیں تو صباؔ اغنیا رکیا
ناشادماں رکھے گئے ناشادماں رہے

غزل ——— غنیؔ کانپوری

اظہار محبت رہنے دے بے پردہ کسی کا راز نہ کر
اے طائر شوق خدا کیلئے بس حد سے سوا پرواز نہ کر

کیا حسن مجاز پہ اترانا کیا جوش شباب میں تن جانا
وہ دور زندگی یہ مہمانی ہے اس عالم ہیچ پہ ناز نہ کر

قرباں میں سر پہ چڑھا کے مجھے یہ دل سے گرا دیا گیا
اے جان تمنا بہر خدا یوں مجھکو نظر انداز نہ کر

صد شکر کہ خوبی قسمت سے وہ آج میرے گھر آئے ہیں
اس بزم مسرت میں اے دل افسانۂ غم آغاز نہ کر

دنیا میں جہاں والوں سے غنیؔ بس دور کا ملنا بہتر ہے
بنجائے جو وجہ کلفت دل اس درجہ کسی سے ساز نہ کر

رنگے ہوئے گیدڑ ——— بقیہ صفحہ ۲۳

کہ زمانہ ہمیں فضائے نیلگوں کے اس پار پہنچا دے تمہیں ان سے آگاہ کریں گے لیکن اس وقت رات آدھی ہو چکی ہے اور بیداری نے ہماری پلکیں کو تھکا دیا ہے اسلئے ہمیں اجازت دو کہ ہم سو جائیں، بہت ممکن ہے خوابوں کی پری ہماری روح کو اس عالم میں لے جائے جو عالم سے کہیں زیادہ صاف ستھرا ہے!

اقبال کے تضاد پر ایک نظر

(۱)

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ

میں اپنے بزرگ محترم حضرت میکش اکبر آبادی اور جناب ڈاکٹر تاثیر صاحب کے مضامین پڑھکر چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہر دو مضامین کے متعلق مختصری گذارش کروں۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب کے نزدیک "اقبال میں تضاد نہیں ہے۔ اقبال جامع اضداد ہے اور تضاد بالذات نہیں، اور یہی اقبال کے تمام شاعرانہ اور حکیمانہ محاسن اور مختلف نظریات کی بنیاد ہے۔ اقبال نے اپنے مختلف ادوار میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی نوعیت سے بالواسطہ تعلق رکھتے تھے۔ آپ ایک بالغ نظر محقق اور حقیقت کے متلاشی بھی تھے۔ مختلف ماحول کے تاثرات نے آپ کی فکر و نظر پر ہوا تاثر مرتب کئے۔ اسکا اظہار آپ کے مختلف شاعرانہ اور مفکرانہ احساسات کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اب اسے "تضاد" فی الحقیقت سمجھا جائے یا نہیں؟ لیکن ایک محقق کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ ہر پہلو پر نظر ڈالے اور اپنے مقاصد کی صداقت کے لئے غور و فکر سے ایک مفید راستہ اختیار کرے۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک میکش صاحب کی مساعی بھی اصولاً کچھ معیوب نہیں۔ ڈاکٹر تاثیر نے میکش صاحب کے چند شبہات دور کرنے کے لئے اقبال کے تضادِ فکر پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک صحیح الخیال متجسس اور جویائے حقیقت کی طرح مختلف ماحول سے متاثر تھے۔ لیکن صداقت کے انکشاف پر آپ نے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ آپکے سامنے جن مسائل کا مقابلہ تھا اس کے ہر پہلو پر غور کرنے اور صحیح نتائج کی تلاش آپ کی فکر و نظر میں عریاں صورت سے موجود ہے۔ گو تاثیر صاحب کے مضمون کے چند پہلوؤں سے مجھے اتفاق نہیں تاہم اس حقیقت کے اظہار سے متفق ہوں کہ اقبال کے نظریات کے مختلف پہلوؤں کا باہمی تضاد فی الحقیقت تضاد نہیں بلکہ اس کے کمالاتِ شاعرانہ و حکیمانہ کا تجرباتی تظاہر ہے جبکہ اقبال کی زندگی ہی میں اقبال نے اپنی شاعری اور حکیمانہ احساسات کے تظاہر میں مختلف تاثرات کا انکشاف کیا۔ جب تک اقبال کے تمام سیاسی و غیر سیاسی اور شاعرانہ حکیمانہ عارفانہ اور صوفیانہ انقلابات و خیالات کا کلی مفہوم پیش نظر نہ ہو صحیح معنوں میں ان نظریات کا پس منظر اور اسکا حقیقی پہلو سامنے نہیں آسکتا۔ اسکا مفید نتیجہ آخر الامر اقبال کی جامعیت اور منتہائے مقصود کو سمجھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اقبال نے مختلف خیالات کا اظہار بیک وقت نہیں کیا، بلکہ مختلف ادوار میں بحیثیت ایک شاعر و حکیم و فلسفی نیز "بالغ نظر محقق و عارف" اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ عقدہ جب ہی حل ہوگا کہ اقبال کے مختلف اور متضاد نظریوں کو غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اس سلسلے میں اقبال ہی کی جملہ تحریرات کی روشنی میں ہم ایک مفید اور یکساں مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تجسس و تحقیق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اقبال کی فکر و نظر اپنے مختلف ادوار و نوعیت کے لحاظ سے متضاد ماحول سے وابستہ ہے۔ سب سے پہلے اس بات کا تجزیہ ضروری ہے کہ اقبال کے تمام محسوساتِ فکر کے ادوار کا انتخاب کیا جائے۔ ہر دور کی خصوصیات کو انکی بنیادی اور بالاصالت حیثیت سے سمجھکر اسکا مفہوم حقیقی اخذ کیا جائے جیسا کہ جناب غلام محمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے اپنے ایک مضمون "کلامِ اقبال کا تحلیلی مطالعہ" میں اقبال کے مختلف ادوارِ فکر کی تقسیم کی ہے۔ آپ نے اقبال کے کلام کا "بہ لحاظِ فکر" اور "بہ لحاظِ ماحول" تجزیہ کرتے ہوئے حسبِ ذیل خصوصیات کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے:-

(۲) بہ لحاظ اثراتِ ماحول		(۱) بہ لحاظِ فکر
پختگی	تجسس	استفہام
سفرِ مغرب کے بعد	سفرِ یورپ	سفرِ یورپ سے پہلے

آپ نے ان ادوار کی ہر خصوصیت پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے سے مولانا میکش صاحب کو کافی تشفی ہو جائیگی اور اسباب کا انکشاف بھی ہو جائے گا کہ اقبال کے متضاد نظریات کا پس منظر کیا ہے اور کن احوال و وجوہ کی بنا پر آپ کے کلام میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مضمون میں غلام محمد صاحب اقبال کے "آخری زمانہ" کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس سفر (سفرِ یورپ) سے جب علامہ موصوف واپس ہوئے تو چونکہ مشرقیت اور مغربیت کے حقائق یکساں طور پر واضح ہو چکے تھے، پھر انکے مقابل اسلام کی حقیقت اور کاملیت بھی ظاہر ہو چکی تھی اسکے اب انکا ایمان اور ایقان پختہ تر ہو چکا تھا۔ قرآنی حقائق انکے قلب میں ایقانِ کامل کے درجے تک پہنچ چکے تھے وہ ایک حقیقت کے متلاشی تھے۔ انکی طبیعت میں "تقویٰ" تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ سے انھوں نے صحیح رہبری حاصل کی۔ حقائق و معارف کھلنے لگے اور کیسے نہ کھلتے جب خود بھیجنے والے نے اپنی کتاب بھیجتے ہوئے بتلایا تھا "ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدیً للمتقین"۔

بشیر محی الدین القادری

غرض جوں جوں اسرار کھلتے گئے، علامہ نے ان کو بلا کم و کاست ہمارے سامنے رکھ دیا جو غلط تخیلات دورِ اول میں پیش کر چکے تھے اُن کی بلا مذبذب تردید کر دی کیونکہ اسوقت ان کے خیالات اور تاریخِ فکر اٹل نہ تھے اور اب ان کا فلسفہ محکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا یہ چیز ان کی وقعت نہیں گراتی بلکہ "جویائے حقیقت" ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جو اقبال کو عام مفکرین سے ممتاز کر دیتا ہے۔ حقانیت کے عصا سے اُنھوں نے غلط تخیلات کے بُت خانہ پر جو ضربِ کلیمی لگائی اس سے وہ مویانِ حق کی صف میں شامل ہو گئے اگر وہ اس بت خانہ پر ضرب نہ لگاتے تو نہ راستہ بھولتا اور نہ وہ جلوۂ حقیقت سے دوچار ہوتے جو صرف "مومنین" کا مقام ہے۔ اس دور کی ہر بات سے نہ صرف صداقت و سچائی ٹپکتی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیماتِ محمدی ان کے قلب و دماغ سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچ رہی ہیں" (آثارِ اقبال)

اقبال کے مختلف احوال کے اثرات اور متضاد نظریات کے اسباب کو ان توجیہات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی اقبال کا متعین نظامِ فکر "جدید" پہلوؤں کے لحاظ سے عصرِ حاضر کے مختلف مسائل سے دوچار ہو کر جس تعمیر کا متقاضی ہے اسپر مختصر طور سے ڈاکٹر تاثیر صاحب نے بھی روشنی ڈالی ہے" جہاد و اصلاح اور تجدیدِ فکر کے ماحول دا بین ایک بلند نظر محقق و مفکر کو کن صورتوں سے اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیئے اس کے لئے اس دور و عہد کے حالات و انقلابات و دقیق احساسات کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ ہر فکر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے "اختلاف و اتفاق" با اصول ہو سکتا ہے۔ اسی "تضاد" کو دیکھ کر بعض اہل فکر عمیق نظر سے کام نہ لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال فی الجملہ "مختلف و متضاد" خیالات کا ناشر ہے۔ حالانکہ اسباب و علل اور بنیادی خصوصیات کو ہر فکر سے وابستگی ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبال ہی کے مجموعہ "مکتوبات" کو گہری نظر سے دیکھنے پر کسی حقیقی نتیجے تک پہنچنا بہت

مشکل ہے۔ اسی مجموعے کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اقبال کے احساسات فکر و نظر کن کن ماحول و اثرات پر مبنی ہیں۔ بلکہ میں نے اس مجموعے کے مرتب جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ایم۔ اے پروفیسر معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو خاص طور پر اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ مجموعے کے ساتھ اقبال کے تمام حقیقی اثرات اور آپ کی نگارشات و تحریرات کے وجوہ پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔

اقبال کے متصوفانہ کمالات و عرفانی محسوسات و خیالات کا تجزیہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا بھی ہے کہ اقبال نے کن تاثرات کی بنا پر اپنے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور اس ماحول اور اس فکر کے تعمیری خصوصیات میں کن ذرائع کو مشتعل کیا گیا۔ مولانا سیکش صاحب نے اکثر متضاد نظریات "فلسفۂ عجم" سے اخذ کئے ہیں جو یورپ اور مستشرقین یورپ کے ماحول میں تصنیف کی گئی جس کے مترجم کو آپ نے خود ہی بعد میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب اس سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اسوقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے"

اس انکشاف و انقلاب کے لئے علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنے مکاتیب میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص علامہ سلیمان ندوی کے نام اپنے خطوط میں آپ نے تحقیقی اور متجسسانہ فکر، نیز مختلف نظریات و ماحول کے تاثرات کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ آپ نے خواجہ حافظ شیرازیؒ، ابن عربیؒ وغیرہم کے نظریات پر پہلے تو مختلف خیالات کا اظہار فرمایا تھا لیکن بعد میں اپنے اہم نظریات بالخصوص "تصورِ زمان و مکان، فلسفہ و تصوف" کے متعلق حضرت شیخ اکبرؒ ہی کے فیضانِ خاص سے خوشہ چینی کی ہے۔ بلکہ یورپ میں دوبارہ خاص طور پر مفکرِ اسلام حضرت شیخ اکبرؒ و حضرت شیخ مجددؒ سرہندی پر لیکچر دینے کے لئے دورِ آخر کے مشہور روحانی رہنما حضرت قبلہ عارفِ کامل سیدنا پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ قادری چشتی گولڑوی کے نام عریضہ لکھ کر استفادہ کی خواہش ظاہر کی۔ خیر میں اپنے موضوع سے بہت دور نہیں جانا چاہتا۔ اتنا عرض کرنا ہی کافی سمجھتا

پنکھڑیاں

سلام سندیلوی

راز ہوا جو آشکار، راز کی زندگی گئی — جونہی کلی ذرا کھلی، توڑی گئی، دلی گئی
شمع کو زندگی بھی کیا، رنج و الم کی دی گئی — آئی، جلی، لٹی، مٹی، روئی، بجھی، چلی گئی
سبزہ بہکنے کے لئے زیرِ زمیں تھا بے قرار — دیکھی چمن کی جو فضا ساری ہنسی خوشی گئی
موت بھی کم نہ کر سکی، ظلمتِ بختِ آدمی — کالے کفن سے رات کے تربتِ غم ڈھکی گئی
کتنا حسین تھا یہ چمن جس سے ارم کو بھی جلن — آئی تھی کس لئے بہار، سوچ کے کیا چلی گئی
صبح کے حالِ زار پر، بکھری گر ذرا نظر — مانا کہ شب کو تیری مانگ موتیوں سے بھری گئی
نظروں نے رکھا تھا بھرم، اشکوں نے کر دیا تمام — تھوڑی سی آبرو جو تھی، وہ بھی رہی سہی گئی

کیسے اٹھاتا حشر تک آہ یہ بارِ غم سلام
سجدۂ شکر چاہیئے، عمر جو تھوڑی سی دی گئی

ہوں کہ تصوف کے خاص مسائل اور "وحدت الوجود" کے متعلق تو اقبال ؒ کے مُرشد معنوی، عارف اعظم، مولانا سفیر اسلام، حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ العزیز کے ہی ارشادات قولِ فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے خود اقبال نے معنوی و روحانی تربیت پائی۔ بقول مکرمی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب لیکچرار اورینٹل کالج لاہور۔

"ڈاکٹر اقبال کے ماخذ میں رومی کو سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اقبال رومی کو اپنا ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ میرے میکدے کی شراب حاصل پیر رومؒ کے خمستان کی حاصل کردہ ہے۔ اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مُرشد رومیؒ کے سر باندھتے ہیں۔ یہی رومیؒ جاوید نامہ کے زندہ رود کے لئے خضرِ راہ بنتے اور اسے آسمانی دنیا کی طلسماتی فضا کی سیر کراتے ہیں اور جب حکیم مشرق زندگی کے کام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوامِ مشرق کو آخری پیغام دیتا ہے تو اسوقت اسی حکیم کی روح نرالے سرورش بن کر مژدۂ انقلاب لاتی ہے۔ یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مُصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی۔ طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہ بر بھی ہیں اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں، اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی۔ غرض اقبال کے نزدیک ہماری "موجودہ کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومیؒ ہے جسکی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومیؒ" قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہدِ قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغامِ حیات لائے تھے اور اس پُر آشوب دورِ حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ ہیں۔" ؎

مرشدِ رومیؒ حکیم پاک زاد ٭ سِترِ مرگ و زندگی برما کشاد
زندگی گیر باسرارِ فقیری ٭ کہ آں فقر است محسودِ امیری (اقبال)

"وحدت الوجود" اور تصوفانہ مسائل کے متعلق مولانا میکش صاحب نے کچھ مدت گذری کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب سے میری خط و کتابت شائع ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا۔ علامہ صاحب نے اقبال اور اس کے مقاصد، بالخصوص تصوفانہ مسائل کے متعلق ایک حد تک مفید اور اچھی رائے ظاہر فرمائی تھی گو مجھے آپ کے چند الفاظ پر طالب علمانہ اظہار خیال کی ضرورت بھی ہوئی مگر مزید استفادہ کا موقعہ نہ ملا۔ اقبال کے تصوفانہ اور فلسفیانہ مسائل یا آپ کی فکر و نظر کو یکساں کرنے کی بجائے ہر مسئلہ کی بنیادی حیثیت اور نوعیت کو پیش نظر رکھا جائے۔ اقبال کی فکر و نظر میں "اہلِ عرفان و مشاہدات" کے "نکات و رموز اور گوہر مقصود کو اپنی عقل و ادراک میں محدود کرنا حقائق و معارف اقبال سے بڑی حد تک ناآشنائی کا ثبوت دیتا ہے"۔ تعمیر نو یا کہن" کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ فیصلہ بھی ضروری ہے کہ اقبال کی تعمیر "کہن یا نو" کے تعین میں کیا صورت رکھتی ہے اور کسطرح اُسے اقبال ہی کے مفہوم و مقاصد کے لئے مستعمل کیا گیا ہے۔

"توحید وجودی" ہو یا ایسے دوسرے مسائل، ان کو اقبال نے "ارباب کشف و عرفان" ہی کے مشاہدات کا نتیجہ قرار دے کر ان سے اپنے خیالات کو جلا دی ہے۔ افسوس کہ ایسے خالص عرفانی مسائل کو صرف "فلسفیانہ نکات" کے دائرے میں لاکر مغربی مفکرین کے تصورات پنتھی ازم (Pantheism) یا مسٹی سیزم (Mysticism) کے مطابق پیش کیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اپنے پہلے دور میں اس امتیاز کو قائم نہ رکھکر فلسفیانہ نکتۂ نظر سے ان مسائل کو دیکھا اور سمجھا تھا لیکن اپنے "آخری دور" میں "اپنے خیالات کے انقلاب" کے اظہار سے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ "فلسفۂ عجم" میں آپ نے صوفی مفکرین کے مسئلہ "توحید وجودی (وحدت الوجود) کو سمجھانے کے لئے قرآن حکیم کی روشنی میں ان کے خیالات کا بھی "مرکزی نکتہ" بیان فرمایا ہے۔

گذشتہ دو تین سالوں میں مجھ فقیر حقیر دور افتادہ نے ملک کے مشہور فضلا اور اہلِ علم حضرات سے انہیں مسائل کے متعلق گفتگو کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان شاء اللہ ان کوششوں کے مفید نتائج کا اظہار میری آئندہ مساعی سے ہوگا۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رئیس دار المصنفین اعظم گڑھ، مفکر سندھ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم۔ مولانا ماہر القادری۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید مصنف "اقبال کے چند جواہر ریزے" مکرمی شیخ عطاء اللہ صاحب پروفیسر معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہم سے مبادلۂ افکار اسی سلسلے میں ہو چکا ہے انھیں لوگوں میں سے خاص طور پر میرے عزیز و محترم دوست جناب مولانا شاہ عبدالغنی صاحب قادری چشتی نیازی پروفیسر مارین کالج ناگپور سے بھی کافی گفتگو کا موقعہ مجھے ملا ہے۔ میں نے اپنی خاموشانہ فضا میں رہ کر اقبال کے مختلف نظریات کو سمجھنے کے لئے کافی سعی کی۔ ہنوز میری تشنگی باقی ہے۔ شکر ہے کہ اب مولانا میکش ایسے بزرگ علم دوست بھی ان مسائل پر توجہ فرما رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مضمون نگار حضرات مضمون صاف اور کاغذ کے ایک طرف تحریر فرمائیں

دُنیا کے دو سب سے بڑے کتب خانے

گربچن سنگھ

برطانوی عجائب خانے کا کتب خانہ

انگلستان کے بہت سے اداروں (مثلاً پارلیمنٹ اور بنک آف انگلینڈ) کی طرح برطانوی عجائب خانہ کا کتب خانہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ یہ کتب خانہ فرانس کے قومی کتب خانے سے دوسرے درجہ پر ہے لیکن دنیا کے دوسرے بڑے سے بڑے کتب خانوں میں ممتاز ہے۔ ملکیت اور انتظام کے لحاظ سے یہ سلطنتی کتب خانہ ہے لیکن جو خدمت یہ کتب خانہ کر رہا ہے اس پر برطانیہ جتنا فخر کرے بجا ہوگا۔ اس میں عہد حجری سے لے کر موجودہ زمانے تک کی چیزیں موجود ہیں۔ ہڈی کے ٹکڑوں پر کھدی ہوئی تصویروں سے لے کر بڑے بڑے برطانوی مفکروں کے خطوط اور نجی کاغذات بھی ہیں اور قطب جنوبی کے کھوجیوں کا آخری روزنامچہ بھی ہے۔ غرض، یہ عجائب خانہ تاریخی اور قبل تاریخی آثار کا گراں بہا خزانہ ہے۔ کچھ لوگ تو اپنی عمریں اس کتب خانہ میں گذار دیتے ہیں اور کچھ گاہے ماہے آتے ہیں اور اس وسیع گنج علم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

اس ودیا مندر کی ابتدا ۱۷۵۳ء میں ہوئی۔ پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے وہ سب کتابیں، قلمی نسخے اور دیگر عجائب جو سر ہنس سلون نے اپنی وصیت کے ذریعہ قوم کے استعمال کے لئے چھوڑے تھے اس کتب خانے کو مل گئے۔ ۱۷۵۷ء میں جارج دوم نے انگلستان کے شاہی کتب خانے کی کتابیں اس کتب خانہ کو دے دیں۔ پہلے پہل عجائب خانہ اور کتب خانہ دونوں مانٹیگو ہاؤس میں تھے اور ۱۵ جنوری ۱۷۵۹ء کو اعلان کیا گیا یہ دونوں ہر خاص و عام کے لئے ہیں۔ جارج سوم، رائٹ آنریبل ٹامس گرینویل، ریورنڈ سی۔ ایم کریشروڈ اور سر جوزف بینکس نے بھی اپنی کتابیں اور قلمی نسخوں کے نادر اور کثیر ذخیرے اسی کتب خانہ کو دے دیے۔ کتب خانہ کی موجودہ عمارت کا افتتاح ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ دار المطالعہ کے گرداگرد لوہے کی الماریوں میں جن کی مجموعی لمبائی پچپن میل ہے کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں کتابوں کی تعداد تینتالیس لاکھ تھی۔ جنوبی کنسنگٹن کا طبیعی تاریخ کا عجائب خانہ بھی اسی برطانوی عجائب خانہ کا جزو ہے۔

برطانوی عجائب خانے میں ہر دیس اور ہر زمانے کے آثار موجود ہیں لیکن یہ عجائب خانہ عتیق چیزوں کا محض انبار نہیں ہے بلکہ نگراں ماہروں نے ان نادرات کو اس سلیقہ سے ترتیب دی ہے کہ دنیا کی تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ دستاویزوں کے دیوان خانہ میں ہزاروں فرمان اور دستاویزوں کے پلندے موجود ہیں۔ پیپرس کے اوراق پر لکھی ہوئی یونانی اور لاطینی تحریروں سے ان قدیم قوموں کے جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ عجائب خانہ میں کچھ پتھر بھی ہیں جن پر گلاب کے نقش بنائے ہوئے ہیں۔ یہ پتھر اسکندریہ سے لائے گئے تھے۔ ان پتھروں سے ماضی بعید کے کتبوں کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ دنیا کی قدیم ثقافت کے سمجھنے میں کتابوں، مخطوطات، پیپرس اور کتبات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عجائب خانہ میں بہت سی اور چیزیں بھی ہیں جن سے لوگوں کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے کی روزمرہ کی زندگی پر پوری روشنی پڑتی ہے مثلاً مکانات، کھیلوں، اوزاروں اور جواہرات کے چھوٹے چھوٹے ڈھانچے جو آج سے چھ ہزار سال پہلے مصر میں بنائے گئے تھے اور ہاکی کے کھیلتے اور ناچتے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی بنائی ہوئی مٹی کی مورتیاں —— ان چیزوں کی تاریخ میں جان پڑ جاتی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے بچے بھی انہیں دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔ ہر قسم کے لوگ۔ طالب علم، اہل قلم، تماشائی، عورتیں، بچے۔ اتوار کے دن عجائب خانہ کی گیلریوں میں گھومتے اور ماضی کے علمی اور ثقافتی آثار کا آسانی اور اطمینان سے معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ عالمگیر جنگ کے دوران میں یہ عجائب خانہ بند رہا کیونکہ یہ سب ذخیرے ویلز کے مختلف مقامات میں چھپا دئے گئے تھے۔ اب وہاں سے واپس لائے گئے ہیں۔ عجائب خانہ کے قریب ہی ایک بم پھٹا تھا جس سے اس کی عمارت کو کچھ گزند پہنچا۔ لیکن اس کے ذخیرے سب صحیح و سالم ہیں اور اب عام لوگ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ جنگ کے سنگتراش اور اہل قلم لڑائی سے واپس آئے ہیں اب اس عجائب خانہ میں وہ پر لطف سکون حاصل کر سکتے ہیں جس کو وہ ترستے تھے۔

نیویارک کا پبلک کتب خانہ

نیویارک کی بہت سی شاندار عمارتوں میں اس کتب خانہ کی عمارت بھی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ میں عام لوگوں کے لئے ساڑھے چھ ہزار بڑے کتب خانے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کتب خانہ بھی ہے۔ اس کتب خانہ کا آغاز ۱۸۹۵ء میں ہوا۔ جب تین نجی کتب خانے ملا دیئے گئے۔ اب شہر نیویارک میں اس کتب خانہ کی اکسٹھ شاخیں ہیں۔ اس میں دنیا کی ہر بڑی زبان میں چھپی ہوئی پینتالیس لاکھ کتابیں ہیں صرف ہسپانوی کتابوں کی تعداد سات ہزار ہے۔ ان کے علاوہ چینی، ہالینڈ، فنلینڈ، فرانس، جرمنی، یونان، ہنگری، اطالیہ، ناروے، پولینڈ، رومانیہ اور سویڈن کی زبان کی کتابوں کے علاوہ عبرانی کتابیں بھی ہیں، پراگ کو چھوڑ کر چیکوسلوواکیہ کی کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ اسی کتب خانے میں ہے۔ پینتالیس لاکھ کتابیں الماریوں میں چنی ہوئی ہیں اور ان الماریوں کی کل لمبائی ستسٹھ میل ہے۔ ہر الماری اور کتاب پر نمبر پڑے ہوئے ہیں اس کتب خانہ میں سات سو لائبریرین اور کلرک ہیں۔ دس ہزار سے زیادہ لوگ روزانہ اس کتب خانے میں آتے ہیں۔

اس کتب خانے کے جنوب میں "برائنٹ پارک" ہے جہاں موسم گرما میں لوگ درختوں کے سائے اور کھلی ہوا میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کتب خانے میں دو نگار خانے ہیں جن میں منجملہ دیگر تصویروں کے، مشہور مصوروں رینالڈز، ریبورن، کوپلے، ٹرنر اور گلبرٹ سٹوارٹ کے فن کے نمونے ہیں۔ ایک بڑے کمرے میں تمام ملکوں کے بڑے بڑے نقشے لگے ہیں۔

اس کتب خانہ کا انتظام ڈائرکٹروں کے ایک بورڈ کے سپرد ہے جن کا تقرر چناؤ سے ہوتا ہے۔ اس بورڈ کے فرائض، کتب خانہ کی پالیسی اور عملہ سے متعلق قواعد و ضوابط ریاست نیویارک نے بذریعہ قانون معین و مرتب کر دیئے ہیں۔ کتب خانہ کا لائبریرین اس بورڈ کا ایگزیکٹیو افسر ہے۔

معمولی کتابیں دو ہفتے کے لئے دی جاتی ہیں اور مقررہ معیاد کے اندر واپس نہ کرنے پر روزانہ جرمانہ کیا جاتا ہے۔ نئی کتابوں کا چناؤ خود بورڈ بھی کرتا ہے لیکن یہ کام عام طور پر لائبریرین سے متعلق ہے۔

(فارین ریویو سے ماخوذ)

نواب مرزا

افسانہ

بھیم شنکر پروانہ

نواب مرزا سے میری ملاقات اس وقت سے تھی جب وہ پہلے پہل کالج ہوسٹل میں داخل ہوئے تھے۔ مرزا کے والد ایک اچھے رئیس اور زمیندار تھے۔ تحصیل ملیح آباد ضلع لکھنؤ میں ان کی زمینداری تھی۔ باپ کو اس بات کی بڑی حسرت تھی کہ بیٹا کسی طرح انگریزی پڑھ کر کلکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے قابل ہو جائے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے کرانے کی انہیں خواہش نہ تھی۔ اور مرزا صاحب نے بھی باپ کے اس حکم کو خیال میں رکھ کر ہی کالج میں قدم رکھے تھے۔ انہیں درجہ پاس کرنے کی بالکل پروا نہ تھی۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ نوکری تو کرنی نہ تھی۔ پھر مرزا صاحب جھوٹے دکھاوے کی فکر کیوں کرتے۔ ہاں ادھر ادھر بیٹھ کر سوسائٹی والا بننا تھا۔ اور سوسائٹی والے کام کے لئے خدا کے فضل سے ہم لوگوں کا کالج سب کالجوں سے بڑھا چڑھا تھا۔

اسے خاندانی وراثت سمجھئے یا کچھ بھی خیال فرمائیے مرزا صاحب انتہا درجہ کے باتونی تھے۔ اگر باتونی ہی ہوتے تو غنیمت تھا۔ مرزا صاحب باتونی ہونے کے ساتھ ساتھ بے سروپا کی اڑانے کے بھی عادی تھے۔ اور بے سروپا کی اڑانے کی وجہ سے اکثر بیوقوف بھی بنائے جاتے تھے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مرزا صاحب کو خوب سوجھی۔ فرمانے لگے "بھئی یہ ہوسٹل کے نوکر بھی کمبخت کس قدر بدذات ہیں۔ ابھی حال ہی میں نئی اچکن بنوائی تھی۔ کھونٹی پر ٹنگی دیکھی تو وہ رمضانی کہنے لگا مرزا صاحب یہ اچکن کس قدر نفیس ہے۔ یہ تو بیاہ میں دولہا کے پہننے کے لائق ہے"۔ میں سمجھ گیا میاں کی شادی جو ہونے والی ہے اسی سے نیت بگڑی ہے۔ فوراً کھونٹی سے اتار کر اس کے حوالے کر دی۔

ہم لوگ جانتے تھے کہ مرزا بے سروپا کی ہانک رہے ہیں۔ گھر کے رئیس کتنے بھی ہوں، پر ہیں بھی تو بہت خسیس۔ بھلا نوکر کو نئی اچکن کیوں دینے لگے۔ میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہا: "مرزا یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہوئی۔ جب پہلے پہل میں آیا تو اپنا نیا پانچسو پونڈ کا سوٹ جسے لندن سے اسپیشل آرڈر کر کے منگایا تھا اتار کر رکھ دیا۔ کمبخت فراش کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا جان بوجھ کر اس نے اس پر دو قطرے روشنائی کے دوات سے گرا دئے۔ بھلا بتلائیے پھر وہ سوٹ میرے کس کام کا رہ گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کمبخت کی میں اچھی طرح خبر لیتا۔ مگر اس کے حال پر رحم فرما کر میں نے وہ سوٹ اسی کو بخش دیا کیونکہ مرزا صاحب آپ جانتے ہیں جن کپڑوں پر روشنائی کے داغ پڑ جائیں وہ پھر ہم لوگوں کے پہننے کے لائق تو رہتے نہیں"۔

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ ہم لوگوں کے کس کام کے وہ داغدار کپڑے" سب یار لوگ کہہ اٹھے۔ اور پھر قہقہہ مار کر اس زور سے ہنسے کہ مرزا صاحب جھینپ گئے۔

ایک بار مرزا صاحب گھر گئے۔ گھر سے لوٹتے وقت بہت بڑھیا قسم کا حلوا جس میں بہت سی مقوی چیزیں پڑی ہوئی تھیں، اور جو گھی، میوے اور انڈے ڈال کر بنایا گیا تھا، اپنے ساتھ لائے۔ حلوے کو حضرت کپڑے والے صندوق میں بند کر کے اس لئے لائے کہ کہیں اس کی خوشبو اڑ کر ہم لوگوں کی ناک میں نہ پہنچ جائے، اور اس حلوے کی خیریت نہ رہے۔ جب کوئی اپنے گھر سے کوئی بڑھیا چیز لاتا تو باقاعدہ میس میں چن دی جاتی اور ہم سب بیٹھ کر اسے برابر برابر بانٹ کھاتے۔ اور اگر کوئی ہم لوگوں سے چرا کر چیزیں کھانے کی کوشش کرتا تو پھر اس کی خیر نہ رہتی۔ یہی حال بیچارے مرزا کا بھی ہوا۔ صندوق میں بند کر کے وہ حلوا اس بیچارے نے رکھا مگر ہمارے جاسوس بھی کم نہ تھے۔ پتہ چل گیا۔ اور پھر حلوا وہاں سے غائب ہو کر ہم لوگوں کے پیٹ میں پہنچ گیا۔ اور مرزا ٹاپتے رہ گئے۔ بعد کو نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سینکڑوں گالیاں دے رہے تھے۔ مگر اس کی پروا کسے تھی۔ منہ پر کہنے کی ہمت انہیں نہیں تھی، کیونکہ برابر ہم لوگوں کے گھر کی سوغاتوں میں حصہ دار بن چکے تھے۔ پھر کہتے کیا۔ ہاں جب نظریں چار ہوتی تھیں تو جھینپتے سے نظر آتے تھے۔ یہ دوسرا سبق تھا، جو مرزا کو ہم لوگوں نے پڑھایا۔

ایک دن مرزا صاحب ذرا مزے میں آئے۔ فرمانے لگے: "بھئی شہر میں گھومنا محال ہو رہا ہے۔ کوئی سواری ہوتی تو مزا دیتا۔ گھر سے چلتے وقت والد کا ارادہ تھا کہ ایک کار ساتھ کر دیں۔ مگر پھر خیال ہوا کہ کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تو خاصی مصیبت رہے گی۔ یہی سوچ کر میں نے کار رکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مرزا صاحب نے یہ بات ہم لوگوں پر رعب گانٹھنے کو کہی تھی۔ منشا یہ تھی کہ ہم لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے گھر پر کار بھی ہے۔ مگر ہم لوگ مرزا صاحب سے دو قدم آگے تھے۔ ایک صاحب نے فرمایا: "کیوں مرزا صاحب آپ کے گھر کتنی کاریں ہیں۔"

"ایک والد کے پاس ہے ایک چچا جان کے پاس"

"بس، دو"

مرزا ذرا چونکے۔ بولے: "ہاں صاحب ارادہ ایک اور لینے کا

تھا۔ مگر جیسا کہ ابھی میں نے عرض کیا تھا، فی الحال معاملہ ملتوی کر دیا گیا ہے"۔

انعیں صاحب نے ارشاد کیا: "مرزا صاحب بالکل ٹھیک کیا۔ کار بہت بری چیز ہے۔ میرے گھر پر آٹھ موٹریں تھیں۔ دو والد کی، دو والدہ کی، دو چچا کی، اور دو چچی کی۔ ان سب موٹروں کے لئے ایک بڑا بھاری گیرج بنا ہوا تھا۔ اس میں یہ سب موٹریں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار میں کھیلتا کھیلتا اس گیرج کے پاس پہنچ گیا۔ شب برات کا دن تھا۔ میں نے جو ایک سُرسُری چھوڑی تو وہ سیدھی گیرج کی طرف بھاگی۔ گیرج تھا کھلا ہوا موٹروں میں پٹیرول ڈالا جا رہا تھا۔ بس وہ سرسری جو اس پٹیرول سے ٹکرائی تو بس کہرام مچ گیا۔ میں بھاگ کر ماں کی گود میں جا چھپا۔ اور وہاں جو آگ لگی تو سارا موٹر خانہ جل کر خاک ہو گیا۔ اور موٹریں تو راکھ ہو ہی گئیں۔ اس کے بعد جو ہوا تیز چلی تو وہ راکھ بھی اڑ کر نہ معلوم کدھر گئی۔ اب نہ وہ موٹر خانہ ہے، نہ موٹریں۔ خیریت اتنی ہوئی کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور میں یہ واقعہ سنانے کے لئے زندہ رہ گیا"۔

سب لوگوں نے اس پر اتنا اظہار افسوس کیا، اور مرزا صاحب کو موٹر ساتھ نہ رکھنے کی اتنی تائید کی کہ مرزا صاحب مارے جھینپ کے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

مرزا صاحب کو ہم لوگوں نے اتنے سبق سکھائے اور اتنا بنایا کہ رفتہ رفتہ انھوں نے ڈون کی ہانکنا چھوڑ دیا۔ بے سر پیر کی اب بھی اڑاتے مگر ذرا ہوشیاری کے ساتھ، یہ دیکھ کر کہ کوئی خاص آدمی ان کو اُلّو بنانے والا تو نہیں بیٹھا ہے۔ ایک بات اور ہوئی۔ مرزا صاحب اب ہم لوگوں سے دور دور رہنے لگے۔ شام کو ہم لوگ دیکھتے کہ مرزا صاحب فرسٹ کلاس سوٹ پہن کر گھومنے چلے جاتے ہیں۔ پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ہمارے ہوسٹل سے تھوڑی دور پر جو گرلس ہوسٹل ہے آپ اسی کا چکر کاٹا کرتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے یا نہ دیکھے مگر مرزا صاحب کٹے پتنگ کی طرح ادھر ادھر چکر کاٹتے ضرور نظر آتے۔ بس پھر کیا تھا کمیٹی بیٹھ گئی اور اسکیمیں بننے لگیں۔ مرزا صاحب کے رومان کو کس طرح زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے اسکی ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔

ایک دن مرزا صاحب کو ایک خط لکھا گیا۔ مضمون یہ تھا۔

مائی ڈیر

تمہیں دیکھ کر دل ہاتھ سے جا تا رہا ہے حد بیقرار ہوں۔ آج ٹھیک چھ بجے شام کو گرلس ہوسٹل سے ملے ہوئے پارک میں ملنا، وہیں جہاں بنچ پڑی رہتی ہے۔ مولسری کے درخت کی آڑ میں۔ دیکھو بھولنا نہیں ٹھیک چھ بجے۔

... تمہاری کوئی

خط، لکھنے کے بعد ڈاک میں ڈال دیا گیا۔ اور وہ وقت سے مرزا کو مل گیا۔ خط کی لکھاوٹ سے اور اس کے مضمون سے مرزا صاحب کے اگر دماغ ہوتا تو وہ سمجھ لیتے کہ یہ سب ان کے بنانے کی ترکیب ہے۔ سوچتے کہ کسی لڑکی کو ان کا نام اور پتہ کیسے معلوم ہوا جو اس نے انھیں اس قسم کا خط لکھا۔ اور پھر مرزا صاحب ایسے کہاں کے بڑے حسین تھے کہ کوئی حسینہ ان پر فدا ہو جاتی۔ مگر یہ سب باتیں تو ہیں سمجھداروں کے لئے۔

ہم لوگ خوب جانتے تھے کہ خط دیکھتے ہی مرزا سب کچھ بھول کر اس حسینہ سے ملنے کی چاہ میں پڑ جائیں گے۔ انہیں تو آجکل رومان کی سوجھ رہی ہے۔ بس کسی سوسائٹی گرل کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا دماغ کہاں کہ وہ اس خط کی باریکیوں پر نظر ڈالیں۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ دیکھا مرزا صاحب چار بجے ہی غسل خانہ میں داخل ہیں۔ خوب نہا دھو کر اچھے سے اچھا کریم پاوڈر وغیرہ لگا کر بن سنور رہے ہیں۔ فرسٹ کلاس سوٹ آئینہ میں دیکھ دیکھ کر پہنا جا رہا ہے۔ ادھر مرزا صاحب کی یہ تیاری ہو رہی تھی، ادھر ہم لوگ اپنے داؤں پیچ میں لگے ہوئے تھے۔ کسی طرح مرزا صاحب کو پریشان کرنا تھا۔

معلوم ہوا کہ اب مرزا صاحب کمرہ سے نکلنے ہی والے ہیں۔ بس، ہم میں سے ایک ان کے کمرہ میں جا پہنچا۔ کئی مہینوں سے مرزا صاحب نے ہمارے ہوسٹل یونین کا چندہ نہیں دیا تھا اور نہ دینے کی ان کی نیت ہی معلوم پڑتی تھی۔ اب مرزا صاحب سے اس چندے کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ دھیرے دھیرے چار اور بھی جا دھمکے۔ یونین سے فائدہ ہے یا نہیں، اس پر بحث شروع ہو گئی۔ دو ایک مرزا کی طرفداری کرنے لگے، دو ایک ان کے خلاف کہنے لگے۔ ادھر گھڑی میں چھ بج گئے۔ مرزا صاحب گھڑی دیکھ کر گھبرائے جھٹ پٹ چندہ ادا کر دینا چاہا۔ مگر ہم لوگوں میں جو صاحب مرزا کی طرف سے بول رہے تھے انھوں نے مرزا کا پکڑ لیا۔ بولے: "پہلے طے ہو جانے دو یہ معاملہ۔ چندے کی کوئی بات نہیں۔ معاملہ اصول کا ہے"۔

مرزا صاحب نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح وہاں سے نکل جائیں، مگر اس دن سات بجے سے پہلے انھیں نجات نہ ملی۔ آخر معاملہ طے ہوا۔ مرزا صاحب نے چندہ دیا اور رسید لے گرلس ہوسٹل کی طرف بھاگے۔

بھوت کی طرح ہم لوگ بھی مرزا صاحب کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب مرزا صاحب اس جگہ پہنچے تو بنچ پر بیٹھ کر انھوں نے دیکھا کہ مولسری کے پیڑ کی ایک ڈال میں ایک خوبصورت ریشمی رومال بندھا ہوا ہے۔ لپک کر مرزا صاحب نے اس رومال کو اتارا۔ اس میں ایک کاغذ بندھا تھا پنسل سے اس پر لکھا تھا۔

مائی ڈیر

اتنی دیر تک تمہارا راستہ دیکھا۔ اب ہوسٹل جا رہی ہوں۔ ہائے ظالم، تجھے کسی کی کیا خبر۔ میری نشانی یہ رومال رکھ لینا اور اپنی کوئی نشانی چھوڑ دینا۔ اسی لئے کررات کاٹوں گی۔

تمہاری کوئی۔

مرزا صاحب نے خط آنکھوں سے لگایا، اور رومال کو چومنے لگے۔

اس کے بعد اپنا پارکر فاؤنٹین پین ایک کاغذ میں لپیٹ کر مولسری کے ایک کھوکھلے میں رکھ کر وہاں سے چلتے بنے۔

ان کے جاتے ہی وہ قلم ہمارے قبضہ میں آگیا۔ ہمارے جاسوس نے لاکر اسے ہمیں دے دیا، مرزا صاحب کی ساری حرکتیں سنائیں۔ سن کر مارے ہنسی کے سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اور ادھر مرزا صاحب اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر کے آہ بھر رہے تھے، اور اس رومال کو ہاتھ میں لے کر اور بار بار آنکھوں سے لگا کر اس کا وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ سارے ہوسٹل میں یہ خبر پھیل چکی تھی۔ مگر مرزا صاحب کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ اپنے "رومان" اور محبت میں اتنے گہرے ڈوبے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھ، کان، ناک، منہ سب نے انہیں جواب دے رکھا تھا۔ اس وقت وہ محبت میں پورے مجنون بنے ہوئے تھے۔ نرگس کے، یہ انہیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ مزیدار بات یہ تھی کہ مرزا کے بیوقوف بننے سے کتنوں کی تفریح طبع کا سامان ہو رہا تھا۔ کالج کی زندگی کا مزا ہی اس میں ہے۔

مرزا صاحب نے دوسرے روز اپنے ایک دوست سے کہا: "بھائی آج میں کالج نہ جا سکوں گا۔"

دوست نے پوچھا: "کیوں۔ خیریت تو ہے۔"

"ایسے ہی کچھ بازار میں خریداری کرنا ہے۔"

"تو شام کو بازار چلے جانا پڑھائی کا کیوں نقصان کرو گے۔"

"نہیں، کچھ ایسا ہی سامان لینا ہے۔ شام کو ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"آخر کیا خریدو گے"۔

"ایک بنارسی ساڑی لوں گا۔"

"بنارسی ساڑی۔ کس خوش نصیب کو وہ تحفہ دیا جائے گا۔"

"توبہ توبہ۔ آپ کا بھی کیا خیال ہے۔ آپ جانتے ہیں، میں ایسی خرافات میں نہیں پڑتا۔ بھئی عید آ رہی ہے۔ گھر جانا ہونا ہو گا۔ ہمشیرہ کے لئے ایک اچھی سی ساڑی لے جانے کی سوچ رہا ہوں۔"

"اوہ۔ تو آپ اپنی بہن کے لئے کچھ لے جانا چاہتے ہیں۔ معاف کیجئے مجھے معلوم نہیں تھا۔ ضرور ساڑی خریدئے۔ بیچاری بہن راہ دیکھ رہی ہو گی کہ بھائی جان آئیں گے تو کچھ ضرور لائیں گے۔ پھر عید کا موقع ٹھہرا۔"

"جی ہاں۔ اسی سے تو ارادہ ہے کہ ابھی روپے پاس ہیں خرید لوں۔ پھر نہ جانے کو صرا اٹھ جائیں۔"

"تو، مرزا جی، چلوں، خریدوا دوں۔"

"واہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

اس کے بعد مرزا اور ان کے دوست مشفق ساڑی خریدنے بازار روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت وہ ساری کہانی ہم لوگوں کو بتلاتے گئے۔ یہ تو ہم سمجھ ہی گئے کہ مرزا اپنی کونسی ہمشیرہ کے لئے وہ ساڑی خریدنے جا رہے ہیں۔

مرزا صاحب کے دوست نے اس دن مرزا صاحب کو خوب پریشان کیا۔ ایک بازار سے دوسرے بازار اور دوسرے سے تیسرے بازار انہیں لئے لئے پھرے۔ ایک فرضی دوکان والے کا نام گھڑ لیا اور ہر بازار میں پوچھتے پھرے۔ "بھائی، جھنڈو مل پنو لال بنارسی ساڑی والے کی دوکان کہاں ہے۔"

اب اس نام کی کوئی دوکان ہو تو پتہ چلے۔ مرزا صاحب کہتے:

"بھئی، دام نقد دینا ہیں۔ کسی دوکان سے بھی لے لو۔"

اور ان کے دوست فرماتے: "پھر مجھے آپ لائے ہی کیوں۔ اس دفعہ فلاں صاحب اسی دوکان سے ساڑی لے گئے ہیں، نہایت عمدہ اور بہت سستی۔ میرے رہتے تو آپ روپیہ برباد کر نہیں سکتے۔ اچھی سے اچھی چیز اور اچھی سے اچھی دوکان سے لینی ہو گی۔"

مرزا صاحب چپ ہو جاتے۔

جیسا کہ ہم لوگوں نے پٹی پڑھا رکھی تھی منشا کسی طرح مرزا صاحب کو بازار میں گھماتے رہنا تھا کہ کسی صورت سے ملاقات کا وقت گذر جائے۔ اور اس کام کو وہ بڑی خوبی سے نباہ رہے تھے۔

خیر، بڑی بحث کے بعد مرزا صاحب ایک نایاب ساڑی سو روپیہ کی لے کر ساڑھے پانچ بجے شام کو واپس آئے۔ صرف آدھ گھنٹہ چھ بجنے میں باقی رہ گیا تھا۔ اس سے مرزا صاحب اور بھی بے تاب ہو رہے تھے۔ آج ہم سب لوگ بھی وہاں سے ہٹ گئے کہ مرزا کو کسی قسم کا شبہہ نہ ہو جائے۔

اب مرزا صاحب جیب سے چابی نکال کر تالے میں لگا رہے ہیں۔ مگر کمبخت تالا کھلتا ہی نہیں۔ ہم لوگوں نے اس کی ترکیب پہلے سے ہی کر دی تھی سیسہ گلا کر تالے کے سوراخ میں بھر دیا تھا۔ اب کنجی اس تالے کے لئے بیکار تھی۔ بیچارے مرزا تالا کھولتے کھولتے عاجز آ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

ادھر ہم لوگ اپنے کمرہ میں بیٹھے بیٹھے مرزا کے پسینے پسینے ہونے کا مزہ لے رہے تھے۔ آخر محبت کرنا خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں۔ خون پسینہ ایک کر دینا ہوتا ہے۔ اور یہاں سچ مچ مرزا صاحب کا خون پسینہ ایک ہو رہا تھا۔ جب گھڑی کی سوئی سوا چھ پر پہنچ گئی اور مرزا نا امید ہو گئے تب ہم لوگ اپنے کمرہ سے نکلے اور مرزا کی خیریت پوچھنے لگے۔ آخر تالا توڑا گیا۔ مرزا صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ ہاتھ منہ دھو کر، سوٹ بدل کر، اور ہمشیرہ کے لئے لائی ہوئی ساڑی بغل میں دبا کر، ادھر ادھر چور کی طرح نظر ڈالتے ہوئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے وہ اپنے رومانوی والے اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر آج بھی چھ بجنے سے پہلے سانچ چکے تھے

غرضیکہ جس طرح اس دن پچاس روپیہ کا پارکر فاؤنٹین پین ہمارے ہاتھ لگا تھا اسی طرح آج سو روپیہ کی ساڑی بھی ہمارے ہاتھ لگی۔

اب ہم لوگوں کی کمیٹی میں یہ پاس ہوا کہ اس طرح تو مرزا بالکل تباہ ہو جائے اب یہ مذاق ختم کیا جائے اور اس کھیل کا آخری پردہ گرا دیا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز ہی اس کی نوبت بھی آگئی۔

ہوسٹل یونین کی طرف سے کالج میں ایک 'انٹر کالج ڈیبیٹ' ہوا کرتا تھا۔ اس ڈیبیٹ میں گرلس کالج کی لڑکیاں بھی 'پارٹ' لیا کرتی تھیں۔ وہ 'گرلز ڈے ڈیبیٹ' تھا۔ کالج ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ ڈیبیٹ ہونے لگا۔ مرزا صاحب سب سے آگے بیٹھے ہوئے 'ڈیبیٹ' میں آئی ہوئی لڑکیوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی خیالی معشوقہ کا تصور کر رہے ہوں۔ سوچ رہے ہوں کہ شاید ان کی منظورِ نظر بھی ان کی نذر کی ہوئی ساڑی پہنے اور بڑھیا پارکر فاؤنٹین پین لگائے، مسکراتی، اٹھلاتی چلی آ رہی ہو۔

ادھر ادھر ہماری دوسری اسکیم چل رہی تھی جس کی مرزا صاحب کو کانوں کان خبر نہ تھی۔

ڈیبیٹ ختم ہوا۔ انعامات دئے جانے لگے۔ ہماری یونین کے سیکرٹری نے یونین کی طرف سے، اوّل نمبر آنے والی مناکشی دیوی کے لئے بطور تحفہ ایک خوبصورت ساڑی نذر کی۔ اور دوسرا تحفہ، ایک خوبصورت پارکر فاؤنٹین پین مس زیب النسا قادری کو نذر کیا گیا۔ ساڑی اور فاؤنٹین پین کی نمائش کی گئی۔ سارا ہال دیکھنے والوں کے تعریفی نعروں سے گونج اٹھا۔

لوگوں نے دیکھا، مرزا صاحب کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس وقت نہ تو وہ ان حسینوں کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا رہے تھے، اور نہ نعرہ ہائے مسرت سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اسکے بعد پھر مرزا صاحب کو کسی گرلس ہوسٹل کے گرد چکر کاٹتے نہیں دیکھا۔ کچھ ٹھوکر سیکھنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

"تلخی"

کونسی رات تھی جو اشک بہاتے نہ کٹی ⁂ کونسا دن غم فرقت میں گزارا نہ گیا
کب تبسم مرا اشکوں سے سنوارا نہ گیا ⁂ ابرِ رحمت سے بھی قسمت کی سیاہی نہ چھٹی

*

آسماں چاند ستاروں سے سنورتا ہی رہا ⁂ ڈھل سکا پھر بھی نہ تاریک خلاؤں کا غبار
بن سنورتی رہی ہر تصویرِ حسین و زرکار ⁂ نور ہر ذرّۂ عالم پہ بکھرتا ہی رہا

*

چھین بھی لیتا ہے تو مجھ سے اگر غم اپنا ⁂ تیرے غم کے سوا غم ہائے دگر اور بھی ہیں
منظرِ درد ابھی محتاجِ نظر اور بھی ہیں ⁂ اتنی محدود نہیں میرے دکھوں کی دنیا

*

غم سمیٹتے ہوئے لمحات جوانی کی قسم ⁂ چاندنی موسمِ گل نرم ہوا کچھ بھی نہیں
نغمہ و ساز مئے ہوش رہا۔ کچھ بھی نہیں ⁂ موت اور خون کے دریا کی روانی کی قسم

*

ذہن میں بنتے ہیں جنت کے نرالے نقشے ⁂ دوزخیں ناچنے لگتی ہیں ان ایوانوں میں
اہرمن چیختا ہے جنگ کے میدانوں میں ⁂ خون میں ڈوبنے لگتے ہیں سنہری سپنے

*

قیصری سینٹ لیا کرتی ہے انسانوں کی ⁂ جال پھیلائے ہوئے آہنی دستوروں کا
خسروی خون بہا کرتی ہے مجبوروں کا ⁂ کسقدر تلخ حقیقت ہے ان افسانوں کی

*

نکہت نسیم

اس جہاں میں زندگی تیری ہے ننگِ زندگی
تیری دنیا ایک مسلسل خواب بے تعبیر ہے
گر مجھے اتنی اجازت ہو تو پوچھوں ایک بات
تیری دنیا میں وہ معبود، وہ مسجود و خدا
خود ہی کھو بیٹھی ہے تو اپنا وقار و احترام
تو اسی کو سوچتی ہے اک کمالِ لازوال

تیری ہستی بارِ ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی جوشِ حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
تجھ میں کیا خوبی نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
اسکی دنیا میں تو عورت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری دنیا اب اطاعت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری نظروں میں یہ ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

ڈالتی ہے بزدلی پر کیوں نقابِ شرم تو
یہ حیا فقدانِ جرأت کے سوا کچھ بھی نہیں

علیگڑھ کے بکسوؤں کی صنعت پر ایک اجمالی نظر

دنیا کی موجودہ اعلیٰ ترقی یافتہ مرکباتی پیداوار اور تجارتی نظم کے دور میں عملی تعلیم کتابی تعلیم کے دوش بدوش نہایت مفید اور ضروری ہے۔ ہندوستان میں طلبائے کومرس کو عملی تعلیم کے وہ مواقع میسر نہیں ہیں جو امریکہ اور انگلستان جیسے اعلیٰ صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں عام ہیں۔ عملی تعلیم کو ہمارے نظام تعلیم میں یقیناً نمایاں اور مستقل جگہ ملنی چاہیے کیونکہ اول الذکر سے ہماری قوت تخیل اور ادراک پر وہ پائیدار اثر ہوتا ہے جو محض قیاسی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "عملی تعلیم ایک ٹن اور کتابی تعلیم ایک تولہ با عتبار افادہ مساوی ہیں"۔ ہم طلبائے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ محترم ایس۔ ایم شفیع صاحب (صدر شعبۂ کومرس) جیسے ہمدرد استاد کو پاکر خوش نصیب ہیں جو طلباء کی تعلیم کے عملی پہلو پر زور دینے کے زیادہ قائل ہیں تاکہ طلباء کو محض کومرس کی کتابوں کے حافظ ہونے سے محفوظ رہ سکیں۔

۳ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ہمیں (طلبائے بی کوم کلاس) علیم اینڈ سنس علیگڑھ کے کارخانہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اب سے پیشتر یہ تالوں کا کارخانہ تھا لیکن موجودہ جنگ کی مسلسل مانگ کی بناء پر اس کارخانہ میں بجائے قفلوں کے بکسوئے بنائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں علیگڑھ میں تقریباً پندرہ کارخانے اور ہیں جن میں یہی کام ہوتا ہے۔ کارخانوں کے علاوہ لوگ اپنے گھروں پر بھی بکسوئے کے کام کو کرتے ہیں۔ عورتیں اور لڑکیاں بھی اس کام میں مدد دیتی ہیں۔ معمولی کام مثلاً تار سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹنا اور بکسوؤں میں تار کے پن لگانا یہ کام عورتیں آسانی سے کر لیتی ہیں۔ ذیل میں ان بکسوؤں کے بنانے اور تیار کرنے کے مدریجی طریقہ کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

سعد احمد و اعتقاد الدین

(۱) پیداوار خام — الومونیم، پیتل، ٹین اور لوہا وہ ضروری فلزات ہیں جو اس صنعت کے قیام میں درکار ہوتی ہیں۔ پیتل کی چادروں کی درآمد ریواڑی اور جگادھری (پنجاب) اور آہنی چادروں کی درآمد بمبئی سے ہوتی ہے۔ جنگ سے پیشتر الومونیم انگلستان سے دستیاب ہوتا تھا لیکن دوران جنگ کی مشکلات کی بناء پر اس کی ساخت اندرون ہند میں ہی ہونے لگی ہے چنانچہ اب الومونیم دہلی سے بھی مل سکتا ہے۔

(۲) طریق ساخت — ابتداً پیتل اور لوہے کی طویل چادروں کی قطع و برید چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں مشینوں کے ذریعہ کر لی جاتی ہے۔ بعد ازاں پٹیوں کی چھدائی ہوتی ہے۔ سوراخ ہونے کے بعد ان پٹیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کیا جاتا ہے۔ جب یہ پٹیاں بکسوؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو ان میں مضبوط تار کے پن لگائے جاتے ہیں۔ ان تمام کاموں میں تقریباً آٹھ یا دس مشینیں درکار ہوتی ہیں۔ بعض مشینیں قطع و برید کے کام میں لائی جاتی ہیں اور دوسری چیزوں کو بکسوئے کی شکل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منتقل کرنے کے کام میں آتی ہیں۔ آخر میں ملمع کرنے کی غرض سے ان کو نکل پلانٹ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ملمع کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

سب سے پہلے ان بکسوؤں کو بدرپور کی مٹی کے ساتھ ایک ڈھول میں ڈال کر برقی قوت سے گھمایا جاتا ہے اس طریق عمل سے بکسوؤں کی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں ان کو شفاف پانی میں دھو کر لکڑی کے برادہ میں خشک کیا جاتا ہے جب بکسوئے سوکھ جاتے ہیں تو ان کو ایک اور ڈھول میں جو چمڑے کی کترنوں سے پر ہوتا ہے قلعی کرنے کی غرض سے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے روزن شدہ ڈھول میں ان بکسوؤں کو ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ڈھول ایک پر آب حوض میں جس میں ریٹھا اور سوڈا کا نمک حل کیا ہوا ہوتا ہے برقی قوت سے گھومتا ہے اور اس عمل سے چمڑے کی کترنوں سے پیدا شدہ چکناہٹ کو دور کیا جاتا ہے۔ ان بکسوؤں کو دوبارہ صاف پانی سے دھو کر چوتھے ڈھول میں جس میں سوراخ ہوتے ہیں ملمع ہونے کے لئے ڈال دیتے ہیں۔ جس حوض میں یہ ڈھول ہوتا ہے اس میں امونیکل سالٹ حل کیا ہوتا ہے اور نکل پلیٹیں اس پانی میں لٹکی رہتی ہیں۔ ملمع ہونے کے بعد بکسوؤں کو صاف پانی میں دھو کر پانچویں ڈھول میں جس میں لکڑی کا برادہ بھرا ہوتا ہے خشک کرنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور اس طرح بکسوئے استعمال کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔

(۳) تقسیم عمل — تقسیم عمل موجودہ صنعت و حرفت کا سبب

اہم جزو ہے۔ بکسوؤں کی صنعت میں بھی ہر کارگیر کو جدا جدا عمل سپرد کر دیا جاتا ہے۔ کسی مزدور کو چادر کے کاٹنے میں اور کسی کو چھوٹی چھوٹی پتیاں بنانے میں اور کسی کو ان پتیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کرنے میں لگا دیا جاتا ہے۔ ایک یوم میں ایک مزدور مشین کی مدد سے تقریباً ۱۲۰۰۰ چھوٹی چھوٹی پتیوں کو بکسوؤں کی شکل میں منتقل کر دیتا ہے۔ دوسرے طریق میں تقریباً تین من بکسوے دس گھنٹے میں قلعی کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک تحقیق ہو سکی علیگڑھ کے کارخانوں میں تقریباً ایک ہزار روپے یومیہ کی قیمت کے بکسوے تیار ہو جاتے ہیں ملمع کے کام میں دو یا تین آدمی درکار ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ تمام کام برقی قوت کی امداد سے کئے جاتے ہیں اس لئے بہت جلدی پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور دستی محنت کو اس میں کوئی خاص دخل نہیں ہوتا۔ اس طریق میں مزدور کا کام محض ڈھول کو بکسوؤں سے بھرنا اور اس کو مشین میں لگا کر بجلی سے چلا دینا ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل قلعی وغیرہ کے کام میں انسانی محنت درکار ہوتی تھی لیکن زمانۂ جنگ میں میسرز گنگ اینڈ کمپنی برنگھم نے بیرل سسٹم کے ذریعہ ملمع کاری کا طریقہ روشناس کرایا۔

(۴) بازار کی وسعت بکسوؤں کے لئے بڑے وسیع بازار موجود ہیں پیٹیوں، گھڑیوں کے تسمے اور فیتے اور مختلف قسم کی دوسری چیزوں میں انکی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگ سے پیشتر علیگڑھ کے بکسوؤں کی درآمد برھما میں بھی ہوتی تھی۔ اگرچہ آجکل تمام ہندوستان میں ان کی مانگ ہے لیکن علیگڑھ کے ان کارخانوں کی سالانہ مصنوعات کا بیشتر حصہ کلکتہ، بمبئی، مدراس، کانپور اور آگرہ چلا جاتا ہے جہاں ہندوستان کے چمڑے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔

(۵) اجرت عاملین پیدائش میں محنت بھی ایک عامل ہے اور دوسرے عاملین کی طرح یہ عامل بھی اپنے صلہ کا مستحق ہے۔ اس کارخانے میں اجرت مزدور کی کارکردگی کے مطابق دیجاتی ہے۔ لڑکے اور مرد جو غیر مہارتی کام میں لگائے جاتے ہیں بالترتیب پچیس اور تیس روپے ماہوار پاتے ہیں۔ جنگ سے قبل ان کو بالترتیب آٹھ اور دس روپے ماہوار ملتے تھے۔ کاریگروں اور مستریوں کو جو فٹنگ وغیرہ کا کام کرتے ہیں پچیس روپے سے کر اسی روپے تک دیئے جاتے ہیں۔ جنگ سے پیشتر ان کو پندرہ روپے سے پچاس روپے تک ملتے تھے۔ جنگ کی وجہ سے ضروریات زندگی کی قیمت میں عام اضافہ ہونے کی بنا پر اجرتیں دوگنی سے زیادہ ہو گئی تھیں اب جنگ ختم ہو چکی ہے لہذا اجرتوں میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو رہی ہے۔

(۶) مزدوروں کی حالت پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا نتیجہ ہمیشہ گنجان شہروں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور مزدوروں کی رہائش کا سامان قابل اطمینان میسر ہوتا ہے۔ یہاں کے مزدوروں کی حالت دیگر مقامات کے مزدوروں سے کہیں بہتر ہے جہاں پیدائش بر پیمانۂ کبیر ہے۔

(۷) قوت علیگڑھ کے کارخانے عموماً برقی قوت کی امداد سے چلائے جاتے ہیں لیکن کارخانہ میں بجز قلعی اور ملمع کے کام کے کوئی مشین برقی قوت کی امداد سے نہیں چلائی جاتی تھی البتہ اس امر کی پوری طرح گنجائش ہے کہ برقی قوت کو دوسری مشینوں میں بروئے کار لایا جائے۔

(۸) باقیات الومونیم، پیتل، ٹین اور آہن کے باقیات جو بیکار کترنوں کی شکل میں ہوتے ہیں بیچ دیا جاتا ہے جن سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ الومونیم اور پیتل کی بیکار کترنیں اصل قیمت سے نصف پر فروخت ہو جاتی ہیں۔ اکثر ان کو پگھلا کر دوبارہ چادروں کی شکل میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ ان سے ضروریات زندگی کی مختلف اشیا تیار کرتے ہیں۔ ٹین اور آہن کی بیکار کترنوں سے اصل قیمت کا ½ حصہ حاصل ہوتا ہے۔ آہن کی کترنیں چوہے اور کلیں بنانے کے کام میں آتی ہیں اور ٹین کی کترنوں سے چمچے اور مختلف قسم کے کھلونے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔

(۹) صنعت کے مستقبل کے امکانات اگرچہ علیگڑھ میں بکسوؤں کی صنعت کو قائم ہوئے کئی سال گذر چکے تھے لیکن بیرونی مقابلہ کی بنا پر جنگ سے پہلے اس کو فروغ نہ حاصل ہو سکا۔ جنگ کے سبب اور چونکہ ان کی درآمد بند ہو گئی اس لئے علیگڑھ کے بکسوؤں کی صنعت نے ہندوستان میں نمایاں اہمیت اور حیثیت حاصل کر لی ہے۔ جنگ نے اس صنعت کی ترقی کی رفتار میں اضافہ کر دیا ہے اور اس امر کی امید کی جاتی ہے کہ بابعد جنگ حکومت کی امداد سے یہ صنعت غیر ملکی صنعتوں کا مقابلہ کر سکے گی۔

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔
(ادارہ)

نقد و نظر

لاجونتی

مصنف:- ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر۔
ملنے کا پتہ:- جناب آنند سروپ بھٹناگر ۲۵ تغلق روڈ۔ نئی دہلی۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ فلسفے کی طرح عملی سائنس بھی ایک ایسا موضوع ہے کہ اسکے جاننے والے شعر و ادب سے عموماً کنارہ کش رہا کرتے ہیں لیکن اگر ماہد اقبال جیسا فلسفی شاعر پیدا کر سکتی تھی تو وہ بھٹناگر جیسا سائنسداں شاعر کیوں نہ تخلیق کرتی۔ بھٹناگر صاحب کی شخصیت سائنس کے دائرے میں جس عالمگیر شہرت کی مالک ہے' اتنی ہی شاعری کی دنیا میں زبان زد خلائق ہے۔ موصوف کو یہ عطیہ اپنے نانا منشی ہر گوپال تفتہ سے ورثے میں ملا ہے۔ تاہم انھوں نے گل و بلبل کے افسانہائے عشق سے دامن بچا کر وہ ترقی پسند شاعری اپنے لئے اختیار کی جسے صحیح معنوں میں زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں مطالعۂ قدرت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ چند نظمیں شاعر کی شریک حیات سے متعلق ہیں جن میں جذبات قلب کی ترجمانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ خصوصاً وہ نظمیں جن کا تعلق ان کی علالت اور حسرتناک موت سے ہے اسقدر دلسوز اور روح فرسا ہیں کہ پڑھنے کے بعد کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لاجونتی اور شانتی ـــــ ان دو لفظوں کے آخری تین حروف کی یکسانیت ان کی ازلی و ابدی محبت کا پتہ دیتی ہے۔ بعض نظموں میں قومی اور سیاسی رنگ بھی جھلک رہا ہے۔

نقش و نقاش

مصنف:- جناب سلطان حیدر جوش ملنے کا پتہ:- نظامی پریس بک ایجنسی۔ بدایوں۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔ قیمت ڈھائی روپے۔ اس ناولٹ میں دلچسپ رومانی کیفیات سے قطع نظر آرٹ اور آرٹسٹ کے موضوع پر جو مفید بحث کی گئی ہے' وہ بجائے خود ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ کنز، رواد سلیم ـ دو آرٹسٹ ـ اور ان کے دو موڈل موتی اور سرلا۔ اسی دنیائے آب و گل کی جیتی جاگتی ہستیاں ہیں۔ ان کے کردار پیش کرنے میں تصنع اور بناوٹ سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔ بعض مقامات پر تجزیہ نفسی کرتے ہوئے کسی قدر بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ بیباکی داغ عریانی سے اپنا دامن بچائے رکھتی ہے اور اسی لئے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش بلا تامل کی جا سکتی ہے۔ زبان پاکیزہ اور دلپذیر ہے۔ مگر بعض الفاظ کی املا میں انھوں نے جدت طبع کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً خود اور خوش کو خد اور خش لکھا ہے۔ بعض الفاظ کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ مثلاً پی جے گا، سینے ما، گفت گو وغیرہ۔ چند نئے مصدر گھڑے ہیں۔ مثلاً تلاشنا سے تلاشنا۔ ان تجربات کی صحت و افادیت آنے والا زمانہ ہی کر سکے گا کہ وہ عوام میں مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں۔

جدید اردو شاعری

مصنف:- جناب عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ ناشر:- کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور۔ بڑے سائز کے ۴۹۶ صفحات۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

سروری کی یہ کتاب چند اضافوں کے ساتھ تیسری بار شائع ہوئی ہے۔ اس میں شعر کی حقیقت و ماہیت پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد جدید اردو شاعری کے آغاز و ارتقا کا اس کے پس منظر کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر شاعر کی خصوصیات شاعری اور کلام کے نمونے پیش کئے ہیں۔ موصوف کی رائے نہایت آزاد لیکن ہر قسم کے تعصب سے پاک ہے۔ انھوں نے نہ کسی خاص دبستان شاعری کو سراہا ہے' نہ کسی کی مذمت کی ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں چھپواتے وقت "موجودہ دور" سے متعلق باب میں ان شاعروں کو نظر انداز کر دینا جو اس وقت دنیائے ادب میں اپنے لئے نئے مقامات پیدا کر چکے ہیں، کسی قدر تعجب خیز ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان کو بھی موجودہ دور کے گروپ میں شامل کر لیا جاتا۔ آخری باب "نئی تحریکیں" بالکل تشنہ ہے۔ حالانکہ اس پر سب سے زیادہ بحث ہونی چاہئے تھی کیونکہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شاعری کا ذکر خیر کیا گیا ہوگا جس کے تجربات اس وقت اردو شاعری میں کئے جا رہے ہیں۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری

مصنف:- ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ (علیگ) ملنے کا پتہ:- مسلم یونیورسٹی پریس۔ علیگڈھ۔ بلا جلد۔ قیمت درج نہیں ہے۔

ابواللیث صاحب نے بڑے سائز کے چھ سو صفحات کا یہ طویل مقالہ پیش کر کے علیگڈھ یونیورسٹی سے زبان اردو میں پی ایچ ڈی کی سب سے پہلی سند حاصل کی اور اس طرح دوسروں کے لئے اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کھول دیا۔ اس کتاب میں لکھنؤ کے شعرا اور ان کے کلام کو دس ابواب میں تقسیم کر کے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ ایک باب میں لکھنؤ کے تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ایران کی شاعری کا اس پر کیا اثر پڑا۔ چوتھا باب شاہان اودھ کی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ پانچویں باب میں ان شعرائے دہلی کا تذکرہ ہے جو ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہ امر مسلم ہے کہ مرثیہ گوئی کو سب سے زیادہ ترقی لکھنؤ کی فضا میں حاصل ہوئی' نواں باب اسی موضوع خاص سے متعلق ہے۔ آخری دور کے لکھنوی شعرا میں سے حسرت، طباطبائی، صفی، ثاقب، عزیز، آشا اور آرزو جیسے اساتذہ کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایسی خوبیوں کی حامل ہے کہ اس موضوع کے تمام تذکرے اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات کیلئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

ف۔ ح

لہو ترنگ

مصنف:- جناب سکندر علی وجد۔ ملنے کا پتہ:- عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن۔ مجلد قیمت تین روپے۔ یہ وجد صاحب کی تقریباً ساٹھ نظموں اور متعدد غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے جسے بڑی نفاست کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ غزلوں میں پرانا رنگ کارفرما ہے لیکن نظموں میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ اچھوتے پن کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں بڑا وزن اور زور ہے۔ اشعار کی مترنم کیفیات ان پر مستزاد ہیں جن کا لطف سن کر ہی نہیں پڑھ کر بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ وجد صاحب ابھی جوان ہیں۔ اگر انکا ذوق ادب نوازی اسی طرح قائم رہا تو وہ بہت جلد دنیائے شعر میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

مسیح الملک کا علاج

مرتب: سید وفیسر حکیم محمد مظہر الدین احمد۔ ملنے کا پتہ: دفتر مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی۔ قیمت دو روپے۔ "مسیح الملک" ایک ماہانہ طبی رسالہ ہے جو دواخانہ مجلس اطبا کے کارکنوں کے زیر اہتمام دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس سال اس کا خاص نمبر بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا ہے۔ اس میں تمام بیماریوں کی تشخیص، ان کے لاحق ہونے کے اسباب، ان کی روک تھام اور ان سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کے طریقے طبی و عقلی نقطۂ نظر کے ساتھ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہر مرض پر بحث ختم کرنیکے بعد وہ مجرب نسخے درج کئے ہیں جنکو استعمال کراتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اپنے مطب میں آنیوالے مریضوں کا علاج کرتے تھے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

دنیائے تبسم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین دنیائے تبسم اردو میں بہت مقبول ہیں یہ مجموعہ سلسلۂ تبسم کی سب سے کامیاب کڑی ہے۔ ظرافت کے پردے میں ہندوستانی معاشرت پر تنقید کرنے کا جو طریقہ شوکت صاحب نے نکالا ہے وہ اپنے ہمعصروں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ عبارت کی روانی، طرز بیان کی دلآویزی بے تکلف شگفتگی اور بے تصنع شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب شوکت تھانوی صاحب کی بہترین تصانیف میں شمار کی جا سکتی ہے۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے مقدمہ نے جس میں متانت اور ظرافت آپس میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں کتاب کے لطف میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

مجلد معہ گرد پوش — قیمت ڈھائی روپے صرف

نئی تہذیب نئی تعلیم

امریکہ کے مشہور ماہر تعلیم ولیم۔ ایچ۔ کلپیٹرک کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب تعلیم کے کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیگی اور دوسرے لوگ بھی اسے پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہماری تہذیب جامد ہو کر رہ گئی ہے اور یہی ہمارے مصائب کا راز ہے۔

قیمت مجلد سوا دو روپے صرف عہ/

ہماری دوسری کتابیں

واردات: از منشی پریم چند (افسانے) ...... ۲ؔ
خونی۔ از اختر انصاری (") ...... عہ/
مجنوں کے افسانے از مجنوں گورکھپوری (افسانے) ۱۲؍
ماہ درخشاں۔ بیگم احمد علی (ناول) ...... سے/
بیوہ۔ منشی پریم چند۔ (ناول) ...... ۱۲؍
آبگینے۔ اختر انصاری (قطعات) ...... ۱۲؍
تجلیات۔ مہر عثمانی ... (نظم) ...... ۲ؔ
مسدس حالی۔ صدی ایڈیشن آرٹ پیپر ...... ۱۲؍
جمالیاتی شاعری۔ سعید انصاری (ادب) ...... ۴؍
خارستان۔ آغا شاعر ...... (ادب) ...... ۱۲؍
آب حیات کے لطیفے۔ محمد حسین آزاد (ادب) ... ۱۲؍
مقالات اسلم جیراجپوری ...... (ادب) ... ۱۲؍
خطبات اقبال۔ علامہ اقبال مرحوم ...... ۱۲؍
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاسی) ۱۲؍
مضامین ابو الکلام آزاد (اول) (مذہب) ... للعہ/

مضامین ابو الکلام آزاد (دوم) (سیاسی) ... للعہ/
مضامین البلاغ ...... سے/
ہندوستان کا مستقبل۔ از راجندر پرشاد سابق صدر کانگرس ۱۲؍
غبار خاطر۔ از ابو الکلام آزاد ...... للعہ/
شرح چینی کا رہنما۔ از اسرار احمد (سوانح) سے/
پیتھک لارنس سے ۳/
کیا خوب آدمی تھا ...... (سوانح) ... عہ/
اقبال کا نظریۂ پاکستان ۶/
تاریخ آزاد ہند فوج از منشی عبد القدیر ...... سے/
بچوں کا لندن ...... ۱۲؍
ہوائی حملے ۱۰/
خیال آفرین دماغ عرش تیموری ۔۔ (تمثیل) ... ۶/
حسن حسین ...... (مذہب) ... ۷/
اسلام کیسے شروع ہوا۔ عبد الواحد سندھی (مذہب) ۱۲؍
اسلام کیسے پھیلا۔ اول " " (") سے/

اسلام کیسے پھیلا۔ دوم۔ عبد الواحد سندھی (مذہب) ۱۲؍
سامان آخرت۔ خواجہ غلام الثقلین۔ (مذہب) عہ/

بچوں کی دلچسپ سبق آموز کتابیں

نظم

اسلامی نظمیں ۱۰/ وطنی نظمیں ۱۰/ بچوں کا تحفہ اول ۱۰/
بچوں کا تحفہ دوم ۱۰/ حب وطن ۱۰/ چپ کی داد ۱۲/
تحفۃ الاخوان ۱۰/ مناجات بیوہ ۲/ حقوق اولاد ۳/

کہانیاں

چنن منن ... از شفیع الدین نیر ۳/
میاں مٹھو " " ۵/
ٹلو میاں ۵/ کھلو میاں ۸/
منی کا پرستان ۵/ طلسمی مینا ۵/
فسانۂ عجائب ۳/ دیو مالا ۴/
حیات حالی ۴/
بلی حج کو چلی ۳/ مسولینی ۵/

بیس روپیہ کی کتابیں منگانے والے کو محصول معاف

ہر قسم کی عمدہ کتابیں ملنے کا پتہ

حالی پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار (بی) دھلی

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۶ | ۱۵ اگست ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیران
راجیندر ناتھ شیدا — ایم اے
فضل حق قریشی — دہلوی
مشیر احمد — ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

امریکہ کا خوراکی وفد

پچھلے ماہ امریکہ کا غیر سرکاری خوراکی وفد موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے ہندوستان آیا اور ملک بھر کا دورہ لگا کر دہلی سے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر اپنے وطن لوٹ گیا۔ روانگی سے قبل ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے قائد وفد نے کہا "اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگلی فصل تیار ہونے سے پہلے اہل ہند کو صرف غیر ملکی اناج کی درآمد پر بھروسہ کرنا پڑے گا جہاں تک ممکن ہو سکے یا دہو سکے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اناج کی فراہمی کے ساتھ ساتھ راشن کی تقسیم میں کسی قدر ہاتھ کھینچ کر گزارہ کیا جائے۔ تمام دنیا میں اس وقت اناج کی مقدار محدود ہے اور یہ اچھا ہوا کہ حکومت ہند نے کوئی ایسا مطالبہ پیش نہیں کیا جس کی تعمیل کو، ضرورت سے زیادہ سمجھا جاتا۔ حکومت ہند کا یہ اقدام بھی لائق تحسین ہے کہ اس نے غلے کی موجودہ مقدار کو ان علاقوں میں جمع کر لیا ہے جہاں اس کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ جنوبی ہند میں خاص طور پر غلے کی فراہمی اور راشن کا انتظام اتنا اعلیٰ ہے کہ اس کی مثال شاید ساری دنیا میں کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔ اس حسن انتظام نے قحط کے امکانات کی بڑی حد تک روک تھام کر دی۔"

وفد مذکور نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستان میں اگر اناج کا کوئی مرکزی ذخیرہ قائم کر دیا جائے تو صورت حالات زیادہ سدھر سکتی ہے یعنی اگر کسی مقام پر اناج کی یکبیک کمی واقع ہو جائے تو مرکزی ذخیرے سے مدد پہنچائی جا سکے۔ اس کے ذریعہ راشن کی مقدار بھی سارے ملک میں یکساں کی جا سکتی ہے۔ بنگال جیسے مقامات پر جہاں اناج کی کمی رہتی ہے اور جہاں کے پچھلے دردناک واقعات کی یاد خوف اور اندیشے کی صورت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ مرکزی ذخیرے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب سوال کیا گیا کہ امریکہ سے ہندوستان کو کس قدر مدد مل سکتی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ "میں غلط توقعات پیدا کرنی نہیں چاہتا۔ بہتر یہی ہے کہ تمام ہندوستانی باہمی تعاون کا لحاظ رکھتے ہوئے جیسے چھٹانک راشن پر اکتفا کریں اور زیادہ کے مطالبات پیش کر کے انتظام میں رخنے نہ ڈالیں۔ نئی فصل آنے تک یہ صورت لازمی ہے۔ تمام دنیا میں خوراک کی حالت نازک دور سے گذر رہی ہے لہٰذا کسی ملک کے لئے بھی زیادہ مقدار میں اپنے پڑوسی کو اناج دینا ممکن نہیں ہے۔"

ہیروں کی کان

جنوبی افریقہ میں جھیل وکٹوریہ کے جانب جنوب ٹانگانیکا کے دلدلی جنگلوں میں ایک مقام وادیٔ شنیانگا کہلاتا ہے۔ وہاں ہیروں کی ایک بہت بڑی کان دریافت کی گئی ہے۔ یہ وادی چند مہلک فیاؤں اور بخاروں کا مرکز ہونے کے علاوہ شیروں، چیتوں اور اژدھوں کا مسکن ہے۔ وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔ اور پھر قیام کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے اس لئے بہت سے لوگ وہاں جاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ تاہم آسٹریلیا کے ایک دھیڑ عمر تاجر جن کا نام ڈاکٹر جے پی ولیم سن ہے، اس علاقہ پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے لاکھوں روپے پیش کئے کہ ہیرے نکالنے کا انتظام ہمارے سپرد کر دیا جائے مگر ولیم سن نے قبول نہیں کیا۔ چند سال پہلے جب انہوں نے اپنا کاروبار چلانے کے لئے مالی مدد مانگی تو ایک دھیلا بھی جمع نہ ہو سکا۔ لیکن آج شرکت کے لئے کروڑوں روپیہ پیش کیا جا رہا ہے محض اس لئے کہ ان ہیروں کی تجارت لاکھوں روپے سالانہ کے اعداد و شمار پر ہو رہی ہے چونکہ شروع میں لوگوں نے ساتھ نہیں دیا تھا اسلئے اب وہ لوگوں کو شامل کرنا نہیں چاہتے۔

حیدرآباد کا صنعتی وفد

حال ہی میں ایک صنعتی و تجارتی وفد حیدرآباد سے روانہ ہو کر انگلستان پہنچا ہے۔ اس کے قائد نواب زین یار جنگ بہادر ہیں جو کچھ عرصہ سے پہلے ریاست کے تعمیرات امور عامہ کے وزیر تھے۔ یہ وفد بعد جنگ کی ترقیوں کے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں بھیجا جا رہا ہے جو کچھ عرصہ پہلے حکومت حیدرآباد نے اپنی ریاست کی فلاح و بہبود کے لئے مرتب کیا تھا اور جس کی رو سے آئندہ پندرہ بیس سال کی مدت میں بہت سے نئے کام شروع ہونگے۔ اس منصوبے کی کل لاگت کا اندازہ تین کروڑ پونڈ کے قریب ہے۔ اس میں سے

منعتی ترقیوں کی مد میں پچاس لاکھ پونڈ کی رقم محسوب کی گئی ہے۔ وفد مذکور اس رقم سے برطانوی مال خریدنے کی کوشش کرے گا۔ ریاست کو اس وقت تیل، سیمنٹ، شکر، کھانڈ اور مصنوعی ریشم تیار کرنے والی مشینوں کی سخت ضرورت ہے۔ پانی اور بھاپ کی قوت پیدا کرنے والے کارخانوں کا قیام بھی ضروری ہے۔ فی الحال اس وفد نے مانچسٹر کے کارخانوں میں جاکر ضروری معلومات حاصل کی ہیں۔ سوئیڈن، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا اور امریکہ کا دورہ لگا چکنے کے بعد پتہ چلیگا کہ برطانیہ میں اس کے معاہدے کس کس سے ہو سکیں گے۔ علاوہ برطانیہ کے مصنوعی ریشم کے کارخانوں سے بھی بات چیت کرنی ہوگی۔ مال خریدنے کے علاوہ ٹکنیکل معاہدے بھی دائرۂ عمل میں آئیں گے۔

چین میں خانہ جنگی کا نیا دور

جاپان کی سپر اندازی کے بعد چین میں خانہ جنگی کا سلسلہ تھوڑے عرصہ قائم رہا لیکن جلدی ہی گفتگوئے مصالحت شروع ہو گئی اور اس میں شک نہیں کہ اس ضمن میں امریکہ کے جنرل مارشل کی کوششیں بڑی حد تک کامیاب رہیں۔ تمام چین میں امن و عافیت کی فضا پھیل گئی تھی اور باہمی مصالحت کی گفتگو بہت پرسکون طریقے پر جاری تھی کہ یکایک خانہ جنگی کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی اور پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے شعلے جان و مال کو نقصان پہنچانے لگے۔ نانکنگ اور شنگھائی کے درمیان دریائے یانگسی کے کنارے کیانگ گن کے قریب ایک اہم بحری اڈا ہے۔ وہاں اشتراکیوں نے رات کے وقت چھاپہ مارنے کی کوشش کی مگر چین کی قومی جماعت کے سپاہیوں نے انہیں مار بھگایا۔ سرکاری اور اشتراکی دستوں میں اب بھی گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ مقام چین کے صدر مقام نانکنگ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ چین کے ایک سرکاری بیان سے معلوم ہوا کہ تین ہزار اشتراکی نانکنگ کے علاقے میں لڑتے ہوئے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ سنا گیا ہے کہ اشتراکیوں کے مزید دستے اس جنگی ساز و سامان کے ساتھ جو اسی مقام پر جاپانیوں سے چھینا گیا تھا لیس ہو کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اشتراکیوں کے پاس سب سے زیادہ ہوائی جہاز موجود ہیں حالانکہ وہ خود اسکی تردید کرتے ہیں۔ زبردست جمود و تعطل کے بعد یک دم لڑائی چھڑ جانے کے باعث جبکہ دونوں جماعتیں جلد مدافعت کے لئے تیار نہیں تھیں، صورت حالات بہت نازک ہو گئی ہے۔

چینی زبان کی ٹائپ مشین

سب جانتے ہیں کہ چینی اور جاپانی زبانیں اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہیں کیونکہ ان کا طرز تحریر بہت ہی عجیب و غریب اور دشوار پسند ہے۔ حروف ابجد کے طور پر جو منفرد یا مرکب علامات استعمال کی جاتی ہیں، ان کی تعداد کم و بیش ڈھائی ہزار ہے۔ بعض لفظوں حتیٰ کہ جملوں کے لئے بھی صرف ایک ایک نشان مقرر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کو سیکھنا قدیم مصری ہیروغلیفی زبان سیکھنے سے بھی زیادہ وقت طلب ہے۔ اسی لئے طباعت کے سلسلے میں ان کے ٹائپ کا ذخیرہ ایک طومار معلوم ہوتا ہے۔ ان مشکلات کے ہوتے ہوئے یہ بات کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ چینی زبان کی ٹائپ مشین کبھی ایجاد ہو جائے گی مگر اب یہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ چینی ٹائپ مشین کی ایجاد کا سہرا چین کے مشہور و معروف مصنف لِن یوتانگ کے سر ہے جو ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ انجینیر اور ماہر فنون بھی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے ٹائپ رائٹر میں کم و بیش تین ہزار حروف اور جوڑ ہوں گے۔ یہ تعداد یقیناً بہت زیادہ ہے۔ اس مشین پر کام کرنے والے کو بہت عرصے میں پوری مہارت حاصل ہوا کریگی، لیکن اس کی زبردست افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی اور اردو کی ٹائپ مشینوں میں چالیس پچاس کے قریب حروف یا جوڑ ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں تین ہزار کا عدد کس قدر ہوشربا معلوم ہوتا ہے۔

برطانیہ اور کینیڈا کے مابین معاہدہ

حال ہی میں برطانیہ اور کینیڈا کے مابین ایک اقتصادی معاہدہ ہوا ہے۔ یہ طے پایا ہے کہ یکم اگست ۱۹۴۶ء سے آئندہ چار سال تک برطانیہ کینیڈا سے گیہوں خریدے گا۔ پہلے دو سال میں حکومت کینیڈا سولہ کروڑ بشل ہر سال فراہم کرے گی اور بعد کے دو سال میں چودہ کروڑ بشل ہر سال۔ دارالعوام میں اس معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اغذیہ نے کہا کہ حکومت کینیڈا نے اس امر کا وعدہ کیا ہے کہ اچھی فصل ہونے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مقدار پہلے دو سال میں دیدی جائے گی۔ یہ بھی طے پایا ہے کہ موجودہ شرطوں میں ترمیم و تنسیخ کا حق دونوں فریق کو ہر وقت حاصل رہیگا بشرطیکہ اسکا فیصلہ باہمی طور پر بین الاقوامی انتظامات کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا جائے۔ وزیر اغذیہ نے کہا کہ یہ معاہدہ تجارتی اعتبار سے ہے اور دونوں ملکوں کے مفاد کا خیال رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر جیسا کہ قیاس ہے، اگلے چار سال میں اناج کی کمی رہی تو برطانیہ کے لئے قحط سے بچنا ممکن نہ ہو سکیگا۔ پھر قیمت بھی منڈی کے عام بھاؤ سے کم لی جائے گی یعنی پہلے سال اس شرح سے جو امریکہ میں رائج ہو تیس فیصدی کم دام دینے ہوں گے۔ رقم کی ادائیگی کینیڈا کے ڈالر والے سکوں سے ہوگی اور وہ روپیہ جو امریکہ سے حال ہی میں قرض لیا گیا ہے، اس مد میں خرچ نہیں کیا جائیگا۔

جارج برنارڈ شا

برطانیہ کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نویس جارج برنارڈ شا کی عمر ۲۶ جولائی کو نوے سال کی ہو گئی۔ مسٹر شا آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں لیکن عرصۂ دراز سے انگلستان میں رہنے کے باعث

دیس کے باشندے سمجھے جانے لگے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ۱۸۸۰ء میں چھپا۔ گویا وہ گذشتہ چھیاسٹھ سال سے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے بے شمار ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے ہیں جن میں زیادہ تر اشتراکی خیالات کی ترجمانی اور تائید کی گئی ہے۔ وہ نوّے سال کے ہونے کے باوجود اس وقت بھی نہایت قوی اور تندرست ہیں۔ اس سالگرہ کے موقعہ پر انہوں نے فرمایا کہ اب میں زندگی کی اس منزل میں قدم رکھ رہا ہوں جہاں پہنچ کر انسان سیاست کو سمجھ سکتا ہے نیز وہ حکومت کی پالیسی کے متعلق بھی اپنی رائے پیش کر سکتا ہے کیونکہ صحیح زندگی در اصل نوّے سال کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ابھی چند مہینے پہلے اپنی زندگی کا بیمہ کرایا ہے۔ نناوے سال کی عمر ہونے پر ان کو ایک کثیر رقم کمپنی سے ملے گی۔ وہ خود بھی بہت مالدار انسان ہیں۔ ان کی بیشتر آمدنی تصانیف کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ ان کی آمدنی کی اوسط تقریباً سوا چھ روپے فی لفظ ہے۔ کثیر التصانیف ہونے کے باعث اس حساب سے مجموعی رقم بے قیاس ہو جاتی ہے۔ ان کے ڈراموں کے فلم بھی تیار ہوئے ہیں۔ ان کی رائے ہمیشہ بے باکانہ ہوتی ہے۔ وہ اظہار خیال کرتے وقت کسی کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھتے۔

آسٹریا کا صدر مقام

آجکل سفر کرنے والے زائرین آسٹریا کے صدر مقام شہر وائنا میں پہنچتے ہیں تو یہ دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں کہ خوبصورت اور عالیشان عمارتیں پچھلی جنگ میں ہوائی حملوں کی زد سے مسمار ہو کر خاک دھول اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بن گئی ہیں۔ مشہور تاریخی کلیساؤں اور محلوں کو عام مکانوں اور سرکاری عمارتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ طویل و عریض اور عظیم الشان ہونے کے باعث جہازوں میں بیٹھنے والوں کو زیادہ آسانی سے نظر آ جاتے تھے۔ ہوائی لڑائی میں تباہی کا سب سے بڑا مرکز وہ علاقہ رہا جو دریائے ڈینیوب کے دونوں ساحلوں پر آباد تھا۔ ان مقامات پر روسی اور جرمن دستوں میں برابر چار دن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی تھی۔ کئی درجن پلوں اور ساحلی قہوہ خانوں کی وجہ سے ان کی اہمیت لڑائی سے پہلے ہی بہت زیادہ تھی۔ لڑائی کے دنوں میں اہم مورچوں کی کنجی ہونے کے باعث ان کا درجہ بدستور بلند رہا۔ اب نہ ان پلوں کا پتہ ہے نہ قہوہ خانوں کا۔ ہر عمارت بری طرح مسمار ہو چکی ہے اور ایک آدھ جو کسی قدر بچ رہی ہے، اتنی خطرناک حالت میں ہے کہ اسے ڈائنامیٹ کے ذریعہ منہدم کرایا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روسی دستوں نے انکی درستی اور تعمیر نو میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے لیکن سابقہ شان پیدا ہونے کے لئے عرصہ دراز چاہئے۔ قہوہ خانوں میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے اور بے فکر ہو کر سیر دریا کا لطف اٹھانے کے موقعے جلدی ہی نصیب نہیں ہو سکیں گے۔

آسٹریا کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مرمت اور تعمیر نو کے سلسلے جاری ہیں لیکن اہم نقصانات کی تلافی تو شاید کسی طرح بھی نصیب نہ ہو سکے گی۔

ہندوستانی فوج میں تخفیف

مرتبہ خاکے کے مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء تک ہندوستانی فوج میں تخفیف ہوتی رہیگی۔ یہ سلسلہ پچھلے سال اکتوبر ہی کے مہینے میں شروع ہوا تھا۔ دنیا کی اس سب سے بڑی رضاکار فوج کے دس لاکھ سپاہی کم کر دئے جائیں گے۔ اس خاکے کے مطابق فیصلہ ہوا تھا کہ ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء تک ساڑھے آٹھ لاکھ فوجی فرد کم ہو جانے چاہئیں۔ رفتار تخفیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ تجویز عملی جامہ پہن لے گی۔ اس سال مئی کے آخر تک ساڑھے چھ لاکھ نفوس فوجی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر شہری زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ تخفیف کا سلسلہ بڑی تیزی کے ساتھ چلتا رہا ہے۔
اکتوبر ۱۹۴۵ء سے مارچ ۱۹۴۶ء تک ماہانہ اوسط تقریباً پچھتر ہزار رہی۔ اپریل میں چالیس ہزار زیادہ کم کئے گئے لیکن مئی کے اعداد و شمار یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار سب پر سبقت لے گئے۔ مئی کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ شاید یہ ریکارڈ کبھی ٹوٹ نہیں سکیگا۔ ۳۰ جون ۱۹۴۶ء تک کم ہونے والے مرد و عورت کی کل تعداد سات لاکھ چورانوے ہزار آٹھ سو ہے۔ صرف جون کے مہینے میں چوراسی ہزار سات سو ساٹھ ہندوستانی فوج سے، چھ سو دو ہندوستانی بحریہ سے اور ایکہزار نو سو اکتیس ہندوستانی فضائیہ سے کم کئے گئے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے ریاستی دستوں سے چھ ہزار دو سو آٹھ نفوس کی تخفیف کی گئی۔

سانحۂ ارتحال

یکم اگست کا آجکل چھاپہ خانے میں جا چکا تھا کہ یہ افسوسناک خبر سننے میں آئی کہ دہلی کے مشہور ادب نواز جناب فصیح الدین احمد ایم۔ اے اچانک حرکت قلب بند ہونے کے باعث اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ موصوف نہایت قوی الجثہ اور تندرست انسان تھے۔ اس غیر متوقع صدمۂ عظیم سے کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مرحوم ماہانہ "ادیب" اور "نیو لائٹ" کے مدیر، ہارڈنگ لائبریری کے ناظم اعزازی اور محکمۂ راشننگ کے ایک افسر اعلیٰ تھے۔ وہ بہت سی خوبیوں کے حامل تھے جن کے باعث ہر شخص ان کا مداح تھا۔ انہوں نے انگریزی زبان سے کئی ناولوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ طبعزاد افسانے اور مقالے بھی لکھے ہیں۔ "ادیب" کا اعلیٰ معیار ان کی بلند ذوقی کا ثبوت ہے۔ ہارڈنگ لائبریری میں صرف انکی وجہ سے ادبی فضا قائم تھی۔ انہوں نے ماہانہ مشاعروں اور ادبی جلسوں کا انتظام کر رکھا تھا جن کی مثال دوسری لائبریریوں میں ملنی مشکل ہوگی۔ بے وقت وفات پر ادارۂ آجکل اظہار افسوس کرتا ہے۔ دعا ہے کہ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

حشرِ جذبات

ثاقب کانپوری

میں عشق و محبت میں پشیماں نہیں ہوتا
مجھ پر کسی بے درد کا احساں نہیں ہوتا

ہوتا ہے محبت میں وہی روحِ غمِ عشق
جو درد کہ منت کشِ درماں نہیں ہوتا

کیا راز ہے اے عشق تری آگ کے ہوتے
ہستی کا ہر اک ذرہ پریشاں نہیں ہوتا

کس طرح ہوا کرتا ہے آغازِ محبت
نظارہ اگر شوق کا عنواں نہیں ہوتا

یاد آتا ہے وہ عشق و جوانی کا زمانہ
جب ضعف سے ہاتھوں میں گریباں نہیں ہوتا

کیا اس کو سمجھتا ہوں ترے عشق کا حاصل
کیوں مجھ سے ترے درد کا درماں نہیں ہوتا

کس طرح دلاؤں انھیں الفت کا یقیں میں
صورت سے مری رنگ نمایاں نہیں ہوتا

کس طرح بہار آ کے گزرتی ہے قفس میں
دامن پہ اگر رنگِ گلستاں نہیں ہوتا

کیا کیجئے اس سے گلۂ جورِ محبت
جو عشق کی حسرت پہ پشیماں نہیں ہوتا

ہے وجہِ تسلی وہی دل کیلئے ثاقب
جو مرحلۂ سخت کہ آساں نہیں ہوتا

یوں سناتا ہے کسی کو، کوئی افسانہ کہیں
ہے کہیں ہنگامۂ کعبہ تو بت خانہ کہیں

پھر بھی جاتا دستِ ساقی سے جو پیمانہ کہیں
بزم سے اس کی نکل سکتا تھا دیوانہ کہیں

راز ہی رہتی زمانے میں حقیقت کفر کی
کعبۂ مقصود بن جاتا جو بت خانہ کہیں

میرے ساغر کو تو دزدیدہ نگاہی سے نہ دیکھ
روحِ مستی بن نہ جائے دل کا پیمانہ کہیں

تیرا جلوہ گر بہ قدرِ ظرف ہوتا دہر میں
کچھ تو ظاہر ہو ہی جاتا رازِ بت خانہ کہیں

تیری محفل میں بھی ساقی ہیں وہی محرومیاں
پا نہیں سکتا تسلی ذوقِ رندانہ کہیں

دیکھتا پھر تیرا، رنگِ بزم او عشرت نواز
گر اثر انداز ہوتا میرا، افسانہ کہیں

ضبط سے کچھ کام لے اے انتہائے شوقِ دید
سوچ تو بے ربط ہو جائے نہ افسانہ کہیں

کچھ تو کر پاسِ وفا، اے حسنِ مستورِ ازل
کر نہ دے بدنام تجھکو ذوقِ بیگانہ کہیں

جانبِ کعبہ چلا ہوں راہ میں ثاقب مگر
آ نہ جائے سامنے پھر حسنِ بت خانہ کہیں

ثاقب کانپوری

جناب ثاقب کانپوری دورِ حاضر کے اُن چند جوان سال سحر طرازوں میں سے ہیں جن کی رشک آفریں شہرت دنیائے ادب کے دور دست گوشوں تک پہنچ چکی ہے۔ قدرت نے جنھیں ذوقِ سلیم اور ایک بے تعصب دل عطا کیا ہے ان کے لئے تو کلام ثاقب شہاب ثاقب کی طرح آپ ہی اپنی روشنی کی بین دلیل ہے مگر کمزور آنکھ کے لئے عینک کی ضرورت ہے جسکی مدد سے نظر اچھی طرح کام کر سکے دُھندلے نقوش اُبھر آئیں اور منظر کا جزو و کل آئینہ ہو جائے۔ اس سے میری مراد نقد شعر کے لئے ایک معتدل معیار پیش کرنا ہے۔ مطلق حسن و قبح اور خوبی و زشتی کے پرکھنے کے لئے کوئی حقیقی معیار نہ کبھی معین ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ تعریفات عموماً یکساں طور پر مغالطہ انگیز اور غیر تسلی بخش ہوتی ہیں۔ خصوصاً شعر کی جتنی تعریفیں آج تک کی گئی ہیں وہ اسی نوعیت کی ہیں کیا ایک نقاد کے لئے کسی کلام موزوں کے متعلق قطعی طور پر یہ کہنا ممکن ہے کہ "یہ شعر ہے، اور "یہ شعر نہیں ہے"۔ یا جسطرح ایک سائنسداں مادی اشیاء کی نسبت ایک قطعی حکم لگا سکتا ہے کیا اسی طرح ایک نقاد بھی شعر کے محاسن کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ صادر کر سکتا ہے؟ — لارڈ بائرن کے بقول:-

"نقد شعر کے اصول یکسانی سے اسقدر بعید ہیں کہ نہ کبھی ان کی تعین ہو سکی ہے اور نہ ہو سکے گی۔ ان اصولوں سے مراد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایک خاص عہد کے میلانات ہیں اور یہ میلانات ہر دور میں مخصوص اور عہد گزشتہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک وقت ہومر اور درجل کا دَور دَورہ ہے دوسرے وقت ڈرائیڈن کا اس کے بعد والٹر اسکاٹ کا وغیرہ وغیرہ۔"

خود میرے ایک زمانہ شناس دوست کا قول ہے کہ "حُسن نام ہے پسند کا" باینہمہ جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کی ایک اضافی اور اعتباری حیثیت قائم کی جاتی ہے اسی طرح شعر کے حدود بھی معین کئے جا سکتے ہیں اور کئے ہو گئے ہیں۔

شعر کی ایک تعریف تو وہی ہے جو صدیوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہے اور علم عروض و قافیہ کی کتابوں میں عموماً کسی تغیر اور تبدل کے بغیر پائی جاتی ہے یعنی "شعر وہ کلام موزوں ہے جو متکلم نے بالقصد موزوں کیا ہو"۔ یہ قصد ارادہ کی قید خوش اعتقاد بزرگوں نے جس وجہ سے لگائی اسکی تصریح کا یہ محل نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ نیک نیتی کے جوش میں حماقت کا ایک دلچسپ مظاہرہ کیا ہے۔ خیر ارادہ (قافیہ) اور وزن کی شبک مایہ بحثوں سے گزر کر اب دیکھنا چاہئے کہ اساتذۂ فن کے نزدیک وزن و ارادہ کے علاوہ اور بھی کوئی چیز ہے جسے شعر کی اصل و حقیقت کہہ سکتے ہیں؟ چونکہ اُردو شعر کا ماخذ فارسی اور فارسی کا سرچشمہ عربی ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے اساتذۂ عرب و عجم کے خیالات پر نظر ڈالنی چاہئے آج تو یہ مسئلہ بالکل طے ہو چکا ہے لیکن قدما کے کلام میں بھی اس کے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں کہ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں[1] بلکہ اسکی روح رواں تخیل ہے۔ اساتذۂ فارس نے بھی تخیل ہی کو شاعری کی جان مانا ہے مثلاً نظامی، عروضی سمرقندی جو چھٹی صدی ہجری کا ایک بلند پایہ شاعر اور جید فاضل ہے اپنی نادر الوجود کتاب چہار مقالہ میں فن شعر کے متعلق لکھتا ہے: "شاعری وہ فن ہے جس کے ذریعہ شاعر مقدمات موہومہ کو اس طرح مرتب کرتا ہے کہ چھوٹی بات کو بڑی اور بڑی بات کو چھوٹی خوبی کو زشتی اور زشتی کو خوبی کر دکھاتا ہے اور ایہام کی مدد سے قوت غضبی و شہوی کو مشتعل کر دیتا ہے۔ یہانتک کہ اس ایہام سے دلوں میں شگفتگی و گرفتگی پیدا ہو جاتی ہے[2]"

فضلائے عرب میں سے کسی نے شعر کی تعریف اسطرح کی ہے کہ "شعر وہ ہے جو قلب انسانی کے عمیق ترین اسرار کو مجسم کر دیتا ہے یعنی وہ اُن اسرار کو خیالی صورت میں لانے اور حواس ظاہری کے سامنے پیش کرنیکا واسطہ ہے[3]"

یا بالفاظ دیگر جذبات و احساسات کی مصوری کا دوسرا نام شاعری ہے اب ہمیں اس بارے میں دیگر اقوام کے خیالات کا جائزہ لینا چاہئے۔ ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے[4] یونان کی ایک قدیم ضرب المثل ہے کہ "شعر ایک بولتی ہوئی تصویر ہے" گویائی کی شمعوں نے ارسطو کی تعریف میں ایک معتد بہ اضافہ کر دیا۔ گویائی زندگی کا ثبوت ہے۔ اب گویا تصویر کے قالب میں جان بھی پڑ گئی۔

عندلیب شادانی

یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت نازک اور لطیف بحثیں کی ہیں اُن سب کا خلاصہ شعر کی وہ حسب ذیل تعریف ہے جو انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں بیان کی گئی ہے۔

"شعر مطلق وہ جذبات انگیز اور موزوں کلام ہے جو انسان کی قلبی کیفیات کو اس خوبصورتی سے پیش کرے کہ وہ مجسم ہو کر سامنے آ جائیں۔"

---

[1]: شعر العجم حصہ اول علیگڑھ اڈیشن۔
[2]: چہار مقالہ۔ مقالۂ دوم ص۱۱ لاہور اڈیشن۔ مرتبہ شادانی۔
[3]: دائرۃ المعارف جلد دہم ص۲۵۲ مطبوعہ مصر۔
[4]: شعر العجم حصہ اول ص۱۲۔ علیگڑھ اڈیشن۔

وہ فی الواقع معلوم ہونے لگتی ہیں تخیل کے زیر عمل اگرچہ شاعر کا طریق استدلال منطقیانہ نہیں ہوتا مگر جو نتائج وہ نکالتا ہے جذباتی حیثیت سے دل کے لئے ضرور قابل قبول ہوتے ہیں۔

دوسری چیز صحیفہ کائنات اور خصوصاً فطرت انسانی کا مطالعہ ہے کیونکہ یہی وہ سامان اور مصالحہ ہے جس سے صناع تخیل شعر کی عمارت چنتا ہے۔ اگرچہ نہایت مختصر ذخیرۂ معلومات سے بھی متخیلہ کچھ نہ کچھ کام لے سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اسے اپنے کمال صنعت کے اظہار کا موقع نہیں مل سکتا۔

تیسری چیز ان الفاظ کا انتخاب ہے جن کے ذریعہ کسی معنی کو ادا کیا جائے۔ الفاظ کے برمحل استعمال پر قدرت ایک نہایت اہم چیز ہے۔ کیونکہ خیال کتنا ہی لطیف پاکیزہ کیوں نہ ہو اگر جب خوبصورت مناسب الفاظ میں ادا نہ کیا جائے تو اسکا حسن فنا ہو جاتا ہے۔ شعر نام ہے جذبات اور نیچر کی منہ بولتی تصویر کا۔

تخیل، مطالعہ کائنات و فطرت انسانی اور الفاظ کا مطالعہ، انتخاب اور برمحل استعمال اس کے لوازم ہیں، اعلیٰ درجہ کے اشعار کے لئے اصلیت، سادگی اور جوش بیان ضروری چیزیں ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس معیار کے مطابق کلام ثاقب کا کیا درجہ ہے۔

ثاقب کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ "متاعِ درد"[1]، ۱۲ مسلسل نظموں ۵، غزلوں اور ۵۴ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ از روئے ترتیب پہلا نمبر مسلسل نظموں کا ہے مگر ہم بوجوہ پہلے غزلیات کو لیتے ہیں۔

عربی کی ایک مشہور مثل ہے کہ "کم ترک الاوّل للآخر" یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور کہیں اس مثل کا صحیح اطلاق ہو سکے یا نہ ہو سکے مگر اردو غزل پر یقیناً یہ مثل بالکل صادق آتی ہے عشق و عاشقی کے مختلف مدارج میں جو کیفیات انسان پر طاری ہوتی ہیں ان کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں مان لیا جائے پھر بھی اس ایک محدود موضوع کے مختلف پہلو اتنے نہیں ہو سکتے کہ ایک جم غفیر کی سیکڑوں برس تک مسلسل طبع آزمائی کے بعد بھی ختم نہ ہوں اول تو فارسی والوں ہی نے کیا چھوڑا تھا اور رہا سہا جو کچھ تھا وہ ہمارے اساتذہ ختم کر گئے ایسی حالت میں غزل میں کسی دلنواز ندرت کا پیدا کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ میر صاحب اردو کے جیسے مسلم الثبوت اور گراں پایہ شاعر ہیں دنیا جانتی ہے اور ان کے بہتر نشتروں کا چرچا بھی عام ہے۔ مگر آج تک کوئی یقین نہ کر سکا کہ آخر وہ بہتر نشتر کون سے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ یہ بہتر نشتر کبھی نظیری میشاپوری کا طغرائے امتیاز تھے، لیکن عقیدتمندوں نے میر صاحب کی طرف منسوب کر دئے جس طرح بعض کرامتیں با اخلاص مریدوں کی بدولت ہر زمانہ کے بزرگوں سے منسوب چلی آتی ہیں۔ پروفیسر محمد حسین آزاد

---

[1] متاعِ درد ۱۹۲۸ء میں مرتب ہوا تھا۔ زمانہ کو نظر میں رکھئے۔

صاحب آبحیات کے بقول یہ بہتر کی تعداد فرضی ہے۔ بہر تقدیر اگر اس تعداد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ حقیقت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ میر صاحب نے غزلوں کے چھ ضخیم دیوان چھوڑے ہیں اس طرح گویا ان کے ہر دیوان میں نشتروں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں۔ پس آج کل کے مجموعۂ غزلیات میں دس بیس شعر بھی ایسے نکل آئیں جنہیں مذاق سلیم "نشتر" تسلیم کرے تو یقیناً یہ اس نغز گو کے کمال فن کی آخری دلیل ہوگی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے جناب ثاقب کے مختصر مجموعۂ کلام میں غزلوں کی تعداد پچھتر ہے۔ اس میں بھی اکثر غزلیات تین چار اور پانچ شعر کی ہیں لیکن با اینہمہ ناظرین کو جا بجا وہ بجلیاں کوندتی نظر آئیں گی جو محبت سرشت کے سرمایۂ شکیب کو خاکستر کئے بغیر نہیں چھوڑ سکتیں۔ تخیل جو شعر کی جان ہے اور جس کے مختلف مراتب پر شعر کے ادنیٰ و اعلیٰ ہونیکا انحصار ہے قدرت نے دل کھول کر ثاقب کو عطا کیا ہے۔ اگرچہ تخیل کی تعریف بیان ہو چکی ہے مگر اسکا مفہوم زیادہ واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے کلام ثاقب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ؎

جان دیتا ہوں قفس میں دونوں پر کھولے ہوئے
حسرت پرواز میں بھی شان ہے پرواز کی

شاعر کو یہ پہلے سے معلوم ہے کہ طائر جب اڑنا چاہتا ہے تو اپنے دونوں پر کھول دیتا ہے۔ اب اس نے دیکھا کہ ایک پرندہ قفس میں بند دونوں بازو پھیلائے ہوئے جان توڑ رہا ہے۔ سبب مرگ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کی متخیلہ نے ان معلومات کو ایک نئی شکل میں مرتب کر کے پیش کر دیا یعنی اس آخری لمحہ میں دونوں پروں کا پھیلا ہونا اس کے نزدیک دلیل ہے اس امر کی کہ طائر محبوس کو تمام زمانۂ قید میں آزادی کی تمنا رہی حتیٰ کہ مرتے مرتے بھی قفس سے چھوٹ کر پرواز کر جانے کی حسرت اس کے دل میں موجود تھی۔ ؎

غلط ہے ناز یہ آسودگان منزل دوست ؛ ہلاک منزل جاناں بھی کامیاب ہوا

شاعر یہ پہلے سے جانتا ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جانا ہی کامیابی ہے اور کامیاب ہو جانے کے بعد انسان اپنی کامیابی پر ناز کیا کرتا ہے اور جو شخص منزل پر پہنچنے سے پہلے راستہ ہی میں ضائع ہو جائے وہ گویا ناکام رہا اسے یہ بھی معلوم ہے کہ راہ کی صعوبتیں اور سفر کی تکلیفیں منزل پر پہنچنے کے بعد راحت و آسائش سے مبدل ہو جاتی ہیں اب متخیلہ نے ان معلومات میں اپنا تصرف کر کے ایک بالکل نئی ترتیب پیدا کر دی یعنی جو لوگ منزل جاناں تک پہنچ گئے اور اب ہمدوش آسودگی ہو کر اپنی کامیابی پر نازاں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اثناء راہ میں سفر کی سختیاں جھیلتے جھیلتے فنا ہو گئے اور منزل جاناں تک نہ پہنچ سکے انہیں حصول مقصود میں کامیابی نہیں ہوئی وہ ایک سخت غلطی میں مبتلا ہیں اسلئے کہ اگر منزل جاناں کا متمنی راستہ میں ہلاک ہو جائے تب بھی اُسے کامیاب سمجھنا چاہیئے کیونکہ غائیت سعی،

خوشنودیٔ محبوب ہے اور ظاہر ہے کہ جو راہ طلب میں خود کو مٹا دے اس سے بڑھکر محبوب کی خوشنودی اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟

ان مثالوں میں تخیلہ کا عمل معنیً اور لفظاً دونوں طرح حد درجہ لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے بخوفِ طوالت مانعِ تشریح ہے اس لئے اب ہم چند شعر کسی تفسیر کے بغیر درج کرتے ہیں ؎

میدانِ حشر میں بھی تھی اُمیدِ التفات ٭ دامانِ آرزو مرا کتنا دراز تھا؟
برقِ ناکام گئی سوز کی حسرت لیکر ٭ جیب نہ کچھ خانۂ برباد میں ساماں نکلا
عشق کی منزلوں میں ہے میرا خیال کچھ بلند ٭ یہ نہیں جانتا ہوں میں درد ہے کیا قرار کیا
گلوں سے میں آغوشِ وا بہرِ رخصت ٭ ذرا بڑھ کے بلبل کو آواز دینا
کیا جانئے کسے ڈھونڈھا بیمار نے مرتے دم ٭ اکبار ادھر دیکھا اکبار اُدھر دیکھا
مری نظروں کی طرح دیکھینگی تجھ کو منفعل ٭ کاش مٹ جائے وہ دھبہ جو ترے دامن پہ ہے

ثاقب کی فلک پیما سحر کار تخیل کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کلام ثاقب یوں تو جوشِ بیان، ندرتِ تشبیہ، جدتِ ادا، خیال آفرینی، لطفِ ترکیب، برجستگی و روانی، شیرینی و دل آویزی اور دیگر محاسن معنوی و لفظی سے یکسر مالامال ہے۔ مگر اسکی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت سوز و گداز، جوشِ بیان اور شدتِ تاثیر ہے اور اسکا سبب غالباً یہ ہے کہ اکثر اشعار جذباتِ صحیحہ اور کیفیاتِ قلبی کے ٹھیک اسی طرح ترجمان ہیں جس طرح ایک دردمند دل کی بے اختیار آہ یا ایک اضطراری چیخ۔ اس کے علاوہ اکثر انھیں واردات و حالات کا بیان ہے جو عشق و محبت میں عموماً ہر شخص کے لئے ناگزیر ہیں مگر انھیں "معمولی باتیں" سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ثاقب کی فطرتِ نکتہ شناس نے انھیں "معمولی باتوں" کو لے کر وہ ساحری کی ہے کہ سننے والے کو اکثر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ گویا اسی کے خاص جذبات کی ترجمانی اور اس کے حالات کی تصویر ہے حالانکہ وہ سب ثاقب کے خود اپنے وارداتِ قلبی ہیں اب ہم مثال کے طور پر درد و تاثیر کے چند مرقع کلام ثاقب سے پیش کرتے ہیں ؎

آہ اس طائرِ مجبور کی حسرت کو نہ پوچھو ٭ جو یہ سنتا ہو قفس میں کہ بہار آتی ہے
کیا جانئے کسے ڈھونڈھا بیمار نے مرتے دم ٭ اک بار ادھر دیکھا اک بار اُدھر دیکھا
وطن کی خاک تجھ کو یاد کرکے ہم بہت روئے ٭ کہ تجھ سے دور تھے اور شامِ غربت تھی بیاباں تھا

آخری شعر میں ایک غریب الوطن کو جس شدت سے وطن کی یاد ستاتی ہے اسکا نہایت صحیح اور دردناک نقشہ کھینچ دیا ہے۔ گھر سے دور، یار و دیار سے مجبور، بیگانہ دیس، اس پر طرہ یہ کہ ہنوز ابھی منزل پر نہیں پہنچا ہے۔ راستہ ہی میں شام ہو گئی۔ چاروں طرف ویران، سنسان جنگل بستی کا کہیں دور تک نشان نہیں کہ یہ درماندہ وہاں پہنچکر ذرا دم لے۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ اپنا وطن اپنا گھر یاد آتا ہے اور دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ آنسو امنڈ امنڈ کر آتے ہیں اور آنکھوں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب مجھے اس شعر کے متعلق ایک "مبصر" کے یہ "ناقدانہ" جملے یاد آتے ہیں کہ "آپ کو چاہئے تھا کہ وطن کی ذرا سی خاک پڑیا میں باندھکر سفر پر جاتے وقت جیب میں رکھ لے جاتے اور جس وقت خاکِ وطن کی یاد ستاتی فوراً اس پڑیا کو جیب سے نکالکر خاک کی زیارت کر لیتے تاکہ بلاوجہ رونے کی ضرورت پیش نہ آتی"۔ یہ ہے ہمارے اربابِ ادب کا ذوقِ تنقید! افسوس۔ خاک کے معنی اگر خود نہیں جانتے تھے تو کسی لغت میں دیکھ لیتے یا کسی پڑھے لکھے سے پوچھ لیتے معلوم ہو جاتا کہ "خاک" "سرزمین" کو بھی کہتے ہیں۔ اسے بھی جانے دو، خاک کے معنی وہی سہی جو مشہور ہیں مگر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ اس غریب الدیار کو خاکِ وطن کی صرف ایک چٹکی یاد آتی تھی ؎

اُف چاندنی کی یہ کرنیں کچھ یاد دلاتی ہیں ٭ اس وقت نگاہوں میں اک حسن کی دنیا ہے

"حسن کی دنیا" میں گلگشتِ چمن، سیرِ دریا، محفلِ نشاط، یکجائی و تنہائی، راز و نیاز سب کچھ موجود ہے۔ ماضی کے جاں نواز لمحوں کی یاد نشتر بن کر کلیجہ چاک کر ڈالتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں ثاقب نے اسی جانگداز حالت کی تصویر کھینچی ہے اور لفظ "کچھ" سے ایک ایسا لطیف مبہم اشارہ کر رہا ہے کہ قوتِ خیال اس سے افسانے کے افسانے تیار کر سکتی ہے اسی مضمون کو ایک دوسرے پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

اے چمکتے ہوئے تارو یہ کیا کیا تم نے ٭ میں قفس میں تھا مجھے صحنِ چمن یاد نہ تھا
دیکھکر تجھ کو مری آنکھ سے آنسو نہ رُکے ٭ ورنہ اے دوست سرِ شکوۂ بیداد نہ تھا

اس لذیذ حکایت کے اس قدر جلد ختم کر دینے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا، مگر بخوفِ طوالت اب کسی تشریح کے بغیر چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

کسی کا نمکدہ تاریک ہے اندوہِ حرماں سے ٭ کسی کی صبحِ عشرت تک چراغِ شام آتا ہے
ناتوانی بھی عجب اُفتادِ عبرت خیز تھی ٭ دیدۂ حسرت سے گردِ کارواں دیکھا کئے
مری ہر سانس ہے ڈوبی ہوئی زہرابۂ غم میں ٭ علاج اے چارہ گر اندیشہ ہا دنگرِ درماں سے
یا تو اجل کیا نہ آئے سحر کفن بدوش ٭ یا کوئی پھر کمی نہ ہو میری شبِ دراز میں
کیا کیا تو نے یہ اے میری اُمیدِ موہوم ٭ اُس کو پھر یاد دلایا جو مجھے یاد نہ تھا
موت نے ضبط کی کچھ شرم ہی رکھ لی ورنہ ٭ میں یہ کیونکر کہوں دل مایۂ فریاد نہ تھا
فسانہ ہو چکا تھا عہدِ دوشیں تو نے اے صیاد ٭ نظر کے سامنے کیوں لاکے خاک آشیاں رکھدی

بدیع الاسلوبی یا جدتِ طرزِ ادا

کلام ثاقب کی دوسری نمایاں خصوصیت طرزِ ادا کی جدت ہے اور اس میدان میں ثاقب نے اکثر حریفوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ندرتِ خیال کو جسقدر اہمیت دی جائے کم ہے مگر اس کے ساتھ ہی اگر اس خیال کے لئے کوئی اچھوتا اندازِ بیان ہاتھ آجائے تو قیامت ہے۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ بعض اوقات معمولی سا خیال محض ندرتِ اسلوب کی بنا پر سامعین کو اس درجہ کیف و متاثر کرتا ہے کہ نادر سے نادر مضمون بھی اس سے زیادہ لطف نہیں دے سکتا بلکہ سچ پوچھئے تو

نیا خیال جہاں تک غزل کا تعلق ہے اب عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے اس دور میں غزل گو شاعر کی مشکلات کی انتہا نہیں۔ مگر جو لوگ طرزِ ادا میں کوئی جدت اور اسلوبِ بیان میں کوئی تازگی پیدا کر سکتے ہیں آج بھی اُن کا کلام عملِ تسخیر کا حکم رکھتا ہے۔

اس محل پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ندرتِ خیال سے کیا مراد ہے؟ ایسا اچھوتا خیال کہ ایک شخص خاص کے سوا کبھی کسی کے دماغ میں نہ ہو خود الشاذ کالمعدوم کے حکم میں داخل ہے خصوصاً غزل کے محدود دائرہ میں تو اسکا وجود ہی محال ہے اسلئے وہ خارج از بحث ہے پس نئے خیالات سے ہماری مراد وہ خیالات ہیں جو آنے کو ہر شخص کے خیال میں آتے ہیں گر انہیں معمولی سطحی، غیر اہم اور ادنیٰ درجہ کا سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے یا انہیں معمولی خیالات کی تہ میں کوئی بات ایسی ہوتی ہے کہ عام طور پر لوگوں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی یا جزئیاتی امور جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے کبھی اس لئے کہ انہیں غیر ضروری سمجھا جاتا ہے اور کبھی اس لئے کہ زبان پہ اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ انہیں دلنشیں پیرایہ میں ادا کر سکیں اور معمولی طرزِ بیان میں ان کا ذکر بالکل بے لطف ہو جاتا ہے مگر ایک فطرت شناس شاعر انہیں حقیر چیزوں سے ایک نئی اور بالکل نئی دنیا ایجاد و آباد کر لیتا ہے چنانچہ ثاقب کے یہاں اس قسم کے بہت سے دلکش نمونے موجود ہیں جنہیں ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا نے اور بھی دلفریب و دلنواز بنا دیا ہے مثلاً یہ کہنا مقصود ہے کہ برباد الفت ہر آزار سے محفوظ ہے اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے کیا خوبصورت پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے ؎

برقِ ناکام گئی سوز کی حسرت لے کر ؛ جب نہ کچھ خانہ برباد میں ساماں نکلا

بجلی گری اس لئے کہ خانۂ دل میں جو کچھ سامان ہے اسے جا کر خاکستر کر دے مگر وہاں کیا دھرا تھا۔ پہلے ہی سب کچھ برباد ہو چکا تھا اس لئے برق کے دل میں جلانے کی جو حسرت تھی وہ دل ہی میں رہ گئی اور مایوس ہو کر اُسے واپس جانا پڑا۔ ہمدردگیِ خیال کے دلفریب چہرہ پر استعارہ کا اسقدر لطیف حجاب ڈالا ہے کہ خط و خال صاف نظر آتے ہیں اور پھر دوگونہ حسن کے ساتھ۔ دراصل مطلب یہ ہے کہ "وہ" اس لئے آئے تھے کہ میرے ارمانوں کا خون کریں مجھے آزار پہنچائیں مگر ان کی عنایت سے تمناؤں کی دنیا پہلے ہی اجڑ چکی تھی اگر دل میں کوئی آرزو باقی ہوتی اور وہ ان کے "کرم تازہ" سے اس وقت مٹ جاتی تو البتہ قلب کو بیحد اذیت پہونچتی لیکن ایسا نہیں۔ لہٰذا ان کی سعیِ ستم بیکار گئی اور مجھ نامراد کو مزید آزار دینے کی حسرت ان کے دل ہی میں رہ گئی ؎

ٹھہر جا ایک لمحہ کے لئے اے شوقِ نظارہ ؛ ذرا میں دل کی طاقت کا تو پہلے امتحاں کر لوں

اے ذوقِ تن آسانی برباد کیا تو نے ؛ ساحل سے کہیں بہتر نظارۂ ساحل تھا

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کسی مبتلائے مصیبت کی اذیت کو ایک ستم دیدہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ ایک عشرت نصیب کے لئے اسکا اندازہ قطعی ناممکن ہے۔ خواجہ حافظ نے یہی خیال کو اسطرح ادا کیا ہے ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل ؛ کجا دانند حالِ ما سبکبارانِ ساحلہا

ثاقب نے اسی مضمون کو اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے خواجہ صاحب نے واقعہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بجائے خود مکمل ہے اور اسپر اضافہ تو کیا اسکا برابر اتارنا بھی محال ہے مگر دیکھنا چاہئے کہ یہ دشوار گزار منزل ثاقب نے کس طرح طے کی ہے ؎

کیا اس کو خبر اس کی ہم غرق ہوئے کیونکر ؛ جو محوِ تماشا تھا آسودۂ ساحل تھا

خواجہ صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ اندھیری رات ہے، طوفانی موجیں اٹھ رہی ہیں خوفناک بھنور پڑ رہے ہیں اور ہر لحظہ کشتی اُلٹ جانے اور اہلِ کشتی کے غرق ہو جانے کا خطرہ ہے ایسی حالت میں اہلِ کشتی کے دل پر جو کچھ گزر رہی ہے اسکا اندازہ ساحل نشین نہیں کر سکتے جو ہر قسم کے خطراتِ غرقابی سے محفوظ ہیں۔ نفسِ مطلب ثاقب کے شعر کا بھی یہی ہے مگر خواجہ صاحب نے متلاطم سمندر کا بھیانک منظر پیش کیا ہے۔ ثاقب کا شعر اس سے یکسر خالی ہے تاہم اس میں ایک اشارہ ایسا ضرور موجود ہے جو سمندر کے طوفان و تلاطم کے بیان کے بغیر بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے ہماری مراد غرق ہو جانے کا ذکر ہے کیونکہ کسی خاص حالت سے قطع نظر کشتی ڈوبنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سمندر میں تلاطم اور فضا میں طوفان برپا ہو۔ اس کے علاوہ دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ خواجہ صاحب نے اہلِ کشتی کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جبکہ اہلِ کشتی واقعی غرق ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت کے بہ نسبت دوسری صورت میں اہلِ کشتی موت کے قریب تر ہیں۔ اس بنا پر ان کی روحانی اذیت بھی شدید تر ہو گی دوسرے یہ کہ خواجہ نے جن "سبکبارانِ ساحل" کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق اور کوئی خاص بات بیان نہیں کی مگر ثاقب نے جس "آسودۂ ساحل" کا ذکر کیا ہے وہ خطراتِ غرقابی سے محفوظ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ کشتی کے ڈوبنے کا منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور ثاقب کا اُسے "محوِ تماشا" کہنا ایک لطیف اشارہ ہے اس کی سنگدلی کی طرف، کیونکہ رقیق القلب آدمی ایسے دردناک مناظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا یقیناً یہ منہ پھیر لے گا یا آنکھیں بند کر لے گا بلکہ بعض اوقات لڑکھڑا کر گر پڑے گا اور بیہوش ہو جائے گا۔ لیکن ایسا بے حس آدمی جس کے لئے ایک طوفان زدہ کشتی کا تہِ آب ہونا ایک دلچسپ نظارہ ہے ڈوبنے والوں کے احساسات کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟ اس کے علاوہ ڈوبنے والی کشتی اور آسودۂ ساحل کے درمیان ایک علاقہ پیدا ہو جانے سے واقعات کے کل حصے ایک مکمل تصویر میں مرتب ہو گئے جس سے شعر کی تاثیر دونی ہو گئی۔ خواجہ صاحب کے یہاں تصویر کے دو ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ ان تشریحات سے ہمارا منشا حافظ و ثاقب کا تقابل ہرگز نہیں بلکہ ثاقب کے لطیف کنایات کی تصریح مقصود تھی جو ان کے طرزِ بیان کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

برہمی کے عالم میں رُخِ محبوب کی دلفریبی کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے۔ اس خیال کو کیسے پیارے انداز میں ادا کیا ہے ؎

جلنے لگی نقابِ حسن کوندگئیں وہ بجلیاں ⁂ آئینۂ جمال میں رنگِ جلال آگیا

نظر کا بجلی سے استعارہ معمولی بات ہے مگر بحالتِ غصہ آنکھوں میں جو ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے اسے بجلی کے کوندنے سے تشبیہ دینا پھر غصے کے جوش سے چہرہ کے تمتما اٹھنے کو نقابِ حسن کے جلنے سے تعبیر کرنا اور رخسار کو پہلے آئینۂ جمال کہہ کر پھر اس میں رنگِ جلال بھرنا حسنِ بیان کا ایک ایسا دلفریب نمونہ ہے جس کی نظیر اردو ادب مشکل سے پیش کر سکتا ہے ؎

بس ایک اشکِ دمِ آخر میں دیئے لکھاں رکھدی
اسی اک حرف میں دل نے کتابِ داستاں لکھدی

وہ لہو دل کا جو تھا سرمایۂ دارِ زندگی ⁂ کچھ ہے میری آستیں میں کچھ ترے دامن میں ہے

یہ دتی معصیت میرا عبادت سے بھی ارفع ہے ⁂ تڑپ جاتی ہے خود رحمت مرے معیارِ عصیاں پر

کیا زود آشنا تھی وہ برقِ نگاہِ ناز ⁂ اظہارِ اشتیاق و تمنا نہ ہو سکا

نگاہ شوخ رہی تجھ کو بجلیوں کی تلاش ⁂ مگر کبھی نہ مرے دل کا انتخاب ہوا

کتنے اچھوتے انداز سے دل کی شدید بے تابی کا اظہار کیا ہے۔

وارداتِ حسن و عشق

مختلف عنوانوں کے تحت میں اب تک جو اشعار درج کئے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر وارداتِ حسن و عشق کے بہترین نمونے ہیں مگر ہم انہیں دہرانے کے بجائے اس موضوع کے متعلق چند اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ثاقب کے شعر کی بنیاد محض خیالی نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی نہ کسی حقیقتِ نفس الامری پر مبنی ہوتا ہے اس لئے سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر ایک خاص اثر کرتا ہے ؎

تنہائیٔ فراق کی راتیں ہی کٹ گئیں ⁂ ممنون ہوں میں اس دلِ افسانہ ساز کا

کل کائنات نغمۂ دردِ آفریں بنی ⁂ اُف رے اثر یہ دل کے غمِ جانگداز کا

ہو ہم سخن دشمن وہ خوابِ تخیل میں ⁂ اے کاش نہ دیکھوں میں یہ منظر رسوائی

ثاقب کا یہ شعر عزتِ نفس اور غیورانہ شرافت کے جذبات کا بہترین مرقع ہے عموماً شعرا کے نزدیک ان کے محبوب کا رقیب سے ہم سخن ہونا بلکہ ہم بغل ہونا بھی چنداں مبالغہ کی بات نہیں۔ چنانچہ ایک بڑے مشہور استاد کا شعر ہے ؎

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار ⁂ اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

ایک اور بزرگوار فرماتے ہیں ؎

تم جاؤ تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ⁂ ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مگر ثاقب کی فطرتِ بلند اور ضمیر صافی سے ان آلودگیوں کا تحمل ناممکن ہے اس کے لئے فی نفسہٖ نہیں بلکہ صرف عالمِ خیال میں محبوب کا غیر سے ہم سخن ہونا اس کی انتہائی ذلت ہے وہ خدا سے التجا کرتا ہے کہ اے بار الہا کاش تو یہ قوتِ تخیل مجھ سے چھین لے کیونکہ اپنی رسوائی و ذلت کا یہ روح فرسا منظر اب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا ؎

یاد میں تیری اس طرح عمر مری گذر گئی ⁂ کچھ نہ سمجھ سکا کہ تھا حاصلِ انتظار کیا

ہر طرح کی ویرانی ہر رنگ کی آبادی ⁂ میں آپ ہی خلوت تھا میں آپ ہی محفل تھا

زبانِ شوق سے کیا حرفِ آرزو نکلے ⁂ کہ جب نگاہ سے بھی عرضِ حال ہو نہ سکا

وقوع گوئی

وقوع گوئی سے مراد ان واقعات و معاملات کا بیان ہے جو عشق و عاشقی میں پیش آتے ہیں، عشق و ہوس کے ڈانڈے چونکہ ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے عموماً شعراء وقوع گوئی میں حدِ اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں اور ان کے اس قسم کے اشعار اس میں شک نہیں کہ جذباتِ نفسانی کو برانگیختہ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں مگر پاکبازانِ محبت کے لطیف احساسات کو مجروح کر دیتے ہیں لہٰذا ان چیزوں پر قلم اٹھانے والے کے پاس ایک پاک دل پاک نظر، پاک خیال اور پاک اندازِ مقال ہونا چاہئے ورنہ اس کی وقوع گوئی بوالہوس شاہد پرستوں کی بدمستی اور خوبانِ بازاری کے حیاسوز حرکات کی المناک تصویر ہو جائے۔ ثاقب کو ردِ مجبوری ہی کے بیان سے فرصت نہیں، مگر جب کبھی اس طرف آتے ہیں تو رشتۂ ادب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے، اور ہر قسم کی آلودگی سے اپنا دامن بچائے ہوئے تاہم واقعہ کی تصویر اس قدر صحیح، اسقدر دلفریب اور اسقدر اثر انگیز ہوتی ہے کہ سننے والے کو تھوڑی دیر کے لئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خود اس واقعہ میں عملی حصہ لے رہا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎۔

دیتا ہے دل میں ایک تلاطم سا ہے بپا ⁂ یوں دیکھتے ہیں وہ نگۂ شرمسار سے

اک حسنِ بے حجاب تو ہے سامنے مگر ⁂ اب تو ہے یا کہ صرف یہ تیرا خیال ہے

ادھر میری توبہ کی ڈھارس بندھانی ⁂ اُدھر مجھ کو ساغر بصد ناز دینا

پنہاں کسی سے حسنِ خود آرا نہ ہو سکا ⁂ یعنی وفورِ شوق میں پردہ نہ ہو سکا

مجھے پرواہ نہیں رسوائیاں ہوں گی زمانہ میں ⁂ ستم تو یہ ہے تم ہنستے ہو میرے جیب و داماں پر

اسرار و معارف

ثاقب صاحب چونکہ ایک ذی مرتبت سالکِ طریقت بزرگ کی یادگار اور خود بھی اہلِ دل ہیں۔ اس بنا پر رموزِ معرفت اور اسرارِ حقیقت اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا جھومنے لگتا ہے۔ ان مباحث پر ان کے اشعار محض اگلوں کی نقالی نہیں بلکہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے ان کے کلام میں بصیرت افروزی کا کافی سرمایہ موجود ہے۔

متاخرین اور متقدمین نے بھی اس میدان میں طبع آزمائیاں کی ہیں مگر تصوف سے واقعی لگاؤ رکھنے والوں اور محض نقالوں کے کلام میں صاف فرق نظر آتا ہے۔ ایک کی لغزشِ مستانہ بے اختیاری ہے دوسرے نے فقط اس کی نقل اتاری ہے۔ دیکھنے میں دونوں کے دامن پھولوں سے بھرے ہیں مگر

ایک سے پھول اصلی دوسرے کے کاغذی ہیں جن میں صرف رنگ بے بو ہیں، جسم بے روح نہیں۔ خدا نے آپ کو ذوقِ صحیح عنایت کیا ہے تو ثاقب کے یہ جرعات نوش کیجئے اور مستا ہو جائیے ؎

محبت کی ہواؤں میں نفس کوئی نہیں فانی ٭ یہی گوشِ خرد میں نغمۂ الہام آتا ہے

عالم تھا کہ عکسِ آئینۂ گردِ دل تھا ٭ کچھ کہہ نہیں سکتا میں یہ کون مقابل تھا

بے فائدہ ہلاکِ فریبِ شہود تھا ٭ دنیا تھی اک طلسم زیاں تھا نہ سود تھا

ہے تجھ سے بُعد عالمِ لے نا شناسِ معنی ٭ درماندگی کا اپنی خود چارہ ساز ہو جا

تسلسل مضامین

ثاقب کے یہاں مسلسل نظموں سے قطع نظر غزلوں میں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کسی خاص کیفیت کے دوران میں غزل شروع کی ہے اور غزل کی غزل اسی حالت کے بیان میں ختم ہو گئی ہے (مسلسل غزل) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی قوتِ بیان کس طرح کسی ایک مضمون کے تمام جزئیات کا احاطہ کر لیتی ہے مثلاً :- ؎

ہائے یادِ شباب کفر انگیز ٭ شاہدِ شوخ و ساغرِ لبریز

یہ چمن زار اور دل بے کیف ٭ یہ گھٹا اور جام سے پرہیز

یاد ہے وہ بہارِ عالمِ عشق ٭ کس قدر تھی ہوا جنوں انگیز

محفلِ کائنات وجد میں ہے ٭ جلوۂ دوست ہے کرشمہ ساز

قدرت کلام

افسوس ہے کہ کوششِ اختصار کے باوجود سلسلۂ کلام پھیلتا چلا گیا پھر بھی بہت سے مباحث بالکل تشنہ رہ گئے اور بعض چیزیں تو بالکل ہی چھوٹ گئیں مثلاً محاسنِ لفظی سے مطلق بحث ہی نہیں کی گئی لیکن محاسنِ لفظی ثاقب کے کلام میں اس قدر نمایاں اور اس قدر فراواں ہیں کہ کسی کوشش کے بغیر ہر شخص ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے لہٰذا قدرتِ کلام کے ضمن میں ہم صرف دو باتیں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

(۱) عام خیال یہ ہے کہ جس زمین میں قافئے کم ہوں اس میں غزل لکھنا نہایت دشوار ہے اسلئے کہ ایک قافیہ کے لئے اچھا مضمون ایک ہی شکل سے ملتا ہے پس اگر اسی قافیہ کو مکرر رکھا جائے تو اچھا مضمون نکالنا محالات سے ہے لیکن ثاقب کی قوتِ تخیل اور قدرتِ بیان کے سامنے یہ دشواری دشوار نہیں رہتی چنانچہ اُن زمینوں سے قطع نظر جن میں قافیوں کی کمی ہے وہ عام طور پر بھی ایک ایک قافیہ کو کئی کئی طرح سے باندھتے ہیں اور ایک سے ایک بہتر مضمون نکالتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو غزل کی غزل ایک ہی قافیہ میں تمام کر دیتے ہیں مثلاً ؎

اُف خاتمِ غم کی اداسی مجھ سے اے ہمدم نہ پوچھ ٭ اک چراغِ آرزو تھا وہ بھی اب خاموش ہے

کس کا غم برہمزنِ ہنگامۂ محفل ہوا ٭ کیوں اداسی چھا گئی کیوں انجمن خاموش ہے

اب نہ قلب میں وہ ارماں نہ وہ سوز و گداز ٭ دل ہے پہلو میں مگر افسردہ ہے خاموش ہے

دیکھنے والو ذرا ثاقب کی صورت دیکھنا ٭ آہ وہ بے کس ہجومِ یاس میں خاموش ہے

(۲) کلام میں روانی کے لئے سب سے بڑا عنصر بندشوں کی چستی ہے، شعر کی ترکیب نثر سے جتنی زیادہ قریب ہو گی اتنی ہی شعر کی روانی، سلاست اور صفائی بڑھ جائیگی۔ ثاقب کی قادر الکلامی کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ان کے سینکڑوں شعر از روئے ترکیب نہ صرف نثر سے قریب ہیں بلکہ انکی نثر کی جائے تو وہی صورت باقی رہے گی جواب ہے اور بعض اوقات تو غزل کی غزل اس حسن سے مالا مال ہے مثلاً ؎

غمنامۂ الفت کا مضمون بس اتنا ہے ٭ مایوسی و ناکامی انجامِ تمنا ہے

ہر سمت مجھے اسکا جلوہ نظر آتا ہے ٭ ہاں بزمِ تصور بھی کیا بزمِ تماشا ہے

سوزِ غمِ فرقت سے یہ حال ہمارا ہے ٭ جو سانس ہے شعلہ ہے جو اشک ہے چھالا ہے

نظارہ کی حسرت میں اپنے کو فنا کر دے ٭ ہستی تری دیوانے اس حسن کا پردہ ہے

لرزش سی فلک کو ہے جنبش سی زمیں کو ہے ٭ یعنی مرے نالوں کا عالم تہ و بالا ہے

اُف چاند کی یہ کرنیں کچھ یاد دلاتی ہیں ٭ ہر وقت تصور میں اک حسن کی دنیا ہے

بیمارِ محبت کو کچھ نیند سی آئی ہے ٭ اب حال نہ پوچھو تم جیسا ہے بس اچھا ہے

یہ ذوقِ خودی ثاقب جو چاہے کرے ورنہ

ہر قطرہ حقیقت میں خود آپ ہی دریا ہے

ہمارا ارادہ تھا کہ غزلیات پر مختصر سا تبصرہ کر کے مسلسل نظموں کے متعلق تفصیل سے بحث کرینگے اسلئے کہ در اصل یہ نظمیں ہی ثاقب کا سرمایۂ کمال ہیں، غزلیں یقیناً ان سے پیچھے ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اختصار کی تمام کوششوں کے باوجود اور خواہش و ارادہ کے برعکس غزلیات کا ریویو اس قدر طویل ہو گیا کہ اب مطلق گنجائش تحریر نہیں ناچار صرف چند باتیں کہکر اس نامکمل تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

غزلوں میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً رفعتِ تخیل، حقائق نگاری جوشِ بیان، حسنِ اسلوب، سلاست و روانی۔ یہ تمام خوبیاں نظموں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور بھی خصوصیت ہے اور جسکا مرتبہ بجائے خود بہت بلند ہے۔ اس سے ہماری مراد "ندرتِ تشبیہ" ہے۔ غزلوں میں اگرچہ کہیں کہیں تشبیہات نظر آتی ہیں مگر نظمیں ان سے مالا مال ہیں۔ ہماری شاعری کو چونکہ ہر باب میں پابندِ تقلید بنایا جاتا ہے اس بنا پر شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے یہاں کوئی نئی تشبیہ نکل آئے ورنہ وہی چبائے نوالے۔ مگر ثاقب نے اس کثرت سے نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے استعمال کئے ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے اور بے اختیار زودِ طبع اور فکرِ رسا کی داد دینا پڑتی ہے۔ بعض نظموں کا تو یہ حال ہے کہ شروع سے آخر تک گویا تشبیہ کے موتیوں کی ایک لڑی ہے جسکا ہر دانہ آب و تاب میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا ہے مثلاً "حقیقتِ زندگی" اور "بارش کی حقیقت"

اسکے علاوہ جا بجا نئی اور خوبصورت تشبیہیں خود بخود پڑھنے والے کا دامن تو جہ تھام لیتی ہیں مثلاً ؎

بڑھ رہا ہے دشت میں اس شان سے مستانہ وار ٭ جسطرح کوئی مسافر بے خبر منزل سے ہو

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

معلمی کا پیشہ

غلام السیدین

میں عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر تعلیم کے متعلق توسیعی خطبات دینے کے لئے حاضر ہوا تھا چونکہ آپ میں سے اکثر حضرات ان تقریروں کے بار سے محفوظ رہے ہیں اس لئے ریڈیو والوں نے ازراہ ستم ظریفی مجھ سے فرمائش کی ہے میں اپنی تقریر سے آپ کی سمع خراشی کروں میری مروت انکار کے راستے میں حائل ہوئی اور اس کا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے! خیر!

اس چند منٹ کی تقریر کے دوران میں میرے لئے کسی مستقل تعلیمی موضوع پر اظہار خیال کرنا تو ممکن نہیں۔ اس لئے میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک کم میرے محبوب مضمون یعنی معلمی کے پیشے کے متعلق چند باتیں کرنا چاہتا ہوں پہلے ان تمام حضرات اور خواتین سے جن کا کام تعلیم کا انتظام کرنا ہے اور جنہیں تعلیم کے نتائج سے دلچسپی ہے۔ اس کے بعد استادوں سے جو تعلیم کا کام انجام دیتے ہیں اور جن کے سپرد یہ فرض ہے کہ ناطق حیوانوں کی ہر آنے والی نسل کو انسان بنائیں۔

آپ نے عام طور پر یہ شکایت سنی ہوگی کہ ہمارے ملک میں جو تعلیم نافذ ہے وہ بہت ناقص اور نامکمل ہے اس شکایت کو نہایت شدت سے پیش کرنے کے لئے کسی خاص واقفیت یا تجربے کی ضرورت نہیں ہے! مجھے یہ شکایت تسلیم ہے اور معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سے بچے تو اسکول کی طرف رخ نہیں کرتے اور جو وہاں جاتے ہیں ان میں سے بیشتر کے قریب سال ہی بھر میں اسکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کیونکہ مدرسے کا ماحول اس قدر ناسازگار اور تعلیم ایسی غیر دلکش ہوتی ہے کہ ان کے لئے وہاں قیام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے کچھ کروڑ بچوں میں سے شاید چالیس لاکھ مدرسوں میں چار سال کی مدت بسر کرتے ہیں اور ان میں بھی اس قلیل عرصے میں صرف خواندگی سکھائی جا سکتی ہے کسی قسم کی دیرپا سماجی اور اخلاقی تربیت نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور ستم یہ ہے کہ جس رفتار سے ہمارے ہاں خواندگی بڑھ رہی ہے اس سے زیادہ رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے یعنی سال بہ سال اس ہندوستان جنت نشان میں جو ہزاروں برس سے تہذیب کا سرچشمہ رہا ہے اور جس کو ہمیشہ اپنی علمی روایتوں پر ناز رہا ہے، ناخواندوں کی مجموعی تعداد بجائے گھٹنے کے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر اس صورت حال کی اصلاح کے لئے کوئی انقلابی اقدام نہ کیا گیا تو ملک کے مستقبل کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اور خدا پر حفاظت کی ذمہ داری ڈالنے کو بھی ایک خوش عقیدہ محاورہ ہی کہیے۔ کیونکہ تاریخی مشاہدہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ خدا کسی قوم کی حفاظت کے لئے اپنے اختیارات خصوصی استعمال نہیں کرتا بلکہ عام قوانین فطرت اپنی کار فرمائی دکھاتے ہیں اور اعمال کا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔

لیکن آپ نے کبھی یہ غور بھی کیا کہ آخر ہمارے ملک میں تعلیم اس قدر کم اور گھٹیا کیوں ہے؟ اس کا اصل جواب جس کو شاید آپ پسند نہ کریں گے یہی ہے کہ دراصل ہم لوگوں میں تعلیم کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہی نہیں ورنہ یہ ستم کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہم تمام سماجی کارکنوں کے مقابلے میں سب سے کم معاوضہ ان استادوں کو دیتے ہیں جن کا کام ہے ہمارے بچوں کے دل و دماغ کی تربیت، ان کی سیرت کی تشکیل، ان کے ذوق کی اصلاح اور ان کے تصور خیر و شر کا تعین! اور ہم اپنے مدرسوں کے لئے بسا اوقات ایسی عمارتیں تجویز کرتے ہیں جن میں خوش حال اور سمجھدار لوگ اپنے جانوروں کو رکھنا ہرگز پسند نہ کریں گے! کیا آپ نے کبھی اس عجیب صورت حال پر غور کیا ہے کہ موجودہ تمدن میں بہترین اعزاز اور انعام کے مستحق وہ لوگ نہیں سمجھے جاتے جو خاموشی اور دیانت داری کے ساتھ ہماری خدمت کرتے ہیں بلکہ دولت، عزت، اثر اور رسوخ کی فراوانی ان لوگوں کے لئے ہو جاتی ہے جو خونریز جنگوں کا باعث ہوتے ہیں یا کاروبار میں سٹہ بازی اور اس قسم کی دوسری حرکتوں کے ذریعہ لوگوں کا روپیہ بٹورتے ہیں یا اشتہار بازی کے ذریعہ بیوقوفوں کی بیوقوفی اور خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض کتابی لوگوں کو چھوڑ کر اکثر کی نظر میں اسکندر، چنگیز خاں اور نپولین کی اہمیت سقراط اور بدھ اور اقبال سے کہیں زیادہ ہے اور خواہ لوگ ان کی شان میں لفظی قصیدے پڑھیں لیکن جہاں تک واقعی اعتراف اور دنیاوی وجاہت کا تعلق ہے خدمت کرنے والوں کا ملک گیری اور لوٹ مار کرنے والوں کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں! یہ دراصل ان تمام انسانی اقدار کی توہین ہے جن پر ایک معقول معاشرے اور ایک متوازن شخصیت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور جب تک ہم اس بات کی کامیاب کوشش نہ کریں گے کہ سماج میں استادوں اور معلموں کو وہ درجہ حاصل ہو جس کے وہ مستحق ہیں، ہماری تعلیم بے نفس اور بے جان رہے گی۔ آپ میں سے کتنے حضرات کو اندازہ ہے کہ ہندوستان کے پرائمری اسکولوں کے بیشتر مدرس جو تنخواہیں پاتے ہیں وہ آٹھ دس روپے ماہوار سے لے کر پچیس روپے ماہوار تک پہنچتی ہیں اور اس قابل تعریف فیاضی سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ بے ضرر اور بے زبان طبقہ جس کو معاشی کشمکش سے ایک دم کو فرصت نہیں ملتی تعلیم و تربیت کے مشکل اور مقدس فرض کو انجام دے! جب آپ معاوضہ اس قدر کم مقرر کریں گے تو ظاہر ہے کہ اس پیشے میں زیادہ تر وہ لوگ آئیں گے جو زندگی کے کسی دوسرے شعبے میں جگہ نہ پا سکیں گے یا اگر بعض مخلص اور

جوشیلے اور بے نفس اور خدمت پسند لوگ اپنی طبیعت کے رجحان سے مجبور ہو کر اس طرف آئیں گے تو انھیں بھی یہ ہمت شکن حالات پسپا کر دیں گے۔ آپ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ اس حالت میں زندگی بسر کریں گے وہ اطمینان خاطر کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کر سکیں گے یا اپنی قابلیت اور کارکردگی میں اضافہ کر سکیں گے یا اپنے گرد و پیش کی معاشرتی تحریکوں میں سمجھداری کے ساتھ وہ دلچسپی لیں گے جو تعلیم کے قالب میں روح ڈالتی ہے؟ لہٰذا ملک کی حکومتوں سے میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ معلموں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس زمانے میں جنگ کی دار و گیر نے قیمتوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ پچیس تیس روپے ماہوار کی تنخواہ کو استادوں کا معراج نہ سمجھیں کیونکہ یہ تیس روپے جنگ سے پہلے کے دس بارہ روپوں سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔ اس بارے میں مالی تنگی کا عذر بے معنی ہے کیونکہ اس مالی تنگی کے باوجود دنیا کی قوموں نے جنگ کی تباہ کاری کے لئے کروڑوں پونڈ روزانہ کا صرف کیا ہے اور جو کام انسان تخریب کی خاطر کر سکتا ہے اگر اسے تعمیر کی خاطر کرے تو یہ حماقت کا ثبوت نہیں دانشمندی کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ہی سوسائٹی سے میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ استادوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنائے اور ان کی وہی قدر و احترام کرے جو ایک زمانے میں ہندوستان میں استادوں کی ہوتی تھی۔ اگر کسی شخص میں وہ شخصی صفات اور قابلیت نہیں ہے کہ وہ ایک اچھا معلم بن سکے تو اس کو یقیناً اس میدان عمل سے ہٹا دینا چاہئے لیکن جس شخص کو حکومت اور سوسائٹی پچیس تیس سال تک بچوں کی ہدایت اور تعلیم و نگرانی کے لئے رکھتی اور انسان سازی کا یہ عظیم الشان کام اس کے سپرد کرتی ہے اس کے ساتھ بے اعتنائی یا تحقیر کا سلوک کرنا محض اس کے ساتھ بے انصافی نہیں بلکہ خود اپنے مستقبل کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔

یہاں تک تو میں استادوں کے حقوق کی حمایت میں حکومت اور والدین اور سوسائٹی سے مخاطب تھا لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں اپنے ہم پیشہ رفقاء یعنی استادوں سے بھی کر لوں۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا بیشتر حصہ استادوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی نگرانی اور ان کے کام کی تنظیم میں صرف کیا ہے۔ اس لئے مجھے قدرتاً ان کے ساتھ بہت گہری ہمدردی اور دلچسپی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ سماج میں انھیں وہ بلند مقام اور عزت حاصل ہو جس کے وہ حقیقی حیثیت سے مستحق ہیں۔ لیکن اگر مجھے ایک صحیح مگر پامال حقیقت کو دہرانے کی اجازت ہو تو میں انھیں یہ بات یاد دلاؤں کہ حقوق اور حیثیت کسی جماعت یا شخص سے بطور عطیہ کے حاصل نہیں ہو سکتے انھیں تو اپنی کارکردگی اور اپنے فرائض کی ادائگی کے ذریعہ جیتا جاتا ہے۔ اس لئے اگر استاد یہ مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں باوجود اپنی مشکلات اور مجبوریوں کے، باوجود سوسائٹی کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے اپنے کام کو اس طرح انجام دینا ہوگا کہ رائے عامہ کو زبردستی اس کا اعتراف کرنا پڑے۔ شاید دنیا میں کوئی پیشہ اس قدر مشکل اور اس قدر متنوع صلاحیتوں کا طلب گار نہیں جس قدر معلمی کا پیشہ ہے۔ اس نے مختلف نصابی مضامین میں مہارت کی ضرورت ہے اور بچوں کی انفرادی فطرت کو جاننا ضروری ہے اس میں اس سادگی و فنکاری کی ضرورت ہے جو مدوّن اور مرتب علوم کو بچوں کے سامنے عمل اور کھیل اور مشاغل کے قالب میں پیش کر سکے۔ اس میں تہذیب اور تمدن اور قومی زندگی کے ان تمام مفید اور مضر اثرات اور تحریکوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو بچوں کی فطرت کو بناتی یا بگاڑتی ہیں اور ان تمام اثرات کے جھگھٹے میں تعلیم کو بحیثیت ایک مرکزی اثر کے نصب کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام باتیں ہر استاد کے لئے، خواہ وہ گانوں کے کسی ابتدائی مدرسے کا استاد ہو، نہایت مشکل لیکن ناگزیر مسائل پیش کرتی ہیں جن کو حل کئے بغیر وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا اس لئے اپنی علمی قابلیت کے حدود کے اندر اندر ان تمام مسائل کو سمجھنا اور ان کی روشنی میں تعلیم کا کام چلانا اس کا فرض ہے۔ اس کے لئے کوئی غلط فہمی اس قدر مہلک نہیں ہو سکتی جس قدر یہ خیال کہ استاد کا کام محض چند مضامین یا چند کتابیں پڑھا دینا ہے اور بس خواہ طالب علم کی شخصیت اور اس کی موجودہ اور آئندہ زندگی کی آبیاری کریں یا نہ کریں۔ کیسی خوبی سے شاعر مشرق نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روح انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لئے — کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیش خورشید برمکش دیوار — خواہی ار صحن خانہ نورانی

لہٰذا اگر آپ اپنے طلبہ کی زندگی کے صحن خانہ کو نورانی بنانا چاہتے ہیں تو خورشید حقیقت کے سامنے دیوار کھینچنے سے پرہیز کیجئے اور موجودہ تمدن کی جو بنیادی حقیقتیں ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میرے پاس اس قدر وقت نہیں کہ میں اس تمدن کا تجزیہ کر کے یہ بتا سکوں کہ اس میں کون کون سے عناصر کارفرما ہیں لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی نے انسان کی زندگی اور معاشرے کو متحرک اور انقلاب آفریں بنا دیا ہے اور اس میں یہ صورت آپڑی ہے کہ سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز۔ اس لئے تعلیم کو بھی اس طرح منظم کرنے کی

ضرورت ہے کہ وہ طلبہ کو ذہنی بیداری کی دولت سے بہرہ ور کرے اور انھیں اس قابل بنائے کہ وہ بجائے عادتوں اور سیکھی سکھائی باتوں کے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر اپنا راستہ خود تلاش کر سکیں۔ آج کل کی زندگی میں ہر ہر قدم پر انسان کو دوراہے ملتے ہیں اور جو شخص عقل کی روشنی میں اپنا راستہ نہیں بنا سکتا وہ اسی بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسری بات جو استادوں کو یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں مختلف قسم کے لوگ بستے ہیں۔ وہ مختلف ملکوں اور قوموں اور نسلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر ملک اور قوم میں مختلف جماعتیں اور مختلف خیال اور عقائد کے لوگ ہیں۔ لیکن دور حاضر کے تقاضوں نے تمام انسانوں کی بہبود کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کہ اگر کوئی جماعت یا قوم یا ملک دوسروں کے حقوق پر تصرف کر کے یا ان کو تمدنی اور مادی دولت سے محروم کر کے اپنا سرمایہ عیش فراہم کرنا چاہتا ہے تو اسے اس نامبارک کوشش میں انجام کار ناکامی ہوتی ہے اس لئے انسانی وحدت اور یکجہتی کے احساس کو طلبہ کے دل و دماغ میں مستحکم کرنا ان کا سب سے اہم فرض ہے۔ اختلافات کی جانب سے رواداری برتنا، مختلف خیالات کو ٹھنڈے دل سے سننا اور ان پر غیر جانب داری کے ساتھ غور کرنا، جو جماعتیں اور طبقے کسی لحاظ سے محروم یا مظلوم ہیں ان کی دستگیری کرنا اور ان کے جائز حقوق کے لئے جدوجہد کرنا، سختی کے ساتھ خود پر احتساب نفس کرنا اور فیاضی کے ساتھ مخالف کے حق کو تسلیم کرنا، یہ تمام صفات محض اخلاقی نقطہ نظر ہی سے قابل تعریف نہیں۔ بلکہ آج کل کی دنیا میں کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے ہر شریف آدمی میں ان کا موجود ہونا ضروری ہے معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ ان صفات

کی تربیت کرے اور انھیں زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کرے۔ اس تنگ نظری اور تعصب کے زمانے میں فیاضی، رواداری اور وسیع القلبی کی یہ تلقین بہت مشکل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ معلم کا کام ہی پہاڑ کی چڑھائی ہے۔ تمدنی زندگی کی بہت سی تحریکیں اور رجحانات اور خود انسان کی فطرت کے آسان پسند رجحانات اس کو پیچھے کی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ مستقبل کی طرف نظر جمائے انسان کو اخلاقی شعور کی بلندی پر پہنچانے کے لئے جدوجہد کرتی رہے اور اس طرح ایک بہتر انسان اور سماج کی خالق بن جائے۔ یہی استادوں کی سب سے بڑی آزمائش یہی ان کی سب سے بلند منزل اور یہی ان کی اعلیٰ ترین سعادت ہے۔ اگر ایسا کرنے میں انھیں ہوا کی رفتار کے خلاف چلنا پڑے تو انھیں جرأت کے ساتھ اس ذمہ داری کو اٹھانا چاہیئے۔ مختلف قسم کی نامبارک تحریکیں اور اثرات مکر و فریب کا بھیس بدل بدل کر ان کے سامنے آئیں گے اور کبھی حب وطن کے نام پر، کبھی دانشمندی کا حوالہ دے کر کبھی انفرادی اغراض کے واسطے سے، کبھی جماعتی اور نسلی تعصبات کو اپیل کر کے اس بات کی کوشش کریں کہ تعلیم شرافت، انسانیت، رواداری اور دردمندی کے بجائے ان جھوٹے معبودوں کی پرستش کرنے لگیں۔ لیکن اس وقت استادوں کا فرض ہے کہ وہ کو وقاری کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں اور جس وقت جنون اور خود غرضی کے طوفان عقل اور اخلاق کے روشن چراغوں کو بجھانے کی کوشش کریں اس وقت وہ اپنے دل و دماغ کی تمام قوتوں کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کریں اور اس بات کو ثابت کر دکھائیں کہ اہل غرض کی پھونکوں سے انسانی فضل و کرامت کے چراغ نہیں بجھائے جا سکتے۔ ("نوا")

غزل

لے مبارک حسن شعلہ نواز — جل گئے عشق کے پر پرواز
کیوں وہ سنتے نہیں مری آواز — نشتر جذب چھیڑ دے رگ ساز
رنگ گل سرخ خون بلبل سرخ — ایک ہی رنگ میں ہیں ناز و نیاز
روک بربادی قفس صیاد — اب نکلتی ہے حسرت پرواز
دل بھی اپنا نہیں محبت میں — اور لاؤں کہاں سے محرم راز
مل رہی ہے شکست دل سے مرے — غنچۂ نو شگفتہ کی آواز
رہ گیا اک وفا کا افسانہ — ہو گئے ختم آپ کے جانباز
اڑ گیا ہائے رنگ لطف سخن — جب سے شعر کا ہے شعلہ آواز

چاہتا ہوں قدم بڑھاؤں ربط
چلنے دیتے نہیں نشیب و فراز

ربط تلہری

اردو کی خدمت کیجیے
اردو کی
ہر قسم کی کتابیں
ہم سے طلب کیجیے
بک ڈپو انجمن ترقی اردو
اردو بازار دہلی

واسوخت

محمد عمر (نور الٰہی)

ارکان

راشد: —— ثریا کا چچا
ثریا: —— سجاد کی بیوی۔
سجاد: —— ثریا کا خاوند۔
زہرا: —— ثریا کی سہیلی۔

سین اوّل

(سجاد کے عالیشان مکان کی خوابگاہ۔ ثریا پلنگ پر اور راشد اس کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ شہلا تو وقت ۱۰ ر جولائی ۱۹۴۷ء چار بجے شام)

ثریا اور راشد

راشد:۔ مگر یہ کیا بچوں کے ایسی حرکت کی ذرا سی بات کے لئے تار دے دیا۔ یہ بھی بھلا کوئی بیماری ہے ثریا۔

ثریا:۔ ہاں کوئی خطرے کی بات تو نہیں اسوقت تک۔ مگر چچا جان! پھر بھی بات اور بیماری کو بڑھتے دیر نہیں لگتی نہ جانے کس وقت کیا ضرورت ہو اور بات تک کرنے کا موقع نہ ملے۔ مجھے تو ہر آپ سے ایک ضروری بات کہنا۔

راشد:۔ رہنے دو یہ باتیں اور پہلے اپنے ہوش کی دوا کرو۔ ناحق تار کھینچ مارا۔ جانتی ہو جب تار آتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو پریشانیوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے سر پر۔ اور دل کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔ ایسے ایسے بھیانک سپنے بناتا ہے کم بخت کہ توبہ ہی بھلی۔ جب تک کھول کر پڑھا نہ جائے کسی پہلو چین نہیں آتا۔

ثریا۔ آپ کو زحمت تو ضرور اٹھانا پڑی مگر آپ جانتے ہیں کہ میکے میں آپ کے سوا اور میرا ہے کون! جو وقت پر میرے آڑے آئے۔

راشد:۔ تو میرا کون ہے تم ہی تم۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ میری زندگی بھی تو تمہارے دم سے ہے۔ ثریا! یہ مرض نہ گیا تو یقین مانو کہ میں بھی دنیا جہان گیا۔ بات یہ ہے کہ یہ بلڈ پریشر محض ڈاکٹر کا ڈھکوسلا ہے۔ کم بخت نے اپنی جیب گرم کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔

ثریا:۔ چیز کچھ بھی ہو۔ ذرا احتیاط کر لی تو کیا مضائقہ ہے۔ دیکھئے نا میرے دل میں ہول پر ہول اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ....

راشد:۔ کہنے دو جو کہتے ہیں۔ خبردار ان پر اعتبار نہ کرنا کہیں۔ جنم کے جھوٹے ہیں یہ۔

ثریا:۔ اگر میں مر گئی تو۔

راشد:۔ مگر مرنے کی تو کوئی بات بھی تو ہو، بیٹا! یہ ڈاکٹروں کا کھیل ہے اسکے فن کی بات نہیں۔

ثریا۔ چچا جان! میں موت سے نہیں ڈرتی۔ اپنی جان کو نہیں روتی۔

راشد:۔ تو کسی کھلونے کے لئے روتی ہو بیٹا!

ثریا:۔ سجاد کی زندگی کو روتی ہوں میں سدھار گئی تو اس کا کیا بنے گا۔

راشد:۔ نادان لڑکی اگر خدا نہ کرے تمہیں کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو سجاد کو کیا پروا۔ ایک نوجوان قبول صورت، لاکھوں پتی کو نئی نویلی دلہن مل جانا کون بات ہے۔

ثریا:۔ یہی تو بات ہے۔ اگر مجھے تسلی ہو جائے تو میرے بعد سجاد کو اس ڈھب کی جورو مل جائے گی۔ تو میرا سفر آخرت سفر کشمیر بن جائے۔

راشد:۔ ڈھب کی بھی خوب کہی ہر عورت میں بیوی پن ہوتا ہے ثریا۔ ہاں کسی میں کم کسی میں زیادہ مگر ہوتا ضرور ہے۔

ثریا:۔ زبان درازی طعنے تشنے کی اور بے لگامی کی لگن حسد، رشک اور رقابت کی گھاگھی۔ لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کی اٹکل جس عورت میں یہ نہ ہو وہ الٹی بیوی بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ عورت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں کہیے کہ ایسی عورت دنیا نے ابھی تک دیکھی ہی نہیں۔ ایسی بیویاں نسوانی مارکیٹ میں ڈھیروں کے ڈھیر ملتی ہیں تسلی رکھو بیٹا! سجاد کے سامنے بھی ان کے کھیپ کے کھیپ پیش ہو جائینگے۔

ثریا:۔ مرد عورت کو یہ چلی گٹی نہ سنائے تو اسے مرد کون کہے۔ خیر مگر چچا جان! سجاد کو ان سب سے الوکھی بیوی درکار ہے۔ بس ایسی جو ماما کی طرح رکھ رکھاؤ جانتی ہو۔ یہ مال آپ کی مارکٹ میں کہاں۔

راشد:۔ سجاد آخر دودھ پیتا بچہ تو نہیں۔

ثریا:۔ اس کی جوانی میں بال پن کھیل رہا ہے۔ میرا سہارا نہ ہو تو وہ سانس نہیں لے سکتا۔ اس کے چھوٹے موٹے کام میں نہ کروں تو ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میں نہ رہی تو کسی جوگا نہ رہیگا سجاد۔

راشد:۔ تو یہ سب بیل بوٹے تمہارے بنائے ہوئے ہیں۔

ثریا:۔ اور سنئے میری پیٹھ پیچھے لقمہ اسکے گلے سے نہیں اترتا۔ چائے میں کھانڈ نہیں ڈال سکتا۔ کپڑے نہیں بدل سکتا۔ بوٹ کے تسمے نہیں لگا سکتا ٹائی نہیں باندھ سکتا۔ سگریٹ تک نہیں جلا سکتا قمیض میں سٹیڈ تک لگانا اسے دوبھر ہے۔ کالر بدلنا اسے نہیں آتا۔ اور ....

راشد:۔ اور کی ضرورت نہیں۔ تو سجاد اس اپاہج پن کو تو پسند کرتا ہے۔

ثریا:۔ دل و جان سے۔

راشد:۔ اور یہ سب کچھ تمہاری دین ہے اچھا نوکر کون رکھتا ہے؟

ثریا:۔ سجاد رکھ تو لیتا ہے مگر موقوف مجھے کرنا پڑتے ہیں۔

راشد:۔ اپنے ہاتھوں یہ بس بویا تم نے ثریا!

ثریا:۔ اور اب ثریا اس کا تریاق ڈھونڈے بغیر نہیں مرے گی۔ چچا جان! بات یہ ہے کہ میں خوشی سے نہیں مر سکتی جب تک اس دنیا کو سجاد کے لئے جنت نہ بنا لوں۔

راشد:۔ دیکھو بیٹا میں دو یتیم خانوں کا ڈائرکٹر ہوں۔

ثریا:- آپ اسے کھیل سمجھتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

راشد:- مجھے معاف رکھو۔ میں سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔

ثریا:- نہ سمجھیں آپ۔ میرے ابا کا بھائی لاکھ بھی چراغ ہے۔ مگر بیٹے جو بویا ہے مجھے کاٹنا ہوگا۔

راشد:- میرے دانا بھائی کی نادان لڑکی ذرا آنکھیں کھول کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ثریا:- میں دیدے پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ سجاد مارا مارا پھر رہا ہے اور اسے بیوی نہیں ملتی۔

راشد:- دیکھو! بیٹا! وقت آئیگا تو سب کچھ ہو جائیگا ابھی اس خیال کو دہنا بتاؤ قبل از وقت ہی نہیں بلکہ بے معنی ہے۔

ثریا:- بجمہ دم توڑنے لگی تو اس نے خاوند سے قسم لی کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

راشد:- ہاں عورتیں ایسی بیش بندیاں کیا کرتی ہیں۔

ثریا:- سن تو لیں پہلے۔ بجمہ نے خاوند سے یہ قسم لی کہ وہ اس کے مرنے کے بعد شادی نہ کرے گا۔ اور بیچارے کی ابھی ٹنگوڑی کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ نئی بیوی کی ڈولی آگئی۔

راشد:- ہاں مرد تھا اسکے لئے عدت کی شرط تھوڑی پورا کرنا تھا۔

ثریا:- جی ہاں۔ سب شرطیں عورتوں کے لئے۔ مرد شتر بے مہار۔ ہرن کی طرح جس طرف چاہے چوکڑیاں بھرے۔ مجھے اس قسم کی پابندیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ سجاد کو کام کی دلہن مل جائے۔

راشد:- ناحق پریشان ہو رہی ہو۔ آجکل جنگ کی وجہ سے عورتیں ساری دنیا میں عام ہو رہی ہیں۔ شادی کے قابل مرد چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملتا۔ اطمینان رکھو ہم سجاد کے لئے اس کے حسب منشا۔ بیوی ڈھونڈ ڈھونڈ ہی لیں گے۔

ثریا:- اس کی منشا اور آپ کی پسند میرے بھروسے کے کارندے نہیں چچا جان! میں تو چاہتی ہوں کہ سجاد کی آئندہ بیوی کو آپ پرکھیں، آپ منتخب کریں۔

راشد:- تو آپ منتخب کرو گی؟

ثریا:- بلا کر بھی چکی۔

راشد:- خوب بیٹی گھٹا دیکھی تو چھاتا تان لیا۔ برسے نہ برسے تمہاری بلا سے۔

ثریا:- چار دن پہر سجاد کو دیکھتی بھالتی رہی۔

راشد:- سمجھا قدرت تم میں حسد، رشک، رقابت کا جذبہ رکھنا بھول گئی۔ اچھا یہ منتخبہ بیگم تمہارے جیسی ہے نا۔

ثریا:- ہاں۔ کچھ ہے کچھ نہیں۔

راشد:- یہ کبھی اسے دیکھ کر سجاد کے دل کو تمہاری یاد گدگدائیگی؟

ثریا:- ہاں اس کے ہوتے سجاد بھول کر بھی مجھے بھول نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں میرے ارمان ضرور نکل جائینگے۔

راشد:- خیر یہ تو دل بہلاوے کی باتیں ہیں۔ ہاں یہ تو کہو اس لڑکی سے بھی بات چیت ہوئی۔

ثریا:- نہیں۔ یہی تو منزل ہے جسے کاٹنے کیلئے آپ کو تار دیا۔

راشد:- بیل تو اچھی ہے جو منڈھے چڑھے۔

ثریا:- وہ اور میں برسوں کالج میں اکٹھے رہے۔ وہ کہیں باہر چلی گئی تھی ابھی ابھی لوٹ کر آئی ہے۔ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ حیادار۔ کم سخن۔

راشد:- بھولی بھالی۔ سیدھی سادھی۔

ثریا:- مگر اتنی بھی سادھی نہیں کہ بودھو کہیں جسے۔ اسکا نام ہے زہرا۔ وسیلہ کریم اللہ کی بیٹی۔

راشد:- اچھا کریم بھیا کی بیٹی۔ میرے بڑے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(زہرا آتی ہے)

ثریا:- یہ لو وہ آ ہی گئی۔ بڑی عمر ہے زہرا تمہاری۔ ابھی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ یہ ہیں میرے چچا خان بہادر راشد علی خاں اور یہ ہیں میری بہن زہرہ سلطانہ۔

راشد:- بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر بیٹا! خدا عمر دراز کرے۔ تمہاری ماں تو اچھی ہیں۔

زہرہ:- ابھی ہیں خدا کے فضل سے۔

راشد:- اور تمہارے ابا، وہ بھی خدا کے فضل سے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

زہرہ:- چھ سال ہوئے اللہ میاں کے عزیز ہو گئے۔

راشد:- خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ خوب آدمی تھے اور

زہرہ:- اور میری دو بہنیں اور ایک بھائی اچھے ہیں۔

راشد:- شکر ہے۔

ثریا:- زہرہ کیا ہی خوشی ہوئی تمہیں دیکھکر

زہرہ:- یہ کوئی انوکھی بات ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

ثریا:- مگر آج کی خوشی میں آباد ھاپی بھی ہے۔ تم میری وہ حسرت نکال سکتی ہو زہرا جسے کوئی اور سننا بھی گوارا نہ کرے۔

زہرہ:- آپا، بڑا کام۔

ثریا:- میں کوئی دن کی مہمان ہوں زہرا! میں ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوں۔

زہرہ:- اللہ نہ کرے۔ کیسے بول بولتی ہو۔

ثریا:- نہیں تو صدمہ ہونا ہی تھا۔ مگر کیا ہو سکتا ہے جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔

زہرہ:- یہ آپ بیمار کب سے ہو گئیں تم۔ میں تو چنگی بھلی چھوڑ کر گئی تھی۔

ثریا:- میری بیماری راز بن گئی زہرا! نہ چپ رہا جاتا ہے نہ کہے بن آتی ہے۔ سجاد تک کو پتہ نہیں۔

راشد:- ایسا بھید ہے جس کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔

ثریا:- زہرہ تمہاری محبت اسوقت میرے آڑے نہیں آسکتی۔ مجھے کچھ قربانی کی ضرورت ہے۔

زہرہ:- جان تک حاضر ہے ثریا! جو میرے بس میں ہے اس سے دریغ نہیں۔

ثریا:- سنو گی تو بھونچک رہ جاؤ گی۔

راشد:- بے شک اچنبھے کی بات ہے۔

ثریا:- میں وہ چاہتی ہوں جو دنیا نے عمر بھر دیکھا نہ سنا تمہیں ہر جس سے بے ڈھب بھیک مانگ رہی ہوں کوئی اور ہو تو زبان نہ ہلنے پائے۔

راشد:- خدا لگتی کہوں کوئی عورت حامی نہ بھریگی اس بات کی۔

زہرہ:- اوئی اللہ، سنوں تو سہی وہ ان ہونی بات۔ آخر ہے کیا جس سے کھچڑی چھٹ رہی ہے سب کو۔
ثریا:- میں چاہتی ہوں میرے مرنے کے بعد......
چچا جان آپ......
راشد:- شکریہ مہربانی۔ مجھے معاف ہی رکھئے۔ میرے باپ دادا نے یہ کام نہیں کیا۔
ثریا:- مگر آپ کو بزرگوں سے آگے بڑھنا ہوگا۔ نہیں تو میری جان پر بن آئے گی۔
راشد:- کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتی ہو ثریا!
ثریا:- دو باتیں تو میں جی کڑا کرکے کہہ ڈالئے۔
راشد:- اچھا جو ہو سو ہو۔ سنو عزیزی!۔ ثریا چاہتی ہے کہ تم اس بات پر رضامند ہو جاؤ...... سمجھیں تم یہ مان لو کہ ۔ کہ تم اس کے خاوند سے شادی......
زہرہ:- ہوش کی دوا کرو خان بہادر صاحب! آخر شرافت اور اخلاق بھی کچھ معنی رکھتے ہیں۔
راشد:- سا رہو۔ ساری بات تو سنی ہوتی بیٹا! میں اب کی نہیں کہہ رہا۔ اسوقت جب ثریا نہ ہوگی۔
زہرہ:- اپنی طرف دیکھئے بڑے میاں! اور سوچئے یہ کہنا آپ کو زیب دیتا ہے۔
ثریا:- خدا کے لئے انکار نہ کرو زہرہ! میری تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ میں کہیں کی نہ رہوں گی مان جاؤ زہرہ! میری موت خوش گوار ہو جائیگی۔ نہیں تو مجھے قبر میں بھی چین نہ آئے گا۔
زہرہ:- چچا صاحب! آخر خدا کو جان دینا ہے۔ کہئے یہ کوئی ٹھکانے کی بات ہے۔
راشد:- پہلے میں بھی اس تجویز کے خلاف تھا۔
زہرہ:- پھر
راشد:- جب ثریا نے تمہارا نام لیا تو میں چپ ہو گیا جس کام کو ناممکن خیال کرتا تھا ممکن نظر آنے لگا۔
زہرہ:- سماج سنیگی تو کیا کہیگی۔
ثریا:- سماج کو رہنے دو۔ کون پوچھتا ہے اسے آجکل

زہرہ:- اور میں نے سجاد کو برسوں سے دیکھا تک نہیں
ثریا:- اس کی فکر نہ کرو۔ چٹکیوں میں بھا لوگی اسے
راشد:- سجاد کو کون نہیں بہا سکتا۔
زہرہ:- اچھی! یہ بات تمہارے سر میں سمائی کیسے۔ ان ہونی سی اپج ہے۔ ثریا۔
ثریا:- اری خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ کلیجہ منہ کو آجاتا ہے میرا۔
زہرہ:- سو کی ایک کہے دیتی ہوں۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہونے کا بس۔ میں نہیں کر سکتی۔ کوئی عورت نہیں کر سکتی۔ بیسوا نہیں کر سکتی۔
ثریا:- چچا جان!
زہرہ:- لو سے اب اجازت۔
ثریا:- زہرہ ستم ڈھا رہی ہو۔ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔
زہرہ:- وہ نہ کہتی جو تم چاہتی ہو۔
ثریا:- کچھ کرو زہرہ! میرا دوگ تمہارے ہونٹوں کا منہ تک رہا ہے تم ہی تم ہو جسے میں یہ امانت سونپ سکتی ہوں۔
راشد:- ذرا تامل سے ذرا غور سے بیٹی زہرہ!
زہرہ:- غور تو یہ فرماتے ہیں کہ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔
ثریا:- ایناد ہن، اپنی جان اپنی عاقبت کسی کے حوالے کرنے کو کھیل سمجھتی ہو زہرہ؟
زہرہ:- مگر یہ تو دیکھو۔ سجاد بھی مجھے گوارا کر لیگا۔ ثریا کی پیرڑھی پر بیٹھنا بہت کچھ چاہتا اور یہاں کچھ بھی نہیں
ثریا:- اری چھوڑ بھی یہ کسر نفسیاں۔ بے اے تک گئیں پر یہ تکلف نگوڑا نہ گیا۔ سورج چاند کی جوڑی بن جائے گی۔
راشد:- ذرا کوشش کرنا ہوگی۔ جو ہو جائیگی۔
زہرہ:- اور جو میں سجاد کو راس نہ آئی تو کیا گت بنے گی بندی کی۔
ثریا:- کچھ مجھ پر بھی چھوڑو نا زہرہ!۔ رتی بھر فکر نہ کرو۔ جو کہوں گی سر ڈالے کرے گا۔
زہرہ:- میں کبھی خواب میں بھی ایسا نہ کرتی مگر......

ثریا:- میرے سے کر دکھاؤ گی۔
زہرہ:- ہاں ایک بات۔ ذرا میں سجاد کو آنکھ بھر کر دیکھ تو لوں۔
ثریا:- اس کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ سجاد چھیل چھبیلا گھبرو، دل چسپ اور دل کش۔
زہرہ:- اچھا تو ذرا حلیہ ہی بتا دو۔
ثریا:- چچا جان آپ بتائیے۔ میری کہی شاید مبالغہ ٹھہرے
راشد:- جہاں تک میں جانتا ہوں اسکے جسم میں کوئی عیب نہیں۔
ثریا:- چچا جان!
راشد:- غلط کہہ رہا ہوں کیا۔
ثریا:- ہے تو ٹھیک۔ مگر ذرا مذاق کا پہلو لئے ہے۔
راشد:- دو ٹانگیں، دو ہاتھ، دو آنکھیں، ایک ناک، اندھا، کانا گنجا۔ لنگڑا۔
ثریا:- کیا بہکی بہکی باتیں ہیں چچا جان! سجاد مجسم حسن ہے۔ اس کا ثبوت میرا قبول۔
زہرہ:- پھر بھی آنکھ دیکھے کی اور بات ہے۔ اچھا ہوگا۔
راشد:- ہاں ہاں۔ خوب دیکھ بھال کر پرکھ لو۔ سیانا گاہک اسی طرح کرتا ہے۔
زہرہ:- ثریا! برا نہ ماننا کہیں۔ میں تمہارے حسن انتخاب کی توہین نہیں چاہتی پھر بھی دیکھو نا پسند اپنی اپنی۔ یہ اچھا نہیں آج بات پکی کر دوں اور کل مجھے زبان بدلنا پڑے۔
ثریا:- یہ سودا مہنگا نہ پڑے گا۔ زہرہ! کسی دن یاد کروگی کہ کوئی بہن تھی۔ تمہارا احسان جنت جہنم میں نہ بھولوں گی۔ ڈوبتی ناؤ کو کنارے لگا دیا۔
راشد:- اس شکریہ میں مجھے بھی شامل سمجھو بیٹیا۔
ثریا:- میں ذرا ماما کو چائے کے لئے بتا آؤں۔ ابھی آئی۔

(ثریا جاتی ہے)

زہرہ:- لحاظ کے مارے منہ پر کچھ نہ کہہ سکی۔ نہیں تو وہ سناتی کہ عمر بھر نہ بھولتی ساری آبرو خاک میں ملا دی

کتا بھی گھر آ سئے تو کوئی ایسا سلوک نہیں کرتا۔

راشد:۔ دیکھو نا بیٹا!

زہرہ:۔ اندھی نہیں دیکھ رہی ہوں۔ نوج میں نہ آئی یہاں

راشد:۔ ذرا ٹھنڈے دل سے۔

زہرہ:۔ تن بدن میں آگ لگ رہی ہے۔ ٹھنڈا دل کہاں سے لاؤں۔ لاج کی آنکھ حیا نہ سے بھاری تھی نہیں تو نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ میں نے اس نا شدنی کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے میری یہ گت بنائی۔

راشد:۔ شاید کچھ بھول چوک......

زہرہ:۔ بھول چوک کی ایک ہی کہی۔ اس نے لگی لپٹی تو کہی نہ رکھی اور صاف کہدیا کہ دنیا بھر کی عورتوں میں ایک میری ذات ہے جو ذلت اٹھا سکتی ہے۔ رہی اس کی چکنی چپڑی باتیں تو جانور کو جال میں پھنسانے کے لئے دو ایک دانے ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔

راشد:۔ عزیزی زہرہ! ذرا تحمل سے۔

زہرہ:۔ چچا جان! آپ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکئے۔ میں باؤلی ہو رہی ہوں۔ آپ بزرگ ہیں ایسا نہ ہو کہ واہی تباہی بک جاؤں۔

راشد:۔ ماحصل یہ کہ تم یہ کام نہیں کرنا چاہتی۔

زہرہ:۔ نہ کرتی کبھی نہ کرتی۔ اب کروں گی۔ ضرور کروں گی۔ مرتی مرجاؤں گی مگر اسے کر کے رہوں گی۔

راشد:۔ اتنی مہربانی۔

زہرہ:۔ ثریا کو سکھ کا سانس لینے دیا تو کہنا انگلی کا ناچ نچاؤں تو سہی۔

راشد:۔ ذرا میری تو سنو بیٹا! تمہاری ماں کا منہ بولا بھیا۔ تمہارے باپ کا لنگوٹیا یار۔

زہرہ:۔ تھوڑی نہیں ہوئی مجھ سے۔ میرے منہ آئے اور جیتی چلی جائے۔ بوٹیاں نہ نوچ کھاؤں نگوڑی کی۔

راشد:۔ تم تو ماشاء اللہ بڑی سمجھدار لڑکی ہو فلاں...

(ثریا اور سجاد آتے ہیں)

ثریا:۔ یہ ہیں میرے سجاد۔ اور یہ ہیں میری بہن زہرہ!

سجاد:۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ خدا کرے ہم کامیاب دوست ثابت ہوں۔

زہرہ:۔ یہ سب آپ کی عنایت ہے۔ نہیں تو میں اس قابل کہاں

سجاد:۔ تو چلئے آج مل بیٹھنے کی بسم اللہ سینما سے کریں۔ آپ کو پسند ہے نا یہ تفریح۔

زہرہ:۔ ساتھی خوش گوار ہو تو بھونڈی چیز بھی سہانی ہو جاتی ہے۔ اب مجھے گھر جانا چاہئیے۔ کس وقت آئیگے آپ۔ ہمارا گھر تو.......

سجاد:۔ خوب جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے میرا آپ کے ہاں آنا جانا تھا۔ کئی بار آپ کو بھی دیکھا۔ میں ذرا بھول گیا۔ پھر بھی کبھی کبھی......

زہرہ:۔ بھولی بسری کہانی یاد آجاتی تھی۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ ہاں وقت۔

سجاد:۔ اس کا پوچھنا ہی کیا۔ آپ کی دولت ہے۔ کہیں تو ابھی حاضر ہوں۔ نہیں تو پورے سات بجے۔

زہرہ:۔ تو پھر ٹھیک سات بجے۔

سجاد:۔ میری کار کھڑی ہے۔ چلئے پہونچا آؤں۔

(سجاد اور زہرہ جاتے ہیں)

راشد:۔ ایک دوسرے میں سموگئے دونو۔ باتیں شروع کیں تو ہمیں بھول ہی گئے۔ گویا ہم تھے ہی نہیں آثار تو اچھے ہیں۔ بیل منڈھے چڑھتی نظر آتی ہے۔

ثریا:۔ امید سے زیادہ میل ملاپ اور اتنی جلدی جو کسی چاہتا ہے۔

راشد:۔ بہرحال ابتدا بڑی حوصلہ افزا ہے۔

ثریا:۔ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھنا چاہئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اور تیل کی دھار کدھر جاتی ہے ہم نے بازی لگا دی اب پانسا جانے اور اس کا کام

سین دوم

(سجاد کے مکان کا ایک پرتکلف کمرہ۔ وقت پہلے سے دس دن بعد (۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء) ۵ بجے شام)

راشد اور ثریا

راشد:۔ سجاد تو گھر کا راستہ ہی بھول گئے۔ خیر سے دس دن ہوئے انہیں دہلی گئے۔

ثریا:۔ ابھی تار آیا ہے۔ ۷ بجے شام آرہے ہیں۔

راشد:۔ جلو جی صبح یا شام۔ بس آجائیں اصل چیز ہے۔

ثریا:۔ حیران ہوں کون دیکھ بھال کرتا ہوگا۔

راشد:۔ زہرہ ان کے ساتھ ہے۔ مشق کر رہی ہے۔ امانت کی رکھوالی کی۔ اور کیا چاہتی ہو۔

ثریا:۔ مجھے پتہ نہ تھا۔ خیر دیکھا جائے گا۔

راشد:۔ تم تو اداس کھوسی گئیں یہ سن کر۔

ثریا:۔ نہیں تو۔

راشد:۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ چہرہ اتر کر کہاں پہنچ گیا ہے۔

ثریا:۔ ہاں بیمار بھی تو ہوں۔

راشد:۔ سجاد کے آنے کی کچھ خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟

ثریا:۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں اور آپ کے بقا دیں مجھے خوشی ہی نہیں ہوئی۔

راشد:۔ ہوگا۔ ایسا ہی ہوگا مگر قرائن کچھ اور کہتے ہیں۔ رت بدل رہی ہے۔ اس کا اثر ہوگا۔

ثریا:۔ کیا آپ چاہتے ہیں اٹھ کر چلی جاؤں۔

راشد:۔ مجھ سے ناراض۔ اس سے ناراض جو سجاد کے لئے نئی دلہن تلاش کر رہا ہے۔

ثریا:۔ مگر چچا جان۔

راشد:۔ تم کیا جانو اچھی بیوی کیسی نایاب چیز ہو۔ مجھے دیکھو چالیس سال دوڑ دھوپ کی۔ ہزاروں روپے ضائع کئے مگر ایک بھی نہ ملی۔

ثریا:۔ مگر آپ کی شرطیں بھی تو دنیا جہان سے نرالی تھیں۔

راشد:۔ کس قدر خوش قسمتی ہے کہ سجاد کو ایک چھوڑ دو اچھی بیویاں مل رہی ہیں۔

ثریا:۔ وہ بیوی کہاں سے بن بیٹھی۔

راشد:۔ مگر بیوی بننے کی مشق کرنے کا تو ہم نے اسے اختیار دیا ہے۔

ثریا:۔ مگر وہ اس اجازت کو اور طرح استعمال کر رہی ہے

راشد:۔ سمجھا! تمہارے دماغ نے کوئی بنا بنایا گورکھ دھندا تیار کیا ہے۔ خیر اب تسلی تو ہوگئی کہ

تمہارے بعد سجاد کو سگھڑ بیوی مل جائے گی۔

ثریا:- میں اسے کچھ سمجھی تھی وہ نکل آئی کچھ اور۔

راشد:- ثریا کیا منشا ہے تمہارا کہیں مجھے پاگل خانہ بھیجنا تو منظور نہیں۔ کل زہرہ لاجواب لڑکی تھی۔ آج اس میں سو کیڑے پڑ رہے ہیں۔ آخر تلون مزاجی کی بھی حد ہونا چاہیئے۔

ثریا:- میں اسے بھولی بھالی سمجھا۔ اور وہ میرے کان کاٹنے لگی۔ میں اسے بدشکل سمجھتی تھی وہ قبول بن گئی۔

راشد:- تو ہوا کیا؟

ثریا:- ہوا یہ کہ وہ آستین کا سانپ بننے لگی۔

راشد:- خوبصورت تو ضرور ہے۔

ثریا:- سانپ بھی خوبصورت ہوتے ہیں مگر ڈسنے سے نہیں رکتے۔ زہرہ گھات لگائے ہے موقع ملتے ہی وہ میری زندگی میں سجاد سے شادی کرلیگی۔

راشد:- میری بچی تو کن الجھنوں میں پھنس گئی۔

ثریا:- خیر ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ جلد کھیل کھیلی اور بھانڈا پھوٹ گیا۔

راشد:- اور اب؟

ثریا:- زہرہ میرے خاوند کی بیوی نہیں بن سکتی۔

راشد:- اب شاید واپس جانا مشکل ہو۔

ثریا:- کوئی مشکل نہیں۔ میں برداشت نہیں کرسکتی کہ سجاد کی کوئی اور بھی بیوی ہو۔

راشد:- اب کیا ہو سکتا ہے۔

ثریا:- سب کچھ ہو سکتا ہے عورت کے وار کا جواب عورت ہی دے سکتی ہے۔ میں اس گھروندے کو ایک ٹھوکر میں ڈھادوں گی۔ سجاد گھومتا گھامتا میرے پاس آکر دم لیگا اور میرا ایک لفظ اس کچے دھاگے کو توڑ کر رکھدیگا۔ اب آپ فرمایئے۔

راشد:- میں کیا فرماؤں خاک۔ میرا سر تو فٹ بال بن رہا ہے جیسے بل میں بنائی ہو جل میں گرائی ہو۔

فرہاد:- چچا جان! آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ ہم پرسوں کشمیر جارہے ہیں اور اسکے ساتھ ہی یہ گرمیاں آپکو آپ ٹھنڈی ہو جائنگی

لغزش

عبدالمجید بھٹی

میں نے چاہا — تجھے چاہا — چاہا
تیری آنکھوں نے جو پیمانِ وفا باندھا تھا
تیرے دل نے جو مرے دل میں جگہ پائی تھی
تیری آغوش میں دنیا ہی سمٹ آئی تھی

*

چار سُو ظلم کی گھنگھور گھٹا چھائی رہی
ناتوانوں کی صدا آئی قضا، آئی رہی
مفلسی چاک بداماں پھری اور پھرتی رہی
دل پُر درد سے آہوں کا دھواں اٹھا کیا
پر یہ دنیا کہ جو سفاک ہے ناپاک بھی ہے
اک حسین خواب بنی تھی مرے ارمانوں کا
میری آنکھوں میں سمن زار سمٹ آئے تھے
گلبنِ عیش کے انوار سمٹ آئے تھے

*

میں نے شعلوں میں بھی نغموں ہی کو رقصاں دیکھا
میں نے چیخوں کو بھی ویک ہی کی تانیں سمجھا
میں نے دیکھا کہ مہ و مہر بھی ہیں میرے غلام
منحصر میرے اشاروں پہ ہے دورِ ایام

اس حسین خواب میں جب ڈوب گئے رسم و رواج
ایک ناگن تھی کہ پھنکار سے جاگ اٹھی سماج
اور میں لے کے نوشتہ ترے ارمانوں کا
اپنے رومانِ فرا رس بھرے افسانوں کا
چاندنی راتوں کی سفاک نظر سے بچ کے
تیرہ و تار سیاہی کی ردا اوڑھے ہوئے
ٹھوکریں کھاتی ہوئی، گرتی ہوئی، چکراتی ہوئی
اپنی ہی ذات سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی
ان حسین خوابوں میں کھو جانے کو آپہنچی ہیاں
تہ دریا میں نظر آتے ہیں حباب رقصاں

*

تیری آنکھوں نے جو پیمانِ وفا باندھا تھا
میری آنکھوں میں سمن زار سمٹ آئے تھے
گلبنِ عیش کے انوار سمٹ آئے تھے

*

تیری آغوش میں گر جانا ہی تھا میرا عروج
آج دریا کی حسین لہروں میں ہے جس کی تلاش
تیرے پیماں کی حقیقت مرے ارمانوں کی لاش

*

کاش! اس جبر کو لغزش ہی سمجھتا کوئی
میں نے چاہا — تجھے چاہا — چاہا

فریبِ نظر

سرشار صدیقی

میں جذب تصور کا اثر دیکھ رہا تھا
ہر جلوہ بعنوانِ دگر دیکھ رہا تھا
جس سمت اٹھی آنکھ اُدھر دیکھ رہا تھا
لرزاں تھا نقابِ رخِ جاناں مرے آگے
اللہ رے مرے حسنِ تخیل کے کرشمات
میں عشق کے گہوارۂ انوار میں کھو کر
ہر ذرے میں آتا تھا نظر جلوۂ جاناں
میری نگہ شوق تھی صد جلوہ در آغوش

ان کو تو ابھی پیشِ نظر دیکھ رہا تھا
حیرت سے تماشائے نظر دیکھ رہا تھا
میں وسعتِ دامانِ نظر دیکھ رہا تھا
جنبش میں ہر اک تارِ نظر دیکھ رہا تھا
اک جلوے کو تا حدِ نظر دیکھ رہا تھا
خود اپنی تجلیٔ نظر دیکھ رہا تھا
میں شعبدۂ ذوقِ نظر دیکھ رہا تھا
میں حاصلِ عرفانِ نظر دیکھ رہا تھا

تا دیر نہ رہ پائے تصور کے طلسمات
ہوش آتے ہی گم ہوگئی تصویر خیالات

وسط ایشیا کے چند فنکار

تمارہ خانم ـــــ ایک ازبک رقاصہ

ل۔ احمد اکبرآبادی

فرغانہ کا علاقہ پورے ازبکستان میں اپنی تہذیب و زباندانی کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ فرغانہ کی شائستگی اور خوش گوئی کا وہی درجہ ہے جو ہمارے یہاں بیسویں صدی کے شروع تک دہلی اور لکھنؤ کو حاصل تھا۔

مرگیلان (یا مرغلان) وادیٔ فرغانہ کا ایک قدیم شہر ہے۔ اس شہر میں یعنی ازبکستانی تہذیب و زباندانی کے گہوارے میں ایک ارمنی النسل لوہار کے یہاں جو معمولی حیثیت کا آدمی تھا ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے۔ یہ لڑکی اتنی پیاری ہے کہ بستی محلے کے گھروں میں وہ ایک خوش آئند مہمان کی حیثیت پاتی ہے۔ وہ جب ذرا بڑی ہوجاتی ہے تو اس کا یہ ملاقاتوں کا حلقہ بڑھتا جاتا ہے۔ اب وہ محلے سے نکل کر گھروں میں پہنچنے لگی ہے اور اس کا وقت ان ملاقاتوں میں صرف ہوتا ہے۔ وہ ان خاندانوں کے بچوں کے ساتھ دن دن بھر کھیل کود میں اور گانا کہانیاں سننے سنانے میں گزارتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جس روز وہ نہیں پہنچتی اس کی تلاش ہوجاتی ہے کہ کیوں نہیں آئی؟ کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ یہ تھا وہ ماحول جس میں یہ لڑکی پروان چڑھی اور خالص ازبک تہذیب و زبان اس نے ان گھروں میں رہ کر، ان بچوں کے ساتھ کھیل کر حاصل کی۔

یہ لڑکی جس کی پیدائش اور تربیت اس طرح ہوئی، آج تمارہ خانم کے نام سے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت کی مالک ہے۔ وہ ایک ہمہ فنی صناع یعنی VARIETY ACTRESS ہے۔ وہ ایک جادوگر رقاصہ ہے، ایک آتش نوا مطربہ ہے، اور ایک باکمال ایکٹریس۔

تمارہ کا قد نکلتا ہوا ہے، چہرہ کتابی، نقشہ باریک اور رنگت صندلی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہات چہرہ سے بھی زیادہ خوبصورت اور نہایت درجہ اظہاری یعنی EXPRESSIVE ہیں۔

وہ پوری سوویٹ یونین اور ہمسایہ اسلامی ملکوں کی مقبول و محبوب فنکار ہے۔ سوویٹ یونین کی طرف سے اسے "صناع عوام" کا سب سے زیادہ معزز خطاب ملا ہوا ہے۔ پیرس، لندن اور دوسرے یورپی پایہ تختوں میں اپنی صناعت کی نمائش کرکے داد و تحسین وصول کر چکی ہے۔ شاہی بلاوے پر تمارہ ایران گئی تو رضا شاہ نے اس کے فن و کمال کے اعتراف میں اس کو "ستارۂ مشرق" لقب دیا۔ منگولیا گئی تو وہاں کی جمہوریت کے صدر نے سرکاری طور پر اسے ایک منگول ستار تحفہ دیا اور منگول قومی لباس کا ایک خلعت فاخرہ عطا کیا۔

تمارہ تین زبانوں میں گا سکتی ہے اور ہر زبان کا گانا اہل زبان کی طرح گاتی ہے۔ اس کے فن و صناعت کا کمال یہ ہے کہ جس قوم کا گانا سناتی ہے اور رقص دکھاتی ہے اس میں قومی اسپرٹ اور قومی آرزوؤں کا اظہار کرتی ہے۔ اس خصوصیت ہی کو وہ اپنے فن کی کامیابی کا راز سمجھتی ہے۔ یہ کمال حاصل کرنے کی وجہ وہ اپنے بچپن کی تربیت کو قرار دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ "وہ گھرانے جہاں میرا بچپن گزرا میرا حقیقی اسکول تھے اور عوام میرے سچے استاد ہیں"۔ مشرقی رقص کی ادا طرازیوں اور رعنا اداؤں کا فطری احساس تمارہ کو ان گھرانوں ہی نے سکھایا۔ اور نغمہ و موسیقی کی سچی حس اس کے اندر ان عوامی گانوں اور دھنوں نے پیدا کی جو اس نے ان گھروں کے اندر سنی۔ اس رقص و موسیقی کی اسپرٹ اس کی روح میں پیوست ہوگئی۔

مشرق میں جاگیردارانہ یا سامنتی سماج نے عورت کو منجملہ اسباب خانہ داری کی حیثیت میں رکھا تھا۔ سوویٹ مشرق میں جب عورت نے اس حیثیت کو ترک کرکے اپنا انسانی درجہ حاصل کیا تو تمارہ ان چند ازبک لڑکیوں میں سے ایک تھی جنھوں نے اپنے لئے تھیٹر کی زندگی پسند کی۔

تمارہ جب پہلی مرتبہ اسٹیج پر نمودار ہوئی تو لکیر کے فقیر ازبکوں نے اس کا تمسخر کیا کیونکہ وہ قومی وقار کو صدمہ پہنچا رہی تھی، روایتی مذہب کے سوداگروں نے اس کی تذلیل کی اس لئے کہ وہ ناموس ملت کو برباد کر رہی تھی۔ مگر تمارہ نے اس مخالفت یا توہین کی مطلق پرواہ نہ کی اور حصول فن میں لگی رہی۔

ان واقعات پر آج پچیس سال گزر چکے ہیں۔ تمارہ آج دور دور تک مقبول و محبوب ہے۔ آج ازبکستان کے بوڑھے اسے ازراہ محبت قدردانی "دختر" سے ممیز کرتے ہیں۔ چائے خانوں میں جب ازبک لوگ گپ زنی کے لئے اکٹھا ہوتے ہیں تو موضوع گفتگو اکثر تمارہ کا فن کمال ہی ہوتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف میں ایک سے دوسرا سبقت لے جانا چاہتا ہے۔

زمانے کے تغیرات عجیب ہوتے ہیں۔ اور ایسا خاموش انقلاب ہمیشہ اور ہر ملک میں جاری رہتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بوڑھے ازبکوں میں جو تمارہ کو آج "دختر" کہتے ہیں ان میں کا کوئی آدمی نہیں ہے جنھوں نے اس کی توہین و تذلیل کی تھی؟

۱۹۲۱ء میں تمارہ پہلی دفعہ ماسکو کے اسٹیج پر نمودار ہوئی تو تماشائی کسی

اظہار کمال و صناعت کی توقع لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ زیادہ تر انکو یہ احساس لے آیا تھا کہ ایک دفاقی جمہوریت کی صناع ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ہونا ہی چاہئے۔ لیکن جب وہ تھیٹر سے باہر نکلے تو ہر شخص اس کی توصیف و ثنا میں سرخ زبان تھا۔ ماسکو والوں نے تمارہ کو تتلی اور بلبل کا مزدجہ سمجھا۔ ان کا احساس کچھ اس شعر سے ادا ہو جاتا ہے۔

ہے آواز نغمہ، ادائیں ہیں رقص تبسم میں یعنی ہیں چنگ و رباب

(ضیا گوالیار)

جنگ عالم کے دوران میں جب پوری سوویٹ یونین کے صناع و فنکار ایک مشترک نمائش کمال کے لئے جمع ہوئے تو تمارہ بھی آئی تھی۔ اس نمائش فن کا مقصد سرخ فوجیوں کا اعزاز اور تفریح تھی۔ "بہری تھیٹر" (پہلے زار کا محل تھا اب مزدوروں کا کلب ہے) کے اسٹیج پر تمارہ نے مختلف قوموں کے رقص پیش کئے اور گانے سنائے تو تماشائیوں کا یہ عالم تھا کہ ایک وقت اگر وہ اپنے آپ کو ترکمانیہ کے کشلاک (گاؤں) میں محسوس کر رہے تھے تو دوسرے وقت کازکستان کی فیکٹریوں کی بو سونگھ رہے تھے، ایک وقت اگر ازبکستان کی اجتماعی کاشت کا احساس کر رہے تھے تو دوسرے وقت ایران کے باغات میں جا پہنچے تھے کبھی تاجکستان میں کپاس بینے جانے کا احساس ہو رہا تھا تو کبھی منگولیا کی برفستانی زراعت کا۔

سوویٹ یونین کے تمام صناع جنگی مورچوں پر جانے اور سرخ فوجوں کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کرتے تھے۔ تمارہ نے بھی تمام مورچوں کا دورہ کیا۔ سوویٹ قومیتوں کے سرخ سپاہیوں نے جب اپنے قومی رقص کی تعبیر تمارہ کی صناعت میں دیکھی اور اپنے عوامی گانوں کی اسپرٹ تمارہ سے سنی تو ان کو اپنے اندر جرمن بھیڑیوں کو فنا کر دینے کا تازہ حوصلے کا احساس ہوا۔ تمارہ کے رقص کی دلنشین ادائیں ان سرخ فوجیوں کی نظر میں جنگی حکمت عملی کے اشارے تھے اور اس کے گلے کی موسیقاری فتح و ظفر کی بشارتیں تھی۔

اسٹیج کے لباس میں تمارہ بلاشبہ ایک نہایت جاذب و دلکش ہستی بنجاتی ہے لیکن وہ اپنے مکان پر سادہ ازبک لباس میں اس سے زیادہ دلفریب ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھریلو لباس میں نسبتاً کم عمر نظر آتی ہے۔

تمارہ کے کمرے میں ایک چھوٹا سا دوتارہ ہمیشہ رہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ملاقاتیوں سے باتیں کرتے کرتے بلا ارادہ وہ اس دوتارے کو اٹھا کر گود میں رکھ لیتی ہے اور بالکل بے خیالی میں کبھی کبھی اس کے تار کو چھیڑ دیتی ہے اور تاروں کی یہ گونج ایک عجیب پس منظر پیدا کر دیتی ہے۔ تمارہ کے ہاتھ عادتاً نچلے نہیں رہ سکتے۔ وہ دوتارے کو نہیں چھوئے گی تو گلے کے موتیوں سے کھیلے گی یا اشاروں سے زیادہ کام لے گی۔ اس وقت تمارہ کے خوبصورت ہاتوں کے یہ اشارے بھی رقص کی حرکتیں معلوم ہوتے ہیں۔

تمارہ نے مختلف قوموں اور ملکوں کے ساز، لباس اور زیور کثرت سے جمع کئے ہیں۔ ان سازوں لباسوں اور زیوروں کی تیاری ان ملکوں ہی میں ہوئی جہاں وہ استعمال ہوتے ہیں۔ اور تمارہ جب اس قوم کے رقص اور نغمے سناتی ہے تو وہی لباس پہنتی، وہی زیور پہنتی اور وہی ساز بجاتی ہے۔ وہ اپنے ملاقاتیوں کو یہ سب چیزیں بڑے شوق سے دکھاتی ہے۔ زیوروں کے معاملہ میں تمارہ سو فیصدی ایک مشرقی عورت ہے۔ اس کا یہ ذخیرہ کسی عجائب خانہ کے لئے وجہ رشک ہو سکتا ہے۔

لیکن یہ سمجھ لینا کہ تمارہ لیس ایک ماہر فن ہے اور اس کا تمام وقت اس فن کی خدمت میں صرف ہوتا ہے، غلط ہوگا۔ اس کی پبلک مصروفتیں بھی ہیں۔ وہ ازبک جمہوریت کی سپریم سوویٹ کی ممبر بھی ہے، اور کلینین اجتماعی کاشت کے حلقے والوں نے اسے منتخب کیا ہے۔ اس حلقے میں چون اجتماعی کاشت کے فارم ہیں۔ جہاں کنڈر گارٹن اطفال خانے اور اسکول ہیں۔ ان اطفال خانوں میں آج بھی ہزاروں بیلوروسی اور یوکرینی یتیم و بے خانماں بچوں کی پرورش اور تعلیم ہو رہی ہے۔ ان بچوں کی تمام غور و پرداخت ازبک عورتیں کر رہی ہیں۔ تمارہ کے حلقۂ انتخاب میں نئے پنجسالہ پلان کے مطابق نئی نئی فیکٹریاں کھڑی ہو رہی ہیں، نئی سڑکیں بن رہی ہیں اور ان تمام کاموں میں تمارہ اتنی ہی گہری دلچسپی لیتی ہے جتنی وہ نغمہ و رقص کی صناعت میں لیتی ہے۔ وہ ان تمام ترقیوں کا ذکر اپنے ملاقاتیوں سے کرتی ہے اور ان تمام ترقیوں پر مسرور و مفتخر بھی ہے۔

تمارہ اپنے فن و کمال کی نمائش کے لئے دورہ کرتی رہتی ہے۔ مگر دورے سے واپس آکر اپنے حلقۂ انتخاب میں ضرور جاتی ہے۔ اس کے آنے کی خبر پاکر سارے حلقے سے عورت مرد۔ بوڑھے بوڑھیاں، اونٹوں، خچروں اور چھکڑوں غرض ہر ممکن سواری پر یا پیدل چل آتے ہیں۔ اور تمارہ انھیں اپنے سفر کے حالات سناتی ہے۔ پھر رات کو مشعلوں کی روشنی میں وہ نئے نئے رقص اور نئی دھنیں سناکر اپنے مہمانوں کی تواضع کرتی ہے۔ تمارہ کے یہ دہقانی دوست روسی اور ایرانی گانے بڑے شوق سے سنتے ہیں حالانکہ وہ یہ دونوں زبانیں نہیں جانتے۔ مگر تمارہ کا نرت تلفظ اور اشارے اس کے رقص و نغمے کو ان کے لئے اس طرح قابل فہم بنا دیتے ہیں جس طرح انگریزی فلم ہمارے عوام کے لئے قابل فہم بن جاتے ہیں۔

تمارہ کو جتنی محبت اپنے فن و صناعت سے ہے اتنا ہی اسے اپنی پبلک زندگی کے فرائض کا احساس ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ گھریلو زندگی میں بھی اتنا ہی شغف اور دلچسپی رکھتی ہے۔ ابھی وہ بالکل نو عمر تھی کہ خوزم میں ایک اندھی بڑھیا کے بچے کو گود لے لیا۔ پھر خود اس کے دو لڑکیاں

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

عمر خیام نیشاپوری ‖ دو آتشہ ‖ صفی لکھنوی

طلوعِ صبح و صلائے میکشی

آمد سحری ندا ز میخانۂ ما
کای رند خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

میخانے سے آئی یہ دمِ صبح ندا
اے رند خرابات ہمارے شیدا
اٹھ جام کو تیرے مے سے کر دیں لبریز
قبل اس کے کہ پیمانہ ہو لبریز اپنا

مستی

از بادۂ ناب لعل شد گوہر ما
آمد لب غنچان ز دست ما ساغر ما
از بسکہ ہمی خوریم مے بر سر مے
ما در سر مے شدیم و مے در سر ما

ہے لعل مے ناب سے سرشت گوہر
سرگرم فغاں ہمارے ہاتھوں ساغر
پیتے رہتے ہیں مے لگاتار جو ہم
ہر دم صفتِ جام ہے سر کو چکر

ضبطِ نفس

تا بتوانی رنجہ مگردان کس را
بر آتش خشم خویش منشان کس را
گر راحت جاوداں طمع میداری
می رنج ہمیشہ و مرنجان کس را

جب تک ممکن ہو تو کسی کو نہ ستا
اور آتشِ قہر سے کوئی دل نہ جلا
ہو راحتِ جاوداں جو تجھ کو مطلوب
خود رنج اٹھا نہ دے کسی کو ایذا

بیوفائی دنیا

عاقل بکہ امید درین شوم سرا
بر دولت او نہد دل از بہر خدا
ہرگاہ بخواہد کہ نشیند از پا
گیرد اجلش دست کہ بالا بنیا

منحوس جگہ ہے یہ سرائے دنیا
عاقل ہے اگر تو اس سے تو دل نہ لگا
موت آکے وہیں ہاتھ پکڑتی ہے کہ اٹھ
جس وقت کوئی قصد کرے بیٹھنے کا

حیرت اندوزی لاعلمی

ہر چند کہ رنگ و روی زیباست مرا
چون لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طربخانۂ خاک
نقاش من از بہر چہ آراست مرا

دلکش ہی سہی رنگ و رخ یہ مانا
رخسار ہے گل سرو سے قد زیبا
دنیا کے طرب خانے میں معلوم نہیں
نقاش نے کیوں نقش سنوارا میرا

مآل اندیشی

با بط میگفت ماہیی در تب و تاب
باشد کہ بجوی رفتہ باز آید آب
بط گفت چو من و تو گشتیم کباب
دنیا پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب

مچھلی نے کہا بط سے بحالِ تب و تاب
پھر نہر میں شاید کہ پلٹ آئے آب
بط نے کہا ہم تم ہوئے جب وقت کباب
دنیا ہو ہمارے بعد دریا کہ سراب

ترغیبِ عیشِ نقد

روزی دو کہ مہلت است مے نوش مے ناب
کاین عمر دو روزہ در فنا ہی دریاب
دانی کہ جہان رو بخرابی دارد
تو نیز بشغب روز زمے باش خراب

مہلت کے ہیں دو دن اسے دے دو شراب
پھر عمر دو روزہ کا نہ دیکھے گا خواب
جب رو بخرابی ہے جہان فانی
رہتا نہیں کیوں آٹھ پہر مست و خراب

چند رباعیات خیام مع ترجمۂ منظوم بتحفظ جملہ حقوق تالیف و تصحیح و تصنیف وغیرہ۔

ابابیل نما ہوائی جہاز

حال ہی میں بالکل ابابیل سے ملتے جلتے ہوائی جہاز بنائے گئے ہیں جن کو بنانے والے کے نام پر «ڈی ہیویلینڈ» کہا گیا ہے اس کے پہلے نمونے کی تیاری پچھلے سال اکتوبر میں شروع ہوئی اور مکمل ہونے کے بعد وہ ۱۰ مئی کو پہلی بار ہوا میں اڑا۔ برطانیہ کے سپلائی منسٹر مسٹر جان ولموٹ نے بتایا کہ ایک ایسا ہوائی جہاز برطانیہ کے فضائی محکمے نے خریدا ہے۔ اس کا وزن تقریباً پچھتر ہزار پونڈ ہے۔ وہ بحراوقیانوس کے پار مسافروں کو چھ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے لیجانے کے کام آئیگا۔

نئے نمونے کا جہاز نمبر ڈی۔ ایچ ۱۰۸ تیزی سے اڑ رہا ہے۔ اس کے پر ۳۰ درجہ کے زاوئے میں ہیں۔ دم کی جانب ابھرا ہوا حصہ قابلِ غور ہے۔
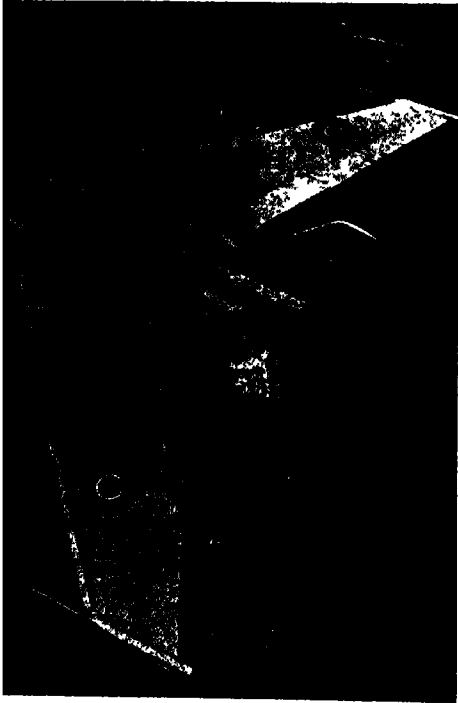
یہ ہوائی جہاز ہیٹ فیلڈ کے ہوائی مرکز پر اترا ہوا ہے اسے دیکھکر اسکی بیرونی بناوٹ کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی جہاز کے پچھلے حصے کا ایک منظر گول خول کے اندر لگے ہوئے انجن کی قوت بارہ ہزار گھوڑوں کی قوت کے برابر ہے۔ اسکی رفتار ہونے
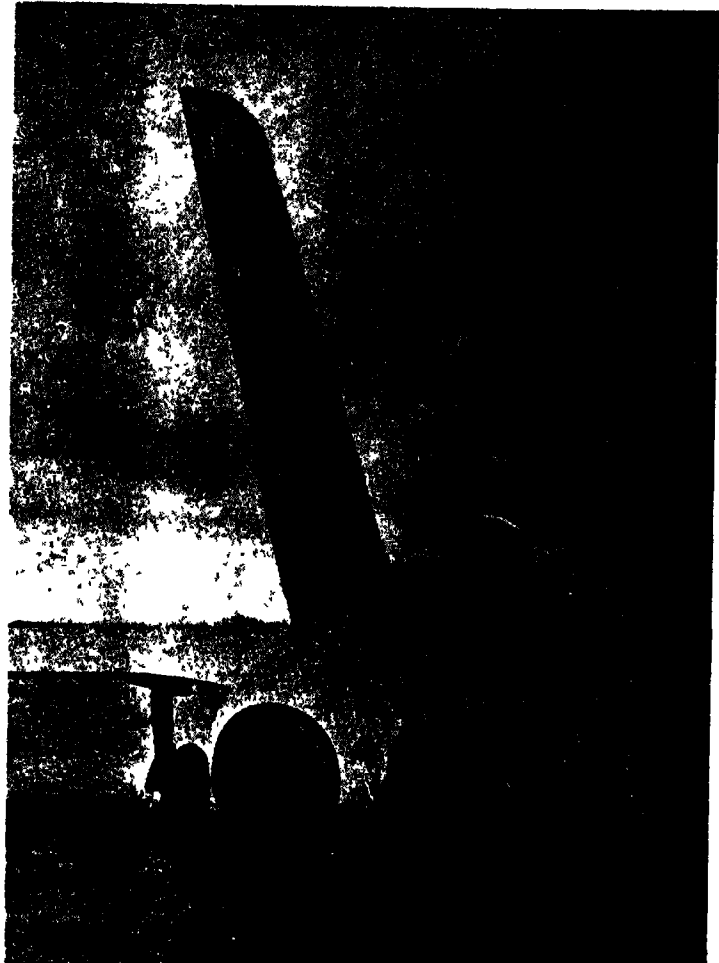
ان دو نر گرگٹوں کی لڑائی کا سبب ایک مادہ گرگٹ بنی ہوئی ہے۔

افریقہ کے گرگٹ

گرگٹ چھپکلی ہی کی جنس کا جانور ہے۔ البتہ یہ چھپکلی سے ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اس صفحہ پر جن گرگٹوں کی تصویریں دی گئی ہیں یہ مشرقی افریقہ کے ہیں اور آجکل لندن کے چڑیا گھر میں ہیں۔ گرگٹ رنگ بدلنے میں کمال رکھتا ہے۔ اسکی یہ بات اسقدر مشہور ہے کہ "گرگٹ کے سے رنگ بدلنا" ہماری زبان کا ایک محاورہ بن گیا ہے۔ سبز' زرد' بادامی' سیاہ اور سفید رنگ اور ان رنگوں کے میل سے جو

ایک گرگٹ دوسرے پر غالب آچکا ہے اور اب اسکو گرا ہی دینے والا ہے

رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ تو بڑی آسانی سے بدل لیتا ہے مگر نیلا اور سرخ رنگ بدلنا اسکے بس کا نہیں ہے۔

گرگٹ اپنی صورت سے جسقدر خوفناک معلوم ہوتا ہے دراصل اسقدر ہوتا نہیں اور یہ افریقائی گرگٹ تو سینگوں کی وجہ سے بہت ہی ہولناک معلوم ہوتے ہیں ڈراؤنے تو یہ ضرور ہیں لیکن ان کے کاٹے سے آدمی مر نہیں سکتا۔

بکوں کی دستکاریاں

بخارا کا یہ بوڑھا کاریگر اپنے شاگردوں کو تابے
کے طباقوں میں نقش کھودتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

یہ قالین انہی عورتوں کا بنا ہوا ہے۔ بیچ میں میکسم گورکی کی
شبیہہ بنائی ہے کیونکہ یہ قالین ترکمانیہ کے ادیبوں کی طرف سے
ماسکو کے ادیبوں کو بطور تحفہ کے دیا جانے والا ہے۔

سائنس کی ترقی اور نئے نئے کل پرزوں کی ایجاد کی وجہ سے
بہت سی دستکاریوں کو زوال ہو گیا ہے۔ اب نہ تو کاریگر اتنی
محنت کرتے ہیں اور نہ خریدار انکی محنت کی قدر کرتے ہیں
ایک بات یہ بھی ہے کہ ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں مشین سے بنی ہوئی
چیزوں سے مہنگی بھی پڑتی ہیں۔ پھر بھی بعض ایسے ہنر ہیں جنکی
ابتک قدر ہوتی ہے کیونکہ مشین سے وہ بات بھی پیدا نہیں ہوتی مثلاً
تانبے کے برتنوں پر نقش کرنا، سنگتراشی اور قالین بافی۔
دستکاریاں ایشیائی روس میں بہت رائج ہیں۔

بوڑھا سنگتراش استاد شیرین مرادوف اپنے شاگرد

یہ عورتیں 'ولیکی سوروشنتسی' کی رہنے والی ہیں

وچ بھی ایسا ہی ہے جیسا ہمارے گھروں میں ہوتا ہے لیکن یہ سوچ ایک لاکھ والٹ کرنٹ پر کنٹرول رکھتا ہے۔

بمبئی میں بجلی کی پیداوار

صنعت و حرفت کے اعتبار سے بمبئی ہندوستان کا ایک بہت ہی ترقی یافتہ شہر ہے۔ اسکی ترقی کا راز بجلی کی بہتات اور ارزانی ہے۔ یہاں برق آبی کے تین بڑے اڈے ہیں۔ ان تینوں کا انتظام ٹاٹا کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ ایک اڈے کیلئے پانی بارش سے جمع کیا جاتا ہے۔ باقی دو کیواسطے دریاؤں پر بند باندھے گئے ہیں۔ بمبئی میں بجلی سے کارخانے چلتے ہیں، شہر میں روشنی ہوتی ہے، ٹرامیں اور ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ حقیقت میں بجلی ہماری موجودہ

بھیرا کا بجلی گھر۔ یہاں پانی کے پائپ ایک میل لمبے ہیں۔
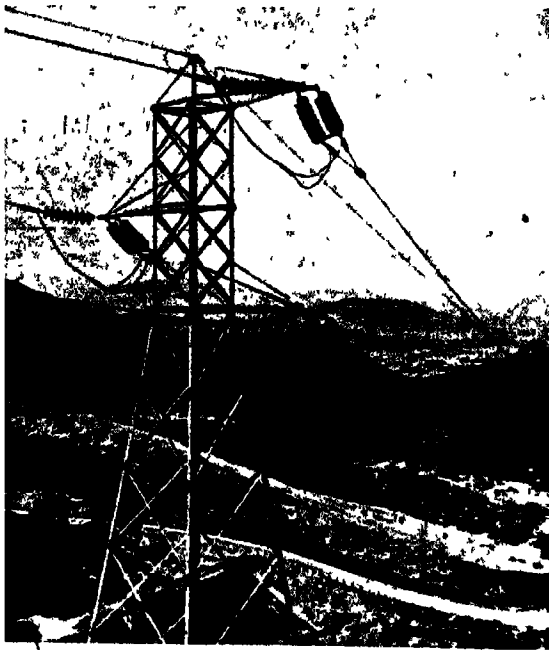
بجلی کے حفاظتی تار
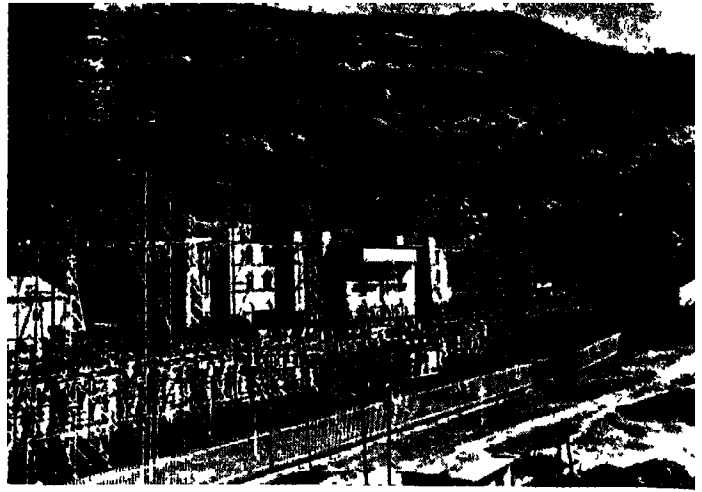
کھوپولی کا بجلی گھر

بجلی پیدا کرنے کے واسطے پہاڑوں میں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع کیا جاتا ہے۔
(نیچے) یہ لمش کا بند ہے۔

آسٹریلیا کی مٹی کی مورتیار

یہ کاریگر آسٹریلیا کے ایک قدیم باشندے
کا سر بنا رہا ہے۔

...رنی اشاریت لئے ہوئے ہے۔ اسکا موضوع ہے
...ریلیا میں قدیم اور گورے باشندوں کا مستقبل،

...ت کے ٹیلوں کی دیوی خوش ہو رہی ہے۔

[illegible]
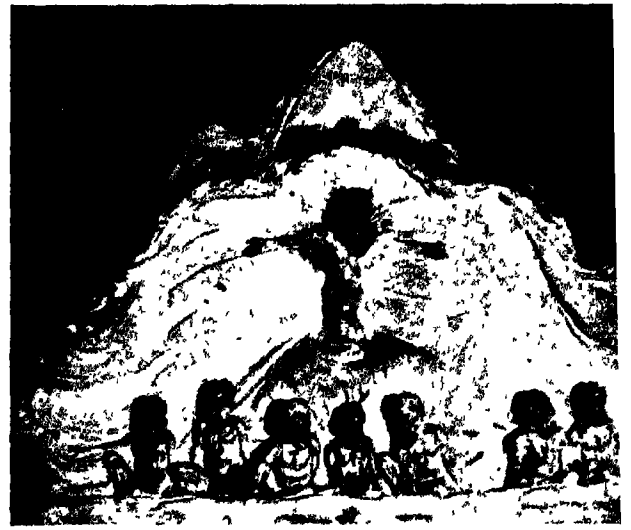
پتھریلے راستہ کے اوپر پتھروں کے ڈھیر
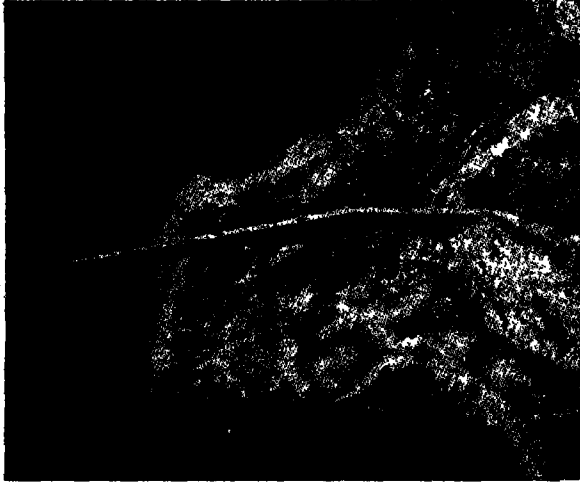
جب ہر سال دریائے نیل میں سیلاب آتا ہے تو پتھریلے راستہ کے پاس بہت بڑے بڑے پتھر بہہ کر آجاتے ہیں۔

یہ ڈھلواں فصیل اتنی بڑی ہے جتنے خود اہرام ہیں۔

پارو -- ایک نئی فلم اسٹار

ریختی اور جان صاحب

مشیر احمد
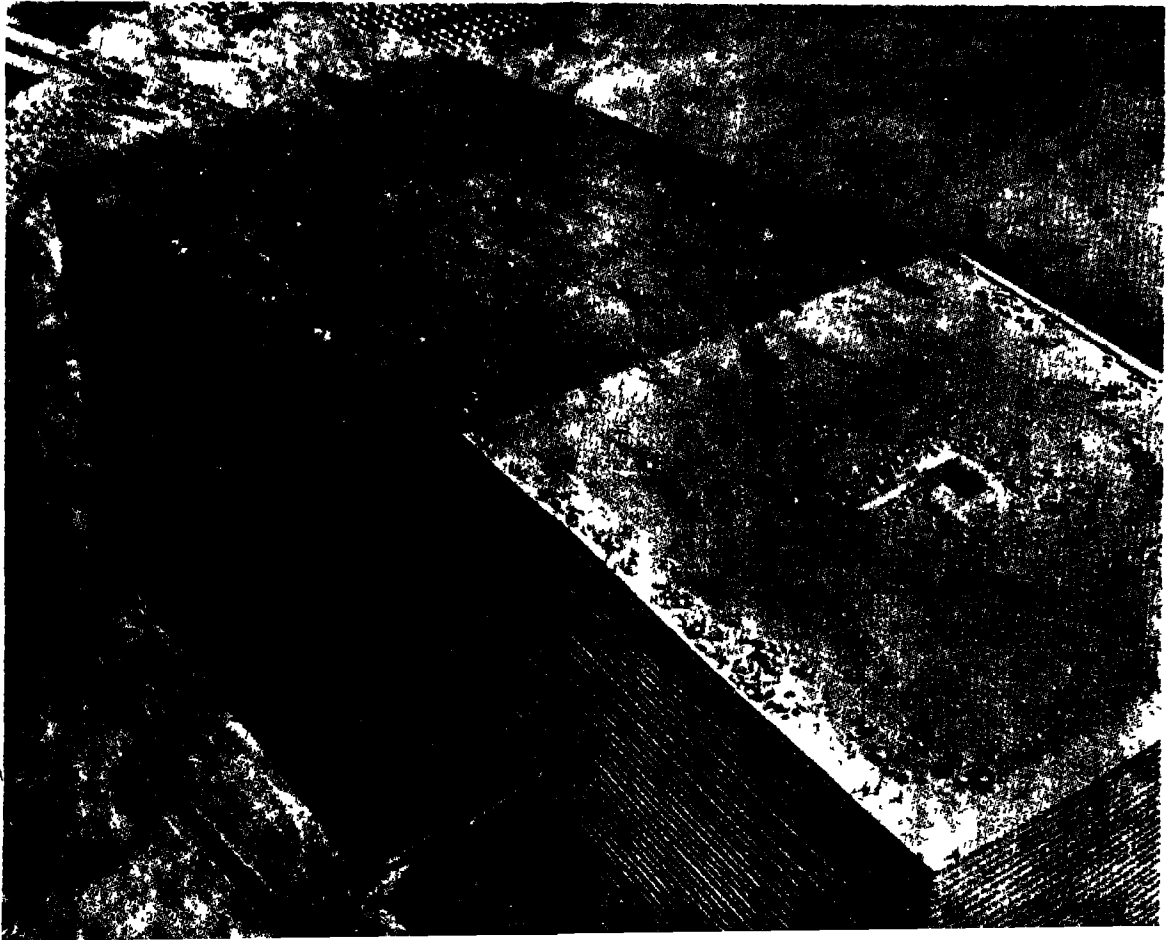
اردو کا قدیم نام ریختہ ہے۔ غزل ریختہ میں ہر کا مخاطب مرد سے یا عورت سے ہوتا ہے لیکن ریختی میں (غزل کے برخلاف) مخاطب عورت ہوتی ہے اور مخاطب مرد۔ اس میں زبان اور محاورے زنانہ ہوتے ہیں اور خیالات اور جذبات بھی عورتوں کے۔ قدما میں ریختی گو شاعر دو ہوتے ہیں: ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادر خاکی۔ لیکن ان کی ریختی کو کوئی مستقل اور باقاعدہ صنف کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ ان کے اشعار ہندی گیتوں کے محض تتبع میں کہے ہوئے ہیں۔ ہاشمی کا ایک شعر قارئین کی دلچسپی کیلئے درج کیا جاتا ہے:

رضا گر جگوں دنیے ہو کر بن کی گھر جا دو رو   اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح پھر آؤں گی چھوڑ دو

ریختی کے اصل موجد سعادت یار خاں رنگین ہیں۔ مرزا قادر بخش صابر نے "گلستانِ سخن" میں اس کی ایجاد کا سہرا سید انشا کے سر رکھا ہے اور یہی خیال صاحب تذکرہ "مہر جہانتاب" کا ہے لیکن "دریائے لطافت" میں خود سید انشا نے یہ فضیلت میاں رنگین ہی کو بخشی ہے۔ رنگین سید انشا کے ہمعصر ہم مذاق اور خاص دوست تھے اور نواب آصف الدولہ کے عہد کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر۔ اگرچہ دہلوی تھے لیکن ان کا قیام لکھنؤ میں اتنا زیادہ رہتا تھا اور اہل لکھنؤ سے ان کو اس قدر ربط و ضبط تھا کہ ان کا شمار شعرائے لکھنؤ ہی میں ہوتا ہے۔ شہزادوں میں مرزا سلیمان شکوہ سب سے پیش پیش تھے۔ رنگین کو ان سے اور ان کو رنگین سے خاص لگاؤ تھا۔ اکثر بڑی گرمجوشی کی محفلیں گرم رہتی تھیں دونوں خوب خوب داد فن دیتے تھے۔ رنگین خود تجارت پیشہ اور مرفہ الحال تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ کو غم و فکر سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انشا فطری کھلنڈرے تھے اس پر آصف الدولہ کی صحبت اور ناز برداری سونے پر سہاگہ۔ غرض ان کی چلبلی طبیعت کو اور بھی شہ ملی اور پھر انھوں نے ایسے ایسے گل کھلائے جن سے اس زمانہ کے ہر شخص کا مشامِ جان معطر و مفرح ہوا۔

رنگین اور انشا کے بعد ریختی کو جس باکمال نے سب سے زیادہ فروغ دیا وہ جان صاحب کی ذات تھی۔ ان کا نام میر یار علی تھا۔ ان کی زندگی کے حالات زیادہ تفصیل سے دریافت نہیں ہو سکے۔ آپ کے اصل وطن کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے کوئی میرٹھ لکھتا ہے، کوئی لکھنؤ اور فرخ آباد۔ غالباً آپ فرخ آباد ہی میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا زیادہ حصہ لکھنؤ میں گزارا۔ لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ خم خانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ آپ تلاشِ معاش میں لکھنؤ سے دہلی آئے اور یہاں سے مایوس ہو کر بھوپال گئے لیکن قسمت خراب تھی وہیں چین نہ ملا اور ہار کر پھر لکھنؤ ہی چلے گئے۔

مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ ان کے والد کا نام میر امن تھا اور یہ نواب میر عاشور علی خاں کے شاگرد تھے۔ جب لکھنؤ میں گزر اوقات کی کوئی سبیل نہ نکلی تو بھوپال چلے گئے اور وہاں رنگ نہ جمتا دیکھ کر اورنگ آباد کا رخ کیا۔ وہاں بھی خاطر خواہ کوئی سہارا نہ دکھائی دیا تو پھر لکھنؤ ہی چلے آئے۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ تاسی کو آپ کے کلام سے بڑا فحش مغالطہ ہوا ہے۔ وہ جان صاحب کو عورت سمجھ بیٹھا۔ اس نے لکھا ہے "جان صاحب ریختی لکھنے والی ایک عورت ہے بچپن ہی سے اس کو موسیقی اور ادب سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس کے کلام کا مجموعہ ۱۲۶۲ھ م ۱۸۴۶ء میں شائع ہوا تھا اس وقت اس کی عمر چھبیس یا ستائیس برس کی تھی۔ یہ مجموعہ بہت جلد ہندوستان کے خوش مذاق معاصروں میں پھیل گیا جس سے مصنفہ کی بڑی شہرت ہو گئی۔ یہ مجموعہ عورتوں کی اس شاعرانہ زبان میں لکھا گیا ہے جس کو ریختی کہتے ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شاعرہ نے شاعری کے تمام اصناف کی تذکیر بجائے تانیث کر دی ہے مثلاً غزل کو غزلی، مخمسہ کو خمسی وغیرہ ....."

ہر زمانہ کی پسند و ناپسند کا معیار جدا ہوتا ہے۔ ادبی مذاق میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے نظیر اکبرآبادی کو محض بحر گو سمجھا جاتا تھا اور قدیم تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے بھی ان کو اچھے الفاظ سے نہ یاد کیا لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہی میاں نظیر جن کا صرف "بنجارہ نامہ" بچوں کی درسی کتابوں میں داخل ہوتا تھا آج ہندوستان کے شیکسپیئر اور جدید ادبی تحریک یا ترقی پسند ادب کے سب سے بڑے پیش رو اور امام مانے جاتے ہیں۔ یہی حال جان صاحب کا بھی ہے یعنی ان کی اور ان کی ریختی کی طرف کسی بھی ثقہ تنقید نگار یا ادبیات کے مورخ نے کوئی اعتنا نہ کیا بلکہ ریختی کو فحش اور عریانی کا مترادف سمجھا۔

یہ خیال کہ ریختی محض بیکار صنف شاعری ہے جو پست مذاقی کی پیداوار تھی اور یہ کہ اس میں سوائے شہوانی خیالات اور رکیک جذبات کے کچھ نہیں ہے، ایک بالکل بے بنیاد خیال ہے اور محض سرسری مطالعہ اور سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ اگر ہمارے ثقہ نقاد نگار جان صاحب کے دیوان کا بغور مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ یہ نوابی عہد کے لکھنؤ بلکہ پوری سرزمین اودھ کا ایک مکمل "انسائیکلو پیڈیا" ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کی تمام رسومات، عقائد و اوہام، طور طریق، زنانہ محاورات، زیورات اور ملبوسات کی طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے جس پر ایک نظر ڈال لینے سے اس زمانہ کی معاشرت کی ایک جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جان صاحب نے محاورے خاص عورتوں کے استعمال کئے ہیں اور حق بھی یہ ہے کہ زبان میں لوچ اور شیرینی عورتوں ہی کے دم سے ہوتی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا

محاورہ بندی میں کمال رکھتے تھے بلکہ صرف زبان ہی کو شاعری کی جان سمجھتے تھے۔ جان صاحب نے بھی بیگمات اور مستورات کے محاورات بکثرت استعمال کئے ہیں لیکن دوسرے شاعروں کی طرح ان کے کلام میں آورد کہیں نہیں پائی جاتی۔ سادگی اور بیساختگی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا جس سے ان کے حسن خلاق اور سلامت مزاج کا ثبوت ملتا ہے۔ اشعار کے نمونے دینے کے بجائے بعض خاص خاص محاروں کی فہرست (مع ان کے عام فہم معنوں کے) ہدیۂ قارئین کیجاتی ہے۔

محاورہ یا روزمرہ	سہل معنی
بی بی کی جھاڑو پھیرنا	برباد ہو جانا
پا ئینچا بھاری کرنا	جم کر بیٹھ جانا
پاؤں بھاری ہونا	حمل سے ہونا
سینکے گز کی چال چلنا	زیادہ کفایت شعاری کرنا
پیچھے ہو	دُور ہو
حمایتی کے گھوڑے سے عراقی کو لات	کسی کی شہ پر بڑوں کا مقابلہ کرنا
سوکھے دھانوں پانی پڑنا	حالت کا سُدھر جانا
گلے میں کھٹکا ہونا	آواز میں لوچ ہونا
ابلا پری	خوبصورت عورت
آنکھ مندی	کنواری لڑکی
بالاپوش	لحاف
بڑی روٹی	قرآن شریف
سُحنت کی رات	شب عروسی
جھپ جھالیا	مکار، دغاباز
چھتیسی	چالاک
دو جیا	حاملہ
رومال ہونا	زکام ہونا
کہاری	کہاروں کی مزدوری
چُھچھی	بوسہ
بیٹھا برس	عورت کا اٹھارواں برس
بیٹھا مہینہ	حمل کا آٹھواں مہینہ

عیش پسند طبائع جی بہلانے کی نئی نئی صورتیں ایجاد کرتی ہیں جسنے بوڑھے اور آپس میں مل بیٹھنے کے بہانے سوچے جاتے ہیں میلوں ٹھیلوں کا بازار گرم رہتا ہے، نئی نئی رسمیں وجود میں آتی ہیں۔ جان صاحب کے زمانہ میں لکھنؤ عیش و عشرت کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ عاقبت سے بے خبر ہر شخص داد عیش دینے میں کھویا ہوا تھا۔ بچہ کی پیدائش سے لے کر بوڑھاپے

کی موت تک آئے دن رسمیں منائی جاتی تھیں۔ شادی کا موقع رسوم کے لئے سب سے زیادہ سازگار ہوتا تھا۔ اصل تقریب سے کئی کئی دن پہلے رسموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن ساچق کا مقرر ہوتا تھا تو ایک دن مہندی کا۔ بہن اپنے بھائی (دولہا) کے سر پر آنچل ڈال کر اپنا حق لیتی تو سالیاں اپنے "دولہا بھائی" کا جوتا چھپا کر نیگ پاتیں۔ کبھی چھتیسی کی پنڈیوں کی تیاری ہوتی تو کبھی پنجیری کی دھوم۔ جان صاحب نے ان سب رسومات کا ذکر بڑا مزہ لے لے کر کیا ہے آپ بھی لطف اندوز ہو جیئے:۔

جان صاحب آئی لو شادی جو بیگم جان کی   آج ساچق کل ہی مہندی پرسوں اسکا بیاہ ہے
ماں جلائی ہوں میں ڈالونگی آنچل ہے یہ میرا کام   جوتا چھپا کے نیگ لیں دولہ کی سالیاں
بھائی کا مرے بیاہ ہے ڈالوں گی میں آنچل   بنوادو کوئی اوڑھنی لچکے کی کرن کی
میرے بیری کھائیں چھتیسی کی سیلی پنڈیاں   لڈو بنواؤں گی لادو تل پہ پستہ مجھے

عقائد اس زمانہ کے خاص طور پر بگڑے ہوئے تھے۔ ذرا ذرا سی بات کا وہم کیا جاتا تھا طرح طرح کی منتیں مانی جاتی تھیں، ہر روز نذر نیاز ہوتی تھی اور آئے دن روزے رکھے جاتے تھے۔ خواب میں دریا دیکھا اور جی دہل گیا، چھت کی کڑی بولی تو گھر ہی چھوڑ بھاگے، ماتھا ٹھنکا اور پریشان ہوئے، سہرے کی لڑی ٹوٹی اور خیر بہ خیر، مہمان آنے کے تیسرے دن جانے کا نام لیتا تو میزبان کو وہم آتا، منگل کے دن کوئی بچہ کو مارتا تو وحشت سوار ہو جاتی، کسی سے بگاڑ ہوا اور چولھے میں تعویذ گڑا، کوئی مشکل آپڑی تو مسجد کے طاق بھر دئیے، سید جلال کا کونڈا ابھرا جاتا، بی آسا کے نام کا چھلا اٹھایا جاتا غرض اوہام زندگی کا جزو اعظم بن چکے تھے۔ خاص طور پر عورتیں ان سے بہت زیادہ متاثر تھیں پھر بھلا جان صاحب کی ریختی کا دامن ان کے ذکر سے کیسے تہی رہ جاتا۔ ان سب باتوں کا ذکر کیا ہے اور خوب خوب کیا ہے:۔

پریوں کا طبق چھوڑونگی دیوانی نہ ہو جاؤں   کچھ کھوٹ ہے جو خواب میں دریا نظر آیا
چلا باندھا ہے کہ ناڑا کھلے منت یہ ہے   رکھا روزہ جو دوگانہ نے ہزاری مرزا
نکلی ہے کھوٹ شیخ کی گرفال میں بوا   چھلا اٹھاؤ دھو کے بی آسا کے نام کا
کوٹھے میں رہو آکے یہ دالان کرو ترک   بی بولنا منحوس ہے اس چھت کی کڑی کا
ہو خیر دولہن دولہ کی ماتھا مرا ٹھنکا   اچھا نہیں یہ ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا
تیسرے دن نہیں جاتے ہیں کسی کے گھر سے   اور جاؤ بھلا آج کا دن آج کی رات
سوت کے منہ کو لگے سات کونڈی کی کالک   میرے چولھے میں اسی نے ہے گڑا تعویذ
اکیلی جاؤ جو مسجد میں طاق بھرنے کو   دوگانا جان تمہیں جھک کے ہم سلام کریں
منگل کا دن ہے سنا ہو جائے گی وہ دلہن   بچی کو میری دیکھو مارو نہ تم طمانچے

اخلاقی حالت بہت پست ہو گئی تھی۔ رنڈیوں کے بالاخانوں کی گرد شہر زندگی کے معمولوں میں داخل تھا۔ طوائفوں کی ناز برداریاں بیگمیں اور بیبیاں

گھروں کے کونوں میں پڑی سڑتیں، باہر والیوں کو زیور سے لادا جاتا اور اپنی بیوی ایک ایک چھلے کو ترستی۔ مرد دو دو عورتیں رکھتے تھے اور سوکنوں میں خوب جوتا چلتا تھا لیکن جیت آنے والی ہی کی ہوتی تھی۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن کبھی کبھی حضرت شوہر کی بھی اچھی طرح مرمت ہو جاتی تھی۔ عورتوں کو زیورات اور اچھے کپڑوں کا بہت شوق تھا۔ ہر روز ایک نئے زیور اور نئے کپڑے کی فرمائش ہوتی تھی۔ جان صاحب نے ان عیوب کا ذکر تفریحاً نہیں کیا ہے بلکہ ان کے بیان میں بڑا گہرا طنز ہے اور انداز میں ایک میٹھا درد۔ اس موقع پر تو وہ ایک اچھے خاصے مصلح اخلاق اور ناصح خیر اندیش نظر آنے لگتے ہیں:۔

خصم دو جورو نکالے ہوا جو سر کا پانی ہے مدعی جس سے کرے گا سامنا ہو وے گا ذلت کا
سوت کیسی خود ہوا دلبر وہ سوکن ہو گیا جان صاحب جان کا بندی کی دشمن ہو گیا
مرد و رنی کے عشق میں شاید سڑی ہوا گھر نالا پوچھنا ہے جو دیوار کا مزاج

نگوڑے مردوئے کیا کیا گناہ کرتے ہیں حواب جان کے عقبیٰ کی راہ کرتے ہیں
زناخی نوج کسی کو میں آج کل دوں دل موئے نعاختے دو دن کی چاہ کرتے ہیں
کیٹرن پہ ڈالی آنکھ مرے دل سے گر گئے اپنے چلن سے آپ ہوئے وہ حقیر ہیں

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر بد چلن مرد اپنی بیویوں پر بڑی بڑی سختیاں کرتے تھے۔ کبھی تو یہ اپنے میکے جا بیٹھنے کی دھمکی دیتی تھیں اور کبھی چپ چاپ وہیں سارے ستم سہتی تھیں لیکن شوہر کی بدنامی ہرگز نہ چاہتی تھیں:۔

اپنی رنڈی کے لئے مجھ سے لڑے تم چھیڑ کر کیا مری تقصیر تھی تم نے جو مارا رات کو
منگا دو مجھے ڈولی میکے کو جاؤں۔ تمہارے لئے کچھ برائی نہ ہو گی
قیامت کا دن یاد رکھو نہ بھولو وہاں کیا خدا کی خدائی نہ ہو گی

کتنا درد ہے! کیسا ایثار ہے اور کیسی لاچاری ہے!

اس زمانہ میں لکھنؤ میں روپیہ کی بڑی ریل پیل تھی لیکن اکثر مرد اپنے کرتوتوں کے باعث مفلس کنگال ہو جاتے تو کبھی ان کا زور بیچاری عورت ہی پر چلتا اور اس کا زیور مہاجن کی نذر کر ڈالتے۔ عید بقر عید پر بیوی زیور چھڑا لانے کا تقاضا کرتی لیکن ان کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی بہانے سنتے سنتے جب عورت تنگ آ جاتی تو صاف صاف کہہ اٹھتی:۔

گیا تھا گنگا مہاجن آتے ہی پہنچا بالے لیا کیسے نہ بالے بالے بتا و جیسا منگا دو بالے مرے چھڑا کر

اور کبھی مہاجن کو کوس ہی کے چپ ہو رہتی ہے ؎

بجلی گرے الٰہی مہاجن کی جان پر کیا پڑ گئیں کھٹائی میں کانوں کی بالیاں
چاندی کا تار تم کو نہ لانا ہوا نصیب سونے کا میر لے گئے زیور اتار کے

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر جولین ہکسلے

ذو کرہ ملن

{ ڈاکٹر جولین ہکسلے ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے اسکول اور یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم ممتاز طریقہ پر حاصل کرنے کے بعد آج تک جبکہ وہ اقوام متحدہ کی ابتدائی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے علم الابدان میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں کئے ہیں اور بہ حیثیت ایک مصنف کے ایسا ممتاز درجہ پایا ہے کہ اس مقالہ کا ہر فقرہ آپ کی ایک نہ ایک کامیابی کی داستان ہے }

ایٹن کالج میں پڑھائی کے آخری سال میں ڈاکٹر ہکسلے کو جو آج اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مجلس کے سکریٹری ہیں، "پونٹری" علم الابدان اور شیکسپیئر کے خاص مطالعہ پر انعامات ملے۔ یہ انعامات اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس بات سے یہ ثابت ہوا کہ آپ کی دلچسپیاں اس قدر ہمہ گیر ہیں اور یہ امر اور بھی مہتم بالشان تھا۔

لیکن ہکسلے کی بڑائی انہی تین باتوں پر ختم نہیں ہو گئی کیونکہ یہ ہونہار مصنف اور ماہر علم حیوانات کسرتِ جسمانی میں ممتاز تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہکسلے بلیلیل برکین بری، اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہاں بھی وہی دلچسپیاں قائم رہیں جو ایٹن میں تھیں۔ امتیازی شان بھی وہی قائم رہی۔ آپ نے پہلا مقالہ جس پر اپنا نام لکھا تھا چھت پر چڑھنے کے ہنر پر لکھا تھا۔ یہاں آپ کو "انگلش ورس" (انگریزی شاعری) میں "نیوڈی گیٹ پرائز ملا" اور "آنرز اسکول آف زولاجی" میں فرسٹ کلاس پائی۔ زمانۂ طالب علمی کی آپ کی ہمہ گیر قابلیت زمانۂ مابعد میں بھی آپ کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

ہکسلے کی خصوصیت کی ایک وجہ بیشک آپ کی خاندانی روایات بھی ہیں۔ آپ کے دادا طامس ہنری ہکسلے تھے جو انیسویں صدی میں ڈارون کے ساتھ بدنیات کے نظریہ کے پیش رو تھے اور آپ رگبی اسکول کے مشہور ہیڈ ماسٹر طامس آرنلڈ کے پڑنواسے تھے۔ مشہور نقاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ آپ کے دادا کے بھائی تھے۔ عہد وکٹوریہ کی مشہور ناول نگار مسز ہمفری وارڈ کے بھتیجے تھے گویا آپ کا تعلق اس خانوادہ سے تھا جس میں سائنسی اور علمی تخلیقی کام روزانہ زندگی کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے۔ خیال اور اظہار خیال کی آزادی آپ کے خاندان کی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی تھی اور نئی دریافتیں اور آزاد خیالیاں حیات انسانی کا ایک جائز حق مانی جاتی تھیں آپ کے کارہائے نمایاں کا سنگ بنیاد آپ کی ابتدائی عمر کا وہ جوش وولولہ تھا جو آپ کے دل میں اڑتی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر پیدا ہوتا تھا اور شاعری سے عشق بھی چودہ ہی برس کی عمر میں پیدا ہو گیا تھا۔ آکسفورڈ چھوڑ کر جب آپ نیپلز میں "میرین بایولوجیکل اسٹیشن" پر ریسرچ کرنے گئے تو تعمیر اور نقاشی کے فنون میں آپ کو ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔

اٹلی میں ایک سال کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے بعد ہکسلے کے دماغ کو اور زیادہ جلا ہو گئی اور وہ بلیلیل کالج میں علم الحیوانات کے لکچرار ہو کر آ گئے۔ وہ اس جگہ پر دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد جرمنی میں سال بھر ریسرچ کر کے وہ ہاؤسٹن (امریکہ) کے "رائس انسٹی ٹیوٹ" میں چلے گئے۔ اپنے تین سال کے قیام کے دوران میں آپ امریکہ کے تمام چوٹی کے ماہرین بدنیات سے واقف ہو گئے خاص طور پر ٹی۔ ایچ مورگن کے ابتدائی کارناموں کا بخوبی جائزہ لیا۔ علاوہ ازیں آپ کو ایک اعلیٰ درجہ کے تعلیمی ادارے کے قائم کرنے کا تجربہ بھی ہو گیا۔ تین سال تک آپ فوج میں رہے اور اس طرح آپ کی علمی زندگی میں ایک عارضی خلل پڑ گیا۔

اس کے بعد آپ پھر ۱۹۱۹ء میں آکسفورڈ میں نیو کالج کے فیلو اور یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانیات میں سینئر ڈیمونسٹریٹر ہو گئے۔ آکسفورڈ میں پانچ سال اور گزار کر آپ کنگز کالج لندن میں شعبۂ حیوانیات کے پروفیسر ہو گئے اور اس جگہ پر دس سال تک کام کرتے رہے۔ آپ کی دلچسپیاں بہت بڑھ گئیں اور ۱۹۲۷ء میں آپ نے محسوس کیا کہ پروفیسری کی ذمہ داریاں اور بڑی بڑی کلاسوں کو پڑھانے کا بار آپ کے مشاغل میں حارج ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے پروفیسری سے استعفا دے دیا۔ اور اعزازی عہدۂ لکچراری قبول کر لیا۔ ۱۹۳۵ء تک آپ بالکل آزاد رہے لیکن اس سال آپ نے لندن کی زوولاجیکل سوسائٹی، کا عہدۂ سکریٹری منظور کر لیا۔ اب آپ کو اپنے شوقوں میں مزید اضافہ کا موقع ملا اور باغات کی طرف ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ۱۹۴۲ء میں ہکسلے نے اس سوسائٹی سے قطع تعلق کرنے کی سوچ لی۔ اس وقت سے لے کر اس وقت تک جبکہ آپ کو اقوام متحدہ کی سائنسی، ثقافتی اور تعلیمی مجلس کا سکریٹری بنا دیا گیا ہے آپ بالکل آزاد رہے۔

اپنی تعلیم کے ابتدائی زمانہ سے لے کر آج تک ہکسلے نے سائنسی تجربات وغیرہ کے سلسلہ میں جتنے سفر کئے ہیں صرف ان کا ذکر کر دینے سے آپ کے کارناموں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ کچھ ذاتی استعداد قابلیت اور کچھ حالاتِ گرد و پیش اور ملاقاتیوں کی صحبت، غرض ان

سب چیزوں نے مل کر آپ کی طبع رواں کو اور بھی زیادہ چابکدست اور تیز کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ خود بھی اپنے زمانہ کے سائنسدانوں اور مفکروں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے۔

جب ۱۹۱۰ء میں ہکسلے نے آکسفورڈ میں ریسرچ کا کام شروع کیا تو "توالد و تناسل" اور "انقلاب نوعی" کے نظریات نے ایک خاص قسم کی مشکوکیت پیدا کر دی تھی۔ لوگوں کی ڈارون کے نظریہ میں دلچسپی کم ہو چلی تھی۔ لیکن ہکسلے پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا اور آپ نے جانوروں کی جنسی حرکات سے نہ صرف ڈارون کے نظریۂ جنسی کو بہتر صورت میں ثابت کیا بلکہ آپ نے "انتخابات باہمی" کا نظریہ بھی پیش کیا۔ اسی ذیل میں جو فلسفیانہ مضامین کا مطالعہ کیا تو "عضویاتی انفراد" کا نیا نظریہ بھی قائم کر دیا اور اس پر آپ نے ۱۹۱۱ء میں ایک کتاب بھی شائع کی۔

امریکہ میں آپ کی سرگرمیاں بدستور بلکہ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جاری رہیں۔ ۱۹۱۹ء میں فوج سے نکل کر جب آپ دوبارہ آکسفورڈ میں آئے تو آپ کا مذاق علمی اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ بلکہ جب آپ کا کام بہت ہی زیادہ بڑھ گیا تو اس کی بہت کچھ ذمہ داری آپ کے شاگردوں پر بھی عائد ہو گئی۔ "عضویات" اور "جنسیات" میں آپ کی ریسرچ جاری رہی اور آپ نے ہیوتی، انقلاب نوعی اور نفسیات میں نئے نئے نتائج اور نظریات قائم کئے۔ اس کے علاوہ ای۔ بی فورڈ کے ساتھ مل کر آپ نے "توالد و تناسل" کے بارے میں بھی اہم نتائج مترتب کئے۔ آپ نے تجربہ گاہوں کے اندر کام کرنے پر صبر نہیں کیا بلکہ پہلی دفعہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے تجرباتی جماعتوں کو لے کر باہر گئے اور علم نباتات میں بھی گرانقدر نئے نتائج کا اضافہ کیا۔

ہکسلے جہاں کہیں بھی جاتے تھے، نئے تجربات کی دھن آپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کی ریسرچ کی دھن ختم ہو گئی ہے۔ ابھی کوئی چار سال ہوئے آپ "جدید نظریات میں انقلاب" نامی ایک کتاب شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب ہکسلے کی کتابوں میں ایک بہت ہی ممتاز درجہ کی مالک ہے۔ یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ آپ باوجود دیگر گوناگوں مشاغل اور مصروفیتوں کے تجربی کام اس قدر زیادہ کر سکے۔ استاد کی حیثیت سے آپ یونیورسٹی کے طالب علموں اور عام پڑھنے والوں کو یکساں طور پر مستفیض کرتے رہے ہیں۔ طلباء کے لئے آپ نے اعلیٰ درجہ کی نصابی کتابیں مرتب کیں اور عام پڑھنے والوں کے واسطے عمدہ قسم کی دلچسپ اور پر از معلومات کتابیں اور مضامین لکھے۔ یہ خیال کہ سائنس صرف معدودے چند لوگوں کے لئے ہے اب دور ہوتا جا رہا ہے اور اس ضمن میں ہکسلے کے کارنامے بہت قیمتی ہیں۔ ہکسلے کی ایک اور اہم کتاب "دی سائنس آف لائف" ہے۔ یہ کتاب ایچ جی ویلز اور جی۔ پی ویلز کے ساتھ مل کر آپ نے ۱۹۲۹ء میں شائع کی تھی۔ ارتقاء کے مسئلہ پر بھی آپ نے فلسفیانہ طریقہ پر بہت ہی اہم باتیں لکھی ہیں۔

کتابیں لکھنے کے علاوہ ہکسلے انگلستان اور امریکہ میں لیکچر بھی بہت سے دے چکے ہیں آپ سینما کی دنیا سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ "گومنٹ برٹش انسٹرکشنل" کے مشورہ کار کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں اور ایک فلم کے پروڈیوسر بھی رہ چکے ہیں۔

ہکسلے کا اثر صرف سائنسی تعلیم ہی پر نہیں پڑا ہے بلکہ آپ نے سائنسی نظریات کے دھارے کا بھی رخ بدل دیا ہے۔ برطانیہ کے محکمۂ نو آبادیات میں آپ اب تک مشیر تعلیمات رہے اور اسی حیثیت سے آپ ۱۹۳۰ء میں مشرقی افریقہ تشریف لے گئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں مغربی افریقہ میں ایلیٹ کمیشن (برائے تعلیمات) کے رکن تھے۔ مشرقی افریقہ میں آپ نے جو تجربات کئے ان کو ایک بہت ہی دلچسپ کتاب "افریقن ویو" میں آپ نے مدون کر دیا۔ جب ہٹلری نازیت نے امن عالم میں رخنہ ڈالا اور نسلی نظریات سے دنیا کے معاشرہ کو تہ و بالا کیا تو ہکسلے ہی دنیا کو اس طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے کمربستہ ہوئے۔ آپ کی کتاب "ہم یورپی" آپ کی سیاسی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے۔

آپ کی علمی و ادبی دلچسپیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا یہاں تک کہ مذہبیات کے انقلاب پر بھی ایک مفید کتاب "مذہب بغیر الہام" لکھی۔

ہکسلے نے تقریروں اور کتابوں کے علاوہ بھی عام ثقافتی معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر غور کیا اور گتھیوں کو سلجھایا۔ آپ نے مشہور ادارہ "پی۔ ای۔ پی" (انجمن سیاسیات و اقتصادیات) کی بنا رکھی اور اس کے شعبۂ زراعت کے صدر رہے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۵ء کے دوران میں آپ معاشرتی تنظیم نو کی تگ و دو میں لگے رہے۔ اسی میں ۱۹۴۱-۴۲ء آپ نے امریکہ میں برطانوی محکمۂ اطلاعات کی طرف سے لکچر بھی دئے۔

اقوام متحدہ کی سائنسی تعلیمی اور ثقافتی انجمن کے موجودہ سکریٹری کے ہزاروں کارناموں میں سے چند سطور بالا میں بیان ہو سکے ہیں۔

ہکسلے ایک ایسے شخص ہیں جن کی معلومات وسیع، ذہن تیز اور حافظہ قوی ہے۔ آپ کے تخیل کی بلند پروازی اور نئی نئی باتوں کے معلوم کرنے کا شوق کبھی نہیں گھٹتا۔ آپ ایک نئے سے نئے اور جوان سے جوان سائنسدان اور سائنس کے طالب علم کی بات سننے کو تیار رہتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں جب آپ نے اپنے مقالات کو ایک کتاب میں یکجا کرکے شائع کیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ اگر اتحادی جنگ میں جیت بھی گئے تب بھی تہذیب انسانی ضروری نہیں ہے کہ محفوظ ہی رہے۔ تہذیب کا تحفظ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مایوسی، ناامیدی اور بے چینی و بدامنی پر قابو پا لیا جائے۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے اور اس کو امن کی ضرورت کی شدت محسوس ہونے لگے۔ یہ احساس اس وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمارا معاشرتی نظریہ ہی بدل جائے۔ اقتصادی اقدار کو اپنی فوقیت کھوکر سماجی اور معاشرتی اقدار کے تابع ہو جانا چاہیے۔ یہ کام صرف منطق کا سہارا لے کر ہی نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے دنیا کے ایک نئے خاکہ کی ضرورت ہے اور نظریات کے ایک نئے ڈھیر کی۔"

اگر اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی انجمن کو واقعی اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب ہونا ہے تو موجودہ سکریٹری کا انتخاب بہترین ہے۔

فریبِ مسلسل

افسانہ

شفیق بانو شفق

بچہ بھی جب کوئی کھیل کھیلتا ہے تو اپنا ہمسر تلاش کرتا ہے۔ تاکہ مسکرا سکے۔ لیکن سارہ کے ماں باپ نے اتنا بھی نہ دیکھا۔ سوچ لیا ہزاروں لڑکیوں نے ایسے ہی زندگی گذار دی ہے شریف اولاد کا شیوہ ہی یہ ہے۔ ایسے ہی — آہ اس "ایسے ہی" میں کیا کیا ظلم پنہاں ہیں؟ کون سمجھے؟ سارہ دل دل میں سوچتی۔ کتنے شرم کی بات۔ میں اپنے شوہر کی بات کہدوں۔ لیکن وہ کس کس انداز سے جذبات سے پہلوانوں کی طرح مقابلہ کرتی، یہ تو کچھ وہ ہی جانتی تھی۔ دل جلتا تھا، مسکراتی تھی، دماغ دہک اٹھتا تھا لیکن ہنستی تھی، جذبات انجن کے سیاہ گہرے دھوئیں کی طرح سائیں سائیں کرتے اٹھتے وہ چھینٹا دے دیتی۔ مایوسیوں کا، ناکامیوں، تسلیوں کا، لفظوں کا، نیند کا، تھکان کا۔ ایک عالم کو فریب دے رہی تھی، اپنے شباب کو بھی بھلا بھلا کر فریب دے رہی تھی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس بڈھے کو بھی فریب ہی دئے جارہی تھی جس کی روٹیاں کہا رہی تھی۔ صاحب روٹی میں کیا کیا طاقت ہے؟

شباب لوٹ لے — !! - جذبات خرید لے — !! - دماغ تباہ کر ڈالے — !! — زبردستی کی توبہ کرالے — !! — مصنوعی محبت کرالے — !! - اب اور اس سے زیادہ بھلا طاقت کیا ہوسکتی ہے؟ سارہ کے بازو اٹھتے اور گر جاتے۔ مخمور نگاہیں اٹھتیں اور جھک جاتیں۔ سینہ میں بے پناہ جذبات جاگتے اور تھک کر سو جاتے۔ چہرے پر ملاحت لہریں لیتی اور پھیکی پڑ جاتی۔ سارا بدن انگارے کی طرح پھنکنے لگتا جیسے کہ زندگی میں آگ لگ گئی ہو، دل میں آگ ہی آگ لگ گئی ہو، روح میں آگ ہی آگ لگ گئی ہو، اور وہ ان لپٹوں سے پناہ لینے کے لئے حیران ویران پریشان سایہ تلاش کرنے سے عاجز ہو۔ سہیلیاں فرمائیں "بھئی سارہ کے ہاں کا صوفہ سٹ نہایت نفیس ہے"۔ "سارہ کے ہاں جھولا بہت ہی رومان پرور چیز ہے"۔ "سارہ کے ہاں کے پلنگ قابل دید ہیں"۔ "سارہ کے برتن تو واہ وا۔ بس ولایت میں خاص خاص انگریزوں کے ہاں ایسے ہوں گے"۔ "سارہ کے ہاں کتنی نفیس ترین الماریاں ہیں؟" "سارہ کے لباس کس قدر قیمتی ہیں — آہ کاش ... کون کہتا؟ بدتمیزو بدنصیبو! — ان چمکتے ہوئے لباسوں میں۔ پالش کی ہوئی الماریوں میں۔ اس حسین جھولے کے پیچھے، ان صوفہ سٹ کی تہ میں، ان خوشنما برتنوں کی جھنکار کے اس پار ایک بہت قیمتی دل بھی دھڑک یا تڑپ رہا ہے، اس کی بھی تو کچھ تعریف کرلو؟

یا ویسے ہی — جل رہی ہو۔ رشک کھا رہی ہو، حسرت سے کہہ رہی ہو۔

یہ سب عارضی غیر ضروری، بیکار چیزیں ہیں جن سے ایک صنف نازک کا سودا کیا گیا ہے۔ گوشت پوست خریدا گیا ہے۔ شباب کا مہکتا چھلکتا جام چکایا گیا ہے۔ کھٹ کھٹ کرتا ہوا زندہ دل سچ مچ کا دل تولا گیا ہے۔ چاند سے بھی زیادہ حسین ابرو وزن کرائے ہیں۔ ستاروں سے بھی چمکدار پیشانی کو مقابلہ کے پلڑے میں رکھا گیا ہے۔ سچے موتیوں سے بھی زیادہ آب و تاب نشیلی نگاہوں، معصوم پلکوں، افسردہ آرزوؤں کو ترازو پر چڑھا دیا ہے جب بھی ڈنڈی برابر نہ آئی۔ زندگی کا نصب العین تمہارے خیال میں اتنا گرا ہوا — ؟ حسن اتنا ارزاں، دل کوڑیوں کے مول، دماغ اس قدر کم وقعت، خیالات اس درجہ سستے، ذرا اس بھوسہ کو ٹٹولو تو سہی، اس راکھ کی دبی ہوئی چنگاری کو کریدو تو سہی، پھر دیکھو۔ آگ، آگ میں سے لپیٹ، لپیٹ میں سے شعلے، شعلوں میں سے چنگاریاں، چنگاریوں میں سے طاقت، پھونک دینے کی طاقت تمہاری آنکھیں کھول دے گی۔

کسی نے اگر کبھی شادی کا مفہوم سنا ہی نہ ہو تو خیر لیکن سارہ تو سب کچھ مطلب مفہوم سن کر سمجھ کر بھی لاعلم رہنا چاہتی ہے بشرطیکہ رومان کے بادل گھر گھر کر اس پر طوفان نہ ڈھائیں۔ روزہ رکھنا تو بالکل آسان ہے۔ ایسے میں صبر بھی آسان ہے۔ لیکن روٹی سامنے ہے اور پابندیاں بھی ندارد۔ تو ایسے میں بھوکا رہنا گویا فرہاد کی نہر کاٹنی ہے بلکہ اس سے بھی شدید۔

صبح کو دکان جاتے جاتے جب خزاں رسیدہ بڈھا فاروق پوچھتا۔ "بیگم دوپٹہ کس رنگ کا کہدوں — ؟ کامدانی کیسی ہوگی — تمہارا دل کیسے کو چاہتا ہے؟ بیگم — سارہ! ہاں یہ تو بتاؤ وہ "کھٹکے" سنار کے ہاں سے لیتے جاؤں گا یہ کہو کہ تمہاری پسند کیا ہے سفید موتی یا — آسمانی — ؟ بیگم بنارسی ساری موہن کی دکان پر نہایت بہترین ڈیزائن کی آئی ہے قیمت دو سو ہے کہو تو لادوں؟ بیگم — تمہارے جوتے کس رنگ کے آئیں گے؟ بیگم سارہ — مجھے بتاؤ تمہارے پیٹی کوٹ کے لئے بیل کتنے تھان منگواؤں؟ سارہ جلدی جلدی گھبرا کے یوں بولنے لگتی جیسے کہ بزرگ کے سامنے مہذب۔ "جی جیسے آپ کی مرضی۔ جیسے آپ چاہیں۔ جو آپ کی خوشی ہو۔ جو دل چاہے"۔ کتنی مرتبہ دل و دماغ نے ساتھ چھوڑ دیا۔ چاہتی تھی کہدے

"لفظ بیگم — بیٹی۔ دونو "ب" سے ہیں۔ تمہارے لئے زیادہ موزون بیٹی ہوگا" اچانک ماں کے باپ کے بھائی کے، محلہ والوں کے، ملنے والیوں کے فقرے کانوں میں سیٹی دینے لگتے "ہائیں بری بات۔ شریفوں کا یہ شیوہ نہیں۔ مرے پاریا بھرے بار۔ خبردار۔ شوہر کے متعلق کچھ برا نہیں سوچا کرتے۔ باغی مت بنو۔ یہ کام بیہودہ بیکار عورتوں کا ہے۔ گناہ ہوگا گناہ۔ دل و دماغ کو پاک صاف رکھو" یہ بھیانک فقرے خوفزدہ بنا دیتے۔ وہ پھر بیگم کے روپ میں جھولے میں بیٹھ کر پلنگ ہلانے لگتی۔ پلنگ پر پھولوں پر لیٹ کر خاروں کا گمان کرتی۔ کرسی پر رعب کے ساتھ بیٹھ کر ظاہر کرتی سب پریشان ہو جاتی کہ دیکھو اس گھر کی رانی میں ہی ہوں لباس پہن پہن کر دنیا کو حیران کرتی جیسے کہ بتانا چاہ رہی ہو تم پر لعنت۔ غربت پر لعنت۔ میلے پھٹے سادے کپڑوں پر آخ تھو۔"

یہ سب زبردستی کی کامیاب ترین ایکٹنگ کرتے کرتے اپنی آگ میں جل اٹھتی۔ آگ لگ جاتی۔ دھواں نکلنے لگتا۔ پھر کچھ سوچ کر آنسوؤں سے یہ تمام سلگتے ہوئے جذبے بجھا دیتی۔ سارہ ہنس ہنس کر فاروق کو فریب دیتی تھی اور وہ نالائق ستر سال کا پچیس سال کی لڑکی سے مسکرا مسکرا کر فریب کھائے جاتا تھا۔ سارہ کا دل چاہتا کہ سارے گھر میں ادھم مچائے۔ چیزوں کو بے ترتیب پھینکے برستی ہوئی بارش میں ناچتی بھیگتی چیختی۔ پانی اچھالتی پھرے۔ سردیوں میں ہلکے شبنم کے دوپٹہ کو ہوا میں لہراتی۔ تتلی بنتی یونہی پھرے۔ اودے بن بن کر کھائے۔ گرمی میں برف اچھالے۔ توڑے۔ خوب کھٹے کھٹے شربت پئے۔ کھانس کھانس کے سب کا برا بھلا سنے لیکن یہ سب کیسے — ؟ ساتھی تو ندارد۔ بوڑھے فاروق سے نہ تو مذاق کر سکتی ہے، نہ چڑیوں کی چہکار بتا سکتی ہے۔ نہ بارش کا رومان سنا سکتی ہے۔ نہ ڈھول دھما کر کے داد لے سکتی ہے نہ بیداد۔ آہ — یہ سسکتے ہوئے بے ڈول، بد شکل، کمزور سے چند بچے — ؟ ان کا کیا ہوگا۔ کون دوائیں پلا پلا کر پالتا رہے گا۔ فاروق صاحب تو جنت میں

مزے کرتے ہوں گے اندر میں؟ عین عالم شباب میں سفید دوپٹہ سر پر ڈالے ان بے روح نامکمل بیوقوف ناسمجھ بچوں کو بہلاتی رہوں گی یہ حسین گھر۔ یہ زرق برق لباس۔ یہ چمکتے ہوئے برتن۔ یہ گھرستی۔ یہ آرام دہ بستر۔ سب ختم ہو جائیں گے۔ کچھ تو پہلی جوان اولاد لوٹے گی۔ کچھ بہن بھائی اپنا حق کہہ کر قبضہ کریں گے۔ پھر — ؟ پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ — آخر کیا ہوگا — ؟ کون بتائے کون جانے — ؟ شاید — شاید کیا معنی ضروری۔ ضروری کیا معنی — لازمی کرایہ کا مکان ہوگا — ہاتھ میں چار آنے سلائی کا کرتا پاجامہ ہوگا۔ صحن میں ٹوٹی ٹوٹی دو تین چارپائیاں ہوں گی۔ مٹی کے گھڑے ہوں گے — ایک کٹورہ ایک لوٹا۔ ایک دیگچی۔ بچوں کے گلے کھلے۔ پریشان حال۔ ننگے پاؤں۔ الجھے سلجھے بال۔ زرد چہرے۔ بھوکے پیٹ — تعلیم سے بے خبر۔ مستقبل سے مایوس۔ پھر کیا ہوگا — میرے اللہ میں کیا کروں گی — سمجھ میں نہیں آتا آخر پھر کیا ہوگا — ؟ کچھ نہیں معلوم!!

"بیگم بیگم سارہ بیگم کروٹ بدلو میری جان — کیوں خواب میں چونک پڑیں تم" یہ کہا اور ریشمی بالوں پر اپنا سوکھا مڑا سا ہاتھ پھیرا۔ سارہ کو ایسا لگا جیسے ٹھنڈا برف کسی مردے کا ہاتھ چھو گیا ہو۔ ایک دم اچھل پڑی "اوں۔۔۔ اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ سونے دو۔۔۔ مجھے میں تو سو رہی تھی۔ بولئے مت!"

"ہاں ہاں سوؤ میری جان۔ تمہیں کون منع کرتا ہے۔ لیکن آرام سے تکیہ پر تو سر رکھو۔ صبح ہو تو ایک تعویذ پیر جی اللہ والے سے لا کر تمہاری مسہری میں باندھوں۔ میں جاگ رہا ہوں مت ڈرنا خبردار۔" شباب انگڑائی لے کر پھر سو گیا۔ پاسبان لیٹا لیٹا شباب کی نگرانی کرنے لگا۔ ایک مسہری پر سانچے میں ڈھلا بدن نیند میں مدہوش تھا۔ دوسری مسہری محض ہڈیوں کا بے ڈول ڈھانچہ۔ زندگی کا کھیل ادھورا رہ گیا۔ فریب در فریب ریشمی پردوں سے لپٹا لپٹا چلتا رہا۔ سنا ہے رہنا جھونپڑی میں خواب محلوں کا۔ لیکن بیچاری سارہ محلوں میں رہ رہی تھی اور خواب جھونپڑی کے دیکھ رہی تھی۔ کیا عجیب فلسفہ!

غزل

آباد لکھنوی

ذوق و شوق بندگی کا ہم سماں دیکھا کئے
جب تصور کر لیا وہ آستاں دیکھا کئے

اپنی آنکھوں سے لگاتا تھا میں پیہم جام مئے
میکدہ والے مری بے تابیاں دیکھا کئے

سننے والوں نے سنی مجھ سے حدیث آرزو
دیکھنے والے مرا طرز بیاں دیکھا کئے

وہ نقاب رخ جو اٹھی تو بھی کیا حاصل ہوا
ہوش ہی جاتا رہا تھا ہم کہاں دیکھا کئے

کس کو ملتی ہیں بھلا اس شان کی بربادیاں
آشیاں ہم کیا بچاتے بجلیاں دیکھا کئے

ہم نے جب آباد سجدے پائے ساقی پر کئے
میکدہ والے بہ نگاہ میکشاں دیکھا کئے

اور اُس نے
لائف بوائے کی
عادت سیکھی ہے!
وہ اِس وقت بہت کچھ سیکھ رہا ہے لیکن زندگی میں لائف بوائے
صابن کے روزانہ استعمال کی عادت سے زیادہ کوئی چیز کام
نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں خوش ہے، اور اُسے
فخر ہے کہ اس نے گرد و غبار کے اس خطرہ کے
متعلق سبق دیا ہے جو ہر جگہ غیر محتاط آدمیوں پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے ایک اچھا صابن ہی نہیں بلکہ
ایک اچھی عادت ہے۔
L.77-23 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

آجکل کی عمارتیں
صنعت
زراعت
سڑکیں وغیرہ
تعلیم
صحت
رہائشی مکانات
تقریباً ہر ایک ایسی چیز کے لئے سیمنٹ کانکریٹ کی ضرورت
ہوگی جس پر کہ ہندوستان کی ترقی کا انحصار ہے
کانکریٹ کے استعمال میں جو فوائد ہیں انہیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کیلئے دی سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ کے فنی ادارے
دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا رنٹ کونس وے نئی دہلی کے فنکاروں کی اعانت حاصل کی جاسکتی ہے۔
دی سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا
CM. 100.

سوانچ دوربین

علی مہدی تقوی

اس وقت تک دنیا کی سب سے بڑی دُوربین امریکہ کی سوانچ دوربین ہے۔ کیلی فورنیا میں ماونٹ ولسن کی چوٹی پر نصب ہے۔ اس دوربین کے آئینے کا قطر سوانچ ہے اسی لئے اسے سوانچ دوربین کہتے ہیں۔ شیشے کا ٹکڑا جس سے یہ آئینہ بنایا گیا ہے، پانچ ٹن وزنی ہے اور صرف اسی شیشے پر پینتالیس ہزار ڈالر لاگت آئی تھی۔

اس کے بننے سے پہلے جو دنیا کی سب سے بڑی دوربین تھی وہ بھی ماونٹ ولسن پر ہی نصب ہے۔ اس کے آئینہ کا قطر صرف ساٹھ انچ ہے اور اس کی مدد سے تقریباً ایک کھرب ستاروں کا مشاہدہ کیا جا سکا ہے۔ ساٹھ انچ دوربین کے بنانے میں ہی اتنی دشواریاں پیش آئی تھیں کہ اس سے بڑی دوربین بنانا ایک عرصہ تک ناممکن خیال کیا جاتا رہا۔ جارج ہیل جس نے ساٹھ انچ اور بعد میں سوانچ دوربین بنائی۔ امریکہ کا بہت بڑا ماہر فلکیات اور باہمت انسان تھا۔ اس کا خیال تھا ناممکن وہ ہے جسے کرنا ہم نے ابھی نہیں سیکھا" اپنی عمر کے آخری زمانہ میں اُس نے دو سوانچ دوربین بنانے کا پہاڑ سا کام شروع کر دیا تھا مگر وہ اُس دوربین کے مکمل ہونے سے پیشتر ہی چل بسا۔

ہیل جانتا تھا کہ اس کی ساٹھ انچ دوربین کی حدوں سے باہر ابھی بیس چالیس کھرب سے زیادہ ستارے اور ہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ ایسی دوربین بنائے جو کائنات کے تمام پوشیدہ رازوں کو پا سکے جس سے بہت دُور پڑے ہوئے ستاروں کا مشاہدہ کیا جا سکے مگر ہیل یہ بھی جانتا تھا کہ بڑی دوربین بنانا کس قدر دشوار کام ہے

دوربین کا مقصد یہ ہے کہ بہت دُور کے ستارے اس کی مدد سے دیکھے جا سکیں ستارے جتنے دُور ہوتے ہیں ان سے روشنی اتنی ہی کم آتی ہے۔ انہیں دیکھنے اور ان کے فوٹو لینے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے عکس خوب روشن ہوں۔ ظاہر ہے دوربین کا لینس یا آئینہ جتنا بڑا ہوگا روشنی اتنی ہی زیادہ مقدار میں ابھر پڑے گی۔ یہ لینس اور آئینے اس وضع کے بنے ہوئے ہیں کہ ستاروں کی کل روشنی جو ان پر پڑتی ہے ایک نقطے پر جمع ہو جاتی ہے اس لئے لینس یا آئینہ جتنا بڑا ہوگا ستاروں کا عکس بھی اتنا ہی روشن ہوگا۔ اور اس طرح دُور کے ستارے نظر آ سکیں گے۔ ہیل کا خیال تھا کہ لینس کی نسبت مقعر آئینے (Concave Mirror). زیادہ بہتر ثابت ہوں گے۔ چنانچہ اس نے ساٹھ انچ دوربین میں یہی آئینہ استعمال کیا تھا یہ آئینے خاص قسم کے اوپٹیکل گلاس (Optical Glass). کے بنے ہونے چاہئیں۔ ان کی اندرونی کثافت تمام حصوں میں یکساں ہونی ضروری ہے۔ بڑی دُوربینیں بنانے میں سب سے مشکل کام ان بڑے شیشوں کا بنانا ہے۔ جب اتنے بڑے شیشے ڈھالے جاتے ہیں تو اکثر ان میں کوئی نقص رہ جاتا ہے۔ اور بہت تجربہ کاری اور ہوشیاری کے بعد ہی اس قدر بڑا بے عیب شیشہ بنانا ممکن ہے۔

یہ آئینے جتنے بڑے بنانے ہوں اس ہی نسبت سے موٹے بھی ہونے چاہئیں۔ ورنہ یہ کمزور رہیں گے۔ اور ان کے ٹوٹ جانے اور چٹخ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ لیکن آئینوں کی موٹائی کی وجہ سے اور کئی نقص پیدا ہو جاتے ہیں۔ دن بھر میں یہ آئینے خوب گرم ہو جاتے ہیں۔ اور رات ہونے پر اس کی سطح تو ٹھنڈی ہو کر سکڑ جاتی ہے لیکن اندرونی حصہ گھنٹوں گرم رہتا ہے۔ اس وجہ سے آئینے کے اندر کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ در عکس سچا ہونے کے بجائے دھندلا دھندلا اور پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر شیشے کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیا جائے تو قیمتی رات کا بیشتر حصہ اس انتظار کی نذر ہو جائے گا۔ اس نقص کو دُور کرنے کے لئے خاص طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جن سے دن کو شیشہ گرم ہونے نہیں پاتا۔

بڑے لینسوں اور آئینوں میں ان کے علاوہ اور بھی کئی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ان کی سطح کو مقعر شکل دینا اور ان پر پالش کرنا بہت مشکل کام ہے۔

ساٹھ انچ دوربین تو بن گئی۔ لیکن بظاہر دوربین کی جسامت کی حد معلوم ہوتی تھی۔ کیا اس سے بڑی دُوربین بنانی ممکن ہے؟ کیا ساٹھ انچ سے بڑے بے عیب آئینے بنائے جا سکتے ہیں، کوئی نہ جانتا تھا۔ دشواریاں بے شمار تھیں۔ اور کامیابی کی اُمیدیں کم۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باقی کھربوں ستارے جو ساٹھ انچ دوربین کی حدوں سے باہر ہیں کبھی نہ دیکھے جا سکیں گے۔ نئی دوربین کی لاگت کا اندازہ بھی بہت زیادہ تھا۔ مگر روپیہ کی تو کمی نہ تھی۔ امریکہ میں سینکڑوں ایسے امیر لوگ موجود تھے جو سائنس کی تحقیقات پر روپیہ پانی کی طرح بہا دینے کو تیار تھے۔ در اصل امریکہ کی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے۔ ایک دفعہ ہیل امریکہ کے ایک دولت مند شخص ہُکر (Hooker) کو جو اس کا بہت شیدا مداح تھا ساٹھ انچ دوربین کی حیرت انگیز دریافتیں سنا رہا تھا ساٹھ انچ دوربین انسان کو فضا کی ان عمیق گہرائیوں میں لے گئی تھی

جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ مگر ابھی اور بڑی دوربینوں کی ضرورت تھی۔

"کتنی بڑی دوربین چاہیے؟" ہکر نے پوچھا۔

ہیل کچھ جواب نہ دے سکا۔ اسے خود معلوم نہ تھا۔

ہکر نے ۴۸ انچ دوربین کی تجویز پیش کی۔ ہیل نے اسے بتایا کہ بڑی دوربینیں بنانی کتنی دشوار ہیں۔ مگر ہکر اس دوربین پر مصر تھا۔ اور اس کی لاگت پیش کرنے کو تیار تھا۔

کچھ عرصے کے بعد ہکر پھر ہیل سے ملا۔ اس نے کہا "۴۸ انچ دوربین نہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی دوربین بناؤ۔ سو انچ دوربین بناؤ۔ روپیہ میں دونگا۔"

مگر ہیل کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بناتے تو کیونکر۔ ساٹھ انچ دوربین سے کام ہوتا رہا۔ مگر جوں جوں ستاروں کے نئے راز معلوم ہونے لگے نئی دریافتیں کرنے کی خواہش سائنس دانوں کے دلوں میں اور شدت سے پیدا ہوتی گئی۔ آخر انہوں نے طے کر لیا کہ بڑی دوربین کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

چنانچہ بڑی دوربین بنانے کا ارادہ کر لیا گیا۔ اس مرتبہ سو انچ کی دیوہیکل دوربین بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب سوال یہ پیش تھا کہ اس قدر بڑا شیشہ کہاں اور کس طرح بنایا جائے۔ دنیا میں سب سے بڑا شیشہ ڈھالنے والی کمپنی فرانس کی سینٹ گوبین کمپنی تھی۔ یہ کام ان کے علاوہ اور کوئی نہ کر سکتا تھا اور خود انہیں بھی پتہ نہ تھا کہ ان کی کوششیں بارآور ثابت ہونگی یا نہیں۔ مگر انہوں نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور سو انچ قطر کا شیشہ ڈھالنے میں مصروف ہو گئے۔

انہوں نے بہت محنت کے ساتھ پہلا شیشہ ڈھالا۔ مگر اس میں ہوا کے بلبلے باقی رہ گئے۔ دوربین کے شیشوں میں ہوا کے بلبلے بالکل نہیں ہونے چاہئیں اس شیشے کو نامنظور کر دیا گیا۔ اور انہوں نے دوسرا شیشہ ڈھالنا شروع کیا۔ تو دوسرا شیشہ پہلے سے بھی خراب نکلا۔ پھر انہوں نے تیسرا شیشہ ڈھالا۔ مگر وہ ویسا ہی خراب تھا۔ اب ان کے پاس پانچ پانچ ٹن کے شیشے کے تین ٹکڑے تھے۔ مگر ان میں کوئی بھی دوربین کے کام کا نہ معلوم ہوتا تھا۔ آخر ان کی ہمت پست ہو گئی۔ بظاہر سو انچ کا شیشہ ڈھالنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ انہوں نے اپنی ناکامی کے حال سے ہیل کو مطلع کیا۔

پھر بھی ہیل چاہتا تھا کہ شیشوں کو منگا کر خود دیکھے۔ اور رائے قائم کرے ممکن ہے ان میں سے کوئی شیشہ استعمال کے قابل ہو۔ مگر جب اس کے پاس ان تینوں میں سے سب سے بہتر شیشہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ واقعی وہ دوربین میں استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ اس شیشے کا خیال ہیل نے چھوڑ دیا۔ اور نیا شیشہ تیار کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ پھر جب کوئی طریقہ نظر نہ آیا تو اس نے سو انچ دوربین کا خیال چھوڑ دیا اور ساٹھ انچ دوربین کے ساتھ اپنی تحقیقات میں مصروف ہو گیا۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ بڑی دوربین کی ضرورت دن بدن بڑھتی گئی۔ ساٹھ انچ دوربین سے اب کام نہ چلتا تھا نئی دریافتیں کرنے کی ضرورت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دور کے ستارے نظر نہ آتے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ زیادہ روشنی — بڑی دوربین صرف یہی ایک حل تھا۔

سو انچ کے شیشے کو دیکھنے کے لئے جو بیکار پڑا ہوا تھا ہیل نے کارنیگی انسٹی ٹیوشن کے مشہور ماہر ریاضیات ڈاکٹر آرتھر ل۔ ڈے کو بلایا اس شیشے کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لئے کسی بڑے ماہر کی ضرورت تھی۔ اگر شیشہ واقعی کام کا نہ تھا تو اس سے دوربین بنانی گویا لاکھ ڈالر ضائع کر دینے کے برابر تھا۔ لہٰذا کوئی اقدام بہت سوچ سمجھ کر کرنے کی ضرورت تھی۔

ڈاکٹر ڈے نے خوب دیکھ بھال کے بتایا کہ شیشے کا ٹکڑا جو انہوں نے فرانس سے منگایا تھا دوربین کے استعمال کے قابل تھا۔ ہوا کے بلبلے جو اس میں رہ گئے تھے کسی قسم کا نقص پیدا نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر ڈے کی رائے کے مطابق اس شیشے کو مقعر (Concave)

غزل

نگاہوں سے عیاں مجبوریاں ہیں — عجب مشکل میں یہ دل مبتلا ہے
فضائے دل پہ چھائی ہے اداسی — کہ کچھ جیسے ہمارا کھو گیا ہے
مجھے حسرت کہ کوئی مجھ سے پوچھے — بتاؤ کیا تمہارا مدعا ہے
بھنور میں پڑ گئی ہے میری کشتی — مگر روپوش میرا ناخدا ہے
نہیں ہے زیست کی مجھ کو تمنا — اجل تیرا ہی تو اب آسرا ہے
مجھے بھی بھولنے والے بتا دے
فراموشی سے تجھ کو کیا ملا ہے

نسیمہ سوز

مشکل رہ جانے لگی۔ یہ کام بہت محنت اور جانفشانی کا تھا اور بڑے تجربہ کار اور مشاق آدمی کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے رشی جس نے ساٹھ انچ دوربین کا آئینہ تیار کیا تھا مقرر ہوا۔ کئی مہینے وہ اسے شکل دینے اور پالش کرنے میں لگا رہا۔ یہ کام اس قدر جانفشانی کا تھا کہ اس کی وجہ سے رشی کا دماغی توازن بگڑ گیا۔

آخر سوانچ والی یہ دوربین تیار ہوگئی۔

نومبر ۱۹۱۷ء کی ایک رات دوربین کا بھاری آئینہ ستاروں کے سامنے لگا دیا گیا۔ یہ سو انچ دوربین پر تجربے کی پہلی رات تھی اور فلکیات کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس رات انسانی حدِ نگاہ میں بہت وسعت حاصل ہوئی۔ انگلستان کے مشہور شاعر الفریڈ نوئیس کو اس اہم موقع پر ماؤنٹ ولسن پر بلایا گیا تھا۔

دھڑکتے ہوئے دلوں سے سائنس دانوں نے دوربین میں سے ستاروں پر نگاہ ڈالی۔ ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ستاروں کے عکس پھیلے ہوئے روشنی کے دھبّے سے نظر آتے ہیں یعنی عکس سچے نہ تھے اور دوربین بیکار ان کی سالہا سال کی محنت ضائع گئی معلوم ہوتی تھی۔

انہوں نے بار بار دوربین میں سے دیکھنے کی کوشش کی ان کے ارادے پورے ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ عکس بالکل دھندلے تھے اب کیا کریں؟

آخر ناامید ہو کر ہبل اور دوسرے سائنس داں سونے کے لئے چلے گئے۔ مگر انہیں نیند کیا خاک آتی صبح کے قریب وہ پھر دوربین میں دیکھنے کے لئے آئے۔

ہوا یہ تھا کہ دن بھر دھوپ میں رکھا رہنے کے سبب شیشہ گرم ہو گیا تھا۔ رات ہونے پر اس کی سطح تو ٹھنڈی ہوگئی۔ لیکن اندر سے وہ ابھی تک گرم تھا۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے اس وجہ سے آئینے میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے مگر اس کا شاید ہی کسی کو خیال آیا ہو۔ اب رات بھر میں آئینہ صحیح حالت پر آ گیا۔

ہبل اور دوسرے لوگوں نے دیکھا کہ ستارے غیر معمولی طور پر چمکدار اور صاف نظر آ رہے ہیں۔ اتنی دور کے ستارے انسانی آنکھوں نے کبھی نہ دیکھے تھے ہیل کی محنت ضائع نہ گئی تھی۔ سوانچ دوربین اس کی خواہش کے مطابق ٹھیک بن گئی تھی۔ اب کئی کھرب ستارے سائنس دانوں کے مشاہدے کی حدوں میں لے آئے گئے تھے۔

سوانچ دوربین دنیا کی اور عجائبات سے کم نہیں۔ یہ ہمیں فضا کی سرحدوں کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ ستارے دیکھے جا چکے ہیں۔ جو اس قدر دور ہیں کہ روشنی کو ان ستاروں سے ہم تک پہنچنے میں پچاس کروڑ برس لگتے ہیں اور یہ اس پر کہ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی تیز رفتار سے چلتی ہے۔ ایک سال میں روشنی چھ کھرب میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے (اس طویل فاصلے کو ایک نوری سال کہتے ہیں)

سو انچ دوربین کے ذریعے بڑے بڑے ستارے دیکھے گئے ہیں۔ اور گیس کے بڑے بڑے جلتے ہوئے سحابی ہیولے (Nebulae). بھی جو کہکشاں میں کروڑوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ہیولے بھی جو بالکل تاریک ہیں اور کہکشاں میں جگہ جگہ سیاہ دھبّوں کی طرح نظر آتے ہیں یہ مادے کے چھوٹے چھوٹے ذرّے ہیں جو فضا میں غبار کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ روشنی ان میں سے گذر کر دوسری طرف نہیں جا سکتی۔ اور اس ہی وجہ سے یہ تاریک نظر آتے ہیں۔ ایسے ہیولے بھی دیکھے گئے ہیں جو بذاتِ خود تو تاریک ہیں۔ لیکن آس پاس کے ستاروں کی روشنی سے ہمیں چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت عجیب اور اہم ہے۔

ہماری کہکشاں ان ستاروں اور گیس کے ہیولوں کا مجموعہ ہے۔ کہکشاں کے باہر ایک بسیط خلا ہے۔ مگر ہم سے بہت دور اس خلا کی گہرائیوں میں اور بھی بہت سی کہکشائیں ہیں۔ قریب ترین کہکشاں بھی ہم سے سات لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر ہے۔ یعنی وہاں سے ہم تک روشنی سات لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔ ان کہکشاؤں کو کائناتی جزیرے کہتے ہیں۔ ان کے مطالعے میں سوانچ دوربین خاص طور پر بہت کام آئی ہے۔ ایڈون ہبل نے اس دوربین سے پچاس ہزار سے زیادہ کائناتی جزیروں کے فوٹو لئے ہیں اور ان کی رفتار اور فاصلوں کا حساب لگایا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دوربین کی حدوں میں تقریباً دس کروڑ کائناتی جزیرے ہیں۔

سوانچ دوربین کے ذریعے کائناتی جزیروں کے مشاہدے نے ہمارے سامنے تحقیق کے نئے باب کھول دیئے ہیں۔ ایڈون ہبل نے معلوم کیا کہ یہ کائناتی جزیرے بہت سرعت رفتار سے ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے ہیں یعنی کائنات بحیثیت کل تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے حساب لگایا گیا ہے کہ ہر ایک تیس لاکھ سال کے بعد کائنات کا قطر دو گنا ہو جاتا ہے۔

ایڈون ہبل نے یہ بھی معلوم کیا کہ جو کائناتی جزیرہ جتنی دور ہے اتنی ہی تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ ہبل، ایڈنگٹن اور دوسرے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ بہت عرصہ گذرا کہ تمام کائناتی جزیرے یکجا تھے۔ اس وقت ستارے علیحدہ علیحدہ کہکشاؤں میں تقسیم نہ تھے، بلکہ یکساں طور پر فضا میں منتشر تھے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ دو ارب سال گذرے ان ستاروں سے کہکشاؤں کے بننے کا عمل شروع ہوا۔ ستارے ایک دوسرے کے

کے قریب آکر گچھوں کی شکل اختیار کرتے گئے اور ان گچھوں نے جنہیں ہم اب کائناتی جزیرے کہتے ہیں ایک دوسرے سے دور بھاگنا شروع کر دیا۔ ان کی رفتار مسلسل بڑھتی رہی اور اب دو ارب سال گذرنے پر ان کا ایک دوسرے سے فاصلہ اور رفتار بہت بڑھ گئی ہے۔

نومبر ۱۹۳۴ء میں ایک کائناتی جزیرہ اس دوربین کی مدد سے دریافت کیا گیا تھا۔ اس کا فاصلہ ہم سے تیس لاکھ نوری سال ہے اور یہ ہم سے ۲۴ ہزار تین سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے دور بھاگ رہا ہے۔ خیال ہے کہ اس سے زیادہ فاصلہ کے جزیرے اور بھی تیز رفتار ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنے بڑے فاصلہ اور رفتار ہمارے تصور میں بھی مشکل ہی سے نظر آتے ہیں۔

سوا نیج دوربین کی مدد سے ایسے ستارے بھی دیکھے گئے ہیں جو یکایک آسمان پر چمک اٹھتے ہیں اور کچھ عرصہ تک بہت تیزی سے چمکنے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی نظر نہیں آتے۔ انہیں انگریزی میں (Nova) یا نئے ستارے کہتے ہیں۔ جدید تحقیق کی رو سے یہ در اصل نئے ستارے نہیں ہوتے بلکہ وہ ستارے ہیں جو بہت دور ہونے کے سبب عام طور پر نظر نہیں آتے لیکن یہ یکایک پھٹ پڑتے ہیں اور بہت تیزی سے جلنے لگتے ہیں ان میں سے بعض تارے اتنے زور کے ہوتے ہیں کہ یہ ستارے دن کی روشنی میں بھی نظر آتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بیت اللحم کا ستارہ جس کا ذکر انجیل مقدس میں ہے ان میں سے ایک ہی ہوگا۔

اس ہی قسم کی اور دوسری بہت دلچسپ دریافتیں اس دوربین کی مدد سے کی جا چکی ہیں۔ ایسے ستاروں کا مشاہدہ کیا گیا ہے جو کبھی زیادہ روشنی سے چمکنے لگتے ہیں اور پھر مدھم پڑ جاتے ہیں۔ پھر ان کی روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ انہیں (Pulsating Stars). کہتے ہیں ان کا مطالعہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس سے ان ستاروں کی اندرونی کیفیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ستارے اکثر ہماری کہکشاں سے باہر دوسرے کائناتی جزیروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے ان کائناتی جزیروں کے فاصلے کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔

سوا نیج دوربین کی مدد سے بہت غیر معمولی جسامت اور روشنی کے ستارے بھی دیکھے گئے ہیں۔ بعض ستاروں کی سطح کا درجہ حرارت تو بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت روشن معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کروڑوں گنی جسامت رکھتے ہیں۔ ان پر مادے کی کثافت بہت کم ہوتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کی سطح کے کسی مکعب انچ ٹکڑے کا وزن ایک تولہ سے بھی کم ہوگا۔ یہ ستارے در اصل گیس کے ہیولے ہوتے ہیں۔ ان کی جسامت کے اعتبار سے انہیں انگریزی میں (Red Giants) یا لال دیو کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا ابھی بچپن کا زمانہ ہے نہیں پیدا ہوئے ابھی نسبتاً بہت کم عرصہ گذرا ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ ستارے بھی ہمارے سورج کی موجودہ حالت پر آ جائیں گے۔

ان کے برخلاف ایک دوسری قسم کے ستارے بھی دیکھے گئے ہیں جن کی جسامت بے حد کم ہوتی ہے۔ یہ سورج سے کروڑوں گنی کم جسامت رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض زمین سے زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ ان ستاروں پر مادہ کی کثافت بہت زیادہ ہوتی ہے اتنی زیادہ کہ ان کے ایک مکعب انچ ٹکڑے کا وزن کئی لاکھ ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ انہیں سفید بونا (White Dwarfs) کہتے ہیں شاید یہ ستارے اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور بستر مرگ پر اپنی زندگی کے آخری لمحے کاٹ رہے ہیں۔ کوئی ایک لاکھ سال اور زندہ رہیں گے۔ ہمارا سورج بھی بہت مدت گذرنے پر سفید بونا بن جائیگا۔ تب اس کی سطح کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہوگا لیکن سورج کو بستر مرگ پر دیکھنے کے لئے ہم اس دن زمین پر نہ ہو سکیں گے پھر بھی سفید بونوں کے مشاہدے سے ہم سورج کے آخری ایام کا تصور کر سکتے ہیں۔

سوا نیج دوربین کی دریافتوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ ان میں سے چند کا ذکر بھی اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اس وقت میں نے چند مختصر دریافتوں کا ذکر کیا ہے۔ سوا نیج دوربین سائنس کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ ہیکل نے کہا ہے کہ ستارے سائنسدانوں کے لئے بہت عمدہ تجربہ گاہ ہیں۔ مادہ کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے مادے کا مختلف کیفیتوں میں مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ مگر ہماری تجربہ گاہوں میں تمام طبعی کیفیتیں پیدا کرنی ممکن نہیں۔ ہم نہ درجہ حرارت چند ہزار سے زیادہ بڑھا سکتے ہیں اور نہ دباؤ۔ لیکن جب تک مادے کو انتہائی کیفیتوں میں نہ دیکھ لیا جائے۔ ہمارا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے کے لئے ہمیں مادے کی کیفیت ستاروں میں دیکھنی چاہئے۔ ستاروں میں طبعی کیفیتیں انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں تو درجہ حرارت لاکھوں تک پہنچا ہوتا ہے اور کہیں بے انتہا کم اور جیسا کہ میں نے لال دیوؤں اور سفید بونوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے۔ ان ستاروں

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

اقبال کے تضاد پر ایک نظر

(۲)

عصرِ حاضر کے ارتقائی لمحات جس تیزی سے اپنی رفتار کو طے کر رہے ہیں اس کے لئے ہمیں ابھی سے غور و فکر کے ساتھ ایک ایسے نظامِ عمل کا صحیح اور مسلّم نصب العین دریافت کرنا ہے، جو اقبال رح کے مقاصدِ حیات اور مستقبل کے روشن و امید افزا روحانی سرمایہ کو حاصل کرنے میں ہماری مدد کر سکے۔ اقبال پر بے اندازہ لٹریچر اور مقالات و مضامین کے باوجود ابتک بہت سی غلط فہمیوں کا احتمال کسی نہ کسی پہلو سے نظر آجاتا ہے۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ سب سے اچھی اور پہلی قابلِ قدر کوشش میرے کرم جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب لیکچرار اورینٹل کالج لاہور نے اپنا فاضلانہ اور محققانہ ملبند پایہ مقالہ "تشریحِ اقبال" لکھکر کی ہے جس سے "اقبال کو اقبال کی نظر" میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ناچیز نے موصوف کو اپنی خط و کتابت میں نہادلی خیالات کے ساتھ مبارکباد دیتے ہوئے توجہ دلائی ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح ہم ایسے دور افتادہ عقیدتمندوں کو حضرت علامہ کے صحیح افکار سے نزدیک لاکر ایک صحیح خدمتِ قومی و ملی سے سبکدوش ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا مکیش صاحب "تشریحِ اقبال" کے مطالعے سے "اقبال کے متضاد نظریوں کا حل" ڈھونڈھ لیں گے اور آپ کے اکثر شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے گا۔ ابھی اقبال کے متعلق بہت سے "مشہور حقائق و رموز" عدم واقفیت کی وجہ سے پردۂ راز میں ہیں۔ شاید ہماری مشترکہ کوششوں سے اسکا کوئی حصہ بے نقاب ہو، اور اقبال رح کا یہ ارشاد کسی خاص بشارت کا مژدہ ہمارے کانوں کو سنا سکے ؎

نغمۂ من از جہانِ دیگر است ❊ ایں جرس را کاروانِ دیگر است

کاش! اس موضوع پر میں اظہارِ خیال کے قابل ہوتا۔ اپنی دیرینہ علالت کی وجہ سے اب تک اس خدمت کو ادا نہیں کر سکا لیکن میری پچھلی مساعی کا ایک ہلکا سا نقش بتوفیقہٖ تعالیٰ عنقریب طبع ہونے والی کتاب "عرفانِ اقبال" میں پیشِ نظر ہوگا محض حضرت علامہ مغفور کی دیرینہ عقیدت اور مخلصانہ محبت کے پیشِ نظر چند الفاظ سپردِ قلم کئے ہیں۔ چنانچہ اپنی مختصر سی کتاب "اقبال کی خودی" کے "دیباچہ" میں ناچیز نے گذارش کی ہے کہ

"ہندوستان کی موجودہ انقلابی شاعری میں جدید رجحانات کے مخاط انداز و نظریات میں حضرت اقبال رح ایک خاص مقام رکھتے ہیں جنھیں عصرِ حاضر کا انقلابی ادب و درر جائیت کا امام کہتا ہے۔ اقبال نے تطہیرِ فکر و نظر اور بیداری ملت و وطن کے لئے جس معیار کے مطابق اپنا بے مثال اور عظیم الشان کارنامہ پیش کیا ہے وہ جوش و عمل اور عقل و عشق و علم و وجدان کے امتیازات کے ساتھ ایک مکمل توازن کو قائم رکھتا ہے حضرت علامہ کے فلسفیانہ نکات اور عارفانہ حقائق و معارف یکجائیت کے ساتھ اپنے آرٹ کے لحاظ سے ایک انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں علامہ کی قلندرانہ روش اور آزادانہ فکر کا پہلو سوز و گداز کا بھی حامل ہے۔ اس لئے علامہ کے نظریات و پیغامات کو سمجھنے کے لئے علامہ کے انقلابی فکر و نظر کے وجوہ اور احساسات گویا اقبال کی شاعری کا پس منظر ہمارے سامنے ہونا لازمی ہے۔ آپ کی شاعری کے دور ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک مختلف خیالات کے حامل ہیں۔ جب اقبال نے تصوف کی تعلیمات کے خلاف اپنا نظریہ قائم کیا تھا اس وقت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے ایک طویل اور مدلل بیان "اسرارِ خودی" کی تردید میں "سترِ اسرارِ خودی" کے نام سے چھپوایا تھا۔ خواجہ صاحب نے حافظ شیرازی اور تصوفانہ مسائل کے متعلق بہترین طریقے پر اہم حقائق کا اظہار فرما کر اقبال کو دعوت دی تھی کہ وہ مولانا روم کی مثنوی شریف کا بخوبی مطالعہ کریں۔ بعد میں خواجہ صاحب سے اقبال کی خط و کتابت بھی ہوئی تھی جب اقبال کی طبیعت خود بخود حقیقت کی طرف مائل ہوئی تو آپ نے فلسفیانہ زندگی کو الوداع کہا اور آہستہ آہستہ تصوفانہ تعلیمات کی طرف راغب ہو گئے۔ بقول جناب میرزا محمد بشیر (ایم اے بی ٹی) "آخر آخر درویشی و قلندری نے ان کو مشرق و مغرب، ہند و ایران تمام سے بیگانہ و برتر بنا دیا تھا۔"

(عالمگیر لاہور) (صفحہ ۴۵ و ۴۶)

مجھے امید ہے کہ مولانا مکیش صاحب ان سطور سے اقبال کے تضاد ذکر پر ضرور غور فرما کر حقیقتِ صادقہ کو سمجھ لیں گے۔ اقبال کے تضاد میں ہی حقیقت لامری پنہاں ہے ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ ؎

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے ❊ کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے"

اقبال جب تک میدانِ سیاست و فلسفہ کا شہسوار رہا اپنی حکمت سے ذریعے "من شکوہِ خسروی او را دہم۔ اد حدیثِ دلبری خواہد ز من" کا

بشیر مخفی القادری

عله، مطبوعہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین۔ گجرات (پنجاب)

پیغامبر رہا با لآخر دنیائے "حقیقت و معرفت" میں قدم رکھتے ہی بلا
"قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں"

کا داعی بنا۔ ان موضوعات پر مولانا ذرّہ کاکوروی کے سلسلے میں حضرت صبا رشیدی ایم اے۔ بی ایل کے متعلق میرے مضامین کا مطالعہ مولانا مکیش صاحب کر چکے ہیں۔ مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ازراہِ نوازش اپنے مکتوبِ گرامی میں لکھا ہے کہ :-

"میں نے جناب کے مضامین اقبال کی خودی پر پڑھے ہیں اور محظوظ ہوا ہوں تاہم انشاء اللہ "اقبال کی خودی" سے بھی استفادہ کروں گا۔ جناب کا بالکل بجا ارشاد ہے کہ ہمیں اپنے بزرگوں کے نظریات اقبال کے تضاد کو دور کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میری حقیر رائے میں ایک راستہ چلنے والے کے لئے اپنے بزرگوں کے نظریات کافی ہیں۔ اقبال کے نظریات پر غور و فکر کی ضرورت ہی کیا ہے لیکن میں نے جس مقصد کے پیش نظر علامہ اقبال کے نظریات پر غور کرنا ضروری سمجھا اسکا اظہار قبل از وقت ہوگا"[15]

اس کے متعلق جواباً میں نے اپنے مقاصد مولانا مکیش صاحب پر واضح کر دئے ہیں۔ مجھے "اقبال کے افکار و نظریات" پر غور کرنے کی اہمیت سے انکار نہیں اور کسے عصرِ حاضر کے ارتقائی جدید مسائل کے پیش نظر انکار ہو سکتا ہے؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ "قدیم و جدید نظریات" کی مطابقت کس نظامِ فکر سے مفید و مستحسن نظر آسکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب

" ان کے افکار اور کلام میں علومِ اسلامیہ کا بہترین خلاصہ موجود ہے جو شاعرانہ زبان میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ تلمیحی اور ایمائی حیثیت رکھتا ہے لیکن اربابِ فکر ان اشارات و کنایات کو کسی قدر کوشش کے ساتھ پوری طرح پھیلا سکتے ہیں میری رائے میں ان علوم سے ابتدائی واقفیت کے علاوہ ہمارے لئے ان حکمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے جن کے سرچشمۂ فیض سے فکرِ اقبال سیراب ہوتا رہا۔" (تشریحِ اقبال")

میرے مکرم جناب نیازی صاحب ایم اے بی ٹی سی۔ لٹریچر بھی اقبال کے بعض صوفیانہ نظریات سے متفق نہ تھے اور اقبال کے فروغ کے دور کے خیالات کے پیش نظر آپ کو بجا اختلاف بھی تھا لیکن بعد میں مسلسل تبادلۂ خیالات و بحث سے آپ نے اپنے طویل مکتوبات میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے مجھ ناچیز سے اتفاق فرمایا۔ آپ نے اپنے ایک طویل مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ :-

"میں اقبال کے عقیدتمندوں پر یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ خودیِ اقبال اور تصوفِ اسلام ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں صرف خودی اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی کیونکہ وہ خود لا اِلٰہ اِلا اللہ (خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ اِلا اللہ) کی محتاج ہے۔ لا اِلٰہ اِلا اللہ کے اسرار کا سمجھنا ہی تصوف ہے لیکن یہ ایک فن ہے جو نظری سے زیادہ عملی ہے"

اور اپنے ایک پہلے خط میں لکھا تھا کہ :-

"میرے خیال میں تصوفِ اسلام نہ افلاطونی تعلیم کا نتیجہ ہے نہ نو فلاطونیت کا نہ ہندی جوگیت کا جیسا کہ اقبال یا انکے نوجوان متبعین کا خیال ہے"

اسی سلسلے میں ناچیز نے ان کے نام ایک عریضہ لکھکر اظہارِ خیال کیا تھا اور اُس عریضہ ہی کے بعد آپ مجھ سے متفق الخیال ہوئے اور اسے ایک ماہنامے میں شائع کرنے کے لئے اصرار فرمایا۔ جسے آج پہلی بار نذرِ ناظرین کرتا ہوں امید ہے کہ اس سے "اقبال کے متضاد نظریات" پر غور کرنے کے لئے اہلِ فکر حضرات مجھ ناچیز کی گذارشات پر توجہ فرمائیں گے!

از کراچی - ۲۶ اگست ۱۹۷۴ء

مکرمی و محترمی جناب نیازی صاحب۔ سلام مسنون۔

" آپ کے مختصر حالات اور علمی ادبی خدمات کے ذکر سے دلی مسرت حاصل ہوئی کچھ ذاتی مصروفیت اور علالت وغیرہ کے باعث بہت کم وقت تحریر کے لئے بچا کرتا ہے میں کیا عرض کروں کہ میں نہ ادیب، نہ شاعر، نہ صوفی، نہ عالم۔ یہ جو کچھ بھی ہے من جانب اللہ ہی ہے اس سے روحانی مسرت میں اضافہ ہوا کہ آپ ماشاء اللہ اہلِ نسبت بھی ہیں۔ الحمد للہ آپ ایسے پاکیزہ خیالات رکھنے والے اشخاص اب بھی اس مادی دنیا میں موجود ہیں مجھے خوشی ہوگی کہ آپ کسی وقت اپنے مرشد بزرگوار کے اسمائے گرامی مختصر حالات سے مطلع فرمائیں گے۔

حضرت اقبال کے متعلق آپ کے گرامی قدر خیالات معلوم ہوئے۔ یقیناً مجھے آپ کے خیالات سے اتفاق ہے شاید ہی کسی تعبیر سے قدرے مختلف خیال واقع ہو۔ مجھے اقبال سے

---

[15] موصوف نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میرا مقصد بعض غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے، خواہ وہ میری کیوں نہ ہوں"

روحانی طور پر والہانہ محبت ہے اور انھیں میں اپنا روحانی رہبر سمجھتا ہوں کیونکہ اقبالؔ ہی کی روحانی تربیت نے مجھے اس مقام سے آگاہ کیا ورنہ ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا

مگر عقیدت کے یہ معنی نہیں کہ مراۃِ مستقیم سے ہاتھ دیدیا جائے تحقیق و تدقیق ہر حال میں مستحسن ہے۔ میں خوش ہونگا اگر آپ اپنے اس فقرے کی مزید تشریح فرمائیں گے کہ "اقبال کی تعریف مزدور کرنی چاہئے۔ لیکن معتقدانہ نہیں نہ حدود واجب سے متجاوز" اس میں شک نہیں چند افراد اقبالؔ کو کسی اور رنگ میں پیش کررہے ہیں لیکن چشم بصیرت ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ٭ من انداز قدت را می شناسم

سا تماشا دیکھ سکتی ہے۔ میری بھی یہ خواہش ہے کہ اقبالؔ کو اقبالؔ کی نظر سے دیکھا جائے۔ "خودی" کے متعلق آپ ایک حد تک درست ارشاد فرماتے ہیں۔ دراصل اقبال کی "خودی" معنویت اور نفسیات کے لحاظ سے تین پہلو رکھتی ہے اور علامہ نے تین اسٹیج میں اسے بیان فرمایا ہے۔

(۱) خودی کا تصوفانہ پہلو (۲) خودی کا سیاسی اور انقلابی پہلو۔
(۳) خودی کا فلسفیانہ اجتہادی پہلو۔

ان متضاد نظریات میں خودی کی حکمت فرد کی قوت فلسفۂ جماعیت اور تنظیم ملت عرفانِ نفس خود شناسی وغیرہ کو مختلف صورتوں سے اظہار میں لایا گیا ہے۔ چنانچہ راقم فقیر نے اپنے مضمون "اقبال کا نظریہ تصوف" میں جو کچھ لکھا ہے وہ مختلف جگہ سے مختصراً پیش کرتا ہوں۔
(۱) "حضرت دردؔ کاکوروی کے جواب میں صبا صاحب رشدی ایم۔ اے۔ بی۔ ایل نے اپنے استدلال پر خودی کی معنویت کو بتایا ہے۔ علمی بحث کے دوران میں اکثر اختلافی مسائل سلجھائے جاسکتے ہیں۔ دردؔ صاحب اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کو تصوف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ میں نے گزشتہ اشاعت میں اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اقبالؔ کے ارشادات سے ثابت کیا تھا کہ اقبال بہ حیثیت ایک فلسفی مختلف فکر و نظر کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن حقیقتاً روحانیت لبندی نے تصوف کے اہم مسائل و واردات کا انھیں حامل بنادیا تھا۔ اقبال کی سیاسی بصیرت اور تصوفانہ حکمت کی بلندی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ساتھ ہی ایک مفکر تھا اور اپنے خصوصی نظریے کا علمبردار۔ پالٹیکس کا علمی اور عملی پروگرام مختلف دور و انقلاب سے گزرتا ہے۔ سیاست انقلاب وقت کے اثرات سے بچ نہیں سکتی۔ سیاسی شعار و نیت اور روحانیت کا تضاد درمیاں رہتا ہے۔

اقبال شروع عمر ہی سے فلسفیانہ نکات اور پالٹیکس کی طرف راغب تھا اس لئے آپ نے قومی بیداری اور احساسات عمل کے لئے فلسفۂ خودی یا جسے اقبال کے الفاظ میں قومی انا کہتے ہیں اسکا اجتہادی نظریہ پیش کیا۔ اقبال کی فکر نے تصوف کے خلاف جو نظریہ قائم کیا وہ ایک موقع اور بعض وجوہ کی بنا پر تھا جو کچھ دنوں بعد تبدیل ہوگیا تھا۔ ایران میں بہت سے فرقے تصوف کو اختیار کرکے اپنے مقاصد اور ملوکیت کی پشت پناہی کرچکے تھے جنھوں نے رہبانیت پر غیر صحیح اثرات پھیلا دئے تھے اس لئے اقبالؔ نے ان کے بعض نظریوں کی تردید کی۔ آپ کا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ صرف مادیت کے ارتقا کے لئے جد و جہد کی جائے بلکہ فطرتی روحانیت کے لئے بھی مصروف عمل رہنا چاہئے اور یہ صحیح تصوف اور اسلامک صوفی ازم کا مسلم الثبوت آئین ہے۔" (شاعر آگرہ مئی ۱۹۴۳ء)

آپ کے مضمون کا منتظر رہوں گا۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ دہلی کی معرفت مولانا اسلم جیراجپوری کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ اصولی اختلاف کے مدنظر کوشش کریں کہ صحیح حقائق کی بنا پر اپنے خیالات تبدیل کرسکیں تاکہ ہم متفق ہوکر عصر حاضر کو اقبالؔ کا صحیح پیغام پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے۔ مزید آئندہ کچھ عرض کرسکوں گا۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔ والسلام۔ دعا کا طالب

بشیر حنفی القادری علی کراچی۔

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ (اقبالؒ)

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کرلیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کرلیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ملحوظ رکھا کریں۔

ادارہ

ہرم اکبر کی تعمیر

ابھی لوگ حیران ہیں کہ مصریوں نے اہرام آخر تعمیر کیسے کئے۔ ان کے پاس نہ تو چرخیاں وغیرہ تھیں اور نہ بڑے بڑے چکر اور گاڑیاں۔ وہ صرف لیوروں، ہاروڑوں، رسیوں، ایلیجوں، ساقولوں وغیرہ سے کام چلاتے تھے لیکن ساتھ ہی نہایت تندرست اور ریاضیات کے اچھے ماہر تھے۔ بہرحال انھوں نے کسی نہ کسی طرح پانچ ہزار برس گزرے قاہرہ کے مغرب میں جیزہ کے مقام پر ہرم اکبر تعمیر کیا۔ یہ مہندسہ دانی کا بہت بڑا مظاہرہ ہے اور اپنی رفعت و عظمت کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس کا وزن ۵۷،۵۰،۰۰۰ ٹن اور حجم ۹۰،۰۰۰ ،۷۷، ۲۲ مکعب فٹ ہے۔ اس طرح یہ دنیا کی سب سے بڑی پتھر کی تعمیر ہے۔ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ محض ۳،۰۵،۰۰۰ ٹن کی ہے۔ امریکہ کے بولڈر بند کا حجم ہرم اکبر سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ یہ ہرم خوفو نامی فرعون کی قبر پر بطور یادگار تعمیر ہوا تھا۔ اس کا سن تعمیر تقریباً ۲۷۰۰ ق۔م ہے۔

اسی پرچہ میں فارن ہیل گیڈنر کی بنائی ہوئی تصویریں بھی ہیں جو اسن انسا کلو پیڈیا بٹینکا کے لئے بنائی تھیں۔ اہرام کی تعمیر کی تاریخ کے متعلق جو معلومات حاصل ہیں وہ واقعات اور قیاسات دونوں مبنی ہیں۔ ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ یونانی ہیروڈوٹس ہے جس نے ۴۵۰ قبل مسیح میں ان کے متعلق واقعات تحریر کئے۔

مسلمانوں نے ہرم اکبر کا احاطہ ہٹا دیا جو چونے کے پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس سے اب نیچے کی عمارت صاف نظر آتی ہے۔ دریا کے کنارے پتھر کے راستے کے نشانات اب تک ملتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مصری ایک طرف یا مختلف اطراف سے پتھر روڑ کا کر اوپر لے گئے یا انھوں نے رسی باندھ کر آہستہ آہستہ اوپر کھینچے۔ ہرم اکبر کا زاویہ ۵۱ درجہ کا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیچے کا حصہ تو وہی ہے لیکن شاید بعد میں اس کی اونچائی دوگنی کر دی گئی۔ مصر میں سب سے پہلا ہرم اس سے سو سال پیشتر امحوطب نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ فرعون زوسر کا ماہر تعمیرات و طب تھا۔ فرعون کے عہد تک مصری تہذیب اپنے کمال کی معراج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد ایک ہزار سال تک اہرام بنتے رہے اور ۱۵۰۰ ق۔م سے پیشتر مصر کا سنہری زمانہ نہیں آیا۔

دریائے نیل کے طوفان سے ہرم کی تعمیر میں بہت مدد ملی۔ مصر کے دوسرے کاموں پر بھی نیل کے طوفان اثر انداز ہوتے ہیں۔ تین مہینے میں ایک لاکھ بیکار کسان ہرم کی تعمیر کے لئے مہیا ہو گئے۔ تقریباً سو کشتیوں کے ذریعہ وہ پتھروں کو طوفانی دریائے نیل کے پار لے گئے اور چٹان کاٹ کر چار چبوترے بنائے گئے جو ہرم کی بنیاد یا نچلا حصہ ہے۔ تہ خانے میں جانے کے لئے سرنگیں بنائی گئیں۔

اہرام زیادہ تر فرعون کی زیر زمین

فرعون کی رائے دو مرتبہ بدلی

قبروں کا دروازہ روکنے کے لئے ٹھوس چٹانوں سے کاٹ کر بنائے جاتے تھے۔ خوفو نے بھی ہرم اپنا مقصد سے بنانا شروع کیا تھا اور ابتدا میں اس کا ارادہ معمولی سا ہرم بنانے کا تھا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا وہ اپنے نقشے میں اضافہ کرتا گیا اور اس نے اپنی قبر زمین سے اوپر اس جگہ بنانے کا فیصلہ کیا جو آجکل "ملکہ کا کمرہ" کہلاتی ہے۔ اس نے ایک مرتبہ دوبارہ نقشے کو وسعت دی اور اس سے بھی اونچی جگہ پسند کی جہاں تک تنگ راستہ جاتا تھا۔ یہ راستہ ۲۸ فٹ اونچا اور ۱۵۶ فٹ لمبا ہے۔ اس کے اوپر پانچ خالی کمرے بنائے تاکہ شاہی محل کے اوپر سے وزن ہٹ جائے۔ ان کمروں تک تین یا چار فٹ چوڑی سرنگ جاتی ہے۔ فرعون کی لاش اندر رکھنے کے بعد پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے دروازہ روک دیا گیا۔

خوفو کا زمانہ کے اندازہ کے مطابق یا تو تین ہزار یا ساڑھے چار ہزار برس پہلے تھا یا دوسرے اندازہ کے مطابق اس کی وفات ۲۷۰۰ سنہ ق۔مسیح میں واقع ہوئی۔ اس میں قبریں، عبادت گاہیں، پتھر کے راستے اور خوفو کے بیٹے خفرا کا مجسمہ اور ابوالہول سبھی کچھ ہے۔ تینوں اہرام کافی شمال کی طرف ہیں۔ پہلے سارے اہرام کا دروازہ شمال میں بنایا گیا تھا۔

ہزاروں سال گزرے کچھ ڈاکو چونے کے پتھروں کے ذریعہ اندر داخل ہو گئے۔ یہ پتھر دروازہ کو روکنے والے سخت پتھروں کے اردگرد تھے۔ ڈاکوؤں نے خوفو کے سنگین تابوت کو خالی کر دیا۔ اس میں اگر ذرا سی بھی جنبش ہوتی ہے تو اس میں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔

وہم پرست ماہرین کا نظریہ ہے کہ شاہی تابوت گاہ کے اندر کے راستوں کے ہر انچ سے دنیا کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تاریخ ۱۹۵۳ء یعنی ایٹم بم کی تحقیق کے کچھ ہی بعد تک کی ہے۔

مندرجہ بالا معلومات امریکی رسالہ "لائف" سے مستعار ہیں۔ ممکن ہے ہمارے قارئین کو اہرام کی تاریخ اور جائے وقوع کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ہو۔ اس کا بہترین طریقہ لندن کے یونیورسٹی کالج کے پروفیسر مصریات سر ولیم فلنڈرس پیٹری کے مقالے سے

خوشحال رائے

اقتباس نقل کرنا ہوگا۔ جو "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" میں شائع ہو چکا ہے۔

ہرم ایک قسم کی عمارت ہوتی ہے۔ پہلے ہرم عمارت کا محض ایک حصہ تھا لیکن یونانیوں نے غلطی سے ساری کی ساری عمارت کو ہرم سمجھا۔ اب ایک خاص ہندسی شکل کی عمارت کو ہرم کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا نیچے کا حصہ کثیر الاضلاع ہوتا ہے جس کے ادھر ادھر مثلث نما دیواریں اوپر جا کر مل جاتی ہیں۔ عصر وسطیٰ میں اس قسم کی تعمیرات چوتھے سے بارھویں خاندان تک مشہور رہیں۔ بارھواں خاندان دو ہزار قبل مسیح سے بیشتر تھا۔ ان کی بنیادیں مربع اور زاویے ۵۰ درجہ کے تھے۔ دوسرے ملکوں میں بھی اس سے ملتے جلتے نمونے وجود میں آئے لیکن اگر موخر الذکر کی قبریں مٹی کی ہوتی تھیں تب تو محرابی ہوتی تھیں اور اگر مربع ہوتا تھا تو ان کے اوپر کا حصہ چپٹا ہوتا تھا لیکن پتھر کا بنا ہوتے کی صورت میں اس میں ہمیشہ یا تو سیڑھیاں ہوتی تھیں یا چبوترے۔

قبر کی تعمیر کے مختلف مدارج سے ہرم کی اصلیت اور ابتدا کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ قبل تاریخ کے زمانہ میں زمین میں ایک مربع تہ خانہ کھودا جاتا تھا اور اس میں مردہ کو رکھ کر اوپر سے لکڑیاں اور ریت ڈال کر چھت بنا دی جاتی تھی۔ بادشاہوں کے پہلے خاندان نے اس تہ خانے میں لکڑی بچھانی شروع کی۔ پھر لکڑی کا ایک مکان سا بنا کر تہ خانے میں اتارنے لگے اور شہتیر کی چھت بنانے لگے۔ اس کے بعد نیچے اترنے کے لئے برابر میں زینہ بھی بنایا جانے لگا اور چھوٹی چھوٹی دیواریں اٹھا کر مٹی کی چھت بنائی جانے لگی۔ تیسرے خاندان کی حکومت تک یہ دیواریں اینٹوں کی بننے لگیں۔ ان کی لمبائی چوڑائی تقریباً ۲۸۰ × ۱۵۰ فٹ ہوتی تھی اور اونچائی ۳۲ فٹ۔ یہ "مصطبہ" قسم کی قبر ہوتی تھی جس میں نیچے اترنے کے لئے ڈھلاؤ راستہ ہوتا تھا۔ تیسرے خاندان کے "سقارہ" حرم میں اینٹوں کی جگہ پتھر استعمال ہوا۔ آہستہ آہستہ بلندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخرکار ساری عمارت کو پوشیدہ کرنے کے لئے دیواریں تعمیر ہونے لگیں۔ اس طرح "مدوم" پہلا ہرم وجود میں آیا۔

ہر ہرم کا ڈیزائن سائز وغیرہ کے لحاظ سے متعین تھا۔ دو سب سے بڑے اہرام کے دیکھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ایک ہی سے ہیں۔ اور لیپسیوس اور اس کے مقلدوں کا یہی خیال تھا۔ ان عمارتوں کے کسی بھی حصہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلے گا کہ ان کی چھوٹی عمارات میں راستوں کا بننا غیر ممکن تھا۔ یہ خیال کہ معمار کی زندگی بھر ڈیزائنوں کو بڑا کیا جاتا رہا سقارہ اور مدوم کے مصطبوں سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ طرز تعمیر کے لحاظ سے اصلی اہرام سے بالکل مختلف ہیں۔

بہت سے اہرام کے اردگرد گول گول خوبصورت دیواریں بھی نظر آتی ہیں ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے چاروں طرف احاطہ ہو۔ جیزہ کے اہرام کے ساتھ معبد ابھی تک موجود ہیں۔ ذاتی قبر کی طرح تہ خانے کے مغربی حصہ میں ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے مرحوم کی روح کے دنیا سے خارج ہونے کی نمائندگی ہوتی ہے اور اسی طرف سے چیزیں چڑھائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ہرم معبد کے مغربی حصہ میں ہوتا ہے جہاں بادشاہ کی پوجا ہوتی تھی۔ معبد میں مشرق سے داخل ہوتے ہیں (جیسا کہ یہودیوں کے یہاں رواج ہے) اس لئے پرستاروں کا رخ مغرب کی طرف ہوتا تھا جدھر کہ بادشاہ مدفون ہوتا تھا۔

ہرم میں گھر کے سارے لوگ دفن نہیں کئے جاتے تھے بلکہ یہ مصریوں کی دوسری قبروں کی طرح ایک شخص کے لئے مخصوص تھا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کی قبریں کبھی کبھی بادشاہ کی قبر کے برابر میں بنا کر چھوٹے چھوٹے اہرام تعمیر کئے جاتے تھے۔ خوفو کے گھرانے کے اہرام اس کی مثال ہیں۔ الگ الگ قبروں میں دفنائے جاتے کی خواہش اس قدر زبردست تھی کہ جیزہ کی پہاڑی میں بے شمار تہ خانے کھدے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی تو ان کے درمیان پتھر کی پتلی سی دیوار رہ جاتی تھی۔ یہ تہ خانے ساٹھ سے اسی فٹ تک گہرے کھودے جاتے تھے۔ ایک جگہ ایک تہ خانہ کا دروازہ چونے اور پتھر سے کسی قدر بند کر دیا گیا تاکہ دوسرا تہ خانہ کھودتے وقت اس میں سے بھی کھدائی کی جا سکے۔

اہرام کی عام ساخت یہ ہے پتھر اور چونے سے بنائی ہوئی متعدد سیدھی دیواریں ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ کھردری ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ چھٹے خاندان تک یہ انگھڑ پتھروں اور گارے چونے کی دیواریں رہ گئیں جن میں لکڑی کی ڈھیلی ڈھیلی چپٹیاں بھری ہوتی تھیں اور بارھویں خاندان میں تو کچی اینٹوں سے تعمیر ہونے لگیں۔ لیکن باہر کی طرف خوشنما پتھروں کی چار دیواری ہوتی تھی جن کی تراش اور جوڑ نہایت عمدہ ہوتے تھے۔ اسی طرح تہ خانوں ..... کے اندر بھی نہایت نفیس کام ہوتا تھا۔ غرض ہر حالت میں ساخت نہایت عمدہ ہوتی تھی۔ اگر دشمنوں کے کینے اور آئندہ کے معماروں کا لالچ نقصان دہ ثابت نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ اہرام اب تک بدستور ایستادہ نظر آتے۔ باہر کی دیواریں بڑی چوڑی اور مضبوط ہوتی تھیں عموماً ان کی چوڑائی بلندی سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ ہر ہرم میں بہت گہرائی پر اور عموماً سطح زمین سے نیچے نعش دفن کرنے کا تہ خانہ ہوتا تھا۔ ہر تہ خانے میں اوپر کی طرف سے زینہ نیچے اترتا تھا کبھی کبھی یہ اہرام کے شمال کی طرف سے شروع ہوتا تھا۔

اور کبھی شمال کے حصے میں بنیادی چٹان پر اترتا تھا۔ اگر یہ تہ خانہ منکورا کی طرح چٹان سے کاٹ کر نہیں بنایا جاتا تھا یا خفرہ کے ہرم کی طرح چٹان میں خندق نہیں کھودی جاتی تھی تو دو لمبی دیواروں کے بیچ میں بنایا جاتا تھا۔ یہ دیواریں مشرقی اور مغربی دیواروں کا کام دیتی تھیں۔ شمال اور جنوب کی دیواریں اور چھت ان سے ملا کر بنائی جاتی تھی۔ شمالی اور جنوبی دیواروں پر ٹھہرے ہوئے بڑے بڑے پتھر ڈھلوان چھت کا کام دیتے تھے۔ اس لئے تہ خانے کو عرصہ دراز تک نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ "پیپی" کے ہرم کو دیکھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جہاں تہ خانہ اوپر سے کھودا گیا ہے چھت ایک سے زیادہ تہوں سے مل کر بنی ہے۔ تین پتھر کی تہیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی گہرائی چوڑائی سے زیادہ ہے اور تینوں ایک دوسرے پر ٹھہری ہوئی ہیں اور ہر ایک تیس ٹن سے زیادہ وزن کی ہے جیزہ کے شاہی تہ خانے میں تہ خانے سے آخری ڈھلوان چھت تک کئی چھتیں ہیں۔ ابو رعاش میں بھی ایسا ہی ہوگا۔

مرکزی تہ خانہ تک جانے والے راستوں کو دوسرے ضمنی تہ خانوں سے بھی گزرنا ہوتا ہے یہ بھی اکثر بھاری بھاری پتھروں سے رکے ہوتے تھے۔ ان کے کچھ حصے اور عموماً زیادہ حصے کا ڈھلان ۲۶.۷ ڈگری کے زاویہ کا ہوتا ہے۔ جنوبی دہشور کی طرح یہ راستے باہر سے بند معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اندر صرف پجاری جا سکتے تھے تاکہ نذرانہ پیش کیا جا سکے۔

مدوم کا ہرم صحیح معنوں میں پہلا ہرم تھا۔ شروع میں یہ مصطبہ بنا تھا۔ اس کے بعد اسے اونچا اٹھایا گیا اور باہر کا حصہ بنا۔ سات دفعہ ایسا ہی ہوا۔ اس طرح ایک بلند عمارت وجود میں آئی۔ مقارہ کے ہرم کے سلسلہ میں بھی ایسا ہی ہو چکا تھا لیکن مدوم کے

غزل ـــــ مبارک

وہ بارگاہ ناز کہاں میرا اگھر کہاں ۔۔۔ اے مست حسن آ گئے تم بھول کر کہاں
اب التفات یار کی ہم پر نظر کہاں ۔۔۔ آہوں میں اپنی پہلا سا اب اثر کہاں
رہبر بغیر ہوگی نہ یہ راہ عشق طے ۔۔۔ اے بیخودیٔ شوق! خدا کو ٹھہر کہاں
زلفوں کا ان کے رخ سے تصادم جو دیکھئے ۔۔۔ پھر کر سکے تفاوت شام و سحر کہاں
یکتائے حسن تو ہے۔ کرے ہمسری تری ۔۔۔ یوسف کا حسن، جلوۂ شمس و قمر کہاں
جلتا نہ کوہ طور اگر سوچتے کلیم ۔۔۔ تاب جمال لائے بساط بشر کہاں
منزل پہ آ کے گر کوئی گم کردہ رہ بنے ۔۔۔ پھر خضر کیا بتائے کہ ہے تیرا گھر کہاں
فطرت نے مجھ کو عشق میں بخشا ہے وہ کمال ۔۔۔ خود حسن ڈھونڈتا ہے کہ اہل نظر کہاں
اے جان ناز و حسن حریم نگاہ و دل میں آ ۔۔۔ ہیں تیری جستجو میں پھر دل در بدر کہاں
ظاہر میں فوق حسن کو ہے عشق پر یہاں ۔۔۔ فانی کو جا وہاں سے ہے نسبت مگر کہاں

ہر شعر اپنی جگہ پہ اک دُرّ شاہوار
رنگینیٔ خیال مبارک مگر کہاں

ہرم میں اوپر سے نیچے تک پہلی مرتبہ ایک سا ڈھلان تھا۔ اس کا تہ خانہ بھی عجیب و غریب ہے کیونکہ اس میں داخل ہونے کے لئے سیدھی سرنگ سے نیچے اترنا ہوتا ہے۔ جیزہ کا ہرم اکبر اندرونی ساخت کے لحاظ سے بہت مختلف ہے اوپر سے یہ تیرہ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور سینٹ پال کے گرجا سے ڈیڑھ سو فٹ زیادہ اونچا ہے۔ اس کے متعدد تہ خانے اور راستے عمدہ کام اور بناوٹ سب قابل قدر ہیں۔ وقوع کے لحاظ سے معمولی تہ خانہ نامکمل ہے۔ اوپر کے تہ خانے جو بادشاہ اور ملکہ کے نام سے موسوم ہیں مخفی تھے کیونکہ ان کو جانے کے راستے بھاری پتھروں سے رکے ہوئے تھے۔ یہ پتھر اترتے ہوئے زینے کی چھت سے باہر کی طرف نکلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں دو عمدہ تہ خانوں کا وجود بادشاہ اور اس کے ساتھی کے سنگین تابوتوں کی وجہ سے ہے۔ جس سطح پر یہ بنا ہے وہ اس قدر صحیح ہے کہ ایک ضلع میں صرف ۱۰/۶ انچ اور ایک زاویہ میں محض ۱۲ ڈگری کا فرق ہے۔

جیزہ کے دوسرے ہرم (جس میں خفرہ کا تابوت ہے) کے دو دروازے ہیں (ایک برابر میں اور ایک پٹری پر) اور دو تہ خانے (ایک پہاڑ کاٹ کر بنایا ہوا ہے اور ایک پتھر کی چھت ہے) ساری عمارت ٹھوس پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ اس ہرم میں اوپر کی عمارت کا بھی حصہ باقی ہے اور اس کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مغربی جانب کاریگروں کے مکانات ہیں جن میں چار سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ منکورا کا تیسرا ہرم بنیاد کے ارد گرد سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ابتدا میں یہ چھوٹا ہرم تھا لیکن بڑھ بڑھ کر یہ بھی بڑا ہو گیا۔ اب یہ ابتدائی ہرم سے آٹھ گنا بڑا ہے۔ لہٰذا اس کے راستوں میں تبدیلی کرنی پڑی۔ مگر اس کے دیکھنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ درجہ بدرجہ بڑھایا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ تبدیلی یکایک وجود میں آئی۔ ہرم کے سنگین تابوتوں پر قدیم محلوں جیسی نقش کاری ہے۔

یہ دو قدیم اہرام کے نقوش سے نہیں ملتی جو کہ بالکل سادہ ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ ۱۸۳۸ء میں سمندر میں غرق ہوگیا۔

مقام	بادشاہ	تاریخ ق۔م	بنیاد	فرق	زاویہ	اونچائی	دائرۂ سمتیہ
مدوم	سنیفرو	۴۷۵۰	۵۶۸۲۰	۶٫۲	۵۱° ۵۲′	۳۶۱۹	۲۴′ ۲۵″ غ
جیزہ	خوفو	۴۷۰۰	۹۰۶۸۸	٫۶۵	۵۱° ۵۲′	۵۷۷۶	۳′ ۴۳″ غ
"	خفرع	۴۷۰۰	۸۴۷۴۹	۱٫۵	۵۳° ۱۰′	۵۶۵۷	۵′ ۲۶″ غ
"	منکورہ	۴۵۵۰	۴۱۵۳۶	۳٫۰	۵۱° ۱۰′	۲۵۸۱	۱۴′ ۳″ ش
دہشور (جنوبی)	؟	؟	۷۴۵۹۰	۲٫۷	۴۳° ۵′	۴۱۳۴	۹′ ۱۲″ غ
دہشور (چھوٹا)	؟	؟	۲۰۶۴۶	۱٫۱	۴۴° ۴۴′ (۵۵° ۱′)	۱۰۱۷	۱۰′ ۱۲″ غ

اور زیادہ جنوب میں ابوصیر کے اہرام ہیں جن کا ذکر کرنل باورڈ وائز نے کیا ہے اور جن کی کھدائی کا کام جرمنوں نے کیا۔ اس کے بعد سقارہ کے اہرام کا نمبر ہے۔ پٹریوں کے اہرام کے بڑھتے ہوئے مصطبوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کے راستے نہایت عجیب و غریب اور پیچیدہ ہیں جو خاص تہ خانے کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ تہ خانہ چٹان کاٹکر بنایا جاتا ہے اس کے نیچے ایک اور بھی تہ خانہ ہوتا ہے جسے سرخ پتھر سے بند کر دیا جاتا تھا۔ یہاں ایک دروازہ پر چمکیلے ٹائل لگے ہوئے تھے جن پر نیتر خیت کے تیسرے خاندان کے بادشاہ کا نام کندہ تھا۔ لیپسوس ان ٹائلوں کو برلن لے گیا۔ ان سے آگے دہشور کے اہرام ہیں جو جیزہ کے اہرام جیسے ہیں اور بڑے بڑے اور سادہ ہیں۔ دہشور کے شمالی ہرم کے تہ خانے چھتے ہوئے ہیں اور کئی پتھر ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سے کم سے کم گیارہ پتھر جھکے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ چھت بہت اونچی ہوگئی ہے۔ دہشور کے جنوبی ہرم کا بہت سا حصہ ابھی تک باقی ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دو مختلف زاویوں سے بنایا گیا ہے۔ نیچے کا حصہ تو عام اہرام کے زاویئے سے بنا ہے۔ لیکن اوپر کے حصہ کا زاویہ صرف ۴۳° ہے۔ محض اہرام کے بعد لِشت الاہوان اور ہوارا کے منتشر اہرام آتے ہیں اور پھر مدوم کے قدیم اہرام۔ الاہول کے اہرام بہت سے پتھروں سے بنے ہیں جن کی اینٹیں گارے سے جمائی گئی ہیں اور ہوارا کے محض کچی اینٹوں سے بنے ہیں۔ اگرچہ ان کے چاروں طرف بھی دوسرے اہرام کی طرح پتھر کی دیواریں ہیں۔

اوپر اہرام کی جو پیمائش دی گئی ہے وہ انچوں میں ہے۔

ان میں پہلے دو بہت کچھ مشابہ ہیں یہ ۱۱ کے پایہ پر اور ۷ کی اونچائی کے ہیں۔ یہ نسبت تقریباً نیم قطر اور دائرہ کی ہے اور اگر مدوم کے پایہ کو ۱۱ سے تقسیم کیا جائے نتیجہ ۵۱۵٫۶۴ آتا ہے اور خوفو والے پایہ کو ۱۱ سے تقسیم کرنے سے ۸۲۴٫۴۴ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی شکل ایک سی تھی مضروب فیہ میں البتہ فرق تھا۔ ایک ۲۵ ہاتھ اور دوسرا ۴۰ ہاتھ تھا۔

ثاقب کانپوری ——— بقیہ صفحہ ۱۳

اونچی اونچی چوٹیوں پر جب مچل جاتی ہیں برف ✤ اور جب پڑتی ہیں تیرا آ کر زمین متصل
اصل معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بجلیاں ✤ کوندتی ہیں پردہ ہائے شب میں مل کر یکبار
ہے یہ جنازہ شباب پاک محو ابنگ ہے ✤ آہ تمہیں خبر نہیں جان کو کوئی تنگ ہے
عرصۂ گردش گنگی زندگی بہار ہے ✤ کیا تری شیشوں میں بند صحبت خوشگوار ہے

ثاقب کی نظمیں یاس و حرماں، درد و اندوہ اور مجبوری و بیکسی کی دردناک تصویریں ہیں خصوصاً "بیوہ اور برسات" ایک بے پناہ چیز ہے ہر شعر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک الماس کا نشتر ہے جو دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دیتا ہے آخر تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے کلیجہ منہ کو آتا ہے مجھے یقین ہے کہ بہت کم ایسے دل ہونگے جو اس نظم کو پڑھ کر بے تاب نہ ہو جائیں۔ ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ جب پڑھتا ہوں جی بھر آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اشعار نہیں کسی ستم رسیدہ و بیکس کی چیخیں ہیں جو دل کے پاس ہوئی جاتی ہیں ✤

تمارہ خانم: ——— بقیہ صفحہ ۲۵

پیدا ہوئیں۔ تمارہ نے ان تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ اس لڑکے کا نام سلطان ہے اور ۱۹۴۲ء میں اس کی عمر انیس سال تھی اسکو نیوی یعنی جنگی جہاز کی افسری کی تعلیم ملی ہے۔

تمام وفاقی جمہوریتیں ریڈ فلیٹ یعنی جنگی بیڑے کے ایک ایک جہاز کی مربی ہیں۔ ازبکستان جمہوریت نے بالٹک فلیٹ کے جنگی جہاز مرادنامی کا مربی بننا چاہا۔ تمارہ نے اس رشتے کو مزید تقویت اس طرح دی کہ اپنے بیٹے سلطان کو اس جہاز کی خدمت کے لئے وقف کیا۔ حکومت نے اس کی یہ پیشکش منظور کر لی تو وہ سلطان کو خود لینن گراڈ لے گئی۔ وہاں اس نے بالٹک فلیٹ کے جہازیوں کی اپنے فن و صناعت سے ضیافت کی اور ان کی آرزو ہے فتح و ظفر کو وہاں پہنچا دیا جہاں پہنچکر وہ دنیا کو فاشیت کی لعنت سے پاک کرنے میں کامیاب ہوسکے ✤

نقد و نظر

فلسفۂ تقریر

مصنف:۔ مولوی حاجی سید نظیر حسن سخا دہلوی (مرحوم)
ملنے کا پتہ:۔ سخا پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۰ صفحات۔ مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

اس میں شک نہیں کہ تقریر کرنا ایک خداداد ملکہ ہے لیکن اس کی کچھ اکتسابی حیثیت بھی ہے۔ یعنی فطری صلاحیتوں کے ساتھ اختیاری کوششیں مل کر انسان کو ماہر مقرر بنا سکتی ہیں۔ یہ کتاب اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھکر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام جیسا کہ خود مصنف نے پیشِ لفظ میں بیان کیا ہے "فنِ تقریر" ہونا چاہئے تھا۔ مولوی سخا مرحوم ادبی حلقوں میں کچھ زیادہ معروف نہیں ہیں لیکن یقین ہے کہ یہ کتاب ان کی بلند شخصیت کو شہرتِ دوام بخش دے گی۔ اس میں تقریر کے ارکان، اجزاء، اقسام، موضوع، حسنِ ادا اور طریقِ بیان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ چند نامور ہستیوں کی تقریر و تحریر کے نمونے شامل کرکے اس میں زیادہ افادیت پیدا کردی ہے۔ ہونہار طلباء کے لئے اس کا مطالعہ خصوصاً ضروری ہے۔

انیسیات

مصنفہ:۔ محترمہ انیسہ ہارون شروانیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارہ محل حیدرآباد دکن ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۹۲ صفحات۔ مجلد قیمت سوا دو روپے

انیسہ صاحبہ کے کلام کا مجموعہ ہے جو مذہبی خیالات اور عقیدت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ غزلیں بھی رنگِ تغزل سے بے نیاز ہو کر اسی خصوصیت کی حامل ہیں۔ محترمہ زیارتِ حرم شریف کی سعادت حاصل کر چکی ہیں۔ بہت سی نظمیں اسی سفر کے دوران میں اور کچھ وہاں سے مراجعت کرنے کے بعد لکھی گئی تھیں۔ اس لئے موضوعِ سخن کی حقیقت ظاہر ہے۔ اس کے مطالعے سے ایمان و عرفان کی روشنی میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ذوقِ شعری کو آسودگی ذرا مشکل سے نصیب ہو گی کیونکہ فنی اعتبار سے اس میں کہیں کہیں سقم موجود ہیں جو نظرِ ثانی کے بعد آسانی سے دور ہو سکتے ہیں۔ میلادِ پاک کے موقعوں پر یا بچوں کو دینی تعلیم دینے کے سلسلے میں اس کا مطالعہ یقیناً مفید رہ سکتا ہے۔

تحلیلِ نفسی اور تعبیرِ خواب

مصنف:۔ جناب عبدالحی جمیل علوی ایم۔اے
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ دانش و حکمت۔ حیدرآباد دکن ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۲۴ صفحات۔ مجلد قیمت ڈھائی روپے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی ہستی ایسی ہو جسے اپنی زندگی میں کوئی خواب نظر نہ آیا ہو۔ لیکن خواب کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صحیح تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اس پر توہمات کی حد سے آگے بڑھ کر بہت کم غور و خوض کیا گیا ہے۔ سگمنڈ فرائڈ نے جو اس زمانے کا بہترین ماہرِ نفسیات ہوا ہے، اس موضوع پر اپنے اعلیٰ خیالات اور تجربات پیش کئے ہیں جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عبدالحی صاحب نے یہ کتاب بڑی کاوش سے لکھی ہے۔ خواب کی نفسیاتی کیفیت پر بحث کرنے کے بعد اس کی تعبیرات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بعض سچے خوابوں اور ان کی تعبیروں نے اس کتاب کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

اس زمانے میں جبکہ افسانوں اور ڈراموں میں نفسیاتی تجزیات کا رنگ جمتا نظر آ رہا ہے، اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ اور مفید ہو گا۔ علمی موضوع ہونے کے باوجود طرزِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔

دامن تہی

مصنف:۔ سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔اے
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ دانش و حکمت حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت سوا دو روپے

یہ چھ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے ابتدائی دو طویل اور طبعزاد ہیں۔ ایک ڈائری کی اور دوسرا خطوط کی صورت میں ہے۔ ان میں حزن و ملال کا رنگ بہت زیادہ جھلک رہا ہے۔ ایسے افسانوں کے پلاٹ میں عموماً جھول پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ اس نقص سے پاک ہیں۔ "خودی کا پیراہن" کلیفرڈ باکس کی ایک منظوم تمثیل کا ترجمہ ہے مشکل حصوں کو یا تو حذف کر دیا یا انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے جس سے اصل کی خوبی فنا ہو گئی ہے۔ "ہماری زندگی" ہر لحاظ سے اچھا افسانہ ہے۔ رفعت صاحب میدانِ ادب میں نئے ہونے کے باعث مشہور نہیں ہیں تاہم ان کی تحریر بعض کہنہ مشقوں سے بہتر ہے۔

اقبال کی خودی

مصنف:۔ صاحبزادہ بشیر مخفی القادری علی کراچوی۔
ملنے کا پتہ:۔ بکڈپو انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۷×۲۷/۱۶ کے ۵۲ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت آٹھ آنے۔

اقبال کے فلسفۂ خودی پر بہت سے مضمون لکھے جا چکے ہیں اور کئی کتابوں میں اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن بشیر مخفی صاحب نے چونکہ حافظ کی بے خودی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقبال کی خودی کا مطالعہ کیا ہے۔ اسلئے نیا زاویۂ تنقید ہونے کے باعث اس میں جدت اور زیادہ افادیت موجود ہے۔ اقبال کے اردو اور فارسی دونوں کلام زیرِ بحث رکھے ہیں۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود سیر حاصل ہے۔

ستارے

مصنفہ:۔ محترمہ سیدہ اختر۔ ملنے کا پتہ:۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار جامع مسجد۔ دہلی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت سوا دو روپے

اٹھارہ مختصر افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے۔ اختر صاحبہ کو ان کی بلند آہنگ بلند پایہ تقریروں کا لحاظ رکھتے ہوئے قوم نے خطیبۂ ہند کا خطاب دیا ہے جو یقیناً حق بجانب ہے۔ ان کی یہ فطری صلاحیت افسانوں میں بھی جلوہ گر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اسی لئے ہر افسانے میں زبردست گہرائی اور اثر موجود ہے۔ ناممکن ہے کہ پڑھنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے۔ تقریباً تمام افسانوں میں ان کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے جو ہمارے سماجی نظام میں پیدا ہو کر ہمارے اخلاق کو پست کر رہی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے ان میں کوئی خاص جدت نہیں لیکن عریاں نگاری سے دامن بچا کر چونکہ ان افسانوں کو نہایت شائستگی کے ساتھ لکھا گیا ہے اور پھر حسنِ بیان نہایت دلآویز ہے، اس لئے ان کو ہمارے ادب میں ایک امتیازی درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ف۔ح

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

نقد و نظر

بقیہ صفحہ ۵۲

منتخب نظمیں پچاس نظموں کا یہ مجموعہ غالباً [illegible] انصاری صاحب نے مرتب کیا ہے اس امر کی پوری طرح وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد محسوس ہوتی ہے کہ یہ رسالہ "جدید ادب" کا خاص نمبر ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے تقریباً سبھی ترقی پسند شاعر اس مجموعے میں شامل ہیں۔ چند مشہور ہیں، چند غیر معروف۔ بعض شاعروں کا انتخاب بعض بہتر کیا گیا ہے، حالانکہ ان کے کلام کے نمونے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ ان میں آزاد نظمیں ہیں اور پابند بھی۔ آزاد نظمیں بری طرح آزاد ہیں۔ یہ مجموعہ بلا جلد اور ۲۰×۲۶ کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت لکھی نہیں ہے۔ دفتر ادارہ جدید ادب فیض آباد

سے طلب کیجیے۔

بط۔ فیل مرغ مصنف:- خواجہ عبد السلام صاحب دہلی۔ ملنے کا پتہ:- دار البلاغ محمود منزل لاہور۔ ۲۰×۳۰ کے ۲۲۴ صفحات۔ مجلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

اس سے قبل خواجہ صاحب کی تین کتابوں یعنی کامیاب مرغی خانہ، تجارتی مرغی خانہ اور طبیب فی خانہ پر اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ یہ اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ اس میں بط، بڑی بط، فیل مرغ، پیرو، مور، کبوتر، کناری، طوطے اور خرگوش وغیرہ کی پرورش اور نسل کشی پر بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ پولٹری فارم قائم کرنے والوں ہی کیلئے نہیں پرندوں کے شوقین حضرات کیلئے بھی اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ اور مفید ہو سکتا ہے۔ موضوع سے متعلق کئی تصاویر بھی شامل ہیں۔

جاپان کا صنعتی مستقبل

جگن ناتھ ماتھر

اس لڑائی میں شکست ہو جانے کے باعث ظاہر ہے کہ جاپان کے ہاتھوں سے اس کی نوآبادیات نکل جائینگی جنمیں کوریا اور فارموسا بھی شامل ہیں۔ ایسی صورت میں وہ تمام فائدے بھی ختم ہو جائینگے جو منچوریا اور چین میں اسے حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح اس کا سیاسی اقتدار صرف جاپان تک کیلئے محدود ہو کر رہ جائے گا۔ جاپان کا رقبہ برطانیہ سے تھوڑا ہی زیادہ ہے لیکن قدرتی ذرائع بالکل محدود بلکہ مفقود ہیں۔ اسلئے آئندہ چند سال کے دوران میں آٹھ کروڑ باشندوں کو اپنی بقا کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑیگی۔ پھر یہ آبادی، اگر قحط یا بیماری کے ذریعہ اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی، بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہیگی۔ کیونکہ موجودہ لوگ زیادہ تر نوجوان اور بچے پیدا کرانے کے اہل ہیں۔ اقوام متحدہ اگلے چند مہینوں میں فیصلہ کرینگی کہ ان صورت حالات کے ماتحت جاپان کے لئے کونسی اقتصادی حکمت عملی اختیار کی جائے پھر اسی حکمتِ عملی کے ماتحت جاپان کو دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے مستقبل کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔

اس موقعہ پر جاپان کے موجودہ اقتصادی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔ چین کے ساتھ جنگ چھڑنے سے قبل مقبوضہ آبادی کے تین کروڑ چالیس لاکھ افراد میں سے ایک کروڑ چالیس لاکھ کاشتکاری میں اور تقریباً چھ لاکھ ماہی گیری میں مصروف تھے۔ ان دو بڑی صنعتوں کے ذریعہ اشیائے خوراک اتنی کثیر مقدار میں دستیاب ہوتی تھیں کہ ان پر سب لوگوں کا گذارہ ہو سکتا تھا۔ اسلئے یہ تصور کرنا غلط ہے کہ جاپان اغذیہ کے ضمن میں اپنا کفیل آپ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دوسرے غیر ملکوں سے اس کے ملک میں درآمد کا سلسلہ بہت قلیل تھا لیکن کثیر مقدار میں اسے اپنی سلطنت کے دوسرے ملکوں کا دست نگر رہنا پڑتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اتنا چاول باہر سے آیا کہ وہ کل آبادی کے چھٹے حصے کیلئے پورا ہو سکتا تھا۔ اس چاول کی زیادہ مقدار کوریا اور فارموسا سے آئی۔ کھانے کی دوسری اہم چیزوں میں سے شکر فارموسا سے اور سیم وغیرہ منچوریا سے درآمد کی گئیں۔

ان باہر سے آنے والی اشیا کے نہ ہوتے ہوئے جاپان کے لئے اپنے معیار اغذیہ کو جو پہلے ہی بہت گر گیا ہے مزید کم کئے بغیر گذارہ کرنا مشکل ہے۔ چونکہ ملک کا بیشتر حصہ قدرتی طور پر پہاڑی ہے، کاشتکاری کے لائق زمین بہت ہی کم ہے اور اب ایسی افتادہ زمین بھی باقی نہیں ہے جسے اناج کے لئے استعمال کیا جا سکے کاشتکاری کے اعلیٰ پیدائش افزا ذرائع عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ہر مخصوص کاشتکار کے لئے تقریباً ڈھائی ایکڑ قطعۂ زمین ملا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ گذارے کے لئے دوسرے مختلف کام کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ریشم کے کیڑوں کی پرورش۔ کیونکہ جاپان میں ریشم کے کاروبار کو خام اشیاء کی صنعتوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

جنگ سے پہلے کاشتکاری میں حصہ لینے والے لوگوں کی تعداد عرصے تک ایک ہی حد تک قائم رہی۔ کیونکہ آبادی بڑھنے پر بھی فالتو لوگ تجارت اور صنعت و حرفت کے کاموں میں گھستے چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں یعنی جب چین کے ساتھ جاپان کی لڑائی شروع ہوئی تو تقریباً نوے لاکھ آدمی صنعت اور کان کنی میں لگے ہوئے تھے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ دس سال میں لوگوں نے صنعتی کاروبار میں بڑی تیزی کے ساتھ حصہ لیا۔ جاپان نے اپنے صنعتی کاروبار کی ابتدا پارچہ بافی سے کی۔ ۱۹۲۹ء میں اس سوتی کپڑے اور خام ریشم سے زبردست آمدنی ہوئی۔ اس سے اگلے دس سال میں خام ریشم کی پیداوار گھٹتی رہی لیکن سوت کا کام اسقدر پھیلا کہ کئی نئی قسم کے سوت اور ریشم ملے ہوئے کپڑے دائرۂ وجود میں آ گئے۔

اس کے بعد ان صنعتوں میں سے جنہوں نے ٹھوس قسم کی ترقی کی دھات اور انجنیئری کی قسم کی تجارتیں ہیں۔ اس کا ایک سبب ٹکنیکل ذرائع کی ترقی ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ منچوریا میں صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے بہت توجہ مبذول کی جا رہی تھی۔ کئی اور تجارتوں نے بھی ترقی کی۔ مثلاً ربڑ، کاغذ، شیشہ، ظروف سازی، ہوزری، ادویات وغیرہ۔

خام ریشم سے قطع نظر، ان صنعتوں کی بہت سی خام چیزیں باہر سے آتی تھیں۔ مثلاً کپاس، اون، پارچہ بافی کا دوسرا سامان لکڑی کا گودا، کچا لوہا دوسری دھاتیں، بناسپتی تیل، چمڑے اور کھالیں اور ربڑ۔ نیز جاپان اگرچہ قوت آبی اچھی مقدار میں تیار کر لیتا تھا، پھر بھی اسے کافی مقدار میں کوئلہ باہر سے منگانا پڑتا تھا۔ اسے ہر قسم کے تیل بھی غیر ملکوں ہی سے درآمد کرنے

پڑتے تھے - اس سے ظاہر ہے کہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو برسر روزگار اور معیارِ حیات کو قائم رکھنے کے لئے صرف ایسی صنعتوں کو دائرہ عمل میں لانا چاہئے تھا جن کے لئے وہ ضروری چیزیں مناسب شرائط پر لے سکتا -

۱۹۲۹ء تک جاپان نے درآمدہ چیزوں کی قیمت اپنے ملک کی چیزوں سے چکائی مثلاً خام ریشم امریکہ بھیجا اور سوتی کپڑے اور عام ضروریات کی دوسری چیزیں مشرقی ایشیا ہندوستان اور بحر جنوبی کے جزیروں میں بھیجی گئیں - پھر امریکہ میں عام کساد بازاری پھیلنے کے بعد جب جاپان سے خام ریشم کی برآمد میں کمی آگئی تو اسنے اپنی توجہ تیار شدہ چیزیں بھیجنے پر مبذول کی - سوتی پارچہ جات کے علاوہ ملوں کی برآمد کا سلسلہ بھی بڑھتا رہا - دوسری قسم کے کپڑے یعنی بنے ہوئے اون یا ٹسر کے کپڑے کے لئے بھی بازار کھل گیا اور ان کے ساتھ ہی ساتھ دوسری چیزوں کی تجارت بھی فروغ پانے لگی -

ایشیا اور بحر جنوبی کی غریب قومیں سستے داموں بکنے والی چیزوں کو اپنے لئے غنیمت سمجھنے لگیں - کچھ اہمیت اس وجہ سے بھی حاصل ہوئی - اس طرح جاپانی مال کی ترقی اور اس کی تجارت کے فروغ پا جانے پر مغربی ممالک کے دیرینہ صنعتی اداروں میں تشویش کے آثار پیدا ہونے لگے تاہم اس کی برآمدی تجارت کے باعث ایشیا بھر میں عام معیارِ حیات بلند ہونے لگا - اور اگر جنگ کے لئے کمر بستہ ہوکر جاپان اپنی اقتصادی حالت کو تباہ نہ کرلیتا تو یقیناً اسے مزید ترقی حاصل ہو جاتی - تیار شدہ مال کی بڑھتی ہوئی برآمد کے علاوہ جاپان کو اپنے بحری جہازوں کے بیڑے سے بھی زبردست آمدنی ہوئی -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل میں صورتِ حالات کیا ہوگی؟ اس کا جواب آسان ہے - کوریا، فارموسا اور منچوریا کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث جاپان کو اہم اشیائے خوراک ان علاقوں سے حاصل کرنی ہونگی جو اب اس کے سیاسی اقتدار و اختیار سے باہر ہیں - بالفاظِ دیگر وہ نوآبادیاتی کاروبار جو اچھے دنوں میں اس کے ملک کے لئے مفید تھا، غیر ملکی تجارت کی نوعیت اختیار کر گیا - اگر اسے ان ملکوں سے جو پہلے اس کی نوآبادیات کی حیثیت رکھتے تھے مساویانہ شرائط پر کاروبار کرنے کی اجازت دیدی جائے تب بھی اس کے لئے وہ سابقہ منفعت بخش صورت پیدا نہ ہو سکے گی -

تاہم اغلب یہ ہے کہ جاپان اپنے ان صنعتی اداروں کے بہت بڑے حصے کو تلف کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گا جو زمانۂ جنگ سے کچھ عرصے پہلے بڑی اہمیت حاصل کر گئے تھے - لیکن اس امر کا فیصلہ یہ معلوم کئے بغیر نہیں ہو سکتا کہ چین کو نئے ساز و سامان اور کلوں وغیرہ کی صورت میں تاوان جنگ دینے کے لئے جاپان کو کسی حد تک مجبور کیا جائے گا - صورتِ حالات کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ بیرونی تجارت کو بجنسہ قائم رکھنے کے لئے اسکے وہ بڑے بڑے صنعتی ادارے برقرار نہیں رہینگے - بلکہ ۱۹۲۹ء سے پہلے کی طرح باہر سے مال منگوانے کے لئے اسے دوسرے ملکوں کا دست نگر رہنا پڑے گا - اس کی تباہ شدہ بحری قوت اب اس لائق نہیں رہی ہے کہ اس کی برآمدی تجارت میں مفید ثابت ہو سکے -

ان نئے حالات کے ماتحت اپنی اقتصادیات کو سنبھالنے کے لئے اسے کیا کرنا پڑے گا؟ بلاشبہ اسے اشیائے خوراک کی درآمد میں حد درجہ کمی کرنی پڑے گی اور وہ اس طرح کہ جاپان کے زیادہ سے زیادہ باشندے زراعت اور ماہی گیری میں حصہ لیں اور زمانہ جنگ سے پہلے کے اعداد و شمار میں اضافہ کر دکھائیں - ہمیں معلوم ہے کہ اس نے تمام قابلِ زراعت اراضی میں کاشت شروع کر دی تھی اور اس فن میں نت نئے طریقے اختیار کئے تھے - اس طرح کھیتوں میں زیادہ مزدور لگا دینے سے نتیجہ اچھا نہیں رہیگا - دوسری طرف اگر روس نے شمالی سمندروں میں سے مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کر دی تو ماہی گیری کا کام بھی ختم ہو جائے گا - لہٰذا اس کے لئے آسان اور مفید صورت یہی ہے کہ ۱۹۲۹ء سے پہلے کے طریقے کار پر عمل پیرا ہو - یعنی یہ کہ وہ عام ضروریات کی صنعتوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول رکھے

غزل ——— سہیل ناروی

نکلے ارمان کیا مرے دل کا — سامنا ہو گیا ہے مشکل کا
راہ الفت میں کیا قدم اٹھیں — کچھ پتہ ہی نہیں ہے منزل کا
دردِ الفت میں سحر فرقت میں — حال کیا کیا ہوا مرے دل کا
بن گیا آسمان پر وہ شفق — خون جتنا گرا تھا بسمل کا
آکے پہلو میں وہ چلے بھی گئے — دل میں ارمان رہ گیا دل کا
آئینہ دیکھ کر اسے بھی دیکھ — حال کیا ہو گیا مقابل کا
ہو اگر آپ کی نگاہ کرم — کام بگڑا ہوا بنے دل کا
جا رہا ہوں عدم کو میں لے کر — سر پہ احسان تیغ قاتل کا
پانو رکھتے ہی راہِ الفت میں — لٹ گیا کارواں مرے دل کا
موسم گل رہے گلستاں میں — مدعا ہے یہی عنادل کا
کیا کہوں کیا گذر گئی جی پر — سامنا اس سے جب ہوا دل کا
بحرِ الفت میں اے سہیل نہیں — نہیں ملتا نشان ساحل کا

اور ایسی چیزوں کی کافی مقدار میں برآمدی تجارت شروع کرسکے جن کے تبادلے میں اسے حسب ضرورت خام اشیا اور کھانے کی چیزیں دوسرے ملکوں سے مل سکیں لیکن اس کوشش میں کامیاب ہونے کیلئے اسے جنگ سے پہلے کی بہ نسبت اپنی تجارت میں غیر معمولی اضافہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ اسکی آبادی بڑھ چکی ہے، اور غیر ملکی آمدنی کی صورتیں اب اس کے لئے ممکن نہیں ہوسکیں گی۔

تاہم اپنے کاروبار کو پرانے ڈھرے پر چلانے کے لئے اسے بہت سی اہم رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ۱۹۲۹ء میں جاپان کی برآمدی تجارت کا ⅓ حصہ خام ریشم تھا اور یہ تجارت اپنی جگہ اس لئے بھی منفرد کہی جاسکتی ہے کہ اس کے لئے کوئی خام شے باہر سے منگانی نہیں پڑتی تھی۔ تاہم ۱۹۴۱ء تک ریشمی مال کی تجارت بہت گر چکی تھی، اور اب بھی نائلن کے سلسلے میں موجودہ مقابلے کے پیش نظر اغلب یہی ہے کہ اس کی حالت بالکل نہ پنپ سکے۔ غرض یہ ہے کہ اگر جاپان کافی مقدار میں اشیائے خوراک اور خام چیزیں لینی چاہتا ہے تو اسکے لئے لازمی ہے کہ وہ زمانہ گزشتہ کے مقابلے میں اب بہت زیادہ مقدار میں تیار شدہ سامان باہر بھیجے۔ ایسے مال میں سب سے زیادہ پارچہ جات شامل ہوسکتے ہیں اور دوسری متفرق چیزیں مثلاً ربڑ کا سامان دھات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں، ظروف، موزہ بنیان، کھلونے، اور روشنی کیلئے بجلی کا سامان۔ اگر تبادلے کا یہ سلسلہ قائم کرلیا گیا تو اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ چند ہی سال میں مغربی دنیا کی بہت سی صنعتوں کو ایسا زبردست نقصان پہنچیگا کہ وہ زمانہ جنگ سے پہلے کے نقصان سے بھی زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اس لحاظ سے انکا شائد ہی اسکے مقابلے میں پورا نہیں اتر سکیگا۔ تاہم اگر جاپان کیلئے یہ ممکن نہ ہوا یا اسکو اس راہ عمل پر ترقی کرنے کی اجازت نہ ملی تو یہ اندازہ لگانا محال ہے کہ پھر اسکے لئے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ نتیجے کے طور پر معیار حیات گر جائے یا قحط رونما ہو جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جاپان کو جس نے اپنے پاؤں میں خود ہی کلہاڑی ماری ہے، یہ حق حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ فاتح اقوام کی اقتصادی حالت میں رخنہ ڈالدے اسے یہ موقع دیا جائے کہ وہ ان مشکلات میں دوسروں کو پھنسا دے جو اسنے جان بوجھ کر اپنے سر لی ہیں۔ جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خود دوسرے ملک بھی اپنی صنعتی مشکلات کو دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی حل سوچ رہے ہیں۔ مزید غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ ایسے مسئلے کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اقتصادی حکمت عملی کے عام اصولوں سے قطع نظر اقوام متحدہ کے پیش نظر یہ امر ہمارے مفاد کے بالکل خلاف ہے کہ مشرق بعید میں قحط و مصیبت کا کوئی مرکز قائم ہو جائے۔ دوسری بات یہ کہ یہ امر ہرگز مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ایشیائی غریب لوگوں کو عام ضروریات کے اس سستے سامان سے محروم کر دیا جائے جو جاپان خام اشیا کے بدلے میں آسانی سے فراہم کرسکتا ہے۔

بہادر شاہ کا حقہ

اس عنوان سے حضرت خواجہ حسن نظامی کا ایک مقالہ اسی ماہ آجکل میں شائع ہوا تھا۔ سہواً اس کی چند آخری سطریں کتابت ہونے سے رہ گئیں جو حسب ذیل ہیں۔ قارئین اضافہ فرمالیں۔

"رسالہ آجکل دہلی کے سالنامے کے لئے یہ چند سطریں اسلئے لکھی ہیں کہ میرے جذبات پچاس برس پہلے جو کچھ تھے وہی جذبات آجکل بھی جوں کے توں موجود ہیں۔ لہٰذا میں آج بھی وہی ہوں جو کل تھا اور کل بھی وہی ہونگا جو آج ہوں یعنی میں آج بھی ہوں۔ اور کل بھی ہوں بلکہ خاموش ہونے سے پہلے کہنا چاہیئے کہ میں "انا الحق" نہیں کہتا مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ میں خود "آجکل" ہوں۔"

سوانح دوربین: ——— بقیہ صفحہ ۴۸

پر مادے کی کیفیات کا مطالعہ کرنے کے لئے سوانح دوربین ایسی کھڑکی کی مانند ہوتی ہے جس میں سے ہم ستاروں کی تجربہ گاہوں پر نظر ڈال سکتے ہیں۔

اس دوربین کو دیکھنے کے لئے دنیا کے ہر حصے سے ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں دوربین کی دریافتیں بتائی جائیں۔ ان پچیس ہزار آدمیوں کے لئے جو ہر سال ماؤنٹ ولسن پر آتے ہیں ایک عجائب خانہ بنایا گیا ہے۔ جہاں اس دوربین کی دریافتوں کی نمائش ہوتی ہے۔ ہر ہفتہ باہر کے لوگوں کو سمجھانے کے لئے لیکچر ہوتے ہیں جس میں ماؤنٹ ولسن کی رصدگاہ کی تحقیقوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور فلکیات پر سوالات کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ ان سوالات میں سے بعض بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایک خاتون ستاروں کے بارے میں سوال پوچھ رہی تھی۔ وہ ان کے بڑے بڑے فاصلوں پر حیران تھی۔ اتنے بڑے فاصلے اس کے ذہن میں نہ سماتے تھے۔ آخر اس نے پوچھا "مجھے ایک بات اور بتا دیجئے۔ اگر ستارے کروڑوں میل کے فاصلے پر ہیں تو آپ نے ان کے نام کیونکر معلوم کئے؟"

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ حال و قال ——— حضرت سیماب اکبر آبادی
۲۔ جان بیرڈ (مع تصویر) ——— مشیر احمد
۳۔ آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط ——— جناب سید اقبال عظیم
۴۔ قاتلہ (مصری افسانہ) ——— جناب صلاح الدین قریشی دہلوی
۵۔ حشر کا ڈرامہ ——— جناب عشرت رحمانی
۶۔ ترجیح (افسانہ) ——— جناب دیویندر ستیارتھی
۷۔ نئی شاعری ——— جناب شوکت تھانوی
۸۔ الیانیہ ——— جناب کرشن چیتنیہ
۹۔ ہندوستان میں شکر سازی ——— جناب [illegible]

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپا کر ادارہ مطبوعات حکومت ہند نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا۔

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۷ | فہرست | یکم ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ: آغا محمد یعقوب دواشی بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی

ناشر: راجیند ناتھ شیدا ایم۔ اے

مدیران: فضل حق قریشی دہلوی — مشیر احمد ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ دہلی

سفر حج اور ہوائی جہاز

اس سال تقریباً نو فیصدی حاجیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعہ حجاز لیجانے کے انتظامات عمل میں آرہے ہیں۔ پہلا اجتماع شروع ہونے سے تین ہفتے قبل جدہ پہنچے گا۔ حج سے پہلے ہی ان حاجیوں کو زیارت مدینہ کرادی جائے گی اور حج ختم ہوتے ہی وہ واپس آجائیں گے۔ دوسرا اجتماع حج شروع ہونے سے چند ہی دن پہلے جدہ پہنچے گا۔ اس میں جانے والے حاجی حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ شریف کی زیارت کریں گے۔ ان کی واپسی تین ہفتے بعد عمل میں آئے گی۔ حکومت ہند نے ہوائی جہازوں کی کمپنیوں سے جہاز کرائے پر مانگے ہیں۔ یہ سفر صرف اسی وقت شروع ہو سکے گا جبکہ ہر پھیرے کے لئے پورے ۳۲ مسافر اپنی اپنی نشستیں مخصوص کرالیں۔ ہر حاجی کا کل خرچ جس میں آنا جانا شامل ہے تقریباً چار ہزار روپے ہوگا۔ ہر مسافر اپنے ساتھ پچاس پونڈ وزن لے جاسکے گا۔ دو سال سے کم عمر کے بچوں سے کرایہ کا دس فیصدی لیا جائے گا لیکن اسباب میں کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ دو سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو پورا کرایہ دینا ہوگا۔ انھیں علیحدہ سیٹ بھی مل سکے گی۔ پردہ نشین خواتین کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں ہوگا۔ سفر کا معیار بالکل وہی ہوگا جو عام یورپین مسافروں کیلئے ہوا کرتا ہے۔

ارجنٹائن کی مکئی

حال ہی میں ہندوستان کا خوراکی وفد دیوان چمن لال کی قیادت میں ارجنٹائن پہنچا ہے۔ خط و کتابت ہی کے ذریعہ تین لاکھ ٹن مکئی ہندوستان کے لئے خریدی جاچکی ہے۔ اس میں سے ساٹھ ہزار ٹن مکئی جہازوں پر لادے جانے کے لئے بندرگاہ پر موجود ہے صرف برآمدی لائسنس ملنے میں کسی قدر دشواری کا سامنا ہو رہا ہے۔ دیوان صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ارجنٹائن کی حکومت اس لائسنس کے جاری کرنے میں کیوں تاخیر کر رہی ہے۔ تاہم انھیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد اس مرحلے کو طے کرلیں گے۔ اور باقی دو لاکھ چالیس ہزار ٹن مکئی بھیجنے کا انتظام بھی ممکن ہو جائے گا۔ وہ اس ملک کی حکومت سے دوسری اشیائے خوراک خریدنے کے لئے بھی بات چیت کریں گے۔ ان میں چاول بھی شامل ہوگا۔

ان چیزوں کے تبادلہ میں اس کو کپڑا اور ٹاٹ وغیرہ دیا جائے گا۔ وفد مذکور جنوبی امریکہ جانے سے پہلے ایکویڈور سے بھی چاول خریدنے کی کوشش کریگا۔ ارجنٹائن میں غلے وغیرہ کی اس قدر بہتات ہے کہ لڑائی کے زمانے میں مشینوں کو چلانے کے تیل نہ ملنے کی صورت میں تقریباً بیس لاکھ ٹن مکئی اور چھیانوے ہزار ٹن گیہوں جلا دینا پڑا۔ لیکن اس سے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اناج بیچنے والی کمپنیاں بہت فائدے میں رہیں۔ نیز روشنی اور حرارت فراہم کرنے والے کارخانے بدستور کام کرتے رہے۔

جرمنی میں ہندوستانی

سرکاری ریکارڈ کے مطابق ننانوے ہندوستانی جنگ چھڑنے کے وقت جرمنی میں موجود تھے۔ ان میں سے اٹھتر اشخاص کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ اکھتر اب بھی جرمنی میں موجود ہیں۔ دو ڈنمارک میں ہیں اور باقی پانچ کا تبادلہ عمل میں آچکا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ باقی لوگوں کا بھی سراغ مل جائے۔ اس سلسلے میں ایک وفد جس کے قائد میجر جنرل اسٹوورٹ ہیں۔ جرمنی میں تحقیق و تفتیش کر رہا ہے۔ اس کے ذمے تین اہم کام ہیں۔ اول جرمنی کے ہتھکنڈوں کا مطالعہ کرنا خصوصاً اس اعتبار سے کہ دوران جنگ میں کن چالبازیوں کے ساتھ جرمن دستوں نے ہندوستانی دستوں کا مقابلہ کیا۔ ہندوستانی اسیران جنگ کو تلاش کرنا جو لاپتہ اشخاص کی فہرست میں شامل ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو اپنے وطن یا کسی دوسری جگہ پہنچنے میں مدد دینا۔ نصف سے زیادہ ہندوستانی واپس آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ باقی سہولت سفر نصیب ہوتے ہی وطن بھیجدیے جائیں گے۔ ان ہندوستانیوں کی قبریں جو جرمنی میں مارے گئے، سرفہرست لائی جارہی ہیں۔ فیصلہ ہوا ہے کہ ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک عمارت تعمیر کردی جائے۔ ان تین ہندوستانیوں میں سے جو دوران جنگ میں برلن سے اردو زبان کی تقریریں نشر کرتے تھے ڈاکٹر فاروقی اور مسٹر حبیب الرحمن برطانوی علاقے میں مقیم ہیں ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جارہی ہے سوائے اس کے کہ وہ ہر مہینے میں دو بار فوجی حکام کے سامنے آکر اپنی موجودگی کا

ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مسٹر عبدالرؤف ملک سقوط المانیہ کے وقت برلن میں موجود تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ لاپتہ ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسوقت روسی ترکستان میں ہیں۔

انگریز عورتیں مردوں کے دوش بدوش

برطانیہ کی مقامی حکومتوں کے ہر شعبے میں عورتوں کی عملی سرگرمیاں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اس وقت وہ مردوں کے بالکل دوش بدوش ہیں۔ اکیس یا اکیس سال سے زیادہ عمر کی ہر عورت کو رائے دینے یا انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ پورے اعداد و شمار کا علم نہیں تاہم یہ یقین ہے کہ رائے دہندگی کے سلسلے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں مجلس بلدیہ کا انتخاب ہوا تو لندن کے دس انتخابی علاقوں میں عورتوں کے چار لاکھ چونتیس ہزار اور مردوں کے تین لاکھ باون ہزار ووٹ تھے۔ ایسی مجالس کے اراکین میں بھی عورتیں اپنے قدم جما رہی ہیں۔ بلکہ کئی شہروں میں تو انھوں نے میئر تک کی حیثیت حاصل کرلی۔ مثلاً لورپول میں جو انگلستان کا چوتھا بڑا شہر ہے ایک ہی عورت نے دوبار "لارڈ میئر" کے عہدے پر کام کیا۔ اس میں شک نہیں کہ عورتیں ایسے عہدوں پر زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں کیونکہ شہری نظام کے بہت سے شعبے عورتوں ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا عمل دخل دفتروں میں بھی بڑھ رہا ہے۔ اعلیٰ افسران کی اسامیوں سے لے کر معمولی محرروں تک وہ ہر جگہ چھا گئی ہیں۔ اسکی ایک خاص وجہ ہے۔ لڑائی چھڑ جانے پر مقامی حکومتوں کے ایک لاکھ پچاس ہزار میں سے تقریباً پچاس ہزار افسران میدان جنگ میں بھیج دئے گئے۔ قدرتی طور پر ان کی جگہ عورتوں نے لے لی۔ ان سرکاری ملازمتوں سے قطع نظر مختلف اقسام کے کاروبار میں بھی ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے ہر کام میں ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ دماغی قابلیت اور جسمانی قوت، دونوں لحاظ سے مردوں کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

ایرانی کابینہ کے نو نکات

ایران کی نئی حکومت کے لائحہ عمل میں جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مرتب کیا گیا ہے نو نکات خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں۔ وزیر اعظم قوام السلطنت نے اس سلسلے میں ایک اعلان حال ہی میں فرمایا ہے۔ وہ اہم نکات حسب ذیل ہیں:-

(۱) ملکی اقتصادیات کی تنظیم اور سرمایہ لگانے کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرنا (۲) بجٹ کی رقم کے بہت بڑے حصے کو تعلیم، حفظان صحت اور زراعت کی ترقیوں کے ضمن میں صرف کرنا (۳) جمہوری اصولوں اور اقوام متحدہ کے میثاق کے مطابق قوانین ملک میں اصلاح کرنا (۴) ان لوگوں کو سزائے موت دینا جو سرمایۂ عوام کو ضائع کریں یا جو مسلح ہوکر لوٹ مار مچائیں (۵) باغیوں کو مناسب سزائیں دینا (۶) زمینداروں اور کسانوں کے مابین تعلقات استوار کرنا (۷) زراعتی طریقوں میں اصلاح اور کسانوں میں اراضیات تقسیم کرنا (۸) ملک کے نظام زر میں اصلاح پیدا کرنا۔ اور (۹) عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دوسرے مفید کام انجام دینا۔

نیستی میں آٹا گیلا

اسوقت دنیا بھر میں خوراک کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کرگیا ہے حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جن کے پاس غلہ ہمیشہ فالتو مقدار میں جمع رہا ہے اور وہ اس سے دوسرے ملکوں کی مدد کرتے رہے ہیں اسوقت اپنے کھیتوں کے خزاں رسیدہ مستقبل کا اندازہ لگا کر بیقدر پریشانی ظاہر کر رہے ہیں ہر جگہ کوشش کی جارہی ہے کہ اناج کا ایک دانہ یا روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ضائع ہونے نہ پائے لیکن بعض دفعہ قدرت کا کھلنڈرا پن انسانی منصوبوں میں رخنہ ڈالدیتا ہے۔ حال ہی میں ایک اطلاع ملی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس اطلاع نے بڑی مایوسی پیدا کردی ہے کہ امریکہ کا ایک جہاز جو امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک لے کر برطانیہ کی جانب روانہ ہوا تھا بحرالکاہل میں ایک دوسرے جہاز سے ٹکرا کر نذر امواج ہوگیا۔ نہ سامان بچا نہ سامان لے جانے والے۔ اس آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک میں پانچ ہزار چار سو پچاس ٹن گیہوں بھی شامل تھا۔ ہرچند یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ قحط کے زمانے میں اسے ایک نعمت سمجھا جاسکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں نیستی میں آٹا گیلا ہونا۔

ترکی کابینہ کا نیا دور

گذشتہ ماہ بالکل غیر متوقع طور پر ترکی میں سراج اوغلو کی وزارت نے استعفےٰ دیدیا۔ صدر جمہوریت عصمت انونو نے نئی کابینہ تیار کرنے کے لئے ایم پیکر کو دعوت دی جو کچھ عرصہ پہلے قومی مدافعت اور امور داخلی کے وزیر تھے۔ انھوں نے مئی ۱۹۴۳ء میں ناسازی طبع کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفےٰ دیا تھا۔ انھوں نے صدر جمہوریت کا دعوت نامہ ملنے پر ارباب سیاست سے گفتگو شروع کردی ہے۔ قیاس ہے کہ سراج اوغلو کی وزارت کا کوئی رکن نئی کابینہ میں شریک نہیں کیا جائے گا سوائے حسن سَقا کے جو وزیر خارجہ تھے۔ ڈاکٹر سراج اوغلو کی وزارت کا نام "پیپلز ری پبلکن پارٹی" تھا اور اس کو ترکی کی قومی مجلس میں اکثریت حاصل ہے۔ ابھی دو مہینے ہوئے نئے انتخابات میں اس جماعت کے اراکین کو ۳۹۶ نشستیں حاصل ہوئی تھیں جبکہ مخالف جماعت کے صرف ۶۲ امیدوار منتخب ہوسکے۔ مخالف جماعت کا نام "ڈیموکریٹک" پارٹی ہے۔ یہ صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ہے ورنہ کمال اتاترک کے زمانہ سے صرف ایک ہی جماعت برسر اقتدار رہی اور اسی نے کثرت رائے کے ساتھ ترکی کی قسمت کے ہر معاملہ کا فیصلہ کیا۔ سراج اوغلو کے استعفےٰ کے دوسرے ہی دن

صدرِ جمہوریت کا انتخاب عمل میں آیا۔ اکثریت کی بنا پر جنرل عصمت انونو ایک بار پھر صدر مجلس منتخب ہو گئے۔ اس سلسلے میں بھی رائے دہندگی کی صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ورنہ یہ انتخاب ہمیشہ اتفاق رائے سے ہوا ہے۔ مخالف جماعت کے اراکین نے مارشل چقماق کے حق میں ووٹ دئے۔

چین اور ہندوستان میں تجارت

فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان سے ایک تجارتی وفد چین گیا تھا۔ چھ ہفتے میں اس کے اراکین نے آٹھ ہزار میل کا ہوائی سفر کیا۔ اس اثناء میں اہم صنعتی مرکزوں کا دورہ کرنے کے علاوہ انھوں نے چین کے مشہور تاجروں اور سرکاری افسروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ جنرلیسمو چیانگ کائی شیک سے بھی ملے جنھوں نے ہندوستانی معاملات میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وفد مذکور کا خیال ہے کہ اشیائے خام کی کمیابی اور ذرائع حمل و نقل کے فقدان کے باوجود یہ امید قائم کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں چین اور ہندوستان کے مابین حسب سابق تجارتی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ شروع میں ان کا ندر زیادہ نہیں ہو سکے گا لیکن یہ کمی عارضی رہے گی کیونکہ ہندوستان کی بہت سی چیزیں چین کے لئے ضروری ہیں۔ جرمنی اور جاپان کو ایک مدت طویل کے لئے چین کی منڈیوں سے نکالا مل گیا ہے۔ اب ہندوستان ہی چین کی ضروریات پوری کر سکے گا۔ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ چین اور ہندوستان کے تعلقات کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ یہ رشتہ صدیوں پہلے سے قائم ہے۔

دو ہزار سال پرانی لاش

مارلبورو کے قریب علاقہ فاہلڈین میں چند مزدور ایک کھائی کھود رہے تھے کہ اچانک ایک شخص کی لاش برآمد ہو گئی۔ ماہرین علم الاجسام نے تحقیقات کے بعد اندازہ لگایا کہ وہ شخص تقریباً دو ہزار سال پہلے زندہ تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔ مرنے کے وقت اس کی عمر تقریباً ستر سال تھی لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے منہ میں پورے دانت موجود تھے۔ اس لاش کو دیکھ کر اس قدیم زمانے کے لوگوں کے قد و قامت، عمر اور عام جسمانی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ علمی تحقیقات کے سلسلے میں کوئی ایسی دریافت بیش بہا خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھی جا سکتی ہے۔

وھیل مچھلی کا شکار

دنیا بھر میں مختلف روغنوں اور چربیوں کی کمی محسوس کرتے ہوئے جنرل مک آرتھر نے جاپانیوں کو اجازت دیدی ہے کہ جنوبی سمندروں کی طرف جا کر وھیل مچھلی کا شکار دوبارہ شروع کر دیں۔ انھوں نے ایک مختصر سا بحری بیڑا استعمال کرنے کا اختیار دیدیا ہے جس میں کارخانوں کے دو جہاز، وھیل مچھلی کے بارہ شکارے اور باربرداری کی سات کشتیاں شامل ہیں۔ یہ اجازت ماہ دسمبر سے ماہ مارچ تک کے لئے ہے۔ کیونکہ اس قسم کے شکار کے لئے یہی مناسب موسم ہے۔ اس مچھلی کا گوشت اور تیل کثیر مقدار میں صرف ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں میں جزو بدن بننے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ گوشت کا زیادہ حصہ جاپان ہی کی منڈیوں میں ختم ہو جائیگا البتہ اس کی چربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی بھیجی جائے گی۔ ان کا یہ دورہ تقریباً چھ ہزار میل کے دائرے میں لگے گا اور وہ مقررہ چار ماہ کے اندر بڑی تعداد میں مچھلیاں مار کر دنیا بھر کی ضرورت پوری کر سکیں گے۔

ہندوستان کی امداد کیلئے پرزور اپیل

ہم آجکل کے پچھلے شمارے میں امریکہ کے اس خوراکی وفد کی بابت اظہار خیال کر چکے ہیں جو غیر سرکاری طور پر غذائی صورت حالات کا مطالعہ کرنے ہندوستان آیا تھا۔ اب چند دن ہوئے اس کے ایک رکن مسٹر جوزف ولکن نے جن کو بہت قریب سے ہندوستان کے صحیح حالات کے مطالعے کا موقع ملا تھا نہایت پرزور الفاظ میں حکومت امریکہ، خصوصاً ورلڈ فوڈ کونسل سے اپیل کیا ہے کہ ہندوستان کو ۳۱ دسمبر سے پہلے پہلے ۲۰ لاکھ ٹن اناج لازمی طور پر مل جانا چاہئے۔ ان کا بیان ہے کہ اگر جلدی ہی اس امداد کا سلسلہ شروع نہ کیا گیا تو آئندہ رونما ہونے والا قحط ایک قومی سانحۂ عظیم کی صورت اختیار کرے گا۔ مسٹر ولکن نے راشننگ کے موجودہ نظام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اناج کاشتکاروں سے حاصل کرنے اور عوام میں تقسیم کرنے کے اتنے اچھے طریقے اختیار کئے گئے ہیں کہ اب ۱۹۴۳ء والے حادثۂ بنگال کی بازگشت کسی حصۂ ملک میں ممکن نہیں ہو سکے گی۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء کی شام کو چار بجے دنیائے ادب کے مشہور و معروف مصنف ایچ جی ویلز کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۹ سال تھی۔ موصوف کو عرصۂ دراز سے ذیابیطس کی شکایت لاحق تھی اور انجام کار یہی موذی مرض ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ سائنس، سیاست، تاریخ اور ناول نگاری کے میدان میں ویلز کو اتنا بلند مرتبہ حاصل تھا کہ اب سرزمین برطانیہ ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا کر سکے گی۔ انھوں نے غور و فکر کی ایسی نئی راہیں نکالیں کہ متمدن دنیا کا کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مندرجہ بالا موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں موجود ہیں جن کا مطالعہ لاکھوں آدمی کر چکے ہیں۔ سینما کی دنیا میں ان کی کہانیوں پر تیار کئے ہوئے کئی فلم بھی بے حد مقبول ہو چکے ہیں۔

حال و قال

سیماب اکبرآبادی

فسردگی یاس کی ہے دل میں شگفتگی کا خیال بھی ہے — یہ آئینہ ماندہی نہیں ہے اس آئینے میں تو بال بھی ہے

ہے سہل اس کا وصال لیکن، یہ حال ہو تو محال بھی ہے — تجھے تو ہے فکر ما سوا بھی، تجھے تو اپنا خیال بھی ہے

عروجِ عالم ابھی ہے مشکل، عروجِ عالم محال بھی ہے — ابھی تو دنیا میں آدمیت ذلیل بھی پائمال بھی ہے

نشاطِ منزل میں کھونے والو تمہیں کچھ اس کا خیال بھی ہے؟ — تمہاری اس رہ گزار میں اک مسافرِ پائمال بھی ہے

ہے تیرا ہی آئینہ یہ انساں، تو کیوں اسی میں تجھے نہ دیکھوں — اسی میں تیرا جمال بھی ہے، اسی میں تیرا جلال بھی ہے

وہی تباہی ہے یا الٰہی، وہی ہے جینا وہی ہے مرنا — ہے داستانِ طویل دنیا، مگر کچھ اس کا مآل بھی ہے

تمہاری محفل میں باریابی ہے قابلِ رشک کامیابی — اگر نہ ہو ناگوارِ خاطر تو حسرتِ عرضِ حال بھی ہے

فقیر مجھ کو سمجھ کے، خاموش بیٹھے، کیا منہ کو تک رہے ہو؟ — زبان دی ہے تو یہ بھی پوچھو کہ تیرا کوئی سوال بھی ہے؟

خموش و سرگشتۂ تحیر نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے — جو تیری تصویر کی ہے صورت وہی تصور کا حال بھی ہے

وہ اک جمالِ لطیف و تنہا اور اس پہ ہنگامۂ تماشا! — خیال سب کو ہے اپنا اپنا، کسی کو اس کا خیال بھی ہے؟

وہ دل میں پیوستہ جلوہ گر ہو تو روح بھی اس سے بہرہ ور ہو — یہی تقرب کا ہے خلاصہ، یہی مرادِ وصال بھی ہے

خزاں ہے دیباچۂ بہاراں، ہے آخرِ شب سحر کا عنواں — زوال سے تو ہے کیوں پریشاں، زوال ہی میں کمال بھی ہے

ملال سے بھی تجھے خوشی ہو، اگر سمجھ لے یہ بات میری — خوشی میں تھا جو شریک تیرا، وہی شریکِ ملال بھی ہے

ہے سبزہ پژمردہ، میں ہوں آزردہ، آشیاں ہے شرار خوردہ — کلی فسردہ ہے پھول مردہ، چمن میں کوئی نہال بھی ہے؟

یہ نہرِ تسنیم و حوضِ کوثر، یہ صاف شیشے، یہ پاک ساغر! — یہاں کہیں خستہ و شکستہ ہمارا جامِ سفال بھی ہے؟

میں طور و موسیٰ کے دور ہی سے جلال کا آپ کا ہوں قائل — یہ صرف ہے پاسِ پردہ داری کہ اعترافِ جمال بھی ہے

میں اہلِ کردار بھی ہوں سیماب، مردِ گفتار ہی نہیں ہوں

یہ خاصہ ہے مری غزل کا کہ حال بھی اور قال بھی ہے

ٹیلی ویژن دیکھی ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے مسٹر بیرڈ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اس عجیب و غریب کام کو سر انجام دیا؟

اس تجربہ کا عام مظاہرہ کئی بار کیا گیا۔ سب کو کامیابی کا یقین ہوگیا! اب روپیہ کی بھی کمی نہ رہی تھی۔ چنانچہ بیرڈ وہ تنگ کمرہ چھوڑ کر ایک بڑی وسیع جگہ چلا گیا جہاں تجرباتی سامان زیادہ سے زیادہ سما سکتا تھا پہلے تجربے میں آدمی کی تصویر ایک سے دوسرے کمرے میں نظر آئی تھی لیکن دو سال بعد تصویر دو میلوں کی دوری پر نظر آگئی۔ پھر نہ صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا بلکہ ہونٹوں کی تمام حرکات صاف طور پر دکھائی دینے لگیں۔ بیرڈ کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ وہ برابر اسی دھن میں لگا رہا کہ اس آلہ میں زیادہ سے زیادہ قوت اور کمال پیدا کرے۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۸ء میں ترقی کی یہ منزل آگئی کہ جن لوگوں کی تصویریں نیویارک میں دیکھی گئیں وہ بالکل اصل کے مطابق تھیں اور دیکھنے والوں نے ان کو فوراً پہچان لیا۔ ایک اور دشوار گزار وادی اگلے سال طے ہوگئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاز کی حرکات اور ہوا کی خلل اندازیاں بھی اس سلسلہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ وہ اس طرح ہوا کہ جہاز "بیرنگاریا" کے وائرلیس آفیسر مسٹر [illegible] نے اپنی منگیتر کو پردے پر دیکھ لیا جو اس وقت لندن میں تقریباً ہزار میل کے فاصلہ پر ٹرانسمیٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ اب تصویر میں رنگ بھی آنے لگے تھے۔

بیرڈ کی یہ شاندار کامیابی دیکھ کر امریکہ اور یورپ کے سائنسدان پوری تن دہی کے ساتھ اس طرف لگ گئے یہاں تک کہ بعضوں کو خیال ہونے لگا کہ اب برطانیہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیگا۔ ۱۹۳۰ء میں بی بی سی سے ٹیلی ویژن کا خاص پروگرام پابندی کے ساتھ ہونے لگا مگر محسوس کیا گیا کہ کام زیادہ اطمینان بخش طریقہ پر نہیں ہو رہا ہے اسلئے ۱۹۳۴ء میں ایک مجلس مشاورت مقرر ہوئی۔ اسکی کوششیں اگست ۱۹۳۶ء میں بارآور ہوئیں۔ حتیٰ کہ آج انگلستان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہاں بہترین اور جدید ترین آلۂ غائب بینی موجود ہے۔ برطانوی ٹیلی ویژن کا مرکز الگزانڈرا پیلس ہے۔

اس ایجاد سے فارغ ہوکر بیرڈ نے ٹیلی ویژن بینی فلمز کی ریسرچ کا کام شروع کر دیا تھا اسکی انتہائی ترقی اور تکمیل اسکے سامنے نہ ہو سکی۔ ٹیلی ویژن کو وہ مکمل شکل ۱۹۴۶ء میں دیکھنا چاہتا تھا ۱۹۴۵ء میں وہ ٹیلی کرم بھی ایجاد کر چکا تھا۔ جان بیرڈ کی کوششوں، احسانات اور خدمت خلق کے جذبہ کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دنیا کو یہ مفید اور لذیذ تحفہ دینے کے لئے جان بیرڈ نے رات دن ایک کر دیئے تھے اسی دھن میں انھوں نے کئی کئی روز فاقے بھی کئے اور لوگوں کے آگے ہاتھ بھی پھیلایا۔ اس میں انکی کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے صرف خدمت خلق کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ مسٹر بیرڈ جسکا ٹیلی فون [illegible] محض بے رحمی کے ساتھ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا آگے چل کر ایک ایسی چیز کا موجد ہوا جس کو دنیا ہمیشہ حیرت سے دیکھتی رہے گی۔ جان بیرڈ کا انتقال اٹھاون سال کی عمر میں ۱۴ جون ۱۹۴۶ء کو بکس ہل کے مقام پر ہوگیا۔

باد شمال — خورشید اسلام

جس پہ ہے آج ہمیں ریزۂ مینا کا گماں
یہ جہاں بادۂ گلرنگ کبھی تھا کہ نہیں
یوں تو ہمدم یہ جہاں خون بھی ہے سنگ بھی ہے
موجۂ خون رگ سنگ کبھی تھا کہ نہیں
جس تلاطم میں ہے آواز مگر سوز نہیں
اس تلاطم میں بھی آہنگ کبھی تھا کہ نہیں

جو مرے شیشے میں باقی ہے وہ آنسو بھی نہیں
تیرے شیشے سے جو چھلکی تھی وہ مے کیا ہوگی
جو مرے ساز سے نکلی ہے نوا سے کم ہے
جو ترے ساز سے نکلی تھی وہ لے کیا ہوگی
نرم کرنوں میں لجاتی ہوئی نرگس کا خمار
اے مرے دیدۂ بے خواب وہ شے کیا ہوگی

نہ فسوں ہے نہ فسانہ نہ تسلی نہ فریب
تجھ پہ اے پیر مغاں ناز کریں یا نہ کریں
دل میں پرواز کی حسرت تو ہے اے جذبۂ دل
ہمنفس ہمت پرواز کریں یا نہ کریں
سر میں یہ دور قیامت ہے تو اے تشنہ لبی
پھر نئے دور کا آغاز کریں یا نہ کریں

غم کے خم تیرہ ہیں خیال مے و مینا کے نثار
غم کے خم تیرہ ہیں ادھر باد شمال آتی ہے
میکدہ آج کف دست پہ نلپے تو نہیں
اس خرابے سے مگر بوئے جمال آتی ہے
لاؤ تیشہ کہ در میکدہ پھر باز کریں
میکشو آؤ کہ وہ جان وصال آتی ہے

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط

سید اقبال عظیم

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی فطرت کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کے لئے اب کسی مزید استدلال کی ضرورت باقی نہیں۔ اس لئے کہ چھان بین کرنے والوں نے جدید تحقیقات کی روشنی میں جو معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ اس بات پر بالتصریح دلالت کرتی ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کا کوئی جز بھی ایسا نہیں جو قدرت کے اس اٹل قانون کا پابند نہ ہو۔ یہ چیز دوسری ہے کہ ہمارا فطری رجحان اپنے میدان عمل میں اپنے مذاق کے مطابق ایک نئی شاہراہ اختیار کرلے لیکن اس امتیازی صورت میں بھی جو چیز سب سے پہلے ہمارا سہارا بنتی ہے وہ ہمارے گرد و پیش کے تاثرات ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا ماحول ایک سانچہ ہے جس میں ہمارے ذوق سلیم کی تکمیل ہوتی ہے، ایک سرچشمہ ہے جس سے احساس لطیف سیراب ہوتا ہے، ایک پس منظر ہے جس کے اشارے پر زندگی رقص کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ادیب کا ادبی کارنامہ۔ کسی شاعر کا شعر۔ کسی مصنف کی تصنیف یا کسی اہل فن کا فنی شاہکار تصویر ہوتی ہے ان تاثرات کی جن کی آغوش میں اس کی ذہنی قوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اپنی انفرادی صلاحیتوں کے باوجود یہ کام اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ان تاثرات سے دامن بچاکر نکل جائے۔ اس کے ہر لفظ میں اس کے گرد و پیش کی جھلک اور اس کے ہر نقش میں اس کے ماحول کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بذات خود اس چیز کا علم نہ ہو لیکن یہ تاثرات غیر محسوس طریقہ پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اس کی فطرت غیر ارادی طور پر ان سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔

اس کلیہ کے پیش نظر جب ہم آخری تاجدار اودھ یعنی سلطان عالم نواب واجد علی خاں اختر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے زندگی کے دو مختلف اور متضاد دور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ روشن دور کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب زندگی کی تمام رنگینیاں سلطان عالم کے قدموں پر سرنگوں تھیں۔ یعنی تخت و تاج دولت و ثروت۔ جاہ و حشمت اور عزو وقار کے ساتھ ساتھ انہیں وہ سب کچھ میسر تھا جو شاہی اقتدار کا حصہ ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اس لئے کہ رنگ و شباب کے اس دور میں چہل رقص و سرود اور لہو و لعب کا بازار گرم تھا سلطان عالم نے اپنے فرائض منصبی کی طرف سے بھی آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ زندگی کا ایک دامن لمحہ بھی فکر و بے اطمینانی سے مکدر نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ کلام جو اس دور کی پیداوار ہے شوخ و شاداب تو ضرور ہے لیکن بے اثر اور بے کیف ہے۔ اس میں وہ ہوک نہیں جو دلوں کو تڑپا دے، وہ کسک نہیں جو روح کو بیقرار کردے۔ بقول حالیؔ۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں ‫ ‫ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

شعر اسی وقت شعر ہے جب اس میں سوز و گداز ہو، اور اس سوز و گداز کے لئے ورکار ہے ایک دردمند دل جس میں ناکامی اور حرمان و یاس کی تڑپ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ سلطان عالم کی زندگی جس رنگین ماحول میں سانس لے رہی تھی وہاں ان چیزوں کا ذکر کہاں! نتیجہ لازمی طور پر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی الابتدا تا انتہا ان کا وہ کلام جو اس زمانہ سے متعلق ہے پھیکا اور بے مزہ ہے۔

لیکن زمانہ کی گردش کو اپنا کمال دکھانا مقصود تھا۔ وقت کا پانسہ پلٹا اور زندگی نے کروٹ لی۔ اور وہی وہ پرکیف فضائیں جو گھنگروؤں کی جھنکار اور شیریں نغموں کی الاپوں سے گونج رہی تھیں یک بیک خاموش اور اداس ہوگئیں یعنی تاجدار اودھ نے ہمیشہ کے لئے تخت و تاج کو خیرباد کہا اور حاکموں کی صف سے نکل کر محکوموں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا کہ درد و کرب کی شدت سے چیخ اٹھا اور یہ شعر پڑھتا ہوا حسرت و یاس اپنے وطن سے رخصت ہوا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں ‫ ‫ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ شعر گویا سلطان عالم کے اس دیوان کا مطلع اول تھا جو ان کی زندگی کے تاریک دور کے ہاتھوں مرتب ہوا۔ اب سلطان عالم شاہ اودھ نہ تھے بلکہ ایک شاعر تھے اور محض ایک شاعر اس لئے کہ اب ان کے سامنے عالم رنگ و بو کے بجائے محرومی و ناکامی کا ایک بحر ناپیدا کنار تھا اور ان کے دل میں وہ تڑپ باقی تھی جو ایک شاعر سے شعر کہلواتی ہے یہی سبب ہے کہ جب ہمارے سامنے ان کا وہ کلام آتا ہے جو اس دور کی تصنیف ہے تو اکثر و بیشتر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا جو حصہ بالخصوص قابل توجہ ہے وہ

سلطان عالم کے وہ منظوم خطوط ہیں جو انہوں نے عالم غربت میں اپنی محبوب بیگمات کے نام لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کی وہ شہرۂ آفاق مثنوی جس کا خطاب سیتمن کی طرف سے ہے اور جسمیں لکھنؤ سے لیکر کلکتہ تک کی دل ہلا دینے والی روداد نظم بیان کی گئی ہے اپنی مثال آپ ہے۔ فن اور بیان کے لحاظ سے تو خیر اس کی جہاں تک تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حسن بیان، سلاست اور فصاحت اس بلا کی ہے کہ وہ اردو کی کسی اچھی سے اچھی مثنوی سے ٹکر لے سکتی ہے۔ تلخ حقائق کو شاعر نے تاثرات قلبی میں کچھ اس طرح حل کیا ہے کہ اس مثنوی کو ایک ادبی شاہکار تسلیم کرتے ہی بن پڑتا ہے۔ اگر سلطان عالم تقدیر کے ہاتھوں ایسی گہری چوٹیں نہ کھاتے تو خیابان کا یہ کارنامہ کبھی عالم ظہور میں نہ آتا۔ اس خط کی ابتدا ملاحظہ ہو ؎

اے مری جان مونس و غمخوار — حال لکھتا ہے تیرا اختر زار
دل بھرا آتا ہے خدا کی قسم — کیا ہی بیدست و پا ہوئے ہیں ہم
درد سر لب پہ آہ و نالہ و زار — نہ کوئی دوست نے شفیق و نیاز
خوف صحرا نہ خار صحرا وطن — پھاڑے کھاتا ہے مجھکو سندر بن
جب سے آئے ہیں شہر کلکتے — داغ دل کے ہو گئے سے پھٹے
سیتمن تیری یاد میں واللہ — کھو گیا روتے روتے نور نگاہ
کبھی آنکھوں سے اشکبار ہیں ہم — کبھی یہ شعر لب پہ جاری ہے
اپنے اختر کی لے خبر جانی — کشتی دل ہوئی ہے طوفانی

اس جانکاہ سفر کے دوران نواب کو جن جن مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا دردناک بیان بالتفصیل اس خط میں منظوم ہے۔ کانپور میں جو مکان انہیں قیام کے لئے ملا تھا اس کا ذکر خود انہیں کی زبانی سنئے ؎

وہ برنڈن کا ایک بنگلا تھا — اپنی ٹوپی سے بھی تھا تنگ سوا
رات دن سب کے دل میں خطرہ تھا یاں — پاؤں پھیلے تو پھر عدم کو رواں
پانچ چھ کا کہنہ سا چھپر — ساتھ سائے کے دھوپ تھی ہر پہر
لوؤں کے جھونکے ہوائے گرم تیز — جلتے مانند کہیں نہ پائے گریز

گویا صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ ہے کہ ابلا چلا جاتا ہے۔ نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات اور پھر محاورات فارسی کا استدر بے تکان صرف!
اس قیام کے سولہ دن بعد جہاز کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ جس نازک نواب نے کبھی پھولوں کی سیج اور مخمل و کمخواب کے فرش سے باہر قدم نہ نکالا تھا اپنی بدنصیبی کی بدولت کہاں سے کہاں پہونچا ہے ؎

سولہویں دن جہاز پر بیٹھے — جل کس جا کے بالا پر بیٹھے
کیا کہیں کیسے رنج و غم پائے — کیسے دورے فلک نے دکھلائے
آندھیاں وہ جہاز پر ان رات — ڈھلتی تھی منہ سے ابھی کچھ بات

برق کا شور رعد کا وہ زور — برق کی روشنی سے چشم تھی کور
دور تجھ سے جو سیتمن ہوں میں — مثل فرہاد کوہکن ہوں میں
لیلی دلبر مہربانی کر — اپنے ہاتھوں سے کچھ نشانی کر

سلطان عالم کو زبان پر جو ملکہ و قدرت حاصل ہے ہر ہر لفظ اس کا گواہ ہے۔ بالخصوص آخری دو شعر قابل صد تحسین ہیں تا فرق ہیں کہ شاعر نے کس خوبصورتی سے گریز کیا ہے یہ خلوص تخاطب ادبی التجائے معصوم! سبحان اللہ!
غالب نے نثر میں خطوط نویسی کا ایسا نرالا ڈھنگ نکالا ہے کہ آج تک صحیح معنوں میں اس کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی لیکن اب یہ بھی دیکھئے کہ سلطان عالم نے کس خوبی سے نظم میں اسی نثر کا لطف پیدا کیا ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہی سلیقۂ تخاطب۔ وہی بے تکلفی۔ وہی روز مرہ و روانی اور بول چال گفتگو کی چاشنی معاملات حسن و عشق کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرنا کچھ آسان کام نہیں ؎

یاد میں یہ حال ہو چکا ہے — رونگٹوں تک ملال ہو چکا ہے
ملکۂ سیتمن خدا کے لئے — خط لکھو یا تیجو خوب کی کہئے
ایک پرچہ لکھا نہ اے گل تر — اپنے احوال کی بھی کی نہ خبر
کہو احوال آج کیسا ہے — دل لگا ہے، مزاج کیسا ہے
اپنے عاشق کو بھول جاتے ہیں؟ — اتنا پردیس میں ستاتے ہیں؟
جلد لکھکر جواب بھجوانا — اپنے اختر کے پاس پہونچانا

ایک دوسرے خط کا جو ملکہ امتیاز محل کے نام ہے آغاز یوں ہوتا ہے ؎

اے مری جان امتیاز محل — یاد کرتا ہوں میں تمہیں پل پل
خط جو آیا تو مہربانی کی — محضر عشق پر نشانی کی
دیکھکر اس کو دل ہوا خرم — اشک شادی مرے بہے پیہم
اس کی ہر بیت بیت ابرو تھی — سطر ہر ایک چشم آہو تھی

کچھ دور آگے بڑھ کر شاعر نے دو شعر ایسے لکھ دئے ہیں جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت ہی بلیغ ہیں ؎

گو نہ تھے ہم حسینوں کے پاس — پھر بھی رہتی تھی یہ دل میں آس
پاس رہتی ہے وہ پری جہاں — چاہی پہونچیں گے ایک دن ہی وہاں

سب کچھ کہے جانے کے بعد سلطان عالم اپنی اس ملکہ کو دعا دیتے ہیں جو ان کی جدائی میں بے چین اور بیتاب ہے اور اس دلاسے میں اپنی تسکین قلب بھی منظور ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب انسان پے در پے ناکامیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا سہارا صرف وہ امید رہ جاتی ہے جو دم توڑ رہی ہو لیکن اس انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی تقدیر سے جنگ جاری ہو ؎

درد دل کی ہیں دوا سمجھو — مرض ہجر کو گیا سمجھو
کیا جدائی کبھی نہیں ہوتی — ہجر میں آنکھ کیا نہیں روتی
وصل بھی پھر نصیب ہوتا ہے — روٹھا جاناں قریب ہوتا ہے

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

برمیوں کے رنگ ڈھنگ

نریندر کمار

برما کے معاملات میں ہندوستانیوں کو بڑی گہری دلچسپی رہتی ہے۔ برما کی ترقی اور خوشحالی میں ہندوستانی بڑے پرانے زمانہ سے برما کی امداد کرتا رہا ہے۔ ابھی کی بات ہے کہ ہندوستان نے اس کو جاپانیوں کے چنگل سے بچانے میں نمایاں حصہ لیا اور آج بھی یہ برما کی نئی تنظیم میں برابر اس کا مددگار بنا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک قدرتی امر ہے کہ ہندوستان اپنی بعد از جنگ تدابیر کا مقابلہ برما کی تجویزوں اور خاکوں سے کرتا رہتا ہے کیونکہ آخرکار ان کی ایک دوسرے پر اثر اندازی لابُد ہے۔

اگرچہ برما کی سرزمین پر ساڑھے تین سال کی لڑائی کی تباہ کاریوں کے اثرات اب بھی موجود ہیں لیکن وہاں سیاسی بیداری اور حقوق کی اُمنگ بھی پیدا ہو چکی ہے اور بڑی حد تک اہلِ برما کے جائز مطالبات پورے بھی کئے جا رہے ہیں۔ سِوِل حکومت کا قیام وہاں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ہو گیا تھا اور اب وہاں کی حکومت گورنر کے ہاتھ میں ہے اور وہ مجلسِ مشاورت اور مجلس آئین ساز کی مدد سے وہاں کا کام چلا رہا ہے۔ حالانکہ ۷ اپریل ۱۹۴۵ء کے برطانوی قرطاس ابیض، کا منشا یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کے برما ایکٹ کا احیا دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہو لیکن دارالعوام کے تازہ بل کے مطابق نئے انتخابات اپریل ۱۹۴۷ء میں ہو جائیں گے۔

برما کی سیاسی فضا

برما کی سیاست بڑی عجیب ہے۔ ایک طرف تو انتہائی ترقی پسندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف ذاتیات کی بنا پر کشمکش اور تنازعات۔ برما کی موجودہ سیاسی جماعتوں میں فاشسیت کی مخالف جماعت "پیپلز فریڈم لیگ" بہت نمایاں ہے۔ اس جماعت کے نوجوان لیڈر جنرل اونگ سان ہیں۔ اس جماعت کا خاص مطالبہ یہ ہے کہ برما میں فوری طور پر عارضی قومی حکومت قائم کر دی جائے اور آئین ساز مجلس کے اعیان وہ ہوں جنہیں جمہور انتخاب کریں۔ (۱۸ سال سے اوپر کے ہر مرد و عورت کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہونا چاہیئے)۔ یہ جماعت شروع ہی سے مجلس مشاورت اور مجلس آئین ساز کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی کیونکہ گورنر اس وقت اس مجلس کے تمام مطالبات ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس جماعت کے رویّہ میں اور بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے اس واقعہ سے کہ گورنر نے اس جماعت کے رضاکاروں کو فوجی پریڈ وغیرہ کرنے سے منع کر دیا۔ دوسری مضبوط جماعت مسٹر سا کی جماعت ہے جس کے خیالات مذکورۂ بالا جماعت کے خیالات سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن یہ لوگ اب تک ڈاکٹر با مو ہی کے متوالے ہیں جو اب تک جاپانی قید میں ہیں۔ برما کی اشتراکی جماعت بھی کافی مضبوط ہے لیکن اس جماعت میں اندرونی طور پر بہت سے تفرقے ہیں۔

برما کا نیا بل

اس پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو جو بل پاس ہوا ہے اس سے آگے چل کر برما کی تمام سیاسی خواہشات پوری ہو ہی جائیں گی۔ اول تو یہی کہ دارالعوام میں مسٹر ہینڈرسن نے جو وعدہ کیا ہے اس سے امید پڑتی ہے کہ برما میں آئینی حکومت کے احیا کی تاریخ ڈیڑھ سال پہلے آگئی ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں نئے انتخابات ہو جائیں گے تقریباً ہر بالغ برمی رائے دے سکے گا۔ اس سے برما کے رائے دہندگان کی تعداد تیس لاکھ کی بجائے ستر لاکھ ہو گئی ہے۔ وزارت انتخابات کی تابع ہو گی اور ایک آئین ساز مجلس قائم کر دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسٹر ہینڈرسن نے کہا: "حکومتِ برطانیہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ برما میں کسی قانون کا نفاذ زبردستی کیا جائے۔"

یہ ظاہر ہے کہ برما کے دیہات میں شدت پسندی کا بہت زور ہے۔ مسلح ڈاکوؤں کے جتھے کسانوں کو ڈراتے اور لوٹتے پھرتے ہیں۔ برما کے قائم مقام گورنر سر ہیوبری ناٹس نے کہا "ڈاکو برما کا سب سے بڑا مسئلہ ہے"۔ برما کی حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور اس اہم کا حل سوچ رہی ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ گزشتہ مارچ سے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کی امداد

برما کے مذکورہ بالا سیاسی حالات اور جرائم وغیرہ کی کثرت کی وجہ سے اس پر بھی برمی لوگ مثلاً زمیندار، کاشتکار، بیوپاری اور مزدور اقتصادی نئی تنظیم کے بڑے خواہاں ہو رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کی بہ نسبت اس سال بیس لاکھ ایکڑ زیادہ زمین جوتی اور بوئی جائے گی اور وہاں تقریباً بیس لاکھ ٹن چاول نکل رہے گا جس کا ہر گوشہ کیا جائے گی۔ ہندوستان کی مدد سے اگلی فصل میں یہ مقدار اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ آٹھ کروڑ کا برطانوی قرضہ جس پر کوئی سود نہیں لیا جائے گا برما کو تنظیم نو میں کافی مدد دے گا۔ اس قرضہ کا کچھ حصہ ہندوستانی سکوں میں بھی تبدیل کیا جا رہا ہے تاکہ برما اپنی ضرورت کی اشیا ہندوستان سے

بقیہ برصفحہ ۱۸

قاتلہ

مصنفہ
محمود کامل (مصری)

مترجمہ
صلاح الدین قریشی دہلوی

افسانہ

اسکندریہ کی فوجداری عدالت میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہزاروں آدمی خیریہ ہانم فوزی کے مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لئے عدالت کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ خیریہ فوزی پر الزام تھا کہ اس نے پستول سے اپنے خاوند سلیم بک فوزی کو عمداً قتل کر دیا ہے۔

اخبارات میں اس خبر کے شائع ہو جانے کے بعد لوگوں کا اس طرح عدالت میں جمع ہو جانا اور اس واقعہ کی اہمیت کا بڑھ جانا بالکل قدرتی امر تھا۔ اس سلسلے میں جو تفتیش ہوئی تو قطعی دلائل اور خود مقتول کے مختلف رشتہ داروں کے بیانات نے یہ ثابت کر دیا کہ ملزمہ کو اپنے خاوند سے بے حد محبت تھی۔ اسلئے یہ ناممکن سی بات ہے کہ وہ اسکے قتل کی مرتکب ہو یا اسے کوئی معمولی سی اذیت پہنچانے کا بھی خیال کرے۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزمہ لوہے کے کٹہرے میں آئی اور بالکل آخر میں حاکم کی میز کے قریب سر دقد کھڑی ہو گئی۔ اسکا چہرہ بالکل شستا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود حسن اور جوانی کے تیور دے رہے تھے۔ اسکی عمر تائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لمبا قد، چھریرا جسم اور متناسب اعضا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے متعجبانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسکا ہاتھ کبھی کٹہرے پر نظر آتا اور کبھی ایک چھوٹا سا رومال اس میں چھپنے لگتا۔ اس کی کنپٹیاں بار بار غلطی سے دانت بھینچنے کی وجہ سے ابھرتی نظر آ رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اعصابی کشمکش اور روحانی الجھن میں مبتلا ہے۔

حاکم عدالت مع جیوری اور سرکاری وکیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے اپنا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ ملزمہ انہیں دیکھ کر لرز اٹھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت ضروری چیز کی تلاش میں ہے۔

لوگوں نے تعجب سے رہ رہ کر دروازے اور وکیلوں کے بنچ کی طرف تکتے دیکھا تو اسکا مقصد سمجھ گئے۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ ملزمہ نے فوجداری مقدمات کے ماہر اور شہر کے مشہور وکیل عبدالرؤف بک سلام کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے لیکن وہ موجود نہیں تھے اور کیوں ان کا پتہ نہیں تھا۔

مجسٹریٹ نے پکارا:۔ خیریہ فوزی!

نوجوان ملزمہ نے دبی ہوئی گلوگیر آواز میں جواب دیا:۔ جی حضور!

اسی وقت استاد ابراہیم عدلی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے وکیل استاد عبدالرؤف بک کی طرف سے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکنے کی معذرت کرتے ہوئے ملزمہ کی طرف سے خود پیش ہونے کی اجازت چاہی۔

ابراہیم عدلی اسوقت تک اکثر نوجوان وکیلوں کی طرح مشہور نہ تھا۔ عدالت کے کمرے میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے جب ایک نوجوان کو جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی ملزمہ کی طرف سے پیش ہوتے دیکھا تو ایک حد تک ناامید ہو گئے۔ اسکا رنگ گورا، بال سنہری اور آواز دھیمی تھی۔ بجز رعب اور ہیبت اسکی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے لوگ ایک پرانے عمر رسیدہ وکیل کی امید پر بیٹھے تھے جو نزدیک و دور مشہور تھا۔ اس ناامیدی کا اثر سب سے زیادہ ملزمہ کے رشتہ داروں پر تھا۔ وہ لوگ لڑکی کے بری ہو جانے سے قطعی مایوس ہو چکے تھے۔ حالانکہ عبدالرؤف بک نے انہیں پورا یقین دلایا تھا کہ یا تو لڑکی کو بالکل بری کر دیا جائیگا یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی قید کی سزا ہو سکے گی۔ لیکن نوجوان وکیل نے جب لڑکی کی طرف سے بحث شروع کی تو لوگوں کی مایوسی آہستہ آہستہ دور ہونے لگی یہانتک کہ بالکل ختم ہو گئی بلکہ اس کے بجائے لوگوں کو مقدمے کی تفصیلات کے بارے میں اسکی باریک بینی اور صحیح سوجھ بوجھ پر ایک قسم کی حیرت ہونے لگی۔

اس نے خاص طور پر ان جذبات انگیز واقعات پر زور ڈالا جن سے مغلوب ہو کر ملزمہ نے اقدام قتل کیا تھا اور ساتھ ہی یہ چیز خصوصیت سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قطعی دلائل سے یہ حقیقت بالکل صاف ہے کہ لڑکی کو اپنے خاوند سے بہت محبت تھی۔ اس کے ثبوت میں اس نے ان دونوں کے وہ خفیہ خطوط پیش کئے جو شادی سے پہلے اور اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان تمام چیزوں پر یہ ثابت تھا کہ لڑکی اپنے خاوند کی رضامندی اور خوشی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو ہر وقت تیار تھی۔ اسکا خاوند سلیم بک فوزی انجینیر تھا اور ایک بیرونی کمپنی میں ملازم تھا۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ لڑکی اس زمانے میں قاہرہ کے ایک انگریزی اسکول میں تعلیم پا رہی تھی۔ یہ سلسلہ دونوں تک قائم رہا یہانتک کہ وہ دل دے بیٹھی اور اسکی محبت کا دم بھرنے لگی۔ آخر اس نے اپنے خاندان کی سخت مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ اسکے ساتھ اسکندریہ چلی آئے جہاں وہ ملازم تھا۔ یہاں وہ آٹھ سال تک اپنے خاوند کے ساتھ رہی۔ اس دوران میں اسکی محبت برابر بڑھتی رہی۔ وہ ہمیشہ ایسے کام کیا کرتی تھی جن کے متعلق وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند کو خوشی ہوگی، یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی خوشی کو بھی خوشی سے قربان کر دیا

سے انجام دیتی تھی تفتیش کے دوران میں اس قسم کا ایک عجیب واقعہ علم میں آیا۔ تسلیم کا یہ معمول تھا کہ اکثر اتوار کے دن وہ شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ اکثر افسوس کیا کرتا تھا کہ بندوق نہ چلانے کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کے ایک دوست کی بیوی اپنے خاوند کے ساتھ برابر شکار کو جاتی ہے اور ایک ایک کام میں شریک رہتی ہے۔ خیریہ نے اپنے خاوند کو خوش کرنے کے خیال سے ریوالور لیا اور نشانہ کی مشق کرنے لگی۔ ایک دن وہ ریوالور میں کارتوس رکھ رہی تھی کہ وہ چل گیا اور اسکی پنڈلی میں بڑا سخت زخم آیا ایسا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔۔۔۔۔ آہ! اسکا پیارا شوہر! لیکن خیریہ کی اس گہری اور خاموش محبت کا جواب کبھی نہیں ملا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا طویل عرصہ گزارنے کے بعد تسلیم کا جی بھر گیا کچھ دنوں بعد وہ گھر کے کام کاج کے لئے قاہرہ سے ایک ملازمہ کو لایا جو اس کے والد کے یہاں ملازم تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور جب تک اس نے شادی کر کے گھر کے ترچھے ہی اپنی شرعی بیوی کی طرح سے ایک اور مکان میں آباد نہ کر لیا بیچاری خیریہ کو خبر تک نہ ہونے پائی۔

خیریہ نے بیوی کی حیثیت سے اپنی اتنی بڑی توہین ہونے پر بھی اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ اس کے باوجود وہ تسلیم سے برابر محبت کرتی رہی! یہ چیز اسکے ایک خط سے ثابت ہوئی جو اس نے تسلیم کی نئی بیوی کے گھر پر اس کے نام بھیجا تھا اور مرنے کے بعد اس کے کاغذات میں سے نکلا۔ اس میں لکھا تھا:۔

"۔۔۔۔ تسلیم پیارے میں تم سے اب بھی محبت کرتی ہوں۔۔۔۔ میں ان لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے تمہاری حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گذارے ہیں۔ میں تم سے ناراض ہونا نہیں چاہتی۔ میرا اب یہ حق نہیں ہے کہ تمہیں زبردستی اپنے سینے سے لگاؤں یہ حق اب ایک دوسری عورت کے حصے میں آ چکا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ تمہیں اس انتخاب میں ذرا مجھ سے کام لینا چاہئے تھا شاید کبھی تمہیں میرے گھر والوں کی مخالفت کا حال معلوم ہی ہے۔۔۔۔ تم نے جو مجھے تکلیف پہنچائی ہے میرے نزدیک اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ تمہارا اپنا فعل ہے میں تم سے اس سلسلے میں معذرت چاہتی ہوں۔ اسلئے کہ ہر مرد کی روح میں ایک ایسا گوشہ ضرور ہوتا ہے لیکن میں تو اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور جب اپنے پیارے بچے شکری کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو بے اختیار تم یاد آ جاتے ہو۔۔۔۔ کیا تم کبھی آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرو گے؟ ہمیں اس معصوم ننھے بچے کے مستقبل کا کوئی انتظام کرنا ہے۔"

ظالم شوہر نے اس عاجزانہ درخواست کو قبول کر لیا اور خیریہ نے اس سے اپنے لڑکے شکری کے متعلق کچھ باتیں کرنی چاہیں۔ اس نے جب یہ کہا کہ شکری کو اسکا آخری سہارا سمجھ کر اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تو تسلیم نے بڑی سختی کیساتھ جواب دیا۔

"میں اپنے بچے کو ایک مطلقہ عورت کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

خیریہ نے اس سے دریافت کیا: "کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ ایک ملازمہ اسکی تربیت کرے؟"

تسلیم نے اُٹھتے ہوئے جواب دیا: "وہ اب میری بیوی ہے۔ میں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا!"

اس نے تسلیم کا دامن پکڑ لیا اور چلّانے لگی: "لیکن مجھے میرا لڑکا چاہئے۔۔۔۔ میں اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔۔ پیارے فوزی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے!"

تسلیم نے زبردستی اس کو فرش پر دھکیل دیا۔ آنسو برابر اسکی آنکھوں سے جاری تھے۔ دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا:۔

"وہ تجھ سے زیادہ بہتر ہے!"

اس کے بعد ہی اسکا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف بڑھا۔ اس نے فائر کیا گولی پیٹھ پر لگی اور وہ وہیں گر پڑا۔ ساتھ ہی خیریہ بھی اس کی لاش کو چومتی ہوئی اور اس کے خون سے اپنا چہرہ رنگتی ہوئی اس کے پہلو میں گر پڑی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور شور مچا رہی تھی۔۔۔۔۔۔

لوگوں کو نوجوان وکیل کی بحث کے دوران میں ان تمام واقعات کا پتہ چلا اور ہر شخص کو خواہ مخواہ اس سے ہمدردی ہو گئی۔ ان واقعات کا علم ہو جانے کے بعد لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ قاتلہ نہیں بلکہ دیوانی ہے!

سرکاری وکیل کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ یہ جرم جذبات سے مغلوب ہو کر سرزد ہوا ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی طرف فرانس میں خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے اور اکثر بری کر دیا جاتا ہے۔ اسکا خیال تھا کہ اسوقت مصر کی موجودہ سوسائٹی بھی کچھ ایسے ہی حالات سے گزر رہی ہے۔ آخر میں اس نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزمہ کو جو حالات درپیش تھے انہیں ضرور سامنے رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف دلائل سے جرم کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور ملزمہ کو ایک قاتلہ کی حیثیت سے سزا دینے کی طرف توجہ دلائی۔

عدالت جیوری سے مشورہ کرنے کی غرض سے برخاست ہوئی اور تھوڑی دیر بعد خیریہ فوزی کو چھ مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ فیصلے میں ان مختلف حالات کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا تھا جو ملزمہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کے متقضی تھے۔

خیریہ عدالت کے کٹہرے سے ہنسی خوشی نکلی چونکہ وہ اب پھانسی کی کال کوٹھڑی سے بچکر نکل آئی تھی۔ وہ اپنے وکیل کی طرف شکریہ ادا کرنے کے خیال سے مڑی اور اسے بتایا کہ اپنی زندگی کے لئے وہ ہمیشہ اسکی کوششوں کی احسان مند رہیگی۔

خیریہ اس نوجوان وکیل کے متعلق سوچتی ہوئی گھر آئی اور دیر تک اس راز پر غور کرتی رہی جس نے ابراہیم عدلی کو ایسے عجیب طریقے پر اسکی وکالت کرنے پر مجبور کیا۔۔۔۔ اور ادھر ابراہیم عدلی بھی خیریہ کے مقدمے کا قائل تھیں

لیکن تم تو اب تک اس سے محبت کرتی ہو؟ اس کا چہرہ پھر تمتما اٹھا اور کہنے لگی: یہ آپ سے کس نے کہدیا؟

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک ہے۔ تم جب اپنے لڑکے کی آنکھوں کو دیکھتی ہو بے اختیار اس کی یاد آ جاتی ہے۔۔۔ تم نے بار بار اسے لکھا ہے کہ اس کی آنکھیں اس کے باپ جیسی ہیں۔ میں تو اس کے تصور سے پاگل ہو جاتا ہوں، حالانکہ وہ بیچارا کبھی کا مر چکا ہے۔ جب یہ لڑکا بڑا ہو کر بالکل اپنے باپ جیسا ہو جائے گا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا پہلا شوہر اس طرح دوبارہ زندہ ہو جائے اور میرا جینا حرام کر دے۔

اوہو! تو یوں کہئے آپ کو میرے بچے کی محبت بھی بری معلوم ہوتی ہے، میرے اکلوتے بچے کی محبت!

ہاں! تم اس سے اس کے باپ کی وجہ سے محبت کرتی ہو، تم جب اس کو سینے سے لگاتی ہو یا اس کے لبوں کو چومتی ہو اس کے باپ کا تصور تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!

خیریہ نے سر جھکا لیا آنسو اس کی آنکھوں سے بہ نکلے اور اس نے اپنا چہرہ اپنے معصوم بچے کے بالوں میں چھپا لیا جو حیرت سے کھڑا دونوں کو تک رہا تھا۔ پھر وہ حسرت و غم کے بوجھ سے دبی ہوئی آواز سے کہنے لگی:

تب تو پیارے! ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہئے۔

عدلی دروازے کی طرف پلٹا اور باہر نکلتے ہوئے کہنے لگا:

ہاں! ہاں!! ضرور۔

کچھ دنوں بعد ابراہیم عدلی نے خیریہ ہانم کو طلاق دے دی۔ بیچاری خیریہ اپنے اکلوتے لڑکے کو لے کر قاہرہ اپنے گھر واپس آگئی۔ اس کے سینے میں دونوں شوہروں کی یاد دفن تھی ——— ایک سے اس نے محبت کی لیکن وہ محبت نہ کر سکا ——— دوسرے سے اس نے محبت کرنی چاہی لیکن وہ خواہ مخواہ پہلے شوہر سے جلنے لگا، حالانکہ وہ بیچارہ اس دنیا میں موجود نہ تھا۔

برمیوں کے رنگ ڈھنگ

بقیہ صفحہ ۱۲

لے سکے۔ اس طرح پر گویا برما کو ہندوستانیوں کی پوری ہمدردی حاصل ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ حکومت ہند نے برما کو ۹۶ لاکھ گز کپڑا ہندوستان سے لینے کی اجازت دی ہے۔ برما کے وفد کو حکومت ہند کے محکمہ جات کے ذریعہ پوری پوری سہولت دی جا رہی ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنی ضرورت کا کل کپڑا، ادویات وغیرہ، سیمنٹ، لوہا اور کوئلہ یہاں سے حاصل کر سکے حالانکہ ان چیزوں کی خود ہندوستان میں سخت کمی اور ضرورت ہے

تبرکات سخا دہلوی مرحوم

وہ چند ہو گیا وہ بناؤ سنگھار سے
قدِ کتاب بڑھ گئی نقش و نگار سے

پیہم صدا بلند ہے قلقلِ یار سے
دیکھوں تو کون کون نہ اٹھے مزار سے

میں نے کیا قیاس رخ و زلف یار سے
روز فراق کم ہے شب انتظار سے

دوزخ بھڑک چلا ہے دل شعلہ بار سے
منکر نکیر دور کھڑے ہیں مزار سے

میں مر مٹا تو عارض تاباں چمک اٹھی
آئینے صاف ہوتے ہیں کیسے غبار سے

جاؤں بہشت میں کہ نجاؤں یہ فکر ہے
کہتے ہیں مختلف ہی خدا کوئی یار سے

رونے پہ چٹکیوں پہ منا آپ کیوں کریں
نکلے گی کچھ نہ کچھ تو صدا آبشار سے

اچھا ہوا کہ معجزہ کی بات رکھ لی
موسیٰ کو سابقہ نہ پڑا زلف یار سے

آنکھیں لڑی ہیں غیر کو دیکھیں وہ کس طرح
سی دی ہے چشم یار نگاہوں کے تار سے

دعویٰ صفائی کا ہے تو اچھا ثبوت دو
ڈھلواؤ آئینہ مرے سنگ مزار سے

مانا کہ انتظار قضا سے شدید ہے
حرماں شدید تر ہے مگر انتظار سے

کیا کم ہے روز دست حنائی کا چومنا
کیوں کشمکش ہو کوئی لگے روزگار سے

کوئی نہ آئے دل میں پریزادوں کے سوا
میں نے حصار کھینچا ہے اس انکسار سے

ہیں تو مگر اب بھی وہ اپنے شہید سے
تلوار صاف کرتے ہیں خاک مزار سے

اس بت نے التجا پہ بڑے ناز سے کہا
مانگو دعائے وصل نہ پروردگار سے

اس سے پہ ضیا کو نہ پہنچے گا آفتاب
آگے نکل گیا ہے یہ پیدل سوار سے

سے چھوڑ دوں آج وعدۂ فردا پہ کس طرح
تو لفظ مجھکو اچھے ہیں تیر دو دھار سے

گرتی ایک جا نہیں قسمت میں بیٹھنا
یعنی بگولے اٹھتے ہیں خاک مزار سے

اے کاش اٹھتے عاشق و معشوق حشر میں
دو چار روز میں لپٹتے ہوئے اک مزار سے

جینے سے تنگ ہوں مجھے زندہ ہی گاڑ دو
لے لو حلف جو مر کے بھی نکلوں مزار سے

پستی کا نام ہجر بلندی کا نام وصل
یہ ہے طریق عشق چڑھاؤ اتار سے

درد الم کی یوں ہے مرے دل کو پرورش
پلتے ہیں جس طرح در سجادہ مزار سے

گن گن کے ہوئی حشر میں عصیاں کی بازپرس
اور کیوں جی گر گناہ ہوا ہی بے شمار سے

زرقت کے بعد دل ہو مرے نیچے بعد تیر
یہ دائرہ بنا ہے چڑھاؤ اتار سے

زنجیر پا ہیں گے یہ بڑھ کر شباب میں
بچپن میں دو غدغہ تھا مجھے زلف یار سے

وہ ہی سخا جو کل تھے وہاں اپنے خدا کی شان
منبر پہ وعظ کہتے ہیں کس افتخار سے

مرسلہ جناب ضیاء الحسن نقوی

مشہور و معروف حلوہ سوہن کی قدیمی دکان
حلوہ سوہن کی ہر قسم ... بادامی، پپڑی، پپڑ کی
گری، یکمنی پپڑی ... ہمارے ہاں تیار ملتی ہیں۔
اس کے علاوہ ... مٹھائیاں بھی ملتی ہیں۔
نوٹ: آرڈر آنے پر ... وی - پی بھی بھیجا جاتا ہے۔
شیخ عبدالخالق - ... حلوہ سوہن والے
چاندنی چوک دہلی
اردو کی خدمت کیجئے
ہر قسم کی اردو کی کتابیں
ہم سے طلب کیجئے
بک ڈپو انجمن ترقی اردو اردو بازار دہلی
سید الانبیاء خاتم النبیین، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم
کی
سیرت پر مشہور عالم کتاب
رحمۃ اللعالمین کامل تین جلد
(سیرت النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم)
مصنفہ: علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری
رحمۃ اللعالمین نے شائع ہوتے ہی سیرت رسولؐ کے شیدائیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ اور اس کو جملہ حلقوں میں مستند قرار دیکر پسند کیا گیا۔ اب اس کی مکمل تینوں جلدیں تیار ہو گئی ہیں۔
یقیناً اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر تڑپ جائیں گے۔ اتنی دلچسپ اتنی مکمل اور اتنی اعلیٰ کتاب سیرت النبی صلعم پر آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ طرز بیان محبت اور عقیدت کے رنگ میں ڈوبا ہوا طریقہ استدلال سنجیدہ ہے سیرۃ کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسکی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔
کتابت روشن اور خوشخط
کاغذ چکنا عمدہ دبیز
طباعت دیدہ زیب
جلد پائدار ولایتی کپڑے کی
گرد پوش سہ رنگا خوبصورت
کامل تین حصہ مجلد
سترہ روپے
فہرست مفت طلب فرمایئے
ہم اسلامی و ادبی کتابیں۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں
فہرست مفت طلب فرمایئے
ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار لاہور

ہندوستانی ثقافت و فنون پر مصری اثرات

فراعنہ نے خصوصاً اور مصریوں نے عموماً نوع انسان کے جملہ افراد سے اپنے آپ کو کہیں زیادہ برتر و اعلیٰ سمجھا۔ انھوں نے غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے احتراز کیا اور ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کی صورت ان کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی سب سے بڑی دقت تھی جس کا سامنا رومیوں اور یونانیوں کو کرنا پڑا جب وہ علم نجوم و سطحات سیکھنے اور طب و جراحی کے ضمن میں معلومات بہم پہنچانے کے ارادہ سے مصر میں وارد ہوئے۔ غیر ملکیوں سے اجتناب و احتراز کا سبب یہ تھا کہ مصری اپنے چہرے صفا چٹ رکھتے اور دن میں دو تین بار غسل کرتے تھے۔ اس کے برعکس نو واردوں کی لمبی گھنی داڑھیاں اور میلے کچیلے غلیظ کپڑے ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سبھی غیر ملکیوں کو پلید سمجھا جانے لگا۔ بادشاہ کا گھٹنا چومنے کی اجازت وہ سب سے بڑا اعزاز ہوتا جو فرعون کی طرف سے کسی درباری کو عطا کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی حد تک یہی برتری کا احساس ہندوستان کے ہندوؤں کو ورثے میں ملا ہے۔ اگرچہ ہندوستان پر انگریزی تسلط ہونے کے بعد سے بہت کچھ حالت بدل گئی ہے تاہم جذبۂ تنفر ابھی تک اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صدہا سال تک ان کا قریبی تعلق مصریوں کے ساتھ رہا ہے۔ یہ ربط ضبط سکندر یونانی کے حملے کے وقت تک قائم رہا۔ لفظ "فرعون" دو مصری لفظوں سے مرکب ہے "فیرا" بمعنی "بڑا مکان" اور "اون" بمعنی "رب رع" یا "سورج دیوتا"۔ اب اگر اس کا تقابل ہندی لفظ "مہاراجہ" سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تین ٹکڑوں کے ملنے سے بنا ہے۔ "مہا" بمعنی "بڑا"، "را" (رع) بمعنی "سورج دیوتا" (بزبان مصری)، اور "جہ" بمعنی "بچا" یا "پسر فلاں"۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ تقریباً دو سو سال میں انگریزوں سے قریبی تعلق رہنے کے باعث ہندوستانی ثقافت، رنگ ڈھنگ، طرز بود و معاش اور فکر و خیال میں کتنی زبردست تبدیلیاں ہوتی ہیں تو یہ باور کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان اصلی آریاؤں کی زندگی میں بھی جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوئے تھے ایسے ہی تعلقات کی بنا پر صدہا سال کی مدت میں بہت کچھ تغیرات رونما ہوئے ہوں گے۔

ابتدائی حالات کا جائزہ لینے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علم التشریح البدن پر سب سے پہلی کتاب دوسرے فناہ مصر آتھوتھس نے لکھی جو تقریباً ۴۳۶۶ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ اسی طرح توت نے جس کا یونانی نام ہرمیس تھا علم الادویات پر چھ کتابیں لکھیں جو مندروں میں رکھی رہتی تھیں۔ ادویات کے موضوع پر چار اہم بردی مخطوطات بھی ملے ہیں۔ ایک مسودہ لکسر کے قریب ایبرز نے برآمد کیا جس کا وہ ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ دوسرا جو کسی قدر ضائع بھی ہو گیا برلن کے عجائب خانہ میں ہے۔ تیسرا برطانیہ کے عجائب خانے میں ہے۔ اسیر اٹھارویں خاندان کی تاریخ ہے جو تقریباً ۱۷۰۰ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ چوتھا ایک امریکن کے ہاتھ لگا اور وہ اس نے نیویارک ہسٹوریکل سوسائٹی کو پیش کر دیا۔ بعض کا موضوع تاریخ ہے اور بعض تشخیص امراض اور طریقۂ علاج سے متعلق ہیں۔ ہومر کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کو ایک ایسی مفید سرزمین بتایا گیا ہے جس میں دوائیں بکثرت موجود ہیں۔ کچھ اچھے کاموں کے لئے ہیں اور کچھ برے کاموں کے لئے اور وہاں ہر شخص طبیب ہوتا ہے اور اس کی واقفیت عام لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ سب کے سب صحت و تندرستی کے دیوتا کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔

ہیرو دوطوس (۴۰۰ ق۔م) کا بیان ہے کہ سب سے اہم علاج عمدہ غذاؤں اور غذائی پابندیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آنکھوں، سروں اور دانتوں کے علاج کے لئے الگ الگ ماہرین فن ہوتے تھے۔ دنداں ساز بھی موجود تھے۔ اور وہ کھوکھلے دانتوں میں سونا یا چاندی بھر دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو قدیم اہل مصر مصنفہ ولکنسن۔ جلد دوم صفحہ ۳۵۰) فوج کے سپاہیوں کا علاج بلا اجرت کیا جاتا تھا۔ اگر غلط طریقۂ علاج سے کوئی مریض مر جاتا تو طبیب پر قتل انسانی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ ان ڈاکٹروں کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی لیکن اہم مشوروں کے سلسلے میں وہ فیس وصول کر لینے کا حق رکھتے تھے۔ علاج زیادہ تر جڑی بوٹیوں کے عرقوں، تیل اور دواؤں، پرہیزوں یا دوائی ملی خوراکوں سے کیا جاتا تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بہت سی بیماریاں ضرورت سے زیادہ کھانے اور معدے کی خرابی یا سوء ہضمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پلائنی کا بیان ہے کہ اہل مصر نوعیت مرض کی تحقیق و تشخیص کے سلسلے میں مرنے والے کے مردہ جسم کا معائنہ کرتے تھے

کے۔ حسین

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ موت کس وجہ سے واقع ہوئی ہے۔
ایتھنیا اور روما کے لوگ مصری طبیبوں سے بہت زیادہ مشورہ لیتے تھے ان کی شہرت اتنے دور دراز حصوں تک پھیل گئی تھی کہ سیاکزض (۶۰۰ ق م) اور دارا (۵۲۹ - ق م) نے مصر سے طبیبوں کو بلا بھیجا۔

نیرو کے زمانے میں طبابت کرنے والے ایک شخص پیڈوسیس ڈائیوسکوریڈیز کے کچھ ایسے نسخے ہاتھ آئے ہیں جو بالکل ان نسخوں کی نقل ہیں جو مذکورہ بالا بردی کاغذات پر نقش ہیں پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں ڈائیوسکوریڈیز کا ایک ترجمہ موجود ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے اور خلیفہ المامون کی خاطر آرمینیہ کے ایک عالم اسٹیفن نے کیا تھا۔ یہ کتاب جو اپنی قسم کا واحد نسخہ ہے "کتاب الحشیش" کہلاتی ہے۔ تقریباً یہی طریقہ ادویات آریاؤں کے ابتدائی عہد میں بھی رائج تھا۔

یقین کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے علم طب کا بہترین زمانہ سشرت سے چرک تک تھا جن کا ذکر مہابھارت میں کیا گیا ہے لیکن ترمیم و تنسیخ ہوتے رہنے کے باعث اس کی قدامت حملہ سکندر سے زیادہ پہلے کی نہیں سمجھی جا سکتی بالفاظ دیگر اسے ۳۲۷ قبل مسیح سے ۵۰ سن عیسوی تک کہا جا سکتا ہے۔

بالکل مصریوں کی طرح ہندوؤں میں بھی پجاریوں کو طب اور جراحی کے اسرار و رموز کا محافظ سمجھا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ ویدوں اور طبی کتابوں کا علم اس فن کا ایک حصہ بن گیا وہ صرف ہندوستان کے پجاریوں سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ طب و جراحی کے ضمن میں ہندوستان میں رہنے والے آریائی لوگ بدھی زمانہ کے دوران میں پورا عروج حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی یقینی ہے کہ مصر انکا وطن تھا ہو سکتا ہے کہ حملے کے بعد یونانیوں سے تعلقات بڑھنے پر کچھ ترقیاں ہوئی ہوں۔ ہندوستان کے ہندو اب بھی ایسے منتر جپنے کے عادی ہیں جو مصریوں کے قدیم عہد میں مریضوں کے علاج کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے قدیم آریاؤں کی نباتاتی ادویات کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جڑی بوٹیوں کو چاندنی خاص خاص تاریخوں میں توڑا جاتا تھا اور اس اعتبار سے بھی قدیم مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ اب بھی جلدی امراض اور دوسری متعدی بیماریوں کے سلسلے میں منتروں کو ساز کے ساتھ گا بجا کر علاج معالجہ کیا جاتا ہے۔

عربی اور فارسی لفظ "یونانی" دراصل یونانی زبان کے لفظ "آئیونین" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ سنسکرت میں بھی لفظ "یوانا" ہے جو یونانیوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اولیری نے اپنی کتاب "عرب قبل از محمد" (صفحہ ۶۶) میں لکھا ہے:۔ "برہمی رسم الخط

تاثرات

زہے ناخن غم کی سینہ خراشی۔ کہ قلب و جگر ہو گئے پارا پارا
ہوئے اپنے ناوک سے ہم آپ زخمی۔ کسی کی نگاہوں نے کیا تیر مارا؟

یہ مانا محبت نے اب تک کسی کی نہ دنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا
خدا کی قسم پھر بھی ترک محبت۔ نہ ان کو گوارا نہ مجھ کو گوارا

اگرچہ خرد نے بہت کھیل کھیلے۔ اگرچہ جنوں نے بہت زور مارا
مگر یہ طلسم مشیت نہ ٹوٹا۔ ازل سے یہی تجربہ ہے ہمارا

وہ کب کے گئے بھی۔ مگر دل کو اب تک نہیں ترک شوق و تمنا گوارا
جہاں کوئی آہٹ ہوئی میں یہ سمجھا کہ جیسے وہی آ رہے ہیں دوبارا

ہر اک منزل نشو و بالیدگی میں یہ کیوں خار و گل کی نگہباں ہے فطرت
اگر پردۂ رنگ و بو میں تمہیں ہے کوئی جلوہ گستر کوئی مجلہ آرا

کوئی لاکھ عزلت گزیں ہو جہاں میں۔ حوادث سے ممکن نہیں رستگاری
بھلا بحر طوفاں سے کیا بچ سکیگا۔ کوئی لاکھ ساحل سے کر لے کنارا

وہ عالم ہے پیہم صف آرا رہوں گا کہ ہے میرا مقسوم زور آزمائی
ہزیمت کا اپنی مجھے غم نہیں ہے۔ مقدر سے لڑ کر مقدر سے ہارا

کوئی یہ حوادث کو پیغام دیدے۔ ابھی میرے دل میں تمنا ہے باقی
کوئی باد صرصر سے جا کر یہ کہدے مری خاک میں ہے ابھی اک شرارا

بہار چمن کروٹیں لے رہی ہے خزاں کی غم انگیز ویرانیوں میں
شب غم کی ظلمت پتہ دے رہی ہے رئیس اپنی قسمت کا چمکا ستارا

رئیس امروہوی

بلا شبہ سامی مادّے سے نکلا ہے اور اگر پوری صحت کے ساتھ اس کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ساتویں صدی قبل مسیح میں رائج ہوا تو پھر یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا کہ باہمی تعلقات اس وقت سے مسلسل قائم رہے۔ حالانکہ قدیم ترین ہندوستانی کتبہ جو دستیاب ہو سکا ہے تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ (روزنامہ "ڈان" کے شکریہ کے ساتھ)

حشر کا ڈرامہ

عشرت رحمانی

مجلہ "آجکل" کی اشاعت مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۴۵ء میں جناب محمد عمر (نور الٰہی) کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون جناب جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی کے اس مضمون سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ جو "آجکل" کی اشاعت مورخہ ۱ر مئی ۴۵ء میں درج ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں راقم الحروف رسالہ "آجکل" کی کسی گذشتہ اشاعت میں ایک مختصر مقالہ پیش کر چکا ہے۔ مکرمی محمد عمر صاحب کا یہ مضمون بیتاب صاحب کے مضمون پر ایک حاشیہ سمجھنا چاہیئے جس کا مقصد اس کے آغاز سے واضح ہے۔

محمد عمر صاحب (نور الٰہی مرحوم) سے ادبی دنیا متعارف ہے اور ناٹک ساگر کے مصنف سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اردو ڈرامہ نگاری کے ابتدائی ابواب پر انھیں معقول عبور ہوگا لیکن آغا حشر مرحوم سے جس قسم کی ناواقفیت کا اظہار انھوں نے اس مضمون میں فرمایا ہے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور بقول "پردہ نگاری" چاک ہوتا نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

جناب بیتاب بریلوی کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور انھوں نے آغا حشر مرحوم سے ذاتی واقفیت کے پردہ میں جس ناواقفیت کا اظہار فرمایا ہے میں اپنے مضمون میں کسی حد تک تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ اس لئے یہاں اس سے گریز ہی مناسب ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیتاب صاحب کے وہ کون سے انکشافات ہیں جن کی نسبت محمد عمر صاحب جیسے فن ڈرامہ کے دعویدار یہ فرمانے پر مجبور ہو گئے کہ "ایسے انکشافات کے جن کی بڑی ضرورت تھی اور جو مجھے ناٹک ساگر کی تکمیل میں بڑا کام دیں گے۔" یہاں سب سے پہلے تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ "آیا ناٹک ساگر اسی قسم کی معلومات سے مکمل کی گئی ہے، کیا ڈرامہ کے فن اور فن کاروں کے بارے میں اسی قسم کی بے پر کی تو نہیں جمع کر دی گئی ہیں؟" حالانکہ جہاں تک میں واقف ہوں ایسا نہیں ہے۔ ناٹک ساگر اس فن میں وقعت کے قابل اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ مجھے محمد عمر صاحب سے جو غائبانہ تعارف حاصل ہے اور جو مضامین انھوں نے عرصہ ہوا میرے رسالہ نیرنگ اور نیرنگستان کے لئے لکھے وہ سنجیدہ معلومات پر مبنی تھے۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ڈرامہ کے فن پر انھیں سطحی عبور بھی نہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر مجھے تعجب ہے کہ ایک ایسے غیر معتبر مقالہ سے وہ اس قدر متاثر کیوں ہوئے اور بیتاب صاحب کے "ذاتی الہامات" کو "انکشافات" کیوں تصور فرما بیٹھے۔ جبکہ انھیں خود آغا حشر مرحوم سے اس سے زیادہ حد تک واقف ہونا چاہیئے ان سب امور پر غور کرنے کے بعد ان کے اس مضمون کا انداز صرف بتا دیتا ہے کہ ان کے لئے "چھیڑو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں" والی مثل صادق آتی ہے۔ اور غالباً حشر مرحوم کے بارے میں جو کچھ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہوتے یا ایسے مانے جاتے وہ بیتاب صاحب کے غیر ذمہ دار قلم کے ذریعہ انھیں مل گیا۔

اس مضمون میں محمد عمر صاحب خود مانتے ہیں کہ "حشر ہندوستانی ڈرامہ کے ایک دور کے خاتم ہیں"۔ چونکہ جناب بیتاب کے متن پر پہلے لکھ چکا ہوں اسلئے محمد عمر صاحب کے حاشیہ پر لکھنا ضروری ہے۔ مجھے سب سے پہلے اپنے ایک سہو کا اعتراف کرنا ہے کہ ناٹک پتر بکاولی کو میں سہواً اپنے گذشتہ مقالہ میں احسن لکھنوی مرحوم کی تصنیف کہہ چکا ہوں۔ درحقیقت وہ منشی کریم الدین بریلوی مرحوم کی تصنیف ہے۔

محمد عمر صاحب نے حشر مرحوم کے مقلدین کا ذکر کر کے رحمت کو بھی ناٹک نویس مانا ہے۔ یہ اور تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ انکی حیثیت ایک نقال سے زیادہ کی نہیں۔ گو وہ ڈائرکٹر بننے کے بھی دعویدار رہے۔ مگر اپنے دور اور رنگ کے ایک اچھے ایکٹر اور پیڑ باز ضرور تھے۔ اور یہ صحیح ہے کہ انھوں نے محشر اور عباس کے ساتھ نام بھی پیدا کیا۔ اس حقیقت کو سب سے زیادہ جناب محشر شیرازی جانتے ہیں۔ اس دور کے ناٹکوں کا ذکر کرتے ہوئے پلاٹ وغیرہ کی جو خصوصیت بتائی ہے اس میں محمد عمر صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ "ٹریجیڈی سے شاذ ہی اعتنا کیا جاتا تھا۔ انجام یا عاقبت کبھی بخیر نہ ہوتی تھی" تعجب ہے آپ نے یہ کس دور کے ناٹکوں کا ذکر فرما دیا۔ حالانکہ ان ناٹکوں کی سب سے پہلی خصوصیت تو جاننے والے یہی مانتے ہیں کہ انجام "سب خوش" ہونا لازمی تھا۔ اور اسی کو ان میں سے اکثر ناٹکوں کا نقص سمجھا جاتا ہے کہ پلاٹ سے انجام میں خوشی پیدا ہو یا نہ ہو Anti-climax ہی کیوں نہ بنا دیں۔ مگر کھینچ تان کر المیہ پلاٹ کو بھی کومیڈی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خود آغا حشر مرحوم کے کئی ناٹکوں میں یہ نقص نمایاں ہے۔ جو اگر سیدھے سادھے انداز میں پلاٹ کی مطابقت کے لحاظ سے جائز Climax پر ختم ہوتے تو نیچرل اختتام ہوتا۔ مگر عوام کو انجام کے وقت خوش خوش اٹھانے کے لئے غیر فطری کھینچ تان کے ذریعہ سب کردار خوشی خوشی ملا کر "عاقبت بخیر" کر دکھائی ہے۔ اور یہ یقیناً مالکان کمپنی کی مرضی کے مطابق مجبوراً کرنا پڑتا۔ بنگالی ڈرامہ کے بارے میں جو بیتاب صاحب نے تذکرہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ حشر مرحوم کے ڈراموں پر اس طرز نگارش کا اثر بہت کچھ ہوا۔ یہ بات محمد عمر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی یا سمجھ کر اسے الجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "آغا صاحب مرحوم نے کن بنگالی ڈراموں سے اثر قبول کیا؟" بندہ نواز! میں یہ دریافت کروں گا کہ آپ نے آغا حشر مرحوم کے کون کون سے ڈرامے ملاحظہ فرمائے ہیں! زیادہ طویل بحث یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ آغا صاحب مرحوم کے تیسرے دور کے ناٹک "بن دیوی" کو بنگالی ڈرامہ کے ایک کامیاب اثر کا بلند نمونہ سمجھئے۔ اس کے بعد ان کے آخری دور کے ناٹک "پریمی بالک" "دھرمی بالک" "آنکھ کا نشہ" "دل کی پیاس" "ہندوستان" اور "پہلا پیار" میں ہندی اور بنگالی کا

سمویا ہوا دلکش اور موثر انداز موجود ہے۔ یاں یہ میں بھی نہ سمجھ سکا۔ آپ نے جو دریافت فرمایا ہے کہ "یہ بتائیے آغا صاحب کس اسکول سے موثر ہوئے؟" یہ تو پہلے آپ کو بتانا ہے کہ موثر ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟

آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "جب تھیٹر ختم ہو گیا اور متکلم فلم نے ڈرامہ کی سرپرستی قبول کرلی تو بھی حشر اسکول کا ڈرامہ اسے وراثت میں ملا اور اسی کو اس نے سنگ میل بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حشر اسکول میں سنگ میل بننے کی بدرجۂ اتم صلاحیتیں موجود تھیں اور اس کے سوا اور کوئی راستہ کسی کے سامنے نہ تھا پھر آپ فرماتے ہیں کہ "پہلی بولتی فلم "عالم آرا" میں حشر اسکول کی گہری جھلک نظر آتی ہے۔ شیریں فرہاد (دہلی) میں بھی حسینی میاں ظریف جھلکتے ہیں"۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ سیدھی بات کہہ کر پھر بھٹک گئے۔ حشر اسکول سے حسینی میاں ظریف کو کیا نسبت؟ یہ غور نہیں فرمایا شاید۔ آپ فرماتے ہیں "خود آغا ڈرامہ 'یہودی کی لڑکی' فلم میں عہد عتیق کی یادگار ہے۔ دور حاضر کے ڈرامہ نگار حکیم احمد شجاع اپنے فلموں میں حشر اسکول کو یاد کر جاتے ہیں۔

قبلہ! ایک 'یہودی کی لڑکی' ہی کیا، عہد عتیق کی کامیاب یادگاریں تو آجتک فلم میں بکثرت ہیں۔ آپ کس کس کا رونا روئیے گا۔ دھارمک اور تاریخی فلموں میں شروع سے آجتک حشر اسکول کی خوشہ چینی ہے۔ کیا دور حاضر کی ایک کامیاب ترین فلم 'رام راجیہ' حشر مرحوم کے 'سیتا بن باس' سے الگ ہے؟ فلم 'بکار'، 'اور سکندر'، 'بابر'، اور 'ہمایوں' وغیرہ میں کس اسکول کے چربے ہیں؟

حالانکہ یہ کچھ زیادہ خوشی کی بات نہیں مگر مجبوری کا کیا علاج کہ ہمارے آج کے اکثر ڈرامہ نگار جدت سے قاصر ہیں اور فلم کمپنیاں بھی لکیر کی فقیر ہیں۔ علاوہ ازیں آغا حشر مرحوم کو آپ کسی انداز میں بھی دیکھئے اور کچھ بھی نقائص نکالئے لیکن ڈرامہ کی دنیا مرحوم کے احسانات نہیں بھول سکتی۔ مکرمی حکیم احمد شجاع سے بھی آپ واقف ہیں۔ وہ حشر اسکول کو کیسے بھول سکتے ہیں جبکہ وہ اپنے آپ کو اس اسکول کا قابل فخر شاگرد سمجھتے ہیں۔ (حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے حکیم صاحب کی تازہ شائع شدہ "آپ بیتی" "خوں بہا") آغا حشر مرحوم کی تصانیف آپ نے ملاحظہ کی ہوتیں تو یقیناً اس انداز کی ناواقفیت کا اعتراف نہ فرماتے۔ سوشل فلموں میں بھی حشر مرحوم کے ڈراموں کے چربے موجود ہیں۔ دور کیوں جائیے "فیشن" دیکھ لیجئے اور پھر "دل کی پیاس" پڑھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا ہے "کلکتہ بمبئی۔ میرٹھ اور بریلی میں انگریزی تھیٹروں کے قیام نے ہندوستانی ڈرامہ میں انقلاب کا دروازہ بند کر دیا" یہ انگریزی تھیٹروں سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تشریح طلب معمہ ہے۔ کہ ان شہروں میں انگریزی تھیٹر کب قائم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ "فلم حشر اسکول سے فرار پر مجبور ہو گئی۔ پلاٹ ایک رنگیا۔ زبان مقفیٰ ہونے کے بجائے سادہ روزمرہ میں تبدیل ہو گئی۔ بیت بازی ختم۔ مکالمہ چھوٹے فقروں میں۔ یہ انقلاب تھا جو ڈرامہ میں آیا اور حشر اسکول کو بہا لے گیا" تبا بد گر ست"

والا معاملہ ہے۔ حشر اسکول کے تتبع کا تذکرہ تو مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں کہ اب بھی فلمی دنیا حشر اسکول کی خوشہ چینی کر رہی ہے۔ تازہ ترین ہندوستانی فلمیں ملاحظہ فرماکر انصاف سے بتا دیجئے کہ پچاس فیصدی سے زیادہ میں حشر اسکول بول رہا ہے یا نہیں۔ اب رہا پلاٹ، زبان اور مکالمہ کا مسئلہ۔ تو گذارش احوال واقعی یہ ہے کہ حشر مرحوم کے آخری دور کی تصانیف (جو جدید دور کے رجحانات کا تقاضہ ہیں) میں یہ سب خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کی معلومات کے لئے چند ڈراموں کے نام یہ ہیں "آنکھ کا نشہ" "دل کی پیاس" "پہلا پیار" — انھیں پڑھئے اور فرمائیے کہ ان کے پلاٹ میں یکسوئی، زبان سادہ اور روزمرہ ہے یا نہیں۔ بیت بازی آغا صاحب مرحوم اس دور میں خود ہی متروک قرار دے چکے تھے۔ آپ کے سامنے اُن کے جدید دور کی ایک تصنیف بھی نہیں ورنہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ "حشر اسکول کا انقلاب دقیانوسی ڈرامہ نویسی کو بہا لے گیا اور حشر اسکول کے ہاتھوں چند اوڈ اسکول وغیرہ کی مٹی عزیز ہو گئی" اور یہی ہے وہ قلمرو سخن جس کا بادشاہ حشر کو سمجھا جاتا ہے۔ بیتاب صاحب بھی سب کچھ کہہ کر ٹھنڈے دل سے یہی ماننے پر مجبور ہوئے اور یقیناً غالب و حسن اس کے حقدار نہیں۔ بیتاب صاحب کے اس دعوے کو آپ نے "ہنگامی زاویہ" فرمایا ہے۔ یہ بھی تشریح طلب ہے! یہ "ہنگامی زاویہ" یعنی چہ؟

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ (۱) دوسرے ڈرامہ نگاروں سے حشر کی استعداد علمی زیادہ تھی۔ (۲) آغا نے دوسرے ڈرامہ نگاروں سے بڑھ کر ادب کی خدمت کی۔ (۳) آغا نے دنیائے ادب میں جو حشر بپا کیا اس کی تفصیل رسالہ 'آجکل' کی گذشتہ اشاعت میں آپ نے میرے مضمون میں ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ رہا فن ڈرامہ میں حشر کی اصلاح کا سوال۔ تو حقیقت یہ ہے کہ حشر کی استعداد علمی کا تقاضہ تھا کہ انھوں نے زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی روش اور انداز کو بدلا۔ اور ان کی تصانیف کا ہر دور ایک نیا انقلاب بن کر آیا۔ اگر کسی نقاد کی نظر میں خوبصورت بلا آج کے فن ڈرامہ کے لحاظ سے نکتہ چینی کے قابل ہے تو یہ فنکار کا قصور نہیں۔ اسے نقاد کی کم نگاہی ماننا پڑے گا۔ آغا صاحب مرحوم نے جس دور میں جو ڈرامے لکھے اور جس منصب سے لکھے اس عہد کے رجحانات کا وہی تقاضہ تھا۔ اگر ایک مصلح عام روش کے خلاف آواز بلند کرے اور جبر و اکراہ سے عوام کی اصلاح کرنا چاہے تو قطعاً ناممکن ہوگا۔ عوام کی بغاوت اسے کامیابی کے رُخ پر آنے سے پہلے ہی ختم کر ڈالے گی۔ اور اس کی آواز "صدا بصحرا" ثابت ہو کر گم ہو جائے گی۔ اس کلیہ کو ایک کامیاب مصلح بخوبی سمجھتا ہے اور اگر وہ اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے تو رفتہ رفتہ صحیح راستہ پر لانے کے لئے حل پیدا ہوتا ہے۔ یہی انداز حشر مرحوم کا ہے۔ ان کے ابتدائی دور سے لے کر آخری عہد تک کے ڈرامے غور سے پڑھ کر انصاف کی نظریں اس حقیقت کو پرکھ لیتی ہیں کہ انھوں نے وقت کی مصالح اور عوام کے رجحانات کا غائر مطالعہ کر کے رفتہ رفتہ دنیائے ادب میں حشر بپا کیا اور افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے مر گئے

بے رحم چنگل نے انہیں اس دنیا سے چھین لیا۔ ورنہ آج ہمارے سامنے ان کی حشر انگیز اصلاحی پروگرام کی وہ مکمل تصویریں ہوتیں جن کی آج کے زمانہ کو ضرورت ہے اسلئے یہ کہنا یقیناً بجا ہوگا کہ "اگر حشر مرحوم اس زمین سے نہ اٹھا لئے جاتے تو اسی زمین کو آپ کا ساتواں آسمان بنا دیتے" اب تو خدا بخشے محمد عمر صاحب کے لئے) اس انتشار کو کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا اداکاری کا مسئلہ! یہ آپ مانتے ہیں کہ اکثر کامیاب ڈرامہ نگار کامیاب اداکار بھی ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار کو (خواہ عملی حیثیت سے نہ سہی) کم سے کم اداکاری کے فن میں مہارت ضرور ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ کامیاب فنکار نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد ہی آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "وہ (حشر) پردہ کش سے ڈرامہ نگار اور سوز و دعا کی حد تک پہنچے تو خدا کے لئے بتلائیے کہ انہیں ایکٹری سے کیوں بیر ہو گیا اور وہ ایکٹری سے کیوں کنارہ کش ہوئے" بندہ پرور! بیتاب صاحب کو کیا علم پہلے تو آپ یہ فرمائیے کہ "حشر پردہ کش کب تھے؟" اور یہ "اڑتی خبر" اگر آپ تک پہنچی ہے "زبانی طیور" کی۔ تو خدا کے لئے صاحب طیور کا نام آپ بتلائیے: اب حقیقت سنئے! حشر نے ناٹک کی دنیا میں جب قدم رکھا تو ڈرامہ نگاری بن کر۔ اور رفتہ رفتہ اسی حیثیت سے اداکاری اور تمثیل نگاری کا فنی طور پر مطالعہ کر کے عملی حیثیت سے کامیاب فن کار بنے۔ آپ کہتے ہیں "وہ ادنے پارٹ بھی نہ سنبھال سکے اور اسٹیج پر ان کے قدم نہ جمے" "چہ خوش! ناٹک ساگر" کے مؤلف کے قلم سے ایسی بے پر کی زیب نہیں دیتی۔ تھوڑی بہت پوچھ گچھ کر لیا کیجئے یہ جدید تنقید کی دنیا ہے۔ نئی تحقیق کا دور ہے۔ یہاں چھان بین کے بعد مستند بیان مانا جاتا ہے۔ "آغا حشر مرحوم کے معمولی معمولی سے شاگرد بھی آج اسٹیج اور فلم کی دنیا میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر کامیاب ہو رہے ہیں اور انہیں اس پر فخر ہے کہ آغا صاحب نے اداکاری کا فن سکھایا۔ ذرا اپنے قریب ہی حکیم احمد شجاع صاحب اور سید امتیاز علی صاحب تاج سے دریافت کرکے دیکھئے کہ حشر کا اداکاری کی دنیا میں کیا درجہ تھا؟ پھر آپ کو قرائن دوڑانے اور مزید تجسس کی ضرورت نہ رہے گی۔

باقی جو پھبتیاں آپ نے لیس کر آغا صاحب سے کسی "الٰہی بخش" کی شہادت دی ہے۔ اس کی نسبت کچھ کہنے کی حاجت اس لئے نہیں کہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے گری ہوئی ہیں۔ علمی، ادبی، تنقیدی دنیا میں ہر قسم کی ذاتیات معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ آپ بیتاب صاحب کے اس بیان کو اعجاز کا رتبہ دے رہے ہیں کہ "آغا مرحوم نے کسی یورپین خاتون کو رفیقۂ حیات بنا لیا" اور پھر خود ہی اس کو ایک "کہانی" بھی لکھتے ہیں۔ یہ واقعی ایک لغو کہانی ہے جس کا پلاٹ بیتاب صاحب نے بنایا اور آپ نے اس پر حاشیہ آرائی فرمائی۔ حیرت ہے کہ اس فرضی یورپین خاتون کو آپ نے قرائن سے بلند مرتبہ قرار دیتے ہوئے آغا صاحب مرحوم کو جمالیات سے محروم۔ ناخواندہ، لاؤ ابالی، سدا کا تنگ دست، گردانا ہے اور مرحوم کا قصور یہ قرار دیا گیا کہ وہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ تھے یہ بیتاب صاحب یا آپ کا کمال نہیں بلکہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا تقاضا ہے کہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ ہونا سو عیبوں کا ایک عیب ہے جس کا آپ کو بھی (بشرط انصاف) ماتم کرنا چاہئے۔ یہ سب افترا پردازی ہے ورنہ واقعہ در اصل یہ ہے کہ ایک انگریز خاتون جو مغربی اور مشرقی علم و ادب کی ماہر اور ہندوستانی ڈرامے سے دلچسپی رکھتی تھی۔ آغا صاحب مرحوم کے کمالات فن کی معترف تھی۔ موصوف نے آغا صاحب کو دیکھا تک نہ تھا۔ صرف ان کے ڈرامے دیکھے اور سن کر اس نے مرحوم سے خط و کتابت شروع کی جس کا سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا۔ وہ خطوط آغا صاحب مرحوم کے بے بہا ذخیرے میں ابھی تک موجود ہیں اور میں بنارس میں انہیں دیکھ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی جائز یا ناجائز تعلق اس داستان کا کچھ نہیں۔

علاوہ ازیں شیکسپیئر کے ناٹکوں کا ترجمہ (براہ راست یا بوساطت) آغا صاحب کے لئے چنداں وجہ امتیاز بھی نہیں۔ ڈرامہ نگاری کے جوہر ان کی طبع خداداد میں قدرت نے ودیعت کئے تھے۔ اور اہل نظر ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

آغا صاحب مرحوم کے ہندی ڈراموں کے بارہ میں بیتاب صاحب کے بیان کو جو آپ نے سراہا ہے اس کی نسبت اتنا عرض کرنا ہے کہ خاکسار کے پچھلے مضمون میں اس کی پوری صراحت شائع ہو چکی ہے جس میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ (حشر نگاری) کی اہلیت کسی دوسرے میں نہ تھی۔ اس ثبوت کے لئے کہ ہندی ڈراموں کا مصنف کوئی غیر شخص تھا جو ہندی داں ہونے کی حیثیت سے حشر کا ہم پلہ گردانا گیا) حشر کی طرز نگارش کو کیوں نہیں پرکھ لیا جاتا حشر کے اردو ڈراموں کا جیتا جاگتا انداز حشر کے تہذیبی ڈراموں میں کیسے آیا۔ اس پر جب آپ یا کوئی معترض بھی غور کرے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ "بن دیوی" ہو یا "گنگا اوترن" "سیتا بن باس" یا "بھیشم پرتگیہ" حشر اسٹائل کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں اور بلا شک حشر کی تصانیف ان میں سے ایک لفظ بھی کسی غیر کا لکھا ہوا نہیں۔ البتہ حشر مرحوم کے منشی جنہیں مرحوم پورے پورے ڈرامے بول کر لکھایا کرتے اگر یہ دعویٰ کریں کہ نقل کا نام تصنیف ہے اور اس لئے وہ ان ڈراموں کے مصنف ہیں اور بلا دلیل بیتاب صاحب یا آپ انہیں مان لیں تو کس کا اجارہ ہے۔ ورنہ ایک نہیں بے گنتی واقفین موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ آغا صاحب مرحوم کو ہندی زبان پر کافی عبور تھا۔ آخر میں آپ کا بیان کہ "وہ کردار نگاری سے آغا صاحب کو کیا واسطہ" افسوسناک ہے۔ آپ کی اس لاعلمی پر مجھے بے حد حیرت ہے کہ "آغا حشر اس صنعت (کردار نگاری) ہی سے ناآشنا تھے" ورنہ کوئی نہیں جانتا کہ حشر کے ڈراموں کے چھوٹے چھوٹے کردار بھی چلتی پھرتی زندہ یادگاریں ہیں حقیقت یہ ہے کہ حشر کی کردار نگاری پر ایک مستقل مبسوط باب کی ضرورت ہے۔

"یہودی کی لڑکی" کا عذرا۔ "سلور کنگ" کا افضل اور پروین "خوبصورت بلا" کا توفیق۔ "سورداس" میں رام داس (رباب) کا کیرکٹر آخر دم تک (سورداس) چنتامنی (طوائف) رمبھا (بیوی) "آنکھ کا نشہ" میں بیجی، چنچل، کام لتا، سروجنی کا حق۔ "سیتا بن باس" میں سیتا جی اور رام چندر جی کے کردار "سہراب و رستم" میں تہمینہ

(باقی صفحہ

پیا پیا مت بول

بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول
ایسی بولی بول رے پپیہے! اگنی لاگی دونی ہوئے
جیون کے سب سوت کھلیں او من بھوی میں دھونی ہوئے
بھاڑ میں ڈاروں ان شبدوں کو نیک نہ بولیں دونگی تھوئے
آگ لگے اس جیبھ کو تیری، رام کرے یہ گونگی ہوئے
پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بول بول پپیہے، اگت کی بانی بول
ہردے بھیتر کیا بیتت ہے؟ کہا بتاوے بھولی نار
جلے، تڑپے، گھس گھس رووے، رہے مرسا مار
ہ، کراہ کی سن گن پاکے پیٹ میں لیٹ ڈار
ہے رے مورکھ باورے! تو کوک پھر اسنسار
پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے، اگت کی بانی بول
اونچا اڑا آڑ بادل پھاڑے، ات ات ڈولے ڈانوا ڈول
لکی مارکے پنچھی رووے، ٹپ ٹپ انسوا ہیں آن مول
ڈھلکی جیمی، سب رہنے دے! دبی لگی مت کھول
جیتن لاگی کو نہ جانے، تو کیوں پیٹت ڈھول
پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے اگت کی بانی بول
ات بیت کی یہ بھول ہے پنچھی! اگھاؤ لگے اب کچھ نا ہوئے
کاچے پھل جب پاک گئے تو چڑیا کھائے اب کچھ نا ہوئے
ہونی تھی سو ہو گئی پیارے، بتیرے مٹتے اب کچھ نا ہوئے
گیا سمے پھر ہاتھ نہ آوے، ہاتھ ملے اب کچھ نا ہوئے
پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے اگت کی بانی بول
بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول

سوامی مارہروی

نظروں کا سلام

اس عشق کے ہاتھوں ایسا بھی اک منظر عام آجاتا ہے
خود حسن تماشا کرنے کو کھینچ کر لب بام آجاتا ہے
تارے ڈوبے نبضیں چھوٹیں ایسے میں تمہیں غمخوار نہیں
یہ وقت وہ نازک ہوتا ہے جب غیر بھی کام آجاتا ہے
تم نے تو نہیں توڑا دل کو تم کس لئے برہم ہوتے ہو
جب ظلم کے قصے چھڑتے ہیں ظالم کا بھی نام آجاتا ہے
جب عاشق کے جلوے ہوتے ہیں عرفان نظر کی منزل میں
خود حسن تقاضا کرتا ہے اک ایسا مقام آجاتا ہے
دامن کا کوئی بھی گوشہ بیکار نہیں ہے دامن میں
جو پھولوں سے بچ رہتا ہے کانٹوں کے وہ کام آجاتا ہے
جب ملتا ہوں تو دانستہ ہوتے ہیں تجاہل آمادہ
جب کھنچتا ہوں تو چپکے سے نظروں کا پیام آجاتا ہے
ہنستی ہوئی کلیوں سے کہہ دو پھولیں نہ شمیم گلشن پر
اک ایسی ہوا بھی چلتی ہے رونے کا مقام آجاتا ہے
میں درد کو یوں بھی تعظیماً سینے سے لگائے رکھتا ہوں
جس وقت یہ کروٹ لیتا ہے لب پر ترا نام آجاتا ہے
بیگانہ رہی میری آنکھوں پر اے دوست مگر بے غرض آنکھ
دنیا اسے اپنا کہتی ہے جو وقت پہ کام آجاتا ہے
وہ نیم کشادہ چلمن سے مجبور ہے نگاہی کا عالم
جس طرح نکلتے سورج کی کرنوں کا سلام آجاتا ہے
جب نیت صادق ہوتی ہے رحمت نہیں ہوتی اٹھنے کی
جس جام پہ نظریں جمتی ہیں اٹھ کر وہی جام آجاتا ہے
ان کافر گیسو والوں سے اللہ بچائے ہر دل کو
جب زلفیں بکھرا دیتے ہیں عالم تہ دام آجاتا ہے
وہ ہم سے گریزاں ہو بھی چکے مدت ہوئی اس کو اے محشر
لیکن اب بھی لگتا ہے نظروں کا سلام آجاتا ہے

فاروق محشر بدایونی

یہاں وہاں

اڑائی ختم ہوچکنے کے باعث یہ ’ ہیلی کو پٹر ‘ (پنکھے کا جہاز) کھیتوں میں ایسی ادویات چھڑک و جس کے اثر سے نہ صرف خس و خاشاک کا ملکہ بیماری او پھیلانے والے کیڑوں کا قلع قمع ممکن ہے۔ یہ طریقہ بہ مفید ثابت ہوا ہے۔

← دریائے ٹیمز کے کنارے ایک کشتی میں نئی وضع کا انجن لگا کر اسکا معائنہ کیا جارہا ہے۔ یہ انجن رائس کمپنی کے ایک انجینئر کی ایجاد ہے۔ عنقریب انجن بہت تعداد میں تیار کرکے باہر بھیجے جائینگے

فٹ بال کا کھیل عراق کے لوگوں کو بہت زیادہ پسند ہے اس تصویر میں عراقی ’ ہوائی بیڑے ‘ اور متحدہ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔ حال ہی میں ایک مقابلہ کے آخری کھیل میں عراق کے قائم مقام بادشاہ تشریف لائے اور انعامات تقسیم کئے۔

ٹ کے قدیم نمونے

ایک ہوشیار ماہر فن مٹتے ہوئے نقوش کو دوبارہ اجال رہا ہے۔ یہ ظروف اپنے زمانے کے قابل یادگار نمونے ہیں۔

آج سے سینکڑوں سال پہلے آرٹ کے یہ بیش قیمت نمونے جو چین، ایران، ترکی اور ہسپانیہ سے مصر لائے گئے تھے حوادث روزگار کے باعث مٹی کے نیچے دب گئے۔ حال ہی کی کھدائی میں انکو برآمد کیا گیا ہے۔ پانچ سال بعد ان کی عام نمائش شروع ہوئی انہیں دیکھکر عہد قدیم کی لائق تحسین صناعی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لاکھی مٹی کا بنا ہوا ایک پرندہ جو چھ سو سال پہلے ایرانی کاریگروں نے تیار کیا تھا۔

چودھویں صدی کے ایرانی فن کا نمونہ۔ قرمزی رنگ کو

تانبے کا بنا ہوا چھ سو سال پرانا جھاڑ جسکے بارہ پہلو ہیں۔ تیل میں ڈوبی ہوئی متعدد بتیاں اسے روشن رکھتی ہیں۔

کانسی کا ایک خوبصورت آفتابہ۔ ٹونٹی کی جگہ ایک مرغ اپنے پر پھیلائے

مکھن بنانے کی مشین میں سے مکھن نکل رہا ہے۔
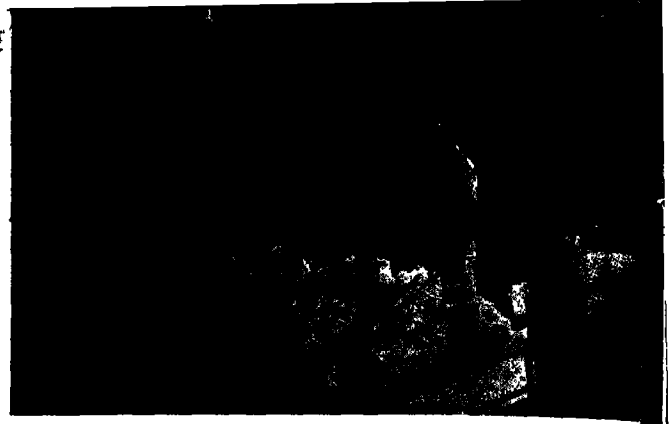
مکھن کی ٹکیاں کاٹنے اور کاغذوں میں لپیٹنے کی
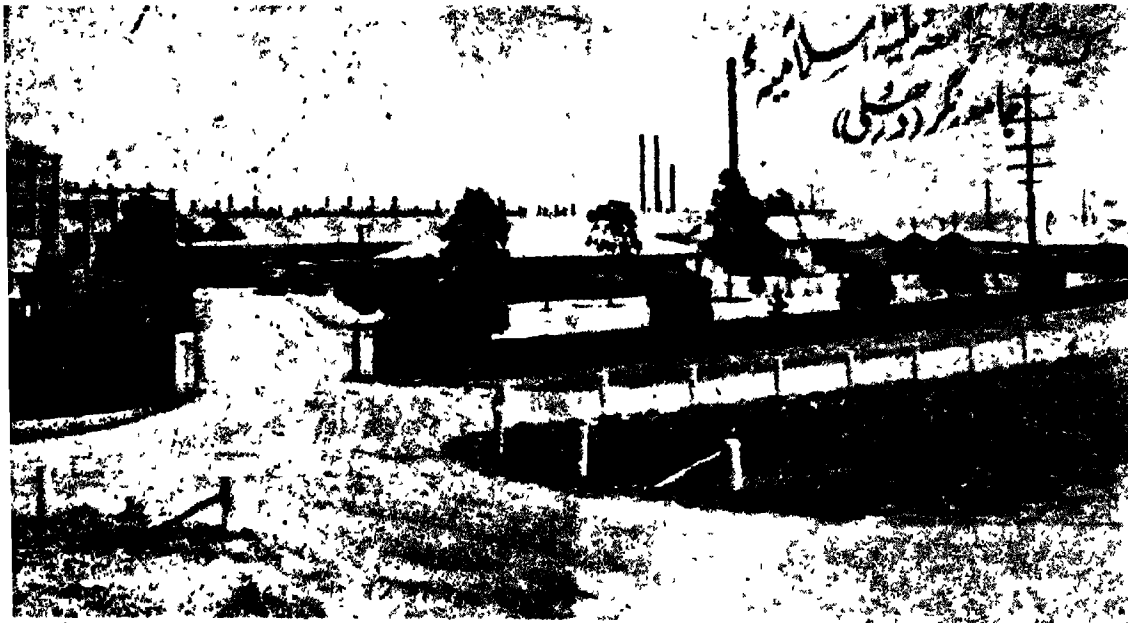
آسٹریلیا کے ڈیری فارم

نیو ساؤتھ ویلز میں مکھن بنانے والے ایک کارخانے کا عام نظارہ۔

مکھن بنانے والے کارخانے کی ایک لیباریٹری۔

صحت و صفائی کا لحاظ رکھتے ہوئے مکھن کے ڈبے بند کئے ج

هندوستان میں ریشم

اس کی کشتی میں ریشم کے کوئے۔ ایسی هی
شتیوں میں ریشم کے کیڑے کوئے تیار کرتے هیں۔

روشن اور هوادار کمرے جنمیں کیڑے اور انڈے
پرورش پاتے هیں۔

بشیا میں چین کے بعد هندوستان بھی ریشم سازی کی صنعت کے
ئے مشهور هے۔ قدیم ترین زمانے سے یہاں ریشم کے کپڑے
غیره تیار هوتے رهے هیں۔ اس وقت اس صنعت کا سب سے بڑا
رکز ریاست میسور میں هے۔ ورنه قابل ذکر کارخانے تو دوسرے
شهروں میں بھی موجود هیں۔ ریشم کے کیڑے شہتوت کے
پتوں پر پرورش پاتے هیں اسلئے کیڑوں اور انکے انڈوں کی
دیکھ بھال کے علاوہ شہتوت کے درختوں کی صحیح نشو و نما کا
بھی خیال رکھا جاتا هے۔ اچھا ریشم صرف اسی کارخانے میں تیار
هوسکتا هے جسکے زیر اهتمام کیڑوں اور انڈوں کا سائنسی معائنه
کرنے کیلئے عمده تجربه کار هوں۔ شہتوت کے پتوں کو چاٹ
چاٹ کر نئے کیڑے خاصے بڑے هو جاتے هیں انهیں کیڑیلز
کہا جاتا هے۔ تقریباً چھ هفتے بعد وہ اپنے هی جسم کے گرد تار
لپیٹنے لگتے هیں۔ چند دن بعد وہ مکوڑوں کی شکل میں
کوئے سے باهر آجاتے هیں اور پر نکلنے تک آرام کرتے هیں۔
ان میں سے ماداؤں کو خاص طور پر ریشم کی تھیلیوں میں بند
کرلیا جاتا هے تاکه وہ حدود سے باهر جاکر انڈے نه دے سکیں۔

ریشم کے ایسے کیڑوں سے بھری هوئی کشتی جنکی عمر
[illegible]

میسور ...
میں اتنے زیادہ انڈے نکلوائے جاتے ہیں کہ ریشم سے قطع نظر انکی تجارت بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسرے شہروں کے چھوٹے ریشم ساز ان کیڑوں کو خرید کر اپنا کام چلاتے ہیں ہندوستان کا ریشمی کپڑا یا صرف ریشم بڑی مقدار میں آس پاس کے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت بھی خاطر خواہ مدد دیتی ہے تاکہ یہ ہندوستانی تجارت اچھی طرح فروغ پاسکے۔

مائکروسکوپ والے کیمرے کے ذریعہ ریشم کے ا...
کی تصویریں لی جا رہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ا...
لگایا جائیگا کہ کونسے کارآمد ہیں اور کونسے ...

کی صنعت
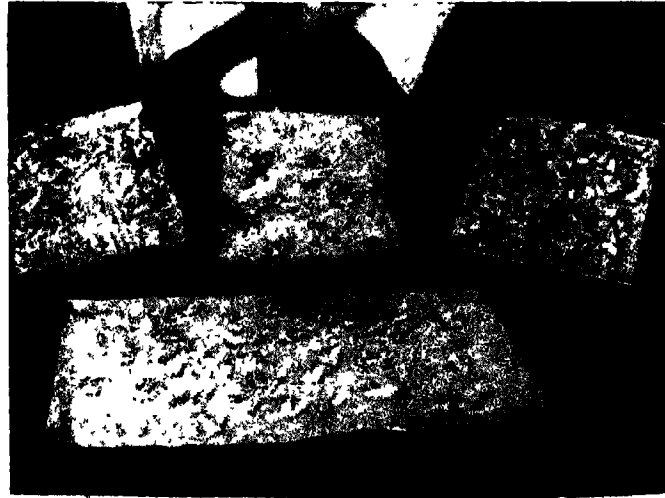
کیڑوں کی مادائیں انڈے دے رہی ہیں۔ انکی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے انکا شجرۂ نسب محفوظ رکھا جاتا ہے۔

ذخیرے کے کمرے میں کوئے ٹوکروں میں بھرے رکھے ہیں۔ یہ ہندوستان بھر کے ریشم سازوں کو بھیجے جائینگے۔ ←

چین کی نئی پود ترقی
کے راستے پر گامزن ہے۔
س سلسلے میں لڑکیاں
ڑکوں سے کسی طرح بھی
یچھے نہیں ہیں۔ لڑائی
کے خطرناک ماحول کے
باوجود انہوں نے دوسرے
شاغل کے ساتھ اپنی تعلیم
جاری رکھی ہے۔ اس صفحے
کی تصاویر میں کن لنگ
نانہ کالج کی لڑکیاں نظر
آرہی ہیں جو صوبہ ذی
شوان کے شہر چنگ ٹو
میں واقع ہے۔ یہ اور ایسے
ہی بہت سے کالج چین کو
حیات نو بخشنے میں
بڑی مدد دینگے

کالج کی چند طالبات
مطالعے میں مصروف ہیں۔
پشت کی جانب دیوار میں
لگا ہوا سوئے کا تختہ غور
طلب ہے۔ ←

ایک طالبہ اپنے ذاتی کمرے میں۔ اسکا لباس بالکل نئی وضع کا ہے جس کا رواج سارے ملک میں ہو چلا ہے۔
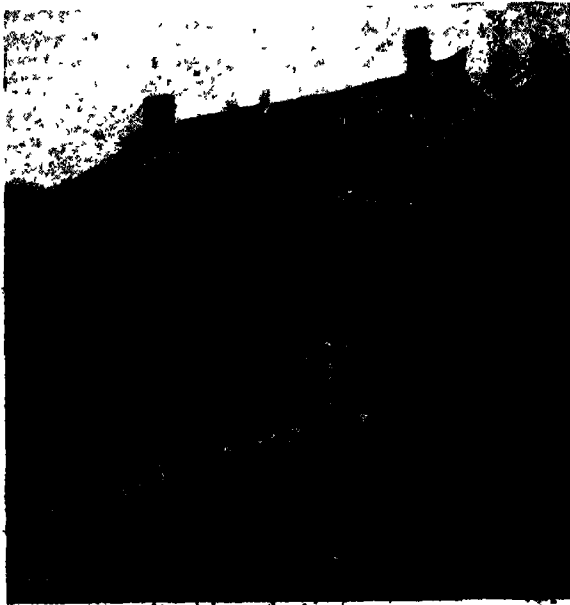
کالج کی عمارتوں اور میدانوں کا ایک خوشنما منظر۔ اس حصہ ملک کو جاپانی بمباری سے نقصان پہنچ چکا ہے۔

عراق

عراق کی سرزمین قدیم زمانے سے آج تک عظیم الشان محلوں اور مستحکم مقبروں کیلئے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طرز تعمیر میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن نفاست و پاکیزگی کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر محل اور مقبرے کے ساتھ شاداب باغیچے اور عمدہ روشیں بنائی جاتی ہیں۔ سابق شاہ عراق کو بھی عمارتیں
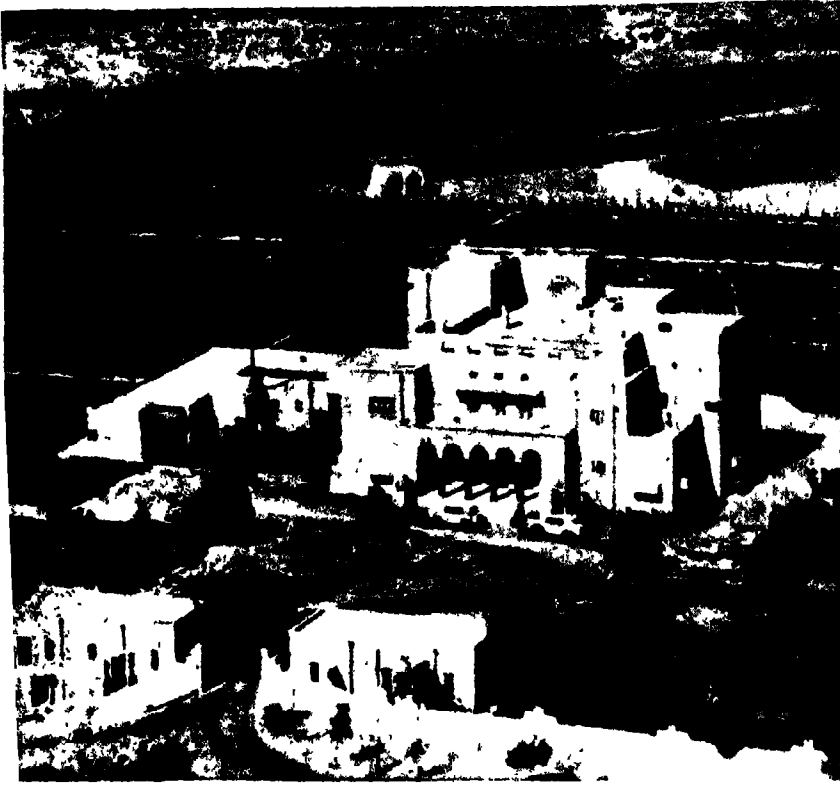
قصر الرحاب کا ایک دلکش منظر۔ آجکل اس میں عراق کے قائم مقام بادشاہ رہتے ہیں۔ یہ تصویر عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے۔

بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ انکے عہد کے دو محل قصر الزہور اور قصر الرحاب خاص طور پر مشہور ہیں۔

سابق شاہ فیصل کے مقبرے کا طائرانہ منظر۔ یہ تصویر بھی عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے

مس ستارہ — فلم ایکٹرس

ترجیح

افسانہ

دیوندر ستیارتھی

یہ نمائش کا آخری دن تھا۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے تیوری کا عجیب سا ترشول بنایا جو نیل کمل کی منہ بولی اماں یعنی اسکی بڑھیا پڑوسن کے ماتھے پر اکثر نظر آ جاتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کنگھی چوٹی کی اور سڑک پر آ گئی۔ یہ طے تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر نیل کمل کے ہاں پہنچے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ آج نمائش کے راستے میں وہ دل کی بات کہہ ڈالے گی۔ آخر کوئی کب تک راز کو چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ اس سے فائدہ؟ ایک لطیف سا خوف اس کی روح کی پہنائیوں سے ابھرتا اور چلتے چلتے اس کے پاؤں رک رک جاتے۔ آخر یہ بات وہ نیل کمل سے کیسے کہے گی؟ وہ کیسے اسے سمجھائے گی کہ اس کی سونیا خوشی اور غم کے درمیان معلق ہے۔ وہ کیسے اسے بتائے گی کہ اسے دنیا والوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان دنیا والوں سے خدا ہی بچائے۔ ان کی ایک ہی تہمت عورت کو کچل کر رکھ سکتی ہے۔ آج اسے نیل کمل کی مدد کی ضرورت تھی آج اسے بے پناہ خلوص کا ثبوت ملنا چاہئے۔ ورنہ بات نہیں جانے کے بعد معاملہ بگڑ جائے گا۔ جیسے وہ ایک گہری جھیل میں ڈوب رہی ہو۔ نمائش کا خیال آتے ہی وہ سنبھل گئی۔ یہ طے تھا کہ آج نیل کمل وہ سبھی چیزیں خرید دے گا جنہیں وہ دونوں دوکانداروں سے ریزرو رکھنے کو کہہ آئے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نمائش سے لوٹتے ہوئے نیل کمل سے اپنا فیصلہ کہے گی، پہلے نہیں۔ اس کی بے چینی کسی قدر کم ہو گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نیل کمل غیر حاضر ہے۔ بڑھیا پڑوسن نے حسب معمول ماتھے پر تیوریوں کا ترشول بنا کر اس کے ہاتھ میں چابی تھماتے ہوئے کہا "تم بیٹھو، سونیا۔ نیل کمل کا تو سبھاؤ ہی ایسا ہے۔ وہ پتہ نہیں کب بھول جاتا ہے!"

وہ چاہتی تھی کہ کیلی ہی نمائش کا راستہ ناپے۔ شاید ادھر کہیں نیل کمل بھی مل جائے۔ لیکن بے دلی سے کمرہ کھول کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ بڑھیا پڑوسن کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ چلو اچھا ہوا اس نے سوچا، اس چڑیل سے تو چھٹی مل گئی۔ یہاں آ بیٹھتی تو وہی پرانا راگ چھیڑ دیتی — یہ آجکل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا، سونیا۔ نہ لاج نہ شرم۔ تم ان سے الگ ہو۔ نیل کمل ہمیشہ تمہیں سراہتا ہے۔

دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ یہ مجسمہ اسے پسند تھا۔ فنکار نے ایک حسینہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا تھا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ خیال آ جائے کہ وہ ناچنے والی ہے۔ اس کا رنگ کچھ اس طرح بدل گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا آنے والے مہمان کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی ہے۔

صوفے کے قریب فرش پر ڈھیر کی ڈھیر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اٹھ کر انہیں درست کرنے لگ جاتی۔ اس وقت اس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اسے دنیا کی لطف مسرتوں سے محروم کر دیا ہو۔ اسے یاد تھا کہ ایک روز نیل کمل نے اسی ایک کتاب سے کسی عورت کے جذبات پڑھ کر سنائے تھے — پہلے وقتوں میں دیوتا دھرتی پر اترتے تھے اور عورتوں سے محبت کرتے تھے۔ اب وہ نیچے نہیں اترتے۔ اگر وہ مر چکے ہیں یا بوڑھے کھوسٹ ہو چکے ہیں تو کہاں مجھے وہ محبت نصیب نہ ہوگی جو زندگی کے ساز پر درد بھرے گیت چھیڑ سکے؟ ......

اٹھ کر وہ اس کتاب کی تلاش کرنے لگی۔ یہ خیال اسے گدگدانے لگا کہ نیل کمل معمولی انسان نہیں، کوئی دیوتا ہے جو آسمان سے دھرتی پر اتر آیا ہے۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کے روبرو محبت کا اظہار کرنے والا شخص ضرور کوئی دیوتا ہوگا۔ لیکن اپنی شکل کا خیال اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ آج وہ سب بات کہہ ڈالے گی۔ اگر دیوتا نے مجھے ٹھکرا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ یہ فنکار قسم کے لوگ بہت بے پرواہ ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس کا بھی کیا علاج کہ نیل کمل کا نام میری روح پر کچھ اس طرح نقش ہو گیا ہے۔ جیسے کسی نے مرمریں سطح پر ٹھوکر لگا کر چاقو سے اپنا نام کندہ کر دیا ہو۔ دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

آئینے کے سامنے اس نے پھر سے بال کھول ڈالے اور تیزی سے کنگھی کرنے لگی۔ کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ کنگھی رک جائے تو بال الجھ جاتے ہیں۔ کمرہ بھی صفائی چاہتا ہے۔ بھلا کوئی پوچھے پیالے کے چھلکے میز کے پاس کیوں پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تو دیوار گیر پر رکھے مجسمے کو منہ چڑا رہے ہیں۔ چھت کے قریب مکڑی نے جالے تن رکھے ہیں۔ دیواروں پر شاید برسوں سے سفیدی نہیں کرائی گئی۔ یہ فنکار قسم کے لوگ اپنے لئے تھوڑا بہت اصول وضع کر لیں تو ذرا بہتر طور پر زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہم مل کر رہیں گے۔ مل کر گھر بنائیں گے۔ نیل کمل میری آواز پر مرتا ہے۔ کہتا ہے "سونیا تیری آواز تو بلبل کو شرمندہ کر دے۔" مجسمے کے قریب پہنچ کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ مجسمے کی حسینہ اس جیسی سو لڑکیوں پر بھاری ہے۔ لیکن جب ایک بار نیل کمل سے اپنی کہہ چکا ہے تو وہ اپنا فیصلہ کبھی رد نہ کر سکے گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ مجسمے کے قریب سے ہٹ گئی۔ کیلے کے چھلکے اٹھا کر اس نے باہر پھینک دئے اور فرش پر بیٹھ کر کتابوں کو قرینے سے رکھنے لگی۔ اچانک اس کے دل میں یہ چاہت پیدا ہوئی کہ بڑھیا بھی آ جائے

اور اس کی مدد کرے۔ اس نے بڑھیا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ شاید وہ کہیں باہر چلی گئی۔ اسے خیال آیا کہ بڑھیا ابھی یہاں چلی آئے تو پھر سے یہی رٹ لگانے لگے کہ چاند سورج کی جوڑی اچھے کرموں سے بنتی ہے۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کو چاندنی سے تشبیہ دینا، یہ کچھ بڑھیا ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کے جی میں آیا۔ فوراً اٹھ کر آئینے میں اپنا روپ دیکھے۔

نمائش کا آخری دن تھا اور وقت یوں اڑتا چلا جائے۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اکیلی ہی نمائش کا رخ اختیار کرے آخر اس حماقت کا کیا مطلب کہ نمائش کا آخری دن یوں بدمزگی کا شکار ہو جائے۔

نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اب نیل کمل کبھی اس کمرے میں نہیں آئے گا۔ جیسے اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہو۔ ان تین مہینوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب اسے دوبارہ "تمھیں چوہلی کھیلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوگی؟ نہ میں نے اس پر یقین کیا ہوتا نہ آج میری یہ حالت ہوتی۔ میری بددعائیں اسے کھا جائیں گی۔ میں وہ انتقام لوں گی کہ دنیا میری ہمت کی داد دے گی۔ لیکن نیچے سے بڑھیا کی آہٹ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی جیسے کوئی نرتکی بانہیں پھیلائے تال کا انتظار کر رہی ہو۔

"مجھے معلوم تھا کہ کمل ابھی تک نہ آیا ہوگا" بڑھیا نے نیچے سے آکر کہنا شروع کیا "بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹیا سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو"

بڑھیا دہلیز پر بیٹھ گئی۔ سونیا اٹھ کر سڑک کی طرف کھڑکی میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ رات اتر آئی تھی۔ ننھے روشن ہوا اٹھے تھے وہ اندھیرے میں دور راہ میں کسی کو آتے ہوئے دیکھنے کیلئے بیقرار ہو اٹھی۔ ایک بھاری بھرکم ٹرک سڑک کی چھاتی کو دہلاتا ہوا نکل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک سڑک کی طرح ہو۔

اس نے مڑ کر دیوار گیر کے مجسمے کی جانب دیکھا جس کے انگ انگ سے دردِ زہ کا علامتی تصور روشن ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بات بڑھیا سے کہہ ڈالے

بڑھیا کہہ رہی تھی "تم اداس کیوں ہو سونیا؟ آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں"

کہانی! ــــ کیسی کہانی؟ اس سے پیشتر کہ وہ ہاں یا نہ کہتی، بڑھیا نے کہنا شروع کیا "بہت پہلے دیس میں بہت بھیانک کال پڑا۔ چشمے، تالاب اور کنوئیں، سب سوکھ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ ایک لڑکی پانی کی تلاش میں نکلی۔ تھک ہار کر اس نے مشکی زمین پر رکھ دی

اور سو گئی۔ آنکھ کھلی تو آسمان سے اترتے بادل کی کرپا سے اس کی مشکی تازہ پانی سے بھر گئی۔ وہ بہت پیاسی تھی۔ لیکن ماں کو پانی پلائے بغیر ایک بوند تک حلق میں ٹپکانا پسند نہ تھا۔ گھر پہنچی تو ماں کے سرہانے جم دوت کھڑے تھے۔ ماں بولی "بیٹی میرا آخری وقت قریب ہے۔ اب پانی تمہارے لئے ہے" جونہی اس نے کٹورا بھر کر پانی پینا چاہا کہیں سے ایک راہی آ نکلا۔ لڑکی نے اپنا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سات قطرے لڑکی کی گود میں آ گرے۔ مشکی سے ایک ندی بہہ نکلی جو آسمان پہنچ کر آکاش گنگا (کہکشاں) بن گئی۔ اور وہ سات قطرے سات ستارے بن گئے"...... کوئی اور وقت ہوتا تو سونیا یہی کہتی کہ تم نے یونہی نیل کمل پر رعب جما رکھا ہے۔ یہ بکواس ہے کہ مشکی سے گنگا بہہ نکلی۔ بھلا یہ گنگا آسمان پر کیسے جا پہنچی؟ راہی کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کٹورے سے لڑکی کی گود میں سات قطرے گرے۔ اور یہ جیسا کہ نیل کمل نے مشہور کر رکھا ہے تم بھی سات بیٹیوں کی ماں رہ چکی ہو۔ یہ بہت بڑی گپ ہے۔ دیکھو تمہاری زبان کو روک دی۔ اسے نیل کمل کے سامنے ہی کھولا کرو۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ وہی بڑھیا ہے جس نے ابھی ابھی کہا تھا ــــ بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹیا، سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو۔ وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ دادی اماں، تمہاری یہ آکاش گنگا والی کہانی تو بہت بڑی حقیقت ہے۔ شاید میں ہی وہ لڑکی ہوں جو پیاسی ماں کیلئے پانی کی تلاش میں بھٹکتی رہی تھی۔ تمہارا یہ نیل کمل ایک راہی کی طرح ہمارے ہاں چلا آیا اور میں نے وہی سلوک کیا جو ہمیشہ ایک مہمان کا حق ہوتا ہے۔

ایک طرف صلیب پر چڑھتے ہوئے مسیح کی رنگین تصویر آویزاں تھی جو ابھی انگلے ہی روز اپنے جنم دن کے موقع پر اس نے نیل کمل کو پیش کی تھی اور جسے پیتے ہوئے اس نے ایک ادیب کا کوئی اچھوتا خیال پڑھ کر سنایا تھا ــــ اپنی معصوم بھیڑوں پر کئے گئے ظلم کی خدا کا بیٹا تاب نہ لا سکا اور اس نے صلیب پر چڑھنا قبول کیا یہی نجات کا ایک سچی طریقہ ہے۔ اس کے ذہن میں نجات کا خیال بجلی کی سی تیزی سے کوندے کی طرح لپکا۔ اور وہ کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ وہ بول اٹھی "نرتکی کے لیکھ تو اسکے جنم سے پہلے ہی لکھے جاتے ہیں، سونیا!"

سونیا نے ایک سہمی سی نظر سے جھنجھلاتے ہوئے بڑھیا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ لیکھ ویکھ کا قصہ میری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ بولی "چھوڑو کوئی کام کی بات کرو، دادی اماں!"

بڑھیا نے اس روکھے جواب سے ذرا برا نہ مانا۔ وہ تو اپنی گذشتہ زندگی کے خیال میں الجھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ کہنے لگی "پیاسی

روٹی کو پھر سے سینک کر کھانے میں مزہ آتا ہے سونیا؟"

سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا سے کہے، یہ پہیلیاں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مجھے نپٹ انجان مت سمجھو۔ تم یہی کہہ رہی ہو نا کہ ہمارا بیاہ ہو جائے تو تمہیں کسی کے ہاں کام کر کے روٹی کمانے کی ضرورت ہی نہ رہ جائے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم تمہیں گھر کا کام سونپ دیں تو تمہاری بیتی ہوئی خوشیاں پھر سے لوٹ آئینگی۔ باری باری تمہاری زندگی میں سات بیٹے آئے۔ مگر کچھ بھی تو نہ رہا۔ نیل کمل تمہارا منہ بولا بیٹا ہے۔ کبھی کبھار تمہارے ہاتھ پر دو چار آنے رکھ دیتا ہے تو تم خوش ہو جاتی ہو۔ ہمارا بیاہ ہو جائے تو میں اور بھی خوش کیا کرونگی۔

بڑھیا نے تمام خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو تمہارے بیاہ پر تمہیں چاندی کا چھلا بھی نہیں دے سکونگی، سونیا"

اس کے جواب میں سونیا جھٹ کہہ اٹھی۔ "وہ تم نے ہی تو کہا تھا، دادی اماں کہ روپ کو سنگار نہیں چاہیئے"

بڑھیا کھسیانی سی ہو گئی۔ "میں دھنوان ہوتی تو بہو کو سونے میں پیلی کر دیتی۔ میں تو تمہارے بیاہ کے دن گن رہی ہوں، سونیا!"

سونیا مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بیکار دن گنتے رہنے سے کیا فائدہ۔ کل کل کرتے رہو تو وہ کل کبھی آتا ہی نہیں۔ کل کا تصور دھندلا ہے۔ یہ آج، بہت انتظار کے بعد آیا ہے۔ اگر یہ آج بھی بیکار رہ گیا تو سمجھ لو دو زندگیاں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے پرے ہٹ گئیں

دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے اب اسے پہلی سی کوفت محسوس نہ ہوئی۔ غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں صلیب پر چڑھتے ہوئے مسیح کی طرف گھوم گئیں۔

بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ جیسے سات بیٹوں کو کھو کر آٹھواں بیٹا پا لیا ہو۔ اب اس بیٹے کا بیاہ ہوگا۔ بہو بری نہیں کرسٹان ہے تو کیا ہوا وہ میموں کی طرح بال تو نہیں کٹاتی۔ جیسا دیس کا رواج ہے، وہ ساڑھی پہنتی ہے سونیا کی سفید ساڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہہ اٹھی۔ "سانولے رنگ پر سفید کپڑا ہی خوب پھبتا ہے، سونیا"

سونیا نے ہنس کر کہا۔ "مگر بیاہ کے موقع پر تو لال ساڑھی چاہیئے نا کیوں دادی اماں؟"

بڑھیا جھٹ کہہ اٹھی۔ "اپنے ہاتھ سے میں تیری مانگ میں سیندور بھرونگی، سونیا"

سونیا کہنا چاہتی تھی کہ نیل کمل تمہارا بہت ادب کرتا ہے۔ تم کہوگی تو کل ہی مجھ سے بیاہ کرے گا۔ ہاں، اب تو فیصلہ ہو ہی جانا چاہیئے۔ آج میں نیل کمل کو اپنی حالت سے آگاہ کر دوں گی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کا حساب تو آسانی سے اِدھر اُدھر کیا جا سکتا ہے۔ اگر نیل کمل انکار کر دے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میری ماں بھی شاید میری مدد نہ کرے۔ چھوٹی بہن مجھے بیوقوف سمجھ سکتی ہے۔ شاید میں یونہی ڈرتی ہوں۔ نیل کمل خوشی سے اچھل بھی تو سکتا ہے۔

وہ چاہتی تھی کہ صوفے سے اٹھ کر بڑھیا کے قریب دہلیز پر جا بیٹھے اور اس سے کہے کہ خدا نے چاہا تو کل ہی میرا بیاہ ہو جائے گا۔ نیل کمل بازار سے لال ساڑھی لیتا آئے گا۔ سیندور تم دے دینا۔ لیکن نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ سکی نہ منہ سے ہی کچھ کہہ سکی۔ چپلین کی طرح بیٹھی اپنے جذبات کو بیاہ کے دھاگے میں پروتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ نیل کمل کی رگوں میں ایک شریف گھرانے کا خون دوڑ رہا ہے اور تھوڑا سا زور ڈالنے ہی سے وہ مان جائے گا۔ آج تو اب ختم ہوا ہے۔ کل ہمارا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ بڑھیا سب سے پہلے بدھائی دے گی۔ نیل کمل کے دوست کتنے خوش ہونگے۔ سب سے زیادہ خوشی شنکر کو ہوگی جو ابھی اس روز ہنس کر کہہ رہا تھا۔ "کمل بھیا، تمہارے بیاہ پر میں تمہارے ساگوان کے صوفے پر نیا پالش کرا دوں گا۔ پھر دیکھنا یہ کتنا خوبصورت نظر آئے گا۔" جواب میں نیل کمل نے آداب عرض کرتے ہوئے کہا تھا۔ "خوبصورتی پالش نہیں چاہتی" اسے یاد تھا کہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی تھی جبکہ نیل کمل کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے شنکر کہہ اٹھا تھا۔ "سچ ہے، میاں مجنوں..." اور وہ جو رتن نے کہا تھا۔ "خوبصورتی اور بدصورتی کے درمیان ہمیشہ ایک مرئی یا غیر مرئی حد فاصل موجود رہے گی لیکن فن کی سطح تک ابھرنے پر بدصورتی بھی بدصورتی نہیں رہتی۔" دیوار گیر کے مجسمے کی طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے سوچا نہ جانے رتن کیا کہنا چاہتا تھا۔ کل ہی ہمارا بیاہ ہو جائے تو نہ جانے رتن کیا بھینٹ لائے گا۔

بڑھیا کہہ رہی تھی۔ "دیسی سب گن پوری بہو تو ہر ساس کو ملے سونیا"

جواب میں سونیا کہنا چاہتی تھی کہ تم دیکھ لوگی، دادی اماں، میں ناشکری نہیں ہوں۔ خوبصورتی تو صرف ایک گن ہے۔ اس دیوار گیر مجسمے کی حسینہ ہی کو لے لو۔ وہ خوبصورت ضرور ہے، سب گن پوری نہ

ہر لحظہ ایک اچھی بہو بننے کا خیال اس کے خون کو گرمانے لگا۔ وہ جو اس روز رتن نے پدمنی، چترنی، ہستنی اور سنکھنی کا قصہ چھیڑ دیا تھا اور عورت کی ان چار قسموں کا ذکر کرتے ہوئے نیل کمل کہہ اٹھا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ پدمنی خوبصورت ترین ہونے کے باوجود بدصورت ترین دماغ رکھتی ہو۔ بابا، مجھے پدمنی نہیں چاہیئے۔ وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے تم سے کوئی زیور نہیں چاہیئے، دعا ہی کافی ہے۔

بڑھیا کہے جا رہی تھی "لال ساڑھی نہ بھی لائی جا سکی تو ایک لا سیندور ہی بہت ہے ، سونیا!"

سونیا نے جواب میں صرف اتنا کہا "نیل کمل چاہے گا تو مجھے سیندور سے مانگ بھرانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔ روحوں کے ملاپ کیلئے بیاہ تو ضروری ہے "

ایک بار سونیا کا خیال اپنی سہیلیوں کی طرف چلا گیا ۔ ہر کسی نے اپنی پسند کا دولہا چنا تھا ۔ موہنی کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ اچھا خاوند وہی ہے جو ہر روز جارجیٹ کی نئی ساڑھی لا سکے ۔ جارجیٹ کی ساڑھی ! اس کے پندار کو ٹھیس سی لگی ۔ کیا روحوں کے ملاپ کیلئے جارجیٹ کی ساڑھیاں نہایت ضروری ہیں ؟ دلربا شہرت کی بھوکی ہے ۔ چنانچہ اس نے ایک فلم ایکٹر سے شادی کر لی ۔ سلاجی کو نہ جارجیٹ کی ساڑھیاں چاہئیں نہ شہرت ۔ اس نے سو فیصدی مرد قسم کا خاوند چن لیا ہے ۔ مجھے بھی چاہیئے کہ نیل کمل کو ہر قیمت پر خوش رکھوں ۔ فنکار قسم کا شخص غریب ضرور رہتا ہے لیکن اگر اس کا انتخاب کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہے تو بیاہتا زندگی مزے سے گزر سکتی ہے ۔ نیل کمل ہی میری مشکلات کا واحد حل ہے ۔ مکمل مرد تو بھلا کہاں ملے گا ؟ مکمل مرد ! جیسے نیل کمل کو مکمل مرد سے کچھ کم نمبر دے کر اسے امتحان میں اول رکھنے کے باوجود اسے ذہنی کوفت ہو رہی ہو ۔ اور مکمل عورت ! ـــ اس کا بھی صرف تصور کیا جا سکتا ہے لیکن جب روحوں کا ملاپ ہو جاتا ہے تو مرد عورت کا جوڑا دنیا بھر کی خوشیاں محسوس کرتا ہے ۔

وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ سڑک پہ بے حرکت سائے رینگ رہے تھے ۔ ان سایوں میں لحظہ بہ لحظہ اپنی طرف آتے ہوئے نیل کمل کا تصور اس کے ذہن کو گدگدانے لگا ۔ اسے خیال آیا کہ ادھر کچھ دنوں سے نیل کمل پر ایک فلمی کہانی لکھنے کا خبط سوار ہے ۔ میں لاکھ سمجھا چکی ہوں کہ یہ ایک چٹان سے ٹکر لینے والی بات ہے ۔ فلم والے کہانی نہیں چاہتے ، چوں چوں کا مربہ چاہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے ، ایک کہانی بک جائے تو تین چار ہزار روپیہ آ جائے ۔ میں کہتی ہوں فلم کمپنی والوں کا بھی ایک نہ ایک چور دروازہ ضرور ہوتا ہوگا ۔ فلمی کہانی لکھنے سے پیشتر اس دروازے کا پتہ چلا لو ۔ شاید وہ اس وقت اسی دروازے کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہو ...... کھڑکی کے باہر جیسے تاریکی کی سطح پر دھندلے دھندلے حرفوں سے ترتیب دیا ہوا "سواگتم" (خوش آمدید) ابھرنے لگا ۔ وہ بڑی شدت سے نیل کمل کی فلمی کہانی کا تجزیہ کرنے لگی ۔ سات سال تک ایک کشمیری لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کیلئے ایک خوبصورت شال پر "سواگتم" کاڑھتی رہتی ہے اور اس کے ڈیزائن میں قدیم اور جدید فن کا امتزاج دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے ۔ لیکن راستے ہی میں اس کے ہونے والے شوہر کی دلچسپیاں کسی اور نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ پھر آدھر سے مایوس ہو کر وہ اپنی منگیتر کے ہاں پہنچتا ہے ۔ وہ متواتر مخلصانہ طور پر اس کی راہ دیکھتی رہی تھی ۔ لیکن "سواگتم" بھینٹ کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اس کی دہشت زدہ روح ڈوبنے لگتی ہے ۔ لحظہ بہ لحظہ اس کی زندگی میں وہ زہر سرایت کرنے لگتا ہے جس سے وہ اب تک بچی ہوئی تھی ۔ شوہر کو اس ماحول میں ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کے ناقابل ہے ۔ اور جو چیز وہ "سواگتم" کے جواب میں پیش کر سکتا ہے ، اسے وہ راستے ہی میں کھو آیا ہے ...... وہ نیل کمل کے روبرو اس المیہ کی بیحد تعریف کر چکی تھی ۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ کوئی کمپنی اسے فلمانا منظور نہ کرے گی ۔

بڑھیا نہ جانے کیا سوچ کر کہہ اٹھی "برہما خوش ہو تو اچھا پتی ملتا ہے ، سونیا "

سونیا نے بے دلی سے بھی ہنکارا بھرنے کی ضرورت نہ سمجھی ۔ اسے ڈر تھا کہ بڑھیا کوئی فرسودہ روایتی قصہ نہ چھیڑ دے ۔ اس کی ذہنی کیفیت مائل پرواز ابابیل سی تھی جیسے بار بار خیال آ رہا ہو کہ اڑنے سے پہلے اپنی منزل کا فیصلہ کر لینا چاہیئے وہ کسی فلم کمپنی کی ایکٹریس ہی کیوں نہ ہو ۔ میں نیل کمل کے قابل ہوں اور نیل کمل میرے قابل ۔ فیصلے بار بار نہیں کئے جاتے ۔ اسے یاد آیا کہ ابھی اگلے ہی روز کمل کہہ رہا تھا ـــ عورت کو چاہیئے کہ حسد کو چین کی دیوار کی طرح راستہ روکنے کا موقع نہ دے ....

پھر اسے خیال آیا کہ بڑھیا کی پیٹھ کر زور سے ایک ٹھوکر جما کر کہے ۔ دور ہو جا یہاں سے بڑھیا چڑیل ۔ بڑی آئی ہے وہ ۔ میری ساس ۔ اونہہ ! میں کسی ساس کو نہیں پہچانتی ۔ اس نے زہر آلود نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھا اور دیر تک دانتوں سے ناخن نوچتی رہی ۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس پریشانی کا حل ڈھونڈ لینا چاہتی تھی ۔ بڑھیا خاموش تھی ، جیسے کوئی فرسودہ روایت ماضی کے کھنڈروں کے پیچھے ہمیشہ کی نیند سونے کا بہانہ نہ پا کر افسوس کر رہی ہو ۔ نیل کمل سے کہہ کر یہ گھر بدلنا ہوگا ۔ ہم اپنی جوانی پر اس چڑیل کا عکس کیوں پڑنے دیں ۔

اسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی ۔ غیر شعوری طور پر اس کا غصہ نیل کمل کی بجائے بڑھیا کی طرف منتقل ہوتا چلا گیا ۔ اسے خیال آیا کہ اگلے ہی روز نیل کمل کہہ رہا تھا ـــ غصے کو ہمیشہ کے لئے تھوک دو ، سونیا ...... اور نیل کمل نے یہ بھی تو کہا تھا کہ تم بلا کی انتہا پسند ہو سونیا زندگی ہمیشہ یک رخی اختیار کرنے والوں کو سزا دیتی ہے ۔ بیحد نفرت اچھی ہے نہ بیحد پیار اچھا ہے ۔ بیحد غصہ اچھا ہے نہ بیحد رحم ۔ انتقام نہ خدا

نگاؤ نہ بے اعتنائی، عزت افزائی نہ تذلیل، ان میں سے کسی کو بھی ہمارے احساس کے گرد تیزی سے گردش کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئیے جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری رگوں میں خون یکساں رفتار سے چلتا رہے۔ جبھی وہ سکون ممکن ہے جس کی تلاش فنکار کو پریشان کئے رہتی ہے۔ کاش نیل کمل باہر سے جھٹ آجائے اور ہم نمائش ختم ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پھر سے بال ٹھیک کر لوں۔ اب تو اسے آہی جانا چاہئیے۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ پھر وہ کہہ اٹھی "میں نیل کمل سے کہوں گی، سونیا کہ پچھلے جنم میں کوئی سو سو موتی دان کرتے تو سب گن پوری دلہن ملتی ہے۔"

سونیا نے فیصلہ کر لیا کہ بڑھیا کی کسی بات کا جواب نہ دے گی۔ غصے کی لہر کے نیچے یہ خیال بھی دب گیا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر پھر سے بال بنائے۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے نیل کمل کی زبان سے سنے ہوئے اس خیال کا تجزیہ کرنے لگی کہ "حسنِ تخیل حسین صورتوں کی نسبت زیادہ مسحور کن ہوتا ہے"...... اسے خیال آیا کہ بڑھیا تو جوانی کے ساتھ سب حسنِ تخیل بھی لٹا چکی ہے۔ لے دے کے اس کا دماغ فرسودہ روایتوں کے گرد ہی گھوم سکتا ہے۔ یہ کہاں کا حسنِ تخیل ہے؟ میرا حسنِ تخیل بہت بلند ہے۔ اور یوں بھی تو میں ایک حسینہ ہوں! جیسے کسی نے اُسے چونکا دیا ہو۔ جھٹ سنبھل کر وہ سوچنے لگی کہ نیل کمل کے ہاں حسن کا پندار نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے جوہرِ قابل کی نشو و نما میں ہاتھ بٹا سکتی ہوں، تخلیقی کام میں برابر کا ساتھی بن سکتی ہوں۔ میرے پاؤں بتا سکیں گے کہ منی ٹھیک گت بجا رہا ہے یا نہیں۔ مجھ میں صلاحیت ہے کہ رقص کو عروج تک لے جاؤں۔

بڑھیا پھر کہہ اٹھی "جب بیاہ ہونا ہے تو سورگ دیوتا آنند سے پھولے نہیں سماتے، سونیا۔"

سونیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ ابھی اگلے ہی دن نیل کمل کہہ رہا تھا کہ حسن مثبت ہے، منفی نہیں...... اس نے بڑے غور سے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اپنی بے تُکی باتوں کو بند بھی کرو گی یا نہیں۔

یک لخت نیچے زینے سے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز آنے لگی اور بڑھیا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سونیا بدستور صوفے پر جم کر بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کی نگاہیں نہ دیوار گیر کے مجسمے کی طرف اٹھ سکتی تھیں نہ صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی تصویر کی طرف۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں بہت جلد نیل کمل کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا چاہتا تھا۔

نیل کمل نے اندر آتے ہی نیلگوں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پرے رکھتے ہوئے سونیا کی طرف بازو پھیلا لئے۔ سونیا نے نہ اس کے ہاتھ جھٹکے، نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ کتنی شدت سے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، جیسے کہنا چاہتی ہو، تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا، تم فنکار ہو نا۔

بڑھیا کہہ اٹھی "آج بیاہ کا فیصلہ کر لو، بیٹیا —— کل بیاہ کر لو۔"

نیل کمل اور سونیا ہنسی قہقہوں میں کھو گئے۔ سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا اور آگے بڑھ جائے۔ وہ نیل کمل سے مخاطب ہونے ہی کو تھی لیکن جیسے چھینک آتے آتے رک جائے، وہ پھر چپ کی چپ رہ گئی۔

نیل کمل برابر ہنس رہا تھا۔ سونیا شرما کے بولی "ہاں ہاں —— آج فیصلہ کر لو، کل بیاہ ہو جائے۔ دادی اماں سچ ہی تو کہتی ہے۔"

نیل کمل کی ہنسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔

گیلی لکڑیوں کے مجھیب سے دھوئیں کی طرح آنے والے مہمان کا خیال سونیا کے ذہن پر چھا گیا۔ دیوار گیر کے مجسمے پر اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اسے خیال آیا کہ یہ مجسمہ کمرے کی زینت میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ اپنی تشویش نیل کمل پر واضح کر دینا چاہتی تھی لیکن موضوعِ سخن اُسکے ہونٹوں تک پہنچ کر خاموشی کی پہنائیوں میں کھو جاتا تھا۔

نیلگوں کاغذ کو الگ کرتے ہوئے ایک مجسمہ نکال کر نیل کمل نے اسے دیوار گیر پر پہلے مجسمے کے بالمقابل رکھ دیا۔ سونیا نے اُدھر توجہ نہ دی۔ وہ کہہ اٹھا "ادھر دیکھو سونیا! ادھر دیکھو!"

یہ ایک حبشن کا مجسمہ تھا، جسے پیتل میں ڈھال کر ایک خاص عمل کی مدد سے چاکلیٹ کا رنگ دے دیا گیا تھا۔

سونیا نے نئے مجسمے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ سوجے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ۔ اونہہ۔ یہ پکوڑا سی ناک۔ بال تو جیسے سوکھی ہوئی گھاس۔ بھدی بے ڈول گردن۔ دائیں بازو کے بالمقابل بری طرح اوپر کو اٹھا ہوا بایاں بازو۔ چھاتیاں ایسی جیسے پھوڑے ابھر رہے ہوں۔

پہلے مجسمے کی طرف انگلی اٹھا کر وہ کہہ اٹھی "معلوم ہے نیل کمل کہ اس حسینہ کی طرح میں بھی اپنا بدل پیش کرتے جا رہی ہوں۔ نہیں اب دنیا کے میاں بیوی کی حیثیت سے کھڑے ہو جانا چاہئیے۔"

نیل کمل نے نئے مجسمے کو نئے انداز سے دیوار گیر کے ایک سرے پر رکھتے ہوئے کہا "مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟ تم اور حبشن، زندگی اور فن، بدصورتی اور خوبصورتی، ان میں بہت تضاد ہے۔ فن میں بدصورتی بھی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے مگر زندگی تو زندگی ہے۔ نہیں سونیا، نہیں ——"

بڑھیا دہلیز پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ سونیا نے دونوں مجسموں کی طرف دیکھتے ہوئے صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی طرف آنکھیں گھمائیں اور بغیر کچھ کہے سنے بجلی کی طرح لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

البانیہ

کرشن چیتنیہ

البانیہ ناہموار پہاڑی چوٹیوں اور کالے پہاڑی کوؤں کا ملک ہے۔ اس کے متعلق انگریزی مورخ گبن نے کہا ہے کہ اس ملک کے متعلق، جو اٹلی سے بالکل قریب ہے، امریکہ کے اندرونی حصوں سے بھی کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ لیکن یہ کہے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا اور اب البانیہ اور امریکہ کے اندرونی حصوں کے بارے میں ہماری معلومات کافی وسیع ہو چکی ہیں۔

اگر البانیہ میں امن چین رہتا تو بلقانی ریاستوں کا سوئٹزرلینڈ ہو سکتا تھا۔ اب بھی ممکن ہے کہ کسی روز یورپ میں سوئٹزرلینڈ کے مقابلہ میں تفریح گاہ بن جائے۔ اگرچہ اس کے پہاڑ ساڑھے آٹھ ہزار فٹ تک اونچے ہیں سوئٹزرلینڈ کے آلپس نامی پہاڑ جتنے اونچے نہیں ہیں لیکن شمالی البانیہ کے مسلسل مناظر کو سوئٹزرلینڈ کے بہترین مناظر کے مقابلے کا کہا جاتا ہے۔ البانیہ ونارک آلپس کے کوہستانی سلسلہ کے آر پار پھیلا ہوا ہے لیکن شمال میں ڈالمیشیا اور جنوب میں یونان کے خلاف، یہ سلسلہ یہاں سمندر سے فاصلہ پر ہے کیونکہ اس کے اور سمندر کے درمیان نشیبی زمین ہے جس کو کئی دریا پار کرتے ہیں لیکن جب شمال اور جنوب دونوں میں پانی کے کنارے پر پہنچنے کے پتھروں کی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں تو ساحل کی نشیبی زمین غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سمندر کا پانی صاف ہلکے نیلے رنگ کا نظر آتا ہے جبکہ درمیانی علاقہ میں دریاؤں کی بہائی ہوئی مٹی سے ساحل کا پانی گدلا ہو جاتا ہے۔

ساحل کے عقب کے علاقہ میں پہاڑی چٹانوں نے اونچی اور الگ تھلگ وادیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان وادیوں میں بہت کافی پیداوار ہوتی ہے اور ان میں کافی گنجان آبادی کی گزر اوقات ہو سکتی ہے حالانکہ باہر سے یہاں آنے والوں کے لئے صرف خچروں کا راستہ ہے۔ جب لارڈ بائرن اس ناہموار جگہ سے گزر رہا تھا تو یہ اسے بہت پسند آئی تھی۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی نظم "چائلڈ ہیرلڈ" کا پہلا اور دوسرا باب کہا تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ یونان میں بھی، جس کا رومانات اور تاریخ میں اس قدر ذکر آتا ہے، البانیہ جیسی خوبصورت پہاڑیاں اور وادیاں نہیں ہیں۔

اس چھوٹے سے ملک کی آب و ہوا ایک سی نہیں ہے۔ ساحل کے قریب کی نشیبی زمین کی آب و ہوا بحیرۂ روم کے ملکوں جیسی ہے۔ گرمیوں میں بارش نہیں ہوتی اور کبھی کبھی درجۂ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ مگر جیسے جیسے بلندی بڑھتی جاتی ہے آب و ہوا میں فرق آتا جاتا ہے اور بارش کسی قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اندرونی البانیہ کے جنوبی حصہ میں کم سے کم دہانوں کے قریب گرمی زیادہ پڑتی ہے لیکن سردیوں میں کہر پڑتا ہے۔ آب و ہوا کے اختلاف کی وجہ سے نباتات کی پیداوار میں بھی اختلاف ہے۔ ساحل کے قریب بحیرۂ روم کے ملکوں کی مخصوص جھاڑیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ جنوب میں شاہ بلوط کے درخت بہت عام ہیں اور پھر وہ بھی ایسے کہ سدا بہار ہوں اور خشک سالی کو برداشت کر سکیں۔ یہ بطور ایندھن ہی کام میں نہیں آتے بلکہ سردیوں میں مزید چارہ کی طرح بھی استعمال ہوتے ہیں۔ البانیہ کے مویشی اور گھوڑے نہایت مضبوط، محنتی اور صابر ہوتے ہیں۔ وہ شاہ بلوط کے پتے کھانے سے نہیں اکتاتے۔ شمال میں بارش بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ شاہ بلوط کے جنگلات کی جگہ ملے جلے گھنے جنگلات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں صنوبر اور ایک قسم کے سرو کے درخت ہیں مگر زیادہ تعداد بیچ کے درختوں کی ہے۔

البانیہ کے شہر وادیوں جتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کا دارالخلافہ تیرانہ، جدید کشادہ سایہ دار سڑکوں اور تنگ گلیوں کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ جدید قسم کے ایک سرکاری دفتر کے باہر ایک عام لوگوں کے خط لکھنے والا بیٹھا رہتا ہے۔ اگر آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تو وہ بہت ہی کم اجرت لے کر آپ کے لئے جذبات سے پُر خطوط لکھ سکتا ہے۔ اس کا خاص صنعتی علاقہ کورتزا ہے جو البانیہ کا مانچسٹر کہلاتا ہے اور خاص بندرگاہ دورازو ایک ایسے میدان میں، جہاں ملیریا پھیلا رہتا ہے، نہایت کریہہ جگہ ہے اس کی بندرگاہ کی تہہ میں بہت جلد مٹی جم جاتی ہے۔ دوسرے شہر اتنے اہم نہیں ہیں جتنے کہ خوبصورت۔ اگر البسان میں، جو جغرافیائی اعتبار سے مرکز میں ہے، پہنچنا آسان ہو جائے تو یہ سیاحوں کیلئے جنت بن جائے۔

البانیہ کی تاریخ بھی طرح طرح کے واقعات سے پُر ہے۔ اٹلی سے محض چالیس میل بحیرۂ ایڈریاٹک کے پار، ہونے کی وجہ سے اس کا سلطنت روما میں شامل ہونا ضروری تھا۔ اس سلطنت کے خاتمہ پر اس پر کئی مرتبہ گوتھوں، سربیوں، بلغاریوں، یونانیوں، وینسیوں، سسلی والوں اور یہاں تک کہ نارمنوں نے حملے کئے۔ اکثر حملہ آور صرف ساحلی علاقوں پر قابض ہو سکے اور وہاں کی آبادی ہٹ کر اپنے پہاڑی قلعوں میں چلی گئی۔ ترکی حکومت پندرھویں صدی کے وسط سے ۱۹۱۲ء تک، ابھی اندرونی پہاڑی علاقوں میں محض برائے نام تھی۔ اس پر انیسویں صدی میں ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۶ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۳ء کے نصف درجن سے زیادہ حملوں سے

خندیہ شروع ہو گئیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں البانیہ نے آخرکار ترکی حکومت کا قصہ پاک کر دیا۔ یورپی طاقتوں نے اس کی آزادی کو تسلیم کیا اور ایک جرمن شہزادے ولیم فان وِیڈ کو عنان حکومت سونپ دی۔ یہ حکمران اوپرٹیا (ایک ایکٹ کی ناٹکیہ غنائی تمثیل) کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ دوران میں اس کا محل جلدی جلدی بنوایا گیا لیکن وہ پہنچنے سے پیشتر ہی بڑے جلیبوں اور میکوں کے تمغے ایجاد کر چکا تھا۔ شاہی دستے کی وردیوں کا خاکہ اس نے خود ہی بنایا تھا۔ وہ شاہی محل کے اٹھاسی چھوٹے بڑے منتظموں کو ساتھ لیتا گیا۔ یہ سب بڑے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ البانوی زبان کی لغت خریدنی بھول گیا۔ اطالویوں کی سازشوں نے چھ مہینے کے اندر اندر اس کی شاہانہ شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد البانیہ نے دوبارہ آزاد ہو کر جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

بلقانی ممالک کے لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن غالباً البانیہ والوں سے زیادہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انھیں انسانیات کا علم نہ ہو لیکن اگر آپ انھیں بتائیں کہ وہ یورپ کے چند قدیم ترین قبیلوں (پلاسجیوں، تھریسیوں اور الیریوں) کی نسل سے ہیں تو شاید وہ بتائیں کہ ہمیں اس کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ یہ "عقابوں کے بچے" جیسا کہ وہ خود کو کہتے ہیں اپنے قدیم نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ جنوبی البانیہ کے ناخواندہ گڈریے آج بھی "ذا" اور "اتھانا" کی قسمیں کھاتے ہیں جو محض یونان کے قدیم دیوتا اور دیوی "زیوس" اور "اتھینا" کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ مشہور تاریخی شخصیتوں میں جنھیں وہ البانوی بتاتے ہیں، سکندر اعظم، اپیرس کا بادشاہ پرہس جو قدیم روم کے خطرناک ترین دشمنوں میں تھا، جسٹینین کا شہنشاہ جسٹینین اور پاپائے روم کلیمنٹ یازدہم شامل ہیں۔ ان کا قومی ہیرو پندرھویں صدی کا سکندر بیگ ہے جس نے بیس برس تک مراد ثانی اور محمود فاتح کے عثمانی سپاہیوں کو روکے رکھا۔ جب وہ آزادی کی حالت میں مرا تو اس کی قبر پر قبضہ کر لیا گیا لیکن البانیہ کے دیہاتی گیتوں میں یہ یقین دلایا گیا ہے کہ کسی نہ کسی دن سکندر بیگ دندانے دار پہاڑ کی چوٹیوں سے روشنی کی شعاعوں پر چل کر واپس آئے گا۔

اہل البانیہ فرقوں اور قبیلوں میں منقسم ہیں۔ ان کے خاندانی جھگڑے اور لڑائیاں قدیم معاشی زمانہ سے چلی آ رہی ہیں۔ البانیہ والوں کی اس قومی خصوصیت کے متعلق جو آج بھی بدستور قائم ہے، بہت سی رومانی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ان کے کسی اہل خاندان کی موت واقع ہو جائے، خواہ وہ اتفاقیہ ہی کیوں نہ ہو، تو اس کے بدلے مجرم یا اس کے کسی رشتہ دار کو قتل کرنا ضروری ہے لیکن اس سنگدلانہ جذبہ کے ساتھ ہی عورتوں کو قتل کرنے کی مخالفت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لڑائیوں میں اہل البانیہ دشمن کی کسی عورت کو قتل کرنا ایسا ہی احمقانہ فعل خیال کرتے ہیں جیسا کہ اپنی کسی بکری کو ذبح کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ زوغو کا جسے کم سے کم آٹھ سو آدمیوں کے خون کا ذمہ دار خیال کیا جاتا تھا اپنے محل میں تقریباً محبوس رہنا پڑا جبکہ اس کی چھ بہنیں کہیں بھی آ جا سکتی تھیں لیکن ان لڑائیوں کا تعلق "بیسا" یعنی قول سے بھی ہے۔ جس شخص کو قول دے دیا جاتا ہے تو بالکل محفوظ رہتا ہے جیسا کہ عورتوں کو بچاتی ہے ساتھ ہی ہر وہ شخص بھی محفوظ رہتا ہے جو عورتوں کے ساتھ ہو۔ اسی طرح سولہ برس سے کم کے لڑکے، مذہبی لوگ اور غرباء وہ سب جو ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیسا کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ آخری عثمانی سلطان عبدالحمید نے قد آور جسیم اور بیباک البانویوں کو اپنا محافظ بنایا اور انھی کی وجہ سے وہ محفوظ رہا کیونکہ انھوں نے اس کی حفاظت کا وعدہ کر لیا تھا۔

اسٹوئن پریبی چیوچ جو بلقانیوں کی تاریخ کا ماہر ہے ایک کہانی بیان کرتا ہے جو ان ہنگامہ آرا لوگوں کی مہمان نوازی پر روشنی ڈالتی ہے۔ کافی سال گزرے ایک البانوی چھاپہ مار کو جو ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا، مقدونیہ کے وزیر نے پکڑ کر پھانسی کا حکم دیا۔ جلاد پھانسی دینے کو تیار ہی تھا کہ وزیر نے کہا "ٹھہرو" اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے بے حس البانوی کی طرف رخ کر کے چپکے سے کہا: "تم مرنے سے پہلے مجھے ایک بات بتاؤ کیا تم کبھی اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں رہ چکے ہو؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں"۔ "وہ کب؟" وزیر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ البانوی نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ کہا: "دو مرتبہ وزیٹ میرے گھر آئے اور میرے پاس انھیں کھلانے کے لئے روٹی تک نہ تھی، اس لئے وہ بغیر کھائے ہی سو گئے۔" وزیر نے ایک لمحہ کے لئے خاموشی سے آنکھیں نیچی کر لیں اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے رہا کر دو۔

یورپ میں مسلمانوں کے اس چھوٹے سے ملک میں، جس کی دس لاکھ سے زیادہ آبادی میں سے ستر فی صدی مسلمان ہیں، شان اور رنگینی صرف روایات تک محدود ہے اور حقیقتیں بے رنگ اور تلخ ہیں۔ کل زمین کا رقبہ ۱۱٬۰۰۰ مربع میل ہے۔ لیکن تقریباً دس فی صدی قابل کاشت ہے۔ اقتصادی حالت کو جس کا انحصار انگور، تمباکو، شہتوت اور چاول کی کاشت اور مویشی پالنے پر ہے، بہت ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اسی صورت میں ملک کا معیار حیات بلند ہو سکے گا۔ مستقبل میں اس چھوٹی سی جمہوریت کے سامنے یہی سب سے بڑا مسئلہ ہوگا۔ دوسرا مسئلہ قبائلی

رسوم سے آہستہ آہستہ نجات حاصل کرنا ہے کیونکہ یہ جدید حالات کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ ملک کی قانونی روایات کی بنیاد تک کے قوانین پر ہے۔ یہ سینکڑوں برس گزرے البانیہ میں رہتا تھا۔ ان قوانین نے خود حضرت موسیٰ کے قوانین سے "لات کی جگہ لات گھونسے کی جگہ گھونسہ" کا مقولہ اخذ کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ازراہ مردانگی عورتوں بچوں اور غیر ملکیوں کو ان لڑائیوں کے ضابطوں کی سخت گرفت سے مستثنیٰ کردیا ہے پھر بھی ان کے قائم رہنے سے جدید ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اقتصادیات میں مناسب درستی کرنے اور قانونی روایات میں اصلاحات کرلے سے ثقافتی مسائل بہت جلد حل ہو جائیں گے۔ صرف پچیس برس گزرے، جبکہ البانیہ کے بچے تیرانا کے امریکی اسکول میں انگریزی یا یادرآنیہ اور روالنا میں پاک دل بہنوں کے ساتھ فرانسیسی یا کسی اطالوی نوآبادی میں اطالوی سیکھ سکتے تھے، لیکن البانوی زبان لکھنا سکھانا منع تھا اور اس کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ عثمانی حکام البانوی زبان کی کتابوں کو پوشیدہ ڈائنامیٹ سے بھی زیادہ خطرناک خیال کرتے تھے۔ لیکن آج البانیہ کا مستقبل خود اس کے ہاتھوں میں ہے اور ہم امید کرسکتے ہیں کہ البانیہ کی چھوٹی سی لیکن مضبوط جمہوریت بہت جلد اپنے مسائل خود حل کرلے گی۔

ونمالا آپ سے کہتی ہے۔ کہ کس قدر لکس ٹائیلیٹ صابن ہی اسکے حسن کا نزالا راز ہے
میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر ملائمیت لگاتی ہوں۔
اسکے بعد میں صاف و ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخر ش باہستگی اپنا چہرہ نرم تولیئے سے خشک کرتی ہوں۔
LUX TOILET SOAP
تمام خوبصورت اور دانشمند فلمی اسٹارس یہ خوب جانتی ہیں کہ لکس ٹائیلیٹ صابن ہی اس کی جلد کو سیب اور پنکھڑی کے مانند خوشنما بناتا ہے۔ اسی لئے وہ اس پر ناز کرتی ہیں۔ اس کا ملائم اور موثر جھاگ جلد کے مسام میں سرائیت کر جاتا ہے اور گرد و غبار اور غلاظت و گندگی سے جلد کو پاک کر دیتا ہے۔ ونمالا کا ایک ماہ کا دیا ہوا خوبصورتی کا درس آپ خود مشق کریں۔ آپ اسکے ملائمیت صفائیت کرنے والی خاصیت سے خوش ہونگے۔
فلمی اسٹارس کا حسن بخش صابن
LTS. 135-23 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED
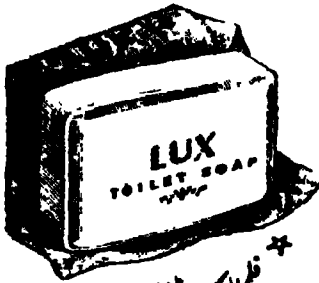
نئی شاعری

شوکت تھانوی

میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں بڑھاپے میں ظلم سخت سے سخت گیلی، بدصورت سے بدصورت فلم اشتہار، مگر نہیں معلوم کیوں تاریخی غلط بیانی پر خون کھولنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مورخ کی تاریخ دماغ نکال کر رکھدوں۔ مثلاً آجکل آزاد شاعری کو دور جدید کی صنعت یا بدعت کہا جا رہا ہے اور بڑے بڑے ذمہ دار لوگ تاریخ کے یہ غیر ذمہ دارانہ بیان دے رہے ہیں کہ شاعری کی یہ غیر شاعرانہ قسم اسی زمانہ کی پیداوار ہے، حالانکہ خود ہمارے خاندان میں اب سے تقریباً سو برس پہلے ایک ترقی پسند بزرگ گذرے ہیں اور ان کے ترقی پسندانہ کلام کا جو نمونہ سینہ بسینہ ہم تک پہنچا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی ایک مستحکم دلیل ہے کہ ترقی پسند شاعری کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بزرگ نوجوانی، جوانی اور پچاس سال کے ابتدائی دور تک اچھے خاصے شاعر تھے۔ اس کے بعد بچارے سٹھیا کر ترقی پسند شاعر بن گئے اور اب ان کا یہ حال ہوگیا کہ ایک مصرعہ بحر طویل میں ہے تو دوسرا بحر بسیط میں اور تیسرا بحر خفیف میں۔ بلکہ اکثر مصرعے بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں بھی ہونے لگے۔ اسوقت کے رجعت پسند لوگ ان کی طرف توجہ بھی نہ کرتے تھے۔ کلام کی داد دینا تو درکنار۔ جو سنتا تھا یہی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ جن بزرگ کو وہ مرفوع القلم اور مخبوط الحواس سمجھ رہے ہیں وہ کس پایہ کے ترقی پسند شاعر ہیں اور جس کلام کو مجذوب کی بڑ سمجھا جا رہا ہے وہ اب سے سو سال بعد لٹریچر میں کیسی ممتاز جگہ حاصل کرسکتا ہے۔

خیر یہ تو ایک مثال تھی مگر میری قطعی رائے یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں ترقی کی تمام علامتیں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔ شاعری کی بھی یقیناً ایک عمر تھی۔ اردو شاعری ولی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں تک آغوں آغوں کرتی رہی پھر تتلا کر بولی۔ پھر بھولی بھولی باتیں کرنے لگی۔ اس کے بعد ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ پکی تلی باتیں ہونے لگیں۔ شباب آیا تو باتوں باتوں میں شوخی بڑھی۔ شباب ڈھلا تو باتوں میں متانت پیدا ہوگئی۔ بات بات میں عاقبت اندیشی شروع ہوگئی پند و نصیحت کے سلسلے شروع ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ان بڑی بی نے بوکھلانا اور سٹھیانا شروع کردیا۔ یہانتک کہ وہ آزاد شاعری بن گئیں۔ اب چاہے کوئی انپر ہنسے یا انکو منہ چڑھائے مگر ان کی عمر میں ترقی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے اور دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔

اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ ہم شاعر ہیں شاعری کرتے ہیں۔ نہ ہم بحار ہیں اور نہ کسی مگرمچھ کو ہمارا تجربہ کرنا ہے کہ بیٹھے ناپ رہے ہیں اس کا ایک ایک پایہ کہ اگر غلطی سے کوئی چھوٹا یا بڑا ہوگیا تو گھڑا ڈھلک جائے گا اور نہ ہم خیاط ہیں کہ گز بیونت لیے سر کھپاتے رہیں تاکہ دامن کی جگہ گریبان نہ پہنچ جائے اور جیب کی جگہ چولی نہ آجائے۔ ہم ٹھہرے شاعر ہم کو اس ناپ تول اور کتر بیونت سے کیا واسطہ۔ ایک تخیل ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم اسکو ہر تکلف اور ہر تکلیف سے آزاد کرکے من وعن پیش کردینا چاہتے ہیں۔ اگر وہ خیریت کے ساتھ بحر رمل میں آجاتا ہے تو شوق سے آئے اسکا گھر ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ اس تخیل کے اب جسقدر اجزاء ذہن میں آئیں ان سب کو بحر رمل ہی میں آنا چاہیے ورنہ وہ تشریف لانے کی زحمت ہی گوارا نہ کریں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ایک سلسلہ خیال ہے اس کا ایک حصہ بحر رمل میں نظم ہوگیا، دوسرا بحر مضارع میں، تیسرا بحر خفیف میں، چوتھا بحر جدید میں اور کوئی ٹکڑا ایسا بھی ہے جو کسی بحر کے کسی ایک آدھ رکن میں ادا ہو رہا ہے۔ تو اب اس کے لئے پورا مصرعہ ضائع کرنا فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی مقصد تو یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا ہے وہ کسی نہ کسی طرح بغیر کسی خارجی آمیزش کے ادا ہو جائے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اس کے لئے آخر پابندیوں کی کیا ضرورت ہے کہ وہ خیال اور اس خیال کا ہر جزو اور ہر جزو کا ہر خفیف سے خفیف جزو گریباں، گلستاں، بیاباں وغیرہ قوافی کے ساتھ "سے" کی ردیف لیکر بحر مقتضب مثمن مطوی مقطوع ہی میں ادا ہو اور فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن کے دائرے سے ذرا بھی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ گویا مصرعہ نہ ہوا نقب زنی کا مجرم ہوا اور شاعری نہ ہوئی کوئی قابل دست اندازی پولیس جرم ہوا۔ باز آئے صاحب ہم اس شاعری سے ہم لنڈورے ہی بھلے۔

لنڈورے پر یاد آیا کہ آخر شاعری کی اس قسم کو لنڈوری کیوں نہ کہا جائے۔ ردیف کا یہاں ذکر نہیں قافیہ سے اسکو سروکار نہیں۔ بحر کا طوطا یہ نہیں پالتی۔ مطلع اس کے یہاں نہیں مقطع اس کے متروکات میں۔ ایطا نہ جلی ہوتا ہے نہ خفی اور ہو بھی کہاں سے ان ہی تمام امراض کی وجہ سے مطلع تک ہاتھ سے دھو بیٹھا کہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔ مطلع کہیں گے نہ شاعری کے تھانیدار صاحبان ایطائے جلی یا ایطائے خفی کا وارنٹ دکھا کر گرفتار کریں گے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی کوئی پابندی اس میں ہی نہیں۔ جو جی چاہے کہتے چلے جاؤ اور اگر کوئی ناسمجھ پوچھ بیٹھے کہ کیا کر رہے ہو تو کہہ دیا جائے کہ یہ علمی معاملات ہیں ان میں دخل نہ دو اور اگر پھر بھی دخل دے تو اسی قسم کی دو تین نظمیں سنا دو۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ سر پر پیر رکھکر بھاگے گا اور پھر تمہارے علمی مشاغل میں کبھی مخل نہ ہوگا بلکہ خود اسکو تمہارے دماغ میں خلل کا یقین ہو جائے گا جو تمہارے لئے یقیناً مفید ہے۔

اس شاعری کے نقصانات تو خیر وہ لوگ گنائیں گے جو ردیف و قوافی

کے گنبد میں پروان چڑھ کر مفعول فاعلات مفاعیل و فاعلن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور - ۴ - نام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جانا۔ مگر فوائد ہم سے پوچھیئے وہ بھی ایک دو نہیں ہزار دو ہزار بلکہ بے شمار۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کو شاعری کا یہ ڈھنگ اختیار کرنے کے بعد اس موذی سے ہمیشہ کیلئے نجات مل سکتی ہے جسکو مصرعہ طرح کہتے ہیں۔ امتحان کا پرچہ کہیں کا کمبخت جس نے ہزاروں کو بر سر مشاعرہ ذلیل کیا ہے۔ لاکھوں کے پول کھولے ہیں۔ سیکڑوں کو شاعر ہونے سے روکا ہے یعنی جو اس موذی کی مکھی پر مکھی بٹھا سکے وہ تو گویا شاعر ہے، باقی سب چڑی مار ہیں گویا مشاعرہ خونڑی ہوتا ہے اس بدبخت کے بدولت۔ دنگل ہوتا ہے: اچھا خاصہ دنگل جہاں ایک سے ایک پہلوان ایک سے ایک رستم سخن ایک ایک قافیہ۔ اپنے داؤں دکھاتا ہے اور سننے والے مصرعے اس طرح اٹھاتے ہیں گویا شاعر کو اٹھا کر پٹخ ہی دینگے۔ اس عذاب سے نجات حاصل کرنا کوئی معمولی بات ہے یہ سمجھ لیجئے کہ مصرعہ طرح سے آزاد ہو جانا ایک قسم کا ادبی سوراج ہے جس کے بعد شاعری آپ کی ہوگی۔ جو چاہیں کہیں اور جس زمین میں چاہے کہیں۔ اور یہ یاد رکھئے کہ مصرعہ طرح سے اگر آپ ایک مرتبہ آزاد ہو گئے تو وہ دن دور نہیں جبکہ جب مشاعروں سے بھی آپ کو نجات حاصل ہو جائے اور اس رات رات بھر کی جگائی اور چیخ پکار سے جو یقیناً کسی مہذب قوم کا مشغلہ نہیں ہو سکتا آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ پھر تو چھوٹا سا ایک جلسہ سر شام ہو جایا کرے گا جس میں غزل کے صرف ایک شعر کو بہتر ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سنا دیا گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ یہ نہیں کہ نو بجے رات سے کڑنڈا لیکر مصرعہ طرح کے پیچھے جو پڑے تو سویرا کر دیا۔ دو موٹے موٹے فائدے تو اس شاعری کے یہ ہوئے۔ باقی فائدے کہاں تک سنئے گا۔ مثلاً ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس قسم کی شاعری کرنے کے لئے کچھ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ شاعر ہی ہوں۔ جی نہیں۔ اگر آپ بساطی ہیں تو بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے یہاں بتدریج کپڑے کا کاروبار ہوتا ہے تو بھی آپ اس قسم کے مختلف البطن مصرعے پکڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو محض ریس کا شوق ہے تو بھی آپ ان چھوٹے بڑے ہلکے اور بھاری مصرعوں کا بینڈی کیپ خود مقرر کر لیجئے اور اگر آپ کچھ بھی نہیں ہیں تو اس شاعری کے بدولت کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائینگے۔ سب سے بڑی خوبی جو خداوند کریم نے اس شاعری کو عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا جا و بے جا استعمال درگاہوں کے قوال، اعراس کے مغنی، مجروں کے مطرب اور مطربات نہ کر سکینگے۔ یعنی یہ شاعری گائی بجائی نہ جا سکے گی۔ اور اگر گانے والے اس کے باوجود مصر رہے تو ان کو اس ترقی پسند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند ہارمونیم فوراً بنانا پڑیگا۔ البتہ اس شاعری کا ایک مصرف تھوڑی سی توجہ کے ساتھ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فلم کمپنیاں اس شاعری کی سرپرستی شروع کر دیں۔

اسلئے کہ اس راز کو ابھی تک پولیس والے بھی نہیں سمجھ سکے ہیں کہ ترقی پسند شاعری فلمی گانوں کی ماں ہے یا فلمی گانوں نے اس شاعری کو جنم دیا ہے۔ بہرحال سی۔ آئی۔ ڈی کی تازہ رپورٹ سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ دونوں کا خون کیمیاوی امتحان کے لئے بھیجا گیا تھا اور اس میں ایک دوسرے سے مشابہ قسم کے جراثیم پائے گئے ہیں۔ اگر یہ بات واقعی تصدیق کی حد تک پہنچ گئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند سازوں کی بھی ضرورت نہیں یہی ساز جو عام طور پر رواج میں ہیں۔ اس شاعری کو بھی جھولینگے اور یہ بے بحری شاعری کم سے کم "بے سری" تو نہ ہونے پائے گی۔ خواہ وہ سُر ہندوستانی موسیقی سے تعلق رکھتے ہوں یا انکو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو۔ اگر یہ شاعری فلموں کے لئے سازگار ثابت ہوئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شاعری پر نحوست اور ادبار کا جو الزام نسلوں سے چلا آرہا ہے وہ یقیناً دور ہو جائے گا اور پھر تو یہ شاعری ہن برسانے لگے گی۔

میں چونکہ ترقی پسند شاعری کی حمایت کرنا چاہتا ہوں لہذا میں ترقی پسند شاعروں کو ایک دوستانہ مشورہ یہ بھی دینا چاہتا ہوں کہ وہ یہی تائید میں یہ دلیل کبھی پیش نہ کریں کہ اس بے ردیفی شاعری کے ماتحت شاعر اپنے نفسی تجزیہ اور جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کر کے ذہن لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ دلیل ذرا بودی ہے اسلئے کہ اگر خدانخواستہ میں خود اپنی مالی حالت سے مجبور ہو کر پرانے شاعروں سے رشوت لینے کیلئے مجبور ہو گیا تو پھر مجھ ہی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ان حالات میں شعر کہنا ہی حماقت ہے۔ ان سبھی پابندیوں کو بھی توڑ کر آدمیوں کی طرح نثر کیوں نہ بولو۔ رہ گیا تسلسل وہ اس لنگڑی لولی شاعری کے علاوہ اپنے پورے خد و خال کے ساتھ نثر میں بھی ممکن ہے اگر میرے اس جواب پر بھی آپ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو میں بڑا صاف آدمی مجھکو مجبوراً یہ بھی کہہ دینا پڑیگا کہ حضرات آپ شاعری سرے سے کرتے ہی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو نثر کی توڑ مروڑ کو شاعری سمجھ بیٹھے ہیں۔ لہذا میں پھر آپ کو یہ مشورہ دونگا کہ یہ کمزور دلیل آپ بحث ہی میں نہ لائیں تو اچھا ہے کیا فائدہ کہ اچھے دل برے ہوں اور پھر کوئی فائدہ بھی نہ ہو۔ ہاں آپ اپنی اس شاعری کے جواز میں اور بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ یہ زمانہ راشننگ کا ہے۔ ہر چیز پر کنٹرول ہے مصرعے بڑھ گئے۔ مصرعے کے ارکان بھی پرمٹ پر ملتے ہیں اور پوائنٹ کے حساب سے یہ تو شاعری ہے مٹی کا تیل تک آپ حسب حوصلہ صرف نہیں کر سکتے۔ پاجامے کیلئے چھالٹین تک تو ملتی نہیں، آپ لئے پھرتے ہیں مصرعوں کیلئے ردیف اور قافیہ۔ آپ معترض سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھائی سنو وقت وہ آ لگا ہے کہ کم کھاؤ زیادہ بچاؤ۔ لہذا ہم اگر ایک آدھ مصرعہ میں بچت دکھاتے ہیں تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آئندہ سال کا بجٹ شاندار ثابت ہو بلکہ آپ صاف صاف یہ کہہ دیجئے

کہ جناب یہ کنجوسی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہے۔ مطلب اگر آدھے مصرعے میں پورا ہو جاتا ہے تو باقی آدھا مصرعہ محض تقطیع پوری کرنے کیلئے ضائع کرنا غلط ہے۔ باقی آدھا مصرعہ ان غریبوں کے کام آسکتا ہے جنکو پوری راشن نہ ملنے کی وجہ سے طرح طرح کی معدے کی شکایتیں پیدا ہو گئیں ہیں اور جو محض ہماری فضول خرچیوں کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ جب فارغ البالی تھی، جب قحط نہیں پڑا تھا ہم نے جسطرح چاہا اپنے مفہوم کو ادا کیا مگر اب ہم غذا غریبوں کیلئے چھوڑ رہے ہیں جو دال روٹی کو ملا کر مطلع عرض کرتے رہیں۔ ہم کو وقت کی ضرورت کا احساس ہے۔ ہم انڈا مچھلی، پھل اور دودھ پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اس کو آپ چاہے بدعت کہیں یا آزاد شاعری لیکن ہم اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو مخاطب آپ کو نا قابل علاج سمجھکر صبر کر لے یا آپ کا قائل ہو کر قدموں پر گر پڑے۔ ایک بات آپ اور بھی سمجھا سکتے ہیں کہ موزونیت تو خیر تھوڑی بہت ہر گانے اور رونے والے کو قدرت کی طرف سے ملتی ہے لیکن باضابطہ سخن طرازی ہمارے امکان میں نہیں اور اس سلسلہ میں بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی بھی ہم کو منظور نہیں۔ لہذا حاضر میں حجت نہیں۔ جو ہمارے امکان میں ہے ہم پیش کر رہے ہیں اگر آپ اس سے مطمئن نہیں ہیں تو ملک الشعراء کا خطاب آپ لے جائیے۔ ہم کو صرف زندہ رہنے کا حق بخش دیجئے۔ اگر آپ ہماری شاعری کو شاعری تسلیم کرنا نہیں چاہتے تو آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔ زیادہ سے زیادہ داد کی "واہ" سے محروم کر دیجئے گا۔ ہم سمجھ لینگے کہ ہماری شاعری خود ہمارے لئے ہے آپ کے لئے نہیں ہے اور اگر ان تمام باتوں کے باوجود معترض فوجداری پر تل جائے تو یہ گر بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ آپ نہایت اعتقاد کے ساتھ اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیجئے گا واضح رہے کہ پرانے شاعروں کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اگر آپ نے ان کو استاد تسلیم کر لیا تو آپ کے سات خون مع ذاتی خودکشی کے معاف ہو جائیں گے۔ پھر چاہے آپ استادی سے زندگی بھر ترقی پسند شاعری کراتے رہئے۔ نہ صرف وہ خاموش رہینگے بلکہ آپ کو جملہ آفات ارضی سماوی سے بچانے کے لئے ایک آدھ تعویذ بھی دے گذریں تو کوئی تعجب نہیں۔ استادی کا یہ آخری گر بتانے کے بعد اب ہم آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے دعائے مغفرت میں ترقی پسندی سے کام لیں کم سے کم اس دعا کے تمام ارکان برابر کے ہوں تو اچھا ہے۔

چلتے چلاتے ایک بات اور سنتے جائیے آپ عوام کے سامنے تو آزاد شاعری کے متعلق ہر ڈینگ ہانکنے کے لئے آزاد ہیں مگر کسی پڑھے لکھے آدمی سے الجھنے کی کبھی کوشش نہ کیجئے گا۔ مثلاً آپ لوگ ایک بات عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ ہماری تخیئل اچھوتی ہے، ہماری فکر بلند ہے اور ہم عنقا کے آشیانے سے اپنا آرٹ لاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو ممکن ہے کہ وہ لوگ کوئی اہمیت دے سکیں جنکو شاعری سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا ہو۔ ورنہ ہر وہ معمولی سمجھ کا آدمی جس نے کبھی کوئی شعر دیکھا یا سنا ہے آپ کو ان باتوں کا کوئی ایسا جواب دیدے گا کہ آپ تو خیر کیا مگر ہمکو آپ کی ہمدردی میں شرمندہ ہونا پڑے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمام کہی ہوئی باتیں آپ بھی فرماتے ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ پہلے ان باتوں کو ذرا سلیقہ سے کہا گیا تھا اور اب آپ سلیقہ کے قائل نہیں رہے ہیں۔ مثلاً ایران میں ہم سب کے ایک چچا گذرے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ اسکو اتنا زمانہ گذر چکا ہے کہ تخیل کنی بھول جائے۔ بہرحال ان ہی ایرانی چچا کے چار مصرعے سنئے ؎

من آن مورم کہ از پایم بمالند — نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند
چہ گونہ شکر این نعمت گذارم — کہ زور مردم آزاری ندارم

اسی مفہوم کو آپ کی آزاد شاعری کے چودہ مصرعے والے ایک شاہکار میں جس کا عنوان "شرابی" ہے یوں پیش کیا گیا ہے ؎

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں دراِ فرنگ کا ادنیٰ غلام
صدر اعظم یعنی دریوزہ گر اعظم نہیں
ورنہ اک جام شراب ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں ہدیہ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

اور اگر یہی شاعری ہے تو لیجئے شرابی کے ساتھ ایک نظم اس خاکسار کی بھی سن لیجئے۔ عنوان ہے "جواری" ؎

ہار آیا ہوں جوئے میں آج میں
دیکھکر جبیں مری غصہ ہوا تجھ پر سوار
شکر کر بیبا کی ماں —

چوہے کا ارتقا

ویسٹرانسٹی ٹیوٹ (امریکہ) نے نسل کشی اور تربیت کے ذریعہ چوہوں میں ایک نسل پیدا کی ہے جس کی اولاد تاریکی سے زیادہ روشنی کو پسند کرتی ہے۔ کھیلنے کے واسطے کھانا چھوڑ دیتی ہے آدمیوں سے اسقدر مانوس ہے کہ انکی آہٹ سے نہیں بھاگتی بلکہ فوراً ان کی طرف دوڑتی ہے اور پیارے بلی کتوں کی طرح ان کے پیروں اور گود اور بغل تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ساز اور موسیقی سے اثر قبول کرتی ہے اور کسی مستقل عبادت خانہ میں توجہ کے ساتھ مصروف عبادت بھی ہوسکتی ہے۔

ان چوہوں کے چہروں جیسے قد و قامت پر صاف ستھرے سفید بال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور جب یہ بے خوف ہوکر اپنی ننھی ننھی گلابی آنکھوں کو اپنے پالنے والوں کو دیکھتے اور ننھے ننھے لال پنجوں سے ان کے پنجوں کو گدگداتے اور نیچے ٹکتے ہیں تو بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلاس نے جنہوں نے اس تجربہ گاہ کا معائنہ کرکے ان چوہوں کی ترقی یافتہ کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جب میں نے ان چوہوں کو دیکھا اور یہ دوڑ کر میری طرف آئے تو میں جھجکا۔ لیکن فوراً یہ دیکھا کہ وہ اپنی گرد اور خاتون کے جس نے پورے گھر کا دروازہ کھول کر ان کو باہر نکلنے کا موقعہ دیا تھا جیسے دوڑے اور یکبارگی بہت سے چوہے اسپر چڑھ گئے کوئی اس کے مونڈھوں پر جا بیٹھا کوئی بغل میں چھپ گیا، کوئی آستین میں چڑھ گیا اور کوئی چھاتی پر کھڑا ہو کر اس کی ٹھوڑی چاٹتا تھا۔

میں حیرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا۔ انسان کی دماغ سوزیوں نے ان چوہوں کی طبیعت کو بھی بدل دیا ہے۔ اپنی جبلّی عادت پر کاٹنا اور کترنا تو درکنار کسی چوہے میں اسکا خیال بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے طبعی انقلاب میں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ نسل کشی یا تربیت میں سے کس کو زیادہ دخل ہے۔ یہ ایسی بحث کا موقعہ بھی نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی ایک میں کوتاہی ہوگی تو دوسری حالت کا اسکا اثر ضرور پڑے گا۔ نسل کشی کا جہاں تک تعلق ہے ان میں یہ خوبی متواتر کئی نسلوں کے متواتر تنقیہ اور اصلاح کے بعد آئی ہے۔ آبائی خون اور انکی خرابیوں کی کشش نے ان کو مدت تک اپنا دامنگیر رکھا ہوگا یعنی جرائم پیشہ چوہوں کو عادات چوری۔ فرار، روپوشی، بچہ کشی بلکہ موش کشی کے فراموش کرانے کی بہت سی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں تب کہیں یہ فرشتہ سیرت اور پری صورت موش زادے برآمد ہوسکے ہیں۔

چوہا انسان کا بہت قدیمی رفیق ہے یعنی اس وقت کا ساتھی ہے جب اس کو گھر بنانا انسان کی طرح نہ آتا تھا اور دوسرے جانوروں کی طرح وہ بھی غاروں اور کھوہوں میں رہا تا تھا اس وقت بھی چوہے اس کے بچوں میں کھیلا کرتے تھے اور اس کے دسترخوان میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ غرضیکہ چوہے کو اس کی پرانی شناسائی ہے اور شاید اسی لئے ویسٹرانسٹی ٹیوٹ کے منتظمین نے چوہوں کی اصلاح کی طرف یہ سمجھ کر توجہ دی ہے کہ چوہا بھی چھوٹی قسم کا انسان ہے جسے قصہ نویسوں نے کہیں کہیں بالشتیے کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے لہذا دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اندر ارتقا کی کوششیں کس حد تک کارفرمائی کرتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر موصوف یہاں کی پرورش سے معلوم ہوا ہے کہ ان مہذب چوہوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو معیار تہذیب سے تین فیصدی زیادہ ترقی کر چکے ہیں مقصود یہ کہ انکی جسامت پر چربی اتنی غالب آگئی ہے کہ اب انکی زندگی آرام سے بیٹھے بیٹھے ہی گذرتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ اگر سوجھ بوجھ ہوتی تو بیچارے کھانا تحلیل کرنے کی غرض سے گالف کھیلنے جایا کرتے۔ اب ان میں چہل قدمی کرنے کی بھی ہمت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جسمانی کیفیت سے زیادہ ان کی دماغی استعداد نے ترقی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان چوہوں کا دماغ ان کے بزرگوں کے دماغوں سے پانچ فیصدی زیادہ وزنی ہوگیا ہے اور یہ ان سے بہت زیادہ ذہین اور ذکی ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ اور روشنی اس سلسلہ میں نہیں ڈالی گئی جس سے ان کی ذہنی قابلیت کا اندازہ معلوم ہوسکتا اور ہم دیکھ سکتے کہ ہمارے قاعدے کے چوہوں سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ کالجوں میں نئے طالب علموں کی بھرتی کے بعد پرانے طالب علم انکی ذہنی قابلیتوں کا جس طرح جائزہ لیتے ہیں شاید ویسا ہی کوئی طریقہ یہاں بھی رائج کیا گیا ہے بہرحال یہ نازک بحث ہے جس نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی خاموش رکھا ہے۔

دسترخوان پر دعوت دینا تو ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے لیکن شکم پری کو اعتدال پر رکھنا اور کھانے سے دستکش کرانا اور وہ بھی چوہوں کو، مشکل ہے۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ نے اس عقدہ کو گراموفون ریکارڈ بجا کر حل کر لیا ہے بتایا گیا کہ کھانے کے دوران میں جب گانے کے ریکارڈ بجتے ہیں تو یہ لے [illegible] ہوجاتے ہیں کہ کھانا بھول جاتے ہیں۔ خیال آتا ہے کہ اگر مرثیہ یا سوز کے ریکارڈ بجائے جائیں تو یہ چوہے درد کی شدت سے ضرور آبدیدہ ہوجائیں گے۔ ان کا ایک عبادت خانہ بھی تھا۔ ایک کمرہ میں ایک طشت میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں بتیوں کے بیچ میں ایک سکہ رکھا تھا۔ اسپر کسی مورت کا ٹھپہ تھا شاید کسی موش دیوی کی مورت تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان کے جذبات مذہبی کو ان کے اخلاق کے بلند کرنے میں کسقدر دخل ہے لیکن

عبدالرشید خاں

بظاہر ہم تو ان خوبیوں کو غذا اور تربیت کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ایک مشہور ناول نویس نے اپنے افسانے کے چوہوں کے ذکر پر لکھا تھا کہ وہ کھلانے کھلاتے شیر کے قد و قامت کی برابر ہو گئے تھے اور اس جسمانی ترقی کے ساتھ وہ عذاب الٰہی بھی بن گئے تھے اسلئے کہ شیر جیسے ہو کر وہ اس جیسے خونخوار بھی بن گئے تھے پس جسمانی ترقی کے مفید مطلب اچھی غذا اور خاطر خواہ آسائش اسی وقت جائز ہو سکتی ہیں کہ یہ جسامتیں خطرناک صورتیں اختیار کرنے کے بجائے اخلاق و محبت میں بھی ترقی کر سکیں۔ ایسی خوبیاں متوازن خوراک اور پابندی اوقات سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

ان چوہوں میں ایک گروہ ایسا بھی دیکھا گیا جو بظاہر بہت مصیبت زدہ اور غمگین تھا۔ یہ چوہے دبلے اور سست تھے اور مرجھائے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے گویا ان کو ٹھیک کھانا نہیں ملتا تھا یا نگرانی میں لاپرواہی سے کام لیا جاتا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صورت حال برعکس تھی۔ اس گروہ کے چوہوں کو دوسرے چوہوں کی طرح نہ صرف یکساں خوراک ملتی اور نگرانی میں رکھا جاتا تھا بلکہ دوسروں سے زیادہ ایک مقوی بلان بھی اور ایسی دی جاتی ہے جس کے اشتہار اخبار اور رسالوں میں بڑے دعووں اور شان کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اور صحت اور طاقت کے طلبگار رؤسا حصول طاقت میں اسکی مسیحائی پر ایمان لا کر دائمی وظیفہ بنائے ہوئے ہیں مصلحت اجازت نہیں دیتی کہ اس مفید چیز کا نام بتا دیا جائے۔ تاہم یہ تو واقعہ تھا کہ اس غذا کے نہ کھانے والے چوہوں کی صحت کھانے والے رئیس چوہوں سے بہتر تھی۔ ایسی امتیازی کیفیتیں انسانی طبقوں میں بھی چونکہ ملتی ہیں لہٰذا اگر قیمتی اور اشتہاری غذاؤں پر روپیہ صرف کرنے والے ان کا تجربہ پہلے چوہوں پر کر لیا کریں تو کثیر رقمیں اور ان سے زیادہ بہت سی قیمتی جانیں بچ سکتی ہیں۔ مثلاً انسانی خوراک اور غذاؤں کی نسبت اب تک جتنی معلومات بہم ہوتی ہیں اور ان پر جسقدر عملدرآمد کیا گیا ہے ان کے تلخ نتائج اگر استعمال سے پہلے معلوم ہو جاتے تو ضعف معدہ اور سوکھے کے عارضوں سے لاکھوں جانیں بچ سکتی تھیں۔

ان چوہوں میں سے اب بلوں میں گھسنے اور زمین دوز سوراخوں کی تاریکیوں میں دوڑنے کا شوق زائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ آدمی سے نہیں ڈرتے اس لئے اب ان کے لئے چھپنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اب تو وہ دوڑ کر اس کے پاس آ سکتے ہیں گودیوں میں کھیلتے ہیں ان کو کاٹنے کے مواقع ملتے ہیں مگر نہیں کاٹتے۔ اسکی وجہ وہی ہے کہ دشمنی لڑائی اور خونریزی خوف سے پیدا ہوتی ہیں جب خوف نہیں رہتا تو دشمنی کی بنیاد بھی مٹ جایا کرتی ہیں۔ رہا کتے اور بلی کا خوف، معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تذکرہ مہذب حیوانات کا ہے جہاں سماج کے تمام اہل معاملہ مہذب اور متمدن ہیں اور اپنے مرشد انسان کے حلقہ ارادت کے مرید ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ نے یہ بھی بیان کیا کہ ان چوہوں میں چالیس پشتوں سے دشمنی، خونریزی، نوچ کھسوٹ اور دغا کے آثار دیکھنے میں نہیں آئے لیکن یہ انسان کا کمال ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے جنگل کے وحشیوں کو زیر کر کے آگ پانی ہوا اور زمین کے طاقتور عناصر کو سمجھ کر گو ان سے مانوس ہو گیا ہے اور انہیں مفید مطلب آلہ کار بنائے ہوئے ہے پھر بھی وہ اطمینان سے سانس نہیں لے سکتا۔ اس کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ وہ خونریزی، قتل، غارتگری وغیرہ سے اگر محفوظ اور مامون نہیں ہے تو غور کیجئے کہ اب اسکو کس کا خوف ہے؟ اب اسکی لڑائی جنگل کے وحشیوں سے تو رہی نہیں۔ سانپ بچھو کا بھی خوف نہیں۔ سمندر کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں سے بھی اندیشہ نہیں۔ بجلی اور زلزلوں کا کھٹکا بھی بے معنی ہو گیا۔ ان میں کوئی اسکا مخالف نہیں سب خادم اور چاکر ہیں اب اسکی دشمنی جنگ، بے چینی اور خوف اپنے ہم جنس انسان سے ہے یعنی انسان کی چیں اسے حرص اور نفس سے ہے۔ ان چیزوں نے ترقی کر کے منظم طاقتوں کی سلطنتوں کی شکلیں اختیار کر لی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ علم الاخلاق، ادبیات اور اعتقادات میں اصلاح نفس کے نسخوں کے بے شمار ذخیرے موجود ہیں مگر یہ فرائض موقعے کے ہیں جب امراض اتفاقی کردہ اور عارضی ہوا کرتے تھے اور علاج میں چٹکیوں سے کامیابی ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت کے خوفناک طاقتوں کے پیش نظر مقتضائے ضرورت ہے کہ

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

رومان، شادی، اور فرض!! ـــــ زیب عثمانیہ

عقد و رومان میں فطرت ہی کے آئین دونوں
یوں تو دونوں ہی تصور میں خوش آئند مگر
یہ جو بالواسطہ ہے تو وہ بلا واسطہ ہے
دیکھنا یہ ہے انہیں فرض سے کیا واسطہ ہے

کوئی رومان کہ انجام ہو جسکا شادی
نوع انساں کے لئے گرچہ ہے پیغام سرور
نہیں لیکن سبب پختگی رشتۂ زوج
کہ ہے کسل بدن و خستگی انجام سرور

ہاں زن و شو کے لئے ہے جو کوئی راہ وثوق
تو وہ تکمیل فرائض کے سوا اور نہیں
گھر کی ہے فرض، محبت کی بناتھی جذبات
زوج ہے زوج ہی، محبوب کسی طور نہیں

یوں محبت کو سزا ہے کوئی کتنا ہی مگر
بھول سکتا نہیں یہ بات زمانہ ہرگز
فرض ہے زیست کا وہ تلخ نوالۂ زیب
قند الفت سے مزا جس کا نہ بدلا ہرگز

ہندوستان میں شکرسازی کی تاریخ

بی، این، استہانا

شکر ہندوستان میں بہت ہی پرانے زمانے سے بنتی چلی آرہی ہے بلکہ اصل خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہے اور تمام دنیا میں جس قدر اراضی میں گنا بویا جاتا ہے اُس کا نصف حصہ ہندوستان کی اراضی کا ہے یہی وجہ ہے کہ شکر سازی کی صنعت ہندوستان کی صنعت و حرفت کی تاریخ کا ایک دلچسپ اور رنگین باب ہے۔ چونکہ مناسب محصولات اس کی پشت پر ہیں اس لئے اس صنعت نے عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کے زمانہ میں بھی نمایاں ترقی کی۔ محافظتی قانون نافذ ہونے کے بعد دس سال سے بھی کم عرصہ میں ہندوستان میں اتنی شکر بننے لگی جو اس کی اپنی ضروریات کے واسطے کافی تھی۔

ہندوستان میں شکر سازی کی ابتدا بنگال میں ہوئی۔ ۳۵۰ ق م کے لگ بھگ زمانہ میں ڈیوسکریڈیز (Dioscrides). نے لکھا تھا "ہندوستان کے سرکنڈے میں ایک طرح کا میٹھا رس پایا جاتا ہے"۔ سنہ ۷۷ء میں پلینی (Pliny). نے لکھا تھا کہ شکر مغربی ممالک میں عربستان اور ہندوستان سے آتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی شکر زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ سنہ ۱۶۰ء میں ایرین (Arian). نے لکھا کہ سرکنڈے سے نکلے ہوئے رس سے شکر بنائی جاتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی تجارت ہندوستان اور بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ شکر ہندوستان میں بہت ہی قدیم زمانہ سے بنتی چلی آرہی ہے بلکہ اس کی تجارت بھی غیر ممالک کے ساتھ ہوتی رہی ہے۔ سنہ ۲۱۴ء میں سکندر ایفروڈیوکس نے لکھا ہے "جس چیز کو ہندوستانی شکر کہتے تھے وہ ایک طرح کا جما ہوا شہد ہوتا تھا جو سرکنڈے سے نکلتا تھا"۔ اسی طرح مارکوپولو نے بھی سنہ ۱۲۹۸ء میں شکر کا ذکر کیا ہے کہ وہ بنگال میں تیار ہوتی ہے۔ گنے کی باقاعدہ کاشت اور شکر بنانے کی صنعت کا زمانہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ آئین اکبری کی رو سے سولہویں صدی سے بہت پہلے سے ہندوستان میں یہ صنعت پھیل چکی تھی۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شکر بہت بڑی مقدار میں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھی۔ شکر کی برآمدی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی تھی۔ جو شکر کمپنی ہندوستان سے انگلستان بھیجتی تھی اس پر کمپنی کو پچاس فیصدی کا منافع ہوتا تھا۔ ایک قدیم مورخ نے جو اعداد و شمار دئے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ کمپنی کو اس سلسلہ میں کس قدر منافع ہوتا تھا۔ وہ اعداد و شمار یہ ہیں:- سنہ ۱۷۹۸ء میں کمپنی نے ۵۲۴۴۲ ٹن شکر انگلستان میں درآمد کی۔ شکر کی قیمت ۹۹۶۰۲ پونڈ تھی۔

جہاز وغیرہ کا کرایہ	۱۰۴۸۳۸	پونڈ
محصول	۶۹۴۶	پونڈ
بکری پر لاگت	۴۹۳۰	پونڈ
کل لاگت	۲۱۶۳۹۶	پونڈ
قیمت فروخت	۳۳۱۳۸۱	پونڈ
منافع تقریباً	۵۰	فیصدی
کل منافع	۱۱۴۹۸۵	پونڈ

شکر کی برآمد پر جب اس قدر منافع ہوتا تھا تو برآمد کی مقدار بڑھنا ایک لازمی امر تھا۔ مندرجہ ذیل گوشوارہ سے پتہ لگے گا کہ مختلف سالوں میں نجی سوداگروں نے کتنی شکر باہر بھیجی:-

سال	قیمت سٹرلنگ	انگلستان کو	امریکہ کو
سنہ ۱۷۹۶ء	۸۲۰۱۸۹	۳۰۵۵۱	۱۲۶۱۷۱
سنہ ۱۷۹۸ء	۸۸۶۵۲	۱۸۲۶۵۰	۵۱۹۸۳۳
سنہ ۱۸۰۰ء	۲۳۸۹۶۹۱	۶۹۸۶۶۲	۴۵۹۳۴۰
سنہ ۱۸۰۲ء	۱۲۰۱۷۹۸	۲۱۷۸۹۹	۲۱۰۳۷۹
سنہ ۱۸۰۴ء	۱۰۷۱۳۶۶	۶۴	۸۵۳۳۱۴
سنہ ۱۸۰۶ء	۳۳۲۴۱۶۸	۵۴۴۷۸	۱۱۶۹۲۵۱

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۶ء تک برآمد میں کمی رہی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہوئی کہ اس کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ کرنے لگی۔ دوسرے یہ کہ جزائر غرب الہند میں بھی شکر بننے لگی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان سے شکر کی برآمد بند ہوگئی بلکہ یہاں اس کی درآمد ہونے لگی جن ملکوں سے شکر یہاں آنے لگی ان میں جزائر موریشیس اور جاوا خاص ہیں۔ انگریز، فرانسیسی اور پرتگالی سوداگروں نے انگلستان کی شکر کی منڈی پر قبضہ کرنے کی جو زبردست کوششیں شروع کیں تو اس سے ہندوستانی صنعت کو شدید نقصان پہونچا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفاد کے مد نظر شکر کی برآمد کو جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جب ہندوستانی شکر جزائر غرب الہند کی شکر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوگئی

تو اس پر حفاظتی محصول لگا دیا۔ اسی ناروا رویہ کی وجہ سے شکر کی برآمد میں ۱۸۰۰ء و ۱۸۰۶ء سے کمی آتی جا رہی ہے۔

حالات اور بھی زیادہ خراب اس وقت ہو گئے جب ۱۸۴۸ء سے یورپ میں چقندر سے شکر بننے لگی۔ امریکہ میں اس شکر پر محصول لگا دیا گیا۔ اور ہندوستان خسارہ میں رہا۔ جاوا میں گنا اگانے کے لئے سائنسی طریقے اختیار کئے گئے جس کی وجہ سے وہاں بہتر قسم کی شکر بننے لگی۔ ان باتوں کی وجہ سے یورپ کی بہت سی منڈیاں ہندوستان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ آئندہ پچاس سال کے اندر ہندوستان میں اتنی ہی شکر کی درآمد ہونے لگی جتنی کی برآمد ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آئندہ پچاس سال میں ہندوستان بجائے برآمد کرنے والے ملک کے درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک صرف یو۔پی ہی میں تقریباً دو سو شکر سازی کے کارخانے بند کر دینے پڑے۔ کچھ ایسے محصولات لگائے گئے جو ہندوستانی شکر سازی کی صنعت کے لئے مفید ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اس صنعت کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ منظم کوشش نہیں کی گئی اس لئے ان محصولات سے بھی کچھ کام نہ بنا۔ غیر ملکی شکر سے مقابلہ بازی کی وجہ سے ہندوستانی شکر کی قیمت گرتی ہی گئی۔ ایک وجہ اس زوال کی یہ بھی ہوئی کہ یہاں شکر گڑ سے بنائی جاتی تھی یا دودھ بھی بڑے بھدے اور بھونڈے طریقوں سے جس کی وجہ سے بہت کچھ مال ضائع بھی ہو جاتا تھا۔ پھر بھی ہندوستانی شکر ایسی عمدہ نہ بن سکتی تھی جیسی غیر ملکی ہوتی تھی۔ شکر بہت کم مقدار میں بنتی تھی اور نئی مشینوں کا استعمال بھی زیادہ مقبول نہیں رہا۔ چونکہ حکومت نے راب سے رم (شراب) بنانے کی اجازت نہیں دی اس لئے شکر بنانے والوں کا منافع بھی کم رہا۔

باہر کے گنے کے مقابلہ میں ہندوستانی گنا پتلا ہوتا تھا اور اس سے رس بھی کم نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ فی ایکڑ پیداوار اتنی کم ہوتی تھی کہ گنا ملک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی رہتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے بہت سے باشندے سبزی خور ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں البتہ اس صنعت کو جدید سائنسی طریقوں پر ترقی دینے کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ حکومت ہند کا محکمہ زراعت ۱۹۱۲ء سے برابر کوشاں ہے کہ ہندوستان میں گنے کی پیداوار کو بہتر اور زیادہ بنایا جائے۔ ڈاکٹر بار بر کے تجربوں نے بہت اچھے نتائج دکھائے ہیں۔ گنوں کی حفاظت کے بہت سے طریقے ایجاد اور اختیار کئے گئے ہیں اور آب و ہوا کے مطابق گنوں کی فصل کو بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اچھی قسم کے گنے اگانے کے واسطے بہتر قسم کے بیج ہٹائے جا رہے ہیں۔ کوئمبٹور کے "امپیریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" اور مختلف صوبوں کے گنوں کے محکمہ جات کی کوششوں سے گنوں کے ایسے قلم لگائے گئے ہیں جن سے زیادہ لمبے، زیادہ موٹے اور زیادہ رسیلے گنے پیدا ہونے لگے ہیں۔ کوئمبٹور کے محکمۂ شکر نے جو نئی قسم کے گنے اگائے ہیں (مثلاً ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۴ کو کے گنے) وہ دیسی گنوں سے کہیں بہتر ہیں۔ آج یہ گنے تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین میں بوئے جاتے ہیں۔

دور حاضر میں شکر سازی کی تاریخ نئے محصولات اور نئی قسم کی پیداوار کی ایک طویل فہرست ہے۔ ۱۹۳۲ء سے پہلے (جبکہ حفاظتی قوانین پاس ہوئے) صاف شکر کی صنعت بہت ہی خراب حالت میں تھی۔ غیر ملکی مقابلہ بازی، شکر سازی کے عمدہ طریقوں کا فقدان اور رس کی کمی۔ یہ سب چیزیں اس صنعت کی ترقی کی راہ میں حائل رہیں۔ ۱۸۹۴ء میں صرف برائے نام محصول بشرح ۵ فیصدی لگایا گیا تھا اور اس کا مقصد محض سرکاری آمدنی بڑھانا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں یہ محصول دس فیصدی ہو گیا، ۱۹۲۱ء میں ۱۵ فیصدی اور ۱۹۲۲ء میں ۲۵ فیصدی۔ ۱۹۲۵ء میں اس معمولی محصول نے چار روپیہ آٹھ آنے فی صدی محصول کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۰ء میں یہ محصول ۶/۴ روپے سے چھ روپے ہو گیا اور ۱۹۳۱ء میں ۷/۴ روپیہ فیصدی ہو گیا۔ دوران جنگ اور بعد از جنگ کے زمانہ میں مالی خسارہ کو پورا کرنے کی نیت سے درآمدی شکر کے محصول میں بھی زیادتی کی جاتی رہی۔ ۱۹۱۹ء میں "انڈین شوگر کمیٹی" اسلئے بنائی گئی کہ وہ شکر سازی کی صنعت کو منظم کرے اور اس کو ترقی دے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ "شوگر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کچھ بے اتفاقی سی ہوتی رہی ہے اور اس کی حفاظت کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں "امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ" کے ایماء پر حکومت نے اس طرف خاص توجہ دی اور حفاظتی قوانین کے زیر سایہ شکر سازی کے محکمے قائم کئے جانے لگے۔ حفاظت کا مسئلہ "ٹیرف بورڈ" (Tariff Board) کے حوالہ کیا گیا۔ "فسکل (مالی) کمیشن" نے جو شرائط لگائی تھیں ان کی روشنی میں اس بورڈ نے کل معاملہ پر غور کیا۔ ۱۹۳۲ء میں "شوگر انڈسٹری پروٹیکشن ایکٹ" پاس ہوا۔ پہلے سات سال کیلئے ۷/۴ روپیہ فیصدی کا محصول لگایا گیا اور آئندہ آٹھ سال کے لئے ۶ روپیہ فیصدی کا۔ یہ بھی شرط رکھی گئی کہ ضرورت کے وقت اس شرح میں زیادتی کی جا سکتی تھی۔ یہ صورت حال گویا بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے درآمدی شکر پر سرکاری محاصل کے نقصانات کو پورا کرنے کی غرض سے ۱۹۳۴ء سے آبکاری محصول بشرح ۱۰ (آنے) کھنڈ سازی پر اور بشرح ۵ (آنے) فی صدی کارخانہ کی شکر پر لگایا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس محصول کی رقم میں سے کچھ روپیہ (جس کی مقدار سات روپیہ تک پہنچ گئی تھی)

ایک آنہ فیصدی کے حساب سے تمام صوبوں کو دیا گیا تاکہ وہ اس روپیہ سے کو آپریٹو سوسائٹیاں قائم کریں جو گنا پیدا کرنے والے کسانوں کی امداد کریں۔ گنا اور شکر کی صنعت کو ترقی دینے کے واسطے دس لاکھ روپیہ "امپیریل کونسل آف اگریکلچر ریسرچ" کو دیا جانا طے ہوا۔ محصول درآمد ۷ہ فیصدی کر دیا گیا اور جو سرچارج (بالائی محصول) ۱۹۳۱ء میں لگا تھا وہ ۴ سے ۵ کر دیا گیا فروری ۱۹۳۴ء سے ڈیوٹی ۹ کر دی گئی اور سرچارج ڈیوٹی بشرح عہ فی ہنڈرڈ ویٹ ملک تیار ہونے والی شکر پر لگا دی گئی۔ اس سے شکر پر کل درآمدی محصول ۷ہ ہو گیا۔ کھنڈسار ی پر جو آبکاری محصول تھا اس میں بھی عہ روپیہ کی کمی کر دی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں ٹیرف بورڈ نے سفارش کی کہ حفاظتی محصول کو ۷ فیصدی کر دیا جائے اور کھنڈسار ی پر آبکاری محصول ۸ فیصدی کم کر دی جائے۔ یکم مارچ ۱۹۴۰ء سے حفاظتی محصول پھر ۷ہ کر دینا پڑا۔ کیونکہ آبکاری محصول عار سے عہ ہو گیا تھا۔ حفاظتی محصولات سے شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہونچی لیکن آبکاری محصول کے لگ جانے سے کھنڈسار ی کی پیداوار میں بڑی کمی آگئی۔

جس اراضی میں گنے کی کاشت ہوتی تھی اس کی مقدار بھی بڑھتی ہی رہی ہے ۱۹۲۹ء میں ۰۰ر۲۷ر۲۶ر۲ ایکڑ زمین میں گنا بویا جاتا تھا لیکن ۱۹۳۴ء میں اس کی مقدار ۰۰ر۲۳ر۴۱ر۳ ایکڑ ہو گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں تقریباً ۰۰ر۴۰ر۹ ٹن شکر کی ہندوستان میں درآمد ہوئی تھی لیکن ۱۹۳۱-۳۲ء سے درآمد کی مقدار برابر گھٹتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس کی مقدار صرف ۰۰ر۲۳ ٹن رہ گئی۔ ۱۹۲۹ء میں شکر سازی کے کارخانوں کی تعداد ۲۹ تھی لیکن ۱۹۳۳-۳۴ء میں یہ تعداد ۱۴۲ ہو گئی اور ۱۹۴۱ء میں ۱۴۸ تک پہونچ گئی۔ یہ کارخانے زیادہ تر بہار اور یوپی میں ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں یو۔پی میں ۱۷ کارخانے تھے اور بہار میں ۳۲۔ حال آنکہ ۱۹۳۲ء میں یو۔پی میں صرف ۴ تھے اور بہار میں ۱۲۔ محافظتی محصول کے لگ جانے سے ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہونچ گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں یہاں صرف ۰۰۰ر۹۰ر۸ ٹن شکر بنتی تھی لیکن ۱۹۴۰-۴۱ء میں یہ مقدار ۰۰۰ر۴۰ر۱۲ ٹن تک پہنچ گئی۔ اس میں سے یوپی میں ۵۰۰ر۵۹ر۶ ٹن بنی اور بہار میں ۰۰ر۱۴۴ر۲ ٹن۔ ۱۹۳۲ء کے حفاظتی قانون سے اس صنعت کی جو توسیع اور ترقی ہوئی اس کا اثر قدرتی طور پر درآمد پر پڑا۔ درآمد کی مقدار میں جو کمی ہوئی اس سے ملک کو ۱۵ کروڑ کی بچت ہوئی اور حکومت کو تقریباً ۹ کروڑ کا نقصان ہوا۔

ہندوستان کی اس صنعت کی ترقی کی داستان بہت دلچسپ ہے اس کی خاص وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہی ۱۹۳۲ء کا قانون ہوا جس کے بغیر یہ ترقی اس سرعت کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس ترقی کے کچھ اور اسباب بھی تھے جو اسی قدر اہم ہیں۔ اقتصادی کساد، نئی مشینوں اور دوسری چیزوں کی ارزانی نے بھی اس سلسلہ میں بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ سود کی شرح کی کمی بھی کافی سودمند ثابت ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں زمینوں کی قیمت بھی گری ہوئی تھی اور بجلی کے کنوؤں اور آبپاشی کی دوسری سہولتوں کی وجہ سے بھی بڑی آسانی بہم پہونچ گئی۔ اس صنعت کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کے مزدوروں کی اجرت مقابلتہً کم ہوتی ہے اور اس کے کارخانے انہی مقامات میں ہیں جہاں گنا بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ شکر سازی کے علاقوں میں ریلوں کے جال بچھے ہوئے ہیں اور کچا اور پکا مال بھی سستے داموں میں ادھر ادھر بھیجا جا سکتا ہے۔ "امپیریل شوگر انسٹی ٹیوٹ" کی مساعی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ان تمام اسباب نے مل جل کر اس صنعت کو اس قدر نمایاں ترقی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان دنیا کے سب سے بڑا شکر ساز ملک ہے۔ اس صنعت میں جس قدر سرمایہ لگا ہوا ہے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ۲۵ اور ۳۰ کروڑ کے درمیان ہے۔

اس صنعت نے جو اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی کر لی ہے اس نے کئی الجھنیں بھی پیدا کر دی ہیں مثلاً گنے کی پیداوار کے علاقوں کی تخصیص، شکر سازی کے کارخانوں کو گنے کی باقاعدہ اور مسلسل بہم رسانی، گنے کی کم از کم قیمت کا تعین،

پیام سجدہ

سلام ساگری

کسی کی بزم میں کرنا ہیں کچھ دن رائیگاں مجھکو — کہاں لیجا رہی ہے اے مری عمر رواں مجھکو
جلال برق کا مقصود ہے اب امتحاں مجھکو — بنانا ہے ابھی ہر شاخ پر اک آشیاں مجھکو
جاتا تھا کس شبابی انجمن کا رنگ آنکھوں میں — جہاں دیکھا وہیں ہر شے نظر آئی جواں مجھکو
جہاں تک میری روداد وفا سے وہ نہ اکتائیں — سنانی ہے وہیں تک زندگی کی داستاں مجھکو
سمجھتا ہوں نجومی گردش ایام کا پہلو — زمانہ آزماتا ہے وہاں ان کو یہاں مجھکو
جہاں گرتا ہوں تھک کر ٹھو لیتا ہوں میں منزل — غبار کارواں سمجھیں نہ اہل کارواں مجھکو
تماشا غیر دیکھیں میں یہ کیوں کر دیکھ سکتا ہوں — ترے جلوے کی ارزانی بھی ہوتی ہے گراں مجھکو
بیان عشق کی خاطر زباں سے کام لینا ہے — تمہارے سامنے آنکھوں نہیں دینی ہے زباں مجھکو

سلام اپنی محبت اصل میں خودداری لیکن
"پیام سجدہ" دیتا ہے کسی کا آستاں مجھکو

کارخانوں اور ٹھیکہ داروں کو لائسنس دینا، تول اور قیمت کی ادائگی کی نگرانی، حمل و نقل کی سہولتیں اور مزدوروں کے فائدہ اور آرام کی باتیں۔ حکومت نے ان تمام مسائل پر کما حقہ اپنی توجہ صرف کی ہے۔

ہندوستان میں اور بالخصوص یو۔پی اور بہار میں یہ صنعت بہتر سی منظم صورت میں ہے۔ گنے کی قیمت مقرر کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۳۴ء میں گنے کا قانون (شوگر کین ایکٹ) پاس کیا۔ اس کی رو سے صوبہ جاتی حکومتوں کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ قیمت مقرر کرنے تول اور گنے کی خرید کو منظم کرنے کے مناسب قوانین بنائیں۔ حکومت یو۔پی نے گنے کی قیمت "ہفتہ کمیٹی" کی سفارش پر مقرر کی۔ اس کمیٹی میں کسانوں اور کارخانہ جات کے مالکوں، دونوں کے نمائندے شریک تھے۔ شکر کی منڈی پر بھی نگرانی رکھی گئی اور اس کام پر نظر رکھنے کے لئے انسپکٹروں کا تقرر ہوا۔ حکومت نے اس سلسلہ میں جو مزید دلچسپی لی اس کا اندازہ ۱۹۳۸ء کے "شوگر فیکٹریز ایکٹ" سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایکٹ مندرجہ ذیل امور پر حاوی تھا۔

(ا) شکر کے کارخانوں کو لائسنس دینا۔
(ب) کارخانوں کو گنا مہیا کرنا۔
(ج) "شوگر کنٹرول بورڈ" اور مشاورتی مجلسوں کا قیام
(د) گنے کی کم از کم قیمت کا تعین۔
(ہ) گنے کی بکری پر محصول لگانا۔

حکومت نے جو اقدامات ۱۹۳۸ء کے بعد سے کئے ان سے اس صنعت کو بڑی تقویت پہونچی۔ حکومت نے یہ قوانین اس لئے بنائے تاکہ اس صنعت کی سریع ترقی سے جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں وہ حل ہو جائیں۔

اس صنعت کو دو دفعہ بڑے نازک دوروں سے بھی گذرنا پڑا پہلی دفعہ ۱۹۳۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں۔ ۱۹۳۷ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکر کی قیمت بڑھتی ہی چلی جائے گی اس لئے گنے کی پیداوار زیادہ سے زیادہ کی جانے لگی۔ شکر ۱۲،۳۰،۰۰۰ ٹن تک تیار ہونے لگی حالانکہ اس کی کھپت کا اندازہ ۱۱،۵۰،۰۰۰ ٹن کا تھا۔ کثرت پیداوار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی قیمت گر گئی۔ اس کثرت پیداوار اور اندرونی مقابلہ بازی سے منافع میں جو کمی آگئی تھی اس کو دور کرنے کے لئے "شوگر سنڈیکیٹ" بنا اور "شوگر کنٹرول ایکٹ" بنائے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں شکر کے بارے میں جو معاہدہ ہوا اس میں ہندوستان کی صنعت شکر سازی کا قطعی کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے ہندوستان سے شکر سمندر کے راستہ سوائے برما کے اور کہیں نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ہندوستان میں اس زمانہ میں شکر کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوئی لیکن یہ اپنے ہمسایہ ممالک مشرق وسطی کو اپنی زائد شکر نہیں بھیج سکا جب ۱۹۴۰ء میں جبکہ ہندوستان میں انتہائی کثرت سے شکر تیار ہوئی یہاں سے لاکھوں ٹن شکر بڑی آسانی سے باہر بھیجی جا سکتی تھی۔ اس بین الاقوامی معاہدہ سے ہندوستان کی اس صنعت کو بڑا نقصان پہونچا اور ۱۹۴۰ء میں تو اس کے لئے ایک بہت ہی نازک دور آگیا۔

ہندوستان کی اس صنعت کو بہت سی دقتیں پیش آئیں لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود یہ صنعت برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ آج شکر سازی ہندوستان کی سب سے بڑی صنعتوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ آبکاری محصول کی زیادتی اور مرکزی حکومت اور صوبہ جاتی حکومتوں کے درمیان یکسانی کے فقدان نے اس صنعت کو ہر قدم پر نقصان پہونچایا۔ گنے کی کوئی ایک قیمت کبھی مقرر نہیں ہوئی جس کی وجہ سے زیادہ پیداوار اور کم پیداوار کے سالوں میں قیمتیں برابر گھٹتی بڑھتی رہیں ۱۹۴۲ء میں جبکہ شکر کی گرانی نے اس کی پیداوار میں بڑی زیادتی کردی تھی حکومت سمندر کے راستے اس کی برآمد کا انتظام نہ کر سکی۔ اگر ایسا ممکن ہو جاتا تو ۱۹۴۰ء والا نازک دور کبھی نہ آتا۔

ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت دوسرے درجہ پر ہے۔ پہلے درجہ کی صنعت سوت کی ہے۔ حفاظتی محصول کی مدد سے اس صنعت نے بڑی نمایاں ترقی کرلی ہے اور تقریباً ۱½ لاکھ آدمی اس صنعت کی بدولت پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ۳،۰۰۰ گریجویٹ بھی شامل ہیں۔ اس صنعت نے نہ صرف یہ کیا کہ لاکھوں روپیہ دوسرے ملکوں کو جانے سے بچا لیا بلکہ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو خوشحال بنا دیا۔ کارخانوں کے حصہ داروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس صنعت کا مستقبل بہت روشن ہے۔ بمبئی کے تاجروں کی جو منصوبہ بندی ہمارے طریقہ حیات کو بلند تر کرنا چاہتی ہے وہ اس صنعت کو بھی یقیناً تقویت پہونچائے گی۔

چوہے کا ارتقا

بقیہ صفحہ ۵۰

طبیعت یا اہل ذوق ان کی بنیادوں کو سمجھیں۔

انسان نے جب سے سکے کو ذریعہ خرید و فروخت بنا کر اس کے اندر دستور فطرت کی تقلید میں قوت تولید جنسی یعنی سود کو جائز قرار دیا ہے وہ قرض کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز اتنی خوفناک نہیں بے پناہ نہیں جتنی تقاضہ دار کی شکل۔ صدیوں سے انتقام کا تصور در حقیقت اپنی ہی کے تخیل ہیں۔ خوف کی شکلوں اور مخافتوں کی قسمیں مختلف ہیں۔ نام الگ ہیں۔ لیکن بنیاد خوف اسی غیر فطری مولود کا قیام ہے جس کو انسان نے ابھی تک نہیں سمجھا ہے ✦

ریختی اور جان صاحب

۲

مشیر احمد

جان صاحب نے اپنے زمانہ کی دگرگونی، سیاسی ابتری، انقلابِ زمانہ اور گردشِ دوراں کا ذکر بھی بڑے دردانگیز اور موثر طریقہ پر کیا ہے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے خاندانی رئیس نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور کم ذات اجلاف دولت سے مالا مال اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے اور اپنی کم ظرفی سے بڑوں کے منہ کو آئے تو ان کا حساس دل چیخ اٹھا۔ ان کی چیخ درد میں بھری ہوئی اور زہر میں بجھی ہوتی ہے:-

انڈے کا تیل جن کو میسر نہ ہو کبھی
روشن کریں وہ قوم کے کوری جمائے شمع

ہے خدا کی شان وہ افضل النسا خانم بنی
بیچتی پھرتی تھی گلیوں میں جو کھرنی فالسے

مغربی معاشرت کے اثرات نوابی زمانہ میں ہی لوگ قبول کرنے لگے تھے۔ ولایتی کپڑوں اور انگریزی لفظوں کا چلن ہو چلا تھا۔ بہت سے امیر کبیر ہندوستانی فرنگی عورتوں سے بیاہ شادی بھی کرنے لگے تھے لیکن جان صاحب مشرقیت پسند اور پکے وطن پرست تھے ان کو یہ مغربی ہوا ذرا نہ بھاتی تھی۔ وہ نئے فیشن کو برا سمجھتے تھے اور اس پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اپنی بے بسی پر افسوس کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے تھے۔

کلو نظر آنے لگے اب لکھنؤ میں گورے
در گور ہوا لکھنؤ کمپو سے زیادہ

مجھکو توڑا الا گھر میں، فرنگن کے ہو مرید
مسجد بنائی آپ نے گرجا کے سامنے

(طنز ملاحظہ ہو)

پہن کے کپڑے انگریزی میاں خوش نکلتے ہیں
نئے موتی محل سے بن کے اب گولو نکلتے ہیں

(اکبر الہ آبادی کا رنگ)

نیا رنگ اختیار کرنے سے انکار:-

کپڑا انگریزی نہ پہنوں گی ہیں موتی خانم
ماں جو گو گو ہو تو کیا بیٹی بھی گوگو ہو جائے

ایک بات سن کر شاید آپ کو تعجب ہو کہ وہی جان صاحب جس کو آپ سنی سنائی کے بھروسے ایک فحش گو اور عریانی پسند شاعر سمجھتے ہیں وہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی شاعر تھا۔ اس کے کلام میں وہ تاثیر ہے جو بڑے بڑے واعظوں کی زبان میں نہیں۔ "قدرِ عافیت بعد زوال" کے مضمون کو کس اچھوتے انداز میں ادا کیا ہے:-

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت
سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

"مالِ موذی نصیب غازی" :-

جس نے دولت قدم روپے گاڑے
مال وہ موذیوں کا مال ہوا

زمانہ سفلہ پرور ہے۔ صاحبانِ کمال کی قدر نہیں ہوتی:-

جان صاحب رہا وہ تنگ سدا
جس کو حاصل کوئی کمال ہوا

عجیب زمانہ میں اندھیر ہے بدر جہاں
کسی کمال کا کوئی نہ قدرداں دیکھا

کورانہ عقیدت اور غلط قسم کے مذہبی عقائد پر چوٹ کس انداز سے کی ہے:-

ہے منافع جو مسئلے سے روا
سود کھانا بھی اب حلال ہوا

چپکے رہنے میں تھا حرام وہ کام
ایک دو بولوں سے حلال ہوا

مزارات کی بی زمانا جو درگت بنی ہوئی ہے اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر وہاں جو جو کچھ ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ ان بداعمالیوں کا جان صاحب نے یوں پردہ فاش کیا ہے:-

یہ چھنیاں ہیں تماش بینیں نہیں یارو کام انکو
یہی ہے مطلب کہ جائیں درگاہ مردوں کا کریں نظارا

پرانی روش کا مذاق:-

ہوئی ضعیف میں رنڈیا نہ وہ شباب رہا
عجب ہے ہم دولہن جان ہی خطاب رہا

رضا اور توکل کی تعلیم:-

روٹی خدا کے ہاتھ ہے جان گھر میں بیٹھ
کیوں باندھے باندھے پھرتا ہے تو دبلا ہو کر

مروجہ تعلیم کے خراب اثرات کی وضاحت:-

پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کو
کیا خانہ خراب اس کو دکھایا کوچہ الفت کا

بزرگوں کے ادب کی تعلیم و تلقین:-

بد زبانی نہ کرو ان سے۔ بڑی بوڑھی ہیں
ساس سسر و نندے دولہن جانی رکھنا لحاظ

مردوں کی بے وفائی ہرجائی پن اور حسن پرستی کا پردہ اس طرح چاک کیا ہے:-

یہ حسن کے ہیں گاہک مردوں کو خوب دیکھا
یوسف بنا رہے گا بی بی کا غلام کب تک

حسن و عشق چند روزہ ہوتے ہیں اور جوانی کے جوش کا ابال:-

جوانی بیٹھے موئے عارضی ہیں بس دونوں
یہ حسن و عشق نہیں اعتبار کے قابل

عالی ظرفی، خود داری اور بلند حوصلگی:-

اس کو قربان کروں اپنے گزی گاڑھے پر
میری جوتی سے میسر ہے اگر تاش تمہیں

موت برحق ہے اور دنیوی عیش و آرام زوال پذیر اور فانی ہیں:-

زناخی سدا جو ہیں پھولوں پہ سوتے
انھیں ایک دن خاک پر دیکھتے ہیں

دنیا چند روزہ ہے:-

بایا ہوا کے کاندھے پہ تھا جیلے تخت کا
وہ تاج چتر والے نہ مسند نشیں رہے

دنیا سرا ہے لوگ مسافر عدم کے ہیں
کوئی نہیں رہے گا زناخی یقیں رہے

جان صاحب نے اپنے زمانہ کا حال بھی مفصل بیان کیا ہے۔ ان کا شہر آشوب سودا کے شہر آشوب سے کم نہیں بلکہ سودا کے ہاں شاعری ہے اور جان صاحب کے ہاں واقعیت۔ حکومت کو زوال ہو چلا تھا، ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا، رشوت کا بازار گرم تھا، عدالت میں بجائے انصاف

کے جھوٹ کی داد ملتی تھی، وکیل، موکل اور خود منصف جھوٹ بولتے اور بُلواتے تھے، سچ کی ہر جگہ ہار تھی اور سچ بولنے والا بجائے اپنا حق پانے کے الٹا ماخوذ ہوتا تھا۔ چوری ہوئی تو بجائے چور کا سراغ لگانے کے پولیس الٹا گھر والے کو ستاتی تھی۔ روپیہ ہی کا سکہ چلتا تھا بے زر کو کوئی نہ پوچھتا تھا خواہ کتنا ہی ذی علم اور صاحب کمال ہو۔

عدالت کا حال ؎

کیا انجیل میں دابکے ایمان بیٹھے بیچیا　　بی دوگانا پاس خالق کا نہ ہے قرآن کا
ڈاڑھی منڈو سے ہیں بنتے ڈاڑھیوں والے سوا　　حق کو ناحق کرتے ہیں ناحق کو حق یہ برملا
نوج دکھلائے خدا ایسی عدالت آج کل

پولیس کی کیفیت :-

کوتوالی والوں نے باندھی کمر انصاف پہ　　الٹا راضی نامہ دے کچھ او خرچے آن کر
پھر جو ہو چوری تو دہشت سے نہ ہو کوئی خبر　　پہلے گھر والے بندھیں اس کے ہو چوری جس کے گھر
تھانہ داروں نے نکالی ہے یہ حکمت آج کل

رشوت کی گرم بازاری :-

لالچی بندے یہ لینا ہی سمجھتے ہیں ثواب　　ڈر نہیں مرنے کا ہے کس کمبخت کی سوئی عذاب
صاف ٹکڑا تو کر دیتے ہیں کا ندھے جواب　　جو بہت دے اس کا کہنا ہو جو کم دے ہو خراب
ہر کچہری میں ہے کرتی کام رشوت آج کل

عام بدنظمی اور سلطنت کی دگرگونی :-

جب گنواروں کو ہو حاکم کے نہ بنتے کیوں　　کس طرح پیسا چلے دستور ہے یہ بھی کہیں
سال میں بارہ بدلتے ہیں بو احاکم یہیں　　بی امانی سال بھر کا کچھ اجارہ ہی نہیں
جو اضافہ دے وہی بس پہنے خلعت آج کل

بڑی ناانصافی اور حق ناشناسی ہو گی اگر جان صاحب کی علمی اور ادبی عظمت کا بھی اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے کسی شعر میں (بہ استثناء ایک قصیدے کے جس کا ذکر آگے آئے گا) نہ فارسی کی اضافت استعمال کی نہ فارسی کا حرفِ عطف۔ غریب اور نامانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا ہے۔ سادگی اور سلاست آپ کے کلام کا خاص جوہر ہیں اور تشبیہات تو بہت ہی دلکش اور نئی نویلی ہیں۔ چند ایک سے آپ بھی لطف اندوز ہو جیئے :-

پان کھا کر جو ہنسی گوہر تو اس کے عکس سے　　موتیوں کا ہو گیا باجی گلے میں ہار سرخ
پروانے اڑ کے آتے ہیں پھبتی کہوں ہوا　　ہے کھیلتی بٹیر کا گویا شکار شمع
تیل نہیں مانگ میں زناخی کے　　یہ کنھیا کھڑا ہے گوگل میں
کالی چادر کو نہیں پھینک کے چمکی مہتاب　　کوند کے اودی گھٹا سے نکل آئی بجلی

جان صاحب کا ایک قصیدہ بھی دیکھنے میں آیا ہے جو ایک رنڈی حسین باندی کی شان میں ہے۔ بڑی دھوم دھام کا قصیدہ ہے۔ شان و شوکت پیدا کرنے کے لئے صنائع بدائع کا خوب استعمال کیا ہے۔ سراپائے ممدوحہ خاص طور پر جاذبِ نظر ہے۔ حسین باندی سے جان صاحب کا کیا تعلق اور رشتہ تھا اور وہ کون سا جذبہ تھا جو اس قصیدہ کا محرک ہوا یہ ایک دلچسپ داستان ہے جس کی لطافت ہمارے بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آپ خود جان صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے ؎

کہتا نہ کیوں سراپا تیرا حسین باندی؟　　شیدا کا ہوں میں تیرے شیدا حسین باندی

سراپا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

گردن تو ہے صراحی آنکھیں ہیں جام صہبا　　ہے اس میں خطِ ساغر سرمہ حسین باندی
بازو ہیں ترے دو لوں اس برج آب گوہر　　مضمون یہ ہاتھ کا ہے پایا حسین باندی
جو ہے ہلالِ گردوں اے آسمانِ شوکت　　ترشا ہوا ہے ناخن ترا حسین باندی
شفاف ایسا پایا پائے نگاہ پھسلے　　عالم غضب شکم کا دیکھا حسین باندی
بلور کے ستوں ہیں رانو سے ساق تک　　تصویرِ نقش پا کا نقشہ حسین باندی

یہ خیال غلط ہے کہ ریختی محض شہوانی خیالات کے اظہار کا آلہ تھی بلکہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس نے بھی ادب اور سماج کی خدمت انجام دی ہے اور جان صاحب میں تو ترقی پسندی اور جدت کے تمام عناصر موجود تھے۔ وہ اپنے ماحول کے غلام بن کر نہیں رہے بلکہ اپنے زمانہ کا ہر عیب اور ہر برائی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے بیہودہ باتوں کی طرف رغبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیزاری ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کا ہر شعر ایک طنز ہے اور ہر قہقہہ ایک زہر خند۔

ریختی میں جذبات، واردات، محسوسات اور خیالات سب زنانہ ہیں لیکن جدید ادب کی طرح اس میں جنسی بھوک کا شائبہ بھی نہیں بلکہ ریختی گویوں نے عورتوں کے صحیح خیالات اور معاملات کی ترجمانی کر کے ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کہیں کہیں خیالات پست ضرور ہیں لیکن اس کی وجہ خود شاعر کی پست مذاقی یا دنائیت نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر نے ہر درجہ، ہر طبقہ، ہر منصب اور ہر حیثیت کی عورت کے دل و دماغ کی ترجمانی کی ہے۔ اس سے ریختی اور ریختی گو شاعر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس صنفِ شعر کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے اور ہم کو شاعر کی دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے بعض شاعر اور افسانہ نگار ارزاں شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے عورت کو اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن ان کی تحریرات سے ان کی جنسی بھوک اور دماغی ہیجان و خلفشار کا پتہ لگتا ہے جو عورت کی دوری کا نتیجہ ہے ان کے بیانات ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی نہیں بلکہ مستعار ہیں اور اسی لئے مبہم بھی۔ ان کے برخلاف ریختی گو شاعروں کے رشحاتِ قلم عورت کے قرب کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے خود عورت کو پرکھا، برتا اور سمجھا۔ "عورت ان کے اعصاب پر سوار نہیں" بلکہ وہ خود عورت کی کائنات پر حاوی تھے۔

آسٹریلیا کے ڈیری فارم

جدید طریقوں سے پیداوار میں اضافہ

کرتار سنگھ

جب آسٹریلیا کے کسان اور مزدور فوج میں بھرتی ہو گئے تو آسٹریلیا میں کام کرنے والوں کی کمی محسوس ہونے لگی اور ساتھ ہی مشینوں کا استعمال بڑھ گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج آسٹریلیا میں پیداوار کے نسبتاً کہیں زیادہ ذرائع موجود ہیں اسطرح ڈیری کی صنعت کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔

آسٹریلیا میں مکھن کی سب سے زیادہ پیداوار یعنی ۲،۱۱،۹۰۷ ٹن ۱۹۳۹-۴۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد لڑائی کی وجہ سے آدمیوں کی کمی ہو گئی۔ یہ پیداوار لڑائی اور بُرے موسم کے سبب ۱۹۴۳-۴۴ء میں گھٹ کر تقریباً ۱،۵۷،۹۰۴ ٹن رہ گئی جو ۱۹۳۰-۳۱ء تک کے زمانہ میں سب سے کم تھی۔ اس کے خلاف آسٹریلیا نے اپنے اتحادیوں کو خوراک کی بڑی مقدار دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس میں دودھ کی پیداواریں بھی شامل تھیں۔

گھریلو استعمال کے لئے مکھن کا ہفتہ وار راشن آٹھ اونس سے گھٹ کر چھ اونس فی کس رہ گیا تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں آئی۔

اب آسٹریلیا میں پچھلے کئی سالوں سے دودھ کی پیداوار کے بہتر امکانات ہیں اور برآمد کے لئے مکھن کی بہت بڑھتی جا رہی ہے۔ یکم جولائی ۱۹۴۵ء اور ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کے درمیانی زمانہ میں مکھن کے ۱،۰۲۷،۸۲۸ ڈبے باہر بھیجے گئے جن میں سے ہر ایک میں ۵۶ پونڈ مکھن تھا۔ اچھے انتظام اور سخت محنت سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اس کی ایک مثال ہنری کلٹنرنگ، اس کی بیوی، دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کا کام پیش کرتا ہے۔

کلٹنرنگ نے ۱۹۴۰ء میں ۲۱۱ ایکڑ چراگاہ لی جہاں چالیس انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ یہ جگہ ملبورن سے، جو صوبہ وکٹوریہ کا صدر مقام ہے، نوّے میل مشرق میں واقع ہے۔ اس کے پاس تھوڑا سا روپیہ، کچھ گائیں، کچھ مشینیں اور ڈیری کے کام کا کچھ تجربہ تھا۔

اس وقت تک بحر الکاہل کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس آٹھ کمروں کا ایک لکڑی کا گھر، ایک پیانو، ریڈیو، ریفریجریٹر، گرگش اور جدید قسم کی نالیاں تھیں۔ بجلی سٹیٹ الکٹریسٹی کمیشن سے حاصل کی جاتی تھی اور پانی ایک چھ ہزار گیلن کے زمین دوز حوض سے جو چھت کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ فارم کے اسوقت کے کاموں اور متعلقات کا بیان حسب ذیل ہے:-

کلٹنرنگ پانچ بجے صبح کو اٹھتا ہے۔ سوا چھ بجے دودھ دوہنا شروع کرتا ہے۔ احاطہ، سائبان، نالیاں اور ٹہلنے کے راستے کنکریٹ کے بنے ہوئے ہیں جو اس جائداد کی ایک خندق سے نکالی گئی ہے۔ چھ مشینیں جن کی موٹر دو تین ہارس پاور کی ہے ایک گھنٹہ میں ساٹھ گایوں کو دوہ لیتی ہیں۔ دوہتے وقت گایوں کو نلی دار فولادی ٹکڑوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ دودھ کریم کی نلکیوں کے ذریعہ مینا کی ہوئی بڑی بڑی ناندوں میں جاتا ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری امدادی چیزوں میں پچاس گیلن پانی گرم کرنے کی بجلی کی مشین، دودھ سے مکھن نکالنے کی مشین اور دودھ کا گودام جس میں تاروں کے جالی دار دروازے لگے ہوئے ہیں تاکہ مکھیاں داخل نہ ہو سکیں، شامل ہیں۔

شام کو چار بجے دودھ دوہنا شروع ہوتا ہے ہر مرتبہ دوہنے کے بعد نلی کے ذریعہ احاطہ اور سائبان کو صاف کیا جاتا ہے اور پانی نکال دیتے ہیں جو مکئی کی آبپاشی کے کام آتا ہے۔

کلٹنرنگ کے پاس جزیرۂ جرسی کی عمدہ نسل کے چار سانڈ ہیں۔ وہ ہر بچھڑے بچھڑی کی شناخت اور نسل کی یادداشت رکھتا ہے۔ ہر مہینہ دودھ دینے والے مویشیوں کا معائنہ ہوتا ہے اور جو ایک خاص معیار سے کم دودھ دیتے ہیں انھیں نکال باہر کیا جاتا ہے۔ ہر سال فارم میں پیدا ہونے والی تقریباً ۲۵ نئی دودھ دینے والی گائیں گلہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بچھڑیوں وغیرہ کو اس وقت تک ان خاص احاطوں میں رکھا جاتا ہے جن میں موسم سے بچنے کا انتظام ہو، جب تک کہ وہ دودھ سے خالی مویشیوں کے ساتھ فارم کے پچھلے حصہ میں جانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد سے وہ بھی دوسرے مویشیوں کی طرح تمام سال میدان میں رہتے ہیں۔ کلٹنرنگ نے خوب بیج بو کر اور کھاد استعمال کر کے چراگاہیں تیار کی ہیں وہ ایک ایکڑ میں چار پونڈ سال بھر رہنے والی رئی، تین پونڈ دوب اور تین پونڈ تلی جلی تپتا گھاس بوتا ہے، موسم خزاں میں ان کے علاوہ توی خاسفیٹ بھی ڈالتا ہے۔ اور چراگاہ میں گھاس اگاتا ہے جس میں سے نوّے ٹن خشک گھاس کے گٹھے محفوظ کر لیتا ہے اور ڈیڑھ سو ٹن سبز گھاس پہاڑی کی ایک خندق میں دبا دیتا ہے۔ یہ چارہ سردیوں میں کام آتا ہے۔

میدان کے سامان میں ۲۰ ہارس پاور کا ایک امریکی ٹریکٹر اور ایک آسٹریلیا میں بنی ہوئی گٹھا باندھنے کی مشین شامل ہیں۔

گرمیوں میں اس فارم میں تقریباً ۰۰۰ گیلن پانی کی ہر روز ضرورت پڑتی ہے یہ پانی ایک بجلی کے پمپ کے ذریعہ ایک چشمے سے اٹھا کر دس ہزار گیلن کے کنکریٹ کے حوض میں ڈالا جاتا ہے جو سب سے بلند سطح پر واقع ہے، اور ساری ناندوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ خاص ضروریات میں پانی حاصل کرنے کے لئے ہوا کی چکی لگائی ہوئی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

نقد و نظر

بدلیاں

اس کتاب کی مصنفہ دلی کے مشہور شاعر اور ادیب حضرت آغا شاعر مرحوم کی صاحبزادی ہیں جنھوں نے ادبی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔ کتاب میں ایک مقدمہ اور سولہ چھوٹے بڑے ادب پارے شامل ہیں۔ ان سب کو افسانے کہنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر مخصوص لمحات کے ایسے تاثرات کا نتیجہ ہیں جو فنی معنوں میں پوری طرح افسانہ بننے سے پیشتر ہی نذر قرطاس ہوگئے۔

اس کے باوصف محترمہ سحاب کے اظہار و بیان کی روانی اور بے ساختگی ان کی کم سنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تصویر پرستی اور جذباتیت ہی کی قندیلیں روشن نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی مشعل حیات سے زندگی کے شعلے بھی بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ صنف نازک کی زندگی پر مرد کی تلون مزاجی اور والہانہ اظہار عشق کے اثرات کو بھی محسوس کرنے لگی ہیں جس کی عمدہ مثالیں "کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب" اور "ٹوٹا ہوا کھلونا" وغیرہ ہیں۔

اگر انھوں نے لکھنے کی مشق جاری رکھی اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر توجہ دی تو ان کا ادبی مستقبل یقیناً نہایت شاندار ہوگا۔ افسانوی ادب اور خصوصاً صنف نازک کے ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

ناشرین۔ ہندوستانی پبلشرز دلی ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار دلی۔ صفحات ۲۵۰۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ایک کاروباری

اختر اورینوی کا یہ ناولٹ ایک ایسے شخص کی زندگی کا آئینہ ہے جو غریب کمپاؤنڈر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے تعلیم تو برائے نام ہی حاصل کرسکا لیکن اپنی تاجرانہ صلاحیتوں اور انتھک کوششوں کی بدولت ایک اعلیٰ درجہ کا کاروباری ثابت ہوا۔

تاجرانہ کامیابیوں کے برعکس اس کی خانگی زندگی میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور وہ آخرکار خودکشی تک پر مجبور ہو جاتا ہے۔

درحقیقت یہ کردار کا ناولٹ ہے۔ اس میں کردار نگاری اور تحلیل نفسی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ کردار کے افعال و افکار کے ربط کو واضح کرنے کے لئے اس کے ہر ضروری پہلو کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کے کردار پلاٹ سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہیں۔

آئندہ واقعات اور پلاٹ کے پیش نظر ابتدا میں چھوٹا کمپونڈر اور بیوی کے متعلقین کے حالات کس قدر زیادہ تفصیلی محسوس ہوتے ہیں۔ ممکن ہے شروع کرتے وقت اختر صاحب کا ارادہ خاصہ بڑا ناول لکھنے کا ہو جو آئندہ کسی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا ہو۔

یہ خوبصورت مجلد ناولٹ ۲۷×۲۲/۱۶ کے ۱۰۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۲ آنے۔

ناشرین: ہندوستانی پبلشرز دلی۔ ملنے کا پتہ: نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی۔

شاہکار کا بہار نمبر

شاہکار نے گزشتہ سال ترقی پسند ادب نمبر نکالا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس مرتبہ بہار نمبر شائع کیا ہے۔ اس خاص شمارے میں، جس کے شائع ہونے کی اپریل کے آخری ہفتہ میں امید کی جارہی تھی، مئی کے آخر میں شائع ہوسکا لیکن اندراجات نے اس طویل اور پریشان کن انتظار کی تلافی کردی۔ بہار نمبر پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے قابل مدیروں کی سلیقہ مندی کا اندازہ ہوسکتا۔

حصہ نظم زیادہ تر بہار ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس میں جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، جوش ملسیانی اور احمد ندیم قاسمی کی نظمیں خاص دلکشی اور رنگینی کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مشاہیر کی غزلیں اور نظمیں ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت خوشگوار تنوع پیش کرتی ہیں۔

ادبی مقالات کم ہونے کے باوصف نہایت معلومات افزا اور مفید ہیں۔

میرزا ادیب کا افسانہ "شبنم" ایک ایسے سپاہی کی متضاد نفسیات پیش کرتا ہے جس کا تصور کبھی اس کے ذہن میں غم و غصہ کی سرخ آندھیاں چلاتا ہے تو کبھی اس کے دل کو محبت سے سیراب کرکے جنگ، خونریزی، اور فتح و شکست تک کے احساسات سے بلند کر دیتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا ڈرامہ "ہمپٹ" اور سلطان داؤد کا افسانہ "میرکھو" بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ پرچہ میں دو رنگین تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ خاص نمبر دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے اس کی قیمت دو روپے کسی طرح زیادہ نہیں۔

سالنامہ تمثیل (بمبئی)

کاغذ کی کمیابی آجکل بہت سے ماہناموں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے دو دو مہینے کے متعدد شماروں کو خاص نمبر بنائیں۔ تمثیل کا زیر نظر سالنامہ جنوری سے اپریل تک کے چار شماروں کا واحد نمائندہ ہے۔

حالانکہ اس کے شروع میں "احوال" کے تحت تمثیل کے تین چوتھائی حصہ کو خالص ادبی بتایا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں فلمی پرچہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ڈائرکٹروں اور فلموں کے متعلق مضامین، فلمی خبریں، فلمی ستاروں کی متعدد تصاویر، فلموں پر تنقیدات اور اشتہارات غرض سبھی کچھ موجود ہے۔

اس سالنامہ کے "ادبی" حصہ کی بہترین چیز فراق کی نظم "تقدیر آدم"

ر۔ ن۔ ش

دُنیائے تبسم
شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین دُنیائے تبسم اردو میں بہت مقبول ہیں یہ مجموعہ سلسلہ تبسم کی سب سے کامیاب کڑی ظرافت کے پردے میں ہندوستانی معاشیات پر تنقید کرنیکا جو طریقہ شوکت صاحب نے نکالا ہے وہ اپنے ہمعصروں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ عبارت کی روانی، طرز بیان کی دلآویزی، بے تکلف شگفتگی اور بے تصنع شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب شوکت تھانوی صاحب کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے مقدمہ نے جسمیں متانت اور ظرافت آپس میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں کتاب کے لطف میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے
مجلد معہ گرد پوش
قیمت ڈھائی روپے صرف
نئی تہذیب نئی تعلیم
امریکہ کے مشہور ماہر تعلیم ولیم ایچ کلپٹرک کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب تعلیم کے کام کرنے والوں کیلئے مشعل راہ کا کام دیگی اور دوسرے لوگ بھی اسے پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو جائینگے کہ ہماری تہذیب جامد ہو کر رہ گئی ہے اور یہی ہمارے مصائب کا راز ہے۔
قیمت مجلد سوا دو روپے صرف
ہماری دوسری کتابیں
وارادات۔ از منشی پریم چند (افسانے)
خونی۔ از اختر انصاری (〃)
مجنوں کے افسانے از مجنوں گورکھپوری (افسانے)
ماہ درخشاں۔ بیگم احمد علی (ناول)
بیوہ۔ منشی پریم چند (ناول)
آبگینے۔ اختر انصاری (قطعات)
تجلیات۔ مہر عثمانی (نظم)
مسدس حالی۔ مدی ایڈیشن آرٹ پیپر
جمالیاتی شاعری۔ سعید انصاری (ادب)
خارستان۔ آغا شاعر (ادب)
آب حیات کے لطیفے۔ محمد حسین آزاد (ادب)
مقالات اسلم جیراجپوری (ادب)
خطبات اقبال۔ علامہ اقبال مرحوم
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاسی)
مضامین ابوالکلام آزاد (اول) (مذہب)
مضامین ابوالکلام آزاد (دوم) (سیاسی)
مضامین البلاغ
ہندوستان کا مستقبل۔ از راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس
غبار خاطر۔ از ابوالکلام آزاد
سرخ چین کا رہنما۔ از اسرار احمد (سوانح)
میتھیک لارنس سے
کیا خوب آدمی تھا (سوانح)
اقبال کا نظریۂ پاکستان
تاریخ آزاد ہند فوج از منشی عبدالقدیر
بچوں کا لندن
ہوائی حملے
خیال آفرین دماغ بیرش تیموری (تخیل)
حسن حسین (مذہب)
اسلام کیسے شروع ہوا عبدالواحد سندھی (مذہب)
اسلام کیسے پھیلا اول
اسلام کیسے پھیلا۔ دوم عبدالواحد سندھی (مذہب)
سامان آخرت۔ خواجہ غلام الثقلین (〃)
بچوں کی دلچسپ سبق آموز کتابیں
نظم
اسلامی نظمیں ۱۰، وطنی نظمیں ۱۲، بچوں کا تحفہ اول ۱۰
بچوں کا تحفہ دوم ۱۰، حب وطن ۱۰، چپ کی داد ۳
تحفۃ الاخوان ۱، مناجات بیوہ ۳، حقوق اولاد ۳
کہانیاں
چیتن منن از شفیع الدین نیر ۳
میاں مٹھو 〃 ۵
ٹمو میاں ۵، کھلو میاں ۸
منی کا پرستان ۵، طلسمی مینا ۵
فسانۂ عجائب ۳، دیومالا
حیات حالی
بی جج کو چلی ... مسولینی ۵
بیس روپیہ کی کتابیں منگانے والے کو محصول معاف
ہر قسم کی عمدہ کتابیں ملنے کا پتہ
حالی پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار، دہلی

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۸ | فہرست | ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دھلوی

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

لنکا میں ماہی گیری

لنکا کے چاروں طرف سمندر میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس حصے میں مچھلیوں کا جمگھٹ زیادہ ہے دوربین لگے ہوئے ہوائی جہاز اڑائے جائیں گے۔ اس کے بعد ماہی گیروں کی کشتیاں فوراً ان مقامات پر پہنچکر اپنے جال ڈال دینگی یہ خاکہ لنکا کے محکمۂ ماہی گیری نے بعد جنگ کے لائحۂ عمل کے سلسلے میں مرتب کیا ہے۔ اس پندرہ سالہ اسکیم پر تقریباً پچھتر لاکھ روپئے خرچ ہوں گے۔ اس رقم میں دخانی کشتیوں، جالوں اور دیگر قسم کے ان آلات کی قیمت شامل ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں استعمال ہوں گے مچھلیوں کو خشک کرنے اور دوسرے ملکوں کے لئے انہیں ڈبوں میں بھرنے کے کارخانے قائم ہوں گے۔ جنگ سے پہلے لنکا میں تقریباً ایک کروڑ چونتیس لاکھ روپے سالانہ کی خشک مچھلیاں یا مچھلیوں سے بنی ہوئی چیزیں دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ اگر جزیرے کی کل آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے اوسط لگائی جائے تو فی کس چودہ پونڈ سالانہ کا حساب پھیلتا ہے۔ حالانکہ جاپان میں تقریباً ساٹھ پونڈ فی کس کے حساب سے مچھلی کھائی جاتی ہے قیاس ہے کہ آئندہ لنکا کے باشندے بھی زیادہ تر مچھلیوں پر گذارہ کرینگے اور وہ خود انہی کے ملک کی پیداوار ہونگی۔

آسٹریلیا میں جنگلی کتے

آسٹریلیا میں بھیڑ بکریوں کی پرورش وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا اور اہم پیشہ ہے۔ لیکن قدرت نے ان جانوروں کے ساتھ ساتھ جنگلی کتے بھی پیدا کر رکھے ہیں جو ہر وقت تباہی اور نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ جب موقع ملتا ہے، ان کی ٹولیاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ خصوصاً کوئنیز لینڈ میں ان کتوں کی افراط وبال جان ہوگئی ہے۔ لڑائی سے قبل حکومت نے ایسے کتوں کو تلف کرانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب کوئی شکاری کسی کتے کو مارکر اسکی کھوپڑی کاٹ لاتا، تو اسے سرکاری خزانے سے اسے آٹھ روپے مل جاتے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال تقریباً ساڑھے بائیس ہزار کتے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ پھر بھی انکی تعداد ہولناک ہے۔ چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کو زہر کے ذریعہ بہت جلد فنا کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے زہریلی گولیاں انگلستان سے منگائی گئی ہیں۔ ہر گولی میں چاول کے برابر اسٹرکنا ئین شامل ہوگا۔ کوئنیز لینڈ میں پہنچتے ہی یہ گولیاں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں رکھکر ہوائی جہازوں کے ذریعہ لاکھوں کی تعداد میں ان حصوں پر پھینک دی جائینگی جو جنگلی کتوں کے مرکز ہیں اور جن میں سے اکثر جگہ انسان کی رسائی ممکن بھی نہیں ہوسکتی۔ انہیں کھاتے ہی کتے آن واحد میں فنا ہو جائیں گے اور غریب بھیڑ بکریوں کو آئندہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکیگا۔

انگریزی فلم اردو زبان میں

کچھ عرصہ ہوا انگریزی طرز کو رواکا نیا یا ہوا رنگین فلم "بغدادی چور" جس میں سابو نے بھی کام کیا ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دکھایا جاچکا ہے۔ اسکا مکالمہ انگریزی زبان میں ہے۔ اب کمپنی کے مالکان نے بڑی کوشش کے ساتھ مکالمے کا ترجمہ اردو زبان میں اس طرح کر دیا ہے کہ عبارت کم یا زیادہ ہونے نہیں پائی۔ بلکہ اجزائے کلام کی تعداد تک تقریباً برابر رہی۔ نتیجہ یہ کہ جب اردو جاننے والے اداکاروں نے نیا مکالمہ یاد کر کے پردے کے پیچھے سے فلم کے ساتھ ساتھ بولنا شروع کیا اور اسکی صدابندی ہوتی رہی تو وہ تصاویر کی نقل و حرکت کے ساتھ بالکل منطبق ہوگیا۔ چنانچہ حال ہی میں اس کی نمائش انگلستان میں جشن فتح کے موقع پر ہوئی تو لوگ یہ دیکھکر محو حیرت ہوگئے کہ اصل فلم کے امریکی اداکار بظاہر نہایت صاف اردو بولتے نظر آرہے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ کسی جگہ بھی تصنع اور بناوٹ کی جھلک محسوس نہیں ہوتی۔ عنقریب اس فلم کی نمائش ہندوستان میں شروع ہوجائیگی۔ اگر یہ کامیاب تجربہ آئندہ بھی عمل میں آتا رہا تو غیر ملکی کمپنیوں کے لئے فلمی کاروبار میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہو جائیگا۔ پھر وہ لوگ بھی جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں، ان اعلیٰ فلموں سے لطف اندوز ہوسکیں گے جو انگریزی اور امریکی کمپنیاں تیار کرتی رہتی ہیں۔

امریکہ میں غیر ملکی طلباء

اس لڑائی کے بعد سے مشرقی دنیا کے کئی ملکوں کو مغرب میں خاصی اہمیت حاصل ہو چلی ہے۔ اس امر کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حکومت امریکہ نے غیر ملکی طلباء کو اپنے ملک میں تعلیم پانے کی اجازت دیدی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ۲۲۹ طلبا سان فرانسسکو پہنچے ہیں۔ یہ ریاستہائے متحدہ کے مختلف کالجوں اور اداروں میں تعلیم حاصل کرینگے۔ ان میں سے تین سو بارہ ہندوستانی طلبا میں سے ایک سو ستر کو حکومت ہند کی طرف سے سرکاری وظیفہ ملیگا۔ ایک سو بتیس نجی ذرائع سے امداد حاصل کرینگے۔ دو ہندوستانی نرسیں جنہیں شجاعت و بہادری دکھلانے کے صلے میں تمغہ جات مل چکے ہیں، صرف سفر خرچ حاصل کرنے کے بعد باقی مصارف خود برداشت کرینگی نیز ایک اور طالب علم کو کالج کی طرف سے وظیفہ دیا جائیگا۔

حکومت ہند کا خیال ہے کہ آئندہ چند برس میں تقریباً دو ہزار طلبا امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیجے جائیں۔ اسوقت وہاں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد برائے نام ہے۔ شروع میں امریکہ کے ارباب حل و عقد کے پیش نظر یہ سوال زیر غور تھا کہ غیر ملکی طلبا لئے جائیں یا نہیں لیکن فیصلہ حق میں ہوا اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ ہر کالج زیادہ سے زیادہ طلبا مانگ رہا ہے اور اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان اور سونے کی کانیں

ملک ہندوستان معدنیات کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری دھاتوں کے علاوہ سونے کی یافت قابل ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میسور کی کولار والی کانیں سونے کا مخزن ہیں۔ دنیا بھر میں جتنا سونا برآمد ہوتا ہے، اسکا تقریباً دو فیصدی حصہ یہاں کی سرزمین اگلتی ہے۔ ہندوستان میں سونا کہیں اور نہیں ہوتا۔ یورپ کی چار کمپنیاں کان کنی کا کام انجام دیتی ہیں۔ یہاں کی کانیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ گہری ہیں۔ ان کا عمق بالکل عمودی حالت میں نو ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ ان کانوں سے ریاست میسور کو مالیانہ کے طور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کام شروع ہوا تو صرف نو اونس سونا نکلا جس کی قیمت محض ۲۷ پونڈ ۱۲ شلنگ ۵ پنس ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں کل یافت ۵۵۶ اونس ہوئی جس میں ۵۲۷ کی قیمت ۲۳،۴۳،۷۵۰ پونڈ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں ۲،۵۲،۹۳ اونس خالص سونا نکلا جس کی قیمت ۸،۲۹،۷۸۱ پونڈ ہوئی۔ شروع سے ۱۹۴۳ء کے آخر تک کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۲،۰۶،۳۰،۹۱۵ اونس سونا نکلا جس کی قیمت ۱،۳۷،۹۳،۵۵۵ پونڈ ہوئی۔ ان تمام کانوں کے سلسلے میں بیس ہزار سے زیادہ مزدور ملازم ہیں۔ انہیں کو اچھی اجرتیں دی جاتی ہیں۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی معقول طریقے پر کر رکھا ہے۔

نمکین چینی

چینی کا کال تقریباً ساری دنیا میں شدید دشواریاں پیدا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یورپ کے ملکوں کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چینی یا اور قسم کی مٹھاس کسی قیمت پر نہیں ملتی اور اگر چور بازار میں کبھی اسکی جھلک دکھائی بھی دی تو اتنی قیمت طلب کی گئی کہ خریدنے والوں کو سنتے ہی پسینہ آگیا تاہم پیرس کے ایک بازار میں ایسا عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا کہ شاید اس جیسی مثال دنیا میں کہیں اور نہ مل سکے۔ پیرس کی مونت مارترے اسٹریٹ میں جو اپنی چور بازاری کے باعث آجکل بہت مشہور ہے، ایک شخص بڑا سا تھیلا لئے منظر عام پر آیا اور آواز لگانی شروع کی: "عمدہ صاف چینی کوڑیوں کے مول خرید و خریدنے والو!" یہ سنتے ہی عورت و مرد چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک سیر چینی کا پیکٹ سوا چھ چھ روپے میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ خوش تھا کہ آج مدتوں کے بعد کام و دہن کی تلخی کو شیرینی سے بدلنے کا موقع مل جائے گا لیکن گھر پہنچکر جب سب نے اپنے اپنے پیکٹ کھولے تو معلوم ہوا کہ چینی کی صرف ایک انچ موٹی تہ کے نیچے کھانے کے معمولی نمک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چینی کی تہ بھی اس طرح لگی ہوئی تھی کہ جب اسے الگ سے اٹھالینے کی کوشش کی گئی تو نیچے کا نمک اس میں مل گیا اور چینی نمکین ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کام و دہن کی وہ لذت نصیب ہوسکی ہوگی جسکی لہر عارضی مسرت کے ساتھ تمام لوگوں کے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ اس لڑائی کے نتائج نے دردناک حادثات کے ساتھ بعض مضحکہ خیز صورتیں بھی پیدا کی ہیں۔

نوّے منٹ میں ہوائی ڈاک

عنقریب برطانیہ اور امریکہ کے مابین ہوائی ڈاک کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا کم وزن کے خط اور دوسری ہلکی چیزیں خدنگ نما ہوائی جہازوں میں رکھکر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جہاز چلانے والوں کے بغیر پھینکی جائیں گی۔ یہ جہاز تقریباً دو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے یا بالفاظ دیگر نوّے منٹ میں ساری مسافت طے کرلیا کریں گے۔ ان کی رہنمائی ریڈیائی لہروں کے ذریعہ ہوگی۔ برطانیہ کی فضائی وزارت نے بیڈ فورڈ میں جو ہری بموں کی تجربہ گاہ کے قریب کچھ جگہ لے کر نئی ہوائی ڈاک کا مرکز قائم کیا ہے۔ یہ صورت اگر ممکن ہوگئی اور ممکن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے یہ جہاز رسل و رسائل کی شاہراہ پر نئے سنگ میل کی حیثیت اختیار کریں گے۔

تیل کے میدان اور کارخانے

مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں برطانوی ملکیت کے تیل کے میدانوں اور صاف کرنے کے کارخانوں کی مکرر تعمیر اور ان کو نئے

سازوسامان سے لیس کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ پونڈ سے زیادہ کے ٹھیکے دئے گئے ہیں۔ یہ رقم ۱۹۴۵ء میں دئے جانے والے ٹھیکوں سے بقدر دس لاکھ پونڈ زیادہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک عظیم الشان پائپ لائن کا سازوسامان اور کلیں وغیرہ خریدنے کے سلسلے میں ایک کروڑ پونڈ کے ٹھیکے دئے جائیں گے۔ یہ لائن ۱۹۴۸ء میں مکمل ہو کر شمالی ایران کے ان سلسلوں کو جو حیفہ اور ٹریپولی سے وابستہ ہیں سہ گنا زیادہ قوی بنا دے گی۔ ایک ماہر فن کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں خصوصاً بم زدہ علاقوں میں مکرر تعمیر کا کام دو سال میں ختم ہو سکیگا۔ برطانوی حکمت عملی اس کوشش میں ہے کہ وہ تیل کے اعتبار سے دنیا بھر کی منڈیوں پر چھا جائے۔ حکومت امریکہ بھی مشرق وسطیٰ اور وینیزویلا میں بے قیاس رقم خرچ کر کے یہی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس مقابلے کے باوجود یہ فیصلہ ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین نرخ کی کمی بیشی سے کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔ ولندیزی جزائر شرق الہند اور برطانوی بورنیو میں تیل کے میدان اور کارخانے سب سے زیادہ زدہ حالت میں ہیں کیونکہ ۱۹۴۲ء میں وہ بری طرح تباہ ہو گئے تھے۔ جاپانیوں نے عارضی تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کی مرمت کرائی تھی لیکن پسپائی کے وقت انھوں نے دوبارہ ان کو نقصان پہنچا دیا۔

حکومتِ سندھ کا دستِ تعاون

حکومت ہند کے بنیادی خاکے کے مطابق حکومت سندھ نے ڈیڑھ کروڑ ٹن چاول ان علاقوں میں بھیجے ہیں جہاں قحط کے اثرات سب سے زیادہ رونما تھے۔ اس میں سے چوہتر ہزار ٹن ریاست ٹراونکور، تیس ہزار ٹن ریاست کوچین، پونے پندرہ ہزار ٹن بمبئی اور دس ہزار ٹن مدراس بھیجے گئے۔ تقریباً نو ہزار ٹن مغربی ہندوستان کی ریاستوں کو دئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء ختم ہونے سے پہلے دس ہزار ٹن چاول کی فالتو مقدار ان علاقوں میں اور بھیجی جائے گی۔ چاول کے علاوہ پینتیس ہزار ٹن چنا بھی صوبہ سندھ ان علاقوں کو دے سکیگا۔ اس مقدار میں سے چھ ہزار ٹن پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ باقی مقدار بھی حاصل کر کے ایک جگہ جمع کر لی گئی ہے اور حمل و نقل کے انتظام کی تیاری کی جا رہی ہے۔

مغربی ممالک میں گیہوں کی افراط

امریکہ کے محکمۂ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ سال گذشتہ کے مقابلے میں اس سال یورپ میں گیہوں کی فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ یہ اندازہ ان رپورٹوں کی روشنی میں لگایا گیا ہے جو وہاں کے بارہ ملکوں نے شائع کی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں چونسٹھ کروڑ ستر لاکھ بشل پیدا ہوا تھا۔ اس دفعہ کا تخمینہ تقریباً بیاسی کروڑ بشل کا ہے۔ اس سلسلے میں فرانس سب پر سبقت لے گیا ہے۔ وہاں گیہوں کی فصل اتنی عمدہ ہوئی ہے کہ اس سے قبل فرانس کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔ فرانس کے وزیر اغذیہ حال ہی میں لندن جانے والے ہیں۔ وہ برطانیہ کے وزیر اغذیہ سے بات چیت کریں گے کہ فرانس سے کتنا گیہوں برطانیہ کے لئے بھیجا جائے۔ کینیڈا میں بھی گیہوں کی فصل عمدہ رہی ہے۔ وہاں سے تقریباً بیس لاکھ بشل اناج برآمد کیا جا سکیگا۔ مغرب کے ان اعداد و شمار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیر مسئلۂ خوراک کی صورت حالات عنقریب سدھر جائے گی۔

برطانوی پولیس اور ریڈیو

برطانیہ میں پولیس کا سب سے بڑا مرکز اسکاٹ لینڈ یارڈ کہلاتا ہے۔ پولیس کے تمام احکامات اسی جگہ سے نافذ ہوتے ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ اب سارے برطانیہ کے مشرقی اضلاع والے پولیس مرکزوں سے ملانے کے لئے ریڈیو کا ایک جال قائم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں تقریباً چودہ اسٹیشن قائم ہوں گے۔ لاگت کا اندازہ تقریباً دو ہزار پونڈ فی اسٹیشن ہے۔ چیف کانسٹبل کے آئندہ اجلاس میں اس مسئلہ پر پوری طرح غور کیا جائے گا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ریڈیو پولیس اب تک صرف لندن کے علاقوں سے متعلق ہے۔ اس کے بعد اس کی پہنچ دور دراز حصوں تک ہو سکیگی۔ اس صورت میں مختلف قسم کی واردات و حادثات کی تعداد کم ہو جانے کا امکان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس توسیع سے عوام کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ دہلی کے مشہور نوجوان اخبار نویس جناب سید محمود مورخ بی اے کسی اچانک صدمے کے باعث راہیٔ ملک بقا ہو گئے۔ انا للہ الخ۔ آپ ہفتہ وار "گلفروش" اور روزانہ "مسلمان" کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ اردو ادب میں بھی انکو ایک اچھا مرتبہ حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے اخبار جاری کرنے سے قبل مرحوم "تیج" "ہلال" میں نائب مدیر رہے تھے۔ خدا نے انکو ایک فطری صلاحیت یعنی سماعت سے محروم کر رکھا تھا لیکن یہ کمی انکے ادبی اور صحافتی مشاغل میں حارج نہیں ہوتی تھی۔ ان کی بے وقت موت سے ادب و صحافت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تبرکاتِ سائلؔ دہلوی مرحوم

بے حجابی میں سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
اور انگشت نما ہوتے ہو کیا کرتے ہو

تم گلے مل کے جدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
ابھی کیا تھے ابھی کیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

بے سبب ہم سے خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
دشمنِ اہلِ وفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اب وہ بچپن کا زمانہ نہیں دیکھو دیکھو
ناسمجھ اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

آگ دینے کے لئے آئے تھے یا لینے کو
جب تم آتے ہو ہوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

غیر کے شکوۂ بیجا سے تو ہو شرمندہ
میری منت پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

پردہ داری میں قباحت ہو تو بتا دو کیا ہے
پردہ درِ روزِ جزا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

خوگرِ جور وستم سے یہ عداوت کیوں ہے
تارکِ وضعِ جفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اور انجان بنے جاتے ہو ہو کر سیانے
کیا سے کیا نامِ خدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

وقت پہ کام نہ آئیں گے تمہارے اغیار
ضد سے تم اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اس بناؤ سے بگڑ جائے گا بیمار کا حال
تم تو پیغامِ قضا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

کھولتا ہوں میں تمہیں وصل میں جتنا، اتنے
اور پابندِ حیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

جانشینِ داغؔ سے شاعر کا یہی سائلؔ ہے
اور تم اس پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اختر حسین رائے پوری

بحیثیت ادیب

(۱)

ظہور الحسن ڈار

ہند جدید کے اردو ادب میں بیسویں صدی کا پینتیسواں سال یادگار رہے گا یہی وہ موقعہ تھا جب رسالہ اردو کی اشاعت جولائی میں اختر حسین رائے پوری کا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" شائع ہوا اور اس دیس میں نئے اور صحت مند ادب کے بیج بو گیا۔ اس وقت اردو ادب کی حالت روسی ادب کی اس دور سے کچھ مختلف نہ تھی جب زار روس کا ساشتی نظام مغربی ملکی سرمایہ داری کے بھنور میں پھنس کر پوچھ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ روسی کردار مایوسی اور قنوطیت کا پرچار کر رہے تھے، اور "علم اج" کا نعرہ زبان پر آتا بھی تھا، تو اس کا ردعمل فرد کی موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ہندوستانی ادب بھی کم و بیش اسی راہ پر چل رہے تھے۔ ملکی سیاست کے رنگ ڈھنگ کا اثر ادب پر یہ ہوا کہ اس میں قوم پرستی، آزادی، سراج، اصلاح اور خود پسندی کے مورچے قائم ہو گئے تھے۔ ایسے منفاد رجحانات میں ظاہر ہے کہ ادب کی حیثیت ایک سماجی فریضے کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے ہمیں زندگی کی سچی قدروں کی تلاش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ماحول کے اندھیرے میں کہیں امید اور امنگ کی بجلی تڑپتی بھی تھی تو اسلئے کہ تاریکی کا نقش اور بھی گہرا ہو جائے پرانے ادیب اگرچہ زمانے کے بدلتے ہوئے چلن سے مرجھا رہے تھے، پھر بھی وہ میدان چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ادھر نئے لکھنے والوں کے لئے یہ مصیبت تھی کہ ابھی تک وہ یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ کچھ من چلے جو جنگ عظیم کے بعد یورپ کی خاک چھان چکے تھے اور مغربی ادیبوں کے شاندار کارناموں سے واقف ہو گئے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ ہندوستانی ادب کو بھی اس ہار میں گوندھنے کی فکر میں تھے جس کے سدا بہار پھول چننے میں مغربی فن کاروں کو بڑی جاں کاری سے واسطہ پڑا تھا۔ مختصراً اس وقت اردو ادب میں زندگی کی ایسی لہر دکھائی نہ دیتی تھی جو اسکے ارتقاء کی خبر دیتی، بلکہ اگر کہیں آندھی کا نشان بھی ملتا تو ناظر کے حصے میں خاک دھول کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے لق و دق صحرا میں کہیں کہیں ننھے پیڑ پودوں نے سر نکال لئے تھے، مگر ان کی نشو و نما اسی وقت ممکن ہو سکی جب ادبی افق پر ایک نئی بجلی نے کڑک کر ادب اور زندگی کا چیکا روشن کیا اور آناً فاناً صحت مند خیالات کی برکھا سے ہر طرف زندگی کی لہر دوڑا دی۔

"ادب اور زندگی" دراصل اختر رائے پوری کے اس مضمون کا پھیلاؤ تھا جو "ساہتیہ اور کرانتی" کے عنوان سے تین سال قبل ہندی کے مشہور ماہنامہ وشوامتر کلکتہ میں شائع ہو چکا تھا۔ جس طرح اس مضمون نے ہندی ادب کے سوچ بچار کی، نہج بدل کر ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی، اسی طرح اردو ادب میں بھی اس کی اشاعت نے مولانا سراسیل کا کام دیا نئے دور کے تقاضوں کی پہلی للکار نے جہاں رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے قلعوں میں رخنے ڈال دئے وہاں نئے ادیبوں کے اس گروہ کو بھی راہ دکھلائی جو ابھی تک سوچ رہا تھا کہ ہمیں کیا کہنا چاہئے اور کیسے کہنا چاہئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لے دے کے ایک منشی پریم چند کی ذات نظر آتی تھی جس کے کردار خیال کے محلوں سے نکل کر حقیقت کی سڑکوں پر چلنے پھرنے لگے تھے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد سے متاثر ہو کر اب ان کا کسان ستیہ گرہ کرنا بھی سیکھ گیا تھا، اور طالسطائی کے کرداروں کی طرح جوگان ہستی کا اندھا سور داس سن کے سنسار میں نیکی کی جوت جگانے نکل آیا تھا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اجتماعی طور پر اردو ادب کے دھارے کا رخ بدلنے اور ادیبوں کو ادب کا مفہوم اور اسکے مقاصد سمجھانے میں جو کام اختر رائے پوری کے "ادب اور زندگی" نے کر دکھایا، وہ منشی پریم چند کے محض افسانوں کا سے ممکن نہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خود منشی پریم چند نے اختر کے خیالات کو بیحد پسند کیا، بلکہ اختر کے ساتھ مل کر ہندوستانی ادیبوں کو ہند جدید کے ادبی تقاضوں سے باخبر کرنے میں انہوں نے جو کام کیا۔ وہ اس تحریک کے پھیلاؤ کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔ "ادب اور زندگی" کی اشاعت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو ادب میں ہرجائی معشوقوں کی کمی ہونے لگی، رقیب اور عاشق دونوں پھانسی لگا کر مرنے لگے، فراق یار کے نالے اور آہیں دھیمی پڑ گئیں اور اب اس میں ایسے کردار پیش ہونے لگے جو چلمن کے پیچھے بیٹھ کر جھلک دکھلانے کی بجائے اس دیس کی سڑکوں گلیوں اور کھیتوں میں گھوم پھر کر اپنے دکھ درد کی کہانی سنانے تھے۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کا بڑا مقصد بھی یہی تھا کہ ادب کو اپنے ماحول سے متعلق دکھایا جائے اور بتلایا جائے کہ ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں۔ اس مقالے کی تاثیر اور شہرت کے اسباب کی تلاش کچھ اتنی مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ نظر آئے گی کہ اس دور کے ہندوستانی ادیب، ادب کا کوئی واضح تصور نہ رکھنے کے باعث اپنے آپ سے مطمئن نہ تھے۔ دل میں جذبات کا ہجوم ہو اور راہ اندھیرے میں راستہ نہ سوجھتا ہو ایسے میں کوئی من چلا مشعل جلا کر دوسروں کو راہ نہ دکھا دے تو اس کی ہمت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مشعل کی جوت ایسی شفاف اور سہانی تھی کہ نہ صرف ہندوستانی ادیبوں کو اپنی منزل کی جھلک نظر آنے لگی بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر زندہ قوم کا ادبی قافلہ کس جانب رواں ہے۔ کہاں پیشہ ور ادیبوں کی خود پسندی اور "ادب برائے ادب" جیسا مہمل نقطۂ نگاہ اور کہاں اختر رائے پوری کی انسان دوستی اور "ادب برائے زندگی" کی مجاہدانہ صدا۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد ہندوستانی ادب کے دھارے میں ایک عظیم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے تاریخی جلسے میں جب ہندوستانی ادیب ادب کے مقاصد کی توضیح کے لئے مل بیٹھے تو ظاہر ہو گیا کہ اب ہندوستانی ادب کے مڑتے ہوئے دھارے نے اپنے جوش کا مظاہرہ کرنے کے لئے نیا میدان تلاش کر لیا ہے۔ اس جلسے میں اختر رائے پوری نے "ادب اور زندگی" کے نعرۂ انقلاب کی تجدید کی اور کھلے الفاظ میں اعلان کیا ——

"ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے، اور اسے کدھر جانا چاہئے، ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لئے اقدام کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے

انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے، ادیب اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ کیا حسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہِ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا وہ واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟ احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے، تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو اور وہ کیا کہے کن سے کہے اور کس طریقے سے کہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی جڑیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے، زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے، اور جو بنی نوعِ انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان سطور میں ادیب اور ادب دونوں کو انانیت اور خود پسندی کے حجروں سے نکال کر زندگی کے بھرے میلے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہیں سے ادب اجتماعی زندگی سے آشنا ہوتا ہے، انسانیت کے دکھ درد کو کہتا سنتا ہے، قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور وحدت کا پیغام سناتا ہے اور ان تمام عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے، جو زندگی کو محدود اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔ یہ وہی صدائے حق ہے جسے روس میں میکسم گورکی اور پرنس کروپاٹن، فرانس میں رومان رولاں اور ہندوستان میں قاضی نذر الاسلام نے بلند کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان فنکاروں کے آرٹ میں زندگی کی ایسی جوت جگمگا رہی ہے، جو غمزدہ انسانوں کے تاریک دلوں کو اجالتی ہے، اور محبت کے ساتھ ان کے دکھ درد کی عیادت کرتی ہے۔ یہاں یہ واضح ہے کہ اختر رائے پوری کا نظریۂ ادب کسی دل جلے کی پکار نہیں بلکہ اسکے پس منظر میں روشنی کی وہ لکیر نظر آتی ہے جو ماضی کا رشتہ حال سے اور حال کا ناتا مستقبل سے جوڑتی ہے۔ اپنے وسیع سیاسی، معاشی اور ادبی مطالعے کی مدد سے ہمارا نقاد جب ہندِ قدیم اور ہندِ جدید کے ادب کا تجزیہ کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بےچین لہر ٹھہرے ہوئے پانی میں تلاطم برپا کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، ایک عظیم قوت ادبی مزاج سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان میں آگئی ہے، اور ایسا لگا کہ اس دیس کے ادب کی بے حسی اور بے راہروی کو بہا لے جائیگی۔ چنانچہ حقائق کو ایک نظر دیکھ کر دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ توقع غلط نہیں ثابت ہوئی۔

ہندوستانی ادب میں آج جو خوش آئند تبدیلیاں نظر آتی ہیں، وہ اختر کے "ادب اور زندگی" ہی کی مرہونِ منت ہیں، ہندِ جدید کے ادب کا معاشی تجزیہ دراصل اختر کے اس قول کی صحت کا ثبوت ہے کہ ادب درحقیقت اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

پریم چند جب مزدوروں کو زندگی کی جد و جہد کا پیام سنانے کی بجائے سرمایہ دار کے من میں نیکی کی جوت جگمگانے کی توقع کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیگور کی طرح یہ بھی اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ایک طرح سے یہ ادیب کے عجز کا اظہار ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے تھک ہار کر راستے ہی میں کہتا ہوا بیٹھ گیا "کیوں نہ سمجھ لوں کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں" من کے سنسار میں کیسے تبدیلی ہو سکتی ہے؟ اسے ہزار کوشش کے باوجود پوری طرح سمجھنا مشکل ہے، پھر کسان اور مزدور زمینداروں اور سیٹھوں کے دل کی تاریکی پگھلنے کی توقع میں کیوں بیٹھے رہیں، سوال یہ ہے کہ زمیندار اور رشتہ دار اور کسان و مزدور کی تمیز ہی کیوں باقی رہے، کیوں نہ پیداوار کے ذرائع پر پوری سماج کا قبضہ ہو اور اس کی تقسیم مساوات کے اصول پر ہو۔ ادب جب زندگی کا ترجمان اور رہنما ٹھہرا تو کیا وجہ ہے کہ وہ انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے اسے قسمت اور صبر کی افیون کھلاتا رہے ۔۔۔

"ادب اور زندگی" کا مصنف ایسے ادب کا سخت مخالف ہے، جو حقیقت کا سامنا ہوتے ہی راہ فرار ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ادب دراصل حقیقت کا جویا ہے۔ پھول کے حسن اور خوشبو کی تعریف کرتے ہوئے وہ کانٹوں کی بیدردی جھٹلاتا نہیں بھولتا۔ اسی طرح جب وہ بلبل کے نغمے کا ذکر کرتا ہے، تو اس کی دلربائی کے ساتھ سوز اور درد کی داستان سنانے سے نہیں چوکتا۔ پھر یہ کیوں ہو کہ ادیب ظالم کو نیست و نابود کرنے کی بجائے مظلوم کو بہلانے میں اپنی قوت صرف کر دے۔ ہندوستانی ادیبوں کی بے راہروی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو وہ اپنے ماحول سے متعلق کوئی واضح تخیل اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور نہ انہیں اپنی شخصیت پر قابو تھا، ورنہ کیا وجہ تھی کہ خالص زرگرانہ جذبات کے زیر اثر ناول لکھے جاتے اور شعر کہے جاتے، یا گھبرا کر ماحول سے بچنے کی بے سود تمنا میں آرٹسٹ کی قوت کا بیشتر حصہ برباد ہوتا۔ اختر کے نقطۂ نگاہ سے ایسا ماحول سچے ادب کی تخلیق کے لئے موزوں نہیں ۔۔۔ "سچے ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ممکن ہے، جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کے اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری شخصیت نے ایثار کا سبق نہیں پڑھا۔ وہ ضبطِ نفس سے بیگانہ ہے۔ وہ خودی کی کیچلی میں دبی ہوئی ہے۔ اس پر تن آسانی نے چربی کی تہیں چڑھا رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں اس میں حقیقت نہیں ہوتی، وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے نامانوس ہو کر نامراد رہ جاتی ہے۔۔۔"

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر کتنے مضمون لکھے گئے! ناظر کو پھر "بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی"، کا خیال آنے لگا۔ ہر ادبی حلقے میں اس پر بحث اور تنقید کا سلسلہ چل نکلا، رجعت پسند طبقہ بگڑنے لگا، اور نئے ادیبوں نے مصنف کے خیالات کو مشعلِ راہ بنا کر اس طرح نئی بنیاد ڈالی جو بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۴۳ء تک اختر رائے پوری نے باقاعدگی سے ہندوستانی ادب کی رہنمائی کے لئے متعدد مضامین لکھے۔ ان میں وہ تنقیدیں اور تبصرے بھی شامل ہیں جو وہ "ناخدا" کے نام سے انجمن ترقی اردو کے مشہور رسالہ میں لکھتے رہے۔ ان میں سے کچھ مضامین "ادب اور انقلاب" کے نام سے مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں، یہ مضمون اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انہوں نے ادب میں ایک تنقیدی احساس پیدا کیا، اور قدروں کو جانچنے کے لئے ادیب کو ایک سماجی معیار سے آشنا کیا۔ "ادب اور زندگی" کے بعد "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم"، "اردو شاعری میں عورت کا تخیل"، "جنگ اور ادب" اور "اردو ادب کے جدید رجحانات" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ پچھلے دس سال میں ہندوستانی تنقید نگاری کی جو کایا پلٹ ہوئی وہ بڑی

انہی مضامین کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔

اختر ایک آئیڈیلسٹ نقاد ہے۔ وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ مضمون لکھتا ہے کہ ہندوستان میں صحت مند ادب کی تخلیق کے امکانات نہیں ملتے۔ یہ احساس اس کی تحریر میں بلا کا جوش اور تیکھاپن پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو جتلا کر کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ سچے ادب کی قدروں کا تعین کرتا ہے، ان قدروں کی جڑیں زندگی کے بنیادی جذبات میں پیوست ہیں۔

اس کسوٹی پر جب وہ ہندوستانی ادب کو پرکھتا ہے تو اسے اپنے آئیڈیل کی تصویر کہیں نہیں ملتی۔ اس کے ذوق و شوق اور بلند نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ اس دیس کی دو عظیم ادبی شخصیتوں ٹیگور اور اقبال تک سے مطمئن نہیں۔ ان کے آرٹ کی عظمت کا وہ قائل ہے، مگر نئے دور کے نئے تقاضوں سے آنکھ چرا کر عہد گزشتہ کی کمین گاہوں میں پناہ کی تلاش کو وہ معیوب قرار دیتا ہے۔ زندگی کے حقائق سے گریز کے اس رجحان کو نظر انداز کرنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس مرحلے پر ادبی حلقوں میں اختر کے خلاف بڑی شورش پیدا ہوئی مگر وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس طوفان کو سہہ گیا۔ اپنے خواب کی تعبیر اگر اسے کسی فن کار میں نظر آئی ہے، تو وہ نذرالاسلام ہے۔ جس کی شاعری اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے جہاں ادب ظالم کے لئے تلوار اور مظلوم کے لئے صور بیداری کا کام دیتا ہے۔ اختر کے تنقیدی شعور میں گہرائی اور پختگی اور اس کی تنقید میں ضبط و توازن کی حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ مصنف کے مطالعے کی وسعت، تجربہ کی گہرائی، خیالات کا ستھراپن اور انداز بیان کا وہ نکھار ہے جو اس کی تحریر میں جابجا جھلکتا ہے۔ اس کا خلوص اور تجسس، جس کی کوئی انتہا نہیں، ان خوبیوں کو جلا دیتا ہے۔ ہمارا ادبی تحریک میں اس کی باریک بین آنکھ پس منظر کے مدھم سے مدھم نقش کو دیکھ لیتی ہے اور حقیقت نگار قلم اسے کمال خوبی سے اجاگر کرتا ہے۔ "ادب اور انقلاب" میں مکمل چھان بین کی یہی صفت ہر موقعے پر آشکار رہتی ہے اور اختر کو ہندوستان کے منفرد نقاد کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے ادب پر اختر کا جامع مقالہ اردو تنقید کے شاندار مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ کہاں اردو تنقید کی کم عمری اور خامیوں کا شدید احساس اور کہاں اس حقیقت کا بولتا ہوا ثبوت کہ اب اس میں دنیا کی دوسری زبانوں پر بھی کامیاب تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے! — موضوع کی وسعت کے مقابلے میں مصنف کا اختصار دیکھو تو حیرت ہوتی ہے، کہ ایک پورے ملک کے ادبی ارتقا کی ایسی مکمل تصویر چھوٹے سے چوکھٹے میں کیوں کر سما گئی۔

جن خوبیوں نے اختر کی تنقید کے سر قبول عام کا سہرا باندھا ہے، ان میں طرز بیان کا وہ حسن اور رسیلا پن بھی شامل ہے جس نے اسے پر بہار بنا دیا ہے، اس کی مثال ہمیں "بنگال کا باغی شاعر" میں ملتی ہے۔ یہ مضمون گو نذرالاسلام کی شاعری کے متعلق لکھا گیا ہے، مگر مصنف کے جوش عقیدت اور خلوص نے نثر میں بھی شعر و نغمہ کے رنگا رنگ پھول کھلا دیئے ہیں۔ پورے مضمون میں ایک آفاقیہ اور حسین نظم کی سی رعنائی پائی جاتی ہے، ہندوستانی تنقید میں ایسے دلربا مضمون کی مثال کہیں نہ ملے گی، جہاں نقاد فن کار سے اس قدر قریب آ گیا ہو کہ اس کے احساسات کی خفیف سے خفیف تھرتھری کا نظارہ بھی دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں تنقیدی شعور کے ساگر کی وسعت اور گہرائی میں بیکرانی پیدا ہوتی ہے اور تنقید اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صرف یہی ایک مضمون اختر کو ہندوستان کے نقاد کا درجہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمے کو خاص درجہ حاصل ہے اس اعتبار سے اسے بھی ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہے بھی بڑا کٹھن کام۔ فن کار کو ادب کی تخلیق میں یقیناً جگر خون کرنا پڑتا ہے، مگر مترجم کو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فن کار سے بھی زیادہ پتہ مارنا پڑتا ہے۔ اس کی مشکلات کی انتہا نہیں۔ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس کا تار پود سے باخبر ہونا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے دیس کی زبان سے۔ کوئی ترجمہ اسی وقت کامیاب کہلائے گا جب مترجم کا رباب فن کار کے گیت کا پوری طرح ہم نوا ہوگا۔ یاد رہے کہ جب تک وہ مصنف کی روح کی لرزش محسوس نہیں کرتا، اس کے جذبات و احساسات کے دھارے میں نہیں بہتا اور اس کی تحریر کے ہر انداز کو نہیں پہچانتا، اس کے ترجمے اور اصل تحریر میں وہ مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو کامیاب ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اردو میں ترجمے کی ویسے ہی کمی ہے، مگر اس کسوٹی پر پرکھئے تو گنے چنے مترجم ہی معیار پر پورے اتریں گے، ایک زمانہ تھا کہ اس میدان میں ظفر علی خاں جیسے پر تکلف بزرگوں کا سکہ چلتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے تراجم کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور مولوی عنایت اللہ اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے باکمالوں نے اردو ترجمے کا سنگھار نکھارنا شروع کیا۔ تراجم کے لئے صحیح کتابوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی، زبان و بیان کی اونچ نیچ کو مد نظر رکھا جانے لگا اور کوشش کی گئی کہ مترجم کی بے راہروی سے مصنف کی تحریر کا خون نہ ہو۔ اس سلسلے کی تکمیل موجودہ دور میں اختر رائے پوری کے ان تراجم سے ہوئی جو انجمن ترقی اردو کی اسکیم کے مطابق وجود میں آئے اور انجمن نے ہی انہیں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اسے اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق کہئے کہ ادب عالیہ کے تراجم کی جو اسکیم انجمن نے سوچی تھی اس کی تکمیل کیلئے اختر جیسے ادبی مجتہد کا تعاون حاصل ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں کے اشتراک سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچا، مگر اردو ترجمے کی خوش قسمتی میں کلام نہیں کہ اختر جیسا گوہر نایاب اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اب تک جو ادبی شاہپارے اختر کے ذریعے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ان میں کالی داس کا مشہور ناٹک "شکنتلا"، نذرالاسلام کی نظموں کا مجموعہ "پیام شباب"، "گورکی کی آپ بیتی" اور پرل بک کا شہرت یافتہ ناول "پیاری زمین" (GOOD EARTH) شامل ہیں، ان تراجم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو ترجمہ مدت سے جس انقلاب کی راہ دیکھ رہا تھا اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہندوستانی تنقید اور ادب کی طرح اردو ترجمے میں انقلاب کی بنیاد بھی اختر ہی کے قدامت شکن ہاتھوں سے رکھی گئی۔

ہمارے دیس میں اس آمر انقلابی کی شخصیت اس جوہر کی سی ہے جو ادب کی دنیا کے روپ کو نئی شان سے جگمگا رہا ہے۔

اختر کے تراجم کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے جو شاہکار اس نے اردو کے سینے میں اتارے ہیں، ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان فن پاروں میں کالی داس، میکسم گورکی، پرل بک اور نذرالاسلام جیسے بین الاقوامی شہرت کے ادیبوں نے اپنی صناعی کا پورا کمال دکھایا ہے۔ اس اعتبار سے مترجم کو جن مشکلات سے واسطہ پڑا ہوگا ان کا اندازہ ممکن نہیں، مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی قیامت خیز قوت کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہرتی، ایک سیلاب کی طرح وہ ہر بلند و پست پر چھا جاتا ہے، اور اپنی عظمت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔

کالی داس کی "شکنتلا" کا ترجمہ براہِ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ سنسکرت اور اردو کی فطرتوں میں وہی فرق ہے، جو بقول مترجم، کسی مالوا کے پنڈت اور لکھنؤ کے میرزا میں ہو سکتا ہے، اور سنسکرت بھی کالی داس کی، جو اس منجھی سنجھائی اور دھلی دھلائی زبان کا سب سے بڑا صاحب طرز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی کتاب اس صاحب طرز کی مدھر شاعری سے بھرپور ہے، سنسکرت جیسی وسیع زبان کو جس میں نازک سے نازک احساسات کو حسن و خوبی سے بیان کرنے کے لئے الفاظ کا بہترین ذخیرہ موجود ہے، اردو جیسی تہی دست زبان میں گھلانا، واقعی ایک حد درجہ کٹھن کام تھا لیکن مترجم نے اسے جس خوبی سے کر دکھایا ہے، وہ داد سے مستغنی ہے،

میکسم گورکی کی آپ بیتی کو ادب عالیہ میں جو درجہ حاصل ہے وہ بہت کم فن پاروں کے حصے میں آیا ہے۔ اس کتاب کے ہر لفظ میں آرٹسٹ کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ گورکی کو نہ صرف اپنے احساسات کے اظہار میں کمال حاصل ہے بلکہ وہ زبان و بیان کا بھی بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی رام کہانی زندگی کے رنگا رنگ جذبوں کی سچی تصویر ہے اور غالباً اس کے ادبی رنگ محل کی سب سے البیلی اور موہنی مورت ہے۔ اختر نے جس نفاست سے روسی ادب کے اس شاہکار کو اردو کے قالب میں سمویا ہے، اس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔ مترجم یوں بھی گورکی کا شیدائی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ترجمے میں مصنف کی روح کے اس جوہر کو دکھانے میں کامیاب ہو گیا جو اس کی اصلی تحریر میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ گورکی کی آپ بیتی کے ترجمے میں ایسی دلفریبی اور سچائی پائی جاتی ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے اور اردو بھی کیسی۔ جس کی رعنائی اور دلکشی ناظر کی سدھ بدھ بھلانے کے لئے کافی ہے

ترجمے کا سچا روپ دکھانے کے لئے ایک دو ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

"کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں شفق کی ندیاں بہنے لگتیں، اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہے، باغ کے مخملی سبزے پر آتش بار سنہری بارش سی ہونے لگتی تھی، اور ہر درخت پہلے یک گونہ تاریک ہو کر دھندلا تر ہو جاتی،— پھول سی جاتی، اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہو جاتی تھی، دھوپ میں جھلس کر پتیاں مرجھا جاتیں اور گھاس کے تنکے سر جھکا لیتے تھے ہر چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی، اور ایسی مہک پھیلاتی، جو موسیقی کی ترنگیں کھیتوں سے اٹھ کر آتیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے، رات آئی— اور اس کے ساتھ ماں کے پیار کی سی شگفتگی، اور حیات آفرینی پیدا ہونے لگتی، ستارے نے اپنے گرم و گداز ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی، اور سارے گرد و غبار کو دھوکر وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے، چت لیٹے ہوئے آسمان کی نا محدود گہرائی— ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں ستاروں کی ایک نئی محفل سجاتی ہے— ستاروں کی چمک دمک کے نظارے میں کیسا مزا ملتا تھا، اور اس موقع پر اگر زمین پر قدم رکھو تو گمان ہوتا ہے کہ یا تو دنیا سمٹ گئی ہے، یا تم بہت بڑے ہو گئے ہو، اور اپنے ماحول میں سمائے جا رہے ہو، لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے، تاہم نہایت ہی دھیمی اور ناقابلِ احساس آوازوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور ہر آواز— خواہ وہ کسی بلبلِ خوابیدہ کا ترانۂ نیم شب ہو یا کسی خرگوش کا سراسیمہ خرام یا کسی انسان کی زیر لب گفتگو— دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہے، ایک خاص نرالا پن اس کے حساس سکون کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔"

چلتے چلاتے اردو میں بنگال کے باغی شاعر نذرالاسلام کے تعارف کا ذکر ضروری ہے، جو تراجم کے سلسلے میں اختر کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ "پیام شباب" کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نرم و نازک جذبات کے ساتھ ساتھ انقلاب کے آتشیں ترانوں کو بھی پوری کامیابی سے اپنے فنی طلسم خانے میں سما سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک نظم کا مختصر سا ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

"میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں
اس قدر سعادت فروش اور وفا ناآشنا کہ میں اسے اسی کے آتشِ جہنم
میں جھونک دوں گا،
اس آگ کو میں تباہی کے پنکھے سے ہوا دوں گا، یہاں تک کہ زمین و آسمان
اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے،
میرے ہاتھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہے۔
بیک آواز تم سب کہو،
"تو سراپا بدعا ہے، تو شیطان ہے، تو ملک اجل ہے،
نہ تو کسی سے ڈرتا ہے، نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے،
تو قیامت کا پیامبر ستارۂ تخریب ہے،
تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے،
تو دجال ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے،
بجا اور درست! ہاں ہاں۔ میں نقیب قیامت ہوں،
میں ستارۂ تخریب ہوں ——"

(باقی آئندہ)

کچھ ایران کے بارے میں

ایچ - ڈی
(دگریوز لا)

یہ مضمون "ایشیاٹک ریویو" بابت اپریل ۱۹۴۶ء میں اور بعد میں اسکا فارسی ترجمہ مجلہ "روزگارِ نو" لندن میں شائع ہوا تھا۔

گذشتہ دو ایک سال میں انگلستان میں ایران سے متعلق بہت سے اہم اور معلوماتی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مضامین پڑھے ہیں وہ ضرور اس نتیجہ پہ پہنچے ہوں گے کہ ایران کے حالات تسکین بخش نہیں ہیں۔ ایران کئی سیاسی، مالی اور معاشی مشکلات کے باوجود، جو باہری افواج (اتحادی ہی کیوں نہ ہوں) کے طویل قیام کے سبب زیادہ سنگین ہو گئی ہیں جمہوری طرز حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے اور ایران کے عامتہ الناس بلکہ ان کے بعض رہنما بھی شکست، تذبذب بلکہ قنوط کے احساسات میں گرفتار ہیں۔

یہ سب مسائل حقیقی اور یہ سب مشکلات اہم ہیں۔ لیکن ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے انھیں نظر انداز کر دیں اور ہو سکے تو اس بات پہ غور کریں کہ اس وقت ایران اور ایرانیوں کے دل و دماغ پہ کیا کچھ گذر رہا ہے اور ایران کے سیاسی، بین الاقوامی یا انتظامی وجود پہ نہیں بلکہ اس کے روحانی وجود پہ نظر ڈالیں۔ ایرانی جرائد پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران جو تین ہزار سال آزاد رہا اور شاندار ماضی اور شاندار روایات کا حامل ہے، اگر مرا نہیں تو ایک مہلک مرض میں ضرور مبتلا ہے۔ اسکا روگ اور اس کی حسرت لاعلاج ہے اور تعلیم کی کمی، بھوک اور انتظامی کوتاہیاں اس قدر سنگین ہیں کہ بہتری کی امید نہیں رہی۔ ایران کے مشہور وطن پرست ادیب آقائے رہنما نے اپنے روزنامہ ایران مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء میں "ایرانیوں کے افکار" کے عنوان سے ایک افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس میں اس نے لکھا کہ ایسے فارغ البال ایرانی بہت کم ہیں جو کچھ سوچ سکیں، بقیہ لوازم زیست کی فکر میں الجھے رہتے ہیں اور جو فارغ البال ہیں انھیں عیش و راحت کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

کیا ہم اس مایوس کن تشخیص کو جس کی تائید ایران کے قریب قریب سب جرائد کے مطالعہ سے ہوتی ہے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر سکتے ہیں؟ جی نہیں، بلکہ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ یہ تشخیص غلط ہے۔ روزنامہ اطلاعات کے مدیر آقائے مسعودی نے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں اپنی حکومت اور ملت سے یہ اپیل کی تھی کہ یاس اور قنوط کو ترک کر کے ایران کی حیات نئی بنیادوں پہ تعمیر کی جائے۔ یہ اپیل قابل عمل ہے اور اس پہ عمل ہو بھی رہا ہے۔

اگرچہ ایران کے مقابلہ میں بہت سے یورپی ممالک کے مصائب کہیں زیادہ سنگین ہیں تاہم اس میں کلام نہیں کہ ایران ایک تاب آزما دور میں سے گذر رہا ہے لیکن ایران کی طولانی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ قوم زندہ رہنے پہ تلی ہوئی ہے۔ قدرت۔۔۔ نے اس قوم کو بڑی قوتیں عطا کی ہیں اور اب اس میں بیداری فکر اور تجسس کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کے پیش نظر یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی صلاحیت مر گئی ہے یا مر سکتی ہے۔

جہاں تک ایران کے دل و دماغ کے ارتقا کا تعلق ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایران کو دفعتاً بیسویں صدی میں چھلانگ مارنا پڑی۔ ہماری (اہل مغرب کی) یہ خوش قسمتی تھی کہ ہم نے نہ صرف تعلیم بلکہ ذہنی تفریح کے تمام مدارج دھیرے دھیرے طے کئے۔ انشا پردازی، ناول نگاری، تھیٹر۔۔۔ سب اٹھارویں اور بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھے۔ سنیما مغرب میں ایران کی طرح دفعتاً ظہور میں نہیں آیا۔ تھیٹر سے خاموش فلم، خاموش فلم سے متحرک فلم، یہ سب منزلیں سلیقہ اور متانت کے ساتھ طے پائیں۔ لیکن ایران میں معاملہ دگرگوں رہا ہے۔ تقریب قریب دس سال کے اندر اندر ایران کو نہ صرف رنگین فلم بلکہ ریڈیو، فرنگی نغمہ و سرود، جدید عمارات، فرنیچر، لباس اور رسم و رواج سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں اسے یکایک سب سے اہم اور دور رس انقلاب یعنی آزادیٔ نسواں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں اگر ایران بوکھلا جائے اور اپنی اقدار کا اندازہ نہ کر سکے تو چنداں تعجب کا مقام نہیں ہے۔ سخت گیر آمریت کے اچانک سقوط سے صورت حالات اور بھی بگڑ گئی۔ کہاں وہ جبر و تشدد! کہاں یہ آزادیٔ فکر و اظہار! ایرانی دماغ ڈگمگا گیا ——— وہ دن دور نہیں جب کہ اسے سکون اور توازن میسر ہو جائے گا لیکن سر دست ایران کا رد عمل کیا ہے؟ سب سے پہلے جرائد ہی کو لیجئے۔ ادھر دباؤ ہٹا اور ادھر ہزاروں دبی ہوئی آوازیں ابھرنے لگیں۔ رات رات میں اخبارات کُکرمتّا کی طرح نمودار ہو گئے۔ گذشتہ دو سالوں میں طہران ہی سے ساٹھ ستر اخبارات شائع ہونے لگے۔ آج بھی چالیس سے تو زیادہ ہوں گے۔ یہ اخبارات کیا کہتے ہیں؟ بہت سے ایڈیٹر حتاً ادیب ہیں لیکن جو ایرانی اخبارات انگلستان آ رہے ہیں ان کا واسطہ تو زیادہ تر سیاسیات، سماجی اور معاشی مسائل اور دنیا کی خبروں سے ہے جن نے

روزنامہ ایران (جسکا ایڈیٹر آقائے رہنما ہے) کے چار تازہ شمارے اٹھا کر دیکھیے جنکے ہیں۔ ان کے افتتاحیوں کے موضوع یہ ہیں:- افیون اور شراب کے خلاف جنگ، محکمۂ ٹیلیفون کے عملہ کی شکایات، ایرانی کالجوں کی تعلیم، اگست ۱۹۴۱ء (جب اتحادی افواج ایران میں داخل ہوئیں اور رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوا) کے باعث عبرت واقعات۔ یہ سب موضوع اہم اور مضامین فکر انگیز ہیں۔ لیکن اگر بڑے سے بڑے ایرانی اخبار کو چھان ماریں تو بھی اکا دکا مضمون ایسے ملیں گے جو کسی عام ثقافتی موضوع سے متعلق ہوں یا کہیں کتابوں پر تبصرے ہوں یا کوئی ادبی مباحثہ ہو یا مراسلات کے ذریعہ روزمرہ کی دلچسپی کے واقعات پر اظہار خیال کیا گیا ہو یا سینما کے کھیلوں یا ریڈیو کی خبروں کے بارے میں کوئی دلچسپ اور تیکھی تنقید ہو۔ ان اخبارات کی تعداد اشاعت کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پرچے خریدے کم جاتے ہیں اور لوگ عام طور پر ایک دوسرے سے لیکر پڑھتے ہیں۔ اس سے یہ خیال آتا ہے کہ اگر کم اخبارات چھپیں تو نہ صرف یہ کہ کاغذ کی زیادہ کھپت اور طباعت میں بھی زیادہ آسانی ہوگی بلکہ ادبی ذوق زیادہ مستقل قسم کی ادبیات کی تخلیق میں صرف ہو سکیگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے:- کیا ایرانی اخبارات عام لوگوں کو پہنچتے ہیں۔ یا لوگوں کے دل و دماغ کا انعکاس ہیں یا ان کی رہنمائی کرتے ہیں یا ان کے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں؟ کیا ایران میں عوامی اخبار ہیں؟ کیا کوئی عوامی ادب بھی ہے؟ کیا حجازی کے لطیف مزاحیہ مضامین یا مسعود فرزاد کی سنجیدہ تنقید یا برق آسا مزاح یا جمال زادہ اور ایسے ہی اوروں کے افسانے عوام تک پہنچتے ہیں یا محض خواص تک؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایران میں نہ عوامی اخبارات ہو سکتے ہیں نہ عوامی ادب، اس لئے کہ عوام اَن پڑھ ہیں۔ ایران کی تمدنی زندگی میں داستان گو کو صدیوں سے ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ بچوں کے لئے طلسماتی یا دیگر قسم کی کہانیاں نہیں چھپتیں اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر دایہ یا نانی یا دادی کو ایسی ہزاروں کہانیاں ازبر ہیں۔ لیکن داستان گو اور دائیاں اب نا پید ہو رہی ہیں۔ اب ان کی جگہ کون لے؟ کیا یہ امید افزا علامت نہیں کہ بچوں کا رسالہ نونہالاں جو حال ہی میں طہران سے شائع ہونے لگا ہے اسکی ہفتہ وار اشاعت بیس ہزار ہو گئی ہے؟ پہلی مرتبہ اب ایرانی لڑکے اور لڑکیاں رابرٹ آف ہنزڈ" ایسی ہمت افزا کہانیاں ایرانی زبان میں پڑھنے لگی ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ ایرانی خود اپنے طبعزاد رومان لکھیں گے اور شاید کوئی ایرانی "شرلاک ہومز" جاسوسی کہانیاں لکھنے لگے۔

ایران اپنی صدیوں پرانی ادبی ثقافت اور روایات کے باوصف کیوں اسقدر پسماندہ ہے؟ اسکا جواب آقائے جمال زادہ نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "یکی بود یکی نبود" کے دیباچہ میں دیا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ سالہا سال کی مستبدانہ طرزِ حکومت کے باعث معدودے چند فکر اور ثقافت کے ارتقا سے مستفید ہو سکے جو نتیجے اس نے نکالے ہیں کم از کم ان کی صحت میں کلام نہیں۔ یعنی یہ کہ تعلیم عامہ نہ ہونے کے باعث، ایرانی ادیبوں کا روئے سخن خواص کی طرف رہا ہے نہ کہ عوام کی طرف۔ معدودے چند لوگ ادب سے مستفید ہو سکتے تھے اور ادب اور بول چال کے محاوروں میں وسیع فرق ہے۔ ان نتائج کی بنا پر وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تعلیم عامہ کے علاوہ ایران کی سب سے بڑی ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اظہار خیال ایسی زبان میں کیا جائے جسے عوام سمجھ سکیں اور ایسے محاورے استعمال کئے جائیں (مثلاً ناول میں) جن سے عوام لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کی رائے میں ناول یورپی ثقافت کا مضبوط ترین کھمبا ہے۔ "یکی بود یکی نبود" میں اپنے نظریہ کو دلآویز اور مزاحیہ انداز میں عملی جامہ پہنایا ہے۔ صادق ہدایت ایک اور افسانہ نگار ہے جو ایرانی ادب میں، اپنے لئے تیزی سے ایک مخصوص جگہ بنا رہا ہے اور جس کے بارے میں بے لاگ رائے ہو رہی ہے۔ ایک غیر ملکی کا ایرانی ادب میں اس افسانہ نگار کے موجودہ یا آئندہ مرتبہ کا اندازہ لگانا اس کی جسارت بلکہ حماقت پر محمول ہوگا۔ کیونکہ نہ صرف اس کے طرز نگارش بلکہ اس کے افسانوں کے متن کے بارے میں ارباب نقد و نظر کی رایوں میں شدید اختلاف ہے۔ البتہ میں اتنا کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہدایت بہت لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے اس میں اپج اور جاذبیت ہے، "تخیل اور دقت نظر ہے" اگرچہ وہ اکثر و بیشتر جن کرداروں اور جس ماحول کو پیش کرتا ہے وہ ایک غیر ملکی کے لئے اجنبی ہے تاہم ان کے غم والم اور ان کے سینے گہری اور ناقابل فراموش حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

ہدایت بہت بڑا ادیب ہے یا محض سیانا ٹھیک، یا وہ ایک ناخوشگوار حادثہ ہے۔ یہ چنداں اہم سوال نہیں ہے۔ اہم سوال تو یہ ہے۔ اور جسکا جواب ہمیں دل سے مطلوب ہے۔ کیا ہدایت ایک جداگانہ انوکھی ہستی ہے یا نہیں؟ کیا وہ ایران کے نئے مکتب افسانہ نگاری کا پیشرو ہے یا نہیں؟ یہ ایک صحت مند علامت ہے کہ ایرانی اس مسئلہ میں دلچسپی لے رہے ہیں اور بحث و تمحیص رہتی ہے۔ اسوقت ایران میں ہدایت ایسے افسانہ نگار بہت کم ہیں اور صرف اسی بنا پر اسے کسی لحاظ یا معیار سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۳ء میں ماہنامہ "سخن" (طہران) جاری ہوا جسمیں ہدایت کے مضامین برابر شائع ہوتے ہیں۔ اس ماہنامہ میں نہ صرف تعلیمی، معاشی، تاریخی اور فلسفی مضامین بلکہ انگریزی، جیکی، چینی اور امریکی نظموں کے ترجمے، موسیقی اور ادبی تنقید سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اسکی ہر اشاعت میں حیات ایران کی تجدید کی خواہش پائی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے چوٹی کے ادیبوں ـ فردوسی، حافظ، رومی، نظامی، سعدی ـ جو صدہا سال سے ایرانی قوم سے خراج عقیدت لیتے رہے ہیں، کی اب کیا حیثیت ہوگی؟ کیا ان کے شاہکار کسی عجائب خانے کی زینت بن کے رہیں گے یا اس دور میں بھی ان کا کوئی عمل دخل ہوگا؟ کیا انکے معیار طاق نسیاں میں ڈالدئے جائیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ برعکس اسکے یہ سرمایۂ ادب ایران کی حیات ملی کا جزو رہیگا۔ نہ صرف ادب عالیہ کے صحیح نسخے بڑی کاوش سے مرتب کئے جا رہے ہیں بلکہ بہت سی فراموش شدہ تصنیفات کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ قدیم تصانیف کے بیشمار نسخے تدوین اور اشاعت کے منتظر ہیں۔ "سخن" کے ایڈیٹر آقائے خانلری نے کئی پرمغز مضامین سپرد قلم کئے ہیں جن میں اس نے قدیم اور جدید ادب کا موازنہ کیا ہے۔ اس نے آجکل کے بھونڈے ادبی مذاق اور غیر متعین معیار اور ادب عالیہ سے ناواقفیت کی سخت مذمت کی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم شاہکار ادب کے حرف آخر نہیں ہیں اور ان کے طرز فکر و بیان کی غلامانہ تقلید دور حاضر کے حقائق کے منافی ہے۔ اسکا یہ کہنا تو تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ عصر ماضی کے سب بڑے ادیب اپنے زمانے کے عوام کی زندگی اور افکار سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ کم از کم سعدی پر، جو اب بھی ایرانی فکر و دانش کا زندہ مجسمہ ہے، یہ اعتراض عائد نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس حد تک تو آقائے خانلری سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ زمانے نے ادیب اور قاری کے باہمی تعلق میں گہری تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ ایران میں تعلیم عامہ کے دس سالہ منصوبہ کے اجرا کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن پڑھے لکھوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اب ادیب اور قاری کے خیالات میں ہم آہنگی ضروری ہو گئی ہے۔ یہ سب صحیح، لیکن ان پڑھوں تک کیسے پہنچا جائے؟

ریڈیو اور سینما نے افکار، تفریح اور ثقافت کی تعلیم کی نئی راہیں نکالدی ہیں یہ بڑا انقلاب ہے۔ جو لوگ ڈرامے یا افسانے نہیں پڑھ سکتے وہ ریڈیو پر سن سکتے ہیں۔ اس سے ان کا شوق بڑھتا جائے گا۔

طہران ریڈیو اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں کھلا اور اب روزانہ ساڑھے آٹھ گھنٹے کا موزوں پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایران میں ریڈیو سٹ بہت ہی کم ہیں لیکن ریڈیو سننے کا شوق اسقدر بڑھ رہا ہے کہ سٹ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ جن ان پڑھوں کو ریڈیو سننے کا موقع نہیں ملتا ان کے لئے سینما ہے۔ اسوقت ایران میں چالیس ایک سینما ہیں جن میں سے زیادہ جدید قسم کے طہران میں ہیں اور بقیہ دوسرے بڑے بڑے شہروں میں۔ کوئی نصف درجن گاڑیاں جن میں سینما دکھانے کا سامان ہوتا ہے سال بھر دیہاتوں میں گھومتی پھرتی اور سینما دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ آذربائیجان ہی میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی ان سینماؤں سے مستفیض ہوتے ہیں؟ اور کرمان کی آبادی کا تو ایک تہائی حصہ سینما دیکھنے کے لئے آمڈ آتا ہے۔ سہ رنگے فلم "انگلستان کے باغات" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ریڈیو سے زیادہ فلم تعلیم عامہ کے لئے مفید ہو سکتا ہے اور ایران کی برٹش کونسل اور ایرانی حکام اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ایران میں انگریزی سیکھنے اور انگریزی کتب پڑھنے کا شوق عام ہو گیا ہے۔ طہران کے ایک کتب فروش سے معلوم ہوا کہ انگریزی رسائل بہت بکنے لگے ہیں۔ ان حالات سے پورا اور منظم طور پر استفادہ کرنا چاہیئے۔ انگریزی ادب کے شاہکاروں کے فارسی ترجمے شائع کرنا چاہئیں۔ کچھ ایرانی ادیبوں نے ترجمے کر بھی دئے ہیں۔ اگر ایرانی ادیب اپنے تخلیقی ادب کو ترجیح دیں اور نقالی کو ناپسند کریں تو بھی بہترین خارجی مصنفوں اور ان کے فنی طریقوں کا جاننا ان کو بیحد مفید ہوگا۔ حجازی جو سرتاپا ایرانی ادیب ہے انگریزی ادیب چارلس لیمب کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایرانی عورتیں کیا کرتی ہیں۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ عورتوں کے لئے بہت سے میدان کھلے ہیں۔ "تحریک نسواں" جو علیا حضرت ملکہ فوزیہ کی سرپرستی میں شروع ہوئی ایک منظم تحریک ہے۔ بقول ڈاکٹر رضازادہ شفق عورتوں کو معاشی، اخلاقی اور سماجی میدانوں میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ادب اور فنون کے میدانوں میں بھی وہ بہت کچھ کر سکتی ہیں اور جدید ایران کی مشہور شاعرہ پروین اعتصامی کے نقش قدم پر چل سکتی ہیں۔ طہران ریڈیو میں عورتیں بھی معلن کے فرائض ادا کر رہی ہیں اور عورتوں کے لئے ایک مخصوص رسالہ زیر غور ہے اور عنقریب جاری ہونے والا ہے۔ غرض، عورتوں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایران کو بہت سی سخت پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہ پریشانیاں یکایک رونما ہوئی ہیں اور اسوقت جبکہ ایرانی لیڈر اور ہندصنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جب وہ سیاسی، معاشی اور اصلاحی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہوں تو تخلیق ادب، نئے افکار اور نئے اسلوب اظہار کے مسائل کو طے کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن وقت، امن اور رواداری میسر آئے تو یہ سب مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ لیکن قرائن صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ نئی تحریک بڑھنے لگی ہے اسکے زندہ رہنے اور پھیلنے کے لئے نہ صرف داخلی قوت بلکہ باہری امداد کی بھی ضرورت ہے۔ خاک ماضی تو بھولی نہیں جا سکتی لیکن اب تو حال اور مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے اور قوت ایمان، جرأت اور خود اعتمادی کے ساتھ۔ پرنہ کوش اپنے ناول "ساز شکستہ" میں کہتا ہے :۔ (باقی صفحہ ۱۸ پر)

ایک سوال

(افسانہ)

جی۔ ایم۔ درّانی

اس دن بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ طبیعت کی یہ مارنگی کسی کل بیٹھنے بھی دے گی یا نہیں خیر کتنے سال ہوگئے ازدواجی زندگی بھی گذرتے ہوئے لیکن وہ جو ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے نہ آج ختم ہوتی ہے نہ کل کمی کیا ہے؟ کاش وہ یہی معلوم کرسکتی بس جیسے ساری دنیا سے بیزار۔ تھکی تھکی بدمزہ سی ——— ہنستی بھی تو اس طرح جیسے کوئی روتے کو گدگدا کر ہنسا رہا ہو۔

بقول دیکھنے والوں کے، بڑے بڑے سیٹھوں جیسی زندگی۔ آزادی بھی خاصی نصیب۔ کونسی چیز تھی جو شادی کے بعد اسے نہ ملی ہو۔ لیکن جب کوئی اسکے سامنے اسکے شوہر کی تعریف کرتا تو نہ جانے کیوں اس کا جی چاہتا کہ کمبخت کا منہ نوچ ڈالے۔ اپنے شوہر میں چُن چُن کر عیب نکالے اور اسقدر ملامت کرے کہ تعریف کرنے والے کا منہ بند ہو جائے ——— لیکن وہ اپنے گھٹتے ہوئے جذبات روک کر رہ جاتی۔ کیا وہ یہ سب کہہ کر کسی کی نظروں میں عزت حاصل کرسکے گی؟ دنیا تو اسے ہی برا کہے گی اور دنیا کی نظروں میں برے ہوکر جینا بھی دل گردے کا کام ہے۔ وہ بجھے بجھے دل سے تعریف کرنے والوں کا ساتھ ہی دینا بہتر سمجھتی اور اپنے بیقرار دل کو تسلی دینے کے لئے سوچ لیتی کہ انسان بہت سی باتیں اپنی مرضی کے خلاف کرنے پر بھی مجبور ہے۔ انہیں خلاف مرضی باتوں میں سے ایک شوہر کی تعریف ہے۔ سب کچھ سہی لیکن تنہائی میں تو اسے کمبخت نہ جانے کیا کیا ہونے لگتا۔ شادی سے پہلے کے تمام خیالات اسے گھیر لیتے۔ وہی خوبصورت خوبصورت چنبیلی کی ڈالیوں کی طرح لچکیلے نازک نازک خیالات جن میں کمسن محبوبائیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ وہ خیالات جن میں زندگی کا حقیقی گھر دراصل مفقود ہوتا ہے مگر جب وہ ان سہانے خوابوں سے چونکتی تو سوچنے لگتی کہ آخر وہ اسقدر اچھوتی رنگینیاں کیوں چاہتی ہے جو اسے ازدواجی زندگی میں نہیں مل سکتیں وہ بھی کیوں عام عورتوں کی طرح ہر حال میں خوش رہنا اور شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا نہیں سیکھ لیتی۔ کمبخت یہ بھی کوئی عادت ہے کہ ہزاروں مرتبہ بازار جانے پر بھی اس کا دل کچھ خریدنے کو نہ چاہتا۔ کوئی چیز اسے چاہے کتنی ہی پسند کیوں نہ آجائے لیکن وہ اسے خرید نہ سکتی۔ یونہی بس اسکا جی چاہتا کہ اس کی پسند اس کا شوہر خود کیوں نہیں سمجھتا —

بیوقوف ہے ——— احمق ہے۔ وہ جیسے اندر ہی اندر سلگ اٹھتی ——— ایک بار دو بار کیا ہزاروں بار یہی ہوتا۔ وہ دو دو دن کنگھی نہ کرتی صرف اس خیال سے کہ شاید اسے اُجڑا بکھرا دیکھ کر اس کا شوہر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر اپنی انگلیوں سے کنگھی کرکے اس سے پوچھے ——— اور گرم جوشی سے پیار کرکے کھینچے اور بڑے ہی مشفقہ انداز میں اسے بال سنوارنے پر مجبور کرے۔ لیکن اس کا شوہر تو بڑا ہی سیدھا سلجھا ہوا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے ——— پھر اسے اپنی بیوی کے خیالات میں پڑی ہوئی گتھیاں کیسے نظر آتیں۔

شوہر کی عدم موجودگی میں وہ بیٹھ کر سختی سے اپنی بچت کی رنگین خواہشوں کا احتساب کرتی۔ اپنے آپ پر جھنجلاتی۔ لیکن جیسے ہی اسکا شوہر اپنی آمد کی اطلاع موٹر کے ہارن سے دیتا، وہ پھر ایک دم چڑچڑا جاتی۔ اچھی خاصی بیٹھی بیٹھی کھٹ سے بستر پر گر کے تکئے میں منہ چھپا لیتی ——— پھر دہی خواہش کہ اس کا شوہر آکر اسے منائے، اسکے چاؤ چونچلے کرے مگر اسکے شوہر کو اتنی فرصت کہاں؟ وہ آتا اور اسے یوں پڑا دیکھ کر آہستہ پوچھتا کہ آج بیگم صاحب نے ٹانک پی یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ملتا تو وہ نہایت بجھے ہوئے لہجے میں کہتا: "تمہیں دوا سے نفرت ہے اور صحت ہے کہ گرتی ہی جاتی ہے ہر وقت گری گری سی رہتی ہو۔ اچھا آج تم فلاں ڈاکٹر کو بلاکر دکھاؤ۔"

وہ تلملا کر اٹھ بیٹھتی۔ طبیعت اور بھی چڑچڑا جاتی۔ مگر یہ سب سمجھنے کی اسکے شوہر کو فرصت کہاں تھی۔ وہ ایک بڑا عہدے دار تھا۔ وہ اسے اٹھتا دیکھ کر کہتا! "لیٹی رہو، خانساماں کھانا کھلا دے گا۔ مجھے جلدی ہی جانا ہے۔" وہ کھانا کھا کر پھر چلا جاتا اور وہ گویا اپنی بوٹیاں نوچتی رہتی۔ وہ سوچتی کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں جہاں دولت ہوگی وہاں محبت مر جائیگی ——— کاش اس کی شادی کسی غریب آدمی سے ہوئی ہوتی۔ اور ایک دن ———

شادی تو نہیں ہاں اسے ایک غریب سے آدمی سے محبت ہوگئی۔ وہ غریب آدمی ایک بدقسمت ادیب تھا عرفانی۔ وہ اسکے شوہر کا دوست تھا ——— اسے وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا جب کہ پہلی مرتبہ اسکے شوہر نے عرفانی سے اسے ملایا تھا۔

"آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔" اس نے رسماً کہا۔ "مگر محترمہ!" عرفانی نے جواب دیا۔ "میں یہ کہنے سے معذور ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر کسی قسم کی خوشی یا غم ہو۔ ہوسکتا ہے آئندہ چل کر آپ میری مسرت یا غم کا باعث ثابت ہوں؟" وہ بڑی لاپرواہی سے مسکرا رہا تھا۔ اور وہ اس کی صاف گوئی پر کچھ پریشان سی ہوگئی تھی۔

"بیگم! چائے تو پلاؤ عرفانی کو۔ اپنے دوست ہیں۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" اس کے شوہر نے کہا۔

وہ چائے بنا رہی تھی کچھ کھوئی کھوئی سی۔ کبھی کبھی نیچی نظروں سے

اسے دیکھ بھی لیتی معمولی شکل و صورت کا نوجوان۔ دیکھنے میں کوئی خاص بات بھی تو نہ تھی اس میں لیکن پھر بھی وہ اس سے مرعوب تھی۔ شاید اس کی آنکھوں سے۔ تھیں بھی تو کچھ عجیب سی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی مایوس آنکھیں — بالکل ویسی ہی جیسی اسے اپنی آنکھیں آئینے میں نظر آتی تھیں۔ وہ بے خیالی میں پیالی میں شکر گھولے ہی جا رہی تھی۔

"چائے میں اسقدر شکر حل کر دینے سے زندگی کی تلخی تو نہیں کم ہو سکتی" عرفانی نے کہا۔ اس کا اشارہ شاید اپنی ہی طرف تھا۔ لیکن ہو بہو یہی کیفیت اس کی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے پر اسکے بہت قریب ہو گئی۔ اسے یہ معلوم کر کے بڑا ہی سکون سا محسوس ہوا کہ عرفانی اسکے گھر پر کچھ دن رہیں گے، جب تک وہ اپنی ماں بہنوں کو نہ بلا لیں۔

اس کا چڑچڑا پن کم ہوتا جا رہا تھا بس یہی جی چاہتا کہ دن بہت طویل ہو جائیں۔ اسکا شوہر یونہی باہر رہے اور وہ عرفانی کے پاس بیٹھی رہے۔ وہ اس کا کسقدر ہم خیال تھا۔ جب وہ باتیں کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ عرفانی اسے بھی پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا! "بغیر محبت کے انسان کیسے جیتا ہے؟" تو اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے شوہر کی شکایتیں کرتے ہوئے اپنا چہرہ اسکے سینے میں چھپا کر چیخ اٹھے۔ "بالکل ٹھیک ہے" مگر وہ ڈرتی کہ عرفانی اسے بری عورت نہ سمجھ لے اور وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی۔

وہ کنگھی کرتی ہوتی تو عرفانی اس کے بالوں کے پیچ و خم کی تعریف بے جھجک کر جاتا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ بازار جاتی تو نہ جانے کیسے عرفانی اس کی نظروں ہی سے پہچان جاتا کہ وہ کیا چیز پسند کر رہی ہے۔ اور وہ ایک دم کھل کر جیسے مرجھانے لگتی۔ عرفانی اس کا آئیڈیل ہے۔ لیکن وہ شوہر والی ہے۔ وہ جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھتی۔ دل کی آنچ بڑھ جاتی اور وہ اپنے جذبات کی آندھی کو دبانے کے لئے عرفانی کے آرام و آسائش پہنچانے میں اور بھی سرگرم ہو جاتی۔ اپنے آپ پر ملامت کرتی۔ اپنے آپ کو دنیا سے ڈراتی۔ لیکن دل کی آگ کم نہ ہوتی۔ عرفانی کو دیکھتے ہی اس کا جی چاہتا کہ وہ کہہ دے کہ تم میرے آئیڈیل ہو۔ اور اس دن وہ یہی کہنے والی تھی۔ ریڈیو پر وائلن بج رہا تھا اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چند لمحوں سے خاموش بیٹھے تھے۔

"سنئے! آپ —" وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ عرفانی کی آنکھیں چند لمحوں کے لئے چمک اٹھیں۔

"جی!" اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

"آپ آپ —" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "آپ شادی کر لیجئے۔"

اور وہ دونوں اس غیر متوقع بات سے حیران رہ گئے۔

"کس سے؟"

"کسی سے بھی، میں کرا دوں گی آپ کی شادی" اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے — پھر نہ جانے کیسے عرفانی اس کے قریب آ گیا۔ بہت قریب۔ اس نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دی — دو مہینے جو اس نے کشمکش میں گذارے تھے ان کا تجزیہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جس سے کہے گی اس سے وہ شادی کرے گا۔

قربانی کا نشہ بھی بڑا تیز ہوتا ہے — وہ اپنے آئیڈیل کو حاصل نہ کر سکی تو کیا ہوا۔ وہ اسے کامیاب زندگی بسر کرنے میں مدد دے گی۔ اس نشے کے تحت اس نے اپنی ایک پڑھی لکھی خوبصورت سہیلی کو

غزل

روش روش پہ جنوں کے آگے خرد کی ظالم مقام کب تک
جھکی جھکی سی نظر کہاں تک، رکا رکا سا خرام کب تک

یہ احتیاطِ کرم کہاں تک، یہ زحمتِ گام گام کب تک
نفس نفس میں پیام کب تک، نظر نظر میں سلام کب تک

رکی سی آہیں، جھکی نگاہیں، وہی حقیقت، وہی فسانہ
سکوت تیرا سکوت کب تک، کلام میرا کلام کب تک

یہ بندگی ہے تو بندگی کا فریب رسوائے عام کب تک
لبوں پہ صبحیں تو ہیں مسلّم، مگر سبوؤں میں شام کب تک

حدودِ دیر و حرم سے باہر بھی تیری نظر کی ہے ضرورت
سجود میں سر جھکانے والے، یہی ہے سودا تو خام کب تک

ترے لئے ہے نہ تیرے دھارے تری ہلاکت نہیں تو کیا ہے
ترے سفینوں سے ساحلوں پر یہ موج کا انتقام کب تک

یہی جمالِ گل و سخن ہے، تو اس چمن سے دھواں اٹھا دیں
روش روش پر کھچے رہیں گے یہ لالہ و گل کے دام کب تک

سر دستِ طوفاں پہ آشیانہ، نہ بجلیوں پر کمند تیری
یہی چمن ہے، تو اس چمن میں ترے نشیمن کا نام کب تک

سنو! نگاہیں چرانے والے! زمانہ آواز دے رہا ہے؟
رہیں گی ظالم تری نگاہیں، غریقِ مینا و جام کب تک

نہ نور تیرا، نہ آگ تیری، رباب ٹوٹے، شراب چھوٹی،
یہ ذلتِ انجمن کہاں تک، یہ تہمتِ جامِ جام کب تک

اگر نہ برہم ہوں اہلِ محفل، تو اہلِ محفل سے شورؔ پوچھوں
کوئی بتا دے کہ میرے ہونٹھوں پہ اس کا نغمہ حرام کب تک!

شورؔ (علیگ)

عرفانی کے لئے منتخب کیا اور کوشش کر کے ان دونوں کی شادی کرادی۔

اب وہ خواہ مخواہ اپنی سہیلی سے جلنے لگی اندر ہی اندر —— اسے اپنی سہیلی سے حسد ہوتا۔ اس شادی کو وہ اپنی غلطی سمجھتی۔ اس کے باوجود کہ عرفانی اب بھی اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ بسر کرتا تھا —— وہ سوچتی کہ سماج کے بندھن ایسے کیوں ہیں کہ وہ اپنی پسند کی چیز نہیں حاصل کر سکتی ——

لیکن ایک دن اسکے دل کی یہ آگ اس طرح بجھ گئی جیسے چراغ کو کسی نے پھونک ماردی ہو۔

اس کی سہیلی بستر پر پڑی رو رہی تھی کہ وہ پہنچ گئی اور جیسے لڑکھڑا کر رہ گئی۔

اس کے آئیڈیل کی بیوی بھی کیا اسی طرح تکیوں میں منہ چھپا کر رو سکتی ہے؟

"فاطمہ!" اس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پکارا۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو میری جان"

"نسرین!" وہ زور سے ہچکیاں لینے لگی۔

"آخر فاطمہ کچھ کہو گی بھی" وہ بیتابی سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہوں میری تو قسمت پھوٹ گئی اس کنگال سے۔ اسے میرے جذبات کی ذرا بھی پروا نہیں۔ بس ہر وقت پیسہ کمانے کی فکر میں کہانیاں لکھا کرتا ہے۔ رات کے دو دو بجے تک میرے سر پر لائٹ رکھتا ہے اور میں بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی ہوں۔ آخر کوئی کب تک صبر کرے۔ اگر وہ مجھے آرام نہیں دے سکتا تو کیا محبت بھی نہیں دے سکتا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فاطمہ رو رہی تھی۔ اسکے آئیڈیل کی بیوی۔ وہ بھی اس کی طرح پیاسی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا عورت کو صرف محبوبہ ہونا چاہئے تھا بیوی نہیں؟ ۔

*

کچھ ایران کے بارے میں: —— بقیہ صفحہ ۱۴

"آزادی ذریعہ نجات اسوقت ہو سکتی ہے جب اسکا رخ مستقبل کی طرف ہو نہ کہ ماضی کی طرف، عمل کی طرف نہ کہ یاد ماضی کی طرف، جوش اور انقلاب کی طرف نہ کہ احتیاط اور سلامتی کی طرف"

بیشک جوش اور انقلاب۔ انقلاب سے زیادہ جوش۔ ایران میں انقلاب تو ہو رہا ہے — باطنی نہ کہ ظاہری۔ اب ایران اڑان کے لئے تیار ہے۔

غزل

وفائیں جتا کر انہیں کیا بلائیں!
وہ مختار مطلق ہیں آئیں نہ آئیں!

نئی شان ہر آن ہی اللہ اللہ!
دو عالم بہ دامن ہیں انکی ادائیں

شب و روز پھیرا ہے جنکی گلی میں
جھلک سی کہیں ان کی ہم دیکھ پائیں!

ادھر کہیں ادھر پھیر لیں مست آنکھیں
پلاتے پلاتے مجھے۔ رک نہ جائیں

بھلا میں اور ان کی توجہ کا مرکز
بھری بزم میں شوق سے وہ ستائیں۔

یہ دل مجھکو منظور ہے ان کی خاطر
کریں جو بھی چاہیں وہ اپنی جلائیں

میسر ہے جب ہم کو ان کی حضوری
امیں! کیوں خوشی کے ترانے نہ گائیں

امین حزیں

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔
"نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں وصول ہونی چاہئیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔

(ادارہ)

وسط ایشیا کے چند فنکار

ابرار ہدایت — ایک ازبک اداکار

(۴)

ابرار ایک ازبک ایکٹر ہے اور اسکی ڈرامائی صناعت کے اعتراف میں سودیٹ یونین کا خطاب "صناع عوام" ملا ہوا ہے۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ ابرار صحیح معنوں میں عوام کا بیٹا ہے۔ اور تاشقند کے حمزہ تھیٹر میں ابرار کا اوتھیلو اور ہیملیٹ پیش کرنا ازبکستان کی ثقافتی زندگی کا ایک خاص اور اہم واقعہ تھا۔ ابرار کا صناعانہ جوہر ان ڈراموں کے پیش کرنے ہی سے منظر عام پر آیا۔

ابرار کا باپ تاشقند میں معماری کا کام کرتا تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور خوش باش آدمی تھا۔ اسکا دستور تھا کہ اپنا کام ختم کرکے چائے خانے میں جا بیٹھتا اور وہاں "اسکیا" (ASKIA) یعنی ازبک پھبتی یا ضلع جگت کا کھیل ہی اس کی تفریح کا مشغلہ تھا۔ وہ اس فن میں استاد مانا جاتا تھا۔ داد بھی دل کھول کر ملتی تھی اور داد ملنے سے اسکی طبیعت اور بھی جولانی پر آتی تھی۔ چائے خانے میں بیٹھنے والے خورد و نوش سے اس کی تواضع کرتے اور وہ سب کا غم غلط کیا کرتا۔

نو سال کی عمر ہوئی تو ابرار نے باپ سے کہا کہ "میں پڑھنے جاؤنگا؟"

فقرہ باز باپ مسکرایا اور کہنے لگا:-

"کیوں نہیں بیٹا! مگر یہ کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی چھوٹا موٹا دفینہ ملے یا تمہارا استاد فیس طلب نہ کرے۔"

ظاہر ہے کہ دونوں باتیں انہونی تھیں۔ چنانچہ ابرار نے خود ہی راہ نکالی۔ اس نے ایک امیر آدمی خواجہ خاں کے ہاں جھاڑو بہارو، اٹھایا دھری اور مویشیوں کی گہبانی کی نوکری کر لی۔ اسے دو روبل مہینہ ملتا تھا، وہی وہ اپنے استاد کو دیدیتا تھا۔ اس قسم کی نوکری کرکے ابرار پڑھنے کے لئے وقت بھی نکال لیتا تھا۔ یہ نوکری چھوٹ جانے کے بعد وہ ایسی ہی دوسری نوکریاں کرتا، استاد کا مہینہ دیتا اور پڑھتا رہا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں پہلے پہل تاشقند میں سب سے پہلا ازبک تھیٹر "توران" وجود میں آیا۔ ورنہ اس سے پہلے ازبک لوگ تھیٹر کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ اس ذیل میں بیت بازی، سوانگ بھرنا، مداری کے کھیل اور کٹھ پتلی کے تماشے کا رواج تھا۔

ایک دن ایک خاص واقعہ پیش آیا جس نے ابرار کے مستقبل پر مہر لگا دی۔ ابرار اسوقت ڈراما ایکٹنگ کی ایک کلاس میں شریک تھا جسے توران تھیٹر کے ایکٹر وغیرہ تعلیم دیتے تھے۔ تھیٹر کا منیجر ایک ڈراما "ضحاک ماران" پیش کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے تھیٹر کے منظر کے لئے کچھ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسنے ان ایکٹروں سے کہا جو اس کلاس کو تعلیم دیتے تھے، اور انہوں نے چند لڑکے منتخب کئے جن میں ایک ابرار بھی تھا۔

اس طرح ابرار پہلی بار صحیح معنوں کے اسٹیج پر آیا۔ تھیٹر کی طرف سے اسے ایک چھ صفحے کا رسالہ دیا گیا۔ اس میں اسکا پارٹ درج تھا۔ یہ پارٹ ابرار نے کوئی غلطی کئے بغیر نہایت خوبی سے ادا کیا۔ تھیٹر کے منیجر انفور نے جسے اب ازبک جمہوریہ کی طرف سے "صناع عوام" کا خطاب بھی حاصل ہے۔ ابرار کا کام دیکھکر اس کو تھیٹر میں مستقل کر لیا۔

کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ابرار کا تعلق ازبک اسٹیٹ ڈراما تھیٹر سے ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں سول وار شروع ہو گئی۔ اسوقت ابرار ایک ایکٹر بھی تھا اور سرخ سپاہی بھی۔ ترکمان فوجی افسر اعلیٰ نے ابرار کو ایکٹروں کی ایک جماعت کے ساتھ فرغانہ کے محاذ پر بھیجدیا جہاں اس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ابرار اور اس کے ساتھی سرخ فوج اور چھاپہ مار دستوں کے لئے ڈرامے کھیلتے اور وقتاً فوقتاً انقلاب دشمن بساچیوں سے بھڑپ بھی لے لیتے تھے۔

ایک موقعے پر ابرار کی پارٹی ایک ڈراما کر رہی تھی اور یہ ڈراما جنگ کے ہی موضوع پر تھا۔ اس میں بندوقیں وغیرہ بھی چلتی تھیں اور نعرے وغیرہ بھی لگائے جاتے تھے۔ تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ اچانک بندوقوں کی آوازیں بہت زیادہ ہو گئیں اور ساتھ ہی "بساچی!" کا نعرہ بھی سنائی دیا۔ تماشائی اور ایکٹر دوڑ پڑے اور دغا باز بساچیوں سے جنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسوقت طرفین کے اتفاق سے عارضی طور پر جنگ ملتوی کر دی گئی تھی اور قلعے کی حفاظت کے لئے ایک مختصر دستہ مقرر کر دیا گیا تھا مگر مضابین بیگ کی سرکردگی میں قلعے پر اسوقت حملہ کر دیا گیا۔ جب سرخ سپاہی ڈراما دیکھنے میں مشغول تھے۔

ابرار اسوقت ایک بے (زمیندار) کا پارٹ کر رہا اور اسی سلسلے کا لباس فاخرہ پہنے تھا۔ سر پر امیرانہ دستار اور بر میں ریشمی خلعت کے ساتھ مونھ پر ایک ریش دراز بھی لگی ہوئی تھی۔ ابرار جب اسٹیج کے پیچھے پہنچا تو ایک قباحتی دو عورتوں کو دھمکا کر ان کا زیور اتروا رہا تھا۔ عورتوں نے ابرار کو دیکھا تو پناہ کی خاطر اسکی جانب لپکیں۔ وہ بساچی ابرار کے لباس اور میک اپ کے دھوکے میں آگیا اور اسے اپنا حامی تصور

ل۔ احمد

کرکے پوچھنے لگا۔

"باواجان، سرخ سپاہی کدھر ہیں؟"

یہ ڈرامائی موقعہ ابرار کے لئے مفت کھو دینا دشوار تھا۔ اس نے ایکڑی انداز سے عبا کا گریبان کھول دیا اور اندر سے سرخ سپاہی کی وردی دکھا کر دبنگ آواز میں بولا:-

"کتے! ایک تو تیرے سامنے کھڑا ہے!"

بسماش نے خنجر سوت لیا مگر ابرار کی انگلیاں تمنچے کے گھوڑے پر پہلے حرکت میں آگئیں۔

سول وار ختم ہوگئی تو ابرار پھر اپنی تعلیم اور مطالعے میں منہمک ہو گیا۔ اسکی بڑی خواہش تھی کہ وہ ماسکو کی تھیٹری صناعت کے ماہروں سے ملے۔ اسکی یہ خواہش ۱۹۲۴ء میں پوری ہوئی اور وہ ماسکو کے ازبک ڈرامائی اسٹوڈیو میں داخل کر لیا گیا۔ وہاں اس نے تین سال تعلیم پائی اور روسی تھیٹری صناعت کے ماہر چیٹکارر پروڈیوسر میخرایدا بیکواس معارزادے کو فن ایکٹری کے راز بتاتے سکھاتے رہے۔ اور حق یہ ہے کہ ابرار نے اپنے استادوں کا نام روشن کیا۔

تعلیم مکمل کرکے جب وہ اپنے وطن تاشقند واپس پہنچا تو بہت سے ازبک اور غیرملکی ڈراموں میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جن کلاسیکی ڈراموں کی پیشکش میں ابرار نے نام پیدا کیا۔ ان میں گوگول کا "انسپکٹر جنرل" اور غازی کا "شہزادی توران داد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حمزہ تھیٹر نے ۱۹۳۵ء میں تھیٹر کی پندرھویں سالگرہ پر شکسپیئر کا ڈراما ہیملیٹ پیش کرنے کا طے کیا تو ہیملیٹ کا کردار ابرار کو دیا گیا۔ یہ واقعہ ابرار کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ وہ فطرتاً جوشمند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا پارٹ سمجھنے میں ہمہ تن منہمک ہوگیا گھر میں اور گھر سے باہر سونی سڑکوں اور راستوں پر اپنا پارٹ دہراتا اور اپنے کردار کی فطرت کی گہرائیوں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی طبیعت کی نزاکتیں سمجھنے کی جستجو میں منہمک تھا اکثر ایسا ہوا کہ اسٹیج پر کوتاح کے کونے میں پڑھتے پڑھتے سو گیا ہے اور صبح کو لوگوں نے آکر اٹھایا ہے۔

ابرار کی اسٹیج کی زندگی میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کی بیوی سارہ ایشان توراتی بھی ایکٹریس ہے اور اسی تھیٹر میں کام کرتی ہے۔ بالعموم یہ دونوں ساتھ کام کرتے ہیں اور ہیرو ہیروئین کے کردار سمجھنے میں آپس میں بحث و تکرار بھی کر لیتے ہیں

اس کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابرار ہیملیٹ اور اوتھیلو کو ایک نئی کرداری قوت دیکر اور ہاہامات لبریز شخصیت بنا کر پیش کر سکا۔ اس کے بعد ابرار کی صناعت کا سکہ جم گیا اور مان لیا گیا کہ اسکا صناعتی مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

تاشقند کے حمزہ تھیٹر کو ماسکو سے دعوت آئی اور ماسکو میں ابرار نے شکسپیئر کے مشہور عالم کرداروں کو جب اپنی تعبیر اور تفہیم کے ساتھ پیش کیا تو ماسکو کے نقاد دان فن اس کے کمال کی داد دینے میں سرخ زبان تھے۔

اوتھیلو کے کردار کا ایکٹنگ ابرار کا بانو اواں ہیرو ایکٹنگ تھا۔ اس کردار کو پیش کرنے میں خود ابرار کی منور فطرت اور پختگی طبیعت سمو گئے تھے۔

اس پیشکش کی کامیابی میں ازبکستان کے محبوب ترین شاعر غفور غلام کا بھی ہاتھ تھا۔ ازبک زبان میں شکسپیئر کو منتقل کرنے میں غفور غلام نے بھی اپنا ادبی کمال دکھا دیا ہے۔

جس رات اوتھیلو پہلی مرتبہ پیش کیا جانے والا تھا۔ اس دن تاشقندی اخبار کے ایک نمائندے نے ابرار سے ملاقات کی تو ابرار نے اوتھیلو کے کردار کی تعبیر کے ذکر میں بتایا کہ:-

"میرے خیال میں اوتھیلو کی فطرت کو سمجھنے کی کنجی خود اوتھیلو نے بتادی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میری بیوی حسین ہے، کھانا عمدہ کھلاتی ہے، صحبت احباب کی شائق ہے، گفتگو میں آزاد ہے، گاتی خوب ہے، کھیلتی خوب ہے اور رقص بھی خوب کرتی ہے، یہ باتیں سنکر میرے اندر رقابت کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ بلکہ یہی باتیں اس کی باعصمتی کی ضامن بن سکتی ہیں"۔ دوسرے موقعے پر اوتھیلو کا یہ قول کہ شک کرنے سے پہلے میں دیکھنا چاہونگا اور شک ثبوت کے ساتھ کروں گا اور جب ثابت ہوجائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ محبت رہے گی نہ رشک و رقابت۔

"بھروسے میں دغا پانا اور بے آبرو ہو جانا، یہ دو ایسی باتیں ہیں جنکا ڈنک موت کی سوئی ہی نکال سکتی ہے"۔

"رچرڈ بوربیج شکسپیئر کا دوست بھی تھا اور اس کے ڈراموں کا پہلا ہیرو ایکٹر بھی۔ اس نے اوتھیلو کو ایک "فہمیدہ مور" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ میں نے بھی اسی نوعیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابرار ہدایت اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

رات میں آسمان کے نیلے پس منظر پر دو پرچھائیاں نظر آتی ہیں:- ایک کے جسم پر چست شلوکہ، پاؤں میں لانبے چرمی بوٹ اور سر پر ایک ہیٹ ہے جس میں ایک پر بھی لٹکا ہوا ہے یہ آیٔگو ہے۔ دوسری پرچھائیں ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے اور عمامہ باندھے ہے یہ اوتھیلو ہے۔ یہ دونوں زینے پر سے آہستہ آہستہ اتر رہے ہیں۔ اوتھیلو کا انداز پرسکون اور اعتماد انگیز ہے، جیسے کوئی فتحمند فوجی کا ہوتا ہے۔ اس کے اسوقت کے انداز میں ایسی کوئی بات یا اشارہ نہیں ملتا جس سے پتا چلے کہ تھوڑی دیر میں غیظ و غضب کا ایک طوفان

اُبل پڑنے والا ہے۔ اُس کی نظریں ڈیسڈیمونا کے مسکن پر قائم ہو جاتی ہیں، اور ان نظروں سے نرمی و لطافت اور احسان و محبت ٹپکی پڑ رہی ہے۔ اوتھیلو آئیگو سے باتیں کر رہا ہے مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخاطب صحیح ڈیسڈیمونا ہے، حالانکہ وہ اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

اسی سین میں کاسیو اسکو بتاتا ہے کہ ترکوں کے بیڑے پے بہ پے بارہ بیڑے بھیجے ہیں۔ یہ سنکر اوتھیلو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اس کے چہرے مہرے سے کسی قسم کی فکر یا پریشانی کا قطعی اظہار نہیں ہوتا۔ انداز سے وہ یہ سوچتا معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"برابانشیو سے میرا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ وہ کیسی ہی کینہ وری سے کام لے، میں نے سگنوری کی جو خدمت کی ہے وہ اسکی بدگوئی کا مونہہ بند کر دے گی!"

ان موقعوں پر ابرار نے اپنے ایکٹنگ سے اوتھیلو کے کردار کی نئی تعبیر کی ہے۔ اس وقت جب ابرار کا اوتھیلو برابانشیو کے نوکروں اور اپنے ساتھیوں کی تکرار رد کر دیتا ہے تو اوتھیلو کی آواز میں ایک عجیب طاقت پوشیدہ محسوس ہوتی ہے، وہ ان سے کہتا ہے:۔

"ہاں، اپنی تلواریں بلند رکھو تاکہ شبنم انہیں زنگ آلود کر دے۔" یہ موقعہ ہوتا ہے جب ابرار تماشائیوں کے دل میں اس مور کے کردار کی عظمت بٹھا دیتا ہے۔

پھر جب اوتھیلو سینیٹ کے سامنے تقریر کرتا ہے تو ابرار کی شخصیت کا جادو ہر تماشائی کو محسوس ہونے لگتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو ڈیسڈیمونا سے اپنی محبت کی داستان سناتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ محبت کی ان گھڑیوں کو پھر سے جی رہا ہے اور جب وہ ختم کرتا ہے تو اس کے آخری لفظوں میں ظفرمندی کی گونج ہوتی ہے، مردانہ وار عزم کی کھنک ہوتی ہے۔

اور پھر جب ڈیسڈیمونا اپنے دوگانہ فرض کی طرف اشارہ کرکے حق شوہری کو مرجح بتاتی ہے تو ابرار کے اوتھیلو کا احساس فخر و ظفر اس کے سیاہ چہرے کو دمکا دیتا ہے۔ اس موقعے پر ابرار کا اظہار اس درجہ حقیقی و فطری ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اس مور کی سادہ فطرتی اور خلوص کا معتقد ہو جاتا ہے۔ ابرار کا اوتھیلو صرف محبت کرنے والا ہی نہیں بلکہ ایک بھروسا کرنے والا اور سادہ فطرت انسان بھی ہے۔ اوتھیلو کی آتش دلپسند فطرت، ابرار کی تعبیر کے مطابق، دوسرے ایکٹ میں ظاہر ہوتی ہے۔

محل کے اندر سے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے اور اوتھیلو اندر داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے "کیا معاملہ ہے؟" اس کے یہ لفظ سکون آمیز سوال کے لفظ ہیں۔ لیکن ابرار کا اوتھیلو کمرے کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی برغضب ہو چکا ہے۔ اس کے اندر جو سکون و سنجیدگی تھی وہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی غائب ہو چکی ہے۔

چنانچہ وہ جب کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے قدم تیزی سے اٹھتے اور بھاری پڑتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ سکون میں خلل ڈالنے والا ضرور سزا پائے گا۔

ابرار کی یہ تعبیر کہ اوتھیلو اچانک طور پر نہایت پرغضب ہو سکتا ہے اور کاسیو پر اس کے الطاف و عنایات دفعتاً بھلائے جا سکتے ہیں۔ اوتھیلو کے کردار کا نیا پہلو ہے۔

اسی ڈرامے کا تیسرا ایکٹ ایک ایکٹر کے لئے مشکل ترین ایکٹ ہے۔ اس ایکٹ میں شک و یقین کی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور اوتھیلو فریب و اتہام کی عیارانہ چال میں آ جاتا ہے۔ یہ مشکل ترین ایکٹ ہی ابرار کی کامیابی و شہرت کا سبب بنتا ہے۔

آئیگو بظاہر معصومانہ انداز میں ڈیسڈیمونا سے کاسیو کی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ابرار کا اوتھیلو بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اوتھیلو کی صحیح فطرت غصے پر غالب آ جاتی ہے اور وہ مزاحی انداز میں باتیں کرنے لگتا ہے، اگرچہ اس کے ہاتھوں کا نچلا نہ رہنا اوتھیلو کے اندرونی ہیجان کی علامت ہے۔ وہ نہایت اعتماد آمیز لہجے میں سوال کرتا ہے:۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں رشک و رقابت کی زندگی اختیار کروں گا؟"

لیکن رفتہ رفتہ آئیگو اوتھیلو کے اندر اندھی قسم کے جذبۂ رقابت کو ابھار دیتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو بغلوں میں ہات دبا کر آئیگو پر نظر جمائے ہوئے ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک اُڑتی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ کیونکہ اس کو یقین نہیں آتا کہ اس کی بیوی بیوفائی کرے گی۔ لیکن عقل و دلیل کا یہ اظہار آخری اظہار ہوتا ہے۔ رشک کا احساس شدید تر ہوتا جاتا اور عقل کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اندر ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے ہاتوں کو دیکھکر کہتا ہے کہ "میں کالا ہوں" تو لہجے سے کمتری و فروتنی کا احساس ٹپکتا ہے۔ یہ گویا اعتراف گناہ تھا۔ وہ پھر سوچتا ہے کہ اس بے وفائی کا کوئی جواز سمجھ میں آ جائے۔ وہ تماشائیوں کی طرف پیٹھ کرکے خود کلامی (آپ ہی آپ باتیں کرنا) کرنے لگتا ہے تو اس کے خیالات تلخ اور محسوسات عقوبت ناک ہوتے ہیں۔ جب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے تو پہلے رنج و ملال کا اظہار ہوتا ہے اور پھر اچانک غیظ و غضب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر یہ شدید قسم کی روحی اذیت اسے اپنی قوت کا علم و احساس کرا دیتی ہے:۔ یعنی وہ ایک عزم کر لیتا ہے۔ یہ عزم ایک ایسا بوجھ ہے کہ اسکا سر کوچ کے تکیے پر ٹک جاتا ہے۔

ڈیلیٹر یونا سے گفتگو کرنے میں ابرار کے اوتھیلو کا ایک بنیادی وصف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی کی بیوفائی کا صدمہ ایسے مضبوط آدمی کو بالکل پامال و دل شکستہ بنا دیتا ہے۔ بیوی سے سوال و جواب کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ اوتھیلو اس دردناک جستجو میں ہے کہ بیوی الزام سے انکار کرے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ اپنے معاملے کی قوت سے ہی ڈیسڈیمونا کو دیوار سے بھڑا کر پیس دینا بھی چاہتا ہے۔

آئیگو کے الفاظ میں زہر ملا ڈنک تھا جسکے اثر نے اوتھیلو کے غیظ و غضب کو اس نقطے پر پہنچا دیا ہے کہ اوتھیلو غافل یا بے حواس ہو جاتا ہے۔

پیش کشی کی پہلی رات کو جب ابرار اسطرح غافل ہو کر گرا تو اسکا ہاتھ بے ڈھب طور پر اسکے بدن کے نیچے دب گیا۔ یہ ایکٹنگ اسدرجہ فطری و حقیقی تھا کہ تھیٹر کا ڈاکٹر جو تماشائیوں میں بیٹھا تھا اسنے سمجھ لیا کہ ابرار دو فورِ جذبات کی تاب نہ لا سکا اور اسکی موت واقع ہو گئی۔ چنانچہ وہ بے تحاشا دوڑ کر اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔

ابرار کا اوتھیلو اس ٹریجڈی کے آخری حصے میں اتنا بے حال و شکستہ پر ہو جاتا ہے کہ آنکھوں میں چمک نہیں رہتی۔ آواز بھرا جاتی ہے، ہاتھ پاؤں کی حرکات سست اور ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اسکا آخر وقت ہے۔

تھیٹر سے نکلتا ہوا تماشائی اوتھیلو کی ٹریجڈی کی جو تعبیر از یکستانی مناع عوامی ابرار نے کی ہے اسکے اندر کھویا ہوا ہوتا ہے۔

اُردو تنقید کا پس منظر

ابواللیث صدیقی

آرٹ مہذب انسانوں کے اجتماعی فعل کا نام ہے خواہ اس کا اظہار نقش و نگار کی صورت میں ہو یا صوت و نغمہ کے پردہ میں، اس لئے آرٹسٹ یا فنکار اپنی فنی تشکیل کے لئے اپنی ذات کے علاوہ کسی حد تک دوسرے اپنے جیسے انسانوں کے وجود کا محتاج ہے جو اس کے فن کو دیکھیں اور سمجھیں، ان کی تعریف و تحسین سے اس کی ہمت بڑھتی ہے، کام کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور فن کی معراج تک رسائی کا ولولہ باقی رہتا ہے۔ اگر اس کے تخلیق کئے ہوئے نمونوں میں کچھ خامی ہوتی ہے تو تنقید و تبصرہ اسے اپنی اصلاح اور آئندہ عادت پر مائل کرتا ہے۔ اس طرح ناقد کا وجود آرٹ کی ترقی کے لئے ہمیشہ ضروری ہے۔ قدیم تاریخ سے صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اگر فن کار یا آرٹسٹ کے کام میں دلچسپی لینے والے اور اسے اچھا سمجھنے والے موجود نہ ہوتے تو یقیناً وہ آرٹسٹ کو جماعت کا عضو معطل سمجھ کر زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیتے کیونکہ ترقی کے اس ابتدائی زمانہ میں کسی بیکار چیز کے رہنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

اس وقت ہمیں آرٹ یا فن کے صرف ایک شعبہ یعنی شعر و ادب اور اس کی تنقید سے بحث ہے۔ ہر سوسائٹی کا ادب اس کے خاص رجحانات اور زندگی کے متعلق اس کے خاص تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا اور مستقبل کو خود متاثر کرتا ہے۔ ناقد بھی اسی ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی اسی ماحول میں بیدار ہوتی ہیں۔ زندگی اور اس کے ساتھ شعر و ادب کی قدریں کچھ تو اسے ورثہ میں ملتی ہیں اور کچھ خارجی اور داخلی اثرات کے ماتحت خود قائم کرتا ہے لیکن ماحول کا نقش اس کے ہر تصور پر اپنی مہر لگا دیتا ہے اس لئے جس طرح کسی ادب کا مطالعہ بغیر اس عہد کے ذہنی اور سماجی پس منظر کے پیش نظر ناقص اور نامکمل رہتا ہے اسی طرح تنقید کے تصورات، خاص اقدار اور تنقید کی ارتقا کے مسائل بغیر اس پس منظر کے بیان نہیں کئے جا سکتے اس لئے اردو تنقید کا جائزہ لینے والے کے لئے اس عہد کی سماجی حالت، شخصی حکومت اور اس کا اثر، سیاسی انقلابات اور ان کے اثرات، خاص حالات میں خاص اصناف کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

آئیے سب سے پہلے سماجی حالات کا جائزہ لیجئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تو ایران و افغانستان سے آنے والے امیروں اور لشکریوں نے اپنے سماجی تعلقات اسی ملک کے باشندوں سے استوار کر لئے۔ یہیں وہ اپنا وطن بنا کر آباد ہوئے اور شادی بیاہ کر کے ایک ایسی نسل تیار کی جو ہندلمانی (INDO-MUSLIM) تھی۔ یہ آمیزش و آویزش ان کی صورت، شکل، تراش خراش، وضع قطع، چال ڈھال غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا رنگ دکھانے لگی لیکن ان تعلقات کی سب سے مبارک یادگار یہی اردو زبان ہے جو خاص ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تمدنی ربط و ارتباط اور آپس کی لین دین کے باعث ظہور میں آئی۔ اور پہلے پہل ہندوی یا ہندی کہلائی، دکن پہنچ کر اس نے دکھنی نام پایا۔ پھر ریختہ کا خطاب ملا۔ دارالخلافہ کی زبان قرار پائی تو زبان اردوئے معلّے کا معزز لقب نصیب ہوا۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستانی کے نام سے بھی پکاری گئی۔ یہ سارا زمانہ یہیں گذرا۔ اور یہ تمام نام اسی ملک میں مختلف علاقوں اور زمانوں میں اسے ملے غرض اس خالص ملکی زبان نے رفتہ رفتہ مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اس میں شعر و ادب کے ابتدائی نمونے پیدا ہونے لگے۔

اس مشترک ہندلمانی (INDO MUSLIM) تمدن میں جس کی یادگار یہ زبان ہے ایرانی عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ اگرچہ ایرانی اور ہندی دونوں آریا قوم تھے اور دونوں کی زبانیں اپنے ماخذ میں ایک ہی زبان کا پتہ دیتی ہیں لیکن جب دونوں ملے تو مدت کی جدائی اور خاص ملکی حالات اور اثرات نے دونوں کا رنگ روپ بالکل بدل دیا تھا۔ پہلے کچھ دنوں اجنبیت قائم رہی لیکن جب دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور رشتہ استوار ہو گیا تو مغائرت کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا لیکن حاکم کا اثر محکوم پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے ایرانی عناصر نے زیادہ عمل دخل پایا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور آداب معاشرت کے دوسرے شعبوں میں ایرانی تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ اس لئے ایرانیوں نے جو کچھ ہندوستان سے لیا اس کے بدلے میں اس سے زیادہ ادا کر دیا۔ فارسی شعر و ادب کی ترقی کا ایک خاص سبب اس ماحول میں یہ ہوا کہ ایران میں سیاسی انقلابات کے باعث شعرا اور ادیب ہندوستانی مغلوں کے دربار میں پناہ گزین ہوئے۔ ان کے شعر و سخن سے محفلیں گرم ہوئیں۔ اس وقت دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ مقامی بولیوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور شعر و ادب کے سرمایہ سے محروم تھیں۔ قدرتی طور پر عوام بھی اس نئی طرز کی شاعری اور ادب کی طرف مائل ہوئے۔ اسی ماحول میں ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے ایران کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی لیکن ان کا کلام ہر اعتبار سے اساتذہ ایران کے ہم پایہ ہے۔ ابتدائی دور میں اُردو

شعر و ادب کے سرمایہ کی کمی کا اصلی سبب ہے۔ پھر جو اردو شاعر اپنی ملکی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے اور انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی وہ یا تو فارسی سے ترجمہ کرتے تھے یا پھر اس طرز پر لکھتے تھے جو ترجمہ نہیں تو کم از کم ماخوذ ضرور ہیں۔ اس کا اندازہ دکھنی ادب کے پہلے دور کا جائزہ لینے سے ہو سکتا ہے۔ نثر میں سب سے پہلا کارنامہ جو ادبی حیثیت سے اہم ہے ملا وجہی کی سب رس ہے۔ اگرچہ ملا صاحب نے کتاب کے طبعزاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اسے اپنے دماغ کی پیداوار بتایا ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کے فارسی "حسن و دل" سے نقل اڑائی ہے اور طرز بھی ویسا ہی مقفیٰ اور مرصع عبارت کا ہے جس کا اس زمانہ کی فارسی انشا پردازی میں خاص رواج تھا۔ ترجمہ کے سلسلہ میں دکن کا مشہور رزمیہ نگار شاعر کمال خاں رستمی ایک بڑے پتہ کی بات لکھ گیا ہے۔ وہ اپنی مثنوی خاور نامہ میں کہتا ہے کہ اپنی طبیعت سے نیا مضمون اگرچہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن میں فردوسی یا اس کے ہم پلہ شاعروں کی برابری کا دعویٰ کیا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے زیادہ مناسب ہے کہ میں کسی بلند پایہ فارسی تصنیف کا دکھنی میں ترجمہ کر لیتا ہوں چنانچہ ملکہ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر اس نے ابن حسام کے فارسی منظوم قصہ کا ترجمہ کر ڈالا۔ یہ قصہ حضرت علی اور ان کی جنگوں سے متعلق ہے اور اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں اردو میں رزمیہ نظم کا اس سے طویل نمونہ اور نہیں ملتا۔ یہ تو ایک مثال تھی۔ دکن میں فارسی نظم و نثر سے جس قدر ترجمے ہوئے انکی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری ابتدائی دور میں فارسی کا پرتو نظر آنے لگی۔ اردو شعرا کی کوشش برابر یہی رہی کہ ان کا اردو کلام فارسی کے ہم پلہ ہو جائے بہت بعد میں مرزا غالب جب بڑی حد تک اردو نے اپنی مستقل حیثیت علیحدہ حاصل کر لی تھی یہی کہتے نظر آتے ہیں:-

جو کوئی کہہ دے ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

چنانچہ اردو ناقدین بھی برابر اپنے فنکاروں کی تعریف میں اسی قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو کو فارسی کا مرتبہ بخشا۔ مشہور اردو شعرا کو مشہور فارسی شعرا کا ہم رنگ اور ہم مشرب بنا کر ان کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ ولی کو اردو شاعری کا رودکی بتایا گیا ہے۔ سودا اپنی مدح و قدح کے کمال سے انوری ہیں۔ ذوق کا ہمہمہ اور شکوہ ان کو خاقانی ہند بناتا ہے، میر و سودا اردو کے حافظ ہیں، ریاض اور جگر، حافظ اور خیام کے ہم مشرب ہیں۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری فردوسی اسلام کہلاتے ہیں۔

یہ تمام فقرے جو قدیم و جدید شاعروں کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا ذہنیت کی یادگار ہیں۔ ظاہر ہے جو فنکار فارسی کے نمونوں کو سامنے رکھے اور اس کے شاہکاروں کو فن کی معراج قرار دے ہیں اسے اسی کے اصولوں اور انہیں اقدار پر پرکھنا چاہیئے جو فارسی والوں نے مقرر کر رکھی ہیں۔ اس میں نہ شرم کی کوئی بات ہے اور نہ اس سے اپنی زبان یا اس کی تنقید کی توہین ہوتی ہے ہر نئے راہرو کو رہبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اردو نے فارسی سے بس یہی کام لیا

اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ شخصی حکومت کے طریقے نے شعر و ادب پر کیا اثر ڈالا اور اس طرح بالواسطہ تنقید نے کیا رجحانات قبول کئے۔ عرصہ تک ہماری زبان کے مورخ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اردو شاہجہاں کی درباری زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ بعض حضرات نے اسے اکبر کے دربار سے وابستہ کیا۔ غرض یہ معلوم ہونے لگا گویا یہ زبان مسلمان حکمرانوں نے اس ملک پر مسلط کی۔ جدید تحقیقات نے لاعلمی اور جہالت کے پردہ کو اٹھا کر اس غلط فہمی کی تردید کر دی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صوفیائے سب سے پہلے اس کی سرپرستی کی اور انہیں کے مبارک اقوال اور ملفوظات اس زبان کی قدیم ترین تاریخی دستاویز ہیں۔ ان کے اثر سے متصوفانہ خیالات، بالخصوص پاکیزگی نفس، عشق حقیقی حسن مطلق، معرفت نفس، ضبط و تحمل، ایثار و استقلال کے مضامین اردو شاعری کے خمیر میں داخل ہو گئے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے بدنام صنف ہے لیکن اس میں اعتدال انہیں مضامین سے پیدا ہوتا ہے اور انہیں خیالات نے عشق و عاشقی اور ہوسناکی میں حد فاصل قائم کر رکھی ہے جب کبھی اور جہاں کہیں ان سے انحراف کیا گیا ہے وہیں شاعروں کے قدم کو لغزش ہوتی ہے مثال میں لکھنؤ کے تمام شعرا پیش کئے جا سکتے ہیں۔

شخصی حکومت کا تقاضہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شعرا مدح گوئی کی طرف زیادہ مائل ہوتے اور فنی حیثیت سے اردو میں قصیدہ کا بڑا درجہ ہوتا لیکن شاعری کی تمام تاریخ میں سوائے سودا اور ذوق کے صف اول میں اور کوئی نام نہیں ملتا۔ دوسری صف میں کھینچ تان کر غالب او مومن کو لے آئیے لکھنوی شعرا میں امیر مینائی کا نام لے لیجئے۔ ان کے بعد فہرست ختم ہو جاتی ہے۔ یوں طبع آزمائی کے لئے یا مصلحت وقت کی خاطر اور شعراء نے بھی توجہ کی ہے لیکن میر اور میر حسن جیسے باکمال بھی اس میدان میں نہ چل سکے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سلاطین یا امرا کی محفلوں میں شاعروں کی سرپرستی صرف قصیدہ خوانی کے صلہ میں نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ لوگ فضل و کمال کی سرپرستی کو شان ریاست اور وضعداری سمجھتے تھے۔ ایک دربار بگڑتا تو دوسرا دربار ان باکمالوں کی راہ میں آنکھیں بچھا دیتا۔ اس لئے ان کی سرپرستی نے شاعروں کے مذاق کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ البتہ جب ان کی حالت خود بگڑ گئی تو زوال آمادہ شخصی حکومت کی جملہ خرابیاں سلطنت میں راہ پا گئیں، امیروں کا مذاق بگڑ گیا اور یہی لکھنؤ میں جہاں خان آرزو

سودا، میر تقی میر، جعفر علی حسرت، حیدر علی حیران، مصحفی، انشا اور میر حسن جیسے باکمالوں نے محفلیں گرم کی تھیں۔ صاحبقران اور رنگینی کو نوازا گیا۔ لیکن لکھنؤ کے بعد رامپور اور پھر حیدر آباد نے اس وضعداری کو آخر تک نباہ دیا۔ کبھی کبھی شخصی حکومت میں رئیس وقت کے خاص میلانات اور رجحانات نے خاص اوقات میں بعض اصناف کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ مرثیہ فنی حیثیت سے لکھنؤ میں اثنا عشری عقیدہ رکھنے والے نوابان اودھ کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ انیس و دبیر اور ان کے کارنامے اسی فضا کی پیداوار ہیں ورنہ ان سے پہلے بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا قوال مرثیہ خوان کہلاتا تھا اس طرح مرثیے نے لکھنؤ کے بگڑتے ہوئے مذاق کی جس طور پر اصلاح کی وہ بھی بالواسطہ انہیں کا مرہون منت ہے۔ پھر بعض سلاطین کی خاص دلچسپیوں نے خاص طور پر زبان کی ترقی اور اس کی رفتار پر اثر ڈالا۔ اردو نظم کا پہلا کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ نے خود مرتب کیا۔ ہماری قدیم ادبی کتابوں میں یہ تصنیف نہایت اہم ہے۔ اس سے ایک طرف بادشاہ کی دلچسپی اور ملکی زبان سے اس کے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا قادر الکلام شاعر تھا اور اس کا کلام بیشک کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پائگاہ گولکنڈہ میں بکثرت شعراء نے دکھنی شاعری کی طرف توجہ کی اور بادشاہ کے مذاق کے مطابق غزلیں اور عاشقانہ مثنویاں نظم کیں۔ کمال خان رستمی علی عادل شاہ والی بیجاپور کا تذکرہ اس عقیدت سے کرتا ہے گویا وہ اس کا استاد ہے اور درحقیقت یہ تاجدار اپنے شعرا کے کلام کو بغور سنتا اور اس پر اصلاح دیتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کی شاعری کو آخری دور میں متاثر کیا اور اسے ایک نیا رنگ بخشا۔ واجد علی شاہ کا کلام کسی طرح اس کے درباری شعرا کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ فنی واقفیت کے اعتبار سے خود اس کا پایہ ہی بلند رہتا ہے۔

شخصی حکومت نے شاعری کے تمام اسلوب پر بڑا اثر ڈالا۔ استعاروں اور کنایوں کا رواج اسی کا مرہون منت ہے۔ شخصی حکومت میں انفرادی آزادی کسی نہ کسی حد تک سلب ہو جاتی ہے اور تحریر و تقریر میں دارو گیر کا خوف ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا۔ تقریر کرنے والے اپنی گفتگو میں اور شعرا اور ادیب اپنی تحریروں میں اپنے آزاد خیالات ظاہر کرنے میں جھجک محسوس کرتے رہے بالخصوص ایسے معاملات میں جہاں شعرا زمانہ کے ماحول، سیاسی بےچینی اور ذہنی انتشار کا ذکر کرنا چاہتے ہوں، چونکہ ان کی قوت حاسہ شدید ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ان حالات کا اثر عوام سے زیادہ ہی قبول کرتے ہیں اور اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجبوراً استعاروں اور کنایوں کا پردہ ڈال کر اپنے جذبات اور تاثرات سپرد قلم کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم شعرا اور ادیبوں میں اس انداز کے عام رواج کا باعث یہی ہے۔ جو لوگ اردو غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں شاعر صرف اپنے دل کی رام کہانی سناتا ہے اور عام ماحول سے بیگانہ نظر آتا ہے یعنی بالفاظ دیگر غزل میں صرف داخلیت پائی جاتی ہے۔ وہ اسی نکتہ سے عدم واقفیت کی بنا پر غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر غزل گو شعراء کے استعاروں اور کنایوں کو صرف استعارہ اور کنایہ سمجھ کر تحقیق کی جائے کہ دراصل شاعر کا مقصد کیا تھا تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس دور میں بھی شعرا نے اپنے خارجی ماحول کی ترجمانی اپنے کلام میں ہمیشہ مدنظر رکھی ہے۔ ایسے مطالعہ کے لئے شاعر کے عہد کی تاریخ، اس کی زندگی کا روزنامچہ یا کم از کم اہم واقعات کی تاریخیں ہمارے سامنے ہونے ضروری ہیں۔

اردو شعرا اور ناقدین نے عام طور پر شاعری کے لئے اور بالخصوص بعض اصناف کے لئے درد و سوز و گداز کو جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ اس ذہنیت کا سلسلہ بھی اس عہد کے سیاسی ماحول سے ملتا ہے۔ اردو کی نشوونما کا زمانہ دراصل مغلیہ حکومت کے زوال کا دور ہے۔ ملک میں انتشار تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی آئے دن کی یورشوں نے کم از کم شمالی ہند کے باشندوں پر زندگی حرام کر دی تھی۔ دکن میں مرہٹوں کی بغاوت، ادھر سکھوں اور جاٹوں کی سرکشی، نظام حکومت کے کمزور ہو جانے کے باعث اور زور پکڑ رہی تھی۔ درباری امرا اور اعیان لشکر خود غرض ہو گئے تھے اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رہے تھے۔ دربار میں ایسی ریشہ دوانیاں تھیں کہ کسی رئیس کا پایہ مستحکم نہ تھا۔ جو آج ہفت ہزاری نظر آیا کل نان شبینہ کو محتاج تھا۔ جب درباروں کی یہ حالت تھی تو درباروں سے وابستہ رہنے والے شعرا اور ارباب فن و اہل کمال کس طرح سکون کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کی قسمت میں در بدر کی ٹھوکریں، معاشی تنگ حالی، ذہنی پریشانی اور ذاتی آلام و مصائب ہی لکھے تھے۔ اگر ان حالات میں کائنات کا ایک ایسا تصور ان کے ذہن میں آیا جہاں انسان مجبور اور بیکس، حقیر اور کمزور، حوادث اور اتفاقات کے رحم و کرم پر ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قدرتی طور پر سوال ہوگا کہ اس ہند لسانی تمدن میں جس کی پیداوار یہ اردو زبان ہے، ایرانی عنصر کے مقابلہ میں ہندی عنصر کی کمی کا سبب کیا ہے۔ دکھنی دور میں دیسی بھاشاؤں کے الفاظ اور ملکی تشبیہات کثرت سے ملتی ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بہت جلد ان زبانوں کا جو مقامی بولیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں سرمایہ ختم ہو گیا اور سنسکرت آریائی تمدن ایک زیادہ مہذب اور متمدن ایرانی آریائی ثقافت کے سامنے نہ ٹھیر سکا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ہمارے زمانہ میں مغربی تمدن اور معاشرت کے سیلاب میں قدیم ہندوستانی خس و خاشاک کی طرح بہی چلی جا رہی ہیں اور جو اثرات پہلے ایرانی تمدن اور فارسی زبان و ادب سے ہم میں آئے وہ اب انگریزوں کی تہذیب، معاشرت اور انکی زبان و ادب سے رفتہ رفتہ ہماری زبان کے مزاج میں دخل پا رہے ہیں۔

مصوّر

(افسانہ)

ظفر جاوید

آج شہنشاہ اعظم کی سترویں سالگرہ ہے دربار خاص نہایت آب وتاب سے آراستہ ہے۔ بوڑھے شہنشاہ کے تخت کے پیچھے اس کی مہ جبیں کنیز فرزانہ موتیوں کا پنکھا لئے کھڑی ہے۔ تخت کے نیچے ملک کا خوبرو نوجوان مصور فرید ادب سے دست بستہ کھڑا ہے۔

"حاضرین دربار! آج میں آپ کو اپنے ملک کے سب سے مشہور مصور کا شاہکار دکھاتا ہوں"۔ شہنشاہ اعظم نے کہا۔

دربار ایستادہ ہو گئے۔ شہنشاہ نے پاس رکھے ہوئے طلائی چوکھٹے کی نقاب کشائی کی۔

"سبحان اللہ! ماشاء اللہ!" حاضرین دربار کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

"بیشک یہ ایک یگانہ روزگار شے ہے۔ فرزانہ میرا کھلونا ہے۔ بچوں اور بوڑھوں دونوں کو کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے — میرے اس کھلونے کی تصویر فرید نے چھ ماہ کی لگاتار محنت کے بعد تیار کی ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رخساروں پر فرید نے اپنے خون دل سے رنگ آمیزی کی ہے۔ ان سرخ جھلکیوں میں کیا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے — اسی تاج خاندانی کی قسم! میں فرید کو منہ مانگا انعام دوں گا۔ کہو فرید کیا انعام مانگتے ہو"۔ شہنشاہ اعظم نے ستائش، قدردانی اور انتہائی خلوص کے جذبات میں سرشار ہو کر کہا۔

فرید ہچکچایا — فرزانہ کی نظروں نے ہمت دلائی لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔ آنکھیں کھلی ہونے پر بھی بند تھیں۔ کچھ جرأت دکھانا چاہتا تھا لیکن قاصر تھا — دربار میں عجیب سا سناٹا تھا — فرید اور فرزانہ کی پھر آنکھیں چار ہوئیں۔ فرزانہ کی نظروں میں فرید کو امید اور جوش کی جھلک نظر آئی — حاضرین دربار گوش بر آواز تھے — چاروں طرف ایک قسم کا مقدس سکوت طاری تھا — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرید کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا ہے۔

کچھ دیر تک یہ کیفیت دیکھنے کے بعد خود شہنشاہ اعظم نے سکوت توڑا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ فرید! میرے وعدے پر شبہ نہ کرو۔ ہمت کر کے تمنائے دلی صاف صاف بیان کر دو۔ درحقیقت میں تم کو منہ مانگا انعام دوں گا"۔

"حضور! جان بخشی ہو تو عرض کروں"۔ ہمت سے کام لے کر فرید نے رکتے رکتے کہا — فرزانہ کی آنکھیں جوش مسرت سے چمکنے لگیں۔ حاضرین دربار متوجہ ہو گئے۔

"ہاں! ہاں! کہو۔ اس فضول تاخیر سے کیا فائدہ"۔ شہنشاہ اعظم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر حضور! مجھ کو میری محنت کے صلے میں — میری بنائی ہوئی یہی تصویر عنایت کر دی جائے"۔

"ہائیں — للہ یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" شہنشاہ اعظم نے تعجب و حیرت سے دریافت کیا۔

"جی ہاں حضور! بالکل سچ عرض کر رہا ہوں"۔ فرید نے جواب دیا۔

"میری خوشی تو اسی میں تھی کہ تم فرزانہ کو مجھ سے مانگتے — چھ مہینے کی مسلسل صحبت میں تم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ہو۔ میں نے اکثر تم دونوں کی آنکھوں میں محبت کا نشہ دیکھا ہے — میں تو فرزانہ کو پھول اور تم کو بھونرا سمجھنے لگا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ بھونرا اس پھول کا رس چوسے"۔ شہنشاہ اعظم نے کہا۔

"لیکن حضور میں ایسا پھول لے کر کیا کروں — جو چند ہی روز میں اپنا حسن کھو بیٹھے۔ مجھ کو تو حسن پائیدار کی ضرورت ہے جس کی تکمیل یہ گوشت پوست کی فرزانہ نہیں کر سکتی ہے!— !"

خدارا! میرے حضور — مجھ کو یہ تصویر دے دیجئے۔ یہ ہمیشہ شگفتہ و حسین رہے گی — لائیے — لائیے" فرید بے چین ہو کر چیخنے لگا۔

"واہ فرید تیرا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تو بے شک مصوّر ہے۔

ع "برہمن تجھ سا نہیں حسن کے بت خانہ میں"

رُباعیات

دل جھوم اُٹھا جو ابر پارے جھومے
آنکھوں میں محبت کے ستارے جھومے
نظارہ بہ نظارہ چھید جام پہ جام
ہم گردن مینا کے سہارے جھومے

ضیا

جعفری

نانکنگ

جاپانیوں نے ۱۹۳۷ء میں نانکنگ کو تباہ کردیا تھا، لیکن یکم مئی سے وہ دوبارہ چین کا صدر مقام ہوگیا ہے۔ بہت سے سرکاری دفتر تو پہلے ہی آگئے تھے لیکن جنرلسیمو چیانگ کائی شیک اور انکے وزراء کی آمد کے بعد پوری چہل پہل شروع ہوگئی۔ جنرل مارشل نے بھی چنکنگ سے واپس آنے کے بعد جرمنی کے سابقہ سفارت خانے میں اپنا صدر دفتر کھول لیا۔ ۱۹۳۷ء میں اعلان جنگ کئے بغیر جاپان نے حملہ کیا اور مارچ ۱۹۴۴ء تک چین کے دس صوبوں پر قبضہ جما لیا۔ ۱۹۴۰ء میں نانکنگ کے مقام پر انہوں نے ' جمہوریت چین کی قومی حکومت ' قائم کی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں جرمنی اٹلی بلغاریہ رومانیہ ـلوویکیہ ھسپانیہ اور ھنگری نے اس نام نہاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ گویا اسطرح اسکے تعلقات یورپی ممالک سے استوار ہوگئے۔ لیکن زمانے کی کروٹ بدلنے کے ساتھ نہ ان ملکوں کی آن بان باقی ہے اور نہ جاپان کا پچھلا اقتدار۔

نانکنگ کے چند بازاروں کا ایک دلکش منظر۔ وسـ
سن یات سن کا مجسمہ نصب ہے۔

۵ مئی کو ڈاکٹر سن یات سین کے
زیارت کے بعد جنرلسیمو اور میڈم
شیک واپس جا رہے ہیں

٭

قومی حکومت کے دوبارہ قائم ہو
منانے وقت نانکنگ کے عام باشند
جمع ہوکر اصل رسم ادا کر

ھاتھی · کڈھا ·

جنوبی ھندوستان میں ریاست میسور بڑے جانوروں کے شکار کیلئے خاص جاذبیت رکھتی ھے شیروں اور جنگلی ھاتھیوں کی تلاش میں گھنے جنگلوں کی خاک چھاننے والے وھاں جاتے اور اپنا شوق پورا کرتے ھیں۔ وہ ھاتھیوں کو گھیر گھار کر لکڑی کے ایک جنگلے میں قید کردیتے ھیں جسے اپنی زبان میں « کڈھا » کہتے ھیں۔ یہ مستطیل شکل کا جنگل کی مضبوط لکڑیوں کا بناھوا جنگلہ ھوتاھے جس میں کئی حصے ھوتے ھیں۔ اسکا دروازہ اتنا وسیع رکھا جاتا ھے کہ ھاتھی آسانی سے گذر سکیں۔ اسے بنانے بھی ایسے راستے پر ھیں جہاں سے ھاتھی عموماً گذرتے ھوں۔ ھاتھیوں کو دیکھتے ھی شکاری ڈھول بجاتے چیختے چلاتے اور خوب غل مچاتے ھیں۔ اور انھیں ھنکا کر کڈھے کے قریب لے آتے ھیں۔ جب ھاتھیوں کو کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی تو وہ اس جنگلے میں چلے جاتے ھیں۔ پھر مہاوت سدھائے ھوئے ھاتھیوں کے ساتھ کڈھے میں جاتا اور ھاتھیوں کو ایک ایک کرکے الگ الگ حصوں میں داخل کردیتا ھے۔ کئی دن تک تنہا رھنے کے بعد ھاتھی اس ماحول سے مانوس ھو جاتے اور اپنے جنگلی پن کو چھوڑ دیتے ھیں۔
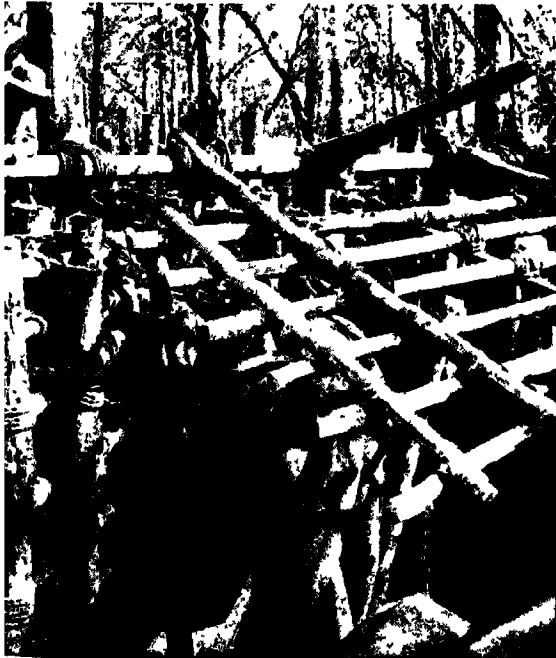
ایک تجربہ کار مہاوت جو سابو نامی فلمی اداکار کا چچا ھے کڈھے میں کھڑے ھوئے ایک جنگلی ھاتھی کو رسی سے جکڑ رھا ھے۔

جنگلی ھاتھی ایک ندی میں نہا کر خوش ھو رھے ھیں۔

ایک پالتو ھاتھی جنگلے میں داخل ھو رھا ھے۔

ہندوستانی بت تراشی کے نمونے

(جنوب مشرقی ایشیا میں)

شاندار کمبودی آرٹ کا ایک اعلی نمونہ۔ مہارا یعنی ۔۔ ایک عجیب الخلقت ہستی ہے جس کا دھڑ ہاتھی سے مشـ دو عورتوں کو اپنے جبڑوں میں دبا رکھا ہے
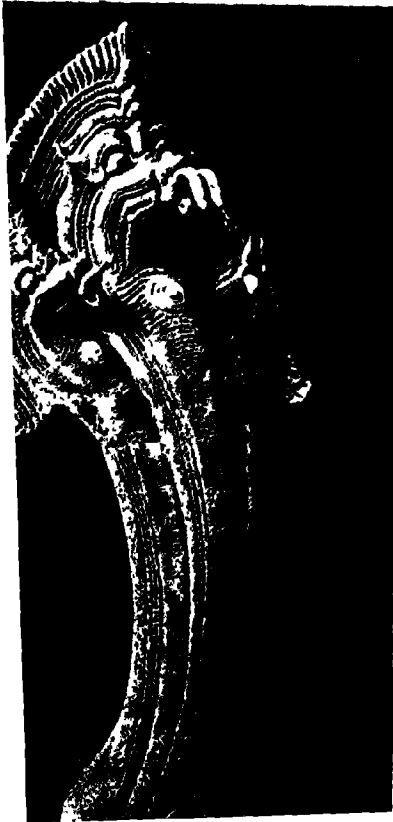
وشنو دیوتا کی ایک صحیح سالم مورت جو نویں صدی کی ہے انککور کے قریب برآمد ہوئی۔ ھندوؤں کے عقیدے کے مطابق وشنو دیوتا نے نظام شمسی کو سنبھال رکھا ہے۔

کانسی کا بنا ہوا خمر آرٹ کا ایک اعلی نمونہ جو بارھویں صدی کا ہے۔ ناک دیوتا جس پر زنگاری رنگ چڑھا ہوا ہے پھن مارنے کے انداز میں کھڑا ہے۔ ←

جامعه طہران

جامعہ طہران ایران کی واحد یونیورسٹی ہے۔ اسکا شمار دنیا کی بہترین درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ دوسرے مضامین کے علاوہ اس میں طب' قانون اور علمی فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس صفحہ کی تصاویر سے ظاہر ہے جامعہ طہران کی سب عمارتیں نئی طرز پر بنی ہوئی ہیں۔ اس میں طلبا کے کھیلوں کے لئے کلب اور ایک ریستوراں بھی ہے۔ انکی جسمانی ترقی کیلئے کھیل کے میدانوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر کالج نے اپنی لائبریری الگ بنا رکھی ہے جس میں یورپ کی تقریباً ہرزبان کی کتابیں جمع ہیں۔ انکی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ ابتدائی آٹھ سال تک جامعہ کا نظم و نسق سرکاری حکام کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے بعد ایران کی پارلیمنٹ نے ایک قانون بنا کر اسے آزاد کر دیا اور اسکی ایک مجلس انتظامیہ بنادی۔ تاسیس جامعہ کی یادگار میں ہر سال سارے ایران میں ایک اچھا جشن منایا جاتا ہے۔

فنون کی درسگاہ کا ایک نظارہ۔

اقامت گاہ کا خوبصورت باغیچہ۔

قانون کے کالج کے
دلکش

—— :o:
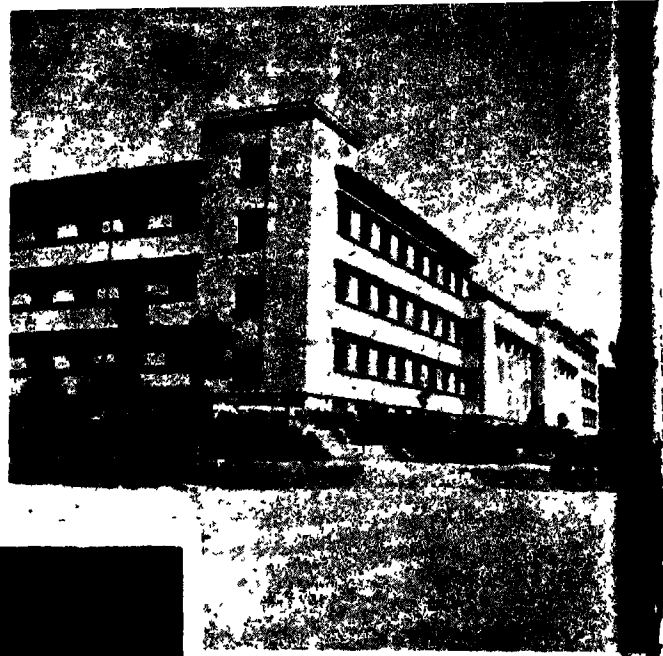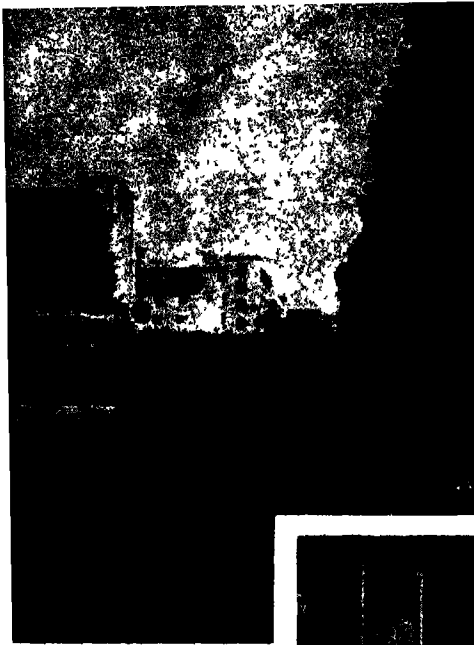
طلبا کی کلب کا
ریستور

جامعہ کا تکنیکل کالج ۔

—— :o: ——

جامعہ کی لائبریری کا ایک حصہ ←

—— :o ——

قانون کے کالج کا دروازہ
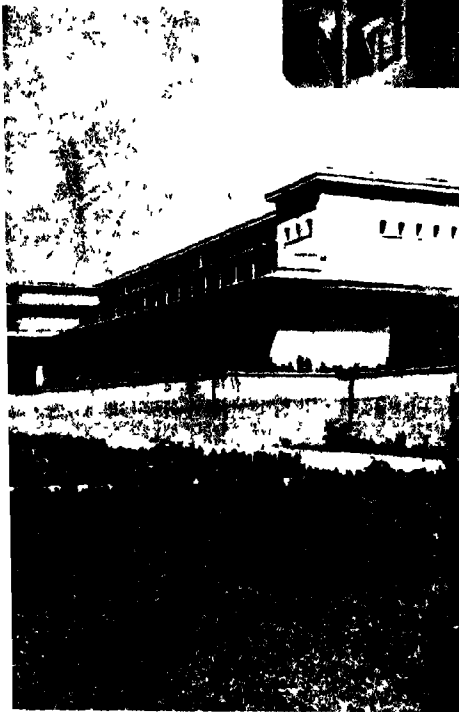
دربار صاحب' امرتسر' کا ایک دلکش نظارہ۔ یہ سکھوں کی ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔

امرتسر

سکھوں کا مقدس شہر

۱۵۷۷ میلادی میں اکبر بادشا
ایک قطعۂ زمین گرو رام داس جی
جو سکھوں کے روحانی پیشوا تھے
کیا اور اسکے ساتھ ایک بہت بڑا ح
بھی ملا دیا۔ گرو جی نے اسکا
«امرتسر» یعنی «آب حیات کا حو
رکھا۔ انھوں نے حوض کے بیچ
ایک گردوارہ تعمیر کرایا اور اسکا
«ہری مندر» رکھا۔ شہر اور عباد
انہی ناموں سے ابتک مشہور ہیں

دربار صاحب' امرتسر' کے صدر دروازہ کا ایک حصہ۔ پتھر پر اعلی نقاشی کا کام حد درجہ دیدہ زیب ہے۔

ھنگری

یورپ کے مطلوم ترین ملک ھنگری سے متعلق ایک مضمون "کشمکش حیات" کے عنوان سے اسی شمارے میں شائع کیا جا رھا ھے۔ ان تصاویر کو دیکھکر اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

گریٹ روٹو چرچ مین جانے کا صدر دو

سینٹ گیلرٹ ماؤنٹ سے ایک دلکش نظارہ۔

اسی محل کا دوسرا منظر جسکہ سات ھفتے
بمباری نے اسکے سقف و بام منہدم کرکے رکھ

بوڈاپسٹ کا مشہور شاھی محل جو میریاتھریسا نے ۱۷۴۹-۷۱ء
میں بنوایا تھا۔ یہ تصویر لڑائی سے پہلے لی گئی تھی۔

سے
کو
مط.
من
نام
ن،
میں
نام
گاہ

نورجہاں — ایک فلمی ستارہ۔

دُھواں

افسانہ

شمس عظیم آبادی

وہی کثیف دھواں۔ وہی بکدر فضاء وہی بے معنی اداسی۔ اس کا جی الجھنے لگا۔ اس نے ایک بار کھڑکی سے باہر سر نکالا اور پھر فوراً ہی سے سُکڑ گرادیا۔ دُھواں دُھواں! کثیف دھواں! جہاں دیکھو دھواں اٹھ رہا ہے شہر ہے یا کوئلہ اور لوہے کا کارخانہ ہو گیا ہر وقت دھواں! جب دیکھو دھواں!۔ اور سامنے کے مکانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلتے دیکھ کر اس کا جی ہوا کہ سارے شہر کی چمنیوں پر ایک وزنی بھاری پتھر رکھ دے تاکہ دھوئیں باہر نہ نکل سکیں اور اس گھر کے رہنے والے دھوئیں کی شدت سے گھٹ کر نہ مر جائیں —

دھواں!!! آہ! اسے دھوئیں سے نفرت ہے وہ دھوئیں کی کثافت برداشت نہیں کر سکتا — یکایک اس کی نظر آتشدان پر پڑی جہاں دھیمی دھیمی آنچ سے کوئلہ دہک رہا تھا اور کوئلہ کا دھواں اس بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی کے باہر جا رہا تھا۔ اس کے گھر سے بھی اس کے کمرہ سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا! دھواں! دھواں! دھواں! اس کے اپنے کمرے میں دھواں۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل کو آتش دان میں اُلٹ دیا۔ نہ آگ جلے گی نہ دھواں اٹھے گا۔ پانی تھوڑا تھا آگ پوری نہ بجھ سکی۔ کوئلہ بھیگ گیا اور بھیگے ہوئے کوئلے کے ٹکڑوں نے انگاروں سے مل کر اور دھواں پیدا کر دیا اور پھر سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے جھنجھلا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا — وہ کمرے سے باہر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر کمرے کے باہر بھی تو دھواں تھا — وہ دھوئیں سے بیزار تھا وہ کسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں سے دھواں نہ اٹھتا ہو! —

اس نے آتشدان پر ایک کاغذ کا ٹکڑا پھینک دیا۔ دھواں بہت تیزی سے آتشدان کے بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی سے باہر نکلنے لگا — اس نے نظر پھر اوپر اٹھا دی۔ دھوئیں کی تہہ آسمان پر اور موٹی ہو گئی تھی۔ مختلف چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے چھوٹے بڑے گول دائرے۔ اور اس کا جی ہوا کہ یہ دائرے پھانسی کے پھندے بن جائیں اور ان پھندوں میں وہ ان لوگوں کی گردنیں ڈال دے جن کے گھروں سے یہ دھواں اٹھ رہا تھا — ہوا کے ایک جھونکے سے بہت سا دھواں اس کی ناک کو چھوتا ہوا اس کے کمرہ میں چھا گیا۔ اس نے چڑ کر کھڑکی سے سر ہٹا لیا — کثیف دھواں! اور اسے اپنی کھڑکی کے نیچے دو سائے نظر آئے۔ اس نے اپنا پورا سر کھڑکی سے باہر کر دیا۔ دو مخلوط سائے۔ جنہیں دھوئیں نے گھیر لیا تھا اس نے زیادہ عیاں طور پر دیکھنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس نے زیادہ دیکھنے کی کوشش کی اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دھوئیں کی ایک بڑی کثرت منہ اور ناک سے گھونٹ رہا ہے۔ دو مخلوط سائے۔ دو پیوست نقوش۔ کثیف دھواں، اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے تمام جسم سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس نے زور سے سر گرا دیا۔ اس کا جسم دہک رہا تھا آتشدان میں آگ بہت تیزی سے جل رہی تھی۔ دھواں بہت کم نکل رہا تھا — اس کا بدن جل رہا تھا۔ انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ دھواں! کثیف دھواں! وہ چیخ اٹھا۔ دھواں!!! —

بیت رہی برسات

رین اندھیری ساون کی رت
بادل گونجے بجلی چمکے
کیسے بتاؤں من کی بات
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
کوئل کی درد بھری صدائیں
کیسے بتاؤں من کی بات
بنا سجن یہ ساون جھولا
گیت سکھی میں کیسے گاؤں

چھائی گھٹا گھنگھور
دھک دھک ہو من مور
بیت رہی برسات
من مورا لہرائے
ہوک سی جیہ چھید جائے
بیت رہی برسات
من مورا گھبرائے
ہائے جیا کلپائے

کیسے بتاؤں من کی بات
رو رو تڑپوں چین نہ پاؤں
ساجن اب تک گھر نہ آئے
کیسے بتاؤں من کی بات
رہتے تھے جب پاس پیا
دیکھ لیا یاں جو کچھ دیکھا
کیسے بتاؤں من کی بات
بھول گئے پردیس بسے
ساجن کیا سچ روٹھ گئے
کیسے بتاؤں من کی بات

بیت رہی برسات
ہائے جیا گھبرائے
رہ رہ یاد ستائے
بیت رہی برسات
جگ میں سب کچھ اپنا تھا
کتنا سندر سپنا تھا
بیت رہی برسات
پریت روگ لگانا تھا
دو دن مجھ کو ہنسانا تھا
بیت رہی برسات

عائشہ پرویز علیم

ہندوستانی ثقافت و فنون پر مصر کے اثرات

کے حسین

دآرا نے ۳۲۱ قبل مسیح میں یا اس کے الگ بھگ زمانے میں گندھارا فتح کیا تھا۔ کوہ بےستون سے برآمد ہونے والی تختیوں پر اس کے مفتوحہ ممالک کی تفصیل درج تھی۔

ہندوستان کی طرف سے دآرا کو ہر سال ۳۶۰ ٹیلنٹ سونا خراج کے طور پر دیا جاتا تھا ایک ٹیلنٹ کا وزن ۳۵ سیر ہوتا تھا۔ اس حساب سے خراج کی رقم بہت زیادہ تھی۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ بلوچستان ایک سرسبز ملک ہونے کے باعث دآرا سب سے کم خراج دیتا تھا۔ یعنی ۱۷۰ ٹیلنٹ چاندی۔ لیکن یہ بات زیادہ تعجب خیز ہے کہ دریائے سندھ کے دو نام ہوتے تھے۔ فارسی زبان کے ایک مسودے میں (شاہجہاں نامہ مصنفہ معتمد خاں، صفحہ ۲۵۶ سطر ۷) دریائے سندھ کو دریائے نیلاب لکھا گیا ہے۔

کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ ان آریاؤں کو جو بعد میں آکر دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے پہلے مہاجرین کے ساتھ مل گئے تھے مصر کا دریائے نیل یاد تھا اور انہوں نے اس ملک کی یادگار میں جسے چھوڑ آئے تھے، سندھ کا یہ نام رکھ دیا؟

ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، فراعنہ مصر نے جب ہائکسوس قوم پر غلبہ حاصل کر لیا تو کسی بحث و تمحیص میں حصہ لینا ان کے لئے دشوار تھا۔ پھر بھی صلح کی گفت و شنید کر لینے کے بعد انہوں نے بیس لاکھ ہائکسوس کو ۱۵۹۱ قبل مسیح کے لگ بھگ اجازت دیدی کہ وہ بے خوف و خطر مصر چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ ہائکسوس یروشلم اور عرب کو پار کر گئے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہودیوں، شامیوں یا عربوں کے حوالاجات سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کس جگہ قیام پذیر ہوئی اور نہ قبائلی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بدوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر انہی میں مدغم ہو گئے۔ حکومت مصر کی قدرتی سرحد دریائے فرات کے کنارے تک قائم تھی۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ہائکسوس کو اس حد کے اندر رہنے کی اجازت نہیں ملی ہوگی ورنہ ہر وقت ان کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا۔ بلکہ انہوں نے دریائے فرات کو عبور کیا اور بابل و بہارا میں عارضی طور پر قیام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھے اور درۂ بولان یا درۂ خیبر کی راہ دریائے سندھ کی وادی تک چلے آئے۔ جہاں گنڈرولا کی حیثیت سے پہلے مہاجرین آئے تھے اور یہ لوگ انہی میں مل جل کر رہ گئے۔

غالباً اسی سب سے بڑے سبب کی بنا پر مصر کے فرعون رعمسیس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اثرات کا دوسرا ثبوت اس اعتبار ملتا ہے کہ چھوٹے پیمانے کے ظروف میں جو مصر، نالندہ اور موہنجوداڑو سے برآمد کئے گئے، زبردست مشابہت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض کی وضع قطع بھی یکساں ہے۔ ایک دلچسپ مشابہت اس نمونے میں پائی جاتی ہے جو "تاریخ مصر" مصنفہ بریسٹڈ کے صفحہ ۳ پر دیا گیا ہے۔ اس ہنڈیا پر کھدائی کا کام بہت بڑی حد تک اس نقاشی سے ملتا جلتا ہے جو پنجاب کے بنے ہوئے مٹی کے حقوں پر اب بھی عام ہے۔ مٹی کو پاؤں سے گوندھ کر گارا بنالیا جاتا اور پھر اس گارے کو چکلی پر رکھ کر نرم دست سے گھمایا جاتا تھا۔ مصر میں قاعدہ تھا کہ برتن کی خاص وضع قطع ڈھالنے کے لئے انگلیوں کی مدد لی جاتی تھی اور یہی دستور ہندوستان میں رائج تھا۔

مصری لباس جن کے کنارے نیلے رنگ کے تھے فراعنہ کے مقبروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ انکا کیمیاوی معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں نیل میں رنگا گیا تھا۔ اور سب جانتے ہیں کہ نیل وادیٔ سندھ کے شہر بربریکون سے مصر بھیجا جاتا تھا۔ جن نمونوں کا معائنہ کیا گیا وہ بہت قدیم ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے زمانے سے ان کی برآمدگی عام تھی۔

مصر کے کھیتوں میں بیلوں کے ذریعہ ہل چلایا جاتا تھا۔ ہل کی بناوٹ بھی وہی تھی جو ہندوستان کے دیہاتوں میں استعمال ہونے والے ہلوں سے مشابہ تھی اسی طرح کتائی وغیرہ کے اوزاروں میں بھی یکسانیت کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرا دلچسپ سوال اگنی پوجا سے متعلق ہے۔ اس کی رسم کتنی پرانی ہے؟ اس کا طریقہ کہاں سے اختیار کیا گیا؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم بہت ہی پرانے زمانے سے ایرانیوں میں رائج تھی۔ آگ کا احترام لوگوں کے دلوں میں اسوقت پیدا ہوا جب ایک بار موسم سرما میں باکو کے قریب خود بخود شعلے اٹھتے دکھائی دیئے حالانکہ زمین کی سطح برف سے

ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا مظہر قدرت تھا جسے اگلے وقتوں کے لوگ سمجھنے سے قاصر ہے۔ سپیرسی سائکس نے اپنی کتاب "تاریخ ایران" جلد اول کے صفحہ ۱۱۰ پر اس حادثۂ طبعی کا حال لکھا ہے۔ ایران سے آگنی پوجا کی رسم بابل اور سیمارا میں اور وہاں سے ہندوستان میں منتقل ہوئی۔

اس مظہر قدرت کی توجیہہ اب آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ باکو تیل والی زمینوں کے قریب ہے اور جو شعلہ اس وقت نظر آیا وہ ضرور پیٹرول کے انجرات کے بھڑک جانے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے ہمارے لئے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے ایک رسم کے نقل مکانی کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ مشرقی اثرات کی بنا پر اس کی تقدیس و پرستش روما اور ایشینیہ میں عام تھی۔ لیکن وہ عضوِ تناسل کی پوجا سے بالکل مختلف تھی (ہندوستان میں اس پوجا کو "لنگ پوجا" یا "شولنگ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) پوجا کا یہ طریقہ مصر والوں کو بہت ہی پرانے زمانے میں معلوم تھا۔ اور قبط جو دریائے نیل کے اس موڑ پر واقع تھا، جو بحیرۂ احمر کے بالکل نزدیک ہے، اسی طریقۂ عبادت کے لئے مشہور تھا۔ مسودات سے پتہ چلتا ہے کہ باہمی تعلقات پیدا ہو جانے کے بعد اس رسم کو یونان والوں نے بھی اختیار کیا تھا۔ یہ عام عقیدہ تھا کہ اس کی پوجا کرنے والوں کو زرخیزی نصیب ہو جاتی تھی۔ چونکہ بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے ذریعہ ہندوستان کے آریاؤں کے ساتھ تجارت اور بیوپار ہوتا تھا اسلئے سندھ کی وادی میں رہنے والے آریاؤں نے اسے اختیار کرلیا اور اب بھی اس پوجا پر کاربند ہیں۔ عضوِ تناسل کے دیوتا کو "چم" کہا جانے لگے یونانی اسے "بین دیوتا" کہا کرتے تھے۔

اب ہمیں ثقافت کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہئے جس سے ہمیں اندازہ ہو سکیگا کہ قدیم زمانے کے لوگوں نے تہذیب و تمدن کا کتنا بلند درجہ حاصل کرلیا تھا مثلاً موسیقی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ قبل تاریخ کے وہ لوگ جو غاروں میں رہتے تھے، ناچ گانے کے شائق تھے کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسرت و شادمانی، رنج و غم اور امید و یاس کے جذبات ظاہر کرنے کا سب سے بڑا قدرتی طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ ہسپانیہ کے کھرپا کے غاروں میں جو نقش و نگار ہیں وہ اسی چیز کو ظاہر کرتے ہیں یعنی یہ کہ غاروں کے رہنے والے شکاریوں کے گرد ناچ رہے ہیں۔ تاریخ سے پہلے کے ان لوگوں نے صرف ہڈی کے ٹکڑے ناچ کا ٹھمکا یا گیت کی تال ظاہر کرنے کیلئے استعمال کئے ہونگے۔ یہی ٹکڑے ترقی پاکر کھڑتال بن گئے جن کا استعمال آج تک رائج ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے مصریوں نے سب سے پہلے موسیقی کے ساز ایجاد کئے۔ اگرچہ مصری کاہنوں کیلئے بہت سی چیزیں ممنوع تھیں تاہم ناچ گانے کی انہیں بھی اجازت تھی۔ قدیم ترین فراعنۂ مصر کے مقبروں میں دیواروں کی پچیکاری دیکھنے سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس کے بہترین نمونے مرگارڈ نرولکنسن نے اپنی کتاب "قدیم مصری" میں صفحہ ۹۰ تا ۱۴۴ پر دکھائے ہیں۔ موسیقی کے یہ چند ساز پہلے پہل مصریوں نے استعمال کئے تھے۔ کانسی یا پیتل کے بنے ہوئے مجیرے۔ آج بھی ہندوستان میں اسی وضع کے مجیرے استعمال ہوتے ہیں۔ کئی قسم کے کھڑتال جن کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اور بربط۔ خصوصاً بربط کا وہ جوڑا جو رمسیس کے مقبرے کی دیواروں پر بنا ہوا ہے، خوبصورتی اور فنی اعتبار سے بے مثل ہے۔

بربط یہودیوں نے اپنایا اور پھر اس کا رواج سارے یورپ میں ہو گیا در اصل اس زمانے کے پیانوں کو اسی کا نقش اول کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا تاروں والا ساز جو جھ سے ملتا جلتا ہے اور غالباً اسی قسم کے سازوں میں وضع قطع بدل کر رباب، وینا اور ستار بن گئے۔ مصری زمانۂ قدیم

موسمِ گل

موسمِ گل ہے عجب شورِ نہ خوار دوں میں — جان سی پڑ گئی فطرت کے پرستاروں میں
کس غضب کی ہے کشش عشق لے دربازوں میں — خود بخود حسن کھنچا آیا ہے کہساروں میں
حوصلے بڑھ گئے پوشیدہ گنہگاروں میں — اب تو واعظ بھی نظر آتے ہیں میخواروں میں
اک فغاں میں ہی نہیں حسن کے بیماروں میں — زخم ہی زخم نظر آتے ہیں گلزاروں میں
شہر ویراں ہوئے دیہات نے رونق پالی — زندگی ناچتی پھرتی ہے چمن زاروں میں
سبزہ و گل کی روش پر نظر اے مستِ خرام — دلِ شاعر بھی ہے ان حاشیہ برداروں میں
کیا غضب ہے کہ غضبناک بنے رہتے ہوا — آگ لگ جائے دہکتے ہوئے انگاروں میں
کس طرح ناوکِ نازک کے لگا لیں جھالے — چارہ گر خود ہی نظر آتے ہیں بیچاروں میں
آنکھ سے آنکھ ملی ٹوٹ پڑی برقِ نظر — دل کا شیرازہ کھلا، مل گیا سیاروں میں
سینہ خالی بھی نہیں، دل بھی نہیں، دل کی جگہ — اک وضعدار، مگر لاکھ وضعداروں میں
گردشِ نقشِ قدم منزلِ دل بن کے رہی — اک سفینہ کو قرار آگیا منجدھاروں میں

پھونکتا رہتا ہوں دل سوزِ محبت سے عمر
خاک کو پاک کیا جاتا ہے انگاروں میں

عمران انصاری

سے بانسری بجاتے رہے ہیں۔ ان کے پاس بانسری ہوتی بھی تھی۔ نفیری کی ایک قسم جو آج بھی یورپ میں بادشاہوں کی تشریف آوری کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے، قدیم مصریوں میں رائج تھی۔ یہ لوگ ایک عجیب وضع کا طنبورہ بجاتے تھے جو عرب میں پہنچ کر مدوّر ہو گیا اور اہلِ عرب اسے دف کہنے لگے۔ اس میں مجیرے جیسی چھوٹی چھوٹی پیتل کی کٹوریاں ہوتی تھیں۔ عرب سے وہ ہسپانیہ پہنچا جہاں اب بھی وہ بہت زیادہ مقبول ہے۔ ہندوستان میں اس کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اس وقت کا شہرۂ آفاق ڈھول افریقہ تک پھیلا اور ہندوستان میں پہنچ کر اپنا سکہ جما بیٹھا۔ مصریوں نے کسی قدر طویل قسم کا ڈھول بجانا شروع کیا جسے غالباً پکھاوج کا جدِ امجد کہا جا سکتا ہے۔

گیتوں کی سنگت میں کسی تار والے ساز کا بجایا جانا ہمیشہ خوش مذاقی کا ثبوت دیتا ہے۔ نئے لوگوں کو تربیت دیتے وقت ہمیشہ اسے زیرِ مشق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ توجہ اس امر پر مبذول رہتی تھی کہ صرف وہی گیت اور راگ نے سکھائے جائیں جو صحیح قسم کے ہوں۔ کوئی محفل اچھے مذاق کی حامل نہیں سمجھی جاتی تھی جبتک کہ اعلیٰ موسیقی کا بھی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ گویے گانے بجانے لوگوں کو خوش کرتے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پھرتے تھے۔ اسوقت بھی ہندوستان میں ہم کو سادھوؤں کی قسم کے ایسے گائک نظر آتے ہیں جو تفریحِ طبع کے لئے دیہاتیوں کے مجمع کے سامنے اشلوک گاتے پھرتے ہیں۔

لیکن مغرب کو اس لحاظ سے مشرق پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہاں موسیقی کی تانیں پوری احتیاط کے ساتھ دائرہ تحریر میں آ سکتی ہیں چنانچہ ماہرینِ موسیقی کے مختلف دلکش نغمے ابتک بجنسہٖ محفوظ ہیں لیکن ہندوستان میں ہر شاگرد مجبور رہے کہ وہ صرف کانوں کا سہارا لیکر مختلف استادوں سے یہ فنِ لطیف سیکھے۔ اس نظام کے باعث ہندوستان بڑے گھاٹے میں رہا کیونکہ بہت سے اچھے نغمے اور پیاری دھنیں چند گھرانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں اور ان سے عام غریب طالبِ علم محروم رہ گئے۔ مغرب کے دوش بدوش مشرق میں بھی اچھے کلاکار پیدا ہوئے ہیں مثلاً حضرت داؤد جو یہودیوں کے بادشاہ تھے۔ اسحاق موصلی، ابن جامی، دمشق میں دربارِ خلافت کا موسیقی اور ہسپانیہ میں الحاکم کے دربار کا ضرباب۔ غالباً اسی یا اس کے لگ بھگ زمانے میں سرزمین ہند کے دو فنکار گوپال نائک اور حضرت امیر خسرو گذرے ہیں جو خلجی خاندان کے عہدِ حکومت میں تھے۔ ان کے بعد تان سین اور برجو باؤلے کا نمبر تھا۔ لیکن ان کی فنی مہارتوں کا کونسا نمونہ ہے جو ہم تک باقی رہ گیا سوائے اسکے جو سینہ بسینہ محض کانوں کے اعتبار کے ساتھ ہم تک پہنچ سکا ہے اور جو بہت ہی قلیل ہے۔

(ڈان کے شکریہ کے ساتھ)

سیّدہ اختر و اقبال

علامۂ اقبال کی غزل پر

تجسّس کے رنگیں نشاں اور بھی ہیں! — ترے منتظر کارواں اور بھی ہیں؛
مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں! — ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

تری جستجو کی نہیں انتہائیں! — مگر پائے ذوقِ طلب کو بڑھائیں؛
اٹھو پردۂ آرزو کو اٹھائیں! — تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں؛

یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

ہر اک ذرہ دردِ تمنا سے مضطر! — ہر اک گام تازہ بہ تازہ ہے محشر!
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر! — نگاہوں سے پوشیدہ لاکھوں ہیں منظر

چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر چاک ہے گل کا دامن تو کیا غم! — خزاں ساز ہے تیرا گلشن تو کیا غم؟
اگر چھن گیا تیرا مامن تو کیا غم! — اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم؛

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ہر اک سانس ہے ایک الہام تیرا! — ستاروں سے آگے ہے پیغام تیرا!
ہر آغاز مصروفِ انجام تیرا! — تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا!

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کبھی تو بھی دیکھ آپ اپنا تماشا! — نہ کر اپنی محدود و بے کیف دنیا!
ازل سے ابد تک ہے تیری تمنا! — اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا!

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

بہارِ سخن آئی ہے پھر چمن میں! — یہی ذکر ہوتا ہے اہلِ سخن میں!
ہے اختر بھی نغمہ سرا اب وطن میں! — گئے[1] دن کہ اقبال تنہا انجمن میں

حقیقت کے اب رازداں اور بھی ہیں

سیّدہ اختر

[1] بہ ترمیم اضافی۔

علامہ اقبال کی فکری وحدت یا تضاد

(۱)

میرا مضمون "علامہ اقبال کے متضاد نظریئے" آجکل کے یکم اور ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کے نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا جواب یکم اپریل کے آجکل میں ہندوستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر تاثیر صاحب اور ۱۵ مئی و ۱۵ جون کے آجکل میں غلام محمد صاحب بٹ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ میں ان تمام حضرات کا دل سے ممنون ہوں جنہوں نے میرے شبہات کے ازالے کی کوشش کی۔ میں سچائی سے علامہ اقبالؒ کے کمال کا معترف ہوں اور اپنے آپ کو ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اگر علامہ کی حیات میں مجھے اس طرف توجہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے شکوک صرف ان کی ہی خدمت میں پیش کرتا۔ اس لئے مجھے بجا طور پر ان اصحاب سے شکایت ہونی چاہیئے جنہوں نے مجھے علامہ مرحوم کا مخالف یا معترض سمجھا۔ علامہ کی شخصیت نے ہماری عقلوں کے علاوہ ہمارے دلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس لئے محل تعجب نہیں اگر جواب دینے والے حضرات کے دلی تاثرات بھی اس خالص علمی بحث میں شامل ہو جائیں۔ بہرحال الزامات کی صفائی اور اصل مضمون کے متعلق مجھے عرض کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے کم اور بٹ صاحب نے زیادہ یہ کوشش کی ہے کہ علامہ کی عبارتیں نقل فرما دیں جن کا تعلق موضوع سے ہونا ضروری نہیں۔ اس کو یہ فائدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ناظرین کی توجہ اصل بحث سے ہٹ جائے۔ بعض عبارتیں موضوع سے متعلق ہیں بھی تو ایک رخی ہیں یعنی ان کے خلاف علامہ کے دوسرے ارشادات موجود ہیں جن سے تضاد ثابت ہوتا ہے۔ ان کا نہ ذکر کیا گیا وتطابق کی کوشش کی گئی اور سوائے تاویلات کے نہ کسی نظریئے کے متعلق یہ کہا گیا کہ علامہ نے اس قول سے رجوع فرما لیا تھا۔ بعض سوالات کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی۔

میں نے اپنے مضمون میں علامہ کا کوئی مسلک متعین نہیں کیا، وہ متضاد اقوال کی موجودگی میں ایسا کر بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا قصوروار ٹھیرایا گیا ہوں کہ میں نے "غالباً یہ فرض کر لیا ہے کہ اقبال کسی خاص گروہ یا مسلک کے پابند ہونگے" مقصد غالباً یہ ہے کہ جو شخص کسی خاص فرقے کا پابند ہو اسے متضاد باتیں کہنے کی اجازت ہے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ میکش نے لکھا ہے کہ اقبال کا یہ تضاد نامحمود ہے۔ حالانکہ میں نے اپنی خلش کو نامحمود عرض کیا تھا معلوم نہیں یہ گستاخی کی تعلیم ہے یا تنبیہ۔ ڈاکٹر صاحب نے تسلیم فرمایا ہے کہ

"تضاد اگر ہے تو کارگاہِ عالم میں ہے — انسانی زندگی کے عام مظاہر میں، خدا کی صفات میں ہے — قرآن میں ہے — میکش کے اقوال میں — اس لئے اقبال کے تضاد پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ تضاد حقیقت ہے اور علامہ اقبال ترجمانِ حقیقت تھے — ایک ہی چیز کا انکار اور اقرار بذاتِ خود ناروا نہیں۔"

ان بیانات سے میرے شبہات کا جواب مل جاتا ہو پھر بھی ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ازراہ معارف نوازی ہر عنوان کے متعلق راہ نمائی فرمائی ہے ڈاکٹر صاحب کا مضمون مرتب ہے، سنجیدہ ہے اور طنز سے پاک ہے۔

بٹ صاحب نے اپنی تمہید چند دعووں اور وحدۃ الوجود کی بحث میں مخلوط فرما دی ہے۔ بٹ صاحب کے ارشادات ہیں۔

"جذبات کسی مفکر کے ہوں یا عامی کے غیر مستقل و غیر مستقیم ہوتے ہیں:" "اقبال چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے مطالعے میں بھی یہی اصول کارفرما ہونا چاہیئے۔۔۔" "ہمیں اقبال کو سمجھنے کے لئے اقبال ہی سے استمداد و استنتاج کرنا چاہیئے۔"

بات وہی ہے جو ڈاکٹر تاثیر صاحب نے فرمائی ہے۔ انداز بیان ذرا مختلف ہے یعنی اقبال کے جذبات غیر مستقل و غیر مستقیم تھے اس لئے وہ کبھی کچھ فرماتے تھے اور کبھی کچھ۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے اس لئے یہ بات ان کے لئے اصولی طور پر جائز تھی۔ علاوہ ازیں اقبال کے سمجھنے کے لئے کسی منطقی اصول کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اقبال ہی سے امداد حاصل کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ بٹ صاحب نے ایک دعوے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اقبال کا کلام سریع التاثیر اور عسیر الفہم ہے۔" سوال یہ ہے کہ یہ تعریف اقبال کے کلام کی ہے یا سمجھنے والوں کی جن پر سمجھنے سے پہلے یا بغیر سمجھے ہوئے تاثیر ہو جاتی ہے۔

میکش قصوروار ہے کہ اس نے "وحدۃ الوجود کا تذکرہ چھیڑا جو بہت فرسودہ ہو چکا ہے" لیکن میکش معذور ہے اگر علامہ اقبال نے یہ فرسودہ تذکرہ نہ چھیڑا ہوتا اور میکش نے اس میں تضاد محسوس نہ کیا ہوتا تو یہ تذکرہ نہ چھیڑا جاتا اس کے بعد بٹ صاحب خود بھی اس فرسودہ تذکرے کے چھیڑنے کا جواز اس طرح ظاہر فرماتے ہیں۔

"جس کی (وحدۃ الوجود کی) چند در چند تاویلیں بھی ہو چکی ہیں ہمہ اوست ہمہ از وست ہمہ با اوست جبر و قدر، وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود وغیرہ ایک ہی گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ پھر اقبال کی توضیح و تشریح کیوں ناکام رہے۔"

میکش اکبرآبادی

(آگے چل کر فرماتے ہیں) زرتشت کی ثنویت بھی درحقیقت
وحدۃ الوجود کی ایک توضیح تھی "

بٹ صاحب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کو مدلل و مشرح فرمائیں کیونکہ اب تک تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود ایک ہی ہے اور ہمہ ازوست یا وحدۃ الشہود اس کے متضاد دوسرا نظریہ ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہے۔ ثنویت اور وحدت میں صریحی تضاد ہے۔ ہمہ بہ اوست میرے علم میں تو مہمل ہے البتہ اگر بٹ صاحب تشریح فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔ اسی طرح جبر و قدر اور وحدۃ الوجود سے علاقہ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ جبر و قدر کا تعلق انسان کے اختیار و عدم اختیار سے ہے نہ اس سے کہ وجود واحد ہے یا کثیر۔ بٹ صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

"اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا" وہ حرکت و عمل کو زندگی
سمجھتے تھے اور حیات مطلق کو خدا، کیا یہ وحدۃ الوجود نہیں
کیا یہ ایسا تصوف نہیں جو عین قرآن ہو۔ اسی حرکت و عمل اور
اثبات خودی کی وجہ سے وہ شیطان کو بطور ایک اولوالعزم کردار
کے پیش کرتے ہیں "

یہ مسلّم ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا مگر یہ محتاج تشریح و ثبوت ہے کہ یہی فلسفہ وحدۃ الوجود ہے یا عین قرآن ہے۔ علامہ اقبال حرکت و عمل کو زندگی سمجھتے تھے اور زندگی کو خدا یعنی حرکت و عمل کو خدا سمجھتے تھے اور حرکت و عمل ہی کی وجہ سے شیطان کو اولوالعزم سمجھتے تھے۔ بہرحال میرے شبہات کا اس منطق سے کوئی تعلق نہیں شیطان کے متعلق میں نے صرف ایک شبہ پیش کیا تھا کہ علامہ خودی کو خدا کے سامنے نہ چھوڑنے کی تعلیم دیتے ہیں، فراق و جدائی کی تبلیغ فرماتے ہیں اور بالکل یہی تعلیم ابلیس کی زبان سے دیتے ہیں۔

(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو آجکل ۱۵ فروری ۱۹۶۰ء)

اس صورت میں ابلیس کے اور علامہ کے فلسفے میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب نے دینا ضروری نہ سمجھا اور بٹ صاحب نے صرف شیطان کا تذکرہ ہی کافی خیال فرمایا۔

بٹ صاحب کی رائے میں آریائی وحدۃ الوجود اور قرآنی وحدۃ الوجود بظاہر ایک اور درحقیقت دو متضاد نظریئے ہیں۔ ایک کا ملجا و ماوا بے عملی اور نفی خودی دوسرا سراپا عمل ہے۔ نفی خودی کی وجہ یہ قرار دی جاسکتی ہے کہ وحدۃ الوجود خواہ آریائی ہو یا قرآنی ایک وجود کے سوا سب کی نفی کرتا ہے اس لئے خدا سے آنکھیں لڑانے والی خودی کی بھی نفی ہوجاتی ہے جو غیر اللہ ہے علامہ بھی "دل ز غیر اللہ بپرداز اے جوان" فرماتے ہیں۔ البتہ عمل اور بے عملی کا تعلق اس مسئلے سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ نہ بٹ صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے میں علامہ اقبال نے بھی ان شعروں میں یہی بات فرمائی ہے جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں :۔

<table>
<tr><td>آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اسکے مقامات</td><td>خود گیری و خودداری و گلبانگ انا الحق</td></tr>
<tr><td>خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات</td><td>محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست</td></tr>
</table>

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ " وہی شعر جس سے تضاد نکالا گیا ہے تضاد کے وہم کو دور کرتا ہے " بٹ صاحب نے خود سوچنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ میں نے ان شعروں میں تضاد کب ظاہر کیا تھا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ دو متضاد نظریوں کے علاوہ علامہ اقبال کے یہاں ایک تیسرا خیال بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ وحدۃ الوجود سے قوموں کی ترقی و تنزل کا کوئی تعلق نہیں جن عبارات سے تضاد ثابت ہوتا ہے ان کے متعلق بٹ صاحب نے خاموشی اختیار کرلی تاثیر صاحب نے اتنی جرأت فرمائی کہ معناً تسلیم تو کرلیا مگر فرمایا کہ "مجھے نثر و نظم کا مقابلہ ناپسند ہے۔ ایک شعر بھی تو مخالفت میں نہیں نکلتا "۔ میں عذر خواہ ہوں تاثیر صاحب کی پسند کا لحاظ نہ کرسکا۔ اگر نثر سے وحدۃ الوجود کی مخالفت نکلتی ہے تو نثر ہی سے موافقت بھی ثابت ہوتی ہے۔ نظم کو نظر انداز فرما دیجئے ڈاکٹر تاثیر صاحب کو ملفوظات کا پیش کردہ یہ قول تسلیم ہے کہ " وحدۃ الوجود مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں۔ اس پر بحث اسلامیت کے لئے ضروری نہیں " لیکن تضاد تسلیم نہیں فرماتے ہیں " میں نے اقبال کے اقوال کو خلاصہ کیا ہے ان میں تضاد کا شائبہ تک نہیں۔ میکش صاحب نے وحدۃ الوجود کی فلسفیانہ صداقت اور وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر دو مختلف شقوں کو ایک سمجھ کر مغالطہ کیا ہے " میں تاثیر صاحب کے اس شائستہ انداز تحریر کا ممنون ہوں مجھے واقعی مغالطہ ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن بٹ صاحب کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری طرف سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ اور مغالطہ دینے کے لئے علامہ کی عبارتیں حذف کردی جاتی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس موقع پر جو میں نے تضاد ظاہر کیا تھا اسکا وحدۃ الوجود کی محمود اور مذموم تفسیر سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر ملاحظہ فرمائیے کیا ان دو جملوں میں تضاد نہیں؟

" ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں " ...... مذہب اسلام
کی رو سے خدا اور کائنات ... ایک ہی کل کے مختلف
اجزا ہیں "

ڈاکٹر تاثیر کی یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر کہ " میکش نے اس بحث میں اقبال کو وحدۃ الوجود کا منکر قرار دیتے ہوئے کسی شعر کا حوالہ نہ دیا۔ میرے خیال میں از روئے استدلال نثر بہ نسبت نظم کے زیادہ واضح

ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس بحث میں اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کا مخاطب واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ مگر بٹ صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ مجھے معاف فرمائیں اسے ہم دعظ تو کہہ سکتے ہیں مگر ایک طالب علم کے لئے اس میں کوئی مواد نہیں ہے اس کے علاوہ بٹ صاحب نے وحدۃ الوجود کی جو تعریف فرمائی ہے وہ نہ مستند ہے نہ صحیح۔ اسی طرح علامہ اقبال کا نظریۂ توحید بھی اقبال کے الفاظ میں اور انہی کے حوالے سے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ دوسروں کے مذاہب و نظریات پیش کرتے وقت اہل علم اس کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بٹ صاحب نے بہت سی غیر متعلق بحثیں پیدا کر دی ہیں جن کے متعلق سردست کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک نیا عنوان مجھے بٹ صاحب کے مضمون سے اور حاصل ہوا۔ امید کہ کوئی صاحب اس پر بھی روشنی ڈالیںگے۔ بٹ صاحب علامہ اقبال کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:۔

> "اسلام کی مذہبی زندگی میں اس تجربہ کی کاملیت منصور حلاج کے مشہور الفاظ" انا الحق" کی صورت میں اپنے معراج کو پہونچی حلاج کے معاصرین اور متاخرین نے اس کی تفسیر وحدۃ الوجود کے رنگ میں کی لیکن ایم مینگنن کی مدونہ اور شائع کردہ "جزئیات حلاج" نے کوئی شک و شبہ نہیں چھوڑا کہ صوفی شہید کا مفہوم خدا کی لامحدودیت اور مطلقیت سے انکار کرنا نہیں تھا اس کے تجربے کی سچی ترجمانی سمندر میں قطرے کا مل جانا نہیں بلکہ ایک بے پایاں تر شخصیت میں انسانی خودی کے استقلال و واقعیت کا ایک غیر فانی جملے میں دلیرانہ تصدیقی احساس کا اظہار تھا"

اس عبارت کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے اس مکتوب کی چند سطریں ملاحظہ ہوں جو رسالہ جوہر اقبال نمبر ۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

> "منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطبعاسین جس کا ذکر ابن ندیم کی فہرست میں ہے فرانس میں شائع ہوگیا ہے۔ مولف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسینؒ کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کو سزا دینے میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ کہ متقدمین صوفیہ قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے"!

معلوم نہیں منصور کی یہ توصیف و تنقیص وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر کے اعتبار سے ہے یا محمود تفسیر کے اعتبار سے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک بار اس کی مذموم تفسیر کی جائے اور دوسری مرتبہ محمود۔

بٹ صاحب فرماتے ہیں:۔ "اقبال اور رومی کا تصوف انسان کو مجبور محض نہیں مانتا اور نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا" نفی خودی کے ثبوت میں علامہ اقبال کے جو شعر میں نے پیش کئے تھے اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب نے دیا نہ بٹ صاحب نے لیکن مزید برآں بٹ صاحب نے یہ دعوی اور کر دیا کہ رومی کا تصوف بھی نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا۔ معلوم نہیں رومی سے یہ سلسلہ ملانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ مغربی فلسفے سے اس کی سند بآسانی مل سکتی تھی۔ رومیؒ شدت سے نفی خودی کی تلقین کرتے ہیں اور یہی مسلک تمام اسلامی صوفیہ کا ہے۔ خواہ وہ بقول علامہ اقبال حر کی یعنی نقشبندی ہوں یا دوسرے حضرات۔ رومی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

چیست توحید خدا آموختن	خویشتن را پیش واحد سوختن
گر ہمی خواہی کہ بفروزی چو روز	ہستی ہمچو شب خود را بسوز
ہستیت در ہست آں ہستی نواز	ہمچو مس در کیمیا اندر گداز
روئے در دیوار کن تنہا نشیں	وز وجود خویش ہم خلوت گزیں
عاشقاں را کار نبود با وجود	عاشقاں را ہست بے مایہ سود
ہیچکس را تا نہ گردد او فنا	نیست رہ در بارگاہ کبریا
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی	نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

بٹ صاحب دیباچہ اسرار خودی کا ایک حصہ نقل کرنے کے باوجود یہ ثابت فرما سکے کہ میکش نے یہ اقتباس مغالطہ دینے کیلئے پیش کیا تھا اور استتاراً یہ سعی کی تھی کہ علامہ کو تصوف کا مخالف ثابت کرے اگر میں ایسا محسوس کرتا تو صراحت سے عرض کرتا۔ استتار کی کیا ضرورت تھی۔ بٹ صاحب اقبال کی عظمت پرانی اصطلاحات کی تبدیلی میں سمجھتے ہیں حالانکہ اصطلاح کی تبدیلی بجائے خود کچھ بھی اہم نہیں۔ پھر اصطلاح کی تبدیلی کا تضاد سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی اصطلاحات پر قابو یافتہ نہ ہو اور کبھی ایک لفظ کو اپنے مصطلحہ معنوں میں اور کبھی دوسروں کے مصطلحہ معنوں میں استعمال کرے اور کوئی قرینہ تبدیل معنی پر نہ ہو تو ضرور تضاد کی غیر حقیقی یا حقیقی رونمائی ہو سکتی ہے۔ بٹ صاحب کی رائے علامہ اقبال کے متعلق غالباً یہ تو نہ ہوگی ○

(باقی آئندہ)

خالہ جمالو

محمد یٰسین ثانی

سلہ (کسی چیز کے گر کر ٹوٹنے کی جھنکار کی آواز)

شکیل:۔ دیکھ رہی ہیں خالہ جمالو آپ انکا غصہ۔

نوشابہ:۔ وہ کیا دیکھیں گی ہفتوں سے تیل کے لئے چیخ رہی تھی روکھے بال لئے ہوئے پھر رہی ہوں آج دام دئے تو یہ موا جگ اور گلاس آگیا آگ لگے اس کمبخت میں جانے اس کی کونسی ناک پڑ رہی تھی۔

خالہ جمالو:۔ اے تو اب بیٹی تم ہی چپ رہو۔

شکیل:۔ وہ یوں تھوڑی چپ ہوں گی جب تک میرا خون پانی ایک نہ کردیں گی۔ اسوقت تک نہ زبان تالو سے لگے گی نہ چین آئے گا۔ مزاج تو دیکھئے عرش معلیٰ پر ہیں گلاس مجھ پر پھینکا گیا ہے۔ خدا کی مار مجھ پر گرہستی کے خیال سے لے آیا تھا۔ (جگ اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور وہ بھی چکنا چور ہو جاتا ہے)

خالہ جمالو:۔ لو چلو چھٹی ہوئی۔ نہ موا تیل آیا نہ جگ اور گلاس رہا۔

نوشابہ:۔ اے تیل آئے یا چولھے میں جائے میں بھی موئے جھوٹے چھپر وگی بیلر لیا ہے۔

شکیل:۔ جو نخرے لئے پھر دیا مگر اب میرے منہ نہ لگو میں نے کہہ دیا ہے۔

خالہ جمالو:۔ اچھا اب تم ہی غم کھاؤ بھیا۔

نوشابہ:۔ نہیں میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ آخر انکا ارادہ کیا ہے۔

خالہ جمالو:۔ کر یہ ہے بیٹا مرد کی بات کا جواب نہیں دیتے ہیں میری جانو۔

شکیل:۔ جواب؟ جواب تو جب تک میری سات پشت کو وہ نہ سنا لیں گی اسوقت تک ان کو چین آہی نہیں سکتا مگر میں بھی اب چپ رہنے والا نہیں ہوں سکان کھول کر سن لو۔

خالہ جمالو:۔ بیٹا بری بات ہے غصہ حرام ہوتا ہے۔

نوشابہ:۔ نہیں خالہ آج انکو دل کی بھڑاس نکال لینے دیجئے۔

خالہ جمالو:۔ اچھا ہٹو تو سہی یہاں سے، چلو تم ادھر باورچی خانہ میں۔

شکیل:۔ دل کی بھڑاس نکالوں تو بیگم صاحب تمہاری دنیا سیاہ ہو کر رہ جائے تم ہو کس ہوا میں۔

خالہ جمالو:۔ اچھا خیر بیٹا تم ہی مان جاؤ۔ چلو تم ادھر اپنے کمرے میں۔ میرا بھی کوئی حق ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔

شکیل:۔ مگر آپ دیکھ رہی ہیں ان کا تنتنا۔ آپ کی بھی نہیں سننے دیتیں۔

نوشابہ:۔ اے میں کیا اور میرا تنتنا کیا کوئی ہوتی سننے والی تو پتہ بھی چل جاتا۔

خالہ جمالو:۔ آؤ بیٹا شکیل۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اپنے کمرہ میں چلو۔ ہٹو یہاں سے اور اب تم بھی چپ رہو نوشابہ۔ سمجھیں کہ نہیں۔ (خالہ جمالو شکیل کو لے کر جاتی ہیں کمرہ میں پہنچ کر)

شکیل:۔ بدنام ہے میرا غصہ کہ صاحب بارود کے بنے ہوئے ہیں۔ آگ بگولا ہیں۔ اور یہ ہیں وہ ہیں۔

خالہ جمالو:۔ (آہستہ سے) تو یہ ہے بھیا۔ عورت کا ایسا غصہ بھی کس کام کا کہ مرد غم کھا جائے اور وہ نہ مانے۔ تم کو تو بھیا میں لے بھی آئی۔ مگر وہ میرے قابو میں نہ آئی۔

شکیل:۔ جی ہاں یہ ان لوگوں سے کہیے جو ان کو بے زبان اور مجھکو آتشبازی کا قلعہ اور توپ کا گولہ کہتے ہیں۔

خالہ جمالو:۔ منہ دیکھی نہیں کہتی ہوں بھیا۔ میں نے تو تم کو کبھی غصہ کرتے ہی نہیں دیکھا۔ غصہ کرتے تو اسی وقت آفت آجاتی۔

شکیل:۔ خالہ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دن رات کی یہی کل کل ہے۔ گھر کی برکت اٹھ گئی۔ ادھار سے تعمیر رکھا ہے مگر یہ نحوست کسی طرح جاتی ہی نہیں میں بھی آخر آدمی ہوں کہاں تک غم کھاؤں۔

خالہ جمالو:۔ بیا میرے لئے جیسے تم ویسی وہ۔ سچ خدا کو بھی منہ دکھانا ہے تم جیسی برداشت سے کام لیتے ہو دوسرا مرد ایسا کو ہی نہیں سکتا سچ سچ (آہستہ سے) اس کا مزاج ہے بہت چڑچڑا۔

شکیل:۔ اب بتلایئے بھلا اس میں غصہ کی کونسی بات تھی تیل کے لئے جیب میں دام پڑے تھے کہ راستہ میں نیلام ہوتا ہوا ملا۔ یہ جگ اور گلاس کا سٹ کسی طرح بھی ڈھائی تین روپیہ سے کم کی چیز نہیں تھی۔ میں نے ایک روپیہ کی بولی بولدی اور میرے نام چھوٹ گئی۔

خالہ جمالو:۔ بھلا بتاؤ مفت کا تھا جو۔ تیل نگوڑا سے کا کیا ہے مگر یہ تو گت کی ایک چیز گھر میں آگئی تھی۔

شکیل:۔ گت کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ ہر مہینے ایک چائے کا سٹ لاتا ہوں اور آٹھویں دن قسم کھانے کے لئے بھی کسی پیالی میں کنڈا دکھا دیجئے تو جو چور کی وہ میری سزا۔

خالہ جمالو:۔ اے تو میں دیکھتی ہی ہوں۔ موئے چائے کے برتن ٹھیکریوں کی شکل کے میں نے تو ہمیشہ دیکھے اور ہمیشہ نئے سٹ آتے ہوئے بھی دیکھے۔

شکیل:۔ خالہ کیا مجال جو وقت پر ایک چیز بھی گت کی اس گھر سے نکل آئے

خالہ جمالو:۔ بیٹا یہ باتیں ہیں ڈھنگ کی اور ڈھنگ ان میں نام کو نہیں ہے گھرداری جسے کہتے ہیں وہ تو جانتی ہی نہیں۔

شکیل:۔ یہی بات اگر میں کہہ دوں تو ابھی لینے کے دینے پڑ جائیں پھر یہ وقد میکے چلی جائیں گی۔

سلہ بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی

خالہ جالو:- ہائے کمبخت۔ اور جو تمہارے منہ سے بھی کچھ نکل جائے۔ بھائی بندہ بشر ہے کسی وقت منہ سے نکل جائے کہ جاؤ اب کبھی صورت نہ دکھانا تو پھر کیا ہو۔

شکیل:- ہو گیا۔ جو کچھ بھی ہو ان کی بلا سے۔ وہ تو خدا سے چاہتی ہیں کہ وہ میکے میں رہیں اور دنیا مجھ پر تھوکے۔

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:- خالہ ـــ اے خالہ ـــ ذرا ادھر آؤ۔

خالہ جالو:- (آواز دے کر) آ رہی ہوں بیٹی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب اسوقت تم ہی چپ ہو رہو (جاتی ہیں)

نوشابہ:- ابھی تک وہ میرا دکھڑا آپ سے رو نہیں چکے۔

خالہ جالو:- کیا بتاؤں بیٹا۔ میرے لئے تو جیسی تم ویسے وہ۔ مگر کاہے کو ایسے مردوے ہوتے ہوں گے کہ گھر والوں کا دم ہی نکال لیں۔

نوشابہ:- آخر کیا کہہ رہے تھے۔

خالہ جالو:- اے بہن ختم کرو۔ جو کچھ انھوں نے کہا میں نے جواب دے دیا۔ اب جو کچھ تم کہو وہ بھی سن لوں گی۔ مگر میں نے تو ایسا آگ کا بنا ہوا مزاج دیکھا ہی نہیں۔

نوشابہ:- اے خالہ آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ آپ کی وجہ سے تو اسوقت کچھ بولے ہی نہیں، وہ تو کہیے کہ میں خود چپ ہو گئی نہیں تو میکے بھیجنے کے لئے ابھی ڈولی لاکے کھڑی کر دیتے۔

خالہ جالو:- ہائے میرے اللہ۔ اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی۔ جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی۔

نوشابہ:- کیا کہا میں دھمکی دیتی ہوں میکے جانے کی یا اٹھتے بیٹھتے مجھ ہی کو میکے کے طعنے ملتے ہیں۔

خالہ جالو:- اے بیٹا چپ بھی رہو کیا میرے اس بڑھے چونڈے میں سیاہی لگواؤ گی، اس نے تو جانے کیا کیا کہا۔ مگر میں تو کہتی ہوں کہ بیٹی اب جانے ہی دو۔

نوشابہ:- نہیں بتلایئے تو آخر اور کیا کیا کہا۔ میں بھی سنوں۔

خالہ جالو:- نہ بی بی۔ بندی ان باتوں سے بہت دور بھاگتی ہے کہ ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر کرتی پھرے۔ منگائی بجھائی کرنے پر آؤں تو اس نے تمہارے پھوہڑ پن، تمہاری بدمزاجی، تمہارے بے ڈھنگے پن کی جتنی باتیں کہی ہیں سب ہی کہہ دوں اور بیکار بات میں بات بڑھ جائے۔ میں تو چائے کے سٹوں کا بھی ذکر کرنا نہیں چاہتی کون بیوی میاں کے قصہ میں اپنی گردن پھنسائے۔

نوشابہ:- نہیں خالہ تو کیا میں ان سے کہنے جا رہی ہوں مگر مجھے بھی تو معلوم ہو جائے کہ میری طرف سے ان کے دل میں کیا کیا غبار ہے۔

خالہ جالو:- آج کو لڑائی ہے میاں بیوی کی لڑائی ہی کیا۔ سبات پیچھے لڑائی اور بات پیچھے میل۔ بعد میں گردن ماری جائے خالہ نگوڑی کی۔ تو بیوی مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ تم جانو تمہارا کام۔ مگر یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے جو سب کچھ ٹھنڈے دل سے سنتی ہو۔

نوشابہ:- (اطمینان سے) نہیں خالہ تمہاری قسم میں ان سے نہ کہوں گی۔ مگر مجھے بتایئے تو سہی آپ کو میری جان کی قسم۔

خالہ جالو:- یہ تم میں نوشابہ بڑی بری عادت ہے کہ ذرا سی بات میں جان کی قسم دے دی۔ اے کہہ کیا رہا تھا۔ یہی کہہ رہا تھا کہ ایسی منحوس ہیں کہ اس گھر کی برکت اڑا دی ہے۔ ڈھنگ ایسے ہیں کہ مہینے پیچھے نیا چائے کا سٹ لاتا ہوں اور چار دن میں پیالیوں کے کنڈے تک غائب ہو جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے شبہ یہ ہے کہ نئے سٹ تم میکے بھجوا دیتی ہو اور گھر میں پرانے کے پرانے رہ جاتے ہیں۔

نوشابہ:- خدا غارت کر دے مجھے جو میں ایسی چھچھوری باتیں کروں اور نہ میرے میکے والے ایسے۔ ان کا بس چلے تو وہ فوراً انکا گھر بھر دیں ابھی ابا جان نے میز کرسیاں ان کو منگا کر دی ہیں کہ اپنا دفتر باہر کے کمرے میں سجاؤ بائیسکل ٹوٹ گئی تھی تو نئی بائیسکل لے کر دی اور صاحب ہیں اسکا یہ صلہ ملا ہے کہ میں اپنے یہاں کے برتن چرا چرا کر اپنا میکہ بھر رہی ہوں۔

خالہ جالو:- اے چپکے چپکے بولو۔ کیا سچ مچ میرے منہ میں کالک لگواؤ گی۔ کہ اچھی خالہ آئی تھیں جو آگ لگا کر چلی گئیں۔ میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے اور تم سے بھی کہتی ہوں کہ خدا کے لئے میری ٹانگ بیچ میں نہ کھینچو کوئی سنے تو کہے کہ عجب لتری موئی عورت ہے۔

نوشابہ:- قسم کھا کے کہتی ہوں خالہ کہ میرے میکے والے ان کے اتنی سی چیز کے شرمندہ نہیں ہیں۔

خالہ جالو:- اے میں نہ جانتی ہوں تو مجھ سے کہو کبھی وہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ ساس الگ داماد پر جان چھڑکتی ہیں اور سسر تو جیسے داماد کے نام پر مٹے ہی جاتے ہیں مگر وہ تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔

نوشابہ:- اے بس یہ خاطر میں لاتے ہیں کہ میں چائے کے نئے سٹ ہر مہینہ بھیجا کرتی ہوں اور یہ بیچارے ایسے چپ رہنے والے کہ چپ ہو رہتے ہیں۔

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:- (بلند آواز سے) خالہ ذرا میری بات سن جایئے۔

خالہ جالو:۔ آئی بیٹا (نوشابہ سے) بیٹی میری لاج تیرے ہاتھ ہے کہیں تو اس سے سب باتیں لگا دے۔

نوشابہ:۔ آپ کی بھی کیا باتیں ہیں خالہ (خالہ جاتی ہیں)

شکیل:۔ اب تک دہی لنگیٹر لگی ہوگی۔ اب سمجھے کہ دو تین دن کے لئے گویا آفت بلا ٹلی۔

خالہ جالو:۔ کیا بتاؤں بھیا۔ یہ عمر ہونے کو آئی مگر میں نے تو اس گھر کا سا کارخانہ کہیں دیکھا نہیں۔ اے کون سے سسرال والے داماد کے ساتھ سلوک نہیں کرتے مگر وہ سلوک گنواتے نہیں پھرتے تو بہ ہے اللہ توبہ ہے۔

شکیل:۔ سلوک؟ یعنی میرے ساتھ کوئی سلوک بھی کیا ہے ان کے میکے والوں نے۔

خالہ جالو:۔ اے ہے بھیا کیا مجھ کو گردن میں ہاتھ دے کر نکلواؤ گے اس گھر سے۔ لو اور سنو وہ سنے تو سمجھے کہ میں نے آکر یہاں لگائی بجھائی کی ہو گی۔ بس کچھ نہیں جانتی بھیا تم جانو اور تمہارا کام مگر خوش باش ہے ایسی بیوی کو جو میاں کے لئے ایسی بات کہے۔

شکیل:۔ بتائیے نا آخر کیا فرمایا انھوں نے اور کیا سلوک ہوا ہے ان کے میکے والوں کی طرف سے۔

خالہ جالو:۔ کچھ نہیں بھیا کچھ نہیں۔ میں تمہاری ان سے اور ان کی تم سے اگر جا کر لگاؤں تو مفت خدا میں بات کا بتنگڑ بنے گا اور بیچ میں ماری جاؤں گی میں۔

شکیل:۔ نہیں خالہ میں ان سے کہنے تھوڑی جا رہا ہوں۔ آپ بتائیے نا کہ یہ معمہ کیا ہے۔ مجھے تو کوئی سلوک یاد نہیں پڑتا۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا کیا نوازشیں اور پرورشیں ہیں آپ کو خدا کی قسم بتائیے۔

خالہ جالو:۔ اے میں کہتی ہوں تم ایک بات کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مگر بھیا جب تم جانتے ہو تو پھر کیوں ہر چیز سر جھکا کر لے لیتے ہو۔ موئی دمڑی کی چیز اور سوا لاکھ کا احسان۔

شکیل:۔ خدا کے واسطے بتائیے کہ میں نے کون سا احسان لیا ہے۔ میں ان سے یا کسی سے کچھ نہ کہوں گا میں وعدہ کرتا ہوں مگر مجھ کمبخت کو معلوم تو ہو جائے۔

خالہ جالو:۔ اے کمبخت ہوں تمہارے دشمن۔ کیا اچھی زبان ہے۔ موئی دو ٹکے کی پیر گاڑی کیا دیدی کہ جیسے میرے بچے کو خرید لیا۔

شکیل:۔ بائیسکل کا ذکر ہے۔ اب دیکھئے یہ کم ظرفی اور اوچھا پن۔ میں اسی لئے انکار کرتا تھا تو ان کے والد صاحب بھی برہم تھے اور خود بدولت بھی ناراض تھیں۔ قصہ یہ ہوا خالہ کہ وہ جوان کے بھائی صاحب ہیں نالس کی گانٹھ، ایک دن بائیسکل اٹھا لے گئے اور اس کو کسی موٹر سے ٹکرا کر چرخہ بنا لائے۔ میں چپ ہو رہا۔ خسر صاحب کو جو خبر ہوئی تو وہ نئی بائیسکل لے کر تشریف لائے۔ میں نے لاکھ کہا کہ مجھ کو ضرورت نہیں ہے میں اسی کو ٹھیک کرا لوں گا۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور اس کو میرے سر مونڈھ گئے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں پھر کیا کرتا۔

خالہ جالو:۔ اے بیٹا سسرال والے دیتے ہی ہیں مگر احسان گنواتے نہیں ہیں۔

شکیل:۔ تو احسان کس نامعقول نے کیا۔

خالہ جالو:۔ اور ہاں یہ احسان بھی نہیں مگر وہاں تو سینکڑوں احسان ہیں۔ ایک ایک میز کرسی تک کا۔ مگر بھیا میں کچھ نہیں کہتی۔

شکیل:۔ میز کرسی۔ خدا کی قسم جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں اور یہ میز کرسیاں سب ان کے منہ پر مار آؤں۔

خالہ جالو:۔ چپکے چپکے بیٹا چپکے چپکے۔ کیوں میری جان عذاب میں ڈالو گے۔ میں تو خود ان جھگڑوں سے الگ رہتی ہوں۔ اپنے ایک کونے میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔

شکیل:۔ خالہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میز کرسیاں میرے لئے عذاب بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کا قصہ بھی سن لیجئے۔ خسر صاحب محترم و معظم اب میں کیا کہوں ان بزرگ کو۔

خالہ جالو:۔ ہاں بیٹا خسر بجائے باپ کے اور وہ تو ویسے بھی ماموں ہیں تیرے۔

شکیل:۔ اجی ایسے ماموں بہت ہوتے ہیں۔ مجھے تو شرم آتی ہے ان کا بھانجہ یا داماد کہلاتے ہوئے۔ تو خالہ ان حضرت نے کسی کا سامان قرق کرایا تھا اس سامان کی تمام کار آمد چیزیں تو اپنے یہاں رکھ لیں اور جو کوڑا کرکٹ تھا وہ میرے سر پر ڈھیر کر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باہر کا کمرہ میرے بیٹھنے تک کے کام کا نہ چھوڑا۔ حال یہ ہے کہ کسی میز کا پایہ ندارد ہے تو کسی کرسی سے بید غائب۔ کسی کا ہتھہ نہیں ہے تو کسی میں سب کچھ ہے مگر سب الگ الگ۔ نہ جانے کیا آخر ہے۔

خالہ جالو:۔ اور اس موئے کباڑ خانے کا احسان اتنا بڑا۔ واہ وا واہ۔

شکیل:۔ آج تک خدا کے فضل اور آپ کی دعا سے ایک پیسہ کا ان سسرال والوں سے شرمندہ نہیں ہوں۔ تو یہ بیگم صاحب آپ سے یہی کہتی تھیں کہ میرے گھر والوں نے بائیسکل کی خیرات دی اور ان میز کرسیوں سے مجھ کو نوازا۔

خالہ جالو:۔ خیر ہو گا بیٹا۔ تمہارا دیکھنے والا خدا ہے کہ تم نے اپنی سسرال والوں کے ساتھ کیا کیا اور اس کا بدلہ تم کو کیا ملا۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ تم خود دیہی سالیوں کے ساتھ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سلوک کرتے رہتے ہو۔ یہ تو جو ہوا سے بتاؤ۔

شکیل:۔ خدا گواہ ہے خالہ کہ آج تک یہ ذکر زبان پر نہیں لایا تھا مگر اب کہا گیا ہے تو کہتا ہوں کہ خسر صاحب نے عاجز آکر میاں سلیم یعنی انھی بیگم صاحبہ کے بھائی صاحب کی تعلیم چھڑا دی تھی کہ میں اب خرچ نہیں برداشت کر

میں نے کہا کہ لاؤ میں اس کی تعلیم کا ذمہ لے لوں۔ آج تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور میں برابر کالج کی فیس کتابوں کا خرچ، ماسٹر کی تنخواہ سب اپنے ذمہ لئے ہوں۔ مگر اس کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔

خالہ جالو:۔ بیٹا یہ تمہارا ہی جگرا ہے کہ اس تھوڑی سی پونجی میں ایسے ایسے ہاتھی باندھے ہوئے ہو اور پھر یہ باتیں بھی سنتے ہو۔

شکیل:۔ اور اسی پر کیا ہے ابھی بیگم صاحبہ کی بہن صاحبہ کی شادی میں تنخواہ کٹوا کر قرض لیا اور جوڑے کے ساتھ زیور تک دے کہ بھائی بیوی کا دل نہ میلا ہو مگر اس کا پھل یہ مل رہا ہے۔

خالہ جالو:۔ ہاں ہاں بیٹا عالی حوصلہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی تو میں نے اس سے بھی کہا کہ وہ بھلا بائیسکل اور ان میز کرسیوں کا احسان کیا لے گا۔ جو اس باپ کا بیٹا ہے جس نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:۔ خالہ ذرا ادھر آئیے۔

خالہ جالو:۔ آتی ہوں بیوی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب تم جاؤ (چھوڑو اس ذکر کو جاتی ہیں)

نوشابہ:۔ یہ سلیم کا کس بات پر ذکر چلا تھا خالہ۔

خالہ جالو:۔ چلا ہوگا موا کسی بات پہ ذکر، ایک سلیم کا کیا تمہاری چھوٹی بہن تک کی شادی کا ذکر تھا مگر میں اب سب تم سے لگا کر قیامت برپا کراؤں اس گھر میں۔

نوشابہ:۔ نہیں خالہ بتائیے تو سہی کہ آخر بات کیا تھی میں بھی تو سنوں۔ انہوں نے اگر آپ سے کچھ کہا ہے تو میں بھی تو بتاؤں کہ بات ہے کیا۔

خالہ جالو:۔ یہ تو بتاؤ کہ میں جو دو دن کے لئے آگئی ہوں تو کیا مجھے کالا منہ کر کے اس گھر نکلواؤ گی؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟ میں تو تم سے بھی سنتی ہوں اور ان سے بھی مگر ایک کی بات دوسرے سے کہنا یہ کام شیطان کا۔ میں اچھے دل بُرے کرنے نہیں آئی ہوں۔

نوشابہ:۔ مگر میں تو خود سن رہی تھی کہ کچھ سلیم کی تعلیم کا ذکر تھا۔

خالہ جالو:۔ اے جب تم سن ہی چکی ہو تو مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ یہی کہہ رہا تھا کہ سلیم کی تعلیم کا خرچ الگ میرے سر ڈال دیا ہے اور ان کے گھر کی ایک ایک شادی اور بیاہ کی تقریب میں قرض لے کر بوٹی بوٹی بندھواتا جاتا ہوں۔ اور میں نے تو کہہ دیا کہ بیٹا اگر تم نے کوئی سلوک کیا ہے تو تم کو زبان سے کہنا تو نہیں چاہئے۔

نوشابہ:۔ تو یہ بچارے دلوا رہے ہیں سلیم کو تعلیم؟ کیوں نہیں۔ خالہ میں اب آپ سے کیا کہوں ابا جان کی عادت اور سیدھے پن کو کہ انہوں نے ایک دفعہ سلیم کی فیس اور کتابوں کے دام جو لے تو ان بچارے نے اسی خیال سے کہ یہ برا مان جائیں انکار نہیں کیا۔

خالہ جالو:۔ اے ہے تو تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔ کیا مجھے پتہ نہیں کہ اللہ رکھے وہ خود جانے کتنے طالب علموں کو وظیفہ دے کر پڑھا رہے ہیں وہ بھلا کسی کا احسان کیوں لینے لگے۔

نوشابہ:۔ سنئے تو سہی خالہ کہ انہوں نے جو ان کی گودیلات ماری تھی اس کی بھی تو کوئی وجہ تھی۔ ابا جان نے کہیں ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس فکر میں ہوں کہ کوئی صورت نکل آئے تو تم کو سال دو سال کے لئے ولایت بھیج دوں۔ بس انہوں نے سوچا کہ بڑے میاں کو خوش کرنے کا اس سے اچھا موقع نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ دوسرے ہی مہینے سے چپ ہو کر بیٹھ رہے۔

خالہ جالو:۔ اے ہے۔ تمہیں میری قسم تو کیا پھر سلیم کی فیس ویس بھی نہیں دی۔

نوشابہ:۔ کیا باتیں ہیں خالہ آپ کی بھی کیسی فیس اور کیسا کچھ۔ جب یہ سنا کہ ابا جان مقدمہ ہار گئے تو پھر سلیم کے کالج تک کا نام اس شخص نے نہیں لیا۔

خالہ جالو:۔ بس حد کر دی بیٹا مگر خیر تمہاری بہن کو تو جہیز میں سونے کے زیوروں سے لاد دیا۔

نوشابہ:۔ اب خالہ مجھ سے کچھ کہلوائیے نہیں میمونہ کی شادی میں ایک موئی بنارسی ساڑھی پر رکھ کر انگریزی سونے کے بندے دیدئے تھے۔ یہ اسی کا طومار باندھا گیا ہے۔ مگر سلیم کی شادی میں ابا جان نے خود جوڑے کے ساتھ سونے کی گھڑی انگوا اور جوڑے کے ساتھ کرن پھول مجھ کو دئے پھر دس سو روپے سہرہ بندھائی کے دئے وہ کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں۔

خالہ جالو:۔ اے تو بیٹا مجھے یہ سب کیا پتہ۔ مجھ سے اس نے کہا کہ میں نے یوں سالے کو تعلیم دلوائی اور یوں سالی کو جہیز دیا۔ میں بھی کہ سچ ہی کہتا ہے۔ اب تم نے مجھ کو سمجھا دیا۔ مگر وہ تو زمانہ بھر سے یہی کہتا ہوگا تم کس کس کو سمجھاتی اور بتاتی پھرو گی۔ مگر خیر اب جانے بھی دو ان باتوں کو۔

نوشابہ:۔ خالہ باز تھوڑی آؤں گی۔ میں بھی اگر کچھ جو رے بن پہ اتر آئی تو ایک ایک چیز گنواؤں گی۔ اس موئے باپ دادا کے مکان پہ قرض لے کر بیٹھ رہے تھے۔ ابا جان کو جب خبر ہوئی انہوں نے پائی پائی ادا کی اور ان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔

خالہ جالو:۔ اوئی بیوی۔ آخر یہ مکان پر قرض لینے کی ضرورت کیا پڑ گئی تھی۔

نوشابہ:۔ وہی موا گھوڑوں کا شوق جس نے اس لاکھ کے گھر کو خاک کر رکھا ہے۔

خالہ جالو:۔ تم تو ہو پھر لونڈیا۔ شادی بیاہ ہو گیا تو کیا ہوا مگر دنیا ابھی نہیں دیکھی ہے۔ یہ نہ گھوڑوں کا شوق ہے نہ کچھ۔ مجھے تو کچھ اور ہی دال میں کالا نظر آتا ہے۔ مگر خیر ہٹاؤ اس ذکر کو۔

نوشابہ:۔ (تسلی سے) خیر یہ تو میں ان کی غیبت میں بھی کہوں گی کہ کسی اور بات میں نہیں ہیں نہ کوئی ایسا ویسا شوق ہے البتہ یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ ہمیشہ اٹھایا اور گھر کی یہ حالت کر دی۔

خالہ جالو:۔ بیٹیا تم کرو ان مردوں کا اعتبار۔ میں نے بھی زمانہ دیکھا ہے بھلا غضب خدا کا کہ مکان پہ قرض لیا اور تم چپ رہیں۔

نوشابہ:۔ اے میری کیا مجال تھی جو میں بولتی۔ ابا جان تک بیچارے نے ایک لفظ نہیں کہا چپکے سے قرضہ چکا کر ان سے بس اتنا کہلوا دیا تھا کہ تم کو ضرورت تھی تو مجھ سے کہتے۔

خالہ جالو:۔ واہ ری شرافت اور واہ رے دل۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل تو لائے۔

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:۔ خالہ ذرا ایک بات سن جائیے۔

خالہ جالو:۔ (بلند آواز سے) آ رہی ہوں۔ (نوشابہ سے چپکے سے) اچھا خیر اب تم ہی غم کھاؤ۔ (جاتی ہیں)

شکیل:۔ کچھ مکان اور قرض کے متعلق بات چیت تھی ابھی۔

خالہ جالو:۔ اے بیٹیا تم ان باتوں پر کان ہی نہ دھرو۔ ہوگی کچھ بات چیت۔ وہ مجھ سے جو کہہ رہی تھی میں اس کا ویسا ہی جواب دے رہی تھی۔

شکیل:۔ مگر میں تو ان کی اعلیٰ ظرفی دیکھ رہا ہوں۔ کوئی پوچھے کہ مکان پر قرض لیا تو کسی کا کیا اجارہ؟ اپنا مکان اپنی ضرورت قرض لیا خوب کیا۔

خالہ جالو:۔ وہی تو میں نے بھی کہا کہ آخر تم کون ہوتی ہو کہنے والی اس کے باپ دادا کی جائداد ہے وہ۔ ضرورت کے وقت کوئی کام لیتا ہے تو اس میں کسی کا کیا ساجھا۔

شکیل:۔ خالہ ضرورت بھی ایسی کہ جس کی بدولت آج پیٹ کو روٹی مل رہی ہے۔ نوکری کے لئے ضمانت داخل کرنے کی شرط تھی۔ آخر میں کہاں سے پانچ ہزار کی تیار رقم پاتا۔ میں نے مکان پر لے لی یہ رقم۔

خالہ جالو:۔ خیر مکان پہ تو تم نے لی تھی رقم۔ اچھا کیا تھا۔ مگر ان کے باپ سے کیوں ادا کروائی۔ ان کو تو بس اسی کا رونا ہے کہ کہاں تک میرے باپ پورا کئے جائیں۔

شکیل:۔ کس نامعقول نے ان کی رقم دبالی ہے خالہ۔ میں نے تو ان سے ذکر تک نہیں کیا تھا جب ان کو خود خبر ہوئی اور انھوں نے روپیہ دیا تو میں نے یہ سمجھ کے لیا کہ کسی اور کا نہ سہی ان ہی کا قرض سہی اگر میں ادا نہ کرتا جب کہتیں۔

خالہ جالو:۔ تو یہ کہو کہ قرض لیا ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ ابا نے مکان چھڑوا دیا اور اپنی گرہ سے رقم دی۔ خیر ہوگا یہی۔ دنیا اندھی نہیں بیٹیا۔

شکیل:۔ دنیا تو اندھی نہیں ہے خالہ مگر یہ آنکھوں میں دھول جھونکنا کیا؟

خالہ جالو:۔ تم بھی تو بیٹیا نا سمجھی سے کام لیتے ہو۔ آخر جب انھوں نے سونے کی گھڑی دی اور سلیم کی سہرا بندھوائی کے دو سو روپے اور جوڑے دئے تو تم کیوں چپ ہو رہے؟

شکیل:۔ بس انہی باتوں پر جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں یا کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں۔ خالہ یہ بالکل جھوٹ بکتی ہیں میں نے خود ان دو سو میں پچاس اپنے پاس سے ملا کر سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی میں دئے۔ اب آخر اور میں کیا کرتا۔

(نوشابہ آتی ہے)

نوشابہ:۔ دیکھئے خالہ اب میں کچھ کہوں گی تو ان کو لگے گا برا۔ سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی جو دی وہ بھی میرے یہاں رکھی نہیں گئی مجھکو ابا جان نے خود تین سو روپیہ بینک میں دیا۔

شکیل:۔ اجی وہ آپ کو ہزاروں دیدیں مجھ سے کیا؟ آپ ان کی بیٹی وہ آپکے باپ۔ مگر میں کسی کا شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے کس دن مکان کیلئے ان سے بھیک مانگی تھی؟۔

خالہ جالو:۔ ہوگا بھی بیٹیا۔

نوشابہ:۔ نہیں آپ نے نہیں بھیک تو انھوں نے مانگی تھی کہ اللہ کے نام پر میرے لڑکے کو تعلیم دلوا دو۔

خالہ جالو:۔ اے ہے بیٹی اب تم ہی چپ رہو۔

شکیل:۔ میں بیچارا تعلیم کیا دلواتا جس کی پرورش سہرا بندھوائی کے دو سو روپیہ پر ہوتی ہے

خالہ جالو:۔ جانے بھی دو بیٹیا ان باتوں کو میرا دم الجھتا ہے ان باتوں سے۔

نوشابہ:۔ آپ کی پرورش وہ بیچارے کیا کریں گے آپ ہی ان کی لڑکیوں کے جہیز میں سونے کے زیور دے دے کر ان کی پرورش کر رہے ہیں۔

خالہ جالو:۔ یہی اللہ بڑی ضدی ہو نوشابہ۔ تم بھی اب چپ کیوں نہیں رہتیں۔

شکیل:۔ اجی میں زیور کیا دونگا۔ میں خود آپ کے یہاں کی ٹوٹی پھوٹی میز کرسیوں کا محتاج رہتا ہوں۔

خالہ جالو:۔ اچھا بیٹیا تم مجھے تو ڈولی منگا دو پھر تم دونوں جانو اور تمہارا کام۔

نوشابہ:۔ میری بہنوں کی شادی تک نہیں ہو سکتی جب تک آپ جہیز نہ دیں۔ میرے بھائی پڑھ نہیں سکتے جب تک آپ تعلیم نہ دلوائیں اور ان کا خرچ نہ اٹھائیں۔

خالہ جالو:۔ اچھا بیٹیا نہ مانو تم۔ بڑے بوڑھوں کی بات تو مان لیا کرو۔

شکیل:۔ جی نہیں یہ حال تو میرا ہے کہ آپ کے یہاں کی بائیسکل تک کا محتاج ہوں۔

خالہ جالو:۔ میرا لال بس ہو گیا۔ یہ موئی لین دین کی کونسی ایسی بات ہے میرا دماغ تو تم دونوں نے چکرا دیا۔

شکیل:۔ خالہ آپ نہیں جانتیں جس طرح آج انھوں نے آپ کے سامنے

مجھے بدنام کیا ہے اسی طرح یہ تمام دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں۔
نوشابہ:۔ اور آپ نے تو جیسے مجھکو اور میرے گھر والوں کو خالہ کے سامنے کچھ کم ہی کہا ہے۔
خالہ جالو:۔ اسے تو کچھ کہا بھی ہو کسی نے۔ مجھ خالہ کمبخت کے سامنے یا آپ ہی آپ بیباتیں ہو رہی ہیں۔ نہ تم میرے لئے غیر ہو بیٹیا نہ تم غیر ہو بیٹی۔ گودوں میں پال کر اتنا بڑا کیا ہے اور اب مجھ ہی سے غیریت آتی ہے۔
شکیل:۔ مگر ان کو آپ ہی سے سہی سچ بتا دیجئے کہ یہ باتیں کہنا چاہئیں تھیں۔
خالہ جالو:۔ کیسی باتیں اور کیا کچھ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔
نوشابہ:۔ کہا کیسے نہیں میں نے کہا ہے مگر جیسا سنا دیا کہا۔ میرے اور میرے ماں باپ کے لئے کہا جائیگا تو میں بھی ضرور کہوں گی۔
شکیل:۔ تو پھر میرے متعلق جھوٹ سچ لگایا جائیگا تو میں بھی چپ رہنے والا نہیں ہوں۔
نوشابہ:۔ یہ آخر خالہ کدھر چلیں۔
شکیل:۔ اور کچھ ان سے کہنے کو باقی رہ گیا ہو تو بلا لیجئے نا۔ میز کرسیوں کا احسان گنوا دیا۔ مکان کے قرض والی پرورش گنوا دی۔ سہرا بندھوائی کی رقم اور سونے کی گھڑی تک کا ذکر ہو چکا اب آخر رہ کیا گیا ہے۔
نوشابہ:۔ ہاں تو جب بات کہوائی جائے گی تو ضرور کہی جائے گی میرے بھائی کو آپ نے کونسی تعلیم دلوائی۔ میری بہن کو کونسا جہیز آپ نے لا دیا۔
شکیل:۔ یہ آخر ان باتوں کا ذکر کرنے کی خالہ کو کیا ضرورت تھی۔
نوشابہ:۔ اور میری باتیں لگانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔
شکیل:۔ اتنی باتیں آخر پیدا کیونکر ہوتیں میں نے تو جب آپ کی طرف سے طعنے سنے اس وقت خود بھی کچھ کہا۔
نوشابہ:۔ آپ نے جب میرے میکے والوں کے ساتھ اپنے سلوک گنوائے تو میری زبان سے بھی کچھ نکلا۔
شکیل:۔ اور تو خیر کچھ نہیں مگر خالہ کے سامنے گڑے مردے اکھڑے خوب۔
نوشابہ:۔ یہ سب خالہ نے ایک ایک کی بیس بیس لگا کر آفت مچوائی۔
شکیل:۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے مگر ایک ایک کی بیس بیس لگانے کا آخر ان کو موقع ہی کیوں دیا گیا۔
نوشابہ:۔ موقع میں نے دیا کہ آپ نے؟ احسان میں گنوانے بیٹھی تھی کہ آپ؟
شکیل:۔ احسان میں نے گنوائے تھے گویا۔
نوشابہ:۔ اور نہیں تو کیا میں نے گنوائے تھے؟
شکیل:۔ بے شک آپ نے گنوائے تھے۔ میز کرسیوں کا ذکر آپ نے کیا۔ بائیسکل کا ذکر آپ نے کیا۔
نوشابہ:۔ یہ کیوں کیا اس پر یہ ذکر کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نئے چائے کے

غزل

مسکراتے ہوئے تاروں نے تجھے یاد کیا
حسن فطرت کے نظاروں نے تجھے یاد کیا

ابر نے تیری جوانی کے ترانے گائے
جھومتے میکدہ زاروں نے تجھے یاد کیا

نقرئی قہقہے تیرے نہ کوئی بھول سکا
غنچے چٹکے تو بہاروں نے تجھے یاد کیا

یاسمیں کرنوں کی آنکھوں کو رہی تیری تلاش
رات بھر چاند ستاروں نے تجھے یاد کیا

آنکھوں آنکھوں میں جو چپ چپ کہا آکر تجھے
ان محبت کے اشاروں نے تجھے یاد کیا

کسی صورت نہ بجھی آگ تری الفت کی
دل سے اٹھتے ہی شراروں نے تجھے یاد کیا

جن کے سینے ہیں تیرے نقش کف پا کے مزار
ان تیری راہگزاروں نے تجھے یاد کیا

کوئی فارغ سا وفادار نہ پایا ہوگا
یاد کرنے کو ہزاروں نے تجھے یاد کیا

فارغ بخاری

سیٹ اپنے میکے بھجوا دیتی ہوں اور یہاں ٹوٹی ہوئی پیالیاں رہ جاتی ہیں۔
شکیل:۔ میں نے یہ کہا۔ اگر میں نے کہا ہو تو خدا مجھ کو غارت کر دے۔
نوشابہ:۔ کدھر گئیں خالہ میں ابھی پچھواتی ہوں میرا کیا سر پھر گیا تھا کہ میں بات کی بات پیدا کر دیتی۔
شکیل:۔ ہاں ہاں بلائیے نا خالہ کو (آواز دیتا ہے) شکور۔ او شکور۔ ذرا خالہ کو تو ادھر بھیجنا۔
نوشابہ:۔ میرے تو اسی بات سے آگ لگی کہ اب میں ایسی چھچھوری اور میرے گھر والے ایسے گئے گذرے ہو گئے۔
شکیل:۔ ارے شکور سنا نہیں تو نے۔ ذرا خالہ کو بھیجنا۔
شکور:۔ (آکر) سرکار وہ تو ابھی تانگہ منگوا کر کہیں گئی ہیں۔
نوشابہ:۔ دیکھ لیا آپ نے؟
شکیل:۔ میں کیا دیکھوں تم ہی دیکھو۔
نوشابہ:۔ قبر میں پیر لٹک گئے مگر یہ لگائی بجھائی کی عادت نہیں گئی۔
شکیل:۔ اور نہ جائے گی عادت۔ خالہ کس کی ہیں آپ ہی کی نا۔
نوشابہ:۔ اور آپ کی تو جیسے خالہ ہیں ہی نہیں۔ بیاہ تو آپ کے خاندان کا ہے
شکیل:۔ میرے خاندان کی ہوتیں تو ٹھہرتی نا۔
نوشابہ:۔ (ہنستے ہوئے) نام بھی تو جالو ہے۔
شکیل:۔ یہ تم نے سچ کہا بعض میں یہ چٹکی ڈال جالو الگ کھڑی۔
نوشابہ:۔ نہیں بعض میں چٹکی ڈال جالو تانگہ چڑھی۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ہانگ کانگ

ہنری بو

کئی برس تک اسکولوں میں جغرافیہ کے نقشے بیکار پڑے رہے۔ ہانگ کانگ کے بندرگاہ سے سمندر میں جو متعدد نقطہ دار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں — شنگھائی ۸۰۵ میل — سنگاپور ۱۴۴۰ میل — ناگاساکی ۱۰۷۰ میل — انکے کچھ معنی باقی نہیں رہے تھے۔ ان لکیروں پر میلوں کے یہ ہندسے بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے کہ جاپانیوں کے قبضہ میں آنے کے بعد سے ہانگ کانگ بالکل ویران تھا اور مشرق بعید میں اس کی پہلی سی مرکزی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے ہانگ کانگ میں بڑی تیزی سے اور بڑے حیرت انگیز انداز میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان نقطہ دار لکیروں میں جان سی پیدا ہوگئی ہے۔ ہانگ کانگ کا ایک مستقبل ہے۔ اور ان کھنچے ہوئے خطوط ہانگ کانگ کے روشن مستقبل کا پیام سنا رہے ہیں جس میں اسے شاید وہی حیثیت حاصل ہوسکے جو مشرق بعید میں شنگھائی کو حاصل تھی۔ ایٹم کا نشانہ بن کر ناگاساکی اب بالکل ختم ہوچکا ہے اور اصل میں ہانگ کانگ ہی اب طلوع ہوتا ہوا آفتاب ہے۔

یہ تبدیلی بے حد عجیب و غریب ہے۔ جو سڑکیں سنسان تھیں اب ان میں پھر رونق بڑھ رہی ہے۔ لوگ اب ہانگ کانگ کی گہما گہمی کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی تجارت اور تعمیر کے بے پایاں اور کثیر منصوبوں کے باوجود اس کی حیثیت گو کسی مثالی شہر کی سی نہیں ہے لیکن جیسا کہ ایک انگریز افسر نے کہا ہے ہانگ کانگ ایک ایسا شہر ہے جس کی زندگی مشرق بعید میں سب سے زیادہ معمول کے مطابق ہے۔

تباہی کے سال

پہلے ہانگ کانگ کو جاپانیوں نے لوٹا کھسوٹا اور پھر دو سال تک اتحادیوں نے اس پر بم باری کی — اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بھی وہاں بعض ایسی مشکلیں باقی ہیں جنھیں حل کرنا ہے — مکانوں کی کمی، چور بازار، شہری زندگی کا انتشار اور اس کے لئے مستقبل کے آئین کا مسئلہ۔

اس شہر کو کئی سال تک جن تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ اس کی برابر گھٹتی بڑھتی آبادی سے کیا جاسکتا ہے۔ اتحادیوں کے قبضہ کے وقت اس کی آبادی پندرہ لاکھ سے گھٹ کر تین لاکھ رہ گئی تھی۔ اور آج کل صرف یہاں کے چینی باشندوں ہی کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے اور لوگوں کی پیشین گوئی ہے کہ سال کے ختم ہوتے ہوتے اسکی آبادی لڑائی سے پہلے کی آبادی کے برابر ہوجائیگی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سال کے ختم ہونے تک صرف ۸۰ فیصدی یورپین باشندوں کے رہنے کے لئے جگہ بنائی جاسکے گی۔ یہاں ۱۶۰،۰۰۰ چینی اب بھی ایسے ہیں جن کے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ جاپانیوں کی تباہ کاریوں اور اتحادیوں کی بمباری سے ۱۹ ہزار سے زیادہ مکان تباہ و برباد ہوگئے اور بہت سے مکانوں کو پناہ ڈھونڈنے والے چینیوں نے لوٹ کھسوٹ لیا۔

اور اس طرح اتحادیوں کے انتظامی افسروں کے سامنے تعمیر کا ایک زبردست کام تھا۔ سب سے اہم مسئلہ خوراک کا تھا۔ تین لاکھ بھوکے چینیوں کی خوراک مہیا کرنے کے لئے چاول کی بہت بڑی تعداد باہر سے یہاں لائی گئی اور اسے راشن کرکے تقسیم کیا گیا۔ لیکن بے ایمان تاجروں اور رسد پہنچانے والوں نے چاولوں میں ریت ملا کر بھاری بھاری نفعے کمائے اور حکومت نے انھیں سخت سزائیں دیں۔ تعمیر کے ابتدائی کاموں میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں دو آدمیوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں آدمی جنگ سے پہلے ہانگ کانگ میں ملازم تھے اور پچھلے اگست میں اتحادی عملہ کے ساتھ پھر ہانگ کانگ واپس آئے ہیں۔ ان دونوں کے نام تھے ڈیوڈ مکڈوگل اور والٹر تھامسن، اور ہانگ کانگ کے لوگ انھیں محبت میں "اسکاٹ لینڈ کی ٹیم" کہتے تھے۔

ان دونوں کو مقامی انتظام اور مقامی حالات کا جو تجربہ اور علم تھا اس کی مدد سے انھوں نے مقامی لوگوں سے وہ برادرانہ اتحاد قائم کرلیا جو تعمیر کی دشوار ابتدائی منزلوں میں ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں نے انتظامی عملہ اور شہریوں کے درمیان ایک گہرا اور مضبوط ربط قائم کیا۔

پستہ قد پھرتیلے ۴۱ سال کے مکڈوگل — جو آج کل نو آبادی کے قائم مقام سکرٹری ہیں — پہلے ہانگ کانگ کی سول سروس میں تھے۔ ہانگ کانگ کے خاتمہ کے بعد جو لوگ یہاں سے بچ کر لندن پہنچے، مکڈوگل ان میں پہلے آدمی تھے جب وہ لندن پہنچے ہیں تو جاپانی گولیاں اس وقت تک ان کی پیٹھ میں موجود تھیں۔ اور یہ گولیاں لندن کے اسپتال میں ان کی پیٹھ میں سے نکالی گئیں۔

لیکن اتنے دن تک اس حالت میں رہ کر بھی ان کا زندہ بچ رہنا محض ایک عجیب و غریب اتفاق کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ان کی گردن اور کمر میں سخت زخم آئے تھے اور اس لئے وہ برابر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے الگ رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن وہ ایک چینی کی دوکان میں چھپے ہوئے

تھے کہ ان کی نظر گند ھک کی گولیوں کی ایک شیشی پر پڑی۔ اس کے بعد سے اسپتال پہنچنے تک انھیں آٹھ دن لگے اور آٹھ دن تک وہ برابر دو گولیاں روز کھاتے رہے اور ان دو گولیوں نے انھیں کے لفظوں میں "زخموں کو شیشے کی طرح صاف ستھرا کر دیا۔"

اچھا ہو جانے کے بعد پچھلے اگست میں وہ وائس ایڈمرل سر سسل ہارکورٹ کے انتظامی عملہ کے ساتھ آزاد ہانگ کانگ واپس آئے۔ جب مئی کے مہینہ میں ہانگ کانگ کا شہری انتظام سر مارک ینگ کے سپرد ہوا جو ہانگ کانگ کے خاتمہ کے وقت یہاں کے گورنر تھے، تو یہاں کے حالات نے اچھی خاصی معمولی صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔

اس کے بعد سے بہت سے کارنامے ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا یہ کہ مشرق بعید کے اس علاقہ میں برطانیہ کا وقار دوبارہ قائم ہو گیا ہے۔ برطانوی انتظام میں لوگوں کو ہانگ کانگ کے مستقبل کی طرف سے بڑا بھروسہ ہے۔

جب اتحادیوں نے ہانگ کانگ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا اور چاولوں کی درآمد کر کے یہاں راشننگ کی پالیسی پر عمل شروع کیا تو ہانگ کانگ کی بکھری ہوئی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس نئے انتظام نے جنوبی چین کے بہت زیادہ لوگوں کو ہانگ کانگ کی طرف کھینچا جن کی تعمیری کاموں کے سلسلہ میں بے حد ضرورت تھی۔ مئی کے مہینہ تک اس طرح کے چھ لاکھ آدمی ہانگ کانگ آ چکے تھے۔

ہانگ کانگ کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت مکانوں کا مسئلہ ہے یہاں تک کہ کسی نئے آنے والے آدمی کو دو کمروں کا مکان اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ ایک بہت بڑی رقم — یعنی تقریباً تین سو پونڈ پیشگی ادا نہ کر دے۔ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں کرائے تین گنے ہو گئے ہیں حالانکہ سرکاری حکم کے مطابق کرایوں کی تعداد اتنی کر دی گئی ہے جتنی پہلی ہار بری کی بم باری سے پہلے تھی۔ لیکن لڑائی کے بعد کے ہانگ کانگ کا سب سے برا پہلو وہاں کی ڈکیتیاں ہیں، جو دن دہاڑے ہوتی ہیں، اس لئے کہ جاپانیوں نے ہتھیار ڈال دینے اور لڑائی کے زمانہ کی بدنظمی کی وجہ سے ہتھیار لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے۔ شمالی چین کی طرف جانے والی چینی فوجیں ایک طرح سے انگریزوں کی مہمان ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلے نو مہینوں میں ان فوجوں کے سپاہی بہت سی نامناسب حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکروں کو مارا پیٹا، بسوں کے کرائے ادا کرنے سے انکار کر دیا، سنیماؤں میں بغیر ٹکٹ جانے کی کوشش کی (یہاں تک کہ کینٹن میں جب چینی سپاہیوں کو بغیر ٹکٹ اندر جانے سے روکا گیا تو انھوں نے ٹکٹ گھر کے بابو کو گولی سے مار دیا) اور چینی شہریوں سے زبردستی اپنی بات منوانی چاہی۔ ان سپاہیوں میں سے بہت سے برما کے محاذ سے لوٹے ہوئے ہیں اور وہاں سے اپنی فوجی بہادری کی برتری کا احساس اپنے ساتھ لائے ہیں۔ انھوں نے برطانوی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ہانگ کانگ کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ سیمو پیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے وقتاً فوقتاً لوگوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوششیں کیں اور اس طرح ملی جلی آبادی میں تفرقے اور اختلاف پیدا کر دئے۔

درآمد میں اضافہ

ہانگ کانگ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اس مختصر مدت کی سب سے حیرت انگیز بات اس سال کے پہلے تین مہینوں کی درآمد کی مقدار ہے۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں مہینوں میں درآمد کی چیزوں کی قیمت ۷،۸۴۵،۰۰۰ پاونڈ تھی۔ اس کے برخلاف ان تین مہینوں میں درآمد ۸،۴۸۷،۰۰۰ پاونڈ تھی۔ برطانوی ملایا سے آنے والی چیزوں کی تعداد تقریباً چوگنی ہو گئی ہے اور چین سے آنے والی چیزوں کی تقریباً دوگنی — ان مختلف آنے والی چیزوں میں برطانوی موٹر کاریں (جو ڈاکٹروں اور ضروری کام کرنے والوں کے لئے آئی تھیں) گھڑیاں اور فاونٹین پن (زیادہ تر چینی امیروں کے لئے) اور دس پاونڈ فی جوڑے کے (NYLON) نائلون کی عورتوں کے لئے۔

اسی عرصہ کی باہر جانے والی چیزوں کی قیمت ۵،۶۴۲،۰۰۰ پاونڈ تھی اور اس کے مقابلہ میں ۱۹۳۹ء میں ۷،۵۲۳،۰۰۰ پاونڈ۔

آج کل کی زندگی دسمبر ۱۹۴۱ء کی زندگی سے بہت مختلف ہے جو لوگ ہانگ کانگ چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ اب اپنے گھروں کو واپس آئیں تو انھیں اپنی چیزیں اپنے گھروں کے بجائے چور بازار میں جا کر ملیں گی۔ لیکن نسلی امتیاز اور فرق اب انھیں گذرے ہوئے زمانہ کی ایک چیز معلوم ہوگی۔ فوجیوں کے ساتھ بھی اب ان کا برتاؤ زیادہ دوستانہ ہے۔ گو لوگوں کو کھانے کے لئے اب پیٹ بھر کر غذا ملتی ہے لیکن زندگی کی ضروری چیزیں کثرت سے نہیں ملتیں اور چاول کا راشن صرف اسی قدر ہے جتنا عام صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

تمام ضروری چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہے۔ اور اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ کپڑے کی قیمت پر (جو لڑائی سے پہلے کی قیمتوں سے دس گنی ہیں) اور دوسری ضروری چیزوں کی قیمتوں پر بھی کنٹرول ہو جائے گا۔ فوجی کینٹینوں کو امریکی جہازوں سے مال آکر چور بازار میں پہنچا رہتا ہے (اور آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے)، اس زمانہ کی ایک بہت اچھی بات یہ ہے کہ حکومت نے افیم کھانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس سے پہلے افیم کے استعمال کی ترغیب خود

حکومت کی طرف سے ہوتی تھی، اس لئے کہ افیم کی فروخت اور افیون خانوں کے لائسنس کی اجارہ داری حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

حکومت کا انتظام سول افسروں کے ہاتھ میں آنے کے بعد سے اب یہ احساس شروع ہو گیا ہے کہ مکمل اصلاح کے طویل طویل اور ناہموار سفر کو جلدی طے کیا جا سکے گا لیکن شاید اس کے لئے ضروری ہو کہ جس رعایا پر اب تک ٹیکس بہت کم لگائے جاتے تھے، اسے اب زیادہ ٹیکس دینے پڑیں۔

حکومت نے ہانگ کانگ کے آئینی مستقبل کے بارے میں یہاں کے لوگوں سے مشورے طلب کئے تھے، لیکن لوگوں نے ملکی سیاست کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ شاید حالات کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلے کہ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ اگزیکٹیو اور آئین ساز کونسلیں گورنر کو اس کے کام میں مدد دیتی رہیں، ان کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کے چناؤ میں عوام کی زیادہ آواز ہو، اور حکومت کا کام ایسے افسروں کے ہاتھ میں ہو جو ہانگ کانگ گورنمنٹ کے کام کو محض آسائش اور پنشن کا ذریعہ نہ سمجھتے ہوں۔

ہانگ کانگ کو چینیوں کے سپرد کر دینے کے علاوہ وہاں خواہ کسی طرح کی آئینی تبدیلیاں ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا مستقبل بے حد شاندار ہے۔ پھر بھی حاکموں اور تاجروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جنگ سے پہلے کے ہانگ کانگ کے دن اب پھر واپس نہیں آ سکتے۔

رفتہ رفتہ ہانگ کانگ کو تجارتی مرکز کی حیثیت سے وہی جگہ حاصل ہو گی جو کبھی شنگھائی کو تھی۔ اس کی علامتیں کچھ کچھ ابھی سے نظر آنے لگی ہیں۔ بڑے بڑے چینی کاروبار اب شنگھائی سے اٹھ کر ہانگ کانگ آ رہے ہیں۔ بعض حلقوں میں یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ ہانگ کانگ برطانوی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور اکثر امریکی تاجر فلپائن میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔

جو لوگ برطانیہ کی نوآبادیات کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو ہمیشہ ہانگ کانگ کی ترقی ان کی نکتہ چینی کا بہترین جواب ہے۔ اس نو مہینے کے حالات نے نوآبادیوں میں برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ کے افسانے کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے اور دنیا پر یہ بات پوری طرح ظاہر ہو گئی ہے کہ برطانیہ کے ان ابتدائی حکمرانوں اور آباد کاروں کی دانشمندی اور ان کا وہ رسوخ اب بھی قائم ہے جس نے ویران سنسان اور ٹیکروں اور لٹیروں سے بسے ہوئے چٹانوں کو ایک جدید قسم کا بندرگاہ بنایا تھا۔

اعلان دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نظم و نثر کافی مقدار میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبہ کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔ (ادارہ)

گردش

عبادت بریلوی

شام کے ہنگام پر ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو!
راہ پر چلتے ہوئے مدقوق انسانوں کے غول ——
قہقہوں کی دھند میں لپٹے ہوئے
آنسوؤں کے کارواں
پیہم رواں، پیہم رواں!
سامنے جن کے کوئی منزل نہیں!

ہو چکا اب ختم وقتِ شام بھی
رات آدھی آ چکی،
نیلگوں آکاش کی پھیلی ہوئی آغوش میں
مسکرانے سے ستاروں کا فسوں پر مدجال
تیرگی کی روح پر چھانے لگا؟
اس سماں میں رک گیا یہ کارواں،
جذب ہو کر رہ گئے دیوار و در میں قہقہے،
آنسوؤں کا سیگوں سیلاب دامن میں لئے!

رات رخصت ہو گئی،
صبح کی رکشن کرن لینے لگی انگڑائیاں!
کارواں چلنے لگا،
قہقہے پھر جاگ اٹھے
آنسوؤں کا سیگوں سیلاب دامن میں لئے!
شاہراہوں پر نظر آنے لگا
دور —— کوسوں دور تک
پھر ایک بحرِ بیکراں
جس کی دنیا میں کوئی ساحل نہیں!

رباعیات

یا آئینۂ جلوۂ جانانہ بنے
یا جلوۂ جانانہ کا دیوانہ بنے
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اکبرآبادی

کشمکشِ حیات

ہنگری میں اقتصادی صورتِ حالات اتنی خراب ہے کہ شاید اس سے زیادہ خراب کبھی نہ ہو سکے۔ "بوڈاپسٹ یورپ کے قحط کا مرکز بنا ہوا ہے اور ہر چیز نایاب ہے" ان الفاظ میں برطانوی پارلیمان کے ایک رکن جان ہیر نے وہاں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اگرچہ ان کے قول کے مطابق وہاں کے لوگ زندہ دل ہیں تاہم انہیں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ــــــ (مترجم)

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا، ہنگری سب سے زیادہ خوفناک قسم کی جنگ کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ اس سرزمین کا ایک ایک قطعہ لڑائی کا میدان تھا۔ اسکا خوبصورت صدر مقام بوڈاپسٹ اکیاون دن کے محاصرے کے باعث تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

حتیٰ کہ آج بھی ملک بھر کی پیشانی پر ہولناک جنگ کے داغ نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ منہدم شہروں، برباد شدہ پلوں، ناقابلِ گذر راستوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فولادی ٹینک جو لڑائی میں شکستہ اور چور ہو کر بیکار ہو چکے ہیں، ادھر ادھر سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ ایک لڑاکا ہوائی جہاز کو جو بہت عرصے پہلے ایک بڑی عمارت کی بالائی منزل پر ٹوٹ کر گر پڑا تھا، حال ہی میں اٹھایا گیا ہے۔

بوڈاپسٹ کا نظارہ بڑا روح فرسا ہے۔ کبھی اسے دریائے ڈینوب کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ آج اسکا مشکل سے چوتھائی حصہ صحیح و سلامت ہے۔ برسٹل ہوٹل کے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جب میں نے نظر ڈالی اور ڈینوب کے پار اس حصے کو دیکھا جو یورپ میں سب سے زیادہ خوش منظر سمجھا جاتا تھا تو میں حیران رہ گیا۔ شاہی محل بالکل ڈھانچ بن چکا تھا۔ اس کا بڑا گنبد مڑے تڑے فولادی تیروں کا پنجرا معلوم ہوتا تھا۔ اور خوبصورت پل بھی بالکل فنا ہو کر دریا کی تہ میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ باقی سات پلوں کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔

اب بوڈا اور پسٹ کے درمیان زندگی کے ہنگامے ایک نیم مستحکم پل کے قریب مرکوز ہیں جسے اسی سال جنوری میں مکمل کیا گیا ہے۔ دو بجرے کے پیپوں سے بنائے ہوئے دو عارضی پل جو خزاں اور بہار کے دنوں میں دریا کے اوپر سے آنے جانے کے کام آتے تھے، موسمِ سرما کی شدید برفباری سے چکنا چور ہو گئے۔ وہ شاداب پہاڑی جو دریا کے پار دلکش مناظر پیش کرتی تھی، ایک عریاں لاش کی طرح بالکل اجاڑ اور سوگوار پڑی ہے۔ اس کے درخت ختم ہو گئے۔ جاڑے کے موسم میں ایندھن کی خاطر انہیں کاٹ ڈالا گیا۔ اور اس جزیرے کے درخت بھی جو دریا کے بیچوں بیچ جنت کی بہاریں دکھاتا تھا، اسی مقصد کے ماتحت غارت ہو گئے۔

اس کے باوجود صدر مقام میں زندگی اب بھی دھڑکتے ہوئے دل کی طرح مچلتی اور بل کھاتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنگری کے لوگ غمِ ماضی کو بھلا دینا چاہتے ہیں وہ مستقبل کی تعمیرِ نو کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ شہر کے میئر نے مجھے بتایا کہ شہر کے دوبارہ تعمیر ہونے میں دس سال لگیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دس کی بجائے بیس سال لگ جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ پہلی سی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔

بوڈا کے مقابلے میں پسٹ کم تباہ ہوا ہے۔ اس کے بازاروں میں بڑا حیرت انگیز تضاد نظر آتا ہے۔ آپس میں چہلیں کرتی کچھ ایسی عورتیں دکھائی دینگی جو یورپ میں سب سے زیادہ زرق برق لباس پہننے والیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ اور دوسری طرف ایسی مزدورنیاں اور دیہاتنیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جن کے میلے کچیلے لباس اور فاقے سے مرجھائے ہوئے چہرے دلوں میں سوز پیدا کر دیتے ہیں۔ جنگ سے قبل یورپ میں خرید و فروخت کا سب سے زیادہ مشہور مرکز ویسی اکا تھا۔ دکانوں میں نہایت قیمتی ریشمی کپڑے اور پوستینیں بکتی تھیں جنکی قیمتیں اشرفیوں کی صورت میں وصول کی جاتی تھیں۔ اسی بازار کی ان دوکانوں میں اب چیری ہوئی لکڑیاں اور کوئلوں کے انبار بکتے نظر آتے ہیں۔ بوڈاپسٹ میں آجکل ایندھن بھی بہت کمیاب ہے۔ اور پچھلے موسمِ سرما میں جو غیر معمولی طور پر زیادہ سرد رہا وہ بالکل ہوش اڑا دینے والے نرخ پر فروخت ہوا۔

بوڈاپسٹ کبھی قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کا شہر کہلاتا تھا۔ انکی تعداد کئی سو ہوگی۔ ہر ایک میں ذاتی جپسی بینڈ بجانے والے موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے مشہور اور مقبولِ عوام مقامات کا وجود گولوں کی زد میں آکر صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اکا دکا کوئی قہوہ خانہ باقی ہے جو عام طور پر کسی عارضی عمارت میں قائم کر لیا گیا ہے۔ کئی قسم کا کھانا اب بھی وہاں مل سکتا ہے۔ عام طور پر دو یا تین قسم کی شوربے والی خوراک میسر آ جاتی ہے۔ ایک وقت کے کھانے کے عوض اتنی رقم ادا کرنی پڑتی ہے کہ لڑائی سے پہلے اسے ایک زرِ کثیر سمجھا جا سکتا تھا۔ گذشتہ ماہ اکتوبر سے گوشت بالکل ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔ اسکی وجہ جانوروں کی کمیابی ہے۔ لڑائی کے دوران میں صرف ہنگری کے پچیس لاکھ مویشی مر گئے۔ اب تقریباً چار لاکھ باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو افزائشِ نسل کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر اب یہ طعام خانے بالکل ویران معلوم ہوتے ہیں۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ

جے پرکاش نرائن

بوڈاپسٹ کے لوگ کیونکر گزارہ کرتے ہیں۔ آٹھ لاکھ باشندوں میں سے زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ وہ قحط، بیماری اور سردی کا بڑی مشکل سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اسوقت بوڈاپسٹ یورپ کے قحط کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اموات کے اعداد و شمار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً بچے کوئی پچاس فیصدی کے حساب سے ضائع ہو رہے ہیں۔ گذشتہ نومبر کے مہینے میں ۲۱۸۸ اموات ہوئیں جبکہ پیدائش کی تعداد ۸۲۲ سے نہ بڑھ سکی۔ تقریباً ہر شخص کی حالت یہ ہے کہ کمی خوراک کے باعث آنکھیں دھنس گئی اور گال پچک گئے ہیں۔ مجھ سے ملنے والے ہر شخص نے کہا کہ ہم پوری خوراک نہ ملنے کے باعث اسقدر کمزور ہو گئے ہیں کہ روزانہ چند گھنٹے بھی آسانی سے کام نہیں کر سکتے لیکن ہر شخص کے لئے کام کرنا لازمی ہے کیونکہ کام کئے بغیر روٹی بالکل نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ان کا نعرہ یہی ہے۔ "کام نہیں تو خوراک نہیں"

حد یہ کہ گیہوں اسقدر کمیاب ہے کہ ہفتہ میں تین دن مکئی کے لئے مخصوص ہیں۔ کارخانوں کے مزدور، حکومت کے وزیر، درسگاہوں کے معلم غرض سبھی قحط اناج سے پیدا ہونے والی مشکلات کا شکار ہو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو کارخانوں کے مزدوروں کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تمام نہیں تو تنخواہ کا کچھ حصہ انھیں خوراک کی صورت میں مل جاتا ہے جس کا انتظام کارخانے کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ بہت سے کارخانوں کے زیر اہتمام خوراک جمع کرنے کے گروہ بنائے جاتے ہیں جو دیہاتوں میں جاکر کھانے کی چیزیں تلاش کر لاتے ہیں۔ یہ اسطرح جمع کی ہوئی مقدار جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں میں اس طرح تقسیم کر دی جاتی ہے کہ ہر ہفتے ان کو ۱۴۳۲۰ درجہ اور پھر خاندان کے ہر رکن کو ۸۵۶۰ مزید درجہ حرارت عزیزی پیدا کرنے والی خوراک مل جائے۔ مزدوری کی باقی رقم ان کو نقد دیدی جاتی ہے۔ حالانکہ نقدی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔

اسوقت ہنگری میں تو تیرِ زر کی کیفیت بھی ہوشربا حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جب میں اکتوبر کے مہینے میں ہنگری گیا تو معلوم ہوا کہ پنگو کی قیمت جو کبھی بارہ آنہ کے قریب ہوتی تھی۔ اتنی گر گئی ہے کہ صرافہ میں ایسے دس ہزار نوٹوں کے عوض بمشکل پندرہ روپے مل سکتے ہیں۔ اب اتنی ہی رقم کے لئے تقریباً پچاس لاکھ پنگو دینے پڑتے ہیں اس سال جنوری کے مہینے سے قیمتیں کوئی تیس گنی حد تک بڑھ گئی ہیں مجھے انہی دنوں کا ایک عجیب واقعہ یاد ہے۔ جبکہ میں ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے کرتے پوری خوراک پر دس آنے اس رقم کے مقابلے میں بڑھ گئے جو کھانا شروع ہونے کے وقت مقرر تھی۔

اسوقت ہنگری سے جو خطوط میرے پاس آئے ہیں وہ ٹکٹوں سے بری طرح لپے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھکر بھی یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ وہاں تو تیرِ زر کی کیفیت کسقدر بڑھی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک خط کے چند ہی دن بعد جب دوسرا خط ڈالا جاتا ہے تو اسپر بہت سے فالتو ٹکٹ نظر آتے ہیں۔ یہ اجرتوں کے مقابلے میں قیمتیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ہنگری میں ہر وزیر یا جینہ کی موجودہ تنخواہ کم و بیش ڈہائی تین روپے ماہانہ کے برابر ہے۔ صدر کو مشکل سے چالیس روپے سالانہ کے لگ بھگ کچھ رقم وصول ہوتی ہے۔

کچھ بھی ہو زرِ مبادلہ کی حیثیت سے ہنگری میں نوٹوں کی قیمت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ لڑائی سے پہلے دس روپے کے نوٹ کے مساوی جو نوٹ وہاں ملتے تھے، اب ان کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اب اتنی رقم ایک معمولی اخبار خریدنے، بھری ہوئی گاڑیوں پر اور زیادہ لکر کرایہ ادا کرنے یا ایک بار ٹیلیفون کرنے کی اجرت دینے کے کام آ سکتی ہے۔ برائے نام چند چیزیں جو بازار میں بکنے آتی ہیں، اتنی گراں ہیں کہ ان کی قیمت ڈالر میں لکھی جاتی ہے۔ شہر ہو یا دیہات بہت سی چیزیں بکنے کی بجائے ایک دوسرے سے بدل لی جاتی ہیں۔ مثلاً جوتہ کا ایک جوڑا دیا اور ٹوکری بھر کوئلے لئے یا ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی بجائے اُسے ایک درجن انڈے تھما دیئے۔

مجھے بوڈاپسٹ میں ایک نوجوان عورت سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ پورے خاندان میں سے وہی ایک رکن زندہ بچ رہی تھی اس نے بتایا کہ میں نے بوڈاپسٹ والے اپنے شکستہ مکان سے اٹھارہ عدد برق افشاں (ریڈی ایٹر) نکال کر لطیف کی دس پونڈ چربی کے عوض بیچ دئے۔ وہ شہری ملازمت میں تھی۔ اسکے جسم پر جو کپڑے نظر آ رہے تھے، بس وہی اسکی کل کائنات تھی۔ باقی سب سامان اشیائے خوراک کے عوض دیا جا چکا تھا۔

شہر کے رہنے والے بہت سے لوگوں کا لباس میلا کچیلا اور پھٹا پرانا ہوتا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر ٹھنڈا موسم گرما کا۔ کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں اور اس کے بعد والے زمانے میں بہت سے لوگوں کے لباس لوٹ لئے گئے تھے۔ بچے سب سے زیادہ مصیبت میں گرفتار تھے۔ حال ہی میں گاڑی کے اندر ایسے بچوں کو دیکھا جو صدر مقام چھوڑ کر کسی دوسرے ضلعے میں اسلئے جا رہے تھے کہ شاید وہاں کچھ زیادہ کھانے کو مل جائے۔ ان میں سے مشکل ہی سے ایک دو بچوں کے پاس اوور کوٹ یا جوتے تھے، اور بہت سے ننگے پاؤں تھے۔

کچھ سردی کی بنا پر اور کچھ اسلئے کہ عمارتیں سلامت نہیں تھیں، موسم سرما کے مہینوں میں تمام مدرسے بند کر دئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض مارچ کے آخر میں کھل گئے۔ گذشتہ چند سال میں ہنگری میں تعلیمی نظام کو بھی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ پچھلے سال تمام مدرسے لڑائی کی وجہ سے بند کر دئے گئے تھے خصوصاً اس لئے کہ تمام استادوں کو لام پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے وہ

اتحادیوں کی بمباری کے باعث بند رہے۔ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنگری کے بچوں نے گذشتہ تین سال میں بمشکل چھ مہینے تعلیم حاصل کی۔

نئی پود کو لازمی طور پر بقائے حیات کے لئے زبردست کشمکش کرنی پڑ رہی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کے لئے صورت حالات بالکل ناقابل برداشت ہے۔ عام دنوں میں بھی ہنگری کے طلباء عموماً غریب ہوتے تھے۔ پھر بھی چھ ہزار کے قریب طلباء بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں واپس آ گئے ہیں اور تقریباً دو ہزار باقی دو تین یونیورسٹیوں میں ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح طلبا بھی زمین میں گڑھے کھود کر ان میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کی رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے جوتوں کے تلے بالکل چھلنی ہو گئے ہیں گھی، چینی اور گوشت ایسی چیزیں ہیں جو اب بھول کر بھی ان کے خواب میں نظر نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ کتابیں بھی ان کے لئے کمیاب ہیں۔

مجھے فنی کتابوں کی ایک لائبریری کی بابت بتایا گیا جسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں چھپا دیا گیا تھا، کہ جب نازی فوج کے سپاہیوں کو اسکا پتہ لگ گیا تو انھوں نے کتابیں نکال کر دلدلی سڑکوں کو پاٹ دیا۔ اب جو کتابیں بچ رہی ہیں بھروسے کے لائق نہیں ہیں، اس لئے ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔

خوراک اور لباس کی کمیابی پر مستزاد مکانات کی کمیابی ہے۔ جس کے باعث اس مصیبت زدہ ملک میں زندگی بسر کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ بمباری سے تباہ شدہ شہروں اور قصبوں میں ہزاروں لوگ کھلیانوں اور ذخیرے کے گوداموں میں رہنے کے لئے مجبور ہیں لڑائی کے دوران میں ہنگری کے آدھے سے زیادہ مکانات بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ بوڈاپسٹ کے ہزاروں مکانوں کی کھڑکیاں فنا ہو چکی ہیں اور انھیں بند رکھنے کے لئے نہ شیشے کے ٹکڑے ہیں نہ لکڑی کے تختے۔ میں نے شہر کے ایسے مکانوں کو جاکر دیکھا جن میں مزدور یا درمیانی درجہ کے بیوپاری رہتے تھے ان میں سے ایک کی کھڑکی بھی سلامت نہیں تھی۔ ایسی صورت میں گذشتہ موسم سرما کی سردی کتنی تکلیف دہ رہی ہوگی، اسکا تصور ہی ہوش اُڑا دیتا ہے۔

ان مصائب و آلام کے ہوتے ہوئے یہ معلوم کرکے تعجب نہیں ہوتا کہ

ہوتا کہ وہ اسپتال جو بچ رہے ہیں، مریضوں سے بری طرح بھرے ہوئے ہیں۔ معدودے چند ڈاکٹر موجود ہیں اور ڈاکٹری سامان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ملک بھر میں نہ تو بیہوشی سنگھانے یا انجکشن دینے کا سامان ہے اور نہ ایکس رے کی تصاویر کھینچنے کے لئے کوئی فلم۔ بہت سے باقیماندہ اسپتال بھی محض اسلئے بند ہو گئے کہ وہاں نہ دوائیاں تھیں نہ کپڑے کی پٹیاں اور نہ ایندھن۔ انھوں نے مریضوں کو قسمت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔

حمل ونقل کی دشواریاں بھی علیحدہ مصیبت بنی ہوئی ہیں سنہ ۱۹۴۴ء میں ہنگری کے سرکاری محکمۂ ریل کے پاس باربرداری کے پانچ ہزار ڈبے موجود تھے۔ اب ان میں سے دو ہزار نو سو باقی ہیں۔ دو ہزار چار سو اسّی انجنوں میں سے کل چار سو اسّی رہ گئے ہیں۔ جرمن سپاہی تقریباً اسّی ہزار موٹر گاڑیاں اور دریائے ڈینیوب کا سارا آبی بیڑا لے بھاگے۔

نتیجہ یہ کہ ریل کا سفر اب دشوار ہو گیا ہے۔ حال ہی میں حکومت امریکہ نے گفت وشنید کے بعد ایک کروڑ ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے تاکہ ہنگری اس رقم سے امریکی فوج کی گاڑیاں خریدے۔ اسطرح کافی مدد مل جائے گی۔

آزادی کے بعد نئی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گذشتہ اگست کے مہینے میں تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین ساڑھے سات لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دی لیکن نتیجہ کچھ نہ رہا۔ بدقسمتی سے اوزار، بیج اور باربرداری کی سہولتیں میسر نہ ہونے کے باعث اس امداد سے برآمد ہونے والے نتائج کسی عنوان اپنا ظہور نہ دکھا سکے۔

مختصر یہ ہے کہ ہنگری اسوقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہر چیز کمیاب ہے اور پھر بھی ہنگری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہاری ہوئی لڑائی کا بھگتان بھگتی رہے۔ زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان حالات کے ہوتے ہوئے لوگوں میں خوش مزاقی کی اہر دوڑی ہوئی ہے اور حکومت حد درجہ آرزومند ہے کہ بہت جلد اپنے ملک میں ایک خوشگوار نئی دنیا کی فضا قائم کرے۔

("لنڈن کالنگ" سے ماخوذ)

غزل

جلیل شیرکوٹی

بڑھ گئی حد سے کیوں خلش دل کی
آمد آمد ہے میرے قاتل کی؟

یہ ہی معراج ماتم غم ہے
ڈبڈبا آئی آنکھ قاتل کی

تک رہے ہیں جدھر جدھر دیکھو!
اُف خدا خیر ہو مرے دل کی

کاش! منزل کی جستجو ہو مری
راہ تکتا ہوں تھک کے منزل کی

چوٹ دل پر ضرور کھائی ہے
چشم پرنم ہے آج قاتل کی

یہ ہی نا! ایک شئے لطیف و گداز
ہوگی تعریف اور کیا دل کی؟

ان کے طعنوں کا کچھ اثر نہ ہوا
داد دے کوئی تنگیٔ دل کی

خود وہ کھنچتے ہوئے چلے آئے
وسعتیں دیکھ جذبِ کامل کی

نقد و نظر

مطبوعاتِ ادارۂ نشریاتِ اردو حیدرآباد دکن

اس سے قبل ادارۂ اشاعتِ اسلامیات کی بابت اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ یہ ادارہ اسی ادارے کی تجارتی اور ادبی شاخ ہے۔ لہٰذا مقاصد اور حسنِ انتظام یکساں ہیں جس کے مکرر اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسوقت اس ادارے کی تین کتابیں پیشِ نظر ہیں:۔

جنگِ مشرق و خاتمۂ جاپان | مصنفین مولوی محمد اسحٰق صاحب و محترمہ زبیدہ تبسم۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۰ صفحات مجلد قیمت دو روپے۔ یہ جاپان کے عروج و زوال کی ایک پُراز معلومات داستان ہے جسے نہ صرف سیاسی بلکہ تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی اعتبار سے بڑے سلیقے کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ اصولاً چین اور بحرالکاہل میں پھیلے ہوئے مشرقِ بعید کے تمام جزیروں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ کیونکہ یہ جانے بغیر اصل موضوع کو پوری طرح سمجھ لینا مشکل ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے تاریخ ہے حتیٰ کہ آخری باب میں ایٹم بم کی ایجاد اور اسکی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً چودہ پندرہ صفحات میں مختصر طور پر جنگِ مشرق کا روزنامچہ پرل ہاربر کے حملے سے سپر اندازی تک لکھا ہے جو یادداشت کے لئے یقیناً مفید ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب کا مطالعہ کر کے ان تمام واقعات کو جو ابھی تازہ ہیں، حافظے کی لوح پر ہمیشہ کے لئے مرتسم کیا جا سکتا ہے۔

رموزِ اقبال | مصنف:۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۸۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سوا دو روپے۔ اس کتاب کے پانچ باب ہیں جو فلسفۂ خودی، نظریۂ عقل و عشق، حدیث جبر و قدر، عہد حاضر کا انسان اور مسلمان کی زندگی سے متعلق ہیں۔ ہر چند ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن قابل مصنف نے جو جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ہیں، بڑی گہری نگاہ ڈال کر ایسے نکتے پیدا کئے ہیں جو ان سے قبل قلم اٹھانے والوں کی نظرِ انتقاد سے پوشیدہ رہ گئے تھے۔ اور بس اسی اعتبار سے اس کتاب کو مفید اور قابلِ قدر کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کی تعلیمات اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں متعدد بار آیاتِ قرآنی سے ہم آہنگی پیدا کر کے دکھائی ہے۔ مشرق و مغرب کے دوسرے مفکرین کے اقوال بھی بطور حوالہ درج ہیں۔

روحِ حیات | مصنف:۔ جناب اختر قریشی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۱۲ صفحات جلد معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔ یہ ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف حضرات کو لکھے گئے ہیں۔ مکتوباتِ نیاز کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن نہ فکر و خیال کی اتنی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی بے ساختگی کہیں کہیں طنز و مزاح کے لطیف پہلو کچھ مزا دے جاتے ہیں۔ ورنہ بحیثیت مجموعی ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ اکثر جگہ زبان کی غلطیاں ہیں جو معمولی کوشش سے دور ہو سکتی تھیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت کے وقت ان کا لحاظ رکھا جائیگا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ خطوط اصلی ہیں حالانکہ درحقیقت بالارادہ لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے تصنع اور بناوٹ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

شفق | مصنف:۔ جناب شفیق جونپوری۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب عزیز ربانی سیکرٹری نظام ادب۔ جونپور ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۸ صفحات بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ حضرت شفیق جونپوری کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے قبل صبح کعبہ، اغلاسِ مشرق، اور طوبیٰ شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف نے قدیم طبقے کی ہمنوائی اس لئے نہیں کی کہ "وہ ابھی تک اپنی کہنگی و پامالی ہی پر قانع ہے۔ اس میں کسی تازگی کی گنجائش نہیں" نیا رنگ اسلئے اختیار نہیں کیا کہ "اعتماد کے قابل مستند ادیب شاعر نئے دور نے ایک بھی نہیں پیدا کیا" اس کے ساتھ ہی اس کا اعتراف ہے کہ "بعض کسی فرمائش یا مخصوص جذبات کے ماتحت ہیں تاکہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بھی کلام ہی دامن نہ ہو" وہ پہلے حسرت موہانی کے معتقد تھے، ۱۹۴۳ء سے علامہ اقبال کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ ان کے اظہارِ بیان کے متضاد پہلوؤں کا لحاظ رکھنے کے بعد جب کلام پر نظر ڈالی جائے تو کہنگی اور پامالی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ بعض اشعار متقدمین کے کلام کا بالکل چربہ بلکہ ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ایسے شعروں کو جو زبان زدِ خلائق ہو چکے ہوں نئے الفاظ میں پیش کیا جائے تو اسے توارد بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ف ح

سیرِ کشمیر | مصنف:۔ مولوی محمد عبدالمجید صاحب بی اے گورکھپوری۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب قاضی محمد مسعود علی، قاضی پور خورد۔ گورکھپور۔ ۲۰×۲۶/۸ کے ۱۳۲ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخی، جغرافیائی اور تفریحی اعتبار سے مفید ہو سکتا ہے۔ مصنف نے بذاتِ خود کشمیر کی سیر کر کے جملہ واقعات قلمبند کئے ہیں۔ معمولی سے معمولی چیزیں بھی انکی نظر سے بچنے نہیں پائیں۔ انہوں نے خوب سیر کی اور اسے پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ زبان شگفتہ اور اندازِ بیان دلپذیر ہے۔ کہیں کہیں اشعار کا استعمال زیادہ لطف پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کتاب "رہنمائے کشمیر" ہونے کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی لائقِ تحسین ہے۔ مطالعہ کرتے وقت انسان اپنے آپ کو کشمیر کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس خطۂ جنت نظیر کی سیر کرنے والے حضرات سفر سے قبل اسکا مطالعہ کر لیں تو انہیں بہت سے کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔

دنیا ہماری مصنف :- جناب پردیسی۔ ملنے کا پتہ :- راج کمل پبلشرز جموں کشمیر ۶۰۰ ۔ ۲۰ ۔ ۲۰ ۔ ۲ ۔ ۴ صفحات ۔ مجلد قیمت ڈھائی روپے۔ یہ پردیسی صاحب کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں زندگی کے دردناک پہلوؤں کو بڑے دلگداز انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ ہر افسانہ روزمرہ زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں صداقت اور واقعیت کی جھلک سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح وہ مظلوموں کی حیات المیہ سے کھیلے نہیں ہیں بلکہ دکھے ہوئے دلوں کی ضربات کو خود محسوس کرنے کے بعد دوسروں کو محسوس کرایا ہے کہ وہ بھی ان کا مطالعہ اس طرح کریں اور سماج کے چہرے پر لگے ہوئے بدنما داغوں کو دھونڈلنے کی کوشش کریں۔ انداز بیان میں بھی صحیح جذبات کی ترجمانی موجود ہے۔ البتہ افسانوں میں پلاٹ برائے نام ہے۔ اسمیں ندرت پیدا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود ہر افسانہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "میراحق" "کاریگر" "دنیا ہماری" اور "چتائیں" خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ "تمہارا" میں جنسی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مگر عریانی سے پاک ہے۔

> "نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں آنی ضروری ہیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔ ـــــ ادارہ

برطانیہ کی ٹریڈ یونینیں

ان کی ابتدا اور ارتقا

والٹر اسٹرین

(برطانیہ میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک کا ارتقا آہستہ آہستہ لیکن باقاعدگی کے ساتھ ہوا۔ گو اس تحریک کے ابتدائی نشان سترھویں صدی کے وسط میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی حقیقی ابتدا اصل میں اٹھارویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ وقتاً فوقتاً جو مختلف قانون نافذ ہوتے رہے انہوں نے اس تحریک کو قومی زندگی کے تار و پود میں شامل کر لیا اور اس کے بعد سے برابر زندگی میں اس کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس مضمون کا مصنف ۱۹۲۶ء سے برابر برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگریس کا جنرل سکریٹری رہا ہے۔)

برطانیہ کے جن قومی اداروں میں اہلِ برطانیہ کے کردار کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے، ان میں ٹریڈ یونینوں کی بے حد نمایاں جگہ ہے۔ ان ٹریڈ یونینوں سے ان کے کردار اور سیرت کے خاص خاص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے — مثلاً زندگی کے جمہوری طریقوں کے ساتھ اٹل لگاؤ، آزادی کا شدید احساس، ضبطِ نفس کی صلاحیت، اور اپنے معاملات کو پوری عملی سوجھ بوجھ اور مستعدی کے ساتھ کرنے کی حیرت انگیز قدرت۔

برطانیہ کے لوگوں میں امداد باہمی اور اشتراکِ عمل کا جو شدید جذبہ ہے، برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تخلیق اس کے تحت میں ہوئی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ جذبہ مشینی پیداوار، کارخانوں کے نظام، اور اجرت کے معاہدوں کے زمانہ سے کافی پہلے سے کام کر رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی گلڈز کو صحیح معنوں میں ٹریڈ یونینوں کی ابتدائی شکل نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ گلڈ جدید ٹریڈ یونینوں کے بعض خاص مقصدوں کو پورا کرتے تھے اور ایک ایسے زمانہ میں کرتے تھے جب اجتماعی لین دین کے موجودہ طریقوں پر عمل کرنا تو تقریباً ناممکن تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قانون اور گلڈوں کے بنائے ہوئے قاعدے اور ضابطے جہاں ایک طرف امیدواروں، ورکروں اور پیشہ کاریگروں کی ذمہ داریوں اور کام کی شرطوں کا تعین کرتے تھے وہاں دوسری طرف کارخانداروں، جن کی حیثیت آجکل کے آجر کی سی تھی، کی ذمہ داریوں کو بھی واضح کر دیتے تھے۔

درحقیقت میں جب ٹریڈ یونینوں کا رواج شروع ہوا ہے تو گلڈوں کا نظام بھی باقی اور قائم تھا اور مزدوری اور کام کے متعلق حکومت نے جو قانون اور ضابطے بنا رکھے تھے انہیں بھی آجروں کا نیا طبقہ اور سرمایہ داروں کا وہ گروہ جسے صنعتی انقلاب نے پیدا کیا تھا، مٹا نہیں سکا تھا۔

موجودہ برطانوی ٹریڈ یونینوں سے ملتی جلتی ایک چیز جس میں کام کرنے والے متحد ہو کر سامنے آئے، اصل میں اٹھارویں صدی کے ابتدائی دنوں میں شروع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پانی کی قوت کے استعمال سے، گاؤں اور چھوٹے چھوٹے شہروں کی گھریلو صنعتوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی زمانہ ہے کہ جب زمین کی مشترکہ ملکیت کے خلاف بعض قانون جاری ہوئے تھے اور زراعت پیشہ لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں کارخانہ والے شہروں، کانوں والے علاقوں اور ان حصوں کی طرف آ رہی تھی جہاں لوہے کی صنعت بڑھ رہی تھی۔ صنعتی انقلاب نے کام کرنے والوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو لمبی لمبی مزدوریاں کرتا تھا، اور کام لینے والوں میں بھی ایک نیا سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ کام کرنے والوں (یا مزدوروں) کے لئے اجرت اور مزدوری کے سرکاری قانون ایک قسم کے تحفظ کا کام دیتے تھے۔ لیکن کام لینے والوں (آجروں اور سرمایہ داروں) کے لئے یہ قانون ایک طرح کی رکاوٹ تھے۔ اور اسلئے انہوں نے ایسے قانونوں کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ اور ان دنوں بہت سی عارضی یونینیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ پارلیامنٹ پر زور ڈال کر مزدوروں کے قانون نافذ کرا دیں۔

ادھر بعض نئے قانونوں کے نفاذ کی وجہ سے مزدوروں کے لئے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو منظم کر سکیں۔ ۱۸۲۴ء کے قانون کی رو سے یہ طے ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کام دھندے کے حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے کسی جماعت یا تنظیم میں شریک ہو تو وہ کسی طرح کی سازش کا مجرم نہیں ٹھیرایا جا سکتا اور نہ اس پر کسی قسم کی قانونی سختی یا سزا کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس قانون کے بعد سے یونینوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ لیکن ان یونینوں کی حیثیت محض کاریگروں اور دستکاروں کی مقامی انجمنوں کی سی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں ان کو ایک قومی پیمانہ پر متحد کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ اور انجینیری، لکڑی کے کام، جہاز سازی کی صنعت، چھاپہ خانوں، کپڑے اور جوتے کا کام کرنے والوں کے علاوہ دوسرے دستکاروں کی مستحکم اور عملی انداز میں چلنے والی یونینوں کے قیام نے اس تحریک کو نئی راہ دکھائی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ٹریڈ یونینوں سے تعلق رکھنے والے قانونوں میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ سنہ ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان جو متعدد قانون جاری ہوئے انہوں نے واضح طور پر یہ بات صاف کر دی کہ ٹریڈ یونینوں کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ ان قانونوں سے یونینوں کو ایک طرح کا قانونی تحفظ مل گیا اور ان کی ایک آزاد اور

شخصی حیثیت تسلیم کرلی گئی۔ پارلیامنٹ کے ان قانونوں کی بنا پر یونینوں کو اس بات کا حق حاصل ہوگیا کہ وہ بغیر کسی قسم کی دخل اندازی کے اپنے متعین مقاصد پر چل سکیں۔ ۱۸۷۶ء کے بعد ۲۵ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک ان کی قانونی حیثیت ان کے حقوق، ان کی ذمہ داریوں اور ان کی رعایتوں کے متعلق کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔

تقریباً ۲۵ سال کی مدت میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک دستکاروں کی محدود جماعت سے بڑھ کر مزدوروں کی نسبتاً بہت بڑی جماعت میں پہنچ گئی۔ اور رفتہ رفتہ کانوں میں کام کرنے والوں، ریلوں کے ملازموں، اور ٹرانسپورٹ کے محکمہ والوں میں اس کا اثر بہت تیزی سے بڑھا۔ اور پھر ہر طرح کے مزدوروں، مثلاً بندرگاہوں، میونسپل گیس ورکس، برتنوں کے کارخانوں، اور چھوٹے بڑے کارخانوں میں کم مزدوری پر کام کرنے والی عورتوں تک میں یہ تحریک پھیل گئی۔ ۱۸۸۹ء میں لنڈن کے بندرگاہ میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہوئی۔ اور یہ ہڑتال بہت جلد دوسرے بندرگاہوں میں بھی پھیل گئی۔ اس ہڑتال میں ایک نئی بنی ہوئی یونین نے بندرگاہوں، گھاٹوں اور دریا کے کنارے کام کرنے والے مزدوروں کے لئے ۶ پینس فی گھنٹہ کی مزدوری کا مطالبہ کیا۔

اس ہڑتال سے ٹریڈ یونین کی تحریک کو زبردست قوت ملی اور مقامی ٹریڈ کونسلوں کے قیام اور ٹریڈ یونین کانگریس ۱۸۶۸ء میں بنائی گئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے تعلق رکھنے والی مختلف یونینوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اپنے معاملات پر بحث مباحثہ کرسکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ابتدائی مقصد میں اور بہت سے مقصد بھی شامل ہوتے گئے۔ حالانکہ اب بھی اس کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی ہے جہاں معاملات پر صحیح بچار اور بحث تمحیص ہوتی ہے۔ کسی یونین پر اس کی رکنیت لازمی نہیں۔ جو یونینیں اس کی رکنیت قبول کرتی ہیں وہ اپنی خوشی سے اس کے قواعد کی پابندی کو بھی اپنے لئے لازم سمجھتی ہیں۔ لیکن اس رکنیت کے بعد ان کی اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت جوں کی توں رہتی ہے۔ اور وہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتی ہیں۔ کانگریس نے اپنے لئے بھی ایک مرکزی نظام وضع کیا ہے جس کی مدد سے وہ پوری تحریک کو چلا سکے، یونینوں کی عام بھلائی اور بہبودی کے سلسلہ میں اپنی کوشش جاری رکھ سکے۔ اور اپنا ایک عام پروگرام اور پالیسی بنا سکے۔ اس پروگرام اور پالیسی میں کانگریس، صنعت و حرفت اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلیاں کرتی رہتی ہے۔

تعداد اور دائرہ عمل میں ان یونینوں نے کس حد تک ترقی کی ہے، اس کا اندازہ کانگریس کے کاغذات دیکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۸۶۸ء میں مانچسٹر میں ہو رہا تھا جس میں تھوڑی سی سوسائٹیوں کے ۳۴ نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس وقت ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی تعداد ۱۲۰،۰۰۰ تھی۔ انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں ممبروں کی تعداد پندرہ لاکھ ہوگئی، اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ان ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ تھی۔

برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تعداد برابر گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ لیکن بحران کے بدترین دنوں میں (بیسویں صدی میں) اس کی بنیادیں بے حد مضبوط رہی ہیں اور اس کے لاکھوں ممبروں میں پوری تنظیم رہی ہے۔ دونوں جنگوں کے درمیانی زمانہ میں، ۳۴-۱۹۳۳ء میں ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ سے گھٹ کر ساڑھے تینتیس لاکھ رہ گئی۔ لیکن جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کانگریس میں ۲۰۶ یونینیں شامل تھیں اور ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۴۵ لاکھ ہوگئی تھی۔ لڑائی کے زمانہ میں ممبروں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں جو یونینیں کانگریس کے ساتھ ملحق تھیں ان کے ممبروں کی تعداد ۶۵،۷۵،۶۵۴ تھی — اور ان میں ت ۱۳،۰۰،۰۰۰ تھیں۔

اب برطانوی ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ ۲۰۰ یونینیں ملحق ہیں۔

پیتم

کیا رکھا ہے اس جیون میں تو ہی نہیں جب پاس؟
تیرے بنا اس دکھیا من کی کون بندھائے آس؟
نیر بہائیں نین
پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

امنڈ گھمنڈ کے بادل برسیں جھوم رہی برسات
رہ رہ کر ڈستی ہے من کو ناگن کالی رات
تڑپت ہوں دن رین
پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

سلگ رہی ہے من میں اگنی آ کر اسے بجھا جا
نینن ہیں درشن کے پیاسے سندر مکھ دکھلا جا
ہردے ہے بے چین
پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

کشور شمیم

ان کا آپس میں بھی الحاق ہوتا رہتا ہے اور اس طرح ان کی تعداد گھٹتی رہتی ہے۔

ان یونینوں میں ہر طرح کے کاروباری اور ملازم شامل ہیں۔ اب مزدوروں کی یونینوں کے علاوہ، تنخواہ دار ملازموں، ٹکنکل ماہروں، نگرانوں اور انتظامی افسروں کی اپنی اپنی یونینیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر پیشہ کے لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اپنے مشترک مفاد کی حفاظت اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کیلئے منظم ہونا ضروری ہے۔ اور بہت سے پیشہ وروں کی یونینیں، ٹریڈ یونین کانگریس سے ملحق ہوگئی ہیں پبلک مفاد کے کام کرنے والوں، تاجروں، اسپتالوں، بنکوں، انشورنس کے ملازموں، آرٹسٹوں اور تھیٹر کے کام کرنے والوں، گویّوں، سائنٹفک کام کرنے والوں اور ڈاکٹروں کی بھی الگ الگ یونینیں ہیں۔ ان پیشوں کی منظم جماعتوں میں بھی اسی طرح الحاق ہوتا ہے جیسے چھاپہ خانوں، دھات کا کام اور لکڑی کا کام کرنے والوں کی یونینیں ہیں مثلاً انجنیرنگ اور جہاز سازی کے نقشہ نویسوں کی یونینیں، یونینوں کے اس گروہ کے ساتھ ملحق ہوں گی جس میں انجنیری، ڈھلائی اور گاڑیاں وغیرہ بنانے کے کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس سے ریلوے کلرکوں کی یونین کا الحاق ریلوے کے انجنیروں، فائرمینوں اور دیگر مستریوں کی یونینوں کے ساتھ ہوگا۔ یا جہازرانوں کی یونین)، ریڈیو کے افسروں کی یونین، اور ہوائی جہاز چلانے والوں کی یونین، ٹریڈ یونین کانگریس کے اس گروہ میں شامل ہوں گی جس میں ٹرانسپورٹ کی دوسری یونینیں (ریلوے کے علاوہ) شامل ہیں۔ اوراسی طرح کانوں والے گروہ میں، کان کے کام کرنے والوں کی بڑی نیشنل یونین کے علاوہ، کوئلہ کی کانوں کے افسروں، ماتحتوں اور نگرانوں کی یونینیں بھی شامل ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے انجنیرنگ کے گروہ میں نگراں اسٹاف، اور انجنیرنگ ٹکنکل آدمیوں کی یونینیں شامل ہیں، اور لوہے اور دوسری دھاتوں کا کام کرنے والوں کی یونینوں میں قیمتی دھاتوں کا کام کرنے والے کاریگروں کی یونین، عمارتوں کا ٹکنکل کام کرنے والوں، لکڑی کا کام کرنے والوں اور سجاوٹ کا کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔

ٹریڈ یونین کانگریس کا خیال ہے کہ عملی اور نظری دونوں حیثیتوں سے ہر وہ کام جس کا آج اور مزدور کا تعلق ہے، ٹریڈ یونین کے نقطۂ نظر سے منظم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں، ٹریڈ یونین کی تحریک انگلستان میں اب ان لوگوں میں بھی عام ہو رہی ہے، جو کسی دوسرے کے نوکر نہیں بلکہ خود اپنا کام کرتے ہیں۔ نظری حیثیت سے اس میں بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ ہاتھ کا کام کرنے والوں کی یونینوں کا الحاق انتظامی کام کرنے والوں کی یونینوں سے کر دیا جائے اسلئے کہ ٹریڈ یونین کی تحریک کی بنیاد تو اصل میں انسانی فطرت کا یہ جذبہ ہے کہ وہ باہمی طور پر مل جل رہے اور اسکے ساتھ ساتھ وہ قدرتی خواہش جو مشترک مقاصد اور مفاد کی ترقی کیلئے انسان کو متحد و متفق ہونے کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس جذبہ اور خواہش نے برطانیہ کی زندگی کے طریقہ اور نظام پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات تحرک نے پوسٹ بکس ۲۱۶ سے شائع کیا۔

لڑکیوں کی شادی کا ایک اچھا
تحفہ
رضیہ کا شاہی دسترخوان
کھانا پکانے کی بہترین کتاب
قیمت
علاوہ محصول
رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کا حسین مجموعہ
قیمت علاوہ محصول
رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بطرز جدید
قیمت
باپ کا خط بیٹی کے نام
باپ کی نصیحت
قیمت بارہ آنے
تازیانہ
دلچسپ ناول
قیمت
فاطمہ رضؓ کا لال
شہادت حسینؑ پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتاب
قیمت
پتھر سے ہیرا
اخلاقی ناول
قیمت
چھالے
نئے افسانوں کا مجموعہ
قیمت
مذکورہ کتابوں کا سیٹ ہے۔ پورے سیٹ کی قیمت سترہ روپے چار آنے ہے۔ پورا سیٹ منگانے پر محصولڈاک غیر معاف
نیا کتاب گھر اردو بازار (اے، سی،) دہلی

آجکل

دہلی

اردو کا پندرہ روزہ
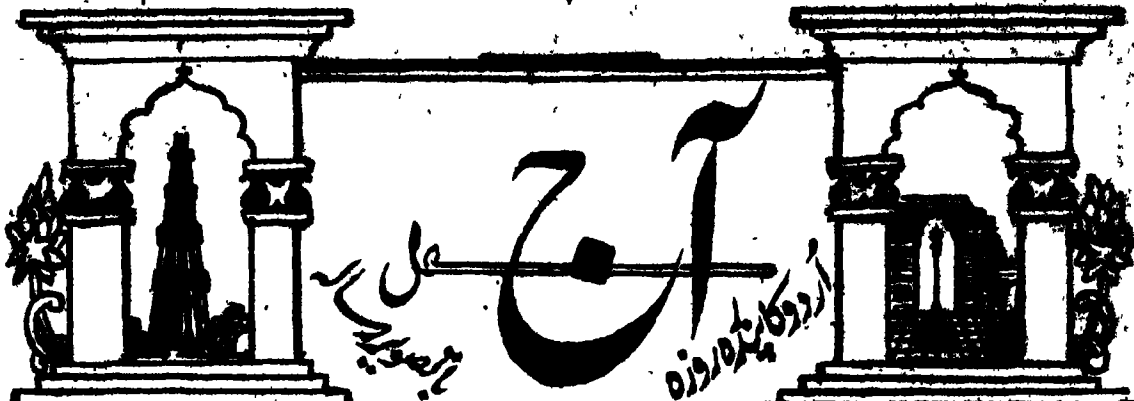
چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۹ | فہرست | یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ

آغا محمد یعقوب دواشی

بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیر

فضل حق قریشی

دہلوی

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

نائب صدر کی پہلی تقریر

ہندوستان کی عارضی حکومت کے نائب صدر آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو کی اردو تقریر کا متن جو انہوں نے ۷ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پونے نو بجے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی:-

دوستو اور ساتھیو! جے ہند!

چھ روز ہوئے کہ میں اور میرے رفیقوں نے حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں کو سنبھالا۔ اس قدیم ملک میں ایک نئی حکومت قائم ہوئی ہے جسے ہم عبوری یا عارضی حکومت کہتے ہیں۔ اور یہ ہندوستان کی کامل آزادی کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمیں دنیا کے تمام حصوں اور ہندوستان کے کونے کونے سے مبارکبادی اور خیر سگالی کے ہزاروں پیغامات موصول ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی ہم نے اس تاریخی واقعہ کو جشن کے طور پر منانے کے لئے نہیں کہا بلکہ ہم نے اپنے لوگوں کے جوش و خروش کو دبایا ہے۔ کیونکہ ہم ان کو اس بات کا احساس کرانا چاہتے تھے کہ ہمارا سفر ابھی جاری ہے۔ نیز منزل مقصود تک پہنچنا ابھی باقی ہے۔ ہمارے راستے میں بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ہمارے سفر کی آخری منزل اتنی قریب نہ ہو جتنی لوگوں نے سمجھ رکھی ہے۔ اس وقت کسی کمزوری کا اظہار اور رنجیت بیٹھنا ہمارے مقصد کے لئے مہلک ہوگا۔

حادثات کلکتہ کلکتہ کے ہولناک حادثہ اور بھائی بھائی میں فضول لڑائی جھگڑے کے باعث ہمارے دل غم سے پُر تھے۔ ہمارے پیش نظر جو آزادی ہے اور جس کی خاطر ہم نے پشت ہا پشت سے تکالیف اور مصیبتیں جھیلی ہیں وہ کسی ایک گروہ۔ جماعت یا کسی ایک مذہب کے پیرووں کی آزادی نہیں بلکہ ہندوستان کے سارے باشندوں کی آزادی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ امداد باہمی کی ایک ایسی دولت مشترکہ قائم کی جائے جس میں مواقع کے لحاظ سے یہ ان تمام باتوں میں جو زندگی کو پرمعنی بناتی اور اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہیں سب کو برابر حصہ ملے۔ اس لئے یہ کشمکش یہ خوف اور ایک دوسرے پر یہ بے اعتمادی آخر کیوں؟

خوش آیند پیغامات میں آپ کے سامنے مستقبل کی اعلیٰ پالیسی اور اپنے پروگرام کے متعلق کچھ زیادہ بیان نہیں کروں گا۔ اس کے لئے ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ میری غرض یہ ہے کہ مہر و محبت کے اس اظہار پر جو آپ نے اس قدر وسیع پیمانے پر کیا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ محبت اور تعاون کا یہ جذبہ ہمیشہ خوش آیند ہے۔ مگر اس کی ضرورت آنے والے کٹھن ایام میں بہت زیادہ ہوگی۔ ایک دوست نے مجھے یہ پیغام بھیجا ہے "حکومت کی کشتی کے پہلے ناخدا! خدا کرے آپ ہر طوفان کا کامیابی سے مقابلہ کریں۔ آپ کو یہ سفر مبارک ہو"۔ یہ پیغام خوش کن ہے مگر ہمیں آئندہ بہت سے طوفانوں کا سامنا ہوگا۔ ہماری حکومت کی کشتی پرانی شکستہ اور سست رفتار ہے اور تیزی سے بدلنے والے زمانہ کے مناسب حال نہیں ہے۔ اسے توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ ایک نئی کشتی تعمیر کرنی ہوگی لیکن کشتی خواہ کتنی پرانی کیوں نہ ہو اور ناخدا خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، اگر اس کی مدد کے لئے کروڑوں لوگ موجود ہوں تو ہم سمندر کے زبردست تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور بھروسے کے ساتھ مستقبل کے سامنے ڈٹ سکتے ہیں۔ یہ مستقبل وجود میں آرہا ہے اور ہندوستان — ہمارا قدیم اور پیارا ملک — مصیبتوں اور مشکلوں سے دوچار ہونے کے بعد اپنے آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا پاتا ہے۔ وہ اب پھر جوان سال ہے اس کی آنکھوں میں حوصلہ اور جرأت کی چمک پائی جاتی ہے۔ اسے اپنے آپ اور اپنے مقصد پر بھروسہ ہے۔ وہ ایک لمبے عرصہ تک تنگ دائرے میں محدود و فکر و غم میں ڈوبا رہا۔ لیکن اب اس کی نظریں وسیع دنیا پر اٹھ رہی ہیں اور وہ دوستی کا ہاتھ دنیا کی

دوسری قوموں کی طرف بڑھا رہا ہے جو اگرچہ ابھی تک کشمکش اور جنگ کے خیالات سے پر ہے۔

اشتراکِ عمل کی امیدیں

عارضی قومی حکومت اس بڑی اسکیم کا ایک حصہ ہے جس میں دستور ساز اسمبلی شامل ہے، جس کا اجلاس آزاد اور خود مختار ہندوستان کا آئین مرتب کرنے کے لئے جلد منعقد ہوگا۔ کامل آزادی کے قریبی حصول کی یہی امید ہے جس کی وجہ سے ہم اس حکومت میں شامل ہوئے ہیں اور ہم اپنے فرائض کو اس رنگ میں انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ نہ صرف اپنے ملکی معاملات میں بلکہ غیر ملکی تعلقات میں بھی یہ آزادی عملی طور پر بسرعت حاصل ہو جائے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پورا پورا حصہ لیں گے۔ اس بارے میں ہماری پالیسی کسی دوسری قوم کا طفیلی ہونے کی حیثیت سے نہیں ہوگی بلکہ وہ ہماری اپنی پالیسی ہوگی ہم دوسرے ملکوں سے گہرے اور براہ راست تعلقات قائم کرنے اور عالمگیر امن اور آزادی کے مقصد کے حصول میں ان سے اشتراک عمل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم مخالف گروہوں کی اقتداری سیاسیات سے دور رہیں۔ زمانہ ماضی میں یہی جذبہ عالمگیر جنگوں کا موجب ہوا ہے اور یہی جذبہ آئندہ بھی وسیع تر بربادی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ امن اور آزادی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور کسی ایک ملک کو آزادی دینے سے انکار لازمی طور پر دوسرے ملکوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈال دے گا اور کشمکش اور جنگ کا موجب بن جائے گا۔ ہمیں نوآبادیوں اور دست نگر ملکوں اور باشندوں کی آزادی سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ اس طرح ہمیں اس بات سے بھی خاص دلچسپی ہے کہ تمام نسلوں کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچانے کے اصول کو نظری اور عملی اعتبار سے تسلیم کر لیا جائے۔ ہمیں نسلی برتری کے نازی اصول سے جس پر خواہ کہیں بھی اور کسی صورت میں بھی عمل کیا جا رہا ہو شدید اختلاف ہے۔ ہم دوسروں پر اقتدار قائم کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہمیں دوسری قوموں پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہونے کا دعویٰ ہے۔ لیکن ہمارا یہ مطالبہ ضرور ہے کہ ہمارے لوگ جہاں بھی وہ جائیں ان سے مساویانہ اور عزت مندانہ سلوک کیا جائے اور ہم ان کے خلاف کسی قسم کی تفریق کو گوارا نہیں کر سکتے۔

باہم رقابتوں، نفرت اور داخلی تنازعوں کے باوجود دنیا ناگزیر طور پر پہلے سے زیادہ اشتراک عمل کرنے اور ساری دنیا کی ایک دولت مشترکہ کے قیام کی طرف آرہی ہے۔ یہی وہ واحد دنیا ہوگی جس کے لئے آزاد ہندوستان کوشش کرے گا۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں آزاد قومیں آزادانہ اشتراک عمل کریں گی، اور کوئی جماعت یا گروہ کسی دوسری جماعت یا گروہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

انگلستان کے ساتھ دوستی

گذشتہ باہمی کشمکش کے باوجود ہمیں امید ہے کہ آزاد ہندوستان کے تعلقات انگلستان اور برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ہوں گے۔ لیکن بہتر ہے کہ دولت مشترکہ کے ایک حصہ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اسے یاد رکھا جائے۔ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کو سرکاری حمایت حاصل ہے اور نسلی اعتبار سے ایک اقلیت کے جور و ستم کے خلاف ہمارے لوگ بہادروں کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اگر نسلی برتری کے اس عقیدہ کو قبول کر لیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ [illegible] پیمانے پر تصادم اور عالمگیر تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندوں کو مبارکباد دیتے ہیں جنہیں مقدر نے بین الاقوامی معاملات میں اہم حیثیت دے رکھی ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ اس بہت بڑی ذمہ داری کو امن اور انسانی آزادی کو ہر جگہ فروغ دینے کے لئے کام میں لایا جائے گا۔ موجودہ دنیا کی اس دوسری بڑی قوم یعنی سوویٹ یونین کو بھی ہم مبارکباد دیتے ہیں جس پر عالمگیر واقعات کی تشکیل کی عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایشیا میں وہ ہمارے پڑوسی ہیں لازمی طور پر ہمیں کئی مشترکہ کام سنبھالنے ہوں گے اور ہمیں ایک دوسرے سے اکثر واسطہ پڑیگا۔

پڑوسی ملکوں سے اتحاد

ہم ایشیا کے رہنے والے ہیں اور دوسروں کی نسبت ایشیا کے لوگ ہم سے زیادہ نزدیک اور قریب ہیں۔ ہندوستان اس طرح واقع ہوا ہے کہ وہ مغربی، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کا مرکز ہے۔ گذشتہ زمانے میں ہندوستان کی تہذیب ان تمام ملکوں تک پھیل گئی تھی اور ان ملکوں کا بھی ہندوستان سے کئی صورتوں میں واسطہ پڑتا تھا۔ ان تعلقات کی تجدید کی جا رہی ہے اور مستقبل میں ایک طرف ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا اور مغرب میں افغانستان۔ ایران اور دنیائے عرب کے درمیان اور بھی زیادہ اتحاد ہونا ناگزیر ہے۔ آزاد ملکوں کے اس گہرے اتحاد کو ترقی دینے کے لئے ہمیں اپنی کوششیں صرف کرنی چاہئیں۔ ہندوستان انڈونیشیا کے لوگوں کی جنگ آزادی کا گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا ہے اور ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ہمارا پڑوسی چین کا بڑا ملک

جس کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے صدیوں سے ہمارا دوست ہے۔ یہ دوستی قائم رہے گی اور بڑھتی جائے گی۔ ہمیں قوی امید ہے کہ چین کی موجودہ مشکلات جلد ختم ہو جائیں گی اور ایک متحدہ اور جمہوری چین جنم لے گا جو دنیا کے امن اور ترقی میں بہت بڑا حصہ لے گا۔

داخلی پالیسی

میں نے اپنی داخلی پالیسی کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اس مرحلہ پر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ اس پالیسی کے تعین میں وہی اصول کام کریں گے جن پر ہم آج تک کاربند رہے ہیں۔ ہم ہندوستان کے بھلائے ہوئے عوام کی خبر گیری کریں گے اور انہیں آرام پہنچانے اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم چھوت چھات کی لعنت اور اونچ نیچ کی جبری تفریق کی مختلف شکلوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور خاص طور پر ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے جو اقتصادی یا دوسرے اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ آج کروڑوں آدمیوں کو خوراک، کپڑوں اور مکانوں کی ضرورت ہے اور بہتوں کی حالت فاقہ کشی تک پہنچنے والی ہے۔ اس فوری ضرورت کو پورا کرنا ایک اہم اور مشکل کام ہے اور امید ہے کہ دوسرے ملک غلہ بھیج کر ہماری مدد کریں گے۔ ایک ایسا ہی ضروری اور اہم کام نفاق کے اس جذبہ پر قابو پانا ہے جو آج ہندوستان میں بہت پھیلا ہوا ہے۔ باہمی جھگڑوں کی بنا پر ہم آزاد ہندوستان کو تعمیر نہیں کر سکیں گے جس کے خواب ہم اتنی مدت سے دیکھتے رہے ہیں۔ سیاسی تغیرات خواہ کچھ ہی ہوں ہم سب کو اس ملک میں اکٹھا رہنا سہنا اور کام کرنا ہے۔ نفرت اور تشدد اس بنیادی حقیقت کو بدل نہیں سکتے اور نہ ہی یہ ان تبدیلیوں کو روک سکتے ہیں جو ہندوستان میں واقع ہو رہی ہیں۔

دعوتِ اشتراک

دستور ساز اسمبلی میں گروپ بندی اور سیکشنوں کے متعلق کافی گرماگرمی کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ہم ان سیکشنوں میں بیٹھنے کے لئے بالکل تیار رہیں اور ہم نے اس پوزیشن کو قبول بھی کر لیا ہے جو گروپوں کی تشکیل کے مسئلہ پر غور کریں گے۔ میں اپنے رفیقوں اور خود اپنی جانب سے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم دستور ساز اسمبلی کو زور آزمائی یا ایک فریق کے نقطۂ نظر کو دوسرے پر زبردستی ٹھونسنے کے لئے اکھاڑا نہیں سمجھتے۔ ایک مطمئن اور متحدہ ہندوستان کو تعمیر کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہم ایسے متحدہ اور متفقہ حل چاہتے ہیں جنہیں زیادہ سے زیادہ خیرسگالی حاصل ہو۔ ہم دستور ساز اسمبلی میں اس پختہ عزم کے ساتھ جائیں گے کہ تمام متنازعہ مسائل کے لئے اتفاق کی مشترک بنیاد تلاش کی جائے پس جو کچھ ہو چکا ہے اور جو سخت الفاظ استعمال کئے جا چکے ہیں ان کے باوجود ہم نے تعاون کا راستہ کھلا رکھا ہے اور ہم ان لوگوں کو بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہمسروں اور حصہ داروں کی حیثیت سے کسی قسم کی پابندیوں کے بغیر دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جب ہم ایک جگہ جمع ہو کر مشترکہ کاموں میں ہاتھ ڈالیں تو ہماری موجودہ مشکلات ختم ہو جائیں۔

ہندوستان کا کاروان جادہ پیما ہے اور پرانا نظام ختم ہو رہا ہے۔ کافی مدت تک ہم واقعات کا چپ چاپ مشاہدہ کرتے رہے اور دوسروں کے کھلونے بنے رہے اب ہمیں ہمارے ہاتھ آئی ہے اور ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنا مستقبل بنائیں گے۔ آؤ ہم سب اس بڑے کام میں شریک ہوں اور ہندوستان کو جس پر ہمیں فخر ہے اور جس کا مرتبہ دنیا کی قوموں میں بہت بڑا ہے امن اور ترقی کے ذرائع میں امتیازی درجہ دے دیں۔ دروازہ کھلا ہے اور مقدر ہم سب کو اشارے سے بلا رہا ہے۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جیتتا کون ہے اور ہارتا کون ہے کیونکہ ہمیں ساتھیوں کی طرح آگے بڑھنا ہے اور یا تو ہم سب کامیاب ہوں گے یا سب کے سب اکٹھے ڈوبیں گے۔ لیکن ہمیں ناکامی ہرگز نہ ہوگی۔ ہمارا قدم کامیابی۔ آزادی، خود مختاری، اور ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کی بہبودی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

جے ہند" جواہر لال نہرو

گندم کے ذخیروں میں کمی

امریکہ کے محکمۂ زراعت کا بیان ہے کہ یکم جولائی کو امریکہ، کنیڈا، ارجنٹائن اور آسٹریلیا کے گندم کے ذخیروں میں قلت کا یہ عالم تھا کہ گزشتہ دس سال میں یہ کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور یہ وہ ملک ہیں جہاں گندم سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ گذشتہ سال ذخیروں میں ۸۴۴،۰۰۰۰۰ بشل گندم تھا اور اس سال ۳۷،۲۰۰۰۰۰ بشل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا دارومدار زیادہ تر سال رواں کی فصلوں پر ہوگا۔ یکم جولائی کو کنیڈا کے ذخیروں میں سب سے زیادہ کمی دیکھی گئی یعنی پچھلے سال اگر ۳۱۸۰۰۰۰۰ بشل گندم تھا تو اس سال ۹۰۰۰۰۰۰ بشل ہوا۔ اس طرح امریکہ میں اس سال ۱۰۱۰۰۰۰۰ بشل تھا لیکن پچھلے سال ۲۸۱۰۰۰۰۰ بشل تھا، اور ارجنٹائن میں پچھلے سال ۱۷۵۰۰۰۰۰ بشل تھا اور اس سال ۱۱۵۰۰۰۰۰ بشل ہے۔ آسٹریلیا میں البتہ گذشتہ سال کی نسبت اس سال کے ذخیرے بہت زیادہ تھے یعنی ۵۰۰۰۰۰۰۰ کی بجائے ۶۷۰۰۰۰۰۰ بشل تھے۔

تبرکات

آغا شاعر قزلباش مرحوم

بدل دی انقلاب دہر نے تاثیر میخانہ — یہ آنکھیں رہ گئیں اتری ہوئی تصویر میخانہ

نشیلی انکھڑیوں کا واسطہ پلکیں جھکا لیجے — ادھر سے یہ ادھر سے آرہے ہیں پیر میخانہ

اثر اتنا تو ہو آنے لگے بوئے شراب اُس سے — کہ جس کاغذ پہ کوئی کھینچ دے تصویر میخانہ

بہت کچھ پارسا بنتا ہوں لیکن تار بارش میں — دکھائی دیتی ہے ہلتی ہوئی زنجیر میخانہ

گیا وہ دور شاعر اب نہ مے ہے اور نہ پیتے ہیں
زمانہ مانتا ہے ہم کو پھر بھی پیر میخانہ

اُنس، اپنے میں کہیں پایا نہ بیگانے میں تھا — کیا نشہ ہے؟ سارا عالم ایک پیمانے میں تھا

آہ - اتنی کاوشیں - یہ شور و شر یہ اضطراب؟ — ایک چٹکی خاک کی - دو پر - یہ پروانے میں تھا

آپ ہی اس نے انا الحق کہدیا - الزام کیا؟ — ہوش کس نے لے لیا تھا؟ ہوش دیوانے میں تھا؟

اللہ اللہ! خاک میں ملتے ہی یہ پائے ثمر — لو خدا کی شان پھل بھی پھول بھی دانے میں تھا

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے اس کو کیا کہوں؟ — میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ مے خانے میں تھا

شاعر نازک طبیعت ہوں مرا دل کٹ گیا
ساقیا لینا کہ شاید بال پیمانے میں تھا

اختر حسین رائے پوری

بحیثیت افسانہ نگار

۲

ظہور الحسن ڈار

اختر حسین رائے پوری کو اردو کے افسانوی ادب میں روشناس کرانے کا سہرا ”نیا زمانہ“ [illegible] کے سر ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ”زبانِ بے زبانی“ اسی پرچے میں شائع ہوا اور شدتِ احساس، خلوص اور منفرد طرزِ بیان کی ایسی مثال چھوڑ گیا، جس کا سراغ اختر کے آرٹ کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ جس زمانے میں اختر رائے پوری نے لکھنا شروع کیا، منشی پریم چند اس دیس کے افسانوی ادب کی چوٹی پر نظر آ رہے تھے۔ قاعدہ ہے کہ کسی بڑی ادبی شخصیت کی موجودگی میں اچھے اچھے فن کاروں کو بھی اپنا چراغ جلانے میں بڑی جاں کاری سے واسطہ پڑتا ہے، مگر اختر حسین نے جس قلیل مدت میں نہ صرف اس دیس کے ادبی حلقے بلکہ خود منشی پریم چند کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا، وہ بجائے خود ان کی عظمت کی بڑی دلیل ہے۔

اردو افسانے سے اختر کا تعلق محبت سے شروع ہوا اور نفرت کے عنوان پر گھوم آیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کا نام بھی یہی ہے اور ان افسانوں کے پس منظر میں زندگی کے دو ہی اَمٹ جذبے کارفرما ہیں۔ انسان کے دل کی تھہراتی ہوئی تاریکی میں یہ جذبے حواس کے تاروں پر لرزتے رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر حادثے میں ایک نہ ایک جذبے کا دخل ہوتا ہے، محبت یا نفرت، محبت نیلے آسمان کی طرح حسین اور نسیم بہار کی طرح معطر ہے، اس کی بیکراں وسعت میں زندگی کا سارا حسن اور رس موجود ہے۔ جب آدم کو شجرِ ممنوعہ چکھنے کے جرم میں جنت سے نکالا گیا، تو جذبۂ محبت نے ہی اس کے محزون و بیقرار دل کو تسکین بخشی، مگر ایک ایسا زمانہ آیا کہ آدم کی اولاد نے خود محبت کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا، اور سماج کا جامہ اوڑھ کر اخلاق کے بھوت کی مدد سے اس کے گرد پہرا دینے لگی۔

یہ پہرا آج بھی قائم ہے، آدمی فطرت سے مجبور ہو کر اس شجرِ ممنوعہ کی طرف بڑھتا ہے، اور سماج کے کلہاڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ قربانی بڑی دردناک ہے مگر اس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ محبت جیسے حیات بخش جذبے کا تحفہ موت کیوں ہے اس کی ذمہ داری ہمارے سماج پر ہے، اس ماحول میں ہندوستانی سماج کے قوانین کا سکہ چلتا ہے، ان بہیمانہ قوانین کا جو زندگی کے منفی پہلو کے نمائندہ ہیں، اور جن کی موجودگی میں حیات کا کوئی بھی صحت مند جذبہ پھل اور پھول نہیں سکتا، ہندوستانی سماج نے سب سے زیادہ ظلم جذبۂ محبت کے ساتھ کیا ہے، خاص طور پر عورت کی محبت پر، مرد تو خیر خدا کا خلیفہ ہے مگر عورت، کیا اس کے گناہ بھی معاف کر دیئے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو آج اس دیس کے چکلے ویران نظر آتے، اندھیری گلیوں میں حوا کی بیٹیاں عصمت فروشی کرتی دکھائی نہ دیتیں، آتشک کے جراثیم آبائی ورثے میں تقسیم ہوتے دکھائی نہ دیتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس لئے کہ ہندوستانی سماج کی نظر میں محبت گناہ ہے، اور اس کی سزا جہنم کی جلن سے بھی زیادہ تلخ ہے۔

اختر نے محبت کے عنوان سے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں، وہ محبت، نامرادی اور سزا کی ایسی ہی کشمکش کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں ایک بیقرار روح کا کرب ہے، ایک مجروح دل کی فریاد ہے، ایک ناکام تمنا کا سوز ہے، جو ناظر کے دل میں گہرا غوطہ لگا کر آنسوؤں کے موتی چن لاتا ہے، ان افسانوں میں ”زبانِ بے زبانی“ ”یوں ہوتا تو کیا ہوتا“ اور ”منزلِ ناتمام“ بڑے معرکے کی چیزیں ہیں، ”زبانِ بے زبانی“ کا ہیرو برگد کا ایک بوڑھا درخت ہے جو اس جہانِ بے ثبات سے چلتے چلاتے اپنی بے زبانی سے انسانی محبت کی داستان سناتا ہے، اور اپنے مشاہدے اور فکر کے میل سے ایک ایسی پرسوز کہانی مرتب کرتا ہے جو ناظر کے دل میں محبت کی طرف سے بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ محبت کی پاکیزگی اور رعنائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہے، مگر اس کا مشاہدہ بتلاتا ہے، کہ محبت کا انجام بربادی کے سوا اور کچھ نہیں، وہ خود بھی اپنے بدن سے لپٹی ہوئی ”امربیل“ سے محبت کرتا ہے، اس کے بوسوں کی لذت میں مسرور رہنا چاہتا ہے، مگر اس کے دل میں یہ کھٹک موجود ہے کہ آخر کار یہ محبت میری زندگی کا رس چوس لے گی، اور یہی محبوبہ ”امربیل“ ایک دن میری خاتمے کا عنوان لکھے گی۔ اس کا مشاہدہ اس کھٹک کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔ اپنی بے بہرہ آنکھوں سے وہ دو تین مرتبہ انجامِ محبت دیکھتا ہے اور اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ وہ انسان نہ ہوا ورنہ اس کی محبت کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس عورت کا ہوا جس نے مرتے وقت کہا۔

”دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا، انسان کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی، میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی، کس امید پر، محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی، محبت! فریب، مکر، دھوکا، اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا، مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دو گے، جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہِ عظیم کا بار لئے آئی ہوں، ایک ایسے بچے کی ماں ہوں، جس کا باپ بننے پر کوئی مرد تیار نہیں، دیوتا! کیا تم میرے گناہوں سے درگذر کرو گے، ...... کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا اور اس بچے کو؟ — اس بچے کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے، خیر میں ہی سہی، مگر میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائیگا۔ خدا رحیم و کریم ہے، — شاید مردوں کے لئے، لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے، خدا — جنت — روح — دنیا — عاقبت — سب مردوں کے لئے، آہ میرا بچہ — میرا بچہ، —“

اس عورت کا جو برگد کی آغوش میں اپنے نوزائیدہ بچے سمیت تڑپ تڑپ کر مرگئی، صرف یہ جرم تھا کہ اس نے محبت کرنا چاہی، محبت، مگر محبت کی بجائے اسے موت ملی۔ یہ موت مرد کی ناپاک ہوس رانی کا عطیہ تھی یا سماج کے رسم و رواج کا تحفہ،

بہرحال وہ عورت سوسائٹی کی قربان گاہ پہ ذبح ہوگئی اور اس کے ساتھ وہ بے گناہ بھی جو اسی رات اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح اس افسانے میں اختر رائے پوری نے اخلاقیات پر کوئی وعظ نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے ہندوستانی سماج کے متوازی کوئی فلسفۂ حیات مرتب کیا ہے، وہ یہ نہیں بتلاتے کہ ان خرابیوں کو جو انسانیت کی جڑ کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں کس طرح برباد کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ ان ہولناک خامیوں کی سچی تصویر پیش کرکے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب یہ ناظر کا کام ہے کہ وہ اپنا راستہ خود متعین کرے۔ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" بہت حد تک "زبانِ بے زبانی" کا ہی آخری حصہ ہے، رات کی تاریکی میں بجلی نے ایک برگد کے بوڑھے درخت کا دل چیر دیا ہے، اب وہ زمین پر گرا پڑا ہے، مگر عالم نزع میں اس کی بے زبانی زیادہ شدت اختیار کرگئی ہے۔ "زبانِ بے زبانی" میں اس نے ایک ایسی عورت کو دیکھا، جو سماج کی ساری پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے جا ملی، مگر انجام کار اسے واپس آنا پڑا، مگر کہاں! اسی برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کے پاس جو اس مرد کے دل کی طرح بے حس تھا جس نے اسے محبت کے بدلے فریب دیا تھا یا گناہ کی وہ گٹھڑی جو اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں دفن تھی، لیکن "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" میں وہ ایک ایسی لڑکی کا ذکر کرتا ہے جس نے محبت کی آگ میں جلنا پسند کیا مگر سماج کی پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے ملنے کی ہمت اس میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے وصال کا نتیجہ موت ہوگا، یا ایک ہرجائی کی زندگی جو موت سے بھی بدتر ہوگی۔ برگد کے درخت کے نیچے کھڑی وہ سوچتی ہے کہ کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گریہ و زاری اور بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کر دے، اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر یہ کہے کہ عورت اپنی روح کو پاگئی، اس کی خودی اپنے لئے ایک الگ خدا بنائے گی، وہ صرف رسم الفت کو مانے گی، وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی، اس کے آئین الگ ہوں گے، کیا میں یہ سب کچھ کرسکوں گی، کیا یہ ممکن ہے؟ ——— "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کاش وہ ایسا کرسکتی، مگر وہ عورت ہے، بے بس، لاچار اور مجبور عورت اپنی موت کو آواز دیتے ہوئے اس کے حلق میں پھندا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کو ان الفاظ میں الوداع کہتی ہے۔ "میں پھر اسی غلام گردش میں جا کر اپنے آپ کو پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہوں، کل خاندان شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا، بہت سے سوداگر میری خرید کو آئیں گے، میرے والدین انہیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کرکے وقار کے ترازو پر تولیں گے، اور جو سب سے بوجھل ہوگا، میں اسی کے سپرد کر دی جاؤں گی۔ کیا تم بھی اس نیلام میں بولی بولو گے، اگر آؤ تو سودے کے لئے تیار ہو کر آنا ... مجھے وہیں پہنچا دو جہاں سے محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا، کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں"——— "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

کتنی حیرت ہے، ان الفاظ میں کیسی جگر گدازی تھی، جیسے عورت کی روح عالم نزع میں ہو، کیا ہندوستانی سماج کے پاس مظلوم عورت کی اس حسرتناک فریاد کا بھی کوئی جواب ہے؟ شاید ہو اور شاید نہ بھی ہو، مگر برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کا بے حس دل بھی اس ہولناک مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتا، وہ جذبۂ محبت کی خودکشی پر ان دیکھے آنسو بہاتا ہوا زبانِ بے زبانی سے پکار اٹھتا ہے۔ "مجھے لوگ خدا سمجھتے ہیں، اگر ان کی دل شکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اٹھتا کہ اے وہ جو مجھ سے بڑا ہے، اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر دے کہ وہ مشعل راہ بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں، تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا۔"

اختر رائے پوری واحد ہندوستانی فن کار ہیں، جو اپنے آرٹ میں نغمہ و فریاد کو پوری طرح گھلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے ایک عجیب قسم کی پرسوز موسیقی کی طرح ہیں جس کی دلکشی میں حزن و ملال کی لہریں کانپ رہی ہیں، جس کے زیر و بم میں مغنی کا اپنا دل دھڑک رہا ہے، وہ دل جو صرف خلوص آشنا ہے، جس نے پوری شدت سے محبت اور نفرت کی ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں احساس کی ایسی شدت، خیالات کی ایسی گہماگہمی اور تاثرات کی ایسی گرمی پائی جاتی ہے جو صرف خلوص سے عبارت ہے، خلوص کی منزل بڑی کٹھن ہے، اس راہ میں انسان کی زندگی ایک ایسے نغمے کی لے بن کر رہ جاتی ہے جو لوٹتے ہوئے دل کی گہرائی سے ابھر کر عرش کو چھو لیتا ہے، وہ محبت کرنا چاہتا ہے، مگر سماج کے بہیمانہ قوانین کی موجودگی میں اس پاکیزہ جذبے کی گنجائش کہاں؟ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ، سماج، قدرت سبھی طاقتیں انسان کی آزادی کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہوگئی ہیں۔ وہ رونا چاہتا ہے مگر آنسو ساتھ نہیں دیتے۔ فریاد کرنا چاہتا ہے۔ مگر کس سے کہے، اور پھر الفاظ کی کم مائیگی بھی آڑے آتی ہے، منجمد ہونٹوں سے آہ کا نکلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ کیا انسان ہمیشہ اس المیئے کا شکار رہے گا، کیا اس کی زندگی میں کبھی بہار نہ آئیگی، کیا وہ کبھی محبت کے چراغ سے زندگی کی تاریکی کو روشنی میں مبتدل نہ کرسکے گا، زندگی، محبت کے بغیر یہ کیسی زندگی ہے، اندھیرے سے زیادہ بھیانک، سناٹے سے زیادہ خوفناک، اور سمندر سے زیادہ ویران ——— کاش سماج کے مسند نشین دیوتاؤں کی بے بہرہ آنکھوں میں کبھی کبھی حقیقت کی روشنی جھلک اٹھے، اور یہ نہیں تو کم از کم منزلِ ناتمام کے مسافر کی طرح ہر انسان پکار اٹھے" ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ اپنے شباب کو وقف کر دیں گے اضمحلال، افسردگی اور بڑھاپے کو مٹانے کے لئے۔ نظام زندگی کو ہم ایسا روپ دینے کی سعی کریں گے، کہ اس میں صرف شباب توانا اور حسن پرور عناصر کے لئے جگہ ہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ بیوہ کے آنسو سہاگ میں آگ لگا دیں غریبوں کی آہ انسانیت کو مسل ڈالے، یہ نہ ہو کہ ذلت اور معصیت کا تسلط ہمیشہ کیلئے نیکی کا گلا گھونٹ دے؟ صرف کوئی ایسا کارنامہ ہی انسانیت کو برباد ہونے سے بچا سکتا ہے، مگر کون جانے ایسا کب ہو۔!"

"نفرت" کے عنوان سے اختر حسین رائے پوری نے جو افسانے لکھے ہیں مثلاً "مجھے جانے دو"، "موت"، "مرگھٹ"، اور "میرا گھر" بہت اہم ہیں، یہ افسانے ہندوستانی سماج کے ترجمان بھی ہیں اور نقاد بھی۔ کچھ عرصے سے ہندوستانی افسانہ نگار کسی کی زندگی کو بڑی توجہ سے کھنگال رہے ہیں۔ بہت سی کہانیاں سماج کے

اس بدنام طبقے کے متعلق لکھی گئی ہیں، مگر خیالات کے الجھاؤ اور مشاہدے کی کمی کی وجہ سے ادب میں ان کا درجہ بہت پست ہے۔ اردو ادب میں ایسی رنڈیوں کی کمی نہیں، جو اپنے ناظر کی طرح تماشبین اندر جرنیلیا ہیں، مگر "مجھے جانے دو" کی ہیروئن اپنی قسم کی واحد کسبی ہے جس کے پاس انسان کے لئے نفرت کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں اس کے الفاظ میں ایسا زہر ہے، جس کا تریاق نہیں مل سکتا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا غصہ ہے، جس کا کوئی اتار نہیں۔ اس کے دل میں ایسی نفرت ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں ــــ اور یہ سب کس کے لئے؟ انسان کے لئے ــــ سماج کے لئے ان کے لئے جو رات کے اندھیرے میں کشاں کشاں اس کے پاس آتے ہیں، اس کے خرابے کو آباد کرتے ہیں اور وہاں سے نکل کر نفرت سے کہتے ہیں۔ "ان طوائفوں کو عصمت و عزت کا ذرا بھی پاس نہیں، انہیں شہر سے نکال دینا چاہئے" ایسا کیوں۔ اس لئے کہ وہ عورت ہے؟ بے بس اور لاچار عورت جسے خود سماج نے ہی عصمت فروش ہرجائی بننے پر مجبور کیا ہے، اب اس کے جسم کو گھن لگ چکا ہے، کئی خوفناک بیماریاں اس کے جسم کو اندر ہی اندر گھلا رہی ہیں، اور وہ مرد کا ذکر کرتے ہوئے مجسم نفرت ہو کر کہتی ہے "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے ملیں، تم جیسے چاہنے والوں کی ہی عطیہ ہیں، مرد ــــ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ"۔ مگر اب اسکے مزاج میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہے، مرد نے اسے جو کچھ دیا ہے، اسے وہ مع سود لوٹا رہی ہے، وہ ساری انسانیت کو آتشک کے جہنم میں جلانا چاہتی ہے، اپنے چاہنے والے پر رحم کھا کر وہ کہتی ہے، "میں تم سے انتقام نہیں لینا چاہتی، اگر کوئی اور ہوتا تو میں بصد شکر آتشک اور سوزاک کے چند جراثیم اس کی نذر کرتی، وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثے میں ملتے، غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی، تب شاید سماج کے ٹھیکیداروں کو ہوش آتا، کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے"۔

جب ناظر اس افسانے کو دیکھتا ہے تو اس کا دل عورت کے ہولناک ارادے سے کانپ اٹھتا ہے، کسبی کی زندگی کا تانا بانا بننے کا ذمہ دار کون ہے، عورت یا خود سماج؟ ــــ پھر ان کی طرف نفرت سے کیوں دیکھا جاتا ہے، کیوں نہیں ایسا ماحول پیدا کیا جاتا جس میں کسبیوں کا وجود ہی نہ ہو؟۔

ایک بڑے فن کار کی طرح اختر رائے پوری کے افسانوں کے کردار بڑے جاندار ہیں، اردو ادب میں ایسے کرداروں کی کمی ہے جنہیں زندگی دوام حاصل ہو سکے، مگر جب میں اختر رائے پوری کے افسانے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے، کہ اردو ادب اس معاملے میں بالکل ہی کنگال نہیں، بلکہ اس کی جھولی میں ایسے ہیرے بھی ہیں جو ادب کی منڈی میں غیر ملکی جواہر ریزوں سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ "مجھے جانے دو" کی کسبی کی طرح "موت" کا ہیرو چراغ علی بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ وہ زندگی کے منفی پہلو کا نمائندہ ہے۔ ایک ہوس پرست، اور شقی القلب انسان، زندگی بھر جس کے دل میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن بھی پیدا نہ ہو سکی، "موت" میں

اس زندگی کے آخری لمحات کی تصویر کھینچی گئی ہے، مگر اس میں ایسے پر اسرار رنگ استعمال کئے گئے ہیں، جن کا نظارہ دل میں عجب طرح کی بے کلی پیدا کرتا ہے، مرتے ہوئے اس سنگدل کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، اس کا ایک ٹکڑا آپ بھی دیکھئے ــــ "روپیہ صرف ایک چمکتا ہوا روپیہ۔ سامنے طاق پر رکھا ہوا ہے، روشن دان میں سے صرف ایک کرن مسکراتی اور جگمگاتی ہوئی گھس آتی ہے، اور اس روپے سے آنکھ مار رہی ہے روپیہ کسی شریر کانی آنکھ کی طرح دمک رہا ہے۔ بوڑھا اسے صاف دیکھ رہا ہے۔ اس کا دماغ مختل ہونے لگا ہے۔ اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس روپے پر خدا کی مہر لگی ہوئی ہے، خدا چاندی کی کانوں کا مالک، امیروں کی امارت بڑھانے والا، غریبوں کے خون کی چاندی بنانے والا، چراغ علی کا خدا، کہاں ہے وہ ــــ اگر وہ ہے تو یقیناً وہ اس وقت بھی ہوگا، جب اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ وہ نیک عورت اس کے ظلم سہتے سہتے مر گئی۔ اس کی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے عصمت فروشی کرنے لگی ــــ ایک عورت اس کی ناپاک ہوس رانی کا شکار ہو کر پاگل ہو گئی۔ اور اسی عالم میں ایک رات سردی نے اس کی زندگی کی حرارت چوس لی۔ اس وقت خالق ارض و سما خاموش رہا ــــ وہ آج بھی خاموش ہے، مگر چراغ علی کا روز مکافات آ پہنچا، اب اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اسی پاگل عورت کا خوفناک چہرہ گھوم رہا ہے۔ وہی چہرا اس کے لئے خدا ہے، موت کا فرشتہ ہے، جہنم کا داروغہ ہے۔ وہ کیا کچھ ہے، یہ چراغ علی ہی جانتا ہے، وہ تو خیر اپنے انجام کو پہنچ گیا مگر بے شمار ایسے چراغ علی ابھی زندہ ہیں، اور نہ جانے کب تک انسانیت کے سینے پہ ناسور بن کر زندہ رہیں گے"۔

"مرگھٹ" ہمارے دیس کی سیاسی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہے۔ اختر کے چابکدست ہاتھ نے اس میں ایسے تمتماتے ہوئے رنگ لگائے ہیں کہ اس مختصر سے افسانے میں انقلابی تحریکوں کے دوران میں عوام کی ذہنی کشمکش کا ہر پہلو اجاگر ہو گیا ہے۔ سرکار کی گولی لکھو مستری کے بیٹے کو ٹھنڈا کر چکی مگر ابھی وہ خود ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ اب وہ ابھی لوہار، شمبھو اور چھوٹو کے دماغ میں گھوم رہی ہے۔ گھومتے گھومتے وہ سرکار کے داروغہ حوالدار کریم خاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے، اور یہ لوگ جو لکھو مستری کے بیٹے کی ارتھی جلانے آئے تھے، اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ کہیں وہ بھی سرکار کے مخالفوں میں شمار نہ ہونے لگیں۔ یہ کہانی ادنیٰ طبقے کے ذہنی اتار چڑھاؤ کی نفسیاتی تحلیل ہے اور عوام کے دل میں دبکی ہوئی اس دہشت کو بے نقاب کرتی ہے جو حکومت کی طاقت کے تصور سے ان میں گھر کر چکی ہے۔

اختر رائے پوری کا یہ مطالعہ ان لوگوں کو ضرور شرمائے گا، جو انقلاب کے نعرے بلند کر کے گھر کی چار دیواری میں دبک کر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور انتظار کرتے ہیں کہ کب ہنگامہ فرو ہو تو پھر احتیاط سے میدان میں نکلیں، کسبیوں کے ذکر خیر کی طرح اردو کے افسانوں میں مزدور اور انقلاب کا تذکرہ بھی بہت ہے مگر ان میں سے ایک بھی مطالعہ "مرگھٹ" کے پائے تک نہیں پہنچ سکا۔ اس افسانے میں اختر رائے پوری

نے جو فنی کمال دکھایا ہے، وہ ناظر کو افسانے کے مطالعے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر اختر رائے پوری کے افسانے اپنے خالق کی انفرادیت کے کامیاب مظہر ہیں۔ انکے مطالعے سے ناظر کے دل میں تاثر کا جو تلاطم برپا ہوتا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ان کی زبان میں جادو ہے، ایسا جادو جو ایک ہی جھلک میں پڑھنے والے کو ہمیشہ کے لئے مسخر کر لیتا ہے۔ انہوں نے جس کامیابی سے ہندی اور اردو کے میل سے اپنے لئے ایک اچھوتا اور دلفریب اسلوب بیان ڈھونڈھ نکالا ہے، وہ ہمارے سارے ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ منظر نگاری کو افسانے میں بڑا درجہ حاصل ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں جب فن کار منظر نگاری سے ماحول کی وضاحت کر رہا ہو۔ اختر رائے پوری کو اس میں بڑا کمال حاصل ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے جملے میں بھی ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک منظر دیکھئے! "اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا، یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی ہے۔ شام کو جب آرتی شروع ہوتی ہے اور کمسن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں، روشنی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے، وہ ہاتھ باندھے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے، اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو زیادہ بیباکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے، جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں"۔ —— ("مجھے جانے دو")

موت کا تصور خوفناک ہے، مگر اس کو الفاظ میں ڈھالنے کے لئے بڑی کاوش کی ضرورت ہے، کوئی تصور جتنا جاندار ہوتا ہے، اس کے بیان میں اتنی مشکل پیش آتی ہے، مگر دیکھئے فن کار نے چند جملوں میں کیسی ہولناک تصویر کھینچی ہے، "مرگھٹ ندی کے کنارے تھا، چھوٹا سا میدان جس میں کبھی کچھ نہ اگتا تھا، اور اس کی مٹی سیاہ تھی، جمے ہوئے خون کی طرح سیاہ! ندی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت جھڑ رہتی تھی اور ان کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح بادلوں کا منہ تاکا کرتی تھیں، ان پر گِدھوں اور کوؤں کے علاوہ کوئی پرندہ نہ بیٹھتا تھا۔ دور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھوپڑی زندگی کے انجام پر باچھیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج کھاٹ سے ٹکرا کر سر اٹھاتی، مرگھٹ کی اداسی دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی"۔

اسی مرگھٹ میں لوگ ایک لاش کو جلانے آئے ہیں، آپ بھی دل کڑا کر کے اس جلتی ہوئی لاش کا نظارا دیکھئے۔ "چتا تیزی سے جلنے لگی، دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو ادھر ادھر لوٹانے لگے، گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اڑ اڑ کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارہ بھرتے اور بے بصر آنکھوں سے ہر طرف گھورتے تھے، اندھیرا ہو چلا تھا، بادلوں کے دو چار گلابی ٹکڑے اڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا، ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی"۔ ("مرگھٹ")

منظر نگاری کے کچھ نمونے آپ نے دیکھ لئے، اب اس طنز نگاری کی چند مثالیں بھی سنئے جو اختر کے آرٹ کا خاص حصہ ہے، طنز نگاری ادب کی ایک مشکل صنف ہے۔ اس دیس کی تو بات ہی کیا دنیا کے بھی چند ہی فنکار اسے کامیابی سے اپنا سکے ہیں۔ اختر رائے پوری نے فن کے اس پہلو میں جو چابکدستی دکھائی ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹکڑا دیکھئے۔ "وہ گھر جو ملک کا پڑپوتا تھا، صوبے کے بیٹے شہر کے چھوکرے، محلہ کا لڑکا —— وہ بہت بڑا تھا، یہ نہ میرا گھر تھا نہ میرے باپ کا بلکہ ایک سیٹھ کا مکان تھا، اس میں بہت سے کمرے تھے، جس طرح مکڑی کے جالے میں بہت سے خانے ہوتے ہیں، بہت سے لوگ مکھیوں کی طرح ان خانوں میں رہتے تھے، ایک منزل دوسری منزل کے اوپر اس طرح چڑھتی چلی گئی تھی، جس طرح ایک آسمان دوسرے آسمان پر رکھا ہو، اور چوتھی منزل پر وہ سیٹھ عیسیٰ مسیح کی طرح رہا کرتا تھا"۔ ("میرا گھر")

رنڈیوں اور گھر بار والی عورتوں کی چشمک بڑی پرانی ہے، مگر فن کار نے اسے جس انداز میں بیان کیا ہے، وہ اردو میں طنز نگاری کے ایک صحت مند باب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ٹریم پر شریف زادیوں، اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کیمپ کے کیمپ گزرا کرتے تھے، ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں، یہ بدبخت نسوانیت کی کلنک، خدا انہیں غارت کرے، چند ٹکوں کے لئے، شراب کی ایک بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں، —— اور ہم! —— پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں، جنہوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں، اور چھ بچے عطا کئے تھے"۔ ("مجھے جانے دو")

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اختر کے آرٹ کی خوبیاں پوری طرح نہیں دکھائی جا سکتیں، بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کو ان فنی بلندیوں کی ایک جھلک بھی نہ دکھلا سکا جو اس فن کار کے آرٹ میں جابجا نظر آتی اور اس کی انفرادیت کو چمکاتی ہی چلی جاتی ہیں، جدتِ طبع، رعنائی بیان، دردمندی، خلوص اور سوز، یہ وہ جواہر پارے ہیں، جن سے اختر حسین رائے پوری کی ادبی زنبیل بھری پڑی ہے، اور وہ عمر عیار کی طرح ہمیں اپنی فنی سحر طرازیوں سے مسحور ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ایسا دردمند دل عطا کیا ہے جو بے حس چیزوں تک کی فریاد پر تڑپ اٹھتا ہے جو شخص برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے، اس کے احساس کی رسائی کا کیا کہنا، جب ان کا قلم جذبات کو الفاظ کے جال میں گرفتار کرتا ہے تو ان کی تحریر میں ایسی پرسوز دلربائی پیدا ہو جاتی ہے جو صرف مجروح نغمے کی آرزومندی میں پائی جاتی ہے۔ زندگی کے بیتے ہوئے لمحوں میں بہت کشش ہے۔ انسان تنہائی کے عالم میں آنکھیں بند کرتا ہے، تو ان دیکھے دریچوں سے نہ معلوم نظریں ماضی کے سہانے چمن زار کو دیکھتی ہیں۔ اس چمن میں پھول ہی پھول ہیں، کانٹے نہیں، حسین

یادوں کے منتظر پھول۔ ان کی خوشبو سے ذہن مہک اٹھتا ہے، مگر دل میں درد پیدا ہوتا ہے، کیا جو کچھ گزر چکا وہ لوٹ کے نہ آئے گا۔ دیکھئے ایک بے زبان نے اس موقع پر فن کار سے سرگوشیوں میں کچھ کہا ہے اور اس نے ان تاثرات کو اپنے انداز میں لکھ دیا ہے، مگر کیسے دلربا، پرسوز اور حسرتناک انداز میں ــــ "کل تک میں گنگا جل میں نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا، صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک انگلیاں پھولوں کی چادر مجھے اڑھاتیں، اور ہر شام میرے اردگرد چراغ حسن محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصولِ آرزو کی دعائیں مانگتو گویا عشق کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینہ میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی کہانی دفن ہے، حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ لچیلی اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے، مگر اس کی زبان وعبارت کو سمجھنے کے لئے ہوشیاری کی نہیں بیہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے، جب زمین ماضی کے خواب دیکھتے دیکھتے بڑبڑانے لگتی ہے، اور اس کی ڈوبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلمِ شفق سے لکھنے کے لئے شب کی سیاہی گھولتا ہے، تو انسان اور بوم کے سوا ہر ذی حیات اس کا ہم نوا اور ہم گوش ہو جاتا ہے۔............ دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے اور اس کے دلفریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہ جاتے ہیں، کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سنا تھا۔ یا جب کوئی دیہاتی برات تیرگرد و پیش ٹھہرتی ہے، اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے پتھروں کے ساتھ مجھے بھی چولہے میں لگا دیتی اور رٹ وں کے ڈر سے ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی جھجکتی آواز میں برہت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آ آ کر چھوتی ہیں تو میں ان سے کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں، مگر جیسے پھانسی کی رسی کا شکنجہ دم واپسیں آخری چیخ کو زبان پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے ادنٰام کی پابندی کسی دلہن کی زبان سے بوقت ایجاب "نہیں" نہ نکلنے دے۔ یہاں دبے ہی میرے جسم لرزاں سے عالم نزع کی سی ایک ہچکی سی نکلتی اور سینہ میں رہ جاتی ہے، البتہ جب کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا ہے اور مجھ سے ہم سخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اسے زمین والوں کی سیاہ کاری سنانے لگتا ہوں!"

"یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

اوپر بیان کی گئی تمام خوبیوں کے علاوہ جو چیز اختر رائے پوری کو دنیا کے بہترین فن کاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے، وہ ان کے خیالات کی پاکیزگی اور نکھار ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا مشاہدہ حقیقی ہے اور انسانیت کے متعلق ان کا تصور اپنے مشاہدے کی طرح واضح ہے۔ ان کے دل میں عہدِ حاضر کے ادیبوں کی طرح انسان کے لئے کچھ کھوکھلے نعرے اور بیکار جذبات نہیں، بلکہ گہری ہمدردی ہے جو اس مظلوم کے زخمی دل پر محبت کے پھاہے کا کام دیتی ہے۔ اس اندھی اور اندھیری دنیا میں آدم کی اولاد سے جو سلوک ہو رہا ہے، اختر رائے پوری کا آرٹ اس کے خلاف ایک سخت صدائے احتجاج ہے، وہ ایک سوال ہے اس دنیا سے، دنیا کے قانون سے، قانون کے بنانے والوں سے اور قانون بنانے والوں کے خالق سے، کہ ایسا کیوں ہے، انسان پر عرصۂ حیات کیوں تنگ ہے، اس کائنات میں وہ اس طرح زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہے، یہ گورکھ دھندا فن کار کو عجب شبہے میں مبتلا کر دیتا ہے اور کئی جگہ وہ اپنے آرٹ میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ "یہ کائنات کتنی عجیب ہے اور کس قدر پراسرار انسان اس طلسم کے دروازے پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہے گا اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئے گا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے بیچوں بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے، اور اس میں وہ معبود رہتا ہے، جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے" (دل کا اندھیرا)

شاید کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہو، مگر وہ اسی طبقے سے ہوں گے جن پر خالق ارض و سما کی رحمتوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، مگر وہ کروڑوں انسان جو ان رحمتوں سے محروم ہیں ان کا گناہ کیا ہے، کس جرم کی پاداش میں وہ ایسی گھناؤنی اور شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، یہ سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے بھکاری، یہ چکلوں میں بیٹھی ہوئی ننگی طوائفیں، یہ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے فاقہ کش انسان، یہ سب کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے؟ اگر فن کار تباہ حال مخلوق کے خالق سے اس کا سبب دریافت کرتا ہے یا سماج سے اس سوال کا جواب چاہتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ــــ کیا دنیا ایسی نہیں اگر ہے تو پھر کیوں کا سوال ہونٹوں پہ نہ آئے تو کیا ہو ــــ کاش فن کار کی یہ صدا سماج کے ٹھیکیداروں کے کان تک پہنچ جائے، اور وہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کے بے زبان بت کی طرح انسان کو جلتا پھرتا اور بولتا ہوا شہاب ثاقب ثابت کرنے کا منصوبہ باندھ لیں ــــ لیکن بقول مصنف کون جانے وہ مبارک ساعت کب آئے۔

"محبت اور نفرت" کی اشاعت کے بعد اختر نے جو افسانے لکھے ہیں، ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان کا آرٹ ملکی قیود کو توڑ کر بین الاقوامی ادب سے رشتہ جوڑ رہا ہے، عجب اتفاق ہے کہ اس دور کی ابتدا بھی اپنے دیس سے بہت دور پیرس کی رومان پرور زمین میں ہوئی جہاں دلوں ہٹلر کے طوفانی دستوں کے مقابلے میں بری طرح گھائل ہو رہا تھا، آرٹسٹ نے وہیں اپنا ہمیشہ زندہ رہنے والا افسانہ "دل کا اندھیرا" لکھا، اور رآندرے جیسے امٹ کردار کی تخلیق کی، جو اپنی درد اور انسانیت کی بدولت سدا زندہ رہے گا، فرانس کا یہ حساس سپاہی اجتماعی انسانیت کی زبان سے بولتا ہے، اس کی آواز میں ساری انسانیت کی فریاد ہے، اس کی آنکھ میں نیکی کی معصومیت اور دل میں سچے جذبوں کا نور ہے، افسانے کے آخر میں جب دکھیاری ماں بیٹے کی موت سے مشتعل ہو کر مریم کے بت کے منہ پر تھوکتی ہے۔۔۔

وہ کلیسا کے تقدس کی مجرمہ کو اپنی پناہ میں لیتا ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ن جانی طاقت روندی ہوئی زندگی کی حفاظت کے لئے میدان میں آگئی ہے۔ افسانہ او حصہ بے حد دردناک ہے جہاں آندرے اس ہولناک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے لہ اپنے دوست کی موت کی خبر اس کی ماں اور بیوی کو کیوں کر سنائے، یہاں سے اس کا زا ایک طرح سے اعتراف شکست ہے، مگر ناظر کے آنسو اس شکست پر بھی عقیدت ے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

"تلاش گم شدہ" کا ہیرو نبو خاں بھی آندرے کی طرح جنگ کے دیوتا کے پاؤں دم کر لوٹا ہے، مگر وہ اپنی ایک ٹانگ بھی اس کی نذر کر آیا ہے، نبو خاں کے کردار میں آندرے جیسی دلکشی نہیں مگر اپنی نامرادی کے اعتبار سے وہ ضرور ہماری ہمدردی کا مستحق ہے، یہ افسانہ اختر کے آرٹ کا نادر نمونہ ہے، مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اب اس کے آرٹ کا ساتھ دینے کے لئے بھی کافی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے، راوی کا بیان ہے کہ موضع نام پورا کے لنگڑے سپاہی نبو خاں کے سوکھے ہوئے گھٹنے سے از سر نو شجرِ زندگی پھوٹ رہا ہے"۔ کا مطلب خواہ کچھ ہی ہو، مگر اس کی ہمہ گیر ٹریجک ویلیو سے انکار نہیں کیا جا سکتا، نبو خاں کے کردار کے آئینے میں اس دیس کے سینکڑوں سپاہیوں کا عکس نظر آتا ہے جو اپنے کٹے پھٹے اعضا، اور مسخ چہرے ہلا ہلا کر زندگی کے انجام کا ماتم کر رہے ہیں، اردو زبان کی خوش قسمتی میں کلام نہیں، کہ جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف جو نعرہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں گونج اٹھا تھا، اس کی صحت مند آواز بھی اس میں شامل ہے۔

"دیوان خانہ" فنی لحاظ سے اردو ادب میں بڑا بلند درجہ رکھتا ہے، اس افسانے میں آرٹسٹ بظاہر ایک جذباتی لڑکی کے کردار کی تکمیل میں مصروف نظر آتا ہے، مگر اس افسانہ کا حقیقی موضوع ــــ ایک آرٹسٹ ہے۔ یہاں آرٹسٹ کا کمال دیکھئے کہ وہ اصلی کردار کو بلا واسطہ پیش کرتا ہے، سارے افسانے میں ایک جگہ آرٹسٹ کا وجود نظر آتا ہے، وہ بھی دھندلا سا، مگر اس کے باوجود وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر منظر میں گھوم رہا ہے، ہر احساس میں جھلک رہا ہے۔

معلوم نہیں کیوں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ افسانہ آرٹسٹ کی آپ بیتی کا ایک دردناک حصہ ہے، بورژوا طبقے کی معاشرت کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آرٹسٹ کی موت کا احساس بڑا پر معنی اشارہ ہے، اور اس حقیقت کا عکاس ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت کسی بھی ماحول کی تاریکی میں گم نہیں ہوتی، مرنے کے بعد بھی اس کی یاد سینکڑوں ارمانوں سے عزیز رکھی جاتی ہے،

"دل کا اندھیرا" کو چھوڑ کر "بیزاری" نئے دور کا بہترین افسانہ ہے، اس افسانے میں آرٹسٹ ہمیں دنیا سے بیزار نظر آتا ہے۔ خود غرضی، معاشی مجبوریوں اور قابلِ نفرت جنگ و خونریزی سے تنگ آ کر اب وہ ستاروں کی دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے، مگر اس خواب کے رنگ بڑے پر اسرار ہیں، اس افسانہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طنز کی تلخی مفقود ہے، اس تلخی کی جگہ بیزاری نے لی ہے جو افسانے کا اصلی موضوع ہے، ایک لحاظ سے یہ افسانہ موجودہ دور کی سیاست اور معاشرت کی مکمل تصویر ہے، مگر حیرت ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے اشارے میں بڑی کامیابی کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے، حوا کی بیٹی کے ساتھ دوسری ملاقات، وہ چاند جس کی ایک آنکھ سے پیلی روشنی کی کرن جھانکتی ہے اور دوسری سے جوانی جذبہ جھلکتا ہے، شمال میں آسمان پر ابھرتا ہوا دم دار سرخ ستارہ ــــ اور یہ آرزو کہ اس کی ضرب سے تمام چیزیں پاش پاش ہو جائیں ــــ ایک ذہین پڑھنے والے کے لئے ان میں بہت کچھ موجود ہے، مگر یاد رہے کہ اسے یہ گوارا نہیں کہ آرٹسٹ اب جمشید کے پیالے میں ہی ڈوب کر رہ جائے، بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ آرٹسٹ اب اس کے لئے کوئی ایسی چیز لائے گا جو مجھے جانے دو کی کسبی کی طرح تلخ، "مرگھٹ" کے لکھو مستری کی طرح دہکتا اور "دل کا اندھیرا" کے آندرے کی طرح درد مند ہوگی، ــــ "محبت اور نفرت" کے آرٹسٹ سے یہ توقع عبث نہیں۔ اس نے ہر نئے افسانے میں اپنے ذہنی اور فنی ارتقاء کا ثبوت دیا ہے، اس کے آرٹ میں زندگی کی جو خوشنما جوت جگمگا رہی ہے، کسی دن اسی روشنی سے بین الاقوامی ادب کے رنگ محل میں ہندوستان کا نام کندہ کیا جائے گا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے، کہ جب میں اپنے دیس کے ادب پر نظر ڈالتا ہوں تو اس بے رنگ و بو چمن میں اختر حسین رائے پوری کا آرٹ ہی ایک ہرا بھرا پودا نظر آتا ہے جس کی شاخوں میں سدا بہار پھول لہلہا رہے ہیں، ان پھولوں میں ایک فنکار کے خلوص کی سرخی جھلک رہی ہے، اور اس سرخی میں ایسی بہارِ بے خزاں ہے جو انہیں ہمیشہ معطر اور تر و تازہ رکھے گی۔

غزل ـــــ ضمیر اظہر

گلشن چہک اٹھے گل لالہ سنور گئے
جلوے ترے جمال کے ہر سو بکھر گئے

دیکھا ترے خیال میں جو سوئے آسماں
ماہ و نجوم اور زیادہ نکھر گئے

وہ چاندنی، وہ صحن گلستاں وہ حسن دوست
کچھ خواب تھے کہ راہ نظر سے گزر گئے

روشن تھی جن کے نور سے بزم طرب کبھی
یا رب وہ خوشگوار لمحات کدھر گئے

جنت بدوش جن کے کرم سے تھی زندگی
کس سر زمیں میں جانے وہ شام و سحر گئے

اے مرگ چارہ ساز تری جستجو میں ہم
ہر منزل جہاں سے سلامت گزر گئے

شمع حریم حسن نے جانے یہ کیا کیا
چپ چاپ سب پتنگے جہاں سے گزر گئے

رویا شب فراق میں اس درد سے ندیم
آنسو نجوم بن کے فلک پہ بکھر گئے

منزل نے بار بار پکارا ہمیں ضمیر
ہم بے خبر خود اپنی ہی دھن میں گزر گئے

موت

احمد ندیم قاسمی

یہ بھی کوئی زندگی ہے! ہر وقت ڈر! خوف! ہراس کوئی دیکھ نہ لے، کوئی پا نہ لے، اور جب ابدی رفاقت کا سوال سامنے آتا ہے، تو کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی، صرف دو حل ہیں، ماحول سے فرار۔ زندگی سے فرار، پہلے فرار کا خیال آتے ہی خاندانی وقار، سماج، قانون، مذہب، غرض بے شمار پرچھائیوں کی ایک گھٹا چاروں طرف سے سمٹنے لگتی ہے، اور ذہن کے ارد گرد ایک فولادی خول چن ڈالتی ہے، دوسرے فرار کے تصوّر میں سکون ہے، دبدبہ ہے، بقا ہے۔ کلثوم اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے عدم کی اندھیاریوں میں کوئی واضح خط تلاش کرتے ہیں، کچھ پتے نہیں پڑتا، مگر اس پابند زندگی سے فرار کا خیال ہی سکون بخش ثابت ہوتا ہے، اور ہم تجویزیں سوچتے ہیں، زندگی کے بحرِ ذخار کا ساحل کہاں ملے گا! زہر، سولی، آگ، چٹانوں سے پٹی ہوئی کھاڑی، دندناتا ہوا انجن چھپاتا ہوا خنجر!۔۔ کلثوم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، میری آواز کھوکھلی ہو کر بجنے لگتی ہے، ہم پھر ابتدا کو پلٹتے ہیں، مگر انتہا سے مفر نہیں، اور ہماری انتہا زندگی سے فرار ہے۔

کلثوم کا راستہ تکتے تکتے کواڑ کی تختیاں دھواں دھار بدلیوں میں تبدیل ہو گئیں، اور دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اڑنے لگیں، اور روشندان میں چمکتا ہوا ستارہ کمرے میں گھس آنے کے لئے تڑپنے لگا، خود میرا وجود بہت سے حصّوں میں بٹ کر پرواز پر تل گیا، ڈولنے لگا، ڈوبنے لگا، اور میں نے تنگ آکر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن کو نئے نئے سیّال خیالوں سے کھنگال کر صاف کر لیا۔

مگر میری اداس خیال آرائیوں کے اثراتِ مابعد ابھی تک میری آنکھوں میں نمی بن کر تیر رہے تھے، اور میرے پپڑائے ہونٹوں پر ابھی تک ایک عجیب قسم کی تلخی کا احساس باقی تھا، کہ اچانک میرا کمرا ریشمی ملبوس کی سرسراہٹوں سے چھلکنے لگا، اور عود حنا اور کافور کی ملی جلی خوشبو سے گھٹی گھٹی فضا مہکنے لگی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میرے بوسیدہ صوفے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی، وہ سر سے پاؤں تک سیاہ ریشم میں لپٹی ہوئی تھی، اور اس کے دراز فرغل کے کنار دبی رقاصاؤں کے گھنگھروں کی طرح کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پُر اسرار بامعنی شکنوں کا حاشیہ سا بُن دیا تھا۔ عورت کی سیاہ، موٹی، اور سوچتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں، اس کے ہونٹ نہایت سنجیدگی اور ملوہیتی سے بھنچے ہوئے تھے، لیکن ان کے گہرے گلابی خموں کے سکون میں ایک مستقل لرزش کا احساس ہوتا تھا، اسکا چہرہ سیپی کی طرح مرمریں اور بیضوی تھا، اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر جیسے ایک اٹل عزم کے زیرِ اثر مجھے گھورے جا رہی تھی۔

"کلثوم؟" میں نے خلا میں تیر چھوڑا۔

اُس نے ایک ملکوتی وقار سے نفی میں سر ہلا دیا،

"بیٹھ جاؤ" ذہن کی تمام راہیں مسدود پا کر میں نے کچھ کہنے کی بجائے محض بے مطلب بول دینا مناسب سمجھا۔

وہ فرغل کو سمیٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مگر اس کے بیٹھتے ہی کسی چیز کے چٹخنے کی آواز آئی، میں نے نادم ہو کر کہا "کوئی اسپرنگ ٹوٹا ہوگا، میرا صوفہ نیلام گھر سے آیا ہے"

اس نے اپنا سفید بازو باہر نکال کر سینے پر سے چادر کھسکائی، اس نے انسانی کھوپڑیوں کا ہار پہن رکھا تھا، اور ایک ہاتھ میں انسانی بازو کی ہڈی ایک عجیب خسروانہ تمکنت سے تھام رکھی تھی،

"تم کون ہو؟" میں اندھیرے میں ہاتھ پیر مارتے مارتے چور ہو چکا تھا۔

"میں موت ہوں" وہ بولی۔ اور اس کی آواز اڑتی ہوئی سنپولیوں کی طرح کمرے میں خمیدہ خطوط کی جالیاں کاڑھنے لگی "میں موت ہوں، اور میں تمہاری روز روز کی یاد سے تنگ آکر تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم مجھے قبل از وقت ہی اتنی شدت اور اتنے تواتر سے کیوں یاد کرتے ہو؟"

"مجھے تم سے محبت ہے" میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا، "میں نے زندگی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے ہیں"۔

اس کے متوقع انداز نشست ولفظ سے واضح تھا کہ وہ ان دکھوں کی تفصیل سننے کے لئے تیار ہے، میں نے کہا۔ "میرا بچپن کا زمانہ روتے بسورتے، پھٹے پرانے چیتھڑے پہنتے، ٹوٹی ہوئی سلیٹوں اور چٹخی ہوئی تختیوں پر لکھتے اور ماں سے ایک پیسہ محض ایک پیسہ حاصل کرنے کی ضد میں گذرا، بچپن کی کچی سپیدی سے نکل کر جب میں عنفوان شباب کی چکا چوند میں آیا اور میری بصارت اور بصیرت نے نئی نئی دنیائیں اور ان دنیاؤں کے اپنی مرضی سے

ڈھالے ہوئے قوانین اور ان قوانین کی زد سے بچتے ہوئے بلند مقاموں اور ان کی زد میں آکر مرمٹنے والے خاک نشینوں کو دیکھا تو میں نے بغاوت کی ٹھانی، تم جانتی ہوگی کہ دنیا کے سب بڑے بڑے باغیوں نے اوّل اوّل اسی سن میں معاشرت، معیشت اور سیاست کے مقررہ ڈھرّوں پر تیوری چڑھائی، سو میری یہ بغاوت اختیاری عمل نہ تھا، مجھے محلوں کی بلند دیواروں اور مطلا چھتوں سے بے اختیار نفرت ہوگئی، میں ویران مسجدوں کے صحنوں اور سنسان سڑکوں کی پٹڑیوں پر سویا، ایک زمیندار کی آٹھ سو من گندم کے مقابلے میں میں نے اپنے چار منوں کا کھلیان پر ہی پڑے رہنا بہتر سمجھا، میں نے ریشم و دیبا کے ضرورت سے زیادہ ملبوسات سے جل کر کھدر کے کپڑے پہنے، اور گو ننگے گرجتے بازاروں میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے ٹہلتا پھرا، جو اس دولت اور اس کی تمام ہنگامہ سامانیوں سے قطعی بے پرواہ ہے، لیکن میرے شعور کے کسی دور دراز گوشے میں آہستہ آہستہ احساس کمتری نے جڑ پکڑنی شروع کی اور میری زندگی جو پہلے ہی تلخ تھی، اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے" موت نے کھوپڑیوں کے ہار کو کھڑکھڑاتے ہوئے پہلو بدلا، وہ مجھ سے شاید اتنی تفصیل کی متوقع نہ تھی "میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے، اور آجکل میں بہت مصروف رہتی ہوں"

"تمہیں کہاں جانا ہے؟"

"مجھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پرواز کرنا پڑتی ہے" موت اسی سنجیدگی سے بولی، جس نے اس کے لبوں کے کناروں پر قوسی احاطہ سا بنا رکھا تھا" مجھے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے جنگی محاذوں میں گھومنا تھا، مگر وہاں میں نے اپنے ان گنت کارندے چھوڑ رکھے ہیں، میں نے اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے تمہارے ہندوستان کے خطۂ بنگال کو چن رکھا ہے، جہاں تمہارا ٹیگور پیدا ہوا تھا، جہاں تمہارا نذرالاسلام زندہ ہے، اور کہتے ہیں اسی سرزمین سے نغمہ نے جنم لیا، اور یہاں کی عورتوں کی آنکھوں اور بالوں کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی، جہاں کے میدانوں میں خوشبوئیں اور جنگلوں میں وسعتیں اور پربتوں میں رعنائیاں ہیں، اگرچہ مجھے تمہارے ہندوستان سے گذشتہ دو تین صدیوں سے تعلق خاطر رہا ہے، لیکن کچھ عرصہ سے مجھے بنگال نے مسحور کر لیا ہے، وہیں سے اڑوس پڑوس کی بھی نگرانی کر دوں گی مجھے بہار کے خطہ پر بھی کچھ دیر منڈلانا ہے، اور چند لمحے آسام اور برما کے جنگلوں میں بھی سیرگشت کرنا ہے"

"تم بہت آوارہ واقع ہوئی ہو" میں نے محبت بھری شکایت کی،

"موت کی آوارگی ہی اس کی زندگی ہے، موت بیکراں ہے اور بیکرانیاں سکون سے ناآشنا ہوتی ہیں، موت ایک وحدت ہے اور یہ وحدت کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور کائنات بیکراں ہے، اور بیکرانیاں تمہارے تصور کی محدود اڑانوں سے بالاتر ہیں، وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی، جیسے بے جانے بوجھے اس نے کوئی بہت بڑا راز فاش کر دیا ہے، پھر کہنی کو صوفے کے بازو پہ ٹیک کر بولی "تم اپنے احساس کمتری کا ذکر کر رہے تھے"

"لیکن تمہیں دیر ہو رہی ہے" میں نے دوبارہ محبت بھری شکایت کی۔

"میں تمہاری مدّتوں کی محبوب ہوں، اس لئے تمہاری سرگزشت سنوں گی، مگر ٹیگور اور نذرالاسلام کے وطن میں ان جھونپڑیوں کا بھی خیال رکھو، جہاں ریڑھ کی ہڈی سے چپکے ہوئے پیٹ اور کانوں سے اوپر اٹھی ہوئی شانوں کی ہڈیاں کھینچ کھینچ کر چیخ چیخ کر میری دستگیری کی دہائی دے رہی ہیں، اجمال سے کام لو، اجمال گفتگو کا حسن ہے"

"تمہیں بھی حسن سے مس ہے؟" میں نے طنزاً پوچھا،

"موت حسن نہیں تو اور کیا ہے، موت ایک حسن تکمیل کی ادا ہے، اس لئے حسین ہے"

"اور زندگی؟" ——— مگر اچانک میں سنبھل بیٹھا، موت کے چہرے پر سنجیدگی کا ہالا جیسے بھڑکتے اور چکراتے ہوئے شعلوں میں بدلنے والا ہو، میں نے فوراً موضوع بدلا "ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میری زندگی جو پہلے ہی تلخ تھی، اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی، میرا احساس کمتری دراصل ذلتوں اور رسوائیوں کے ایک نئے اور دراز سلسلے کی بنیاد ثابت ہوا، اور جب میں نے محبت کی، وہ محبت جو شاعروں اور مصوّروں کے شاہکاروں کے باعث میرے ذہن پر سنہری غبار بن کر چھائی رہتی تھی، جب میرے شعور میں جاگی، اور میں اپنے ماحول، اپنی سماج اور اپنی قوتوں سے بے پرواہ ہو کر اس محبت کے زیر اثر مارا مارا پھرنے لگا، تو اس احساس کمتری نے تصور کی وہ جنبش بھی مجھ سے چھین لی، جو مشاہدہ سے نہ سہی، مطالعہ کے دم سے میرے احساسات کی امانتیں تھیں، محبت کی تلخ ناکامیوں سے دل بجھا مگر پیٹ کی آگ بھڑک اٹھی، اور میں نے روٹی کمانے کی خاطر احساس کمتری کے عقب میں دیکھتے ہوئے

اس جذبۂ خودداری، اس غرورِ نفس، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس ننھی سی چمکتی ہوئی شمع کو بھی فنا کر ڈالا جس نے مجھے کئی مرتبہ گرنے اور گر کر پڑے رہنے سے بچایا تھا، میں غلامی در غلامی کے بھنور میں گھر گیا، مگر پیٹ کی آگ تیز تر ہوتی گئی، ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا، آتشِ دوزخ کا ایک مینار سا بلند ہوا، اور میں اس خودساختہ جہنم میں جل بجھ کر بھسم ہو گیا، مگر ابھی تک میں اپنے جسم، اپنی روح، اپنے مزاج کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کرتا تھا، یہ بھوبھل نہ بھڑکتا تھا، نہ بجھ چکا تھا، ایک چنگاری بجھتے بجھتے دوسری چنگاری کو روشن کر جاتی تھی، اور رواں دواں، رقصاں و جولاں چنگاریوں کی یہ لہراہٹ تھی۔ الوٹ تھی، کہ اچانک ———"

میں رک گیا، موت کی سوچتی ہوئی آنکھوں کو لانبی خمیدہ پلکوں بھرے پپوٹوں نے بہت حد تک ڈھانپ لیا تھا، پتلیوں کی صرف زیریں قوسیں نمایاں تھیں، جن سے میں نے شعاعوں کے تار چھوٹتے دیکھے، اور میں نے گھبرا کر پوچھا "تم کس سوچ میں ہو؟"

"میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے" اس کے پپوٹے اوپر اٹھ گئے، "اور میرے نائب روحوں کے انبار سمیٹ سمیٹ کر تھک چکے ہیں۔"

"تمہیں نیند آ گئی تھی۔"

"موت کو نیند نہیں آتی، نیند ایک کمزوری ہے، مجھے نیند آ جائے تو کرّے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں، ستارے متصادم ہو جائیں، چاند زمین پر گر پڑے، اور زمین سورج کے سینے میں دھنس جائے اور خلا میں واویلا مچ جائے، اور عناصر سر پیٹتے پھریں"

"تم خدا نہیں ہو"

"میں خدائی میں توازن رکھتی ہوں، میں ایک پھول کی رنگ و بو صرف اس لئے نچوڑتی ہوں کہ کونپل سے نئی کلی پھوٹے، میرے خدا کا حکم ہے کہ دنیا پرانی نہ ہونے پائے، جدید و قدیم میں ایک توازن قائم رہے اور توازن حسن ہے، اور میں حسین ہوں، میں حسنِ مجسم کی ایک ادا ہوں۔"

"اور میں انسان ہوں" میں نے تنک کر کہا، "میں مسجودِ ملائک ہوں، میں خلیفۃ اللہ ہوں، میں اشرف المخلوقات ہوں، میں صناعِ مطلق کی اعلیٰ ترین صنعت ہوں"

"اور تم میرے محتاج ہو، اور تمہاری احتیاج ہی مجھے آج یہاں کھینچ لائی ہے"

شرمندہ ہو کر میں نے سر جھکا لیا، موت نے دلاسہ دیتے ہوئے انداز میں کہا، "ہاں تو تم اپنے آپ کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کر رہے تھے"

"ہاں" میں نے ٹوٹتے ہوئے تار کو پکڑا، "اس عالم میں کہ میرے چار طرف چنگاریوں کا قیامت خیز تیزی سے چکر کاٹتا ہوا ایک دائرہ تن گیا، میں نے گھبرا کر اس دائرے میں کوئی رخنہ ڈھونڈنا چاہا، کیونکہ اس دائرے میں مجھے تم نظر آتی تھیں، اور ان دنوں تم میری نیندوں کی بھٹنی تھیں، بالآخر یہ رخنہ مجھے مل گیا، اور میں نے باہر جا کر اپنی امنگوں کے ملبے میں سے کام کی چیزیں چننا شروع کیں، محبت کے کھنڈر مجھے ماضی کی باقیات میں سب سے بھلے معلوم ہوئے، اور میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی جوان ہوں، یہ جذباتی مردنی دراصل میری دوں ہمتی کا نتیجہ تھی، ورنہ یہ راہ اتنی مختصر نہیں، اور نہ اتنی سنسان ہے، کہ انسان بڑھتے ہی پلٹ آئے، میرے خیالات پر ایک سرشار کن نوعیت کا عالم چھا گیا، اور اسی عالم میں میں نے پڑوس میں کلثوم کو دیکھا، اور زندگی جواب تک بالکل بے مقصد نظر آتی تھی، بڑے بڑے بلند مقاصد کا ایک ہجوم معلوم ہونے لگی، میرے سارے ماضی پر کلثوم کی مسکراہٹوں نے سنہری اور روپہلی کہرے چھڑک دیے، اور جب میں نے مستقبل کی سنسناتی ہوئی اندھیاریوں کو اس کے وجود کی کرنوں سے جگمگانا چاہا، تو مثا میرے سامنے، بالکل میری آنکھوں کے مقابل، میرے لمس کی حد میں، ایک بلند دیوار کھڑی ہو گئی، یہ دیوار خاندانی وقار، سماج، قانون اور مذہب کے خشت و سنگ سے اٹھائی گئی تھی، ہم دونوں نے اس دیوار سے ٹکرا کے اور اس میں شگاف ڈال کر آگے نکل جانے کی کئی بار ٹھانی، مگر یہاں کے ریزے ریزے میں ٹکٹکی باندھے ہوئی آنکھ کی پتلی ہماری ہر حرکت پر ہمارے ساتھ گردش کرتی تھی، تھک ہار کر ہم نے اپنے وجودوں ہی سے نکل بھاگنا چاہا، کہ ہماری روحیں تو ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں، مگر تم تک رسائی کے تمام سامان ڈراؤنے اور گھناؤنے تھے، اور ہمارے احساسات میں محبت نے ایسی بالیدگی پیدا کر دی تھی، کہ ہم بھدی موت نہیں مرنا چاہتے تھے، ہمیں اپنے انجام میں بھی حسن کی تلاش تھی۔"

موت نے پہلو بدلا "موت سولی کا تختہ یا زہر کی پڑیا نہیں۔"

"یہی راز سمجھنے کے لئے میں نے تجھے پکارا" میں اب موت سے مسحور ہو چکا تھا، "اور یہ راز میری سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اے میری سیاہ پوش محبوب تو مجھے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے لیتی، اسی لئے میں نے رات کی اندھی وسعتوں اور دن کی منہ پھاڑتی ہوئی بے کناریوں میں تجھے صدائیں دیں، میں نے تجھے ویران قلعوں کے شکستہ برجوں سے آواز دی، میں نے ٹوٹی ہوئی قبروں کے خوفناک شگافوں کے قریب جھک کر تجھے پکارا، میں طاعون زدہ بستیوں کی ہولناک خاموشیوں میں تیری

بارگاہ کی راہ ٹٹولتا پھرا، اور آج جب کہ میں زندگی اور موت دونوں سے مایوس ہو چکا تھا تم خود ہی میرے پاس چلی آئیں"

"تم غلط ما ہوں اور غلط مقامات پہ بھٹکتے پھرے" موت نے کہا اور پھر یوں بولی جیسے وہ سارے قصے کو ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہے، "تم کیا چاہتے ہو؟ ——— اس کے چہرے کی مرمریں پاکیزگی گلابی جھنجھلاہٹ میں بدل گئی تھی، اور وہ ایک کھوپڑی کو انگلی کے ناخن سے کھرچ رہی تھی، اور شغل کچھ اس انداز سے جاری تھا جیسے وہ ذہن میں اٹھتے ہوئے کسی طوفان کا رُخ موڑنے کی کوشش میں مصروف ہے، اور یہ کوشش کامیاب نہیں ثابت ہو رہی۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں" میں نے بے اختیارانہ کہا۔ "میں تمہارے اس ریشمی فرغل کی نرم لہروں میں لپٹ کر ہمیشہ کے لئے زندگی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں، کیونکہ زندگی وحشی ہے، خونخوار ہے، اس کے جبڑوں میں لہو ہے، اور پیپ ہے اور کچے گوشت کی دھجیاں ہیں، تم رحمدل ہو، غریب پرور ہو، تمہارے لبوں کی محرابوں میں سکون ہے، اور سر درد ہے اور نیندیں ہیں"

"تم ابھی کچھ مدت تک میرے آغوش کی جنت سے محروم رہو گے" موت نے بے پروائی سے کہا۔ "تم نے ابھی اس زندگی کا پورا مزا نہیں چکھا، تجھیں دربار خداوندی سے خیرات میں ملی تھی، تم نے ابھی تک میرے قرب کی اہلیتیں حاصل نہیں کیں، میں عموماً پختہ کاروں سے محبت کرتی ہوں"

"مگر تم تو بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور سے مہربان ہو" میں نے ہندوستان کی شرح اموات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا،

"اس کا مطلب یہ ہے" اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ہڈی سے ایک کھوپڑی کو یونہی شغلاً بجا کر کہا۔ "کہ تم نے پختگی کا مطلب نہیں سمجھا، میرا معیار بہت بلند اور بالکل الگ ہے، میں مستقبل کی بھی اندازہ شناس ہوں، اور کبھی کبھی مجھے کسی انسان میں مستقبل کی پختگی اس درجہ مسحور کر لیتی ہے، کہ میں اس کی نا پختگی سے بے پروا ہو کر اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہوں، مگر یہ وقت بحث کا نہیں، آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

اس نے وہی سوال اور میں نے وہی جواب دہرایا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

"انسانوں کی اکثریت مجھے چاہتی ہے" اس کی مرمریں گردن کا تناؤ اچانک ایک عجیب حسین مگر مہیب صورت اختیار کر گیا۔ "چاہت میں کوئی امتیاز ہونا چاہئے، اور مجھے تمہاری چاہت کے خلوص پر اعتماد ہے، ابھی کچھ مدت تک زندگی سے گھل مل جانے کی کوشش کرو، جب میرا جی چاہا تو میں تمہارے بلاوے کا انتظار نہیں کروں گی۔ اور اب کہ میں اپنے بے شمار فرائض کو محض تمہاری چاہت کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنے نائبوں کے حوالے کر آئی ہوں، تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں، مرنے کے علاوہ تمہاری اور کیا خواہش ہے ——— ایسی خواہش جو زندگی سے پرے کی دنیا سے متعلق ہو"

سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑی، ذہن کے گہرے پانیوں میں اچانک ایک بھنور سا پیدا ہوا، جیسے کوئی سیپی تہ سے اچھال دی گئی ہے، اور پانی کو چیرتی چکراتی سطح کی طرف بڑھ رہی ہے۔ "میں اپنے مرحوم دوست مسعود کو ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں" میں نے انتہائی جرأت سے کہا،

ہوا کے ایک طرار جھونکے کی سی آواز آئی، فضا گھٹنے لگی جیسے کمرے کی چاروں دیواریں سمٹی آ رہی ہوں، میں نے گھبرا کر صوفے کی طرف دیکھا، اب وہاں موت کی جگہ مسعود بیٹھا تھا جس نے اپنی چند روزہ محبوبہ کے کھو جانے کے غم میں زہر فروش کے تمام سرخ نشانات والے ڈبوں سے الگ الگ پڑیاں خریدی تھیں، اور ہر زہر کو یوں نگلتا چلا گیا تھا جیسے زندگی نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی ——— اس کے چہرے پر انتہا درجہ کی اداسی تھی، اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اسے میری حالت پر بہت رحم آ رہا ہے، اور وہ میرے بلاوے سے کچھ اتنا خوش نہیں، جیسے اسے ایک اٹل مجبوری یہاں کھینچ لائی ہے۔

"خوش آمدید مسعود" میں نے مسکرا کر کہا، اٹھ کر آگے بڑھا، تو صوفہ اتنا ہی پرے ہٹ گیا، اور جب میں حیران ہو کر پیچھے پلٹا تو صوفہ اپنے اصلی مقام پر آ گیا۔

"جیتے رہو میرے دوست" اس کی سنجیدگی آسیبی معلوم ہوتی تھی، "تمہارے چہرے سے میں نے تمہارا سوال پڑھ لیا ہے، میرے ساتھی، وجود "حقیقت" ہے، اور عدم جذبات کا ایک ایسا فریب جس کا راز زندگی میں نہیں کھلتا، میں زندگی سے اکتا کر موت کی طرف بھاگا تھا، اب موت کے بعد کی حالت سے اکتا کر زندگی کی طرف آنا چاہتا ہوں، مگر بے بس ہوں، موت نے مجھے جو زندگی بخشی ہے، اس میں بقا ہے، مگر وہ نہیں جس کی خاطر میں زمان و مکان کی پابندیوں سے بھاگ نکلا، وہ چہرہ نہیں جو پھولوں سے ڈھکے ہوئے طلائی طشت سے مشابہ تھا، وہ آنکھیں نہیں جن کی ہر جھپکی میں وقت کی ایک صدی بیت جاتی تھی، وہ ہونٹ نہیں جن کے لمس سے مجھے محسوس ہوا کہ زندگی محض جمود نہیں، یہ ایک دہکتا ہوا سرور اور بھبکتا ہوا خمار ہے، کچھ بھی تو نہیں ملا مجھے"

"عجیب بات ہے!" میں اپنے تصور کے خیابانوں کو ایک دم نہیں جلانا چاہتا تھا۔ "مگر دیکھو، اس خیال کو بھلانے کے لئے اپنے ماحول کی حسین خصوصیتوں کا مطالعہ کرو" میں نے دنیاوی مشورہ دیا۔

"میں نے کوشش کی ہے" اس کی آواز زیروبم سے بے نیاز تھی۔ "کہ اپنے ماحول میں ڈوب جاؤں" مگر یہاں کی ہر چیز پر منحوس سنجیدگی کی جھلی منڈھی ہوئی ہے، فرشتے ہیں مگر انھیں ذکر و فکر سے فرصت نہیں، حوریں ہیں جو مسکراتی ہیں تو جیسے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہوں، باتیں کرتی ہیں تو جیسے اندھا کر دینے والی کہر میں تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہوں، گاتی ہیں تو جیسے ہمالہ پر سے ہولے ہولے گلیشیر سرک رہے ہوں، میں نے انھیں چھو کر بھی دیکھا ہے، میں نے زندگی میں وینس کے بت کے عکس کو بھی چھوا تھا، مگر اس عکس کے مس میں بھی گرمی تھی، شاید اس لئے کہ وہ انسانی جذبے کی تخلیق تھا، اور حور ——— وہ یخ بستہ پیکر جمال محض ایک کھلونا ہے، اور کھلونوں سے صرف بچے ہی بہل سکتے ہیں۔ یہاں میں نے ان گنت بوڑھے بچے دیکھے، جو اپنی تمام پرہیزگاریوں اور شب زندہ داریوں کا اجر ایک حور کا دیدار مسلسل سمجھتے ہیں، اور خوش ہیں، اور مطمئن ہیں، اور میں بے قرار ہوں، میں عدم کے وسیع گلبنوں میں بھٹک بھٹک کر نڈھال ہو چکا ہوں، مگر مجھے کہیں کوئی نخلستان میسر نہیں آیا، یہاں جنتیں ہیں جنگل نہیں، یہاں لالہ زار ہیں، ریگزار نہیں، یہاں روحیں ہیں انسان نہیں، اور مجھے روحوں سے کوئی لگاؤ نہیں، مجھے گوشت پوست کے انسان چاہئیں، اور یہاں شفاف پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں، کوئی نہیں ——— اور کوئی ہو بھی تو کیا، جب وہ نہیں، جس کے لئے میں نے زندگی سے جی بھر کر رس چوسنے کی بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جانا افضل سمجھا! میں نے خدا سے دعائیں مانگی ہیں، کہ ایک نہایت معمولی وقفے ہی کے لئے سہی، وہ مجھے پھر سے زمین کی زندگی بخش دے، اور پھر ہمیشہ کے لئے نابود کر دے، مگر صرف ایک مرتبہ مجھے اپنے کرّے کے طوفانوں اور خاموشیوں اندھیروں اور اجالوں، فیروزمندیوں شکستوں، محبتوں اور نفرتوں میں رہنے بسنے دے، اور مجھے محض ایک ثانیے کے لئے اس چہرے کی ایک جھلکی دکھا دے جسے حوریں دیکھ پائیں تو خودکشی کر لیں"۔

"تمہارے مرنے کے فوراً بعد اس نے جل کر دار وغہ سے شادی کر لی تھی" میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

مگر معاً مسعود کے جسم کا ٹھوس پن غائب ہونے لگا، اس حد تک کہ مجھے اس کے وجود کے اس پار صوفے کی پشت نظر آنے لگی، میں اسے چھونے کے لئے اٹھا تو کھوپڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی، اور مسعود کی جگہ مجھے صوفے کے قریب موت کھڑی نظر آئی، اس کی سنجیدگی میں اطمینان کی دھاریاں سی جھلک رہی تھیں، اور اس کی انگلیوں کی پوروں سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔

"یہ ——— یہ ———" میں نے خون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک کھوپڑی سے دھوئیں کا سا ہلکا پھلکا رومال نکال کر انگلیاں کو پونچھا، اور بولی "میں برما کے جنگلوں میں چلی گئی تھی، جہاں توپ کے پہیئے تلے دبے ہوئے ایک سپاہی کی ضدی روح کو اس کی نسوں سے نوچ رہی تھی، کہ مجھے مسعود نے اپنے اظہار آنے کی اطلاع دی"

"میں نے اسے صدمہ پہنچایا ہے، وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ یہاں وہاں ہر جگہ ہے، وہ آج اور کل ہر پل میں ہے، وہ پھیل کر کائنات پر محیط ہو چکا ہے، ابلتے ہوئے پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ برتن سے تھوڑا سا بلند ہو کر کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ وہ فنا نہیں ہوتی، وہ پھیل جاتی ہے، اور جب وہ پھیل جاتی ہے، تو تمہاری بصارت اور بصیرت اس کا احاطہ نہیں کر سکتی، میں نے بھی تمہارے سامنے سمٹے ہوئے عالم میں ایک وجود اختیار کر رکھا ہے، البتہ میری حسیں منتشر ہیں، ایک حس تم سے متوجہ ہے، مگر میری دوسری ان گنت حسیں زمین و آسمان کی پہنائیوں میں رواں دواں ہیں"۔

"کیا میں خدا کو بھی دیکھ سکتا ہوں؟" میرے حوصلے بڑھ گئے تھے،

"مسعود نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" موت نے پوچھا،

"مسعود زندگی کا آرزومند تھا"

"ٹھیک ہے، اگر تم کوشش کرو، اسی خلوص سے کوشش کرو، جس خلوص سے تم نے مجھے پکارا تھا، تو تم خدا کو بھی دیکھ لوگے، اور اس کے لئے تمہیں زندہ رہنا ہوگا، اگر تم زندگی میں اپنے مقصود کو حاصل نہ کر سکے، تو پھر میں تو تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، میرا کام تو محض ماحول کا انتقال ہے"۔

"مسعود۔ قانون۔ سماج، مذہب، غرض ہر کوئی زندگی پکار رہا ہے زندہ رہو، زندہ رہو، یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کیسے زندہ رہوں، تم بھی کہتی ہو کہ زندہ رہوں، اور حالت یہ ہے کہ ——— دیکھو تمہاری پوروں سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے"

"بہنے دو" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "جوان خون ہے، یہ میرے روکے نہیں رکے گا ——— بس اب میں جاتی ہوں"

"میرے سوالوں کا جواب؟"

"ہر سوال کا جواب سوال کے اندر غلطاں ہے"

"میری تشفی نہیں ہوئی"

"تو؟"

"اب میں کیا کروں؟"

"زندہ رہو"

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

فلسطین کے بدوی قبائل کی زندگی

مائل نقوی

یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت دلچسپ کہ دنیا کے جو مقامات کسی مذہبی ہستی سے منسوب ہیں عام اس سے کہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں ان کی قدیم تہذیب میں اسوقت تک بہت کم فرق واقع ہوا ہے۔ ہندوستان، چین، عرب، فلسطین وہ ملک ہیں جو با وفات مختلف پیشوایان مذہب کے ملجاؤ مسکن رہ چکے ہیں۔ ان ممالک کی تہذیب اب بھی وہی ہے جو آج سے ہزارہا سال پہلے تھی۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخی انقلابات وقتاً فوقتاً ان ملکوں کی تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں لیکن ان کی دسترس بہت ہی محدود حدتک ہوئی ہے۔

عہد حاضر میں فلسطین کی سرزمین سیاسی انقلابات اور خیالات کے اختلافات کا مرکز بنی ہوئی ہے اور عرصہ سے مختلف ملکوں کی تہذیب اس پر اپنا اثر بھی ڈال رہی ہے۔ لیکن جہاں تک باشندگان فلسطین کی معیشت اور معاشرت کا تعلق ہے ان چیزوں نے جدید اثرات قبول کرنے سے اپنی بے نیازی کا اظہار کیا ہے۔ جس طرح ہندوستان کا کوئی سیاح اس ملک کی اصلی زندگی اور صحیح حالات سے اسوقت تک آگاہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے گنجان آبادی کے شہروں کو چھوڑ کر دیہات تک رسائی حاصل نہ کرے۔ اس لئے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں نام ہے انہیں دیہات کے مجموعے کا اور یہیں خالص ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کے حقیقی خد و خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ارض بائبل کی سادہ اور دلاویز زندگی کے مناظر دیکھنا چاہتا ہے تو یہ چیز اسے وہاں کے محدود شہروں میں نہیں ملے گی بلکہ اس کے روح پرور نظارے اس کے لق و دق صحرا کی بدوی زندگی میں نظر آئیں گے جو زیادہ تر علاقۂ ماوراء النہر میں واقع ہیں۔

ماوراء النہر رقبہ کے اعتبار سے کوئی بڑا ملک نہیں ہے۔ بلکہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ اس کے ایک طرف وادی جبرطن بحیرۂ مردار اور وادی العرب واقع ہیں بقیہ تین طرف سے ریگستانہائے وسطی ایشیا، عراق اور عرب گھیرے ہوئے ہیں۔ جردان اور بحیرۂ مردار کے قریب کچھ ایسے چشمے ہیں جو تمام سال جاری رہتے ہیں۔ ملک بھر میں بس یہی خطہ زرخیز ہے۔ باقی تمام علاقہ ریگستانی ہے جس پر سفید چاک اور گلابی ریت پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں ریگ رواں کے ہمیشہ طوفان آتے رہتے ہیں۔ چقماق اور سنگ موسیٰ کے جا بجا انبار لگے ہوئے ہیں۔ دریاؤں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ بدوی لوگ پہاڑی دامنوں میں ان قدرتی نشیبوں اور مصنوعی کنوؤں سے پانی حاصل کرتے ہیں جہاں سردی کے موسم میں پانی جمع ہو جایا کرتا ہے۔ آب و ہوا کی کیفیت یہ ہے کہ موسم سرما میں کثرت سے بارش ہوتی ہے اور برف باری کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ اس موسم کے ختم ہوتے ہی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ سرد و شیریں پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ سطح زمین پر سرسبزی و شادابی چھا جاتی ہے اور وادیاں سبزۂ و گل کی کثرت سے چمن زار بن جاتی ہیں۔ لیکن گرمی کا موسم آکر اس کیفیت کو بالکل بدل دیتا ہے۔ خزاں بہار کے حسن کو لوٹ لیتی ہے اور پھر ہر طرف وہی بنجر ریگستان نظر آنے لگتا ہے۔ دن میں سخت گرمی پڑتی ہے اور راتوں کو شدید سردی۔ گلہ بان جو اس ریگستان میں اونٹوں کی نگرانی کی خدمات انجام دیتے ہیں موسم کی ان تبدیلیوں کے ہمیشہ شاکی ہی رہتے ہیں۔

یہاں کے اصلی باشندے جو بدو کہلاتے ہیں تین طبقوں پر منقسم ہیں۔ اول کاشتکار ہیں۔ یہ لوگ دیہات میں مستقل طور سے آباد ہیں اور کاشتکاری ان کا پیشہ ہے۔ دوسرے طبقہ میں نیم خانہ بدوش قبائل ہیں۔ یہ قبیلے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مویشیوں کے گلے بھی رکھتے ہیں اور زمین کی کاشت بھی کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ اصلی بدوؤں کا ہے جو تمام کے تمام خانہ بدوش ہیں۔ ان کے پاس مویشیوں کے بڑے بڑے گلے ہوتے ہیں۔ کاشت وغیرہ سے انہیں مطلق سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے قبیلے اپنے بیشمار مویشیوں کے گلے لئے ہوئے خانہ بدوشی کی حالت میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ ریگستان کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ بعض اوقات تو اپنے علاقے کی حدود سے گزر کر وسطِ عرب تک جا پہونچتے ہیں۔

یوں تو یہ تینوں طبقے بظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں، زبان، لباس، خوراک کسی بات میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن صحرا نورد بدو اپنے آپ کو بقیہ دونوں طبقوں سے افضل تصور کرتا ہے اور انہیں "فلاحین" یعنی کاشتکار کے نام سے موسوم کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی صحرا نورد بدو اس ملک کی آبادی کا جزو اعظم اور صحرائی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔

ایسے ریگستانی ملک میں جہاں منزلوں معمولی سے معمولی نہر یا چشمہ کا سراغ تک نہیں ملتا پانی کے ذخیروں اور ان کی نگہداشت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کنوئیں نہایت بیش قیمت جائداد تصور کئے جاتے ہیں اور بجز اس قبیلہ کے جو ان پر قابض ہو کسی دوسرے کو ان کے استعمال کا حق نہیں ہوتا۔ جب کبھی کوئی غیر متعلق قبیلہ ان ذخیروں سے پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام جنگ کا سبب بنجاتا ہے۔ عہد قدیم میں حریف قبائل کے درمیان بیشتر لڑائیاں اسی بنیاد پر اٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور عرصۂ دراز تک ہولناک خونریزی ہوتی رہتی تھی۔

ان کنوؤں کا نظارہ خصوصاً اس وقت قابل دید ہوتا ہے جب ان کے گرد کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کو پانی پلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ یہ نظارہ اپنے دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے آج سے ہزارہا سال قبل کے اس منظر کی ہوبہو تصویر پیش کرتا ہے جس کا ذکر بائبل میں جابجا آیا ہے۔ بوڑھے اور جوان باری باری سے اپنے اونٹوں کی قطاروں کو کنوئیں کے پاس لاتے ہیں اور انہیں پانی پلا کر واپس لیجاتے ہیں۔ کنوئیں کے گرد بعض اوقات ہزارہا ایسے اونٹ پانی کے منتظر کھڑے رہتے ہیں جو دور دراز کی مسافت طے کرکے یہاں تک پہونچے ہیں اور پانچ پانچ چھ چھ روز کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اونٹوں کو پانی پلانے کا طریقہ یہ ہے کہ دو بدو کنوئیں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چمڑے کے ڈولوں میں پانی کھینچتے جاتے ہیں، عالم محویت میں گاتے جاتے ہیں اور ایک مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ پانی پینے کے لئے اونٹوں کو بلاتے جاتے ہیں۔ اونٹوں کا مالک اپنی قطار کو لیکر آگے بڑھتا ہے۔ کنوئیں کے قریب قطار کھڑی ہو جاتی ہے۔ مالک ایک ایک یا دو دو اونٹ آگے بڑھاتا ہے اور انہیں پانی پلا کر واپس کرتا جاتا ہے۔

اونٹ اس ریگستان کی خاص دولت نہیں بلکہ نعمت ہے۔ ان کی پرورش و پرداخت میں بڑی توجہ صرف کی جاتی ہے اور یہ کام اس فن کے ماہر اور بیش قرار معاوضہ کے مزدوروں کے سپرد ہوتا ہے۔ اونٹ کے بعد اس ملک کی بڑی دولت بھیڑ ہے۔ ان کی بھی کثیر تعداد یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال لڑکیاں کرتی ہیں۔ پانی پلانے میں مقدم اونٹوں کو رکھا جاتا ہے۔ ان سے جو کچھ وقت بچ جاتا ہے اس میں بھیڑوں کا نمبر آتا ہے۔ بعض اوقات بیچاری لڑکیوں کو اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اونٹوں کے قافلے دور دراز کی منزلیں طے کرکے اور دنوں کی پیاسیں برداشت کئے ہوئے کنوؤں پر آتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بھیڑوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

کنوئیں کھودنے میں اونٹ کی امداد :- صحرانشین بدو کے ہر شعبۂ زندگی میں اونٹ کی مدد ایک لازمی جزبنگئی ہے۔ کنواں کھودنے میں بھی وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو آدمی نیچے اتر کر کنواں کھودتے ہیں اور مٹی وغیرہ ڈول میں بھر دیتے ہیں۔ پھر جس طرح ہمارے ملک میں بیلوں سے چرس کھچوایا جاتا ہے اس طرح وہاں اونٹ زیر تعمیر کنوئیں سے مٹی کھینچتا ہے۔

بیت شعر بدوی کا مسکن بھیڑ کے سیاہ بالوں کا خیمہ ہوتا ہے۔ وہ اسے خیمہ کبھی نہیں کہتا بلکہ "بیت شعر" (بالوں کا مکان) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا یہ مکان دنیا کے تمام مکانوں سے کہیں ہلکا، نرم اور لچکیلا ہوتا ہے۔ اس میں گرمی، دھوپ، سردی، آندھی، گرد غرضکہ موسم کے ہر ناگوار اثر سے حفاظت کا معقول لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دن کے وقت جب گرمی تیز ہو جاتی ہے تو قناتیں ہٹا دی جاتی ہیں اور خیمہ ہوادار شامیانہ کا کام دیتا ہے۔ لیکن راتوں کو جب سردی کا زور ہوتا ہے

"آب و آتش"

التفات نظر، مگر مبہم
اک روئے فسوں تبسم نہ کرم

کون ہو محرم حیات اَلم
غیر تو غیر، دوست بھی برہم!

اشک غم ہی رواں نہ آنکھ ہی نم
آہ یہ دل کا گریۂ پیہم!

آرزوئے سکوں نہ شکوۂ غم
الاماں! بے حسی کا یہ عالم

غرق جام و سبو تمام اَلم
ظرف میکش حریف بادۂ غم

آرزوئے حیات تیری قسم
غم زیادہ ہے اور خوشی کم کم

ایک دل مرکز ہزار اَلم
اور کچھ - اور مشق تیر ستم

قہر کی اک نگاہ بھی تو نہیں
کس بھروسہ پہ ہوا امید کرم

اٹھ رہا جائے گا کیا نصیب حیات
زندگی زندگی سے خود برہم

کم نظر اہل بزم کیا جانیں؟
شمع کس کس کے کر گئی ماتم

زندگی کی جھلک ہے ان میں مجیب
شعر کیا ہیں حدیث درد و اَلم

مجیب خیر آبادی

یا جب گرد و باد کے طوفان آتے ہیں قناتیں لگا دی جاتی ہیں۔ شدید سردیوں کے موسم میں جبکہ برفانی ہوائیں بدن کو تھرتھرا دیتی ہیں اسوقت بھی ان خیموں کے اندر بغیر اس کے کہ آگ روشن کی جائے کافی گرمی رہتی ہے۔

بدوی خیموں کی وضع

بدو کا "بیت شعر" مستطیل شکل کا ہوتا ہے۔ چھت ملبند اور اطراف ڈھالو ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا خیمہ بھی اتنا کشادہ ہوتا ہے کہ اس کیلئے نو چوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوبوں کی تین قطاریں ہوتی ہیں۔ یہ خیمہ کے طول میں اس طرح نصب کی جاتی ہیں کہ اونچی قطار وسط میں ہوتی ہے اور اس سے چھوٹی دو قطاریں دونوں اطراف میں ان کو ڈوریوں کے ذریعہ قائم رکھا جاتا ہے۔ خیموں کی قناتیں بھی سیاہ اون کی ہوتی ہیں اور خیموں کے نصب کرنے میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ ان کی پشت ہوا اور آندھیوں کے رخ پر رہے۔ خیموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک زنانہ حصہ ہوتا ہے۔ اسے "حرم" کہتے ہیں۔ اس حصہ میں خاندان کے اہل و عیال رہتے ہیں اور اسی حصہ میں خوابگاہ آبدار خانہ، باورچیخانہ اور اجناس اور خانگی ضروریات کا سامان رہتا ہے۔ دوسرا حصہ نسبتاً کشادہ ہوتا ہے۔ یہ مردانہ نشست اور مہمانوں کے قیام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ جو پردہ خیمہ کو ان دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اس کے حسن و آرائش پر بڑی توجہ صرف کیجاتی ہے۔ پردہ کی زمین عموماً سفید اون کی ہوتی ہے۔ اس پر بھورے، بادامی اور سیاہ اون سے بیل بوٹے نکالے جاتے ہیں۔ یہ سب کام حرم کی عورتیں کرتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ حد درجہ دیدہ زیب گلکاری جو ان پردوں پر کی جاتی ہے اس کیلئے ان صحرانشین عورتوں کے روبرو کوئی نمونہ نہیں ہوتا ساری کاریگری ان کے دماغی تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خیموں کی وسعت

عام بدوی کا خیمہ طول میں آٹھ یا دس فیٹ اور عرض میں اس کا نصف ہوتا ہے۔ خیموں کا طول و عرض ان کے مالکوں کی حیثیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ غریب گلہ بانوں کے خیمے تو بہت مختصر ہوتے ہیں مگر شیوخ اور دولتمند سرداران قبائل کے خیمے سو سے ایک سو بیس فیٹ تک طولانی ہوتے ہیں۔ ایسے خیموں کو کئی کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور چونکہ تقسیم کرنے والے پردہ کو "واسط" کہتے ہیں اس لئے واسطوں کی تعداد سے خیموں کو موسوم کیا جاتا ہے مثلاً چار واسط کا خیمہ۔ دس واسط کا خیمہ وغیرہ ان خیموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بعض مرتبہ تو بیس اونٹ تک ناکافی ہوتے ہیں۔

خیموں کی ساخت میں جو اون استعمال کیا جاتا ہے وہ زیادہ بدوی کی مملوکہ بھیڑوں کا ہی ہوتا ہے اور یہ بات قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔ اون کاتنا، بننا، خیمہ تیار کرنا یہ سب کام عورتیں کرتی ہیں۔ خیموں کے نصب کرنے اور اکھاڑنے کی خدمت بھی عورتوں ہی کو انجام دینا پڑتی ہے۔

نیا خیمہ کب بنایا جاتا ہے

نیا خیمہ اس وقت تیار کیا جاتا ہے جبکہ خاندان کے کسی نوجوان لڑکے کی ازدواجی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ اپنے والدین کے گھر سے علیحدہ ہوکر اپنی شریک زندگی کے ساتھ عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

بدوی خیمے کبھی فرسودہ نہیں ہوتے

بدوی خیموں کے سلسلہ میں جو بات سب سے زیادہ تعجب خیز معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ مسلسل اور شدید موسمی تغیرات کو برداشت کرنے کے باوجود ان میں کہنگی کے آثار کبھی نمودار نہیں ہوتے۔ کیا ان پر برف و باراں کے طوفانوں اور صرصر و سموم کے خوفناک حملوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا؟ یا صحرائی بھیڑوں کے اون میں اینٹ، پتھر اور چونے سے زیادہ پائداری ہوتی ہے؟ مگر یہ بات تو کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ خیموں کی ظاہری خوشنمائی اور ہمیشہ نئے رہنے کا راز بدوی خواتین کی ہنرمندی اور محنت پسندی میں مضمر ہے۔ بھیڑوں کا اون ہر گھر میں ہمیشہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ عورتیں اسے کاتتی اور پٹیاں بنتی رہتی ہیں اور سال گزر جانے کے بعد پرانی پٹیوں کی جگہ نئی لگا دیتی ہیں۔ اس طرح سال بسال نئی پٹیوں کے باعث خیمہ ہمیشہ تازہ ساخت معلوم ہوتا ہے اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان میں شکستگی و کہنگی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

عدیم النظیر مہمان نوازی

دنیا کی تہذیب و تمدن کے مرکزوں سے دور بسنے والا یہ صحرانورد بدو اپنی بے مثل مہمان نوازی کی شہرت کا مالک ہے۔ اس کے تمام علاقہ میں سیاح ایک سرے سے دوسرے تک چلا جائے لیکن اسے کہیں کوئی مسافرخانہ یا ہوٹل نظر نہیں آئے گا۔ اجنبی شخص اس کمی کو تہذیب جدید سے بدو کی ناواقفیت پر مبنی کرے گا۔ مگر یہ اس کی سخت غلطی ہوگی۔ ملک بھر میں ہوٹل یا سرائے کا نہ ہونا بدو کی بےنظیر مہمان نوازی کا ثبوت ہے۔ اس کا خیمہ مسافر کے لئے سرائے، ہوٹل، آرام گاہ اور فرودگاہ کا قائم مقام بنتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایک بدوی کے خیمہ میں داخل ہوجانے کے بعد مسافر کو آب و طعام ہی کی طرف سے اطمینان نصیب ہوجاتا ہو بلکہ اسے تمام خطرات سے کامل حفاظت حاصل ہوجاتی ہے۔

اس کے ہاں ہر اجنبی مسافر اپنے آپ کو ایسا پاتا ہے گویا کہ وہ برسوں سے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے جھرمٹ میں آگیا ہے۔ قبیلہ کا شیخ میزبان اور باقی افراد مسافر کے خادم بنجاتے ہیں۔ اس کے لئے آرام و آسائش کے بہتر سے بہتر سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ مہمان کی ضیافت کے لئے شیخ اپنے گلوں میں سے بہترین جانور کا انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گلے کے گلے مہمان کے سامنے سے گزارے جاتے ہیں اور وہ کوئی جانور پسند کرتا ہے۔ شیخ خود جانور کو ذبح کرتا ہے اور اس کی بانوئے محترم اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتی ہے۔ مہمان کی خاطر قیمتی قالین کا فرش کیا جاتا ہے۔ قبیلہ کے معزز افراد دسترخوان پر مدعو کئے جاتے ہیں۔ مہمان کی تواضع اور احترام کا اس درجہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ شیخ اس کے ساتھ بیٹھکر کھانا نہیں کھاتا بلکہ دعوت کے دوران میں اس کے روبرو حاضر رہتا ہے اور مثل خادم کے ہر چیز اس کے سامنے خود پیش کرتا ہے۔

بدویوں کی شکل و صورت

بدویوں کا قد میانہ، بدن چھریرا، نقشہ بیضاوی اور آنکھیں بڑی اور چمکدار ہوتی ہیں۔ ہونٹ باریک، داڑھی چھدری اور ناک عقابی ہوتی ہے۔ مدتہائے دراز سے آفتاب کی سوزش میں رہنے کی وجہ سے رنگت سالونی ہوگئی ہے۔

عورتیں توانا اور صحتور ہوتی ہیں۔ سرو اندام ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار سے شاہانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔ جوان لڑکوں اور لڑکیوں میں "گودنے" کا عام رواج ہے۔ بعض لڑکیوں کی ٹانگیں تو اسقدر گدی ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ جھالردار موزے پہنے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے عموماً اپنے چہرہ پر چار نقطے گدواتے ہیں۔ ایک ناک پر، ایک ٹھوڑی پر، اور ایک ایک رخساروں پر۔ بعض منچلے جوان اپنے بازوؤں پر شیر، عقاب، تلوار وغیرہ کی شکلیں بھی بنوا لیتے ہیں۔

لباس

عام قاعدہ ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کی پوشاک اس ملک کی آب و ہوا کی مناسبت سے ہوا کرتا ہے۔ یہی حال بدویوں کے لباس کا بھی ہے۔ ان کا ملک ریگستانی ہے جہاں ایک وقت میں آندھیوں کا زور اور گرد کی بھرمار رہتی ہے۔ اور دوسرے وقت میں سردی کی شدت اور برفباری کی کثرت ہوتی ہے۔ لہذا باشندگان ملک کے طرز لباس میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر شخص خواہ کسی طبقہ یا رتبہ کا ہو گھٹنوں تک نیچا سفید کرتہ پہنتا ہے جسے ان کی اصطلاح میں تاب کہتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک سفید یا دھاریدار ریشمی دردہ سوتی جبغہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری لباس بغیر آستین کی قبا ہے۔ یہ کوٹ، اوورکوٹ، برساتی اور کمبل کا کام دیتی ہے۔ قبا بھیڑ یا اونٹ کے اون سے تیار کی جاتی ہے اور اس کے لئے پسندیدہ رنگ سیاہ، بادامی، نارنجی اور سفید ہیں۔ اونی کپڑا جو اس غرض سے تیار کیا جاتا ہے اس کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ کپڑا اونی ہونے کے باوجود اسقدر نفیس اور باریک ہوتا ہے کہ دوسرے طرف کی چیز صاف نظر آتی ہے۔ پھر اس نفاست کے ساتھ مضبوط اور کارآمد بھی اتنا کہ جب احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے تو تیز سے تیز بارش اور شدید سے شدید برفباری کا مطلق اثر جسم تک نہیں پہونچتا۔ عام بدوی جنہیں سرد آب و ہوا میں رہنا پڑتا ہے وہ بھیڑوں کی پوستین استعمال کرتے ہیں۔

بدوی لوگ ٹوپی استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے سر کی حفاظت ایک خاص وضع کے رومال سے کرتے ہیں۔ یہ رومال، سر پر اس طرح ڈال لیا جاتا ہے کہ اس کے دو گوشے کانوں کے نیچے تک لٹکتے رہتے رہتے ہیں۔ اس کے اوپر اونی یا ریشمی "سرپیچ" ہوتا ہے۔ اس ترکیب سے کان اور سر دھوپ اور سردی اور گرد سے محفوظ رہتے ہیں۔ پاؤں میں رنگین چمڑے کی چپل پہنتے ہیں۔ شیوخ اور وہ لوگ جنہیں گھوڑے کی سواری کا زیادہ کام رہتا ہے ایک خاص وضع کا مراکشی چمڑے کا بوٹ استعمال کرتے ہیں۔

بدویوں کی ڈھیلی ڈھالی عبائیں اور ان کے کشادہ دامن ممکن ہے کہ اجنبی نگاہوں کو غیر ضروری معلوم ہوں لیکن وہ بہت مفید اور آرام دہ اور مقامی آب و ہوا کے بالکل مناسب ہیں۔ سفید رنگ کا سوتی لباس انہیں آفتاب کی طپش سے محفوظ رکھتا ہے اور سیاہ اونی پوشاک سرد راتوں میں جسم کی حفاظت کرتی ہے۔ گرمی میں قبا کے بند جب کھول دئے جاتے ہیں تو خوشگوار ہوا بدن کو فرحت پہونچاتی ہے لیکن باد سموم کے وقت یہی دامن اگر لپیٹ لئے جائیں تو اس کے مضر اثرات کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

عورتوں کی پوشاک مردوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی وضع ایسی ہوتی ہے جسمیں شان اور خوبصورتی دونوں پائی جاتی ہیں۔ انکے لباس کا رنگ عموماً آسمانی ہوتا ہے۔ دامن میں ہلکے رنگ کی پلیٹیں ہوتی ہیں۔ جہاں کلیاں اور جوڑ ملتے ہیں وہاں خوشرنگ ریشمین کام ہوتا ہے۔ کنواری لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کی پوشش میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لڑکیاں اپنا سر ایک ایک رومال سے ڈھکے رہتی ہیں جو سوتی یا خانہ ساز ریشمی کپڑے کا ہوتا ہے اور اس پر کلابتون کا کام کیا ہوتا ہے۔ شادی شدہ عورتیں معمولی کپڑے کا رومال سر اور پیشانی کے گرد باندھ لیتی ہیں۔

دلہنوں کا "سربند" بہت خوبصورت زرکار اور بیش قیمت ہوتا ہے۔ زیورات کے ذیل میں چوڑیاں، گلوبند، انگشتری عام ہیں۔ بالوں کی زیبائش کے لئے موبات کے گرد شبک گھونگھرو ٹانکے جاتے ہیں سردی اور بارش میں اگر کہیں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو شانوں پر دراز عبائیں ڈالی جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں ایک طریقہ نہایت ہی شریفانہ اور قابل تعریف یہ ہے کہ لباس اور وضع قطع میں مرد و عورت ایک دوسرے کی مشابہت سے سخت احتراز کرتے ہیں۔ ہر صنف کی طرز و وضع اس صنف کے ساتھ مخصوص ہے حتیٰ کہ تفریح طبع کے مشغلوں اور نقلوں وغیرہ میں بھی اس امر کی انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے۔

اخلاق و عادات

بدویوں کے اخلاق و عادات نہایت سادہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ خیالات بلند، اور مستحکم اور طبیعت میں جلالت و جوش کا مادہ قدرتی ہوتا ہے۔ خودداری اور عزت نفس ہر بدو کا آبائی ورثہ ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کر سکتا۔ آزادی کو وہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے اور اس کے تحفظ کی خاطر ہر قربانی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی دوستی اور دشمنی کھلی ہوتی ہے اور اس کا زبانی پیمان ہزار دستاویزات پر بھاری ہوتا ہے۔

موت: ——— بقیہ صفحہ ۱۸

اُٹھ کر اس نے ایک انگڑائی لی، اور کمان سا خم کھا کر دیر تک ایک دھندلی قوس کی طرح فضا میں معلق رہی، اور جب میری جمی ہوئی نظروں نے اس قوس میں سانپ کے سے بل ڈالنا اور اسے عجیب عجیب روپ دینا شروع کیا، تو میں نے تنگ آکر پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"کوئی کہاں تک تمہارے استغراق کے انجام کا انتظار کرے"۔ مگر یہ موت کی آواز نہیں تھی، "جب میں یہاں آئی، تو تم پر یہی حالت طاری تھی جب میری آنکھ لگی تو تم اسی عالم میں گم تھے، اور اب میری آنکھ کھلی ہے، تو تم اسی طرح خلا میں گھور رہے ہو"

"کلثوم" میں پکارا،

"ہمیں نیند آئی ہے، ہم چلتے ہیں" کلثوم انگڑائی کا خم توڑ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی،

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اسے اپنی طرف کھینچا، اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے ہار کی گھنگھریاں چھنکنے لگیں جیسے سب مل کر الاپ رہی ہوں ——— جئیں گے، ہم جئیں گے، ہم جئیں گے!"
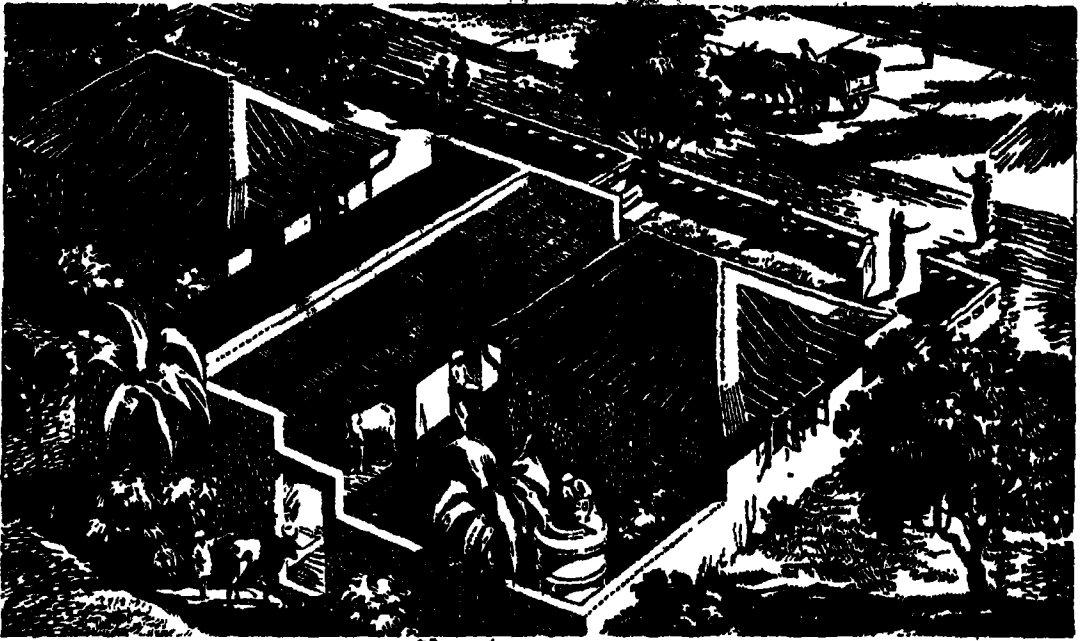
جدید مکانات کی تعمیر

انسانی ضروریات زندگی میں کھانے اور کپڑے کے بعد سب سے زیادہ اہمیت گھر کو حاصل ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آجکل لوگ گھر نہ ملنے کی تکلیف سے دوچار ہیں اور اس کے رفع کرنے کے لئے فوری اعانت کے خواستگار ہیں اس حاجت کی شدت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ برسوں تک لڑائی لڑنے کے بعد ہندوستان کے بہادر فوجی جوان اپنے لاتعداد دیہاتوں میں واپس آرہے ہیں قدرتی اور بجا طور پر انہیں اچھے معیار کے گھر اور گھریلو زندگی کی توقع ہوگی تاکہ وہ امن کا مفید اور تعمیری کام انجام دینے اور زندگی کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے آباد ہو سکیں۔

کانکریٹ صرف رئیسوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنی ذاتی پائیداری۔ کفایت شعاری۔ صلاحیت۔ آگ سے بچاؤ اور صفائی کی صفات کے سبب ہر خاص و عام کے لئے مفید ہے۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کے لئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا، ہوگنس وے نئی دہلی کے فنی ادارے کی اعانت حاصل کی جا سکتی ہے۔

خواہ آپ کا گھر امیر کا عالیشان محل ہو یا غریب کی کٹیا کانکریٹ کے ذریعے آسانی اور کفایت سے تعمیر ہو سکتا ہے۔

دی سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

ہندوستان اور کنیڈا کے مابین تجارت

(یہ اعداد و شمار انڈین ٹریڈ بلیٹن سے اخذ کئے گئے ہیں۔ تمام رقمیں امریکی ڈالروں کی صورت میں ہیں)

۱۔ کنیڈا سے باہر جانے والے مال میں ہندوستان کا حصہ:۔

ملک	۱۹۳۹	۱۹۴۴	۱۹۴۵
ریاست ہائے متحدہ	۳۸,۰۳,۹۲,۰۰۰	۱,۳۰,۱۳,۲۲,۰۰۰	۱,۱۹,۶۹,۷۷,۰۰۰
برطانیہ	۳۲,۸۰,۹۹,۰۰۰	۱,۲۳,۵۰,۳۰,۰۰۰	۹۶,۳۲,۳۸,۰۰۰
برطانوی ہندوستان	۵۱,۶۶,۰۰۰	۱۷,۴۷,۹۴,۰۰۰	۳۰,۷۴,۶۱,۰۰۰
اپنے ملکوں کا میزان	۴۳,۰۸,۰۷,۰۰۰	۱,۶۳,۱۴,۵۱,۰۰۰	۱,۴۸,۶۸,۴۸,۰۰۰
غیر ملکوں کا میزان	۴۹,۴۱,۱۹,۰۰۰	۱,۸۱,۹۵,۰۲,۰۰۰	۱,۷۳,۱۴,۸۲,۰۰۰
برآمد کا کل میزان	۹۲,۴۹,۲۶,۰۰۰	۳,۴۳,۹۹,۵۳,۰۰۰	۳,۲۱,۸۳,۳۰,۰۰۰

۲:۔ کنیڈا میں باہر سے آنے والے مال میں ہندستان کا حصہ:۔

ملک	۱۹۳۹	۱۹۴۴	۱۹۴۵
ریاست ہائے متحدہ	۴۹,۶۸,۹۸,۰۰۰	۱,۴۴,۷۲,۲۶,۰۰۰	۱,۲۰,۲۴,۱۸,۰۰۰
برطانیہ	۱۱,۴۰,۰۷,۰۰۰	۱۱,۰۵,۹۹,۰۰۰	۱۴,۰۵,۱۷,۰۰۰
برطانوی ہندوستان	۹۸,۰۸,۰۰۰	۲,۷۸,۷۸,۰۰۰	۳,۰۵,۶۸,۰۰۰
اپنے ملکوں کا میزان	۱۸,۸۹,۰۰,۰۰۰	۲۲,۰۳,۳۴,۰۰۰	۲۷,۱۶,۶۸,۰۰۰
غیر ملکوں کا میزان	۵۶,۲۱,۱۵,۰۰۰	۱,۵۳,۸۵,۴۴,۰۰۰	۱,۳۱,۴۱,۰۷,۰۰۰
درآمد کا کل میزان	۷۵,۱۰,۱۵,۰۰۰	۱,۷۵,۸۸,۷۸,۰۰۰	۱,۵۸,۵۷,۷۵,۰۰۰

۳۔ (ا) کنیڈا کی بیرونی تجارت میں برطانوی ہندوستان کا حصہ:۔

سال	کنیڈا کا درآمدی سامان برطانوی ہندوستان سے	کنیڈا کی مجموعی درآمد	مجموعی درآمد کا فیصدی
۱۹۳۰	۹۸,۰۸,۰۰۰	۷۵,۱۰,۵۶,۰۰۰	۱.۳
۱۹۴۰	۱,۶۰,۴۲,۰۰۰	۱,۰۸,۱۹,۵۱,۰۰۰	۱.۵
۱۹۴۱	۱,۷۸,۶۷,۰۰۰	۱,۴۴,۸۷,۹۲,۰۰۰	۱.۲
۱۹۴۲	۲,۱۳,۴۶,۰۰۰	۱,۶۴,۴۴,۴۲,۰۰۰	۱.۳
۱۹۴۳	۱,۷۰,۹۰,۰۰۰	۱,۷۳,۵۰,۷۷,۰۰۰	۱.۰
۱۹۴۴	۲,۷۸,۸۷,۰۰۰	۱,۷۵,۸۸,۹۸,۰۰۰	۱.۶
۱۹۴۵	۳,۰۵,۶۸,۰۰۰	۱,۵۸,۵۷,۷۵,۰۰۰	۱.۹

سال	کنیڈا کا گھریلو مال جو برطانوی ہندستان آیا	کنیڈا کے گھریلو مال کی مجموعی برآمد	اس مجموعی برآمد کا فیصدی
۱۹۳۹	۵۱,۶۶,۰۰۰	۹۲,۴۹,۲۶,۰۰۰	۰.۶
۱۹۴۰	۱,۱۲,۴۲,۰۰۰	۱,۱۷,۸۹,۵۴,۰۰۰	۱.۰
۱۹۴۱	۳,۸۰,۳۷,۰۰۰	۱,۶۲,۱۰,۰۳,۰۰۰	۲.۳
۱۹۴۲	۱۴,۷۸,۸۴,۰۰۰	۲,۳۹,۳۷,۷۳,۰۰۰	۷.۱
۱۹۴۳	۱۳,۴۵,۷۶,۰۰۰	۲,۹۷,۱۴,۷۵,۰۰۰	۴.۵
۱۹۴۴	۱۷,۴۷,۹۴,۰۰۰	۳,۴۳,۹۹,۵۳,۰۰۰	۵.۱
۱۹۴۵	۳۰,۷۴,۶۱,۰۰۰	۳,۲۱,۸۳,۳۰,۰۰۰	۹.۶

۳۔ (ب) کنیڈا کی بیرونی تجارت میں برطانوی ہندستان کا حصہ:۔

	۱۹۳۹	۱۹۴۰	۱۹۴۱	۱۹۴۲	۱۹۴۳	۱۹۴۴	۱۹۴۵
درآمد	پانچواں	پانچواں	چھٹا	تیسرا	چوتھا	تیسرا	تیسرا
برآمد	تیرھواں	آٹھواں	چوتھا	چوتھا	چوتھا	تیسرا	تیسرا
کل تجارت	نواں	چھٹا	پانچواں	چوتھا	چوتھا	تیسرا	تیسرا

رخصت کے بعد

اختر شیرانی

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!
میں نے اک لمحہ خوشی کا نہ گزارا ہمدم!
چھن گیا میری امیدوں کا سہارا ہمدم!
چھپ گیا میرے شبستاں کا ستارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

جب سے رخصت ہوئی وہ، رہتا ہوں دن رات اداس
دل میں ہیں شعلہ فشاں رنج و الم، حسرت و یاس
کوئی تسکیں نہ تسلی، کوئی امید نہ آس
کر گئے ہجر میں سب مجھ سے کنارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری آنکھوں میں مچلتی ہیں ادائیں کس کی؟
چٹکیاں لیتی ہیں سینے میں حیائیں کس کی؟
ہر گھڑی کان میں آتی ہیں صدائیں کس کی؟
ہر گھڑی کہتا ہوں یہ کس نے پکارا ہمدم؟
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری وحشت کو بڑھاتی ہے چمن کی صورت
دل کو تڑپاتی ہے شمشاد و سمن کی صورت
یاد آجاتی ہے اس غنچہ دہن کی صورت
بھولتی ہی نہیں نظروں سے یہ نظارہ، ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا، ہمدم!

اس کے جانے سے فضاؤں میں طراوت نہ رہی
باغ کا رنگ اڑا، پھولوں میں نکہت نہ رہی
جلوہ زارِ مہ و انجم میں وہ طلعت نہ رہی
بجھ گیا سب کے مقدر کا ستارہ ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

کبھی وحشت لیے پھرتی ہے خیابانوں میں
کبھی تکمیل جنوں ہوتی ہے ویرانوں میں
اور کبھی روتا ہوں جا کر شجرستانوں میں
کہ چمن میں نہیں کوئی چمن آرا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!
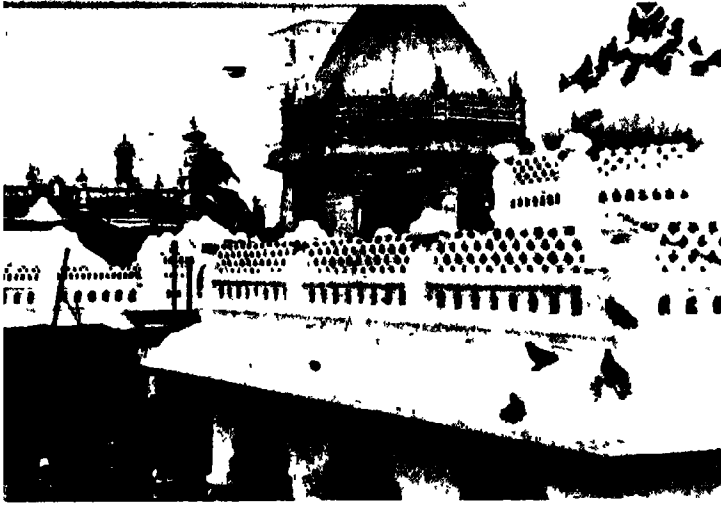
ناگور

ناگور جنوبی ہند کا ایک اہم اور مشہور شہر ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی مرکز ہے۔ وہاں کی مسجد شاہ ابوالحامد سے منسوب ہے جو میرن صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ مسجد انکے مزار پر تعمیر کی گئی ہے۔

سالانہ تہوار کے موقعہ پر میناروں پہ لگے ہوئے پرچم ہوا میں لہرا رہے ہیں۔

درگاہ شریف کا اندرونی احاطہ' چھتیر اور گنبد۔

مزار پر ہر سال ایک تہوار منایا جا ہے جس میں ہندو مسلمان امیر او غریب افسر اور ماتحت ہر مذہب ا ہر مرتبے کے لوگ حصہ لیتے ہیں پوری تفصیل جناب ایل۔ این۔ گبل ک مقالے میں ملاحظہ فرمائیں جو اس شمارے کے صفحہ ۴۹ پر شرنک اشاعت ہے

انبالہ امپلائمنٹ اکسچینج

۲۹ جولائی کو ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب نے انبالہ امپلائمنٹ اکسچینج کا معائنہ کیا۔ تصویر میں اسکے منیجر کپتان عبدالحکیم شیخ پٹیالہ کے ایک جرنلسٹ کا تعارف کرانے ہوئے گورنر صاحب سے باتیں کررہے ہیں۔ فوجی ملازمت سے الگ کئے ہوئے لوگوں کیلئے دوبارہ روزگار حاصل کرنے میں شیخ صاحب اپنی پر خلوص خدمات پیش کرتے ہیں۔

« شی اکنگ » کے مقابلے میں حصہ لینے کے لئے پہاڑ پر چڑھا جارہا ہے۔

طہران میں موسم سرما کے کھیل

ایرانیوں نے موسم سرما کے بہت سے کھیل سیکھ لئے ہیں۔ البرز پہاڑ کی لمبی ڈھلانیں اس مقصد کیلئے بہت مناسب ثابت ہوئی ہیں۔ جب میدان کی سڑی گرمی سے طبیعت اکتا جائے تو قدرتی طورپر پہاڑ کی فرحت بخش فضا میں چھٹیاں گذارنے کو جی چاہتا ہے۔ شروع میں روئی کے گالوں جیسی نرم برف پر بے ڈھنگے پن کے ساتھ لڑھک جانا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوتا کھلاڑیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انکے لئے تو یہ موقع ایک نعمت ہوتا ہے۔ تندرست اور توانا لوگ اونچائی اور نیچائی کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے خوب دوڑتے ہیں۔ بعض لوگ لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہیں۔ « شی اکنگ » کا کھیل جیسا کہ ان تصویروں سے ظاہر ہے ایران میں بھی بہت مقبول ہوگیا ہے۔ برف سے پٹے ہوئے پہاڑوں پر سینکڑوں ٹولیاں اس کھیل میں دلچسپی لیتی نظر آتی ہیں۔ یہ کھیل صرف انہی کے بس کا ہے جنکے جسم میں طاقت ہے اور جو توازن قائم رکھنے کے سلسلہ میں اپنے حواس پر قابو پاسکتے ہیں۔

« شی اکنگ » کا ایک مشہور کھلاڑی مسٹر « مفی امام » جو اس کھیل کے سلسلے میں میر میدان سمجھا جاتا ہے۔

بچوں کا سرکس

ان بچوں کے لئے سرکس کا ہر کھیل پر لطف

دو ماہر قلا باز جھولے پر اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔

جنگ کے بعد دس میں سے بہی چھ ہاتھی بچے تھے۔
وہ اپنا کرتب دکھا رہے ہیں۔

مصنوعی طور پر قد بڑھاکر کھیل
زیادہ دلچسپ بنایا جارہا ہے۔

جنگ کے باعث برطانیہ کے بعض
س بچوں کو سرکس دیکھنے کا کبھ
موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے موسم سر
میں جب بعد جنگ کا پہلا سرک
گلاسگو میں کھلا تو بچوں کے ذ
و شوق کی کوئی انتہا نہ رہی۔
تصویریں اسی موقع پر لی گئی تھیں

مٹی بہہ جانے کے باعث اس درخت کی جڑیں دکھائی دینے لگی ہیں۔ اسطرح درخت کی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے۔

قاعدے کے مطابق زراعت

کھار کے باعث زمین کا بنجر یا بیکار ہوجانا ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ مشرق وسطی اور امریکہ میں بھی بہت سی زمینیں جو آج صحرا بنی ہوئی ہیں کسی زمانے میں دنیا کی زرخیز ترین زمینوں میں شمار ہوتی تھیں۔ زمین میں کھار پیدا ہو جانے کے دو سبب ہیں۔ جنگل کا چھدرا ہو جانا یا ضرورت سے زیادہ جانوروں کو چرائی کے لئے چھوڑ دینا۔ درختوں کو کاٹ کر چراگاہیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن جانوروں کے روندے جانے سے مٹی پولی ہوکر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑ جاتی یا بارش کے پانی کے ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ بعض دفعہ لا پرواہی کے ساتھ کاشتکاری

تین سال پہلے درخت اور جھاڑیاں لگاکر اس بند کو زیادہ مضبوط بنایا گیا تھا۔

یہ نصف میل لمبی منڈیر صرف ایک دن میں بنائی گئی ہے۔ زمین کی خرابی کو اسطرح بھی روکا جا سکتا ہے۔

کر لینے پر بھی یہی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ان خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ نئے درخت لگائیں اور بند لگاکر زرخیز مٹی کو بہہ جانے سے روکیں۔ تمام ہندوستان میں اس قسم کے تجربات عمل میں لائے جارہے ہیں۔ خصوصاً بیجاپور میں بڑی کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ وہاں یہ ثابت کر دکھایا گیا ہے کہ پچھلی لاپرواہیوں کے اثرات دور کرنے اور مزید نقصانات کی روک تھام کیلئے کیا کیا صورتیں اختیار کرلی چاہئیں۔ چنانچہ وہاں بہت سی بنجر زمینیں زرخیز بنادی گئی ہیں۔

بیجاپور میں ایک پرانے محل کی چاردیواری اس قطعۂ ز
کیلئے ایک قدرتی بند ثابت ہوئی جس پر جوار کی
شاداب کھیتی لہلہا رہی ہے۔

محکمہ جات جنگلات و زراعت کے چند افسران اعلی
کسانوں کے ساتھ کھیتوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے
مفید گفتگو کر رہے ہیں۔ (دائیں طرف) اس تصویر
دکھایا گیا ہے کہ بند لگانے اور کھیتوں میں نالیاں
دینے سے بارش کا پانی کس طرح رک جاتا ہے

بیجاپور بلگاؤں اور دھاروار ضلعوں کے ' مدرسہ اصلاح اراضیات ' کے
افسر اعلی اپنے شاگردوں کو مرتبہ خاکے کی مدد سے پوری تفصیل
کے ساتھ سمجھا رہے ہیں کہ کام کس طرح شروع کیا جائے۔

نقشہ بنانے والے اپنے کام میں محو ہیں۔ ' مدرسۂ اصلاح اراضیات '
میں یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
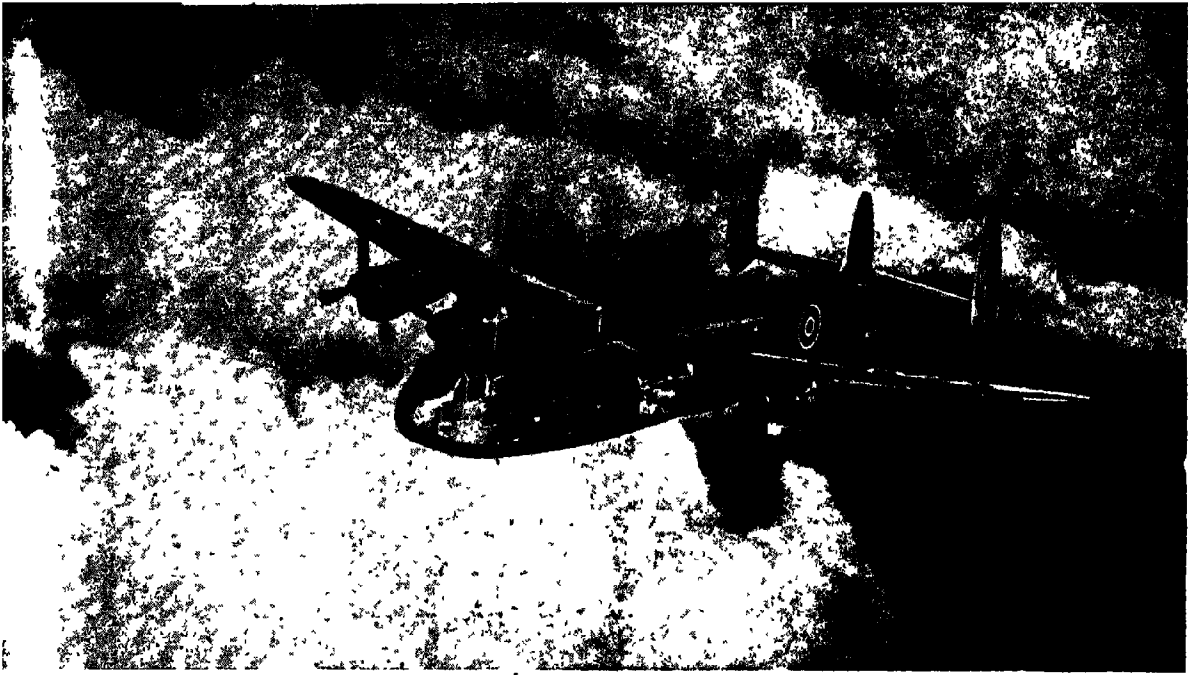
«ایورویورک» نامی ہوائی جہاز جو «ایورو لنکا سٹر» کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اس وقت یہ سلطنت برطانیہ کے تمام راستوں پر چل رہا ہے۔

فضائی حمل و نقل مستقبل قریب میں

برطانیہ نے زمانۂ جنگ میں جو ہوائی جہاز بنائے تھے وہ اب شہری ضروریات پوری کرنے میں بڑی مدد دینگے۔ اس کے علاوہ نت نئے تجربات کے بعد جو نمونے تیار ہوئے ہیں وہ زیادہ باربرداری اور تیز رفتاری کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب انکو پیش نظر رکھتے ہوئے مزید ترقیاں عمل میں آ رہی ہیں۔ کوشش کی جائیگی کہ ہر قسم کا آرام حاصل کرنے کے علاوہ مسافر ہر قسم کے موسمی اثرات سے بچے رہیں۔

ایک متوسط درجے کی لمبائی چوڑائی کے ہوائی جہاز «وکرز وائکنگ» کا آرام دہ اندرونی حصہ۔ اس میں ۲۱ سے ۲۷ تک مسافر آسکتے ہیں۔
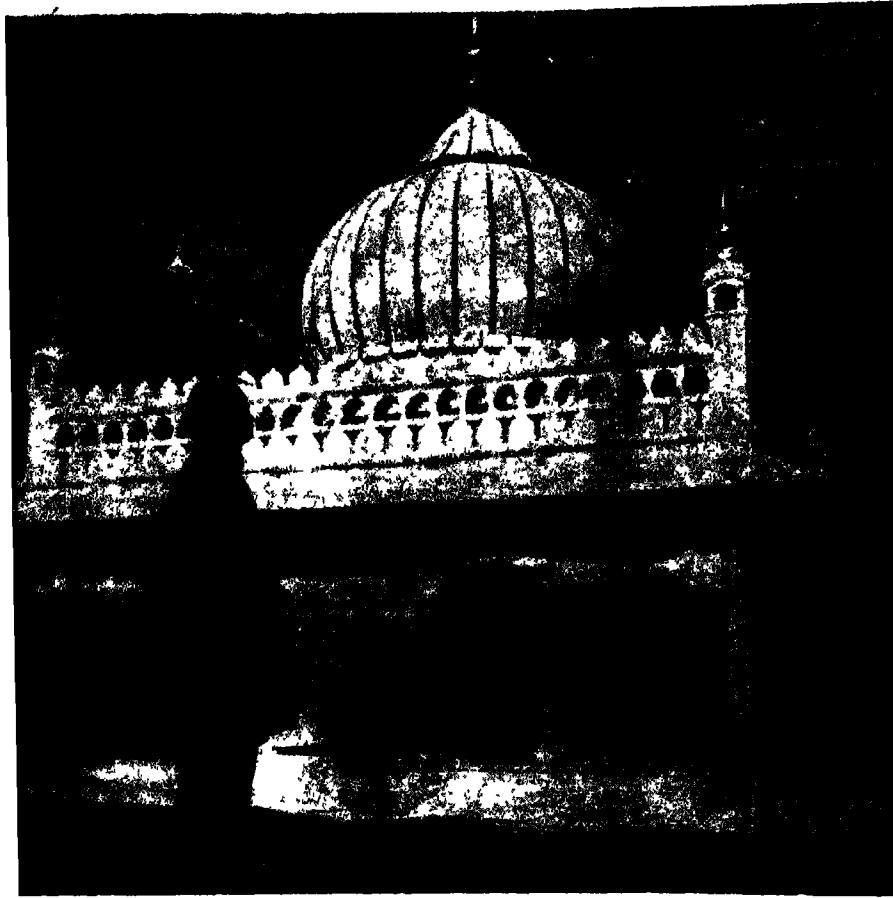
درگاہ شریف
نظام الدین
اولیاء

دھلی میں حضرت سلطان المشائخ سید نظام الدین اولیا علیہ الرحمتہ کی آخری آرامگاہ۔

حضرت نظام الدین علیہ الرحمتہ
ستانہ شریف شہر دھلی سے تقریباً
میل کے فاصلے پر واقع ہے جو
ذھب و ملت کے عقیدتمندوں کے
ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ حضرت
ھ میں تولد ھوئے اور ۷۲۵ھ میں
وفات پائی۔ زندگی ہی میں آپکے
مند ملک بھر میں موجود تھے
اب سوا چھ سو سال گذرنے کے
انکا شمار بھی مشکل ہے۔ آپ کے
مبارک پر ھر سال ربیع الثانی کے
مہینے میں سترہ تاریخ کو ایک بڑا
بھاری عرس ھوتا ھے، جس میں دور
دور سے آکر لوگ شریک ھوتے
ھیں۔ عرس کے موقعہ پر فاتحہ شریف
کے علاوہ سب سے زیادہ اھمیت قوالی
کو حاصل ھے۔ جس کا اھتمام درگاہ
کے موجودہ سجادہ نشیں شمس العلما
حضرت خواجہ حسن نظامی فرماتے
ھیں۔ موصوف خود بھی ایک معزز
اور مقدس ھستی ھونے کے علاوہ
صاحب علم و فضل ھیں۔

حضرت سلطان اولیاء کا ایک عقیدت مند پھولوں کی ٹوکری مزار مبارک پر چڑھانے کیلئے مجاور کی خدمت میں پیش کر رہا ھے۔

مہتاب — ایک فلمی ستارہ۔

ایثار

مصنفہ
قسطنطین طرنوف

مترجمہ
بشیر حسن

ٹینک چلانے والا الیکسی جس سڑک پر جا رہا تھا وہ اب خشک ہو چکی تھی۔ گھاٹیوں کی گذشتہ سال کی خشک گھاس میں سے ہری ہری گھاس پھوٹ رہی تھی۔ الیکسی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہاں ابھی تک خندقوں کے نشانات اور ٹوٹی ہوئی موٹر گاڑیوں کے ڈھانچے دکھائی دے رہے تھے اسکو اپنا گاؤں بھی نظر آ رہا تھا۔ اوپر پہنچکر الیکسی سانس لینے کے لئے ٹھہر گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا یہ تو اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ گاؤں تباہ ہو چکا ہے اور راستے میں بھی اس نے بہت سے گاؤں اور قصبے تباہی کی حالت میں دیکھے تھے۔ اسکا اپنا گاؤں بھی اسی تباہی کا شکار بن چکا تھا جہاں سوائے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اس نے اپنی آستین سے آنسو پونچھے جو اس کے زخمی رخساروں پر ڈھلک آئے تھے جسطرح دشمن نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا ٹھیک اسی طرح گاؤں کی بھی حیثیت بگاڑ دی تھی۔ گاؤں کی مرمت ہو سکتی تھی۔ جلے اور ٹوٹے پھوٹے مکانات سب نئے سرے سے بنائے جا سکتے تھے لیکن اسکے چہرے کا جو حال ہونا تھا ہو گیا اسکی درستی ناممکن تھی۔

یہ ہسپتال سے سیدھا اپنے گھر جا رہا تھا۔ یہ اس کو یاد نہ تھا کہ ہسپتال کیونکر پہنچا تھا۔ اس کو صرف اتنا یاد تھا کہ دریا کو پار کرنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔

دریا پار کرتے ہی یہ اپنی ٹینک لیکر جرمنوں کے لشکر پر پل پڑا جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنی ٹینک میں ایک آنکھوں کو خیرہ کرنے والا شعلہ دیکھا بس اس کو صرف اتنا ہی یاد تھا۔ یہ اس لڑائی کے انجام کو نہ دیکھ سکا۔ البتہ ہسپتال میں اسے مزید حالات معلوم ہو گئے تھے۔ اسکا چہرہ جھلس کر گوشت دکھائی دینے لگا تھا ہسپتال میں اس کے چہرے پر کچھ اس کی اپنی اور کچھ کسی اور کی کھال چڑھا دی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ٹانکے لگائے گئے تھے۔ دھات کا گلا لگا دیا گیا تھا اور مصنوعی آنکھ چڑھائی گئی تھی۔ یہ سب ہونے کے بعد اسے آرڈر آف لینن اور سونے کا تمغہ ہسپتال میں ہی عطا کیا گیا تھا اسکا گلا بیٹھا ہوا تھا اور آواز بالکل بدل گئی تھی۔ اس کے چہرے کی ہیئت بالکل دگرگوں ہو گئی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اپنی شکل خود نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرف ڈھلان پر سے اترا اور جب ذرا آگے بڑھا تو اس نے ایک مرد کو دیکھا جو اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے کسانوں کو نہایت انہماک سے کچھ لیکچر دے رہا تھا۔ جب الیکسی اس شخص کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ تو اسکا پرانا دوست کھرتش تھا وہ کھرتش اور اس کے مجمع کے پاس پہنچا۔ ان میں کچھ بعض نے مڑ کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ الیکسی نے خاموشی سے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ جب وہ ایک اور مجمع کے پاس سے گذر رہا تھا تو اس نے لسیّا کا نام سنا۔ اس نام کو سنتے ہی غیر ارادی طور پر وہ ٹھٹھک گیا اور اسکا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد لسیّا کا نام "اجتماعی کھیت" کے صدر کی حیثیت سے لیا گیا اب وہ وہیں جم گیا۔ یہاں سے اسے اپنی جھونپڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ انتہائے شوق کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ دو قدم اور آگے بڑھا اور اسے سرکنڈے کے درخت کے نیچے جس کی شاخ ٹوٹی ہوئی تھی اپنی صاف ستھری سنہ چھپر والی جھونپڑی دکھائی دی۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جسے سوتے جاگتے آرام میں اور لڑائی میں دیکھا کرتا تھا۔ وہی دروازہ تھا جس میں وہ ہمیشہ داخل ہوا کرتا تھا۔ الیکسی نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں ایک ہل اور ایک ہتھوڑا رکھا تھا پیچھے کے کمپاؤنڈ سے ایک بوڑھی عورت اس سے ملنے آئی۔ یہ اس کی ماں تھی جسے وہ اس کی آنکھوں سے پہچان گیا۔ "سلام" الیکسی نے اپنی گرفتہ آواز میں کہا۔

"سلام" عورت نے جواب دیا اور پوچھا کہ "کیا تم لسیّا سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں لسیّا اور آپ دونوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں الیکسی کے پاس سے ایک خوشی کا پیغام لے کر آیا ہوں"۔

لڑکے کا نام سنتے ہی ماں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور آنسو بھر آئے "ارے میرے بچے! اب کہاں ہے وہ تم اس سے کہاں ملے تھے؟ ہسپتال میں یا کہیں اور؟"

"ہاں میں اس سے ہسپتال میں ملا تھا اور ہم دونوں دوش بدوش لڑائی میں بھی ساتھ تھے۔ اس کے بیوی بچے کس طرح ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے سب اچھی طرح ہیں" یہ کہہ کر بڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائیں یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اسکی حالت اتنی خطرناک نہیں ہے۔ صرف معمولی سا زخم آیا ہے اسے بہت جلد ہسپتال سے چھٹی ملنے والی ہے۔ یہ تو بتائیے اس کے بیوی بچے ہیں کہاں ؟" الیکسی نے پوچھا۔

نسیا تو تمام دن کھیت پر رہتی ہے اور کبھی اور کاموں میں رہتی ہے۔ سب مل کر اسے کچھ بنا رہے ہیں اور کل یا پرسوں سب کھیت پر بیج ڈالنے جائیں گے۔ میرا پوتا ستا کی اور پا بھی ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ صرف چھوٹی بچی نتا سا گھر میں ہے تم اندر آؤ۔ کچھ دیر آرام ہی کر لو۔" یہ کہہ کر ماں نے دروازہ کھول دیا وہ دروازہ جسے وہ بچپن سے جانتا تھا اور اندر بلا لیا۔ اندر کی مانوس خوشبو اس کے لئے شام رنج سے زیادہ معطر تھی۔ کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی بچی بنچ پر بیٹھی چیتھڑوں سے کھیل رہی تھی۔ گو یہ بچی دبلی اور لمبی تھی مگر آنکھیں ہو بہو ماں کی طرح تھیں۔ اس لئے یہ پہچان گیا ورنہ پہچاننا مشکل تھا۔ سب سے پہلے وہ لڑکی کے پاس پہنچا۔ لڑکی کونے میں دبک گئی اور خوفزدہ آنکھوں سے اسے گھور گھور کے دیکھنے لگی۔

"ننھی ڈرو مت" دادی نے اسے سمجھایا۔ "یہ تو تمہارے چچا ہیں ابا کے پاس سے آئے ہیں" "اور کھلونے بھی تو لائے ہیں۔" الیکسی نے کہا اور فوراً اپنا تھیلا کندھے پر سے اتارا اور اس میں سے کھلونے وغیرہ نکالے جو ہسپتال میں بچوں کے لئے ملے تھے۔ بچی کو دینے چاہے مگر بچی نے نہ لئے وہ کسی قدر خوفزدہ ہو رہی تھی۔

"اے بچی آخر اسقدر پریشانی کی کیا بات ہے" دادی بولی "دیکھ تو سہی تیرے باپ کو تیرا کتنا خیال ہے تو بھی تو ہر وقت باپ کو یاد کرتی رہتی ہے" اور پھر الیکسی کی طرف دیکھکر اس نے کہا "بس بچھونے سے اٹھتے ہی یہ باپ کی تصویر لے کر بیٹھ جاتی ہے اور جب تک کہ باپ کی تصویر کو پیار نہ کرے کبھی سوتی نہیں۔ زراعت کے دفاتر میں باپ کی تصویر دیکھکر تو بس پھولوں نہیں سماتی تھی۔"

الیکسی نے فیتوں اور کاغذ کے پھولوں سے سجی ہوئی اپنی تصویر دیکھی۔

"کیا اب بھی میرا بیٹا ایسا ہی لگتا ہے جو تصویر اس کی دفتر میں ہے۔ وہ بالکل اصل کی مانند ہے؟"

"دفتر تو وہی پرانی جگہ پر ہے نا ؟"

"نہیں۔ جرمنوں نے سکول اور کتب خانہ وغیرہ سب جلا کر خاک کر دیا۔ اب ہم لوگوں نے پھر بنانا شروع کیا ہے۔ نسیا بچاری بھی رات دن اسی میں لگی رہتی ہے۔

الیکسی جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"اتنے جلدی کیوں جاتے ہو؟"

"مجھے نسیا سے بھی تو ملنا ضروری ہے اسے ایک پیغام بھی پہنچانا ہے۔"

بازار میں پہنچکر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ صدر سے کہاں ملنا ہو سکتا ہے مگر یقین سے کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ صدر صاحبہ مل کہاں سکتی ہیں۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری وہ برابر ڈھونڈھتا رہا۔ اچانک ایک احاطے میں چار دیواری کے پیچھے سے ایک عورت کے قہقہے کی آواز آئی جسے سنتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ یہ تو وہ ہنسی کی آواز تھی جو ہوائی جہاز کی گھنگھناہٹ اور بموں کے پھٹنے کی آوازوں میں اس کے کانوں میں گونجا کرتی تھی۔

الیکسی اس احاطے کو خوب پہچانتا تھا یہ اس کے دوست پتول کا احاطہ تھا۔ وہ مڑا اور جلدی سے دروازے میں گھس گیا اور دیکھا کہ سامنے وہ کھڑی تھی اور پتول بھی پاس کھڑا تھا جسکے چہرے پر وہی نوجوانی کی خوشباش مسکراہٹ تھی۔ اب آہستہ آہستہ اس نے انکی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جونہی نسیا نے اسے دیکھا اسکی ہنسی ہمدردی سے بدل گئی۔ وہی ہمدردی جو وہ غیروں کے چہرے پر دیکھ چکا تھا۔ نسیا کی یہ ہمدردی اس کے دل پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے ملنے آگے بڑھا اس سے ملنے کے انتظار میں نسیا کی کمانی دار بھوئیں تعجب سے اوپر کو چڑھ گئیں۔ یہ بات کرنی چاہتا تھا مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔

آپ ..... ہی ..... نسیا ہیں" اس نے پوچھا۔

"جی۔ کیا بات ہے ؟"

کئی لمحوں تک وہ اس کے چہرے کو محو حیرت دیکھتی رہی۔ کیا خوفناک لمحات تھے وہ جن پر اسکی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا دار و مدار تھا۔

"میں آپ کے پاس ایک خط اور خوشی کا پیغام لایا ہوں۔"

"کس کے پاس سے؟"

"الیکسی کے پاس سے جو ہسپتال میں ہے۔"

الیکسی کا نام سنتے ہی اس کی بیوی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ الیکسی نے جیب سے وہ خط نکالا جو اس نے سٹیشن پر لکھا تھا اور سراسیمہ ہو کر اپنی بیوی کو دیدیا۔ بیوی نے جلدی سے خط پڑھکر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اس نے اپنے آخری خط میں یہ لکھا تھا کہ وہ ہسپتال سے تھوڑی سی چھٹی لے کر گھر آئے گا۔" بیوی نے افسردگی سے کہا "لیکن اب اس نے لکھا ہے کہ وہ پھر محاذ پر جا رہا ہے آپ کون ہیں کیا آپ بھی اس کے ساتھ ہی ہسپتال میں تھے؟"

"ہاں ہم دونوں ساتھ تھے۔ ہم دونوں لڑائی میں ایک ہی ساتھ زخمی ہوئے تھے۔"

"تو آپ دونوں لڑائی کے ساتھی ہیں۔"

"جی ۔میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں ایک ہی ٹینکوں کے دستے میں تھے، ایکے معمولی ساز خم آیا"

"اور آپ کے"

"میں جل گیا تھا جیسا آپ دیکھ رہی ہیں مگر ہسپتال والوں نے مجھے ٹھیک کر ہی دیا۔" اسی اثنا میں کچھ اجتماعی کسان نسیا سے کسی مسئلے پر گفتگو کرنے آئے۔ اس نے فوراً انھیں کچھ ضروری ہدایات دیکر رخصت کیا اور پھر الیکسی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی "میرے خاوند کے ساتھی اب آپکا کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں..... اپنے..... گھر..... ڈون لبسی میں جاؤں گا۔ میں تو صرف یہاں یہ خط اور خوشخبری دیتے اترا تھا۔"

"میں آپ کی خاطر خواہ تواضع نہ کر سکی۔ اور نہ آپ کے ساتھ زیادہ وقت گذار سکی۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ موجودہ حالات دیکھتے ہوئے مجھے ضرور معاف کر دینگے۔ بہر حال ہمیں کچھ باتیں تو کرنی چاہیئے ہیں۔ کیا آپ ہمارے گھر چلکر کچھ دیر آرام نہ کریں گے؟"

"آپکی مہمان نوازی کا شکریہ لیکن مجھے ابھی اسٹیشن پر جانا ہے ورنہ میں شام کی گاڑی سے سوار نہ ہو سکوں گا"

"مگر آپ دوسری ٹرین سے بھی تو جا سکتے ہیں۔ اتنی دیر آرام کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ میں ابھی آپ کو اپنے ساتھ لے چلتی ہوں۔ گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔"

"آپ کے گھر تو میں پہلے ہی ہو آیا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ تب تو میں دفتر بھی جا سکتی ہوں۔ آپکو میرے ساتھ پیدل چلنے میں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ راستے میں ہم باتیں بھی کر لیں گے۔"

لیکن راستے میں نسیا کے ملنے والوں کی وجہ سے ان دونوں کو باتیں کرنی مشکل ہو گئیں۔ راستے میں بہت سے لوگ ایسے ملے جنھیں الیکسی عرصے سے جانتا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا جس وجہ سے دوران جنگ میں پہلی بار الیکسی کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے ہی وطن میں غریب الوطن ہے۔ کبھی کبھی نسیا کو بھی کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا جس کا چہرہ اب پہلے ہی جیسا بشاش اور منور معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں میں وہی چمک تھی اور لبوں پر مستقل مزاجی کی مسکراہٹ تھی۔ یہ دیکھکر الیکسی کے دل کا بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

دفتر میں اس نے اپنی رنگین تصویر دیکھی مگر اب تصویر میں اور اس میں زمین اور آسمان کا فرق آچکا تھا۔ تصویر میں جوانی تھی، مسکراہٹ تھی۔ رخساروں پر سرخی تھی اور گھونگر والے بال تھے اسکو یہ احساس ہو رہا تھا کہ گویا اسکی تصویر زبان حال سے اس کی حالت پر خندہ زن ہے۔

"آپ ایلائی آدشا (الیکسی) کے دوست اور لڑائی کے شریک ہیں"۔ نسیا نے سب سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

سب نے اسے مصافحہ کرنے اور حالات پوچھنے کے لئے گھیر لیا۔ ان میں سے اکثر کو یہ خوب جانتا تھا۔

اسی اثناء میں اجتماعی کسانوں کی ایک جماعت نے بہت سے معاملات طے کرنے کے لئے نسیا کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

الیکسی بغیر کسی سے ملے جلے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چل پڑا کسی کو بھی اس کے جانے کا احساس نہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔

جب وہ کنویں کے پاس سے گذر رہا تھا تو ایک بچے نے اسے پکارا۔

"سپاہی کیا تم ہی میرے باپ کے پاس سے آئے ہو؟" یہی اسکا چھ سالہ لڑکا ستائی ادیا تھا۔ اسکا چہرہ اب پہلے سے نحیف معلوم ہوتا تھا۔ ہونٹوں پر پیاری پیاری دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں وہ جدائی کا وقت یاد ہے جب یہ اپنے باپ سے لپٹ گیا تھا آنسوؤں سے چہرہ تر تھا اور رو رو کر کہہ رہا تھا" ابّا! ابّا! لڑائی سے جلدی آنا"

یہ دونوں گھر کی طرف چلے۔ راستے میں الیکسی نے پوچھا "تم نے یہ کیسے جانا کہ میں تمہارے باپ کے پاس سے آیا ہوں"

"اس لئے کہ دادی اماں کہہ رہی تھیں کہ کوئی خوفناک چہرے والا آدمی ابّا کے پاس سے آیا تھا۔

"کیا میرا چہرہ خوفناک معلوم ہوتا ہے"

"نہیں، خوفناک تو صرف نازی ہیں۔ انھوں ہی نے تو تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہوگا"

"ہاں نازیوں نے"

"تم ابّا سے ملے تھے"

"ہاں ملا تھا"

"اور تم نے ابّا کا اعزازی تمغہ اور ستارہ بھی دیکھا تھا"

"ہاں"

"تمہارے پاس بھی تو اعزازی تمغہ ہوگا نا؟ ابّا کیا جلدی گھر آجائیں"

"تم انھیں بہت یاد کرتے ہو"

"بے شک"

"کیا تمہیں یاد ہے جب وہ لڑائی پر گئے تھے"

" جناب آپ کیا سمجھتے ہیں! میں تو بہت رویا تھا۔ انھوں نے مجھے اُچھالا اور چکر دیئے مگر میں روتا ہی رہا کیونکہ مجھے جب تک یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے بہادر بننے والے ہیں۔ اس کے علاوہ سب رو رہے تھے صرف ثاشا تو روئی نہیں کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ جب جرمن یہاں تک بھی آگئے تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھی۔"

گھر پہنچکر الیکسی نے ستائی اوپا کو باپ کے بھیجے ہوئے تمغے دیئے اور پھر یہ دونوں کھیت میں چلے گئے۔ آج سے دو سال قبل جب وہ ان کھیتوں سے رخصت ہو رہا تھا تو یہ اناج کا سنہری لہریں مارتا ہوا سمندر تھا جس کی بالیں اسے لمبے اور خطرناک سفر پر جاتے ہوئے جھک جھک کر سلام کر رہی تھیں۔ اب یہ کھیت تک فاصلہ طے کرکے پہنچا اور کھیت کی مانوس پگڈنڈیوں پر سے چلا۔ وہی بالیں پھر اسکا انتظار کر رہی تھیں۔ یہی ان کا نوکر تھا یہی ان کا آقا تھا دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کا خیرمقدم کر رہے تھے۔ اس تمام وقت میں ستائی اوپا اس سے اپنے باپ کے کارناموں کے قصے سنتا رہا۔ اس نے بہت اختصار سے کام لیا لیکن جب اس نے لڑکے کے چہرے کو دیکھا تو اسکا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جب الیکسی قصہ ختم کرچکا تو لڑکے نے اپنے رخسار کو الیکسی کے کوٹ سے رگڑتے ہوئے کہا کہ

"میں انتقام ضرور لوں گا۔"

الیکسی اب یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی ٹانگیں اسے گھر سے دور لے جانے میں اسکا ساتھ دیگی۔ الیکسی نے اب ایک پھاوڑا اٹھایا اور اپنے باغیچے میں نئے پودے لگانے کے لئے گڑھے کھودنے شروع کئے۔ اس عرصے میں اس کی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی: "بیٹا! میں تم کو دروازے میں سے دیکھ رہی تھی کیا بتاؤں مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا ایلائی اوشا (الیکسی) کھڑا ہے۔ تمہاری پیٹھ اور تمہارے کام کرنے کا طریقہ بالکل میرے بیٹے سے ملتا ہے۔ بیٹا کیا تمہارے بیوی بچے ہیں"؟

"ہاں اور میری ماں بھی ہے۔"

"کتنی خوش ہوگی وہ جب تم اس سے ملوگے۔ اب بیچاری تمہاری جدائی میں آنسو بہا رہی ہوگی۔"

"لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ بیچاری اپنی باقی زندگی آرام سے گذار دے۔"

"لیکن بھائی! جب دل صدمے سے بجھ جائے تو آرام کہاں۔"

"مگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے تو بہرحال دل کا بجھنا بہتر ہے۔"

"ہاں...... ہوگا! رونا تو اس دن کا ہے جس دن میں نے ایسے برے دن دیکھنے کے لئے جنا تھا"۔ بوڑھی عورت نے آہ بھر کر کہا۔

"اس نے تو یہ دن اپنے ملک کی عزت بچانے اور ملک کو جرمنوں سے نجات دلانے کے لئے دیکھا ہے۔"

اسپر بوڑھی عورت نے اپنے آنسو آستین سے پونچھتے ہوئے کہا

"جانے دو اس قصے کو اور آؤ بیٹا کھانا کھاؤ۔"

"لیکن یہ تو بتلایئے لسیا میکھے لوانا کہاں ہے؟"

"اکثر وہ شام کو گھر نہیں آتی اور کئی دفعہ بغیر کھانا کھائے ہی چلی جاتی ہے۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔ ایک سیب کا درخت اپنی یادگار چھوڑنے کے لئے لگا دوں۔"

ماں چلی گئی اور الیکسی درخت کے لئے گڑھا کھود کر باغیچے میں کیاریاں کھودنے لگا جب شام ہونے آئی تو اس نے لسیا کو پیول کے ساتھ احاطے میں آتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ دونوں احاطے کے کونے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے کانوں میں اس کی بیوی کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔ ان دونوں نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ باتیں کرنے کے بعد پیول چلا گیا اور لسیا گھر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ستائی اوپا بھاگتا ہوا اسے کھانے پر بلانے کے لئے آیا۔ جب یہ گھر پہنچا تو لسیا کو جلدی جلدی کھانا کھاتے دیکھا۔ اب اس کی بیوی نے اس سے الیکسی کی صحت اور موجودہ کیفیت کے متعلق تفصیل سے حالات پوچھنے شروع کئے۔

"لیکن آپ اسے اتنے کم خط کیوں لکھتی ہیں؟"

"مجھے فرصت کم ملتی ہے۔" اس نے ترشروئی سے جواب دیا۔

"لیکن آپ کو جتنے خط لکھنے چاہئیں اتنے نہیں لکھتیں۔"

"آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم لوگ آجکل کتنے عدیم الفرصت ہیں۔ بس ہوا کی طرح دن گذر جاتا ہے۔"

ان باتوں کے دوران میں کسی تکلیف دہ خیال سے الیکسی کی آواز بھرّا گئی جب اس نے کہا: "لیکن آپ کو احاطے میں ہتوڑے پر بیٹھ کر باتیں کرنے کا خوب وقت مل جاتا ہے!"

اس خیال کے ساتھ وہ اپنی معمول سے زیادہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا چلا گیا "خیر! آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ! اب میرے اسٹیشن جانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

"اتنی دیر سے اب جانے کی کیا ضرورت ہے؟" لسیا نے اب نرم لہجہ میں کہا "ذرا باہر کی طرف دیکھئے شام ہوگئی ہے آج رات ہمارے مہمان رہیئے۔"

بیچارہ الیکسی گھر چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا مگر ستائی اوپا نے آکر اسے

پکڑ لیا اور رات کو ٹھیرنے اور اپنے باپ کے متعلق مزید حالات سنانے کے لئے مجبور کرنے لگا۔

"آپ نے دیکھا؟" نُسیا نے کہا "اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں کچھ اور باتیں سنوں۔ آج تو ٹھیر ہی جائیے۔" اس نے نرمی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا جبکہ وہ دروازے میں سے گذر رہی تھی "میں آپ کو کسی طرح خدا حافظ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔"

کچھ دیر بعد رات ہوگئی۔ الیکسی کی ماں نے اسکا بستر تیار کر رکھا تھا وہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا لیکن جونہی وہ بستر پر لیٹا، نُسیا کی بستر پر جاتے وقت پیروں کی آواز آئی۔

اس نے آدھی رات تک سونے کی کوشش کی مگر اسے نیند نہ آئی وہ اپنے بستر سے اٹھکر سننے لگا۔ اس نے نُسیا کے کروٹیں بدلنے کی آواز سنی کیونکہ وہ بھی اب تک جاگ رہی تھی۔ پھر اس نے نُسیا کی سرد آہ کی آواز سنی۔ اسکے لئے بغیر کسی کے معلوم ہوئے چلے جانا ناممکن تھا وہ اپنے بچوں اور ماں کے سانس کی آوازوں کو بھی پہچان رہا تھا۔ ان کا کیا حشر ہوگا۔ بچوں کے خیال سے کوئی ٹیس نہیں تھی بلکہ وہ ایک درد تھا لامتناہی ایسا درد جو رات کی طوالت کے ساتھ طول کھینچ رہا تھا۔ آخر کار موسم بہار کی چھوٹی رات ختم ہوئی اور صبح کی مدھم روشنی نمودار ہونے لگی۔ اب بستر سے اٹھنے کا وقت ہوگیا تھا۔ پہلے ماں اس کے بعد نُسیا اٹھی۔ الیکسی پردے کے پیچھے سے اٹھکر آیا اور سب کو صبح کا سلام کیا۔

"آپ اتنے سویرے سے کیوں اٹھ گئے۔ ابھی کچھ دیر اور آرام کر لیتے۔" نُسیا نے کہا۔

"انھیں آرام کی نیند کہاں آسکتی ہے پرایا گھر نئی جگہ" ماں نے سرد آہ بھر کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"ہم تم کو اسٹیشن تک پہنچا دینگے۔" نُسیا نے کہا۔

"اسٹیشن تک آپ کہاں جائیں گی؟" الیکسی نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو بارہ میل کا فاصلہ طے کرکے ہم سے ملنے آئے۔" نُسیا نے کہا "اور اس کے علاوہ مجھے سٹیشن پر کچھ کام بھی ہے۔ پیول رات کو یہاں آیا تھا۔" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا "اور کہتا تھا کہ اسکو ضلع کے صدر مقام جانا اشد ضروری ہے۔" پھر اس نے الیکسی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اب کچھ ناشتہ کرلو۔ تھوڑی دیر میں پیول گھوڑا گاڑی لے کر آنے ہی والا ہے۔"

اب الیکسی اور نُسیا میز پر بیٹھ کر جلدی جلدی بغیر بات کئے کھانے لگے۔ الیکسی کی ماں گھر کے کاموں اور اس کے ناشتہ دان میں کھانا بھرنے میں مصروف ہوگئی۔ اب ستائی اوپا بھی اٹھ گیا تھا۔

"اچھا ستائی اوپا خدا حافظ۔" الیکسی نے کہا "مجھے بھول نہ جانا۔ شاید پھر ملیں۔"

"آپ جا کیوں رہے ہیں" ستائی اوپا نے آزردہ ہو کر کہا۔

"تم آخر یہ کیوں سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ یہیں رہیں گے" نُسیا نے ہنسکر کہا۔

"ہاں" ستائی اوپا نے ضد سے کہا "کم از کم ابا کی واپسی تک تو یہیں رہیں گے۔"

"اپنے ابا کی واپسی تک تم خوب بڑے ہو جاؤ" الیکسی نے کہا۔

"اور باپ کی طرح ایک ہیرو بھی بنو" دادی نے بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے یہاں آنے اور اچھی خبریں سنانے کی میں بھی بہت شکرگزار ہوں" نُسیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

اب ان آنکھوں میں پہلا سا وہ رحم یا غیریت نہیں تھی بلکہ افسردگی آمیز یگانگت تھی۔

پھر خوشی اور روح فرسا رنج کے ملے جلے جذبات سے الیکسی کا سر چکرانے لگا۔ وہ سوتی ہوئی لڑکی کے پاس گیا۔ اس کے ننھے سے چہرے کو جھک کر بہت دیر تک پیار کرتا رہا پھر رونا ضبط کرتے ہوئے ستائی اوپا کی طرف مڑ کر بولا "ستائی اوپا خدا حافظ" یہ الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کئے اور جس طرح وہ دو سال پہلے کیا کرتا تھا بچے کو ہوا میں اچھالا اور چکر دینے لگا۔

اس کی یہ حرکت دیکھ کر نُسیا پہچان گئی اور چلا اٹھی "ایلائی اوشا" اپنی بیوی کی زبان سے اپنا نام سن کر الیکسی نے ستائی اوپا کو زور سے پکڑ لیا جیسے کوئی گرتا ہوا کسی کا سہارا لیتا ہو اور گردن ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ نُسیا دوڑ کر اس کے پاس آئی اور تمغوں سمیت قمیص پھاڑ کر اپنے چہرے کو اس کے ننگے سینے پر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"تم ہی ایلائی اوشا ہو! میری جان و دل کے مالک! میرے سب سے زیادہ پیارے تم ہی ہو!" نُسیا نے آہ بھر کر کہا اور الیکسی کے چہرے پر ہاتھوں پر اور سینے پر لگاتار پیار کیا۔

ستائی اوپا بھی رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر الیکسی کی ماں گھبرائی ہوئی دوڑ کر آئی اور خوفزدہ ہو کر دروازے میں ٹھٹک گئی۔ پھر یہ منظر دیکھ کر اس نے بھی ایک چیخ ماری اور الیکسی کے قریب زمین پر گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"میرے چاند! میرے لاڈلے! تو نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں"

"خدا کا شکر ہے اب مشکلیں ختم ہوئیں" نُسیا نے آہستہ سے کہا

"کیوں جی تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں کہ تم ہی الیکسی تھے اور پھر ہمیں چھوڑ کر

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اور اس نے
لائف بوائے کی
عادت سیکھی ہے!
وہ اِس وقت بہت کچھ سیکھ رہا ہے لیکن زندگی میں لائف بوائے
صابن کے روزانہ استعمال کی عادت سے زیادہ کوئی چیز کام
نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں خوش ہے، اور اُسے
فخر ہے کہ اس نے گرد و غبار کے اس خطرہ کے
متعلق سبق دیا ہے جو ہر جگہ غیر محتاط آدمیوں پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہے۔
LIFEBUOY
SOAP
لائف بوائے ایک اچھا صابن ہی نہیں بلکہ
ایک اچھی عادت ہے۔
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

چانکیہ کا نظریہ سیاسی

عبد الحمید نظامی

چوتھی صدی قبل مسیح کے آخری سال پراچین ہندوستان کی تاریخ میں ایک ہنگامہ خیز اہمیت رکھتے ہیں۔ سکندر اعظم اپنی فتوحات کے نشہ میں چور مصر، ایشیائے کوچک، فارس اور افغانستان کو لتاڑتا ہوا پنجاب کے کھلے میدانوں تک آ نکلا مگر ہندوستان کے جری بہادروں نے ستلج کے اس پار جانے کا موقع نہ دیا۔ دوسرے لفظوں میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں سکندر جیسے آزمودہ کار فاتح کو مقابلے کی ٹکر کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے دانت کھٹے ہوتے دیکھ کر ستلج کے اس کنارے سے ہی واپس لوٹ جانا پڑا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جتقدر یونانی قوت ہندوستان کے مختلف حصوں پر غالب رہ گئی تھی اس کو چندر گپت موریہ نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی سیاسی طاقت کو منظم کیا۔

چندر گپت کا عہد حکومت ایک سنہری زمانہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ تاریخ کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ایک زبردست سیاسی شخصیت چانکیہ کا پتہ چلتا ہے چندر گپت کی ساری عظمت و شوکت اسی سیاستداں کی مرہون منت ہے۔ یہ چندر گپت کا منتری یعنی وزیر اعظم تھا محض اسی کی رہنمائی اور سیاسی افکار نے اس زمانہ کو زریں عہد کہلانے کی ناموری بخشی۔

چانکیہ یا کوٹلیہ یا وشنو گپت (تینوں نام سے مشہور ہے) کی پیدائش اور موت کی تاریخ کا تعین ذرا مشکل ہے صرف روایات سے پتہ چلتا ہے اس نے اپنا مشہور عالم سیاست نامہ ارتھ شاستر ۳۰۰-۳۲۱ قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں مرتب کیا ہے۔

ارتھ شاستر چانکیہ کی وہ بلند پایہ سیاسی تصنیف ہے جس نے مصنف کو بقائے دوام بخشی۔ اور یہی کتاب آگے چل کر چندر گپت کا دستور حکومت بنی۔ اس کی ترتیب و تدوین میں (بقول مصنف) پراچین شاستروں سے مدد لی گئی ہے گویا یہ آریہ ورت کے قدیم فلسفی سیاست دانوں کے افکار و نظریات کا بہترین خلاصہ ہے۔ اور اس کی اہمیت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے جب پراچین ہندوستان کے فلسفۂ سیاست کے علاوہ چندر گپت کے عہد حکومت کا پورا پورا تاریخی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ گویا یہ ایک تاریخی ماخذ بھی ہے۔

اپنی اس تصنیف میں چانکیہ بڑی شان سے جلوہ گر ہے اور اس کے سیاسی عقائد کا پورا پتہ چلتا ہے۔ پراچین عہد کے سیاست دانوں کے برعکس چانکیہ کا رجحان نظریاتی کم اور عملی زیادہ ہے۔ نیز وہ افلاطون کی طرح صرف تصورات کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے نہیں مارتا بلکہ بڑی سادگی کے ساتھ حکومت کی مشینری چلانے کے لئے قابل عمل اور موٹے موٹے اصول وضع کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا یہ دستور حکومت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے اس قدیم سیاستداں نے دو ہزار برس پہلے برطانوی فلسفی تھامس ہابس Thomas Hobbes کے نظریہ "زبردست مچھلی" (Eagle of fish) کی پیش بینی "متسیا نیاؤ" (بڑی مچھلی کا انصاف) کے نظریہ سے کی ہے۔ گویا مغربی فلسفی کسی طرح سے ضرور چانکیہ کے نظریہ سے متاثر ہے۔

متسیا نیاؤ کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں اسی طرح غیر منظم حکومت میں طاقت اور انصاف کا استعمال ناجائز طور پر ہوتا ہے۔ ہر طاقتور کمزور کے حقوق کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اور اپنی آسودگی اور خوشحالی کی بنیاد کمزور کی ہڈیوں پر استوار کرتا ہے۔

اس نظریہ کی چانکیہ اس طرح تشریح کرتا ہے:- "پراچین آریہ ورت میں کوئی اچھا راجہ نہ ہونے کے باعث ملک میں بدعملی پھیل گئی اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح زبردست کمزور پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ جب حد سے زیادہ ظلم و ستم بڑھ گیا تو لوگوں نے منو کو اپنا راجہ منتخب کر لیا۔ راجہ کے خرچ اخراجات کے لئے زمین کی پیداوار یعنی غلہ کا چھٹا حصہ اور تجارت کے منافع کا دسواں حصہ مقرر کیا تاکہ راجہ اس معاوضہ پر ملک میں امن بحال رکھنے اور رعایا کو دشمن کے حملوں سے بچانے کا ذمہ لے سکے۔ اور رعایا کی ان بداعمالیوں کا بھی جواب دہ ہوگا جو واجبی لگان اور عدل و انصاف کے اصول ٹوٹ جانے سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔

چانکیہ کا دستور سیاسی مکر و فریب اور ہر غیر روادارانہ پالیسی سے بالکل پاک ہے۔ اس نے اس کی بنیاد زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر رکھی ہے۔ جب وہ کسی راجہ کو ایک کامیاب حکمراں بننے کے لئے گر سکھاتا ہے تو ان ہدایات کو سامنے پیش کرتا ہے:-

"راجہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ عورت ذات کی عزت کرے اور کسی قسم کی دست درازی نہ کرے ہمیشہ راست باز رہے۔ برے طور و طریق سے سختی سے پرہیز کرے نظام حکومت کے فن کو سمجھنے کے لئے شہزادوں کی تربیت ضروری ہے۔ راجہ کو ہرگز حریص بن کر زر اور زمین نہ چھیننا چاہئے۔ مقتولوں کے بیوی بچوں کو لونڈی غلام مت بنائے مفتوحہ علاقوں کو

نوٹ:- اس مضمون کی ترتیب میں ڈاکٹر ہارون شروانی کی انگریزی کتاب Mauryan political thought and administration سے مدد لی ہے۔

حدودِ سلطنت میں ملحق کرنے کی پالیسی ترک کرے۔ بلکہ شکست خوردہ کو یا مقتول راجہ کے کسی لائق وارث کو جیتا ہوا ملک واپس کردے"۔

"ہر فرمانروا میں ان تین شکتیوں کا ہونا نہایت ضروری سمجھتا ہے:۔ پہلی شکتی منتر شکتی (صاحب الرائے ہونا) دوسری پربھو شکتی (شاہانہ وقار وطاقت) تیسری اُتسہا شکتی (ذاتی جرأت وطاقت) ہے۔ یہ تینوں شکتیاں علم۔ فوج۔ خزانہ اور راجہ کی ذاتی طاقت کا مظہر ہیں۔ اس ضمن میں چانکیہ قدیم فلسفیوں کے نظریوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ پربھو شکتی کی نسبت اُتسہا شکتی پر راجہ کو زیادہ بھروسہ رکھنا چاہئے۔

چانکیہ (جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے) کا نظریۂ سیاسی ایک عملی سیاستداں کا نظریہ ہے۔ اس کا مقابلہ اگر میکیاولی اور افلاطون فلسفی بو طلزی سے کیا جائے تو اس کو ان پر فوقیت حاصل ہوگی کیونکہ اس کے اصول اور نظریات بالکل سادے اور عمل میں بالکل آسانی سے لائے جاسکتے ہیں ان میں مغربی سیاست دانوں کا محض مادی اور تعصب انگیز رجحان نہیں پایا جاتا۔

چانکیہ بھی توسیع مملکت کا قائل ہے مگر یہ استعماریت کسی ذاتی نفع کے لئے نہیں ہے عدل وانصاف کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔ وہ اس کی ترغیب یوں دیتا ہے:۔

"اپنے زور بازو سے فتح پاکر یا کسی غاصب سے چھین کر یا ورثہ سے حاصل کرکے سلطنت کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے۔ ایک فاتح راجہ کو مفتوح راجہ کے نیک اوصاف کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ اہل علم۔ محتاج اور بہادر انسان کی حمایت کرنا راجہ کا پہلا فرض ہے۔ بے یار و مددگار اور مصیبت زدہ کو اس کی مصیبتوں سے نجات دلانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ مفتوحہ لوگوں میں ہر دل عزیز بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے رسم و رواج کا پورا احترام کیا جائے۔ اگر ان عوام کے دیوی دیوتاؤں سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے تو رعایا کا دل راجہ کی مٹھی میں آجائے گا"۔

چانکیہ کے نزدیک "سزا" کا ہونا بہت ضروری ہے۔ راجہ کو صرف نیک دل ہی نہ ہونا چاہئے بلکہ انصاف کا توازن پیدا رکھنا اس کا پہلا فرض ہے۔ سزا جرائم کو ختم کرتی ہے اور سیاسی اور سماجی نظام کو برقرار رکھنے کی ضامن ہوتی ہے بشرطیکہ مبنی بر عدل ہو۔ بلا وجہ اور حد سے زیادہ سزا دینا ظلم کہلاتا ہے مگر بہت زیادہ نرمی کا سلوک بھی حکومت کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیتا ہے۔ وہی راجہ احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا جس نے جرم کی حیثیت کے مطابق سزا دی ہو۔ جرائم سے چشم پوشی عدل کا خون ہوگا اور مت سیا نیاو کا راج قائم ہوجائے گا۔

چانکیہ نے اس نظریۂ سزا وجزا کو راج منتی میں بہت اہمیت دی ہے۔ اس نظریہ کی اہمیت اس وقت اور واضح ہوجاتی ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی سیاستدانوں نے بھی یورپ کے لئے اصلاحی پروگرام بنایا تو "سزا وجزا" کو ایک بہترین آلہ تصور کیا۔

چانکیہ کا ارتھ شاستر واقعی ایک ایسا دستورِ سیاسی ہے جس میں ایک آئینی ریاست (Constitutiona: State) قائم کرنے کے لئے بلند پایہ اصول مل سکتے ہیں۔

غزل

سیّد ضامن علی

دمِ آخر سلاسل سے نہ ٹانکے زخمِ تن کوئی
نہ بہلائے سونگھا کر بوئے زلفِ پرشکن کوئی

اسیروں سے کہے کیوں حال خوش باش چمن کوئی
کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ لے نامِ وطن کوئی

ہجومِ یاس و حرماں ہیں نشانِ دل نہیں ملتا
نہ ہوگی بے چراغ ایسی جہاں میں انجمن کوئی

یہاں کیونکر کریں لطف جراحت تیغ و زخمِ تن
دہاں بے زباں کوئی زبان بے دہن کوئی

مزاجِ عشق سے شوریدگی جاتی رہی شاید
سرِ وادیٔ وحشت پھر نہ آیا کوہکن کوئی

ٹھکانا ہے نہ دنیا میں عدم میں اور نہ محشر میں
خدائی میں نہ ہوگا مجھ سا آوارہ وطن کوئی

نمایاں یوں نہ ہر تصویر ہوتی بزمِ امکاں میں
پس پردہ سہی لیکن ہے شمعِ انجمن کوئی

جمالِ حق وہ کیا دیکھیں گے جو خود کور باطن ہیں
مری آنکھوں سے دیکھے شوخیٔ رنگِ چمن کوئی

ہمیں ضامن جو ہستی و عدم دونوں میں رہنا ہے
بتاؤ تو سہی کس کو کہے اپنا وطن ——— کوئی

(مرسلہ مجیب خیرآبادی)

لنکا

مول چند تگرنا

لنکا کے جزیرہ کا رقبہ ۲۵،۴۸۱ مربع میل ہے۔ اور یہ قریب قریب ہالینڈ اور بلجیم کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ یہاں کی آبادی ۰۰۰،۰۰ ہے جغرافیائی لحاظ سے اصل میں یہ مغربی گھاٹ کا ایک حصہ ہے جسے ایک آبنائے نے گھاٹ سے علیحدہ کر دیا ہے۔ یہ آبنائے ۲۲ میل چوڑی ہے۔ اور اس میں بہت سے نیچے جزیرے اور ریتیلے حصے ہیں اور اس لئے ۲۲ میل چوڑی اس آبنائے میں جہاز رانی کے قابل صرف ایک راستہ ہے

آب و ہوا، زراعت اور صنعت

لنکا خط استوا سے قریب ہے اور راس جزیرے پر بڑی حد تک اس کی آب و ہوا پر اثر ڈالا ہے۔ یہاں بارش بہت ہوتی ہے اور گو آب و ہوا گرم ہے لیکن بہت سخت نہیں اور اس لئے زراعت کے لئے بہت موزوں ہے۔

لنکا اپنے مسالوں اور ناریلوں کے لئے مشہور رہے اور یہ دونوں چیزیں لنکا سے دوسرے ملکوں کو جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یورپ کے لوگ یہاں قہوہ کی کاشت ند تجارتی پیمانہ پر کیا کرتے تھے لیکن اب قہوہ کی جگہ چائے نے لے لی ہے۔ اور اس چائے کا شمار دنیا کی بہت اچھی چائے میں ہوتا ہے۔ ربر کی کاشت بھی اب رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔

آبادی

لنکا کی آبادی میں مختلف عناصر کا میل ہے اور یہاں کے موجودہ سنگھالی باشندے مختلف نسلوں کے میل جول سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں کے اصل باشندے ویدا نسل کے لوگ تھے لیکن مختلف زمانوں میں دراوڑ قوموں اور آرین نسلوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے رہے اور ان آنے والوں کا خون سنگھالی لوگوں میں شامل ہوتا رہا۔ ہندوستان سے لنکا میں آ کر بسنے کا سلسلہ ہر زمانہ میں جاری رہا ہے یہاں تک کہ یہ اب تک جاری ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ زور اس وقت ہوا جب یورپ کے آبادکاروں نے یہاں قہوہ، چائے اور ربر کی کاشت کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح لوگوں کے لئے کام کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا اور اب تو لنکا میں بہت سے ہندوستانی مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں، لیکن یہ لوگ سنگھالیوں میں گھلے ملے نہیں۔ یہاں تک کہ گو ہندوستانیوں کی تعداد لنکا کی پوری آبادی کے تقریباً ¼ کے برابر ہے لیکن باہر سے آنے والوں اور لنکا کے مقامی باشندوں میں تضاد کی کشمکش اور اختلاف اب بھی موجود ہے۔ اور لنکا میں ہندوستانیوں کی آبادی کا مسئلہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کے لئے ایک بڑا اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔

پھر عرب، پرتگال، ہالینڈ اور برطانیہ سے بھی ہمیشہ لنکا کے تجارتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں نے یہاں کی آبادی کے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

بدھ مت

تہذیب اور کلچر کے معاملہ میں لنکا پر ہندوستان کا بڑا احسان ہے۔ ۲۴۲ قبل مسیح میں، موریا خاندان کے بادشاہ اشوک نے بدھ مت کی تبلیغ کے لئے اپنے بیٹے مہند کو لنکا بھیجا تھا۔ بادشاہ وقت پوجاتسا نے اس کا خیر مقدم کیا اور بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ اس وقت سے برابر بدھ مت لنکا میں پھیلتا رہا ہے۔ پچھلے دو ہزار برسوں میں متعدد خانقاہیں اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والی بہت سی عمارتیں اور یادگاریں لنکا میں بنیں۔ ان یادگاروں میں انورادھا پور میں تھوپا راما کی عمارت سب سے پرانی ہے۔ اس عمارت میں بدھ کی ہنسلی کی ہڈی دفن ہے۔

لنکا کے شہر

کولمبو کا بندرگاہ دنیا کے بہت اچھے بندرگاہوں میں سے ہے اور دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے یہاں جہاز آتے جاتے ہیں۔ کولمبو کا شہر لنکا کا سب سے خوبصورت شہر ہے اور ترتیب کی باقاعدگی، خوبصورتی اور صفائی کے لئے مشہور ہے۔ دوسرا مشہور شہر کینڈی ہے۔ اور گرم آب و ہوا کے شہروں میں اسے نفاست کا ایک مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ شہر خوش منظر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور اس خوشنما منظر کا عکس ایک شفاف بلوریں جھیل میں پڑتا ہے۔

عرب اور لنکا

ہندوستان کے علاوہ عرب سے بھی لنکا کے تجارتی تعلقات کئی صدیوں سے قائم ہیں۔ اسلام کے عروج سے کئی صدیاں پہلے سے عرب بحر ہند میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اور ہندوستان، لنکا اور انڈونیشی مجموعہ الجزائر کے ساحلوں پر ان کے تجارتی اڈے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چین کے ساحلوں تک پہنچ گئے۔ عربوں کے لئے لنکا میں ساری کشش اس کے بحری موتیوں، قیمتی پتھروں اور مسالوں کی وجہ سے تھی۔ اسلام کے سیاسی عروج اور اس کی ترقی نے عرب اور لنکا کے تجارتی تعلقات کو اور بھی بڑھایا۔ مختلف ناموں سے عربی کی کتابوں میں لنکا کا جو ذکر ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں اور لنکا والوں کے درمیان گہرے تجارتی تعلقات تھے۔ تیسری صدی ہجری کے ایک مصنف نے اپنی کتاب "کتاب المسالک والممالک" میں اسے "سراندیپ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ القزوینی اور ابن بطوطہ نے سراندیپ سے وہ علاقہ مراد لیا ہے۔ جہاں کوہ آدم ہے۔ پورے جزیرے کا نام ان لوگوں نے سیلان لکھا ہے۔ کوہ آدم ۷۳۴۰ فٹ اونچا ہے اور طبری کے خیال کے مطابق یہی وہ جگہ ہے جہاں جنت سے نکلنے کے بعد آدمؑ اترے تھے۔ اس کی چوٹی پر ایک بڑی سی گول چٹان ہے۔ بدھوں کا عقیدہ ہے کہ اس چٹان پر بدھ کے قدم کا نشان ہے۔ ہندو اسے وشنو کے پیر کا نشان سمجھتے ہیں اور مسلمان حضرت آدمؑ کے پیر کا۔ اور اس لئے یہ جگہ سب کے لئے زیارت گاہ بن گئی ہے۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں بھی سراندیپ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ عربی کی مشہور کتاب

"عجائب الہند" میں اس کا ذکر "سہلان" نام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی بڑے تعجب کی ہے کہ "ابن وستہ" کو لنکا کا یونانی نام "بت ربانی" معلوم تھا۔ یونان کے لوگ لنکا کو اسی نام سے جانتے تھے۔

سولہویں صدی کے شروع میں جب پرتگالی بحر ہند میں آئے تو عربوں کی لاثانی قوت اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا۔ پرتگالیوں کی ابتدائی نوآبادیاں لنکا کے ساحلوں پر ۱۵۰۵ء میں قائم ہوئی تھیں۔ ۱۶۵۸ء میں ہالینڈ والوں نے پرتگالیوں کو یہاں سے نکال باہر کیا اور فرانس کی انقلابی لڑائیوں کے زمانہ میں ۱۷۹۶ء میں انگریزوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا۔ اس وقت سے یہ جزیرہ انگریزوں ہی کے قبضہ میں ہے۔

عربوں کا لنکا سے جو طویل تعلق رہا ہے اس کی وجہ سے یہاں عربوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی ہے۔ ان عربوں کی اولاد کو پرتگالی شروع میں "مور" کہتے تھے۔ اور ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۲۶۶،۵۴۴ تھی۔ لنکا کے یہ عرب باشندے یا تو چھوٹی چھوٹی تجارتیں کرتے ہیں، یا قلیوں، مچھیروں اور ملاحوں کے پیشے کرتے ہیں۔ وہ تامل بولتے ہیں، جس میں عربی کے لفظ ملے جلے ہیں۔ ان پر ۱۹۰۷ء کے قانون کا نفاذ ہے، جس میں اسلامی قانون (شریعت) کے کچھ حصے شامل ہیں۔

حکومت ۱۹۲۰ء سے برابر لنکا رفتہ رفتہ خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ لنکا کا موجودہ آئین (جس کا اعلان پچھلے جاڑوں میں کیا گیا تھا) لنکا کے سیاست دانوں کے مشورے سے تیار ہوا ہے اور اس سے لنکا والوں کو اپنے اندرونی معاملات میں مکمل خود مختاری حاصل ہے۔ اس آئین کے مطابق یہاں ایک پارلیامنٹ بھی شامل ہے، جس میں ایک دار الامرا ہے اور ایک دار العوام۔ وزیروں کی مجلس حکومت کا کام چلانے اور اس پر ضبط رکھنے کی ذمہ دار ہے اور مجموعی حیثیت سے یہ پارلیامنٹ کے سامنے جوابدہ ہے۔ گورنر، بادشاہ کی نیابت کرتا ہے۔ بچاؤ اور بیرونی معاملات کے سلسلہ میں احکام صادر کرنے کا حق صرف حکومت برطانیہ کو ہے۔ آئین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب، رنگ اور نسل کی وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

لکھنے والوں سے رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔
قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔ ——— ادارہ

ایثار

بقیہ صفحہ ۳۹

بھی جا رہے تھے۔ بڑے آنے سکتے جانے والے۔

"کیا بتاؤں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی پہچانے" الیکسی نے بمشکل نہایت آہستہ سے کہا۔

"میں بھی تو کہوں کہ بچوں کو سوائے باپ کے کون اس طرح پیار کر سکتا ہے" لسیا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"بچے بغیر میرے بھی بڑے ہو سکتے ہیں۔ تم ابھی جوان ہو خوبصورت ہو۔ تم آخر اپنی زندگی مجھ جیسے کریہہ منظر کردہ انسان کے ساتھ کیوں خراب کرو"

یہ سن کر لسیا فوراً اس سے الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور کچھ دیر بعد اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الفاظ پر زور دے دے کر آہستہ آہستہ کہنے لگی "آپ نے جو رائے میرے متعلق قائم کی ہے اس کے لئے میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں۔ تو آپ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں؟ آپ سمجھتے تھے کہ میں صرف آپ کو اسوقت تک چاہتی تھی جب تک آپ خوبصورت تھے۔ وہ اوپر تصویر دیکھئے۔ اسکی خوبصورتی ہی میرے لئے سب کچھ ہے"۔

ہر شخص اس تصویر کے حسن کی تعریف کرتا ہے حالانکہ میرے نزدیک دنیا میں کوئی تصویر ایسی نہیں ہو سکتی جو تصویر والے (الیکسی) کے حسن کو پورا پورا دکھا سکے" لسیا نے مسکراتے ہوئے اور الیکسی سے لپٹتے ہوئے کہا" میں بھی کیسی باولی ہوں تمہاری قمیص پھاڑ دی" لسیا نے ہنس کر کہا "ابھی سی دیتی ہوں"

میرے بچے! اماں نے محبت بھرے لہجے میں کہا "کمبختوں نے تیرا کیا حال بنایا ہے! کل جب میں اس کی پیٹھ دیکھ رہی تھی تو اپنے دل ہی میں کہہ رہی تھی کہ یہ تو ہو بہو میرا الیکسی ہے اس کے بات کرنے کے طریقے سے بھی میرا خیال الیکسی کی طرف جاتا تھا مگر مجھ عقل کی ماری کو دیکھو کہ میں نے ......

اور کل جب ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے" لسیا نے کہا "ساری رات اسی خیال میں آنکھوں میں کٹ گئی" اب اس کی آواز خوشی اور محبت سے کانپنے لگی "یہ ابا آیا! استانی اوپا بات کاٹ کر بولا "تم نے کتنی ٹینکوں کے پرخچے اڑائے" اب سورج پہاڑی سے اونچا ہو چکا تھا دروازے پر کسی نے دستک دی اور لسیا کو کام پر بلا کر لے گیا۔

اعلان دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)

اقبال کی فکری وحدت یا تضاد (۲)

میکش اکبرآبادی

مادّہ اور روح

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ابتدا میں لفظی بحث فرمائی ہے اسکی وضاحت غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقبال مادّے کو روح کی ایک شکل قرار دیتے ہیں لیکن علامہ اقبال کا یہ مسلک بہرحال مسلم ہے کہ روح اور مادہ دو چیزیں نہیں "تن و جان را دو تا گفتن کلام است" اور اس مادّی دنیا کو روحانی دنیا کی خاطر نہیں چھوڑنا چاہیئے لیکن اسی کے ساتھ وہ "جسم ما از بہر جاں باید گداخت" بھی فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب جسم را از بہر جاں باید گداخت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس دنیا میں روح کا اظہار اسی جسم کے ذریعے سے ہوتا ہے اس لئے جسم کو قتل کرنے کا اقبال مخالف ہے مگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس مادّے کی غیر مستقل حقیقت سے آگاہ رہیں۔ - باقی رہا روح کی خاطر جسم کو گداخت کرنا سو یہ بھی کوئی انوکھا ویدانتی ڈھکوسلا نہیں۔ روزہ نماز ورزش قواعد یہ سب جسم کو تکلیف دیتے ہیں اور ہم سب ان میں سے کسی ایک کو ضرور اچھا سمجھتے ہیں اس میں سیحی تصوّف یا تضاد یا ویدانت کی کونسی بات ہے!" معلوم نہیں ڈاکٹر تاثیر نے "پاک ما از خاک می باید شناخت" کی شرح کیوں نہ فرمائی۔ بٹ صاحب نے جسم گداختن کی شرح کرنے کے بجائے جاں گداختن کی شرح کرنی شروع کر دی اور ثبوت میں علامہ کا شعر بھی پیش فرما دیا۔

فرماتے ہیں جسم را از بہر جاں باید گداخت ..... میں جاں گدافتن کی تشریح حضرت علامہ اسی نظم میں آگے چل کر یوں فرماتے ہیں ؎

چیست جاں دادن بحق پرداختن ٭ کوہ را با سوز جاں بگداختن

اس کے متعلق میں تو مغالطہ کھانا بھی عرض نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بات بالکل سامنے کی تھی۔ معلوم نہیں بٹ صاحب نے کیوں توجہ نہ فرمائی۔ البتہ ایک شعر علامہ کا نفی خودی کے ثبوت میں بٹ صاحب نے اور عطا فرما دیا اسکا شکریہ۔ بٹ صاحب کے خیال میں میری پیش کردہ مثالوں سے مادّے کے تیاگ کا پہلو نہیں نکلتا ان کی رائے میں علامہ کے ارشاد

"مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے"

کا مقصد اجتماعی ایثار زور دینا ہے اور بقول تاثیر صاحب تکلیف تو ہر جد و جہد میں اٹھانا پڑتی ہے۔ جسم گداختن سے مراد مادّے کی نفی ہرگز مقصود نہیں (حالانکہ سوال صرف مادے کی نفی کا نہیں بلکہ ثنویت کا بھی ہے) مسیحی تصوف کا قصہ جو ڈاکٹر اقبال نے بیان کیا ہے اس وجہ سے غیر متعلق ہے کہ میکش نے بھی اسکا تذکرہ کیا ہے اور چونکہ مادیت سے گزرنے کی تلقین علامہ نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کی ہے اس لئے اس سے بٹ صاحب کے خیال میں مادہ روح کا قضیہ پیدا کرنا جائز نہیں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

ترک عالم

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں، "اقبال رہبانیت کا مخالف ہے۔ درست۔ اقبال دنیا کو چھوڑ کر دشت میں خلوت گزینی کے خلاف ہے" درست۔ لیکن اسکا مطلب یہ کس طرح ہوا کہ اقبال بدن پروری کا قائل ہے یا یہ کہ اقبال سمندر کے کنارے یا پہاڑ کے دامن میں یا اپنے گھر میں کسی وقت اکیلا بیٹھ کر سوچنے کے خلاف ہے" اس کے بعد خود ہی فرماتے ہیں "اقبال وحدت و کو ہسار و لب دریا سے خلوت طلب ہے۔ وہ خودی کی طلب میں، انجمن آرائی کرتا ہے انسانوں کا خیر خواہ ہے، لیکن کم آمیز ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح رسول پاک غار حرا میں خود آگاہ ہوئے تم بھی خود آگاہ ہو۔"

بظاہر علامہ اقبال کے اقوال کی طرح تاثیر صاحب کے بھی یہ اقوال متضاد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسے تطبیق اضداد یا جمع اضداد سمجھا جائے۔ یہ میں نے بھی عرض نہیں کیا تھا کہ اقبال بدن پروری کا قائل ہے یا سمندر کے کنارے یا اپنے گھر میں کسی وقت اکیلا ہونا حرام شرعی سمجھتا ہے۔ شکستِ عالم سے مراد دنیا کو توڑنا پھوڑنا، چنگیز یا ہٹلر ہی لے سکتے ہیں۔ یہ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شکستِ عالم سے مراد ہے ماسوی اللہ سے منہ موڑ لینا۔ یہی مراد ان صوفیہ کی بھی ہے جو ترکِ خودی کے ملزم ہیں۔ فوائد الفواد کے حوالے سے جو معنی آپ نے ترکِ دنیا کے بتلائے ہیں وہ غالباً علامہ اقبال کی مراد کے خلاف ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے مکتوب میں شاہین میں اسلامی فقر کے جو خصوصیات گنائے ہیں اس میں خلوت پسندی کے علاوہ بے تعلقی بھی ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ خلوت پسندی سے ممکن ہے۔ علامہ کی مراد یہی ہو کہ کبھی تنہا جنگل یا پہاڑوں میں تنہا ہو جاتا ہو لیکن آشیانہ نہ بنانے سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ آشیانہ بنائے مگر آشیانے سے دل نہ لگائے جیسا کہ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے فوائد الفواد سے تائید فرمائی ہے۔

اقبال فرماتے ہیں:-

"فقر کا خلوت دشت و راست"

لیکن بٹ صاحب خلوت دشت کو رہبانیت نہیں سمجھتے بلکہ ان کے خیال میں خلوتِ دشت کا مفہوم یہ ہے کہ "تجرد اور خلوت جس میں ترک کا شائبہ ہو" وہ تجرد اور خلوت ہی کیا جس میں ترک کا

شائبہ نہ ہو ترک تعلقات ہی کا نام تجرد اور خلوت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بظاہر خلوت اختیار کرے لیکن دل سے تعلقات دنیا کو ترک نہ کرے۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر ٭ شعلہ او میرد از غوغائے شہر
خلوتے جوید بہ دشت و کوہسار ٭ یا لب دریائے ناپیدا کنار

خلوتے کی یا کو تنکیری قرار دیکر بٹ صاحب مستقل خلوت کے خلاف گواہی حاصل فرما رہے ہیں لہذا ان کے خیال کے بموجب عشق شور انگیز کا شعلہ غوغائے شہر سے صرف تھوڑے روز بجھتا ہے یا یہ کہ عشق کا شعلہ شہر میں رہنے سے تسخیر ہو جاتا ہے جیسا کہ انھوں نے فرمایا کہ شکستِ عالم سے مراد تسخیرِ عالم ہے کیونکہ یہ اصطلاح ہے اور لا مناقشتہ فی الاصطلاح

حقیقت عالم

ڈاکٹر تاثیر صاحب کے نزدیک "یہ دنیا خواب بھی نہیں اور حقیقت اصلی بھی نہیں"۔ ڈاکٹر صاحب کے اس نظرئے کے بموجب اگر علامہ اقبال نے دنیا کو حقیقت کہا تو غلط کہا اور اگر نقش باطل کہا تو غلط کہا۔ بٹ صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک دنیا کو حقیقت یا جلوۂ حقیقت سمجھنا غلط ہے لیکن فریب خوردہ این نقش باطل ست ہنوز کے یہی معنی نہیں کہ دنیا حقیقت نہیں۔ میں نقش باطل کے یہی معنی سمجھا تھا۔ بٹ صاحب نے اس شعر کے علاوہ علامہ کے کسی اور کلام سے یہ معنی اخذ کئے ہونگے۔ نتیجہ ایک ہی ہے لیکن بٹ صاحب نے اس سے بھی انکار نہ فرمایا کہ علامہ کے ذیل کے اشعار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ عالم کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ ؎

تو چشم بستی و گفتی کہ این جہاں خواب است
کشائے چشم کہ این خواب خواب بیداری ست

اور نیز جلوہ حقیقت بھی سمجھتے ہیں ؎

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب و بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہے تواں خرید

یہ مسلم ہے کہ علامہ کا پیغام عالمگیر ہے اور عالمگیر ہونا چاہئے اسلئے

یہ عذر کہ یہ نظم قرطبہ میں لکھی گئی تھی یا اہل یورپ کی مادہ پرستی اسکا نتیجہ ہے عذر نہیں بلکہ علامہ کی کسر شان اور ان کے کلام پر الزام ہے۔

یہ باتیں بحث کے قابل نہ تھیں کہ مہ و ستارہ اور گرداب تشبیہ ہے یا نہیں گذارش تو یہ ہے کہ جو شاعر فرار کے خلاف اور تسخیرِ عالم کا مدعی ہے حیات جاوداں اندر ستیز است کہتا ہے وہ صوفی شعرا اور ایرانی تصوف کی طرح مہ و ستارہ کے گرداب سے سفینہ سنبھال کر کیوں لے جانا چاہتا ہے۔

بٹ صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ کا ارشاد ہے بس ؎

غلام ہمت بیدار آں سوار انم ٭ ستارہ را بہ سناں سفتہ در گرہ لبستند

یہ حضرات علامہ کا کلام میری معروضات کے خلاف سمجھکر پیش کرتے ہیں حالانکہ میری گذارش علامہ ہی کا ارشاد ہوتا ہے۔ اس طرح تضاد خود تسلیم کر لیا جاتا ہے مجھے اس سے انکار نہیں کہ علامہ ستارے کو بہ سناں سفتہ در گرہ لبستن کے مداح نہیں لیکن وہ مہ و ستارہ سے بچکر نکل جانے کی تلقین بھی کرتے ہیں ؎

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

یہ آپ کو اختیار ہے کہ اسے تضاد بیانی نہ سمجھیں وحدت فکر خیال فرمائیں۔ اسی طرح دل بکس ندہند کے معنی بٹ صاحب دلبر شدن بتاتے ہیں جو خلاف محل اور بے موقع ہونے کے علاوہ بٹ صاحب کے لئے مفید نہیں کیونکہ مطلب پہلے مصرع سے پورا ہو جاتا ہے کہ وہ شخص جو دل کسے نباختہ با دو جہاں نہ ساختہ "پر فخر کرتا ہے ایسوں کا غلام ہے جو عاشق ہو ہیں: "غلام زندہ دلانم کہ عاشق سرہ اند" بقول علامہ مرحوم ؎

دلے تا دل شاں بہ حیرت انداخت ٭ خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

نظر باطن

تمام صوابات پر بٹ صاحب نے ڈاکٹر تاثیر صاحب سے استفادہ کیا ہے۔ بعض مرتبہ باطل تقل پر کتفا فرماتے ہیں لیکن کہیں یہاں زمانہ مزدوری لہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے جو جواب

غزل

قمر جلالوی

اب مجھے گلشن سے کیا جب زیر دام آہی گیا
ایک نشیمن تھا سو وہ بجلی کے کام آہی گیا

سن حال سوز الفت جب یہ نام آہی گیا
شمع آخر جل بجھی پروانہ کام آہی گیا

کوشش منزل سے تو اچھی رہی دیوانگی
چلتے پھرتے ان کے ملنے کا مقام آہی گیا

دیر تک باب حرم پر رک کے اک مجبور عشق
سوئے بت خانہ خدا والے کے نام آہی گیا

حسن کو بھی عشق کی ضد رکھنی پڑتی ہے کبھی
طور پر موسیٰ سے ملنے کا پیام آہی گیا

کر دیا مشہور پردے میں تجھے زحمت نہ دی
آج کو ہوا ہمارا تیرے کام آہی گیا

رات بھر مانگی دعا ان کے نہ جانے کی قمر
صبح کا تارا نکل کے پیام آہی گیا

دیا ہے وہ صحیح ہے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب اور بٹ صاحب دونوں کے خیال میں اقبال کا مسلک نظر ظاہر اور نظر باطن کو جمع کرنا اور ان میں اعتدال پیدا کرنا ہے۔ بٹ صاحب علامہ کے ارشاد میں لفظ صرف پر زور دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے یہ خیال نہ فرمایا کہ "جو بہ قلب خویش تندیلے بجو" میں بھی جز کا لفظ رکھا ہوا ہے۔

افلاطون ڈاکٹر تاثیر صاحب نے صرف ایضاً پر اکتفا فرمائی ہے۔ بٹ صاحب نے پہلے تو ایضاً ہی فرمایا ہے اور اس کے بعد فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ "علامہ افلاطون کی مخالفت میں حق بہ جانب ہیں" پھر فلسفہ عجم کے متعلق علامہ کے قول سے ثابت فرمایا ہے کہ اس کے بعد علامہ کے خیالات میں بہت سا انقلاب آگیا تھا اور خود حضرت علامہ کو اس کتاب کی کمزوری کا پورا احساس تھا" میری گذارش بھی یہی تھی کہ ان انقلابات کی تصریح علامہ کو کرنی چاہئے تھی جسطرح "قادیانیت" کے متعلق فرمائی تھی اور اگر نہیں فرمائی تو اب علامہ کے تربیت یافتہ اصحاب کو کرنی چاہئے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر تاثیر صاحب اور بٹ صاحب اسکو سنی سنائی باتیں کہکر ناقابل اعتنا نہ سمجھیں۔ فلسفہ عجم کی سند مجروح کرنے کے باوجود بٹ صاحب فرماتے ہیں "مولانا رومیؒ کے متعلق خود علامہ کے خیالات جو انھوں نے اس کتاب میں ظاہر فرمائے ہیں کافی حد تک روشن ہیں اس لئے مزعومہ تناقض کو دور کرنے کی مزید کوشش فضول ہوگی غیر محسوس اور غیر مشہود کی بحث بھی عبث کیونکہ ظاہر و باطن اور غیب و شہادت کے قرآنی الفاظ کے ہوتے ساتھے کیوں اس مخمصے میں پڑیں۔"

غالباً روئے سخن علامہ اقبال کی جانب ہے جنھوں نے "آسمان از فسون نامحسوس خورد" فرمایا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ بحث عبث ہے اور تضاد دور کرنے کی کوشش فضول ہے۔

حالانکہ علامہ صراحتاً فرما چکے ہیں "شاعرش وابوسد از ذوق حیات — اور — وایٔ ہستی زمانِ تو برد ہا"

لیکن ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ بٹ صاحب کے بقول علامہ جسمانی موت کو انتقال سمجھتے ہیں اور خودی کی فنا کو حقیقی موت اسلئے انھوں نے جہاں موت کی مخالفت کی ہے وہاں خودی کی فنا کی مخالفت ہے اور جہاں موت کی موافقت کی ہے وہاں ان کی مراد جسمانی موت ہے۔ توافق کی یہ صورت صحیح ہو سکتی ہے اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ افلاطون کی مراد موت سے جسمانی موت نہ تھی۔ "سر زندگی در مردن ست" سے افلاطون کا مقصد بھی بقول علامہ اقبال یہ ہو سکتا ہے کہ "مرگ او را می دہد جانے دگر" اس کے علاوہ عالم اسباب کو افسانہ افلاطون نے بھی کہا اور علامہ نے بھی نقش باطل فرمایا۔ منکر ہنگامہ موجود افلاطون بھی تھا

اور علامہ بھی فرماتے ہیں۔ ؎

"جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے"

بٹ صاحب نے آخر میں علامہ کا ایک اور نظریہ پیش کر دیا جسکا محل سمجھ میں نہ آیا فرماتے ہیں:-

"اقبال فرماتے ہیں ہمیں شخصی ابدیت اپنے حق کے طور پر نہیں مل سکتی لیکن ہم ذاتی جد و جہد سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔"

یہاں بٹ صاحب کو ہم ان کا دعوی یاد دلاتے ہیں کہ اقبال کا تصوف قرآنی تصوف ہے اور اقبال قرآن کی روشنی میں مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے۔ کیونکہ کفار کے لئے خالدین کی نص صریح قرآن میں موجود ہے۔

تقلید ڈاکٹر تاثیر صاحب اس عنوان پر زیادہ بحث غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں علامہ اقبال تقلید اور اجتہاد دونوں کے لئے مناسب مقام اور محل تجویز فرماتے ہیں۔ اس لئے "اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — اور — مست ہم تقلید از اسمائے عشق" میں تضاد نہیں ہے۔ بٹ صاحب کی رائے میں علامہ تقلید جامد کے خلاف تھے نہ تقلید صالح کے نیز یہ کہ عوام میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہوتی۔" معلوم نہیں بٹ صاحب کے حضرت بایزیدؒ عوام میں سے تھے یا خواص میں اور اگر تقلید اسمائے حق میں سے ہے تو حق صالح و جامد کی تعریف کیا ہوگی۔ بٹ صاحب اگر تقلید صالح و جامد کی تعریف فرماتے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی کہ خربزہ نہ کھانا تقلید صالح ہے، یا تقلید جامد۔ بٹ صاحب نے اس موقع پر یہ دعوی فرمایا ہے کہ تصوف میں تقلید ہے مگر مجدد الف ثانی کے تصوف میں تقلید نہیں" معلوم نہیں اس جملے سے بٹ صاحب کی کیا مراد ہے۔ اسکا مطلب یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ مجدد صاحب نے تصوف میں اپنے اشیاخ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید نہ کی یا یہ کہ مجدد صاحب کے سلسلے کے مریدین مجدد صاحب کی تقلید نہیں کرتے؟ بٹ صاحب کے اس دعوے کا بحث سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ علامہ اقبال کا میں نے کوئی قول ایسا بیان نہیں کیا، نہ مجدد صاحب کا اس عنوان میں کہیں تذکرہ ہے۔ معلوم نہیں بٹ صاحب کو یہ مقتابسے کیسے لگا ذکر نقشبندیت کا کیا ہے نہ کہ مجدد صاحب کا۔

مشائخ نقشبندیہ اور مرزا بیدل اس عنوان پر تضاد کی بحث غالباً ناقابل تاویل تھی، کیونکہ تاثیر صاحب نے تو یہ عذر فرما دیا کہ "اسوقت اقبال کے فرمودات (؟) سے بحث ہے منقولہ روایات سے نہیں" اور بٹ صاحب نے یہ فرمایا کہ ان اعتراضات کا جواب مندرجہ بالا عنوان کے جواب میں گزر چکا ہے اور

نہ اصل یہ بحث دور از کار بھی ہے "مرزا بیدل کا عنوان بٹ صاحب نے شارح نقشبندیہ کے عنوان میں شامل کر دیا اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اصولی طور پر ہمیں فلسفۂ عجم سے سوچے سمجھے بغیر استناد نہیں کرنا چاہیئے" حالانکہ بٹ صاحب خوب جانتے ہیں کہ مرزا بیدل کے عنوان پر میں نے فلسفۂ عجم سے کوئی استنا نہیں کیا۔ یہ مغالطہ دینا ہے یا مغالطہ کھانا بٹ صاحب ہی تشریح فرما سکتے ہیں۔

قادیانیت ڈاکٹر تاثیر صاحب نے بجا ارشاد فرمایا کہ وہ اسکا جواب تمہید میں دے چکے ہیں لیکن بٹ صاحب نے علامہ اقبال کی وہ عبارت پیش نہ کی جس میں انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے اور جسے ڈاکٹر تاثیر صاحب پیش کر چکے ہیں جسے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ قادیانیت کا عنوان مرتب کرتے وقت علامہ مرحوم کی یہ عبارت میری نظر سے نہ گزری تھی ۔۔۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں، "ایک طرح سے اقبال کا یہ جواب بکثش کے تمام مضمون کا جواب ہے" ۔۔۔ یہ مجھے بھی تسلیم ہے واقعہ یہی ہے جو علامہ نے فرمایا کہ

"اگر تم یہ کہتے ہو کہ میرا موجودہ رویّہ پہلے رویّہ کے نقیض ہے تو جواب ہے ایک سوچنے والے زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، نہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا"

کاش دوسرے حضرات بھی یہ تسلیم فرمالیتے کہ علامہ ایک سوچنے والے زندہ انسان تھے ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

علامہ ابن تیمیہ اس موقع پر ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اپنا معمول کا عذر پیش نہ فرمایا اس لئے بٹ صاحب نے وہی عذر پیش کردیا فرماتے ہیں "اس ضمن میں مقالہ نگار علامہ کی کوئی تحریر پیش نہ کرسکے محض سنی سنائی باتوں پر استدلال قائم کرلیا۔ بایں ہمہ کوئی منبہہ نتیجہ اخذ نہ ہوا" معلوم نہیں منبہہ نتیجے سے بٹ صاحب کی کیا مراد ہے بات صرف اتنی تھی کہ "علامہ نے ابن جوزی کی تلبیس ابلیس پر اظہار ناپسندیدگی کیا" بلکہ اپنے ممدوح ابن تیمیہ کے خلاف رائے دی کہ وہ بھی حقیقت سے واقف نہ تھے اور یہی تضاد بیان ہے جسکو بٹ صاحب نے باوجود ارشاد کے وحدت الوجود کی بحث میں بیان نہیں فرمایا۔

علم و حکمت معلوم نہیں ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اپنا نظریہ بیان کیا ہے یا علامہ اقبال کا کہ "فقط علم بھی کام کا نہیں اور عشق بھی کافی نہیں" بٹ صاحب نے مولانا روم کے شعر کو علامہ اقبال کا شعر قرار دے کر جواب کی بنیاد رکھی ہے اس کے بعد علامہ کے دو شعر پیش کئے ہیں جو ہم مفہوم ہیں۔ ان کے متضاد جو جملہ تھا اور جس سے تضاد ثابت ہوتا تھا وہ قصداً ذکر نہ کیا یعنی "علم کی راہ چلنے والا بھی آخر پہونچ ہی جاتا ہے بلکہ محفوظ طریق سے" اس جملے کے متضاد یہ شعر بھی نظر انداز کر دیا گیا ؎

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

شیخ مکتب کے طریقوں میں کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

متضاد اقوال کو نقل نہ کرکے رفع تضاد کرنا اور انصاف چاہنا کہاں کا انصاف ہے معلوم نہیں ان عبارتوں اور اشعار سے ڈاکٹر تاثیر صاحب کس طرح اپنا نظریہ ثابت فرمائیں گے۔

خودی ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس عنوان میں سے صرف ایک پہلو کو لے کر اور باقی میرے سوالات کو نظر انداز کرکے فرمایا ہے کہ "اگر آپ وحدت وجود کو مانتے ہیں تو پھر خودی کی اس ہمہ گیری سے تضاد کا شائبہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ اگر خالق و مخلوق میں وحدت ہے تو پھر اس حقیقت معرکہ یعنی خودی کی مختلف اللون حقیقت سے کیوں انکار ہے۔ البتہ آپ اگر وحدت وجود کے قائل نہیں تو پھر خودی کیا اور کئی بیگانگتوں پر اعتراض کیا جاسکتا ہے" گذارش یہ ہے کہ میرے وحدت وجود کو ماننے نہ ماننے سے بحث نہیں سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ خودی کے متعلق علامہ کا کیا مسلک ہے۔ کیونکہ وہ کہیں خودی کو عین خدا کہیں غیر خدا کہیں محض اعتباری کہیں خدا کا ظل اور ایک مستقل شئے قرار دیتے ہیں کہیں خودی کے ترک کا حکم دیتے ہیں، کہیں اسے خدا کے مقابلے میں بھی نہیں چھوڑتے۔ کہیں خدا کے سوا سب سے منہ پھیر لیتے ہیں کہیں ابلیس کے مسلک کے موافق اور کہیں خدا اور رسول کے سچے پرستار نظر آتے ہیں۔ اس مشکل کو نہ تاثیر صاحب نے حل فرمایا نہ بٹ صاحب نے۔ اسے تضاد بیانی نہ سمجھئے جو چاہے کہتے لیجئے مگر آپ سمجھے ہوئے ہیں تو دوسروں کی دستگیری فرمائیے ورنہ اپنا وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ علامہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ انکی غلط حمایت کی جائے۔ میرا اصل مقصد اپنے اشتباہات کا رفع کرنا تھا نہ بحث و مباحثہ، نہ میں نے علامہ کے اصل نظریات کے متعلق فی الحال کچھ عرض کیا تھا۔ مذکورہ بالا گزارش سے پروفیسر تاثیر اور مولانا بٹ صاحب نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ اپنے طالب علم کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اس لئے مزید بحث فضول ہوگی۔ بٹ صاحب کو اختیار ہے کہ وہ سعی اور اہتمام من اللہ کی دعا فرماتے جائیں۔ میں انکے قیمتی وقت ضائع کرنے کی دعا پر آمین نہیں کہہ سکتا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے (ادارہ)

ناگور

نیگاپٹم کے شمال میں ناگو جنوبی ہند کا ایک اہم اور مشہور شہر ہے۔ باشندوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو صدیاں سال سے وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پرامن طریقے پر آباد ہیں۔ ناگور سوت کی کتائی اور چٹائیوں کی بنائی کے لئے مشہور ہے۔ کئی لحاظ سے وہاں کی جامع مسجد قابل ذکر ہے۔ تعمیر کے اعتبار سے وہ ایک نمونۂ حسن ہے۔ نیز اس کی شاندار مینار یں اپنی ظاہری شوکت وجلال کے ساتھ حد درجہ جاذب نظر ہیں۔ بندرگاہ ہونے کے لحاظ سے بھی اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی مرکز ہے اور موجودہ سیاسی چپقلشوں کے باوجود یہاں کے ہندو مسلمان شیر وشکر ہوکر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مئی کے مہینے میں یہاں ایک سالانہ تہوار "کندوری" ہوتا ہے جس میں نہ صرف یہاں کے بلکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ہندو مسلمان اور دوسری ذات کے لوگ بلا امتیاز مذہب وملت شرکت کرتے ہیں۔

ناگور کی مسجد شاہ ابوالحامد سے منسوب ہے جو میرن صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ان کے مزار پر تعمیر کی گئی ہے۔ ایک مسلمان زائر کی حیثیت سے ہندوستان کے طول وعرض میں سفر کرتے رہنے کے بعد وہ آج سے چار سو سال پہلے وہاں مقیم ہوئے اور آخر وقت تک آباد رہے۔ تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگ ان کی مقناطیسی شخصیت انکے پاکیزہ خیالات اور ان کے افعال حسنہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ لوگ انھیں مافوق الفطرت ہستی سمجھتے تھے کیونکہ عام عقیدہ ہے کہ وہ پرانے امراض چٹکی بجاتے میں دور کر دیتے تھے۔ انتقال کے بعد بھی عقیدتمند انکے مزار پر حصول فیض کے لئے آتے رہے اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ چنانچہ عام ہندو مسلمان ہی نہیں، ہر قسم کے بیمار اور روگی بھی تندرستی کی تلاش میں وہاں آتے ہیں۔

جو شخص بھی ایک بار ان کے آستانے پر پہنچ جاتا ہے ان کی روحانیت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بعض انھیں ہندو سمجھتے ہیں اور بعض مسلمان۔

ایک ہندو راجہ نے اس مسجد کی توسیع کرائی اور اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ کیونکہ وہ ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا تھا لیکن اس مسجد اور مقبرے کی زیارت کے بعد فوراً اچھا ہو گیا۔ اس نے اس بزرگ ہستی کی خاطر بڑی رقم صرف کی لیکن اس طرح اپنے آپ کو اور انھیں غیر فانی بنا دیا۔ "کندوری" کا سالانہ تہوار مسلمانوں کے مہینے جمادی الاول کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ نیا چاند دیکھتے ہی میلا لگتا ہے اور اس کا سلسلہ چودھویں رات تک رہتا ہے۔ سب سے اہم رسم یہ ہے کہ اس کی بڑی میناروں پر بہت شان وشوکت کے ساتھ پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ پھر سجی سجائی گاڑیوں پر پرچموں کا ایک شاندار جلوس نکلتا ہے۔ موسیقی کی تانوں کے ساتھ ساتھ سچ مچ کی معلوم ہوتی ہوئی کشتیوں جہازوں، اور روشنی کے میناروں کا ایک سیلاب عظیم اس طرح دکھایا جاتا ہے جس سے سمندر کی خطرناک زندگی کا اندازہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ پیر صاحب کی پرخلوص اور بروقت دعاؤں نے ان مصائب وآلام کا استیصال کر دیا تھا۔ اسی لئے ملاح اور جہاز راں ان کے بڑے معتقد ہیں اور اس یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے یہ تہوار مناتے ہیں۔ شام تک جلوس مسجد کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے جہاں ہندو مسلمان امیر وغریب، افسر اور ماتحت غرض ہر مذہب اور ہر مرتبے کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور اسی وقت میناروں پر پرچم لہرانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پرچموں کو چھو لینے سے نہ صرف بیمار تندرست ہو جاتے ہیں بلکہ بانجھ عورتوں کی گود ہنستے کھیلتے بچوں سے بھر جاتی ہے۔

یہاں کی سجادہ نشینی ورثے میں نصیب ہوتی ہے۔ سجادہ نشین چاند رات کو سر شام ہی ایک مینار پر چڑھتا اور افق پر طلوع ہونے والے چاند کو دیکھتا ہے۔ اس کے نظر آتے ہی وہ ایک نعرہ لگاتا ہے۔ فوراً پرچموں کی تہیں کھل جاتی ہیں، باجے بجنے لگتے ہیں۔ نفیری کی آواز اور ڈھول کی گونج فوراً آگاہ کرتی ہے کہ تہوار شروع ہو گیا ہے۔ بجلی کی تیز روشنیاں ساری مسجد اور مقبرے کے سقف وبام کو بقعۂ نور بنا دیتی ہیں۔ جلوس میں خوشبودار صندل سے بنی ہوئی لئی بھی رتھوں پر رکھی ہوتی ہے۔ اس سے دوسرے روز صبح کے وقت مقبرے کے در و دیوار کو لیپ دیا جاتا ہے۔ پیر صاحب کا ایک مرید مقبرے کے ایک گوشے میں معتکف ہو کر بہتر گھنٹے کا روزہ رکھتا ہے۔ اس دوران میں وہ کسی سے بولتا بھی نہیں۔ یہ وقت گذرنے کے بعد وہ دلئے سے روزہ کھولنے کے لئے ساحل سمندر تک جاتا ہے۔ دلیا اتنی مقدار میں ہوتا ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا کرکے تمام مجمع میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لوگ اسے من وسلویٰ سمجھ کر کھاتے ہیں۔ تہوار ختم ہونے پر میناروں پر سے پرچم اتار لئے جاتے ہیں۔

وہاں کے ہندو مسلمانوں میں جو اخلاص، اخوت اور یکجہتی موجود ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مستقبل میں کبھی نہ کبھی وہ ملک کی ان دو بڑی جماعتوں میں اتحاد قائم کرنے کی صورت پیدا کر دیگی اور دنیا دیکھے گی کہ اختلاف مذہب وملت کے باوجود وہ کسطرح بھائی بھائی ہو کر پرامن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ وہ الگ الگ اپنے مذہب کے پھر بھی پابند ہیں گے۔

ایل، این گبل

"لکس
ٹائیلیٹ صابن ہی میرے
حسن و جمال کا آسان طریقہ ہے"
مایا بینرجی کہتی
ہے
میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور
جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے
اپنی جلد پر ملائمیت سے لگاتی ہوں۔
اس کے بعد میں صاف و
ستھرے اور ٹھنڈے پانی
سے دھو ڈالتی ہوں۔
آخر میں آہستگی سے
چہرہ نرم تولئے
سے خشک کرتی ہوں
LUX
TOILET SOAP
فلمی اسٹارس کا
حسن بخش صابن
فلمی ستارہ اپنے کمال جلد کی قدر اس لئے نہیں کرتی کہ وہ
اس کے کیرئیر کی خوبصورتی کا ایک جزو ہے۔ بلکہ وہ اس کے
زندگی کا ایک انمول پونجی بھی ہے۔ اسی لئے ہندوستانی
فلمی اسٹارس لکس ٹائیلیٹ صابن سے اپنے
قیمتی حسن کی حفاظت کرتی ہیں۔ آپ خود اپنے
مکان میں اس آسان طریقہ کو استعمال کر سکتی ہیں۔
اس کا ۳۰ دن کے لئے تجربہ حاصل کیجئے۔ آپ اسکے
صاف کرنے والے اور ترغیب دینے والے انجام سے خوش ہونگی
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

پل

سعیدہ بشیر

نہ جانے کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے نیند کب آگئی تھی کہ دروازہ کھلتے ہی ایکدم سے چونک پڑی —— اور دروازہ کمبخت کھلا بھی توکس قدر زور شور کے ساتھ —— کھولنے والی جو شدو ایسی آفت کی پڑیا تھی۔ کھٹ پٹ —— کھٹ پٹ —— کھٹ .. پٹ —— اور پھر میرے اوپر دھڑ سے کاغذ کا ایک بھاری پلندہ گر پڑا —— میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے لحاف کے ذرا اندر گھستے ہوئے کہا۔

"تمہارا کوٹ اور کیا" وہ بڑے احسان بھرے انداز میں بولی۔ اُس کے مارے میری ساری شاپنگ دھری رہ گئی"

"اوہ تم میرا کوٹ لے آئیں شدو" —— میں لحاف وحاف ایکطرف پھینک اچھل کر زمین پر آ رہی "کتنی اچھی ہو تم شدو" —— میں نے جلدی جلدی بنڈل کو کھولتے ہوئے کہا۔

"زیور لی تھی۔ تم کو وہ پوچھ رہی تھی" —— شدو بیگم دھیرے سے بڑبڑائیں۔ لیکن میں نے جیسے سنا ہی نہیں —— "مگر شدو تم میرا کوٹ آج ہی کیسے لے آئیں۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ ...... "

"لیکن لاتی کیسے نہیں" وہ میری بات کاٹ کر بولی "تمہارا حکم جو تھا اور اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک ایسا شخص آنے والا ہے جسے تم کو نئے نئے رنگ کے کوٹوں میں دیکھنے کا شوق خبط کی حد تک تجاوز کر گیا ہے" —— اور پھر وہ مسکرا پڑی۔

"اچھا تو یہ بات ہے" —— میں نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا —— "لیکن یہ شخص ہے کون" —— میں نے جان بوجھ کر انجان بن کر پوچھا —— اور پھر میں نے آئینہ میں دیکھا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ غیر ارادی طور پر ہی پھیل گئی ہے ——

"اب بننے سے فائدہ ہی کیا۔ صاف کہہ دو نا کہ نام سننے کا شوق ہے۔ اجی وہی تمہارے عماد بھائی اور کون —— یا بالفاظ دیگر وہی جو تمہارے دل میں ...... "

میں نے کہا "ہشت"، اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ —— مگر مجھے ایسے لگا جیسے میں آسمان کی عظیم ترین وسعتوں میں اُڑتے اُڑتے ایکدم سے زمین پر آگری ہوں مجھے نہیں معلوم تھا۔ بلکہ میں سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ کچھ دنوں سے میرے دل کو ایک عجیب سی خلش، ایک بالکل بے معنی سے اضطراب نے کیوں گھیر رکھا تھا۔ اور جب میں اپنے خوش آئند خوابوں اور ان کی مسرتوں کی شدت میں گم ہونے لگتی تو سر سے پیر تک خوف خطر کی ایک ہلکی سی لہر کیوں دوڑ جایا کرتی۔ جیسے کسی غیر مرئی مگر لوہے کے ایسے ہاتھوں نے مجھے بڑی زور سے جھنجوڑ ڈالا ہو اور میرے لاشعور کی گہرائیوں سے کوئی چیخ رہا ہو —— بے وقوف خوابوں پر جی رہی ہے۔ یہ سب تو خواب ہی ہے محض خواب —— آہ جس کی تعبیر کچھ بھی نہیں۔ کبھی میں سوچنے لگتی کہ کہیں یہ سب کسی آنے والے خطرے کا پیش خیمہ تو نہیں۔ لیکن پھر جلدی ہی میں اپنے آپکو وہمی اور شکی ٹھیرا کر ان باتوں کو بھولنے کی کوشش میں لگ جاتی۔ اسوقت بھی میں نے اپنے آپ کو شدو کی کھلکھلاہٹوں میں کھو دینا چاہا اور جلدی سے کوٹ پہن کر اپنے آپ کو آئینہ میں ہر پہلو سے دیکھنے لگی۔ گویا اس کی سلائی وغیرہ کا جائزہ لے رہی ہوں جب تک میں اپنے پریشان خیالات کی دنیا میں کھوئی رہی شدو نہ جانے کیا کیا بک گئی۔ مگر اب جو غور کیا تو وہ کہہ رہی تھی —— "یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے نرجی۔ جیسے تم کو کسی نے ہپنوٹائز کر دیا ہو ——" اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اندھیرے کی دھندلائیوں میں کھوتے کھوتے یکلخت اجالے کی جگمگاہٹوں میں آپڑی ہوں۔

"ارے تم ایکدم سے اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں دکھائی دینے لگتی ہو؟" —— شدو نے میرے اور آئینہ کے درمیان آکر کہا۔ شاید اس لئے کہ اسطرح میں اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف مبذول کر دونگی۔ میں زبردستی ہنس دی۔ ممکن ہے ایسے وقتوں میں کبھی آپ کو بھی یونہی ہنس دینا پڑا ہو۔ بس یونہی۔ زبردستی —— بے موقع، بے معنی سی ہنسی! پھر میں نے کہا "اچھا ہٹو تو۔ دیکھوں کوٹ ٹھیک سلا بھی ہے یا نہیں" میرے لہجے میں کچھ اکتاہٹ سی تھی جب ہی تو شدو جل کر الگ بیٹھ رہی۔ کہنے لگی۔ "نہ جانے جیسے جیسے بھائی عماد کے آنے کے دن قریب آتے جاتے ہیں تم کچھ سہمی سہمی کیوں لگنے لگی ہو۔ بالکل جیسے ایک ننھا سا بچہ اپنے کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے ایکدم سے رو پڑے"۔

میرے اللہ یہ شدو میرا دل ٹٹولنے کی کوشش میں کیوں لگی رہتی ہے۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا اظہار منظور نہ تھا۔ شدو میری عزیز ترین سہیلی کے علاوہ خالہ زاد بہن بھی تھی۔

"بڑی ہر وقت کہتی رہتی ہو دنیا میں تمہیں مجھ سے زیادہ کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ کبھی بھی اپنے دل کی کوئی بات بتائی ہے مجھے۔ نرجس مجھے تمہارے جھوٹ پر بڑا غصہ آتا ہے" —— شدو میری مسہری پر بیٹھی بیٹھی نہ جانے کیا کیا بڑبڑائے جا رہی تھی لیکن اس کی اس بات نے کہ "جیسے جیسے بھائی عماد کے آنے کے دن نزدیک آتے جاتے ہیں نہ جانے تم سہمی سہمی سی کیوں لگنے لگی ہو"۔

میرے سمند خیال پر تازیانے کا کام کیا تھا —— میرے خدا کہیں

کچھ ہونے والا تو نہیں —— عین اسی وقت دروازہ کا پردہ ہٹا اور بھائی جان غیر معمولی آہستگی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کہنے لگے "نرجی اِدھر آؤ۔ میرے ساتھ ٹہلنے چلتی ہو؟"

"کس طرف جائیں گے ٹہلنے آپ؟" میں نے پوچھا۔

"پل پر" وہ بولے۔ میں ان کے ساتھ ہو لی۔ شنو بھی میرے ساتھ چل پڑی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں بھائی جان نے اسے ساتھ چلنے سے منع کر دیا۔ میں نے بھائی جان کو آج سے زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ویسے میں ان کا اتنا زیادہ ادب کرتی تھی کہ زیادہ کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ میرا ان کے سوا اور ان کا میرے سوا اس دنیا میں اصل معنوں میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالات میں مست اور میں اپنے میں آہستہ آہستہ کہر کے دھندلکے میں کھو گئے۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ بھائی جان کو یہ پل آخر کیوں اسقدر مرغوب ہے۔ میں نے اکثر راتوں کو اپنی سہیلیوں کے یہاں جاتے وقت یا اور کسی تفریح کی جگہ سے لوٹتے وقت انھیں پل کی سرخ آہنی دیوار کے سہارے کھڑا ہوا پایا تھا۔ وہ واقعی میرے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئے تھے —— وہی پل آ گیا اور اسی سرخ رنگ کی آہنی دیوار پر اپنی اسی مخصوص جگہ بھائی جان رُک گئے —— دریائے گنگا کی وسیع اور سوئی ہوئی سطح پر چاندنی کا ہلکا ہلکا سا غبار چھایا ہوا تھا —— فضا پر غضب کی خاموشی مسلط تھی —— چاروں طرف جیسے پرستانی خواب سا طاری تھا —— بھائی جان نے اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی اجلی چاندنی اور اس کے نیچے سوئی ہوئی پانی کی ساکت لہروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑائی اور پھر بلا کسی تمہید کے کہنے لگے: "نرجی، میری اور اس کی پہلی ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔ اس کی ایک انگوٹھی یہاں پر گر پڑی تھی۔ ۔ وہ اسے ڈھونڈھ رہی تھی۔ پریشان تھی اور اس کی سہیلیاں آگے نکل گئی تھیں۔ اتفاق سے وہ مجھے مل گئی ۔ ۔ اسی سرخ آہنی دیوار کے پاس چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی شبنمی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی ایک ننھی سی انگوٹھی۔ ! وہ اسے پا کر فرط انبساط سے کھل پڑی اور مجھے تشکر بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی تیز قدموں سے اپنی سہیلیوں میں جا ملی۔ اور میں اسے دیکھتا رہا —— دیکھتا ہی رہا جب تک میری آنکھوں میں اسے دیکھنے کی تاب رہی۔ اس کے بعد وہ جب کبھی آتی میری آنکھیں فرط مسرت سے جگمگا اٹھتیں۔ وہ کہتی مجھے تمہاری آنکھوں کی سطحوں پر دو ستارے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں کس قدر روشن اور چمکیلی ہیں۔ اور میں سوچتا کہ میری آنکھوں میں شاید اس کی اپنی خوبصورت اور چمکیلی آنکھوں کا پرتو آ گیا ہے۔ بالکل جیسے آسمان پر قریب قریب دمکتے ہوئے دو ستاروں کا دریا کے پانی میں جھلملاتا ہوا عکس !"

بھائی جان ذرا رک گئے۔ اپنے اوورکوٹ کا کالر سیدھا کیا پھر دریا کی پاک لہروں سے مس ہو کر آتی ہوئی برفیلی ہواؤں کو اپنی گرمیلی سانسوں میں جلد جلد جذب کرتے ہوئے بولے —— "ایک دن وہ دیر تک نہ آئی۔ میں انتظار کرتے کرتے جل کر سینما چلا گیا۔ واپسی میں یہاں ایک پتھر سے دبا ہوا اس کا پرچہ ملا۔ لکھا تھا —— "میں اب آپ سے ملنے نہیں آؤں گی اسلئے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ آزاد ہوتے ہوئے بھی ایک قفس کے اندر بند پرندہ کی مانند —— اور سماج کا قانون بنانے والے آپ لوگ ہیں —— مرد ! اس لئے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لئے میں مجبور ہوں۔ میری وہی انگوٹھی جو آپ نے ڈھونڈھ کر دی تھی اور آپ کو بہت پسند تھی بطور یادگار حاضر ہے" اسے پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اٹھا کر مجھے سرخ سرخ انگاروں پر رکھ دیا ہے۔ جی چاہا کہ اس انگوٹھی کو اسی وقت دریا میں پھینک دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ میں جو کچھ اسوقت کر رہا ہوں یہ غصہ کے فوری جذبہ کے تحت ہے بعد میں مجھے یقیناً افسوس ہوگا وہ انگوٹھی میں نے جیب میں ڈال لی۔ کئی دن بیت گئے لیکن اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ نرجی شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ سچائی خواہ کتنی بھی تلخ ہو، کتنی ہی ذلیل اور بے حیا کیوں نہ ہو مجھے عزیز ہے اور بے حد عزیز۔ اور اسی بنا پر میں اپنی اس کمزوری کو جھوٹ کی بد صورت آڑ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے اس سے والہانہ محبت ہو چکی تھی۔ اور جہاں تک میں نے سوچا اور سمجھا ہے اسے بھی مجھ سے عشق تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہ تھا اور نہ میں نے پوچھا، مجھے تو بس اس کی ہی ذات سے سروکار تھا۔ عزت اور جاہ و حشمت پر فنا ہو جانے والے پروانوں کی طرح مجھے ان لوازمات سے لگاؤ رکھنا گوارا نہ تھا —— خیر تو ایک تاریک شب جبکہ میں دریا کی اندھیری سطح پر تاروں کی مدھم روشنی جذب ہوتے دیکھتے دیکھتے اونگھ رہا تھا کہ کسی نے مجھے بڑے زور سے جھنجھوڑ ڈالا "عفت پر اچانک ہیضے کا شدید حملہ ہوا۔ اب وہ مر چکی ہے اور اس نے مجھ سے تم تک اس کا آخری سلام پہونچا دینے کو کہا تھا" —— نرجی ذرا سوچو تو —— یہ خبر اور اسی جگہ جہاں ہم نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو بہت قریب سے سنا تھا۔ اسی جگہ عین اسی جگہ جہاں اسوقت ہم اور تم کھڑے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مجنوں کی طرح صحرا کی خاک چھانتا پھروں گا لیکن دیکھ لو کہ اب تک جی رہا ہوں۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کو بھی عماد سے اور عماد کو تم سے بے پناہ محبت ہے۔ انسان کو زمانہ

کبھی ایک حال پر نہیں رہنے دیتا ـــ نرجی اب تمہیں اسی دل میں کسی اور کو جگہ دینی ہوگی" بھائی جان پھر ذرا رُکے لیکن میں حیران تھی کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں ــ اور میرا دل سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر میری ساری ہستی کو دہلائے دے رہا تھا ــ بالکل جیسے سمندر کی بے پناہ لہریں پتھروں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی ہیں ـ لیکن کاش کہ میرے سینے کی دیواریں بھی ان پتھر کی چٹانوں کی طرح مضبوط ہوتیں ـ میں پریشان و ڈرا دینے خیالات کی رو میں بہتی جا رہی تھی کہ بھائی جان کہیں دور دیکھتے ہوئے پھر بولنے لگے ــ " نرجی اسی پل بھر اسی جگہ میں نے اپنی عزیز ترین ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دینے کی خبر سنی اور اب تم بھی اسی جگہ اور تقریباً اسی وقت سنو کہ تمہارا محبوب تم سے بچھڑ چکا ہے ـ تھوڑے دنوں کے لئے نہیں بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ـ وہ یہاں آتے وقت ہوائی جہاز سے گر کر ختم ہو چکا ہے" ـــ "بھائی جان" ـــ شاید میں اپنی روح کی تمام ترقوتوں کے ساتھ صرف اتنا چیخ سکی اور پھر کچھ نہ بولی ـــ بولتی کیسے بول ہی نہ سکی ـــ !

مانچسٹر یونیورسٹی میں طالبعلموں کی زندگی

مانچسٹر یونیورسٹی شہر کے مرکزی حصے سے کسی قدر دور بنی ہوئی ہے۔ اور یہاں تک پہنچنے کے لئے طالب علموں کو ایک ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی سڑک سے یہ لمبا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ناہموار اور ناخوشگوار راستہ طے کرنے کے بعد جب آدمی وہاں پہنچتا ہے تو اسے جو عمارتیں دکھائی دیتی ہیں انہیں خوبصورت کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یونیورسٹی کی عمارتوں میں داخل ہونے کا راستہ میلا کچیلا اور مایوس کن ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح، یہاں ایسا کچھ بھی نہیں جس سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہو۔ لیکن جونہی جانے والا اندر داخل ہوتا ہے، یہ ساری فضا بدل جاتی ہے ـــ اس لئے نہیں کہ فضا میں کوئی حسن پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ یہاں آ کر زندگی میں ایک تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اور زندگی کی اس رو میں شان و شوکت بھی ہے اور زندگی کے سارے آثار بھی۔

یونیورسٹی کا اجتماعی مرکز وہاں کا زبردست رستوران ہے، جسے صرف 'کاف' کہتے ہیں۔ یہ کاف دن کے ہر حصہ میں، صبح سے شام تک طالب علم لڑکوں، لڑکیوں سے بھرا رہتا ہے ـــ کام کرتے ہوئے باتوں میں وقت گذارتے ہوئے، چاء اور قہوہ کی پیالیاں پیتے ہوئے اور 'کاف' کے لمبے چوڑے اور روشن ہال کو گہما گہمی اور شور و غل سے بھرتے ہوئے کھانے کے وقت، یہ گہما گہمی اپنی معراج کو پہنچ جاتی ہے۔ ہال کی سیکڑوں میزوں سے کاؤنٹر تک آدمیوں کی ایک مسلسل زنجیر سانپ کی طرح لہراتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک گھنٹہ تک یہ بھیڑ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کے بعد دیکھتے دیکھتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے ـــ سوائے چند میزوں کے، کہیں کوئی لڑکا اور لڑکی آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور کہیں کوئی یکہ و تنہا طالبعلم دانتوں میں پنسل دبائے کتاب پر اپنا غصہ اتار رہا ہے۔

طالب علموں کی زندگی میں 'کاف' ایک 'ادارہ' ہے اور ان کی زندگی کا ایک اہم مرکز۔ طالب علموں کو سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کتنا حصہ اس اہم مرکز کے لئے وقف کریں۔ اس لئے کہ 'کاف' میں 'گپ بازی' کا سامان بھی بے پایاں ہے، ہر طرح کے مذاق کے لئے اپنا ساتھی تلاش کرنے کے امکانات بھی بے حد ہیں ـــ اور پھر وقت کے ضائع کرنے کے بھی۔ اور اس لئے فیصلہ کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔

تاہم خوش وقتی کے وہ چند گھنٹے جو 'کاف' میں گذرتے ہیں یونیورسٹی کی تعلیم کا اتنا ہی اہم حصہ ہیں جتنی کتابیں۔ حالانکہ عام طور پر یونیورسٹی کو کسی خاص قسم کی ٹکنیکل تعلیم کا مرکز سمجھنے کا جذبہ عام ہے اس لئے کہ شمالی علاقے کے ان طالب علموں کے احساس پر معاشی افکار کا بوجھ چھایا ہوا ہے۔ اور ان کا خاص مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص منتخبہ پیشہ یا کام کا اہل بنا لیں۔

یونیورسٹی غیر اقامتی ہے اور مانچسٹر میں یا اس کے مضافات میں ایسا شاید کچھ بھی نہیں جو لطیف احساسات کے لئے کسی تفریح یا تسکین کا سامان بن سکے۔ یہاں کے ناچ گھر، تصویر خانے اور تھیٹر اچھے ہیں لیکن مصروف طالب علم کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اتنے پیسے کہ وہ انکی سرپرستی کر سکے۔ یہاں ایک شاندار پبلک لائبریری بھی ہے جس میں بے حد خوش اخلاق عملہ کام کرتا ہے ـــ یہاں طالب علم کو سکون اور خاموشی مل جاتی ہے، وہ ریلوں، لبوں، راستوں اور 'کاف' کی بھیڑ بھاڑ اور گھٹی ہوئی فضا سے بھاگ کر لائبریری کی کھلی ہوئی فضا میں پناہ لے سکتا ہے اور یہ امن اور سکون اسے بغیر کچھ خرچ کئے حاصل ہو جاتا ہے۔

مانچسٹر کے طالب علم زندگی کی ان کمیوں سے بلند و بالا رہ کر جس طرح رہتے ہیں۔ دیکھنے والا اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

'کاف' کے علاوہ، مانچسٹر یونیورسٹی میں دو یونینیں یا یونیورسٹی کلب بھی ہیں ـــ ایک مردوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔ ان یونینوں کو (دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف) خود طالب علم ہی چلاتے ہیں۔ یونینوں کے چلانے کے لئے جن عہدداروں کا انتخاب کیا جاتا ہے انہیں انتظام کا بہت اچھا تجربہ ہو جاتا ہے اور اس تجربہ میں وہ بڑی ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لیتے ہیں۔

مانچسٹر کی یونیورسٹی میں سیاسی اور بین الاقوامی، دونوں احساس موجود ہیں۔ یونیورسٹی انٹر یونیورسٹی کمیٹیوں کے لئے، یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں جانے کے لئے اور دوسری یونیورسٹیوں سے آنے والے نمائندوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے، اپنے نمائندے چنتی ہے۔ اس کے باوجود کہ مانچسٹر کے طالب علموں کو ایک ایسی فضا میں رہنا پڑتا ہے جہاں لطف کے لئے سکون و تفریح کا کوئی سامان موجود نہیں، اور باوجود اس کے کہ اپنے گھروں پر رہنے کی وجہ سے انکی سوسائٹی بالکل محدود ہے، وہ حیرت انگیز حد تک بیدار ہیں۔

ایل اے جی اسٹرونگ

اگر مجھ سے یونیورسٹی کے طالب علموں کے سامنے بولنے کو کہا جائے تو باوجودیکہ آکسفورڈ میری "مادر علمی" ہے، مجھے مانچسٹر کی یونین کے سامنے بول کر زیادہ خوشی ہوگی۔

مانچسٹر میں آکسفورڈ جیسی خوش مذاقی اور لطافت ہوگی، اور نہ وہاں کی تقریروں کی سی تیزی اور ذکاوت، لیکن اس کے بجائے وہاں ایک اور چیز ملے گی ـــ بحث کے موضوع کی تہ تک پہنچنے کی سچی کوشش، خواہ سچائی کی اس جستجو میں کہیں ایک بھدا پن اور کرختگی ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ کئی برس کی مدت میں جس نے جتنی تقریریں سنی ہیں، ان میں سب سے اچھی تقریر مانچسٹر یونین کی ایک ۱۹ برس کی لڑکی کی تھی۔

مانچسٹر کے دیہاتوں میں مجھے جا بجا طالب علمی کے زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور اس زندگی میں جو تازگی، شگفتگی اور جوانمردی مجھے دکھائی دیتی ہے اسے بے اختیار سراہنے کو جی چاہتا ہے ——— اس لئے اور بھی کہ یہ خوبیاں طالب علموں نے ایک ناسازگار فضا میں رہ کر پیدا کی ہیں۔ ان کی ایک چیز اور ہے جس کے لئے میرے دل سے تحسین نکلتی ہے — اور وہ یہ کہ انھیں ایسے معاملات سے بھی وہی پرجوش اور سچی دلچسپی ہے، جن کا براہ راست ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک موقعہ پر یونیورسٹی کے طالب علموں نے رائے کی بہت بڑی اکثریت کے ساتھ یہ بات طے کی کہ ان کے راشن میں کمی کر کے کھانے کا سامان جرمنی کے طالب علموں کو بھیجا جائے۔ اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی گئی کہ غذا بھیجنے کے معاملہ میں اتحادی ملکوں کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ ترمیم ۱۲۹ : ۷ رایوں سے رد کر دی گئی۔ میں رایوں کی اس تعداد کے متعلق کسی طرح کی رائے نہیں دینا چاہتا۔ میں تو صرف ایک واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں۔ یہ تجویز کسی نسبتاً پرانی یونیورسٹی کے خوش حال طالب علموں نے نہیں پاس کی تھی، بلکہ ایک بڑے صنعتی شہر کے غریب اور مصیبت زدہ طالبعلموں نے۔ ("لندن کولنگ" سے ماخوذ)

غزل ——— عرشی بھوپالی

نگاہِ شوق سے کب تک مقابلہ کرتے
وہ التفات نہ کرتے تو اور کیا کرتے

غرورِ حُسن کو مانوس التجا کرتے
وہ ہم نہیں ہیں جو خودداریاں فنا کرتے

یہ رسمِ ترکِ محبت تھی ہم ادا کرتے
ترے بغیر مگر زندگی کو کیا کرتے

کہاں کے حضرتِ ناصح، نہ مانتا میں کبھی
مرے خلاف جو وہ بھی یہ فیصلہ کرتے

شکستِ ربط کی فرما رہے تھے وہ تردید
ہم اعتراف نہ کرتے تو اور کیا کرتے

ہمیں تو اپنی تباہی کی داد بھی نہ ملی
تری نوازشِ بیجا کا کیا گلا کرتے

نگاہ لُطف کی تسکین کا شکریہ، لیکن
متاعِ درد کو کس دل سے ہم جُدا کرتے

یہ پوچھو حُسن کو الزام دینے والوں کو
جو وہ ستم بھی نہ کرتا تو آپ کیا کرتے

کسی کی یاد نے تڑپا دیا پھر آ کے ہمیں
ہوئی تھی دیر نہ کچھ دل سے مشورہ کرتے

ستم شعار ازل سے ہے حُسن کی فطرت
جو میں وفا نہ بھی کرتا تو وہ جفا کرتے

جیون

جیون کی سُندر بگیا میں
آشاؤں کے پھول کھلے ہیں ✤ پیارے پیارے، رنگ برنگے
پھولوں میں کانٹے بھی لگے ہیں ✤ نِراشا کے تیز نکیلے

جیون کی بہتی ندیا میں
لہروں بیچ چلی ہے نیّا ✤ آشا کے چپّو کے سہارے
نِراشا کا تیز جھکولا ✤ کہتا جائے "دور کنارے"

جیون کی میٹھی ندیا میں
سُندر اور سُنہرے سپنے ✤ آشا بن کر من الجھائیں
نِراشا کی پَرا تا ہوتے ✤ بھیانک بھیانک روپ کھائیں
مورکھ آش نراش میں کھو کر ✤ جیون کو کہتا ہے بگیا
سُندر بگیا بہتی ندیا
بہتی ندیا۔ میٹھی ندیا
جیون کا کچھ بھید نہ پائے ✤ کال کا پنچھی اُڑتا جائے
بگیا۔ ندیا۔ ندیا۔ سب پر ✤ اپنا گہرا رنگ جمائے
مورکھ آش نراش میں کھو کر
جیون کا کچھ بھید نہ پائے

نقش صحرائی

نقد و نظر

اقبال اس کی شاعری اور پیغام

مصنف:۔ جناب شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ۔ ملنے کا پتہ:۔ کمال پبلشنگ مال روڈ لاہور۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۴۲۴ صفحات۔ مجلد قیمت ساڑھے چار روپے۔ مصنف نے علامہ مرحوم کی زندگی ہی میں ان کی شاعری پر چند مقالات بزبان انگریزی قلمبند کئے اور ایک ادبی مجلس میں سنائے، جو بہت پسند کئے گئے، اور چند اضافوں کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو گئے۔ پھر اسی مجموعے کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ کتاب اردو میں لکھی جس میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے سب مجموعے زیر بحث لائے گئے ہیں۔ کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تنقید کا زاویہ بالکل جدا لیکن نہایت مفید ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے پہلوؤں سے کلام اقبال کو جانچا ہے جہاں اب تک نقاد صاحبان کی نگاہ ذرا مشکل سے پہنچی ہے اور یہ شاید اسلئے کہ انہیں اقبال سے زبردست عقیدت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کا مطالعہ بڑا پُر خلوص رہا ہے۔ ان میں سخن فہمی کی صلاحیت بھی مطالعۂ اقبال ہی سے شروع ہوئی تھی۔ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے لیکن ضمنی عنوانات کا شمار کیا جائے تو وہ سینکڑوں ہیں۔ پہلے باب میں حیات اقبال پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند ہمعصر شعرا کے کلام سے موازنہ بھی کیا ہے۔ غرض یہ کہ ہر باب ایک مستقل کتاب ہے اور ان کا مجموعہ اپنی نظیر آپ۔ پیغامات اقبال کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ کتاب حد درجہ مفید ہے۔ اس کا دیباچہ سر عبدالقادر نے تحریر فرمایا ہے۔

نشری تقاریر

مصنف:۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب:۔ ناشر ادارۂ نشریاتِ اردو۔ حیدرآباد دکن۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۱۵۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے۔ یہ ان پندرہ سائنسی مضامین کا مجموعہ ہے جو مصنف کبھی کبھی حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرتے رہے ہیں۔ زیادہ موضوعات فلکیات سے متعلق ہیں چونکہ موصوف جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں اسلئے ہر مضمون کو استادانہ رنگ میں پیش کرتے ہوئے انداز بیان اتنا سہل اختیار کیا گیا ہے کہ معمولی استعداد کے لوگ بھی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم طلباء کے لئے یہ کتاب حد درجہ مفید ہے۔ "کلیانی تجربے" "بچپن کے بعد" "دکن کی سرزمین" اور "حیدرآباد کی نوجوان" اصل موضوعات سے الگ ہیں لیکن ان کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان میں بھی سائنسی رنگ اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ بعض علمی اصلاحات کی وضاحت حاشیہ پر یا آخر میں کر دی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔

تنقیدات

مصنف:۔ جناب ابوالسلام نعیم صدیقی۔ شائع کردہ:۔ مکتبہ نشاۃ الثانیہ چپل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۲۳۴ صفحات۔ مجلد قیمت عہ۔ قدامت پرستی سے الگ ہٹ کر بالکل ترقی پسند انداز میں چند اسلامی موضوعات پر گہری نظر ڈال کر مفید خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کا مطالعہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو بری طرح جھنجوڑ کر بیدار کر سکتا ہے۔ اس زمانے میں کفر و الحاد کا جو عام رنگ پھیل چلا ہے، یہ اسکے خلاف ایک زبردست آواز ہے۔ اس میں بعض اعتراضات کا معقول جواب بھی دیا گیا ہے جو کبھی کبھی اسلامی تعلیمات پر کئے جاتے ہیں۔ انداز بیان نہایت مؤثر اور دلآویز ہے۔ عام مسلمانوں کے علاوہ معترضین کے لئے بھی اسکا مطالعہ ضروری ہے۔

تذکرۃ الذاکرین

مولف:۔ مجدد مشرقیات آغا اشہر لکھنوی۔ ملنے کا پتہ:۔ صدیقی بکڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۱۲۶ صفحات۔ بلا جلد قیمت ایک روپیہ۔ واقعات کربلا اور شہادت حسین کے موضوعات پر تحریر یا تقریر کے ذریعہ اظہار خیال کرنے والوں کے حالات کتابی صورت میں جمع کئے گئے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ایسا موضوع ہے کہ اس سے قبل کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اسلئے ظاہر ہے کہ آغا صاحب کو کس قدر سعی و کاوش سے کام لینا پڑا ہوگا۔ ان صفحات میں خطابت و وعظ کے فرق اور خطیب و واعظ کی ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ کوفے کے بعد ذکر حسین کی ابتدا ہندوستان میں کب ہوئی اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ اس کا مرکز کب اور کس طرح قرار پایا۔ لکھنؤ میں شیعہ اور سنی حضرات میں جو جھگڑے ہوتے رہے ہیں ان کے ابتدائی اسباب بیان کئے ہیں۔ چونکہ واقعاتِ کربلا اور شہادتِ حسین بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کے لئے موضوع ذکر و فکر رہے ہیں اس لئے اس کتاب کا مطالعہ شیعہ و سنی دونوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے خصوصاً اسلئے کہ آغا صاحب نے تعصبات سے الگ ہٹ کر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور یوں بھی طرز بیان کی خوبیاں ہر شخص کو دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔

انتخاب اور رائے دہی

مصنف:۔ جناب محمد نوراللہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم مجلۂ ملیسانین۔ دفتر مجلس ناکش۔ باغ عام حیدرآباد دکن۔ $\frac{20 \times 30}{16}$ کے ۹۲ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت ایک روپیہ۔ انتخابات کی نوعیت ضرورت اور اہمیت پر بحث کرتے ہوئے رائے دہندگان کی صلاحیت، فرائض اور تنظیم پر روشنی ڈالی ہے۔ انتخاب کا قانونی طریقہ شروع سے آخر تک ان مرحلوں سمیت بیان کیا ہے جو اس دوران میں گذرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو غلط اور ناجائز طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، ان کو بھی موضوع بنایا ہے۔ غرض ہر لحاظ سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ زیادہ تر حیدرآباد کے شہری اور ریاستی انتخابات کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اس سے عام موضوع کی افادیت پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا اور اسی لئے اسکا مطالعہ ان تمام حضرات کیلئے مفید ہو سکتا ہے جو اپنے شہری حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں خواہ وہ کسی ریاست میں ہوں یا برطانوی ہندوستان میں۔

ف۔ح

ترکی کی مشکلات

گذشتہ ۱۰ مئی کو صدر ترکی عصمت انونو کے ایما پر ری پبلکن پیپلز پارٹی کا غیر معمولی جلسہ طلب کیا گیا تھا۔ وہ سرکاری پارٹی ہے جو بائیس سال سے ترکی پر راج کر رہی ہے اس موقعہ پر صدر انونو نے پارٹی کے پروگرام میں یا یوں کہئے کہ حکومت کی پالیسی میں بعض تبدیلیوں کا اعلان کیا۔ فوری سیاسی نقطۂ نگاہ سے ان میں سب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ شہری اور ملکی دونوں انتخابات آئندہ سال کی بجائے اگلے چند مہینوں میں ہو جائیں۔ اول الذکر اسی مہینے شروع ہوا اور موخر الذکر ۱۹۴۷ء کی کسی غیر معینہ تاریخ کی بجائے ستمبر ۱۹۴۶ء میں ہوں۔ انہوں نے بالواسطہ اور ملکی حق رائے دہندگی کا بھی اعلان کیا تاکہ رائے دینے والے اور نمائندے کے مابین مضبوط رشتہ استوار ہوسکے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پارٹی کے دوامی رہنما کا عہدہ نہیں چاہتے بلکہ اس مدت کو چار سال کے لئے محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے قول کے مطابق آئین انجمن میں ایسی ترمیم کی جائے گی کہ تاجروں اور پیشہ وروں کی انجمنیں بنانے میں آسانی ہو جائے مختصراً یہ کہ انہوں نے آمریت کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس رویہ کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو ترکی پر بیرونی دباؤ کا خطرہ۔ اس کے مقابلے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کی بنیادیں زیادہ مستحکم کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ ترکی کے اندر جو اعتراضات کی بھرمار اور بے چینی پھیلتی جاتی ہے، اس کا سدباب کیا جائے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ حکومت اصلاح کے میدان میں پہلا قدم اٹھائے، اور نکتہ چینوں سے بازی لے جائے۔ غرض یہ کہ بیرونی اور اندرونی حکمت عملی کی خاطر حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قبول عام حاصل کرے۔

غالباً بیرونی دباؤ سے حکومت زیادہ متفکر ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں سات سال سے ترکی اس دباؤ کا سامنا کر رہا ہے۔ صرف دوران جنگ ہی میں نہیں بلکہ اعلان صلح کے بعد سے بھی ترکی لام بندی کی حالت میں رہتا آیا ہے اور نتیجہ یہ کہ اس کا ملک کی اقتصادی اور مالی حالت پر بہت برا اثر ہو رہا ہے۔ پچھلے دونوں کے مقابلے میں خصوصاً اب لام بندی کا بار نا قابل برداشت ہو گیا ہے۔ غیر جانبدار رہتے ہوئے ترکی کو دردانیال اور بحر یونان کی حفاظت کرنی ضروری تھی کیونکہ ان پر جرمنی کے حملے کا ڈر رہا ہے لگا رہا تھا۔ اگرچہ حفاظتی کارروائی کے سلسلے میں ترکی زیر بار رہا لیکن اس کا صلہ یوں ملا کہ وہ اپنا مال کسی قدر زیادہ دام پر فروخت کر سکا۔ جرمن خریداروں اور برطانیہ کی انجمن خرید و فروخت کے نمائندوں نے عالمگیر میعار سے سو فی صدی زیادہ پر قیمتوں کا مقابلہ کیا۔ امریکہ نے ادھار پٹہ کا جو انتظام کیا تھا، ترکی نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ لیکن آج آمد و خرچ کا نقشہ بدل چکا ہے۔ آمدنی کے ذرائع تو مسدود ہو گئے لیکن اخراجات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ روس کے دباؤ کی وجہ سے جو کبھی تو دردانیال کے انتظام میں تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے، کبھی حکومت کے غیر جمہوری ڈھانچے پر حرف زنی کرتا ہے اور کبھی ترکی کی مشرقی سرحد میں تبدیلی پر زور دیتا ہے، حکومت ترکی نے محسوس کیا کہ مجبوراً اپنی فوجی تیاری میں کوئی تخفیف نہ کرے۔ عارضی طور پر اگر جمود و تعطل کی فضا پیدا ہوئی بھی تو ماسکو سے نشر ہونے والے پریشان کن ریڈیائی اعلانات نے اس کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ کبھی آذربائیجان میں پھیلنے والے انتشار نے اور کبھی مشرقی اناطولیہ اور ایران میں کردوں کی شورشوں نے سر اٹھا کر ترکی کی گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ یہ پریشانی بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ ابھی جنگ ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ماسکو اور انقرہ کے مابین کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مشرقی اناطولیہ میں جرمن جاسوسوں اور غیر ملکی پناہ گزینوں کا جم غفیر تھا جن سے روس کو خطرہ محسوس ہوا اور اسی لئے ایک قسم کی نفرت اور بد ظنی پھیلتی چلی گئی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ مارچ ۱۹۴۵ء میں اسی کشیدگی کی بنا پر روس نے ترکی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ان حالات میں ترکی اور روس کے مابین دوستی کے معاہدے کی تجدید نہیں ہوسکے گی۔ اس اعلان کے فوراً ہی بعد مسٹر مولوٹوف نے ترکی کے سفیر متعینہ ماسکو کو لکھ بھیجا کہ ان شرائط پہ دونوں ملکوں میں نیا معاہدہ عمل میں آسکتا ہے۔ ان میں سے اہم شرائط یہ ہیں:- (۱) مونٹریولی قرارداد میں ترمیم کر دی جائے۔ (۲) دردانیال میں روس کو فوجی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ (۳) مشرقی ترکی کے تین اضلاع، قارس، اردہان اور آرٹوین واپس کر دئے جائیں۔ قدرتی امر تھا کہ حکومت ترکی نے ان شرائط کو نا قابل غور سمجھا اور اسلئے دوستی کا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اسکے بعد ساری دنیا کے آرمینی عیسائیوں کو ماسکو اکساتا رہا کہ وہ ترکی آرمینیہ کو

پی ایل آہوجا

آرمینی جمہوریت سے ملا دینے کا مطالبہ کریں کیونکہ وہ سوویت یونین کا ایک حصہ ہے۔ ادھر جارجیا کے پروفیسر کہنے لگے کہ ان کی جمہوریت کو توسیع کا حق حاصل ہے۔ اس شور و غوغا کا نیز ان حملوں کا جو ماسکو ریڈیو کے ذریعہ ترکی کے ارباب حل و عقد اور ان کے اداروں پر ہو رہے تھے اس کے سوا کچھ مطلب نہیں تھا کہ روس اپنے تیل کے علاقے کے جنوب اور مشرق کے ملکوں میں ایسی حکومتیں بنانی چاہتا ہے جو اس کے اغراض کا تحفظ کر سکیں۔

اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکی کو مستقل طور پر دس لاکھ سپاہیوں کی فوج کو ہتھیار بند رکھنا پڑا۔ ان پر جو سالانہ خرچ آتا ہے، وہ ایک ارب روپے سے زیادہ یعنی قومی بجٹ کا نصف حصہ ہوتا ہے۔ اخراجات کا یہ بار ملک کو تباہ کر رہا ہے کیونکہ اب نہ تو زمانۂ جنگ کی تجارت باقی ہے اور نہ ادھار پٹے کی رعایت۔ لڑائی سے پہلے ترکی کا مال وسطی یورپ خصوصاً جرمنی میں خوب بکتا تھا۔ اب وہ بازار غارت ہو چکا ہے۔ رہ گئے دنیا کے دوسرے ملک وہ ترکی کا مال ان قیمتوں پر خریدنے سے رہے، جن کا عادی ترک تاجر ہو چکا تھا لہٰذا ترکی میں معاشی ابتری بے حد پھیلی ہوئی ہے۔ ملک کو حمل و نقل کے لئے گاڑیوں اور دوسری کلوں کی سخت ضرورت ہے لیکن ان کی درآمد کے لئے غیر ملکی تبادلہ محدود ہے، دوسری طرف اس کے منہ مانگے دام پر کوئی بھی ملک ترکی کا مال خریدنے کو تیار نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی فوج برقرار رکھنے کی وجہ سے ملک میں مزدوروں کی کمی ہو گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاوضے میں اضافہ اور ٹیکس کی زیادتی ہو گئی۔ آمد و رفت کے ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے کرایہ وغیرہ بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔ لیکن باہر کا مال نہ آنے کی وجہ سے جنگی باقل (؟) و وصول نہیں ہوتی۔ اسلئے برآمدی مال کی قیمتیں کم نہیں ہو سکتیں۔

غزل

ادیب سہارنپوری

شیخِ حرم نئے ہوں حرم بھی نئے نئے / بتخانے چاہتے ہیں صنم بھی نئے نئے
کن منزلوں کی تاک میں ہے کاروانِ زیست / راہیں نئی ہیں نقشِ قدم بھی نئے نئے
اک مستقل جنوں ہے امنگوں کے ساتھ ساتھ / خوشیاں نئی نئی ہیں تو غم بھی نئے نئے
فطرت کا اقتضا ہے بہرحال بندگی / تم خود تراش لوگے صنم بھی نئے نئے
تابِ مقابلہ بھی خدا ناخدا کو دے / طوفاں بھی پر خروش ہیں یم بھی نئے نئے
صبحِ وصالِ یار کا قصہ بھی لو بہ لو / نقش و نگارِ شامِ الم بھی نئے نئے
"زردار حاتموں" کو کوئی پوچھتا نہیں / کاسے نئے ہیں دستِ کرم بھی نئے نئے
ان کی عنایتوں کے فسانے نہ پوچھئے / غم بھی نئے نئے ہیں ستم بھی نئے نئے
قیدِ غمِ نیاز سے ممکن نہیں نجات / ہے انجمن نئی تو صنم بھی نئے نئے

کیا غم جو اجنبی ہے ذرا گفتگوئے شوق
تم بھی نئے نئے سے ہو ہم بھی نئے نئے

غرض ہزارہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اس اقتصادی بدحالی کا قدرتی اثر ملک کی اندرونی سیاسی حالت پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ عوام میں بے اطمینانی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ روس کا منشا بھی یہی ہے کہ ترکی پر مستقل لام بندی کا بار ڈال کر اسے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے تباہ کر دے۔

انہی اسباب کی بنا پر صدر اِنونو چاہتے ہیں کہ اندرونی معاملات کو سدھار لیں اور سرکاری یا غیر سرکاری اعتراضات کو دبا کر آگے بڑھ جائیں۔ ان کے موجودہ اقدامات کی غرض و غایت یہی ہے۔ مخالفت کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے، ایک کا تعلق براہِ راست "پیپلز پارٹی" سے ہے۔ مخالف جماعت کا نام "ڈیموکریٹک پارٹی" ہے۔ اس کی قیادت ایم جلال بیار کے ہاتھ میں ہے جو پہلے ترکی میں قومی اقتصادیات کے وزیر تھے۔ اس جماعت کا لائحۂ عمل حکومت کے طریقۂ کار سے کسی قدر مختلف ہے۔ اسکے اراکین زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنکو پچھلے سال پیپلز پارٹی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کی پشت پناہی چند مشہور آزاد خیال اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں ترقی کے راستوں سے روک دیا گیا تھا۔ لیکن ابتک انہوں نے مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اپنے رجحان طبع کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ اس نے تو کوئی ایسا کارنمایاں بھی پیش نہیں کیا جو اس سے قبل دائرۂ وجود میں آنے والی مخالف جماعت نے کر دکھایا تھا جس کی قیادت مسٹر فتحی اوخیار نے کی تھی اور جسے ۱۹۳۰ء میں کچل کر رکھ دیا گیا۔ شاید موجودہ مخالف جماعت نے کسی مضبوط بنیاد پر اپنا نظام قائم کیا ہو۔ انتخابات کے دوران

بھی اس امر کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کی اہمیت کس قدر ہے۔ چونکہ انتخابات کی تاریخیں بڑھا دی گئی تھیں اسلئے اس نے شرکت سے انکار کردیا اور کہا کہ وہی تاریخیں مقرر کی جائیں جو پہلے طے کی جاچکی تھیں۔

ایک اور مخالف جماعت بھی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے ترکی کی رفتار عمل کو بدل دے گی۔ لیکن چونکہ روس سے اس کی سازباز تھی اس لئے حکومت نے اسکو پنپنے نہ دیا۔ پریس کو بہت کچھ آزادی دینے کے وعدوں کے باوجود اخبارات پر پھر احتساب لگی ہوتی ہے اور ان کے ہر فعل کو روکا جاتا ہے۔ مثلاً ۴ دسمبر کو نام نہاد محبان وطن نے ان کے دفتروں اور چھاپہ خانوں میں آگ لگادی اور یہ سب کچھ دانستہ طور پر ہوا کیونکہ اگر پولیس کو ہدایات دی جاتیں تو اس کی روک تھام آسانی سے ممکن تھی۔ اس کے بعد اخبار "تان" کے مدیر مسٹر اثمار کو اور اس کی بیوی کو جو روسیوں کی حامی ہے گرفتار کرکے کچھ عرصے کے لئے معطل کردیا۔ اس سلسلے میں کوئی پیشی نہیں ہوئی۔ بلکہ انہیں اس جرم میں کہ انہوں نے حکومت کے وقار کا مضحکہ اڑایا ہے ایک سال کی سزا دیدی گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت سیاسی اعتبار سے وہ مرتبہ دوبارہ حاصل کرسکتی ہے یا نہیں جسے وہ کھو چکی ہے۔ بہت کچھ انحصار ان غیر ترکی النسل باشندوں پر ہے ــ مثلاً آرمینی، کرد، یہودی اور دوسرے لوگ ــ جنکے خلاف پچھلے چند سالوں پر کافی تفریق و امتیاز کا سلوک روا رکھا گیا، خصوصاً ان پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔

جہاں تک اقتصادی حالت کا تعلق ہے وہ اپنی حیثیت استوار کرنے اور ہر دلعزیز بننے کے لئے کئی کام کرسکتی ہے۔ سب سے پہلی چیز لام شکنی ہے۔ زمانہ جنگ کے بہت سے تجربات حاصل کرلینے کے بعد یہ محض بے وقوفی ہے کہ ایک مختصر سی حکومت ایک بے پناہ قوت والی فوج اپنی سرحد پر خواہ مخواہ ڈالے رکھے۔ اگر بفرض محال روس کی جانب سے حملہ بھی ہو تو ترکی مدافعت کے ان روایتی طریقوں کو عمل میں لاسکتی ہے جن سے اس طوفان کا سدباب ہوسکتا ہے۔ ترکی ایک پہاڑی ملک ہے اسلئے بڑے پیمانے پر وہ فضائی حملے کی روک کے لئے کوئی اہم مرکز قائم نہیں کرسکتا البتہ اسے اپنے چھاپہ مار سپاہیوں کو گڑھوں اور پہاڑی کھوؤں میں چھپا کر رکھنا پڑے گا تاکہ دشمن کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے سیلاب کو فوراً روکا جاسکے۔ اس کام کے لئے موجودہ فوج کا صرف تہائی حصہ کافی رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر لام شکنی سے ملک کی مدافعت کسی طرح بھی کمزور نہیں پڑسکتی تو خرچ کم ہوجانے سے قوم کی اقتصادی حالت ضرور سدھر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اور طریقے بھی عمل میں لانے ہیں تاکہ ترکی کی بین الاقوامی تجارت ایک بار پھر فروغ پاسکے۔ مثلاً اس وقت تجارت کے سلسلے میں جو مصنوعی رکاوٹیں لگا رکھی ہیں فوراً ترک کردی جائیں۔

مضبوط بنیادوں پر ایک ایسا ملک جو بیک وقت اندرونی انتشارات کی بھرمار کو اور غیر ملکی دباؤ کے اثرات کو جھیل سکے ایک دن میں تعمیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے بشرطیکہ صدر اُنونو مخالف جماعت سے زیادہ مفاہمت کے ساتھ بازی کھیل سکیں جس میں سیاسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ نسلی امتیازات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہو۔ پچھلے چند سالوں میں انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی قوم کو عروج دینے میں کمال اتاترک کی حکمت عملی بہت بلند پایہ تھی۔ ان کی رہنمائی میں ترکی دنیا بھر میں مقبول ہوگیا۔ اس کی کامیابی پر پاس پڑوس کے لوگ آتش رشک سے جلنے لگے۔ اگر جنگی اعتبار سے ملک کے محل وقوع کا لحاظ رکھتے ہوئے یا پرانی وضع سے جنگی طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے یا اس کی اقتصادی ابتری کے پہلو پر غور کرکے اس طریقۂ کار کو اختیار کرلیا جاتا جب اس کی بابت کہا گیا تھا کہ "وہ یورپ میں بستر مرگ پر لیٹے ہوئے بیمار کی حیثیت رکھتا ہے" تو ظاہر ہے کہ ترکی کے لئے اس سے بڑا کوئی سانحۂ عظیم نہ ہوتا۔ بیمار اب بھی خطرے میں ہے لیکن اس کی صحتیابی کی امیدیں ہنوز قائم ہیں۔

موجودہ نظام کے مطابق ایک ترکی تاجر کے لئے جس نے مال درآمد کرنے کے لائسنس حاصل کرلیا ہو یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ لائسنس جاری ہونے پر چار ماہ کے اندر اندر مال جہازوں پر لد جائے ورنہ لائسنس منسوخ ہوجائے گا۔ لیکن اسوقت جبکہ ساری دنیا میں جہازوں کی کمی ہے اور ان کی صحیح روانگی کا کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا، ایسی شرط ناقابل عمل ہے۔ تجارتی مال کی مانگ اس کی فراہمی کے مقابلے میں ابھی بہت بڑھی ہوئی ہے اور غیر ملکی تاجر مصنوعی رکاوٹوں کو توڑ دینے کی کوشش کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں جبکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا مال کسی قسم کی دشواری کے بغیر دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں جاتے ہی فوراً بک جائے گا۔ اس تمام نظام کا احتیاط سے جائزہ لینا اور ان پابندیوں کو ہٹا دینا ضروری سا ہے جو تجارتی ترقیوں میں حائل ہوں۔

تجارتی ترقیوں کے سلسلے میں ایک اور اہم پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے اور وہ ہے ترکی پونڈ کی شرح مبادلہ۔ اس وقت ایک اسٹرلنگ پونڈ کے عوض ۵ء۲ پونڈ دینے پڑتے ہیں اور یہ شرح تقریباً

معین ہے۔ اگر مال برطانیہ بھیجا جائے تو اس پر چالیس فیصدی پریمیم بھی منظور کر دیا جاتا ہے۔ اگر اصل قدر و قیمت میں اضافہ ہو جانے کے باوجود ترکی پونڈ کی قیمت بحسبہٖ رہے تو ظاہر ہے کہ ترکی سے باہر جانے والے مال کے دام گر جائیں گے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر چیزیں اندرون ملک میں صرف ہوں تو خریدار پر خرچ بار پڑے گا لیکن اگر باہر بھیجنے کی صورت پیدا کر لی جائے تو زیادہ مقدار میں باہر کی چیزیں آسکتی ہیں اور اس طرح خریدار کو زیادہ فائدہ رہ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قانون بھی اصول تجارت کے خلاف ہے جس کی رو سے ترکی میں قائم ہونے والی غیر ملکی کمپنیوں کے لئے اپنا منافع باہر بھیجنا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے حکومت ترکی کو غیر ملکی سرمائے کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسا سرمایہ آسانی سے اسوقت تک میسر نہیں آسکتا جبکہ منافع کے ایک مخصوص حصے کو باہر بھیجنے کی اجازت نہ مل جائے۔

حکومت ترکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی زائرین کو اپنے ہاں آنے کی سہولت دے۔ ترکی زائرین کے لئے ایک نہایت مناسب ملک ہے کیونکہ وہاں قدرت کی حسن کاریاں چپے چپے پر موجود ہیں۔ اس کی تاریخی حیثیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر تفریح کے اعتبار سے بھی اس کا شمار اعلیٰ ملکوں میں ہو سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ موجودہ لڑائی کے بدنما داغوں سے اس کا دامن بچا رہا ہے۔ اب تک اس کی اس اہم تجارت کو ترقی دینے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن صنعتی اعتبار سے اہمیت حاصل کر لینا اس کے لئے یقینی ہے۔ (”فورن ریویو“ سے ماخوذ)

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل ... حضرت جگر مرادآبادی ...
۲۔ اردو زبان کے محسن۔ نصیر الدین ہاشمی (مع تبصرہ) ... محترمہ رضیہ سلطانہ بدایونی
۳۔ صدرالدین عینی۔ ایک تاجیک ادیب ... جناب ل احمد اکبرآبادی ...
۴۔ آسان اردو ... ڈاکٹر مولوی عبدالحق ...
۵۔ افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات ... جناب احمد علی کہزاد ...
۶۔ موئے آتما (خاکہ) ... جناب اشرف صبوحی ...
۷۔ ”ہجوم تجلی سے مسحور ہو کر“ جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو ... جناب اکبر فاروقی مرادآبادی ...
۸۔ چینی جیہ مالا ... فضل حق قریشی دہلوی ...
۹۔ زندگی کا ناچ (افسانہ) ... جناب خالد حسن قادری ...
۱۰۔ جنوب مشرقی ایشیا اور ہندوستان ... جناب جی آر وینکٹا رامن ...
۱۱۔ غزلیات ... حضرت نہال سیوہاروی ...
۱۲۔ میرے من کی آشا جاگ (گیت) ... جناب بالمکند عرش ملسیانی

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱ | فہرست | ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیرِ اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے ملک

ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر متعینہ اسکندریہ کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں مصر نے ۸۷،۴۸،۶۵۲ پونڈ کا مال ہندوستان بھیجا۔ اس کا ۹۷ فیصدی حصہ صرف خام کپاس کے ضمن میں ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان سے مصر جانے والے مال کی مجموعی قیمت ۲۹،۳۰،۱۵۳ پونڈ تھی۔ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں یہ رقم بقدر ۵ لاکھ پونڈ کم ہے۔ اس رقم میں سے ۹،۳۹،۸۵۹ پونڈ کا سن کا سامان، ۹۶،۸۶۹ ، ۱ پونڈ کا تمباکو اور سگار، ۶۷،۴۸ ، ۱ پونڈ کی روئی اور سوتی کپڑے کے تھان اور سوت، اور ۸۳،۴۹ پونڈ کی چائے بھیجی گئی۔ اسی سال ۲،۳۲،۳۲،۸۱۲ پونڈ کا مال ہندوستان سے سوڈان بھیجا گیا۔ یہ ملک کی کل درآمد کا ۲۸.۱ فیصدی تھا۔ اس میں سب سے زیادہ مقدار سوتی کپڑے کی تھی یعنی ۶۰۰، ٹن کپڑا جس کی مالیت ۲۲،۲۰،۲۸۰ پونڈ تھی بھیجا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں سوڈان سے صاف کی ہوئی ۲۵،۱۱۴ ٹن روئی جس کی مالیت ۲۲،۳۲،۰۰۳ پونڈ تھی ہندوستان آئی۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں سوڈان جانے والے مال میں بے قیاس اضافہ ہوا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ان ملکوں میں جو مال سوڈان پہنچا، ہندوستان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ چنانچہ ابتدائی تین ماہ میں ۷ [illegible] ۱۱۰،۵ پونڈ کا مال بھیجا گیا جو وہاں کی کل درآمد کا ۳۵ فیصدی حصہ تھا۔ سوڈان میں ہندوستانی کپڑے کی بہت زیادہ کھپت ہے۔ کپڑے، دیا سلائی اور ٹاٹ کی بوریوں کے ضمن میں اس ملک کی کل ضروریات ہندوستان سے پوری ہوتی ہیں۔ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی بھی وہاں بڑی مانگ ہے مثلاً کینوس کے جوتے خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے ابتدائی تین ماہ میں سوڈان سے ۶،۴۴،۲۳۷ پونڈ کا مال ہندوستان آیا جو وہاں کی کل برآمدی تجارت کا ۳۲.۶ فیصدی حصہ ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ۲۰،۴۷،۰۳۵ فلسطینی پونڈ کا مال ہندوستان سے فلسطین گیا۔ اس میں سے نصف حصہ صرف مونگ پھلی کا تھا۔ اس سال فلسطین سے ہندوستان آنے والے مال کی قیمت ۹،۶۲،۶۰۸ فلسطینی پونڈ ہوئی۔ اسی سال میں ہیرے کے نگوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی سال ہندوستان ۶۲،۸۱،۰۰۰ شامی پونڈ کا مال شام اور لبنان گیا۔ ۱۹۴۴ء میں کل رقم ۵۷،۵۵،۰۰۰ شامی پونڈ تھی۔ اس مال میں سب سے زیادہ مقدار سن سے زیادہ تیار کی ہوئی چیزوں کی تھی۔

ہندوستان اور کنیڈا

ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر متعینہ کنیڈا کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اپریل کے بالمقابل مئی ۱۹۴۶ء کے دوران میں وہاں سے ہندوستان آنے والے مال میں بہت اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اپریل میں ۶۹،۰۳،۰۰۰ روپے کا مال آیا تھا اور مئی میں ۳۵،۱۰،۴۴،۰۰۰ روپے کا۔ اضافہ کی سب سے بڑی وجہ گیہوں کی درآمد ہے۔ اس رقم میں سے ۸۷،۸۲،۸۵۱ روپے کا صرف گیہوں آیا۔ اس کے برعکس ہندوستان سے ۷۳،۰۸،۰۰۰ روپے کا مال گیا جبکہ اپریل کی رقم ۵۹،۰۶،۰۰۰ روپے تھی۔ یہاں سے جانے والے مال میں سب سے زیادہ مقدار سن کے کپڑے، اخروٹ، چائے اور دباغت شدہ چمڑے کی تھی۔ اگر جنوری سے مئی ۱۹۴۶ء تک کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ مبلغ ۴۲،۴۹،۲۰،۰۰۰ روپے زیادہ کا مال کنیڈا سے ہندوستان آیا۔ ٹریڈ کمشنر کی رپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مئی ۱۹۴۶ء میں اخبار کے کاغذ کی تیاری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی رہی اور پارچہ بافی کے کارخانوں میں بھی کچی روئی کا خرچ ترقی پذیر رہا۔

ہندوستان اور ارجنٹائن

حال ہی میں ہندوستان اور ارجنٹائن کے مابین ایک تجارتی معاہدہ عمل میں آیا ہے۔ اس کی رو سے حکومت ارجنٹائن نے اس اناج کی برآمد کا جائزہ

فوراً دے دیا ہے جو ہندوستان نے ارجنٹائن سے خریدا تھا۔ اس اناج میں ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن مکئی اور پچیس ہزار ٹن گیہوں شامل ہے اس کے عوض ہندوستان نے اس سال کے آخر تک تیس ہزار ٹن سن دینے کا ذمہ لیا ہے ۱۹۴۷ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں بھی تیس ہزار ٹن سن دیا جائے گا۔ ہندوستان نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اس ملک سے ربڑ کے ٹائر اور ٹڈے مارنے کی دوائیں خریدنے میں ارجنٹائن کی مدد کرے گا۔ معاہدے میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اناج پہنچانے کے سلسلے میں ارجنٹائن اپنے بحری جہاز پیش کر سکے گا جن کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسی لئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تینوں جہاز نو نوٹن مکئی لے کر وہاں سے چل پڑے ہیں اور عنقریب ساحل ہند پر لنگر انداز ہونے والے ہیں۔ یہ بھی طے پایا ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کو آئندہ سامان خریدنے میں ہر قسم کی سہولت دیں گے۔ حکومت ہند کی طرف سے دیوان چمن لال نے معاہدے پر دستخط کئے اور ارجنٹائن کی طرف سے ارجنٹائن سنٹرل بنک کے صدر سینور میگوئل میراندا نے دستخط کئے ہیں۔ عنقریب دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی پیدا ہو جائیں گے اور دونوں کے سفیر ایک دوسرے ملک میں رہنے لگیں گے۔

ہندوستان اور روس

مسٹر وی کے کرشنا مینن نے جن کو عبوری حکومت کے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے نجی قاصد کی حیثیت سے پیرس بھیجا تھا، روس کے وزیر خارجہ موسیو مولوٹوف سے ملاقات کی اور ہندوستان کے موجودہ مسائل کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ دونوں ملکوں کے مابین سفارتی تعلقات عمدہ پیمانے پر استوار رہنے چاہئیں، یہ معلوم کرنا چاہا کہ فی الحال روس سے کس قدر اناج کا ہندوستان بھیجا جانا ممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیو مولوٹوف نے بڑی توجہ کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا اور تسلیم کیا کہ آئندہ دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے سفیروں کا رہنا ضروری ہے۔ لیکن خوراک کے معاملہ میں انھوں نے بالکل صاف جواب دیدیا۔ انھوں نے بتایا کہ خود روس میں اشیائے خوراک کی اس درجہ کمی ہے کہ فی الحال اناج کا باہر بھیجا جانا کسی عنوان ممکن نہیں ہو سکتا تاہم انھوں نے ہندوستان کے نازک مسئلہ خوراک کے سلسلے میں اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ میں بہت جلد روس پہنچنے پر اس مسئلہ کو اٹھاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہندوستان کے لئے کس حد تک اناج بھیجا جانا ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر جواب انکار کی صورت میں ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا حقیقی سبب مجبوری ہے۔

انگلیوں کے نشانات

لندن کا "اسکاٹ لینڈ یارڈ" نامی محکمۂ پولیس اپنی کامیاب سراغرسانی کے سلسلے میں عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے تحقیق و تفتیش کے طریقے نرالے لیکن بڑے نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ اب اس نے جرائم کے خلاف جدوجہد کرنے کے سلسلے میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ وہاں سے ریڈیو کے ذریعہ انگلیوں کے نشانات دور دراز علاقوں تک پہنچائے جایا کریں گے تاکہ انکو مدنظر رکھتے ہوئے مجرموں کی تلاش بلا تاخیر شروع کر دی جایا کرے۔ حال ہی میں اس قسم کے کئی تجربات عمل میں لائے گئے۔ لاسلکی کے ذریعہ انگلیوں کے نشانات کی نقلیں امریکہ اور آسٹریلیا بھیجی گئیں جن میں سر مو فرق پیدا نہ ہو سکا۔ قوی امید ہے کہ ایک سال کے اندر اندر دنیا بھر کے پولیس محکمے اس طریقہ کار پر عمل کرنے لگیں گے۔ انگلیوں کے نشانات کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ یہ بھی کیا گیا کہ مقتول کے جسم کی کھال سے ان نشانات کی تصویریں لی گئیں جن سے قاتلوں کا پتہ لگانا آسان ہو گیا۔

برطانیہ اور دوسری جنگ عظیم

ادارۂ اقوام متحدہ نے ایک خاص سب کمیٹی بنائی تھی جس کا کام اس جنگ کے سلسلے میں مختلف قسم کے اخراجات و نقصانات کے اعداد و شمار جمع کرنا تھا۔ حال ہی میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف برطانیہ کو اکیس ارب پونڈ نقد خرچ کرنے پڑے۔ برطانیہ کے تیس فیصدی مکان بالکل مسمار ہو گئے۔ ان کے علاوہ اور عمارتوں کو بھی نقصان پہونچا ہے۔ جنگ سے پہلے بحری جہازوں کا مجموعی وزن جو کچھ بھی تھا، اب وہ آدھا رہ گیا ہے۔ سمندر پار ملکوں میں لگائے ہوئے سرمایہ کی آمدنی بھی نصف رہ گئی ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۴۶ء کے وسط تک ساٹھ لاکھ فوجی مختلف ملازمتوں سے الگ کئے جا چکے ہیں۔ اب باقی ماندہ کی تعداد تقریباً وہی ہے جو ۱۹۳۹ء کے شروع میں تھی البتہ اب یورپ میں برطانیہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں وہاں برطانوی مال کی کھپت بہت زیادہ ہو گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے خسارہ کو بہت جلد پورا کر لیا جائے گا۔

قراقرم کے دامن میں

کشمیر اور سنکیانگ کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ کوہ قراقرم کے دامن میں آٹھ نو سو مربع میل کا علاقہ اتنا سخت، دشوار گزار اور پیچیدہ ہے کہ آج تک کسی شخص کو اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تاہم اب چند من چلے نوجوانوں نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چنانچہ سائنسدانوں اور نقشہ نویسوں کی ایک جماعت اس علاقے میں بھیجنے کے لئے لندن میں

ضروری خاکے مرتب کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے قائد کپتان فرنیک مینڈیز ہوں گے جو حال ہی میں برطانیہ کے شاہی خبر رساں دستے سے الگ ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے محکمۂ سروے نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی منظوری دیدی ہے۔ دو نقشہ نویسوں کے علاوہ ایک ماہر طبقات الارض بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ لوگ تقریباً بارہ مہینے اس علاقہ میں بسر کرینگے لڑائی سے پہلے بھی اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن چند دشواریوں کے باعث وہ پورا نہ ہوسکا۔ کپتان موصوف فوج میں ۱۴ سال رہ چکے ہیں۔ اس مدت میں سے دو سال ہندوستان میں بھی بسر کئے ہیں۔ اس لئے خاص طور پر انھیں اس ملک سے دلچسپی ہے۔ انھوں نے سولستان میں بھی کوہ نوردی کی ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ اس مہم کے سامنے وہ تجربات معمولی کہے جائیں گے۔ کیونکہ اس علاقے میں وہ دشواریاں لاحق ہیں جن سے وہاں دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔ وہ تقریباً ایک ماہ بعد لندن سے روانہ ہوکر ہندوستان پہنچیں گے اور جلدی ہی اپنا کام شروع کر دیں گے۔

مسئلۂ خوراک و زراعت

زراعتی تحقیقات کی شاہی مجلس کے سولھویں اجلاس میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو عبوری حکومت کے محکمۂ خوراک و زراعت کے رکن ہیں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ دونوں وقت کا پیٹ بھر کھانا ہر ہندوستانی کو مل جانا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں قدرتی ذرائع کی کمی نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ منظم سائنسی ترقی پر ہر ملک کی نجات کا دار و مدار ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اپنی زیادہ توجہ زراعت اور پرورش مویشیان کی طرف مبذول کریں اچھے اوزاروں اور آبپاشی کے طریقوں کی چھان بین کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ مالی اعتبار سے ہمارے کسانوں کے لئے بار خاطر نہ ہوں۔ ہمارے ملک کی زمینیں پیاسی ہیں اور ان کی تشنگی بجھانے کے لئے ضروری ہے کہ نہروں، کنوؤں اور حوضوں کا ایک جال سستے داموں بچھا دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ زراعت و خوراک کے مسائل کو دوسری تمام صنعتوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جائے۔ اس ملک میں کاشتکاری کا پورا انحصار بیلوں پر ہے۔ اس لئے ہماری توجہ گئو رکھشا کی طرف بھی مبذول ہونی چاہئے۔ گائے اور اس کے بچے نہ صرف دودھ مکھن کے سلسلے میں مفید رہیں گے بلکہ بیلوں کے لئے بھی ان کا وجود ضروری ہے۔ سائنس کو انفرادی طور پر کوئی خاص ترقی نصیب نہیں ہوسکتی، اس لئے ملک بھر کے اعلیٰ دماغ لوگوں کو چاہئے کہ سر جوڑ کر اجتماعی حیثیت سے ان مسائل پر غور کریں تو باہمی تبادلۂ خیالات کے ذریعہ اپنے وطن کو فائدہ پہنچایا جاسکے۔ اناجوں کے علاوہ گنے کی کاشت کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہم زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرف مبذول کریں تو وہ لاکھوں روپے کی رقم جو اب تک باہر جاتی رہی ہے، اپنے ہی وطن میں رہ سکتی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زراعتی تحقیقات کی شاہی مجلس کو یقین دلایا کہ اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں انکا پر خلوص دست تعاون ہمیشہ دراز رہے گا۔

برما میں نئی حکومت

۲۶ ستمبر کی شام اہل برما کے لئے بہت مبارک اور بھاگوان تھی کیونکہ ان کے ملک میں قومی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ برما کے گورنر سر ہیوبرٹ رانس نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ برما کی تمام بڑی سیاسی جماعتیں متفق ہوگئی ہیں اور اب ان سب کے نمائندے عبوری حکومت میں لئے جا رہے ہیں۔ اراکین کی کل تعداد گیارہ ہے جن میں سے چھ اینٹی فیسٹ لیگ کے ہیں۔ اس لیگ کے صدر میجر جنرل اونگ سان جمہوری حکومت کے نائب صدر ہونے کے علاوہ امور خارجہ اور دفاع کے محکموں کے رکن ہیں۔ دوسری پارٹی کے قائد یو سا ہیں۔ وہ تعلیم اور قومی تعمیر کے محکموں کے رکن مقرر کئے گئے ہیں۔ برما کی یہ نئی حکومت بالکل ہندوستان کی نئی حکومت کی طرح کام کرے گی اور اسے اتنے ہی اختیارات حاصل ہوں گے۔ وہاں کے لوگوں کو بھی دفاع اور امور خارجہ کے عہدے سنبھالنے کا فخر زندگی میں پہلی بار حاصل ہو رہا ہے۔ گورنر برما نے تمام باشندگان ملک سے پر خلوص اتحاد عمل کی درخواست کی ہے تاکہ ملک میں نئی روح پھونکنے اور اسے ترقی کے راستے پر چلانے میں آسانی ہو۔ انھوں نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ نئی مجلس انتظامیہ کے جملہ اراکین پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کیا جائے تاکہ انھیں نت نئے خاکے اور منصوبے تیار کرنے میں کسی قسم کی دشواری لاحق نہ ہو۔ برما ہندوستان کے پڑوس میں واقع ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ہی ساتھ برما میں بھی عبوری حکومت کا قائم ہو جانا دونوں ملکوں کے لئے ایک شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے دونوں ملکوں کے مابین ثقافتی تعلقات قائم ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ یہ تعلقات زیادہ استوار ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ برما کی نئی حکومت نے ہندوستان کی قومی حکومت کو ایک لاکھ ٹن چاول کی پیش کش بھیجی ہے اور اس کے عوض روزمرہ کی ضروریات کا ایسا سامان مانگا ہے جو ہندوستان آسانی سے برما بھیج سکے۔ یہ اطلاع آئندہ کی امیدیں قائم کرنے کے سلسلے میں بہت ہی خوشگوار ہے۔

غزل

جگر مُرادآبادی

توہینِ عشق دیکھ! نہ ہو اے جگر! نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو
یہ اور بات ہے تمہیں ابتک خبر نہ ہو

جس دل میں ہے لگی ہوئی اب ہر طرف سے آگ
ظالم یہ دیکھ لے کہیں تیرا ہی گھر نہ ہو

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بیخودی کیساتھ
کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

دریائے حسن و کارِ غمِ عشق، ناصحا
یہ کیا کہا؟ "ترا سرِ دامن بھی تر نہ ہو"

پیشِ نگاہِ شوق ہے اک حسنِ بے پناہ
ڈرتا ہوں میں کہ یہ بھی فریبِ نظر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں، نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو، الٰہی خبر نہ ہو

یا طالبِ دُعا تھا میں ایک ایک سے جگر
یا خود یہ چاہتا ہوں دُعا میں اثر نہ ہو

اردو زبان کے مورّخ نصیر الدین ہاشمی

ربیعہ سلطانہ

شہرت سے دور، صلے سے بے نیاز، ستائش سے بے پروا، اپنی دھن میں مگن، اردو زبان کی خدمت کرنیوالے لوگ ذرا مشکل ہی سے ملیں گے — ایک جذبہ ہے، ایک لگن ہے، کہ جس کے ماتحت بس وہ کام کئے جاتے ہیں، ایسے لوگ ہوتے ہیں، مگر کم، جو باوجود کثرت افکار اور دیگر مشاغل کے بھی اردو کی خدمت کئے جاتے ہیں۔
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اس پایہ کی ہستی ہیں جو بیس سال سے مسلسل اردو زبان کی سچی اور خاموش خدمت کر رہے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ زبان اردو نے خود بخود اتنی وسعت اختیار کرلی ہے۔ اس کی ترقی کے لئے، جو کوششیں کی جارہی ہیں، اور اب تک کی گئی ہیں وہ اس زبان کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے بہت ہی محدود ہیں، لیکن شائد قدرت ایسے ہی لوگوں کو پیدا کر کے لیتی ہے، جو خود نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، مگر ایک شوق ہے کہ خود بخود اسطرف مجبور ہو جاتے ہیں، ایک ذوق ہے جو انھیں اسطرف کھینچ لے جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب کے سارے کارناموں میں یہی جذبہ کار فرما ہے جسے آگے چل کر میں ذرا تفصیل سے بیان کروں گی۔ ہاشمی صاحب ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :—

"مجھے تو سرے سے یہ کہنا ہے کہ میں نے ابتک اردو زبان پر کوئی احسان ہی نہیں کیا ہے، جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ اپنا شوق ہے، کوئی اپنا شوق پورا کرے تو بھلا آپ ہی فرمائیں احسان کیسے ہوگا —؟"

یہ عجز نہیں، یہ خاکساری نہیں، حقیقت ہے، مگر جس کو ہاشمی صاحب اپنے "شوق" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کم و بیش "عشق" کی حدوں تک پہنچا ہوا ہے اگر آپ انکی ساری علمی جدوجہد کا جائزہ لیں تو صرف ایک ہی فیصلہ پر پہنچیں گے کہ ہاشمی صاحب کو اردو زبان سے محبت ہے، اور تصانیف کا یہ سارا مجموعہ اسی محبت کا اظہار ہے۔ زبان اردو کی خدمت کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا ہے، اردو کے مصنفین میں بلاشبہ وہ حضرات ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، جنہوں نے اردو کی خدمت بے لاگ اور ذاتی منفعت سے دور رہ کر کی ہے، بلکہ یہ ایک طرۂ امتیاز ہے کہ معاش کے لئے تو غیر علمی مشغلہ ہے، لیکن فرصت کے اوقات میں اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھتے ہیں۔ اور زبان کی خدمت کرنے ہی میں اپنے دماغ کا سکون اور دل کی راحت تلاش کرتے ہیں۔ یہ ایثار ہے، یہ قربانی ہے، ان فرصت کے لمحات کی جب

انسان دن بھر کی محنت کے بعد فرصت پاتا ہے، تو تفریح و راحت کے وہ دیگر لوازم تلاش کر لیتا ہے جن کو آرام کہتے ہیں، مگر ہاشمی صاحب کی علمی سرگرمیاں وقتی چیز نہیں ان کی تصانیف نرے جذبات ہی نہیں، بلکہ ٹھوس علمی حقیقتیں ہیں، جو برسوں کی دیدہ ریزی جاں فشانی و جانکاہی کا نتیجہ ہیں، ان کا علمی سرمایہ تفریحی نہیں، بلکہ مدتوں کی کھوج اور سر کھپانے کا نتیجہ ہے۔
خوشا! وہ لوگ جن کی تفریح علمی محنت ہے، جنکا شوق ادبی کاوش ہے۔ یہ مزید ہے کہ ہاشمی صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ علمی خدمت کرنے میں کافی حصہ لیتا رہا ہے، اور اس خاندان نے کثیر تصانیف و تالیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاشمی صاحب نے بھی علمی خدمت کا شوق اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پایا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس عزیز امانت کی ذمہ داری انھوں نے کہاں تک محسوس کی ہے وہ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے، بارہ سال کے ہوئے یعنی ابھی ہوش و خرد نے آنکھیں بھی نہ کھولی تھیں کہ شفقتِ پدری سے محروم ہوگئے، ظاہر ہے کہ یہی زمانہ بچوں کو راہ راست پر لگانے کا ہوتا ہے، یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ بچے کو جس سانچے میں چاہو، ڈھال لو، بری صحبت میں بٹھاؤ تو "پسر نوح با بداں بنشست — خاندان نبوتش گم شد" کا مصداق بن جائے۔ اچھی راہ لگاؤ تو ماں باپ کا نام روشن کرے، باپ ایک ایسا رہبر ہوتا ہے جو بیک وقت محبت بھی کرتا ہے، اور محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے، لیکن یہاں صرف ماں کو یہ کام انجام دینا تھا، اور یہ صرف ماں کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہاشمی صاحب علم کی شاہراہ پر گامزن ہوسکے۔

ہاشمی صاحب کی صحت تمام زمانۂ طالب علمی خراب رہی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سارا بچپن دائم المریض رہے، اور باوجود اس کے کہ ان کو صحیح رہبری کے لئے اچھے ذرائع میسر نہ تھے، پھر بھی ان کے فطری ذوق نے ان کی رہبری کی۔ اور مطالعہ کے شوق نے ان کو اس علمی ماحول میں پہنچا دیا، جس نے کبھی ان کو اپنے شوق سے غافل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ جوں جوں سمجھ آتی گئی، حصول مدعا کے لئے آتش شوق تیز تر ہوتی گئی۔ مدرسۂ دار العلوم میں انکی ماں نے

انھیں شریک کیا، صحت نے جواب دیدیا، اور باقاعدہ پڑھائی کی کوئی صورت نہ بن آئی، لیکن شوق دامنگیر تھا، بالآخر انھوں نے اپنے مطالعہ کو اتنی وسعت دی کہ آج وہ چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، غرض یہ شوق ہی تھا، یہ ذوق ہی تھا جس میں دریا سی روانی تھی یہی ان کا ناخدا تھا، جو رکاوٹوں کے بھنور سے ان کو نکال لیتا تھا، ہاشمی صاحب کو علم ہے کہ یہ انکی والدہ محترمہ کی تربیت کا نتیجہ ہے، اور اس شکر کا اظہار وہ اس ہمدردی کے پیرائے میں کرتے ہیں جو نسوانی دنیا سے ان کو ہے۔

ہاشمی صاحب کا وطن حیدرآباد دکن ہے۔ سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں قدردانان علم وفن کی بہتات رہی ہے، اور وہاں ہمیشہ ایسے حضرات عالم وجود میں آتے رہے، جنھوں نے زبان اردو کی خدمت اپنا حاصل زندگی بنالیا، ہاشمی صاحب نے جب ہوش سنبھالا اپنے کو ایسے ہی ماحول میں پایا۔

یہ تو ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان اپنے کو ماحول سے جدا نہیں کرسکتا، اور جس گرد وپیش میں اس کی نشو ونما ہوئی ہو، جس تمدن میں اس نے آنکھیں کھولی ہوں، اس سے بالکل علیحدہ کوئی چیز پیش کرے، وہ اپنے زمانہ کے رجحانات سے الگ ہوکر کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی تخلیقی قوتیں جدت وندرت وتازگی کی علم بردار ہوسکتی ہیں، لیکن ان میں ضرور انھیں فضاؤں کے نقوش ہوں گے جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ اسی خاک کے اثرات ہوں گے جس سے وہ پیدا ہوا ہے، انھیں خیالات کی پرواز ہوگی، جن میں وہ پروان چڑھا ہے۔ ہم کو ہاشمی صاحب کے صحیح ماحول کا اندازہ خود موصوف کی تصنیف "تذکرہ دارالعلوم" سے ہوتا ہے، جہاں ان کی تعلیمی جدوجہد کی ابتدا ہوتی ہے، حالانکہ وہاں کی زندگی بہت مختصر رہی، یہ بات بھی اس ضمن میں خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ انھوں نے جس زمانہ میں اردو کر دلچسپی لینا شروع کی مولانا شبلی کی علمیت اور ان کی تصنیفات کا سارے ہندوستان میں ڈنکا بج رہا تھا۔

ہاشمی صاحب مولانا شبلی سے بہت زیادہ اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں اور ان کا یہ اندازہ اور ان کی یہ تخصیص مضامین جو انکی تصانیف سے عیاں ہے، وہ مولانا شبلی کے تتبع کو ظاہر کرتا ہے، شبلی ایک عجیب وغریب حیثیت کے مالک ہیں، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، اگر ہاشمی صاحب ان سے متاثر ہوئے ہیں، ان کو بچپن سے تاریخ، سوانح اور سفرناموں سے دلچسپی رہی ہے، اور علامہ شبلی کی کتابیں ضرور ان کے طبعی رجحانات کے لئے باعث تسکین ثابت ہوئی ہونگی۔ اس زبردست شخصیت سے کسب فیض کے علاوہ ان کو حضرت امجد، ادیب، مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم جیسے یگانۂ روزگار حضرات کی صحبت کا بھی شرف حاصل رہا۔ ادھر تحقیق وتنقید کا شوق ادھر ان باذوق استادوں کی علمی صحبتوں کی جلا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، اور اس لئے ہاشمی صاحب کے لئے ایک مخصوص راہ نکل آئی، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بیشتر تصانیف تاریخ ادب اردو سے متعلق ہیں، مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب نے "مقالات ہاشمی" کے پیش لفظ میں ہاشمی صاحب کے متعلق جو رائے دی ہے اس کے چند فقروں کا اعادہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

"میرے دوست سید نصیرالدین ہاشمی صاحب ان لوگوں میں ہیں، جو سارے دن دفتر کا کام کرنے پر بھی چپکے نہیں بیٹھتے .... انھوں نے صرف ایک ہی مضمون لولیا ہے، اور اسی دائرہ میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں ایسے ہی لوگ کچھ کر جاتے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے کارنامے کچھ رہ جاتے ہیں۔ بھلا دنیا میں وہ لوگ کیا کرسکتے ہیں، جو دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ چلائیں، اور اس لوٹ میں جو ٹوٹ اور انمل جو مال ہاتھ لگے اس کو کباڑی کی دکان کی طرح اوپر تلے جمائیں اور پبلک میں پیش کرکے ادیب ہونے کے دعویٰ دار ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب سستے اور سطحی ادیب نہیں ہیں، ان کے تحقیقی وتنقیدی خیالات سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور وہ ہر چیز کی گہرائی تک پہنچ جانے کی کوشش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات سطحی نہیں ہوتیں، وہ جو رائے دیتے ہیں، اس میں وزن ہوتا ہے اور وہ بے لاگ ہوتی ہیں، کسی بات کے متعلق تا وقتیکہ تحقیق کے سارے ذرائع ان کو میسر نہ آجائیں، اور جب تک کہ اس کے متعلق ان کو کامل عبور نہ ہو جائے، وہ مشکل ہی سے قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان بہت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اور یہ اسلوب ان کے موضوع کے لحاظ سے بہت مناسب ہے، یہ ضروری ہے کہ اسلوب بیان کا انتخاب موضوع کے لحاظ سے کیا جائے کیونکہ اسلوب اور طرز نگارش ہی پر موضوع کے رنگ کے نکھار کا دارومدار ہوتا ہے، ان کی تحریر میں سنجیدگی اور متانت ہے اور وہ اپنی رائے کے اظہار میں بہت محتاط ہیں، وہ دوراز کار باتیں نہیں لکھتے، صرف انھیں باتوں کا اظہار کرتے ہیں جو مفید مطلب ہوتی ہیں۔ یہ انتخاب خود ہی ایک امر دشوار گزار ہے، لیکن ہاشمی صاحب کو اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے، ان کی تصانیف میں ہم کو یہ خوشگوار اختصار ہر جگہ نظر آتا ہے، ان کا ضبط اور ان کا فیصلہ ہر جگہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتا ہے۔

آپ کی تنقید کے متعلق ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ یہ ہیں :-

"ہاشمی صاحب کو ادبی حس اور غیر جانبدارانہ فیصلہ کرنے کا ملکہ حاصل ہے، یہ وہ صفات ہیں جو موجودہ زمانے کے اردو زبان کے ادیبوں میں عموماً ناپید ہیں، آپ کی تنقید میں رائے بے لاگ اور نڈر ہوتی ہے، بایں ہمہ اسکا مقصد عیب جوئی نہیں ہوتا۔ آپ کے طرزِ بیان میں ادبی شان اور روانی ہوتی ہے اور دلچسپ اور اچھوتے پیرائے میں اپنے مطلب کو ادا کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ دلائل کو حقائق کی روشنی میں پیش کرتے ہیں" (لیڈر ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء)

جس طرح موسیقی قوت سامعہ کے لئے لذت آگیں ہوتی ہے، ادب اسی طرح ذہن کے لئے باعثِ انبساط ہوتا ہے، یہ وہ لطف ہے، جسکے اثرات دماغ کو فلاح کی منزلوں پر پہنچاتے ہیں، خیالات میں بلندی پیدا کرتے ہیں، اور انسان کی وجدانی قوتوں کو بیدار کرنے میں ممد معاون ثابت ہوتے ہیں، درحقیقت اردو ادب کی جو خدمت ہاشمی صاحب نے اتبک انجام دی ہے، تاریخی و تنقیدی لحاظ سے جو ذخیرہ پیش کیا ہے، وہ اردو ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ مورخانہ ذہنیت رکھنے کی وجہ سے ان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے، کہ خرافات کے انبار سے وہ جواہرات نکال لیں، جو ادب کا گرانمایہ سرمایہ ہیں، یہی وہ سرمایہ ہے جو پچھلوں کی کاوشوں کا حق ادا کرتا ہے۔ ہمارے لئے باعثِ فخر اور اگلوں کے لئے مشعلِ راہ ہے، جس طرح حسن کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جا سکتی، ادب کی بھی تعریف کرنا امر محال ہے لیکن حقیقی ادب میں ایک استقلال ہوتا ہے کہ اس سے جب مستفیض ہوا جائے، مسرت بخشتا ہے گویا ایک دائمی مسرت کا حامل ہوتا ہے یعنی ادب کے ان گہر ہائے آبدار کی چمک دمک کبھی کم نہیں ہوتی، ان کی تنقید کی نمایاں خوبیاں، اہمیت کا احساس، جرأت، خلوص، صفائی اور بے باکی ہیں ایسے زمانے میں جب ادب نئی کروٹ لے رہا ہے، اور زبان میں نئے خیالات و رجحانات تیزی سے داخل ہو رہے ہیں، ان کے کارنامے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، بیش بہا معلومات کا وہ گنجینہ جو انھوں نے منظرِ عام پر پیش کیا ہے، اس میں سے تاریخی اور تنقیدی لحاظ سے سات کتابیں اہمیت رکھتی ہیں۔

"دکن میں اردو" آپ کی وہ کتاب ہے جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور جسکی اشاعت کے بعد نظام گورنمنٹ نے سر راس مسعود کی ایما سے آپ کو یورپ بھیجا، جہاں آپ نے انگلستان اور فرانس کے کتب خانوں کی چھان بین کی اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے لئے بیش قیمت مواد فراہم کیا۔ "دکن میں اردو" یہ زبان کی تاریخ ہے، اور اپنی ادبی و تنقیدی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، بلکہ حقیقتاً موضوع کے لحاظ سے اپنی نوع کی پہلی تصنیف ہے، جیساکہ ڈاکٹر زور صاحب نے فرمایا ہے کہ "دکن میں اردو" کتاب آفریں ثابت ہوئی، اور اس کے بعد ہی لوگوں کو خیال پیدا ہوا اور "پنجاب میں اردو" "دہلی اور اردو" جیسی کتابیں تصنیف ہوئیں، اس کتاب کو دیکھکر ہاشمی صاحب کے سلاست ذوق اور بصیرت ادبی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کے علاوہ یہ کتاب اربابِ ذوق و نظر کے لئے بھی باعثِ تسکین ہے، باوجود اختصار کے جو ہاشمی صاحب نے ملحوظ رکھا ہے، مورخانہ شان میں کمی نہیں ہونے پائی ہے۔ ادبی حیثیت بھی بلند ہے، بدیں وجہ اس کتاب نے اردو ادب میں ایک مستقل درجہ حاصل کر لیا ہے۔ "یورپ میں دکھنی مخطوطات" ایک لحاظ سے آپ کا شاہکار ہے۔ اس میں انگلستان اور فرانس کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی جو کتابیں موجود ہیں، ان کے متعلق تفصیلی وضاحت ہے اور نمونۂ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ مخطوطات اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ آجکل ہر قسم کے تذکرے وجود میں آرہے ہیں لیکن بہت سے ایسے ہوتے ہیں، جنکی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن یہ تذکرہ اپنی اہمیت و زندگی کا خود ضامن ہے۔ میرے نزدیک تو ہاشمی صاحب کی یہی ایک تصنیف انکی شہرت اور ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کتاب کو اہلِ ذوق و نظر نے حسین نظر سے دیکھا ہے، اسکا اندازہ ان آراء سے ہو سکتا ہے، جو معتبر حضرات نے ان کی اس تصنیف پر ظاہر کی ہیں۔ ان میں سے بعض اصحاب یہ ہیں :- (۱) ڈاکٹر بیلی (۲) ڈاکٹر اسٹوری، (۳) پروفیسر کرن کورڈ (۴)، علامہ اقبال (۵) سر تیج بہادر سپرو (۶) سر عبدالقادر (۷) سر ظفر اللہ خان (۸)، علامہ سید سلیمان ندوی (۹)، پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۰) مرحوم حبیبش سید سلیمان۔

علاوہ ان کتب کے ہاشمی صاحب نے حیدرآباد کی نسوانی دنیا کی علمی جدوجہد کا بھی جائزہ لیا ہے، غالباً یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے خواتین کے لٹریچر کی چھان بین کی ہے، اور اہلِ قلم خواتین کے تذکرے مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کئی تصانیف ہیں، میں نے کہیں گذشتہ صفحات میں اسکا اظہار کیا ہے کہ ہاشمی صاحب کو طبقۂ نسواں سے خاص ہمدردی ہے۔ ہندوستان کے ادیبوں میں دو ہی چار ادیب ایسے نکلیں گے جنہوں نے طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبودی کی طرف عملی قدم اٹھایا ہو۔ اس سلسلے میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا نام سرِ فہرست آتا ہے، جنہوں نے طبقہ

نواں ہی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، مگر وہ گذشتہ دور کے ادیب تھے، نئے دور کے ادیبوں میں ہاشمی صاحب کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف طبقہ نسواں سے متعلق ہیں۔

ہندوستان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس نے نسوانی دنیا کو انتہائی پستی و جہالت میں مبتلا کر رکھا تھا، نہ کسی کو ان کی اصلاح کی طرف توجہ تھی، اور نہ خود ان میں یارا تھا کہ کوئی نئی کروٹ لیں، لیکن زمانے نے خود ہی محسوس کیا کہ اس صنف کی ترقی کے بغیر قوم کی نکبت دور ہوتی نظر نہیں آتی، آخرش ایسا دور آیا کہ آفتاب علم کی روشنی ان تک بھی پہنچنے لگی، یوں تو اکا دکا ہمیشہ ہی ایسی خواتین ملیں گی، جنہوں نے علم پر توجہ کی۔ مگر گذشتہ نصف صدی کے اندر عورتوں نے علمی مشاغل میں کامل حصہ لینا شروع کیا۔ اس سے قبل ان کا کہاں شمار تھا؟ اگر کوئی جوہر قابل ہوتا بھی، تو گمنامی اور بے توجہی کی نظر ہو جاتا اور جس طرح جنگل میں پھول کھلتا ہے، اور اپنی مقررہ زندگی کے بعد مرجھا جاتا ہے، بالکل یہی کیفیت ان خواتین کی تھی اور کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہاشمی صاحب نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا ہے اور انہوں نے کم از کم خواتین دکن کے ان علمی کارناموں کو ہمارے سامنے کر دیا ہے، جن سے ہم کبھی واقف نہ ہو سکتے۔ اگر ہاشمی صاحب اس طرف توجہ نہ کرتے، ان کی تصنیف "خواتین دکن کی اردو خدمات" اہل قلم خواتین کا پہلا تذکرہ ہے۔ جو اردو زبان میں شائع ہوا۔ اور نقش اول ہی باوجود مختصر ہونے کے ایک کامیاب تذکرہ ہے۔ اہل علم حضرات کا تذکرہ لکھ دینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اہل قلم خواتین کے حالات اور کلام نثر و نظم کا مہیا کرنا، جن پابندیوں اور پردوں میں خواتین گذشتہ دور میں رہی ہیں، اسکا علم کسی کو نہیں، ایسی صورت میں ان کے حالات کا فراہم کرنا اور ان کے مشاغل کا پتہ لگانا، کوہ کندن سے کم نہیں، لیکن ہاشمی صاحب کی ہمت نے انہیں اس معاملہ میں بھی کامیاب کیا اور انہوں نے تیرہویں صدی تک کی خواتین کے حالات ڈھونڈ نکالے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی بھی اہل قلم خواتین کے حالات وغیرہ فراہم کئے ہیں۔

اس تذکرے سے علم و کمال ہمارے سامنے خواتین کی مستعدی جوش و انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، جو وہ اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں کر رہی ہیں۔ علاوہ بریں درجہ بدرجہ اور عہد بہ عہد جو ترقی طبقہ نسواں نے کی ہے اسکا صحیح تصور بھی سامنے آجاتا ہے، حالات کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں جس سے کتاب کی ادبیت میں اضافے کے علاوہ کسی شاعرہ یا ناثرہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

ایک مختصر مگر جامع تصنیف ہاشمی صاحب کی "حیدرآباد کی نسوانی دنیا" ہے، جس کے پیش لفظ میں محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا صاحبہ تحریر فرماتی ہیں کہ:-

"..... عورتوں کی ترقی اور بھلائی کے لئے آپ کا قلم روانی سے چلتا ہے، ہمیشہ آپ کو فکر ہے کہ عورتیں ترقی کریں، ان کا خیال ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں گی، مرد ترقی نہیں کر سکتے"

"حیدرآباد کی نسوانی دنیا" مجموعہ ہے آپ کے چند مضامین کا، جو عورتوں کے بارے میں لکھے گئے ہیں، یہ سب حیدرآباد کی طرز معاشرت، اور گھریلو طبقے کے عام حالات کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ پیشے، لباس وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کی ترقی یافتہ خواتین، صنعت و حرفت، علم و ادب وغیرہ کی کیونکر امداد کر رہی ہیں۔

آپ کے مضامین کا دوسرا مجموعہ "خیابان نسواں" ہے یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ مضامین بھی عورتوں سے متعلق ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے معلومات کا ایک گنجینہ ہے، ہر مضمون ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اور ہماری معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان مفید اور کارآمد مضامین کو دیکھنے سے ہاشمی صاحب کے خلوص و دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ بقول جہاں بانو نقوی صاحبہ "قسم قسم کے مضامین کا یہ ادبی معاشرتی و اصلاحی مجموعہ آپ اپنا جواب ہے"

طبقہ نسواں کی خوش قسمتی ہے کہ ہاشمی صاحب جیسے علم دوست اور باکمال مصنف کی ہمدردیاں اسے حاصل ہیں، اور اس سلسلے میں ہاشمی صاحب جس کاوش اور دلچسپی کا ثبوت دیتے ہیں، طبقہ نسواں کو ان کا مشکور ہونا چاہیئے۔

مجھے افسوس ہے کہ ان اوراق میں ان سب کتابوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں کہ ایک دفتر درکار ہے، لیکن ان سب کتابوں کو دیکھنے کے بعد آپ کو یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہاشمی صاحب نے کسقدر کاوش اور محنت کی ہے اور اگر انہیں "جنوبی ہند کی اردو زبان کا مورخ" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔

ریویو کیلئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ آینزکسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کیجائیگی۔

(ادارہ)

آسان اردو

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چلی تو انھوں نے یہ عذر کیا۔ یہ عذر تو ——— ایک لطیفہ ہے لیکن اس شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ سچ مچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اسکا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی التجا کرنی پڑی ہے خدا کرے اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اسکا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ اردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے ہی آثار پیدا ہو چلے ہیں ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی، عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیئے تھے جو عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لئے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب عالم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا "صدر پر انصباب نوازل ہے۔" آپ سمجھے کیا کہا؟ غزل جس کی زبان سہل، فصیح اور عام فہم ہوتی ہے وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی، فارسی کے لفظ لکھنے شروع کر دیئے جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ اسکا اثر اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا۔ اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنے کے بعد فرمایا "علیت کا ضماد کرو۔" وہ بے چارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا "علیت کا ضماد کرو۔" وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہمے ہوئے انہیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شرر سے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ خیر وہ تو ایک گنوار تھا لیکن آپ معاف فرمائیں اگر میں اس تقریر کے سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اسکا مطلب سمجھے؟ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے کہ "مکئی تھینک کا لیپ کرو" تو کیا ان کی شان میں بٹہ لگ جاتا اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آ جاتا؟ مگر نہیں وہ طب کے علمی الفاظ و اصطلاحات کو عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر عام بول چال میں یہ باتیں آ گئیں تو علمی شان کہاں رہی۔ یہی حال مولویوں کا ہے۔ وہ اپنی تقریر، وعظ یا بیان میں موٹے موٹے عربی، فارسی کے لفظ اور جملے کے جملے مزے لے لے کر بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے، لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھتے ہوں مگر دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرنے کا یہ بہت اچھا گر ہے۔

سرسیّد احمد خاں نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ سرسیّد کی سادہ نویسی مشہور ہے، مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے۔ اور انھوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض بعض جگہ سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال نے وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے، میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا مولینا کس فکر میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسیّد نے بھی اسپر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

ہم کیوں لکھتے ہیں؟ اسی لئے ناکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں۔ تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اسی نسبت سے اسکا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ تحریر آسان زبان میں ہو، اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ

عبدالحق

اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان میں ہوتی تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہو گی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنھیں قبول عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت انھیں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کئے ہیں۔

ہم آسان کیوں نہیں لکھتے؟ ——— اور مشکل کیوں لکھتے ہیں؟

آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان نہیں، بہت مشکل ہے۔ اول تو یہ لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو۔ دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اور اسکا ہر پہلو اسقدر جچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہمارے ذہن میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کونسا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ بعض اوقات اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اُسے بھی ہٹا دیتا ہے، تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی ردوبدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب اینچ پینچ اور ایر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کر دیتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پُرشکوہ لفظوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لئے پُرشکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور مشیخت جتانے کے لئے بھی۔ لیکن اثر اور دل نشینی کے لئے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں۔ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولانا حالی کے پاس ایک ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی۔ فرمانے لگے کہ لوگ جیسے بولتے ہیں ویسے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ بولنے میں زبان کے سوا آدمی چشم و ابرو، ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسر نہیں۔ اس لئے دقیق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں حسن پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا جس کا میں اشارۃً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افق صحافت پر نمودار ہوا اور اس کے بعد انھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لئے "بدل اشتراک" اڈیٹر کے لئے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا۔ یعنی "سید محی الدین المکنی بہ ابی الکلام الدہلوی"۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ اردو ہے یا اردو دشمنی۔ اسے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تقلید انسان کی فطرت میں ہے۔ بعض اخبار والے اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے اور عجیب و غریب (اور واہی تباہی) الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں۔ ان کے ایک مقلد اخبار کے اڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا: "بعد از انقضائے دہور و مرور ایام و شہور"۔ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا۔ لیکن یہ طرز بیان زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے کہ نہ چلی۔

اب حال میں مشکل پسندی کے تیسرے دور کا آغاز حیدرآباد میں ہوا ہے۔ یہ اثر غالباً کچھ تو یہاں کی دفتری زبان کا ہے اور کچھ جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم کا۔ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ کتابیں یہاں کی تعلیم کے لئے ترجمہ کی گئیں اور جو علمی اصطلاحات اس غرض کے لئے وضع ہوئیں انھوں نے انداز تحریر کو مشکل کر دیا ہے۔ تحریر تو تحریر بعض اوقات یہاں کے تعلیم یافتہ اصطلاحوں میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ اسکا اثر یہاں کے اخباروں پر بھی پڑا ہے۔ مجھ سے اکثر احباب نے شکایت کی کہ جامعہ کے ترجمے سمجھ میں نہیں آتے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بھی اپنے خطبۂ تقسیم اسناد میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اوروں کی شکایت تو ایک طرف خود متعلم اور معلم بھی اکثر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات مترجم صاحب بھی نہیں سمجھتے کہ

انھوں نے کیا لکھا ہے۔ ترجمہ بہت ضروری اور کام کی چیز ہے بشرطیکہ اچھا ہو۔ ہر زبان کے محاورے، جملوں کی ساخت اور بیان کے پیرائے الگ ہوتے ہیں۔ ترجمے کا کمال یہ ہے کہ مصنف کے مفہوم کو اپنی زبان اور محاورے میں اس طرح ڈھال کر ادا کیا جائے کہ کھٹک پیدا نہ ہو، اصل خیال کی قوت میں فرق نہ آئے اور یہ معلوم ہو کہ کتاب ہماری ہی زبان میں لکھی گئی تھی یہ بات ان ترجموں میں مفقود ہے اچھے ترجمے ادب کا جز بن جاتے ہیں اور انھیں اصل تصنیف کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ برے ترجمے زبان و ادب، پڑھنے والوں کے دماغ اور ان کے طرز تحریر پر بہت مضر اثر ڈالتے ہیں۔

علم و فن کے لئے اصطلاح ضروری ہے لیکن اصطلاحوں کی بھرمار ضروری نہیں۔ اصطلاح کے لئے ضروری نہیں کہ ادق اور مغلق ہو۔ اب زمانہ عام تعلیم کا ہے اس لئے اصطلاحیں ایسی بنانی پڑیں گی جو قریب الفہم ہوں۔ دارالترجمہ کی اصطلاحیں نظرثانی کی محتاج ہیں بعض بلاشبہ بہت اچھی ہیں اور وہ مقبول بھی ہوئیں لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی ایسی ہیں جو نہ زبان پر چڑھتی ہیں نہ سمجھ میں آتی ہیں اور نہ استعمال کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجز چند مستثنیات کے علم و فن کی جو کتابیں یہاں لکھی گئی ہیں ان میں اصطلاحات غیر مانوس اور مشکل الفاظ کی کثرت اور عبارت اکھڑی اکھڑی اور پیچیدہ ہے اور برے ترجمے کی ساری شان موجود ہے۔ عام پڑھنے والوں کے لئے سلیس زبان میں وہی لکھ سکتے ہیں جو اپنے فن کے پورے ماہر اور زبان پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔

آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو کہ اردو پر جو سب سے بڑی آفت آئی اور جس کا خمیازہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں وہ اسی مشکل پسندی کی وجہ سے آئی۔

بہار اس سے پہلے احاطۂ بنگال میں شامل تھا مظفرپور میں سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے احاطہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر جی سی کیمبل کو مدعو کیا گیا۔ ۱۰ نومبر ۱۸۷۲ء کو انھوں نے مظفرپور پہنچ کر سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر فیلن نے انگریزی میں، سید امداد علی نے اردو میں تقریر کی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر جو تقریریں کی جاتی اور سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں ان میں پرشکوہ عربی، فارسی لفظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ سید صاحب کی تقریر سنکر لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ "میں مشکل سے یہ فرق کر سکا کہ ان کی تقریر اردو زبان میں تھی یا فارسی میں"۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ اردو دیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جا سکتا۔ یہ واپس جانے کے چند ہی روز بعد اس نے ایک عجیب و غریب سرکاری یادداشت شائع کی جس میں اردو کے خلاف بہت زہر اگلا ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "پچھلے دنوں جب مجھ کو بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں جو زبان میں نے سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس زبان کے لئے "اردو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے.... کتابوں میں اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن درحقیقت یہ اردو زبان اہل دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا مدارس میں اس زبان کی تعلیم کو روکنے کی کوشش کروں گا"۔

"ڈائرکٹر تعلیمات، انسپکٹران مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

میرے من کی آشا جاگ

من کا مندر تھل جائے گا۔ من کا کنول بھی کھل جائے گا
من کی منڈیر پہ بول رہا ہے کلپن رُوپی کاگ
میرے من کی آشا جاگ

بدرا کا سکھ موت کا سکھ ہے، بدرا میں تو دکھ ہی دکھ ہے
رین نہیں اب ہوا سویرا، اُٹھ بدرا کو تیاگ
میرے من کی آشا جاگ

قسمت کے سوتے بھی جاگے۔ بدرا کے بیٹے بھی جاگے
تو جاگے تو پھر کیا کہنا۔ جاگ اٹھیں گے بھاگ
میرے من کی آشا جاگ

من میں ایسی لے بس جائے۔ ناگن بن کر جو ڈس جائے
لے کا زہر چڑھے نس نس کر، چھیڑ دے دیپک راگ
میرے من کی آشا جاگ

عرش ملسیانی

افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات

(یہ تقریر بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی سر ولیم جونز کی پندرھویں سالگرہ کے موقع پر کلکتہ کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی)

احمد علی کہزاد

دوسرے ممالک کی طرح افغانستان کے مورخین بھی اپنے وطن کی تاریخ کی صحیح چھان بین کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اسلئے کہ ان کے ملک کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور ادبی حالات سب پر واضح ہوجائیں، وہ اپنے وطن کے قدیم مسودات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ انہی مسودات کی روشنی میں ہم پڑوسی ملکوں کے ساتھ اپنے ثقافتی تعلقات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

تقریباً دو صدیوں سے ویدوں کے اشلوک اور اوستا کی نظمیں دنیا بھر کے ارباب علم کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ بلاشبہ ان میں تاریخ افغانستان کے بہت سے ابواب شامل ہیں۔ ان ماخذوں سے نہ صرف ملک کے جغرافیائی حالات کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم باشندوں کی زبان، ادب، گیتوں، کہا و توں، صنمیاتی کہانیوں، فلسفے اور مذہب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر ایک مسودے میں کوئی بات رہ گئی ہو تو دوسرا اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کے مسودات کے جوڑ توڑ سے قیمتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

فراعنہ نے مصری مندروں کے سنگین ستونوں پر سردغلیفی خط میں اپنی تاریخیں کندہ کرائی تھیں۔ سمیری، کلدانی، بابلی اور آشوری گلی تختیوں پر لکھتے تھے۔ ہند یورپی یا زیادہ مناسب الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی ایک شاخ نے جو "آریہ" کے نام سے موسوم ہوئی اور جو دریائے آمو اور سندھ کے درمیانی علاقے میں آباد تھی، سینہ بسینہ ایسے گیت ہم تک پہنچائے ہیں جن کے اقتباسات سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مختلف اقوام کے ارباب علم نے اپنے ذاتی تصورات کی بنا پر آریاؤں کے حسب و نسب کی چھان بین کرتے ہوئے اس قوم کے وطن مالوف کو مختلف مقامات سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ان ادبی اور مذہبی یادگاروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو آریاؤں نے چھوڑی ہیں یعنی وید اور اوستا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی ابتدا اس علاقے سے ہوئی جو آج "فرغانہ" کہلاتا ہے۔ روسی ارباب علم کے انکشافات سے بھی اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ "کبھا" (کابل)، "کرمو" (کرم)، "گوماتی" (گومل)، "راسا" (کنار)، "سوستی" (سوات)، "سرسوتی" (اوستا کا ہراوتی یا موجودہ ارغنداب)، "سندھو" (سندھ) اور پنجاب کے دوسرے دریاؤں کا ذکر ویدوں میں موجود ہے۔ یہ فہرست گنگا پر ختم ہو جاتی ہے جس کا ذکر صرف ایک بار کیا گیا ہے۔ دریاؤں کے علاوہ بعض مقامات کا بھی ذکر آیا ہے مثلاً "بلہیک" (بلخ)، "گندھار" (وادی کابل)، اور کوہ مجاوت (درہ منجان)، لہٰذا کسی چون و چرا کے بغیر یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ویدوں کے زمانے کے آریہ وادی سندھ تک آنے اور وہاں سے ادھر ادھر پھیلنے سے پہلے ہندوکش کے دونوں جانب رہتے تھے۔

آریاؤں کا دوسرا ماخذ اوستا در اصل ویدوں کا تکملہ ہے۔ اسکے اندراجات کم منتشر، زیادہ مسلسل، واضح اور مکمل ہیں۔ وینديداد کی پہلی فرگرد کے سولہ خوبصورت علاقوں کا حال پڑھ کر ایک واضح جغرافیائی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ علاقے یہ ہیں:-

(۱) ایریانم ویجو (فرغانہ)
(۲) سگدھا (سوگدیانہ)
(۳) مُورو (مرغیانہ یا مرغاب)
(۴) بکھدی (بلخ یا باختر)
(۵) نسایا (مُورو اور بکھدی کے مابین، مائی مانہ کا علاقہ)
(۶) ہراوا (قدیم آریا، صوبہ ہرات میں دریائے ہری کا حصہ)
(۷) دئی کراتہ (دریائے کابل)
(۸) اُردا (ردہ کا علاقہ قندھار اور سندھ کے درمیان)
(۹) کھینتا (ہرکینیا)
(۱۰) ہراوتی (عرب مصنفین کے مطابق رودخج)
(۱۱) ہیلمانت (دریائے ہلمند)
(۱۲) راگھا (راہ، بدخشاں میں)
(۱۳) کاخرا (غزنی کا علاقہ)
(۱۴) ورینا (وزیرستان کا اگلا حصہ)
(۱۵) ہپت ہندو (ویدوں کے مطابق سپت سندھو یعنی پنجاب)
(۱۶) رانہا؟

ان میں سے بعض علاقوں کو اچھے الفاظ میں خراج تحسین ملتا تھا۔ مثلاً ہراوتی کو خوبصورت، ہیتمانت کو روشن اور مستور۔ نیز بکھدھم کری رم اریدھو درفشم یعنی خوبصورت بکھدی جسے بڑا عروج حاصل ہے۔

ان علاقوں کے علاوہ بھی اولستا میں افغانستان کے بہت سے پہاڑوں اور دریاؤں کا ذکر ہے۔ مثلاً :۔

"اپائرسینا" یعنی "عقاب سے اوپر" گویا عقاب کی پرواز سے بھی اونچا۔ یہ بنداہش کا اپارسن ہے جہاں سے دریائے بری دریائے ہلمند، دریائے مرغاب اور دریائے بلخ نکلتے ہیں۔ زدسپرام کا بیان ہے کہ یہ پہاڑ سیستان سے سنستان تک یعنی سیستان سے چین تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے ہندوکش کا ایک سلسلہ کہا جا سکتا ہے۔

"پوراتا" پروان کے پہاڑ جس کا ایک درہ اب بھی اسی نام سے موسوم ہے (کاپیسا کا شمالی حصہ آجکل کے جبل السراج سے اوپر)

"سپیتا گاؤ اگیری" یعنی "کوہ سفید" موجودہ زمانے کا اسپین گھار پکھتیکھا علاقے میں (جنوبی صوبہ) پشتو زبان میں اسپین گھار کے معنی "کوہ سفید" ہیں۔

"استائرا" کو اصل مسودے میں شاعرانہ طور پر "استائرا اتاروسارا" کے نام سے درج کیا ہے۔ استائرا کی چوٹی ستاروں کو چھوتی ہے۔ جیمز ڈرمسٹیٹر نے اس پہاڑ کو گھور بند گروپ میں شامل کیا ہے لیکن سرارل اسٹین نے اسے تیرہ کے ساتھ ملایا ہے (افغانستان کے مشرق میں) "ہرائیتا باریز" اولستا کا پہلا اونچا پہاڑ۔ گیگر نے اسے پامیر گروپ میں شامل کیا ہے۔

"زبیدھاز" جیمز ڈرمسٹیٹر اسے ہرائیتا باریز کے بالکل ساتھ تصور کرتے ہیں۔

"سیاسکا" بنداہش کا سیاک اوند یعنی دریائے ہری کے شمال میں اس عہد کا کوہ سیاہ۔ اس نام کے معنی یعنی کالا پہاڑ اولستا کے مسودے سے بالکل ملتے ہیں۔ ڈرمسٹیٹر اسے دریائے ہری کے شمال میں ایک دیوار کی حیثیت دیتے ہیں۔

"وافرائیت" بنداہش کا وافرا ومند (برفپوش پہاڑ) کوہ سفید۔

دوسرے درجے کے دریاؤں میں سے جن کا ذکر اولستا میں کیا گیا ہے مندرجہ ذیل قابل لحاظ ہیں :۔ ہاونترا، ہواسپا، فرادتھا، ہوارسے نانوہائیتی۔ سرارل اسٹین نے کشک کے ساتھ ملایا ہے، اراچوسیا کا کھواسپا، دریائے فراہ اور ہارت۔ یہ سب کے سب دریائے ہلمند کی شاخیں ہیں۔

چنانچہ ویدوں میں اور اولستا میں الگ الگ یا مجموعی طور پر جو جغرافیائی معلومات درج ہیں، وہ سارے افغانستان سے متعلق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ویدا اور اولستا کے زمانے کے آریہ اس ملک سے اچھی طرح واقف تھے اور اس لئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ وہ ملک جو دریائے سندھ اور دریائے آموں کے مابین واقع تھا، آریاؤں کا وطن تھا اور وہ ہندوکش کے آریہ کہلاتے تھے۔

اب ہمیں اراتوستھنیز، استرابو اور بطلیموس کے بیانات کی روشنی میں اصل موضوع کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اراتوستھنیز پہلا یونانی مصنف ہے جس نے ہمارے ملک کے جغرافیائی حالات تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں قلمبند کئے۔ بدقسمتی سے اس کا وہ کارنامہ تلف ہو گیا تاہم استرابو نے اس کے چند حصوں کو اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ ان دونوں نے ویدوں اور اولستا کے اس ملک کو جو اب افغانستان کہلاتا ہے "آریانہ" لکھا ہے۔ استرابو نے آریانہ کا حدود اربعہ حسب ذیل لکھا ہے :۔ مشرق میں دریائے سندھ تک۔ جنوب میں بحر اعظم یعنی بحر ہند تک۔ شمال میں اس سلسلۂ کوہ تک جو شمالی ہندوستان سے بحیرۂ خزر تک ہے۔ مغرب میں اس حد تک جو بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی ساحل کو خلیج فارس سے ملاتی اور پارتھیا، کرمان اور مکران کو فارس اور میڈیا سے جدا کرتی ہے۔ بلخ یا باختر کی بابت استرابو نے مختصر طور پر صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آریانہ کا موتی ہے۔

یونانی النسل مصری جغرافیہ دان بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں آریانہ کا جغرافیائی مطالعہ کرتے ہوئے اس کے صوبے گنوائے ہیں۔ ہم مسٹر ایچ ڈبلیو بیلو کی تحریر کے مطابق انھیں یہاں نقل کرتے ہیں۔ مرغیانہ (وادیٔ مرغاب) بکتریانہ (باختر اور بدخشاں) آریی (وادیٔ ہری رود صوبہ ہرات میں) پاروپامیسس (ہزارہ جات۔ کابل کا علاقہ سندھ، نورستان اور درستان تک ان سمیت) درنگیانہ (سیستان) اراکوسیا (قندھار اور غزنی، سلسلۂ کوہ سلیمان دریائے سندھ تک) گدروسیا (کیچ اور مکران یا بلوچستان)

پس ویدا اور اولستا کے مسودات اور اراتوستھنیز، استرابو اور بطلیموس کے بیانات کے مطابق افغانستان ویدی اور اولستائی آریاؤں کا گہوارہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان قدیم کلاسیکی مصنفین نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اس سرزمین کو آریانہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زمانہ وسطیٰ کے عرب مصنفین نے اس ملک کو خراسان لکھا ہے اور اسکی حدبندی اسی طریقے سے کی ہے۔ افغانستان اس کا نیا نام ہے۔

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر ایچ ایچ ولسن نے جو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک قابل رکن تھے تقریباً ایک سو پانچ سال پہلے ہمارے ملک کی بابت ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام "آریانہ اینٹیکا" ہے۔ انھوں نے اس سرزمین کے جغرافیائی

حالات لکھے اور اس کے قدیم نام "آریانہ" پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں تقریباً سو صفحات مخصوص کئے ہیں۔ قدیم مسودات کی مدد سے انہوں نے ہمارے ملک کے صوبے، شہر اور قبیلے بیان کئے اور گنوائے ہیں۔ میں اس وقت ان کے اس کارنمایاں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ ہماری تحقیقات کی ٹھوس بنیاد ہے اور اس سے بھی تاریخ کے قدیم ترین زمانے سے افغانستان کے جغرافیائی اور تاریخی وجود کا پتہ چلتا ہے۔

ویدی اور اویستائی مسودات کی غیر معمولی مشابہت نیز زبان و فلسفے، صنمیات و مذہب اور تہذیب و تمدن کے دوسرے موضوعات کی مماثلت ثابت کرتی ہے کہ وید اور اویستا کے ماننے والے آریانہ کے باشندے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ویدی تہذیب، بہت سی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد شمال مغربی ہندستان تک پھیلی اور اویستائی مت کو تو آجکل بھی ایران میں فروغ حاصل ہے۔

ویدی قبیلوں کے ناموں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ افغانستان کے پہاڑوں میں رہ گئے اور کچھ نقل مکان کرکے پنجاب جا پہنچے۔ کیونکہ موضوع زیادہ وسیع ہے، اس لئے ہم صرف دو قبیلوں کا ذکر کریں گے۔

۱۔ پشت یا پخت۔ پشتان یا پختان (بصورتِ واحد پشتون یا پختون)، ہیرودوطوس نے ان کا ذکر "پکتیا قسس" کے نام سے کیا ہے اور ان کے طور طریق کو پختیا یا پکتیکا لکھا ہے۔ یہ لفظ اب بھی "پختینو" کے نام سے رائج ہے۔ نیز یہ قبیلہ آجکل بھی افغانستان کی آبادی کا اہم حصہ ہے۔

۲۔ بھارتھ۔ ہم آگے چل کر معلوم کریں گے کہ یہ قبیلہ کس طرح ہندوکش کے شمال سے ہندوستان چلا گیا۔ پنجاب کے وسیع میدانوں کو چراگاہوں میں تبدیل کر لینے کے بعد وہ "بھارتھ ورشس" یعنی "بھارتھوں کی چراگاہیں" کہلانے لگا۔ چنانچہ ہندوستان کا پہلا تاریخی اور قومی نام "بھارت ورش" ہی ہے۔

وہ ویدی قبیلے جو ہندوکش کی جنوبی ڈھلانوں سے ہجرت کرکے سندھ سے پرے تک پہنچے اس سرزمین پر جو اس دریا اور دریائے گنگا کے مابین واقع تھی، ایک ہی کوشش میں اپنا قبضہ نہ جما سکے۔ انھیں دریائے سندھ کے کنارے ہی روک دیا گیا کیونکہ انہی میں نیز ان میں اور ہندوستان کے اصلی باشندوں کے درمیان کچھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے قبضہ جمایا اور اس حصۂ ملک میں جو ستلج اور یمنا (جمنا) کے مابین ہے، سکونت اختیار کر لی اور اس بستی کا نام کرکشیتر یعنی "کروکا ملک" رکھا۔ اپنے پھیلاؤ کے دوسرے دور میں وہ جمنا اور گنگا کے درمیان جا پہنچے اور اس علاقے کا نام "مادھیہ دیس" یعنی "درمیانی زمین" رکھا۔ بھارت میں چند اہم قبیلے بھی شامل تھے۔ ہندوکش کی ڈھلانوں سے اترتے وقت وہ وادیٔ سندھ میں دو راستوں سے پہنچے یعنی کبھا، کرموا اور گوماتی کی وادیاں طے کرنے یا ارگھنداب کی وادی عبور کرنے کے بعد۔

"مہابھارت" اس بھارت ورش کی صنمیاتی رزمیہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ وید اور اویستا کے بعد یہ تیسرا خاص ماخذ ہے جس کے مطالعے سے ہم ان چند قبیلوں کی ہجرت کے اہم حالات معلوم کر سکتے ہیں جو افغانستان سے ہندوستان گئے۔ مالا یا ملاوا ہندوستان کے قدیم باشندوں میں شامل ہیں۔ ایل ڈی لاویلی پاؤسن کو ان میں اور مادا، مدادا، مدرا اور مدرا کا میں مجھ بھدرا اور بھالا کے پڑوسی تھے، گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ اسی مصنف کے خیال کے مطابق ان اور بہت سے دوسرے قبیلوں کو باھیک کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ سنسکرت ماخذوں میں اکثر یہ نام باھلیک لکھا گیا ہے۔ بلکہ سنسکرت ادب میں باھلیک ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلوی مسودات میں اسے بہل یا باخلی لکھا گیا ہے۔ اس امر کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح آریائی قبیلے باختر سے ہندوکش کو عبور کرکے آئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ جیسے پرزائیلوسکی اس بات کو ان الفاظ

پرواز

پرواز جعفری

کبھی کبھی مجھے آتی ہے اک پرانی یاد — کہیں لے غور سے دیکھی ہے قوم کی افتاد
یہ شور و غل یہ کشاکش یہ انقلاب چمن — کہ دام فکر میں پابند ہے غم صیاد
اک آہ نیم شبی ہے فسانۂ سحری — سنا سکا نہ کوئی قصۂ غم فرہاد
متاع زیست نہیں کچھ بجز خس و خاشاک — میں نذر کرتا ہوں سرمایۂ دل برباد
مری نگاہ بھی دام خیال میں پھنس کر — تلاش کرتی ہے اک اور عالم ایجاد
بدل رہا ہے زمانہ بدل رہی ہے نظر — نئے نظام کی رکھی گئی نئی بنیاد
یہ اور بات ہے آمادگی نہیں جاتی — جنوں کی منزل آخر بھی ہو گئی آباد

رموز دھر کو پرواز ہم سمجھتے ہیں
ازل سے اہل خرد کی نگاہ میں ہے کشاد

میں بیان کرتا ہے کہ "پنجاب کے بالھیک اور باختر سے آنے والے دراصل ایک ہی" سنسکرت زبان خصوصاً اپنی پہلی ادبی صورت میں یعنی ویدی سنسکرت ہندوکش کے دونوں جانب بولی جاتی تھی۔ ویدوں کے اشلوک ان میں سے رگ وید سب سے زیادہ پرانا ہے کاپیکا اور پنجاب کے مابین گائے جاتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ سنسکرت ادب کی داغ بیل افغانستان میں پڑی اور اسے فروغ پنجاب میں حاصل ہوا۔ پانینی نام کے ماہر صرف و نحو نے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں اٹک کے گرد و نواح میں رہتا تھا زبان کو نکھارا اور اس وقت سے وہ سمس کردا یا سنسکرت کہلانے لگی۔

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے لائق و فائق بانی سر ولیم جونز کا ایک سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے لسانی مطالعے کیلئے زباندانی کے مقابلے پر پہلے پہل توجہ دی۔ انہی نے سب سے پہلے سنسکرت اور ژند میں مماثلت پائی۔ یہ مماثلت، زباندانی کے نقطۂ نظر سے ایک واضح ثبوت ہے کہ وہ لوگ جو یہ دو قدیم محاورے بولتے تھے ایک ہی فرقے کی حیثیت سے مل کر رہتے ہوں گے۔ ویدا اور اولیستا کی زبانیں اس درجہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ ایک زبان کے جملے کے جملے آسانی سے دوسری زبان میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ہندوکش کی ان دو بڑی زبانوں سے بہت سی بولیاں بنیں جن کو ماہرین لسانیات ہندوستانی اور ایرانی خاندان کی بولیاں کہتے ہیں۔

ناروے کے ایک عالم کا خیال ہے کہ بہت سی ہند یورپی بولیاں سلسلۂ ہندوکش کی وادیوں میں اب تک برقرار ہیں اور ان کے مطالعے کے لئے افغانستان بہترین جگہ ہے۔ ہم افغانیوں کا بھی خیال ہے کہ ماہرین لسانیات کا مطالعہ ہمارے ملک کی ادبیات اور قدیم تاریخ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور قابل اعتماد ذریعہ اور ماخذ ہے۔ ان مطالعوں سے افغانستان کے توسیعی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح مختلف بولیاں ہجرت کے ذریعہ ہمارے پڑوسیوں تک پھیلتی چلی گئیں۔

چنانچہ سنسکرت زبان ویدی قبیلوں کے ساتھ افغانستان کے پہاڑوں سے گئی اور ہندوستان میں پھیل گئی جہاں اس سے نکل کر بہت سی ہندوستانی بولیاں ترقی پا گئیں۔ پھر اشوک کے زمانہ میں جب بدھ مت کو فروغ ہوا تو یہ زبان دوبارہ ہمارے ملک میں آ گئی اور کشان حکومت کے عہد میں یہ افغانستان اور ہندوستان کی مذہبی زبان بن گئی۔

ہم مذکورہ بالا سطور میں ثابت کر چکے ہیں کہ ویدا اور اولیستا کے جغرافیائی بیانات افغانستان کے مقامات سے بالکل منطبق ہوتے ہیں۔ تاریخی واقعات جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کسی قدر خیالی شکل و صورت اختیار کرتے چلے گئے اب بھی اتنے حالات فراہم کر سکتے ہیں کہ ہم ان بنیادوں پر اپنے ملک کی تاریخ کا پہلا باب مرتب کر لیں۔

شروع کے تمام آریائی ماخذوں میں وہ وید ہوں، اولیستا ہو یا مہابھارت شہزادوں اور بادشاہوں کی شجاعت کے قصے شامل ہیں۔ اولیستا میں خاندانوں کا شجرہ درج ہے۔ پرادت کوی اور اسپال ایسے بادشاہ ہیں جنھوں نے وندیدا یعنی کلاسیکی مصنفین کے آریانہ کے دوسرے فرگرد کے کل سولہ کے سولہ خوبصورت علاقوں پر حکومت کی تھی۔ ان خاندانوں کا ذکر شاہنامہ میں بھی آیا ہے۔ ان کا مرکزی مقام بلخ تھا لیکن بلخ کے علاوہ کابل، زابل، سمنگان، قندھار، ہرات اور سیستان وغیرہ تک ان کا عمل دخل قائم تھا۔

ویدی آریاؤں نے شمال مغربی ہندوستان میں اچھی طرح تسلط حاصل کر لینے کے بعد سب سے پہلے برہمو سماج کی بنیاد رکھی اور پھر بدھی فرقے کو فروغ دیا۔ تاریخ ہند کے پہلے خاندان کے مشہور موریا بادشاہ یعنی اشوک اعظم نے اپنی سلطنت کو ہندوکش کی جنوبی ڈھلانوں تک پھیلا چکنے کے بعد نہ صرف آس پاس کے بلکہ دور دراز کے ملکوں میں بدھی پرچار کی سبھائیں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مہانتیک، دھرم اکھیت اور مہا اکھیت ایلچیوں کے اس گروہ میں شامل تھے جو افغانستان اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا۔ اس طرح تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں بدھ مت مشرقی آریانہ یعنی گندھارا میں اپنی جھلک دکھانے لگا۔ تمام وادی کابل "نئی مگدھ" یعنی بدھ مت کی نئی سرزمین موعودہ بن گئی۔ اے فوچیہ کی تحقیقات کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ بدھ مت نگارا ہارا یعنی موجودہ ننگرہار یا جلال آباد سے لنپکا (لغمان) تک پھیل گیا اور وہاں سے تگاؤ اور نجراؤ اور پھر کابل و کپیسا تک جا پہنچا۔ غوربند، قندکستان اور بامیان کی وادیوں کی راہ اس مذہب کی رسائی ہندوکش کے شمال میں ہائبک اور پھر باختر اور تخارستان تک ہوئی (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب مزد رفتہ رفتہ نصف مشرقی حصہ ملک میں بدھ مت کے لئے جگہ خالی کرتا گیا) اولیستا کے ایک نسخے سے جو سمرقند میں دستیاب ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک سنگھاسن جسے وہرن کہتے تھے اور جو دشتاسپ کے بیٹے سپندات نے "باغ بالک" میں بنوایا تھا، بدھی سنگھرم میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا نام "نوا وہارا" رکھا گیا جسے عربی اور فارسی مصنفین نے "نوبہار" کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ صورت حالات ساتویں صدی

باقی صفحہ ۲۰ پر

موٹے آکا

(خاکہ)

اشرف صبوحی
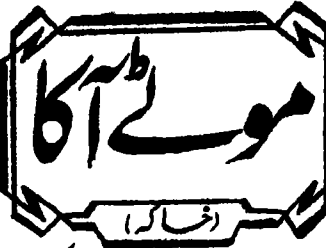
غدر کے بعد پٹا باز کی معنی تومانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں، میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر پچھے رشتوں میں ایک آکا مصطفےٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا جنہیں لوگ عام طور پر موٹے آکا کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑ سے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی والوں کے محلے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دوکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یار نجان ایک کشمیری ناٹا سا قد۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ڈنڑ پھیلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آکا مصطفےٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر آ رہے تھے۔ اور اس لئے عصر کے بعد عموماً مرزا یار نجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر انکی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور گٹھے جثے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی لیکن ڈنڑوں کی مچھلیاں اب بھی ایسی طاقتور تھیں کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جاسکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انھوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابوظفر سراج الدین کا چراغ ٹمٹماتا رہا قلعہ ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دو جانے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلی آئے اور جب تک جئے اکنگ جئے۔

آکا کی نسبت سنا ہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی سچ مچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی پھر لکڑی کی چھریاں ہو گئیں۔ اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں مثلاً ہٹ کوٹا، بغلگیر، حلقوم، گولا لاٹھی۔ بازو بند وغیرہ۔ جس طرح بنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں۔ لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا۔ صحیح نہیں معلوم۔ داستانوں میں عیاروں کی خنجر بازی سنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہوگی تو خنجر اور کٹار سے کام لیا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آکا بھی تھے۔

آکا کی شہزوری اور بکیتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا سانڈوں کا اکھاڑا تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ بسیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آکا یار نجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ٹکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یار نجان نے آکا سے کہا اوپر آجایئے سانڈوں کا رخ اسی طرف ہے۔ آکا نے ہنس کر جواب دیا مرزا ڈرو نہیں۔ جانوروں سے کیا بھاگنا۔ آرہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آجائے یا کسی کا خوانچہ الٹ جائے۔ ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے دوکان کے آگے آکر سینگ جوڑ لئے۔ اب پھر یار نجان نے کہا "آکا دوکان کے اوپر کیوں نہیں آجاتے؟" آکا پھر ہنسے اور کہنے لگے "مرزا یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے، آنے تو دو"۔ یار نجان کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دوکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آکا کے مونڈھے کے قریب پیڑی کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دئے۔

آکا: بس بھئی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دئے اتم بھی ہٹ جاؤ۔ لوگ ہنسنے لگے کہ آکا جانوروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آکا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جیداری اچھی نہیں اپنا مونڈھا ہٹا لیجئے۔ مگر آکا قطب تھے۔ قطب از جا نمی جنبد کے مصداق، انھوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آستین چڑھا کر بولے "نہیں مانتا اب کیا میں اٹھوں"۔

اتنے میں پچھڑا ہوا سانڈ پیڑی کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ آکا نے اٹھتے ہی پہلے تو سنبھالتے ہوئے سانڈ کی کوک پر ایک لات رسید کی۔ لات کو وہ پی گیا۔ بلکہ جھنجلا کر اس نے آکا پر حملہ کرنا چاہا تو آکا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لئے اور ایک رو میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔

سانڈ کا چھری چھری لینا تھا کہ آکا نے گاؤ دُکھ کا داؤں کیا۔ سانڈ اڑا اڑا کر کے زمین پر آ پڑا۔ تماشائیوں پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ واہ آکا واہ کیا بات ہے۔ سچ مچ کا گا دُکھ آج ہی دیکھا ہے۔

سانڈ گر پڑا تو آکا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بولے "ابھی بہتے پر آکا کا مونڈھا اٹھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا ورنہ بے چھری حلال کر دوں گا"۔ سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا پھر اٹھ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی دپٹی کمشنر اور کمشنر وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی دیگ کی کھرچنیں قابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ سو جب حکام سے ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کو لئے دیئے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوتیں۔ مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے، علاوہ شہر میں جو پوچھنے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ڈپٹی ہادی حسین خاں، شہزادہ سلیمان شاہ، اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد نہر والے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلی والوں پر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا آکا مصطفےٰ بیگ کی سند سے کہتے کہ بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا۔ صاحب نے پوچھا یہ آکا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے کہا ایک باامن شہری ہیں۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا اب ان کے سوا شاید دلی میں دوسرا نہیں۔ رہا ان کے دیکھنے کا سوال۔ شام کو بلا ناغہ چاوڑی بازار میں حافظ داؤد کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے۔ جب جی چاہے ادھر نکل جائیے اور دیکھ آئیے"۔

صاحب بہادر:۔ وہ ہمارے بنگلہ پر نہیں آئیں گے؟

ڈپٹی صاحب:۔ ان آکاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلائے یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں۔ اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں بٹھائے جائیں گے کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔

صاحب بہادر: لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ ان پرانے دستوروں کے ہم پابند نہیں۔

ڈپٹی صاحب:۔ آپ پابند نہیں وہ تو پابند ہیں۔

غرضیکہ اسی طرح کی رد و بدل کے بعد صاحب بہادر نے وعدہ کر لیا کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انھیں لا کر آپ سے ملا دوں۔

آکا کی نشست اکرام اللہ خاں کے ہاں رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی حسین خاں نے ان کے ذریعہ سے آکا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر چلنے کے لئے مجبور کیا اور صاحب کو چٹھی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آکا کو جناب کی ملاقات کے لئے رضامند کر لیا ہے۔ آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انھیں لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کی واجب تعظیم فرمائیں گے۔ صاحب نے ہادی حسین خاں کی چٹھی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ ملاقات چونکہ نجی ہے اس لئے دوستانہ ہوگی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آکا کو لے کر صاحب کے بنگلہ پر پہونچے اور اطلاع ہوئی تو وہ بلا تامل باہر نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں آکا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے۔ داڑھی چڑھی ہوئی جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آگے بڑھے پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آکا سے معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب:۔ (آکا سے) آپ اچھے ہیں؟

آکا:۔ اچھا تو خدا کا نام ہے۔ زندہ ہوں۔

صاحب:۔ (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) کیا مطلب؟

ڈپٹی صاحب:۔ آکا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس شہر میں ہوں وہاں بُرائی کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہم زندہ ہیں۔

صاحب: (آکا سے) مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔

آکا:۔ آپ کی مہربانی۔

صاحب:۔ آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔

آکا:۔ پٹا بازی کیسی میں سمجھا نہیں؟

صاحب:۔ محرّم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے؟

آکا:۔ صاحب۔ خدا خدا کیجئے ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل سے کیا نسبت۔

صاحب:۔ ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے۔ اور ہمارے ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ آپ اُن کے استاد ہیں۔

آکا:۔ ہاں انھوں نے دو چار گھائیاں مجھ سے سیکھی ہیں۔

صاحب:۔ گھائیاں کیا؟

آکا:۔ لکڑی کے فن کے داؤں یا چوٹیں۔

صاحب:۔ تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں۔

آکا:۔ اچھل کود تو پٹا بازی یا بنوٹ میں ہوتی ہے۔ بانک اور بنوٹ کو ان بوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق؟

صاحب:۔ بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

آکا:۔ ہلانے پڑتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت۔ بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اوٹ نہیں۔ اس کے داؤں سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ بانک والا بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے جس طرح بنوٹ کے لئے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دو چار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بیکار ہیں۔

صاحب:۔ لیکن یہ فن اگلے زمانہ میں شاید کچھ کارآمد ہو۔ آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلہ میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا ہے۔

آکا:۔ بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آجاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

صاحب:۔ ولایت میں بوکسنگ اور فینسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لئے سیکھتے تھے لیکن ریوالور کے مقابلہ میں اب یہ چیزیں صرف کھیل سمجھی جاتی ہیں۔

آکا:۔ بوکسنگ اور فینسنگ کیا ہوتا ہے؟

صاحب:۔ گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔

آکا:۔ میں نے یہ کھیل نہیں دیکھے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی کشتی اور لکڑی کے فن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔

صاحب:۔ میں نے بھی ولایت میں ان دونوں میں اچھا کمال پیدا کیا تھا۔

آکا:۔ بہت مبارک لیکن کبھی ان کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔

صاحب:۔ کیا مطلب؟

آکا:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔

صاحب:۔ مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا اگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔

آکا:۔ وہ لوگ گھونسے کے مقابلہ میں گھونسے اور تلوار کے مقابلہ میں تلوار ہی چلاتے ہوں گے۔

صاحب:۔ قطعی۔

آکا:۔ اگر کسی کو گھونسے بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے۔

صاحب:۔ تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔

آکا:۔ لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔

صاحب:۔ کیا آپ کو تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور گھونسے کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔

آکا:۔ بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔

صاحب:۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔

آکا:۔ سانڈ کے مقابلہ میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟

صاحب:۔ مگر سانڈ تو جانور ہے۔

آکا:۔ آپ کا مکا باز ایسے موقعے پر کیا کرتا۔ سانڈ کی جھپٹ سے کیونکر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔

صاحب:۔ (کچھ سوچ کر) اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلہ میں کیا کریں گے؟

آکا:۔ کوئی گھونسے باز سامنے ہوں تو بتاؤں۔ ایک گھونسہ کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدتوں گھونسا نہ بنا سکے۔

صاحب:۔ ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونسا ماروں تو آپ کیا کریں گے؟

آکا:۔ (ہنس کر) مگر میں آپ کو گھونسا مارنے کی صلاح نہیں دونگا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔

صاحب:۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

ڈپٹی صاحب:۔ کوئی دوسرا انگریز اسوقت دلّی میں ایسا نہیں جو گھونسا بازی جانتا ہو۔

صاحب:۔ (گھنٹے کی طرف دیکھ کر) قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے گھونسہ بازی کا پورا مشاق۔ وہ شاید ابھی آجائے۔

اتنے میں بیرے نے آکر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلالیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آکا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ تم بڈھا آدمی ہم سے گھونسہ بازی کرنا مانگتا ہے؟

آکا:۔ بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔

میجر:۔ پھر؟

آکا:۔ تم گھونسا چلاؤ ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔

میجر:۔ تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا؟

آکا:۔ خون معاف لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔

میجر:۔ (قہقہہ لگا کر) کچھ پروا نہیں۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا قمیض کی آستینیں چڑھالیں اور آکا کی طرف اشارہ کیا کہ آیئے میدان میں۔

آکا:۔ آپ گھونسہ بازی شروع کیجئے۔

میجر:۔ (ہنس کر) بیٹھے بیٹھے لڑے گا؟

آکا:۔ لڑنا کیسا تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے۔

میجر نے صاحب ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سید ہادی حسین سے کچھ کہا۔ سید صاحب نے گردن ہلا دی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کر دیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آکا پر چلا۔ آکا دیکھتے رہے۔ جب میجر صاحب آکا کے قریب پہنچے اور گھونسا ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکایک معلوم ہوا جیسے کسی درخت کا گدّا الٹوٹا سا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب میجر زمین پر چت پڑے ہوئے دکھائی دئے اور آکا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ صاحب اور ڈپٹی صاحب اٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا ہمیں کچھ نہیں معلوم ہم نے گھونسا مارنا چاہا بڈھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرا دیا۔

صاحب: (آکا سے) ہم تو کچھ دیکھ نہیں سکے۔

آکا:۔ آپ کہاں چلے گئے تھے۔

صاحب:۔ ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہوگا اس لئے پوری توجہ نہیں کی۔

آکا:۔ ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسا مارا ہم نے کیلی کر کے انھیں پچھاڑ دیا۔ البتہ اتنی رعایت کی کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقع پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔

صاحب:۔ کیلی کیا؟

آکا:۔ ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔

صاحب:۔ مگر آپ نے تو بجلی کی سی پھرتی کی۔

آکا:۔ ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔

میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پنجے سے لے کر شانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آگا کے قریب آکر آکا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا۔ ان کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن۔ نہ ان کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آکا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔

آکا:۔ بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔

صاحب:۔ ناممکن ہے۔

آکا:۔ آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہئے کہ طمنچہ چلائیں۔ خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہوگا۔

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ لگتے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تاکہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ اور صاحب نے اپنا ریوالور لا کر میجر کو دیا۔

آکا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر جھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور نہ اس کی گھوڑی دبانی چاہتے ہی تھے کہ آکا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی۔ ہاتھ نیچے آہی رہا تھا کہ آکا کے ہاتھ کی گدی اسکی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آکا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

صاحب:۔ یہ آپ نے کیا کیا؟

آکا: (مسکرا کر) اسے ہت کٹی کہتے ہیں۔ میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی۔ میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے لیا۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متعجب ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے آکا کی تعریف کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آکا رخصت ہو کر گھر آگئے اور اس روز سے مرزا ترک کی دوکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔ قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔

وسط ایشیا کے چند فنکار

صدرالدین عینی — ایک تاجیک ادیب

ل احمد اکبرآبادی

صدرالدین عینی نسلاً تاجیک ہے اور تعلیم و تعلم کے اعتبار سے ازبک۔ اس لئے کہ سن شعور سے اس کا سارا وقت بخارا وغیرہ میں گذرا وہیں اس نے درجۂ علم و فضل حاصل کیا اور وہیں اس کا شعر و ادب پروان چڑھا۔ امیر بخارا کے زمانے تک یہ علاقے الگ تھے بھی نہیں لیکن جب ازبکستان اور تاجکستان وغیرہ کی جداگانہ جمہوریتیں قائم ہوئیں تو عینی نے اپنا مستقر تاجکستان میں بنالیا۔ بایں ہمہ وہ جتنا تاجیک ہے اتنا ہی ازبک ہے۔ دونوں ملک اور قومیں عینی کو "اپنا" کہتے اور سمجھتے ہیں

وسطِ ایشیا، جو انقلاب سے پہلے تک روسی ترکستان کہا جاتا تھا انقلاب کے بعد کازاک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور ازبک سوویٹ جمہوریتوں میں تقسیم ہوا، اور جب ازبکستان میں سوویٹ طاقت قائم ہوئی تو اسوقت صدرالدین عینی مسلمہ شہرت کا مالک تھا۔ صدرالدین نے بچپن میں گانوں کے ایک مکتب میں پڑھا جہاں بچے عموماً "ہفت یک" اور دوسری قرآنی سورتیں حفظ کر لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد صدرالدین بخارا چلا آیا تعلیم جاری رکھی۔ پھر ایک مسجد کی کوئی خدمت اس کے سپرد ہوگئی۔ اس زمانے میں اس نے بخارا کے ایک مقتدر ملّا صاحب سے اعلیٰ نصاب کا درس لیا۔ وسط ایشیا میں تعلیم کا یہی ایک طریقہ تھا۔ الغرض صدرالدین نے امیر بخارا کی حکمرانی میں رائج نصاب پورا کر کے فضیلت کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے پرانے شعر و ادب کا مطالعہ کر کے اور سعدی و حافظ اور جامی و نوائی سے کسب فیض کیا عینی تخلص اختیار کیا اور شعر کی مملکت میں ایک معزز مقام حاصل کر لیا۔

صدرالدین عینی تھوڑے ہی عرصے میں ایک نہایت قابل انشاء پرداز اور محرّر کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوگیا۔ اور سمجھا جانے لگا کہ قصیدہ گوئی اور درخواست لکھنے میں عینی ایک فردِ کامل ہے۔ اب وہ تمام لوگ جنہیں امیر یا قاضی القضاۃ کے یہاں درخواستیں گزارنا ہوتیں۔ عینی کو تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تھے۔ اس طرح سماجی طور پر بھی صدرالدین عینی ایک مقتدر شخصیت بن گیا تھا۔

عینی نے جو ماحول پایا اور جس فضا کے اندر اس کی تعلیم و تربیت ہوئی وہ ازمنہ وسطیٰ کی تاریکیوں اور گمراہیوں کا ماحول تھا۔ اور صدرالدین کی فطرت عالی اس ماحول سے مطابقت نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وہ اپنے ماحول سے گھبرا گیا اور اس کی تصنیفات میں بغاوت کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے اپنی تحریروں میں حقیقت پر سے پردے ہٹائے اور لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کے کچھ انسانی حقوق ہیں، امیر کی حکومت پر عوام کی طرف سے کچھ فرض عائد ہوتے ہیں، عوام کی بے کسی منشائے قدرت نہیں ہو سکتی اور امیر کی مطلق العنانی ارادۂ خداوندی نہیں ہے۔

اونچے سماجی طبقے میں پہلے تو عینی کے نعرۂ حق و انصاف سے گھبراہٹ پیدا ہوئی، پھر خفگی اور بیزاری کا اظہار ہوا، اور پھر اس کی خفگی کا عملی ثبوت دیا جانے لگا۔ عینی نے کسی بات کی پروا نہ کی اور اپنا فرض منصبی ادا کرتا رہا۔ اور جب مخالفوں کی طرف سے تعزیر و تشدد ہونے لگا تو رد عمل میں عینی تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ ادھر سے دشمنی اور سزا کا اعلان تھا تو اس طرف سے تنقید و مخالفت سخت سے سخت تر ہوئی تھی۔

بڑے لوگ صدرالدین سے خفا تھے کہ اس نے آداب و مروت کی تمام قدیمی روایتوں کو پامال کیا ہے! بخارا کی پوری تاریخ میں اس بغاوت و غداری کی مثال نہیں ہے۔ اس نے امیر اور امرائے دربار کی مخالفت اور حقارت کی؟ اس نے بزرگوں کی کے رسم و رواج کو توڑا؟ اس نے صدیوں کے پرانے عقیدوں کی مخالفت کی؟ رائج الوقت رسوم سے روگردانی کی؟ ان سب باتوں کا جرمانہ عینی نے بالکل اسی طرح ادا کیا جس طرح تاریخ میں حق کے ساتھی اور صداقت کے پرستار ادا کرتے چلے آئے ہیں۔ عینی استحکام و استقلال کا پہاڑ ثابت ہوا۔ اور وسط ایشیا کی "جدید بخارا" تحریک کا سرخیل قرار پایا۔

صدرالدین بخارا سے تاشقند چلا گیا تو امیر نے اس کے بھائی کو قتل کرا دیا۔ عینی کو اپنے بھائی سے غیر معمولی محبت تھی، اس لئے اس واقعے نے اس کو پاگل بنا دیا۔ عینی کے غم کی حد اور غصّے کی انتہا نہ تھی۔ بھائی کے غم میں اس نے ایک نظم لکھی جسکے اندر قلب و جگر کا خون صرف کیا ہے۔ یہ نظم قومی جنگ میں بصورت ترجمہ شائع ہوئی تھی۔

"اب میں حسن و عشق کے گیت نہ گاؤں گا۔ گلستانی نغمہ موقوف!
اور حسین خوابوں کا ترانہ ختم! آج سے میری آواز میں انقلاب کے
نعرے بند ہونگے اور نفرت کے شعلے بھڑکیں گے! میں انقلاب
اور نفرت کا نغمہ الاپونگا ....

اس موقع پر عینی کے تین شعر جو انگریزی ترجمے کی صورت میں

نہیں بلکہ اخبار قومی جنگ کو اصل فارسی میں دستیاب ہوئے، یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

در آتش ستم جگرم شد کباب سرخ	از خون مستبد قدحے دہ شراب سرخ
با انقلاب روئے مرا سرخ کے کند	از انقلاب سرخ دمد آفتاب سرخ
عینی بیک غزل نتواں شرح حال کرد	باید بہ انقلاب نوشتی کتاب سرخ

عینی حکام متعلقہ کو اطلاع کئے بغیر قرتاب چلا گیا اور وہاں ایک روئی کے میل میں مزدوری کرنے لگا۔ یہ بھی ایک نئی بات تھی کہ او نچی سماج کا آدمی کارخانوں میں مزدوری کرے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا آدمی مزدوری کرنے نکل کیسے سکتا ہے۔ بخارا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہ تھی کہ ایک جوان شاعر و ادیب اور عالم و فاضل ادنے قسم کا مزدور بنا ہو۔ اشرف بخارا اس بنا پر بھی اس کے زیادہ مخالف ہو گئے۔

امیر بخارا نے سنا تو صدر الدین کو بخارا بلا لینا چاہا اور اسلئے اس نے ایک معزز اور دولتمند مسجد کی نگراں کاری صدر الدین کو پیش کی۔ اس دور میں مسجدیں بھی دولتمند و مفلس اور معزز اور غیر معزز ہوتی تھیں۔ لیکن ایک مستبد حکمراں کا ایک خود سر باغی کو کوئی منصب اور مرتبہ عطا کرنا طرفہ تر بات تھی اور اس طرفگی سے عینی خود بے خبر نہ ہوگا۔ عینی نے مسجد کی نگراں کاری قبول کر لی۔ اور امیر علیم خاں والی بخارا کو اتنی مہلت منظور تھی کہ صدر الدین کو سر بازار گردن مروا دیا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اور یہ راز کھلا بھی نہیں کہ امیر نے صدر الدین کو صرف زنداں میں ڈال دینے پر کیوں اکتفا کیا۔ قید خانے کی جان لیوا تکلیفوں کو برداشت کرکے عینی نے ثابت کر دیا کہ اسے مرنے سے انکار ہی نہیں بلکہ جینے پر اصرار بھی ہے۔

اس کو تاریخ کا حسن اتفاق کہا جانے لگا کہ انہیں دنوں انقلاب نمودار ہو گیا، اور ازبک عوام سرخ فوجوں کی معیت میں زنداں کا پھاٹک توڑ دیا اور جبر و استبداد کے مظلوم زندانی آزاد ہوا میں سانس لے سکے۔

عینی کے ساتھ "جدید" تحریک کے حامیوں کی اچھی خاصی جماعت تھی لیکن حکومت کے جبر و استبداد کے سامنے اس میں سے کچھ لوگ اعتدال پسند کردہ گئے۔ مگر عینی ایک سچا ہیرو ثابت ہوا۔ اس نے اپنے علم و فضل اور شعر و ادب کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور اس طرح قومی کلچر کا رہنمائے اعظم قرار پایا۔

وسط ایشیا میں اسوقت تک شعر کی مقبولیت عام تھی اور آجکل کے مفہوم میں نثری ادب بالکل نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق صرف شعری ادب سے نثری ادب کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ بلند پایہ شعری ادب کلچری پرواز کیلئے راستہ ضرور ہموار کر دیتا ہے، اور بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ نثری ادب خاص کر واقعیت نگارانہ اصول پر ناول نویسی اسی وقت رونما ہو سکی ہے جب کسی قوم نے سماجی اور کلچری ترقی کی کچھ منزلیں طے کر لی ہیں۔ چنانچہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جیسے ترکی، ایران اور ہندوستان میں نئے خیالات کی آبیاری بیسویں صدی کے شروع سے ہوئی جب وہاں قومی تحریکات نے جنم لیا اور ان قوموں میں آزادی اور ترقی کے خیالات نے جڑ پکڑ لی۔ آزادی کے پرچار کے ساتھ جمہوری خیالات پھیلے تو نثری ادب کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ بڑھنے لگا۔

عینی کی ہستی وسط ایشیا میں ایسے "تاریخی موقع" پر رونما ہوئی کہ وہ نثری ادب کا اور جدید اصول پر ناول نویسی کا باوا آدم ثابت ہوا۔ عینی پہلا شخص ہے جس نے مسجع و مقفیٰ عبارت ترک کرکے سادہ و سلیس زبان اختیار کی۔ اس نے "گل و بلبل" کا پیرایہ اور لفظی جمالیات کو ترک کرکے بول چال کی زبان میں تصنیف و تالیف شروع کی۔

عینی کے پہلے ناول کا نام ادینہ (یا ایک غریب تاجیک کی روداد) ہے۔ یہ وسط ایشیا کی پہلی تصنیف تھی جو واقعیت نگاری کی اصول پر لکھی گئی۔ اس ناول کا ہیرو ایک نوعمر دہقانی ہے اور اس کی زندگی کی زبانی دکھ درد کی داستان ہے۔ اس افسانے کی جائے وقوع نہ محلات ہیں اور نہ باغات بلکہ دہقان کی جھونپڑی ہے۔ کہیں مزدوروں کی "بیں" کا منظر ہے، کہیں ریلوے تعمیر کی عارضی آبادی کا ایک گھٹیا قسم کے چائے خانے میں واقعات رونما ہوتے ہیں یا زنداں کے تاریک تہ خانے ہیں۔

اس ناول کی بناء وہی خیالات و محسوسات ہیں جو انقلاب کے وقت پڑھے لکھوں کے طبقے میں عام طور سے رائج تھے۔ اس ناول میں عینی کو اس وقت کے سماج کی ناانصافیوں اور ناروائیوں کا گہرا احساس ہے مگر اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے، تاریکی ہی تاریکی ہے۔ چنانچہ افسانے کا ہیرو آدینہ زندگی کی اس جد و جہد میں شکست کھاتا اور فنا ہو جاتا ہے۔

لیکن اس تصنیف کے بعد عینی کا منصب شعر و ادب جس خاص وجہ سے اپنے راستے پر قائم رہ کر پختہ ہو گیا وہ چیز عینی کی عوامی مفاد سے وابستگی اور وفاداری تھی۔ اس کا جذبۂ وطن پرستی سچا اور حقیقی تھا۔ اسے قومی کلچر اور اس کی روایات سے محبت تھی۔ چنانچہ

عینی کا شاعرانہ جوہر اور ادبی قابلیت قوی تر ہوتا گیا اور عینی نے تھوڑے ہی دنوں میں نئے ناولوں کا ایک سلسلہ تصنیف کرلیا۔ "دوخندہ"، "غلام" "سود خوار کی موت"، اور "ماضی کے اندر سے" وغیرہ متعدد ناول تصنیف کئے اس کی ان کتابوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ جس عہد کی زندگی بیان کرتا ہے اس پر اس کی گرفت گہری اور گیرائی حیرتناک ہے۔

ان ناولوں میں بہت سی نئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو اس کے پہلے ناول آدینہ میں نہ تھیں۔ اب عینی نے نئی باتیں دیکھ لی تھیں اور وہ خود بھی عوام کی نئی زندگی میں شامل تھا۔ "دوخندہ" میں "آدینہ" کی طرح نہ تو جذباتی و انعطافی باتیں ہیں اور نہ ویسا تعطل اور یاسیت ہے۔

اس ناول کا ہیرو بھی ایک دہقان لڑکا ہی ہے جو ایک افلاس زدہ گانوؤں میں رہتا ہے۔ یہ لڑکا ایک آزاد، منصفانہ اور نئی زندگی کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن اس کا مقدر وہی نہیں ہے جو آدینہ کا تھا۔ دوخندہ عوامی جنگ کا سپاہی بنجاتا ہے، اور دوسرے انقلابیوں کی طرح وہ بھی زندان کے تہ خانوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ لیکن انقلاب فتحمند ہوتا ہی کا میرو بخارا فرار ہوجاتا اور دوسرے رفیقوں کے ساتھ دوخندہ بھی زنداں سے آزاد نکلتا ہے۔ وہ ۱۹۲۲ء تک سرخ فوج کا سپاہی بن کر انقلاب دشمن بسماشی ڈاکوؤں سے جنگ کرتا رہتا ہے۔ اور جب سوویٹ حکومت قائم ہوجاتی ہے تو قومی تعمیر کا مزدور و معمار بنجاتا ہے۔

لفظ دوخندہ یا دُخندہ ازبک زبان میں تحقیرا و ر ہانگھٹر کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہ دوخندہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان مناظر کی زیارت کو جاتا ہے جہاں ان کی محبت نے جنم لیا تھا۔ گویا وہ اپنے عالم بے کسی کے خوابوں کو زندہ یا تازہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب دونوں اپنے وطن مالوف میں پہنچتے ہیں تو کوئی چیز پہچانی نہیں جاتی۔ گانوں بدلا ہوا ہے، علاقہ بدل گیا ہے، سارے منظر بدلے ہوتے ہیں! وہ خود بھی تو بدل گئے تھے! وہ ڈھونڈھتے ہیں مگر پہاڑی کھاڑی کے کنارے وہ گانوؤں نظر نہیں آتا۔ اس موقع پر عینی لکھتا ہے۔

"ان کی حیرانی ہر ہر قدم پر بڑھتی جاتی تھی۔ پہاڑی چشمے جو پہلے بیکار اور بیراہ بہتے تھے، اب سب ایک بڑی ندی بنکر بہتے ہیں اور بند باندھ کر اس میں سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ چپہ چپہ زمین کاشت سے آباد ہے۔ ہر کھیت کو پانی کی بہم رسانی یکساں ہے۔ سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر تھی کہ انہوں نے وہاں روئی کی کاشت دیکھی۔ پہلے کپاس کبھی نہ بوئی گئی تھی۔ دوخندہ اپنی بیوی سے کہتا ہے :-

"میں نہ کہتا تھا؟ دیکھا تم نے گلنار؟ ہمارا درۂ نہاں یہاں تھا۔ بتاؤ پہلے سارے تاجکستان میں ایسا شاداب علاقہ کہیں تھا؟ دیکھتی ہو ہماری جمہوریت نے تھوڑے دن کے اندر کیا سے کیا کر دکھایا؟ ابھی تو بہت کچھ ہونا ہے!"

گلنار شوہر کا ہات پکڑے دل میں خوش ہے اور اپنے پرانے درۂ نہاں کی جگہ ایک صاف ستھرا گانوں، ایک نیا درۂ نہاں دیکھتی ہے اور مسرور ہوتی ہے۔

اسی ناول کے ایک باب میں عینی نے حرص اور بخل کی دون فطرتی کی نقاشی کی اور دکھایا ہے کہ انسان! بخل میں پڑکر اور ظلم وسعائی کا عادی ہو کر کتنا ذلیل اور بے غیرت ہوسکتا ہے۔ بخارا کا قاضی جس کے جبر و ظلم سے ساری آبادی نالاں تھی گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر اس کے گھر کی تلاشی لی جاتی ہے اس موقع پر قاضی کے کردار کو عینی نے چند جملوں میں پیش کیا ہے۔

"قاضی القضاۃ کو جیل سے نکال کر اس کے باپ دادا کے مکان پر لایا گیا۔ عام لوگوں میں ہیجانی حالت پیدا ہوگئی؟ اور سمجھا گیا کہ قاضی القضاۃ پر اسی کے گھر میں مقدمہ چلایا جائے گا جہاں بیٹھ کر اس نے سینکڑوں مجبور و معذور اور ہزاروں بیگناہوں کو موت کی سزا دی تھی۔ راستہ اگرچہ سپاہیوں نے روک رکھا تھا لیکن اس تماشے کو دیکھنے کو محض شوقین دھینگا مشتی کر کے اندر پہنچ ہی گئے۔ لیکن۔ اندر تو کوئی عدالت بیٹھی نہ تھی، نہ کسی مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ البتہ چند سوویٹ حکام قاضی کے مال اسباب کا جائزہ طیار کرنے آئے تھے۔ حاکم اعلیٰ نے کنجیوں کا ایک بھاری گچھا قاضی کے ہات میں دیتے ہوئے کہا۔

"کوٹھوں اور صندوقوں کے قفل کھول کر وہ تمام مال اسباب دکھاؤ جو تم پچاس برس سے اکٹھا کرتے رہے ہو!"

اس حکم کی تعمیل سے پہلے قاضی نے اس حاکم سے گڑگڑا کر ایک سگرٹ مانگا اور اپنی حرکات سکنات سے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا۔

"برادرم، آپ دیکھ رہے ہیں، میں سگرٹ پیتا ہوں، اب تو آپ کو میرے "جدید" ہونے پر شک نہیں؟ مہربانی کر کے لوگوں کو بتا دینا کہ میں جدید ہوں، تم پر خدا کی عنایت نازل ہو۔ خدا نے چاہا تو مجھے سزا ہلکی دی جائے گی، میں سگرٹ پیتا ہوں۔"

"اطمینان رکھو، میں اعلان کردوں گا کہ تم سگرٹ پیتے ہو۔

اب کام شروع ہونا چاہئے" حاکم نے اسے جواب دیا۔
قاضی نے اسے توشہ خانہ کا قفل کھولا اور اس حاکم کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ دہلیز کے قریب ہی ایک جوڑی جوتا رکھا ہوا ہے۔ اسپر اس نے حاکم کو مخاطب کر کے :۔
"برادرم، خدا تم پر زیادہ سے زیادہ بخشش کرے، یہ جوتہ تو مجھے رکھ لینے دو، جو پہنے ہوں وہ بالکل پھٹ چکا ہے۔ چلتا ہوں تو میری جوتیاں مجھ سے آگے دوڑنا چاہتی ہیں"
اس حاکم نے منظوری دیدی تو قاضی کو اتنی خوشی ہوتی جیسے کسی بھکاری کو سونے کا ڈلا ملجائے۔ یہ جوتے اس نے پہن لئے اور پرانے لپیٹ کر بغل میں دبا لئے۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر اس حاکم کو درازی عمر و دولت کی دعائیں دیں۔
توشہ خانہ سونے چاندی کی اینٹوں سے بھرا تھا اور بہت سا سونے کا برادہ بھی تھا۔ حاکم نے ہر چیز کی فہرست بنائی، اور صندوقوں کو مقفل کر کے اپنر مہریں لگا دیں اور چابیاں ایک دوسرے حاکم کے سپرد کر دیں۔
پھر دوسرا کمرہ کھولا گیا۔ اس میں بیش قیمت قالین اور نمدے الوان اور دھستے بھرے پڑے تھے۔ ایک بڑا صندوق جس میں آہنی بند لگے تھے ان اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا جو انقلاب سے کچھ ہی دن پہلے بخارا میں ضرب ہوئی تھیں۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے کہا۔
محنت کش تاجیکوں کا خون پسینہ پچاس برس تک اس صورت میں جمع ہوتا رہا ہے"
تیسری کوٹھری میں آہنی بند لگے صندوق اوپر تلے چنے ہوئے تھے۔ ایک میں طلائی کٹورے نکلے جن میں ہیرے اور عقیق جڑے تھے اور بخارا کے بہترین مرصع سازوں کی دستکاری تھی۔ اس صندوق پر ایک لیبل لگا تھا "شاہنشاہ زار اور جناب عالی کی ملاقات پر نذر کے لئے" ایک دوسرے ٹرنک میں زنانہ زیور تھے جنپر "شاہنشاہ زار کے خاندان کے لئے" ایک بکس پر لکھا تھا "موسم بہار میں قصر یالٹا کے لئے" دوسرے صندوقوں میں قیمتی لباس، مخمل و ریشم کے تھان بھرے تھے۔ حصار اور کرشی کا ریشم، بخارا کی مخمل اور دوسرے ملکوں کے ساختہ زربفت و کمخواب کے تھان۔ غرض ہزاروں اور بہ چیزیں برآمد ہوئیں۔
ایک ٹرنک کھولا گیا تو اس میں سے ایک بندھی ہوئی سفید مخمل کی دستار نکلی۔ اسے دیکھکر قاضی بے چین ہو گیا اور حاکم سے گڑگڑا کر کہنے لگا

"پردیسی بلم"

اقبال معروف

برکھا کیسے من کو رجھائے ✦ جیون ان بن کیوں کل پائے
نیناں نیر بہائے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
چاند گگن کے مکھ نہ دکھا تو ✦ کالی بدری میں چھپ جا تو
من مورا بھر آئے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
جانے کیسے بیتیں رتیاں ✦ یاد آویں گی "ان" کی بتیاں
کیوں بادل گھر آئے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
پون چلے کلیاں مسکائیں ✦ بھونرے گھومیں پنچھی گائیں
کویل کوک ستائے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
پریت کی نرمل ریت نبھانا ✦ برہن کو ساجن نہ بھلانا
جیون روٹھ نہ جائے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
تڑپت رہوں بن نیر مچھلیا ✦ جیون ہے یا کوئی پہیلیا
یاد توری تڑپائے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے
مور بلم جب لوٹ آؤ گے ✦ نینن میں جب مسکاؤ گے
پھر جیون کل پائے ✦ بلم مورے آج بدیس بسائے

برادرم! ایک عنایت اور کیجئے، یہ پگڑی مجھے بخشدیجئے۔ جو پہنے ہوں دیکھ لیجئے پھٹ چکی ہے"
حاکم نے اجازت دیدی تو قاضی کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پرانی پگڑی اتار کر کمر سے لپیٹ لی اور نئی کو سر پر رکھا۔ اسکی خوشی کی حد نہ پوچھئے۔ لوگ سمجھے کہ وہ ناچ رہا ہے۔
حاکم نے فہرست مکمل کر کے اپنے محرر کو دی کہ اس کی کئی نقلیں کرلے۔ محرر فہرست کی طوالت پر حیرت زدہ ہو کر بولا۔
"گلیاب کا ایک کنجوس اور اتنا بڑا ذخیرہ!"
تماشائیوں میں سے ایک آدمی کہنے لگا:۔
"گلیاب سے اس کا کیا تعلق؟ میں گلیاب کا باشندہ ہوں مگر یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی دن بھی پیٹ بھر کھانا کھایا ہو!"
یہ کہنے والا یادگار تھا جسے بخارا والے دو خندہ کہکر پکارتے تھے۔
یہی اب ضعیف ہو گیا ہے لیکن آج بھی پورے وسط ایشیا کی کلچرل زندگی کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ اس کا دوسرا کام مبتدیوں کی تربیت اور اصلاح۔

نائب صدر کی پہلی تقریر

ندوستان کی عارضی حکومت بن جانے کے بعد
کے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے ۷
مبر کو بو نے نو بجے آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی
ے ہندوستانی میں تقریر نشر کی جس میں آپنے
رضی حکومت کی تاریخی اہمیت جتانے کے بعد
ادثات کلکتہ پر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے یہ امید
اہر کی کہ عارضی حکومت کو چلانے کیلئے اشتراک
ل سے کام لیا جائیگا اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ
ں اتحاد کو استوار رکھنے کی کوشش کی جائیگی
جو صدیوں سے ہمارے ملک کے ساتھ قائم ہے۔

پیرس میں امن کانفرنس

یہ تصویر ان ہندوستانی نمائندوں کی ہے جنھو
نے پیرس کی امن کانفرنس میں حصہ لیا (کرسیو
پر بائیں طرف سے) سررا گھون پلائی' سرجور
بھور' سرسیموئل رنگانادھن (لیڈر) ملک .
خضر حیات خاں ٹوانہ اور سرہوروجی واد
(کھڑے ہوئے بائیں طرف سے) مسٹر بی ایا
بھنڈاری' کیپٹن آر ہورکس دیباث' مسٹر ۔
سی رائے' مسٹر ایم۔آر۔آھوجہ' مسٹر اے و
بائی' میجر جنرل جنرل ڈی اسٹورٹ' مسٹ
آر۔ایس مانی' اور مسٹر ایچ ٹریویلیاں۔

سیام کے لئے قرضہ

ہی میں حکومت ہند نے حکومت سیام
انچ کروڑ روپے قرض دینے منظور کئے
. اس تصویر میں حکومت ہند کے محکمۂ
ت کے پرسپل سکریٹری معاہدہ پر دستخط
ہے ہیں۔ سیامی خزانے کے افسر اعلی (نائی
لامین) اپنی حکومت کی طرف سے دستخط
کر رہے
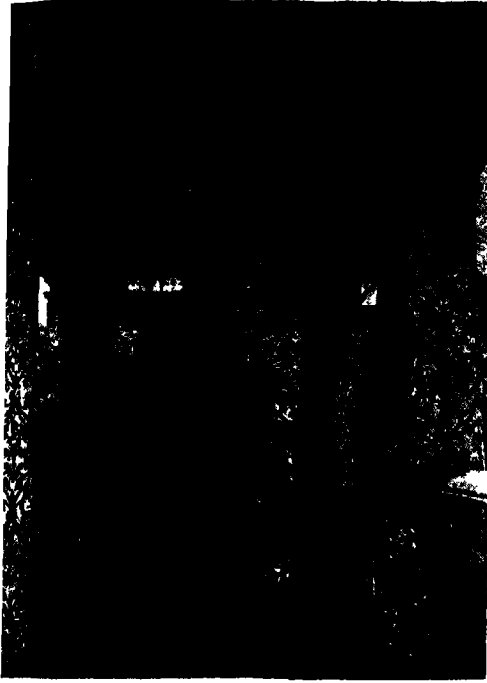
جین مندر

کلکتے کے جین مندر کی سادھی میں جانے کا شا[illegible]
صدر دروازہ۔ اندرونی حصہ میں ایک جین [illegible]
پارس ناتھ کا بت رکھا ہے۔

ایک شہ نشین کے ستون کا قریبی نظارہ۔ خوب[illegible]
نقش و نگار کس درجہ دیدہ زیب ہیں۔

مندر کے باغیچے میں رکھی ہوئی ایک مورت۔ اوپر کی
شاندار چھتری دیکھنے کے قابل ہے۔
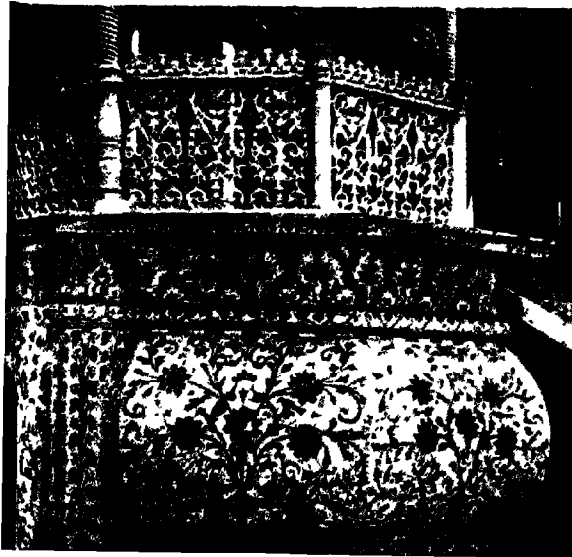
ہندوستان میں جینیوں کا فرقہ تعداد میں کم سہی لیکن بڑا مالدار ہے۔ انکے مندر ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ لیکن کلکتہ کا جین مندر اتنا عمدہ اور قابل دید ہے کہ کوئی سیاح اسے دیکھے بغیر شہر سے واپس نہیں جاتا۔ اس میں ہر قسم کا سامان تعمیر استعمال ہوا ہے۔ برف کے مانند سفید سنگ مرمر ہے اور دھات کے چمکتے ہوئے پترے ہیں۔ چینی مٹی کے رنگین ٹائل ہیں اور صاف شیشے کے مربع و مستطیل ٹکڑے ہیں۔ انسانی صنعتوں کے ساتھ ملحقہ باغیچوں کا قدرتی ماحول سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ نیز دیواروں کے نقش و نگار فواروں کی بہار اور مورتیوں کا سنگھار سیاحوں کے دل الگ موہ لیتا ہے۔ یہ مندر

برطانیه اور چرم سازی

س موضوع سے متعلق ایک مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۵۸ پ
ملاحظہ کیجئے' جس میں بتایا گیا ہے کہ اس صنعت نے دوران جنگ میں
کتنی ترقی کی ہے اور اسی ترقی کے باعث برطانیہ کے کارخانوں میں
بنی ہوئی چمڑے کی چیزیں دنیا کے ہر حصے میں مقبول ہو رہی ہیں

برطانیہ کے کارخانوں میں بنی ہوئی چمڑے کی چیزو
کے چند نمونے۔

کچھ اور نمونے جو خاص طور پر سمندر پار کی منڈیو
کے لئے بنائے گئے ہیں۔

فوجی ہوا بازوں کا چرمی
لباس جو صحیح معنوں میں
انکو سر سے پاؤں تک ڈھک
دیتا ہے۔

ٹخنوں سے اوپر تک کا فوجی
جوتا جو برطانیہ میں پچیس
سال کی تحقیقات کے بعد پہلے
پہل ۱۹۱۴ء میں استعمال ہوا
تھا۔

شاہی فضائی بیڑے میں استعمال
ہونے والا جوتا جسکے بالائی
حصے کو ہواباز جب چاہے
آسانی سے الگ کر سکتا ہے۔
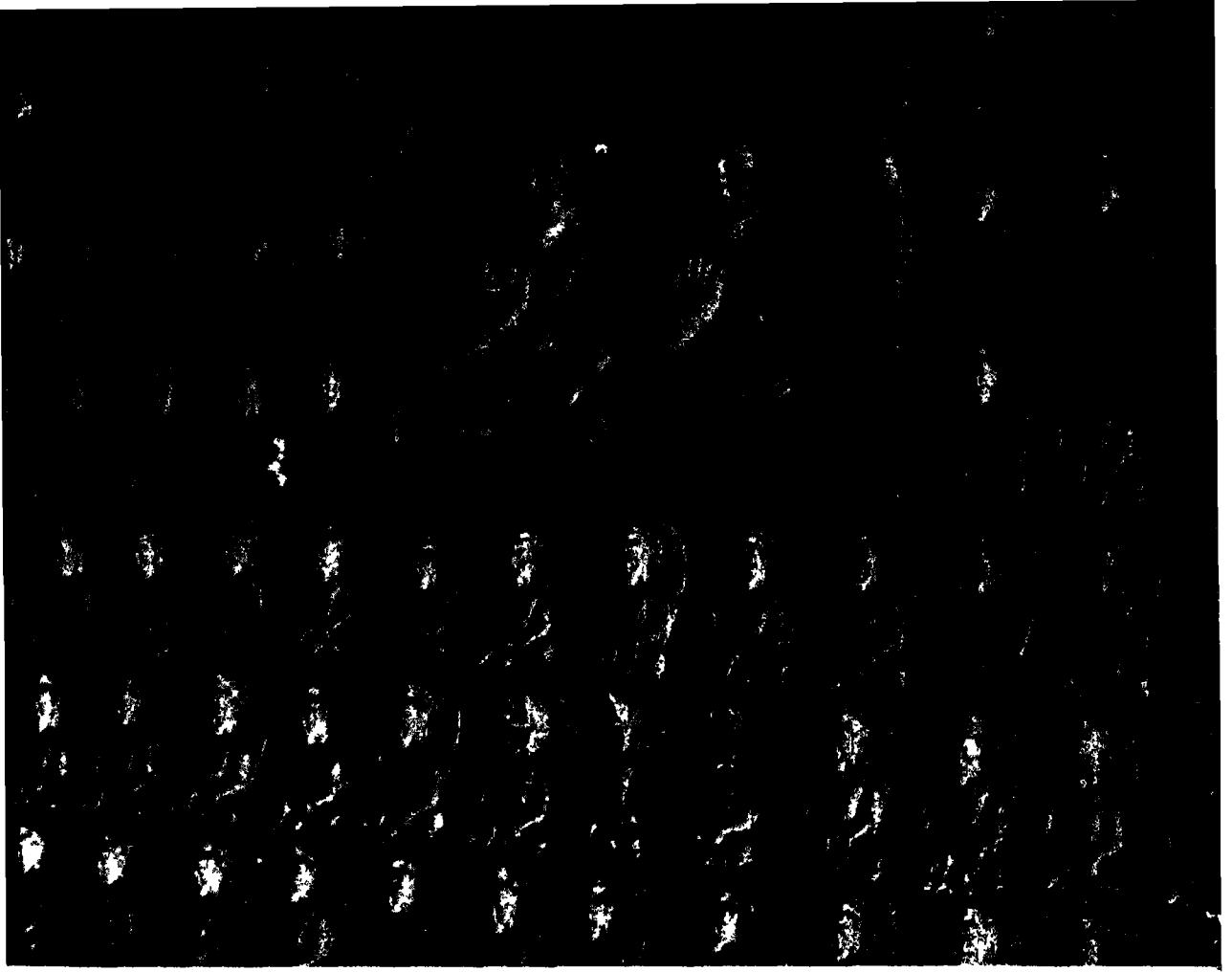
دنیا کا آٹھواں عجوبہ

چین میں بدھ تہذیب کے یوں تو بہت سے آثار موجو
لیکن ین کانگ کے غار اپنی قدامت اور شان کے لحاظ سے
اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ غار بدھ راہب "تان یاؤ" کے ا
بادشاہ "ون چینگ" کے عہد میں پتھر کی چٹانیں کاٹ کر
گئے ہیں۔ ان سب میں قدیم چینی اور گپت عہد کی منقو
نقاشی کے طرز ملے جلے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سنگ تر
فن کے توازن، حسن کے تناسب اور روحانی جذبات کے
کی بہترین مثالیں ہیں۔ (اوپر) ایک غار کی دیوار پر بدھ کم
ہزار مورتیں برابر بنی ہوئی ہیں۔ (دائیں طرف) سب سے
غار میں داخل ہونے کا دروازہ (دوسرا صفحہ۔ اوپر)
درمیانی حصہ۔ اسمیں پہنچنے کیلئے مندر کی بہت سی عا
سے گذرنا پڑتا ہے (نیچے) گوتم بدھ کا ستر فٹ
بت۔ یہ بھی چٹان کاٹ کر بنایا گیا ہے
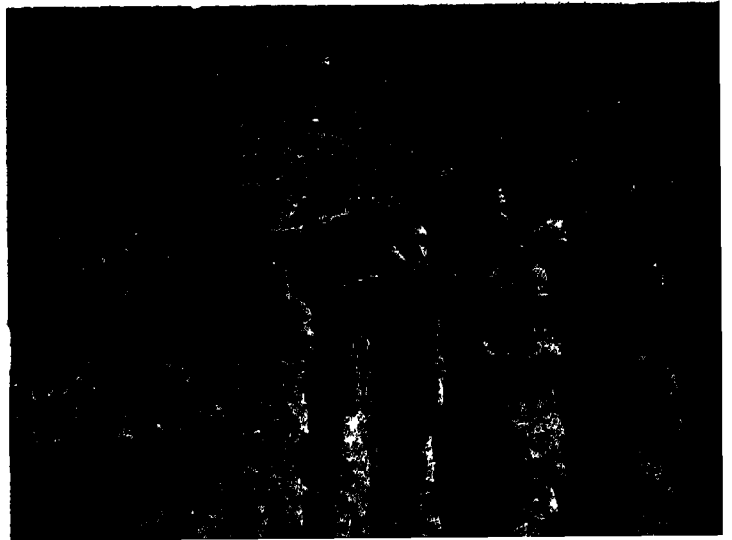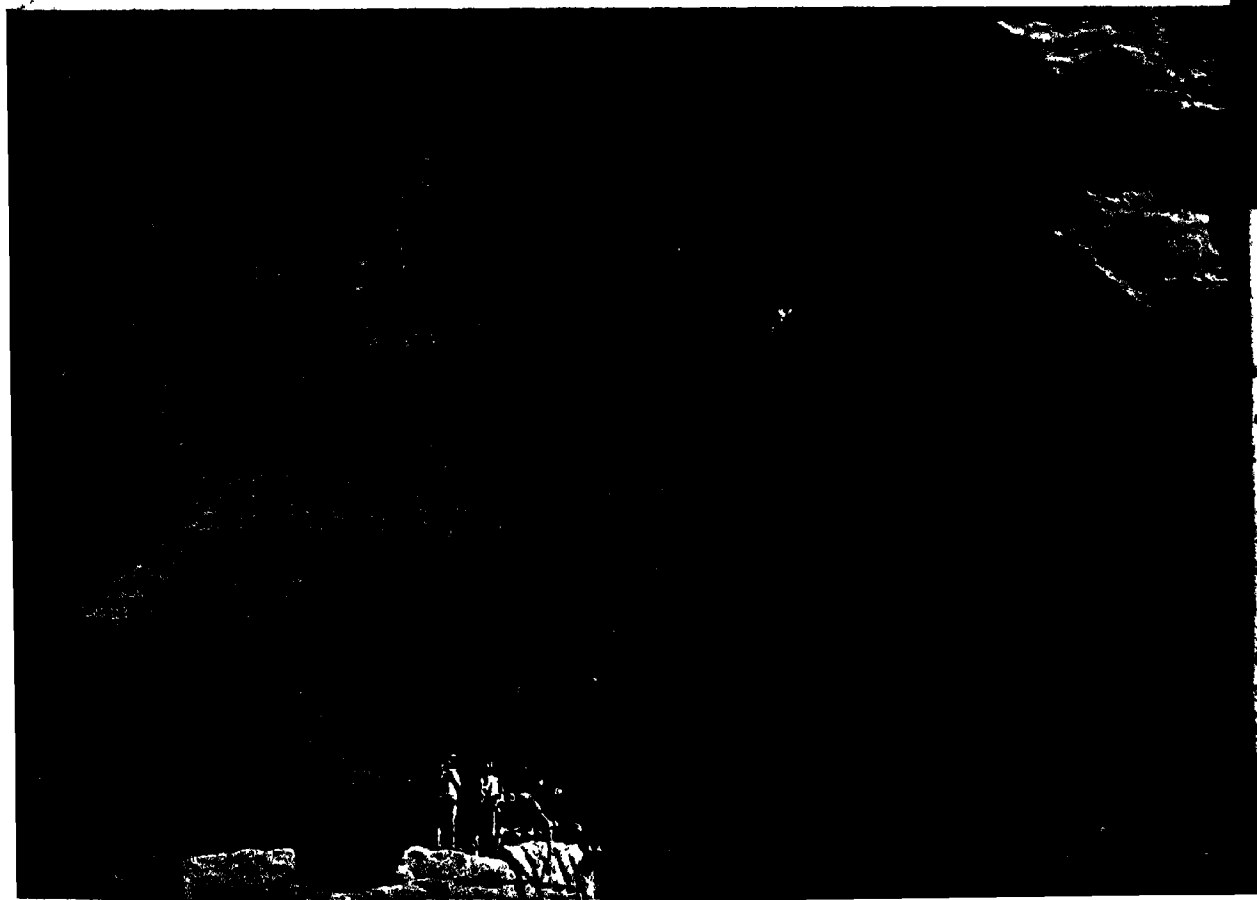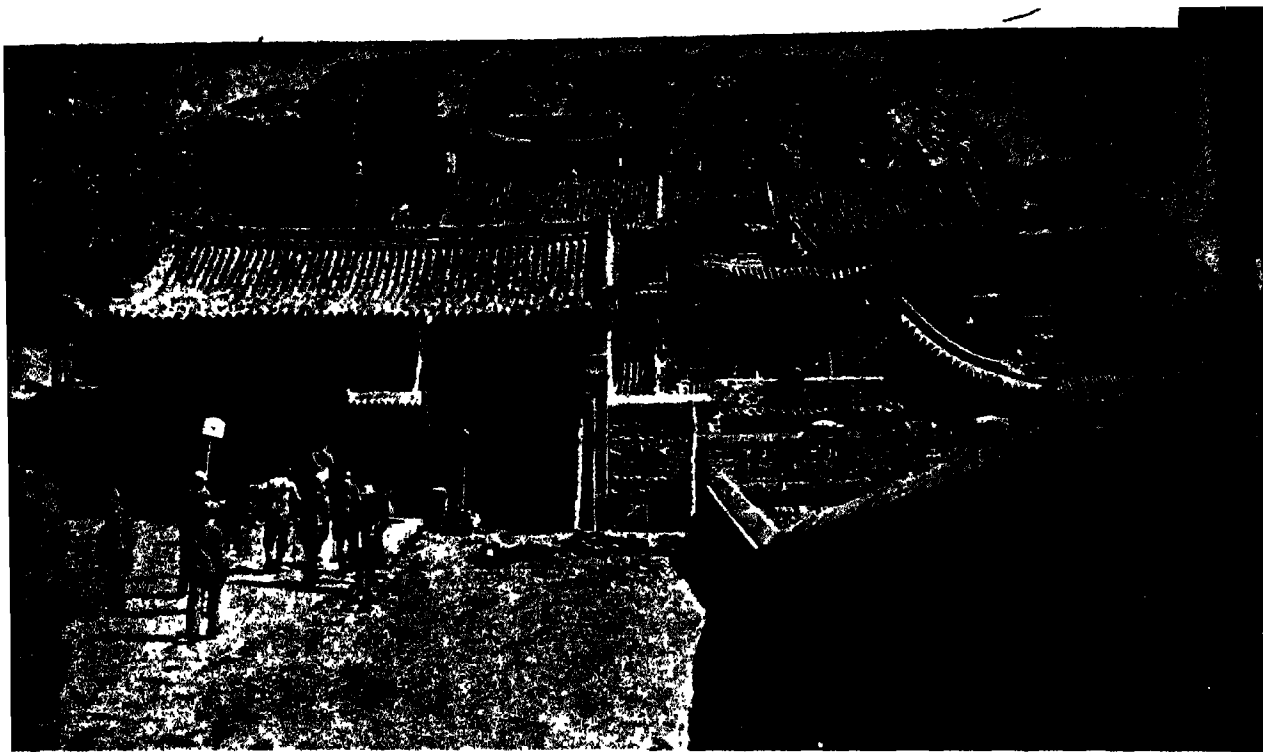
روسی بچوں کے لئے تربیت گاہ

بیس سال ہوئے گرجستان کے خوبصورت قصبے «کو نابسی» میں
یں کی ایک تربیت گاہ قائم کی گئی تھی۔ وہاں تقریباً دو ہزار
وں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس وقت زیادہ بچے یتیم ہیں یا پھر
ہیں جو لڑائی کے باعث اپنے والدین سے جدا ہوگئے ہیں۔
ی ہر وقت خوش و خرم رکھنے اور اچھی تربیت دینے کیلئے ہر
ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

نصاب تعلیم میں نقاشی موسیقی اور رقص بھی شامل ہیں۔
دیکھئے کس شوق سے تصویر بنائی جارہی ہیں۔

تربیت گاہ کی دو ہنس مکھ بچیاں جن کے والدین
لڑائی میں مارے گئے۔

دیہات کی کھلی ہوا میں بچے مل کر ٹہلنے جارہے ہیں۔

سینے پرونے اور کاڑھنے کے کاموں میں بھی لڑکیاں بڑی دلچسپی
سے حصہ لیتی ہیں۔

ایرانین ٹوبیکو موناپلی
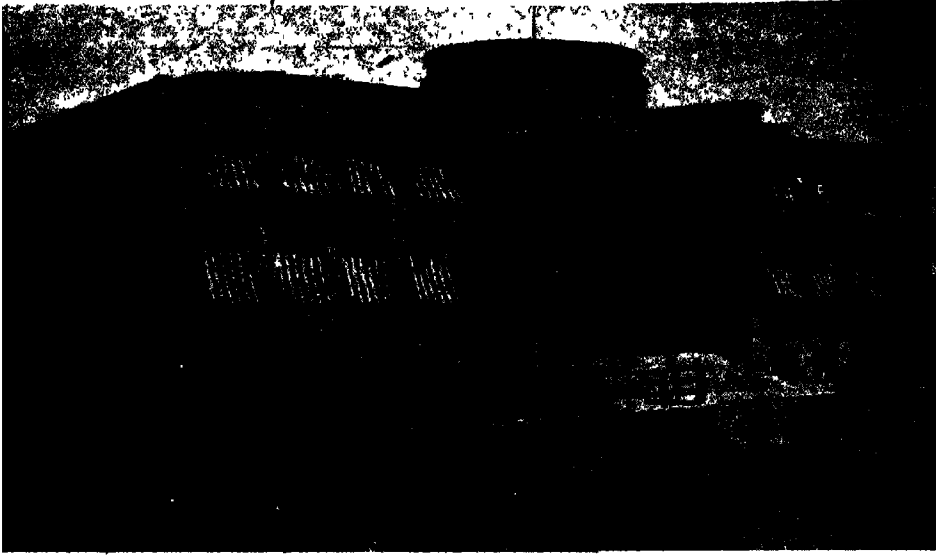
«ایرانیں ٹوبیکو موناپلی» کی سرکاری عمارت کا صدر دروازہ۔

سترھویں صدی کے شروع میں تمباکو پہلے پہل ھندوستان اور پرتگال سے ایران پہنچا۔ پھر اسکی کاشت وھیں ھونے لگی۔ حتی کہ ۱۹۳۸ء میں ۲۰۲۰۳ ایکڑ زمیں سے ۳۲۷۱۷۳۲۰۳ پونڈ تمباکو پیدا ھوا۔ تمباکو کی ساری تجارت پر حکومت کا قبضہ ہے۔ کوئی کاشتکار اپنی فصل کی پیداوار اپنی مرضی سے نہیں بیچ سکتا۔ ھوایہ کہ ۱۸۹۱ء میں ایک انگریز میجر تالیوٹ نے پندرہ ھزار پونڈ سالانہ اور آمدنی کے چوتھائی حصے کے عوض تمام ایران میں تمباکو کی چیزیں بیچنے کی اجازت مانگی۔ لیکن جب ملک والوں نے اس تجویز کی مخالفت کی تو حکومت نے معاھدہ نہیں کیا اور ساتھ ھی فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر تمباکو کی اجارہ داری قائم کرلی جائے۔

سگرٹ بنانے کی مشینیں۔ کمرہ خوب روشن ہے اور گرد و غبار سے پاک ہے۔
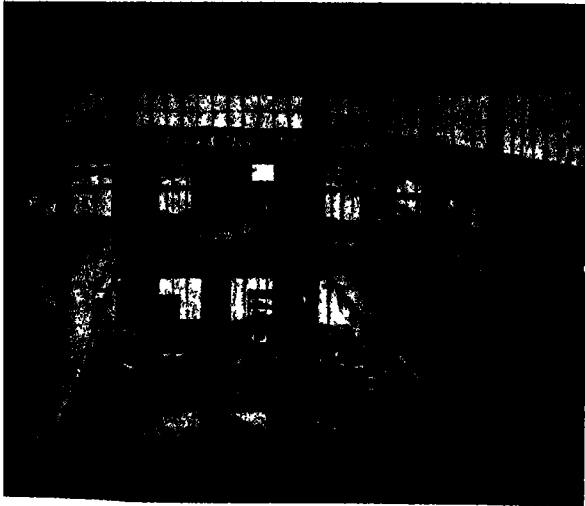
پھر بھی دیر ھوتی رھی یہاںتک کہ ۱۹۲۹ء میں قانون نافذ ھوا اور ایرانین ٹوبیکو موناپلی بنالی گئی۔ اس کا صدر دفتر طہران میں ہے اور شاخیں ان تمام حصوں میں پھیلی ھوئی ھیں۔ جہاں تمباکو کی کاشت بکثرت ھوتی ہے۔ اسکا انتظام وزیر مالیات کے سپرد ہے ۱۸۴۳ء کے بجٹ سے ظاھر ہے کہ حکومت کو اس تجارت مین ۲۶۷۲۲۵۹۴۰ ریال کا فائدہ ھوتا تھا۔

موناپلی کے دفتر کا اندرونی نظارہ۔ ←

مری دولہ ـ ایک فلمی ستارہ ـ

چینی دیومالا

فضل حق قریشی

روزِ ازل سے انسان کی زندگی اتنی مختصر رہی ہے کہ وہ اس محدود عرصۂ حیات میں اپنے گرد و پیش کی چیزوں کی اصلیت و نوعیت اور ان کے اسباب و علل پر خود غور و خوض اور اپنے پیش روؤں کے نتائج افکار سے استفادہ کرتے رہنے کے باوجود کسی اٹل اور انقطاعی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ یہ دنیا کیا ہے؟ کب بنی؟ کب آباد ہوئی؟ انسان کا وجود کس طرح عمل میں آیا؟ زمین و آسمان، مہر و ماہ ستارے اور کہکشاں، برق و رعد اور باد و باراں، دریا، پہاڑ اور میدان، پھل پھول اور سبزہ زار، چرند پرند اور حیوان، یہ سب کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ ان اسرارہائے سربستہ کی عقدہ کشائی بظاہر اس کے لئے ناممکن تھی۔ تاہم اس انانیت کے باعث جو فطرتاً اس کی طبیعت میں موجود ہے، اس نے اپنی لاعلمی یا کج فہمی کے سلسلے میں اعترافِ عجز کرنے کی بجائے خیالی اور فرضی تشریح و توجیہہ سے کام لیا اور اس شد و مد کے ساتھ کہ بہت سی بے بنیاد باتیں بھی ٹھوس حقیقت کے روپ میں جلوہ دکھانے لگیں۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ چونکہ موجوداتِ عالم میں سے کسی کو تخلیق یا فنا کرنا یا ان پر کسی طرح سے قابو پانا انسان کے بس میں نہیں ہے، اسلئے لازمی طور پر یہ سب کرشمے اعلیٰ ہستیوں سے ممکن ہوئے ہونگے، جنکو اپنی دماغی کاوشوں سے کام لیکر خود اس نے تخلیق کیا اور انہیں اپنے سے زیادہ مرتبہ دیتے ہوئے ہر فرد کو ایک علیحدہ مظہرِ قدرت سے منسوب کر دیا۔ انہی دیوتاؤں اور دیویوں سے متعلق موضوع کا نام "دیومالا" ہے۔ یہ کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ملک میں ہر قوم نے اسے اپنے ماحول کے مطابق، اس کی تشکیل کی اور ارتقا کی منزلیں طے کرا کے اسے پوری طرح عروج دیا۔

مختلف ملکوں کی دیومالائی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ تضاد و اختلاف کے ساتھ ساتھ بہت سی باتوں میں زبردست یکسانیت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسے خیالات کا توارد کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ اس قدیم ترین زمانے میں جب ذہن انسانی اسرار سربستہ کی من مانی توجیہہ کر رہا تھا ایک دوسرے سے سینکڑوں ہزاروں میل دور رہنے والی قوموں کے مابین کسی نہ کسی طرح ثقافتی تعلقات قائم تھے

یہ باتیں اس قدیم دور کے انسان کے لئے جبکہ غور و فکر کی راہیں اس کے لئے محدود تھیں اور مذہبی عقائد نے توہمات کے درجے سے آگے اپنا قدم نہیں بڑھایا تھا، نہ صرف دلچسپ بلکہ عمرانی زندگی کے نظم و نسق کے واسطے ضروری تھیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی جبکہ سائنسی نظریات نے خوب فروغ پا کر حقائق کائنات کو بڑی حد تک صحیح رنگ میں پیش کر دیا ہے، قدیم مفروضات کو انہی راسخ عقیدوں کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس ضمن میں انسان ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ حد درجہ ترقی پسند ہونے کے باوجود انسان ایمان و عقیدے کے لحاظ سے ہمیشہ قدامت پرست رہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم الاصنام کو اس کی فرضی اور خیالی بنیادوں کے باعث دنیا کبھی ترک یا نظرانداز نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے مطالعہ سے اجتماعی طور پر قوموں کی معاشرت و سیاست اور جذبات و احساسات کی نوعیت اور عام رجحانِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح اہلِ چین نے بھی تخلیق عالم سے لیکر خود اپنی پیدائش تک کی باتیں بے شمار من گھڑت قصوں کی صورت میں پیش کی ہیں۔ لیکن چونکہ اس ملک میں ایک کی بجائے تین مذاہب نے بیک وقت اپنا اپنا سکہ چلایا ہے اور دیومالائی کہانیاں ہمیشہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں اس لئے یہاں کے علم الاصنام کا مطالعہ کرتے وقت بڑی پیچیدگیوں کا سامنا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی ربط و تسلسل ٹوٹ جانے کے باعث ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور مجبوراً ایک نئے سرے کو تھام کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔

عموماً چین کے اساتذہ اپنے شاگردوں کو صنمیات کا پہلا سبق اس طرح شروع کراتے ہیں:-

"ابتدا میں صرف "عدم" کا دور دورہ تھا۔ ایک طویل زمانہ اسی صورت میں گذرتا چلا گیا۔ پھر وہ عدم ترقی کر کے "وجود" میں بدل گیا۔ اس "وجود" میں "وحدت" تھی۔ پھر ایک طویل زمانہ گذرتا چلا گیا یہانتک کہ وہ وحدتِ وجود دو حصوں میں منقسم ہو کر تذکیر و تانیث (یانگ اور ین) کی ہیئت میں جلوہ گر ہوئی۔ ان دونوں نے ملکر عملی قدم اٹھایا اور پہلی ذی جان ہستی رونما ہوئی جسکا نام "پی آن کو" تھا۔"

چینی زبان میں پی آن کے معنے "انڈے کا چھلکا" اور کو کے معنے "ٹھوس" ہیں۔ چنانچہ ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ پی آن کو ایک کائناتی انڈے میں سے پیدا ہوا تھا۔

پی آن کو کی تصویر ایک پستہ قد انسان کے روپ میں بنائی جاتی ہے۔ اس کا جسم ریچھ کی کھال، پتوں یا پتوں کے لباس سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا اور بائیں میں چھینی ہوتی ہے۔ یہی وہ ابتدائی اوزار ہیں جن کی مدد سے اس نے اپنا کام عظیم شروع کیا اور اٹھارہ ہزار سال تک اس میں منہمک رہا۔ اس اثنا میں اس نے چاند سورج، تارے اور زمین و آسمان بنا ڈالے۔ اسکا قد اس دوران میں چھ فٹ روزانہ کے حساب سے برابر بڑھتا رہا۔ اپنا کام ختم کر لینے کے بعد وہ مرگیا تاکہ اس کی اختراعات زندہ رہیں۔

اس کی لاش عرصے تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ پھر اس کے سر سے پہاڑ، سانس سے ہوا اور بادل، آواز سے کڑک اور گرج، ہاتھ پاؤں سے زمین کے چاروں کھونٹ، خون سے دریا اور سمندر، گوشت سے مٹی، ڈاڑھی سے ستاروں کے جھرمٹ، کھال اور بالوں سے درخت، جھاڑیاں اور پودے، دانتوں ہڈیوں اور تلیوں کے گودے سے دھاتیں، چٹانیں اور قیمتی پتھر، پسینے سے بارش اور شبنم اور آخر میں ان کیڑوں سے جو اس کے سڑے ہوئے جسم پر رینگنے لگے تھے، حضرت انسان کی تخلیق ہوئی جسے اس غلیظ و ناپاک ابتدا کے باوجود اشرف المخلوقات کہا گیا۔

پی آن کو اور اس کی ان کاوشوں کا حال تاؤمت کے عقیدے کے مطابق ہے کنفوشیس مت اور بدھ مت کی رو سے بیانات میں کسی قدر اختلاف ہے لیکن کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پی آن کو نے زمین و آسمان کو تو اپنی اپنی جگہ قائم کر دیا لیکن چاند اور سورج میں نظم و نسق پیدا کرنا بھول گیا۔ اس لئے یہ دونوں روشن اجسام ایک سمندر کی تہ میں جا پڑے اور اس طرح ساری دنیا میں شدید تاریکی پھیل گئی۔

ایسی صورت میں عالم سفلی کے ایک شہنشاہ نے ایک افسر اعلیٰ — "وقت" — کو حکم دیا کہ ان دونوں کو مرد دربار پیش کیا جائے مگر ان دونوں نے صاف انکار کر دیا، اور بدستور سمندر میں پڑے رہے۔ آخر کار "وقت" نے شہنشاہ کی اجازت سے پی آن کو کی روح کو بلایا اور سب حال سنا کر اس سے مدد مانگی۔ پی آن کو کی روح نے بائیں ہتھیلی پر سورج اور دائیں ہتھیلی پر چاند کے نشانات بنائے اور سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کو پھیلایا اور سات بار ایک منتر پڑھا۔ اس کے اثر سے چاند اور سورج باہر نکل کر اس کی مٹھیوں میں آگئے اور پھر آسمان پر چمکنے لگے۔ تاہم "وقت" سے انتقام لینے کی خاطر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں یک وقت کبھی نہیں چمکیں گے۔ اس طرح وقت کے دو حصوں رات اور دن میں ہمیشہ کیلئے جدائی ہوگئی۔

سورج دیوتا کو ایک دائرے کے اندر بیٹھے ہوئے پہاڑی کوے کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور چاند دیوی ایسے خرگوش سے مشابہ بنائی جاتی ہے جو اپنی پچھلی دو ٹانگوں کے ذریعہ چاولوں کو روند رہا ہو۔ ان دونوں کی پوجا سرکاری اور نجی طور پر سارے ملک میں ہوتی ہے۔ سال کے آٹھویں مہینے میں جب فصل تیار ہوتی ہے، چودھویں کے چاند کی پرستش شروع ہوتی ہے۔ اس روز چاند سے مشابہ گیہوں اور چاول کی ٹکیاں بازاروں میں بکتی ہیں اور انہیں مقدس اور بھاگوان سمجھتے ہوئے ہر شخص خرید کر کھاتا ہے۔

ستاروں میں سے قطبی ستارے کی دیوی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ چینیوں کے خیال کے مطابق آسمان کے تمام ستارے قطبی ستارے کے گرد گھومتے ہیں۔ اس دیوی کا نام طؤمو ہے۔ یہ تصویر میں بدھ می" راج پہنے، کنول کے تخت پر جو ایک آسمانی گاڑی کے اوپر رکھا ہوتا ہے، بیٹھی دکھائی جاتی ہے۔ اس کی تین آنکھیں اور اٹھارہ بازو ہوتے ہیں۔ اس کے ہر ہاتھ میں ایک قیمتی یا مفید چیز

غزل

اقبال فاروقی

وہ جلوۂ بے حجاب چمکا، وہ ان کے رخ سے نقاب سرکی
وہ شامِ غم کا نظام بدلا، جھلک وہ ظاہر ہوئی سحر کی

ہزار لپت و بلند آئے۔ ہزار دشت و چمن سے گذرا!
ازل سے اب تک رواں دواں ہوں نہیں کوئی حد مرے سفر کی

نہ آسماں کی طلب ہے مجھکو۔ نہ کچھ زمیں سے ہی واسطہ ہے
کسی کے جلووں میں محو ہوں میں۔ خبر نہیں کچھ ادھر ادھر کی

الٰہی۔ یہ ذوقِ عشق مجھکو کہاں پہ لایا ہے بیخودی میں!
اثر کو ہے آرزو دعا کی۔ دعا کو ہے جستجو اثر کی

روش روش پر سنور رہا ہوں۔ قدم قدم پہ بکھر رہا ہوں
خودی سے گویا گذر رہا ہوں، تلاش ہے ان کی رہگذر کی

کہا ہے اقبال آج میں نے خوشی سے نذرِ جمالِ دل کو
جوان کے قدموں پہ لا کے رکھدی یہی کمائی ہے عمر بھر کی

ہوتی ہے تیر کمان برچھی، تلوار، پرچم، اژدہے کا سر، گھوڑا، سورج اور چاند کی ٹکیاں وغیرہ۔ اسے زندگی اور موت کے نوشتوں پر اقتدار حاصل ہے۔ لوگ اپنی عمریں بڑھانے کے لئے اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے پجاری ہر مہینے کی تیسری اور ستائیسویں تاریخ کو گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کے دو بیٹے ہیں جو شمالی اور جنوبی "نشل" کہلاتے ہیں اول الذکر سفید لباس پہنتا، موت پر حکومت کرتا ہے۔ آخر الذکر سرخ لباس پہنتا اور زندگی پر حکومت کرتا ہے۔

قطبی ستارے کے علاوہ اور بہت سے ستاروں کے بھی دیوتا اور دیویاں ہیں جن کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ سو ہے۔ ان کی شکلیں عجیب و غریب بتائی جاتی ہیں ان میں سے اہم کا تعلق منگنی بیاہ، طوفان باد و باراں، جنگ اور وبائی بیماریوں سے ہے۔ ان میں سے بعض کی حکومت فرشتوں یا شیطانوں پر ہوتی ہے۔ لوگ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ستارۂ صبح کی پوجا ایک خاص مقررہ وقت پر نہ کرے تو اس سال کے دوران میں اس کے باپ یا اس کی ماں کی موت یقینی سمجھی جاتی ہے۔

ستاروں کے ضمن میں ایک کہانی اکوتیلا اور ویگا کی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اکوتیلا چرواہا تھا اور ویگا جلاہے کی لڑکی۔ یہ لڑکی رات دن چرخہ کاتنے میں اسقدر مصروف رہتی تھی کہ اس کا باپ اس غیر ضروری انہماک سے تنگ آگیا اور آخر اس عادت میں تبدیلی پیدا کرنے کی خاطر اس نے بیٹی کی شادی اپنے ایک پڑوسی سے کر دی جو آسمان کے نقرئی دریا (کہکشاں) کے دوسرے ساحل پر مویشی چرایا کرتا تھا۔ شادی ہوتے ہی لڑکی کے طور طریق حد سے زیادہ بگڑ گئے۔ اس نے چرخے اور تکلے کو بالائے طاق رکھا اور دن رات کھیل کود اور خوش گپیوں میں مشغول رہنے لگی۔ سورج دیوتا کو یہ بات ناگوار گذری اور اس نے محب و محبوب میں جدائی کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وہ دریا کے ایک ایک ساحل پر الگ الگ رہا کریں اور صرف ساتویں مہینے کی ساتویں شب کو ایک دوسرے سے ملا کریں۔ دریائے فلک کو عبور کرنے کے سلسلے میں اس نے کئی لاکھ راج ہنسوں کو حکم دیا کہ وہ وقت مقررہ پہ پانی کی سطح پر لگاتار اڑ کر ایک پل کی صورت اختیار کر لیا کریں تاکہ دونوں عاشق و معشوق اسے طے کر کے آپس میں مل لیا کریں۔ لیکن ساتویں مہینے میں دریا بالکل لبریز ہوتا ہے اور تھوڑی بہت بارش بھی اس میں طوفان پیدا کر دیتی ہے جس کے باعث راج ہنسوں کا پل نہیں بن سکتا اور اس سال ان دونوں کے لئے وصل کی رات بھی شب فراق ہی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل چین ساتویں مہینے کے شروع ہی سے دعائیں مانگتے، چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں پیش کرتے ہیں کہ ساتویں تاریخ کو مطلع صاف رہے اور بارش نہ ہو۔ اس رسم میں عورتیں خصوصاً نوجوان لڑکیاں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار حالت میں بسر ہوتی ہے۔

یہ کہانی بجنسہٖ جاپانی دیومالا میں بھی شامل ہے۔

چند روایات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دیوتا ایسے بھی ہیں جو اپنی ابتدائی زندگی میں انسان تھے اور اسی دنیا میں رہتے تھے۔ کسی معجزے یا حادثے کے ماتحت یا کسی کی دعاؤں کے زیر اثر ان کی ہیئت تبدیل ہوئی اور انہوں نے غیر فانی بنکر آسمان پر رہنا شروع کر دیا تاہم دنیا والوں سے ان کا اچھا یا برا تعلق ضرور رہا۔ وہ اہل زمین پر نظر عنایت رکھتے یا بصورت دیگر انہیں ستاتے اور ان سے جنگ آزمائی کرتے رہے۔

اس ضمن میں ہوا کا دیوتا فینگ پو ہے۔ سفید ڈاڑھی مونچھ والا یہ بوڑھا آدمی زرد لبادہ پہنتا، اور نیلی اور سرخ ٹوپی اوڑھتا ہے۔ اسکی عادت ہے کہ ایک بہت بڑا تھیلا تان کر چلتی ہوا کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور اس کی سمت بدل دیتا ہے۔ یہ دیوتا برج اسد کے ماتحت ہے کیونکہ جب چاند اس منزل سے باہر نکلتا ہے تو تیز ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ ابتدا میں فینگ پو ارضی حکومت کے سب سے بڑے باغی اور سرکش سردار چیہ یو کا حامی تھا لیکن جب ہوانگ تی نے اسے شکست دیدی تو فینگ پو اپنی ہیئت بدل کر دیو بن گیا۔ اس نے آسمان پر پہنچ کر جنوبی علاقوں کی ہوا کو تیزی سے جنبش دی اور دنیا میں ایک طوفان باد برپا کر دیا۔ تب شہنشاہ یاؤ نے تین سو سپاہی کے لشکر کے ساتھ شین آئی کو بھیجا کہ کسی طرح اس مصیبت کو ختم کرے اور ساتھ ہی چیہ یو کے رشتہ داروں کو جنہوں نے شورش مچا رکھی تھی، خاموش کر کے امن اور شانتی کی ترغیب دے۔ شین آئی نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ ایک بڑی چادر کھلے میدان میں اس طرح تان دو کہ پیچھے کے سرے پتھروں کے ساتھ بندھے رہیں۔ اس ترکیب سے ہوا کا رخ بدلا اور وہ اس پر سوار ہو کر ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے دیکھا کہ دیو ایک چٹان پر کھڑا بہت زور سے سانس لے رہا ہے اور اسی لئے ہوا میں تموجات پیدا ہو رہے ہیں۔ شین آئی نے فوراً تیر مارا جو دیو کے گھٹنے میں لگا اور اس نے مجبور ہو کر اپنا سانس روک لیا جس کے ساتھ ہی موسم کی کیفیت بدل گئی۔

ہوئی لو یعنی آگ کا دیوتا عوام میں زیادہ مقبول ہے۔ شروع میں یہ زبردست جادوگر تھا۔ یہ شہنشاہ یاؤ کے باپ شہنشاہ تی کو

(۲۴۳۶ تا ۲۳۶۶ ق-م) کے عہدِ حکومت میں رہتا تھا۔ اس کے پاس پی فانگ نامی عجیب وغریب پرندہ کے علاوہ ایک سو کے قریب آگ پھیلانے والے دوسرے پرندے موجود تھے۔ جب وہ انہیں ڈربے سے نکال کر ہوا میں اڑاتا تو ساری دنیا میں آگ سی برسنے لگتی۔ ہوانگ تی نے چوجنگ کو حکم دیا کہ ہوئی لو سے لڑے اور کسی طرح اس پر قبضہ پالے۔ چوجنگ کے پاس خالص سونے کا ایک بڑا بازوبند تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بازوبند کو گھما کر اس طرح پھینکا کہ ہوئی لو کی گردن اس میں پھنس گئی اور وہ بے بس ہوگیا۔ آخر ہار مان کر اس نے اپنی ہیئت تبدیل کی اور ارضی قیام کو ترک کرکے آسمانوں پر رہنے لگا۔

آگ کے دیوتا کے ساتھ ہی باورچی خانے کے دیوتا کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تساؤجن دراصل تاؤمت کی تخلیق ہے اور چین کے ہر گھرانے میں ہر ماہ میں دو بار پہلی اور پندرہویں تاریخ کو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ اس کا سنگھاسن باورچی خانے ہی کے کسی طاق میں بنایا جاتا ہے۔ اس کے محل کی سب سے بڑی آرائش یہ ہے کہ اسے ہمیشہ دھوئیں سے کالا رکھا جائے۔ عوام کا عقیدہ ہے کہ اگر اس دیوتا کی نظرِ عنایت ہو تو انسان بغیر کھائے پئے بہت دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کے لئے مورتی پر شہد کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔

رحم وکرم کی دیوی کنوان ین کہلاتی ہے، اور اسے بدھ مت کے ماننے والے چینی وہی رتبہ دیتے ہیں جو عیسائیوں میں حضرت مریم کو حاصل ہے۔ اسے کنوان ین اسلئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی آہ وفریاد سن لیتی اور ان پر نظرِ عنایت رکھتے ہوئے ان کی مراد پوری کر دیتی ہے۔ یہ مفہوم ان دو لفظوں میں مضمر ہے۔ وہ بے اولادوں کو اولاد، بیماروں کو شفا، مفلوک کو روزگار اور مصیبت زدگان کو نجات دیتی ہے۔ ایک لحاظ سے اس کا مرتبہ گوتم بدھ سے بھی زیادہ ہے چنانچہ اس کو ماننے والے کہتے ہیں کہ لاکھ لاکھ بار بدھ کا نام لینا اور کنوان ین کا نام صرف ایک بار لینا برابر ہے۔ اس دیوی کو نسوانی حسن وجمال کا اعلیٰ ترین نمونہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کے لئے سب سے بڑا افتخار یہ ہے کہ اسے کنوان ین کے پاؤں کی خاک سے تشبیہ دیدی جائے۔

چینی دیومالا میں اور بھی بہت سی کہانیاں شامل ہیں لیکن ان کو صنمیاتی سے زیادہ روایتی حیثیت حاصل ہے، نیز طوالت کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ اس لئے ان کو پھر کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھا جاتا ہے۔

آسان اردو: بقیہ صفحہ ۱۴

وہ دیکھیں کہ ہمارے مدارس میں کوئی کتاب اس زبان کی نہ پڑھائی جائے ہائی کورٹ کو بھی توجہ دلائی کہ وہ اس زبان کے لفظ استعمال نہ کریں۔

میں اس موقع پر اس جاہلانہ اور تعصب آمیز تحریر کی تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت سے جو اردو کی مخالفت شروع ہوئی تو آج تک اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ یہ یادداشت ہمارے لئے بہت سبق آموز ہے اگر ہمیں اپنی زبان عزیز ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی تحریروں اور کتابوں میں خاص کر ان تحریروں اور کتابوں میں جو عام لوگوں کے لئے شائع کی جاتی ہیں غیر ضروری مشکل اور مغلق الفاظ اور ترکیبوں سے پرہیز کریں اور جہاں تک ہو سکے سادہ اور آسان زبان لکھیں اس سے ایک تو علم کی عام اشاعت ہوگی دوسرے ہماری زبان کی اشاعت اور مقبولیت دور دور تک ہو جائے گی۔ جس کا کلام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر وہ زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔

من کہ گویم کہ ایں مکن آں مکن
مصلحت بیں وکار آساں کن

("نوا" سے شکریہ کے ساتھ)

افغانستان وہند کے مابین ثقافتی تعلقات بقیہ صفحہ ۱۸

عیسوی کے نصف اوّل تک جاری رہی۔ چینی سیاح ہوانگ سانگ کی سیاحت کے وقت تک بلخ "راجگڑھ" یعنی "شاہی شہر" کے نام سے موسوم تھا اور "نوادیہارا" کو پورا عروج حاصل تھا۔ چنانچہ اس مذہبی ادارے کے مشہور پروہت پساجن کار نے چینی معلم قوانین کا سوگت کیا تھا بدھ مت کا پرچار بڑی تیزی کے ساتھ آدھے ملک میں ہونے لگا اور اس کا اثر بلخ سے ہوتا ہوا قندھار تک چلا گیا۔ قدرتی طور پر اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان افغانستان میں داخل ہو گئی چنانچہ اس مسودے سے جو ۱۹۳۱ء میں پروفیسر ہیکن نے بامیان سے دستیاب کیا اور جس کا کچھ حصہ ۱۹۳۲ء کے "جرنل ایشیاٹک" میں سلوین لیوی نے شائع کیا افغانستان میں سنسکرت کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس ملک کے پروہتوں اور مصنفوں نے نویں صدی کے شروع تک اسے مختلف قسم کے رسم الخط میں لکھا۔ (باقی آئندہ)

مضمون نگار حضرات مضمون خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھ کر بھیجیں

"ہجوم تجلی سے معمور ہوکر"

جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو

جناب جگر مرادآبادی عصر حاضر کے اُن مایۂ ناز شعراء میں سے ہیں جن کا نام نامی محتاج تعارف نہیں۔ موجودہ غزل گوئی میں حضرت جگر ایک طرز خاص کے مالک ہیں۔ زبان اُردو کی تاریخ اور اس کی نشوونما پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان اپنی موجودہ ترقی اور ہمہ گیر پسندیدگی کے لئے ہمارے شعراء ہی کی ممنون احسان ہے۔ مختلف شعراء نے مختلف اصناف شاعری کو اپنے "اشہب قلم" کی جولان گاہ بنایا اور مختلف عنوان کے تحت خامہ فرسائی کی۔

اردو شاعری میں غزل ہی سب سے زیادہ مقبول عام صنف ہے جس کا اصولی حیثیت سے تمام تر دار و مدار حسن وعشق کی سچی داستان اور فراق ووصال کی اصلی واردات پر ہے لیکن ہمارے شعراء نے غزل کو صرف یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں فلسفہ، تصوف اور اخلاقی مضامین کو بھی نمایاں جگہ دی اور غالب مرحوم کی طرح یہ کہہ کر کہ ؎

سبزۂ وگل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؟ !
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے !

کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ دور حاضر کا یہ مایۂ ناز شاعر (جگر) بھی "فکر فرماتے وقت"[1] "ذرے ذرے میں سما جانا" چاہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک صوفی عزلت نشین مراقبے کے ذریعے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کسی "بحر ناپیدا کنار" سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہوا ور اسی میں اپنی نجات دیکھتا ہو ؎

ترے جلووں میں گم ہوکر خودی سے بے خبر ہوکر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں میں سر تا پا نظر ہوکر

اردو شاعری میں تصوف کی ابتدا، خواجہ میر دردؔ سے ہوئی اور واقعہ یہ ہے کہ دورِ متقدمین میں دردؔ سے بہتر تصوف میں کسی نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ دردؔ کو تصوف ورثہ میں ملا تھا۔ اور اسی لئے ان کے کلام میں عشق حقیقی جلوہ گر ہے۔ وہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں "حسن حقیقی" کی جھلک دیکھتے ہیں ؎

بے گانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

خواجہ میر دردؔ اُردو کے ارکان ثلاثہ میں سے ہیں، ان کی زبان اُس دور کی زبان ہے جو اُردو کی پرورش یا بچپن کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کا طرز بیان نہایت سلیس اور شیریں ہے۔ اور سوز وگداز و چستی بندش میں بھی خواجہ صاحب اپنے معاصرین میں سے کسی سے پیچھے نہیں رہے ؎

شیخ کعبہ ہوکے پہونچا ہم کنشت دل میں ہو
دردؔ منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا
کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط ! پر آہ ! میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں !

موجودہ شعراء میں جہاں تک تصوف کا تعلق ہے، جگر کا کلام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جگر کے یہاں تصوف تغزل سے کہیں زیادہ نمایاں اور بلند ہے اور بعض اشعار میں تو تصوف اور تغزل اس لطافت کے ساتھ ایک دوسرے سے توام نظر آتے ہیں کہ ذوق سلیم بغیر وجد کئے نہیں رہ سکتا۔ جگر نے بھی خواجہ میر دردؔ کی طرح ہر "بیگانے" میں کسی "جانے پہچانے ہوئے" کی جھلک دیکھی ہے ؎

تری صورت کا مظہر ہے سراسر یہ نور نگیں تجھی کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے
محبت اصل حقیقت محبت اصل مجاز وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے
اک حسن کا دریا ہے اک نور کا طوفاں ہے! اس پیکر خاکی میں یہ کون خراماں ہے؟!

آخری شعر میں استفہام کتنا لطیف ہے اور "تجاہل" کسقدر دلچسپ !
اس سلسلہ میں یہ کہنا بھی لبعید از واقعہ نہیں کہ دردؔ کی طرح جگر نے بھی تصوف ورثہ میں پایا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ (مصنف عوارف المعارف) سے ملتا ہے اور وہ ایک نہایت برگزیدہ ہستی حضرت شاہ سید عبدالغنی منگلوری ؒ سے بیعت بھی ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ شان عبودیت ہے میری خود ذات مری صفت ہے میری
خاک درِ دولتِ سنی ہوں پابند شریعت نبی ہوں

جو حضرات جگر کی ظاہری رندی و سرمستی کے شاہد ہیں وہ ممکن ہے اس کو مبالغے پر محمول فرمائیں لیکن سچ یہ ہے کہ محض صوری مشاہدہ کسی شخص کی نیکی یا بدی کے متعلق کسی یقینی نتیجہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ ایک ساقی بے نام[1] کا یہ "رند لم یزل" شاعر جس کی نگاہ میں اس عالم رنگ و بو کی

---

[1] شاعر فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

[1] میں ہوں رند لم یزل اک ساقی بے نام کا
شش جہت میرے لئے لوٹا سا اک پیمانہ ہے (جگر)

اکبر فاروقی مرادآبادی

وقعت ایک "ٹوٹے ہوئے پیالے" سے زیادہ نہیں اپنی رندی و سرمستی کے متعلق کیا کہتا ہے؟ سنئے ؎

جانتا ہوں کہ ہوں وہ آل میں ننگِ اسلاف
کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ فکرِ انجام

میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام
وہی میخانہ وساقی وہی شیشہ وہی جام

مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریا کاری و پندار نہیں

باہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی
ہوں در احمدِ مرسلؐ کا غلام نسبی

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کیوں نہ پھر رحمتِ باری کا طلبگار رہوں میں
ہاں مجھے فخر ہے اس پہ کہ گنہگار ہوں میں

کیا یہ ممکن نہیں کہ جگر کی یہ روشِ خاص "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" کی مصداق ہو؟ بہر حال اشعار ذیل سے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ؎

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف!
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال؟!
در پردہ چشمِ یار کی شہ پاکے پی گیا

سرمستیٔ ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

جگر کا عقیدہ ہے کہ اس عالم میں ہر شخص اپنا ایک خاص مشن لے کر آیا ہے اور اس کا ہر فعل تقدیرِ الٰہی کا تابع ہے لیکن جگر کو میر دردؔ کے اس مقولے سے اختلاف ہے کہ ؎

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

جگر کے نزدیک ؎

مست جامِ شراب ہونا تھا
بے خودِ اضطراب ہونا تھا

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں
ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

وہ رحمتِ باری سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس کے کانوں میں "لا تقنطو" کا مژدۂ جاں بخش ہر وقت گونجتا رہتا ہے جب کبھی وہ اپنے گناہوں پر نظر ڈالتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

نویدِ بخشش عصیاں سے شرمسار نہ کر
گناہ گار کو یارب گناہ گار نہ کر

عفو کیسا جلوہ رحمت کبھی نکلے گا یہیں
ذوقِ عصیاں چاہئے عرفانِ عصیاں چاہئے

سرِ محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہوگا؟
درِ جنت نہ وا ہوگا درِ رحمت تو وا ہوگا

یہ نسبتِ عشق کی بے رنگ لائے رہ نہیں سکتی
جو محبوبِ خدا کا ہے وہ محبوبِ خدا ہوگا

نفسِ مضمون کا جہاں تک تعلق ہے جگر نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ وہ انھیں اصول کا اعادہ کرتا ہے جن کی تعلیم خواجہ حافظ شیرازیؒ اور مولانا جامیؒ جیسی مقتدر ہستیوں نے دی۔ فارسی شعراء میں حافظؒ نے جو رتبہ پایا وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں لیکن حافظؒ خود معترف ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ ان کی "من گھڑت" نہیں بلکہ ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

اسی پیرِ طریقت کی پیروی کرتے ہوئے جگر بھی کہتا ہے ؎

سنائے تھے لب نے کسی نے جو نغمے
لبِ جگر سے مکرر سنائے جاتے ہیں

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

تصوف کیا ہے؟ یہ ایک دقیق سوال ہے۔ تاہم تصوف کا ماخذ اوّلاً "عشقِ حقیقی" کے ذریعے صفائی قلب حاصل کرنا اور دوم "حسنِ حقیقی" کی تلاش میں اپنی ذات کو اس درجہ فنا کرنا کہ من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے جیسا کہ امام الشعراء حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

جگر کی بھی یہی تمنا ہے ؎

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں نکل جاؤں جدھر ہو کر

صوفیہ کرام کے نزدیک تخلیقِ عالم کی بنیاد ہی "عشقِ حقیقی" پر ہے۔ خلاقِ عالم کو چونکہ اپنے حسن کا مظاہرہ مقصود تھا اس لئے مختلف شکل و صورت میں اس کے شاہد پیدا کئے ؎

حدیثِ حسن دشتاقے درون پردہ پنہاں بود
برآمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا

رخ و خط و خال شکینش تقاضا شکلے نمود اوّل
قلم برداشت ہر ذرہ ورق برگشت ہر انشا

(نظیری)

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جب "حسنِ حقیقی" نے آئینۂ وحدت میں اپنی صورت دیکھی اور چاہا کہ اس کے دیکھنے والے پیدا ہوں (جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ) چنانچہ "عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود" کا مصداق ہو کر یہ عالمِ خاکی وجود میں آیا ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (غالب)

جگر کہتا ہے ؎

اگر شامل نہ درپردہ کسی کی آرزو ہوتی
تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

بہرحال جب لفظ "کن" سے "فیکون" کا ظہور ہوا تو خلقت اس نورِ مجرد سے اس درجہ مسحور ہوئی کہ "اَلَستُ بِرَبِّکُم" کے جواب میں سوائے سرِ تسلیم خم کرلینے کے اور کچھ نہ بن پڑا ؎

عشق کو بے نقاب ہونا تھا (جگر) آپ اپنا جواب ہونا تھا

عشق کیا ہے؟ اس کا جواب مختلف شعراء نے مختلف پیرایہ میں دیا ہے، جگر کے خیال میں ؎

شوق بے پایان و جوشِ بے حساب   عشق کیا ہے اک مسلسل اضطراب

عشق کیا ہے؟ پر توِ حسنِ تمام   شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب

زندگی کیا ہے؟ نمود عاشقی   عشق کیا ہے؟ حسن کا آغاز ہے

لیکن سچ تو یہ ہے کہ "عشق" کی جامع تعریف کرنے سے زبان قاصر ہے ؎

لفظ و معنی میں نہیں جلوۂ صورت نہیں   عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

حقیقی عشق کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ "العشق نارٌ تحرق ما سواء المحبوب" یعنی عشق وہ آگ ہے جو سوائے محبوب کے ہر شئے کو جلاکر خاک کر دیتی ہے۔ شاید اسی لئے جگر نے کہا ہے ؎

تیرے سوا تری محفل سے کیا غرض مجھکو   خروشِ نغمہ رہے یا سکوتِ ساز رہے

ایک اور شعر سنئے ؎

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

راہ عشق کی دشواریوں سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنہوں نے کبھی اس وادیٔ پرخار میں مجنوں وار قدم رکھا ہے۔ ہر کس و ناکس اس راہ میں قدم رکھنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا کیونکہ ؎

شرطِ اول قدم این ست کہ مجنوں باشی

اور بقول داغ ؎ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔

لیکن دو چار مقام تو چند قدم چلنے کے بعد آتے ہیں، یہاں تو راہرو آغاز راہ سے ہی متحیر ہو جاتا ہے ؎

شروعِ راہ محبت ارے معاذاللہ   یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

اس راہ پر تو وہی قدم رکھ سکتا ہے جو جستجوئے یار میں محو و سرشار ہو کر اس وادی کو سیرگاہ سمجھے ؎

سیرگاہ عشق میں کانٹے ہی کانٹے ہوں تو ہوں
دیکھنے والی نظر گلشن بداماں چاہیئے

کیوں؟ اس لئے کہ کوئے یار تک پہونچنا مقصود ہے! اور راہنمائے شوق ہی جستجوئے یار میں رہنمائی کرسکتا ہے! آئیے دیکھیں کہ جگر... مست و سرشار جگر اس وادی میں کس طرح گامزن ہوتا ہے ؎

جام در دست و صراحی در بغل   با چہ ساز و با چہ ساماں می روم

عشق دشوار ست و شوقم رہنما   راہ پرخار ست و آساں می روم

در بلائے عشق خود را کردہ گم   در ہوائے شوق رقصاں می روم

مستیٔ عشق است و یاد روئے دست   ہم بکفر و ہم بہ ایماں می روم

رہرو عشق کی دھج ہی نرالی ہے۔ وہ زندگی سے سیر اور محبوب حقیقی کا تقرب حاصل کرنے کے شوق میں مست و سرشار ہی نہیں بلکہ تیغ و کفن باندھے ہوئے چلا جاتا ہے ؎

آں منم سیر زجاں گشتہ کہ با تیغ و کفن   تا در خانۂ جلاد غزلخواں رفتم

جگر کا بھی یہی حال ہے۔ کہتا ہے ؎

واہ رے شوقِ شہادت کوئے قاتل کی طرف   گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

تا کجا یہ پردہ داری ہائے عشق و لاف حسن   ہاں سنبھل جائیں دو عالم ہوش میں آتا ہوں میں

راہ عشق کی مشکلات ایک حقیقی عاشق کی ہمت اور "عزم راسخ" پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ وہ نہ تو اپنی ناتوانی کا شکوہ کرتا ہے اور نہ اپنی دشواریوں کا رونا روتا ہے بلکہ ان بے پایاں مشکلات سے تنگ آکر آہ کرنا بھی غیرت سے بعید سمجھتا ہے ؎

مرا عشق صادق مرا عزم راسخ   مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے

وہ جانتا ہے کہ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا" ؎

مجھکو خدائے عشق نے جو بھی دیا بجا دیا   اتنی ہی تاب ضبط دی جتنا ہی غم سوا دیا

جگر اگر کبھی بھولے سے بھی نالہ کرتا ہے تو اس میں ایک معجز نما صبر و شکیبائی مضمر ہوتے ہیں وہ عشاق کو نالہ کرنے کا طریقہ اس طرح سکھاتا ہے ؎

نالہ یوں کیجے بہ انداز شکیبائی ہو   جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

وہ اپنے درد کی کسک کو شاید مخفی کی چھیڑ اور اپنی آبلہ پائی کی کھٹک کو حسن سنور کی اٹکھیلیاں تصور کرتا ہے۔ اس کو اپنے درد اور درد بھرے دل پر ناز ہے ؎

خوشا وہ درد محبت نہ ہے وہ دل کہ جسے   ذرا سکون ہوا گدگدا دیا تو نے

خوشا وہ جان جسے دگئی امانت عشق   نہ ہے وہ دل جسے اپنا بنا کے لوٹ لیا

سلام اسپہ کہ جس نے اٹھا کے پردۂ دل   مجھی میں رہ کے مجھی میں سما کے لوٹ لیا

جس دل میں تری یاد ہو تو صد نشیں ہو   وہ دل بھی حسیں اسکی محبت بھی حسیں ہے

جگر کے نزدیک صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گویا عظمت عشق کو کم کرنا ہے ؎

عشق کی عظمت نہ ہرگز جیتے جی کم کیجئے   جاں دیدیجے مگر آنکھیں نہ پرنم کیجئے

توہین عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو   ہوجائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

یہی وجہ ہے کہ اس کو اپنے ضبط پر فخر ہے۔ رنج و الم کی انتہا اسکی آنکھیں پرنم کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوئی کہتا ہے ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی   وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

(باقی دارد)

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔
دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت عہ

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔
تیسرا ایڈیشن قیمت عہ

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور شرعی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریحاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بےنظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکیس روپے۔

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب ڈیدرش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی رہین منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف قیمت مجلد آٹھ روپے

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی ردو بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے شائع ہوتے ہیں۔
فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی نے بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔
قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے عہ

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔
تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے
قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

زندگی کا ناچ

خالد حسن قادری

ہماری زندگی کا بیشتر حصہ حماقت میں ہی گذرتا ہے عقلمندی کے تو صرف وہ لمحات ہوتے ہیں جب ہم آرام کرسی پر لیٹ کر سگار کے دھوئیں کے دائرے اڑاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا حماقتیں کی ہیں۔

ایسے لمحات میں ہر آدمی سب سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق سوچتا ہے۔ شادی شدہ یہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی نصف بہتر کے انتخاب میں شدید حماقت کی یا دوسروں نے زبردستی اس کے سر مڑھ کر اس پر سخت ظلم کیا۔ لیکن اب عقلمندی اسی میں ہے کہ اس ظلم کو سہہ لیا جائے اور اس حماقت کو نبھا دیا جائے۔

غیر شادی شدہ جب شام کو پارک میں، پارٹی میں، سینما میں پہلو بہ پہلو چلنے والے جوڑوں کو دیکھتا ہے تو اس کے کنوارے دل میں خیالات کی عجیب عجیب لہریں اٹھتی ہیں۔ جب اس کی نظر اپنی خالی آغوش پر پڑتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ مسرت کی رعنائیاں دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے مل جانے میں ہی ہیں۔ اور یہ تو شاید اسے کبھی خیال بھی نہ ہوتا ہو کہ یہ بات حقیقت سے اتنی ہی دور ہے جتنا وہ خود کسی کی گداز بانہوں اور زلف کی عنبر آگین خوشبو سے۔ یہ پہلو بہ پہلو چلنے والے جسم ہمیں جس قدر قریب نظر آتے ہیں ان کی روحیں ایک دوسرے سے اسی قدر دور ہوتی ہیں۔

ایسے موقعہ پر مجھے ہمیشہ اپنے دو ہمسفروں کی گفتگو یاد آجاتی ہے۔

دسمبر کی تعطیل میں میں پنجاب جا رہا تھا۔ میں اوپر کی برتھ پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ نیچے مقابل کی سیٹ پر دو مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ درجہ میں اور کوئی نہ تھا۔ ان میں سے ایک کوئی فوجی افسر تھا۔ اونچی پیشانی اور بل کھائی مونچھوں سے حاکمانہ دبدبہ ٹپکتا تھا۔ دوسرا غالباً پروفیسر ہوگا۔ وہ کچھ پہلے سے گفتگو کر رہے تھے وہ تو میں سن نہ سکا۔ ان میں سے ایک نے اپنا سگار سلگا کر مجھ سے پوچھا، "اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

"دس۔"

"یہی وقت ہوگا جب وہ ہمارے لئے کافی بنایا کرتی تھی۔" پروفیسر نے شیشوں میں سے تاریکی کو گھورتے ہوئے کہا۔ اور ایک دبی ہوئی گہری سانس لی۔

"ہاں ٹھیک دس بجے ہی وہ کافی تیار کرتی تھی۔" فوجی نے سر ہلا کر پھر گھڑی کو دیکھا۔ اس کی آواز میں اب بھی ایک رعب تھا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر ہماری زندگی میں ایسا خلا پیدا ہوجائیگا" پروفیسر نے کسی قدر پرسوز لہجہ میں کہا۔

"مجھے جب یہ خیال آتا ہے رمزی" پروفیسر نے فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ پینتالیس سال کس قدر جلد گذر گئے تو اس قدر حیرت ہوتی ہے کہ جس کی کچھ حد نہیں۔"

"ہماری عمر بھی ایسی تیزی سے جاری ہے جیسے یہ طوفان"، رمزی نے مونچھوں کو ذرا بل دیتے ہوئے کہا، "جب ہم درجہ میں دیکھتے ہیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ گاڑی چل رہی ہے یا کھڑی ہے بالکل ایسے ہی ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہماری عمر اس قدر تیز رفتاری سے بھاگ رہی ہے۔"

"تمہیں شاید خیال ہو کہ میں گذشتہ سال ٹراونکور میں تھا" پروفیسر نے فوجی کے فلسفہ پر غور نہ کرتے ہوئے کہا، "اور عید کے موقعہ پر تم نے بضد ہو کر مجھے وہاں سے بلایا تھا۔"

"ہاں وہ اسی نے اس قدر اصرار کیا تھا اور مجھ سے کئی مرتبہ تار بھی دلوائے۔"

"اچھا ——" پروفیسر نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا —— "مگر ہم سب کس قدر خوش تھے اس رات۔ برفباری رک چکی تھی۔ عید کی رات کو ہلکی ہلکی برف چنبیلی کے برف کی طرح کس قدر سہانی معلوم ہوتی ہے۔ وہ صوفہ پر بیٹھی ہوئی ننھے اسلم کے لئے موزہ بن رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب اس نے کافی بنائی۔ تم تو کافی کی ایک ہی پیالی پی کر اونگھ گئے۔ ہم دیر تک موت کے پراسرار فلسفہ پر بحث کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں میں نے ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی ......"

"ہاں ہاں"، رمزی سنجیدگی سے مسکرایا، "وہ اکثر تمہاری خرافات کا ذکر کرتی تھی۔"

"...... مگر" پروفیسر نے اس کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تمہاری بیوی کے انتقال کے بعد تو اب دنیا میرے نزدیک ایک مہمل و بے معنی لفظ ہوگیا ہے۔"

"ہاں وہ بہت ہی اچھی تھی۔" رمزی نے برتھ پر ذرا اوپر کھسکتے ہوئے کہا، "واقعی مجھے اب احساس ہوتا ہے وہ بہت ہی نیک تھی۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے اٹھ جاتی اور خود چائے بنا کر دیتی۔ میری ہر بات کا بہت ہی خیال رکھتی تھی۔ اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں"

"وہ کس میں نہیں ہوتیں۔" پروفیسر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس وقت کے علاوہ جب وہ تم سے فلسفہ کے مہمل موضوع پر بحث کرنے لگتی ویسے وہ بے حد ہی فرماں بردار اور اچھی تھی۔"

"تم کبھی اس کو نہیں سمجھ سکے۔" پروفیسر نے مدھم آواز میں کہا اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے گوشوں کو دباتے ہوئے اپنی اداس نظریں جن میں کسی نامعلوم گناہ کی پاداش جھلک رہی تھی رمزی کے چہرہ پر جما دیں۔ کمپارٹمنٹ میں چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ رمزی نے اپنا کمبل اوپر کھینچ لیا اور

پروفیسر کی طرف کچھ متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"وہ تمہاری بیوی تھی" پروفیسر نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا، "مگر تم آج تک اس کو نہ سمجھ سکے۔"

ایک لمحہ کے لئے پھر سکوت چھا گیا۔ رمزی برابر عجیب انداز سے پروفیسر کو تکے جا رہا تھا۔

"رمزی" پروفیسر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ سے کہنے کی فکر میں تھا مگر نہ معلوم کیوں نہ کہہ سکا۔ مگر اب میں اس کو قبر میں نہیں لے جا سکتا۔

"ہاں ہاں تم اس کو کہہ ڈالو" رمزی نے نہ معلوم کیوں کمبل میں کلبلاتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"تمہیں شاید میرے اور اس کے تعلقات کا علم نہیں ......"

رمزی ایک دم کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا۔ مینے درجہ کی ہلکی روشنی میں دیکھا کہ رمزی کا مرجھایا ہوا فوجی چہرہ تمتما گیا۔

"کیا کہا —— تعلقات" اس کی آواز میں درشتی تھی۔ "یہ مذاق کا موقعہ نہیں ہے راحی۔"

"ذرا ہوش سے کام لو" پروفیسر راحی نے دوستی کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"تم فوجی آدمی اردو کیا جانو۔ تعلقات کو کسی اور معنی میں نہ لو" تھوڑے سکوت کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں اس بات کو پینتالیس سال تک اپنے سینہ سے لگائے رہا لیکن میں سمجھتا ہوں اب تم سے کہنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا" رمزی اپنی برتھ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا میری بیوی نے مجھے دھوکہ دیا —— یہی مطلب ہے تمہارا نا۔"

"شرم کرو رمزی خدا کے لئے ذرا شرم کرو۔" راحی نے اپنے اوداس لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

رمزی اپنی پشت سیٹ سے لگائے ہوئے کچھ بڑبڑایا۔

"وہ تو بہت ہی فرشتہ خصلت تھی۔ بالکل حور تھی۔ یہ تو ہم اور تم ہیں رمزی کا جو گناہوں کی تاریکیوں میں گم ہیں۔ حوا کی بیٹیاں تو واقعی مریم صفت ہوتی ہیں۔"

"ہوں"۔ رمزی نے طنز سے کہا۔

"اس زمانہ میں یہاں ایک رقاصہ رہتی تھی —— ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں —— یاد ہے تمہیں —— کیا نام تھا اس کا ...."

"رخسانہ" رمزی کی آواز میں ایک غیر معمولی لچک پیدا ہو گئی۔ اس نے سگار کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔ اور اس پر نظریں جما دیں گویا وہ اس دھویں میں رخسانہ کے لہراتے ہوئے گیسو دیکھ رہا ہے۔

"تم نے اپنی بیوی کو دھوکہ دیا۔ عورتوں کو اس قسم کی باتوں کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا تھا لیکن کبھی ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چمپئی رنگ میں ہلکی زردی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اس کی باتوں میں پہلی سی شگفتگی نہ رہی تھی۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھوئی رہتی۔ میں نے ایک دن پوچھا بھی کہ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ لیکن اس نے صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ میں ابھی تک بالکل اچھی نہیں ہوئی ہوں۔ اسلم اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ اس لئے اس کی صحت اور گری گری رہتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ صرف یہی بیماری نہیں۔ بلکہ تمہارے رویہ سے بھی اس کو شدید روحانی اذیت تھی۔

اس بات کو پینتالیس سال ہو گئے۔ عید کی رات کو حسب معمول میں آٹھ بجے آیا۔ وہ ہلکے پیازی رنگ کے سوٹ میں اچھی معلوم ہو رہی تھی ——"

کیپٹن رمزی نے اسے گھور کر دیکھا۔ مگر راحی کمپارٹمنٹ کی کانپتی ہوئی روشنی کو دیکھتے ہوئے برابر کہے جا رہا تھا۔

"وہ اسلم کا سوئٹر بن رہی تھی۔ عید کا دن تھا۔ مگر کمرے پر ایک مغموم ماحول طاری تھا۔ میں اسے اخبار سناتا رہا وہ بنتی رہی اور تمہارا انتظار کرتی رہی۔ گھنٹے نے دس بجائے پھر گیارہ بجائے مگر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں اخبار سناتے سناتے تھک گیا۔ اور وہ بنتے بنتے تھک گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اس وقت کہاں ہو گے۔ اس نے سوئٹر اپنی گود میں رکھ لیا اور صوفہ کی پشت سے تکیہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ہلکے سے ڈھلک کر سوئٹر میں جذب ہو گئے۔

اب میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اخبار رکھ دیا اور تمہیں ڈھونڈنے کے ارادہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازہ تک ہی پہنچا تھا کہ وہ بھی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اور جلدی سے قریب آکر میرے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"تم جا رہے ہو" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ نہ معلوم کیوں اس کا عضو عضو کپکپا رہا تھا، "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"رمزی کو دیکھنے۔"

"خدا کے لئے راحی تم تو نہ جاؤ۔ کم سے کم تم تو میرے پاس رہو" یہ کہتے کہتے اس کا سر میرے سینہ سے لگ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نہ معلوم کیوں تھرتھرا رہا تھا۔ آج تک کوئی عورت مجھ سے اتنی قریب نہ ہوئی تھی۔ اس کی گرم گرم سانسیں، اس کی گداز بانہوں کا لوچ، میری ہیجانی کیفیت ہر طرف مجھے فضا میں نرم روئی کے گالے اڑتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا، تسلی دی، بڑی مشکل سے وہ اپنی حالت پر قابو پا سکی۔ ہم دونوں پھر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں تم داخل ہوئے۔ تمہارا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔ آنکھیں محبت کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ تم ہماری حالت کا اندازہ نہ کر سکے۔ اس رات سے میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ جب بھی مجھے اس کی گداز باہیں، اس کی زلفیں، اس کی تیز تیز سانسیں، اس کے سینہ کا تموّج، اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھیں یاد آتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ہزاروں چمکتے ہوئے ستارے آسمان سے ٹوٹ پڑے۔ مجھے پھر ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سب چیزیں ایک بار پھر مجسم ہو کر میرے سینہ سے لگ گئیں۔ میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن رمزی مجھ سے اس کا معصوم چہرہ، اداس آنکھیں، خشک و غمگین لب، زرد رنگت نہ دیکھی جاتی تھی۔ تم خود سوچو ایسی معصوم عورت کے لئے تمہارا یہ رویہ کس قدر نازیبا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا بے اختیارانہ کیا۔ اور میں وہ کرنے پر بالکل مجبور سا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔ اپنے دل کو سکون پہنچانے کی صرف یہ ترکیب سمجھ میں آتی تھی۔ کہ تمہیں کسی صورت سے رخسانہ سے چھین لوں تاکہ پھر ایک بار تمہارے گھر کی بے کیف فضا میں زندگی جھلکنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ رخسانہ یوں قابو میں نہ آئے گی۔ اتفاق سے میرے پاس بنک میں کچھ روپے تھے۔ میں نے رخسانہ کو ایک خط لکھا کہ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں چلی جائے اور پھر تم سے کوئی تعلق نہ رکھے تو میں اتنی رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے خیال تھا کہ شاید وہ اتنی رقم پر تیار نہ ہو مگر خوش قسمتی سے وہ مان گئی۔"

"اوفوہ ——" رمزی ایک دم اٹھ بیٹھا۔ کچھ تعجب اور کچھ غصّے سے کہنے لگا۔ "تو یہ تمہاری ہی حرکت تھی تمہاری ہی وجہ سے اس نے وہ آخری خط لکھا تھا کہ میں تمہیں چھوڑنے پر مجبور ہوں۔ میرا جسم تم سے دور رہے گا مگر میرا دل اور روح تمہارے پاس ہی رہے گی۔"

"ہاں وہ میں ہی تھا" پروفیسر راحی کسی قدر سکوت سے بولا۔ "مگر سنو مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ان روپوں سے میں سکون و آرام خریدنا چاہتا تھا۔ میں ذہنی خلفشار سے نجات حاصل کرنی چاہی تھی، مگر دماغی انتشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں ہر چند عید کی اس رات کو بھولنا چاہتا تھا مگر وہ رات میرے تصورات پر کچھ اس طرح چھائی تھی کہ میں بھلانے پر بھی نہ بھول سکا۔ میں نے اپنے کام میں اور زیادہ مصروف رہنا شروع کر دیا کہ شاید اس طرح میں یہ سب بھول سکوں۔ مگر اس کی سانسیں میرے دل میں پھانسیں بن کر رہ گئیں۔ میں نے اس عرصہ میں اس سے بہت دور رہنے کی کوشش کی۔ مگر میں جس قدر دور رہتا وہ اسی قدر قریب محسوس ہوتی۔ آخر عید کی رات پھر آئی۔ ہم سب پھر اسی کمرہ میں پھر جمع ہوئے۔ شام کی دعوت سے تھک کر تم برابر والے کمرہ میں سو رہے تھے۔ وہ میرے مقابل کے صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں اس کے زرد چہرہ پر تھیں۔ باوجود کوشش کے میں گذشتہ عید کی رات نہ بھول سکا۔ ایک بار پھر اس کی مرمریں باہیں، گداز سینہ اور تیز تنفس بالکل اپنے قریب محسوس ہونے لگا۔ عنبریں گیسو، نازک انگلیاں پھر مجھے چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرہ پر زندگی ناچ رہی تھی۔ ہماری نظریں ایک لمحہ کے لئے ملیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک جواب تھا۔ جواب بے سوال —— ایک پیغام تھا، میرے تمام خواب، تمام تصورات تحلیل ہو کر اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ بے اختیارانہ اس کے قدموں میں گر پڑا۔ میرا سر دیر تک اس کی گود میں رکھا رہا۔ میں نہ معلوم کس عالم میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اس کے نرم ہاتھ کی حرکت اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ اس نے کئی مرتبہ میرے سر پر ہاتھ پھیرا ——

اور —— اور شاید اس کے لبوں کی نازک جنبش بھی محسوس ہوئی۔ اس نے میرا سر دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے کہا، "راحی، عزیز راحی، نادان نہ بنو۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ کیا تم اپنے دوست کو جو محض تمہارے اعتماد پر برابر والے کمرے میں آرام کر رہا ہے دھوکہ دینا پسند کرو گے ——"

میں ایک دم چونک گیا۔ گھبرا کر تمہارے کمرے کی طرف دیکھا اور اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے ایک رسالہ اٹھا کر مجھے دیا۔ میں سمجھ گیا اور اسے کھول کر بلا سمجھے اسے سنانے لگا مگر ندامت و شرمندگی کی کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ سانس حلق میں گھٹی جاتی تھی اور آواز نہ نکلتی تھی۔ گھبراہٹ اور انفعال کی ملی جلی حالت ایسی تھی کہ اس کے سامنے نظر نہ اٹھتی تھی۔ اس خیال سے کہ ابھی ابھی کیا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرہ کی طرف نگاہیں نہ اٹھتی تھیں۔ بلکہ میں اس کے قرب سے بھی اب تو گھبرا رہا تھا۔ اتنے میں تم کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا جیسے صرف تمہارا ہی منتظر تھا۔ تم میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اور شام کی دعوت کی باتیں کرنے لگے۔ وہ کافی بنانے چلی گئی۔ جب وہ کافی بنا کر لائی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا وہ نیچی نگاہیں کئے پیالی میں کافی ڈال رہی تھی۔ زندگی کا ناچ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے چہرہ کی زردی میں مردنی کی سی کیفیت آگئی تھی۔ انتہائی غم سے اس کے ہونٹ خمیدہ ہو گئے تھے۔"

"مگر رمزی، اس رات سے میری حالت بالکل بدل گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ میری تمام محبت کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں۔ بلکہ جب کبھی مجھے اپنی حرکت اور اس کی وہ باتیں یاد آجاتیں تو میں سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوب جاتا۔

نہ معلوم کتنے سال گذر گئے۔ کتنی عیدیں آئیں اور چلی گئیں۔ ننھے اسلم کی شادی بھی ہو گئی۔ ہم تینوں بوڑھے بھی ہو گئے۔ تم بھی اپنی وہ آزادانہ زندگی چھوڑ کر گھر پر ہی رہنے لگے۔ وہ چلی گئی اور آئندہ عید تک شاید ہم تم بھی چلے جائیں۔ لیکن رمزی اس کا خیال ترک کرنا، اس کی محبت چھوڑنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں اس سے برابر محبت کرتا رہا۔ ہاں تم مجھے چاہے کچھ بھی سمجھو، کچھ بھی خیال کرو، لیکن میں اس سے برابر محبت کرتا رہا ہوں۔ لیکن اس رات سے ہماری محبت

نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ تمام جسمانی خواہشات، نفسانی آرزوئیں غائب ہونے لگیں۔ مجھے اپنی روح میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی محسوس ہونے لگی۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم دونوں کسی روحانی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ میری محبت دنیاوی تعلقات سے بلند تھی۔ ہمارے جسم ضرور تھے مگر ہماری روحیں ایک دوسرے سے بہت قریب تھیں۔ تم یقین نہ کرو۔ لیکن محبت صرف جسموں کے ملنے سے نہیں ہوتی بلکہ اکثر اس سے کم ہو جاتی ہے جس محبت کو جسم کی ضرورت ہو وہ محبت نہیں ہوس ہے۔ ہماری محبت ہر قسم کے خیالات سے پاک تھی۔ وہ پاک محبت جو دنیاوی رشتوں اور تعلقات کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہماری محبت ایسی ہی پاک اور سچی محبت تھی۔ مجھے اپنی روح میں پاکیزگی اور جذبات میں صداقت محسوس ہونے لگی۔ تم ضرور ایسی محبت پر ہنسو گے اور ممکن ہے تمہیں یقین بھی نہ آئے ——— مگر خیر ہمارے تعلقات روز بروز پاک اور صاف ہوتے گئے۔ جب ہم بقول تمہارے مہمل فلسفہ پر گفتگو کرتے۔ اگر اس وقت تم یہ جان لیتے کہ ہماری روحیں اور دل ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں تو واقعی تمہیں بیحد جلن ہوتی ——— اب وہ بہشت کی وادیوں میں ہماری منتظر ہوگی اور کون جانتا ہے۔ کہ آئندہ عید تک ہم تم بھی اس سے جا ملیں۔ میں اس بات کو پینتالیس سال تک چھپائے رہا۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ سانس کے آخری جھٹکوں میں بھی یہ خیال لگا رہے کہ میں نے تمہارے پیچھے یہ جرم کیا۔ اس لئے اس وقت تم سے کہہ کر اپنی روح کو سکون دینا چاہا ہے ———

میرے رمزی!

"کیا تم مجھے معاف نہ کرو گے" ماجی نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رمزی سیٹ سے پشت لگائے غور سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی چمک اٹھتیں اور کبھی مدھم پڑ جاتیں۔

"ہشت" رمزی نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس اتنی سی بات تھی۔ یہ بات تو وہ برسوں ہوئے مجھ سے کہہ چکی تھی"

ماجی یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے۔ یہی بات اس نے مجھے جاں بلب ہوتے کہی تھی۔ اور سنو، میں اب تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے ایسی حور صفت عورت کو چھوڑ کر کیوں ایک معمولی رقاصہ کا پیچھا کیا ——— اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اور صرف تم اس کی تمناؤں کے تنہا سہارے تھے"

پروفیسر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اور اس نے اپنے دوست پر نظریں جما دیں۔

ساغرِ سرشار ——— سرشار کسنڈوی

تجلی آزمائی ہو رہی ہے ✤ کہ تکمیلِ خدائی ہو رہی ہے
ادھر جلوہ نمائی ہو رہی ہے ✤ ادھر دل کی صفائی ہو رہی ہے
کوئی گریاں کوئی محو ترنم ✤ مزے کی کبریائی ہو رہی ہے
حجابات دو عالم اٹھ رہے ہیں ✤ یہ کس کی رونمائی ہو رہی ہے
جہاں سے لوٹنا ممکن نہ ہوگا ✤ اب اس در پر رسائی ہو رہی ہے
بجھے پڑتے ہیں تارے آسماں کے ✤ شبِ غم سے جدائی ہو رہی ہے
ہنسے دیتے ہیں دامان و گریباں ✤ جنوں کی پیشوائی ہو رہی ہے
سمجھتا ہوں پیامِ دورِ وحشت ✤ مثل ہے دست پائی ہو رہی ہے
خدا حافظ مری تابِ نظر کا ✤ مجاؤں میں صفائی ہو رہی ہے
معاذ اللہ، عنوانِ محبت ✤ ابھی سے جگ ہنسائی ہو رہی ہے
یہ کس کے دم قدم سے میکدے ہیں ✤ حدیثِ پارسائی ہو رہی ہے
جھکی نظریں، لبوں پر مسکراہٹ ✤ یہ میری ہمنوائی ہو رہی ہے

قیامت اپنی خیریت کی خاطر
شریکِ دلربائی ہو رہی ہے

ہندوستان میں تعلیم
مغلوں کے زمانے میں

عنایت اللہ

ہندوستان کے مغل بادشاہ نہ صرف اپنی حکمت کی وُسعت، سلطنت کے عمدہ انتظام اپنی شاندار عمارتوں اور اپنے دربار کی شان و شوکت کے لئے مشہور ہیں، بلکہ ان کی علم دوستی، علم و فن کی سرپرستی اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا بھی بہت چرچا ہے۔

ان بادشاہوں اور ان کے امیروں نے ملک کے ہر حصے میں مدرسے اور مکتب قائم کر رکھے تھے۔ جہاں رعایا کے ہر طبقے کے لوگ مختلف علوم و فنون کو حاصل کر سکتے تھے۔ ان مدرسوں میں بعض ابتدائی تعلیم کے لئے تھے اور بعض اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ ان مدرسوں کے ساتھ بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں، جن کی آمدنی سے ان کے تمام اخراجات ادا ہوتے تھے۔

مغل بادشاہوں نے تعلیم پھیلانے کے لئے یہ طریقہ بھی اختیار کر رکھا تھا کہ مدرسے جاری کرنے کے علاوہ ملک میں جہاں جہاں، عالم و فاضل لوگ رہتے تھے۔ اُن کی گزران کے لئے شاہی خزانے سے بڑے بڑے وظیفے مقرر کر دئے تھے تاکہ وہ لوگ ہر معاش کے فکر سے آزاد ہو کر بغیر کسی معاوضہ کے اپنے تعلیمی کام میں مشغول رہ سکیں۔ اس شاہی سرپرستی میں ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ دونوں قوموں کے لوگ یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اس طریق سے تعلیم مفت اور عام ہو گئی تھی اور ہر شوقین اور ذہین طالب علم اپنی ذاتی محنت سے علم کی دولت حاصل کر سکتا تھا اور لیاقت پیدا کر کے دنیا میں ترقی کے زینے پر چڑھ سکتا تھا۔

مغل بادشاہوں نے تعلیم کی اشاعت میں جو قابلِ تعریف کوشش کی، اس کے کئی اسباب ہیں ― اوّل تو یہ کہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب انسان تھے۔ وہ علم کی شیرینی سے واقف تھے اور دوسروں کو بھی اس سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علم ایک نور ہے جس سے انسان کا دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی رعایا بھی اس نور کو حاصل کرے اور جہالت کی تاریکی سے نجات پائے۔

تعلیمی معاملات پر انتہائی توجہ دینے کا دوسرا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ علم کے پھیلانے کو ایک نیک کام سمجھتے تھے اور چونکہ اس میں مذہبی اور دینی تعلیم بھی شامل تھی اس لئے وہ تعلیم کی اشاعت کو کارِ ثواب جانتے تھے اور عالموں کی خدمت اور سرپرستی کو اپنے لئے باعثِ برکت اور دین و دنیا کی بھلائی کا موجب سمجھتے تھے۔

مغلیہ خاندان کا بانی بابر بادشاہ بہت سے علوم سے آشنا تھا اور شعر و سخن کا بہت شستہ مذاق رکھتا تھا۔ اس کی مادری زبان ترکی تھی۔ مگر ترکی کے علاوہ وہ فارسی میں بھی عمدہ شعر کہہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں، جو تزک بابری کے نام سے مشہور ہیں۔ بابر کے یہ خود نوشتہ حالات نہ صرف تاریخی لحاظ سے اہم ہیں بلکہ طرزِ بیان کی سادگی، بے ساختہ پن اور دل نشینی کے سبب سے بھی بہت دلچسپ ہیں۔ بابر نے ہندوستان میں صرف چار سال حکومت کی۔ لیکن یہ چار سال کا عرصہ لڑائیوں اور سلطنت کے مضبوط بنانے میں گزر گیا۔ اس لئے وہ تعلیمی کاموں کی طرف خاص توجہ نہ دے سکا۔

بابر کا بیٹا ہمایوں بادشاہ بھی علم و فضل کا بہت شائق تھا۔ اسے علم النجوم اور جغرافیہ کے ساتھ خاص دلچسپی تھی۔ اسے کتابوں کے مطالعہ کا اسقدر شوق تھا کہ وہ سفر میں بھی اپنی دل پسند اور چیدہ چیدہ کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب اس نے افغان بادشاہوں کو شکست دے کر ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا تو دہلی کے پرانے قلعے میں شیر منڈل کی عمارت کو، جسے شیر شاہ سوری اپنے عیش و عشرت کے لئے استعمال کرتا تھا کتب خانہ بنا دیا۔ یہ وہی عمارت تھی جس کے زینے سے پھسل کر اس نے وفات پائی۔

آئینِ اکبری کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ بھی، جو اس کے جانشین اکبر بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوا۔ ایک مدت تک بطور مدرسہ کے استعمال ہوتا رہا جس میں اس زمانے کے بڑے بڑے فاضل استاد درس دیتے تھے۔ مقبرے کی چھت درسگاہ کا کام دیتی تھی اور مقبرے کے پہلو میں جو کمرے تھے وہاں طالب علم رہتے تھے۔

نہ صرف مغلیہ خاندان کے بادشاہ اور شاہزادے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ تھے بلکہ شاہی خاندان کی عورتیں بھی زیورِ علم سے آراستہ تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب انتظام تھا۔ بابر بادشاہ کی بیٹی گلبدن بیگم نے بھی اپنے عہد کے حالات کو ایک کتاب کی صورت میں لکھا ہے جس کا نام ہمایوں نامہ ہے۔ اس کتاب میں وہ تمام واقعات درج ہیں جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا معتبر لوگوں سے سُنے۔

اس کتاب کا طرزِ بیان بھی اپنی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے بڑا دلآویز ہے۔

ہمایوں کے بعد اکبر کا زمانہ آیا۔ اگرچہ اپنے باپ کی پریشان حالی کی وجہ سے اکبر کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور اسے کسی علم و فن میں پوری مہارت حاصل نہ ہو سکی، مگر وہ فطری طور پر ایک بہت بیدار مغز اور قابل حکمران تھا۔ اس کے عہد میں طریقِ تعلیم میں بہت سی

اصلاحیں کی گئیں اور تعلیم کی بڑی اشاعت ہوئی۔ اکبر نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی تعلیم کے لئے یکساں کوشش کی اور اس غرض سے بہت سے مدرسے جاری کئے اور بے شمار عالموں فاضلوں کی شاہانہ انداز سے سرپرستی کی۔ چنانچہ اسکا وزیر ابوالفضل اپنی کتاب "آئین اکبری" میں لکھتا ہے کہ مدرسے تو سبھی مہذب ملکوں میں پائے جاتے ہیں مگر ہندوستان کا ملک اپنی اصلی درسگاہوں کے سبب سے خاص طور پر ممتاز ہے۔

بچوں کو ابتدا میں فارسی تحریر کے سیکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانیں بائیں سے دائیں طرف کو لکھی جاتی تھی۔ اور ہندو بچوں کے لئے خاص طور پر، فارسی حروف کی شناخت اور ان کا تلفظ اور کتابت سخت مشکل تھی۔ اکبر نے نوشت و خواند میں تدریج کے اصول کو جاری کیا یعنی ہدایت کی کہ بچوں کو لکھائی کی درجہ بدرجہ تعلیم دی جائے۔ جیسے پہلے ان کو الگ الگ حرفوں کی پہچان، اور ان کے لکھنے کی مشق کروائی جائے۔ اس ابتدائی مشق پر چند روز سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں پھر بچے حرفوں کو آپس میں ملائیں اور الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملے بنانا سیکھیں۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اس طریق سے سالوں کا کام مہینوں بلکہ دنوں میں طے ہونے لگا۔ اور مکتبوں نے خوب فروغ پایا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مسلمان طلبا دینیات اور دینیات کے علاوہ علم اخلاق، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، اقتصادیات، سیاسیات، فلسفہ اور طبعیات وغیرہ پڑھتے تھے۔ ہندو طالب علم ادب کے علاوہ اپنے عقائد اور مذاق کے مطابق ویاکرن، ویدانت اور پتانجلی کا مطالعہ کرتے تھے۔

اکبر نے اپنے پایہ تخت فتحپور سیکری میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا۔ شاہی سرپرستی کی بدولت بہت سے عالم وفاضل تعلیم وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے ذی علم بھی تھے جو آسودہ حال تھے اور حکومت کی امداد سے بے نیاز۔ انہوں نے محض خدمت علم کے خیال سے اپنی زندگیوں کو شوقین طلبا کی تعلیم وتربیت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

اکبر کی علم دوستی اور قدردانی کا شہرہ سنکر بہت سے ایرانی عالم ہندوستان میں آئے۔ مثلاً شاہ فتح اللہ شیرازی اور چلپی بیگ وغیرہ۔

تعلیم کی اشاعت کا شوق صرف بادشاہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ سلطنت کے امیر اور وزیر بھی اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابوالفضل نے فتحپور سیکری میں ایک مدرسہ جاری کیا جو شاہی محلات کے قریب تھا۔ اکبر بادشاہ کی دایہ ماہم انگہ نے دہلی کے پرانے قلعے کے پاس ایک مدرسہ خیرالمنازل کے نام سے بنوایا۔ اس مدرسہ کا دروازہ اور اس کے چند کمروں کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

اکبر اعظم کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر بادشاہ کا زمانہ آیا۔ جہانگیر کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنے وقت کے چیدہ فاضل استادوں سے تعلیم پائی تھی۔ وہ شعر وسخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتا تھا اور فنون لطیفہ، خصوصاً مصوری کا زبردست نقاد تھا۔ اس نے بھی اپنے نامور پردادا بابر بادشاہ کی طرح اپنے . . . . حالات زندگی خود لکھے ہیں جو تزک جہانگیری کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے عہد میں بھی علماء کی سرپرستی اور علم کی اشاعت بدستور جاری رہی۔ جہانگیر نے یہ قانون بنایا کہ ملک میں جہاں کہیں کوئی مالدار رئیس یا سوداگر مرجائے اور اسکا کوئی وارث اور جانشین نہ ہو تو اسکی جائداد پر سرکاری قبضہ ہو اور وہ مدرسوں خانقاہوں پر خرچ کی جائے۔ چنانچہ اس کی تخت نشینی کے بعد تمام پرانے مدرسے جو ویران پڑے تھے استادوں اور طالب علموں سے بھر گئے۔ جہانگیر کتابوں کا بے حد دلدادہ تھا۔ جب وہ گجرات گیا تو کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لیتا گیا اور گجرات پہنچکر وہاں کے علماء کو بہت سی مفید اور مستند تصنیفات مثلاً تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب تحفہ کے طور پر دیں اور ہر ایک کتاب کی پشت پر اپنے دست خاص سے اپنے گجرات پہنچنے اور ہدیہ دینے کی تاریخیں درج کیں۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں کا زمانہ آیا۔ اگرچہ اسے شاندار عمارات تیار کرانے کا بڑا شوق تھا۔ مگر وہ اشاعت تعلیم کی طرف سے غافل نہ تھا۔ واقعہ نویسوں کو حکم تھا کہ ملک کے دوسرے حالات کے علاوہ مدرسوں کے بارے میں بھی اطلاع دیتے رہیں۔ جب اسے اطلاع ملتی کہ کوئی نیا مدرسہ قائم ہوا ہے یا کسی پرانے مدرسے کو امداد کی ضرورت ہے تو وہ اس کے لئے فوراً شاہی خزانے سے وظیفہ مقرر کردیتا۔ اس طرح سے قدیم مدرسے کامیابی کے ساتھ چلتے رہے اور بعض نئے مکتب بھی جاری ہوتے۔ جب امیر اور شاہزادے کسی علمی مرکز سے گزرتے تو درسگاہوں کا معائنہ کرتے اور اپنی جیب خاص سے انھیں عطیے دیتے۔

شاہجہاں نے جب دہلی کی جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے ساتھ رفاہ عام کے لئے چند دوسری عمارات بھی تیار کرائیں۔ مسجد کے شمالی رخ پر شفا خانہ قائم کیا۔ جہاں غریبوں اور مسکینوں کے مفت علاج کے لئے پورا انتظام تھا۔ مسجد کے جنوب کی طرف شاہی مدرسہ جاری کیا جسکا نام دارالبقاء تھا۔ یہ مدرسہ سن ستاون کے ہنگامے سے پہلے مکمل ویران ہوچکا تھا۔

آگرہ کی جامع مسجد شاہجہاں کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم کی یادگار ہے۔ اس شاہزادی نے اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ مسجد کے

چاروں طرف دکانیں تھیں۔ جن کی آمدنی مسجد اور مدرسے کے لئے وقف تھی۔ اس آمدنی سے یہ مدرسہ مدت تک چلتا رہا۔

شاہ جہاں کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب کا زمانہ آیا۔ وہ بھی علوم وفنون کا بڑا سرپرست تھا۔ اس نے بھی مدرسوں کی امداد بدستور جاری رکھی اور تمام صوبجات کے تعلیمی اداروں کے وظیفے قائم رکھے تاکہ وہاں کے استاد اور طلبا بے فکری کے ساتھ اپنے تعلیمی کام میں مشغول رہ سکیں۔ اس کے عہد میں علمی مرکز تو بیسیوں تھے مگر سیالکوٹ اور لکھنؤ نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ سیالکوٹ کو مُلّا عبدالحکیم اور ان کے فرزند مولوی عبداللہ کے علم وفضل نے چمکایا اور لکھنؤ کو فرنگی محل کے عالموں نے چار چاند لگائے۔ مُلّا نظام الدین اسی خاندان سے تھے۔ انھوں نے ایک جامع درسی نصاب جاری کیا جو ان کے نام پر درسِ نظامیہ کہلاتا ہے۔ یہی درس کسی قدر ردوبدل کے ساتھ ہندوستان کے اکثر اسلامی، دینی، مدرسوں میں آج تک مروّج ہے۔

مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان کی دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ ہندو پہلے تو اس زبان سے ناآشنا رہے مگر آخرکار زمانے کی ضرورتوں سے اس کی تحصیل پر متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ زباندانی میں خود اہلِ زبان کا مقابلہ کرنے لگے اور فارسی زبان کے تمام ادبی اور علمی شعبوں پر حاوی ہوگئے۔ ہندوؤں میں فارسی زبان کے بہتیرے بہتر ادیب، شاعر اور مصنف پیدا ہوئے۔ چنانچہ فنِ تاریخ میں لُبّ التواریخ، تاریخ دلکشا، تاریخ کشمیر، فتوحاتِ عالمگیری، تاریخ فرمانروایانِ ہنود وغیرہ بیسیوں کتابیں ہندو اہلِ قلم کی یادگار ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں تذکرۃ الامراء۔ حدیقۂ ہندی، امیر نامہ، محفلِ رعنا، اور سفینۂ خوشگو بھی ہندو مصنفوں کے علمی ذوق کا عمدہ نمونہ ہیں۔ خود فنِ لغت میں گردھاری لال نے گنجِ لغات۔ پنڈت گنگا بشن نے شیر و شکر، سالکوٹی مل وارستہ نے مصطلحات الشعراء اور ٹیک چند بہار نے بہارِ عجم جیسی مستند کتابیں لکھکر اپنے کمالِ فن کا ثبوت دیا۔ فارسی زبان کے جس قدر ہندو شاعر گزرے ہیں وہ بھی حدِ شمار سے باہر ہیں۔ خاص کر کائستھوں اور کشمیری پنڈتوں نے فارسی دانی میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ فارسی زبان اور ادب کا اعلیٰ مذاق ان کی خاندانی روایات میں شامل ہوگیا۔ ایک مدّتِ دراز کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں آج تک بہت سے ایسے ہندو خاندان موجود ہیں جن کے ہاں فارسی زبان کے قلمی نسخے محفوظ ہیں اور وہ فارسی ادبیات کے ساتھ بڑا شغف رکھتے ہیں۔

رقیب سے!

"وہ کوئی زہرہ جبیں، خورشید شمائل ہوگی۔۔۔؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
بلکہ وہ حُسن کے معیار پہ آتی بھی نہیں!!"
"پھر وہ شیریں لب و شائستۂ محفل ہوگی؟"
"نہیں ایسا تو نہیں!
وہ کسی مرکزِ گفتار پہ آتی بھی نہیں"
"خیر، وہ گاؤں کی دوشیزۂ کمسن ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
شاید اب اُس کی جوانی بھی ڈھلی جاتی ہے!!"
"پھر تو وہ زہر میں ڈوبی ہوئی ناگن ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
اب تو صندل کی نشانی بھی ڈھلی جاتی ہے!!"
"آپ کی جنتِ تخیُّل کی دیوی ہوگی؟"
"نہیں ایسا تو نہیں!
میرے آدرش کی فردوس کوئی خواب نہیں!!"
"آپ ہی جانیں، مجھے کیا، وہ کوئی بھی ہوگی؟"
"نہیں ایسا تو نہیں!
تم سمجھتے ہو، بتانے کی مگر تاب نہیں!!"

سلام (مچھلی شہری)

صِلہ:۔ بقیہ صفحہ ۵۷ پر

آہا! بے چاری بوا" اس نے نرمی سے کہا، "آخر تم کو اتنا دکھ اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ روپے واپس اٹھالو۔ اپنے اور اپنے بچوں کے اوپر خرچ کرنا۔ پاپا کو ان کی ضرورت نہیں ہے خدا نے ان کو بہت دیا ہے اور نہ مجھ کو ہی ضرورت ہے ہمارے یہاں سب خدا کا شکر ہے"

"بیٹی خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ لیکن بی بی میں اس کو کیسے رکھ سکتی ہوں۔ یہ تو میرا مال ہے ہی نہیں"

"نہیں یہ تمہارا ہی ہے۔ اچھا اگر تم نہیں لیتی ہو تو میں نے لے لئے اور اب یہ میری طرف سے لے لو" عذرا نے نرمی سے کہا۔ "اور اب تم آگئی ہو تو تم کو جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔

جنوبی مشرقی ایشیا اور ہندوستان

جی۔ آر۔ وینکٹارامن

ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے لوگوں کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں، ان کے عادات و اطوار اور ان کے رسم و رواج میں جو نمایاں مشابہت ہے اُسے دیکھکر ایک سرسری نظر سے دیکھنے والا بھی اس قریبی تعلق کو محسوس کر سکتا ہے جو بالکل ابتدائی زمانہ سے ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں رہا ہے۔ اپنے تاریخی ارتقا میں دونوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہے ہیں۔ اور ان کے بعض ضروری پہلوؤں کو دیکھکر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے بعض مسائل بھی ایک سے ہیں اور ان کا حل بھی ایک سا ہو سکتا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا کا پورا علاقہ (شاید برما کو چھوڑکر) پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے اثر میں تھا۔ پہلی صدی عیسوی کی بعض چینی تحریروں میں چمپا، کمبوڈیا اور اَنام کی ہندو سلطنتوں کے وجود کا تذکرہ ہے اور جدید تحقیقوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستانی فکر اور چینیوں کے زندگی کے فلسفہ نے جنوبی مشرقی ایشیا کے باشندوں کی موجودہ زندگی کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا کے معاملہ میں ہندوستان کی جو مرکزی جگہ ہے اسے پرتگالی رہنما الفانسو البوکرک کے زمانہ میں بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ البوکرک کا یہ خیال صحیح تھا کہ ایسٹ انڈیز کو ہندوستان سے فتح کیا جا سکتا ہے اور یہیں سے اسکا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔ پرتگالیوں کا جو سیاسی اقتدار ایسٹ انڈیز میں بڑھا اسکی بنیاد ہندوستان ہی میں تھی۔ ہندوستان میں مضبوط بحری اڈے بنا کر الفانسو کا خیال تھا کہ وہ مشرق میں پرتگالی حکومت قائم کر سکیگا۔ ہالینڈ والوں کا ہیڈ کوارٹر جاوا میں تھا لیکن انھوں نے بھی لنکا میں ایک مضبوط بحری اڈا بنایا تھا اور یہیں سے وہ اپنے سامراجی منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے بچاؤ کے کام کی بنیاد اکثر ہندوستان اور لنکا میں کام کرنے والی قوتوں پر رہی ہے اور اس لئے ہندوستان کی قسمت اور اس کے حالات کا اثر گو بالواسطہ ہی سہی، لیکن یقینی طور پر جنوب مشرق پر ضرور پڑتا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا باقی ہر علاقہ سے زیادہ سامراجی قوتوں کی باہمی رقابتوں کا اکھاڑا ہے۔ اور اس چیز کا تعلق براہ راست معاشی مسئلے سے ہے۔ اس علاقہ میں ٹن، ربڑ، تیل اور صنعت و حرفت کی ضرورت کا کچا مال کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ مغرب میں جب صنعت و حرفت کا دور شروع ہوا اور لوگوں کو اس سلسلہ میں کچے مال کی ضرورت پڑی تو مختلف سامراجی قوتوں کی نظر اس پُر امن علاقہ پر پڑنے لگی۔ یہ سامراجی رقابت اس علاقہ کے لئے ایک بڑی نعمت بھی ثابت ہوئی۔ اور جنوبی مشرقی ایشیا نے دنیا کی معاشیات میں ایک نمایاں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی قدرتی اور معدنی پیداواروں کی کھوج کی جانے لگی اور اسکا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی زندگی کے معیار میں ترقی ہوئی اور ان میں زیادہ خوشحالی پیدا ہو گئی۔ مغرب کی آمد اور اس کے اقتدار نے یہاں بھی وہی معاشی اثر ڈالے جو ہندوستان پر پڑے تھے۔ اور اس لئے ہندوستان، جنوبی مشرقی ایشیا اور چین کے مسئلے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مشرقی ایشیا کو وسیع تر بنانے کا خیال محض خواب و خیال نہیں معاشی مسائل ان سب علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتے ہیں اور ایک کا اثر برابر دوسرے پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔

ہندوستان کی طرح یہاں کے معاشی نظام کے بھی دو حصے ہیں — ایک کا تعلق مقامی زراعتی معاشیات سے ہے اور دوسرے کا نوآبادیوں کی معاشیات سے۔ زراعتی معاشیات میں مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پیداوار کے پرانے اور فرسودہ طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے حصہ میں غیر ملکی قوتوں کا ہاتھ ہے، جو ایسی چیزوں کی پیداوار کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہیں، جو صنعتی حیثیت سے مفید ہیں — مثلاً کپاس اور گنا۔ ان پیداواروں سے جو زبردست آمدنی ہوتی ہے اس سے سب واقف ہیں۔ لیکن یہ آمدنی چونکہ غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں جاتی ہے اس لئے قومی معاشی نظام پر اسکا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور اسے اپنی خوشحالی کے لئے دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

جنگ کی ضرورتوں نے مشرق کی ان پیداواروں کی قیمت اور بھی زیادہ بڑھا دی۔ لیکن جوں جوں لڑائی کے زمانہ میں یہ ملک جاپان کے ہاتھوں میں جاتے رہے، یورپ اور امریکہ کے کارخانہ داروں نے جنوبی مشرقی ایشیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے دوسرے بدل تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اور اس لئے آسانی سے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ آنے والے زمانہ میں یورپ اور امریکہ اس کثرت سے یہ کچا مال نہیں خریدینگے جتنا وہ لڑائی سے پہلے خریدتے تھے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جنوبی مشرقی ایشیا کو ایک بہت

سخت معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ہندوستان اور چین کی صنعتی ترقی مشرق کی اس زبردست معاشی تباہ حالی کو روک سکتی ہے اس بات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں کی خوشحالی کس طرح ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے، اور ایشیائیوں میں تعاون کی کمی اور بے توجہی کس طرح دنیا کے آباد ترین علاقوں کے معاشی توازن کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

ہندوستان نے بھی، چین کی طرح جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں کی قسمت اور حالات کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے اور مستقبل میں وہ اور بھی بڑا حصہ لے گا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہندوستان نے کبھی تجارتی لوٹ کھسوٹ یا نفع خوری کے خیال سے ان ملکوں کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ وہ وہاں تاریخی روایتوں کے مطابق خون اور آنسوؤں کا پیش خیمہ بن کر نہیں گیا۔ ہندوستانی تو وہاں ہمیشہ پُرامن کلچرل مشن لے کر گئے اور مشرق کی بڑی قوموں کو ایک ایسے رشتہ میں جوڑنے کی کوشش کی جو مادیت کے رشتے سے بالکل مختلف تھا۔ یہ قدیمی ملک ہمیشہ سے اپنے سیاح، اپنے سفیر اور اپنے مفکر ایک دوسرے کو بھیجتے رہے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آتے رہے۔ انھوں نے اپنے ہمسایوں کا کلچر اور قدیم ہندوستان کی فکری بلندیوں کا مفہوم سمجھنے کی کوششیں کیں۔ ان دو ملکوں کے سیاح اور مسافر صرف علم کی کھوج اور نیکی کی تلاش کو اپنے راستہ کا چراغ سمجھکر اپنے سفر کرتے رہے۔ اس لئے ان دونوں میں قدرتی طور پر کچھ تمدنی اور روحانی اشتراک ہے، اور ان کی تہذیب میں ایک مسلسل ربط و تعلق۔ ان کے عمل کے پیچھے ایک ہی سرچشمۂ ادراک کام کر رہے ہیں۔ لیکن زندگی کے آدرشوں میں یہ یکسانی آخر کس طرح ممکن ہوئی؟ یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔

موریا شہنشاہ اشوک نے مشرقی ملکوں میں بدھ مت پھیلانے کے لئے اپنے سفیر بھیجے۔ بدھ مت کی اس تعلیم نے مشرق کے ملکوں میں انسانیت کا ایک جذبہ پیدا کر دیا اور یہ سارے ملک ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے۔ اس جگہ چین پر بدھ مت کے اثر کا تھوڑا سا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

ہندوستان اور چین کے درمیان عالموں کی آمدورفت ایک عام چیز بن گئی تھی۔ اور مختلف طرح کے مذہبی اختلافات اور شبہات عالموں اور سیاحوں کی زبانی طے ہوتے تھے۔ ان سیاحوں میں سب سے بڑا ہیون سانگ تھا اس کی ذات میں ہندوستانی اور چینی، دونوں کلچروں کی خوبیاں ایک جگہ جمع تھیں۔ اس نے ہندوستان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے چینی عام اچھی طرح واقف ہیں۔ شانتی کے فلسفہ اور لڑائیوں میں اسلحوں کے استعمال کی ناپسندیدگی نے ان دونوں بڑے ملکوں کے رشتہ کو اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا۔

مشرق میں ہندوستانی کلچر کا پھیلنا انسانی تاریخ کا ایک عظیم الشان باب ہے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے شہروں اور خاندانوں کے ناموں کو برما، سیام ہند چینی، ملایا اور لنکا میں اپنایا گیا اور برہمن مذہب اور بدھ مت کے آدرش اور ادارے پورے جنوبی مشرقی ایشیا کی زندگی میں رچ بس گئے اور اس کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا۔ فلپائن میں قدیم زمانہ کے جو کتبے اور نشانات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان تعلیمات کا یہاں کے لوگوں پر کتنا زبردست اثر تھا۔ آرٹ، ادب اور فلسفہ میں چین اور ہندوستان کے اثرات نے مل کر جنوبی مشرقی ایشیا کے شمالی ملکوں کے کلچر کی تخلیق کی۔ روحانی، فکری اور فنی تخلیقات میں ان ملکوں نے ہندوستان سے جو مستقل اور ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات قبول کئے ہیں وہ جنوبی مشرقی ایشیا کی تہذیب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے ان ملکوں کی زبانوں میں بھی ہندوستانی خط و خال موجود ہیں۔ بناوٹ اور لفظوں کے مادوں میں اکثر جگہ ان زبانوں میں ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت کے اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً طیوبو زبان میں خدا کے لئے لفظ 'دیوتا' استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ سنسکرت کے لفظ دیوتا سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ علم الاقوام، علم اللسان اور اثریات کی جدید تحقیقوں نے اب یہ بات بالکل مستحکم کر دی ہے کہ ہندوستان نے مشرق کے لوگوں کے

غزل — مظفر الدین ظفر

ہم بھی کبھی اسیر تھے گیسوئے اعتبار میں
اب وہ لطافتیں کہاں جلوۂ نوبہار میں

حاصلِ زندگی عشق یعنی متاعِ دو جہاں
بکھرے ہوئے ہیں لختِ دل دامنِ تار تار میں

دنیا پیامِ فصلِ گل ڈوب چکی ہے نبضِ دل
کیسے بنائیں آشیاں رکھا ہی کیا بہار میں

قصۂ غم سنا ہو بُرا وہ بھی نہ تاب لا سکے
تلملا رہے کچھ جھلک اُٹھے نرگسِ شرمسار میں

اپنا بھی آشیاں کبھی صحنِ چمن میں تھا مگر
عرصہ ہوا اُجڑ گیا ایسی ہی اک بہار میں

ہستی کو میری اے ظفر سمجھینگے اہلِ عرش کیا
دل ہوں مگر بشکلِ غم سینۂ روزگار میں!

کلچرل اماک کی تشکیل اور تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

آثارِ قدیمہ کی حیثیت غیر منضبط تاریخ کی سی ہے۔ اور جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں میں قدیم زمانہ کے جو آثار، عمارتیں اور کتبے ملے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صرف سیاست اور معاشیات ہی میں نہیں بلکہ فن، کلچر اور مذہب میں بھی جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک نے ہندوستان سے بہت گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ ان قدیم یادگاروں میں سب سے اہم جاوا میں بورو بودور کے مقام پر بنے ہوئے نہایانی بدھ مندر ہیں۔ ملایا میں کیدار کی چوٹی پر شیو کا ایک خوبصورت مندر جو پتھر کے مضبوط اور سڈول ٹکڑوں سے بنایا گیا ہے حال ہی میں برآمد ہوا ہے۔ ڈاکٹر ویلز کو جو ان کھدائیوں کے مہتمم تھے۔ ایک مٹی کا گھڑا ملا ہے جس پر نویں صدی عیسوی کے جنوبی ہندوستان کی زبان کے کتبے کھدے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کانسے کی ایک صندوقچی بھی ملی ہے جو بناوٹ میں بالکل جنوبی ہندوستان کے نمونے کی ہے۔ ان چیزوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چولا خاندان کے بادشاہ راجندر نے اس زمانہ میں ہندوستانی مذہب کے عقیدے یہاں پھیلائے۔ ان ملکوں میں اینٹوں کے بنے ہوئے بہت سے مندر بھی ہیں جن میں ہندو مذہب کی مورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ان علاقوں میں ہندوستانی کلچر ملایا کے راستہ سے پہنچا۔

سیام میں ہندوستانی آرٹ کے اثرات زیادہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں بنکاک کے قریب پانگ توک کے مقام پر کھدائی میں جو چھوٹی چھوٹی مورتیاں نکلی ہیں وہ ہندوستان کے امراوتی اسکول سے بہت مشابہ ہیں۔ ان مورتیوں کے سیام میں برآمد ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی آمدورفت سیام میں دوسری صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی۔ سیام سے بورنیو تک اور سماترا سے چمپا تک اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ ان علاقوں میں عرصہ تک سنسکرت زبان بولی جاتی رہی ہے۔ اس علاقہ میں سنگ تراشی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ گپتا آرٹ سے مشابہ ہیں۔ اسی علاقہ میں وشنو کی، چار ہاتھوں کی ایک چھ فٹ اونچی مورت بھی ملی تھی۔ اب یہ مورت بنکاک کے نیشنل میوزیم میں رکھی ہے۔

سماترا کو دیکھکر نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں خاصے عرصہ تک ہندو آباد رہے ہیں بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہند چینی کلچرل علاقہ کا ایک خاص حصہ رہا ہے۔ پیالو خاندان، چولا حکومت اور تامل اور کرالا کے علاقوں کا اثر یہاں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ان لوگوں میں اب تک دراوڑی نام ملتے ہیں۔ جاوا میں راجہ راجندر کے جو کتبے ملے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی زمانہ سے جنوبی ہند کے لوگوں کی آمدورفت یہاں تھی۔

مشرق کے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہندوستان کا تعلق کلچر اور اخلاق کا تعلق رہا ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کی اب اپنی الگ حیثیت ہے۔ لیکن اس کے جسم اور روح کی تشکیل ہندوستان اور چین نے کی ہے۔ ایسی چیز ہے جس سے آنے والے زمانہ میں ان دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے رشتہ کی تحریک پیدا ہوگی اور یہ رشتہ دونوں کی بھلائی اور خوشحالی کا باعث بنے گا اور ہندوستان جنوبی مشرقی ایشیا کی اس دوستی کے رشتہ کا مرکز ہوگا۔

ان ملکوں کے باہمی رشتہ سے ان کا ناگزیر معاشی تعلق اور نکھرے گا۔ چین، ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کے لوگ جیسے ایک ہی گھرانے کے لوگ ہیں اور یہ ایک گھرانے کے لوگ آنے والے زمانہ میں ایک دوسرے سے اور قریب ہوتے رہیں گے۔

(نیو انڈیا سے ماخوذ)

دعوتِ حسن و عشق

آ شبابِ شعر کا گزرا زمانہ بنکے آ ❊ آ بہارِ حسن کا رنگیں فسانہ بنکے آ
آ دیارِ عشق کا دلکش ترانہ بنکے آ ❊ آ بہر اندازِ یکتا و یگانہ بنکے آ
آ تمنا کی حیات جاودانہ بنکے آ
آ مرے حق میں مسیحائے زمانہ بنکے آ

آ مریضِ عشق و الفت کا مسیحا بنکے آ ❊ آ مرے دردِ محبت کا مداوا بنکے آ
آ خدا کے واسطے جانِ تمنا بنکے آ ❊ آ براہِ لطف تسکینِ سراپا بنکے آ
آ نشانِ الفت و لطف و مدارا بنکے آ
آ جہانِ راحتِ پنہاں و پیدا بنکے آ

آ مری بیتابیٔ رفتہ کا ساماں بنکر آ ❊ آ مرے ظلمت کدے میں ماہِ تاباں بنکر آ
آ مرے تاریک گھر میں ماہِ کنعاں بنکر آ ❊ آ چراغِ ظلمتِ شامِ غریباں بنکر آ
آ مرے اجڑے چمن میں پھر بہاراں بنکر آ
آ مری محفل میں تا رشکِ چراغاں بنکے آ

آ کہ اک مدت سے سونا ہی پڑا ہے شبستانِ حسن و عشق ❊ آ کہ عرصہ سے ہے ویراں گلستانِ حسن و عشق
آ کہ دہرائیں باہم داستانِ حسن و عشق ❊ آ کہ پھر ہنجائیں دونوں شمعِ دنیائے حسن و عشق
ساکت و جامد ہے کب تک محبت کا جہاں
آ بنا دیں اس جہاں کو پھر مسرت کا جہاں

آ کہ یوں کب تک رہیں رنجور ہم مہجور ہم ❊ آ بنا دیں آج حسن و عشق کا دستور ہم
آ کہ دنیا کو بنا دیں پھر سراپا نور ہم ❊ آ کہ پھر روشن کریں مل کر چراغِ طور ہم
آ کہ پھر دیں انجم و شمس و قمر کو روشنی
آ کہ پھر بخشیں جہانِ تیرہ تر کو روشنی

صلہ

افسانہ

بڑھی نصیبن اپنے کوارٹر سے نکلی دروازے پہنچ کر اس نے کوٹھی پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے ۱۵ سال گزارے تھے۔ عذرا سے چھوٹ جانے کی اس کو بہت تکلیف تھی۔ عذرا کی وہ آیا تھی۔ اسی کے ہاتھوں وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اب جب کہ وہ پندرہ برس کی ہو گئی تھی تو اس کو الگ کر دیا گیا۔

خاں صاحب، عذرا کے سخت دل والد نے سب سے پہلے اس کو محسوس کیا کہ جوان لڑکی کے لئے آیا کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لئے انہوں نے نصیبن کو نکال دیا۔ نصیبن نے گھر والوں کی خوشامد کی کہ کچھ جینے اس کو اور رہ لینے دیں۔ اس کے بعد وہ خود چلی جائے گی۔ اس کی لڑکی گلشن بہت سخت بیمار ہے۔ اس کو دوا، پھلوں اور طاقت پہنچانے والی غذاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ کریم اس کا جوان لڑکا دو مہینے سے گھر پر بیکار بیٹھا ہے۔ عذرا کی ماں اور خود عذرا نے اس کی پندرہ سالہ خدمات، لڑکے کی بیکاری اور لڑکی کی بیماری کا خیال کرتے ہوئے خاں صاحب سے التجا کی کہ اس کو نکالا نہ جائے۔ لیکن خاں صاحب نے یہ کہہ کر کہ "ہمارا گھر کوئی خیرات خانہ نہیں ہے" ان کی درخواست سختی سے ٹھکرا دی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ہم نوکروں کو کام کے لئے رکھتے ہیں۔ اس لئے نہیں رکھتے کہ ان کی لڑکی بیمار ہے یا ان کا لڑکا بیکار بیٹھا ہے۔ اور اس طرح ہم ان کے خاندان بھر کی پرورش کریں۔ ہم کو نصیبن کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے اس کو یہاں سے چلا ہی جانا چاہیئے۔"

نصیبن سے رخصت ہوتے وقت عذرا خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اس نے کہا، "بوا کبھی کبھی ہم کو دیکھنے ضرور آیا کرنا۔" "بھلا بی بی میں تم کو کہیں بھول سکتی ہوں۔" نصیبن نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ لاکھ روکنے پر بھی اس کی سسکیاں نکل ہی گئیں اور وہ عذرا کو چمٹا کر رونے لگی۔

ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ، نصیبن اپنی کوٹھری میں داخل ہوئی۔ گلشن ایک پھٹی دری اوڑھے ہوئے کھرے پلنگ پر پڑی تھی۔ کریم اس کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ ماں کو جواب مل جانے کی خبر سنتے ہی جیسے اس پر بجلی گر پڑی۔ لیکن اس نے دل کڑا کر کے کہا، "خیر اماں اللہ مالک ہے۔ لیکن گلشن کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اس کے لئے دوا چاہیئے۔"

"تو پھر مجھ کو کہیں اور نوکری کرنا پڑے گی۔" نصیبن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

کریم بولا، "اماں، اب تمہاری یہ عمر نہیں ہے کہ تم نوکری کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرو۔ تم کو تو اب بالکل آرام کرنا چاہیئے —— میں نے جب سے یہ سنا ہے کہ خاں صاحب نے تمہاری ۱۴، ۱۵ سال کی تابعداری کا خیال نہیں کیا اور تم کو جواب دے دیا، میرے تو تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دیکھتی ہو اس موذی کو۔ ان کو یہ بھی ترس نہ آیا کہ گلشن بیمار ہے اور اس کی حالت دن بدن گرتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اے اللہ تو ہی ہمارا فیصلہ کرنے والا ہے۔"

"تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے، چپکے رہو۔" نصیبن نے اس کو روک دیا۔

"میں ہرگز چپکے نہیں رہ سکتا۔" کریم نے تیزی اور غصے سے کہا، "ان کی ناانصافی نہیں دیکھتیں اور میں جو کہتا ہوں تو خفا ہوتی ہو۔ ان سب امیروں کی سزا یہ ہے کہ ان کی دولت چھین لی جائے۔"

اس کی آنکھیں کسی آئندہ کامیابی کے خیال سے چمکنے لگیں لیکن نصیبن نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

دوسرے دن صبح سویرے جب نصیبن جاگی تو کریم اس طرف بیٹھے تھے۔ زمین پر بیٹھا کچھ گن رہا تھا۔ اس کو روپوں کی جھنکار اور نوٹوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے حیرت سے پوچھا "یہ تم کہاں سے لے آئے؟"

کریم اس کے اس اچانک سوال سے کچھ چونک سا پڑا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "اماں، کل جو ہم نے تم سے کہا تھا وہی کر لائے۔ ہمارے لئے اس میں کوئی عار شرم نہیں ہے۔ پچھلی رات جب تم سو رہی تھیں تو ہم نے خاں صاحب کے یہاں نقب لگائی اور اپنے لئے کچھ سہارا پیدا کر لیا۔"

نصیبن یہ سن کر ہکا بکا رہ گئی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "تم، تم نے صاحب کے وہاں چوری کی۔ ان کے وہاں چوری کی جن کا نمک پورے پندرہ برس تک ہم نے کھایا۔ یا اللہ میرے کان کیا سن رہے ہیں۔"

"ہاں" کریم نے تیزی سے جواب دیا، "میں نے ان کے وہاں چوری کی جن کی تابعداری تم نے ۱۵ برس کی اور اب جب کہ تم بڈھی ہو گئیں تو انہوں نے تم کو نکال باہر کر دیا۔ انہوں نے اس کی بھی پروا نہ کی کہ تمہاری بیمار لڑکی مرے گی یا جیے گی۔ ان کو اس کا بھی خیال نہ گزرا کہ تمہارا کنبہ فاقہ کرے گا۔"

نصیبن رونے لگی اور غصے میں بولی، "کریم تجھ پر اللہ کی سنوار،

حبیب انصاری

"آخر تجھ سے ایسا بڑا کام ہوا کیسے؟ جا جس کے روپے ہیں اس کو ابھی واپس کر آ۔" "یہ نہیں ہو سکتا اماں!" کریم نے سختی سے کہا۔ "ذرا سمجھ سے کام لو۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان روپوں کے چوری جانے کا خاں صاحب کو رنج ہوا ہوگا۔ یہ ۲۰۰ روپے ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ان میں ذرا سی بھی بھلمنساہت ہوتی تو وہ یہ دو سو روپے تم کو گھر سے نکالتے وقت دے دیتے۔ یا پھر تمہارا کچھ گزارا مقرر کر دیتے۔ اماں! اب جب روپے آ گئے ہیں تو یہ فضول باتیں نہ کرو۔ ہم ان کو گلشن کی دوا میں خرچ کریں گے اور جب تک میں روزی سے لگوں یہ ہمارے کھانے پینے میں کام آئیں گے۔" کریم یہ کہہ کر، کھانے پینے کی چیزیں اور گلشن کی دوا لینے کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ سب چیزیں لے کر گھر لوٹا تو اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر نصیبن کو پکارا۔ "اماں، اماں ایک بہت بری خبر سننے میں آئی ہے۔ خاں صاحب کے وہاں کسی اور نے بھی چوری کی ہے۔ میں جب واپس آیا تو دروازہ بند کرنا بھول گیا، موقع پا کر کوئی اندر گھس آیا اور جھاڑو پھیر دی۔ معلوم ہوا ہے بہت سے ہیرے جواہرات چوری گئے ہیں۔"

"ہائے میرے اللہ" نصیبن گھبرا کر چلا اٹھی، "کیا تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھ کو کیسے پتہ چلا؟"

"یہ نکڑ پر جو کلو رہتا ہے اس نے مجھ سے کہا۔ اس کو میں نے رازدار بنایا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں تم کو لے کر کہیں باہر چلا جاؤں اس لئے کہ پولیس ہمارا پیچھا کرے گی اور اس کو سب سے پہلے تم پر شبہ ہوگا۔"

پولیس کا نام سنتے ہی نصیبن چراغ پا ہو گئی اور حلق پھاڑ کر پکاری "بڑی آئی وہاں سے پولیس پیچھا کرنے والی میرا اس میں کیا دوش ہے۔"

کریم نے اس کو سمجھانا شروع کیا "اماں تم تو ذری ذری باتیں بگڑ اٹھتی ہو۔ دوش تو اس میں تمہارا ذرا سا بھی نہیں لیکن یہ دو چوریاں تمہارے وہاں سے آنے کے بعد میں ہوئی ہیں اور خاں صاحب یہ سمجھیں گے کہ اس میں ضرور تمہارا ہاتھ ہے۔ تم اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی ہو لیکن اس صورت میں میں دھرا جاؤں گا۔ اور پھر میرے جواہرات کی بھی میرے متھے جائے گی۔ اور میں کم سے کم ۱۰ سال کے لئے سوا لاکھ کی کوٹھی کی ہوا کھاؤں گا۔" اس نے بے بسی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہائے میرے مقدر" نصیبن دو ہتڑ پیٹنے لگی "کریم میرے بیٹے میں تجھ کو بچاؤں گی اور سارا الزام اپنے سر اوڑھ لوں گی تو ابھی جوان ہے۔ تجھ کو ابھی بہت دن جینا ہے۔ اگر تیرے دشمنوں کو جیل ہو گئی تو تیری جان پر بن جائے گی۔" "اگر ہم ایک مرتبہ بھی اس مشکل میں پڑ گئے تو اس سے نکلنا آسان نہ ہوگا۔ ساری بات میرے ہی اوپر آئے گی۔ جواہرات کی چوری بھی ہم ہی پر لگے گی۔ ہم نے تو یہ سوچا ہے کہ لکھنؤ چھوڑ دیں اور کانپور جا کر کسی مل میں مزدوری کریں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تم وہاں سے چوری سے پہلے آ گئیں ورنہ پھر تو تمہارے ہی اوپر الزام آتا اور ہم بھی پکڑے جاتے۔ چلو تم سامان باندھو میں اکہ بلاتا ہوں۔"

نصیبن غم اور تکلیف کے مارے سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ کریم نے یہ بہت اچھا کہا کہ لکھنؤ چھوڑ کر کانپور چلا جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ہم وہاں بالکل محفوظ رہیں گے۔ اور وہ جلدی جلدی سامان باندھنے لگی۔

کانپور آ کر کریم نے ایک کوٹھری کرائے پر لے لی اور نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ ان لوگوں کے دل سے اب پولیس کا کھٹکا نکل چکا تھا۔ اس لئے کہ لکھنؤ سے آئے ہوئے ان کو تین سوا تین مہینے گزر چکے تھے اور کسی نے خبر بھی نہیں لی کہ نصیبن اور نصیبن کے لڑکے ہیں کہاں؟ مرتے ہیں یا جیتے ہیں؟ لیکن نصیبن کے دل سے ابھی تک چوری کا خیال نہیں نکلا تھا۔ کھانا اس کو زہر معلوم ہوتا تھا اس لئے کہ وہ یہ جانتی تھی کہ یہ اس کے پرانے آقا کے چرائے ہوئے روپوں سے خریدا گیا ہے جن کا نمک اس نے ۱۵ برس کھایا تھا اس کو رہ رہ کر یہ خیال ستایا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

آخر کار وہ ۲۰۰ روپے ختم ہو گئے۔ گلشن بھی اب اچھی ہو چلی تھی۔ اور کریم کو بھی روپے روز کی مزدوری کسی مل میں مل گئی تھی۔ لیکن نصیبن ان سب باتوں سے بھی مطمئن نہیں تھی۔ اس کی کوٹھری کے سامنے والی سڑک بن رہی تھی۔ بجری کوٹنے والی عورتوں میں وہ بھی شامل ہو گئی۔ ۱۵ آنے روز اس کو مل جاتے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ یہ مزدوری کے پیسے وہ خرچ نہیں کرے گی۔ جوڑ جوڑ کر رکھے گی اور خاں صاحب کے دو سو روپے ان کو کسی نہ کسی طرح واپس کر دے گی۔ جب اس نے اپنا منصوبہ کریم سے بیان کیا تو اس نے نرم لہجے میں سختی سے مخالفت کی "اماں تم اس کنجوس مکھی چوس کے لئے اپنی جان پر کھیل کر روپے جمع کرنا چاہتی ہو۔ جس نے تم پر ذرا سا بھی ترس نہ کھایا۔ یہ ۲۰۰ روپے اس کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں اور اس کے لئے میں تم کو بجری نہیں کوٹنے دوں گا۔"

"یہ نہیں ہوگا۔ میں مرنے سے پہلے ان کا قرضہ ضرور چکاؤں گی۔"

نصیبن نے بہت ہی نرمی سے جواب دیا۔

نصیبن نے اپنا ہی کہنا کیا۔ وہ سڑک کی مزدورنوں میں شامل ہی رہی۔ ایک ایک پائی جوڑ کر رکھتی تھی۔ بعض وقت اس کو پیسے پیسے کے لئے کریم کا منہ دیکھنا پڑتا تھا لیکن اس نے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ایک روپے کے پیسے جمع ہو گئے اور وہ ان پیسوں کو گنگا دین بنئے سے ایک روپے کے نوٹ کے بدلے میں بدل لائی۔

۵ سال گزر گئے۔ نصیبن کی حالت پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی وہ سن سے زیادہ بڈھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پیٹھ جھک گئی تھی اور ایک چھوٹا سا کوبڑ بھی نکل آیا تھا۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کام دھندے سے لگی ہی رہی آخر کار اس کا مقصد پورا ہی ہو گیا پورے دو سو روپے اس کی پوٹلی میں بندھے تھے اور اس نے طے کر لیا تھا کہ اب کے منگل کو وہ لکھنؤ چل دے گی اور خاں صاحب کا قرضہ ادا کر دے گی۔

جانے سے ایک دن پہلے پیر کو جب کریم مل سے واپس آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا "اماں شکر کے کارخانے میں مزدوروں کی ضرورت ہے۔ ڈھائی روپے روز کی مزدوری ہے۔ لیکن اس کے لئے ڈیڑھ سے روپیہ ضمانت میں جمع کرانا ہوگا۔ اب بڑا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے میں اس کو جانے نہیں دوں گا اور وہیں مزدوری کروں گا۔"

"لیکن بیٹا! یہ ڈیڑھ سے روپیہ تم لاؤ گے کہاں سے؟" نصیبن نے کہا۔ "لاؤں گا کہاں سے تم ہی سے لوں گا۔ اماں خدا کے لئے ان کو روپے دینا بھول جاؤ۔ وہ اپنے روپوں کی چوری کب کے بھول چکے ہوں گے۔" "نہیں بیٹا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" یہ کہنے کے بعد اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اس کو بڑا ہی دکھ ہوا کہ روپے اس کے پاس ہیں لیکن وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دے نہیں سکتی۔ دوسرے دن صبح وہ روتی ہوئی لکھنؤ چل دی۔

شام ہو چکی تھی، نصیبن خاں صاحب کی کوٹھی پہنچ گئی۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس کو اب تک یقین تھا کہ اس کے بیٹے پر کوئی الزام نہیں آئے گا اور روپے لوٹا دینے کے بعد کریم کا سارا گناہ دھل جائے گا۔ اور وہ اس قصور کو بالکل معاف کر دیں گے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ بجائے کریم کے اس ہی کو سزا دیں لیکن چلو روپے دے ہی دیں اور بقیہ معاملہ اللہ میاں کے سپرد۔ ابھی وہ یہ سب باتیں سوچتی ہوئی ان تک پہنچ چکی تھی۔ عذرا ٹہل رہی

وہ اب ۱۵ سال کی لڑکی سے ۲۰ سال کی ایک مکمل اور خوبصورت عورت میں بدل چکی تھی۔ جیسے ہی اس نے نصیبن کو دیکھا وہ خوشی سے۔ بالکل بچوں کی طرح چیخ اٹھی "ہماری آپا آ گئیں"۔ عذرا کو اس کے آنے کی بہت خوشی تھی۔ اس کو اپنی آپا سے بہت محبت تھی اور وہ بھی عذرا کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتی تھی۔

"ہاں بی بی"۔ یہ کہکر اس نے عذرا کو گلے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولی "آپا تمہارے صدقے بی بی، میں تو یہی سمجھتی تھی کہ تم ابھی تک اتنی ہی سی ہوگی۔ میری آنکھوں میں خاک اب تو ما شاء اللہ تم نے خوب رنگ و روغن نکالا ہے۔ اللہ عمر دراز کرے۔ بی بی تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہوگا۔" نصیبن ایک ہی سانس میں سب کہہ گئی۔ عذرا نے شرما کر کہا "ہاں میں آج صبح دہرہ دون سے آئی ہوں۔ لیکن تم اتنے دنوں ہم کو دیکھنے کیوں نہیں آئیں؟"

عذرا بی بی کیا آپ کو ابھی تک ہمارے اوپر چوری کا شبہ ہے؟"

"چوری۔ چوری کیسی؟" لیکن کچھ سوچ کر وہ مسکرا کر بولی، "اچھا تم اس کو کہہ رہی ہو۔ میں سمجھ گئی۔ پاپا کو تو پہلے شبہ ہوا تھا کہ اس ڈکیتی میں تمہارا بھی ہاتھ ہے لیکن دوسرے دن نہیں تیسرے دن چور پکڑا لیا گیا۔ اور تمہارے اوپر کسی کو شبہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔"

"چور پکڑ لیا گیا؟" اس نے عذرا ہی کی بات دہرا دی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"ہاں آپا، اور پھر ہم کو ہر چیز مل گئی۔ جواہرات اور سارے روپے سب ہی چیزیں تو واپس آ گئیں۔ لیکن میں تو اس وقت بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ ہماری آپا بالکل بے گناہ ہے۔"

نصیبن کی آنکھیں بھر آئیں وہ اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ چوری کا حال عذرا سے کہہ دوں یا نہ کہوں۔ اگر نہیں کہتی ہوں تو دل نہیں مانتا اور اگر کہتی ہوں تو یہ بھولی لڑکی جو مجھ پر اتنا بھروسہ کرتی ہے کیا خیال کرے گی کہ کریم نے کتنی چھوٹی بات کی آخر اس نے دل کڑا کر کے ساری رام کہانی سنا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ کریم نے یہ چوری محض اپنی بہن کی وجہ سے کی تھی اور یہ ۲۰۰ (اس نے روپوں کی پوٹلی چادر سے کھول کر سامنے رکھ دی) کریم نے واپس کئے ہیں۔"

لیکن نصیبن کے کانپتے ہوئے ہاتھوں، جھکی ہوئی پیٹھ، روئی کے گالے ایسے سفید بال اور چہرے کی جھریوں نے سارا راز کھول ہی دیا۔ اور عذرا نے یہ اندازہ لگا ہی لیا کہ یہ روپے آپا نے اپنی جان پر کھیل کر مصیبتیں اور تکلیف جھیل کر جمع کئے ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۹۵ پر)

برطانیہ اور چرم سازی

برطانیہ میں جنگ کے دوران میں جو صنعتی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان پر حال کے چند بیانات سے تازہ روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر ایچ پیل آدم کی ایک نئی کتاب شائع ہوتی ہے جو یقیناً ایک یادگار ثابت ہوگی۔

مصنف نے ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ جنگ کے سلسلے میں چمڑے کی ضرورت ہر جگہ اور ہر چیز کے لئے محسوس ہوتی رہی ہے۔ جنگی جہازوں، ہوائی جہازوں، ٹینکوں، اور دوسرے ساز و سامان کے لئے۔ اسپتالوں میں، اے آر پی کے مرکزوں میں جنگ میں حصہ لینے والوں کو اور ان لوگوں کو بھی جو شہری زندگی بسر کرتے ہوئے لڑائی کے کاموں میں امداد دیتے رہے ہیں، چمڑے کی ضرورت لازمی طور پر لاحق ہوئی۔ کبھی اس کی ضرورت معمولی طور پر محسوس ہوتی اور کبھی پوری اہمیت کے ساتھ لیکن ہمیشہ اس کا حصہ لازمی رہا اور اعداد و شمار سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ برطانوی کارخانے میں تیار کئے ہوئے چمڑے کا رنگ ہر جگہ جمتا رہا۔ سمندر کی گہرائی میں، جنگل کی وسعت میں، برف پوش پہاڑوں کی چوٹی پر پھیلتے ہوئے صحراؤں کے دامن میں اور کبھی کبھی اٹلی اور برما کے دلدلی علاقوں میں بھی چمڑا اور وہ بھی برطانوی چمڑا قدرت اور انسان دونوں سے جنگ آزما رہا۔

برطانیہ میں صنعت چرم سازی کو اپنے نمایاں کارناموں پر ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ اس سلسلے میں اس نے کوشش کی کہ معیار گھٹنے نہ پائے اور اسی لئے برے کاریگروں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جیمز اول کے عہد حکومت میں ایک زین ساز کو محض اسلئے جرمانہ کی سزا دی گئی کہ اس کا کام معیار سے گرا ہوا تھا اور وہ چیز جو اس کی نالائقی سے خراب ہوگئی تھی، اسی کے دروازے کے سامنے جلا دی گئی۔ اسی طرح شاہ چارلس کی وفات سے ایک سال پہلے چمڑے کے ایک کاریگر پر چھ آنے جرمانہ کیا گیا تھا۔ یہ رقم ان دنوں خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے چمڑے کے دو خراب تسمے بازار میں فروخت ہونے کے لئے پیش کر دئے تھے۔

چمڑے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک سرکاری ذخیرے میں رکھی ہوئی مختلف چیزوں کی قسمیں ایک ہزار سات سو کے قریب تھیں۔ لڑائی کے دوران میں گھوڑوں کی زین، ساز و سامان اور فوجیوں کے جوتوں اور تھیلیوں وغیرہ کے ساتھ دوسری چیزوں کی مانگ بھی بڑھتی رہی تاہم ان کا شمار سب سے زیادہ رہا۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فوجیوں کے لئے جوتوں کے سات کروڑ جوڑے فراہم کئے گئے اور جب روس لڑائی میں شامل ہوگیا تو بارہ لاکھ جوڑے اس کی فوج کیلئے بھیجے گئے۔ اس تعداد میں ٹخنوں تک کے تمام قسم کے جوتے شامل تھے۔ برطانیہ کی خشکی کی فوج کیلئے بوٹ سب سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی افادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے بحری اور فضائی فوجوں نے، ہوم گارڈ اور سول ڈیفنس کے لوگوں نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ انہی کو پسند کیا۔ اس کے باوجود لڑائی کے خاتمے سے پہلے ہی برطانوی صنعتِ چرم سازی کے محکمے نے فوجی جوتوں میں ڈیڑھ سو کے قریب نئی قسموں کا اضافہ کر دیا۔ یعنی ایسے جوتے بنائے جو برفانی مقامات پر، کانٹوں والے جنگلوں میں پہاڑوں کی چڑھائی کے لئے یا ان علاقوں میں پہنچنے کے لئے جہاں مچھر زیادہ ہوتے ہیں زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکے۔ حتٰی کہ بعض ایسے جوتے بنائے جو صرف جبل الطارق کی چڑھائی کیلئے موزوں ہو سکتے تھے۔

چمڑے کی صنعت کے لئے لندن میں کچا سامان ساری دنیا سے آتا ہے اور حساب لگایا جائے تو کل فراہمی کا دو تہائی حصہ درآمد شدہ ہوتا ہے۔ دنیا میں چمڑے کی جو بہترین قسمیں سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے زیادہ تر برطانیہ ہی میں تیار ہوتی ہیں۔ درآمد شدہ مال میں سے وہ چمڑا جو جوتے کا تلا بنانے کے کام آتا ہے، امریکہ، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، چین سے اور کچھ ہلکی قسم کا ہندوستان سے لیا جاتا ہے۔

لڑائی کے دوران میں جب جہازوں کی نقل و حرکت کا مسئلہ دشواریاں پیدا کرنے لگا تو برطانوی کارخانوں نے جوتوں کے لئے ایسے چمڑے کی دباغت بھی شروع کر دی جو عام طور پر اس مقصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نیز گھوڑے کی کھال سے بھی مدد لی گئی تاکہ عمدہ قسم کا چمڑا زیادہ اہم کاموں مثلاً فوجی دستانوں کیلئے بچ جائے۔ فوجی ہوابازوں کے لئے ایسا چرمی لباس بھی تیار ہوا جو صحیح معنوں میں ان کو سر سے پاؤں تک ڈھک سکتا تھا۔ اس اعتبار سے چمڑے کی مانگ بہت زیادہ رہی۔ دوسری صنعتوں کی طرح چرم سازی کی صنعت میں بھی یہ نئی بات پیدا ہوئی کہ بہت سے کارخانے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوکر کام کرنے لگے اور نتیجہ یہ کہ اب سب مل جل کر برآمدی تجارت میں بڑی تیزی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔

لڑائی کے دوران میں نت نئے تجربات نے کچھ مفید کام بھی کر دکھائے۔ چمڑے کی ایسی ہلکی پھلکی چیزیں تیار ہونے لگیں جو اس سے قبل ممکن نہ ہو سکی تھیں۔ مثلاً کم وزن کا سامانِ سفر ان لوگوں کے لئے جو عموماً فضائی سفر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا سوٹ کیس تیار کیا گیا جس کا کل وزن ساڑھے پانچ پونڈ سے زیادہ نہیں ہے۔

(لندن کرانکل سے ماخوذ)

نقد و نظر

مطبوعات ادارۂ تعلیمات اسلام

۳۵ امین آباد پارک ۔ لکھنؤ

یہ ادارہ عبدالسلام صاحب قدوائی نے قائم کیا ہے جو فاضل ندوہ ہیں اس ادارے سے صرف مذہبی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ ان کا مقصد خدمت اسلام ہے پیش نظر کتابچوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انکی کوششیں کامیاب اور تعریف کے قابل ہیں۔ فی الحال سلسلۂ اشاعت کی چار کتابیں نمبر ۲ ۔ نمبر ۱۰ ۔ نمبر ۱۱ ۔ اور نمبر ۱۲ بغرض تبصرہ آئی ہیں جن کے نام یہ ہیں :- (۱) عربی کے دس سبق۔ (۲) حضرت ابوہریرۃؓ (۳) حضرت بلالؓ (۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ اول الذکر میں جو مہتمم ادارہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، عربی سیکھنے کے بالکل ابتدائی قاعدے درج ہیں۔ کلام مجید کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے یعنی ان سبقوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اتنی صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ محض اٹکل سے قرآن شریف کے جملوں کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح معنے تو زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہی آسکتے ہیں تاہم "نا سے ہاں بہتر ہے" کے مصداق اسے غنیمت کہا جا سکتا ہے۔ ہر سبق کے ساتھ ساتھ ترجمے کی مشق کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔ باقی تین کتابچے سوانح کے رنگ میں ہیں۔ حضرت ابوہریرۃؓ اور حضرت عبداللہؓ نامور اصحاب رسول مقبول صلعم اور حضرت بلالؓ حضورؐ کے خاص خادم تھے ۔ ان کی سیرتوں اور کارناموں پر بے شمار کتابیں اور متفرق مضامین قلمبند ہو چکے ہیں لیکن انھیں بہت ہی آسان زبان میں کم سن طلبا یا ایسے غیر مسلموں کے لئے لکھا گیا ہے جو ان حضرات کی عظمت سے غیر متعارف ہیں۔ تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں یہ خدمات یقیناً قابل تحسین ہیں۔ یہ علی الترتیب احتشام علی صاحب رحیم آبادی، عبدالسلام صاحب قدوائی اور بشیر الحق صاحب بجری آبادی کی تصانیف ہیں۔ ہر حصے کی قیمت چار آنے ہے۔ مندرجہ بالا پتے سے طلب کیجئے۔

قرآن آموز

مولف :- جناب نذیر بن ابی سلمیٰ۔ ملنے کا پتہ :- دفتر قرآن آموز احاطہ شہزادہ محمد طاہر ۔ لدھیانہ ۔ صفحات ۴۶ قیمت ۸ر

یہ کتاب بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بچوں کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھانے کے سلسلے میں لکھی گئی ہے۔ بہت عمدہ اور سریع الفہم طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ عربی میں زیر، زبر یا پیش کے استعمال یا شروع اور آخر میں چند حروف کے اضافوں سے معنی و مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی سبقوں میں انہی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ ان الفاظ کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے جو قرآن شریف میں بار بار استعمال ہوتے ہیں چنانچہ ان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہر کوئی شخص جس نے اس زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی ہو عربی لغت سے معمولی مدد لے کر تیسوں پاروں کو سمجھ سکتا ہے۔ عربی زبان کو عموماً مشکل کہا جاتا ہے لیکن یہ کتاب دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اس کے سہل ہونے میں کلام نہیں ہے۔

میرا نام ہے تعلیم

مصنف :- جناب نعیم صدیقی۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ نشاۃ الثانیہ چیچل گوڑہ حیدرآباد دکن۔ بڑے سائز کے ۳۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت چھ آنے۔ اردو زبان میں اپنی قسم کا پہلا ڈراما ہے جسے تعلیم کے موضوع پر رمزیہ انداز میں لکھا ہے۔ ڈرامے کے افراد میں تمام علوم مثلاً ادب، فلسفہ، تاریخ، سائنس، سیاست، شہنشاہیت اور تعلیم شامل ہیں۔ سب سے اہم کردار ابلیس کا ہے جس کی تخریبی کوششوں سے نظام تعلیم ہمیشہ بگڑتا رہتا ہے۔ اس مختصر ڈرامے میں شروع سے آخر تک تمثیلی اور اشارتی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے ۔ زبان نہایت شگفتہ اور موثر ہے۔ تاریخ ہند کا ایک دور کی جھلک پس منظر کا کام دیتی ہے ۔

پیغام حق کا اقبال نمبر

مرتبہ :- سید محمد شاہ صاحب ایم ۔ اے ملنے کا پتہ :- دفتر "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ رسالہ "پیغام حق" کئی سال سے جاری ہے۔ اب جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۴۶ء کی مشترکہ اشاعت "اقبال نمبر" کے نام سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ حصول کاغذ کی مشکلات اور کتابت و طباعت کی دقتوں نے بہت تاخیر پیدا کی ہے لیکن "دیر آید، درست آید" کے مصداق یہ خاص نمبر جسے ایک مستقل کتاب کہا جا سکتا ہے، بہت ہی قابل قدر ہے۔ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغامات کے مختلف پہلوؤں پر صائب رائے رکھنے والے حضرات سے مقالے لکھوائے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سید عبداللہ، خواجہ عبدالحمید، ڈاکٹر ظفر الحسن، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، سید ابوسعید بزمی کے اسمائے گرامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ عبدالقیوم باقی نے اقبال سے متعلق ایک ایسا دلچسپ غنائیہ لکھا ہے کہ وہ اس سارے مجموعہ کی جان ہے۔ اردو زبان میں اور خصوصاً اقبال سے متعلق ایسی چیز آج تک نہیں لکھی گئی ۔ مغربی مفکرین نے اقبال کو سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کا جواب چراغ حسن صاحب حسرت نے بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔ حصۂ منظومات میں سائل صاحب انبیٹھوی کو نمایاں حیثیت دی جا سکتی ہے ۔ اس حصہ میں دو ایک غیر متعلق چیزیں بھی ہیں جن کو شامل نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔

ادارۂ آجکل

قارئین کرام گذشتہ چند اشاعتوں سے محسوس کر رہے ہونگے کہ ادارۂ آجکل میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں بشیر صاحب فلم سازی کی تعلیم کے سلسلے میں امریکہ تشریف لے گئے اور مہیندر ناتھ صاحب شیدا کے چلے جانے کے بعد محترمی آغا محمد یعقوب صاحب دواشی بھی ادارۂ مطبوعات متحدہ میں ہندوستانی شعبے کے افسر اعلیٰ مقرر ہو گئے ہیں آجکل سے اسطرح الگ ہو گئے جیسے بڑے گل سے جدا ہو جانے کے بعد بھی اس کے قریب ہی رہتی ہے یعنی اب آردو آجکل ہی نہیں بلکہ ہندی آجکل دنیا اور فوجی ریڈیو کا نظم و نسق ان کے سپرد ہے اور ان کی بجائے ادب آردو کے ۔۔۔ نقاد جناب وقار عظیم صاحب ایم اے جو عرصہ دراز تک ۔۔۔ کے قلمی نام سے صفحات آجکل میں تنقید و نظر لکھتے رہے باقاعدہ طور پر ادارہ میں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے شامل ہو گئے ہیں ہم یقین دلاتے ہیں کہ آغائے محترم جس خوبی کیساتھ چمنستان ادب کے رنگا رنگ پھول چن چن کر گلدستے بناتے رہے ہیں وہ وقار صاحب کے عہد میں بدستور قائم رہیگی بلکہ زیادہ نوازیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگی۔

فضل حق قریشی

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... حضرت نوح ناروی .....
۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (معہ تصویر) ...... پروفیسر رشید احمد صدیقی ..
۳۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ .... وقار عظیم ایم ۔ اے ...
۴۔ رُوپ (رباعیات) .... حضرت فراق گورکھپوری ....
۵۔ آسٹریلیا کی مشینیں اور دنیا کی غذا کا مسئلہ مسٹر ایم گربی ....
۶۔ اردو ایک ترقی پسند زبان ...... ڈاکٹر مسعود حسین خاں .....
۷۔ ایک خواب (مصری افسانہ) ...... حکیم حبیب اشعر دہلوی ...
۸۔ روس کی روزمرہ زندگی ...... جناب رنجیت سنگھ .....
۹۔ آشوب (افسانہ) .... جناب رفیق علی ......
۱۰۔ جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو (۲) ۔ جناب اکبر فاروقی مراد آبادی
۱۱۔ بہار کے دیہاتی گیت ...... بیگم شکیلہ اختر صاحبہ .
۱۲۔ کو مٹہ (نظم) .... جناب اسد ملتانی ...

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۳۶ سے شائع کیا